تکملہ

تفسیر ترجمان القرآن

بلطائف البیان

للامام النواب محمد صدیق حسن خان القنوجی رحمہ اللہ

تالیف

مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ

(۱۲۶۲-۱۳۴۰ھ)

تصحیح وتنقیح ونظرثانی

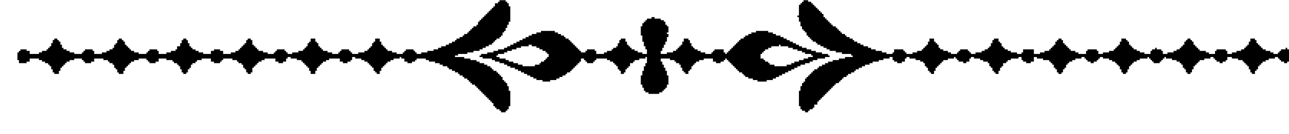
فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف رحمۃ اللہ علیہ | حافظ عبداللہ سلیم حفظہ اللہ

تسہیل: محمد یحیٰی قریشی تخریج: حافظ حامد مشتاق فاضل مدینہ یونیورسٹی

جلد نہم

دار ابی الطیب للبحث والتحقیق

مکتبہ قدوسیہ



نام کتاب: ــــــــــ تکملہ تفسیر ترجمان القرآن

تالیف: ــــــــــ مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی

قیمت: ــــــــــ

طبع اول: ــــــــــ نومبر 2024ء



ناشر

دار ابی الطیب

للبحث والتحقیق

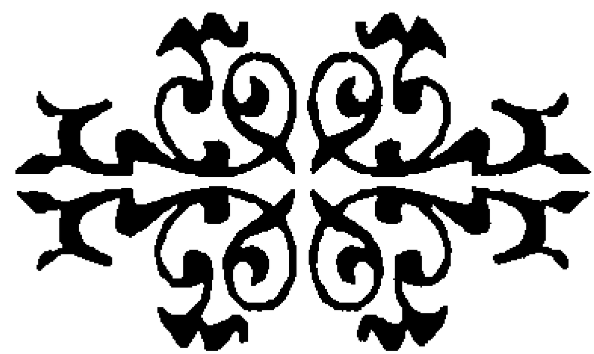
گل روڈ، حمید کالونی گلی نمبر 5 گوجرانوالہ

www.darabitayyab.com darabitayyab1@gmail.com

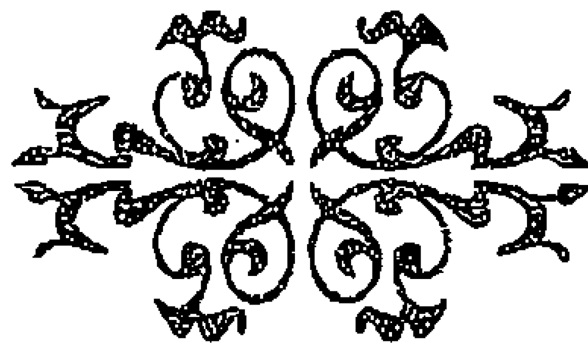
www.facebook.com/darabitayyab/

+92-55-3823990

فہرست



فہرست مضامین



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الشُّوْرٰی

اس سورت مبارکہ کا نام شوریٰ بغیر الف لام کے (اس کو امام حفناوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے اور باقی تین نام جمل رحمہ اللہ نے بحوالہ بیضاوی لکھے ہیں) اور سورت "حٰمٓ عٓسٓقٓ" اور سورت "عٓسٓقٓ" اور سورت "حٰمٓ سٓقٓ" بھی ہے (امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "وَقُرِئَ حٰمٓ سٓقٓ")[1] اس کی تین اوپر پچاس (۵۳) آیتیں ہیں، یہ ساری سورت مکی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ "حٰمٓ عٓسٓقٓ" مکہ میں نازل ہوئی۔ (أخرجه ابن مردويه) اور ابن مردویہ نے عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی کی مثل روایت کیا ہے[2] اور اسی طرح حسن، عکرمہ، عطاء اور جابر رحمہم اللہ نے کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمہ اللہ سے یہ بھی مروی ہے کہ مکی ہے، مگر اس کی یہ چار آیتیں مدینے میں نازل ہوئیں ہیں: ﴿ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ... الخ﴾[3] کسی نے کہا ہے کہ اس میں مدنی سے یہ ہے: ﴿ ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهٗ ۔إلىٰ قوله۔ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴾ اور یہ آیت: ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۔إلىٰ قوله۔ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴾[4] (یہ قول تفسیر خازن میں ہے)۔

امام ابن جریر، ابن ابی حاتم، نعیم بن حماد اور خطیب رحمہم اللہ نے ارطاۃ بن منذر سے ایک طویل حدیث "حٰمٓ عٓسٓقٓ" کی تفسیر میں روایت کی ہے، یہ حدیث صحیح اور ثابت نہیں ہے۔ فتح البیان و فتح القدیر میں فرمایا ہے: ہمارا ظن یہی ہے کہ من جملہ موضوعات مکذوبات ہے۔ وضع کرنے والے کو اس حدیث کے وضع کرنے پر وہ شے باعث ہوئی جو بہت لوگوں کے لیے واقع ہوتی ہے، یعنی اہلِ دول (اربابِ حکومت) کی عداوت اور ان کی شان کی حقارت اور اُن پر عیب لگانا۔

اسی طرح وہ حدیث ہے جو امام ابو یعلیٰ اور ابن عساکر رحمہما اللہ نے ابو معاویہ رحمہ اللہ سے روایت کی ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے فرمایا: "بِسَنَدٍ ضَعِيْفٍ" فتح البیان اور فتح القدیر میں فرمایا: "بِسَنَدٍ مَوْضُوْعٍ وَمَتْنٍ مَكْذُوْبٍ" حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلی حدیث غریب عجیب منکر ہے اور دوسری حدیث کے بارے میں یوں فرمایا کہ وہ پہلی سے اغرب ہے۔ فتح البیان اور فتح القدیر میں فرمایا ہے کہ ہمارے نزدیک دونوں موضوع و مکذوب ہیں[5] ۔إن شاء اللّٰه تعالیٰ۔ ان کا ذکر آئے گا۔

---

[1] تفسير البيضاوي (١٢١/٥) [2] الدر المنثور (٣٣٥/٧) [3] تفسير القرطبي (١/١٦)
[4] تفسير الخازن (١١٥/٦) [5] ان دونوں روایتوں کی تخریج آگے آئے گی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ۝ عٓسٓقٓ ۝ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ڮ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

حٰم ① عٓسٓق ② اللہ زبردست غالب وحکمت والا آپ کی طرف اور اُن لوگوں کی طرف، جو آپ سے پہلے تھے، اسی طرح وحی کرتا ہے ③ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہ بلند مرتبہ، بڑی عظمت والا ہے ④ قریب ہے کہ آسمان (اللہ کی عظمت و جلال کے باعث) اپنے اوپر سے پھٹ جائیں اور تمام فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور اہلِ زمین کے لیے مغفرت مانگتے ہیں۔ خبردار! بلاشبہ اللہ ہی بڑا بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے ⑤ اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا (دوسرے) کارساز بنا لیے ہیں، اللہ ان پر نگران ہے اور آپ ان کے ذمے دار نہیں ⑥

وحی اور عظمتِ الٰہی کا بیان:

آسمان پھٹ پڑیں رب کی عظمت کے زور سے، یا فرشتوں کے ذکر کی کثرت کا اثر ہو اور پھٹ پڑیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ آسمان میں چار انگشت جگہ بھی ایسی نہیں جہاں کوئی فرشتہ اپنا سر رکھے ہوئے سجدہ نہ کر رہا ہو۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حروفِ مقطعہ پر پہلے کلام گزر چکا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس جگہ ایک غریب اور عجیب منکر اثر ارطاۃ بن منذر سے روایت کیا ہے، کہا کہ ایک شخص سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور ان کے پاس حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے، چنانچہ اس نے عرض کی کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے قول ﴿ حٰمٓ ۝ عٓسٓقٓ ﴾ کی تفسیر کے متعلق بتائیں۔ راوی کہتا ہے کہ انھوں نے اپنا سر جھکا لیا اور اس سے اعراض کیا۔ اس نے پھر اپنی بات کو

دہرایا تو پھر اس سے اعراض کیا، پھر اسے کچھ جواب نہ دیا اور اس کے سوال کو ناپسند کیا۔ پھر اس نے تیسری بار اپنا سوال دہرایا، پھر بھی اس کو کچھ جواب نہ دیا، چنانچہ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: میں تجھے اس کی خبر دیتا ہوں۔ میں پہچان گیا کہ انھوں نے اس کو کیوں ناپسند کیا، وہ ان کے اہلِ بیت میں سے ایک کے بارے میں اتری ہے، اس کو عبدالالہ وعبداللہ کہتے ہیں، وہ مشرق کی نہروں میں سے ایک نہر پر اترے گا، اس پر دو شہروں کی بنیاد رکھی جائے گی، وہ ان کے درمیان پوری طرح سے شق کرے گا، یعنی ان میں اس نہر کو کاٹ کر لائے گا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ ان کے ملک کے زوال اور اُن کی حکومت اور مملکت کے زوال کا اذن دے گا تو اللہ عزوجل ان میں سے ایک شہر پر رات کو آگ بھیجے گا تو وہ شہر صبح تک سیاہ تاریک ہو جائے گا اور ایسا جل جائے گا گویا اپنی جگہ میں تھا ہی نہیں اور اس کے ساتھ کا شہر تعجب کرتا ہوا صبح کرے گا کہ وہ اچانک کیوں فنا کر دیا گیا، چنانچہ وہ دن ابھی پوری طرح سفید بھی نہ ہوا ہو گا کہ ان میں سے ہر جبار اور سرکش ایک جگہ جمع ہو جائے گا، پھر اللہ اس کو اور اُن کو ایک ساتھ زمین میں دھنسا دے گا۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ”حٰمٓ عٓسٓقٓ، يَعْنِيْ عَزِيْمَةٌ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَفِتْنَةٌ وَقَضَاءٌ، حٰمٓ عَيْن، يَعْنِيْ عَدْلًا مِنْهُ، سِيْن، يَعْنِيْ سَيَكُوْنُ، قٓ، يَعْنِيْ وَاقِعٌ بِهَاتَيْنِ الْمَدِيْنَتَيْنِ“[1]

اس اثر سے زیادہ غریب وہ حدیث ہے جس کو حافظ ابو یعلی موصلی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے مسند کے جزوِ ثانی میں عن ابی ذر رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے، لیکن اس کی اسناد انتہائی درجے کی ضعیف و منقطع ہے۔
(فإنه قال: حدثنا أبو طالب عبد الجبار بن عاصم، حدثنا أبو عبد الله الحسن بن يحيىٰ الخشني الدمشقي عن أبي معاوية... الخ)۔
امام ابو معاویہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ منبر پر چڑھے، پھر فرمایا: لوگو! کیا تم میں سے کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ﴿حٰمٓ ۝ عٓسٓقٓ﴾ کی تفسیر فرماتے ہوئے سنا ہے؟ تو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اُٹھے اور کہا: میں نے سنا ہے۔ ﴿حٰمٓ﴾ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر عین؟ کہا: ”عَايَنَ الْمُوَلُّوْنَ عَذَابَ يَوْمِ بَدْرٍ“، یعنی اعراض کرنے والوں نے بدر کے دن کے عذاب کا معائنہ کیا۔ فرمایا: پھر سین؟ کہا: ﴿وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ﴾ [الشعراء: ۲۲۷] ”جنھوں نے ظلم کیا وہ بھی ابھی جان لیں گے کہ کس کروٹ الٹتے ہیں۔“ فرمایا: پھر ”ق“؟ تو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما چپ ہو گئے، پھر ابو ذر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور ویسی ہی تفسیر کی، جیسی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کی تھی اور کہا: قاف آسمان سے ایک قارعہ ہے جو لوگوں کو ڈھانک لے گا۔[2]

---

[1] تفسير الطبري (۲۱/۴۹۹، ۵۰۰) تفسير ابن أبي حاتم (۱۰/۳۲۷۴) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ”ارطاۃ بن منذر“ کا سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سماع ثابت نہیں ہے۔

[2] تفسير ابن كثير (۴/۱۳۳) اس کی سند میں ”حسن بن یحییٰ“ ضعیف راوی ہے، نیز سند میں انقطاع ہے۔ ”ابو معاویہ“ کا سماع سیدنا عمر اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح تیری طرف یہ قرآن اتارا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ سے پہلے نبیوں پر اپنے صحیفوں اور کتابوں کو اتارا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ جو اپنے انتقام میں غالب ہے اور اپنے اقوال و افعال میں حکمت والا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! آپ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کبھی تو وہ مجھ پر گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے اور یہ اس کی سب سے زیادہ سخت قسم ہے، پھر جب وہ کیفیت مجھ سے ختم ہو جاتی ہے اور میں یاد رکھتا ہوں جو کچھ فرشتے نے کہا اور کبھی فرشتہ میرے پاس انسانی شکل میں آتا ہے، وہ مجھ سے باتیں کرتا ہے اور میں یاد رکھتا ہوں جو وہ کہتا ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: پس البتہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی سخت سرد دن میں اترتی ہے۔ پھر وہ کیفیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ختم ہوتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پسینے سے ٹپکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہایت سردی کے دن میں وحی کی شدت کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک سے پسینہ ٹپکنے لگتا تھا۔[1] (أخرجه في الصحيحين واللفظ للبخاري) (حدیث شریف میں لفظِ جبین ہے۔ پیشانی کی ہڈی کے دونوں طرف کو جبین کہتے ہیں۔ ہر پیشانی میں دو جبین ہوتی ہیں)۔

امام طبرانی رحمہ اللہ نے عن عبد اللہ بن الامام احمد عن ابیہ بہ سندِ خود عن عائشہ رضی اللہ عنہا عن الحارث بن ہشام رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ سیدنا حارث رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ پر وحی کس طرح نازل ہوتی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مِثْلُ صَلْصَلَةِ جَرَسٍ...» یعنی گھنٹی کی آواز کی طرح، پھر وہ کیفیت مجھ سے ختم ہوتی ہے اور میں اس کو خوب یاد رکھتا ہوں جو اس نے کہا، یعنی فرشتے نے اور فرمایا: یہ وحی مجھ پر سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ فرمایا: اور کبھی میرے پاس فرشتہ آتا ہے اور وہ انسانی شکل میں ہوتا ہے اور وہ مجھ سے باتیں کرتا ہے، چنانچہ میں یاد رکھتا ہوں جو وہ کہتا ہے۔[2] امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اور عرض کی: یا رسول اللہ! کیا آپ کو وحی کا احساس ہو جاتا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صلاصل کی، یعنی گھنٹی کی آوازوں کو سنتا ہوں، پھر میں اس وقت چپ ہو جاتا ہوں، میری طرف جب بھی وحی کی جاتی ہے تو میں گمان کرتا ہوں کہ میری جان قبض کی جاتی ہے۔[3] (تفرد به أحمد) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم وحی آنے کی کیفیت شرح بخاری میں اس طرح سے بیان کر آئے ہیں کہ یہاں دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٣٣) الموطأ (٢٠٢/١)

[2] المعجم الكبير (٢٥٩/٣)

[3] مسند أحمد (٢٢٢/٢) اس کی سند میں ''عمرو بن ولید'' مجہول اور ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢٧٧٨)

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ﴾ یعنی جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے یہ سب اللہ کے بندے اور اس کی ملکیت ہیں۔ اس کے غلبے اور تصرف کے ماتحت ہیں۔ ﴿ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴾ یعنی اور وہی ہے سب سے بلند اور سب سے بڑا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ الْكَبِیْرُ الْمُتَعَالِ ﴾ [الرعد: ۹] ''سب سے بڑا اور سب سے بلند و بالا۔'' اور ﴿ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ ﴾ [سبا: ۲۳] ''اور وہ بلند و بالا اور بہت بڑا ہے۔'' اس بارے میں بہت سی آیتیں ہیں۔

قولہ عزوجل: ﴿ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ ﴾۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ضحاک، قتادہ، سدی اور کعب احبار رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ''فَرَقًا مِنَ الْعَظَمَةِ'' یعنی لگتا ہے کہ آسمان اپنے اوپر سے رب العالمین کی عظمت کے خوف کے مارے پھٹ پڑیں۔[1] ﴿ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ ﴾ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا ﴾ [المومن: ۷] ''عرش کے اٹھانے والے اور آس پاس کے (فرشتے) اپنے رب کی تسبیح حمد کے ساتھ ساتھ بیان کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان والوں کے لیے استغفار کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے ہر چیز کو اپنی بخشش اور علم سے گھیر رکھا ہے۔'' قولہ جل جلالہ: ﴿ اَلَاۤ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴾ ''إِعْلَامٌ بِذٰلِكَ وَتَنْوِیْهٌ بِهِ'' یعنی مقصود اس آیت سے اللہ پاک کی مغفرت اور رحمتِ کثیر کے بارے بتانا ہے اور اس کی شان بلند کرنا ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ اللّٰهُ حَفِیْظٌ عَلَیْهِمْ ﴾ یعنی اللہ پاک مشرکوں کے اعمال پر شہید ہے، ان کو خوب شمار کرتا ہے، ان کاموں کا ان کو پورا بدلے دے گا۔ ﴿ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَكِیْلٍ ﴾ ''أَيْ: إِنَّمَا أَنْتَ نَذِیْرٌ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ وَكِیْلٌ'' یعنی تو تو صرف ڈرانے والا ہے اور اللہ ہر شے پر وکیل ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ حٰمٓ ۝ عٓسٓقٓ ﴾ اس قسم کے سورت کے ابتدائی کلمات پر کلام گزر چکا ہے۔ عبدالمومن کہتے ہیں کہ میں نے حسن بن فضل (ایک نسخے میں حسین بن فضل ہے۔ قرطبی میں اسی طرح ہے۔ فتح القدیر میں حسن ہے۔) سے پوچھا کہ ﴿ حٰمٓ ﴾ کو ﴿ عٓسٓقٓ ﴾ سے کیوں جدا کیا گیا اور ﴿ كٓهٰیٰعٓصٓ ﴾ کیوں نہ جدا کیا گیا؟ تو کہا: اس لیے کہ یہ ان سورتوں کے درمیان واقع ہوا ہے جن کا اول ﴿ حٰمٓ ﴾ ہے سو یہ اپنے قبل و بعد کے نظائر کی چال پر چلا۔ پس ﴿ حٰمٓ ﴾ تو مبتداء ہے اور ﴿ عٓسٓقٓ ﴾ اس کی خبر ہے۔ دوسری وجہ یہ

[1] تفسیر الطبري (۲۱/۵۰۱) [2] تفسیر ابن کثیر (۱۳۳/۴، ۱۳۴)

ہے کہ ﴿ حٰمٓ ۚ عٓسٓقٓ ﴾ دو آیتیں گنی گئی ہیں، اور ان کی طرح کی اور مثالیں جیسے ﴿ كٓهٰيٰعٓصٓ ﴾ اور ﴿ الٓمٓرٰ ﴾ اور ﴿ الٓمٓصٓ ﴾ ایک آیت شمار کی گئی ہیں، یعنی اس لیے ان میں فصل نہیں کی گئی اور کسی نے کہا: اس لیے کہ سارے حروفِ تہجی معنی میں ایک ہیں اس حیثیت سے کہ بیان اور کلام کی بنیاد ہیں۔[1] (كما ذكره الجرجاني) چنانچہ جب اس اعتبار سے ایک ٹھہرے تو یکجا لکھے جائیں اور ان میں فصل نہ ہو۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اہلِ تاویل نے اس میں اختلاف نہیں کیا کہ ﴿ كٓهٰيٰعٓصٓ ﴾ اور اس کی امثال حروفِ تہجی ہیں اور کچھ نہیں اور ﴿ حٰمٓ ﴾ میں اختلاف کیا ہے۔ پس کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی "حُمَّ" ہیں۔ "أَيْ: قَضٰى مَا هُوَ كَائِنٌ"، یعنی جو کچھ ہونے والا ہے اس کا فیصلہ اور مقدر ہو چکا۔ چنانچہ اس کو فعل ٹھہرایا، تو جو فعل ٹھہرایا گیا اور جو فعل نہیں ٹھہرایا گیا، ان کے درمیان فصل کا مطلب یہ ہے کہ ﴿ حٰمٓ ﴾ کو بعض نے حروف کے تحت سے نکالا اور اس کو فعل ٹھہرا کر کہا کہ اس کے معنی "حُمَّ الْأَمْرُ"، یعنی "قُضِيَ الْأَمْرُ" ہیں اور ﴿ عٓسٓقٓ ﴾ اپنی اصل، یعنی حروفِ تہجی پر قائم رہا۔

قاضی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شاید ﴿ حٰمٓ ﴾ اور ﴿ عٓسٓقٓ ﴾ سورت کے دو نام ہیں، اسی لیے ان میں فصل کی گئی اور دو آیتیں شمار کی گئیں اور اگر یہ ایک نام ہو تو فصل باقی حوامیم کی مطابقت کے لیے ہے۔[2] انتہیٰ. اول کی بنا پر دونوں خبر ہوں گی مبتدائے محذوف کی اور ثانی قول کی بنا پر بھی اسے مبتدائے محذوف کی خبر ٹھہرائیں گے، اس کے معنی میں کسی نے کہا ہے کہ "حاء" سے اللہ پاک کا حلم مراد ہے اور "میم" سے اس کی مجد و بزرگی مراد ہے اور "عین" سے مراد اس کا علم اور "سین" سے مراد اس کی سنا و روشنی اور "قاف" سے مراد اس کی قدرت ہے۔ اس نے ان اشیاء کی قسم کھائی ہے، اس کے سوا اور بھی کچھ کہا ہے جو تکلف اور تعسف، یعنی بے راہ روی ہے، اس پر نہ کوئی دلیل ہے نہ حجت اور نہ شبہِ حجت۔ اس میں جو بھی اصل قول روایت کیے گئے ہیں ان کو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں، حق وہی ہے جو سورۃ البقرہ کے ابتداء میں ذکر کیا گیا ہے۔ امام نے فرمایا: یہ بات جان رکھو کہ ایسے مواقع میں گفتگو تنگی کرتی ہے اور مجازفات، یعنی اٹکل پچو باتوں کا دروازہ کھولنا، اس قسم سے ہے جس کی طرف کوئی راہ نہیں ہے۔ لہٰذا زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس کا علم اللہ پاک کے سپرد کیا جائے، وہی خوب جانتا ہے جو اس سے مراد ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے "حٰمٓ سٓقٓ" پڑھا ہے۔[3] ﴿ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ یہ کلامِ مستانف ہے ما قبل سے متعلق نہیں ہے۔ اس سے منظور اس بات کا ثابت کرنا ہے کہ اس سورت کا مضمون ان مضامین کے مطابق ہے جو ان کتابوں میں ہیں جن کا نزول اگلے نبیوں پر ہوا ہے۔ اس میں موافقت یہ ہے کہ جیسا ان کتابوں میں توحید کی طرف بلانا تھا اور حق کی طرف راہ بتانا تھا، ویسا ہی اس میں ہے، یعنی ان معانی کی طرح جو اس سورت میں ہیں، تیری طرف وحی کی گئی اور باقی رسولوں کی

[1] تفسير القرطبي (١٦/١) [2] تفسير البيضاوي (٥/١٢١) [3] تفسير الطبري (٢١/٥٠٠)

طرف وحی کی گئی۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا: مشابہت کی وجہ یہ ہے کہ جس شے کی ساری کتابوں میں وحی کی گئی، وہ تین باتیں ہیں: توحید، نبوت اور بعث۔ چنانچہ اس قدر قرآن شریف میں اور باقی کتبِ الٰہیہ میں موجود ہے۔

شیخ زادہ نے کہا ہے کہ مشابہت کی وجہ یہ ہے کہ ان چیزوں میں اشتراک ہے: توحید، نبوت اور معاد کی طرف بلانا، احوالِ دنیا کی برائی بیان کرنا اور آخرت کے امور میں رغبت دلانا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ حٰمٓ ۝ عٓسٓقٓ ﴾ کی وحی آپ ﷺ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی طرف کی گئی۔ اس بنا پر ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ ﴿ حٰمٓ ۝ عٓسٓقٓ ﴾ کی طرف ہوگا۔ پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا کہ نہیں ہے کوئی نبی صاحبِ کتاب، مگر حال یہ ہے کہ اس کی طرف ﴿ حٰمٓ ۝ عٓسٓقٓ ﴾ کی وحی کی گئی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾.[1] واللّٰه أعلم. اس بنا پر ﴿ حٰمٓ ۝ عٓسٓقٓ ﴾ کے وحی ہونے میں مشابہت ہوئی، یعنی جیسے اس کی وحی تیری طرف کی ویسی ہی اگلے نبیوں کی طرف کی۔

بالجملہ ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ کا حرفِ کاف محلِ نصب میں ہے بنا بر صفت مفعول مطلق محذوف بہ معنی مثل: ''أَيْ: إِيحَاءً مِثْلَ ذٰلِكَ الْإِيحَاءِ الَّذِي أُوحِيَ إِلَى سَائِرِ الرُّسُلِ يُوحِي إِلَيْكَ'' ... الآية'' جمہور نے ﴿ يُوْحِيْٓ ﴾ بہ کسرِ حاء بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے اور فاعل ﴿ اَللّٰهُ ﴾ ہے اور ﴿ اَلْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ اس کی دونوں صفتیں ہیں اور کاف بہ معنی مثل صفت ہے مفعول مطلق محذوف کی، جیسا کہ گزر چکا ہے اور امام مجاہد، ابن کثیر اور ابن محیصن رحمہم اللہ نے بہ فتح حاء بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے،[2] اس کے نائب فاعل میں تین وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ ضمیر مستتر ہے جو ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ کی طرف پھرتی ہے، کیوں کہ وہ مبتداء ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''مِثْلُ ذٰلِكَ الْإِيحَاءِ يُوحِيَ هُوَ إِلَيْكَ''، پس مثل ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ مبتداء ہے اور ''يُوحِيَ هُوَ إِلَيْكَ'' اس کی خبر۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نائب فاعل ﴿ اِلَيْكَ ﴾ اور کاف منصوب المحل ہے۔ پہلی دو وجہ کی بنا پر تیسری وجہ یہ ہے کہ جملہ ﴿ اَللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ نائب فاعل ہے۔ ''أَيْ: يُوحِيَ إِلَيْكَ هٰذَا اللَّفْظَ'' یعنی وحی کی جاتی ہے تیری طرف اس لفظ کی کہ اللہ عزیز حکیم ہے۔ لیکن بصریوں کے اصول اس کے مساعد (مددگار) نہیں ہیں، کیوں کہ جملہ نہ فاعل ہوتا ہے نہ نائب فاعل۔ یا نائب فاعل قرآن ہے یا مصدر ﴿ يُوْحِيْٓ ﴾۔ اس بنا پر ﴿ اَللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ کا رفع اس بنیاد پر ہوگا کہ فعل محذوف کا فاعل ٹھہرے گا۔ کسی نے کہا: ''مَنْ يُوحِي؟'' یعنی کون وحی کرتا ہے؟ تو کہیں گے ﴿ اَللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ یعنی اللہ وحی کرتا ہے جو اپنے ملک میں اپنے قہر کے ساتھ غالب ہے۔ حکمت والا ہے اپنے کام میں اور اپنے قول و فعل میں سچا اور پختہ ہے۔ اس کی مثال کا بیان اللہ تعالیٰ کے اس قول میں گزر چکا ہے: ﴿ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴾ [النور: ٣٦] ''وہاں صبح و شام اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔''

---

[1] تفسیر الخازن (٦/١١٦) [2] تفسیر القرطبي (٣/١٦)

امام ابوحیوہ، اعمش اور ابان رحمہ اللہ نے ”نُوحِيْ“ بہ نون پڑھا ہے،① اس صورت میں ﴿ اَللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ محلِ نصب میں مفعول ہوگا۔ ”نُوحِيْ“ کے معنی یہ ہوں گے کہ وحی کرتے ہیں ہم تیری طرف اس لفظ کی کہ اللہ عزیز حکیم ہے، لیکن اس میں یہ خلل ہے کہ جملے کا بیان بغیر قولِ صریح کے لازم آتا ہے (زیادہ صحیح یہ ہے کہ یوں کہو کہ ﴿ اَللّٰهُ ﴾ مبتداء اور ﴿ اَلْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ اس کی دو خبریں۔ یا ﴿ اَللّٰهُ ﴾ مبتداء اور ﴿ اَلْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ اس کی صفتیں اور ﴿ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴾ اس کی خبریں ہیں،② كما قاله القاضي)۔ اب ﴿ يُوْحِيْٓ ﴾ کو اختلافِ قراءت کے ساتھ دیکھو کہ مضارع ہے، اس کے معنی حال کے ہیں یا مستقبل کے۔ اگر اس کو اپنے معنی پر رکھو گے تو ﴿ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ﴾ کو محذوف سے متعلق کرو گے۔ بایں تقدیر: ”وَأُوحِيَ إِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ“ اور اگر ماضی کے معنی میں ٹھہراؤ گے تو ماضی کو مضارع کی صورت میں لانا بہ لحاظِ تصویرِ حال ہوگا۔ یا یوں کہو کہ مضارع کا استعمال مستقبل میں تو حقیقت ہے اور ماضی میں مجاز۔ چنانچہ اس کا استعمال دونوں میں اس طرح ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں تو بہ نظر اس قرآن کے ہے جو اس وقت نازل نہیں ہوا اور ماضی میں بہ نظر اس قرآن کے جو بالفعل نازل ہو چکا اور بہ نظر ان کتابوں کے جو پہلے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہو چکیں۔ غرضیکہ اللہ پاک نے جو اپنی ذاتِ مقدس کو عزت اور حکمت کے ساتھ موصوف کیا تو اس سے اس شے کی شان کی بلندی بیان کرنا منظور ہے جس کی وحی کی گئی، کیوں کہ جب وحی کرنے والے کی صفت عزیز ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ کامل قدرت والا ہے اور جب اس کی صفت حکیم ہوئی تو سمجھا گیا کہ اس کا علم کامل ہے اور یہ کھلی بات ہے کہ جو اثر ایسی ذات کی طرف منسوب ہو جو کمالِ قدرت اور علم کے ساتھ متصف ہے تو وہ علوِ شان اور رفعتِ قدر کے انتہائی مرتبے میں ہوگا۔

پھر اپنی ذات پاک کا اور وصف ذکر فرمایا: ﴿ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ ﴾ یعنی اس کی کمالِ قدرت اور غلبے کا کیا ٹھکانا ہے، اس کی صفت تو یہ ہے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اسی کی ملکیت ہے اور ساری مخلوقات میں اسی کا تصرف ہے اور اس کی ذات اور شان اپنی خلق پر بہت بلند ہے اور اس کا مکان اور برہان عظیم اور کبیر ہے اور اس کی ہیبت اور جلال کا یہ حال ہے: ﴿ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ ﴾ یعنی قریب ہے آسمان اپنے اوپر سے پھٹ پڑیں۔ جمہور نے ﴿ تَكَادُ ﴾ کو بہ تائے فوقیہ اور ﴿ يَتَفَطَّرْنَ ﴾ کو بہ تائے فوقیہ یائے تحتیہ کے بعد ”طاء“ کی شد کے ساتھ پڑھا ہے اور امام نافع، کسائی اور ابن وثاب رحمہ اللہ نے ”يَكَادُ“ بہ یائے تحتیہ ”وَيَتَفَطَّرْنَ“ پڑھا ہے اور امام ابوعمرو، مفضل، ابوبکر اور ابوعبید رحمہ اللہ نے ”ينفطرن“ بہ نون بعد الیاء پڑھا ہے جو انفطار سے ماخوذ ہے،③ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِذَا السَّمَاۗءُ انْفَطَرَتْ ﴾ [الانفطار: ١] ”جب آسمان پھٹ جائے گا۔“ ”تفطُّر“ بہ معنی ”تشقق“ ہے، یعنی شق ہونا، پھٹنا۔

① فتح القدير (٦٨٩/٤) ② تفسير البيضاوي (١٢١/٥) ③ تفسير القرطبي (٤/١٦)

اب رہی یہ بات کہ شق کیوں ہو تو اس کی وجہ میں کئی قول ہیں: امام ضحاک اور سدی رحمہم اللہ تو کہتے ہیں کہ اللہ کی عظمت و جلال کے مارے پھٹ پڑیں۔[1] کسی نے یوں کہا کہ اللہ پاک کی علوِ شان اور عظمت کے مارے۔ اس معنی کی دلیل یہ بات ہے کہ اس کا ذکر ﴿وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ﴾ کے بعد آیا ہے تو معلوم ہوا کہ ان کا شق ہونا اللہ کی عظمت اور جلال کی وجہ سے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ فرشتوں کی کثرت کی وجہ سے جو آسمانوں پر ہیں۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ قریب ہے کہ ان میں ہر ایک اپنے سے متصل آسمان کے اوپر پھٹ پڑے مشرکوں کے یہ بات کہنے کے سبب سے کہ اللہ نے اپنی اولاد ٹھہرائی ہے۔ کسی نے کہا: ﴿مِنْ فَوْقِهِنَّ﴾ کے معنی ہیں: "مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِيْنَ"، یعنی زمینوں کے اوپر سے پھٹ پڑیں۔ پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ کلمۂ ﴿مِنْ﴾ ابتدائے غایت کے لیے ہے، یعنی پھٹنے کی ابتداء اوپر کی طرف سے ہو۔ امام اخفش صغیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿مِنْ فَوْقِهِنَّ﴾ کی ضمیر کفار کے اجتماعات کی طرف راجع ہے،[2] یعنی کفار کی جماعتوں کے اوپر سے پھٹ پڑے۔ یہ قول انتہائی بعید ہے۔ "فَوْق" کی جہت خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ "فَوْق" کی جہت آیاتِ عظیمہ اور مصنوعاتِ باہرہ کے زیادہ قریب ہے، یا مبالغے کے طور پر ہے۔ گویا کفار کی بات باوجود اس کے کہ نیچے کی طرف سے آئی ہے، اس نے "فَوْق" کی جہت میں اثر کیا تو اس کا اثر نیچے تو بطریقِ اولیٰ ہو گا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ﴾ کلامِ مستانف ہے، یعنی مشرکوں کی بے ادبیاں ایسی ہیں کہ آسمان پھٹ پڑیں، مگر فرشتے اپنے رب کی پاکی بیان کرتے ہیں اس شے سے جو اس کی بارگاہِ عالی جاہ کے لائق نہیں اور اس پر ایسی بات کہنا جائز نہیں، اس حال میں کہ اس کی حمد کرتے ہیں اور اس کی خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ "سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ" یا "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ" کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ تسبیح بجائے تعجب کے رکھی گئی ہے، یعنی مشرکین کے اللہ پاک پر جرأت کرنے سے تعجب کرتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنے رب کے امر سے نماز پڑھتے ہیں۔ (قاله السدي)

قولہ تعالیٰ: ﴿وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ﴾ یعنی ان لوگوں کے لیے شفاعت کرتے ہیں جو زمین میں ہیں، یعنی اللہ پاک کے مومن بندے، جیسا کہ اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ [المؤمن: ٧] "اور ایمان والوں کے لیے استغفار کرتے ہیں۔" مطلب یہ ہے کہ اس جگہ استغفار سے مراد مومنوں کے لیے شفاعت ہے۔ تو آیت ان کے ساتھ خاص ہوئی۔ یا یہ معنی ہیں کہ ہدایت طلب کرتے ہیں زمین والوں کے لیے۔ کسی نے کہا: فرشتوں کے استغفار کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اس شے میں سعی کرتے ہیں جو اُن کے لیے مغفرت کی درخواست ہوتی ہے اور ان کی سزا میں تاخیر کا سبب بنتی ہے، تا کہ کافروں میں ایمان لانے کا اور فاسق لوگوں کو توبہ

[1] تفسیر الطبري (٥٠١/٢١) [2] فتح القدير (٦٨٩/٤)

کرنے کا طمع پیدا ہو۔ اب یہ آیت عام ہو گی۔ چنانچہ ظاہر لفظ یہی ہے اور مومنین کے لیے خاص نہ ہو گی، اگر چہ وہ بھی اس میں یقینی طور پر داخل ہیں۔

قاضی بیضاوی اسی طرف گئے ہیں، بلکہ اگر استغفار کی تفسیر اس طرح کی جاتی کہ وہ کسی شے میں متوقع خلل کو دور کرنے کے لیے کوشش وسعی ہے تو یہ ہر جاندار کو عام ہو جاتی، بلکہ جمادات کو بھی،[1] مطلب یہ ہے کہ بطور عموم مجاز کے استغفار کے ایسے معنی لیے کہ کافرین اور مومنین کو شامل ہیں۔ وہ معنی یہ ہیں کہ اس شے میں سعی کرنا جو مستدعی (درخواست) ہوتی ہے ان کی مغفرت کی، وہ شے ایمان ہے۔ چنانچہ کافروں کے بارے میں ان کی استغفار یوں ہے کہ ان کے لیے ایمان طلب کرتے ہیں اور مومنین کے حق میں یوں ہے کہ ان کی سیئات سے درگزر کرانا چاہتے ہیں تو اب ان کی استغفار زمین کے عام لوگوں کے حق میں ہو گئی۔ یہ شیخ کے قول کا حاصل ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿لِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ﴾ سے مراد مومنین ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا بیان سورۃ غافر میں ہے۔ ﴿وَيَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ [المؤمن: ۷] اس بنا پر کہ ﴿لِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ﴾ سے مراد مومنین ٹھہرے تو ملائکہ سے مراد عرشِ معلی کے اٹھانے والے ہوں گے، کیوں کہ یہ خدمت انہی کی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ سارے فرشتے مراد ہیں۔ امام کلبی رحمہ اللہ کے قول سے یہی ظاہر ہے۔ امام وہب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "مَنْ فِي الْأَرْضِ" کے لیے فرشتوں کا مغفرت مانگنا ﴿وَيَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ سے منسوخ ہے۔ امام مہدوی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ منسوخ نہیں ہے، اس لیے کہ خبر ہے اور خبر میں نسخ نہیں ہوتا۔ نسخ احکام کا خاصہ ہے۔ یہ آیت مومنوں کے ساتھ خاص ہے۔

امام ابوالحسن بن حصار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عرشِ معلی کے حاملان مومنوں کے لیے استغفار کے لیے مخصوص ہیں۔ اور وہ اللہ پاک کے اور فرشتے ہیں جو زمین والوں کے لیے مغفرت مانگتے ہیں۔ امام ماوردی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس استغفار میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ گناہوں اور خطاؤں سے بخشش مانگتے ہیں۔ ظاہر قولِ امام مقاتل رحمہ اللہ یہی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان کے لیے رزق، روزی اور فراخی طلب کرتے ہیں۔[2] (قاله الكلبي) ظاہر تر قول یہی ہے، کیوں کہ ﴿لِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ﴾ عام ہے جس میں کافر وغیرہ شامل ہیں۔ اور امام مقاتل رحمہ اللہ کے قول کے مطابق کافر اس میں داخل نہ ہو گا۔ امام مطرف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وَجَدْنَا أَنْصَحَ عِبَادِ اللّٰهِ لِعِبَادِ اللّٰهِ الْمَلَائِكَةَ وَوَجَدْنَا أَغَشَّ عِبَادِ اللّٰهِ لِعِبَادِ اللّٰهِ الشَّيَاطِيْنَ"[3] یعنی ہم نے اللہ کے بندوں کے لیے اللہ کے بندوں میں سے سب سے زیادہ خیر خواہ اللہ کے فرشتوں کو پایا اور ہم نے اللہ کے بندوں کے لیے اللہ کے بندوں میں سے سب سے زیادہ دغا باز شیاطین کو پایا۔

بالجملہ جب اللہ پاک نے یہ ذکر کیا کہ فرشتے زمین والوں کے لیے بخشش مانگتے ہیں تو اس طرف اشارہ کیا کہ

---

[1] تفسير البيضاوي (١٢٢/٥) [2] تفسير القرطبي (٥/١٦) [3] تفسير القرطبي (٢٩٥/١٥)

وہ ان کی دعا کو قبول کرتا ہے اور وہی مغفرت فرماتا ہے۔ چنانچہ ارشاد کیا: ﴿ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ یعنی سنتے ہو! بے شک اللہ ہی کثیر المغفرۃ والرحمۃ ہے اپنے فرماں بردار بندوں اور دوستوں کے لیے، یا اپنے سارے بندوں کے لیے، کیوں کہ کافروں اور گناہ گاروں کی سزا میں تاخیر کرنا، اللہ پاک کی مغفرت اور رحمت ہی کی ایک قسم ہے۔ دوسری یہ ہے کہ ہر مخلوق اس کی رحمت سے بہرہ مند ہے۔

بالجملہ آسمان کے شق ہونے کی جو دو تفسیریں پہلی گزر چکی ہیں: ایک یہ ہے کہ اللہ پاک کی عظمت کے مارے پھٹ پڑیں۔ دوسری یہ کہ مشرکین کی اس بدگوئی کے سبب سے شق ہوں کہ اللہ پاک کی اولاد ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْهُ۔ چنانچہ اول کی بنا پر تو ﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ﴾ عظمتِ الٰہی کے لیے زیادت تقریر ہوگی، کیوں کہ اللہ سبحانہ کی مخلوقات دو قسم کی ہے: ایک تو عالمِ جسمانیات، ان میں سب سے بڑھ کر آسمان ہیں۔ دوسرا عالمِ روحانیات اور اس میں سب سے بڑھ کر فرشتے ہیں۔ چنانچہ پہلے یہ بیان کیا کہ جسمانیات پر اس کو کامل قدرت حاصل ہے تو فرمایا: لگتا ہے کہ آسمان اپنے اوپر سے اس کی عظمت کے مارے پھٹ پڑیں۔ پھر روحانیات کی طرف کلام کا رخ پھیرا تو فرمایا کہ ﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ﴾۔

پھر جواہرِ روحانی کے دو تعلق ہیں: ایک تعلق تو عالمِ کبریا و جلال کے ساتھ فیض حاصل کرنے اور اس کے قبول کرنے کا ہے اور دوسرا تعلق عالمِ اجسام کے ساتھ دینی فیض اور تاثیر کا ہے۔ تو ﴿ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ﴾ اس تعلق کی طرف اشارہ ہے جو ان کو بارگاہِ ذوالجلال و الاکرام کے ساتھ ہے اور ﴿ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ﴾ اس تعلق کی طرف اشارہ ہے جو اُن کو عالمِ اجسام سے ہے۔ ﴿ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ﴾ جو فرمایا ہے اور "يَحْمَدُوْنَ بِتَسْبِيْحِ رَبِّهِمْ" نہ کہا تو اس لیے کہ تسبیح جو ہے وہ اللہ پاک کی ان امور سے پاکی کرنا ہے جو اس کے لائق نہیں اور تحمید جو ہے وہ اس کا اس بات کے ساتھ وصف کرنا ہے کہ وہ ساری نعمتوں خوبیوں کو عطا کرنے والا ہے اور اس کا فی ذاتہ ایسے امور سے پاک ہونا جو اس کے لائق نہیں رتبے میں اس بات پر مقدم ہے کہ وہ خیرات اور سعادات کا عطا کرنے والا ہے۔ دوسری تفسیر کی بنیاد پر ﴿ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ اس امر کے بتانے کے لیے ہوگا کہ وہ اس بری بات سے پاک ہے جس کی نسبت اس کی طرف کی گئی اور اس بات پر وہ جلدی ان کو عذاب نہیں کرتا تو اس لیے کہ فرشتے مغفرت مانگتے ہیں اور اس لیے کہ اس کی مغفرت اور رحمت انتہا درجے کو پہنچی ہوئی ہے۔ (هذا خاصل الشيخ)

﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جنھوں نے اس کے ورے بت ٹھہرائے جن کو وہ پوجتے ہیں اور اُس کے لیے شرکاء اور انداد اور امثال ٹھہرائے تو

اللہ ان پر نگہبان ہے، یعنی ان کے اعمال کو محفوظ رکھتا ہے، اس طرح کہ ان میں سے کوئی شے غائب نہیں ہوتی، تا کہ ان اعمال کی ان کو جزا دے اور تو ان پر وکیل نہیں ہے۔ یعنی اس نے تجھ کو ان کا ذمے دار نہیں بنایا، تا کہ تجھ سے ان کا مؤاخذہ ہو اور نہ تجھ کو ان کی ہدایت سپرد کی ہے۔ تو تُو صرف احکامِ الٰہی پہنچا دینے والا ہے۔ کہا ہے کہ یہ آیت، آیتِ سیف سے منسوخ ہے۔[1]

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَرِيْقٌ فِى الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِى السَّعِيْرِ ۞ ٧ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِىْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۞ ٨ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِىُّ وَهُوَ يُحْىِ الْمَوْتٰى وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۞ ٩

اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف ایک عربی قرآن وحی کیا، تا کہ آپ اہلِ مکہ اور اس کے گرد وپیش والوں کو ڈرائیں اور آپ جمع ہونے کے دن سے ڈرائیں، جس میں کوئی شک نہیں۔ ایک گروہ جنت میں ہو گا اور دوسرا بھڑکنے والی آگ میں ⑦ اور اگر اللہ چاہتا تو یقیناً ان (سب) کو ایک ہی اُمت کر دیتا، لیکن وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کے لیے نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار ⑧ کیا انھوں نے اس کے سوا (دوسرے) کارساز بنا لیے ہیں؟ درحقیقت اللہ ہی کارساز ہے اور وہی مُردوں کو زندہ کرے گا اور وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ⑨

نزولِ قرآن کا مقصد، لوگوں کو خبر دار کرنا:

﴿ اُمَّ الْقُرٰى ﴾ یعنی بڑا گاؤں مکہ کو فرمایا کہ وہاں سارے عرب کا مجمع ہوتا ہے اور ساری دنیا میں اللہ کا گھر وہاں ہے۔ اس کے آس پاس پہلے عرب ہیں اور اس کے بعد ساری دنیا۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جیسے ہم نے تجھ سے پہلے نبیوں کو وحی کی ویسی ہی وحی ہم

[1] فتح البیان (۱۲/۲۷۳۔۲۷۶)

نے قرآنِ عربی کی، یعنی قرآنِ واضح، جلی اور بین کی تیری طرف کی، تا کہ تو ﴿ اُمَّ الْقُرٰى ﴾ کو ڈرائے، مراد مکہ مکرمہ ہے اور ان لوگوں کو جو آس پاس ہیں، یعنی اور باقی مشرق و مغرب کے شہر۔ مکہ کا نام ام القریٰ اس لیے رکھا ہے کہ یہ سارے شہروں سے اشرف ہے، اس کی بہت سی دلیلیں ہیں جو بجائے خود مذکور ہیں، ان میں سے نہایت مختصر اور پہلی دلیل یہ ہے جو امام احمد رحمہ اللہ نے ابوسلمہ بن عبد الرحمان سے روایت کی ہے کہ عبد اللہ بن عدی بن حمراء زہری رضی اللہ عنہ نے اس کو خبر دی کہ اس نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم موضع حزورہ میں کھڑے ہوئے تھے جو مکہ کے بازار میں ایک جگہ ہے: ''واللہ! بے شک تو اللہ کی بہترین زمین ہے طرف اللہ کے اور اللہ کی زمین میں سے اللہ کی طرف محبوب ترین ہے اور اگر میں تجھ سے نکالا نہ جاتا تو نہ نکلتا۔''[1] (هكذا رواية الترمذي والنسائي و ابن ماجه من حديث الزهري به وقال الترمذي: حسن صحيح)

﴿ يَوْمَ الْجَمْعِ ﴾ سے مراد روزِ قیامت ہے۔ اللہ تعالیٰ اگلے پچھلے لوگوں کو ایک زمین میں جمع کرے گا، اس کے واقع ہونے میں کسی طرح کا شک نہیں ہے اور وہ ضرور ہی ہونے والا ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ﴾، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ﴾ [التغابن: ۹] ''جس دن تم سب کو اس جمع ہونے کے دن جمع کرے گا وہی دن ہے ہار جیت کا۔'' یعنی اہلِ جنت اہلِ نار کو مغبون کریں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴾ [هود: ۱۰۳۔ ۱۰۵] ''یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشانِ عبرت ہے جو قیامت کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ وہ دن جس میں سب لوگ جمع کیے جائیں گے اور وہ، وہ دن ہے جس میں سب حاضر کیے جائیں گے۔ اسے ہم جو ملتوی کرتے ہیں وہ صرف ایک مدتِ متعین تک ہے جس دن وہ آ جائے گی مجال نہ ہو گی کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی بات بھی کرے، سو ان میں کوئی بدبخت ہو گا اور کوئی نیک بخت۔'' امام احمد رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا: ہم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں۔ فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ یہ دو کتابیں کیا ہیں؟ ہم نے عرض کی: نہیں، مگر یہ کہ آپ ہم کو خبر دیں یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ والی کتاب کے متعلق فرمایا: «هٰذَا كِتَابٌ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ بِأَسْمَاءِ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَأَسْمَاءِ آبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ ثُمَّ أُجْمِلَ عَلَى آخِرِهِمْ لَا يُزَادُ فِيهِمْ وَلَا يُنْقَصُ مِنْهُمْ أَبَدًا» یعنی یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے ہے، اس میں جنت والوں کے، ان کے باپوں کے اور ان کے قبیلوں کے نام ہیں۔ پھر ان کے آخر پر اجمال کیا گیا ہے، نہ کبھی ان میں زیادہ کیا جائے گا نہ ان سے کم کیا جائے گا۔

---

[1] مسند أحمد (۳۰۵/٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۹۲٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٤۷۹/۲) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳۱۰۸) صحيح الجامع، رقم الحديث (۷۰۸۹)

پھر آپ ﷺ نے اپنے بائیں ہاتھ والی کتاب کے متعلق فرمایا: «هَذَا كِتَابُ أَهْلِ النَّارِ بِأَسْمَائِهِمْ وَأَسْمَاءِ آبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ، ثُمَّ أُجْمِلَ عَلَى آخِرِهِمْ لَا يُزَادُ فِيهِمْ وَلَا يُنْقَصُ مِنْهُمْ أَبَدًا» یعنی یہ اہلِ نار کی کتاب ہے جس میں ان کے نام اور ان کے باپوں کے اور قبائل کے نام دیے گئے ہیں اور ان کے آخر پر اجمال کیا گیا ہے کہ نہ کبھی ان میں زیادہ کیا جائے گا اور نہ ان سے کم کیا جائے گا۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اگر یہ ایک ایسا امر ہے کہ جس سے فراغت ہو چکی ہے تو پھر ہم کس شے کے لیے عمل کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: «سَدِّدُوا وَقَارِبُوا» (یعنی اپنے اعمال میں سداد اور استقامت طلب کرو۔ سداد کام میں میانہ روی و عدل اختیار کرنا ہے، یا یہ معنی ہیں کہ افراط وتفریط کے درمیان صحیح راستہ طلب کرو اور اگر تم اس سے عاجز ہو جاؤ تو اس سے قریب ہو جاؤ۔ کسی نے کہا: «قَارِبُوا» کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی قربت کو طلب کرو۔ کسی نے کہا ہے کہ تم سارے اوقات کا استیعاب کر کے نہایت کو نہ پہنچ سکو گے، بلکہ اپنی نشاط کے اوقات کو غنیمت جانو، وہ دن کا شروع اور آخر کا حصہ ہے اور کچھ رات کا حصہ۔ اور اس کے درمیان اپنی جانوں پر رحم کرو تا کہ وہ تم کو منقطع نہ کر دے۔ "تَبْلُغُوا الْمَنْزِلَ" یعنی تم مقصد کو پہنچ جاؤ گے۔[1] كذا في مجمع البحار) چنانچہ جنت والے کا خاتمہ جنت کے عمل کے ساتھ کیا جاتا ہے، گو اس نے کوئی سا عمل کیا ہو اور بے شک نار والے شخص کا خاتمہ جہنم کے عمل کے ساتھ کیا جاتا ہے، اگرچہ اس نے کوئی سا عمل کیا ہو۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا، چنانچہ اس کو بند کر لیا۔ پھر فرمایا: تمھارا رب عزوجل بندوں سے فارغ ہو گیا، پھر آپ ﷺ نے دائیں ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس میں جو تھا اسے پھینک دیا اور فرمایا: ﴿فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ﴾ اور بائیں ہاتھ سے پھینک دیا اور فرمایا: ﴿وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ﴾.[2]

(وهكذا رواه الترمذي والنسائي جميعا عن قتيبة عن الليث بن سعد و بكر بن مضر كلاهما عن أبي قبيل عن شفي بن ماتع الأصبحي عن عبد الله بن عمرو رضی اللہ عنہما به وقال الترمذي: حسن صحيح غريب و ساقه البغوي في تفسيره بسنده بنحوه وعنده زيادات منها ثم قال: "﴿فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ﴾ عدل من الله عزوجل". و رواه ابن أبي حاتم بسنده ورواه ابن جرير بسنده عن شفي عن رجل من الصحابة رضی اللہ عنہم فذكره ثم رواه عن عبد الله بن عمرو رضی اللہ عنہما)

سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کو سلائی کے جھاڑنے کی طرح جھاڑا اور ان سے ان کی کل اولاد نکالی وہ "نغف" کی طرح نکلے ("نغف" وہ کیڑے ہیں جو اونٹوں اور بکریوں کے ناکوں میں ہوتے ہیں، یہ "نغفة" کی جمع ہے)۔ یعنی ان کی اولاد باریک باریک کیڑوں کی طرح نکلے، پھر ان کی دو مٹھیاں بھریں، پھر فرمایا: ﴿شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ﴾ [هود: ١٠٥] پھر دونوں کو ڈال دیا۔ پھر ان کی مٹھیاں بھریں،

---

① مجمع بحار الأنوار (٥١/٣)

② مسند أحمد (١٦٧/٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٤١) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٥٢/٦) تفسير البغوي (١٨٥/٧) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٧٦/١٠) تفسير الطبري (٥٠٤/٢١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٨٤٨)

پھر فرمایا: ﴿ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ﴾. ① (وهذا الموقوف أشبه بالصواب والله سبحانه وتعالىٰ أعلم)

امام احمد رحمہ اللہ نے ابونضرہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ اصحابِ نبی ﷺ میں سے ایک شخص جس کو ابوعبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے تھے، ان پر ان کے اصحاب داخل ہوئے، یعنی ان کی زیارت اور ملاقات کے لیے آئے تو ان کو روتا ہوا پایا، چنانچہ اس سے کہا: تجھے کس چیز سے رونا آ رہا ہے؟ کیا تجھے رسول اللہ ﷺ نے نہیں فرمایا: « خُذْ مِنْ شَارِبِكَ ثُمَّ أَقِرَّهُ حَتَّى تَلْقَانِي » کہا: کیوں نہیں؟ لیکن میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے داہنے ہاتھ میں ایک مٹھی بھری اور بائیں ہاتھ میں ایک مٹھی بھری اور فرمایا: "هَذِهِ لِهَذِهِ، وَهَذِهِ لِهَذِهِ" یعنی یہ تو جنت کے لیے ہے اور یہ نار کے لیے اور میں پروا نہیں کرتا۔ میں نہیں جانتا کہ میں کون سی مٹھی میں ہوں۔ ② صحاح اور سنن اور مسانید میں قدر کے متعلق بہت سی حدیثیں ہیں، ان میں سے سیدنا علی، عبداللہ بن مسعود اور عائشہ رضی اللہ عنہم اور ایک جماعتِ کثیر سے مروی حدیثیں ہیں۔

قولہ تبارک و تعالیٰ: ﴿ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ﴾ اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو ایک امت کر دیتا، ہدایت پر یا ضلالت پر، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان فرق کیا ہے۔ چنانچہ ہدایت کی حق کی طرف جس کو چاہتا ہے اور گمراہ کیا حق سے جس کو چاہتا ہے اور حکمت اور حجتِ بالغہ اسی کے لیے ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴾۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابن حجیرہ سے روایت کیا ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے رب! تیری مخلوق جن کو تو نے پیدا کیا اور اُن میں سے ایک فریق کو جنت میں ٹھہرایا اور ایک فریق کو آگ میں، تو نے ان سب کو جنت میں داخل کیوں نہ کیا؟ فرمایا: اے موسیٰ! تو اپنے کرتے کو اٹھا، تو انھوں نے اٹھایا اور عرض کی: میں نے اٹھا لیا۔ پھر فرمایا: اور اٹھا تو اٹھایا اور کچھ نہ چھوڑا۔ عرض کی: یا رب! میں نے مقرر اٹھا لیا۔ فرمایا: اٹھا، عرض کی: میں نے اٹھا لیا، سوائے اس کے جس میں خیر نہیں ہے، فرمایا: اسی طرح میں اپنی ساری مخلوق کو جنت میں داخل کرتا ہوں سوائے اس کے جس میں خیر نہیں ہے۔ ③

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ اللہ پاک مشرکوں پر اس بات میں انکار کرتا ہے کہ انھوں نے اللہ پاک کے سوا معبود ٹھہرائے ہیں اور خبر دیتا ہے کہ وہی ولیِ حق ہے کہ تنہا اسی کی عبادت ہونی چاہیے، اس لیے کہ مردوں کے زندہ کرنے پر قادر ہے اور وہ ہر شے پر قدیر ہے۔ ④

---

① تفسير الطبري (٥٠٤/٢١) ② مسند أحمد (١٧٦/٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥٠)

③ تفسير الطبري (٥٠٥،٥٠٤/٢١) ④ تفسير ابن كثير (١٣٤/٤-١٣٦)

فتح البیان کا بیان:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا ﴾ میں دو وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ "ذٰلِك" کا اشارہ ہے ﴿ اَوْحَيْنَآ ﴾ کے مصدر کی طرف اور حرفِ کاف مثل کے معنی میں محلِ نصب میں ہے اس بنا پر کہ مفعول مطلق محذوف کی صفت ہے اور ﴿ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا ﴾ موصوف وصفت مل کر ﴿ اَوْحَيْنَآ ﴾ کا مفعول بہ ہے۔ "أَيْ: وَأَوْحَيْنَا إِلَيْكَ إِيْحَاءً مِثْلَ ذَلِكَ الْإِيْحَاءِ الْمَذْكُوْرِ فِيْ قَوْلِهِ: يُوْحِيْ إِلَيْكَ الْبَدِيْعُ الْمُبِيْنُ الْمُفْهِمُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَا لَبْسَ فِيْهِ عَلَيْكَ وَلَا عَلَى قَوْمِكَ" یعنی وحی کی ہم نے تیری طرف ایسا وحی کرنا کہ وہ اس وحی کرنے کی طرح ہے جس کا ذکر ﴿ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ ﴾ میں ہے جو بدیع و نادر ظاہر نئی طرز کا مطلب خود سمجھانے والا ہے قرآن عربی کا، جس میں تجھ پر کسی طرح کا شک وشبہہ نہیں ہے، نہ تیری قوم پر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا جو تیری قوم کی زبان ہے، جس طرح کہ ہم نے ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا، تا کہ اس کی زبان خوب سمجھ میں آئے۔ بات چیت میں کسی طرح کا دھوکا نہ ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ "ذٰلِك" کا اشارہ پہلی آیت کے معنی کی طرف ہے۔ (یعنی ﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴾) وہ معنی یہی ہیں کہ اللہ ان پر نگہبان ہے اور صرف ڈرانے والا ہے، اس بنا پر حرفِ کاف مفعول بہ ہوگا اور ﴿ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا ﴾ اس سے حال۔ چونکہ نبی مکرم ﷺ مشرکوں کے ایمان لانے کی حرص رکھتے تھے اور وہ جو شرک و گمراہی پر جمے رہتے تھے اس پر آپ کو غم اور رنج ہوتا تھا، اس لیے اللہ پاک نے اس بات کا اس قول سے انکار کیا: ﴿ اَللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴾ یعنی تیرے قابو میں یہ بات نہیں ہے کہ تو ایسے اصرار کرنے والوں کو ہدایت دے، صرف اللہ پاک اس پر قادر ہے اور تیرا ذمہ صرف ڈرانا ہے اور کچھ نہیں۔

پھر فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا ﴾ یعنی اور اس آیت کی مثل ہم نے تیری طرف وحی کی اور اس مضمون کی مثل جو اس میں شامل ہے، یعنی تو جو ان کے ایمان پر نہایت حریص ہے، اس بات پر انکار کیا ہے اور اس قسم کا انکار قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے، حالاں کہ اس انکار پر جو شے دال ہے وہ عربی زبان کا قرآن ہے، اس کے معنی تجھ پر مخفی نہیں ہیں، کیوں کہ وہ تو تیری زبان ہے اور تو نے اس کو مبہم اور ملتبس کلام کی طرح ٹھہرایا ہے، جب تو ان کے ایمان لانے کی حرص کو نہیں چھوڑتا۔

﴿ لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾ یعنی عربی قرآن کی وحی تیری طرف اس لیے کی ہے کہ تو ام القریٰ کو ڈرائے۔ یہاں مضاف اور مفعول ثانی محذوف ہے۔ "أَيْ: لِتُنْذِرَ أَهْلَ أُمِّ الْقُرَى الْعَذَابَ" یعنی تا کہ تو ام القریٰ والوں کو ڈرائے اور ان لوگوں کو جو اس کے آس پاس ہیں، یعنی عرب اور ساری دنیا کے لوگ۔ ﴿ وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ ﴾ میں مفعول اول محذوف ہے "أَيْ: لِتُنْذِرَ النَّاسَ يَوْمَ الْجَمْعِ" یعنی تو لوگوں کو روزِ قیامت سے ڈرائے۔ اول سے

ثانی اور ثانی سے اول مفعول جو حذف ہوا ہے، چنانچہ وہ تہویل وابہام تعمیم کے لیے ہے۔

﴿ اُمَّ الْقُرٰى ﴾ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ عرب لوگ ہر شے کی اصل کا نام "أم" رکھتے ہیں۔ مکہ کو بستیوں کی اصل اس لیے ٹھہرایا کہ مقصود اس کی عزت اور تعظیم ہے، اس وجہ سے کہ اس میں اللہ پاک کا خانۂ معظم و مکرم ہے اور مقامِ ابراہیم۔ یا اس لیے کہ زمین اس کے نیچے سے پھیلائی گئی ہے۔ قیامت کو ﴿ يَوْمَ الْجَمْعِ ﴾ اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں تمام مخلوق جمع ہوگی۔ یا یہ مراد ہے کہ روحیں جسموں کے ساتھ ملائی جائیں گی۔ یا اس دن ظالم و مظلوم جمع ہوں گے۔ یا عمل کرنے والا اور اس کا عمل ایک جگہ ہوں گے۔

جملہ ﴿ لَا رَيْبَ فِيهِ ﴾ استیناف یا حال ہے ﴿ يَوْمَ الْجَمْعِ ﴾ سے، یا جملہ معترضہ ہے، تقریر ما قبل کے لیے لایا گیا ہے۔ یہ اس کے نزدیک ہے جو جملۂ معترضہ کو کلام کے آخر میں لانے کو جائز کہتا ہے۔ جمہور نے ﴿ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ﴾ کو دونوں جگہ بہ رفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مبتداء ہے اور جار و مجرور خبر ہے۔ ابتداء بہ نکرہ اس لیے جائز ہوئی ہے کہ یہ مقام تفصیل کا مقام ہے، یا یہ کہ فریق سے پہلے خبر مقدر ہے۔ "أَيْ: مِنْهُمْ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَمِنْهُمْ فَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ" یا یوں کہو کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ "أَيْ: هُمْ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ" یہ ضمیر مجموعوں کی طرف راجع ہوگی جو ﴿ يَوْمَ الْجَمْعِ ﴾ معلوم ہوتا ہے، یعنی روزِ جمع جو لوگ جمع کیے جائیں گے، وہ ایک گروہ تو جنت میں ہے اور ایک گروہ دوزخ میں۔

زید بن علی نے دونوں جگہ "فریقًا" بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ جملۂ محذوفہ سے حال ہے۔ "أَيْ: اِفْتَرَقُوْا حَالَ كَوْنِهِمْ فَرِيْقًا فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقًا فِي السَّعِيْرِ" یعنی وہ لوگ فرقے فرقے ہوں گے، درآنحالیکہ ایک فرقہ تو بہشت میں ہوگا اور ایک فرقہ نار میں۔ امام فراء اور کسائی رحمہ اللہ نے نصب کو جائز رکھا ہے، بایں تقدیر "لِتُنْذِرَ فَرِيْقًا"[1] پہلے دو حدیثیں قدر کے بارے میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت سے گزر چکی ہیں، ایک مرفوع اور ایک موقوف۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے موقوف کو اشبہ بہ صواب ٹھہرایا تھا، وہی دونوں فتح البیان اور فتح القدیر میں بھی ہیں۔ فی الجملہ الفاظ کا فرق ہے، آخر میں کہا ہے: "ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کا ایک طرف عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما پر موقوف روایت کیا ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ موقوف ہی زیادہ درست ہے۔"[2]

صاحبِ فتح القدیر و فتح البیان رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: "بلکہ مرفوع روایت زیادہ درست ہے، اس لیے کہ ثقہ رواۃ نے اسے مرفوع روایت کیا ہے۔ اس کا مرفوع ہونا ایک صحیح طریق سے ثابت شدہ زیادت ہے۔ نیز ابن مردویہ کی تخریج کردہ درج ذیل روایت بھی اس کے مرفوع ہونے کے موقف کو مضبوط کرتی ہے۔ براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر نمودار ہوئے، درآنحالیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نظر کر رہے تھے۔ لوگوں نے

---

[1] فتح القدیر (۲۹۰/٤)
[2] ان کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

کہا: دیکھو تو آپ ﷺ نہ پڑھنے والے اُمی ہونے کے باوجود کتاب میں نظر فرما رہے ہیں۔ براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ یہ رب العالمین کی طرف سے ایک کتاب ہے جس میں جنتیوں کے نام ان کے قبیلوں کے نام سمیت لکھے ہوئے ہیں جس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ ہوگی۔ پھر فرمایا: ایک گروہ جنت میں اور ایک جہنم میں جائے گا۔ تمھارا رب بندوں کے افعال سے (ان کو لکھ کر) فارغ ہو چکا ہے۔''[1]

بالجملہ جب اللہ پاک نے یہ بیان کیا کہ سب جمع ہونے والے دو فریق ہیں تو ذکر کیا گیا کہ یہ اس کی مشیت سے ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ﴾۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اگر اللہ چاہتا تو البتہ کر دیتا ان کو ایک دین والے یا ہدایت پر یا ضلالت پر،[2] لیکن مشیتِ ازلیہ سے وہ مختلف دینوں پر متفرق ہو گئے۔ یہی اِس قول کے معنی ہیں: ﴿ وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴾ لیکن جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے، یعنی دینِ حق میں، جس سے مراد اسلام ہے۔ سلمہ اللہ تعالیٰ۔ اور ظالمین اور مشرکین جو ہیں ان کے لیے کوئی ولی نہیں ہے جو ان سے عذاب کو دور کرے اور نہ کوئی مددگار کہ اس مقام میں ان کی مدد کرے۔ اسی جیسی یہ آیت ہے: ﴿ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا ﴾ [السجدة: ١٣]
''اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت نصیب فرما دیتے۔''

مطلب یہ ہے کہ ہدایت و گمراہی مشیتِ الٰہی سے ہے۔ اللہ پاک نے جس کسی کے بارے میں ہدایت کا اختیار کرنا جان لیا ہے تو اس کو ہدایت کرتا ہے، پھر اس کے سبب سے اپنی جنت اور رحمت میں داخل فرماتا ہے اور جس سے گمراہی کا اختیار کرنا معلوم کر لیا ہے اس کو گمراہ کرتا ہے، پھر اس کی وجہ سے اس کو سعیر والوں میں ٹھہراتا ہے، یہاں ظاہر مقابلہ اس کا مقتضی ہے کہ یوں کہا جاتا: ''وَيُدْخِلُ مَنْ يَّشَاءُ فِيْ غَضَبِهٖ وَنِقْمَتِهٖ'' لیکن ایسا نہ کہا، اس لیے کہ وعید میں مبالغہ کرنا منظور ہے، کیوں کہ ان کے متولی اور مددگار کی نفی کرنے میں اس بات پر دلیل ہے کہ ان کا عذاب میں ہونا ایک ایسا امر ہے جو معلوم ہے اور اس سے فراغت ہو چکی ہے۔ (كذا قاله الكرخي)

اور مبالغہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انذار، یعنی ڈرانے کا مقام ہے، ایسی جگہ وعید میں مبالغہ کرنا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ ''وَالْمُشْرِكُوْنَ'' کی جگہ ﴿ وَالظّٰلِمُوْنَ ﴾ فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔ ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [لقمان: ١٣] اور یہی ظلم اس بات کا سبب ہے کہ ان کے لیے ولی اور ناصر نہیں ہے۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس جگہ مختلف مذاہب کے لوگوں میں کافی بحثیں ہیں جو اپنے اسلاف کی حمایت میں مکھی پر مکھی مارتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں ان کے بیان کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ جیسا کہ ہماری اس تفسیر میں عادت ہے، اس لیے کہ یہ نظمِ قرآنی کے مدلولات کی ترجمان کرنے والی حق کا ساتھ دینے والی ایک سلفی تفسیر ہے اور تعصب سے عاری لوگ اس سے بہ خوبی آگاہ ہیں۔''[3]

---

(1) فتح القدير (٤/٦٩٣) فتح البيان (١٢/٢٧٠٧) (2) تفسير ابن أبي حاتم (٤/١١٥٢) (3) فتح القدير (٤/٦٩٠)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ﴾ کلمۂ ﴿ اَمِ ﴾ منقطعہ بہ معنی "بَلْ" ہے۔ ﴿ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ ﴾ شرط محذوف کا جواب ہے، مثلاً "إِنْ أَرَادُوْا وَلِيًّا بِحَقٍّ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ بِالْحَقِّ" اس بنا پر مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے پہلے کافروں کا یہ وصف کیا کہ وہ ظالم ہیں، ان کا کوئی ولی اور ناصر نہیں ہے۔ پھر اس وصف سے دوسرے وصف کی طرف التفات کیا وہ یہ کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا بتوں سے اولیاء ٹھہرائے ہیں، ان کو پوجتے ہیں۔ یہ وصف عام وصف کے بعد بطور تخصیص کے ہے، کیوں کہ ظلم عام ہے اور شرک خاص ہے جو ظلم کی ایک قسم ہے۔ اس سے یہ بات بتانا منظور ہے کہ یہ خاص وصف، باوجود اس کے کہ اپنے ظلم ہونے میں عام ہے، اس حد تک پہنچا ہوا ہے کہ اس کے سبب سے اس عام کے شمار میں سے معدود ہونے کی وجہ سے نکل گیا ہے، یعنی کافر لوگ ظالم ہیں اور یہی ظلم ان کے لیے کوئی ولی و ناصر نہ ہونے کا سبب ہوا ہے، پھر اس سے بطور ترقی کے ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف اضراب کیا، بلکہ انھوں نے تو ایک ایسا بڑا ظلم کیا ہے کہ اپنی عظمت کی بدولت گویا ظلم کی جنس سے نکل گیا۔ وہ یہی ان کا اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو اولیاء ٹھہرانا ہے۔ غرضیکہ شرک انتہا درجے کا ظلم ہے کہ اس سے بڑھ کر ظلم کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

یہاں سے شرک کی برائی کو سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے مبالغہ اور حسنِ ادا سے اس کی برائی بیان فرمائی ہے۔ اگر وہ ولی برحق کا ارادہ کریں تو ولی برحق اللہ ہی ہے، اس کے سوا کوئی ولی برحق نہیں ہے، وہی اس کے قابل ہے کہ اسے ولی ٹھہرائیں، کیوں کہ خالق و رازق، ضار و نافع وہی ہے اور اس کی شان میں سے یہ بات ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہی ہر مقدور پر قادر ہے۔ چنانچہ جو ذاتِ پاک ان اوصافِ جلیلہ کا حامل ہے، وہی اس کا مستحق ہے کہ اس کو اُلوہیت کے ساتھ خاص کریں اور تنہا اسی کو پوجیں نہ کہ مشرکوں کے یہ بت جن سے اپنی مکھیاں تک اڑائی نہیں جاتیں۔ امام محلی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حرفِ فاء صرف عطف کے لیے ہے،[1] یعنی مابعد کا عطف ماقبل پر اور سببیت سے خالی ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محلی کی غرض زمخشری رحمہ اللہ کا رد کرنا ہے کہ وہ شرط مقدر کا جواب ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس تقدیر کی کوئی حاجت نہیں ہے، اس لیے کہ اس کے بغیر کلام مکمل ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ "أم" ہمزۂ انکار کے معنی میں اور دھمکی کے طور پر ہے۔

پہلے اللہ پاک نے ان کا یہ وصف بیان کیا تھا کہ انھوں نے اس کے سوا اولیاء ٹھہرائے ہیں۔ پھر نبی اکرم ﷺ سے فرمایا کہ تو ان پر وکیل نہیں ہے اور ان کی ہدایت تیرے ذمے نہیں ہے اور اللہ چاہتا ہدایت کرتا۔ پھر جس شے کے ساتھ ان کا پہلے وصف کیا تھا، اسی کی یہاں ان پر انکار اور ملامت کر کے ان کی طرف سے خبر دی، یعنی پھر انھوں نے اس کے سوا اولیاء ٹھہرائے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جن کو انھوں نے اولیاء ٹھہرایا ہے وہ اس قابل نہیں ہیں، ولی تو اللہ ہی ہے، اس کا مستحق وہی ہے، کیوں کہ وہ مردے زندہ کرتا ہے اور ہر شے کر سکتا ہے، چنانچہ جو ایسا ہے وہی اس لائق ہے کہ ولی بنایا جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ "أم" "بَل" اور ہمزۂ انکار کے معنی میں ہے۔ "بَل" تو اس لیے ہے کہ

---

[1] تفسیر الجلالین (۱/۶۳۹) [2] البحر المحيط (۷/۴۸۷، ۴۸۸)

پہلے بیان سے بعد کے بیان کی طرف پھیریں۔ پہلے یہ بیان کیا تھا کہ ظالموں کا کوئی ولی اور ناصر نہیں ہے، یعنی ان کو اپنے عذاب میں بغیر ولی اور ناصر کے چھوڑ دے گا۔

پھر اس بیان سے دوسرے بیان کی طرف پھرا، وہ یہ ہے کہ کیا انھوں نے اس کے سوا اولیاء ٹھہرائے ہیں جن کو ولی ٹھہرایا ہے، وہ ولی نہیں ہیں۔ اس بنا پر یہ جملہ ماقبل کا مقرر و مؤکد ہے، کیوں کہ ماقبل میں ولی اور نصیر ہونے کی نفی تھی۔ اس جملے میں اس نفی کی، انکار اور ملامت کے طور پر، مزید تاکید کر دی۔ جب خوب پکے طور پر اس کا بیان ہو چکا کہ ظالموں کا کوئی ولی اور ناصر نہیں ہے تو فرمایا: ﴿فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ﴾ یعنی ولی برحق تو اللہ ہی ہے، اس کے سوا کوئی ولی نہیں۔ پھر جب اللہ پاک نے مشرکوں کو یوں ڈرایا کہ اللہ ان پر حفیظ ہے اور یہ کہ ظالموں کا کوئی ولی اور نصیر نہیں ہے۔ پھر یہ حکم لگایا کہ ولی برحق وہی ہے تو اس کے بعد وہ بات بیان فرمائی جو اس پر دال ہے کہ وہ مومنوں کا ولی ہے، ان کی مدد اور ثواب دینے کے لیے اور دین کے دشمنوں کو عذاب اور سزا کے ساتھ ذلیل کرنے والا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللّٰهِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴿١٠﴾ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿١١﴾ لَهُ مَقَالِيدُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١٢﴾

اور (دین کی) جس چیز میں بھی تم نے اختلاف کیا تو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے، یہی اللہ میرا رب ہے، اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں ⑩ (وہ) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، اس نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے جوڑے بنا دیے اور چوپایوں کے بھی (ان کی جنس سے) جوڑے بنائے، وہ تمھیں اس (زمین) میں پھیلاتا ہے، اس جیسی کوئی چیز نہیں، اور وہ خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے ⑪ اسی کے پاس آسمانوں اور زمین کی کنجیاں ہیں، وہ جس کے لیے چاہے رزق کشادہ کرتا ہے اور وہی (جس کے لیے چاہے) تنگ کر دیتا ہے، بلاشبہ وہ ہر شے کو خوب جاننے والا ہے ⑫

[1] فتح البیان (۱۲/۲۷۶۔۲۷۹)

اللہ تعالیٰ ہی کارساز، حاکم اور خالق ہے:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ساری اشیاء میں یہ اختلاف عام ہے، یعنی جس بات میں تم اختلاف کرو تو اس کا علم اللہ کے حوالے ہے، یعنی اس میں وہی حکم اور فیصلہ کرنے والا ہے اپنی کتاب کے ساتھ اور اپنے نبی اکرم ﷺ کی سنت کے ساتھ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ﴾ [النساء: ٥٩] ''پھر اگر کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔'' ﴿ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴾ یعنی ہر شے میں یہ فیصلہ کرنے والا اللہ ہے جو میرا رب ہے اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اسی کی طرف میں سارے امور میں رجوع ہوتا ہوں۔

﴿ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ﴾ یعنی وہی آسمانوں اور زمین کا اور اس شے کا جو ان کے درمیان میں ہے اس کا پیدا کرنے والا ہے، اس نے تم کو تمھاری جنس اور شکل سے جوڑے بنا دیا تم پر احسان رکھنے کے لیے اور اپنا فضل اور مہربانی کرنے کے لیے تمھاری جنس سے مرد و عورت بنا دیے اور چوپایوں کے بھی جوڑے بنا دیے، یعنی تمھارے لیے چوپایوں سے آٹھ جوڑے بنا دیے۔

﴿ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق میں سے تم کو اس صفت پر ہمیشہ پیدا کرتا رہتا ہے، اس میں نر اور مادہ ہیں، ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق اور ایک گروہ کے بعد دوسرا گروہ اور نسل بعد نسل کے آدمیوں اور چوپایوں میں سے۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ فِيْهِ ﴾ یعنی رحم میں۔ کسی نے کہا ہے کہ پیٹ میں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس طرز کی خلقت میں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "نَسْلًا بَعْدَ نَسْلٍ مِنَ النَّاسِ وَالْأَنْعَامِ"۔[1] کسی نے کہا ہے کہ حرفِ "في" بہ معنی باء ہے۔ "أي: يَذْرَؤُكُمْ بِهِ" یعنی تم کو اس پیدائش کے سبب سے پھیلاتا ہے۔

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ﴾ یعنی سارے جوڑوں کو پیدا کرنے والے کی طرح کوئی شے نہیں، کیوں کہ وہ تو اکیلا اور صمد ہے جس کی کوئی نظیر اور مثل نہیں ہے۔ ﴿ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ یعنی اور وہ خوب سنتا اور دیکھتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ کی تفسیر سورۃ الزمر میں گزر چکی ہے[2] حاصل اس کا یہ ہے کہ وہ آسمان و زمین میں حاکم اور متصرف ہے جس پر چاہتا ہے روزی فراخ کر دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ حکمت اور عدل اسی کے لائق ہے وہ ہر شے کو بہ خوبی جانتا ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ یہ اختلاف عام ہے۔ ہر امرِ دین میں جس کے بارے

[1] تفسير البغوي (١٨٦/٧) [2] رقم الآية (٦٣) [3] تفسير ابن كثير (١٣٦/٤)

میں بندوں نے اختلاف کیا ہے، اس کے بارے میں حکم اور فیصلہ و مرجع اللہ ہی کی طرف ہے۔ وہی اپنے حکم سے قیامت کے دن اس میں حکم دے گا اور اس میں جھگڑنے والوں کے جھگڑے کا فیصلہ کر دے گا اور اس وقت حق والا باطل والے سے ظاہر ہو جائے گا اور جنت کا فریق آگ کے فریق سے علاحدہ ہو جائے گا۔ امام کلبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿مِنْ شَيْءٍ﴾ سے امرِ دین مراد ہے، چنانچہ اس کا حکم اللہ کی طرف ہے، وہ اس میں فیصلہ کرے گا۔[1] قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے "أَوْ أَمْرِ الدُّنْيَا" اور بڑھایا ہے، یعنی دین کا امر ہو یا دنیا کا۔[2] کشاف میں دنیا کا لفظ زیادہ نہیں کیا ہے۔[3] امام محلی رحمہ اللہ نے اس کو یوں ذکر کیا ہے: "مِنَ الدِّيْنِ وَغَيْرِهِ"۔[4]

غیر سے مراد وہ ہیں جیسے دنیا میں خصومات ہوتی ہیں۔ پہلی بات زیادہ صحیح ہے، یعنی امرِ دین، کیوں کہ یہ کچھ لازمی نہیں کہ مومنوں اور کافروں کے درمیان دنیاوی امور میں جھگڑے ہوں اور ایسے جھگڑے میں تحاکم الی اللہ نہیں بولتے۔[5] (كما أفاده الشهاب) شیخ زادے کا بیان یہ ہے کہ یہ آیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مومنین کے ساتھ قول کی حکایت ہے۔ گویا آپ نے امرِ دین وغیرہ میں فیصلے کو اللہ پاک کے سپرد کیا۔ چنانچہ اللہ پاک نے اس قول کو قرآنِ مجید میں نقل فرما دیا۔ اس بات پر آیندہ قول دال ہے، یعنی ﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ﴾ انتھی۔

امام مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بعض اہلِ مکہ نے تو قرآن شریف کا انکار کیا اور بعض اس پر ایمان لائے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[6] عمومیتِ لفظ کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ اور ممکن ہے یوں کہیں کہ کلمۂ ﴿اِلَى اللّٰهِ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اس کا حکم کتاب اللہ کی طرف پھیرا جاتا ہے، کیوں کہ قرآن شریف اللہ کے بندوں کے درمیان حکم اور فیصلے پر مشتمل ہے، اس امر میں جس میں اختلاف کرتے ہیں۔ چنانچہ آیت امرِ دین سے متعلق ہر اختلاف کو عام ہو گی کہ اس کو کتاب اللہ کی طرف پھیرا گیا ہے۔ اسی کے مثل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ [النساء: ٥٩] اور اللہ پاک یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ دین جو ہے تو وہ اسلام ہی ہے اور قرآن شریف حق ہے اور مومن جنت میں ہیں، کافر آگ میں ہیں، لیکن چونکہ کفار اس کے حق ہونے کی تصدیق نہیں کرتے تھے، مگر دارِ آخرت میں کر لیں گے، اس لیے اللہ پاک نے ان کو اس لیے قیامت کے دن کا وعدہ دیا۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ جس بات میں اختلاف ہو اس کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کراؤ، کیوں کہ ان کا حکم اللہ کا حکم ہے اور ان کے حکم اور فیصلے پر غیر کے حکم اور فیصلے کو اختیار نہ کرو۔

﴿ذٰلِكُمُ﴾ مبتداء ہے ﴿اَللّٰهُ﴾ خبرِ اول ہے ﴿رَبِّيْ﴾ خبرِ ثانی ﴿عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ﴾ تیسری خبر اور ﴿وَاِلَيْهِ

---

[1] فتح القدير (٦٩٠/٤) [2] تفسير البيضاوي (١٢٣/٥) [3] الكشاف (٢١٦/٤)
[4] تفسير الجلالين (٦٣٩/١) [5] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٤١١/٧) [6] فتح القدير (٦٩٠/٤)

﴿ اُنِیْبُ ﴾ چوتھی خبر ہے، یعنی یہ حاکم عظیم الشان اس حکم کے ساتھ اللہ ہی میرا رب ہے، اس پر میں نے اپنے سارے کاموں میں بھروسا کیا ہے نہ کہ اس کے غیر پر اور اپنے سارے امور اسی کے سپرد کر دیے اور میں اسی کی طرف ہر شے میں جو مجھے پیش آتی ہے رجوع ہوتا ہوں نہ کہ اس کے غیر کی طرف۔ جمہور نے ﴿ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ پانچویں خبر ہے۔ یا خود مبتداء ہے اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے۔ یا ﴿ رَبِّیْ ﴾ کی صفت ہے، اس لیے کہ اضافتِ محضہ ہے، اس بنیاد پر جملہ ﴿ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَیْهِ اُنِیْبُ ﴾ صفت اور موصوف کے درمیان معترضہ ہوگا۔ زید بن علی نے ﴿ فَاطِرُ ﴾ کو بہ جر پڑھا ہے، اس بنا پر کہ اسم شریف کی صفت ہے جو ﴿ اِلَى اللّٰهِ ﴾ میں ہے اور ان کے مابین معترضہ ہے، یا اس بنا پر کہ ﴿ عَلَیْهِ ﴾ یا ﴿ اِلَیْهِ ﴾ کی ضمیر سے بدل ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے ندا کی بنا پر نصب جائز رکھا ہے اور غیر کسائی نے بنا بر مدح،[1] یعنی "أَمْدَحُ أَوْ أَعْنِيْ"۔ ﴿ فَاطِرُ ﴾ بہ معنی خالق مبدع (موجد) ہے۔ اس کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔

﴿ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا ﴾ چھٹی خبر ہے، یعنی تمھارے لیے تمھاری جنس سے عورتیں پیدا کیں، یا مراد بی بی حوا علیہا السلام ہیں، اس لیے کہ آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہوئی ہیں۔ ﴿ وَمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ﴾ اور چوپایوں کے لیے انھیں کی جنس سے مادہ پیدا کی۔ یا یہ معنی ہیں کہ تمھارے لیے چوپایوں کی قسم سے نر اور مادہ پیدا کیے۔ یہ وہی آٹھ اصناف ہیں جن کا ذکر سورۃ الانعام میں کیا ہے۔ ﴿ یَذْرَؤُكُمْ ﴾، "ذرء" سے ماخوذ ہے۔ "ذرء" بہ معنی "بَثٌّ" ہے، یعنی پھیلانا، یا بہ معنی "خَلَقَ وَأَنْشَأَ" ہے۔ "کم" کا خطاب آدمیوں کے مخاطب لوگوں کو ہے اور انعام کو، مگر اس میں عقلاء کو غیر عقلاء پر تغلیب دی گئی ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مسئلہ احکام ذات العلتین سے ہے۔[2]

شیخ کہتے ہیں کہ یہ ایک اصطلاحِ غریب ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب خطاب اور غائب کے دونوں صیغے جمع ہوں تو خطاب کو تغلیب دی جائے۔ ﴿ فِیْهِ ﴾ کی ضمیر ﴿ جَعَلَ ﴾ کی طرف راجع ہے جو ﴿ جَعَلَ ﴾ سے معلوم ہوتا ہے، یا مخلوق کی طرف راجع ہے، یا تدبیر کی طرف جن کا ذکر ہوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمیوں اور چوپایوں کے لیے جوڑے بنائے، تاکہ ان کے نر مادہ میں توالد اور تناسل ہو۔ کلمۂ "فِي" یا تو اپنے ظرفی معنی پر ہے، یعنی اس تدبیر سے تمھاری کثرت کرتا ہے، یعنی آبادی بڑھاتا ہے، یعنی یہ تدبیر آبادی کے پھیلنے اور کثرت کے لیے منبع اور معدن کی طرح ٹھہرائی گئی ہے، یا بائے سببیہ کے معنی میں ہے، یعنی تم کو اس تدبیر کے سبب سے بڑھاتا ہے۔ امام فراء، زجاج اور ابن کیسان رحمہم اللہ نے کہا: "یُکْثِرُکُمْ بِهٖ"، یعنی تمھیں جوڑے بنا کر تمھاری کثرت کرتا ہے، کیوں کہ یہ نسل کا سبب ہے۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "فِیْهِ أَيْ: فِي الزَّوْجِ"۔[3]

---

[1] فتح القدير (٦٩١/٤) [2] الكشاف (٢١٧/٤) [3] فتح القدير (٦٩١/٤)

قولہ: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ ساتویں خبر ہے۔ یہاں مثل کے ذکر سے نفی میں مبالغہ کرنا مراد ہے کنایہ کے طور پر، جس طرح کہ عرب کا یہ قول ہے: "مِثْلُكَ لَا يَبْخَلُ وَغَيْرُكَ لَا يَجُوْدُ" قائل کے مخاطب کا بخل نہ کرنا اور اس کی سخاوت کو نہایت مبالغہ اور خوبی سے ثابت کرنا ہے تو اس کو یوں ادا کیا کہ تیرا مثل بخل نہیں کرتا اور تیرا غیر سخاوت نہیں کرتا۔ اب دیکھو کہ مخاطب سے کس قدر مبالغے کے ساتھ بخل کی نفی ہوئی، جبکہ بخل کی نفی اس شخص سے کی گئی جو مخاطب سے مناسبت اور مثلیت رکھتا ہے تو اس سے تو بطریقِ اولیٰ اس کی نفی ہوئی۔ اور جب مخاطب کے غیر سے جود (سخاوت) کی نفی ہوئی تو کس مبالغے سے اس کے لیے جود کا ثبوت ہوا۔ یہ محاورہ اردو زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے، مثلاً یوں کہتے ہیں کہ تمھارے جیسے آدمی سے یہ کام بعید ہے۔ غرض یہ کہ جو کوئی تمھاری مثل ہے، اس سے یہ کام بعید ہے تو خود تم سے تو نہایت بعید ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حرفِ کاف زائد ہے، تاکید کے لیے ہے، اس لیے کہ اللہ پاک کا کوئی مثل نہیں ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اس کی مثل کوئی شے نہیں ہے۔ یہ وجہ مُعربین کے نزدیک مشہور ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کلمۂ "مثل" زائد ہے۔ ثعلب وغیرہ اسی کے قائل ہیں جس طرح کہ اس آیت میں لفظ مثل زائد آیا ہے ﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ [البقرۃ: ۱۳۷] "اگر وہ تم، جیسا ایمان لائیں تو ہدایت پائیں۔" "أَيْ: بِمَا آمَنْتُمْ بِهِ" اسی بارے میں اوس بن حجر کا یہ قول ہے:

وَقَتْلَى كَمِثْلِ جُذُوْعِ النَّخِيْلِ   يَغْشَاهُمْ مَطَرٌ مُنْهَمِرٌ [1]

یعنی بہت سے مقتول کھجور کے تنوں کی طرح ہیں کہ ان کو بارانِ ریزندہ نے ڈھانک لیا۔ "أَيْ: كَجُذُوْعِ النَّخِيْلِ" یہ قول جید نہیں ہے، بلکہ پہلا قول زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ کنایہ عرب کا ایک باب مسلوک ہے اور ان کے لیے یہ ایک جانی پہچانی شاہراہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عرب لوگ کنایہ کا بہت استعمال کرتے ہیں۔ اس بارے میں ثعالبی کی تصنیف "كتاب الكناية" ایک بے مثل و بے مثال کتاب ہے۔ قرآنِ مجید و حدیث شریف اور اعلیٰ قسم کے عرب لوگوں کے اشعار میں سے اس میں کنایہ کی مثالیں بیان کی ہیں۔ زیادتِ مثل کے بارے میں کسی شاعر کا یہ شعر ہے:

لَيْسَ كِمِثْلِ الْفَتَى زُهَيْرٍ   خَلْقٌ يُوَازِيْهِ فِي الْفَضَائِلِ

یعنی نہیں ہے مثل جوان کے کہ وہ زہیر ہے کوئی خلق کہ فضائل میں اس کے ہم پلہ ہو۔

کسی اور نے کہا:

عَلَى مِثْلِ لَيْلَى يَقْتُلُ الْمَرْءُ نَفْسَهُ   وَإِنْ يَّأْتِ مِنْ لَيْلَى اَعَلَى الْيَأْسِ طَاوِيًا

یعنی لیلیٰ پر آدمی اپنی جان قتل کرتا ہے اگرچہ وہ آئے لیلیٰ کی طرف سے ناامیدی پر گرسنہ ہو کر۔

---

[1] تفسیر القرطبي (۸/۱٦)

کسی اور نے کہا ہے:

سَعْدُ بْنُ زَيْدٍ إِذَا أَبْصَرْتَ فَضْلَهُمْ فَمَا كَمِثْلِهِمْ فِي النَّاسِ مِنْ أَحَدٍ

یعنی تو جب قبیلہ سعد بن زید کے فضل و بزرگی کو دیکھے تو ان کی مثل لوگوں میں کوئی نہیں ہے۔

امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب لوگ مثل کو نفس اور ذات کے مقام میں قائم کرتے ہیں تو یوں بولتے ہیں: "مِثْلِي لَا يُقَالُ لَهُ هَذَا أَيْ: أَنَا لَا يُقَالُ لِي هَذَا"[1] یعنی مجھ جیسے آدمی سے یہ بات نہیں کہی جاتی۔ مطلب یہ ہے کہ میرے لیے نہیں کہی جاتی۔ کسی نے کہا ہے کہ مثل سے مراد صفت ہے۔ یہ یوں ہے کہ "مِثْل" بہ معنی "مَثَل" ہے اور "مَثَل" بہ معنی صفت ہے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ [الرعد: ٣٥] "اس جنت کی صفت، جس کا وعدہ پرہیز گاروں کو دیا گیا ہے۔" "أَيْ: صِفَةُ الْجَنَّةِ" چنانچہ معنی یہ ہیں کہ نہیں ہے اللہ کی صفت کے مثل کوئی شے ان صفات سے جو اس کے غیر کے لیے ہیں۔ یہ قول ایک محمل سہل ہے۔

امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کاف کی زیادتی کو ترجیح دے کر کہا ہے کہ اگر وہ زائد نہ ہو تو محال کی طرف مفضی ہو گا، کیوں کہ معنی یہ ہوں گے کہ اس کے واسطے مثل ہے اور اس کی مثل کے واسطے مثل نہیں ہے، حالانکہ اس میں تناقض ہے، کیوں کہ جب اس کے لیے مثل ہوا تو اس کی مثل کے واسطے بھی مثل ہوا اور وہ وہی ہے با آنکہ اللہ پاک کے لیے مثل کا اثبات محال ہے،[2] یہ تقریر خوب ہے۔ لیکن امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے جو اعتراض وارد کیا ہے، وہ اس بات سے دور ہو جاتا ہے جو ہم ذکر کر آئے ہیں کہ کلام خارج ہوا ہے مخرجِ کنایہ میں۔ امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو الفاظ مشابہت کے لیے وضع کیے گئے ہیں، ان سب سے زیادہ عام لفظ مثل ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ لفظ "نِدّ" تو اس شے کے لیے کہا جاتا ہے جو صرف جوہر میں شریک ہے اور شبہ اس شے میں بولتے ہیں جو صرف کیفیت میں شریک ہے اور مساوی اس شے میں کہتے جو صرف کمیت (مقدار) میں شریک ہے اور شکل اس شے میں بولتے ہیں جو فقط قدر و مساحت میں اس کا شریک ہے اور مثل ان سب میں بولا جاتا ہے۔ اسی لیے جب اللہ پاک نے ہر وجہ سے مشابہت کی نفی کا ارادہ کیا تو خاص کر کے مثل کا کلمہ ذکر کیا۔[3]

فرمایا: ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ﴾. جو کوئی اس آیتِ کریمہ کو سمجھے گا، جیسا کہ اس کے سمجھنے کا حق ہے اور اس کو سوچے گا، جیسا کہ سوچنے کا حق ہے تو جو لوگ صفات میں اختلاف کرتے ہیں، ان کے اختلاف کے وقت اس کی وجہ سے ایک نہایت روشن اور واضح راہ پر چلے گا اور اس کی بصیرت اور بھی بڑھ جائے گی، جبکہ ﴿ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ کے معنی میں غور و تامل کرے گا، اس لیے کہ یہ اثبات مثال کی اس نفی کے بعد بردِ یقین و شفائے صدور و انثلاجِ قلوب پر مشتمل ہے، یعنی جب پہلے یوں کہا کہ اس کی مثل کوئی شے نہیں۔

[1] فتح القدير (٦٩٢/٤) [2] التبيان في إعراب القرآن (١١٣١/٢) [3] روح المعاني (١٨/٢٥)

پھر یہ فرمایا کہ وہ سمیع بصیر ہے تو صفات کے بارے میں جو شبہہ اور شک سینے اور دل کو بے چین کرتے تھے، اس اثبات نے اس کو دور کر دیا اور یقین حاصل ہو گیا، سینوں کا روگ دور ہو گیا، شفا ہو گئی اور دل ٹھنڈے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی جو صفاتِ جلیلہ قرآن شریف میں یا صحیح حدیثوں میں وارد ہوئی ہیں، وہ سب برحق ہیں، ان کی کیفیت اللہ پاک کو معلوم ہے۔ سلف کا طریقہ یہی ہے کہ ان کو بلا تکییف وتشبیہ وتمثیل وتعطیل وتاویل مانیں اور ان کی کیفیت کو صاحبِ صفات کے حوالے کریں۔ اب اے طالبِ حق! تم اس روشن حجت اور برہانِ قوی کی قدر کرو، کیوں کہ اس سے تم بہت سی بدعتوں کو توڑ پھوڑ ڈالو گے اور ضلالت اور گمراہی کے سروں کو توڑ دو گے اور قاصرین متکلمین متکلفین متاولین کے گروہوں کے ناک کو اس سے خاک آلود کر دو گے، خصوصاً جبکہ تم نے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس قول کو ملا دیا: ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِهٖ عِلْمًا﴾ [طٰہٰ: ۱۱۰] ''مخلوق کا علم اس پر حاوی نہیں ہو سکتا۔'' اب تو اس علم کی رسی کے دونوں سرے پکڑ لیے جس کا نام علمِ کلام وعلمِ اصول الدین رکھتے ہیں۔

وَدَعْ عَنْكَ نَهْبًا صِيحَ فِي حُجُرَاتِهِ وَهَاتِ حَدِيثًا مَا حَدِيثُ الرَّوَاحِلِ

غرضیکہ ﴿وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ آٹھویں خبر ہے اور ﴿لَهٗ مَقَالِيدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ نویں خبر۔ ﴿مَقَالِيدُ﴾ جمع ہے ''مِقْلَادٌ'' کی یا ''مِقْلِيدٌ'' کی یا ''أَقْلِيدٌ'' کی۔ یہ جمع قیاس کے خلاف ہے۔ ''أَقْلِيدٌ'' بہ معنی مفتاح ہے، یعنی اسی کے لیے ہیں آسمانوں اور زمین کی کنجیاں یا ان کے خزانے، مراد بارش اور نباتات وغیرہ ہے، جیسے: وہ جواہر جو زمین سے نکالے جاتے ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو شخص کنجیوں کا مالک ہوتا ہے، وہی خزانوں کا بھی مالک ہوتا ہے۔[1] اس کی تحقیق سورۃ الزمر میں گزر چکی ہے۔[2] پھر جب اللہ پاک نے یہ ذکر کیا کہ آسمان وزمین کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں ہیں تو اس کے بعد بَسط اور قبض کا ذکر فرمایا: ﴿يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ﴾ یہ دسویں خبر ہے، یعنی جس کے لیے چاہتا ہے روزی فراخ کرتا ہے، جیسے: روم وفارس اور جس کے لیے چاہتا ہے روزی تنگ کرتا ہے، جیسے: عرب۔ ﴿اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ یعنی وہ بے شک اشیاء میں سے ہر شے کو خوب جانتا ہے۔ چنانچہ اس پر کوئی مخفی شے بھی پوشیدہ نہیں ہے، اس کے علم نے ہر شے کو گھیر رکھا ہے، چنانچہ اس کے نیچے یہ بھی مندرج ہے کہ مطیع کی اطاعت کو اور عاصی کی معصیت کو جانتا ہے تو ہر ایک کو اس خیر وشر کے ساتھ جزا دے گا جس کا وہ مستحق ہو گا۔[3] جبکہ اللہ پاک نے ﴿كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ میں یہ ذکر کیا کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کی طرف وحی کی تو اس سورت میں جو معانی بیان تھے ان کی تفصیل شروع کی، چنانچہ ارشاد فرمایا:

---

[1] تفسير القرطبي (٩/١٦) [2] رقم الآية (٦٣) [3] فتح البيان (١٢/٢٧٩_٢٨٢)

شَرَعَ لَكُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوۡحًا وَّالَّذِيۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ
اِلَيۡكَ وَمَا وَصَّيۡنَا بِهٖۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمُوۡسٰى وَعِيۡسٰۤى اَنۡ اَقِيۡمُوا
الدِّيۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِيۡهِ‌ؕ كَبُرَ عَلَى الۡمُشۡرِكِيۡنَ مَا
تَدۡعُوۡهُمۡ اِلَيۡهِ‌ؕ اَللّٰهُ يَجۡتَبِىۡۤ اِلَيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَهۡدِىۡۤ اِلَيۡهِ
مَنۡ يُّنِيۡبُ ﴿۱۳﴾ وَمَا تَفَرَّقُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡعِلۡمُ
بَغۡيًاۢ بَيۡنَهُمۡ‌ؕ وَلَوۡلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى
لَّقُضِىَ بَيۡنَهُمۡ‌ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اُوۡرِثُوا الۡكِتٰبَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ لَفِىۡ
شَكٍّ مِّنۡهُ مُرِيۡبٍ ﴿۱۴﴾

اس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے، جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جو ہم نے (اے نبی!) آپ کی طرف وحی کیا ہے اور جس کا (تاکیدی) حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا کہ تم اس دین کو قائم رکھو اور تم اس میں فرقہ فرقہ نہ ہو جاؤ۔ یہی بات تو مشرکین پر گراں گزرتی ہے جس کی طرف آپ انھیں بلاتے ہیں، اللہ جسے چاہے اپنے لیے چن لیتا ہے اور ہدایت اسے دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے ⑬ اور وہ لوگ اپنے پاس علم آ جانے کے بعد صرف باہمی بغاوت و سرکشی کے باعث فرقہ بندی کا شکار ہوئے اور اگر آپ کے رب کی طرف سے ایک بات مقرر وقت تک پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان (فرقہ بازوں) کے درمیان ضرور فیصلہ کر دیا جاتا اور بلاشبہ جو لوگ ان کے بعد اس کتاب کے وارث بنائے گئے، وہ اس کے متعلق گنجلک میں ڈالنے والے شک میں ہیں ⑭

تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا دین ایک ہی ہے:

اصل دین ہمیشہ سے ایک ہی ہے، اس کے قائم کرنے کے طریق ہر وقت میں اللہ نے الگ الگ ٹھہرا دیے ہیں۔ پہلے لوگ تو ضد سے اپنی بات ثابت کرنے کے لیے کتاب کے معنی بدل گئے اور بعد والے مختلف باتیں دیکھتے ہیں تو حیران ہوتے ہیں کہ معنی اس طرح ہیں یا اس طرح۔ یہ اختلاف برا ہے اگر معنوں میں اختلاف نکلتا ہو اور اگر کئی طرح معنی کیے جائیں جن میں اختلاف نہیں نکلتا تو اس کی ممانعت نہیں۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ اس امت سے فرماتا ہے کہ تمھارے لیے دین میں سے وہ دین

مشروع کیا جس کی وصیت نوح علیہ السلام کو کی اور وہ دین جس کی وحی ہم نے تیری طرف کی۔ چنانچہ آدم علیہ السلام کے بعد پہلے رسول کا ذکر کیا، وہ نوح علیہ السلام ہیں اور آخری رسول کا وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، پھر ان کے درمیان کے اولوا العزم رسولوں کا ذکر کیا: وہ ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم علیہم السلام ہیں۔ اس آیت میں پانچ رسولوں کے ذکر کو نظم کیا جس طرح کہ احزاب کی یہ آیتِ کریمہ ان پر مشتمل ہے: ﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴾ [الأحزاب: ۷] ''جب کہ ہم نے تمام نبیوں سے عہد کیا اور (بالخصوص) آپ سے اور نوح سے اور ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ سے۔'' اور وہ دین جس کو سارے رسول لائے، وہ یہی اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت ہے، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [الأنبياء: ۲۵] ''تجھ سے پہلے جو بھی رسول ہم نے بھیجا اس کی طرف یہی وحی نازل فرمائی کہ میرے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں پس تم سب میری ہی عبادت کرو۔''

حدیث شریف میں ہے کہ ہم خاص گروہِ انبیاء علیہم السلام اولادِ علات ہیں، ہمارا دین ایک ہے،[1] یعنی انبیاء علیہم السلام کی باہم قدرِ مشترک یہی اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت ہے، گو ان کی شریعتیں اور طریقے مختلف ہوئے ہیں، جیسا کہ اللہ جل جلالہ نے فرمایا: ﴿ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ﴾ [المائدة: ٤٨] ''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک دستور اور راہ مقرر کر دی ہے۔'' اسی لیے یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ﴾ یعنی اللہ پاک نے سارے انبیاء علیہم السلام کو باہم اُلفت رکھنے اور اکٹھے رہنے کی وصیت فرمائی اور ان کو افتراق و اختلاف سے منع کیا۔

﴿ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد! جس توحید کی طرف تو ان کو بلاتا ہے اس کو انھوں نے اوپرا (اجنبی) سمجھا ہے اور وہ ان پر گراں گزری ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہدایت کو اس کے لیے مقدر کرتا ہے جو اس کا مستحق ہے اور لکھ دیتا ہے گمراہی اس پر جس نے راہِ ہدایت کے بجائے اس کو اختیار کیا ہے۔ اس لیے یوں فرمایا: ﴿ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ﴾ یعنی انھوں نے جو حق کی مخالفت کی تو اس کے بعد کی کہ وہ ان کے پاس پہنچ گیا اور ان پر حجت قائم ہو چکی اور ان کے لیے اس کا باعث سوائے ضد و دشمنی اور مخالفت اور کوئی شے نہیں ہوئی۔ چنانچہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ﴾ یعنی اگر اللہ کا کلمہ نہ ہوتا جو پہلے سے طے ہو چکا ہے کہ بندوں کو حساب قائم کرنے کے دن تک مہلت دے گا تو ان پر جلدی سے دنیا ہی میں عذاب لا ڈالتا۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٦٥)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴾ یعنی قرنِ اول کے بعد والا گروہ جس نے حق کی تکذیب کی ہے، وہ اس سے شکِ مریب میں ہیں، یعنی وہ اپنے دین اور ایمان پر پختہ نہیں ہیں، وہ بغیر دلیل اور برہان کے اپنے آباء و اجداد اور اسلاف کے مقلد ہیں اور بغیر سوچے سمجھے ان کی پیروی کرتے ہیں اور اپنے کام کے بارے میں وہ حیرت میں ہیں اور شکِ مریب اور شقاقِ بعید (پرلے درجے کی مخالفت اور دشمنی) میں ہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ شَرَعَ لَكُمْ ﴾ گیارھویں خبر ہے اور ﴿ شَرَعَ ﴾ بہ معنی بین، واضح، سن اور اظہر ہے اور ﴿ لَكُمْ ﴾ کا خطاب نبی مکرم ﷺ کی امت کو ہے، یعنی اے امتِ محمدیہ! تمھارے لیے دین میں ایک واضح راستہ ظاہر اور واضح کیا اور ایک ایسے دین کی راہ ڈالی جس کے صحیح ہونے پر تمام انبیاء علیہم السلام کا اتفاق ہوا۔ وہ دین جس کی وصیت نوح علیہ السلام کو کی، یعنی توحید اور دینِ اسلام اور شریعتوں کے وہ اصول جن میں رسول مختلف نہیں ہوئے اور ان پر کتابیں آپس میں موافقت رکھتی تھیں اور وہ دین جس کی ہم نے تیری طرف وحی کی، یعنی قرآن اور شرائعِ اسلام اور شرک سے بے زار ہونا۔

مطلب یہ ہے کہ ہم نے نوح علیہ السلام اور تجھ کو اے محمد! ایک دین کی وصیت کی۔ خاص طور پر نوح علیہ السلام کا ذکر اس لیے کیا کہ وہ سب سے پہلے صاحبِ شریعت نبی ہیں۔ ان کے پہلے نبی ہونے کی دلیل وہ ہے جو صحیح حدیث میں ثابت ہوئی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شفاعتِ کبریٰ کی مشہور حدیث میں فرمایا ہے: لیکن تم نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ، بے شک وہ پہلے رسول ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کی طرف بھیجا۔[2] یہ بات صحیح ہے، اس میں کوئی اشکال نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام پہلے رسول ہیں، جو نبی کیے گئے، مگر اتنی بات ہے کہ آدم علیہ السلام کے پاس صرف نبوت تھی، ان کے لیے فرائض مقرر نہیں کیے گئے تھے اور نہ ان کے لیے محارم مشروع ہوئے تھے۔[3] (كذا قال القاضي أبو بكر بن العربي كما نقله القرطبي) ان کی شریعت تو صرف بعض امور پر تنبیہ تھی اور معاشی ضروریات اور حیات و بقا کے وظائف کا نچوڑ تھا۔ یہ شریعت نوح علیہ السلام کے وقت تک رہی۔

پھر اللہ پاک نے ماؤں، بیٹیوں اور بہنوں کے محرمات ہونے کے احکام دے کر ان کو بھیجا اور ان پر واجبات مقرر کیے اور آداب و دیانات کے اصول ان کے لیے واضح فرمائے اور یہ امر ہمیشہ رسولوں سے پختہ اور متاکد (موکد) ہوتا رہا اور نبیوں سے اس کام کی نصرت اور مدد ہوتی رہی۔ ایک نبی کے بعد دوسرا نبی آتا رہا اور ایک شریعت کے بعد دوسری شریعت قائم ہوتی رہی، یہاں تک کہ شریعتوں کو اللہ پاک نے بہترین ملت، یعنی ہماری ملتِ اسلام کے

[1] تفسير ابن كثير (١٣٧،١٣٦/٤) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٣)

[3] تفسير القرطبي (١٠/١٦)

ساتھ ختم کیا، وہ ملت جو اکرمِ رسل ہمارے نبی محمد ﷺ کی زبانِ مبارک سے عطا کی گئی۔ غرضیکہ امتِ محمدیہ کے لیے وہ قدیم شریعت مشروع کی، جس کی وصیت نوح علیہ السلام کو کی، جس کی وحی نبی اکرم ﷺ کی طرف کی اور جس کی ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو وصیت فرمائی، یعنی یہ ایسی نفیس، عمدہ، برگزیدہ اور پاک شریعت ہے جس کی صحت پر سارے نبی اور ساری کتابیں متفق ہیں۔ خاص طور پر ان پانچ نبیوں کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ ہستیاں اکابرِ انبیاء علیہم السلام ہیں اور شرائعِ معظمہ و اتباعِ کثیرہ والے ہیں اور اولوا العزم ہیں اور اس لیے کہ کافروں کے دل ان کی طرف مائل ہیں، کیوں کہ بعض کی نبوت پر تو سب کا اتفاق ہے، جیسے: نوح، ابراہیم اور موسیٰ علیہم السلام میں یہود اور عیسیٰ علیہ السلام میں نصاریٰ متفرد ہیں اور اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک جدید شریعت ہے۔ ان کے علاوہ جو اور رسول ہیں، وہ اپنے سے پہلی شریعت پہنچانے کے لیے مبعوث ہوتے تھے۔ دیکھو شیث و ادریس علیہما السلام آدم علیہ السلام کی شریعت پہنچانے کے لیے بھیجے گئے تھے اور ہود اور صالح علیہما السلام جو ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے درمیان تھے، وہ ابراہیمی شریعت کی تبلیغ کے لیے مبعوث ہوئے تھے، اسی طرح موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان جو ہوئے وہ موسوی شریعت کی تبلیغ کے لیے مبعوث ہوئے۔ فلیتأمل.

اب یہاں پانچ امر سمجھنے کے قابل ہیں:

پہلا: یہ ہے کہ شروع میں ﴿مَا وَصّٰى﴾ فرمایا۔ پھر ﴿وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ﴾ کہا، "وَمَا أَوْحَينَا" نہ کہا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ﴿اَلَّذِيْٓ﴾ اصل موصولات ہے، سو اس اعتبار سے جس شے کی نبی اکرم ﷺ کی طرف وحی کی گئی، اس کی شان کی عظمت منظور ہے کہ جو کلمہ موصولات میں اصل تھا، اس کے ساتھ اس کو ادا کیا۔

دوسرا: امر یہ ہے کہ جو شے ہمارے نبی اکرم ﷺ کے لیے مشروع فرمائی، اس کو وحی کرنے کے ساتھ مخصوص کیا، باوجود اس کے کہ ماقبل اور مابعد میں وصیت کرنے کے لفظ کے ساتھ مذکور ہے۔ یعنی "وَالَّذِيْ وَصَّيْنَاكَ بِهِ" نہ کہا، بلکہ ﴿اَوْحَيْنَآ﴾ فرمایا، چنانچہ اس کا نکتہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی رسالت کی تصریح کرنا مقصود ہے، کیسی تصریح جو کفار کے انکار کے لیے توڑنے والی اور بیخ کن ہے۔

تیسرا: امر یہ ہے کہ یہاں ﴿اَوْحَيْنَآ﴾ فرمایا، "أوحیٰ" نہ کہا، جیسا کہ پہلے ﴿وَصّٰى﴾ کہا تھا، بلکہ غائب سے صیغۂ متکلم مع الغیر کی طرف التفات کیا، چنانچہ نکتہ یہ ہے کہ یہ بات بتانا منظور ہے کہ اللہ پاک کو آپ ﷺ کی طرف وحی کرنے کے ساتھ کمال اور انتہا درجے کا اہتمام ہے، جب تو یوں فرمایا کہ ہم نے تیری طرف وحی کی، جیسا کہ بلاشبہہ بادشاہانِ دنیا کو جب کسی امر کا اہتمام جتانا منظور ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ ما بدولت نے یہ کام کیا اور ہم نے یہ حکم دیا اور اس میں یہی بھید ہے کہ ﴿وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ﴾ کو اس کے مابعد پر مقدم کیا، باوجود اس کے کہ ما بعد کا مضمون، یعنی ﴿وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى﴾ زمانے کے لحاظ سے اس سے پہلے ہے۔

چوتھا: امر یہ ہے کہ اگر ﴿وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ﴾ کی ما بعد پر تقدیم اہتمام کے لیے ہے تو چاہیے تھا کہ ﴿مَا

﴿وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا﴾ پر بھی مقدم کیا جاتا۔ چنانچہ اس کا نکتہ یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کی وصیت کرنے کا ذکر اس لیے پہلے کیا کہ جو دین ان کے لیے مشروع کیا ہے، اس کا جلدی سے یہ بیان ہو جائے کہ وہ ایک قدیم دین ہے۔

پانچواں: امر یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی طرف خطاب کو جو بطریقِ تلوین متوجہ کیا، یعنی پہلے ﴿شَرَعَ لَكُمْ﴾ فرمایا، گو خطاب اُمت کو ہے، مگر آپ سب مخاطبوں کے سردار ہیں تو گویا آپ اول مخاطب ہیں، بعد کو اُمت مخاطب ہے اور یہاں ﴿اِلَیْكَ﴾ فرمایا۔ چنانچہ یہ خطاب کی نیرنگی آپ ﷺ کی تشریف و تعظیم کے لیے ہے اور اس بات سے آگاہ کرنے کے لیے ہے کہ اللہ پاک نے اس دینِ متین کو آپ ﷺ کی زبانِ فیض ترجمان پر آپ ﷺ کی امت کے لیے مشروع کیا ہے۔ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَأَشْيَاعِهٖ وَأَتْبَاعِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ بِعَدَدِ مَعْلُوْمَاتِهٖ إِلَى يَوْمِ الدِّيْنِ، آمین.

پھر وہ شے بیان کی جس کی ان سب کو وصیت فرمائی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ﴾ دین سے مراد اللہ پاک کی توحید ہے، یعنی زبان سے ایک کہنا اور دل سے ایک جاننا۔ کسی نے خوب کہا ہے:

یکے گویم یکے خوانم یکے دانم

''میں اللہ تعالیٰ کو ایک مانتا اور ایک کہتا ہوں۔''

اور اس پر ایمان لانا اور اس کے رسولوں کی اطاعت کرنا اور اس کی شریعتوں اور احکام کو ماننا۔ اس کے قائم کرنے سے مراد اس کے ارکان کی تعدیل (درستی) ہے اور اس کو اس سے محفوظ رکھنا کہ اس میں زیغ (کجی) اور میلان واقع ہو۔ یا اس پر مواظبت و مداومت (ہمیشگی) کرنا ہے اور اس کے لیے چاک و چوبند رہنا ہے اور اس کے احکام کی بجا آوری میں سعی و کوشش کرنا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: یہ معنی ہیں کہ اس پر عمل کرو۔[1] کسی نے کہا کہ اللہ پاک کی توحید ہے اور اس پر ایمان لانا ہے اور اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان لانا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی میں اس کی اطاعت کرنا اور باقی امور جن سے آدمی مسلمان ہوتا ہے اور وہ شریعتیں جو اُمتوں کے احوال کے مطابق درست طریقے ہیں، یہ مراد نہیں ہیں، کیوں کہ یہ مختلف و متفاوت ہوتی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا﴾ [المائدة: ٤٨] ''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک دستور اور راہ مقرر کر دی ہے۔''

امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی کوئی نبی نہیں بھیجا مگر اس کو نماز کے قائم کرنے کی اور زکات دینے کی وصیت کی اور اس بات کی کہ وہ اللہ کی اطاعت کا اقرار کرے۔ چنانچہ یہ اس کا وہ دین ہے جو ان کے لیے مقرر کیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد حلال کو حلال جاننا اور حرام کو حرام جاننا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں

[1] تفسير الطبري (٢١/٥١٣)

کہ اے محمد! ہم نے تجھ کو وصیت کی اور نوح علیہ السلام کو ایک دین کی، یعنی وہ دین ان اصول میں ایک ہے جن میں شریعتیں مختلف نہیں ہوئیں۔ وہ اصول یہ ہیں: توحید، نماز، زکات، روزہ، حج وتقرب الی اللہ حاصل کرنا عملِ صالح سے اور صدق اور عہد کو پورا کرنا، امانت کا ادا کرنا، صلہ رحمی، کفر کو حرام کرنا، قتل اور زنا کو حرام کرنا اور خلق کو ایذا دینے کو، وہ کسی بھی طرح سے متصور ہو، حرام جاننا اور حیوان پر ظلم وزیادتی کرنے کو حرام جاننا، وہ کسی طرح سے ہو اور کمینگی میں گھسنے اور مروءات (احسان) کو قطع کرنے سے باز رہنا۔ چنانچہ یہ سب امور ایک دین ایک ملت کر کے مشروع کیے گئے اور انبیاء علیہم السلام کی زبانوں پر مختلف نہیں ہوئے، اگرچہ ان کے اعذار مختلف ہوئے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ ﴾[1] کلمہ ﴿ أن ﴾ مصدریہ ہے اور وہ اور اس کا مابعد محلِ رفع میں ہے، اس بنا پر کہ مبتداء محذوف کی خبر ہے اور جملہ مستانفہ ہے، سوالِ مقدر کا جواب ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ کیا شے ہے جو اللہ نے مشروع کی؟ تو اس کا یہ جواب دیا کہ "هُوَ إِقَامَةُ الدِّينِ"، یعنی وہ شے دین کا قائم کرنا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ محلِ نصب میں ہے بنا بر بدل موصول سے یا محلِ جر میں ہے بنا بر بدل ﴿ اَلدِّيْنَ ﴾ سے، یا ضمیر ﴿ بِهٖ ﴾ سے۔ (اس قول میں خلل ہے۔ امام ابوالسعود رحمہ اللہ نے اس کو خوب بیان کیا ہے)۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَنْ ﴾ تفسیریہ ہے، اس لیے کہ اس سے قبل وہ شے ہے جس میں قول کے معنی ہیں، یعنی کلمہ ﴿ وَصّٰى ﴾ اور ﴿ اَوْحَيْنَآ ﴾ توصیہ وایحاء دونوں میں قول کے معنی ہیں۔

پھر جب اللہ پاک نے ان کو دین کے قائم کرنے کا امر کیا تو اس میں اختلاف کرنے سے ان کو نہی کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ﴾ یعنی توحید میں اور اللہ پر ایمان لانے میں اور اس کے رسول کی اطاعت میں اور اس کے شرائع واحکام کے قبول کرنے میں اختلاف مت کرو، کیوں کہ یہ وہ امور ہیں جن پر تمام شریعتیں ایک دوسرے کے مطابق ہیں اور ان کے دین ان چیزوں میں متفق ہیں تو ایسے امور میں اختلاف کرنا صحیح نہیں ہے۔

اب رہے فروعی مسائل جن میں دلیلیں مختلف ہوتی ہیں اور حکومتیں، یعنی امارتیں باہم متعارض ہوتی ہیں اور ان کے فہموں میں دوری ہوتی ہے، تو وہ اس تفرق کی قسم سے نہیں ہیں، کیوں کہ وہ تو من جملہ مطارحِ اجتہاد (اجتہاد کی گفت وشنید) اور مواطنِ خلاف (ایسی جگہ جہاں لڑائی اور اختلاف ہو) ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں یوں کہا ہے کہ تم دین کو قائم ودائم ومستمر ومحفوظ ومستقر کرو، اس کے بغیر کہ اس میں اختلاف اور اضطراب کرو۔ سو مخلوق میں سے بعض نے تو اس عہد کو پورا کیا اور بعض نے توڑ ڈالا۔ اور جس نے توڑا تو اس کے توڑنے کا وبال اسی کی جان پر پڑے گا۔ غرض کہ جن امور کا ذکر ہو چکا ہے، وہ تو تمام دینوں میں متفق رہے، اس اعتبار سے سارے دین ایک دین ہیں۔ اور دین کے احکام میں شریعتوں کا اختلاف ہوا، سوائے مذکورہ امور کے حسبِ ارادۂ الٰہی جس وقت میں جس حکم کے متعلق مصلحت کا تقاضا ہوا، وہی اس وقت کی اُمت کو دیا گیا اور جس بات کی جس زمانے میں حکمت

---

[1] تفسیر القرطبي (١١/١٦) [2] تفسیر أبي السعود (٢٦/٨)

موجب ہوئی، وہی بات اس زمانے کی امت کے لیے وضع کی گئی۔[1] مطلب یہ ہے کہ امت اور زمانے کے لحاظ سے شریعتوں اور احکام کا اختلاف مصلحت اور حکمتِ الٰہی کے تقاضے کے تحت اور اللہ تعالیٰ کے ارادے سے ہوا۔ واللّٰہ أعلم.

امام قتادہ رحمہ اللہ نے تفسیر میں کہا ہے: ''أَلَا تَعْلَمُوْا أَنَّ الْفُرْقَةَ هَلَكَةٌ وَأَنَّ الْجَمَاعَةَ ثِقَةٌ''[2] یعنی خبردار ہو کہ جان لو کہ فرقت ہلاکت ہے اور جماعت اعتماد ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جماعت رحمت ہے اور فرقت عذاب ہے۔[3] غرضیکہ جب اللہ پاک نے ایسا نفیس دین مشروع کیا جس پر سارے نبیوں کا اتفاق ہے اور اس کے قائم کرنے کا حکم دیا اور اس میں اختلاف کرنے سے نہی کی تو اب اس گروہ کا ذکر کیا جس پر وہ شاق ہوا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ﴾ یعنی وہ شے مشرکوں پر گراں اور شاق گزری جس کی طرف تو ان کو بلاتا ہے۔ مراد توحید ہے اور بتوں کا چھوڑنا ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان پر ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ'' کی گواہی سخت گزری اور ابلیس اور اس کے لشکر اس بات سے تنگ ہوئے، چنانچہ اللہ نے انکار کیا، مگر اس بات کا کہ اس کی مدد کرے اور اس کو بلندی بخشے اور اس کو ان لوگوں پر ظاہر، غالب اور ظفرمند کرے جنھوں نے اس سے عداوت کی۔[4] امام قتادہ رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ مشرکوں نے اس بات سے تکبر کیا کہ ان کے لیے کہا گیا: ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ''۔[5] امام محلی اور بیضاوی رحمہما اللہ نے ﴿مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ﴾ کی تفسیر ''مِنَ التَّوْحِيْدِ'' کی ہے[6] اور امام خازن رحمہ اللہ نے ''مِنَ التَّوْحِيْدِ وَرَفْضِ الْأَوْثَانِ'' کی ہے۔[7] اور علامہ نسفی رحمہ اللہ نے ''مِنْ إِقَامَةِ الدِّيْنِ وَالتَّوْحِيْدِ'' کی ہے۔[8] یہ سب تفسیر بقرینۂ مشرکین کی گئی ہے، لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ اسے عام کے لیے کیا جائے، اس لیے کہ سیاق اسی تعمیم پر دال ہے اور خاص کر کے جو مشرکین کا ذکر کیا ہے، یہ اس کو مانع نہیں ہے۔[9] (كما لا يخفى كما أفاده صاحب فتح البيان و الكرخي)

پھر اللہ پاک نے اپنے اولیاء کو خاص فرمایا: ﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ یعنی اللہ اپنے نفس کے لیے جس کو چاہتا ہے خاص کرتا ہے۔ یہ قول امام مجاہد رحمہ اللہ کا ہے۔[10] ''اِجْتِبَاء'' بہ معنی اختیار ہے بروزن افتعال ''جِبَايَةٌ'' سے۔ ''جِبَايَةٌ'' کہتے ہیں جمع کو برطریق ''اِصْطِفَاء'' کے۔ ''اِصْطِفَاء'' کہتے ہیں برگزیدہ ومنتخب و پسند کرنے کو۔ اللہ کا بندے کو اجتباء و اختیار کرنا یہ ہے کہ اس کو فیضِ الٰہی کے ساتھ خاص کرتا ہے، تاکہ اس کو انواع واقسام کی نعمتیں اس کی سعی وکوشش کے بغیر حاصل ہو جائیں۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اپنی

---

(1) تفسير القرطبي (١٦/١١) (2) تفسير الطبري (٢١/٥١٣) (3) تفسير النسفي (٤/٩٨)
(4) تفسير الطبري (٢١/٥١٣، ٥١٤) (5) الدر المنثور (٧/٣٤٠) (6) تفسير الجلالين (١/٦٣٩) تفسير البيضاوي (٥/١٢٥)
(7) تفسير الخازن (٦/١١٩) (8) تفسير النسفي (٤/٩٨) (9) فتح البيان (١٢/٢٨٥، ٢٨٦)
(10) الدر المنثور (٧/٣٤٠)

طرف سے اپنی توحید کے لیے اور اپنے دین میں داخل ہونے کے لیے چن لیتا ہے۔ ﴿ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴾ یعنی توفیق دیتا ہے اپنے دین کی اور اپنی عبادت کے لیے اس شخص کو خالص کر لیتا ہے جو اس کی اطاعت کی طرف اور اس کی عبادت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جملہ ﴿ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴾ مستانفہ ہے، حق کی تحقیق کے لیے لایا گیا ہے۔ اور اس میں اس بات کی خبر دی ہے کہ ان میں سے وہ لوگ ہیں جو دعوت کو قبول کرتے ہیں۔

پھر جب اللہ پاک نے وہ شے ذکر کی جو ان کے لیے مشروع فرمائی، یعنی دین کا قائم کرنا اور فرقے فرقے نہ ہونا تو اس کے بعد تفرق اور اختلاف کا ذکر کیا جو واقع ہوا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ﴾ یعنی نہیں متفرق ہوئے، مگر اس بات کو جان کر کہ فرقہ بندی گمراہی ہے اور اس پر وعید کی گئی ہے۔ یا رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے کا علم ہونے کے بعد۔ یا اسباب علم کے آنے کے بعد کہ وہ رسول اور کتب وغیرہما ہیں، مگر ان کی طرف توجہ نہ کی اور متفرق ہوئے۔ کسی نے کہا ہے کہ متفرق ہونے والوں سے مراد قریش ہیں اور یہ وہ ہیں جو اپنے پاس علم آ جانے کے بعد متفرق ہوئے، یعنی محمد ﷺ کے تشریف لانے کے بعد بغی اور ضد کی وجہ سے اور آپ ﷺ کے آنے سے پہلے وہ بات کہا کرتے تھے، جو اللہ پاک نے ان کی طرف سے اس آیت میں نقل فرمائی ہے: ﴿ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴾ [الفاطر: ٤٢] ''اور ان کفار نے بڑی زور دار قسم کھائی تھی کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آئے تو وہ ہر ایک امت سے زیادہ ہدایت قبول کرنے والے ہوں گے۔ پھر جب ان کے پاس ایک پیغمبر آ پہنچے تو بس ان کی نفرت ہی میں اضافہ ہوا۔''

نیز اس آیت میں: ﴿ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ﴾ [البقرة: ٨٩] ''پھر جب وہ ان کے پاس آ گیا جس کو پہچان رکھا تھا تو اس سے کفر کرنے لگے۔'' کسی نے کہا کہ مراد پہلے نبیوں کی امتیں ہیں اور جب ان پر مدتیں دراز ہوئیں تو وہ آپس میں مختلف ہوئیں، چنانچہ ایک قوم تو ایمان لائی اور دوسری قوم کافر ہوئی۔ کسی نے کہا: خاصتاً یہود ونصاریٰ مراد ہیں، جیسا کہ اس آیت میں آیا ہے: ﴿ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ﴾ [البينة: ٤] ''اہل کتاب اپنے پاس ظاہر دلیل آ جانے کے بعد ہی (اختلاف میں پڑ کر) متفرق ہو گئے۔''

متفرق ہوئے بغی کے سبب سے، بعض کی بعض پر طلبِ ریاست کے لیے، چنانچہ ان کا متفرق ہونا کچھ اس لیے نہیں ہے کہ بیان میں اور حجتوں میں کوئی قصور ہے، لیکن بغی اور ظلم کے سبب سے اور دنیا اور جاہ اور حمیت میں مشغول ہونے کے سبب سے متفرق ہوئے۔ پھر اگر کوئی کہے کہ اختلاف کرنے والوں پر عذاب کیوں نہیں آیا تو اس کی

وجہ یہ ذکر فرمائی: ﴿ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ﴾ یعنی اگر وہ بات نہ ہوتی جو تیرے رب سے سابق ہو چکی ہے مراد سزا کو ایک مدتِ مقرر تک، یعنی روزِ قیامت تک مؤخر کرنا تو البتہ جلدی سے ان پر عذاب نازل کر کے ان میں فیصلہ ہو چکا ہوتا، جیسا کہ اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ ﴾ [القمر: ٤٦] ''بلکہ قیامت کی گھڑی ان کے وعدے کا وقت ہے۔'' کسی نے ﴿ اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ سے وہ مدت مراد لی ہے جس کو اللہ پاک ان کے عذابِ دنیا کے لیے جاری کر چکا ہے جو قتل، قید، ذلت اور قہر کی صورت میں ہو گا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ البتہ فیصلہ کر دیا جاتا اس شخص کے درمیان جو اُن میں سے ایمان لایا اور اس کے جو کافر ہوا اس طرح سے کہ کافروں پر تو عذاب نازل ہو جاتا اور مومنوں کو نجات ملتی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴾ یعنی اور بے شک وہ لوگ جو وارث کیے گئے کتاب توریت و انجیل کے، مراد وہ یہود و نصاریٰ ہیں جو نبیِ مکرم ﷺ کے عہد شریف میں تھے ان یہود و نصاریٰ کے بعد جو ان سے پہلے تھے، جنھوں نے حق میں اختلاف کیا تھا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ﴾ بہ معنی ''مِنْ قَبْلِهِمْ'' ہے، یعنی مشرکینِ مکہ کے قبل اور وہ یہود و نصاریٰ ہیں۔[1] کسی نے کہا: ﴿ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ ﴾ سے مراد کفارِ مشرکینِ عرب ہیں جو قرآن شریف کے وارث کیے گئے، اس کے بعد کہ اہلِ کتاب اپنی کتاب کے وارث کیے گئے۔ ان کا وصف اور حال یہ ہے کہ البتہ شک میں ہیں، ایسا شک جو ریبت میں واقع کرنے والا ہے۔ ریبت سے مراد قرآن سے یا نبی اکرم ﷺ سے نفس کا قلق اور اضطراب ہے۔ ان دو معنی کی بنا پر لفظ شک اپنے مشہور معنی پر نہیں ہے، اس کے مشہور معنی یہ ہیں کہ ذہن میں ''نقیضین'' کا اعتدال اور تساوی ہو، بلکہ شک سے مراد اس معنی سے عام تر معنی ہیں، یعنی صرف تردد۔ غرضیکہ وہ اس سے ایسے تردد میں ہیں جو اُن کے نفس کو بے چین کر رہا ہے، اسی لیے وہ ایمان نہیں لاتے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''لَفِيْ شَكٍّ مِنَ الَّذِيْ أَوْصَى بِهِ الْأَنْبِيَاءَ''[2] یعنی ﴿ مِنْهُ ﴾ کی ضمیر اس دین کی طرف راجع ہے جس کی وصیت اللہ پاک نے انبیاء علیہم السلام کو کی۔ جمہور نے ﴿ اُوْرِثُوا ﴾ پڑھا ہے اور زید بن علی رحمہ اللہ نے ''وَرِّثُوْا'' بہ تشدید راء پڑھا ہے ''تَوْرِيْثٌ'' سے۔[3]

شیخ زادہ رحمہ اللہ کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ جب اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ اس نے سارے انبیاء کو اور اُمتوں کو امر فرمایا کہ وہ متفق علیہ دین کو لیں تو یہاں اس بات کا گمان تھا کہ کوئی یوں کہے: پھر ہم ان کو مختلف کیوں پاتے ہیں؟ تو اس کا یہ جواب دیا: ﴿ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ﴾ یعنی وہ متفرق نہیں ہوئے، مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس متفق علیہ دین کے قائم کرنے پر اجماع آ چکا اور اس سے انھیں بات معلوم ہو گئی کہ فرقہ بندی گمراہی ہے، لیکن انھوں نے بغی و ضد کی وجہ سے تفرق کیا اور اس حسد اور عداوت کے سبب

---

[1] تفسير القرطبي (١٢/١٦)　[2] تفسير القرطبي (١٢/١٦)　[3] فتح القدير (٦٩٥/٤)

سے جو ان کے پاس جمی ہوئی تھی اور آپس میں اتفاق سے مانع تھی، چنانچہ اسی لیے ہر گروہ ایک مذہب کی طرف گیا اور لوگوں کو اس کی طرف بلایا اور دوسرے مذاہب کو برا بھلا کہا۔ یہ معنی تو اس بنا پر تھے کہ بغی کے معنی عداوت ہوں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ بغی مصدر ہو "بغاء" کا جس کے معنی طلب ہیں، اس طرح سے معنی یہ ہوں کہ طلبِ دنیا و ریاست کے لیے متفرق ہوئے۔

پھر اللہ پاک نے یہ خبر دی کہ وہ لوگ اپنے تفرق کی وجہ سے عذاب کے مستحق ہوئے، مگر اللہ پاک نے اس عذاب کو ان سے مؤخر کیا، اس لیے کہ اس کے پاس ہر عذاب کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے اصولِ دین میں متفرق ہونے والوں کی تفسیر ان اُمتوں کے ساتھ کی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک پر سابق ہیں اور ﴿ اَلَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ﴾ کی تفسیر اہلِ کتاب کے ساتھ کی ہے جس میں سے ہر فریق ایک کتاب کے ساتھ منسوب ہو کر اپنے صاحب سے جدا ہوا۔ اس نے اپنے آپ کو دوسرے فریق کی کتاب کے ساتھ منتسب نہ کیا۔

لہٰذا ﴿ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ﴾ کی تفسیر یوں کی کہ نہیں تفرق کیا، مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس یہ علم آ گیا کہ تفرق گمراہی ہے، اس پر وعید کی گئی ہے۔ چنانچہ یہ تفسیر اس بنا پر کی گئی ہے کہ تفرق سے مراد اگلی اُمتوں کا اس اصل میں اختلاف ہے جو اصحابِ شرائع کے درمیان مشترک ہے۔ یہ قول قاضی کا مختار ہے۔[1] پھر یہ تفسیر کہ اس کے بعد کہ ان کے پاس رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے کا علم آ گیا، اس بنا پر ہے کہ تفرق سے مراد اہلِ کتاب میں سے ہر فرقے کا صرف اپنی کتاب کی طرف منتسب ہو کر تفرق کرنا ہے، اب اس قول کی بنیاد پر ﴿ تَفَرَّقُوْٓا ﴾ کی ضمیر اہلِ کتاب کی طرف راجع ہو گی اور ﴿ اَلَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ﴾ سے مراد مشرکینِ اہلِ مکہ ہوں گے اور کتاب سے قرآن شریف مراد ہو گا۔ اور ﴿ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ ﴾ کی ضمیر اہلِ کتاب کی کتاب کی طرف راجع ہے، یعنی وہ اپنی کتاب کو جانتے نہیں، جیسی کہ وہ ہے، یا اس پر اس طرح سے ایمان نہیں لاتے، جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے۔ اس قول کی بنا اس پر ہے کہ متفرقین سے مراد اگلے اہلِ کتاب ہیں اور ﴿ اَلَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ ﴾ سے مراد وہ اہلِ کتاب ہیں جو آپ ﷺ کے ہم عصر تھے۔ یا ضمیر قرآن شریف کی طرف راجع ہے، اس بنا پر کہ متفرقین سے مراد صرف اہلِ کتاب ہیں اور ﴿ اَلَّذِیْنَ اُوْرِثُوْا ﴾ سے مراد مشرکینِ مکہ ہیں۔[2]

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝15

[1] تفسير البيضاوي (١٢٥،١٢٤/٥) [2] فتح البيان (٢٨٧_٢٨٣/١٢)

وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ
دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۶﴾ اَللّٰهُ
الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ
قَرِيْبٌ ﴿۱۷﴾ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ۭ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ
يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۱۸﴾ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ
يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۱۹﴾

لہٰذا آپ اسی (دین) کی طرف (سب کو) بلائیں اور ثابت قدم رہیں، جیسے آپ کو حکم دیا گیا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں اور کہہ دیجیے: اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے، میں اس پر ایمان لایا ہوں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کروں، اللہ ہی ہمارا رب ہے اور تمھارا بھی رب ہے، ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال، ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں، اللہ (روزِ قیامت) ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ⑮ اور جو لوگ اللہ کے بارے میں، اس کو تسلیم کر لیے جانے کے بعد، جھگڑا کرتے ہیں، ان کی دلیل ان کے رب کے نزدیک باطل ہے، اور ان پر (اللہ کا) غضب ہے اور ان کے لیے بہت سخت عذاب ہے ⑯ اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب اور ترازو نازل کی اور آپ کو کیا معلوم شاید قیامت قریب ہی ہو ⑰ جو لوگ اس (قیامت) پر ایمان نہیں رکھتے، وہ اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں اور جو لوگ ایمان لائے وہ اس سے ڈرنے والے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ وہ برحق ہے۔ آگاہ رہو! بلاشبہ جو لوگ قیامت کے بارے میں جھگڑتے ہیں، وہ دور کی گمراہی میں (مبتلا) ہیں ⑱ اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے رزق دیتا ہے اور وہ خوب طاقتور، نہایت غالب ہے ⑲

دس اوامر واحکام پر مشتمل آیتِ کریمہ:

پہلی کتابوں والوں سے اس طرح کلام کرنا چاہیے کہ ہمارا اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ سب کتابوں پر ایمان ہے۔ یہ جو کہا کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے اور سخت عذاب ہے تو یہ ان اہلِ کتاب سے کہا جو سمجھنے والے لوگوں کو شبہ

ڈال کر بہکاتے ہیں۔ ترازو دینِ حق کو فرمایا جس میں بات پوری ہے، نہ کم ہے نہ زیادہ۔ وہ بڑی طاقت بڑے غلبے والا ہے وہ جس کو چاہتا ہے اور جتنی چاہتا ہے روزی دیتا ہے۔ انتہٰی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیتِ کریمہ دس مستقل کلموں پر مشتمل ہے، ان میں سے ہر کلمہ اپنے سے پہلے کلمے سے علاحدہ ہے اور ایک مستقل حکم ہے۔ آیۃ الکرسی کے سوا اس کی اور کوئی نظیر نہیں ہے، کیوں کہ وہ بھی اس طرح دس فصول ہے:

1 قولہ عزوجل: ﴿ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ﴾ یعنی تو لوگوں کو اسی دین کی طرف بلا جس کی ہم نے تیری طرف وحی کی اور جس کی وصیت ہم نے تجھ سے پہلے بڑے بڑے رسولوں کو کی جس کی پیروی کی گئی ہے، جیسا کہ اولوا العزم وغیرہم رسول ہیں۔

2 قولہ عزوجل: ﴿ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ﴾ یعنی تو اور جس نے تیری پیروی کی اللہ تعالیٰ کی عبادت پر قائم رہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو حکم دیا ہے۔

3 قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ﴾ یعنی اور مشرکوں کی خواہشات پر نہ چل، یعنی بتوں کی عبادت میں جس کو انھوں نے اپنی طرف سے جھوٹ بنا لیا ہے۔

4 قولہ جل وعلا: ﴿ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ﴾ یعنی اور کہہ کہ میں نے ساری کتابوں کی جو نبیوں پر آسمان سے نازل کی گئیں، تصدیق کی۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔

5 قولہ عظم سلطانہ: ﴿ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ﴾ یعنی اور مجھ کو حکم ہے کہ میں تمھارے درمیان فیصلے میں انصاف کروں، جیسا کہ مجھ کو اللہ نے امر کیا ہے۔

6 قولہ جلت عظمتہ: ﴿ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ﴾ یعنی معبود اللہ ہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سو ہم تو اختیاراً اس کا اقرار کرتے ہیں اور تم اگرچہ اختیاراً اس کو سجدہ نہیں کرتے ہو، مگر سارے جہانوں میں جو کوئی ہے وہ طوعاً و اجباراً اسی کو سجدہ کرتا ہے۔

7 قولہ تبارک وتعالیٰ: ﴿ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ﴾ یعنی ہم تم سے بری و بے زار ہیں، جیسا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ [یونس: ۴۱] ”اور اگر آپ کو جھٹلاتے رہیں تو یہ کہہ دیجیے کہ میرے لیے میرا عمل اور تمھارے لیے تمھارا عمل، تم میرے عمل سے بری ہو اور میں تمھارے عمل سے بری ہوں۔“

8 قولہ: ﴿ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: نہیں ہے کوئی جھگڑا ہمارے اور تمھارے درمیان۔[1]

[1] تفسیر الطبري (۲۱/ ۵۱۷، ۵۱۸)

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت سیف کے نزول سے پہلے تھا۔ یہ قول متجہ ہے، کیوں کہ یہ آیت مکی ہے اور آیتِ سیف ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہے۔[1]

9 قولہ عم نوالہ: ﴿ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ﴾ یعنی اللہ قیامت کے دن ہمارے اور تمھارے درمیان جمع کرے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴾ [سبا: ٢٦] ”انھیں خبر دیجیے کہ ہم سب کو ہمارا رب جمع کرے، پھر ہم میں سچے فیصلے کر دے گا۔ وہ فیصلے چکانے والا اور دانا ہے۔“

10 قولہ جل جلالہ: ﴿ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴾ یعنی اسی کی طرف حساب کے دن لوٹ کر جانا اور ٹھکانا ہے۔

دین میں جھگڑا کرنے والوں کو تنبیہ اور وعید:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴾ اللہ پاک ان لوگوں کو وعید سناتا ہے جو اس شخص کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں جو اس پر ایمان لا چکا ہے، یعنی جو لوگ کہ مومنوں سے جھگڑتے ہیں جو اللہ کو اور اس کے رسول ﷺ کو ماننے والے ہیں، تاکہ ان کو اس راہِ ہدایت سے روکیں جن پر وہ چل رہے ہیں۔ اللہ کے نزدیک ان کی حجت باطل ہے اور ان پر اس کی طرف سے غصہ ہے اور قیامت کے دن ان کے لیے سخت عذاب ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ مومنوں سے جھگڑے اس کے بعد کہ وہ اللہ کو اور اس کے رسول کو مان چکے، تاکہ ان کو ہدایت سے روکیں اور اس بات کا طمع کیا کہ جاہلیت پھر لوٹ آئے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جھگڑنے والے یہود و نصاریٰ ہیں، انھوں نے مومنوں سے کہا کہ ہمارا دین تمھارے دین سے بہتر ہے اور ہمارا نبی تمھارے نبی سے پہلے ہے اور ہم تم سے بہتر ہیں اور ہمیں اللہ کے ساتھ تم سے زیادہ لگاؤ ہے،[2] حالاں کہ وہ اس بات میں جھوٹ بولے۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ وَمَا يُدْرِيْكَ ﴾ یعنی اللہ وہی ہے جس نے اپنے نبیوں پر اپنے پاس سے کتابیں اتاریں اور میزان اتارا، یعنی عدل و انصاف۔[3] (قالہ مجاهد و قتادة) یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ﴾ [الحدید: ٢٥] ”یقیناً ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (ترازو) نازل فرمایا، تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں۔“ نیز اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ﴾ [الرحمن: ٧۔ ٩] ”اسی نے آسمان کو بلند کیا اور اس نے ترازو رکھی، تاکہ تم تولنے میں تجاوز نہ کرو، انصاف کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور تول میں کمی نہ کرو۔“

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١٣٨/٤) [2] تفسیر الطبري (٥١٨/٢١، ٥١٩) [3] تفسیر الطبري (٥٢٠/٢١)

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ﴾ میں تین امر ہیں: ایک تو اس میں قیامت کی ترغیب ہے، دوسرے اس سے ترہیب ہے (خوف دلانا) اور تیسرے دنیا میں بے رغبت کرنا ہے۔ قولہ عزوجل: ﴿ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ﴾ یعنی قیامت کی جلدی وہ لوگ کرتے ہیں جو اس پر یقین نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں: یہ وعدہ کب ہے اگر تم سچے ہو؟۔ اور یہ جو کہتے ہیں تو صرف تکذیب کے لیے اور بعید جاننے کے لیے اور کفر وعناد و دشمنی کے لیے۔ اور جو یقین رکھتے ہیں وہ اس کے واقع ہونے سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ حق ہے، یعنی ضرور ہونے والی ہے، چنانچہ وہ اس کے لیے مستعد ہیں، تیاری کر رہے ہیں اور اس کے لیے عمل کرتے ہیں۔

احادیثِ صحاح، حسان، سنن اور مسانید میں ایک حدیث اتنے طریقوں سے مروی ہے کہ وہ تواتر کے درجے کو پہنچتی ہے، اس کے بعض الفاظ میں یہ ہے کہ ایک شخص نے بآواز بلند آپ ﷺ سے پوچھا اور آپ ﷺ اپنے کسی سفر میں تھے، چنانچہ اس نے آپ ﷺ کو پکارا تو آپ ﷺ نے اس کے مثل آواز سے فرمایا: « هَاؤُمُ » یعنی آؤ، چنانچہ اس نے عرض کی: قیامت کب ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا: تیری خرابی ہو! بے شک وہ تو ہونے والی ہے، پھر تو نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ تو اس نے عرض کی کہ اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی محبت تو آپ ﷺ نے فرمایا: « أَنْتَ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتَ »① یعنی تو اس کے ساتھ ہے جس سے تو نے محبت کی۔ چنانچہ حدیث شریف میں آپ کا قول: « اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ »② یہ لامحالہ متواتر ہے۔ غرض یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو قیامت کے وقت کے متعلق جواب نہیں دیا، بلکہ اس کو اس کے لیے تیاری کرنے کا حکم دیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴾ یعنی خبردار! بے شک وہ لوگ جو قیامت کے وجود کے متعلق جھگڑتے اور اس کے واقع ہونے کا انکار کرتے ہیں، وہ البتہ کھلی جہالت میں ہیں، کیوں کہ جس نے آسمان وزمین بنائے وہ بطریقِ اولیٰ واحریٰ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ۚ ﴾ [الروم: ٢٧] ''وہی ہے جو پہلی بار مخلوق کو پیدا کرتا ہے، پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور یہ تو اس پر بہت ہی آسان ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴾ اللہ پاک اپنے لطف وکرم اور محبت کی خبر دیتا ہے جو اس کو اپنی مخلوق کو روزی دینے میں ہے کہ وہ ساری خلق کو روزی دیتا ہے، ان میں سے کسی کو بھولتا نہیں۔ اس کی روزی میں نیکوکار اور بدکار دونوں برابر ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي

① صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٤٨٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٣٩)

② صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٨١٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٤٠)

الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [ھود: ٦] ''زمین پر پھرنے والے جتنے جاندار ہیں، سب کی روزیاں اللہ تعالیٰ پر ہیں وہی ان کے رہنے سہنے کی جگہ کو جانتا ہے اور اُن کے سونپے جانے کی جگہ کو بھی، سب کچھ واضح کتاب میں موجود ہے۔'' اس آیت کے بہت سے نظائر ہیں۔ ﴿ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ اس کے یہ معنی ہیں کہ روزی کی فراخی کرتا ہے جس پر چاہتا ہے اور وہ زور آور زبردست ہے، یعنی کوئی شے اس کو عاجز نہیں کرتی۔ ①

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے ﴿ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ ﴾ ''ذلك'' کا اشارہ تفرق و شک کی طرف ہے، یا کتاب یا علم کی طرف یا دینِ مشروع کی طرف۔ ماقبل میں یہی اشیاء مذکور ہیں، یعنی تفرق اور شک کے سبب سے، یا کتاب کے سبب سے، یا اس علم کے سبب سے جو تجھے دیا گیا ہے، یا اس بات کے سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے دین کو مشروع کیا ہے جس کو مشروع کیا ہے، تو اللہ کی طرف اور اس کی توحید کی طرف دعوت دے اور اتفاق اور اُلفت اور ایک قوی ملت بننے کی طرف دعوت دے، یا اس شے کی پیروی کی طرف دعوت دے جو تجھے دی گئی۔ اس بنا پر جائز ہے کہ یہ لام ﴿ اِلٰى ﴾ کے بجائے ہو تا کہ اس سے صلہ و تعلیل ظاہر ہو۔

امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ کہتے ہیں: معنی یہ ہیں کہ ''فَإِلَى ذَلِكَ فَادْعُ''، جیسے تم بولتے ہو: ''دَعَوْتُ إِلَى فُلَانٍ وَلِفُلَانٍ''۔ اور ''ذلك'' کا اشارہ اس شے کی طرف ہے جس کی انبیاء علیہم السلام کو وصیت کی، یعنی توحید۔ ② کسی نے کہا: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ معنی یہ ہیں: ''كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ فَلِذَلِكَ فَادْعُ''، یعنی گراں گزری مشرکوں پر وہ شے جس کی طرف تو ان کو بلاتا ہے۔ مراد توحید ہے، لہٰذا تو اسی طرف بلا اور اس شے پر خود بھی قائم رہ، جس کی طرف تو نے دعوت دی۔ امام راغب رحمہ اللہ نے استقامت کی تفسیر منہجِ مستقیم کے لزوم کے ساتھ کی ہے۔ یعنی سیدھی راہ پر جما رہ۔ جب اس کی یہ تفسیر ہوئی تو اب اس بات کی کوئی حاجت نہ رہی کہ استقامت کی تاویل استقامت پر دوام کے ساتھ کی جائے۔ ③

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ کے امر پر مستقیم رہ۔ امام سفیان رحمہ اللہ نے کہا کہ قرآن پر جما رہ۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ رسالت کے پہنچانے پر قائم رہ، ④ جیسا کہ تجھ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم کیا گیا ہے۔ اور مت پیروی کر ان کی خواہشوں کی، یعنی توحید کے چھوڑنے میں ان کی باطل خواہشوں اور ان کے تعصبات کا پیرو مت ہو جو حق سے پھیرنے والے ہیں۔ اور اللہ کے دین میں جو کوئی تیرا مخالف ہوا ہے، اس کی مخالفت کی طرف دھیان نہ دے۔ امام محلی رحمہ اللہ

① تفسير ابن كثير (١٣٧/٤ـ١٣٩) ② فتح القدير (٦٩٥/٤) ③ روح المعاني (٢٤/٢٥) ④ تفسير القرطبي (١٣/١٦)

کا بیان یہ ہے کہ اے محمد! تو اسی توحید کے لیے لوگوں کو بلا اور اس پر خود بھی قائم رہ اور اس کو چھوڑنے میں ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔① علامہ نسفی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کفر کے شاخ شاخ ہو کر بہت شاخیں ہو جانے کی وجہ سے جو تفرق کے سبب سے پیدا ہوئی ہیں، پس تو لوگوں کو آپس میں اتفاق اور اُلفت کی طرف ایک قوی اور حنیفی ملت پر جمع ہونے کی دعوت دے اور خود بھی اس دعوت پر قائم رہ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو حکم دیا ہے اور اُن کی مختلف باطل خواہشات کی پیروی مت کر۔ اسی کے مثل خازن نے بھی کہا ہے۔② قاضی صاحب مرحوم کا بیان یہ ہے کہ "ذلك" کا اشارہ ﴿تَفَرَّقُوْٓا﴾ کے مصدر کی طرف ہے، یا کتاب کی طرف ہے جس سے مراد قرآن شریف ہے۔ یا دینِ مشروع کی طرف ہے جس کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ دین کے قائم کرنے کا امر ہے اور تفرق کی ممانعت ہے۔ یعنی اس تفرق کے لیے، یا کتاب کے لیے، یا علم کے لیے جو تجھ کو دیا گیا ہے تو متفق ہونے کی طرف ایک ملت پر اور اس شے کی پیروی کی طرف لوگوں کو دعوت دے جو تجھے دی گئی ہے۔ اس بنیاد پر کہ "ذلك" کا اشارہ کتاب کی طرف ہو یا علم کی طرف ہو تو ہوسکتا ہے کہ حرفِ لام بہ معنی ﴿إِلَی﴾ ہو، یہاں تک کہ "أُدْعُ" کا صلہ صریحاً مذکور ہو جائے اور تعطیل کے معنی بھی ظاہر کرے۔③ امام فراء و زجاج رحمہما اللہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "فَإِلَی ذٰلِكَ الدِّیْنِ الَّذِيْ وَصَّیْنَا بِهِ الْأَنْبِیَاءَ فَادْعُ النَّاسَ"④ یعنی جس دین کی ہم نے انبیاء علیہم السلام کو وصیت کی تو لوگوں کو اس دین کی طرف بلا۔

﴿وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ﴾ یعنی اور کہہ دے کہ میں ساری کتابوں پر ایمان لایا جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں پر اتارا ہے، نہ ان کی طرح جو ان میں سے بعض پر ایمان لائے ہیں اور بعض کے منکر ہوئے ہیں۔ اس میں حق کی تحقیق ہے اور اس بات کا بیان ہے کہ ساری کتابیں اصولِ دین میں متفق ہیں اور تورات وانجیل والوں کے دلوں کو مالوف کرنا ہے اور ان کے لیے تعریض (اشارہ) ہے کہ ہم تو سب کتابوں کو مانتے ہیں اور تم سب کو نہیں مانتے۔

﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ﴾ یعنی اور مجھے حکم ہے کہ جب تم میری طرف مرافعہ کرو (اپنا مقدمہ پیش کرو) تو میں تمھارے درمیان اللہ کے احکام کے مطابق انصاف کروں اور تم پر ظلم نہ کروں اس طرح سے کہ جو حکم اللہ تعالیٰ نے مشروع فرمایا ہے، اس پر کچھ بڑھا دوں یا اس سے کم کر دوں اور جس شے کے پہنچانے کا اللہ تعالیٰ نے مجھ کو حکم دیا ہے اس کو جوں کا توں تمھاری طرف پہنچا دوں۔ حرفِ لام بہ معنی "كَيْ" ہے، یعنی میں مامور ہوا ہوں اس شے کے ساتھ کہ جس کے ساتھ مامور ہوا ہوں، تا کہ تمھارے درمیان عدل کروں۔ کسی نے کہا ہے کہ لام زائد ہے معنی "أُمِرْتُ أَنْ أَعْدِلَ" ہیں، یعنی مجھے اس بات کا حکم ہوا ہے کہ عدل کروں۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی باء ہے اور

① تفسیر الجلالین (٦٤٠/١) ② تفسیر النسفي (٩٩/٤) تفسیر الخازن (١١٩/٦)
③ تفسیر البیضاوي (١٢٥/٥) ④ فتح القدیر (٦٩٥/٤)

﴿ أَنْ ﴾ مصدر یہ مقدر ہے۔ "أَيْ: بِأَنْ أَعْدِلَ"، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں حکم کیا گیا ہوں، تاکہ تمھارے دین میں برابری کروں اور ہر کتاب پر اور ہر رسول پر ایمان لاؤں۔[1] ظاہر یہ ہے کہ آیتِ کریمہ عام ہے ہر شے میں، یعنی مجھے حکم ہوا تاکہ تمھارے درمیان ہر شے میں عدل کروں۔

﴿ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ﴾ یعنی اللہ ہمارا معبود ہے اور تمھارا بھی معبود ہے اور ہمارا خالق ہے اور تمھارا خالق ہے ﴿ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ﴾ یعنی ہمارے اعمال کا ثواب اور عذاب ہمارے ساتھ خاص ہے اور تمھارے اعمال کا ثواب اور عذاب تمھارے ساتھ خاص ہے، چنانچہ ہر کوئی اپنے عمل کا بدلہ پائے گا۔ ﴿ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ﴾ یعنی ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی خصومت (جھگڑا) نہیں، اس لیے کہ حق ظاہر و واضح ہو چکا، اب باہم جھگڑنے کی کوئی مجال نہیں رہی۔ ان کی باطل باتوں کو جو پیرایۂ حجت میں ادا کیا تو یہ ان کے زعمِ باطل پر ان سے مقابلہ کرنے کے لیے ہے، ورنہ ان کی باتوں کا حجت سے کیا تعلق۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ خطاب یہود کو ہے۔ یہ قول امام قرطبی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ خطاب علی العموم کفار کو ہے۔ فتح القدیر میں کہا ہے کہ یہ آیتِ سیف سے منسوخ ہے۔[3] امام محلی اور خازن رحمہما اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ منسوخ نہیں ہے، اس لیے کہ براہین ظاہر ہو گئیں اور حجتیں قائم ہو چکیں، اب سوائے عناد و دشمنی کے اور کچھ باقی نہ رہا۔ اور عناد کے بعد نہ کوئی حجت ہے اور نہ کسی طرح کا جدال۔ صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ اور کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت میں نہیں ہے، مگر وہ شے جو دال ہے متارکت پر مقاولہ و محاجہ میں نہ مطلقاً تا آنکہ منسوخ ہو،[5] یعنی آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ باہم قیل و قال اور جھگڑا ترک کر دیا جائے، نہ کہ مطلقاً بات چیت ترک کی جائے، جب تک کہ منسوخ نہ ہو۔ قاضی صاحب مرحوم بھی اسی کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں: "وَلَيْسَ فِي الْآيَةِ مَا يَدُلُّ عَلَى مُتَارَكَةِ الْكُفَّارِ رَأْسًا حَتَّى تَكُوْنَ مَنْسُوْخَةً بِآيَةِ الْقِتَالِ.[6] انتہی" ﴿ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴾ یعنی اللہ محشر میں ہمیں جمع کرے گا، تاکہ ہمارے درمیان فیصلہ کرے اور اسی کی طرف قیامت کے دن لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا دے گا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ ﴾ میں ﴿ لَهٗ ﴾ کی ضمیر اللہ کے دین کی طرف راجع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک کی طرف راجع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سیاق سے معلوم ہوتا ہے، فعل یعنی ﴿ اسْتُجِيْبَ ﴾ اس پر دال ہے لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ یعنی وہ لوگ جو اللہ کے دین میں جھگڑتے ہیں، اس کے بعد کہ لوگوں نے اس کو مان لیا اور اس میں داخل ہو

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/١٦) [2] تفسير القرطبي (١٣/١٦) [3] فتح القدير (٦٩٥/٤)

[4] تفسير الجلالين (٦٤٠/١) تفسير الخازن (١١٩/٦) [5] فتح البيان (٢٨٨/١٢) [6] تفسير البيضاوي (١٢٦/٥)

چکے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعد اس کے کہ لوگ اسلام لے آئے۔ کہا: یہ لوگ ایک قوم ہیں، جنھوں نے یہ وہم کیا کہ جاہلیت لوٹ آئی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اہلِ کتاب ہیں، مسلمانوں سے جھگڑتے تھے اور ہدایت سے ان کو روکتے تھے، اس کے بعد کہ انھوں نے اللہ کو مان لیا۔ اور فرمایا کہ یہ ایک قوم ہیں اہلِ ضلالت سے اور یہ اس بات کا انتظار کرتے تھے کہ جاہلیت ان کے پاس آ جائے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ یہود و نصاریٰ ہیں، ان کا جھگڑنا ان کا یہ قول ہے کہ ہمارا نبی تمھارے نبی سے پہلے ہے اور ہماری کتاب تمھاری کتاب سے پہلے ہے۔[1] اور اپنے لیے اس بات کو فضیلت خیال کرتے تھے کہ وہ اہلِ کتاب ہیں اور انبیاء علیہم السلام کی اولاد ہیں۔ اور مشرکین یوں کہتے تھے: ﴿ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴾ [مریم: ۷۳] ''ہم تم دونوں جماعتوں میں سے کس کا مرتبہ زیادہ ہے۔'' اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جب ﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ﴾ [النصر: ۱] نازل ہوئی تو مشرکوں نے ان مومنوں سے کہا جو اُن کے درمیان میں تھے کہ لوگ تو اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو چکے تو اب تم ہمارے درمیان سے نکل جاؤ، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[2]

ان قولوں میں سے بعض قول پہلے گزر چکے ہیں، لیکن فی الجملہ الفاظ کا فرق ہے، غرضیکہ موصول مبتداء ہے اور اس کی خبر یہ جملہ ہے: ﴿ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ یعنی مذکورہ لوگوں کی حجت اُن کے رب کے نزدیک پھسلنے والی ہے، اس کو کسی طرح کا ثبات اور قرار نہیں ہے، وہ ایسی شے کی طرح ہے جو اپنی جگہ سے پھسل رہی ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "دَحَضَتْ حُجَّتُهُ دُحُوْضًا" از باب "خَضَعَ" یعنی اس کی حجت باطل ہوئی۔ ''ادحاض'' بہ معنی ''ازلاق'' ہے، یعنی کسی شے کو پھسلانا اور پھسلنے کی جگہ کو ''مکان دحض'' بولتے ہیں: ''وَدَحَضَتْ رِجْلُهُ'' از باب ''قَطَعَ'' یعنی اس کا پاؤں پھسل گیا۔ ان کے جھگڑے کا نام حجت رکھا، گو وہ حجت نہیں ہے، شبہہ ہے، اس لیے کہ ان کے خیال میں وہ حجت ہے۔ ﴿ وَّعَلَيْهِمْ غَضَبٌ ﴾ یعنی صرف یہی نہیں ہے کہ ان کی حجت باطل ہے، بلکہ ان پر اللہ پاک کی طرف سے بڑا غصہ ہے، اس وجہ سے کہ باطل کے ساتھ جھگڑے، پھر اس پر بھی قناعت نہیں، بلکہ ﴿ وَلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴾ یعنی ان کے لیے آخرت میں سخت عذاب ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے یہود کے مخاصمہ کے بیان میں فرمایا ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے دین میں اس طرح جھگڑا کیا۔ کہا: کیا تم یہ نہیں کہتے ہو کہ متفق علیہ دین کو اختیار کرنا واجب ہے، نہ کہ اس دین کا جس میں اختلاف ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور اُن کی کتاب کی حقیقت بالاتفاق معلوم ہے اور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت متفق علیہ نہیں ہے تو یہ

---

[1] تفسیر الطبري (۲۱/۵۱۸۔ ۵۱۹) [2] الدر المنثور (۷/۳۴۲)

بات واجب ہوئی کہ یہودیت کو اختیار کرنا زیادہ صحیح اور زیادہ واجب ہو۔ تو یہ ان کی حجت ہے اور اللہ پاک نے اس پر یہ حکم لگایا کہ وہ باطل ہے۔ اس کے باطل ہونے کی یہ وجہ ہے کہ یہود نے اس پر اجماع و اتفاق کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا صرف اس لیے واجب ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تصدیق اس طرح سے کی کہ ان کے ہاتھ پر معجزے ظاہر فرمائے اور جس کے دعوائے رسالت کی اللہ پاک اس طرح سے تصدیق کرے تو وہ اپنے دعوے میں سچا ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے، چنانچہ ان کا یہ اجماع ان کی حجت کے باطل ہونے کو لازم کرتا ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے رسالت کا دعویٰ کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے دعوے کی تصدیق اس طرح سے کی کہ آپ ﷺ کے دستِ مبارک پر ظاہر و باہر معجزے پیدا فرمائے اور یہود نے ان معجزوں کا مشاہدہ کیا، پس اگر معجزے کا ظہور نبوت کے مدعی کے صدق پر دلیل ہے تو نبی اکرم ﷺ کی نبوت کا اقرار واجب ہے اور اگر وہ آپ ﷺ کے حق میں اس پر دلیل نہیں ہے تو موسیٰ علیہ السلام کے حق میں کیسے دلیل ہوسکتا ہے؟![1]

چنانچہ اس کو ایک کے صدق پر تو دلیل ٹھہرانا اور دوسرے کی سچائی پر دلیل قرار نہ دینا صرف زبردستی ہے اور محض عناد و دشمنی ہے۔ جبکہ اللہ پاک نے ان معانی کی تعظیم کی جو اس سورتِ کریمہ میں شامل کیے گئے ہیں، اس طرح کہ ان مضامین کی قرآنِ مجید میں آپ ﷺ کی طرف بار بار وحی کی اور ان نبیوں کی طرف جو آپ ﷺ سے پہلے تھے اور اس طرح سے کہ ان کی وحی کی نسبت اللہ عزیز حکیم کی طرف کی۔

پھر مشرکوں کے ایمان لانے پر رسول اللہ ﷺ کی شدتِ حرص سے انکار کیا اور ان کے قصر نہ کرنے کا اور ان کی طرف اس کی رسالت پہنچانے پر انکار کیا اور ان کے یوم الجمع سے اور اس میں گناہ گار کے لیے جو عذاب ہوگا، اس سے ڈرانے پر انکار کیا۔ یہ انکار ایسے طرز پر کیا جس میں ان کی تہدید (خوف دلانا) شامل ہے، اس طرح سے کہ اللہ ان پر نگہبان ہے اور ان کا کوئی ولی اور مددگار نہیں ہے۔

پھر یہ بیان کیا کہ وہ اس تہدید کے مستحق ہیں اس وجہ سے کہ جو دین شریعت والوں کے درمیان متفق علیہ ہے انھوں نے اس کی مخالفت کی وہ دین یہی ہے کہ جن امور پر ایمان لانا واجب ہے ان سب پر ایمان لانا اور جس کام کا اللہ پاک نے حکم دیا ہے اور جس سے منع کیا ہے، اس سب میں اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار ہونا اور اس میں متفرق نہ ہونا تو اب یہ بیان کرنا شروع کیا کہ یہ متفق علیہ دین جو مشروع کیا ہے تو ایسی کتاب کے نازل کرنے کے سبب سے ہے جو طرح طرح اور قسم قسم کے دلائل اور بینات پر مشتمل ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ ﴾ کتاب سے مراد جنس ہے تو جو کتابیں رسولوں پر نازل کی گئی ہیں، وہ سب اس میں شامل ہوں گی۔ کسی

[1] تفسير الرازي (٢٧/١٣٧)

نے کہا کہ خاص قرآن شریف مراد ہے۔ ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ محذوف سے متعلق ہے وہ حال ہے کتاب سے "أَيْ: مُتَلَبِّسًا بِالْحَقِّ" حق سے مراد سچائی اور راستی ہے۔

﴿ اَلْمِيْزَانَ ﴾ سے مراد عدل ہے۔ اکثر مفسرین نے اسی طرح کہا ہے۔ عدل کا نام میزان اس لیے رکھا کہ میزان مخلوق کے درمیان انصاف کا اور برابر کرنے کا آلہ ہے تو اب میزان سے عدل مراد لینا مجاز ٹھہرے گا۔ میزان جو عدل کا سبب تھا، اس کا عدل میں استعمال کیا جو مسبب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے ساری کتابیں نازل کیں، یا خاص قرآن شریف اس حال میں کہ اپنے ساتھ صدق اور راستی کو لیے ہوئے ہے اور نازل کیا عدل، تاکہ مخلوق میں انصاف کیا جائے۔ کسی نے کہا کہ میزان سے وہ شے مراد ہے جو نازل شدہ کتب میں بیان کی گئی ہے، اس قسم سے جس کے ساتھ عمل کرنا ہر انسان پر واجب ہے۔ کسی نے کہا کہ میزان جزا ہے طاعت پر ثواب کے ساتھ اور معصیت پر سزا کے ساتھ۔

امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میزان اس شے میں عدل ہے جس کا امر کیا اور اس شے میں جس سے منع کیا۔[1] عدل کا نازل کرنا یہ ہے کہ اس کا امر فرمانا اور اس کے ساتھ مکلّف کرنا۔ کسی نے کہا کہ میزان سے مراد خود میزان ہے، یعنی ترازو جس سے تولتے ہیں۔ نوح علیہ السلام کے وقت میں اللہ پاک نے آسمان سے اس کو نازل فرمایا اور بندوں کو اس سے تولنے کی تعلیم فرمائی، تاکہ ان کے آپس میں ظلم اور کمی نہ ہو۔ یا ترازو نازل کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اس کے بنانے کا الہام کیا، یا وحی کی۔ یعنی تولنے کی چیزوں کو پورا تول کر لین دین کریں، حقوق میں کمی زیادتی نہ ہونے پائے، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ﴾ [الحديد ٢٥] "یقیناً ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (ترازو) نازل فرمایا تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں۔

امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "هُوَ الَّذِيْ يُوْزَنُ بِهِ"[2] یعنی میزان سے مراد یہی حقیقی ترازو ہے جس سے تولتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ میزان سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، وہ تمھارے درمیان اللہ تعالیٰ کی کتاب سے فیصلہ کرتے ہیں۔ پھر کتاب اور میزان کی اتباع میں اور اُن کی حدود کے قائم کرنے میں ترغیب دی۔ ارشاد فرمایا: ﴿ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ﴾ یعنی تجھ کو کیا خبر ہے، شاید وہ گھڑی پاس ہو، لہٰذا تو کتاب کی پیروی کر اور شرع کے ساتھ عمل کر اور عدل و انصاف پر ہمیشہ قائم رہ، اس سے پہلے کہ تجھے اچانک وہ دن آلے جس میں تیرے اعمال تولے جائیں اور تیری جزا پوری پوری دی جائے۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٥/١٦) [2] تفسير القرطبي (١٥/١٦)

کلمۂ ﴿ مَا ﴾ استفہامیہ ہے اور استفہامِ انکاری ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے یہاں دو ترکیبیں بیان کی ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ لَعَلَّ ﴾ فعل کے عمل سے معلق ہے۔ دوسری یہ ہے کہ اس کا ما بعد دو مفعول کے قائم مقام کیا گیا ہے۔[1]
امام حفناوی رحمہ اللہ نے دوسری ترکیب کی شرح میں لکھا ہے کہ فعل تو ﴿ يُدْرِيْكَ ﴾ ہے اور ما بعد اس کا جملہ ﴿ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ﴾ ہے، یعنی مفعول اول تو کاف ہوا، چنانچہ یہ فعل تین مفعول کی طرف متعدی ہے، اس لیے کہ مضارع ہے "أدری" کا جو معنی کے سبب سے تین کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ انتہیٰ. اس پر امام جمل رحمہ اللہ نے کہا کہ اس ترکیب کو اس ترکیب کے ساتھ دیکھنا چاہیے جو محلی رحمہ اللہ نے سورۃ القارعۃ میں لکھی ہے۔ وہاں یوں کہا کہ جملۂ ﴿ مَا الْقَارِعَةُ ﴾ محلِ نصب میں ہے، قائم مقام مفعول ثانی کے،[2] چنانچہ یہاں فعل کو دو مفعول کی طرف متعدی ٹھہرایا۔ اور امام سمین رحمہ اللہ نے جو یہاں اور سورۃ الانبیاء میں کہا ہے، اس کی غایت یہ ہے کہ جملۂ ﴿ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ﴾ فعل سے محلِ نصب میں ہے ﴿ لَعَلَّ ﴾ سے تعلیق فعل کے سبب سے اور یہ نہیں ذکر کیا کہ وہ ایک مفعول کے قائم مقام ہے یا دو کے۔ حاصل یہ ہے کہ محلی رحمہ اللہ کے دونوں کلاموں میں مخالفت ہے۔ واللہ أعلم.

معنی یہ ہیں: کون سی چیز تجھ کو کرتی ہے جاننے والا قیامت کا، عالم اس کے وقت کا شاید وہ قریب ہو، یعنی کوئی سبب نہیں ہے جو تجھ کو یہ جاننے کی طرف پہنچا دے کہ وہ قریب ہے مگر وہ وحی جو تجھ پر نازل کی جاتی ہے۔ ﴿ قَرِيْبٌ ﴾ کی تذکیر میں وجوہ ہیں: ایک وجہ یہ ہے کہ ساعت کی تانیث حقیقی نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قریب کا موصوف مقدر ہے: "أَيْ: شَيْءٌ قَرِيْبٌ". تیسری وجہ یہ ہے کہ اس کا فاعل محذوف ہے: "أَيْ: قَرِيْبٌ مَجِيْئُهَا أَوْ إِتْيَانُهَا". چوتھی وجہ یہ ہے کہ بہ معنی "ذات قرب" ہے۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ ساعت بہ معنی بعث ہے، جیسا کہ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: "لَعَلَّ الْبَعْثَ قَرِيْبٌ".[3] چھٹی وجہ یہ ہے کہ مضاف محذوف ہے: "أَيْ: لَعَلَّ مَجِيْءَ السَّاعَةِ قَرِيْبٌ". ساتویں وجہ یہ ہے کہ قریب مونث و مذکر دونوں کی صفت میں آتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٥٦] "بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک کام کرنے والوں کے نزدیک ہے۔"

یہ قول امام کسائی رحمہ اللہ کا ہے،[4] لیکن امام کرخی رحمہ اللہ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ قریب میں مذکر مونث برابر نہیں ہیں۔ اس لیے کہ یہاں فعیل بہ معنی فاعل ہے اور اس میں مذکر و مونث برابر نہیں ہوتا۔ خاکسار۔ عفا اللہ عنہ۔ نے اس کی پوری بحث کتاب "المبتکر في بیان المونث والمذکر" میں لکھی ہے جو ایک رسالے کی مثل ہے اور اس میں اکابر علماء کے اقوال نقل کیے ہیں۔

---

[1] تفسیر الجلالین (٦٤١/١) [2] تفسیر الجلالین (٨١٩/١) [3] معاني القرآن (٣٩٦/٤، ٣٩٧) [4] تفسیر القرطبي (١٥/١٦)

بالجملہ کہا ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے قیامت کا ذکر فرمایا اور آپ ﷺ کے پاس مشرکین کی ایک قوم تھی تو اس کی تکذیب کرنے کے لیے بولے وہ کب قائم ہو گی؟ اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اس قول کی صحت پر یہ جملہ دال ہے: ﴿ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ﴾ یعنی جلدی کرتے ہیں اس کی وہ لوگ جو اس پر ایمان نہیں لاتے۔ جلدی کرنا اس کے مذاق کے لیے اور اسے جھٹلانے کے لیے۔ چنانچہ وہ اس سے ڈرتے نہیں ہیں۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ﴾ اور جو اس پر ایمان لائے ہیں وہ اس کے آنے سے خائف ہیں، یعنی وہ اس کی جلدی نہیں کرتے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: اس لیے کہ وہ اس شے کو نہیں جانتے جس پر وہ اچانک آ جائیں گے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ ان سے محاسبہ ہو گا اور ان کو ان کے اعمال کی جزا دی جائے گی۔[1] ﴿ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ﴾ اور جانتے ہیں کہ وہ آنے والی ہے، اس میں کسی طرح کا شک نہیں ہے اور وہ ضرور ہی ہونے والی ہے۔ اسی کے مثل یہ آیت ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ٦٠] ''اور جو لوگ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل کپکپاتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔'' پھر اس میں جھگڑنے والوں یا شک کرنے والوں کی گمراہی بیان کی۔

ارشاد فرمایا: ﴿ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ ﴾. ﴿ يُمَارُوْنَ ﴾ یا تو ''مُمَارَاۃٌ'' سے ماخوذ ہے ''مُمَارَاۃٌ'' مخاصمہ اور مجادلہ کو کہتے ہیں۔ یا ''مِرْيَةٌ'' سے، ''مِرْيَةٌ'' بہ معنی شک و ریبت ہے، یعنی سنتے ہو! بے شک جو لوگ قیامت کے بارے میں جھگڑتے ہیں، یا شک کرتے ہیں، وہ البتہ ایسی گمراہی میں ہیں جو حق سے نہایت درجہ دور ہے، کیوں کہ انھوں نے ان دلیلوں میں غور و فکر نہ کیا جو اس پر ایمان لانے کی موجب ہیں اور ان کے مشاہدے میں ہیں، ان کی آنکھوں کے سامنے کھڑے ہیں، ان کی عقلیں ان کو سمجھتی ہیں، اگر وہ غور و فکر کرتے تو ضرور جان لیتے کہ جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا ہے وہ دہرانے پر بھی قادر ہے۔ کتابِ عزیز اور سنتِ مطہرہ اس کے واقع ہونے پر دال ہیں اور عقلیں اس بات پر گواہی دیتی ہیں کہ دارِ جزا کا ہونا ضروری ہے۔ بعث زیادہ تر محسوس چیزوں کے مشابہ ہے، لہٰذا جو کوئی بعث کے واقع ہونے کے بارے میں ایمان نہ لا سکا تو وہ اس سے دور کی چیز پر ایمان لانے سے اور دور ہو گا ﴿ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ ﴾ یعنی اللہ پاک اپنے بندوں پر بہت لطف اور نرمی والا ہے اور نہایت رحمت اور مہربانی کرنے والا ہے۔

امام مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نیک و بد کے ساتھ لطیف ہے، اس طرح سے کہ گناہوں کی وجہ سے بندوں کو بھوکا نہیں مارا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ لَطِيْفٌ ﴾ بہ معنی نیک و احسان کرنے والا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی رفیق ہے،[2] یعنی نرمی کرنے والا۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی ''حَفِي'' ہے، یعنی نہایت مہربان۔

[1] فتح القدير (٦٩٦/٤) [2] تفسير البغوي (١٨٩/٧)

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے پیش کیے جانے اور محاسبہ میں لطیف ہے۔[1] کسی نے کہا کہ منافع کے پہنچانے اور آزمائشوں کو پھیرنے میں لطیف ہے۔ کسی نے کہا: لطیف ہے ساتھ باریکیوں کے اس کا علم اور جرائم سے اس کا حلم عظیم ہوا۔ کسی نے کہا: لطیف وہ ہے جو مناقب کو پھیلاتا ہے اور مثالب یعنی عیوب کو چھپاتا ہے۔ یا اس شخص کو معاف فرماتا ہے یا درگزر کرتا ہے جس سے لغزش ہوگئی ہے، یا بندے کو کفایت سے زیادہ دیتا ہے اور اس کی طاقت سے کم اطاعت کی اس کو تکلیف دیتا ہے۔ جنید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اپنے دوستوں کے ساتھ لطیف ہے تو انھوں نے اس کو پہچانا اور اگر وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ لطف کرتا تو وہ اس کے منکر نہ ہوتے۔

امام جعفر صادق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کے ساتھ رزق میں دو وجہ سے لطف کرتا ہے: ایک تو یہ ہے کہ اس نے طیبات سے یعنی پاک اور حلال چیزوں سے تیری روزی ٹھہرائی۔ دوسرے یہ ہے کہ تجھ کو ایک ہی دفعہ نہیں دے دی کہ تو اس کو بے جا خرچ کر ڈالے۔ مطلب یہ ہے کہ ضرورت کے مطابق دیتا جاتا ہے۔ واقعی اس سے بڑھ کر اور کیا لطف اور مہربانی ہے۔ حسین بن الفضل نے کہا ہے کہ ان کے ساتھ قرآن میں اور اس کی تفصیل اور تفسیر میں لطیف ہے۔[2] کسی نے کہا: لطیف وہ ہے کہ خوف نہ کیا جائے، مگر اس کے عدل کا اور امید نہ رکھی جائے مگر اس کے فضل کی۔ کسی نے کہا: "هُوَ الَّذِيْ يُعِيْنُ عَلَى الْخِدْمَةِ وَيُكْثِرُ الْمِدْحَةَ" یعنی لطیف وہ ہے جو خدمت پر مدد کرتا ہے اور بہت مدح کرتا ہے۔ کسی نے کہا: "هُوَ الَّذِيْ لَا يُعَاجِلُ مَنْ عَصَاهُ وَلَا يَخِيْبُ مَنْ رَجَاهُ" یعنی جو اس کی نافرمانی کرتا ہے، اس پر عذاب کی جلدی نہیں فرماتا اور جو اس سے اُمید رکھتا ہے، اس کی امید کو ضائع نہیں کرتا۔ کسی نے کہا: وہ ہے کہ اپنے سائل کو رد نہیں کرتا اور اپنے امیدوار کو ناامید نہیں کرتا۔ کسی نے کہا: وہ ہے جو رحم کرتا ہے اس شخص پر جو اپنی جان پر رحم نہیں کرتا۔ کسی نے کہا: "هُوَ الَّذِيْ أَوْقَدَ لِلْعُلَمَاءِ مِنَ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ سِرَاجًا وَجَعَلَ لَهُمُ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ وَالدِّيْنَ الْقَيِّمَ مِنْهَاجًا، وَأَنْزَلَ لَهُمْ مِنْ سَحَائِبِ بِرِّهٖ وَمَنِّهٖ وَلُطْفِهٖ وَكَرَمِهٖ وَإِحْسَانِهٖ مَاءً ثَجَّاجًا" یعنی وہ ہے جس نے علماء کے لیے کتاب و سنت سے چراغ روشن کیا اور ان کے لیے سیدھی راہ کو اور دین کو چلنے کا مضبوط راستہ ٹھہرایا اور ان کے لیے اپنی بر و احسان و لطف و کرم کی بدلیوں سے خوب برسنے والا پانی اتارا۔ کسی نے کہا: وہ ہے جو قلیل عمل کو قبول کرتا ہے اور عطا کرتا ہے کثیر۔ کسی نے کہا: "هُوَ الَّذِيْ يَجْبُرُ الْكَسِيْرَ وَيُيَسِّرُ الْعَسِيْرَ" یعنی وہ ہے جو ٹوٹے ہوئے کو جوڑتا ہے اور مشکل کو آسان کرتا ہے۔ محمد بن علی کتانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لطیف وہ ہے کہ جس نے اس کے بندوں میں سے اس کی پناہ پکڑی جب وہ مخلوق سے ناامید ہوا تو اس پر بھروسا کیا اور اس کی طرف رجوع ہوا۔ چنانچہ اس وقت وہ اس کو قبول کرتا ہے اور اس پر متوجہ ہوتا ہے۔[3]

---

[1] تفسير القرطبي (١٦/١٦) [2] تفسير القرطبي (١٦/١٦۔ ١٧) [3] تفسير القرطبي (١٦/١٧) .

حدیث شریف میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ پرانی قبروں پر مطلع ہوتا ہے۔ پھر اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ ان کے آثار مٹ گئے اور ان کی صورتیں مضمحل ہوگئیں اور باقی رہا ان پر عذاب اور میں لطیف ہوں اور میں ارحم الراحمین ہوں تخفیف کروان سے۔[1] اس کے سوا کچھ اور بھی کہا ہے۔ حاصل معنی یہ ہے کہ اللہ پاک اپنے بندوں پر ان کے کل امور میں اپنا لطف جاری رکھتا ہے۔

من جملہ اس کے وہ رزق اور روزی ہے جس سے دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں اور یہ معنی ہیں اس قول کے: ﴿ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ یعنی ان میں سے جس کو چاہتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے روزی دیتا ہے۔ چنانچہ ایک پر تو فراخی کرتا ہے اور دوسرے پر تنگی۔ مال کے ساتھ کسی قوم کو فضیلت دینے میں حکمت ہے، تاکہ بعض بعض کی طرف محتاج ہوں، جیسا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ﴾ [الزخرف: ٣٢] ''تاکہ ایک دوسرے کو ماتحت کرلے۔'' اور یہ بندوں پر ایک لطف ہوا تاکہ غنی کی فقیر کے ساتھ آزمائش کرے اور فقیر کی غنی کے ساتھ۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ روزی دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور جو چاہتا ہے مختلف قسم کی روزیوں سے۔ چنانچہ وہ اگرچہ ہر جاندار کو روزی دیتا ہے، لیکن اس نے مرزوقین (رزق دیے گئے) کے درمیان رزق میں کمی بیشی اور جنس اور قسم کا فرق رکھا ہے، کسی حکمت کے لیے جس کو وہی جانتا ہے۔

پھر فرمایا: ﴿ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴾ یعنی وہ عظیم قوت والا اور ظاہر و باہر قدرت والا ایسا غالب ہے کہ ہر شے پر وہی غالب ہوتا ہے اور کوئی شے اس پر غالب نہیں ہوتی۔ پھر جب اللہ پاک یہ بیان کر چکا کہ وہ بندوں پر لطیف و مہربان ہے، بہت زیادہ اچھائی اور احسان کرنے والا ہے تو اس طرف اشارہ کیا کہ انسان جب تک دارِ کسب و اختیار، یعنی دنیا میں ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ بھلائیوں کے طلب کرنے میں اور برائیوں سے بچنے میں سعی و کوشش کرے، کیونکہ اس کا لطف و احسان اگرچہ بندے کی سعی و عمل کے مطابق مقدر نہیں، مگر اس کی عادت اس بات پر جاری ہوئی ہے کہ اس کو بندے کی سعی و کسب کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔[2] چنانچہ ارشاد فرمایا:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝۲۰ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ

[1] ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے، البتہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر (١٦/ ١٧) میں بغیر سند کے اسی طرح ذکر کیے ہیں۔

[2] فتح البیان (١٢/ ٢٨٧۔ ٢٩٢)

وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾ تَرَى الظّٰلِمِيْنَ
مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ
ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۲۲﴾

جو شخص آخرت کی کھیتی چاہتا ہے، ہم اس کے لیے اس کی کھیتی میں اضافہ کرتے ہیں اور جو شخص دنیا کی کھیتی چاہتا ہے، ہم اسے اس میں سے کچھ دے دیتے ہیں اور اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ⑳ کیا ان کے لیے (اللہ کے سوا) شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے وہ دین مقرر کیا ہے جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا؟ اور اگر (وعدے کے دن) فیصلہ کرنے کی بات نہ ہوتی تو اُن کے درمیان یقیناً (فوراً ہی) فیصلہ کر دیا جاتا اور بلاشبہ ظالم لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے ㉑ آپ ظالموں کو دیکھیں گے وہ ان (عملوں کی سزا) سے ڈر رہے ہوں گے جو انھوں نے کمائے، جب کہ وہ (سزا) ان پر آ کر رہے گی اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، وہ جنت کے باغات میں ہوں گے، ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ (سب کچھ) ہوگا جو وہ چاہیں گے، یہی بہت بڑا فضل ہے ㉒

دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کا رزق کی تقسیم کرنا:

جو دنیا کے لیے محنت کرے اس کو اپنی محنت کے مطابق ملے، پھر اس محنت کا آخرت میں فائدہ نہیں ہے۔ فیصلے کا وعدہ ہے اپنے وقت پر۔ انتھٰی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یعنی جو کوئی آخرت کے عمل کا ارادہ کرے تو ہم اس کو قوت دیں اور اس عمل پر اس کی اعانت کریں جس کو کرنے کے لیے وہ تیار ہو رہا ہے اور ہم اس کے بڑھنے کو بہت کریں اور ہم اس کی ایک نیکی کا بدلہ اس کا دس گنا دیں، بلکہ سات سو گنا تک، اس تک جس کو اللہ چاہے۔ ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جس کی سعی اس لیے ہو کہ اس کو دنیا سے کوئی شے حاصل ہو جائے اور آخرت کی طرف بالکل اس کو کوئی قصد اور فکر نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو آخرت سے محروم کرے گا اور اگر چاہے گا تو دنیا سے اس کو کچھ دے گا اور اگر نہ چاہے گا تو نہ یہ اس کو حاصل ہوگی اور نہ وہ، اور اس نیت سے دنیا اور آخرت میں خسارے میں رہے گا۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ اس جگہ یہ آیت اس آیت کے مطابق ہے جو سورت سبحان میں ہے، یعنی قولہ تبارک و تعالیٰ: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا﴾ [بني إسرائيل: ١٨۔ ٢١] ’’جس کا ارادہ صرف اس جلدی والی دنیا (فوری فائدہ) کا ہی ہو اسے ہم یہاں جس قدر جس کے لیے چاہیں سرِ دست دیتے ہیں بالآخر اس کے لیے ہم جہنم مقرر کر دیتے ہیں جہاں وہ برے حالوں دھتکارا ہوا داخل ہوگا۔ اور جس کا ارادہ آخرت کا ہو اور جیسی کوشش اس کے لیے ہونی چاہیے، وہ کرتا بھی ہو اور وہ با ایمان بھی ہو، پس یہی لوگ ہیں جن کی کوشش کی اللہ کے ہاں پوری قدر دانی کی جائے گی۔ ہر ایک کو ہم بہم پہنچائے جاتے ہیں انھیں بھی اور انھیں بھی تیرے پروردگار کے انعامات میں سے تیرے پروردگار کی بخشش رکی ہوئی نہیں ہے۔‘‘ ثوری نے عن مغیرۃ عن ابی العالیہ عن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بشارت دے اس امت کو سنا (روشنی)، بلندی، نصرت اور زمین میں غلبے کی۔ چنانچہ جو کوئی ان میں دنیا کی خاطر آخرت کے عمل کرے تو اس کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں ہوگا۔[1]

غیر اللہ کی دین سازی شرک ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اس دینِ قدیم کی پیروی نہیں کرتے جس کو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے مشروع کیا ہے، بلکہ اس شے کا اتباع کرتے ہیں جس کو شیاطین نے ان کے لیے مشروع کیا ہے، وہ شیاطین جو جنوں اور انسانوں سے ہیں۔ یعنی بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ و حام کا حرام کرنا جن کو شیاطین نے ان پر حرام کیا ہے اور حلال کرنا مردار کے کھانے کا اور خون کا اور جوئے کا اور ان کے علاوہ اور گمراہی کے امور، مثلاً: حلال و حرام اور عباداتِ باطلہ و اموالِ فاسدہ کے بارے میں جہالتِ باطل جن کو انھوں نے اپنی جاہلیت میں اختراع کر لیا تھا۔ صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: میں نے عمرو بن لحی بن قمعہ کو دیکھا کہ وہ اپنی آنتیں آگ میں کھینچ رہا ہے، اس لیے کہ پہلے پہل اسی نے سانڈ چھوڑے۔[2] یہ شخص خزاعہ کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا اور اسی نے سب سے پہلے یہ چیزیں کیں اور اسی نے قریش کو بتوں کی عبادت پر آمادہ کیا۔ لعنه الله وقبحه. اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: ﴿وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ﴾ یعنی اگر نہ ہوتی فیصلے کی بات، یعنی اگر قیامت کے دن تک مہلت دینا نہ ہوتا جو پہلے سے طے ہو چکا ہے تو جلدی سے ان پر عذاب ڈال دیا جاتا۔

---

① مسند أحمد (١٣٤/٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٨٢٥)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٥٦)

﴿ وَاِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴾ یعنی ظالموں کے لیے جہنم میں سخت درد دینے والا عذاب ہے اور لوٹ کر جانے کی بری جگہ ہے۔ پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ تَرَى الظّٰلِمِیْنَ مُشْفِقِیْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ﴾ یعنی تو قیامت کے عرصات میں دیکھے گا کہ ظالم اپنی کمائی سے ڈرتے ہوں گے اور وہ جس شے سے ڈرتے ہوں گے، وہ ان پر ضرور پڑنی ہے۔ یہ قیامت کے دن ان کا حال ہے اور وہ اس خوف و ہراس میں ہوں گے۔ اب مومنوں کے ٹھاٹھ کے متعلق سنو۔

﴿ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ سو یہ کہاں اور وہ کہاں۔ یعنی کہاں وہ شخص جو عرصاتِ حشر میں ذلت وخواری اور خوف میں پڑا ہے اور یہ ذلت وخوف اس کے ظلم کو اس پر ثابت کر رہا ہے اور کہاں وہ شخص جو جنتوں کے چمنوں میں ہے اور کھانے پینے، پہننے، رہنے، بسنے، دیکھنے، جماع کرنے، لذت کی اشیاء میں خود مختار ہے، جو چاہتا ہے، وہ کرتا ہے۔ ایسے مزے کے ساز و سامان میں ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی بشر کے دل میں اس کا خیال گزرا۔ حسن بن عرفہ نے ابوطیبہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ بے شک اہلِ جنت کے شراب پینے والوں کی ایک جماعت پر ایک بدلی سایہ کرے گی۔ پھر ان سے پوچھے گی: میں تم پر کیا برساؤں؟ کہا: پھر اس قوم میں سے ہر ایک مانگنے والے پر وہ بدلی وہی چیز برسائے گی جو وہ مانگے گا، یہاں تک کہ ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ ہم پر کواعبِ اتراب برسادے، یعنی سینہ اُبھری ہوئی ہم سن عورتیں۔[1] (رواه ابن جرير عن الحسن بن عرفة به) اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِیْرُ ﴾ یعنی یہی ہے عظیم کامیابی اور مکمل نعمت اور نعمتِ شامل وکامل و عام۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ "حَرْثَ" لغت میں بہ معنی "کسب" ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "هُوَ يَحْرُثُ لِعِيَالِهِ وَيَحْتَرِثُ أَيْ: يَكْتَسِبُ" یعنی فلاں شخص اپنے بال بچوں کے لیے کمائی کرتا ہے۔ اسی معنی میں مرد کو حارث کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ کماتا ہے۔ اصل میں ﴿ حَرْثَ ﴾ کے معنی زمین میں بیج ڈالنے کے ہیں۔ پھر اعمال کے ثمرات اور فوائد پر ﴿ حَرْثَ ﴾ کا اطلاق کیا گیا۔ بطور استعارہ اعمال کی تشبیہ بیج سے دی اور ثمراتِ اعمال کی تشبیہ غلہ سے دی جو بیج بونے سے حاصل ہوتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جو کوئی اپنے اعمال وکسب سے ثوابِ آخرت کا ارادہ کرے تو اللہ اس کے لیے اس کی نیکی کو اس کے دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک بڑھا دے گا۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ اس کی توفیق اور اعانت میں زیادتی کرے گا اور اس کے لیے خیر کی راہیں آسان کر دے گا۔ اور جو کوئی اپنے اعمال اور کسب سے ثوابِ دنیا کا ارادہ کرے، یعنی متاعِ دنیا کا اور اس میں سے وہ شے جو

[1] تفسير الطبري (٦٤٢/٢١) [2] تفسير ابن كثير (١٣٩/٤-١٤٠)

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو روزی دیتا ہے وہ مقصود ہو اور وہ دنیا کو آخرت پر اختیار کرنے والا ہے تو ہم اس کو اس میں سے وہ شے دیں گے جس کے متعلق ہماری مشیت جاری ہو چکی ہے اور ہماری قضا وقدر میں وہ چیز لکھی جا چکی ہے، اگر وہ اس میں سستی کرتا اور اس کو طلب نہ کرتا تو البتہ وہ اس کے پاس آتی۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ہم اس کے لیے وہ شے مقدر کریں جو اس کے لیے قسمت کی گئی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ ﴾ [بني إسرائيل: ١٨] ''اسے ہم جلدی سے جتنا چاہیں دے دیں۔'' امام قتادہ رحمہ اللہ نے یہ بھی کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت کی نیت پر امرِ دنیا سے وہ جو چاہتا ہے دیتا ہے اور دنیا کی نیت پر صرف دنیا ہی دیتا ہے۔ امام قشیری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ آیت کافر کے بارے میں ہے، حالاں کہ یہ کہنا تخصیص بغیر مخصص کے ہے۔[1]

پھر اللہ پاک نے بیان کیا کہ یہ شخص جو اپنے عمل سے دنیا کا ارادہ کرتا ہے، اس کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴾ اس لیے کہ اس نے آخرت کے لیے عمل نہیں کیا تو اب اس کے لیے اس میں کچھ حصہ نہیں ہے۔ سورۃ الاسراء میں اس کی تفسیر گزر چکی ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ آخرت کا حرث (کھیتی) آخرت کی عیش ہے اور فرمایا کہ جو شخص اپنی دنیا کو اپنی آخرت پر اختیار کرتا ہے تو اللہ اس کے لیے آخرت میں سوائے آگ کے کوئی حصہ نہیں کرتا اور وہ شخص اس کے سبب سے دنیا میں سے کوئی چیز زیادہ نہیں کر سکتا، مگر اپنا رزق جو پہلے سے اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔[3] سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس اُمت کو زمین میں روشنی اور رفعت اور مدد اور غلبے کی بشارت دی، جب تک انھوں نے آخرت کے عمل سے دنیا طلب نہ کی، پھر ان میں سے جس کسی نے آخرت کا عمل دنیا کے لیے کیا تو اس کے لیے آخرت سے کچھ حصہ نہ ہو گا۔[4] (أخرجه الإمام أحمد والحاكم وصححه وابن مردويه وابن حبان) یہ حدیث شریف پہلے گزر چکی ہے۔ لیکن وہ ناقص تھی اور یہ کامل ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ... الآية ﴾ پڑھی، پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے ابن آدم! تو میری عبادت کے لیے فارغ ہو جا، میں تیرے سینے کو غنا سے بھر دوں گا اور تیرے فقر کو بند کر دوں گا اور اگر تو نہ کرے گا تو تیرے سینے کو شغل سے بھر دوں گا اور تیرے فقر کو بند نہ کروں گا۔[5] (أخرجه الحاكم وصححه والبيهقي في الشعب) سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ﴿ حَرْثَ ﴾ دو قسم کی ہے۔ دنیا کی حرث تو مال اور اولاد ہیں اور آخرت کی حرث باقیاتِ صالحات ہیں۔[6] (أخرجه ابن أبي الدنيا وابن عساكر)

---

(1) فتح القدير (٤/٦٩٨) (2) رقم الآية (١٨) (3) الدر المنثور (٧/٣٤٣) (4) اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

(5) مستدرك الحاكم (٢/٤٨١) شعب الإيمان (٧/٢٨٨) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

(6) تاريخ دمشق (٤٢/٥٠٢، ٥٠٣) الدر المنثور (٧/٣٤٤)

باقیاتِ صالحات سے مراد اعمالِ صالحہ ہیں جن کا ثواب باقی رہتا ہے اور "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ" کہنا ہے۔

بالجملہ امورِ دنیا و آخرت میں جو قانون تھا، جب اللہ پاک نے اس کو بیان کیا تو اس کے بعد وہ گناہِ عظیم بیان فرما دیا جو آگ کو واجب کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ﴾ کلمہ ﴿اَمْ﴾ منقطعہ بہ معنی "بل" ہے یا متصلہ ہے اور ہمزۂ استفہام کے مساوی ہے۔ تقدیر یہ ہے: "أَيَقْبَلُوْنَ مَا شَرَعَ اللّٰهُ مِنَ الدِّيْنِ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ أَيْ: آلِهَةٌ" کسی نے کہا ہے کہ ﴿اَمْ﴾ بہ معنی "بَلْ" ہے جو انتقال کے لیے ہے اور بہ معنی ہمزہ جو ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ہوتا ہے اور ﴿شَرَعُوْا﴾ کی ضمیر ﴿شُرَكٰٓؤُا﴾ کی طرف اور ﴿لَهُمْ﴾ کی ضمیر کفار کی طرف لوٹ رہی ہے۔ کسی نے اس کے برعکس کہا ہے لیکن پہلا قول صحیح ہے۔

غرضیکہ ﴿اَمْ﴾ میں تین قول ہوئے۔ پہلے قول کی بنا پر تو یوں کہیں گے کہ پہلے ایک مضمون بیان کیا۔ پھر اس سے ہٹ کر دوسرا مضمون بیان کیا۔ دوسرے قول کی بنا پر معنی یہ ہیں: کیا وہ قبول کرتے ہیں وہ دین جو اللہ نے مشروع کیا ہے، یا ان کے کوئی اور معبود ہیں۔ تیسرے قول کی بنیاد پر یہ معنی ہیں کہ پہلے کلام سے ہٹ کر دوسرا کلام بیان کیا اور اُن کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے لیے یوں فرمایا: کیا ان کے لیے معبود ہیں، جنھوں نے ان کے لیے ایسا دین نکالا، جس کا اللہ تعالیٰ نے اذن نہیں دیا۔ مراد شرک اور معاصی ہیں اور گمراہ کرنے والے طریقے اور قاعدے اور قیامت کا انکار اور دنیا کے لیے عمل کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دین کے امور نہیں ہیں، بلکہ دین و دنیا کو بگاڑنے والے امور ہیں، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے جو دین مقرر کرے۔ سوالیہ انداز سے خطاب کرنے کا مقصد صرف ان کو سرزنش کرنا ہے۔ یہ آیت عام طور پر ہر اس شے کو شامل ہے جس کا اللہ پاک نے حکم نہیں کیا اور نہ ہی اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے۔

﴿وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ﴾ کلمۂ فصل سے مراد ان کے عذاب میں تاخیر کرنا ہے، اس لیے کہ ﴿بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ﴾ [القمر: ٤٦] فرمایا ہے۔ ﴿بَيْنَهُمْ﴾ کی ضمیر مومنین اور مشرکین کی طرف راجع ہے یا مشرکین اور شرکاء کی طرف راجع ہے۔ ﴿وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ کو جمہور نے بہ کسرِ ﴿اِنَّ﴾ پڑھا ہے بنا بر استیناف اور امام مسلم، اعرج اور ابن ہرمز نے بالفتح پڑھا ہے بنا بر عطف بر ﴿كَلِمَةُ الْفَصْلِ﴾[1]

("أي: لولا كلمة الفصل وتقدير عذاب الظالمين في الآخرة لقضي بينهم في الدنيا فإن العذاب الأليم غالب في عذاب الآخرة"[2]. قاله القاضي) یعنی قضائے الٰہی میں ان کا عذاب قیامت کے دن پر موقوف نہ رکھا جاتا تو دنیا ہی میں مومنوں اور مشرکوں کے درمیان یا مشرکین اور شرکاء کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور ان پر

[1] فتح القدير (٦٩٨/٤) [2] تفسير البيضاوي (١٢٧/٥)

جلدی سے سزا آ جاتی، کیوں کہ ان کے کام اسی کے مقتضی تھے اور مشرکوں، کافروں اور جھٹلانے والوں کے لیے دنیا اور آخرت میں سخت دردناک عذاب ہے۔

﴿ كَلِمَةُ الْفَصْلِ ﴾ سے مراد اگر عذاب کو روزِ قیامت تک مؤخر کرنا ہے تو ﴿ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ سے مراد آخرت کا عذاب ہے اور اگر ﴿ كَلِمَةُ الْفَصْلِ ﴾ سے مراد دنیا کے عذاب میں تاخیر ہے تو ﴿ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ سے مراد دنیا اور آخرت کا عذاب ہوگا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ أَيْ: أَلَهُمْ شُرَكَاءُ"۔ حرفِ میم صلہ ہے، یعنی زائد ہے اور ہمزہ ڈرانے اور ملامت کرنے کے لیے ہے اور یہ ﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا ﴾ اور ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ﴾ سے متصل ہے۔ وہ لوگ اس پر ایمان نہیں لاتے تھے، سو کیا ان کے معبود ہیں جنھوں نے ان کے لیے شرک کا طریقہ نکالا، جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا اور جب یہ محال ہے تو اللہ پاک نے شرک کو مشروع نہیں کیا، پھر وہ کہاں سے اس کو دین ٹھہراتے ہیں۔[1] بالجملہ چونکہ عذابِ الیم غالباً عذابِ آخرت میں آتا ہے، اس لیے آخرت میں فریقین کا جو حال ہوگا اس کو بطور استیناف بیان کیا۔

پھر کفار کے حال سے ابتداء کی تو فرمایا: ﴿ تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ﴾ یہ ہر اس شخص کو خطاب ہے جو دیکھ سکتا ہے۔ ﴿ هُوَ ﴾ کی ضمیر ﴿ مِمَّا كَسَبُوْا ﴾ کی طرف راجع ہے بہ تقدیرِ مضاف۔[2] (کما قاله الزجاج) "أَيْ: وَجَزَاءُ مَا كَسَبُوْا" اور ﴿ وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ﴾ جملہ حالیہ ہے، یعنی اے دیکھنے والے! تو ظالموں کو قیامت کے دن دیکھے گا کہ وہ ان گناہوں سے ڈر رہے ہوں گے جو انھوں نے دنیا میں کیے تھے، اس حال میں کہ ان گناہوں کی جزا ان پر ضرور نازل ہونے والی ہے، وہ ڈریں یا نہ ڈریں۔ واللّٰه أعلم.

مطلب یہ ہے کہ خوف وہ غم ہے جو کسی ناپسندیدہ چیز کی توقع سے انسان کو لاحق ہوتا ہے، پھر وہ اس کو دور کرنے کی فکر میں رہتا ہے اور بسا اوقات اس سے رہائی پا جاتا ہے۔ سو ظالموں کا قیامت کے دن اپنے اعمال کی جزا ملنے سے ایسا خوف نہیں ہے کہ اس کو دور کرنے کی فکر کر کے اس سے بچا جا سکے، وہ جزا تو ضرور ملنی ہیں، وہ ڈریں یا نہ ڈریں۔ اس سے کسی طرح بھی رہائی ممکن نہیں ہے۔ یا یوں کہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے حال سے تعجب دلاتا ہے کہ اے مخاطب! بڑے تعجب کی بات ہے کہ تو ظالموں کو اپنے اعمالِ بد کی جزا ملنے سے ڈرتے ہوئے دیکھے گا اس حال میں کہ وہ جزا ان پر نازل ہو رہی ہوگی، اس وقت ڈرنے سے کیا فائدہ! ڈرنے کی جگہ تو دنیا تھی، جب وہاں نہ ڈرے تو قیامت میں جزا ملنے کی حالت میں ڈرنے سے کیا ہوتا ہے، ڈرنا نہ ڈرنا دونوں برابر ہیں۔

پھر مومنین کا حال ذکر فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ﴾ موصول مبتداء

---

[1] تفسير القرطبي (١٦/١٩) [2] فتح القدير (٤/٦٩٨)

ہے اور جار و مجرور اس کی خبر ہے۔ ﴿رَوْضٰتِ﴾ "رَوْضَةٌ" کی جمع ہے۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لغتِ کثیرہ واؤ کا سکون ہے اور ہذیل کی لغت واؤ کا فتح ہے۔[1] روضہ وہ جگہ ہے جس میں سبزی و تازگی بہت ہوتی ہے۔ سورت روم میں اس کی تفسیر گزر چکی ہے۔[2] "رَوْضَةٌ" جنت کا خوبصورت اور پاکیزہ مسکن ہے جس طرح کہ دنیا کا روضہ اس کے بہترین مکانات سے ہے۔ اس میں اس بات سے آگاہی ہے کہ مسلمین عاصین اہلِ جنت میں سے ہیں، کیوں کہ مومنین جو صالح اعمال والے ہیں، ان کو اس بات کے ساتھ خاص کیا گیا کہ وہ روضاتِ جنات میں ہیں اور جنت کے روضات تو بہت عمدہ اور عزت والی جگہیں ہیں اور ضروری ہے کہ جو جگہیں ان اوصاف سے کم درجے کی ہیں، وہ ان لوگوں کے لیے مخصوص ہوں جو صالح اعمال والے مومنوں سے کم درجے کے ہیں۔ معتزلہ سے کہو کہ دیکھو جناب حافظ شیراز رحمہ اللہ کیا خوب فرماتے ہیں:

رقیب در گزر و بیش ازیں مکن نخوت — کہ ساکنانِ در دوست خاکسارانند

نصیب ماست بہشت اے خدا شناس برو — کہ مستحق کرامت گناہگارانند

"اے رقیب! درگزر کر اور اس سے زیادہ تکبر مت کر کہ محبوب کے دروازے پر ٹھہرنے والے لوگ نہایت متواضع اور عاجز اور غریب لوگ ہیں۔ اے خدا کو پہچاننے والے جا کہ بہشت تو ہمارا نصیب ہے، کیوں کہ نوازش کے حقدار تو گناہ گار ہوتے ہیں۔"

غرضیکہ عیش و آرام یہی ہے کہ مکان نفیس ہو اور لذت کی سب اشیاء مہیا ہوں۔ چنانچہ فرمایا کہ رہنے بسنے کے لیے جنت کے چمن ہیں اور کھانے پینے اور لذت لینے کی چیزوں کو ایسے مختصر اور جامع بیان سے ادا فرما دیا کہ اس سے بہتر کسی چیز کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ﴿لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ یعنی ان کے لیے قسم قسم کی نعمتیں اور طرح طرح کی لذت دینے والی چیزیں جو وہ چاہیں اپنے رب کے پاس موجود ہیں۔ کلمہ ﴿عِنْدَ﴾ ظرف ہے ﴿يَشَآءُوْنَ﴾ کا، یا استقرار کا جو عامل ہے ﴿لَهُمْ﴾ میں، اور عندیت مجازی ہے۔ قاضی صاحب مرحوم کا مختار دوسرا قول ہے۔[3]

پھر فرمایا: ﴿ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ﴾ یعنی یہ عیش و عشرت کا ساز و سامان جس کا مومنین کے واسطے ذکر کیا گیا، یہی بڑا فضل ہے جس کا نہ بیان ہو سکتا ہے اور نہ عقلیں اس کی صفت کی حقیقت تک پہنچ سکتی ہیں۔ بھلا جب حق تعالیٰ ﴿الْكَبِيْرُ﴾ فرمائے تو پھر اس کی قدر و منزلت کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ شیخ فرماتے ہیں: یہ اس بات کی تصریح ہے کہ عمل صالح کی جو جزا مقرر ہوئی اس کا حصول اللہ کے فضل سے ہوا نہ کہ بطور استحقاق کے۔[4] اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا بِمَحْضِ فَضْلِكَ وَفَتْحِ مِنْكَ وَصَرْفِ كَرَمِكَ يَا سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا وَمَا ذٰلِكَ عَلَيْكَ بِعَزِيْزٍ آمین.

---

[1] البحر المحيط (٤٩٣/٧) [2] رقم الآية (١٥) [3] فتح القدير (٦٩٩/٤) [4] فتح البيان (٢٩٣/١٢-٢٩٦)

ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ
قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ
وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
شَكُوْرٌ ﴿۲۳﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ
يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ؕ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ
الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ ۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۴﴾

یہی (فضل) ہے جس کی اللہ اپنے ان بندوں کو بشارت دیتا ہے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے۔ (اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: میں تم سے اس (تبلیغ رسالت) پر کسی صلے کا سوال نہیں کرتا، مگر قرابت داری کی محبت (ضرور چاہتا ہوں۔) اور جو شخص کوئی نیکی کماتا ہے تو ہم اس کے لیے اس میں بھلائی بڑھا دیتے ہیں۔ بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت قدردان ہے ﴿23﴾ کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اللہ پر جھوٹ گھڑ لیا ہے۔ سو اگر اللہ چاہے تو آپ کے دل پر مہر لگا دے۔ اور اللہ باطل کو مٹاتا ہے اور حق کو اپنے کلمات کے ذریعے سے ثابت کرتا ہے۔ بلاشبہ وہ سینوں کے راز خوب جانتا ہے ﴿24﴾

مومنوں کے لیے جنت کی نعمتوں کی خوش خبری:

اس پر میں تجھ سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا، یعنی قرآن پہنچانے پر اجرت نہیں مانگتا مگر قرابت کی دوستی چاہتا ہوں، یعنی میں ذات میں تمھارا بھائی ہوں مجھ سے بدی نہ کرو۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے تو اللہ اپنے اوپر کسی کو جھوٹ بولنے کیوں دے، وہ دل کو بند کر دے اس دل میں کوئی مضمون ہی نہ آئے جس کو باندھے اور چاہے تو بغیر پیغام بھیجے کفر کو مٹا دے مگر وہ اپنی باتوں سے دین کو ثابت کرتا ہے، اس لیے نبی پر کلام بھیجتا ہے۔ انتھٰی.

اللہ پاک نے جو ذکر فرمایا کہ صالح عمل کرنے والے مومنوں کے لیے روضاتِ جنات ہیں تو اس کی طرف اشارہ کر کے فرماتا ہے: ﴿ ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ ﴾ یعنی یہ ان کو ضرور حاصل ہوگا، اس وجہ سے کہ اللہ پاک نے ان کو بشارت دی ہے۔

﴿ اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ﴾ کا مطلب ومفہوم:

قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ﴾ یعنی اے محمد! تو ان کفارِ قریش کے مشرکوں سے کہہ دے کہ میں تم سے اس رسالت کے پہنچانے پر اور تمھاری خیر خواہی کرنے پر تم سے کچھ مال نہیں

مانگتا۔ میں تو تم سے یہ طلب کرتا ہوں کہ اس قرابت کے سبب سے جو میرے اور تمھارے درمیان ہے، تم اپنے شر کو مجھ سے روکو اور مجھے چھوڑ دو کہ میں اپنے رب کی رسالتیں پہنچاؤں۔ اگر تم میری مدد نہ کرو تو مجھے ایذا بھی مت دو۔

مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں

''مجھے تیری طرف سے کسی خیر کی تو امید نہیں ہے، شر سے ہی رک جا۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ کسی نے ان سے ﴿ إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ ﴾ کے متعلق پوچھا تو امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ بول اٹھے کہ ''قُرْبٰی آلِ مُحَمَّدٍ ﷺ''۔ تو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تو نے جلدی کی۔ قریش میں سے کوئی بطن نہ تھا جس کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی قرابت نہ ہو۔ چنانچہ فرمایا: مگر یہ کہ اس قرابت کو ملاؤ جو میرے اور تمھارے درمیان ہے۔[1] (انفرد به البخاري و رواه الإمام أحمد عن يحيى القطان عن شعبة به وهٰكذا روى عن عامر الشعبي والضحاك وعلي بن أبي طلحة والعوفي و يوسف بن مهران وغير واحد عن ابن عباس ﷺ مثله و به قال مجاهد و عكرمة و قتادة والسدي وأبو مالك و عبدالرحمن بن زيد بن أسلم وغيرهم)[2]

حافظ ابو القاسم طبرانی رحمہ اللہ نے عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کوئی مزدوری، مگر صرف یہ کہ تم میری قرابت کی وجہ سے مجھ سے میرے نفس میں دوستی رکھو اور میرے اور تمھارے درمیان جو قرابت ہے اس کا خیال رکھو۔[3] امام احمد رحمہ اللہ نے عن مجاہد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ میں تمھارے پاس بینات اور ہدایت میں سے جو کچھ لایا ہوں، اس پر تم سے کچھ مزدوری نہیں مانگتا، مگر میرا تم سے صرف یہ مطالبہ ہے کہ تم اللہ سے دوستی رکھو اور اس کے ساتھ اس کی اطاعت کی بنا پر تقرب حاصل کرو۔[4] اسی طرح امام قتادہ رحمہ اللہ نے حسن بصری رحمہ اللہ سے اس کے مثل روایت کیا ہے[5] اور یہ گویا قولِ ثانی کے ساتھ تفسیر ہے۔ گویا یوں فرماتے ہیں: مگر یہ کہ تم اللہ کی اطاعت کے ساتھ عمل کرو جو تم کو اللہ کے نزدیک ہونے کا ایک درجہ قریب کرے۔ اور ایک تیسرا قول ہے: یہ وہ ہے جس کو امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ نے بروایت سعید بن جبیر حکایت کیا ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: اس کے معنی یہ ہیں کہ تم میرے ساتھ میری قرابت میں دوستی کرو، یعنی تم ان کے ساتھ احسان و نیکی کرو۔ امام سدی رحمہ اللہ ابو الدیلم رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب علی، یعنی امام زین العابدین رحمہ اللہ فرزندِ ارجمند سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو قید کر کے لائے اور دمشق کی راہ پر کھڑے کیے گئے تو اہلِ شام میں سے ایک ملعون شخص کھڑا ہوا اور کہا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ قَتَلَكُمْ وَاسْتَأْصَلَكُمْ وَقَطَعَ قَرْنَ الْفِتْنَةِ'' یعنی تعریف ہے اس اللہ کی جس نے تم کو قتل کیا اور تم کو جڑ سے اکھاڑ ڈالا اور فتنے کے سینگ کو کاٹ ڈالا۔ تو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٤١) مسند أحمد (٢٢٩/١) [2] تفسير الطبري (٥٢٥/٢١-٥٢٧)

[3] المعجم الكبير (٤٣٥/١١) [4] مسند أحمد (٢٦٨/١) اس کی سند میں ''قزعہ بن سوید'' ضعیف راوی ہے۔

[5] تفسير الصنعاني (١٩١/٣)

علی بن الحسن رحمہ اللہ نے اس سے فرمایا: کیا تو نے قرآن پڑھا ہے؟ وہ بولا: ہاں! فرمایا: کیا تو نے الٓ حٰمٓ پڑھی ہے؟ کہا: میں نے قرآن پڑھا ہے اور الٓ حٰمٓ نہیں پڑھی۔ فرمایا: تو نے نہیں پڑھا: ﴿ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ﴾، وہ بولا: "وَإِنَّكُمْ لَأَنْتُمْ هُمْ" یعنی وہ تمھیں ہو؟ فرمایا: ہاں۔ امام ابو اسحاق سبیعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے عمرو بن شعیب سے اس آیت کے متعلق پوچھا: تو کہا: "قُرْبَى النَّبِيِّ ﷺ"[1] (رواهما ابن جرير)

پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انصار نے کہا: "فَعَلْنَا وَفَعَلْنَا، وَكَأَنَّهُمْ فَخَرُوا"، یعنی ہم نے یہ کام کیا، وہ کام کیا، گویا اپنے کاموں پر فخر کیا تو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما یا عباس رضی اللہ عنہ بولے، (یہ شک عبدالسلام راوی کا ہے) فرمایا: "لَنَا الْفَضْلُ عَلَيْكُمْ" یعنی ہم کو تم پر فضیلت ہے۔ یہ بات رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ انصار کے پاس ان کی مجلسوں میں تشریف لائے۔ پھر فرمایا: اے گروہِ انصار! کیا تم ذلیل نہ تھے، پھر اللہ نے تم کو میری وجہ سے عزت دی؟ وہ بولے: کیوں نہیں یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم گمراہ نہ تھے، پھر اللہ نے میری وجہ سے تم کو ہدایت دی؟ بولے: کیوں نہیں یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا: پھر تم مجھ کو جواب نہیں دیتے ہو۔ انھوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم کیا کہیں؟ فرمایا: تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ تجھ کو تیری قوم نے نکالا اور ہم نے تجھے جگہ دی۔ کیا انھوں نے تجھ کو نہیں جھٹلایا اور ہم نے تیری تصدیق کی۔ کیا انھوں نے تجھ کو بے یار ومددگار نہیں چھوڑا، پھر ہم نے تیری مدد کی۔ پھر آپ ﷺ فرماتے رہے، یہاں تک کہ انصار گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور عرض کی کہ ہماری اولاد اور جو کچھ ہمارے ہاتھوں میں ہے، وہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ﴾.[2] (وكذا رواه ابن أبي حاتم عن علي بن الحسين عن عبد المؤمن بن علي عن عبد السلام عن يزيد بن أبي زياد وهو ضعيف بإسناده مثله أو قريبا منه وفي الصحيحين في قسم غنائم حنين قريب من هذا السياق ولكن ليس فيه ذكر نزول هذه الآية وذكر نزولها في المدينة فيه نظر لأن السورة مكية وليس يظهر بين هذه الآية و هذا السياق مناسبة. والله أعلم)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، کہا: جب یہ آیت اتری تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہیں؟ یعنی جن کی دوستی کا اللہ نے امر فرمایا ہے؟ فرمایا: «فَاطِمَةُ وَوَلَدُهَا»[3] یعنی فاطمہ اور اُن کی اولاد۔ یہ اسناد ضعیف ہے، اس میں ایک مجہول شخص غیر معروف ہے، وہ راوی ہے شیخ شیعی مخترق سے اور وہ حسین اشقر ہے اور اس کی خبر اس موقعے میں مقبول نہیں ہے اور نزولِ آیت کا ذکر مدینے میں

---

[1] تفسير الطبري (٥٢٩،٥٢٨/٢١)

[2] تفسير الطبري (٥٢٨/٢١) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٧٦/١٠) اس کی سند میں "یزید بن ابی زیاد" ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٧٦/١٠) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٩٧٤)

بعید ہے، اس لیے کہ سورت مکی ہے اور اس وقت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بالکل اولاد نہ تھی، کیوں کہ ان کا نکاح سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے جنگِ بدر کے بعد ۲ ہجری میں ہوا۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کی حقیقی تفسیر اس قول کے ساتھ ہے جس کے ساتھ حبرِ اُمت، ترجمان القرآن سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر کی ہے جس طرح کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان سے اس کو روایت کیا ہے[1] اور ہم اس کا انکار نہیں کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ بیت کی وصیت فرمائی ہے اور ان کے ساتھ احسان کرنے کا اور اُن کی عزت واکرام کرنے کا حکم دیا ہے، کیوں کہ وہ تو ذریتِ طاہرہ سے ہیں اور فخر وحسب ونسب کے لحاظ سے روئے زمین پر اشرف خاندان اور اشرف جسد سے ہیں، خصوصاً جبکہ وہ سنتِ نبویہ صحیحہ واضحہ جلیلہ کے متبع ہوں جس طرح کہ اُن کے سلف اس پر تھے، جیسے: عباس اور ان کے فرزند، سیدنا علی اور ان کے اہلِ بیت اور اولاد ـ رضي الله عنهم أجمعين.[2]

صحیحین میں ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غدیرِ خم میں دیے گئے اپنے خطبۂ مبارک میں فرمایا: «إِنِّي تَارِكٌ فِيكُنُ الثَّقَلَيْنِ: كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِي وَإِنَّهُمَا لَمْ يَتَفَرَّقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ»[3] یعنی بے شک میں چھوڑے جاتا ہوں تم میں دو گراں چیزیں: اللہ کی کتاب اور میری عترت، یعنی اولاد اور بے شک وہ جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر وراد ہوں گے۔ (غدير خم موضع بين مكة والمدينة تصب فيه عين هناك بينهما مسجد النبي صلی اللہ علیہ وسلم.[4] كذا في مجمع البحار) (کتاب اللہ وعترت کا نام ثقلین اس لیے رکھا گیا ہے کہ ان دونوں کو اَخذ کرنا اور ان پر عمل کرنا ثقیل ہے۔ ہر خطیر اور نفیس شے کو ثقل کہتے ہیں، اس لیے ان کی قدر و منزلت اور شان کی عظمت کے لیے ان دونوں کا نام ثقلین رکھا ہے۔[5] آدمی کی عترت اس کے خاص قریبی رشتے دار ہیں۔ یہ لوگ بنی عبد المطلب ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقرب اہلِ بیت۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد اور علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عترت اقرب وابعد، یعنی قریب کے اور دور کے رشتے دار۔[6] كذا في مجمع البحار. مخدوم جہانیاں رحمہ اللہ نے اپنے ملفوظ میں فرمایا ہے کہ میں نے عرب کے علماء سے سنا ہے کہ یہاں عترت سے مراد سنتِ مطہرہ ہے، کیوں کہ یہاں کتاب اللہ کا قرینہ موجود ہے۔ اس حدیث میں لفظِ سنت صاحبِ مشکاۃ نے بحوالۂ موطا ذکر کیا ہے۔[7] از مصحح سلمه الله تعالىٰ یاد آتا ہے کہ کسی حدیث میں « كِتَابُ اللّٰهِ

---

① اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ ② تفسیر ابن کثیر (١٤١/٤، ١٤٢)

③ صحیحین میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ہوا ہے، البتہ اس کے ہم معنی روایت صحیح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٨) میں مروی ہے

④ مجمع بحار الأنوار (١١٤/٢) ⑤ مجمع بحار الأنوار (٢٩٣/١، ٢٩٤)

⑥ مجمع بحار الأنوار (٥١٤/٣) ⑦ الموطأ (٨٩٩/٢)

وَسُنَّةُ نَبِيِّكُمْ» آیا ہے۔ واللہ أعلم۔ آپ کی سنتِ مطہرہ آپ کی اولاد کی طرح ہے۔ «لَمْ يَفْتَرِقَا» کے حوالے سے اصل تفسیر ابن کثیر میں "لم يفترقا" ہے اور ظاہری طور پر "لَنْ يَّتَفَرَّقَا" معلوم ہوتا ہے۔ واللہ أعلم)۔

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! قریش جس وقت ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو خوب خوش ہو کر ملتے ہیں اور جب ہم سے ملتے ہیں تو ایسے چہرے سے ملتے ہیں کہ جو ہم کو پہچانتا نہیں ہے۔ کہا: پس رسول اللہ ﷺ سخت خفا ہوئے اور فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، کسی مرد کے دل میں ایمان اس وقت تک داخل نہ ہوگا جب تک کہ تم کو اللہ اور اس کے رسول کے لیے دوست نہ رکھے۔[1] (اصل روایت میں "لَقُونا بوجه لا تعرفها" ۔ واللہ أعلم۔ اس کے معنی صحیح نہیں بنتے۔ ظاہر یہ ہے کہ "بوجه لا يعرفنا" ہو، یا "بوجوه لا تعرفنا" ہو)۔

پھر امام احمد رحمہ اللہ نے عبد المطلب بن ربیعہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہا: بے شک ہم نکلتے ہیں تو دیکھتے ہیں قریش کو کہ آپس میں باتیں کرتے ہیں، پھر جب ہم کو دیکھا تو خاموش ہو گئے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ خفا ہوئے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کی دونوں چشم مبارک کے درمیان ایک رگ ابھر آئی، پھر فرمایا: واللہ! کسی مردِ مسلمان کے دل میں ایمان داخل نہ ہوگا یہاں تک کہ تم کو اللہ کی خاطر اور میری قرابت کی وجہ سے دوست رکھے۔[2] امام بخاری رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، فرمایا: "اِرْقَبُوْا مُحَمَّدًا ﷺ فِيْ أَهْلِ بَيْتِهِ"[3] یعنی نگاہ رکھو، محافظت کرو رسول اللہ ﷺ کی، آپ کے اہلِ بیت میں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی وجہ سے آپ ﷺ کے اہلِ بیت کی عزت و احترام کرو، ان کی تعظیم کرنا آپ ﷺ کی تعظیم کرنا ہے۔ اسی لیے بزرگانِ دین اپنے استاد اور پیر کے سبب سے ان کی اولاد کی تعظیم و تکریم کیا کرتے تھے۔

صحیح میں ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: واللہ! البتہ رسول اللہ ﷺ کی قرابت مجھ کو میری اپنی قرابت سے زیادہ محبوب ہے کہ میں اس سے وصل کروں۔[4] سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا: واللہ! تیرا اسلام جس دن کہ تو اسلام لایا مجھے زیادہ محبوب تھا میرے باپ خطاب کے اسلام سے، اگر وہ اسلام لاتا، اس لیے کہ تیرا اسلام لانا رسول اللہ ﷺ کو خطاب کے اسلام لانے سے زیادہ محبوب تھا۔ چنانچہ ہر مسلمان پر یہی واجب ہے کہ اس کا حال شیخین (ابوبکر صدیق و عمر رضی اللہ عنہما) کے حال کی طرح ہو کہ وہ نبی کریم ﷺ کی قرابت کو

[1] مسند أحمد (۲۰۷/۱) اس کی سند میں 'یزید بن ابو زیاد' ضعیف راوی ہے۔
[2] مسند أحمد (۲۰۷/۱) اس کی سند میں 'یزید بن ابو زیاد' ضعیف راوی ہے۔
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۵۰۹)
[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۵۰۸)

آپ ﷺ کی وجہ سے کیسے محبوب رکھتے تھے کہ ان کو اپنے والد اور اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ نبیوں اور رسولوں کے بعد تمام مومنوں سے افضل ہوئے۔ رضي الله عنهما و عن سائر الصحابة أجمعين.

امام احمد رحمہ اللہ نے یزید بن حیان سے روایت کیا ہے، کہا کہ میں اور حصین بن سبرہ اور عمر بن مسلم زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور جب ہم ان کے پاس بیٹھ گئے تو حصین نے ان سے کہا: البتہ اے زید! تم واقعی خیرِ کثیر سے ملے، تم نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، یعنی آپ ﷺ کے دیدارِ فائض الانوار سے مشرف ہوئے اور آپ ﷺ کی حدیث شریف سنی اور آپ ﷺ کے ساتھ مل کر جنگیں لڑیں اور آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ اے زید! تم نے خیرِ کثیر دیکھی۔ اے زید! تم ہم کو حدیث کرو اس شے کی جو تم نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے تو زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے بھتیجے! واللہ! البتہ میری عمر بڑی ہوگئی اور میرا زمانہ قدیم ہو گیا اور میں بعض چیزوں کو بھول گیا جن کو میں رسول اللہ ﷺ سے یاد رکھتا تھا، جو کچھ میں تم کو بیان کر چکا ہوں اس کو قبول کرو اور جس کو میں نے تم سے بیان نہیں کیا، اس کی تم مجھ کو تکلیف نہ دو۔

پھر زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ ایک پانی والی جگہ پر ہمیں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، یہ جگہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے۔ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی اور وعظ ونصیحت فرمائی۔ پھر فرمایا: امابعد! خبردار لوگو! میں جو ہوں پس ایک بشر ہوں، قریب ہے کہ میرے پاس میرے رب کا قاصد آئے اور میں اس کو جواب دوں (یعنی اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں) اور بے شک میں تم میں ثقلین کو چھوڑنے والا ہوں۔ ان میں سے پہلی چیز تو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، اس میں ہدایت اور نور ہے «فَخُذُوْا بِكِتَابِ اللّٰهِ وَاسْتَمْسِكُوْا بِهِ» یعنی پس تم پکڑو اللہ کی کتاب کو اور خوب مضبوط پکڑو اس کو۔ چنانچہ کتاب اللہ پر آمادہ کیا اور اس میں خوب رغبت دلائی اور فرمایا: «وَأَهْلُ بَيْتِيْ أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِيْ أَهْلِ بَيْتِيْ، أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِيْ أَهْلِ بَيْتِيْ» یعنی اور میرے اہلِ بیت، میں تم کو اپنے اہلِ بیت میں اللہ یاد دلاتا ہوں، میں تم کو اپنے اہلِ بیت میں اللہ یاد دلاتا ہوں۔ چنانچہ حصین نے زید رضی اللہ عنہ سے کہا: اے زید! آپ ﷺ کے اہلِ بیت کون ہیں؟ کیا آپ ﷺ کی بیویاں آپ کے اہلِ بیت سے نہیں ہیں؟ زید رضی اللہ عنہ نے کہا: بے شک آپ ﷺ کی بیویاں آپ ﷺ کے اہلِ بیت سے ہیں، لیکن آپ کے اہلِ بیت وہ ہیں جن پر آپ ﷺ کے بعد صدقہ حرام کیا گیا ہے، کہا: وہ کون ہیں؟ زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ آلِ علی رضی اللہ عنہم، آلِ عقیل رضی اللہ عنہم، آلِ جعفر رضی اللہ عنہم اور آلِ عباس رضی اللہ عنہم ہیں، یعنی ان سب کی اولاد۔ حصین نے کہا ہے کہ کیا ان سب پر صدقہ حرام کیا گیا ہے؟ زید رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں![1] (وهكذا رواه مسلم في الفضائل والنسائي من طرق عن يزيد بن حيان به)

امام ابوعیسیٰ ترمذی رحمہ اللہ نے زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث ان الفاظ میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٨) مسند أحمد (٣٦٦/٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٥١)

فرمایا ہے: «إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمْ مَا إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِي، أَحَدُهُمَا أَعْظَمُ مِنَ الْآخَرِ، كِتَابُ اللّٰهِ حَبْلٌ مَمْدُودٌ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ وَالْآخَرُ عِتْرَتِي أَهْلُ بَيْتِي وَلَنْ يَتَفَرَّقَا حَتَّى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ فَانْظُرُوا كَيْفَ تَخْلُفُونِي فِيهِمَا» [1] (تفرد بروايته الترمذي ثم قال: هذا حديث حسن غريب) یعنی میں تم میں وہ شے چھوڑنے والا ہوں کہ اگر تم میرے بعد اس کو خوب مضبوطی سے پکڑو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے ان میں سے ایک دوسرے سے بزرگ تر ہے: اللہ کی کتاب جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ایک رسی ہے۔ دوسری میری عترت میرے اہلِ بیت ہیں اور ہرگز وہ جدا نہ ہوں گے، یہاں تک کہ حوض پر وارد ہوں گے۔ (یہ ترجمہ تو "عَلَى الْحَوْضِ" کا ہے۔ اور اگر "عَلَيَّ الْحَوْضَ" ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ میرے پاس حوض پر وارد ہوں گے۔ واللّٰه أعلم) پس تم نظر کرو کہ ان دونوں میں تم میری کیسی خلافت کرتے ہو۔

ترمذی نے بہ سندِ خود عن زید بن الحسن عن جعفر بن محمد عن ابیہ عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو آپ کے حج میں عرفے کے دن دیکھا اور آپ اپنی اونٹنی قصواء نامی پر خطبہ پڑھ رہے تھے، چنانچہ میں نے آپ ﷺ کو سنا کہ فرماتے تھے: لوگو! بے شک میں نے تم میں وہ شے چھوڑی جس کو تم اگر مضبوطی سے پکڑو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے، یعنی کتاب اللہ اور میری عترت، یعنی میرے اہلِ بیت۔ [2] (تفرد به الترمذي أيضا وقال: حسن غريب وفي الباب عن أبي ذر و أبي سعيد و زيد بن أرقم و حذيفة بن أسيد)

پھر ترمذی نے بہ سندِ خود عن علی بن عبد اللہ بن عباس عن ابیہ عن جدہ عن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «أَحِبُّوا اللّٰهَ تَعَالٰى لِمَا يَغْذُوكُمْ مِنْ نِعَمِهِ وَأَحِبُّونِي بِحُبِّ اللّٰهِ وَأَحِبُّوا أَهْلَ بَيْتِي بِحُبِّي» [3] (ثم قال: حسن غريب إنما نعرفه من هٰذا الوجه) یعنی دوست رکھو تم اللہ کو اس وجہ سے کہ وہ تم کو اپنی نعمتوں سے غذا دیتا ہے اور دوست رکھو مجھ کو اللہ کی محبت کے سبب سے اور دوست رکھو میرے اہلِ بیت کو بسبب میری محبت کے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ﴾ [الأحزاب: ۳۳] "اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ اے نبی کی گھر والیو! تم سے وہ (ہر قسم کی) گندگی کو دور کر دے اور تمھیں خوب پاک کر دے۔" کی تفسیر میں اَور حدیثیں ہم اس قدر لائے ہیں کہ اس جگہ ان کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ۔ [4]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۷۸۸) صحيح الجامع، رقم الحديث (۲۴۵۸)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۷۸۶) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۱۷۶۱)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۷۸۹) اس کی سند میں "عبداللہ بن سلیمان نوفلی" مجہول راوی ہے۔ (ضعيف الجامع: ۱۷۶)

[4] تفسير ابن كثير (۱۴۳/۴)

حافظ ابو یعلیٰ نے حنش سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے ابو ذر رضی اللہ عنہ کو سنا اور وہ دروازے کا حلقہ پکڑے ہوئے تھے اور فرماتے تھے: لوگو! جس نے مجھے پہچانا تو اس نے واقعی مجھے پہچان لیا اور جس نے مجھے نہ پہچانا تو میں ابو ذر ہوں! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، وہ فرماتے تھے کہ سوا اس کے نہیں کہ میرے اہلِ بیت کی مثل تم میں سفینۂ نوح علیہ السلام کی مثل ہے، جو کوئی اس میں داخل ہوا تو اس نے نجات پائی اور جو اس سے پیچھے رہا، وہ ہلاک ہوا۔[1]

یہ حدیث اس سند سے ضعیف ہے (وہ سند یہ ہے: قال أبو يعلیٰ حدثنا سويد بن سعيد حدثنا مفضل بن عبد الله عن أبي إسحاق عن حنش قال: سمعت أبا ذر... الخ)۔

قولہ سبحانہ: ﴿ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ﴾ یعنی جو کوئی نیکی کرے تو ہم اس کے لیے اس میں اجر وثواب بڑھائیں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ [النساء: ٤٠] ”بے شک اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا اور اگر نیکی ہو تو اسے دوگنی کر دیتا ہے اور خاص اپنے پاس سے بہت بڑا ثواب دیتا ہے۔“ بعض سلف نے کہا ہے کہ ثوابِ حسنہ سے حسنہ ہے بعد اس کے اور جزائے سیئہ سے سیئہ ہے بعد اس کے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴾ یعنی سیئات میں سے کثیر کو بخشتا ہے اور حسنات سے قلیل کو کثیر کرتا ہے، چنانچہ وہ پردہ پوشی کرتا ہے اور بخشتا ہے اور جزا کئی گنا کرتا ہے، لہٰذا قدر دانی فرماتا ہے۔

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سے قرآن سازی کے الزام کی تردید:

﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تو اللہ پر جھوٹ باندھ لیتا، جیسا کہ یہ جاہل لوگ کہتے ہیں تو وہ تیرے دل پر مہر لگا دیتا اور جو قرآن تجھ کو دیا ہے، اس کو تجھ سے سلب کر لیتا، جیسا کہ اللہ جل جلالہ کا ارشاد پاک ہے: ﴿ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿44﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿45﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿46﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴾ [الحاقة: ٤٤۔ ٤٧] ”اور اگر یہ ہم پر کوئی بات بنا لیتا تو البتہ ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے، پھر اس کی شہ رگ کاٹ دیتے۔ پھر تم میں سے کوئی بھی مجھے اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔“ یعنی البتہ ہم اس سے سخت انتقام لیتے اور لوگوں میں سے کسی کو قدرت نہ ہوتی کہ وہ اس سے روکے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبٰطِلَ ﴾ معطوف نہیں ہے ﴿ يَخْتِمْ ﴾ پر کہ مجزوم ہو، بلکہ مرفوع ہے بنا بر

---

[1] ان الفاظ کے ساتھ مسند أبي يعلیٰ میں روایت نہیں ملی ہے، البتہ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر ابن کثیر (١٤٣/٤) میں امام ابو یعلیٰ رحمہ اللہ سے ذکر کیا ہے اور اس کی سند میں ”مفضل بن عبداللہ“ ضعیف راوی ہے۔

ابتداء۔[1] (قاله ابن جرير)۔ کہا اور اس کی کتابت سے رسم مصحفِ امام میں واؤ حذف کر دیا ہے جس طرح کہ ان دو آیتوں میں محذوف ہوا ہے: ﴿ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴾ [العلق: ١٨] ''ہم بھی (دوزخ کے) پیادوں کو بلا لیں گے۔'' نیز قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ﴾ [بني إسرائيل: ١١] ''اور انسان برائی کی دعائیں مانگنے لگتا بالکل اس کی اپنی بھلائی کی دعا کی طرح۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ ﴾ معطوف ہے ﴿ وَيَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ ﴾ پر، یعنی وہ اپنی حجتوں اور برہانوں سے حق کو ثابت، ظاہر اور واضح کرتا ہے۔ ﴿ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴾ یعنی وہ ان باتوں کو خوب جانتا ہے جن کو ضمیر چھپاتے ہیں اور جو بھید اُن میں لپٹے ہوتے ہیں۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ ﴿ ذَٰلِكَ ﴾ کا اشارہ فضلِ کبیر کی طرف ہے۔ جمہور نے ﴿ يُبَشِّرُ ﴾ کو بہ تشدید پڑھا ہے ''تَبْشِيْرٌ'' سے اور امام مجاہد اور حمید بن قیس رحمہ اللہ نے ''إِبْشَارٌ'' سے بہ ضمِ تحتیہ وسکونِ موحدہ وکسرِ شین سے پڑھا ہے۔ یہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ اور بعض سبعہ نے بہ فتحِ تحتیہ وضمِ شین پڑھا ہے، اس لفظ کی قراءت کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔[3] یعنی یہ فضلِ کبیر وہ ہے جس کی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بشارت دیتا ہے۔ پھر بندوں کا یہ وصف بیان کیا کہ وہ ہیں جو ایمان لائے اور بھلائیاں کیں۔ چنانچہ جن کو یہ بشارت دی گئی، وہ یہی لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اس شے پر عمل کیا جس کا اللہ پاک نے حکم دیا اور اس شے کو چھوڑ دیا جس سے اس نے منع کیا۔

پھر جب اللہ پاک نے ان احکامِ شریفہ کا ذکر کیا، جن پر اس کی کتابِ عزیز مشتمل ہے، جن کی اپنے نبی اکرم ﷺ کو خبر دی ہے تو ان کو حکم دیا کہ ان سے کہیں کہ ان احکام کے پہنچانے کی ان سے کچھ اُجرت نہیں چاہتے۔ ﴿ قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ﴾ یعنی اے محمد! تو کہہ دے کہ میں تم سے اپنی خوش خبری اور ڈر سنانے والی رسالت پہنچانے پر اب تم سے کچھ مزدوری یا کوئی تھوڑا سا نفع طلب نہیں کرتا یا بعد میں بھی طلب نہیں کروں گا۔ ﴿ إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ ﴾ یعنی مگر میں تم سے قرابت داری میں عظیم اور واسع محبت طلب کرتا ہوں۔ یعنی ایسی وسیع اور بڑی محبت جو قریبی رشتے داروں میں ہوتی ہے، اس طرح سے کہ قربیٰ اس کے لیے جگہ اور ظرف ہے جس سے تمھاری محبت میں کوئی شے خارج نہیں ہوتی ہے۔ یہ خطاب یا تو قریش کو ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ کا سارے قبائلِ قریش میں رشتہ تھا۔ یہ قول امام عکرمہ، مجاہد، ابو مالک اور شعبی رحمہ اللہ کا ہے۔[4] یا یہ قریش کو اور انصار کو خطاب ہے، اس لیے کہ انصار آپ ﷺ کے ننھیال والے لوگ ہیں۔ یا سارے عرب کو خطاب ہے، اس لیے کہ فی الجملہ وہ سب آپ ﷺ کے قریبی ہیں۔ اس آیت کے

[1] تفسير الطبري (٥٣٢/٢١) [2] تفسير ابن كثير (١٤٠/٤-١٤٤) [3] فتح القدير (٦٩٩/٤) [4] تفسير القرطبي (٢١/١٦)

معنی تین قول ہیں، چنانچہ پہلے یہ دلائل کے ساتھ گزر چکے ہیں، یہاں کسی اور طرز سے ان کا بیان کیا جاتا ہے۔

پہلا قول یہ ہے کہ قربیٰ بہ معنی قرابت و رحم ہے، یعنی رشتہ جملہ مصادر قرب ضدِ بعد سے ہے۔ اس کی سند میں کئی قول عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں۔ ایک تو وہی ہے جو بہ روایتِ بخاری پہلے گزر چکا ہے، یہ قول بہ طریقِ طاؤس عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ہے۔ دوسرا بہ طریقِ سعید بن جبیر رحمہ اللہ ان سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تم سے اس پر کچھ مزدوری نہیں مانگتا، مگر یہ کہ میری قرابت کے سبب سے میرے نفس کے بارے میں مجھ سے مودت (دوستی) رکھو اور میرے اور تمھارے درمیان جو قرابت داری ہے، اسے محفوظ رکھو۔① تیسرا بہ طریقِ شعبی ان سے مروی ہے۔ شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لوگوں نے ہم پر اس آیت کے معنی پوچھنے میں کثرت کی تو ہم نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو لکھا کہ وہ ہمیں اس کے متعلق بتائیں تو انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش میں واسط النسب تھے۔ قریش میں کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت نہ تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو ان سے کہہ دے کہ میں جس شے کی طرف تمھیں بلاتا ہوں، اس پر کوئی مزدوری نہیں مانگتا مگر مودت قربیٰ میں، یعنی مگر یہ کہ تم میری قرابت کے سبب سے مجھ سے دوستی رکھو اور اس قرابت کی وجہ سے مجھے محفوظ رکھو۔②

مطلب یہ ہے کہ تم میری قوم ہو اور تم سب سے بڑھ کر اس کے مستحق ہو کہ مجھے مانو اور میری اطاعت کرو۔ پھر جب تم نے اس سے انکار کیا تو کم از کم حقِ قرابت کو تو جانو اور میرے ساتھ صلہ رحمی کرو اور ایذا نہ دو۔ چوتھا بہ طریقِ علی بن ابی طلحہ رضی اللہ عنہ ان سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سارے قریش سے قرابت تھی اور جب انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت سے انکار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے میری قوم! جب کہ تم نے میری بیعت، یعنی پیروی سے انکار کر دیا ہے تو کم از کم میری قرابت کا تو خیال کرو جو تم سے ہے، تاکہ تم سے بڑھ کر میری حفاظت اور مدد تمھارے علاوہ عرب کا کوئی اور شخص نہ کرے۔③ غرضیکہ ان سب قولوں سے معلوم ہوا کہ قربیٰ بہ معنی قرابت ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "قُربیٰ" بہ معنی اقارب ہے۔ بہ طریقِ مجاہد سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «قُلْ لَّا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى أَنْ تَحْفَظُوْنِيْ فِيْ أَهْلِ بَيْتِيْ وَتَوَدُّوْهُمْ بِيْ» یعنی مگر یہ کہ تم مجھ کو میرے اہلِ بیت میں محفوظ رکھو اور ان سے میری وجہ سے محبت رکھو۔ اس کو دیلمی و ابونعیم رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے۔④ بہ طریقِ سعید بن جبیر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ کے یہ اقارب کون ہیں جن کی مودت واجب ہوئی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "علی، فاطمہ اور ان کے دو بیٹے۔"⑤ (أخرجه ابن المنذر وابن أبي حاتم والطبراني وابن مردويه قال السيوطي بسند ضعيف)

---

① ان دونوں کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ ② مستدرك الحاكم (٤٨٢/٢)

③ تفسير الطبري (٥٢٥/٢١) ④ الدر المنثور (٣٤٨/٧)

⑤ المعجم الكبير (٤٧/٣) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٤٩٧٤)

امام کلبی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبیِ مکرم ﷺ جب مدینے میں تشریف لائے تو آپ ﷺ کو نوائب (مصائب) اور حقوق پیش آتے تھے اور آپ ﷺ کے ہاتھ میں فراخی نہ تھی تو انصار بولے کہ اس شخص نے تم کو ہدایت کی ہے اور وہ تمھاری بہن کا بیٹا ہے اور تمھارے شہر میں تمھارا پڑوسی ہے، چنانچہ تم اس کے لیے اپنے اموال میں سے تھوڑا تھوڑا جمع کرو تو انھوں نے ایسا کیا اور اس مال کو لے کر آپ ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے وہ ان کو لوٹا دیا، یعنی قبول نہ کیا اور یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴾ یعنی تو کہہ دے کہ میں تم سے ایمان لانے پر کچھ اجر نہیں مانگتا۔ ﴿ اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ﴾ یعنی مگر یہ کہ تم میری قرابت اور عترت سے مودت رکھو اور مجھے ان میں محفوظ رکھو۔[1] (ذکرہ الخطیب) اور بہ طریقِ مقسم سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے انصار کا قول "فَعَلْنَا وَفَعَلْنَا" پہلے گزر چکا ہے۔[2] اس کی اسناد میں یزید بن ابی زیاد راوی ضعیف ہے۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ آیت مکی ہے، مدنی نہیں ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ "قربٰی" بہ معنی قرب وتقرب وزلفی ہے۔ اس کی دلیل وہ ہے جو بہ طریقِ مجاہد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن النبی ﷺ اس کی تفسیر میں مروی ہے: « قُلْ لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَى مَا أَتَيْتُكُمْ بِهِ مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى أَجْرًا إِلَّا أَنْ تَوَدُّوا اللّٰهَ وَأَنْ تَتَقَرَّبُوا إِلَيْهِ بِطَاعَتِهِ »[3] اس کا ذکر بھی پہلے ہو چکا ہے حسن رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: « بِالطَّاعَةِ وَالْعَمَلِ الصَّالِحِ »[4] امام ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رحمہما اللہ نے بہ طریقِ ضحاک عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی اور مشرکین رسول اللہ ﷺ کو ایذا دیا کرتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یعنی اے محمد! تو ان سے کہہ دے کہ میں تمھیں جس چیز کی طرف بلاتا ہوں اس پر تم سے کوئی اجر، یعنی دنیا کا سامان نہیں مانگتا۔ ﴿ اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ﴾ یعنی مگر اپنے لیے اپنی قرابت کی حفاظت چاہتا ہوں جو تمھارے اندر ہے۔

پھر جب آپ ﷺ نے مدینے کی طرف ہجرت فرمائی تو اللہ پاک نے اس بات کو پسند فرمایا کہ آپ ﷺ کو دوسرے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ملا دے جو آپ ﷺ کے بھائی ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ﴾ [سبا: ۴۷] "کہہ دیجیے! کہ جو بدلہ میں تم سے مانگوں وہ تمھارے لیے ہے میرا بدلہ تو اللہ تعالیٰ ہی کے ذمے ہے۔" یعنی آخرت میں اس کا ثواب اور عزت افزائی، جیسا کہ نوح علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الشعراء: ۱۰۹] "میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں چاہتا، میرا بدلہ تو صرف رب العالمین کے ہاں ہے۔" اور جس طرح کہ ہود، صالح اور شعیب علیہم السلام نے فرمایا ہے، اجر کا استثناء نہیں کیا جیسا کہ

[1] تفسیر الرازي (۱۴۱/۲۷)
[2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[4] تفسیر الطبري (۲۵۲۹/۲۱)

نبی مکرم ﷺ نے استثناء فرمایا ہے، چنانچہ اس کو ان پر رد کر دیا۔ اور یہ آیت منسوخ ہے۔[1] حسین بن فضل رحمہ اللہ بھی نسخ کے قائل ہیں اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ضحاک رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔[2]

امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول پسندیدہ نہیں ہے، اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کی مودت اور آپ ﷺ سے ایذا کا روکنا اور آپ ﷺ کے اقارب کے ساتھ دوستی رکھنا اور اطاعت اور عملِ صالح کے ساتھ اللہ پاک کی طرف تقرب کرنا دین کے فرائض سے ہے،[3] یہ بات انہیں تین اقوال کی بنا پر ہے، جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ غرضیکہ حبرِ امت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں بہ طریقِ مختلف جو مروی ہوا ہے، اس کا حاصل وہی ہے جو مذکور ہوا، لیکن جو معنی ان سے صحیح ہوئے ہیں، ان کے شاگردوں میں سے ایک کثیر جماعت نے وہ معنی ان سے روایت کیے ہیں، پھر ان کے بعد جو بہت لوگوں نے کہے ہیں، چنانچہ وہ وہی معنی ہیں جو سب سے پہلے بیان ہوئے اور ان سے جو نسخ مروی ہے، وہ اس کے منافی نہیں ہے، کیوں کہ اس سے کوئی مانع نہیں ہے کہ مکہ میں قرآن شریف یہ حکم لے کر نازل ہوا کہ کفارِ قریش آپ ﷺ سے دوستی کریں اس قرابت کے سبب سے جو آپ ﷺ کے اور اُن کے درمیان ہے اور اس کی وجہ سے وہ آپ ﷺ کو محفوظ رکھیں۔

پھر یہ حکم منسوخ ہو جائے اور یہ استثناء اپنی اصل سے جاتا رہے جس طرح کہ اس پر وہ بات دال ہے جو ہم اس مضمون میں ذکر کر آئے ہیں، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ نے تبلیغِ رسالت پر علی الاطلاق کسی اجر کا سوال نہیں کیا۔ پھر اگر کہو کہ "قربیٰ" کے معنی اہلِ بیت کے بھی تو ان سے مروی ہیں، وہ پہلے معنی کے معارض ہوں گے؟ تو کہیں گے کہ اس معنی کو معنی اول کے معارضے کی قوت نہیں ہے، اس لیے کہ معنی اول بہ طرقِ کثیرہ صحیح طور پر ان سے مروی ہیں اور اس معنی کی روایت کا جو حال ہے وہ تم کو پہلے معلوم ہو چکا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کے لیے وہ فضائلِ جلیلہ و مزایائے جمیلہ ہیں کہ اللہ پاک نے ان کی وجہ سے ان کو اس ضعیف روایت سے بے نیاز کر دیا ہے۔ چنانچہ بعض کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے اور آیتِ تطہیر میں پورے طور پر ان کا ذکر ہوا ہے۔ پھر اگر یہ کہو کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ مودت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مودت کریں اور اس کی طرف اس کی اطاعت کے ساتھ تقرب کریں،[4] یہ معنی پہلے معنی کے معارض ہوں گے تو کہیں گے کہ جس طرح ثانی معنی اس کے معارضے کی قوت نہیں رکھتے، اسی طرح یہ بھی اس کے معارضے پر قوی نہیں ہیں، لیکن اتنی بات ہے کہ اس معنی کے بازو کو یہ امر قوت دیتا ہے کہ یہ تفسیر نبی کریم ﷺ تک مرفوع ہے۔

(مسند امام احمد رحمہ اللہ میں اس مذکورہ روایت کی اسناد یہ ہے: "حدثنا حسن بن موسیٰ، حدثنا قزعة بن سوید عن

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۲۷۵/۱۰) الدر المنثور (۳۴۶/۷، ۳۴۷) [2] فتح القدیر (۶۹۹/٤)

[3] تفسیر البغوي (۱۹۲/۷) [4] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

ابن أبي نجيح عن مجاهد عن ابن عباس رضي الله عنهما أن النبي ﷺ فذكره'' ورواه ابن أبي حاتم عن أبيه عن مسلم بن إبراهيم عن قزعة بن كذا في فتح القدير)

﴿ اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ﴾ میں جائز ہے کہ استثناء متصل ہو اس طرح سے کہ اجر سے مراد مجازاً صرف نفع لیا جائے، کیوں کہ حقیقت میں اجر مالی نفع ہے جو عمل کے بدلے میں واجب ہوتا ہے اور کلمۂ ﴿ فِي ﴾ بہ معنی لام ہے ﴿ اَلْمَوَدَّةَ ﴾ سے متعلق ہے اور ﴿ اَلْقُرْبٰى ﴾ سے مراد قرابت بہ معنی رِحم ہے یعنی میں تبلیغ پر تم سے کوئی نفع طلب نہیں کرتا مگر یہ نفع کہ تم مجھے اپنے ساتھ میری قرابت داری کی وجہ سے مجھے دوست رکھو۔ یا ''قُرْبٰی'' کو مصدر رکھو ''زُلْفٰی'' اور ''بُشْرٰی'' کی طرح بہ معنی قرابت جس سے اقارب مراد ہوتے ہیں اور کلمۂ ﴿ فِي ﴾ ظرفِ مستقر محذوف سے متعلق ہے بنا بر حال ﴿ اَلْمَوَدَّةَ ﴾ سے۔ کہو ''أَيْ: إِلَّا الْمَوَدَّةَ ثَابِتَةً فِي الْقُرْبٰى مُتَمَكِّنَةً فِيهَا'' اس صورت میں کلمۂ ﴿ فِي ﴾ اپنے ظرفی معنی پر رہے گا، گویا ''أقارب'' کو ''مودت'' کا مکان و مقر ٹھہرایا، جیسے: ''لِيْ فِيْ فُلَانٍ مَوَدَّةٌ'' بولتے ہیں، جب انتہا درجے کی مودت کا اظہار منظور ہوتا ہے، یعنی فلاں میں میری محبت ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ میری محبت کا گھر اور قرار گاہ ہے۔ دیکھو جو مبالغہ اس ترکیب میں ہے وہ اس میں نہیں کہ جب یوں کہو: ''إِلَّا مَوَدَّةَ الْقُرْبٰى'' یا ''إِلَّا الْمَوَدَّةَ لِلْقُرْبٰى'' معنی یہ ہیں مگر یہ نفع کہ تم خوب دوستی رکھو میرے قرابت والوں سے۔ اب اگر کوئی کہے کہ استثناء متصل کس طرح ٹھیک ہو سکتا ہے، حالاں کہ اس سے یہ نکلتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ تبلیغ وحی پر طالبِ اجر ہیں اور یہ کسی وجہ سے جائز نہیں ہے۔ اول تو یہ ہے کہ اللہ پاک نے اکثر انبیاء علیہم السلام سے طلبِ اجر کی نفی کی صراحت نقل فرمائی ہے۔ چنانچہ نوح، ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام کے قصوں میں مذکور ہے اور ہمارے نبی کریم ﷺ افضل الانبیاء و سید المرسلین ہیں تو آپ ﷺ کی بلند شان کے لائق اجر کا مطلب کرنا کس طرح ہو سکتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے خود طلبِ اجر کی نفی کی تصریح فرمائی ہے: ﴿ قُلْ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴾ [ص: ٨٦] ''کہہ دیجیے کہ میں تم سے اس پر کوئی بدلہ طلب نہیں کرتا اور نہ میں تکلف کرنے والوں میں سے ہوں۔'' اور دوسری آیت پہلے گزر چکی ہے۔ تیسری یہ ہے کہ تبلیغ آپ ﷺ پر واجب تھی: ﴿ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ [المائدۃ: ٦٧] ''جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے پہنچا دیجیے۔'' اور جبکہ سب سے کم درجے کے انسان کے لیے یہ جائز نہیں کہ ایسی چیز پر اجر طلب کرے جس کا پہنچا دینا اس پر واجب ہے تو افضل الناس اور سید الکائنات کا کیا ذکر ہے!

چوتھی وجہ یہ ہے کہ متاعِ دنیا وحیِ الٰہی اور علمِ نبوت کی نسبت سب سے قلیل اور خسیس چیز ہے، پھر اشرف اشیاء کے مقابلے میں خسیس ترین چیز کا طلب کرنا عقلاً کیوں کر ٹھیک ہو سکتا ہے۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ اجر طلب کرنا موہمِ تہمت ہے اور قطعی طور پر نبوت کے منافی ہے، چنانچہ مندرجہ بالا وجوہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ نبی اکرم ﷺ

کے لیے تبلیغ پر اجر طلب کرنا ہرگز جائز نہیں ہے تو اب کہو کہ جو شے طلبِ اجر کے قائم مقام ہے، یعنی ”مودة في القربی“ اس کا آپ ﷺ سے صادر ہونا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ تو کہیں گے کہ یہ تو بڑے حسین پیرائے میں طلبِ اجر کی نفی ہے۔ دیکھو کسی شاعر نے کہا ہے:

وَلَا عَيْبَ فِيهِمْ غَيْرَ أَنَّ سُيُوفَهُمْ   بِهِنَّ فُلُولٌ مِنْ قِرَاعِ الْكَتَائِبِ

شاعر کسی قوم کی شجاعت کی تعریف کرتا ہے۔ کہتا ہے: ان میں کوئی عیب نہیں ہے سوائے اس کے کہ ان کی تلواروں میں لشکروں کے مارنے پیٹنے سے دندانے پڑ گئے ہیں، حالاں کہ یہ عیب نہیں ہے، بلکہ بڑا ہنر ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھو۔ حاصل یہ ہوا کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا ہوں مگر یہ اجر، یعنی مودت فی القربیٰ، حالاں کہ حقیقت میں یہ اجر نہیں ہے، کیوں کہ اجر تو وہ ہے جو عمل کے مقابلے میں واجب ہوتا ہے اور قریش پر آپ ﷺ کی اور آپ ﷺ کے اقرباء کی مودت واجب تھی۔ گو یہ فرض کر لیا جائے کہ آپ ﷺ نبی بنا کر ان کی طرف نہیں بھیجے گئے اور نہ آپ ﷺ نے ان کو وحیِ الٰہی پہنچائی، کیوں کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے اقرباء ان کے رشتے دار تھے تو اُن کی صلہ رحمی کرنا اور ان کی ایذا دہی سے باز رہنا بہ حکمِ مروتِ جبلی واجب تھا تو اب اُن کی قربیٰ میں مودت تبلیغ کا اجر نہ ہوئی، اس لیے کہ تبلیغ سے قطع نظر اس کا وجوب ان پر تھا، چنانچہ آپ ﷺ تبلیغ پر طالبِ اجر نہ ہوئے، مگر آپ ﷺ نے مودت کا نام اجر رکھا اور مودت کو اجر کے ساتھ تشبیہ دے کر اجر سے اس کا استثناء کر لیا۔ اتصال کے صحیح ہونے پر اس قدر کافی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ استثناء منقطع ہے ﴿ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ﴾ پر کلام مکمل ہو چکا۔

پھر فرمایا: ﴿ إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ ﴾ یعنی لیکن میں تم کو تم میں اپنی قرابت یاد دلاتا ہوں۔ امام زجاج رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں کہ منقطع ہے۔[1] اس بنا پر معنی یہ ہیں کہ ”لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا قَطُّ وَلٰكِنْ أَسْأَلُكُمُ الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى الَّتِي بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ارْقُبُوا لِي فِيهَا وَلَا تَعْجَلُوا إِلَيَّ وَدَعُونِي وَالنَّاسَ“ یعنی تم سے اس پر ہرگز کوئی اجر نہیں مانگتا لیکن تم سے میں اس قرابت میں مودت کا سوال کرتا ہوں جو میرے اور تمھارے درمیان ہے۔ تم میری اس میں پاسداری کرو اور میری طرف جلدی مت کرو اور مجھے اور لوگوں کو چھوڑ دو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ اسی معنی کے قائل ہیں۔ چنانچہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم میری نبوت کے سبب سے اور میری رحمتِ عامہ ہونے کی وجہ سے تم میرا حق نہیں پہچانتے تو اس سے تو کم نہ ہو کہ قرابت کے سبب سے مجھ سے دوستی رکھو اور رشتہ داری کا پاس کرو۔

اب ذرا اس اختصار کے حسن کو دیکھو کہ ﴿ إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ ﴾ کو اس عبارت کے بجائے رکھا ہے: ”إِلَّا أَنْ تَوَدُّونِي لِقَرَابَتِي مِنْكُمْ“ چونکہ قرابت کی وجہ سے باہم محبت و مودت رکھنا ایک نیک بات ہے۔ اس لیے

[1] معاني القرآن (٣٩٨/٤)

فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ﴾ یعنی جو کمائے کوئی طاعت تو ہم اس کے اس ﴿ حَسَنَةً ﴾ یعنی طاعت میں زیادہ کریں، یا جنت میں حسن کو اس کے ثواب کو کئی گنا کر کے زیادہ کریں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں جو کوئی کمائے ایک حسنہ تو ہم اس کے لیے اس میں زیادہ کریں اور اس کی حسنہ کو کئی گنا کر دیں، ایک کے بدلے میں دس اور اس سے بھی زیادہ۔[1] کسی نے کہا ہے کہ اس حسنہ سے مراد وہی مودت فی القربیٰ ہے، لیکن عموم پر محمول کرنا زیادہ صحیح ہے اور مودت فی القربیٰ بہ دخولِ اولیٰ اس کے تحت میں داخل ہو گی، اس لیے کہ حسنہ کا ذکر مودت فی القربیٰ کے بعد ہوا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ ﴿ حَسَنَةً ﴾ رسول اللہ ﷺ کی آل کے لیے مودت ہے۔[2] یہ قول اسی ایک قول کی بنا پر ہے جو تین اقوال میں پہلے گزر چکا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلِ بیت کے لیے مودت کے بارے میں نازل ہوئی،[3] لیکن آیت ظاہری طور پر عام ہے۔ "اقتراف" بہ معنی اکتساب ہے۔ "قرف" کی اصل کسب ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "فُلَانٌ يَقْرِفُ لِعِيَالِهِ أَيْ: يَكْسِبُ" اس کا باب "ضَرَبَ يَضْرِبُ" ہے۔ قولِ عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے: "رَجُلٌ قَرِفَةٌ" جبکہ وہ حیلہ گر اور تدبیر کار ہو۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴾ یعنی جو کوئی کچھ نیکی کرے گا تو اللہ پاک اس کے اجر میں بڑھائے گا، اس لیے کہ بے شک اللہ البتہ بڑا بخشنے والا ہے گناہ گاروں کے لیے اور فرماں برداروں کے لیے بڑا قدر دان ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ غَفُوْرٌ ﴾ ہے گناہوں کے لیے اور ﴿ شَكُوْرٌ ﴾ ہے نیکیوں کے لیے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آلِ محمد ﷺ کے گناہوں کے لیے ﴿ غَفُوْرٌ ﴾ ہے اور قلیل کے لیے ﴿ شَكُوْرٌ ﴾ ہے[4] تو اس کو مضاعف (کئی گنا) کر دے گا۔

﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴾ کلمہ ﴿ اَمْ ﴾ منقطع بہ معنی "بَلْ" و ہمزہ ہے۔ "بَلْ" تو کلامِ سابق سے دوسری طرف پھرنے کے لیے ہے اور ہمزہ توبیخی ہے، یعنی بلکہ کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اللہ پر جھوٹ باندھ لیا اس طرح سے کہ نبوت کا مدعی ہوا اور قرآن کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی۔ پھر اللہ پاک نے اس بات کا یہ جواب دیا: ﴿ فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ﴾ یعنی اگر وہ اللہ پر جھوٹ باندھتا تو البتہ اللہ تعالیٰ اس سے جھوٹ کو صادر نہ ہونے دیتا اور اس کے دل پر مہر کر دیتا اس طرح سے کہ اس کے دل میں ان چیزوں میں سے کسی کا خیال تک نہ ڈالتا جس میں اس نے جھوٹ بولا، جیسا کہ تمھارا خیال ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: اگر اللہ چاہے تو مہر لگا دے تیرے دل پر، پس بھلا دے تجھ کو قرآن، پس خبر دے ان کو اس بات کی کہ اگر وہ اللہ پر جھوٹ باندھتا تو اس کے ساتھ وہ معاملہ کرتا جس کی اس آیت میں ان کو خبر دی

[1] فتح القدير (٦٩٩/٤، ٧٠٠) [2] تفسير القرطبي (٢٤/١٦) [3] الكشاف (٢٢٥/٤) [4] تفسير القرطبي (٢٤/١٦)

ہے۔ مجاہد اور مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پس اگر اللہ چاہے تو تیرے دل پر بندش کر دے ان کی ایذا پر صبر کرنے کے ساتھ، یہاں تک کہ ان کی بات سے تیرے دل کو کوئی تکلیف اور مشقت نہ ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ خطاب نبی اکرم ﷺ کو ہے اور مراد کفار ہیں، یعنی اگر تو چاہے تو کفار کے دلوں پر مہر کر دے اور جلدی سے ان پر عقوبت ڈال دے۔ یہ قول امام قشیری رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اگر تیرا جی تجھ سے یہ کہتا کہ تو اللہ پر جھوٹ باندھے تو البتہ وہ تیرے دل پر مہر کر دیتا، کیوں کہ جھوٹ کی جرأت وہی کرتا ہے جس کے دل پر مہر کی ہوتی ہے۔ پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ اس کلام سے مقصود نبیِ مکرم ﷺ سے ایسی بات صادر ہونے کو بعید قرار دینے میں مبالغہ کرنا ہے۔

﴿ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبٰطِلَ ﴾ کلامِ مستانف ہے۔ ماقبل میں جو افترا کی نفی ہے، اس کی تقریر اور تاکید کے لیے لایا گیا ہے، جزائے شرط میں داخل نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ پاک باطل کو تو مطلقاً محو کر دیتا ہے، یعنی یہ کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔ حرفِ واؤ لفظاً اس سے ساقط ہو گیا ہے التقائے ساکنین کے سبب سے اور لفظ پر محمول کر کے خطاً بھی گرا دیا ہے جس طرح کہ ﴿ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴾ [العلق: ۱۸] ''ہم بھی (دوزخ کے) پیادوں کو بلا لیں گے۔'' کو بغیر واؤ کے لکھا ہے۔ (ذکره السمين)

امام ابن انباری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ" پر وقف تام ہے، یعنی اور مابعد اس کا کلامِ مستانف ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہے کہ اس میں تقدیم و تاخیر ہے۔ "أَيْ: وَاللّٰهُ يَمْحُوْ الْبَاطِلَ" اور یہ حکایت کیا ہے کہ بعض مصاحف میں "یمحو" سے واؤ ساقط ہوا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ کہتے ہیں ہے کہ ﴿ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبٰطِلَ ﴾ اس شخص پر حجت قائم کرنا ہے جس نے اس شے کا انکار کیا جس کو نبیِ مکرم ﷺ لائے۔ یعنی اگر وہ چیز باطل ہوتی جس کو وہ لائے تو البتہ اللہ تعالیٰ اس کو مٹا دیتا جس طرح کہ مفترین کے بارے میں اس کی ایسی ہی سنت جاری ہوئی ہے۔[1] ﴿ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ﴾ اور حق، یعنی اسلام کو اس شے کے ساتھ ثابت کرتا ہے جس کو اس نے قرآن پاک سے نازل کیا ہے۔ اور بے شک اللہ سبحانہ نے یہ کام کر دیا، چنانچہ ان کے باطل کو مٹایا اور اسلام کا بول بالا کیا۔

﴿ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴾ یعنی بے شک اللہ پاک کو ان باتوں کا خوب علم ہے جو بندوں کے دلوں میں ہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہے کہ ﴿ عَلِيْمٌ ﴾ ہے اس شے کا جو تیرے سینے میں ہے اور ان کے سینوں میں ہے، چنانچہ وہ اسی کے مطابق امر کو جاری کرتا ہے۔[2] پھر جب اللہ سبحانہ نے مشرکوں پر انکار کیا اور انھیں اس بات پر ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ کی کہ شیطانوں نے ان کے لیے جو دین مشروع کیا اس کی پیروی کی اور نبی کریم ﷺ کو

---

(1) تفسير القرطبي (۲۵/۱٦) فتح القدير (٤/۷۰۰)

(2) تفسير النسفي (٤/۱۰۲) فتح البيان (۱۲/۲۹٦۔۳۰۱)

"افترا علی اللّٰہ تعالیٰ" کی طرف منسوب کیا جو تمام افترا سے بڑھ کر عظیم اور برا ہے تو ان کو توبہ کی طرف بلایا اور ان کو یہ بات بتا دی کہ وہ ہر گناہ گار سے توبہ کو قبول کرتا ہے، اگرچہ اس کا گناہ کیسا ہی بڑا ہو۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُوا عَنِ السَّيِّاٰتِ
وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿٢٥﴾ وَيَسْتَجِيبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿٢٦﴾ وَلَوْ
بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ
يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿٢٧﴾ وَهُوَ
الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ۭ وَهُوَ
الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٢٨﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَاۗبَّةٍ ۭ وَهُوَ عَلٰي جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَاۗءُ
قَدِيْرٌ ﴿٢٩﴾

اور وہی تو ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور (ان کی) برائیوں سے درگزر فرماتا ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو، اُسے جانتا ہے 25 اور وہ ان لوگوں کی (دعا) قبول کرتا ہے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور وہ انھیں اپنے فضل سے زیادہ دیتا ہے اور کافروں کے لیے بہت سخت عذاب ہے 26 اور اگر اللہ اپنے (تمام) بندوں کے لیے رزق فراغ کر دیتا تو وہ زمین میں ضرور سرکشی کرتے، لیکن وہ اس اندازے سے (رزق) نازل کرتا ہے جتنا چاہتا ہے۔ بلاشبہ وہ اپنے بندوں سے خوب باخبر ہے، (انھیں) خوب دیکھنے والا ہے 27 اور وہی ہے جو لوگوں کے نا اُمید ہو جانے کے بعد بارش نازل کرتا ہے اور وہ اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے اور وہی کارساز، تعریف کیا ہوا ہے 28 اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور جو بھی چلنے پھرنے والے اس نے ان دونوں میں پھیلا رکھے ہیں اور وہ جب بھی چاہے ان کے جمع کرنے پر قادر ہے 29

اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کی توبہ و دعا قبول کرتا ہے:

اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ سب جانتا ہے، یعنی اسے معلوم ہے کہ نبی اس کا پیغام پہنچاتا ہے اور بندوں کو سب

معاملت اپنے رب سے ہے۔ انتھٰی.

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس بات کا احسان رکھتا ہے کہ جس وقت وہ توبہ کرتے ہیں اور اس کی طرف رجوع ہوتے ہیں تو وہ اُن کی توبہ قبول کرتا ہے، بے شک وہ اپنے کرم اور حلم سے معاف کرتا ہے اور درگزر فرماتا ہے اور پردہ پوشی کرتا ہے اور بخشتا ہے، جیسا کہ اللہ عزوجل کا فرمان ہے: ﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [النساء: ۱۱۰] ''جو شخص کوئی برائی کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر اللہ سے استغفار کرے تو وہ اللہ کو بخشنے والا، مہربانی کرنے والا پائے گا۔'' صحیح مسلم میں ثابت ہوا ہے کہ اسحاق بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے اپنے چچا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی توبہ سے جبکہ وہ اس کی طرف رجوع ہوتا ہے، اس شخص سے زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ جس کی کوئی سواری جنگل بیابان میں گم ہو جائے اور اس پر اس کے کھانے پینے کا سامان تھا، پھر وہ اس سے نا امید ہو گیا اور ایک درخت کے پاس آیا اور اسی نا امیدی کی حالت میں اس کے سائے میں لیٹ گیا، پھر اس اثنا میں کہ وہ ایسا تھا کہ اچانک دیکھتا ہے کہ وہ سواری اس کے پاس کھڑی ہے، پھر اس نے اس کی نکیل پکڑی اور خوشی کی شدت کے مارے اس طرح بول اٹھا: اے اللہ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں، یعنی خوشی کی شدت کے مارے چوک گیا۔[1]

نیز صحیح میں یہ روایتِ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس کے مثل ثابت ہوا ہے۔[2] عبدالرزاق نے عن معمر عن الزہری اس تفسیر میں روایت کیا ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی توبہ سے اس شخص سے زیادہ خوشی ہوتی ہے جو اپنی گمی ہوئی سواری کو ایسی جگہ میں ایسے وقت میں پائے، جب وہ ڈرتا ہے کہ پیاس اسے مار ڈالے گی۔[3] ہمام بن حارث رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کسی شخص نے اس شخص کے بارے میں پوچھا کہ جو عورت سے زنا کرتا ہے، پھر اس سے نکاح کر لیتا ہے؟ تو فرمایا: اس کا کچھ خوف نہیں اور یہ آیت پڑھی: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴾[4] (رواه ابن جرير وابن أبي حاتم من حديث شريح القاضي عن إبراهيم بن مهاجر عن إبراهيم النخعي عن همام فذكره)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ ﴾ یعنی توبہ قبول کرتا ہے آئندہ زمانے میں اور سیئات کو معاف کرتا ہے زمانۂ ماضی میں۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ یعنی وہ علام ہے ان سب کاموں کا جو تم نے کیے اور ان سب باتوں کا جو تم نے کہیں اور باوجود اس کے وہ اس شخص پر رجوع ہوتا ہے جو اس کی طرف رجوع ہوا۔ قولہ سبحانہ: ﴿ وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ''يَسْتَجِيْبُ لَهُمْ'' اور اسی طرح

---

(1) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٤٧) (2) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٤٤)

(3) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٥) تفسير الصنعاني (١٩١/٣) (4) تفسير الطبري (٥٣٣/٢١) تفسير ابن كثير (١٤٤/٤)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی دعا کو قبول کرتا ہے جو وہ خود اپنے لیے اور اپنے دوستوں اور بھائیوں کے لیے کرتا ہے اور اس قول کو بعض نحویوں سے حکایت کیا ہے اور اس کو اس آیتِ کریمہ کے مثل ٹھہرایا ہے: ﴿ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ ﴾ [آل عمران: ١٩٥] ''پس ان کے رب نے ان کی دعا قبول فرمالی۔''[1]

پھر امام ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بہ حدیثِ اعمش عن شقیق عن سلمہ بن سبرہ روایت کیا ہے کہ معاذ رضی اللہ عنہ نے ملکِ شام میں ہم کو خطبہ سنایا، چنانچہ کہا: تم مومن ہو اور تم اہلِ جنت ہو۔ واللہ! بے شک میں البتہ اس بات کی امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو جنت میں داخل کرے جس کو تم فارس اور روم میں قید کرتے اور یہ اس طرح سے ہے کہ تم میں کوئی اس شخص کو جو کوئی کام کرے تو یوں کہے: "أَحْسَنْتَ رَحِمَكَ اللّٰهُ" یعنی تو نے اچھا کام کیا ہے اللہ تجھ پر رحم کرے! یا کہے: "أَحْسَنْتَ بَارَكَ اللّٰهُ فِيْكَ" یعنی تو نے خوب کام کیا اور اللہ تجھ میں برکت دے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ﴾.[2]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بعض اہلِ عربیت سے حکایت کیا ہے کہ اس نے قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ ﴾ [الزمر: ١٨] ''جو بات کو کان لگا کر سنتے ہیں'' کو یعنی "هُمُ الَّذِيْنَ يَسْتَجِيْبُوْنَ لِلْحَقِّ وَيَتَّبِعُوْنَهٗ"، کو اس آیت کے مثل ٹھہرایا ہے: ﴿ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ﴾ [الأنعام: ٣٦] ''وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور مردوں کو اللہ زندہ کر کے اٹھائے گا۔'' پہلے معنی ظاہر تر ہیں، اس لیے کہ بعد میں یوں فرمایا ہے: ﴿ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ﴾ یعنی ان کی دعا قبول فرماتا ہے اور اس سے زیادہ اور ان کو عطا فرماتا ہے۔

اسی لیے امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ شفاعت اس شخص کے لیے ہے جس کے لیے نار واجب ہوگئی ہے، ان لوگوں میں سے جنھوں نے ان کے ساتھ دنیا میں کوئی احسان کیا ہے۔[3] امام قتادہ رحمہ اللہ نے ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے ﴿ وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے، کہا کہ اپنے بھائیوں کے حق میں شفاعت کریں گے۔ ﴿ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ﴾ کہا کہ شفاعت کریں گے اپنے بھائیوں کی بھائیوں کے بارے میں۔[4] قولہ عزوجل: ﴿ وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴾ جب اللہ پاک نے مومنوں کا ذکر کیا اور اس ثوابِ جزیل کا ذکر کیا جو ان کے لیے ہے تو کافروں کا ذکر فرمایا اور اس عذابِ شدید اور درد دہندہ کا ذکر کیا جو قیامت اور حساب کے دن ان کے لیے اللہ کے نزدیک ہے۔

رزق کی عدمِ فراخی میں حکمت:

قولہ سبحانہ وتعالیٰ: ﴿ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ یعنی اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/١٤٤) [2] تفسير الطبري (٢١/٥٣٤) تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٧٨)

[3] تفسیر ابن کثیر (٤/١٤٥) اس کی سند میں ''اسماعیل بن عبداللہ کندی'' سخت ضعیف راوی ہے۔ [4] تفسیر الطبري (٢١/٥٢٤)

ان کی ضرورت سے زیادہ رزق عطا کرتا تو یہ ان کی بغاوت وطغیان اور سرکشی کا باعث ہوتا۔ وہ ناز وفخر کرنے کے لیے اور اترانے کے مارے ایک دوسرے پر بغاوت کرتے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہا جاتا تھا: ”خَيْرُ الْعَيْشِ مَا لَا يُلْهِيكَ وَلَا يُطْغِيكَ“ یعنی بہترین گزران وہ ہے کہ مولیٰ سے تجھے غافل نہ کرے اور اللہ کے بندوں پر تجھے باغی اور سرکش نہ بنائے۔[1] (وذكر قتادة حديث: إنما أخاف عليكم ما يخرج الله تعالى من زهرة الحيوة الدنيا وسوال السائل أياتي الخير بالشر، الحديث)

قوله جل و علا سبحان ربي العلىٰ الأعلى: ﴿وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ﴾ یعنی لیکن روزی سے ان کو اتنی روزی دیتا ہے جس کو وہ پسند کرتا ہے، اس قسم سے جس میں اس کی بہتری ہے اور وہ اس کو خوب جانتا ہے، چنانچہ وہ اس شخص کو غنی کرتا ہے جو غنا کا مستحق ہے اور جو فقر کا مستحق ہو اسے فقیر کرتا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ بے شک میرے بندوں میں وہ ہے کہ اس کی اصلاح نہیں کرتی مگر غنا اور اگر میں اس کو فقیر کر دوں تو اس پر اس کے دین کو فاسد کر دوں اور بے شک میرے بندوں میں وہ ہے کہ اس کی اصلاح نہیں کرتا مگر فقر اور اگر میں اس کو غنی کر دیتا تو البتہ اس پر اس کا دین فاسد کر ڈالتا۔[2]

قولہ سبحانہٗ: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا﴾ یعنی وہی ہے جو لوگوں کے پانی سے ناامید ہو جانے کے بعد اس کو ان پر اس وقت نازل کرتا ہے جب انھیں اس کی حاجت ہوتی ہے، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ﴾ [الروم: ٤٩] ”یقین مانا کہ بارش ان پر برسنے سے پہلے پہلے تو وہ ناامید ہو رہے تھے۔“ قوله جل جلاله: ﴿وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ﴾ یعنی اس رحمت کے وجود کو اس قطر اور کنارے کے لوگوں پر عام کرتا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے عرض کی: اے امیر المومنین! بارش رک گئی اور لوگ آس توڑ بیٹھے تو عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”مُطِرْتُمْ“، یعنی اب تم پانی برسائے گئے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ﴾[3] یعنی اپنی خلق کے لیے اس شے کے ساتھ تصرف کرنے والا ہے جو ان کو دنیا اور آخرت میں نفع دیتی ہے اور وہی ان اشیاء میں جن کو مقدر فرماتا ہے اور ان کاموں میں جن کو کرتا ہے محمود العاقبہ، یعنی اچھے انجام والا ہے۔

آسمانوں وزمین اور جانوروں کی تخلیق قدرتِ الٰہی کی ایک نشانی ہے:

قولہ سبحانہٗ: ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ... الآية﴾ یعنی جو نشانیاں اللہ پاک کی عظمت اور

---

[1] تفسیر الطبري (٢١/٥٣٦) البتہ مرفوع روایت صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٠٦٣) اور صحیح مسلم: (١٠٥٢) میں مروی ہے۔

[2] حلية الأولياء (٨/٣١٨، ٣١٩) اس کی سند میں ”ہشام کنانی“ اور ”صدقہ دمشقی“ ضعیف راوی ہیں۔

[3] تفسیر الطبري (٢١/٥٣٧)

قدرتِ عظیم اور سلطانِ قاہر پر دلالت کرتی ہیں، ان میں سے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا ہے اور ان میں جتنے جانور بکھیرے ہیں، یعنی زمین و آسمان میں اُور جو مخلوق پیدا کی ہے، وہ سب کچھ اس کی نشانیاں ہیں۔ یہ قول فرشتوں کو اور انسانوں و جنوں کو اور دوسرے تمام حیوانات کو شامل ہے، ان کی شکلوں، رنگوں، زبانوں، طبیعتوں، جنسوں اور قسموں کے مختلف ہونے کے ساتھ۔ اللہ پاک نے آسمان اور زمین کے اطرافُ و اکناف میں ان کو متفرق کیا اور اس کے باوجود وہ جب چاہے اکٹھا کرنے پر قادر ہے یعنی قیامت کے دن اگلوں اور پچھلوں کو اور ساری خلائق کو ایک ایسے میدان میں جمع کرے گا کہ پکارنے والا ان کو اپنی آواز سنائے گا اور ایک نظر میں ان کو دیکھ لے گا، پھر اپنے عدل و حق کے حکم سے ان میں فیصلہ کرے گا۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ وہی ہے جو اپنے گناہ گار بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے، یعنی جو گناہ اور برائیاں انھوں نے کی ہیں، وہ جب ان سے توبہ کرتے ہیں تو ان کی توبہ کو قبول کر لیتا ہے۔ توبہ یہ ہے کہ معصیت پر نادم ہو اور اس سے باز رہے اور اس کو دوبارہ نہ کرنے کا عزم کرے۔ یہ تین شرطیں ہیں اس معصیت میں جو اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے، چنانچہ جب یہ شرطیں حاصل ہوگئیں تو توبہ صحیح ہوگئی اور اگر ان میں سے ایک شرط کم ہوئی تو توبہ صحیح نہیں ہوئی۔ رہی وہ معصیت جو آدمی کے حق سے متعلق ہے تو اس کی چار شرطیں ہیں: تین تو یہی ہیں اور چوتھی شرط یہ ہے کہ جس شخص کے حق میں معصیت کی ہے، اس کے حق سے بری ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنے اولیاء اور اہلِ طاعت سے توبہ کو قبول کرتا ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ توبہ تو سارے بندوں سے مقبول ہے، وہ مسلم ہوں یا کافر جبکہ وہ صحیح ہو اور خلوصِ نیت اور صحیح عزم سے صادر ہوئی ہو۔ توبہ کے ذکر اور حکم میں بہت سی حدیثیں صحیحین وغیرہما میں وارد ہوئی ہیں، چنانچہ بعض کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

تفسیر خازن میں ہے: کسی نے کہا کہ توبہ از روئے نیت و فعل معاصی سے منتقل ہونا اور از روئے نیت و فعل طاعات کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ سہل بن عبداللہ تستری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ توبہ احوالِ مذموم سے احوالِ محمود کی طرف منتقل ہونا ہے۔[2] جنید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ توبہ اللہ تعالیٰ کے سوا سے منہ پھیر لینا ہے۔[3] حقیقت میں یہ توبہ آخری درجے کی ہے۔ ایسی توبہ والوں کے ہاتھ میں مٹی سونا ہو جاتی ہے۔ قاضی صاحب رحمہ اللہ نے امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کا قول نقل فرمایا ہے کہ توبہ ایک اسم ہے جو چھے معنی پر واقع ہوتا ہے: گذشتہ گناہوں پر ندامت اور اس چیز کا استدراک جس کو فرائض میں سے ضائع کیا یا چھوڑا ہے اور اس کی قضا کی اور ردِ مظالم (اپنے ظلم کو لوٹانا) اور نفس کو طاعت میں گلانا، جس طرح کہ

[1] تفسير ابن كثير (٤/١٤٤-١٤٦) [2] تفسير الخازن (٦/١٢٣) [3] تفسير النسفي (٤/١٠٢)

تو نے معصیت میں اس کی پرورش کی اور اس کو معصیت کی تلخی چکھانا جس طرح تو نے اس کو معصیت کی حلاوت چکھائی اور اپنی سابقہ ہر ہنسی کے بدلے میں رونا۔[1] قبول مفعولِ ثانی کی طرف حرفِ "من و عن" سے متعدی کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں اخذ وابانت (لینا اور ظاہر کرنا) کے معنی شامل ہیں۔

شیخ زادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں اخذ کے معنی پائے جانے کی وجہ سے اس کو حرفِ "من" سے متعدی کیا جاتا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "قَبِلْتُهُ أَيْ: أَخَذْتُهُ" اور "إبانة" کے معنی شامل ہونے کی وجہ سے یہ حرف "عن" سے متعدی ہوتا ہے۔ بولتے ہیں: "قَبِلْتُهُ عَنْهُ أَيْ: أَزَلْتُهُ وَأَبَنْتُهُ عَنْهُ ﴿وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ﴾ یعنی اور معاف کرتا ہے سیئات سے علی العموم اس شخص کے لیے جس نے کسی گناہ سے توبہ کی اور عفو کرتا ہے۔ اس شخص کے لیے جس کے لیے چاہے بغیر توبہ کر کے بھی جبکہ وہ گناہ شرک کے علاوہ ہو۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے سیئات کی تفسیر "مَا دُوْنَ الشِّرْكِ" فرمائی ہے۔ یوں کہا ہے: "هُوَ مَا دُوْنَ الشِّرْكِ يَعْفُوْ لِمَنْ يَّشَاءُ بِلَا تَوْبَةٍ وَّيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ"[2] یعنی اور وہ اس خیر وشر کو جانتا ہے جو تم کرتے ہو، چنانچہ وہ ہر ایک کو بدلا دے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔ امام حمزہ، کسائی، حفص رحمہم اللہ اور خلف نے بہ تائے فوقیہ پڑھا ہے صیغۂ حاضر کی بنا پر اور باقی قراء نے بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے بنا برخبر اور یہ دونوں سبعیہ ہیں۔ ثانی کو امام ابو عبیدہ اور ابو حاتم رحمہما اللہ نے اختیار کیا ہے، اس لیے کہ یہ فعل دو خبروں کے درمیان واقع ہوا ہے۔[3]

﴿وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ موصول محلِ نصب میں ہے "أَيْ: يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ" "أَجَابَ وَاسْتَجَابَ" ایک معنی میں آتا ہے، حرفِ سین و تاء زائد ہے۔ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: حرفِ سین ایسی جگہ میں تاکیدِ فعل کے واسطے ہوتا ہے جیسے "تَعَظَّمَ وَاسْتَعْظَمَ"[4] معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ دعا قبول کرتا ہے ان لوگوں کی جو ایمان لائے اور نیک کام کیے اور عطا کرتا ہے ان کو وہ چیز جو انھوں نے اس سے طلب کی۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ قبول کرتا ہے مخلصین کی عبادت۔ کسی نے کہا کہ تقدیر "يَسْتَجِيْبُ لِلَّذِيْنَ" ہے حرفِ لام حذف کر دیا گیا ہے جس طرح کہ اس آیت میں محذوف ہوا ہے: ﴿وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ﴾ [المطففين: ٣] "اور جب انھیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔" اصل میں "كَالُوْا لَهُمْ" ہے۔ استجابت کی اصل یہ ہے کہ متعدی بہ حرفِ لام ہو جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ﴾ [الأنفال: ٢٤] "اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کے کہنے کو بجا لاؤ، جب کہ رسول تم کو تمھارے زندگی بخش چیز کی طرف بلاتا ہو۔" "أَيْ: أَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهِ" اس لیے کہ "استجاب" اور "أجاب" کے ایک ہی

[1] تفسير البيضاوي (١٢٩/٥) [2] تفسير النسفي (١٠٢/٤) [3] تفسير القرطبي (٢٦/١٦) [4] تفسير النسفي (١٠٢/٤)

معنی ہیں۔ صاحبِ کشاف نے سورۃ القصص کی تفسیر میں کہا ہے کہ استجابت دعا کی طرف تو بہ نفسہٖ متعدی ہوتی ہے اور داعی کی طرف بہ حرفِ لام اور جب داعی کی طرف متعدی ہوتی ہے تو غالب استعمال میں دعا محذوف ہوتی ہے۔ چنانچہ یوں بولتے ہیں: "اِسْتَجَابَ اللّٰهُ دُعَاءَهُ وَاسْتَجَابَ لَهُ" اور "اِسْتَجَابَ لَهُ دُعَاءَهُ" نہیں بولتے۔[1] پھر اگر کوئی کہے کہ اس شعر میں استجاب داعی کی طرف بہ نفسہٖ متعدی ہوا ہے۔ ؎

وَدَاعٍ دَعَا يَا مَنْ يُجِيْبُ النَّدٰى فَلَمْ يَسْتَجِبْهُ عِنْدَ ذَاكَ مُجِيْبُ

یعنی بہت سے پکارنے والے ہیں کہ انھوں نے یوں کہہ کر پکارا کہ اے وہ شخص کہ جواب دے عطا کی طرف سو اس کو اس وقت کسی جواب دینے والے نے جواب نہیں دیا۔

تو کہیں گے: اس کے معنی یہ ہیں: "فَلَمْ يَسْتَجِبْ دُعَاءَهُ مُجِيْبٌ" بنا بر حذفِ مضاف، مگر آیت میں حرفِ لام محذوف ہے۔ اس لیے کہ وہ معلوم ہے جس طرح کہ ﴿ كَالُوْهُمْ ﴾ [المطففين: ٣] میں معلوم ہونے کے سبب سے حذف ہوا ہے۔ بالجملہ معانی مذکورہ کی بنا پر ﴿ يَسْتَجِيْبُ ﴾ میں ضمیر فاعل کی مضمر ہے، اللہ پاک کی طرف راجع ہے اور موصول مفعول بہ ہے۔ اب یہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ پاک کے جواب دینے کے کیا معنی ہیں؟ چنانچہ کہیں گے کہ اجابت مجاز ہے اثابت سے، یعنی اللہ پاک مومنین عاملینِ صالحات کو طاعت پر ثواب دے گا۔ مجاز کی وجہ یہ ہے کہ جب طاعت دعا کے مشابہ ہوئی تو اس ثواب میں جو اس پر مترتب ہوتا ہے تو طاعت پر ثواب دینا ایسا ہوا، جیسا دعا کو قبول کیا۔ چنانچہ اس لیے اثابت کی تعبیر بطور استعارہ کے اجابت کے ساتھ کی جس طرح کہ طاعت کی تعبیر دعا کے ساتھ کی گئی۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ ان کو ان کی طاعت پر ثواب دے گا اور ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ دے گا جو ان کے اعمال کے ثواب سے علاوہ ہوگا۔ یہ زیادتی ان پر از راہِ تفضّل و مہربانی ہوگی۔[2]

کسی نے کہا کہ موصول محلِ رفع میں ہے، اس بنا پر کہ فاعل ہے ﴿ يَسْتَجِيْبُ ﴾ کا اور مفعول محذوف ہے "أَيْ: يَسْتَجِيْبُوْنَ اللّٰهَ بِالطَّاعَةِ إِذَا دَعَاهُمْ إِلَيْهَا" اس بنیاد پر کہ "اِسْتَجَابَ" بہ معنی "أَطَاعَ" ہے، یا "أَجَابَ"، یعنی جواب دیتے ہیں اللہ کو طاعت کے ساتھ، جبکہ وہ ان کو اس کی طرف بلاتا ہے، یا اس کے مطیع ہوتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ ﴾ [الأنفال: ٢٤] ۔ اور امام ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ سے جو بات مروی ہے وہ بھی اسی کی تائید کرتی ہے کہ موصول ﴿ يَسْتَجِيْبُ ﴾ کا فاعل ہے۔ کسی نے ان سے عرض کی: یا حضرت! ہمارا کیا حال ہے کہ ہم دعا کرتے ہیں، پھر وہ قبول نہیں کی جاتی؟ تو فرمایا کہ اس لیے کہ اس نے تم کو بلایا اور تم نے اس کو جواب نہ دیا۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ﴾ [یونس: ٢٥]

[1] الكشاف (٤٢٤/٣، ٤٢٥) [2] تفسير البغوي (١٩٤/٧)

''اور اللہ تعالیٰ سلامتی کے گھر کی طرف تم کو بلاتا ہے۔'' یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو بلایا اور یہ آیت پڑھی: ﴿ وَيَسْتَجِيبُ الَّذِينَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾[1] چنانچہ پہلی آیت سے تو اس طرف اشارہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بلایا اور دوسری آیت سے اس طرف اشارہ کیا کہ اس کے بلانے کا جواب نہیں دیا، مگر بعض نے، وہ بعض یہی مومنین عاملین صالحات ہیں۔

حاصل یہ ہوا کہ جن لوگوں نے اللہ پاک کے بلانے کا جواب دیا اور اس کی طاعت کی تو وہ ان کی دعا قبول کرتا ہے جب وہ اس سے دعا مانگتے ہیں۔ سفاقسی رحمہ اللہ نے بھی قولِ ثانی کو قوت دی ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں: ''وَيَسْتَدْعِي الَّذِينَ آمَنُوا الْإِجَابَةَ'' یعنی مومنین اجابت کی استدعا کرتے ہیں۔ ''استفعل'' کے معنی کی حقیقت اسی طرح ہے، اس معنی میں بھی موصول محلِ رفع میں ہے۔ فتح القدیر اور فتح البیان میں بھی پہلے قول کو اولیٰ کہا ہے۔[2]

﴿ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ﴾ یعنی اللہ پاک اپنے فضل سے ان کو اس شے سے زیادہ دے گا جو انھوں نے طلب کی، یا اس ثواب سے زیادہ دے گا جس کے وہ مستحق ہیں اپنی طرف سے اضافے کے طور پر۔ کسی نے کہا: زیادہ دینے کے معنی یہ ہیں کہ ان کی سفارش ان کے بھائیوں کے حق میں قبول کرے گا، چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے بندوں پر اس طرح سے احسان رکھا کہ جب وہ توبہ کرتے ہیں تو ان کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی سیئات سے عفو و درگزر کرتا ہے اور جب وہ اس سے دعا کرتے ہیں تو اسے قبول کرتا ہے اور اور ان کو اس سے بھی زیادہ دیتا ہے، جس کا انھوں نے اس سے سوال کیا۔[3]

قاضی صاحب مرحوم کے بیان کی وضاحت یہ ہے کہ جس صورت میں استجابت اللہ کا فعل ہو اور یہ معنی ہوں کہ اللہ مومنین کی دعا کو قبول کرتا ہے جب وہ کرتے ہیں اور اجابت اپنے اصلی معنی پر ہو تو ﴿ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ﴾ کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ اپنے فضل سے اس شے سے بھی زیادہ دیتا ہے جس کا انھوں نے سوال کیا اور جب اجابت اللہ کا فعل ہو اور اس کے معنی ثواب دینے کے ہوں تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ ان کو اپنے فضل سے اس ثواب سے بھی زیادہ دیتا ہے جس کے وہ مستحق ہیں اور جب استجابت مومنین کا فعل ہو اور اس کے معنی اطاعت ہوں تو معنی یہ ہوں گے کہ ان کو اپنے فضل سے اس شے سے بھی زیادہ دیتا ہے جس کے وہ اپنی اطاعت کے سبب سے مستوجب و مستحق ہیں۔ قاضی صاحب نے اس معنی کو نہایت ایجاز وحسن سے ادا کیا ہے، جیسا کہ ان کی عادت شریف ہے۔

بالجملہ جب اللہ پاک نے مومنین کا حال ذکر کیا تو اس کے مقابلے میں کافروں کا حال یوں بیان فرمایا: ﴿ وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴾ یعنی کافروں کے لیے سخت عذاب ہے، پھر چونکہ یہ بات وارد ہوتی تھی کہ اول آیت کا مقتضا ساری تقدیروں پر یہ ہے کہ مومن فراخی اور عیش میں ہو اس طرح سے کہ اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرمائے، یا وہ جس کرامت کا مستحق ہے اس سے زیادہ اس کو دے اور حال یہ ہے کہ مومن اکثر سختی اور طرح طرح کی

---

[1] روح المعاني (٣٧/٢٥) [2] فتح القدير (٧٠١/٤) فتح البيان (٣٠٢/١٢) [3] تفسير النسفي (١٠٢/٤، ١٠٣)

آزمایشوں اور فقر میں مبتلا ہوتا ہے، یہاں تک کہ مر جاتا ہے اور اجابت اور زیادت کا اثر اس میں ظاہر نہیں ہوتا تو اس حالت میں اور آیت ﴿ وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ میں جمع کیسے ہوگی؟ تو اللہ پاک نے اس کا یہ جواب دیا کہ اس کی شان تو یہی ہے، مگر یہ ضروری نہیں کہ استجابت کا اثر دنیا میں ظاہر ہو جائے، کیوں کہ وہ دنیا میں انسان کے کام کی تدبیر اس طرح سے کرتا ہے جو اس کی حکمتِ بالغہ کا تقاضا ہے۔

چنانچہ وہ فقیر کرتا ہے اور غنی کرتا ہے، تنگی کرتا ہے اور فراخی دیتا ہے۔ اگر سب کو غنی کر دیتا تو باغی ہو جاتے اور اگر سب کو فقیر کر دیتا تو مر جاتے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ یعنی اگر سارے بندوں کے لیے ان کی روزی فراخ کر دیتا تو وہ سب کے سب زمین میں نافرمان اور سرکش ہو جاتے اور اترا جاتے، نعمت میں مست ہو جاتے اور تکبر کرتے اور وہ شے طلب کرتے جس کا طلب کرنا ان کے لائق نہیں، اس لیے کہ غنا مبطرہ و ماشرہ ہے، یعنی اترانے اور مال مستی کرنے کا گھر ہے۔ عبرت کے لیے قارون اور فرعون کا حال کافی ہے۔ کسی نے کہا کہ اگر سب کو رزق میں برابر کر دیتا تو بعض بعض کا مطیع اور فرماں بردار نہ ہوتا اور صنعتیں اور پیشے بے کار ہو جاتے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ آیت ظاہری طور پر تمام قسم کے رزق کے لیے عام ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ خاص طور پر مطر (بارش) مراد ہے۔ یہ بات کہ رزق کی فراخی سرکشی کا باعث ہوتی ہے، اس کی کئی وجوہات ذکر کی ہیں، ان کے بیان کرنے میں طوالت ہے۔ "بغي" کی اصل اس شے کی مقدار یا کیفیت میں میانہ روی سے تجاوز کرنا ہے جس کو حاصل کرنے کا ارادہ ہو۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ "بغي" یہ ہے کہ ایک منزلت کے بعد ایک اور منزلت کو طلب کریں اور ایک جانور کے بعد ایک اور جانور، ایک سواری کے بعد ایک اور سواری، ایک لباس کے بعد ایک اور لباس طلب کریں۔[1]

﴿ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ﴾ یعنی لیکن اپنے بندوں کے لیے اپنی مشیت اور حکمتِ بالغہ کے مطابق ایک اندازے سے روزی اتارتا ہے۔ ﴿ يُنَزِّلُ ﴾ کو بہ تخفیف و تشدید پڑھا ہے اور دونوں سبعیہ ہیں۔ ﴿ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴾ یعنی بے شک اس کو اپنے بندوں کے احوال کی خوب خبر ہے اور جو چیز ان کی اصلاح کرتی ہے اسے خوب دیکھتا ہے، اسے خوب معلوم ہے کہ روزی کی فراخی فائدہ مند ہے یا تنگی۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک کے لیے وہی مقدر کرتا ہے جو اس کی اصلاح کرتی ہے اور اس کو زمین میں سرکشی اور فساد کرنے سے روکتی ہے، اور بندوں کے لیے وہی شے مقدر کرتا ہے جو اس کی حکمت کا تقاضا ہے۔ چنانچہ وہ فقیر کرتا ہے، غنی کرتا ہے، روکتا ہے، عطا فرماتا ہے، فراخی کرتا ہے اور تنگی کرتا ہے۔ اگر وہ سب کو غنی کر دیتا تو دھوم مچاتے اور اگر فقیر کر دیتا تو ہلاک ہو جاتے اور یہ جو دیکھتے ہو کہ کسی پر روزی کی فراخی ہے اور وہ بغاوت کرتا ہے اور کوئی ایسا ہے کہ بغیر فراخی کے بھی بغاوت کرتا ہے تو ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ فقر کے ساتھ بغاوت بہت کم ہے اور فراخی کے ساتھ بہت غالب اور اکثر ہے۔

[1] تفسير القرطبي (۲۷/۱۲)

امام ابو ہانی خولانی رحمہ اللہ سے مروی ہے، کہا: میں نے عمرو بن خریث رضی اللہ عنہ وغیرہ کو سنا وہ کہتے تھے کہ یہ آیت جو نازل ہوئی تو اصحابِ صفہ کے بارے میں ہے۔ انھوں نے کہا تھا: ''لَوْ أَنَّ لَنَا'' یعنی کاش ہمارے لیے دنیا ہوتی تو انھوں نے دنیا کی تمنا کی۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کی سند صحیح ہے[1] اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی اس کے مثل مروی ہے۔[2] پھر جب اللہ پاک نے یہ بیان کیا کہ وہ اپنی حکمت کے مقتضا سے زیادہ ان کو نہیں دیتا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ زیادہ دینا ان کے دین میں ان کو نقصان کرے گا تو اب یہ بیان کیا کہ وہ جس رزق کے محتاج ہوتے ہیں تو ان کو رزق دیتا ہے اور ان کو بھوک سے نہیں مارتا۔

چنانچہ ارشاد فرماتا ہے: ﴿ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ ﴾ اور وہی ہے جو مینہ کو اتارتا ہے جو فائدہ میں رزق کی سب سے بلند اور عام قسم ہے اور نفع اور مصلحت کے لحاظ سے روزی کی تمام اقسام سے زیادہ ہے۔ خاص کر کے اسم ''غیث'' ذکر فرمایا ''مطر'' نہ کہا، اس لیے کہ ''غیث'' خاص طور پر وہ پانی ہے جو رحمت اور نفع کے لیے نازل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ''غیث'' اس مطر کا نام ہے جو خشک سالی سے لوگوں کی فریاد رسی کرتا ہے، اسی لیے ''غیث'' کو نفع دینے والے ''مطر'' کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ چونکہ شدید آزمایش کے بعد نعمت کا حاصل ہونا فریاد رسی کا آخری مرتبہ ہوتا ہے اور اس سے بہت زیادہ فرحت اور مسرت حاصل ہوتی ہے، اس لیے اس کے بعد یہ فرمایا: ﴿ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا ﴾ یہ مزید احسان رکھتے ہوئے اور استدعائے شکر کے طور پر کہا، یعنی اس کے بعد کہ پانی برسنے سے ناامید ہو گئے تھے تو اب ناامیدی کے بعد اس پانی کے برسنے سے رحمتِ الٰہی کی قدر پہچانیں اور جس نعمت پر شکر واجب ہے، اس پر اس کا شکر ادا کریں۔ ﴿ قَنَطُوْا ﴾ کو عامہ نے بہ فتحِ نون پڑھا ہے اور کسی نے بہ کسرِ نون۔ یہ بھی ایک لغت ہے اور اسی پر ''لَا تَقْنَطُوْا'' کو متواتر میں بہ فتحِ نون پڑھا ہے اور ماضی میں بہ کسرِ نون نہیں پڑھا گیا مگر بطور شاذ۔

کلمۂ ﴿ مَا ﴾ مصدریہ ہے، ''أَيْ: بَعْدَ قُنُوْطِهِمْ'' ﴿ وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ﴾ رحمت سے مراد غیث کے برکات اور منافع ہیں ہر شے میں، یعنی نرم زمین میں اور سنگستان میں اور روئیدگی وحیوانات میں اور ارزانی جو بارش سے ہوتی ہے۔ یا رحمت سے مراد رحمتِ واسعہ ہے جو اشیائے مذکورہ کو ایک انتظام کے تحت منظم کرتا ہے۔ یا رحمت سے مراد خود مطر ہے۔ مطر کے دو نام ذکر کیے: ایک تو غیث، اس لیے کہ وہ سختیوں سے فریاد رسی کرتا ہے۔ دوسرا نام رحمت اس لیے کہ وہ نرمی ومہربانی واحسان ہے۔ زادہ رحمہ اللہ کا بیان ہے ﴿ رَحْمَتَهٗ ﴾ کی ضمیر اللہ پاک کی طرف راجع ہے۔ ﴿ يَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ﴾ فرمایا بعد ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ ﴾ کے، اس کے باوجود کہ غیث ایک رحمتِ بالغہ ہے، چنانچہ یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہے، یعنی عطفِ عام بر خاص کے باب سے ہے۔ گویا یوں فرمایا گیا کہ نازل کرتا ہے

---

[1] تفسير الطبري (٥٣٥/٢١، ٥٣٦) الدر المنثور (٣٥٢/٧) [2] مستدرك الحاكم (٤٨٣/٢)

رحمت کو جو غیث ہے اور رحمت کی باقی قسموں کو بھی پھیلاتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ رَحْمَتَهٗ ﴾ کی ضمیر غیب کی طرف راجع ہو اور معنی یہ ہوں کہ غیث کی برکات اور منافع کو پھیلاتا ہے اور خصب (فراخی و آسودگی) کو جو اس سے حاصل ہوتی ہے۔

﴿ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴾ یعنی وہی ہے جو اپنے بندوں کا متولی ہے اس طرح سے کہ ان پر احسان کرتا ہے اور اپنی رحمت پھیلاتا ہے اور اس احسان و انعام و رحمت پر حمد کا مستحق ہے کہ بندے اس کی حمد کریں اور اس کے انعام کا شکر بجالائیں۔ یا یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے صالح بندوں کا ولی ہے اس طرح سے کہ ان پر احسان کرتا ہے اور ان کے لیے منافع کھینچ لاتا ہے اور شر ان سے دور کرتا ہے اور اپنے انعام پر ان کی طرف سے حمد وثنا کا مستحق ہے کہ ان پر جو خاص اور عام انعامات کیے ہیں ان کا شکر ادا کریں۔

چونکہ حاصل اس آیت کا یہ ہے کہ اس شے کا بیان کیا جائے جو اللہ پاک کی وحدانیت اور الوہیت کے لائق متفرد ہونے کی دلیل ہے، اس لیے ایک اور آیت بیان کی جو اس کی کمال قدرت کی دلیل ہے، کون سی قدرت جو اس کی توحید اور تفرد بہ الوہیت اور بعث اور نشور کے وعدے کے سچا ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ﴾ یعنی اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کا اس عجیب وغریب کیفیت اور کاریگری سے پیدا کرنا ہے جو صانع حکیم قادر کے وجود باجود کو ظاہر ظہور بتا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجود پر استدلال کرنے میں علم کلام میں جو چار مسالک ثابت کیے ہیں، اس میں ان کی طرف اشارہ ہے، وہ یہ ہیں: جواہر کا حدوث اور جواہر کا امکان اور اعراض کا حدوث جو جواہر کے ساتھ قائم ہیں اور نیز اعراض کا امکان اور نیز اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ﴿ خَلْقُ ﴾ کی اضافت ﴿ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ﴾ کی طرف صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہے۔ ''أَيْ: اَلسَّمَاوَاتُ الْمَخْلُوْقَةُ وَالْأَرْضُ الْمَخْلُوْقَةُ'' (كما ذكره الكرخي)

﴿ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ﴾ میں دو وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ خَلْقُ ﴾ پر معطوف ہے بہ تقدیرِ مضاف ''أَيْ: وَخَلَقَ مَا بَثَّ'' دوسری وجہ یہ ہے کہ ''سَمَاوَات'' پر معطوف ہے۔ قاضی نے اس وجہ کو مقدم ذکر کیا ہے۔[1] معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک مختار یہی ہے۔ شاید اختیار کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تقدیرِ مضاف کی حاجت نہیں ہے۔ ﴿ دَآبَّةٍ ﴾ ہر اس شے کو کہتے ہیں جو زمین پر چلتی ہے۔ دبیب کے معنی ہیں نرم رفتن، یعنی ہلکے ہلکے چلنا۔ جب ﴿ دَآبَّةٍ ﴾ کے معنی کلامِ عرب میں یہ ہوئے تو اب کہو کہ ﴿ فِيْهِمَا ﴾ کی ضمیر جو آسمان و زمین کی طرف راجع ہے تو زمین میں تو دابہ کا ہونا ٹھیک ہے آسمان میں دابہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تو فراء کہتے ہیں کہ مراد ''مَا بَثَّ فِي الْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ'' ہے، آسمان مراد نہیں ہے۔ اس کی سند یہ ہے کہ دیکھو اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ

[1] تفسير البيضاوي (١٣١/٥)

﴿وَالْمَرْجَانُ﴾ [الرحمن: ٢٢] ''ان دونوں میں سے موتی اور مونگے برآمد ہوتے ہیں۔'' اس میں ﴿مِنْهُمَا﴾ ضمیر تثنیہ ہے اور موتی اور مرجان جو نکلتے ہیں وہ دریائے شور (کھارے) سے نکلتے ہیں شیریں دریا سے نہیں نکلتے۔ امام ابوعلی فارسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تقدیر یہ ہے: ''وَمَا بَثَّ فِيْ أَحَدِهِمَا'' مضاف محذوف ہے۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں ملائکہ اور آدمی داخل ہیں[2] اور اللہ پاک نے فرما دیا ہے: ﴿وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل: ٨] ''وہ ایسی بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کا تمھیں علم بھی نہیں ہے۔''

امام کرخی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ زمخشری رحمہ اللہ نے جو یہ جائز رکھا ہے کہ فرشتوں کے لیے پرندوں کے ساتھ چلنا ہو تو وہ موصوف بہ دبیب ہوں، جس طرح کہ انسان اس کے ساتھ موصوف ہوتے ہیں۔ یا اللہ تعالیٰ آسمانوں میں حیوانات پیدا فرمائے جو اُن میں چلیں، جس طرح کہ انسان زمین میں چلتے ہیں۔[3] مگر یہ قول سمجھ سے بعید ہے، اس لیے کہ عرفِ عام کے خلاف ہے اور اس لیے کہ شے اسی وقت آیت ہوتی ہے جبکہ وہ معلوم ہو اور ظاہر و مکشوف ہو۔ اسی لیے قاضی صاحب مرحوم نے اس قول کو چھوڑ دیا۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے آخر میں ''وَلَا يَبْعُدُ'' کہہ کر کے اس کو ذکر کیا ہے۔[4]

پہلے یوں کہا ہے کہ دواب صرف زمین میں ہوتے ہیں، لیکن جائز ہے کہ ''شيء'' کی نسبت جمیع مذکور کی طرف کی جائے گو وہ شے کسی اور کے ساتھ مذکور ہو جس طرح کہ محاورے میں بولتے ہیں: ''بَنُوْ تَمِيْمٍ فِيْهِمْ شَاعِرٌ مَجِيْدٌ'' حالاں کہ وہ شاعر انھی میں سے ایک فرد ہوتا ہے غرضیکہ محاورۂ عرب میں مفرد کی جگہ تثنیہ اور تثنیہ کی جگہ مفرد بولتے ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا ہے کہ ﴿دَآبَّةٍ﴾ سے مراد ''حيّ'' ہے بطور مجاز، یعنی اسم مسبب کا اطلاق سبب پر کیا ہے۔[5] اس لیے کہ حیات دبیب کا سبب ہے، چنانچہ حیات پر اور ﴿دَآبَّةٍ﴾ پر اسمِ دبیب کا اطلاق کیا گیا اور اس میں شک نہیں کہ فرشتے زندہ ہیں، چنانچہ اس لحاظ سے ﴿دَآبَّةٍ﴾ میں فرشتے اور انسان وحیوان سب داخل ہیں۔ یا یوں کہو کہ ﴿دَآبَّةٍ﴾ سے مراد اس کے لغوی معنی ہیں، یعنی ''مَا يَدِبُّ عَلَى الْأَرْضِ''۔

چنانچہ اس معنی سے دابہ صرف زمین میں ''مبثوث'' ہے، لیکن اس کا رجوع اسی طرف ہے کہ وہ دونوں ''مبثوث'' ہے۔ اس بنا پر کہ جو شے ''أَحَدُ الشَّيْئَيْنِ'' میں ہوتی ہے تو اس پر یہ بات صادق آتی ہے کہ وہ ان دونوں میں ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی فعل جماعت میں سے کسی ایک سے صادر ہوا تو اس کی نسبت ساری جماعت کی طرف کی جاتی ہے، اس لیے کہ اس کا وقوع ان کے درمیان ہوا ہے، اس لیے اس طرح بولتے ہیں: ''بَنُوْ فُلَانٍ فَعَلُوْا كَذَا''۔ حالانکہ اس فعل کو ان میں سے صرف ایک نے کیا ہے۔ غرضیکہ اس جگہ نزاع کا دارو مدار دو کلمے ہیں ایک تو ﴿فِيْهِمَا﴾ اور دوسرا ﴿دَآبَّةٍ﴾۔ پس ﴿دَآبَّةٍ﴾ کو اپنے معنی پر رکھو تو ﴿فِيْهِمَا﴾ نہیں بنتا۔ کسی نے تو

[1] تفسير القرطبي (٢٩/١٦) [2] تفسير الطبري (٥٣٨/٢١) [3] الكشاف (٢٢٩/٤)
[4] تفسير النسفي (١٠٣/٤) [5] تفسير البيضاوي (١٣١/٥)

اس نزاع کا فیصلہ یہ کیا ہے کہ ﴿ فِيْهِمَا ﴾ میں تصرف فرمایا اور ﴿ دَآبَّةٍ ﴾ کو اپنے معنی پر رکھا۔

کسی نے ﴿ دَآبَّةٍ ﴾ میں تصرف کیا اور ﴿ فِيْهِمَا ﴾ کو اپنے حال پر رہنے دیا، چنانچہ اس کی ساری تفصیل بیان ہو چکی۔ نزاع کی وجہ صرف یہ ہوئی کہ ﴿ فِيْهِمَا ﴾ کے یہ معنی سمجھے کہ ﴿ دَآبَّةٍ ﴾ کا ظرف آسمان و زمین دونوں ہیں تو آسمان میں علاحدہ دواب ہوئے اور زمین میں علاحدہ، حالانکہ دواب زمین میں ہیں اور آسمان میں فرشتے ہیں جن کو دواب نہیں کہتے تو اب کل بٹھانے کی ضرورت ہوئی، اب اگر یوں کہیں کہ یہاں ﴿ فِيْهِمَا ﴾ فرمایا ہے، اگر ''علیھما'' ہوتا تو آسمان اور زمین کے علاحدہ علاحدہ دواب کہنے پڑتے اور دقت پیش آتی۔ ﴿ فِيْهِمَا ﴾ کو بہ معنی ''بَيْنَهُمَا'' کہو اور بے شک دواب و حیوانات آسمان اور زمین کے درمیان بکھیرے گئے ہیں، اس میں کسی طرح کی دقت نہیں۔ ﴿ دَآبَّةٍ ﴾ اور ﴿ فِيْهِمَا ﴾ دونوں اپنے حال پر رہے اور فیصلہ ہو گیا۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ۔ یا یوں کہو کہ زمین وما فیہا آسمان کے اندر ہے تو جو شے زمین پر ہے وہ بطریقِ اولیٰ آسمان میں ہوئی۔

بالجملہ جب یہ بیان کیا کہ اللہ پاک نے انواع و اقسام کے حیوان اور انسان روئے زمین پر متفرق کیے تو بیان کیا کہ ان کا متفرق کرنا عجز کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ ایک مصلحت کے لیے ہے اور جس طرح ان کو متفرق کیا ہے ان کو جمع کرنے پر بھی قادر ہے، وہ جس وقت ان کو حشر و جزا و حساب کے لیے جمع کرنا چاہے گا تو یہ کام ہو جائے گا۔

﴿ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ﴾۔ کلمہ ﴿ هُوَ ﴾ مبتداء ہے اور ﴿ قَدِيْرٌ ﴾ اس کی خبر ہے اور ﴿ عَلٰى جَمْعِهِمْ ﴾، ﴿ قَدِيْرٌ ﴾ سے متعلق ہے اور ﴿ إِذَا يَشَآءُ ﴾، ﴿ جَمْعِهِمْ ﴾ کا ظرف ہے ﴿ قَدِيْرٌ ﴾ کا نہیں ہے، اس لیے کہ ﴿ إِذَا ﴾ مستقبل کا ظرف ہے اور اللہ پاک کی قدرت ازلی ہے مشیت کے ساتھ متعلق نہیں ہے۔ مشیت کے ساتھ مقید اللہ تعالیٰ کا جمع کرنا ہے، اس کی قدرت مقید بہ مشیت نہیں ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا: اس واسطے کہ اس سے یہ معنی ہو جائیں گے کہ وہ ان کے جمع کرنے پر قادر ہے، اس وقت کہ جب چاہے، تو اب قدرت مشیت کے ساتھ متعلق ہو جائے گی، حالاں کہ یہ بات محال ہے[1] اور کلمہ ﴿ إِذَا ﴾ جب وقت کے معنی میں ہوتا ہے تو مضارع پر داخل ہوتا ہے جس طرح کہ ماضی پر آتا ہے۔

امام سمین اور شہاب الدین رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ اہلِ سنت کے مذہب پر اس کے محال ہونے کی کیا وجہ ہے۔ اگر امام ابو البقاء رحمہ اللہ معتزلہ کے اس قول کے قائل ہوں کہ قدرت اس شے کے ساتھ متعلق ہوتی ہے جس کو اللہ نے چاہا تو ان کی بات چل جائے گی، لیکن یہ قول تو ایک ردی مذہب ہے، اس کا اعتقاد جائز نہیں ہے۔[2] بالجملہ جبکہ یہ جمع کرنا جو ﴿ عَلٰى جَمْعِهِمْ ﴾ میں مذکور ہے یہی حساب و جزا کے لیے جمع کرنا تھا، اس لیے اللہ پاک نے اس کے بعد یہ بیان کیا کہ بندۂ مومن سے جو جنایات (گناہ) واقع ہوتے ہیں تو ان کو طرح طرح کی مصیبتیں اور

[1] التبيان في إعراب القرآن (۲/۱۱۳۳) [2] فتح القدير (۴/۷۰۵)

آزمائشیں دے کر اُن سے پاک صاف کرتا ہے، تاکہ اس کو قیامت کے دن ان کے بوجھ سے ہلکا پھلکا کر دے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۝٣٠ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝٣١

اور تمھیں جو بھی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمھارے اپنے ہی کرتوتوں کی وجہ سے (پہنچتی ہے)، اور بہت سی باتوں سے تو وہ درگزر ہی فرماتا ہے (30) اور تم (اسے) زمین میں عاجز کرنے والے نہیں ہو اور تمھارے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ کوئی مددگار (31)

مصیبتیں نافرمانیوں کے سبب سے آتی ہیں:

یہ خطاب عاقل بالغ لوگوں کو ہے۔ وہ گناہ گار ہوں یا نیک۔ مگر نبی نہیں داخل اور بچے ان کو اور کچھ واسطے ہو گا۔ اور دنیا کی سختی بھی آ گئی اور قبر کی اور آخرت کی بھی۔ انتھٰی.

اللہ پاک فرماتا ہے: اے لوگو! تم پر جو کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ گناہوں ہی کے سبب سے ہے جو تم سے ہو چکے ہیں اور وہ بہت سے گناہوں سے درگزر کرتا ہے سو ان پر تم کو جزا نہیں دیتا، بلکہ ان کو معاف کر دیتا ہے۔ ﴿ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ ﴾ [الفاطر: ٤٥] ''اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر ان کے اعمال کے سبب دار و گیر فرمانے لگتا تو روئے زمین پر ایک جاندار کو نہ چھوڑتا۔'' صحیح حدیث میں آیا ہے قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! مومن کو کوئی رنج و بیماری و مشقت و تھکاوٹ و فکر و غم نہیں پہنچتا، مگر اللہ تعالیٰ اس کے سبب سے اس کی خطاؤں کا کفارہ کر دیتا ہے، یہاں تک کہ ایک کانٹا بھی اگر اسے چبھ جائے تو وہ بھی اس کی خطاؤں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔[2]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ایوب سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے امام ابو قلابہ کی کتاب میں پڑھا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴾ [الزلزال: ٧۔ ٨] ''پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا۔'' تو سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کھانا کھا رہے تھے تو رک گئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! کیا میں اس شے کو دیکھوں گا جو میں نے خیر و شر سے کیا؟ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَرَأَيْتَ مَا رَأَيْتَ مِمَّا تَكْرَهُ فَهُوَ مِنْ مَثَاقِيلِ ذَرِّ الشَّرِّ وَتَدَّخِرُ

---

[1] فتح البيان (١٢/٣٠١۔٣٠٤)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٣)

﴿مَثَاقِيلَ الْخَيْرِ﴾ یعنی کیا تو نے دیکھا کہ جو شے تو نے اس شے سے دیکھی جس کو تو مکروہ سمجھتا ہے، پس وہ مثاقیل ذرِ شر سے ہے اور مثاقیل خیر ذخیرہ کیے جائیں گے یہاں تک کہ تو وہ دیا جائے گا قیامت کے دن۔ ابو ادریس رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ میں اس کا مصداق کتاب اللہ کی اس آیت میں دیکھتا ہوں: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾[1] پھر ابن جریر طبری نے اسے دوسرے واسطے سے عن ابی قلابہ عن انس کے واسطے سے روایت کیا ہے کہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن ابی سخیلہ عن علی رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے فرمایا: کیا میں تم کو اللہ کی کتاب کی افضل آیت کی خبر نہ دوں اور ہم کو حدیث بیان کی اس کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾ اور اے علی! ابھی میں تیرے لیے اس کی تفسیر کرتا ہوں کہ تم کو جو کوئی مرض یا سزا یا کوئی آزمائش دنیا میں تمھارے ہاتھوں کی کمائی کے بدلے میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ حلیم ہے کہ اس پر آخرت میں دوبارہ عذاب کرے اور جس شے سے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں عفو کیا تو اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ کریم ہے کہ اپنے معاف کرنے کے بعد عود کرے۔[2] (وكذا رواه الإمام أحمد عن مروان بن معاوية و عبدة عن أبي سخيلة قال: قال علي رضي الله عنه فذكر نحوه مرفوعا)

پھر امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بہ وجہ دیگر مثل اس کے ابو جحیفہ رحمہ اللہ سے موقوفاً روایت کیا ہے، کہا: میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو انھوں نے فرمایا کہ "میں تم کو ایک ایسی حدیث بیان نہ کروں کہ ہر مومن کو لائق ہے کہ اسے یاد رکھے۔" پھر ہم نے ان سے پوچھا تو یہ آیت پڑھی: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾ فرمایا: جس شے سے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں عفو کیا تو اللہ تعالیٰ اس سے کریم تر ہے کہ قیامت کے دن اپنے عفو میں عود کرے۔[3] امام احمد رحمہ اللہ نے معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ فرماتے تھے: مومن کو کوئی تکلیف اس کے جسم میں نہیں پہنچتی مگر اللہ تعالیٰ اس کے سبب اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔[4] امام احمد رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بندے کے گناہ بہت ہو جاتے ہیں اور کوئی ایسی شے نہیں ہوتی جو اس کے گناہوں کا کفارہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے "حُزن" (غم) میں مبتلا کرتا ہے، تاکہ ان گناہوں کا کفارہ کر دے۔[5] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے حسن بصری رحمہ اللہ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے، کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ مَا مِنْ خَدْشٍ

---

[1] تفسیر الطبري (٥٣٩،٥٣٨/٢١) یہ روایت مرسل ہے۔

[2] مسند أحمد (٨٥/١) اس کی سند میں "ابو سخیلہ اور خضر بن قواس" مجہول اور "ازھر بن راشد" ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٢٧٨/١٠) [4] مسند أحمد (٩٨/٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢٧٤)

[5] مسند أحمد (١٥٧/٦) اس کی سند میں "لیث بن ابی سلیم" ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٢٦٩٥)

عُوْدٍ، وَلَا اخْتِلَاجِ عِرْقٍ وَلَا عَثْرَةِ قَدَمٍ إِلَّا بِذَنْبٍ» یعنی قسم ہے، اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے نہیں ہے کسی لکڑی کا خراش لگانا اور نہ کسی رگ کا حرکت اور اضطراب کرنا اور نہ قدم کا لڑکھڑانا مگر کسی گناہ کے سبب سے اور جن گناہوں کو اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے وہ بہت زیادہ ہیں۔[1] نیز امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان کے بعض ساتھی ان کے پاس آئے اور وہ اپنے جسم میں مبتلا کیے گئے تھے، یعنی انھیں کوئی بیماری تھی تو بعض اصحاب نے ان سے کہا کہ ہم اس بیماری کی وجہ سے جو تم میں دیکھ رہے ہیں، رنج کرتے ہیں۔ عمران بولے: تم رنجیدہ نہ ہو، بے شک جس شے کو تم دیکھتے ہو یہ کسی گناہ کے سبب سے ہے اور وہ شے جس سے اللہ تعالیٰ عفو کرتا ہے اکثر ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾

نیز امام ابو البلاد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے علاء بن بدر رحمہ اللہ سے ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾ کے بارے میں پوچھا اور میری بینائی جا چکی تھی جب کہ میں بچہ تھا۔ امام علاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تیرے ماں باپ کے گناہوں کے سبب سے ہے۔ نیز امام ضحاک رحمہ اللہ سے روایت کیا، کہا کہ ہم نہیں جانتے کسی کو کہ اس نے قرآن یاد کیا، پھر وہ اس کو بھول گیا مگر کسی گناہ کے سبب سے۔ پھر ضحاک رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾، پھر امام ضحاک رحمہ اللہ کہتے کہ قرآن کے بھولنے سے بڑی اور کون سی مصیبت ہے۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ کلمہ ﴿مَا﴾ شرطیہ ہے، اسی لیے جمہور کی قراءت میں حرفِ "فاء" اس کے جواب میں آیا ہے۔ نافع و ابن عامر رحمہما اللہ نے بغیر "فاء" پڑھا ہے۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس "فاء" کا حذف کرنا جائز نہیں۔ امام اخفش رحمہ اللہ اور بعض بغدادیوں نے حذف کو جائز رکھا ہے جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ﴾[3] [الأنعام: ١٢١] "اگر تم ان لوگوں کی اطاعت کرنے لگو تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ گے۔" اور اس شعر میں ہے:

مَنْ يَفْعَلِ الْحَسَنَاتِ اللّٰهُ يَشْكُرُهَا وَالشَّرُّ بِالشَّرِّ عِنْدَ اللّٰهِ مِثْلَانِ

امام ابو البقاء رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[4] کسی نے کہا ہے کہ کلمہ "ما" موصولہ ہے تو اب حذف و اثبات "فاء" دونوں جائز ہوں گے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "فاء" کا اثبات جید تر ہے،

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٢٧٨/١٠) یہ روایت مرسل ہے۔

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٢٧٨/١٠، ٣٢٧٩) تفسیر ابن کثیر (١٤٦/٤، ١٤٧)

[3] تفسیر القرطبي (٣٠/١٦) [4] التبیان في إعراب القرآن (١١٣٣/٢)

اس لیے کہ "فاء" مجازاۃ جوابِ شرط ہے[1] اور جس نے "فاء" کو حذف کیا ہے سو اس بنا پر کہ "ما" بہ معنی "الذي" ہے۔ "أَيْ: اَلَّذِيْ أَصَابَكُمْ وَقَعَ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيْكُمْ" یعنی مصائب میں سے جو کوئی مصیبت تم کو پہنچے کوئی بھی مصیبت ہو تو وہ ان گناہوں کے سبب سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے کمائے۔ گناہوں کی نسبت جو ہاتھوں کی طرف کی تو اس لیے کہ اکثر کام انھی ہاتھوں سے وقوع میں آتے ہیں۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مصیبت اس جگہ وہ حدیں ہیں جو گناہوں پر لگائی جاتی ہیں۔[2] زیادہ صحیح یہ ہے کہ مصیبت کو عموم پر محمول کیا جائے۔ چنانچہ سیاقِ نفی میں نکرہ کا وقوع اور اس پر "من" استغراقی کا داخل ہونا اسی عموم کو ظاہر کرتا ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے جو حدود کے ساتھ تفسیر فرمائی تو اس لیے کہ یہ بھی عام مصیبت ہی کی طرح ایک مصیبت ہے جو اکثر واقع ہوا کرتی ہے۔ ان کی غرض کسی خاص قسم کی مصیبت میں حصر کرنا نہیں ہے اور اکثر صحابہ و تابعین کی تفاسیر اسی قبیل سے ہوتی ہیں، چنانچہ ضحاک رحمہ اللہ نے قرآن شریف کے بھول جانے کو سب سے بڑی مصیبت ٹھہرایا ہے۔[3]

صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید کے نسیان کے ساتھ سنتِ مطہرہ کا نسیان بھی ملحق ہے اور اس پر عمل چھوڑ دینا اور سنتِ صحیحہ کے موجود ہونے کے باوجود رائے محض کو اس پر اختیار کرنا بھی شامل ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی روایت، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، کے بعد یوں کہا ہے:[4] أخرجه أحمد وابن منيع وابن راهويه وعبد بن حميد و الحكيم الترمذي وأبو يعلىٰ وابن المنذر وابن أبي حاتم وابن مردويه والحاكم. کسی نے کہا کہ ان مصائب سے مراد احوالِ مکروہ ہیں، جیسے: درد اور بیماریاں اور قحط و آزمایش و غرق و جل جانا و صواعق وغیرہ مصائب۔ تناسخ کے قائل حضرات نے اس آیت کا دامن پکڑا اور یوں کہا کہ اگر اطفال کے لیے کوئی حالت نہ ہوتی جس پر وہ اس حالت سے پہلے تھے تو وہ درد والم نہ پاتے۔ حق یہ ہے کہ ان کا تعلق اس آیت سے صحیح نہیں ہے یہ تو مکلف لوگوں کے ساتھ خاص ہے۔ سیاق و سباق دونوں اس تخصیص کے شاہدِ عدل ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴾ یعنی اللہ پاک بہت گناہوں سے، جن کو بندے کرتے ہیں، درگزر فرماتا ہے، چنانچہ ان پر عتاب نہیں کرتا، یا بہت سے لوگوں کو معاف کرتا ہے اور ان کو جلد سزا نہیں دیتا۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ بندے سے ان مصیبتوں کے سبب سے جو اس کو پہنچتی ہیں کفارہ کرتا ہے اور بہت سے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ صحیح دلیلوں سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ دنیا میں ساری مصیبتیں جو انسان کو پہنچتی ہیں ان سب پر اس کو اجر ملے گا، یا اس سے اس کے گناہوں کا کفارہ کیا جائے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت کافروں کے لیے خاص ہے، اس معنی سے کہ ان کو جو مصیبت ان کے گناہوں کے سبب سے پہنچتی ہے، اس کے بغیر ہے کہ ان کے کسی گناہ کا کفارہ ہو اور ان کے لیے

---

[1] معاني القرآن (٤/٣٩٩) [2] تفسير القرطبي (١٦/٣٠) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٧٩)

[4] فتح البيان (١٢/٣٠٥) البتہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ والی روایت کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

کوئی ثواب حاصل کرے، ان کے بہت سے گناہوں کی سزا چھوڑ رکھی جاتی ہے۔ دنیا میں ان پر سزا کی جلدی نہیں کرتا، بلکہ دارِ آخرت تک ان کو مہلت دیتا ہے۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ آیت کو عموم پر محمول کیا جائے اور عفو جس طرح گناہ کے مٹانے پر اور اس کے بارے میں پوچھ گچھ کے رفع کرنے پر صادق آتا ہے، اسی طرح عذاب کی تاخیر پر بھی صادق آتا ہے۔

امام واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک کی کتاب میں یہ آیت سب آیتوں سے بڑھ کر رجا اور امید کی ہے، اس لیے کہ اللہ سبحانہ نے مومنین کے گناہوں کی دو قسمیں کیں: ایک قسم کا تو ان کے مصائب کے سبب سے کفارہ کر دیا اور ایک قسم سے دنیا میں عفو کر دیا اور وہ کریم ہے، اپنی عفو میں رجوع نہیں کرتا۔ چنانچہ یہ تو اللہ پاک کا مومنوں کے ساتھ طریقہ ہے۔ رہا کافر تو اس کے گناہ کی سزا میں دنیا میں جلدی نہیں کرتا، یہاں تک کہ قیامت کے دن اس گناہ کو لے کر اس سے ملے گا۔[1] امام ترمذی اور عبد بن حمید رحمہ اللہ نے سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی بندے کو کوئی نکبت (رنج و خواری) نہیں پہنچتی زیادہ یا کم مگر گناہ کے سبب سے اور جو اللہ اس سے معاف کر دیتا ہے وہ بہت زیادہ ہے، اور یہ آیت پڑھی: ﴿وَمَآ اَصٰبَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾[2] (نکبة بالفتح رنج و رنج رسانیدن۔ کذا في الصراح)۔ مجمع البحار میں کہا ہے: "ما يصيب الإنسان من الحوادث" دوسری حدیث کے ذیل میں کہا ہے: "الجراحة بحجر أو شوكة")۔[3] امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَا عَثْرَةُ قَدَمٍ وَلَا اخْتِلَاجُ عِرْقٍ وَلَا خَدْشُ عُوْدٍ إِلَّا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيْكُمْ وَمَا يَعْفُو اللّٰهُ أَكْثَرُ»[4] اس کے معنی پہلے گزر چکے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ﴾ یعنی تم اس شے سے جو اللہ تعالیٰ نے تم کو جاری کی ہے بھاگ کر نہ زمین میں فوت ہونے والے ہو اور نہ آسمان میں، اگر تم اس میں ہوتے، بلکہ اس نے جن مصائب کو تم پر جاری کیا ہے وہ ضرور تم پر واقع اور نازل ہوں گے۔ ﴿وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾ یعنی اور تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی ولی نہیں ہے کہ تم سے دوستی کرے اور اللہ کی جاری کی ہوئی شے کو تم سے روکے اور نہ کوئی مددگار ہے کہ دنیا اور آخرت میں اللہ کے عذاب سے تمھاری مدد کرے۔ پھر اللہ سبحانہٗ نے ان بڑی نشانیوں میں سے ایک اور نشانی ذکر کی جو اللہ قادر حکیم کے وجود پر اور اس کی توحید اور صدقِ وعدہ پر دال ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[5]

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿٣٢﴾ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

[1] فتح القدير (٧٠٥/٤) [2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٥٢) [3] مجمع بحار الأنوار (٧٧٩/٤)
[4] الدر المنثور (٣٥٥/٧) [5] فتح البيان (٣٠٤/١٢-٣٠٦)

لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۳﴾ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۴﴾ وَّيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۵﴾

اور اسی کی نشانیوں میں سے ہیں سمندر میں (چلنے والے) پہاڑوں جیسے جہاز (اور کشتیاں) ﴿32﴾ اگر وہ چاہے تو ہوا کو روک لے، پھر وہ (جہاز) سمندر کی سطح پر کھڑے رہ جائیں۔ بلاشبہ اس میں ہر صابر شاکر کے لیے عظیم نشانیاں ہیں ﴿33﴾ یا وہ (چاہے تو) انھیں ان کے کرتوتوں کی وجہ سے تباہ کر دے اور (چاہے تو) بہت سوں سے درگزر کرے ﴿34﴾ اور (تاکہ) وہ لوگ جان لیں جو ہماری آیات میں جھگڑتے ہیں کہ ان کے لیے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ﴿35﴾

اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک اور نشانی سمندر کی تسخیر اور بحری جہازوں کا چلنا:

جو لوگ ہر چیز اپنی تدبیر سے سمجھتے ہیں اس وقت عاجز رہ جائیں گے۔ انتہی۔

جو نشانیاں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ باہر اور سلطانِ قاہر پر دلالت کرتی ہیں ان میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے سمندر کو مسخر کیا ہے، تاکہ اس میں اس کے حکم سے کشتیاں چلیں۔ وہ یہی جہاز ہیں پہاڑوں کی طرح جو سمندر میں چلتے ہیں۔ یہ قول امام مجاہد، حسن، سدی اور ضحاک رحمہم اللہ کا ہے[1] یعنی یہ جہاز سمندر میں اس طرح ہیں جیسے جنگل میں پہاڑ ہوتے ہیں۔ ﴿اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک چاہتا تو اس ہوا کو جو جہازوں میں کو لے کر سمندر میں چلتی ہے، تھام دیتا یہاں تک کہ جہاز حرکت نہ کرتے اور تھمے ہوئے رہ جاتے، نہ آتے نہ جاتے، بلکہ سمندر کی ظہر (پیٹھ) پر ٹھہرے رہتے۔

﴿عَلٰى ظَهْرِهٖ﴾ کے معنی ہیں برروئے آب۔ ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ﴾ یعنی بے شک اس بات میں کہ اللہ پاک نے سمندر کو مسخر کیا اور اس قدر ہوا چلائی، جتنی ان کی ضرورت ہوتی ہے، البتہ اللہ پاک کی ان نعمتوں کی نشانیاں ہیں جو اس کی مخلوق پر ہیں اور ہر اس شخص کے لیے ہیں جو سختیوں پر بڑا صبر کرنے والا اور راحتوں میں بڑا شکر کرنے والا ہے۔ ﴿اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا﴾ یعنی اگر چاہتا تو ان لوگوں کے گناہوں کے سبب سے جو ان میں سوار ہیں، وہ ان جہازوں کو تباہ کر دیتا اور غرق کر دیتا۔ ﴿وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ﴾ یعنی ان کے بہت گناہوں سے درگزر کرتا ہے اور اگر ان کو پکڑتا ان کے سارے گناہوں کے سبب تو ہر ایک کو جو جہاز میں سوار ہے ہلاک کر ڈالتا۔ بعض علمائے تفسیر نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر چاہتا تو زور دار سرکش ہوائیں بھیج دیتا، وہ

[1] تفسير الطبري (٥٤١/٢١)

جہازوں کو پکڑ لیتی تو ان کو تباہی کی حالت میں سیدھی چال سے پھیر کر دائیں یا بائیں طرف کر دیتی، پھر وہ جہاز نہ کسی راہ پر چلتے اور نہ منزلِ مقصود کی طرف چلتے۔

اس قول میں ان کا ہلاک کرنا شامل ہے اور جو پہلی آیت کے مناسبِ حال ہے وہ یہ ہے کہ اگر چاہتا تو ہوا کو تھام دیتا تو جہاز ٹھہر جاتے، یا اس کو زور دار کر دیتا تو جہاز راستے سے بھٹک کر ادھر اُدھر ہو جاتے اور ہلاک ہو جاتے، لیکن اللہ پاک اپنے لطف و کرم اور رحمت و محبت سے ہوا کو ضرورت کے مطابق بھیجتا ہے جس طرح کہ بارش کو بہ قدرِ کفایت بھیجتا ہے۔ اگر اس کو انتہائی درجہ کی تیز کر کے نازل کرتا تو مکانوں کو گرا دیتا، یا تھوڑا اتارتا تو نہ کھیتی اُگاتا نہ میوے، یہاں تک کہ جو زمین بلادِ مصر کی طرح ہے تو اَور زمین سے اس کی طرف سیح ("سيح هو الماء الجاري المنسط على الأرض" یعنی بہتا ہوا پانی زمین پر پھیلا ہوا۔ مصر کی زمین پر پانی نہیں برستا وہاں کی زمین نہایت نرم ہے بارش کے پانی کی متحمل نہیں ہوتی۔ اگر وہاں پانی برسے تو مکان گر جائیں۔ اس لیے اللہ پاک نے وہاں کا یہ انتظام کیا ہے کہ بلادِ حبش میں پانی برستا ہے اور دریائے نیل اس پانی کو مٹی کے ساتھ لاتا ہے، اس پر زراعت ہوتی ہے۔ کہیں کا پانی اور مٹی اور کھیتی کہیں ہو۔ فسبحن الله القادر الحكيم لا إله إلا هو ولا رب سواه) بھیجتا، اس لیے کہ ان کو بارش کی حاجت نہیں ہے اور اگر ان پر بارش کا پانی نازل کرے تو ان کے مکانات گرا دے اور ان کی دیواریں گرا دے۔ قولہ تعالیٰ ﴿وَيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ... الآية﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ہمارے پاس اور قسمت سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں کیوں کہ وہ تو ہماری قدرت کے سبب سے مقہور ہیں۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

امام نافع اور ابو عمرو نے "الجواري" وصل میں بہ اثبات یاء پڑھا ہے۔[2] رہا وقف (نافع و ابو عمرو رحمہما اللہ نے بہ یاء حالتِ وصل میں نہ وقف میں) اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے بہ یاء حالتِ وصل و وقف میں اور باقی قراء نے بہ حذف یاء وصل و وقف میں پڑھا ہے، چنانچہ اثباتِ یاء بر اصل ہے اور حذف تخفیف کے لیے۔ ذكره شيخ زاده رحمہ اللہ) تو اس کا اثبات اصل پر ہے اور حذف تخفیف کے لیے ہے، اس لیے کہ یاءات زوائد سے ہیں۔ غرضیکہ حذفِ یاء خط میں اور اثبات وحذف وصلاً ووقفاً قراءاتِ سبعیہ ہیں۔ "جواري"، "جارية" کی جمع ہے، یعنی چلنے والی کشتیاں۔ "أعلام"، "علم" کی جمع ہے۔ "علَم" پہاڑ کو کہتے ہیں۔ اسی معنی میں خنساء کا اپنے بھائی صخر کے مرثیے میں یہ قول ہے:

وَإِنَّ صَخْرًا لَتَأْتَمُّ الْهُدَاةُ بِهِ كَأَنَّهُ عَلَمٌ فِيْ رَأْسِهِ نَارُ

یعنی بے شک صخر البتہ پیروی کرتے ہیں اس کی راہ بتانے والے، گویا وہ ایک پہاڑ ہے کہ اس کے سر میں آگ ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/١٤٧، ١٤٨) [2] فتح القدير (٤/٧٠٥)

مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس کا یہ قصیدہ پڑھوایا، پھر جب راوی اس بیت تک پہنچا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «قَاتَلَهَا اللّٰهُ مَا رَضِيَتْ بِتَشْبِيهِهِ بِالْجَبَلِ حَتّٰى جَعَلَتْ فِي رَأْسِهِ نَارًا»[1] ''اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرے! وہ اسے پہاڑ سے تشبیہ دے کر راضی نہیں ہوئی کہ اس کے سر پر آگ بھی متعین کر دی۔'' (كذا في شيخ زاده)

امام خلیل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب کے نزدیک ہر مرتفع شے ''علم'' ہے۔ یعنی ہر بلند شے ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''اعلام قصور'' ہیں[2] یعنی محل، واحد اس کا علم ہے۔ بالجملہ "جواري" کا موصوف محذوف ہے۔ "أَيْ: اَلسُّفُنُ الْجَوَارِيْ"۔ قرینہ ﴿فِي الْبَحْرِ﴾ کا موجود ہے اور ﴿فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ﴾ اس سے متعلق ہیں اور اگر "جواري" کو اسم جامد کہو گے تو یہ دونوں اس سے حال ہوں گے یا اس کی صفت۔

﴿إِنْ يَّشَأْ﴾ کو جمہور نے بہ ہمزہ پڑھا ہے۔ اور ورش رحمہ اللہ نے نافع رحمہ اللہ سے ہمزہ کے بغیر پڑھا ہے۔ ﴿الرِّيْحَ﴾ کو جمہور نے مفرد اور نافع رحمہ اللہ نے "اَلرِّيَاحُ" جمع پڑھا ہے۔ ﴿فَيَظْلَلْنَ﴾ کو جمہور نے بہ فتحِ لامِ اولیٰ پڑھا ہے جو عین فعل ہے اور یہی قیاس ہے، اس لیے کہ ماضی بہ کسرِ عین ہے اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے بہ کسرِ لامِ اولیٰ پڑھا ہے اور یہ شاذ ہے اور ایک لغتِ قلیل ہے۔[3] امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ظل يظل و يظل" سے ہے، جیسے: "ضل يضل ويضل"۔[4] شیخ نے کہا ہے کہ ایسا نہیں ہے، جیسا کہ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے، اس لیے کہ "يَضَلُّ"، بہ فتحِ عین "ضَلِلْتُ"، ماضی مکسور العین سے ہے اور "يَضِلُّ" بالکسر "ضَلَلْتُ"، ماضی مفتوح العین سے ہے اور یہ دونوں قیاسی ہیں، یعنی ان میں سے ہر ایک کی ایک اصل ہے کہ اس کی طرف رجوع ہوتا ہے بخلاف "ضَلَّ" کے، کیوں کہ اس کا ماضی فقط مکسور العین ہے۔

بالجملہ "يظللن" افعالِ ناقصہ سے ہے، نون اس کا اسم ہے اور ﴿رَوَاكِدَ﴾ خبر۔ یہ بھی جائز ہے کہ "ضل" یہاں بہ معنی "صار" ہو، اس لیے کہ "ظلول" کا وقت دن کا وقت ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ معنی نہیں کہ کشتیاں صرف دن میں سمندر کی پشت پر تھمی ہوئی رہ جائیں، بلکہ مطلب صرف اتنا ہے کہ اگر وہ ہوا کو تھام دے تو وہ سمندر کی پشت پر ٹھہری رہ جائیں، اس سے کچھ بحث نہیں کہ دن کو یا رات کو۔ یہ مضمون امام سمین رحمہ اللہ کا ہے۔ ﴿رَوَاكِدَ﴾ "أَيْ: فَيَصِرْنَ سَوَاكِنَ ثَوَابِتَ وُقُوْفًا" یعنی پھر وہ کشتیاں ساکن، ثابت اور ٹھہری ہوئی ہو جائیں۔ جب پانی اور ہوا اور کشتی ساکن ہو جاتی ہے تو بولتے ہیں: "رَكَدَ الْمَاءُ وَرَكَدَتِ الرِّيْحُ وَرَكَدَتِ السَّفِيْنَةُ رُكُوْدًا" اور ہر شے جو کسی جگہ میں ثابت ہو تو وہ "راكد" ہے۔ ترازو جب برابر ہو جاتی ہے تو کہتے ہیں: "رَكَدَ الْمِيْزَانُ" "وَرَكَدَ الْقَوْمُ" یعنی قوم ساکن ہو گئی۔ "مَرَاكِدُ" وہ جگہیں ہیں جن میں انسان وغیرہ ساکن ہوتے ہیں۔ ﴿عَلٰى ظَهْرِهٖ﴾

[1] اللباب في علوم الكتاب (١٧/٢٠٣) [2] تفسير القرطبي (١٦/٣٢)

[3] فتح القدير (٤/٧٠٦) [4] الكشاف (٤/٢٣١)

کے یہ معنی ہیں کہ وہ کشتیاں سمندروں کی پشت پر ساکن ہو جائیں چلیں نہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: "يَتَحَرَّكْنَ وَلَا يَجْرِيْنَ فِي الْبَحْرِ" یعنی حرکت کریں، ہلیں جلیں اور سمندر میں چلیں نہیں۔

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴾ یعنی بے شک کشتی کے حال میں جس کا ذکر ہوا البتہ اس میں ہر اس شخص کے لیے بڑی دلالتیں ہیں جو آزمایش پر کثیر الصبر ہے اور نعمت پر کثیر الشکر ہے۔ کہا ہے کہ ایمان کے دو ٹکڑے ہیں: آدھا تو صبر ہے، یعنی معاصی سے باز رہنا اور آدھا شکر ہے، یعنی واجبات کو ادا کرنا۔ امام قطرب رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴾ وہ ہے کہ جب اس کو نعمت دی جائے تو شکر کرے اور جب آزمایش میں مبتلا ہو تو صبر کرے۔ عون بن عبداللہ کہتے ہیں کہ پس بہت سے نعمت یافتہ ناشکرے ہیں اور بہت سے آزمائش میں ڈالے گئے بے صبرے ہیں۔[1] ﴿ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ ﴾ ﴿ يُسْكِنِ ﴾ پر معطوف ہے۔ "إِيْبَاق" بہ معنی اہلاک ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "أَوْبَقَهُ أَيْ: أَهْلَكَهُ" یعنی اس کو ہلاک کر ڈالا۔ معنی یہ ہیں، یعنی ان کشتیوں کو ڈبو کر ہلاک کر ڈالے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے[2] مراد اہلِ کشتی ہیں۔

﴿ بِمَا كَسَبُوْا ﴾ یعنی ان گناہوں کے سبب سے جو انھوں نے کمائے۔ کسی نے کہا: اس سبب سے کہ انھوں نے شرک کیا۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ سمندر میں مشرک اور غیر مشرک دونوں ہلاک ہوتے ہیں۔ ﴿ وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ﴾ یعنی اور عفو کرتا ہے بہت سے کشتی والوں سے اس طرح پر کہ ان کے گناہوں سے تجاوز فرماتا ہے اور ان کو غرق ہونے سے نجات دیتا ہے۔ جمہور نے ﴿ يَعْفُ ﴾ کو بہ جزم پڑھا ہے، جوابِ شرط پر عطف کیا ہے۔ امام قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس قراءت میں اشکال ہے، کیوں کہ معنی یہ ہیں کہ اگر چاہے تو ہوا کو تھام دے، چنانچہ وہ کشتیاں ٹھہری ہوئی رہ جائیں یا ان کو کشتی والوں کے گناہوں کے سبب سے ہلاک کر ڈالے۔ تو اب ﴿ يَعْفُ ﴾ کا عطف اس پر خوب نہیں ہے، اس لیے کہ معنی یہ ہو جائیں گے کہ اگر چاہے تو معاف کر دے، حالانکہ یہ معنی نہیں ہیں، بلکہ معنی تو عفو کی خبر دینا ہے بغیر مشیت کی شرط کے، چنانچہ اب عطف مجزوم پر ہوگا لفظ کے لحاظ سے نہ کہ معنی کے اعتبار سے اور ایک قوم نے "ویعفو" بہ رفع پڑھا ہے۔ یہ قراءت معنی میں جید ہے۔ شیخ ابو حیان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قشیری نے جو یہ کہا، تو یہ جید نہیں ہے، اس لیے کہ ترکیب کے مدلول کو نہیں سمجھا، معنی یہ ہیں: مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو کچھ لوگوں کو ہلاک کر ڈالے اور کچھ لوگوں کو ان سے عفو کرتے ہوئے نجات دے۔[3] امام اعمش رحمہ اللہ نے "یعفو" بہ رفع پڑھا ہے[4] (فتح القدیر میں اعمش ہے اور جمل نے سمین سے اخفش نقل کیا ہے۔ واللہ أعلم)۔

اس میں دو احتمال ہیں: ایک یہ ہے کہ مثل مجزوم کے ہو اور حرفِ واؤ مجزوم میں ثابت رہے جس طرح کہ حرفِ یاء

---

(1) تفسير القرطبي (١٦/٣٣) (2) تفسير الطبري (٢١/٥٤٢)

(3) البحر المحيط (٧/٤٩٨) (4) فتح القدير (٤/٧٠٦)

کا ثبوت ''مَنْ يَّتَّقِي وَيَصْبِرْ'' میں ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ فعل مرفوع ہو۔ اللہ پاک نے اس بات کی خبر دی کہ وہ بہت گناہوں سے عفو فرماتا ہے۔ بعض اہلِ مدینہ منورہ نے بہ نصب پڑھا ہے۔ واؤ کے بعد ''أَنْ'' ناصبہ مقدر کیا ہے جس طرح کہ ﴿ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [البقرة: ٢٨٤] میں حرفِ ''فاء'' کے بعد تین وجہ سے پڑھا گیا ہے اور یہ ''أَنْ'' مع فعل کے مؤول بہ مصدر ہو کر اس مصدر پر معطوف ہوگا جو اگلے فعل سے متوہم ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''أَوْ يَقَعُ إِيْبَاقٌ وَعَفْوٌ عَنْ كَثِيْرٍ'' چنانچہ یہ نصب کی قراءت معنی میں مثل قراءت جزم کے ہے، مگر اتنی بات ہے کہ نصب والی میں تو عطف مصدر مؤول کا ہے مصدر متوہم پر اور جزم والے میں عطف فعل کا ہے اپنے مثل پر۔ (كذا في السمين) اسی باب سے نابغہ کا شعر ہے:

فَإِنْ يَهْلِكْ أَبُوْ قَابُوْسَ يَهْلِكْ رَبِيْعُ النَّاسِ وَالشَّهْرُ الْحَرَامُ
وَنَأْخُذَ بَعْدَهُ بِذِنَابِ عَيْشٍ أَجَبَّ الظَّهْرِ لَيْسَ لَهُ سِنَامُ

بہ نصب ''وَنَأْخُذَ'' (یعنی ''إن يهلك أبو قابوس يكن هلاك ربيع الناس والشهر الحرام وأخذنا بعده بإذناب عيش محبوب الظهر ليس له سنام'') قولہ سبحانہ: ﴿ وَيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ﴾ جمہور نے ﴿ يَعْلَمَ ﴾ کو منصوب پڑھا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: بنا بر ''صرف''۔ ''صرف'' کے معنی پھیرنا۔ عطف علی اللفظ کا عطف علی المعنی کی طرف ہے۔ کہا: اور یہ اس طرح ہوا کہ جب ﴿ وَيَعْلَمَ ﴾ کا عطف مجزوم ہو کر ماقبل پر حسین نہ ٹھہرا، کیونکہ معنی یہ ہوتے ہیں کہ اگر چاہے تو جانیں وہ لوگ جو ہماری آیتوں میں جھگڑتے ہیں تو اس طرف عدول کیا کہ جو فعل ﴿ يَعْلَمَ ﴾ سے پہلے تھا، اس کے مصدر پر عطف ٹھہرایا اور یہ نہیں ہو سکتا ہے، مگر اس طرح سے کہ ﴿ يَعْلَمَ ﴾ سے پہلے حرفِ ''أَنْ'' مقدر کریں تاکہ ''أَنْ'' مع فعل کے اسم کی تاویل میں ہو جائے، چنانچہ اسی باب میں نابغہ کے شعر ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ جس طرح امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ اسی طرح امام مبرد اور ابو علی فارسی رحمہما اللہ نے بھی کہا ہے۔ اس وجہ پر ایسی بات سے اعتراض کیا گیا ہے جس کے تحت میں کچھ فائدہ نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کا نصب اس بنا پر ہے کہ تعلیل محذوف پر معطوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''لِيَنْتَقِمَ مِنْهُمْ وَيَعْلَمَ''

شیخ ابو حیان اور حفناوی رحمہما اللہ نے اس پر یوں اعتراض کیا ہے کہ شرط پر ایک قوم کا اہلاک اور ایک قوم کی نجات مترتب ہوئی ہے تو اب ''لِيَنْتَقِمَ مِنْهُمْ'' کی تقدیر حسین نہ ہوگی، [1] کیوں کہ ماقبل میں دو امر تھے، یعنی اہلاک و نجات، چنانچہ ایک امر کی علت ہوئی اور ایک امر خالی رہ گیا۔ محلی رحمہ اللہ نے بھی نصب کی توجیہ میں یہی وجہ اختیار کی ہے۔ ''أَيْ: يُغْرِقُهُمْ لِيَنْتَقِمَ مِنْهُمْ وَيَعْلَمَ''۔ [2] امام کرخی رحمہ اللہ نے ابو حیان رحمہ اللہ پر رد کر کے کہا، بلکہ تقدیر ''لِيَنْتَقِمَ مِنْهُمْ'' کی حسین ہے جس طرح کہ ہمارے شیخ نے یعنی محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے، اس لیے کہ مقصود صرف اہلاک کی تعلیل ہے جس کی تقدیر محلی رحمہ اللہ نے ''يُغْرِقُهُمْ'' کہہ کر کی ہے، اس لیے کہ ﴿ وَيَعْلَمَ ﴾ علتِ معطوفہ سے مناسب یہی ہے۔ والله أعلم.

[1] فتح القدير (٧٠٦/٤، ٧٠٧) [2] تفسير الجلالين (٦٤٤/١)

امام نافع اور ابن عامر رحمہما اللہ نے بہ رفع ﴿ يَعْلَمَ ﴾ پڑھا ہے بنا بر استیناف،[1] یعنی اس بنیاد پر کہ یہ جملہ فعلیہ ہو یا اسمیہ۔ چنانچہ فعلیہ ہونے پر تو موصول فاعل ہوگا ﴿ يَعْلَمَ ﴾ کا اور اسمیہ کی بنا پر مفعول ہوگا اور فاعل ﴿ يَعْلَمَ ﴾ کا ضمیر مستتر ہوگی راجع طرف مبتدائے مقدر کے۔ "أَيْ: وَهُوَ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ"۔ یہ قراءت ظاہر واضح اللفظ ہے۔ کسی نے ﴿ يَعْلَمَ ﴾ کو بہ جزم پڑھا ہے ما قبل کے فعل مجزوم پر عطف کیا ہے، اس معنی میں کہ اگر اللہ چاہے تو اہلاک و نجات وتحذیر کے درمیان جمع کرے۔ (اگر کوئی کہے کہ ﴿ وَيَعْلَمَ ﴾ کو ﴿ يَعْفُ ﴾ پر معطوف کر کے جزم دیں تو یہ بات لازم آئے گی کہ علم نتیجۂ اعصاف ریح سے ہو، حالانکہ یہ بات ظاہر نہیں ہے تو کہیں گے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ﴾ ان کے لیے تحذیر ہے اور اس اعتبار سے اس کا نتائج اعصاف ریح سے ٹھہرانا ٹھیک ہے، معنی یہ ہیں کہ اگر اللہ پاک چاہے تو زور کی ہوا چلائے تو تین امر کے درمیان جمع کرے: ایک قوم کا اہلاک اور ایک قوم کی نجات اور دوسرے لوگوں کی تحذیر۔ اب یہاں تین فرقے ہوئے: فرقہ ہالکہ، فرقہ ناجیہ وفرقہ محذرہ، پہلے دو کے علاوہ اور اس کی تحذیر ہونے کی یہ وجہ ہے کہ ان کا اس بات کو جاننا ہوگا مگر اللہ تعالیٰ کے آگاہ کرنے سے اور اللہ سبحانہ کا ان کو آگاہ کرنا یہی ان کی تحذیر ہے۔ کذا قال شیخ زادہ رحمہ اللہ)۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴾۔ ﴿ مَا لَهُمْ ﴾ خبر مقدم ہے اور ﴿ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴾ مبتداء مؤخر ہے بہ زیادتِ حرف ﴿ مِنْ ﴾ (کما قاله الجمل) اور جملۂ نفی دو ﴿ يَعْلَمَ ﴾ کے مفعول کے قائم مقام ہے اور نفی معلق ہے عمل سے۔[2] (کما قاله المحلي) امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا: "مَالَهُمْ مِنْ فِرَارٍ وَلَا مَهْرَبٍ مِنَ الْعَذَابِ"، یعنی ان کے لیے نہ تو عذاب سے بھاگنا ہے اور نہ بھاگنے کی جگہ۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے لیے کوئی "ملجا" یعنی جائے پناہ نہیں ہے۔ ﴿ مَحِيْصٍ ﴾ اس قول عرب سے ماخوذ ہے: "حَاصَ بِهِ الْبَعِيْرُ حَيْصَةً إِذَا رَمٰى بِهِ" اور اسی معنی سے یہ قول ہے: "فُلَانٌ يَحِيْصُ عَنِ الْحَقِّ"۔ یعنی فلاں حق سے مائل ہوتا ہے۔[3] جب اللہ پاک اپنی وحدانیت اور کمالِ قدرت کے دلائل بیان کر چکا تو اس کے بعد دنیا سے نفرت دلانے کا ذکر کیا اور اس کی تحقیرِ شان کا، اس لیے کہ دلیل سے مانع یہی دنیا کی رغبت ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[4]

فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ
خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَالَّذِيْنَ
يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ

[1] تفسیر القرطبي (٣٤،٣٣/١٦)
[2] تفسیر الجلالین (٦٤٤/١)
[3] تفسیر القرطبي (٣٤/١٦)
[4] فتح البیان (٣٠٩-٣٠٧/١٢)

يَغْفِرُوْنَ ﴿٣٧﴾ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ
وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَالَّذِيْنَ
اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿٣٩﴾

چناں چہ تمھیں جو بھی شے دی گئی ہے تو وہ دنیاوی زندگی کا (حقیر سا) سامان ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ ان لوگوں کے لیے کہیں بہتر اور بہت پائیدار ہے جو ایمان لائے اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسا کرتے ہیں ﴿36﴾ اور وہ لوگ جو کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور جب غصہ آئے تو وہ معاف کر دیتے ہیں ﴿37﴾ اور وہ لوگ جنھوں نے اپنے رب (کے حکم) کو مانا اور نماز قائم کی اور ان کا (ہر) کام باہمی مشورے سے ہوتا ہے اور ہم نے انھیں جو کچھ دیا ہے، وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں ﴿38﴾ اور وہ لوگ کہ جب ان پر بغاوت وعداوت ہو تو وہ بس بدلہ لیتے ہیں ﴿39﴾

انعام واکرامِ الٰہی کے مستحق لوگوں کی صفات:

ان کا ہر کام آپ کے مشورے سے ہوتا ہے، یعنی وہ مشورے سے کام کرنا پسند کرتے ہیں، وہ کام دین کا ہو یا دنیا کا۔ وہ بدلہ لے لیتے ہیں، یعنی کافروں سے جہاد کرتے ہیں۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی زندگی اور زینت کی تحقیر اور جو کچھ اس میں تازگی، رونق، عیش اور آرامِ فانی ہے، اس کی حقارت بیان فرماتا ہے کہ جو کچھ تم نے حاصل اور جمع کیا ہے، اس سے مغرور مت ہو، وہ تو اس وقت تک استعمال کے لیے ہے جب تک جینا ہے اور دنیا ایک دنی (ناقص) اور خسیس گھر ہے جو ضرور فانی اور زائل ہونے والا ہے اور جو اجر وثواب اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ دنیا سے بہتر ہے اور باقی رہنے والا اور سرمدی ہے، یعنی ہمیشگی والا ہے۔ چنانچہ تم فانی کو باقی رہنے والے پر مقدم نہ کرو۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ یعنی ان کے لیے جنھوں نے دنیا میں اپنی جانوں کو لذتوں کے چھوڑنے کا عادی بنایا۔ ﴿ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴾ اور ان کے لیے جو اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں، تاکہ ان کے ادائے واجبات پر صبر واستقلال اور محرمات کو ترک کرنے میں ان کی اعانت کرے۔

پھر فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ ﴾ یعنی اور وہ جو بڑے گناہوں سے اور بے حیائی سے بچتے ہیں۔ سورۃ الاعراف میں "اِثم" اور "فواحش" پر کلام گزر چکا ہے۔ ﴿ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴾ یعنی ان کی طبیعت ایسی ہے کہ لوگوں سے عفو ودرگزر کرتے ہیں اور لوگوں سے بدلہ لینا ان کی عادت نہیں ہے۔ صحیح میں

ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنے نفس کے لیے انتقام نہیں لیا مگر صرف اس صورت میں کہ اللہ کی حرمتوں کی ہتک کی جائے۔① دوسری حدیث شریف میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ ہم میں سے کسی پر عتاب فرماتے تو کہتے: «مَا لَهُ تَرِبَتْ يَمِينُهُ»② یعنی کیا ہے اس کو، اس کا سیدھا ہاتھ خاک میں آلودہ ہو! یعنی ناراضی کے وقت صرف اسی قدر سرسری طور پر فرما دیتے تھے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن منصور عن ابراہیم روایت کیا ہے کہ مومنین اس بات کو مکروہ جانتے تھے کہ ذلیل سمجھے جائیں اور جب قادر ہوتے تو معاف کر دیتے تھے۔③

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ یعنی اور وہ جنھوں نے اپنے رب کے رسولوں کی پیروی کی اور اس کے حکم کو مانا اور اس کے منع کیے ہوئے کام سے بچے اور نماز قائم کی، یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عبادات میں سے ہے اور ان کا کام آپس کے مشورے سے طے ہوتا ہے، یعنی کوئی کام انجام نہیں دیتے، جب تک کہ اس کے بارے میں باہم مشورہ نہ کر لیں، تاکہ آپس میں اپنی رائے سے مدد لیں، مثلاً: لڑائیوں میں۔ یا ان جیسے اور کاموں میں مشورے سے کام کرتے ہیں، جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴾ [آل عمران: ١٥٩] ”اور کام کا مشورہ ان سے کیا کریں۔ پھر جب آپ کا پختہ ارادہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ پر بھروسا کریں، بے شک اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔“ اور اسی لیے نبی اکرم ﷺ جنگوں میں اور ان کی مثل اور کام میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرماتے تھے، تاکہ اس سے ان کے دل خوش ہو جائیں اور اسی طرح جبکہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو وفات حاضر ہوئی، جب ان کو خنجر مارا گیا تو اپنے بعد خلافت کے معاملے کے لیے چھے آدمیوں کی شوریٰ قرار دی۔ یہ لوگ سیدنا عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد اور عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہم ہیں۔ چنانچہ سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے اس پر متفق ہوئی کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو سب پر مقدم کریں، چنانچہ یہی امر وقوع میں آیا۔ ﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ یعنی اور ہماری دی ہوئی روزی سے خرچ کرتے ہیں، اس طرح سے کہ اللہ کی مخلوق پر احسان کرتے ہیں، پہلے اس پر جو ان کے زیادہ قریب، پھر اسی طرح درجہ بدرجہ جس کو قرب اور رشتہ زیادہ ہے، اس کو مقدم کرتے ہیں۔

قولہ عزوجل: ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴾ یعنی ان میں اس شخص سے بدلہ لینے کی قوت ہے جس نے ان پر ظلم و زیادتی کی ہے۔ نہ عاجز ہیں اور نہ ذلیل ہیں، بلکہ جس نے ان پر زیادتی کی ہے، اس سے انتقام لینے کی قدرت رکھتے ہیں، گو وہ ایسے ہیں پھر بھی جب قابو پاتے ہیں تو عفو کر دیتے ہیں، جس طرح کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے فرمایا: ﴿ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ ﴾ [یوسف: ٩٢] ”آج تم پر

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٢٧)

② مسند أبي يعلىٰ (٤٢٢٠) ③ تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٧٩/١٠)

کوئی ملامت نہیں ہے اللہ تمھیں بخشے۔'' باوجود اس کے کہ ان کو ان کے مواخذے پر قدرت حاصل تھی اور ان کے کام کا بدلہ لے سکتے تھے مگر بدلہ نہ لیا اور قصور معاف کر دیا اور جس طرح محمد ﷺ نے ان اسی (۸۰) آدمیوں سے عفو فرمایا جنھوں نے سالِ حدیبیہ میں آپ ﷺ کا قصد کیا تھا اور کوہِ تنعیم سے اتر آئے تھے۔ پھر جب آپ ﷺ نے ان پر قابو پایا تو ان پر احسان کیا، اس کے باوجود کہ آپ ﷺ کو انتقام لینے پر قدرت حاصل تھی اور اسی طرح نبیِ کریم ﷺ نے غورث بن الحارث سے عفو فرمایا، جس نے آپ ﷺ کو اچانک قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا، جب اُس نے آپ ﷺ کی تلوار برہنہ کر لی تھی اور آپ ﷺ سو رہے تھے اور جاگ اٹھے اور ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں تھی۔ پھر آپ ﷺ نے اس کو جھڑکا تو اس نے تلوار اپنے ہاتھ سے رکھ دی اور آپ ﷺ نے اس کے ہاتھ سے لے لی اور اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کو بلایا، پھر آپ ﷺ نے سارا ماجرا سنایا اور اس شخص کے بارے میں ان کو خبر دی اور اس کو معاف کر دیا۔ اور اسی طرح آپ ﷺ نے لبید بن اعصم سے عفو کیا، جس نے آپ ﷺ پر سحر کیا تھا اور اس کے باوجود نہ آپ ﷺ نے اس کے لیے کوئی تعریض کی اور نہ اس پر عتاب فرمایا، حالاں کہ آپ ﷺ کو اس پر قدرت حاصل تھی اور اسی طرح آپ ﷺ نے یہودی عورت سے عفو فرمایا۔ یہ عورت زینب نام کی تھی اور مرحب یہودی خیبری کی بہن تھی۔ اس شخص نے محمود بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا، اس عورت نے بکری کی دستی میں خیبر کے دن زہر ملایا تھا، پھر دستی نے آپ ﷺ کو اس کی خبر دی تھی۔ آپ ﷺ نے اس عورت کو بلایا تو اس نے اقرار کر لیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ کام کرنے کے لیے تجھے کون سی شے باعث ہوئی؟ تو وہ بولی کہ میں نے ارادہ کیا کہ اگر آپ نبی ہیں تو زہر آپ کو نقصان نہ دے گا اور اگر آپ نبی نہیں ہیں تو ہم آپ سے راحت پا جائیں گے۔ پھر آپ ﷺ نے اس کو رہا کر دیا، لیکن جب بشر بن براء رضی اللہ عنہ اس زہر سے فوت ہو گئے تو آپ ﷺ نے ان کے عوض میں اس عورت کو قتل کیا۔ اس بارے میں بہت سی احادیث اور آثار ہیں۔[1] واللّٰہ سبحانہ و تعالیٰ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے: لوگو! تم کو رزق و روزی اور سامانِ دنیا میں جو آسودگی اور فراخی دی گئی ہے، وہ تو صرف ایک متاعِ قلیل ہے جس کو تھوڑے دنوں میں استعمال کر لیا جاتا ہے، پھر وہ ختم ہو جاتی اور زائل ہو جاتی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے:

إِنَّمَا الدُّنْیَا فَنَاءٌ لَیْسَ لِلدُّنْیَا ثُبُوْتٌ ‏ إِنَّمَا الدُّنْیَا کَبَیْتٍ نَسَجَتْهُ الْعَنْکَبُوْتُ

یعنی دنیا تو یہی فنا ہے، دنیا کو کسی طرح کا جماؤ نہیں ہے، دنیا تو صرف اس گھر کی مثل ہے جس کو مکڑی نے تن بُن

[1] تفسیر ابن کثیر (۱۴۸/۴، ۱۴۹)

دیا ہے۔ غرضیکہ دنیا کی تو یہ حالت ہے جو مذکور ہوئی۔

پھر اللہ پاک نے ان کو ثوابِ آخرت میں اور اس نعیم مقیم میں ان کو رغبت دلائی جو اس کے پاس ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴾ یعنی طاعات کا جو ثواب اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور ان پر روضاتِ جنات کی جو جزا ہے وہ متاعِ دنیا سے بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے، کیوں کہ وہ دائم ہے منقطع نہ ہوگی اور دنیا کی متاع جلد ختم ہو جاتی ہے۔

پھر اللہ پاک نے بیان کیا کہ یہ ثواب جو باقی رہنے والا ہے کن لوگوں کے لیے ہے، تو فرمایا: ﴿ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ یعنی ان لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے اس شے کی تصدیق کی اور اس پر عمل کیا جس کو ایمان واجب کرتا ہے اور اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں، نہ کہ اس کے غیر پر، یعنی اپنے کام اس کے سپرد کرتے ہیں اور تمام حالات میں اسی پر اعتماد رکھتے ہیں۔ کہا ہے کہ یہ آیت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہے، جبکہ انھوں نے اپنا سارا مال خیرات کر دیا اور لوگوں نے ان کو ملامت کی۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓىِٕرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ ﴾ موصول محلِ جر میں ہے ﴿ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ پر معطوف ہے، یا اس سے بدل ہے، یا محلِ نصب میں ہے بنا بر اضمار "أَعْنِيْ" جب کہ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جو ثواب اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے، ان کے لیے جو ایمان لائے اور ان کے لیے جو کبائرِ اثم اور فواحش سے بچتے ہیں۔ کبائر سے مراد ذنوب ہیں، یعنی گناہ۔ اس کی تحقیق سورۃ النساء میں گزر چکی ہے۔[1]

شیخ شیوخنا علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے "إرشاد الفحول" میں اس کی بحث خوب تحریر فرمائی ہے۔[2] جمہور نے "کبائر" بہ جمع پڑھا ہے اور امام حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے "کبیر" بہ افراد پڑھا ہے۔ جو مفاد کبائر کا ہے اسی کے لیے یہ بھی مفید ہے، کیوں کہ اضافت جنس کے لیے ہے مثل لام کے اور رسمِ کریم دونوں قراءتوں کی محتمل ہے۔ ﴿ اَلْفَوَاحِشَ ﴾ من جملہ ﴿ كَبٰٓىِٕرَ ﴾ ہیں، لیکن یہ ان کے وصف کی وجہ سے ہیں۔ "فواحش" گویا "کبائر" سے اوپر ہیں، جیسے: زنا و قتل اور ان کے مثل۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فواحش وہ گناہ ہیں جو حدوں کو واجب کرنے والے ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زنا ہے۔[3] چنانچہ فواحش کا کبائر پر عطف، عام پر خاص کے عطف، یا بعض کا عام پر عطف کے باب سے ہے، اس لیے کہ کبائر پر کبھی کبھی حد واجب نہیں ہوتی، جیسے: غیبت و چغل خوری جو کبائر میں سے ہیں مگر ان پر حد واجب نہیں ہے۔

﴿ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴾ یعنی اور جس وقت خفا ہوں تو وہ تجاوز اور درگزر کرتے ہیں اس گناہ

[1] رقم الآية (٣١) [2] إرشاد الفحول (١/١٤٤) [3] تفسير القرطبي (١٦/٣٥)

سے جو اُن کو غصے میں لایا ہے اور غصے کو پی جاتے ہیں اور اس شخص پر حلم کرتے ہیں جس نے ان پر ظلم کیا ہے۔ غضب کو غفران کے ساتھ اس لیے خاص کیا ہے کہ انسان کی طبیعت پر غضب کا استیلا د غلبہ بہت سخت ہوتا ہے۔ اس لیے جوشِ غضب کے وقت اس کو صرف وہی شخص بخشتا ہے، جس کے سینے کو اللہ پاک نے کھول دیا ہے اور اس کو حلم اور بُردباری کی فضیلت اور شرف کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اسی لیے اللہ پاک نے سورت آل عمران میں ان لوگوں کی یہ تعریف اور صفت بیان کی ہے: ﴿ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ﴾ [آل عمران: ١٣٤] ''وہ غصہ کو پینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔'' امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے مومنین کی دو قسمیں ٹھہرائی ہیں: ایک قسم تو وہ ہے جو اپنے ظالم کو معاف کرتے ہیں، چنانچہ ابتداء ان کے ذکر سے کی اور ایک قسم وہ ہے جو اپنے ظالم سے بدلہ لیتے ہیں،[1] یہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ﴾ یعنی وہ لوگ جنھوں نے اپنے رب کی وہ بات قبول کر لی جس کی طرف اس نے ان کو بلایا اور جو چیز ان پر واجب کی اس کو قائم کیا، یعنی فریضہ نماز۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: یہ لوگ مدینے کے انصار ہیں، انھوں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت قبول کی جبکہ ہجرت سے پہلے ان کی طرف بارہ سردار روانہ کیے اور نماز کو اس کے وقتوں پر اور اس کی شرائط اور طریقوں کے ساتھ قائم کیا۔[2] (قاله القرطبي ونحوه في البيضاوي)

﴿ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ یعنی وہ آپس میں مشورہ کرتے ہیں اور جلد بازی نہیں کرتے اور نہ رائے کے ساتھ منفرد ہوتے ہیں۔ ﴿ شُوْرٰى ﴾ مصدر ہے ''شَاوَرَةٌ'' کا مثل ''بُشْرٰی'' و ''قُرْبٰی''۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ انصار کا مشورہ کرنا ہے جبکہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی خبر سنی اور ان کی طرف سردار وارد ہوئے جس وقت کہ ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر میں انھوں نے اس رائے پر اتفاق کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور آپ کی مدد کریں۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد ان کا ہر کام میں، جو ان کو پیش آتا ہے، مشورہ کرنا ہے۔ چنانچہ ان میں سے کوئی کسی پر رائے کو ٹھونستا نہیں یا اختیار نہیں کرتا۔

امام ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اَلشُّوْرَى أُلْفَةٌ لِلْجَمَاعَةِ وَسِبَارٌ لِلْعُقُوْلِ وَسَبَبٌ إِلَى الصَّوَابِ وَمَا تَشَاوَرَ قَوْمٌ قَطُّ إِلَّا هُدُوْا''[3] یعنی شوریٰ جماعت کے لیے الفت ہے، یہ عقلوں کو خوب جانچنے والا ہے اور صحیح راستے پر جانے کا سبب ہے۔ کبھی کسی قوم نے مشورہ نہیں کیا مگر ان کو ہدایت نصیب ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ جس کام میں مشورہ کرتے ہیں تو مشورے کی برکت سے اس کام کی سیدھی راہ مل جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ پاک نے کاموں میں

---

[1] تفسير الطبري (٥٤٧/٢١) فتح القدير (٧٠٧/٤) [2] تفسير القرطبي (٣٦/١٦) تفسير البيضاوي (١٣٣/٥)

[3] تفسير القرطبي (٣٦/١٦، ٣٧)

مشورہ کرنے کی تعریف فرمائی، ان لوگوں کی مدح کرنے کے سبب سے جو اس کا امتثال کرتے ہیں (حکم مانتے ہیں)۔

بشار بن برد نے کیا خوب کہا ہے: ؎

إِذَا بَلَغَ الرَّأْيُ الْمَشُوْرَةَ فَاسْتَعِنْ   بِرَأْيِ نَصِيحٍ أَوْ نَصِيحَةِ حَازِمِ

وَلَا تَعْجَلِ الشُّوْرَى عَلَيْكَ غَضَاضَةً   فَإِنَّ الْخَوَافِيَ قُوَّةٌ لِلْقَوَادِمِ

رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم سے اپنے امور میں مشورہ فرمایا کرتے تھے اور اللہ پاک نے آپ ﷺ کو اس کا امر فرمایا، چنانچہ ارشاد کیا: ﴿ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ﴾[1] [آل عمران: ١٥٩] یہ مشورہ کرنا آراء میں بہت ہے۔ احکام میں آپ ﷺ ان سے مشورہ نہیں لیتے تھے، اس لیے کہ احکام اپنی تمام اقسام کے ساتھ، یعنی فرض، ندب (نفل)، مکروہ، مباح اور حرام اللہ پاک کے پاس سے نازل ہوئے ہیں۔ رہے آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو وہ احکام میں مشورہ کیا کرتے تھے اور کتابِ عزیز اور سنتِ مطہرہ سے ان کا استنباط فرماتے تھے۔

پہلے پہل جس کام میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے مشورہ کیا، وہ امرِ خلافت ہے، کیوں کہ نبیِ مکرم ﷺ نے اس پر نصِ (صریح حکم) نہیں فرمائی تھی اور اہلِ ردت (مرتدین) کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے مشورہ کیا۔ چنانچہ خلیفۂ اول ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے ان سے قتال کرنے پر مستقر ہوئی، لہٰذا اسی پر عمل درآمد ہوا۔ آپ ﷺ کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم نے جنگوں کے بارے میں مشورہ کیا، یہاں تک کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ہرمزان سے مشورہ لیا، جب وہ مسلمان ہو کر ان کے پاس آیا۔ اس کا قصہ جمل میں مذکور ہے۔ آلِ عمران میں شوریٰ پر کلام گزر چکا ہے۔[2] ﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ یعنی اور ہماری دی ہوئی روزی سے راہِ خیر میں کچھ خرچ کرتے ہیں اور اس کو محتاجوں پر خیرات کرتے ہیں۔

پھر اللہ پاک نے مومنوں کے اس گروہ کا ذکر کیا جو اپنے ظالموں سے بدلہ لیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ إِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴾ یعنی اور وہ لوگ کہ جب ان کو اس شخص کی بغی پہنچے جس نے ان پر بغیر حق کے بغاوت کی تو وہ اپنے ظالم سے بغیر زیادتی کیے انتقام لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح کہ تعریف کے طور پر غصے کے وقت مغفرت کا ذکر کیا ہے، اسی طرح ان بدلہ لینے والوں کا بھی تعریف کے طور پر ذکر کیا ہے، اس لیے کہ جس نے بغاوت کی ہے، اس کے لیے ذلیل ہونا ان لوگوں کی صفات میں سے نہیں ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے عزت رکھی ہے، جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [المنافقون: ٨] ''حالانکہ عزت تو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے ہے۔'' جیسا کہ غصے کے وقت عفو کرنا فضیلت ہے ویسا ہی بغی کے وقت بدلہ لینا بھی فضیلت ہے۔

امام ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے بغی میں بدلہ لینے کا ذکر تعریف کے ضمن میں کیا ہے اور

---

(1) فتح القدير (٧٠٨/٤)   (2) رقم الآية (١٥٩)

دوسری جگہ جرم کو معاف کرنے کا ذکر تعریف کے ضمن میں کیا ہے تو اب یہ احتمال ہے کہ دونوں میں سے ایک دوسرے کا رافع ہو، یا یہ بات دو حالتوں کی طرف راجع ہو: ایک تو یہ حالت ہے کہ باغی علانیہ طور پر اور ظاہری طور پر فجور کا ارتکاب کرتا ہو اور چھوٹے بڑے کو ایذا دیتا ہو تو اب اس سے بدلہ لینا افضل ہے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ بغی کا وقوع اس شخص سے ہو جو معروف بہ زلت ہے اور مغفرت کا سوال کرتا ہو تو یہاں معاف کرنا افضل ہے۔ اسی طرح امام کیا الہراسی رحمہ اللہ نے بھی اپنے احکام میں ذکر کیا ہے۔ امام نخعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مومنین اس بات کو مکروہ جانتے تھے کہ اپنے نفوس کو ذلیل کریں تو سفہاء (کم عقل) اور فاسق لوگ ان پر جری ہو جائیں۔[1] لیکن یہ بدلہ لینا اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اللہ پاک نے جو امر ٹھہرا دیا ہے، اس پر قصر کریں اور اس سے آگے نہ بڑھیں، چنانچہ خود اللہ پاک نے اس کے بعد ان کو یوں بیان فرمایا:[2]

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُہَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۰﴾ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِہٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیْہِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ ﴿۴۱﴾ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِکَ لَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۴۲﴾ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾

اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، پھر جو معاف کر دے اور صلح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے، بلاشبہ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا ﴿40﴾ اور البتہ جو شخص اپنے مظلوم ہونے کے بعد بدلہ لے تو ایسے لوگوں پر کوئی (ملامت کی) راہ نہیں ﴿41﴾ (ملامت کی) راہ تو بس ان لوگوں پر ہے جو دوسروں پر ظلم کرتے اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿42﴾ اور البتہ جو صبر کرے اور معاف کر دے تو بلاشبہ یہ ہمت کے کاموں میں سے ہیں ﴿43﴾

ظالم کو معاف کرنا بہتر ہے یا بدلہ لینا؟:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قولہ تبارک وتعالیٰ: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُہَا﴾ اس آیت کی طرح

---

① تفسیر القرطبي (۱۶/۳۹) ② فتح البیان (۱۲/۳۰۹-۳۱۲)

ہے: ﴿ فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ ﴾ [البقرۃ: ١٩٤] ”جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اسی کے مثل زیادتی کرو جو تم پر کی ہے۔“ اور اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ ﴾ [النحل: ١٢٦] ”اور اگر بدلہ لو بھی تو بالکل اتنا ہی جتنا صدمہ تمھیں پہنچایا گیا ہو اور اگر صبر کرلو تو بے شک صابروں کے لیے یہی بہتر ہے۔“ چنانچہ اللہ پاک نے عدل کو مشروع کیا ہے، مراد بدلہ لینا ہے اور فضل کی طرف رغبت دلائی ہے اور وہ عفو ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ کَفَّارَۃٌ لَّهٗ ﴾ [المائدۃ: ٤٥] ”اور خاص زخموں کا بھی بدلہ ہے، پھر جو شخص اس کو معاف کردے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔“ اور اسی لیے یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ ﴾ یعنی یہ عفو کرنا اللہ کے پاس ضائع نہ ہوگا، چنانچہ یہ بات حدیث شریف میں صحیح ہوئی ہے: اور نہیں زیادہ کیا اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو بسبب معاف کرنے کے مگر عزت میں۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ﴾ ”أَيْ: اَلْمُعْتَدِیْنَ“ یعنی اللہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ مراد وہ شخص ہے جو برائی کی ابتداء کرتا ہے۔ پھر اللہ جل وعلا نے فرمایا: ﴿ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓىِٕکَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ ﴾ یعنی اور البتہ جس شخص نے اپنے ظلم کے بعد بدلہ لیا سو ان لوگوں پر کوئی راہ نہیں ہے، یعنی جس شخص نے ان پر ظلم کیا ہے، اس سے بدلہ لینے میں ان پر کوئی گناہ نہیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابن عون سے روایت کیا ہے، کہا: میں انتصار کے بارے میں پوچھا کرتا تھا۔ ﴿ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓىِٕکَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ ﴾ یعنی اس میں جو انتصار مذکور ہے، اس کے بارے میں لوگوں سے سوال کیا کرتا تھا۔ چنانچہ علی بن زید بن جُدعان نے مجھے حدیث کی اُم محمد اپنے باپ کی بیوی سے، ابن عون رحمہ اللہ نے کہا: لوگوں نے زعم کیا ہے کہ وہ عورت عائشہ رضی اللہ عنہا اُم المومنین کے پاس جایا کرتی تھی۔ اس نے کہا: اُم المومنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آئے اور ہمارے پاس بی بی زینب بن جحش رضی اللہ عنہا تھیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دستِ مبارک سے کچھ کرنے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بی بی زینب رضی اللہ عنہا کی خبر نہ تھی، چنانچہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑا، یہاں تک کہ میں نے بی بی زینب رضی اللہ عنہا کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم رک گئے (اس کی وجہ یہ ہے کہ رات کا وقت تھا اور چراغ نہ تھا)۔

بی بی زینب رضی اللہ عنہا متوجہ ہوئیں اور بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کو برا کہنے لگیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بی بی زینب رضی اللہ عنہا کو منع فرمایا تو انھوں نے باز رہنے سے انکار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ تو اس کو سبّ کر (”سبّ“ بہ معنی

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٥٨٨)

"شتم" ہے یعنی دشنام دینا۔ یہ دشنام وہی قذف و بہتان و دشنام محرم کے باب سے نہیں ہے، بلکہ جس طرح مرد اور عورتیں آپس میں لڑتی ہیں تو ایک دوسرے کو برا بھلا کہتی ہیں، پس یہاں "سبّ" سے مراد سخت باتیں کہنا ہے، دوسرے کی سخت باتوں کے مقابلے میں)۔ تو انھوں نے بی بی زینب رضی اللہ عنہا کو برا کہا، پھر وہ ان پر غالب ہو گئیں اور زینب رضی اللہ عنہا چلی گئیں اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں اور کہا کہ "أَنَّ عَائِشَةَ تَقَعُ بِكُمْ وَتَفْعَلُ بِكُمْ" یعنی عائشہ رضی اللہ عنہا تم کو سخت و درشت کہتی ہیں۔ چنانچہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: « إِنَّهَا حِبَّةُ أَبِيكِ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ » یعنی بے شک ربِ کعبہ کی قسم! عائشہ تیرے والد کی محبوبہ ہے، چنانچہ فاطمہ رضی اللہ عنہا لوٹ گئیں اور علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں نے ان سے یعنی نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ایسا کہا تو انھوں نے ایسی ایسی بات فرمائی۔ راوی نے کہا: اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی۔[1] (هكذا أورد هذا السياق وعلي بن زيد بن جدعان يأتي في رواياته بالمنكرات غالبا و هذا فيه نكارة والصحيح خلاف هذا السياق كما رواه النسائي و ابن ماجه من حديث خالد بن سلمة الفأفاء)

"عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ الْبَهِيِّ عَنْ عُرْوَةَ قَالَ: قَالَتْ عَائِشَةُ رضي الله عنها مَا عَلِمْتُ حِيْنَ دَخَلَتْ عَلَيَّ زَيْنَبُ رضي الله عنها بِغَيْرِ إِذْنٍ وَهِيَ غَضْبٰى ثُمَّ قَالَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ: حَسْبُكَ إِذَا قَلَّبَتْ لَكَ ابْنَةُ أَبِيْ بَكْرٍ دِرْعَهَا ثُمَّ أَقْبَلَتْ عَلَيَّ فَأَعْرَضْتُ عَنْهَا حَتّٰى قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: "دُوْنَكِ فَانْتَصِرِيْ" فَأَقْبَلْتُ عَلَيْهَا حَتّٰى رَأَيْتُ رِيْقَهَا قَدْ يَبِسَ فِيْ فَمِهَا مَا تَرُدُّ عَلَيَّ شَيْئًا فَرَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَتَهَلَّلُ وَجْهُهُ"[2] (وهذا لفظ النسائي) یعنی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے علم نہ ہوا کہ زینب رضی اللہ عنہا مجھ پر کب داخل ہوئیں اور وہ خفا تھیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: کافی ہے آپ کو، جبکہ ابو بکر کی بیٹی اپنے کرتے کو لوٹ دیں۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئیں تو میں نے ان سے منہ پھیر لیا، یہاں تک کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا، یعنی مقابلہ کر، پس بدلہ لے، پھر میں ان پر متوجہ ہوئی، یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ ان کے گلے کا تھوک خشک ہو گیا تھا، یعنی مجھے کوئی جواب نہیں لوٹاتی تھیں، یعنی ہار گئیں، اُن سے کچھ جواب نہ بنا، چنانچہ میں نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ جھل جھلاتا تھا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ امام نسائی، ابن ماجہ اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ بی بی زینب رضی اللہ عنہا مجھ پر داخل ہوئیں اور میرے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، چنانچہ وہ مجھ پر متوجہ ہوئیں اور مجھے برا کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جھڑکا تو وہ باز نہ آئیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ تو اس کو سبّ کر، چنانچہ میں نے ان کو برا کہا، یہاں تک کہ ان کا تھوک ان کے منہ میں خشک ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک خوشی سے چم چماتا تھا۔[3]

---

[1] تفسیر الطبري (٥٤٩/٢١) اس کی سند میں "علی بن زید بن جدعان" سخت ضعیف راوی ہے۔

[2] سنن النسائي الكبرىٰ (٤٥٣/٦) السلسلة الصحيحة (١٨٦٢) [3] سنن النسائي الكبرىٰ (٤٥٣/٦) سنن ابن ماجه (١٩٨١)

امام احمد، مسلم، ابو داود، ترمذی اور ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «اَلْمُسْتَبَّانِ مَا قَالَا مِنْ شَيْءٍ فَعَلَى الْبَادِئِ حَتَّى يَعْتَدِيَ الْمَظْلُوْمُ ثُمَّ قَرَأَ: ﴿ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ﴾» [1] انتہیٰ. یعنی دو شخص جو آپس میں گالی دینے والے ہیں جو کچھ انھوں نے کہا، اس کا گناہ اس کے ابتداء کرنے والے پر ہے، یہاں تک کہ مظلوم زیادتی کرے (المستبان أي: اللذان يشتم كل منهما الآخر، وما شرطية أو موصولة فعلى البادئ جزاء أو خبر أي: إثم ما قالا على البادئ إذا لم يعتد المظلوم فإذا تعدى يكون عليهما.[2] كذا في المجمع)۔ پھر آپ ﷺ نے آیتِ مذکورہ پڑھی۔ امام بزار رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اس شخص پر بددعا کی جس نے اس پر ظلم کیا تو مقرر اس نے بدلہ لے لیا۔[3] (ورواه الترمذي من حديث أبي الأحوص عن أبي حمزة و اسمه ميمون ثم قال: لا نعرفه إلا من حديثه وقد تكلم فيه من قبل حفظه)

قولہ عزوجل: ﴿ إِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْأَرْضِ ﴾ یعنی حرج اور عنت (مشکل) جو ہے تو انہیں لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق بغاوت کرتے ہیں، یعنی لوگوں پر ظلم کی ابتداء کرتے ہیں جس طرح کہ صحیح حدیث میں آیا ہے: «اَلْمُسْتَبَّانِ مَا قَالَا فَعَلَى الْبَادِئِ مَا لَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ»[4] ﴿ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴾ یعنی یہ لوگ جن کا ذکر ہوا انہی کے لیے سخت درد دینے والا عذاب ہے۔ امام ابو بکر بن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے محمد بن واسع سے روایت کیا ہے، کہا: میں مکے کو آیا تو خندق کے پل کے پاس مجھے اچانک پکڑ لیا اور مروان بن مہلب کی طرف لے گئے یہ بصرے پر امیر تھا۔ اس نے کہا: اے ابوعبداللہ! تیری کیا حاجت ہے؟ میں نے کہا کہ اگر تو میری حاجت کی طاقت رکھے تو ویسا ہو، جیسا کہ بنی عدی کا بھائی تھا۔ مروان نے کہا کہ بنی عدی کا بھائی کون ہے؟ میں نے کہا: علاء بن زیاد۔ اس نے ایک دفعہ اپنے کسی دوست کو عامل بنایا کسی عمل پر، یعنی اس کو کسی جگہ کی حکومت دی تھی، چنانچہ علاء نے اس کو یہ خط لکھا: "أَمَّا بَعْدُ! فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ لَّا تَبِيْتَ إِلَّا وَظَهْرُكَ خَفِيْفٌ وَبَطْنُكَ خَمِيْصٌ وَكَفُّكَ نَقِيَّةٌ مِنْ دِمَاءِ الْمُسْلِمِيْنَ وَأَمْوَالِهِمْ فَإِنَّكَ إِنْ فَعَلْتَ ذٰلِكَ لَمْ يَكُنْ عَلَيْكَ سَبِيْلٌ ﴿ إِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴾ یعنی بعد حمد و صلاۃ کے، پس اگر تو اس بات کی طاقت رکھے کہ رات اس حال میں بسر

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٧) مسند أحمد (٢٣٥/٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٩٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٨١) الدر المنثور (٣٥٨/٧) فتح البيان (٣١٢/١٢، ٣١٣)

[2] مجمع بحار الأنوار (١١/٣)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٥٢) اس کی سند میں "ابوحمزہ میمون" ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٤٥٩٣)

[4] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

کرے کہ تیری پیٹھ ہلکی ہو اور تیرا پیٹ پتلا ہو اور تیری ہتھیلی مسلمانوں کے خون اور مال سے صاف ہو تو بے شک تو نے اگر یہ کیا تو نہیں ہے تجھ پر کوئی راہ، یعنی کسی طرح کا حرج و گناہ۔ راہ جو ہے تو انہیں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں۔'' الآیة. چنانچہ مروان بولا: واللہ! اس نے سچ کہا اور نصیحت اور خیر خواہی کی۔ پھر کہا: اے ابوعبداللہ! تیری کیا حاجت ہے؟ میں نے کہا: میری حاجت یہ ہے کہ تو مجھے میرے گھر والوں سے لاحق کر دے (ملا دے)۔ کہا: ہاں۔[1] (رواه ابن أبي حاتم)

پھر جب اللہ تعالیٰ نے ظلم اور اہلِ ظلم کی مذمت فرمائی تو عفو و درگزر کرنے کی طرف رغبت دلائی۔ ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ ﴾ یعنی البتہ جس نے ایذا پر صبر کیا اور برائی کا ستر کیا (معاف کیا)۔ ﴿ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ ﴾۔ سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ پس بے شک یہ البتہ حق امور سے ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے، یعنی یہ امورِ مشکورہ اور افعالِ حمیدہ سے ہے جن پر بہت بڑا ثواب اور اچھی تعریف ہے۔[2] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبد الصمد بن یزید فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کے خادم سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے فضیل رحمہ اللہ کو سنا کہ فرماتے تھے کہ جب تیرے پاس کوئی شخص کسی کی شکایت لے کر آئے تو تو کہہ: اے میرے بھائی! تو اس کو معاف کر دے، بے شک عفو تقویٰ کے بہت قریب ہے، پھر اگر وہ کہے کہ میرا دل عفو کی برداشت نہیں رکھتا، لیکن میں تو بدلہ لوں گا، جیسا کہ اللہ عزوجل نے مجھے امر فرمایا ہے تو تُو اس سے کہہ کہ اگر تو اچھی طرح سے بدلہ لینا جانتا ہے تو بدلہ لے ورنہ، پھر دروازۂ عفو کی طرف رجوع کر۔ چنانچہ بے شک عفو ایک فراخ دروازہ ہے، کیوں کہ جس شخص نے عفو کیا اور اصلاح کی تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔ صاحبِ عفورات کو اپنے بستر پر سوتا ہے اور صاحبِ انتصار (بدلہ لینے والا) امور کو قلب (الٹا) کرتا ہے۔[3]

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو گالی دی اور نبیِ اکرم ﷺ تشریف فرما تھے تو نبی اکرم ﷺ تعجب کرنے اور تبسم فرمانے لگے، پھر جب اس شخص نے گالیوں کی کثرت کی تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کی بعض بات کو اس پر لوٹایا، یعنی گالی کا جواب دیا، چنانچہ نبی اکرم ﷺ خفا ہوئے اور کھڑے ہو گئے۔ چنانچہ ابو بکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ سے جا ملے اور عرض کی: یا رسول اللہ! جب تک وہ مجھے گالی دیتا رہا آپ بیٹھے رہے، پھر جب میں نے اس کی بعض بات کا اس پر رد کیا تو آپ خفا ہو گئے اور کھڑے ہو گئے؟ فرمایا: بے شک حال یہ ہے کہ تیرے ساتھ ایک فرشتہ تھا، وہ تیری طرف سے رد کرتا تھا، پھر جب تو نے اس کی بعض بات کا اس پر رد کیا تو شیطان حاضر ہو گیا، چنانچہ نہیں ہوں میں کہ شیطان کے ساتھ بیٹھوں۔ پھر فرمایا: اے ابو بکر! تین باتیں ہیں؛ وہ کل حق ہیں: نہیں ہے کوئی بندہ کہ اس پر کوئی ظلم کیا جائے اور وہ اللہ کی خاطر اس سے چشم پوشی کرے مگر اللہ اس کے سبب سے اس کو عزت دیتا ہے اور اس کی مدد کرتا ہے۔ نہیں کھولا کسی شخص نے عطیہ (دینے) کا دروازہ اور اس سے

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (۲۴۵/۷) تفسير ابن أبي حاتم (۳۲۷۹/۱۰، ۳۲۸۰)

[2] تفسير ابن كثير (۱۵۰/٤) [3] تفسير ابن أبي حاتم (۳۲۸۰/۱۰)

اس کا ارادہ صلہ رحمی ہوتا ہے مگر اللہ اس کے سبب سے اس کے مال میں اور کثرت کر دیتا ہے۔ اور نہیں کھولا کسی شخص نے سوال کا دروازہ (یعنی لوگوں سے سوال کرتا ہے) جس سے اس کا ارادہ کثرت کا ہوتا ہے مگر اللہ عزوجل اس کے سبب سے اس کی قلت میں اضافہ کرتا ہے۔[1] (وكذا رواه أبو داود عن عبد الأعلى بن حماد عن سفيان عن عيينة قال: ورواه صفوان بن عيسى كلاهما عن محمد بن عجلان و رواه من طريق الليث عن سعيد المقبري عن بشير بن المحرر عن سعيد بن المسيب مرسلا وهذا الحديث في غاية الحسن في المعنى وهو سبب سب الصديقؓ) (محشی مصر نے ہامش ابن کثیر پر لکھا ہے: "قوله: وهو سبب سبه للصديق... الخ كذا بالنسخ و حرر انتهٰى)۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ اللہ پاک نے بیان فرمایا کہ بدلے میں عدل یہی ہے کہ مساوات پر اکتفا کرے۔ اس کا ظاہر عموم ہے کوئی سا بھی قصور ہو اس کا بدلہ لینے میں برابری پر اکتفا کیا جائے۔ امام مقاتل، شافعی، ابو حنیفہ اور سفیان رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بدلہ لینا صرف مجروح (جس کو زخمی کیا جائے) کے لیے ہے کہ وہ زخمی کرنے والے سے انتقام لے قصاص کے ساتھ نہ کے اس کے سوا۔[2] امام مجاہد اور سدی رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ یہ جواب ہے قبیح کا جب کوئی شخص کہے: "أَخزَاكَ اللّٰهُ" (اللہ تجھے ذلیل کرے) تو اس کے جواب میں کہے: "أَخزَاكَ اللّٰهُ"[3] یعنی اللہ تجھے رسوا کرے بغیر اس کے کہ زیادتی کرے اور جب بدلہ لے لیا تو اپنی ظلامت بھر پور لے چکا اور پہلا شخص اس کے حق سے بری ہو گیا اور اس پر ابتداء کرنے کا گناہ، یعنی اللہ تعالیٰ کے حق کا گناہ باقی رہا۔ جزائے سیئہ کا نام جو سیئہ رکھا تو یا تو اس لیے کہ جس پر وہ واقع ہوتی ہے اسے بری لگتی ہے، یا مشاکلت کے طور پر، اس لیے کہ صورت میں دونوں آپس میں متشابہ ہیں۔

پھر جب اللہ پاک نے یہ بیان کر دیا کہ سیئہ کا بدلہ ویسی ہی سیئہ کے ساتھ لینا جائز حق ہے تو اس کے بعد عفو کی فضیلت بیان فرمائی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ﴾ حرفِ "فاء" تفریع (ڈرانے) کے لیے ہے، یعنی جبکہ جزا میں مساوات کی رعایت بغیر زیادتی کے واجب ہے اور یہ رعایت انتہائی مشکل ہے تو زیادہ بہتر عفو اور اصلاح ہے، جبکہ وہ قابلِ اصلاح ہو۔ چنانچہ اب یہ اعتراض وارد نہ ہو گا کہ یہ اس قول کے مخالف ہے: "اَلْحِلْمُ عَلَى الْعَاجِزِ مَحْمُوْدٌ وَعَلَى الْمُتَغَلِّبِ مَذْمُوْمٌ" یعنی عاجز پر حلم کرنا اچھا ہے اور متغلب پر مذموم ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جس شخص نے اس شخص کو معاف کیا جس نے اس پر ظلم کیا اور اپنے اور اپنے ظالم کے درمیان

---

[1] مسند أحمد (٤٣٦/٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٩٦، ٤٨٩٧) تفسير ابن كثير (١٤٩/٤-١٥١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢٣١)

[2] تفسير القرطبي (٤٠/١٦) [3] تفسير البغوي (١٩٨/٧)

عفو کے ساتھ اصلاح کی تو اس کا اجر اللہ پر ہے، یعنی وہ ضرور اس پر اس کو اجر دے گا۔ اجر کو جو مبہم رکھا تو اس لیے کہ اس کی شان کی تعظیم کرنا منظور ہے اور اس کی جلالت اور بزرگی سے آگاہ کرنا ہے، یعنی ایسا عظیم الشان اجر ہے کہ اس کی عظمت بیان سے باہر ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پس عفو اعمالِ صالحہ سے ہوا۔[1] اس کا بیان سورت آل عمران میں گزر چکا ہے۔ آیت کا مقصد عفو پر لوگوں کو آمادہ کرنا ہے اور عفو اور بدلہ لینے کے درمیان توفیق پہلے تم کو معلوم ہو چکی ہے۔

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ ایک منادی کو حکم دے گا اور وہ آواز لگائے گا: خبردار! وہ شخص کھڑا ہو جس کے لیے اللہ پر اجر ہے، چنانچہ کوئی کھڑا نہ ہوگا مگر وہ شخص جس نے دنیا میں عفو کیا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ﴾۔[2] امام بیہقی رحمہ اللہ نے عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک منادی ندا کرے گا کہ وہ شخص جس کے لیے اللہ پر اجر ہے اس کو چاہیے کہ جنت میں داخل ہو جائے۔ یہ ندا دو بار کرے گا۔ چنانچہ وہ شخص کھڑا ہوگا جس نے اپنے بھائی کو معاف کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ﴾۔[3]

پھر اللہ سبحانہ نے یہ بات ذکر کی کہ ظالم لوگ اس کی محبت سے خارج ہیں، کون سی محبت جو کامیابی اور نجات کا سبب ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ''مَنْ يَّبْدَءُ بِالظُّلْمِ''. ''جو ظلم کی ابتداء کرے۔'' امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[4] مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ظلم کی پہل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو دوست نہیں رکھتا، یعنی ان کو ظلم کی ابتداء کرنے کا بدلہ دے گا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اس شخص کو دوست نہیں رکھتا جو بدلہ لینے میں زیادتی کرتا ہے اور اس کی حد سے تجاوز کرتا ہے، اس لیے کہ حد سے بڑھنا ظلم ہے۔ پھر فرمایا کہ بدلہ لینے والے پر کچھ مواخذہ نہیں ہے۔

﴿ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴾ مصدر مضاف ہے طرف مفعول کے ''أَيْ: بَعْدَ أَنْ ظَلَمَهُ الظَّالِمُ''، یعنی البتہ جس شخص نے بدلہ لیا اس کے بعد کہ ظالم نے اس پر ظلم کیا تو ان لوگوں پر کوئی مواخذہ اور عقوبت نہیں ہے، کیوں کہ انھوں نے تو وہ کام کیا جو ان کے لیے جائز تھا۔ یہ حرفِ لام ابتداء کا لام ہے۔ امام حوفی اور ابن عطیہ رحمہما اللہ نے کہا کہ لامِ قسم ہے، یہ قول جید نہیں ہے، بلکہ اولیٰ قولِ اول ہے۔ کلمۂ ''مَنْ'' شرطیہ ہے اور اس کا جواب ﴿ فَاُولٰٓىِٕكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴾ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ موصولہ ہو۔ اس کے جواب میں جو حرفِ ''فاء'' آیا تو اس لیے کہ موصولہ کو شرطیہ سے تشبیہ دی ہے، لیکن اولیٰ قولِ اول ہے۔ تفسیر قرطبی میں

---

[1] تفسير القرطبي (١٦/٤٠) [2] الدر المنثور (٧/٣٥٩) [3] شعب الإيمان (٦/٣١٥) [4] فتح القدير (٤/٧٠٨)

ہے کہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ مظلوم کے لیے یہ ہے کہ وہ خود انتصار کا استیفا کرے، یعنی خود اپنی ذات سے بدلہ لے۔ اس کی تین قسمیں ہیں جو تفسیر قرطبی میں مذکور ہیں۔[1] امام جمل رحمہ اللہ نے پوری عبارت نقل کی ہے، چونکہ ان کی جگہ کتبِ فقہ میں ہے، اس لیے ان کا یہاں ذکر نہیں کیا۔

جب اللہ پاک نے اس شخص سے مواخذے کی نفی کی جس نے اپنے اوپر ظلم کیے جانے کے بعد بدلہ لیا تو اس شخص کا بیان کیا جس پر سبیل ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ﴾ یعنی سبیل ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ابتداءً زیادتی کرتے ہیں۔ اکثر نے اسی طرح کہا ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی ان پر شرک کے ساتھ ظلم کرتے ہیں جو ان کے دین کے مخالف ہے۔ ﴿وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ یعنی نفوس و اموال میں ناحق عمل کرتے ہیں۔ اکثر نے اسی طرح کہا ہے۔ بغی فی الارض کو جو غیر حق کے ساتھ مقید کیا تو اس لیے کہ بغی کبھی درست ہوتی ہے، جیسے: وہ بدلہ لینا جس میں زیادتی نہیں ہوتی۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی بغی یہ ہے کہ معاصی کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ تکبر و تجبر کرتے ہیں۔ امام ابو مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بغی وہ شے ہے جس کی اہلِ مکہ امید رکھتے ہیں کہ مکہ میں اسلام کے علاوہ کوئی دین ہو۔[2] ﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ یعنی وہ لوگ جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں ان کے لیے اس سبب سے سخت درد والا عذاب ہے۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے صبر وعفو میں رغبت دلائی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ صبر و عفو کی تکرار اس لیے فرمائی کہ صبر کی اہمیت کو ظاہر کرنا اور اس میں رغبت دلانا منظور ہے۔ اس جگہ صبر وہی اصلاح ہے جس کا ذکر ہو چکا، چنانچہ اس کا یہاں اعادہ کیا گیا ہے اور اس کو صبر کے پیرائے میں اس لیے ذکر کیا ہے کہ صبر اولو العزم اور ہمت والے لوگوں کی شان ہے اور اس طرف اشارہ ہے کہ عفوِ محمود وہ ہے جو تحمل اور برداشت سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ وہ عفو جو عاجزی سے ہو۔ معنی یہ ہیں کہ جس شخص نے ایذا پر صبر کیا اور اللہ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے اس شخص کے گناہ کو بخش دیا جس نے اس پر ظلم کیا اور بدلہ نہ لیا تو بے شک اس کا یہ صبر اور مغفرت البتہ عزمِ امور سے ہے۔ یہ اس شخص کے حق میں ہے کہ جس نے اس پر ظلم کیا ہے وہ مسلمان ہو۔ کلمۂ لام اور ''مَنْ'' میں بعینہٖ وہی تقریر ہے جو ﴿وَلَمَنِ انْتَصَرَ﴾ میں ہے۔

جملہ ﴿اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ میں ''منه'' محذوف ہے جس میں ضمیر کلمۂ ''مَنْ'' کی طرف پھرتی ہے، چوں کہ ظاہراً مفہوم ہوتی ہے اس لیے اس کو حذف کر دیا ہے، جس طرح کہ ''اَلسَّمَنُ مَنَوَانِ بِدِرْهَمٍ'' میں محذوف ہے: ''أَيْ: مِنْهُ''۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: ''مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ'' کے یہ معنی ہیں کہ ان امور سے ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے امر فرمایا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ اس قبیل سے ہے کہ عاقل کو لائق ہے کہ اس کو اپنے نفس پر واجب کرے

[1] تفسیر القرطبي (٤١/١٦) [2] تفسیر القرطبي (٤١/١٦، ٤٢)

اور اس کے چھوڑ دینے میں رخصت نہ لے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صابر اپنے صبر کے سبب سے ثواب دیا جائے گا۔ چنانچہ ثواب میں رغبت کرنا ہی تو از ردئے عزم مکمل خیر ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سب جہاد کے حکم سے منسوخ ہے اور مشرکوں کے ساتھ خاص ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ عام ہے۔ ظاہر نظمِ قرآنی یہی ہے۔[1]

نکتہ:

یہاں تو بہ لامِ تاکید فرمایا اور سورت لقمان میں اس کے بغیر، اس لیے کہ اس مکروہ پر صبر کرنا جو ظلم کے نتیجے میں حادث ہوا، جیسے: قتلِ فرزند زیادہ سخت اور مشکل ہے، اس مکروہ پر صبر کی نسبت جو بغیر ظلم کے حادث ہوا ہے، جیسے: لڑکے کا مر جانا۔ جس طرح کہ پہلے مکروہ پر عزم دوسرے پر عزم کرنے سے زیادہ مؤکد (تاکید کیا گیا) ہے۔ اس جگہ جو عزم مذکور ہے وہ پہلی قسم سے ہے تو اس کی تاکید زیادہ مناسب ہوئی۔ اور سورت لقمان میں جس عزم کا ذکر ہے وہ دوسری قسم سے ہے تو اس کے لیے مناسب ہوا کہ تاکید نہ کی جائے۔ (أفاده الكرخي)۔

نفیسہ

ابو سعید قرشی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مکارہ پر صبر، یعنی شدائد اور تکالیف پر صبر کرنا علاماتِ انتباہ سے ہے۔ چنانچہ جس شخص نے اس مکروہ پر صبر کیا جو اس کو پہنچتا ہے اور جزع فزع نہ کیا، یعنی مضطر و بے قرار نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ اس کو وارث کرتا ہے، حالِ رضا کا اور یہ حال تمام حالتوں سے عمدہ اور بزرگ ہے اور جس نے مصیبتوں پر جزع و فزع کیا اور شکایت کی تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کے نفس کے سپرد کر دیتا ہے، پھر اس کی شکایت اس کو نفع نہیں دیتی۔[2]

حکایت:

نقل کرتے ہیں کہ حسن رحمہ اللہ کی مجلس میں ایک شخص نے ایک شخص کو گالی دی تو جس کو گالی دی تھی وہ غصے کو پیتا تھا اور پسینے پسینے ہو رہا تھا، چنانچہ وہ پسینے کو پونچھتا تھا، پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور یہ آیت پڑھی: ﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ﴾ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: "عَقَلَهَا وَاللّٰهِ وَفَهِمَهَا إِذْ ضَيَّعَهَا الْجَاهِلُوْنَ"[3] یعنی واللہ! اس نے اس کو سمجھا بوجھا، جبکہ جاہلوں نے اس کو ضائع کر دیا۔ بالجملہ عفو ایک ایسی نفیس شے ہے کہ اس کی طرف رغبت دلائی ہے۔ پھر بعض حالات میں کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے تو اس وقت عفو کو ترک کر دینا مندوب الیہ (امرِ مستحب) ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے کہ بغی کو روکنے اور مادۂ ایذا (ایذا دینے والی اصل چیز) کو ختم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ غرضیکہ ایذا پر صبر کرنا اور عفو و درگزر کرنا ہمت کا کام ہے اور اللہ پاک کی توفیق سے بندۂ صالح کو نصیب ہوتا ہے۔[4] پھر فرمایا:

---

[1] فتح القدير (٧٠٩/٤) [2] تفسير النسفي (١٠٦/٤) [3] تفسير القرطبي (٤٤/١٦) [4] فتح البيان (٣١٢/١٢_٣١٥)

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَتَرَى
الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ
سَبِيْلٍ ۚ﴿۴۴﴾ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ
يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ
الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ
الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴿۴۵﴾ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ
يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ
سَبِيْلٍ ؕ﴿۴۶﴾

اور جسے اللہ گمراہ کر دے تو اللہ کے بعد اس کے لیے کوئی کارساز نہیں اور آپ ظالموں کو دیکھیں گے کہ جب وہ عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے: کیا واپسی کا کوئی راستہ ہے (44) اور آپ انھیں دیکھیں گے کہ وہ جہنم پر پیش کیے جائیں گے تو مارے ذلت کے جھکے جا رہے ہوں گے وہ نظریں چرا کر دیکھتے ہوں گے اور جو لوگ ایمان لائے تھے، وہ کہیں گے: بے شک خسارہ پانے والے تو وہی لوگ ہیں جنھوں نے روزِ قیامت اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو خسارے میں ڈالا، آگاہ رہو! بلاشبہ ظالم لوگ ہی دائمی عذاب میں ہوں گے (45) اور اُن کے لیے اللہ کے سوا، کوئی ایسے دوست نہیں ہوں گے جو اُن کی مدد کر سکیں اور جسے اللہ گمراہ کر دے تو اس کے لیے (ہدایت کا) کوئی راستہ ہی نہیں (46)

روزِ قیامت ظالموں کی بدحالی:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نفسِ کریم کی خبر دیتا ہے کہ جو کچھ اس نے چاہا وہ ہو گیا اور اس کا کوئی رد کرنے والا نہیں اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا، پھر اس کو وجود میں لانے والا کوئی نہیں۔ اور جس کو اس نے ہدایت دی، اس کو گمراہ کرنے والا کوئی نہیں اور جس کو اللہ گمراہ کرے، اسے راستے پر لانے والا کوئی نہیں، جیسا کہ اللہ عز وجل نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴾ [الکھف: ۱۷] ''اور جسے وہ گمراہ کر دے تو ناممکن ہے کہ آپ اس کا کوئی کارساز اور راہنما پا سکیں۔''

پھر اللہ پاک نے ظالمین کے متعلق خبر دی: یہ وہ ہیں جو اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے ہیں۔ یہ لوگ قیامت

کے دن جب عذاب کو دیکھیں گے تو دنیا کی طرف لوٹ جانے کی تمنا کریں گے، کہیں گے: کسی طرح لوٹ جانے کی بھی کوئی راہ ہوگی؟ جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَوْ تَرٰۤی اِذْ وُقِفُوْا عَلَی النَّارِ فَقَالُوْا یٰلَیْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰیٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۲۷﴾ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا یُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ [الانعام: ۲۷۔ ۲۸] ''اور اگر آپ اس وقت دیکھیں جب کہ یہ دوزخ کے پاس کھڑے کیے جائیں تو کہیں گے: ہائے کیا اچھی بات ہو کہ ہم پھر واپس بھیج دیے جائیں اور اگر ایسا ہو جائے تو ہم اپنے رب کی آیات کو جھوٹا نہ بتلائیں اور ہم ایمان والوں سے ہو جائیں۔ بلکہ جس چیز کو اس کے قبل چھپایا کرتے تھے وہ ان کے سامنے آ گئی ہے اور اگر یہ لوگ پھر واپس بھیج دیے جائیں تب بھی یہ وہی کام کریں گے جس سے ان کو منع کیا گیا تھا اور یقیناً یہ بالکل جھوٹے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتَرٰىهُمْ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا خٰشِعِیْنَ مِنَ الذُّلِّ یَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِیٍّ ؕ ﴾ یعنی تو دیکھے ان کو کہ آگ پر اس حال میں پیش کیے گئے ہیں کہ اس ذلت اور خواری کے سبب سے جو اُن پر چھا رہی ہے، وہ آنکھیں نیچی کیے ہوئے ہیں۔ یہ ذلت وخواری انھیں اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے ملی ہے جس کو وہ دنیا میں کر گزرے ہیں اور اب طرفِ خفی سے، یعنی کن انکھیوں سے دیکھتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ذلیل۔[1] مطلب یہ ہے کہ آگ سے ڈر کر اس کی طرف چور نظر سے دیکھیں گے، حالاں کہ جس شے سے ڈرتے ہیں وہ ضرور ان پر واقع ہونے والی ہے اور جو کچھ ان کے جی میں ہے، وہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہوگی۔ أَجَارَنَا اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَالَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ الْخٰسِرِیْنَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ ﴾ یعنی دنیا میں جو لوگ ایمان لے آئے تھے وہ قیامت کے دن یوں کہیں گے کہ یقیناً بڑے خسارے والے وہی لوگ ہیں جنھوں نے قیامت کے دن اپنے گھر والے اور اپنی جانیں گنوائیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو آگ کی طرف لے گئے تو انھوں نے ابد الآباد والے گھر میں اپنی لذت گم کر دی اور اپنی جانیں گنوائیں اور ان میں اور ان کے یار دوستوں اور گھر والوں اور رشتہ داروں میں جدائی کر دی گئی اور وہ ان کو گنوا بیٹھے۔ ﴿ اَلَاۤ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ فِیْ عَذَابٍ مُّقِیْمٍ ﴾ یعنی سنتے ہو! بے شک ظالم لوگ تو دائمی وابدی عذاب میں ہیں جس سے ان کو نکلنا نصیب ہوگا اور نہ ہی اس سے بھاگنے کی کوئی وجہ ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِیَآءَ یَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِیْلٍ ﴾ یعنی اور کوئی ان کے حمایتی نہ ہوئے اللہ کے سوا جو ان کو اس عذاب اور سزا سے چھڑاتے، جس میں وہ پڑے ہوئے ہیں اور جس کو اللہ تعالیٰ بھٹکا دے اس کو کسی طرح کا چھٹکارا نہیں ہے۔[2]

---

[1] تفسیر الطبري (۲۱/۵۵۳)
[2] تفسیر ابن کثیر (۴/۱۵۱)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے، یعنی اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دے تو اللہ کے سوا اس کا کام بنانے والا کوئی نہیں کہ اس کی ہدایت کا متولی ہو اور اس کی مدد کرے۔ ظاہری طور پر آیت عام ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ اس شخص کے ساتھ خاص ہے جس نے نبی اکرم ﷺ سے اعراض کیا (منہ پھیرا) اور آپ ﷺ نے اس کو جس شے کی طرف بلایا اس پر عمل نہ کیا۔ مراد اللہ پاک پر ایمان لانا اور اس شے پر عمل کرنا ہے جو اس نے مشروع فرمائی اور مودتِ قربیٰ میں، یعنی جس شخص کو اللہ پاک نے ان چیزوں سے گمراہ کیا تو کوئی ہدایت کرنے والا اس کو ہدایت نہیں کرتا ہے۔[1] (قاله القرطبي والأول أولیٰ)

﴿ تَرَى ﴾ کا خطاب دونوں جگہ ہر اس شخص کو ہے جس سے رویت ہو سکتی ہے اور دونوں جگہ میں رویتِ بصری ہے، یعنی سر کی آنکھ سے دیکھنا، یہ رویت ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتی ہے، چنانچہ ﴿ اَلظّٰلِمِيْنَ ﴾ اس کا مفعول ہے اور ہر ایک کے بعد کا جملہ حالیہ ہے۔ ظالمین سے مراد مشرکین اور قیامت کے جھٹلانے والے ہیں۔ ﴿ رَاَوُا ﴾ کے معنی "یَرَوْنَ" ہیں۔ ماضی کا صیغہ تحققِ وقوع کے لیے اختیار کیا ہے۔ ﴿ اَلْعَذَابَ ﴾ سے مراد نار ہے، معنی یہ ہیں: اے دیکھنے والے! تو مشرکوں کو اور قیامت کے جھٹلانے والوں کو دیکھے گا کہ جس وقت وہ آگ کو دیکھیں گے۔ کسی نے کہا: جب موت کے وقت اس شے کو دیکھیں گے جو اللہ پاک نے ان کے لیے تیار کر رکھی ہے تو کہیں گے کہ کیا دنیا کی طرف لوٹ جانے کا کوئی راستہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب دیکھ کر دنیا کی طرف لوٹ جانے کی تمنا کریں گے حالاں کہ یہ تمنا بے سود ہے۔

﴿ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ﴾ جملہ ﴿ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال، اس لیے کہ رویت بصری ہے چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ ﴿ خٰشِعِيْنَ ﴾ حال ہے ﴿ يُعْرَضُوْنَ ﴾ کی ضمیر سے۔ ﴿ مِنَ الذُّلِّ ﴾ میں حرف ﴿ مِنْ ﴾ سببیہ ہے۔ "أَيْ: مِنْ أَجْلِ الذُّلِّ" اور ﴿ خٰشِعِيْنَ ﴾ سے متعلق ہے۔ ﴿ عَلَيْهَا ﴾ کی ضمیر عذاب کی طرف راجع ہے گو عذاب مذکر ہے، مگر چونکہ اس سے مراد نار ہے، اس لیے اس کی طرف ضمیرِ مؤنث راجع کی ہے، یعنی اے مخاطب! تو ظالموں کو اس حال میں دیکھے گا کہ وہ آگ پر پیش کیے جا رہے ہوں گے، حالانکہ وہ ذلت کے سبب سے ساکن، متواضع اور فروتن ہوں گے اور کن انکھیوں سے آگ کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ خَفِيٍّ ﴾ بہ معنی ذلیل ہے،[2] یعنی نیچی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے۔

---

[1] تفسیر القرطبي (٦١/٤٥) [2] تفسیر الطبري (٢١/٥٥٣)

حرف ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائے غایت کا ہے، یعنی ان کا آگ کی طرف دیکھنا آنکھ کے کنارے سے شروع ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کا ہو، یعنی بعض لوگ پست نگاہ سے نظر کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ خوف کے مارے پوری نیچی نگاہ سے بھی نظر نہ کریں گے، بلکہ پست نگاہ سے کچھ دیکھیں گے۔ یونس نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْ ﴾ بہ معنی "باء" ہے۔ "أَيْ: يَنْظُرُوْنَ بِطَرْفٍ ضَعِيْفٍ" یعنی کمزور نگاہ سے نظر کریں گے مارے خوف و ذلت کے۔..امام اخفش رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[1] ﴿ طَرْفٍ خَفِيٍّ ﴾ وہ ہے جس کی نظر خفی ہوتی ہے جس طرح وہ شخص تلوار کی طرف دیکھتا ہے جس کو قتل کرنے کے لیے روک رکھا ہے۔ جو لوگ اس طرح دیکھیں گے وہ اس لیے کہ ان کو خوف اور ذلت لاحق ہوا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ تو اپنے دلوں سے نظر کریں گے، کیوں کہ وہ تو اندھے ہو کر اٹھائے جائیں گے اور دل کی آنکھ ﴿ طَرْفٍ خَفِيٍّ ﴾ ہے۔[2] امام قتادہ، سعید بن جبیر، سدی اور محمد بن کعب قرظی رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ "يُسَارِقُوْنَ النَّظَرَ إِلَى النَّارِ مِنْ شِدَّةِ الْخَوْفِ"[3] یعنی شدتِ خوف کے مارے چور نگاہ سے آگ کی طرف نظر کریں گے، بھری نگاہ سے بلا تکلف نہ دیکھیں گے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ مومنین کہیں گے: بے شک خسارے اور نقصان میں کامل اور بھرپور یہی لوگ ہیں، جنھوں نے اپنے لیے اور اپنے گھر والوں کے لیے نقصان اکٹھا کیا ہے کہ ان کو ہمیشہ کے لیے آگ میں بسایا۔ ﴿ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ یا تو ﴿ خَسِرُوْٓا ﴾ کا ظرف ہے، اس بنا پر یہ مومنین کا دنیا میں قول ہوگا یا ﴿ قَالَ ﴾ کا ظرف ہے تو قول قیامت میں ہوگا۔ اس کو ماضی کے صیغے میں اس لیے ادا کیا ہے کہ اس کا واقع ہونا حق معلوم ہو۔[4] (كما قاله أبو السعود)

یہاں دو خسران مذکور ہیں۔ پس انھوں نے اپنی جانوں کا نقصان تو یوں کیا کہ آگ میں چلے گئے اور وہاں معذب ہوئے۔ اور گھر والوں کا نقصان یہ ہے کہ اگر وہ ان کے ساتھ آگ میں ہیں تو اُن سے کسی قسم کا فائدہ نہ اٹھا سکیں گے اور اگر وہ جنت میں ہیں تو ان کے اور ان کے درمیان حیلولت ہوگئی۔ کسی نے کہا ہے کہ اہل کا نقصان یہ ہے کہ اگر وہ ایمان لاتے تو جنت میں اُن کے لیے حورِعین میں سے گھر والے ہوتے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴾ یا تو مومنین کے تتمۂ کلام سے ہے، یا اللہ پاک کے کلام سے ہے، یعنی سنتے ہو! ظالمین بے شک عذابِ دائم میں ہیں جو کبھی منقطع نہ ہوگا۔

﴿ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ اللہ کے سوا نہ ان کے لیے کوئی اعوان (معاون) ہیں کہ ان سے عذاب کو دور کریں اور نہ کوئی انصار اور مددگار کہ ان کی مدد کریں۔

---

[1] تفسير الطبري (٢١/٥٥٣) [2] تفسير القرطبي (١٦/٤٦)

[3] تفسير القرطبي (١٦/٤٥) [4] تفسير أبي السعود (٨/٣٥، ٣٦)

بلکہ اللہ پاک ہی متصرف ہے جو اس نے چاہا وہ ہوا اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا۔ ﴿ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جس کو اللہ بھٹکا دے تو اس کے لیے کوئی راہ نہیں ہے جس پر چل کر نجات حاصل کرے۔[1] پھر جب اللہ سبحانہ نے وعد و وعید کے ذکر میں اطناب (طول) کیا تو اس کے بعد وہ شے ذکر کی جو دونوں کے ذکر سے مقصود ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَىِٕذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ۝ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۭ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ۝

تم اپنے رب کا فرمان قبول کر لو اس سے پہلے کہ اللہ کی طرف سے وہ دن آجائے جو (کسی طرح بھی) ٹالا نہیں جا سکتا، اس دن تمھارے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہو گی اور نہ تم سے (گناہوں کا) انکار ہی بن پڑے گا (47) پھر اگر وہ اعراض کریں تو (اے نبی!) ہم نے آپ کو ان پر نگران (بنا کر) نہیں بھیجا، آپ کے ذمے تو پہنچا دینا ہی ہے اور بلاشبہہ جب ہم انسان کو اپنی رحمت (کا مزہ) چکھاتے ہیں تو وہ اس پر اِترانے لگتا ہے اور اگر انھیں ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی تکلیف پہنچے تو بلاشبہہ انسان بہت ہی ناشکرا ہے (48)

قبلِ قیامت اطاعتِ الٰہی کی ترغیب:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب اللہ پاک نے ان ہولناک اور بڑے بڑے امور کا ذکر کیا جو قیامت کے دن ہوں گے تو اس سے ڈرایا اور اس کے لیے تیاری کرنے کا حکم کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ﴾ یعنی اپنے رب کا حکم مانو اس دن سے پہلے جس کو اللہ کے پاس سے پھرنا نہیں ہے، وہ ایسا دن ہے کہ جس وقت وہ اس کے ہونے کا حکم دے گا تو وہ پلک جھپکنے کی طرح ہو پڑے گا۔ اس کا نہ کوئی دور کرنے والا ہے اور نہ کوئی روکنے والا۔

[1] فتح البیان (۱۲/۳۱۶۔۳۱۸)

﴿ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَىِٕذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴾ اس دن تمھارے لیے کوئی جائے پناہ اور قلعہ نہیں ہے کہ تم اس میں محفوظ ہو جاؤ اور کوئی ایسا مکان نہیں ہے جو تم کو چھپا لے اور تم اس میں محفوظ ہو جاؤ اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی نگاہ سے غائب ہو جاؤ، بلکہ وہ تو اپنے علم و بصر و قدرت سے تمھیں گھیرنے والا ہے، چنانچہ اس سے کوئی جائے پناہ نہیں مگر اس کی طرف۔ ﴿ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۞ كَلَّا لَا وَزَرَ ۞ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ ا۟لْمُسْتَقَرُّ ﴾ [القیامۃ: ۱۰۔ ۱۲] ''اس دن انسان کہے گا کہ آج بھاگنے کی جگہ کہاں ہے؟ نہیں نہیں کوئی پناہ گاہ نہیں آج تو تیرے پروردگار کی طرف ہی قرار گاہ ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴾ یعنی، پھر اگر مشرکین اعراض کریں تو ہم نے تجھے ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا، یعنی تو کچھ ان پر داروغہ نہیں ہے کہ خواہ مخواہ ان کو راستے پر لائے، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [البقرۃ: ۲۷۲] ''انھیں ہدایت پر لا کھڑا کرنا تیرے ذمے نہیں، بلکہ ہدایت اللہ تعالیٰ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴾ [الرعد: ۴۰] ''آپ پر تو صرف پہنچا دینا ہی ہے، حساب تو ہمارے ذمے ہی ہے۔'' اور یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ﴾ یعنی ہم نے تو تجھ کو صرف اس بات کا مکلّف کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رسالت ان کو پہنچا دے۔

پھر فرمایا: ﴿ وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ﴾ یعنی جس وقت انسان کو ارزانی اور نعمت پہنچے تو اس سے خوش ہوتا ہے اور اگر لوگوں کو کوئی برائی پہنچے یعنی قحط و تکلیف و آزمایش و سختی تو بے شک انسان بڑا ناشکرا ہے، یعنی جو نعمتیں اس سے پہلے گزر چکی ہیں ان کا منکر ہوتا ہے اور صرف موجودہ حالت کو پہچانتا ہے، یعنی پہلے انعامات سے چشم پوشی کرتا ہے اور اسی موجودہ حالت کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اگر اس کو کوئی نعمت پہنچے تو اترو بطر کرتا ہے، یعنی اتراتا ہے کہ ہم جیسا کوئی نہیں، ہم ہی ناز ونعم میں ہیں اور اگر اس کو کوئی تکلیف اور ایذا پہنچے تو ناامید ہو جاتا ہے، آس توڑ بیٹھتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں سے ارشاد فرمایا کہ اے عورتوں کے گروہ! تم خیرات کرو، میں نے دیکھا ہے کہ اہلِ نار میں کثیر تعداد تمھاری ہے۔ ایک عورت بولی: یارسول اللہ! یہ کیوں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس لیے کہ تم شکایت بہت کرتی ہو اور خاوندوں کی ناشکری کرتی ہو۔ «لَوْ أَحْسَنْتَ إِلَى إِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ تَرَكْتَ يَوْمًا قَالَتْ: مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ» [1] یعنی آپ نے عورتوں کی طرف التفات کر کے غیر معین مرد کو مخاطب کر کے فرمایا: اے مخاطب! اگر تو کسی عورت پر ایک مدتِ دراز تک احسان کرے، پھر تو ایک دن احسان چھوڑ دے تو وہ کہے کہ میں نے تجھ سے کبھی کوئی خیر نہیں دیکھی۔

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۹) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۰۷)

اکثر عورتوں کا یہی حال ہے، مگر وہ عورت جس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی اور اسے اس کی ہدایت کا الہام فرمایا اور وہ ایمان لانے والوں اور بھلائیاں کرنے والوں میں سے تھی۔ چنانچہ مومن ایسا ہوتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر اس کو راحت پہنچے تو شکر کرے تو وہ اس کے لیے خیر ہو اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچے اور وہ صبر کرے تو اس کے لیے خیر ہو۔ یہ حال سوائے مومن کے اور کسی کا نہیں ہوتا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ تمھارے رب نے جو تم کو اس طرف بلایا ہے کہ تم اس پر اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ تو تم اس کی دعوت کو قبول کرو اس سے پہلے کہ وہ دن آ جائے جس کو دور کرنے کی کسی میں قدرت نہیں۔ یہ تقدیر اس بنا پر ہے کہ معنی یہ ہوں کہ قبل اس کے کہ آئے اللہ کی طرف سے وہ دن جس کو کوئی رد نہ کرے۔ یا ﴿ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اس کو دور نہیں کرے گا، اس کے بعد کہ اپنے بندوں پر اس کا حکم دے چکا اور ان کو اس کا وعدہ دے چکا۔ اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے یا موت کا دن۔ ﴿ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَىٕذٍ ﴾ یعنی اس دن تمھارے لیے کوئی جائے پناہ نہیں کہ تم اس کی طرف پناہ حاصل کرو۔ ﴿ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴾ کے معنی یہ ہیں اور اس دن تمھارے لیے کسی طرح کا انکار نہیں ہے، یعنی تم اپنے گناہوں کا اقرار کر لو گے، کیوں کہ وہ تو تمھارے نامۂ اعمال میں درج ہوں گے اور تمھارے گواہ تم پر ان کی گواہی دیں گے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ "مَا لَكُمْ مِّنْ نَّاصِرٍ يَّنْصُرُكُمْ"[2] یعنی تمھارا کوئی مددگار نہیں جو تمھاری مدد کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ نَكِيْرٍ ﴾ بہ معنی منکر ہے، جیسے: ﴿ اَلِيْمٌ ﴾ بہ معنی مؤلم ہے، یعنی اس دن تم اس عذاب کا کوئی منکر نہ پاؤ گے جو تم پر نازل ہوگا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس کو بیان کیا ہے اور امام کلبی رحمہ اللہ وغیرہ بھی اسی کے قائل ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ وہ اس بات پر قادر نہ ہوں گے کہ ان گناہوں کا انکار کریں جن پر وہ واقف کیے جائیں گے۔[3] یہ معنی پہلے بیان کیے گئے معنی کے لگ بھگ ہیں۔

﴿ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴾ کا یہ مطلب ہے، پھر اگر وہ اعراض کریں تو ہم نے تجھ کو ان پر حافظ اور نگہبان بنا کر نہیں بھیجا کہ جو اعمال ان سے صادر ہوتے ہیں تو ان پر نگاہ رکھے، یہاں تک کہ تو ان پر ان سے محاسبہ کرے اور نہ ہی ہم نے تجھے ان پر موکل و رقیب کر کے بھیجا ہے کہ تو ان کو اس شے کی بجا آوری پر مجبور کرے، جس کو دے کر ہم نے تجھے بھیجا ہے۔ ﴿ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ﴾ یعنی تم پر اس شے کا پہنچا دینا ہے جس کو

---

① صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٩٩) تفسير ابن كثير (١٥٢،١٥١/٤)

② تفسير الطبري (٥٥٥/٢١) ③ تفسير القرطبي (٤٧/١٦)

پہنچانے کا تجھے حکم دیا ہے، اس کے سوا تجھ پر اور کچھ ذمے داری نہیں ہے۔ یہ حکم آیتِ سیف سے منسوخ ہے، اس لیے کہ یہ جہاد کے حکم سے پہلے تھا۔

﴿ وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت ہم انسان کو اپنی طرف سے رحمت چکھائیں، یعنی جب ہم اس کو ارزانی اور صحت اور آسودگی عطا کریں تو اس سے خوش ہو اور غرور کرے۔ دنیا کی نعمتیں گو عظیم کیوں نہ ہوں مگر آخرت کی نیک بختی کے مقابلے میں ایسی ہیں، جیسا دریا کے مقابلے میں ایک قطرہ۔ اسی لیے انعام کے لیے اذاقت کا لفظ استعمال کیا، یعنی دنیا کا انعام اگرچہ کتنا ہی بڑا ہو آخرت کے مقابلے میں ایسا ہے جیسے کسی کھانے کا صرف مزہ چکھ لینا۔

بالجملہ انسان سے مراد جنس ہے، اسی لیے ﴿ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ﴾ میں اس کی طرف جمع کی ضمیر راجع فرمائی، یعنی اگر ان کو ان گناہوں کے سبب سے جن کو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں، آزمایش اور سختی اور بیماری وفقیری پہنچے۔ ذات کو ہاتھوں کے پیرائے میں اس لیے ادا کیا ہے کہ اکثر افعال انھیں ہاتھوں سے انجام پاتے ہیں۔ بے شک انسان ان نعمتوں کا بڑا ناشکرا ہے جن کا اللہ پاک نے اس پر انعام فرمایا ہے، وہ ان پر اس کا شکر ادا نہیں کرتا۔ یہ بات انسانوں کی اکثریت کے متعلق ہے۔ اکثر ناشکرے ہیں شکر کرنے والے بہت کم ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴾ [سبا: ۱۳] ”میرے بندوں میں سے شکر گزار بندے کم ہی ہوتے ہیں۔“

نکتہ:

یہاں ”فَاِنَّهٗ كَفُوْرٌ“ کہہ دینا کافی تھا، اس لیے کہ انسان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، مگر ایسا نہ کیا، بلکہ اسم ظاہر کو ضمیر کی جگہ رکھا، اس لیے کہ اس امر پر تسجیل کرنا منظور ہے کہ یہ جنس موسوم بہ کفرانِ نعمت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴾ [ابراھیم: ۳٤] ”یقیناً انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے۔“ معنی یہ ہیں کہ انسانوں میں سے اکثریت کا یہ حال ہے کہ آزمایش کو یاد کرتا ہے اور نعمتوں کو بھول جاتا ہے اور ان کو ڈھانکتا ہے۔ پھر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنی وسعتِ ملک اور نفاذِ تصرف کا ذکر کیا تو ارشاد فرمایا:[1]

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ الذُّكُوْرَ ۝ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَاۗءُ عَقِيْمًا ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ وَمَا

[1] فتح البیان (۱۲/۳۱۸-۳۱۹)

كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿٥١﴾

آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ جو چاہے پیدا کرتا ہے۔ جسے چاہے (صرف) بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہے (صرف) بیٹے عطا کرتا ہے ﴿49﴾ یا اُن کو بیٹے اور بیٹیاں ملا کر دیتا ہے اور جسے چاہے بے اولاد رکھتا ہے۔ بے شک وہ خوب جاننے والا، بہت قدرت والا ہے ﴿50﴾ اور یہ کسی بشر کے لائق نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے، مگر الہام (دل میں القاء) کر کے، یا پردے کے پیچھے سے، یا فرشتہ بھیج کر اور وہ (فرشتہ) اللہ کے حکم سے، جو اللہ چاہے، وحی کرتا ہے۔ بلاشبہ وہ بلند مرتبہ، خوب حکمت والا ہے ﴿51﴾

اللہ ہی اولاد دینے اور اس سے محروم کرنے کا مختار ہے:

موسیٰ علیہ السلام سے پردے کے پیچھے کلام ہوئے ہیں۔ انتھٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ خبر دیتا ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین کا خالق اور مالک ہے اور اُن میں تصرف کرنے والا ہے۔ اس نے جو چاہا وہ ہوا اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا۔ وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے نہیں دیتا۔ کوئی اس شے کو روکنے والا نہیں ہے جو اس نے دی اور نہ کوئی اس شے کا دینے والا ہے جو اس نے نہ دی۔ اور وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے صرف بیٹیاں بخشتا ہے۔ امام بغوی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان میں سے لوط علیہ السلام ہیں اور جس کو چاہتا ہے فقط بیٹے بخشتا ہے۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جیسے ابراہیم علیہ السلام ہیں کہ ان کے ہاں کوئی بیٹی پیدا نہیں ہوئی، اور لوگوں میں سے جس کو چاہتا ہے جوڑے عطا کرتا ہے، یعنی بیٹے اور بیٹیاں۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جیسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور جس کو چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے، یعنی اس کے نہ بیٹا ہوتا ہے اور نہ بیٹی۔ بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جیسے یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام ہیں۔[1] چنانچہ لوگوں کی چار قسمیں ٹھہرائیں: ان میں سے وہ ہے جس کو بیٹیاں عطا کرتا ہے اور ان میں سے وہ ہے جس کو بیٹے دیتا ہے اور ان میں سے وہ ہے جس کو دونوں قسموں میں سے عطا فرماتا ہے، بیٹے اور بیٹیاں، اور ان میں سے وہ ہے جس کو نہ بیٹا دیتا ہے نہ بیٹی، اس کو بانجھ کرتا ہے، نہ اس کی کوئی نسل ہے اور نہ اولاد۔

﴿ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴾ یعنی وہ اس شخص کو خوب جانتا ہے جو ان قسموں میں سے ہر قسم کا مستحق ہے۔ وہ بڑی

---

[1] تفسیر البغوي (۲۰۰/۷)

قدرت والا ہے، اس شے پر جس کو چاہتا ہے، یعنی اس بارے میں لوگوں کا فرق ہونا۔ یہ مقام اس مقام کے مشابہ ہے جس کی عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے خبر دی ہے: ﴿ وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ ﴾ [مریم: ۲۱] ''ہم تو اسے لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دیں گے۔'' یعنی اور تا کہ ہم اس کو اپنی قدرت کی ایک دلیل بنا دیں، اس طرح سے کہ اللہ پاک نے مخلوق کو چار قسم پر پیدا کیا: چنانچہ آدم علیہ السلام تو مٹی سے پیدا کیے گئے بغیر مرد وعورت کے اور حوا علیہا السلام مرد سے بغیر عورت کے پیدا ہوئیں اور باقی مخلوق عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ، مرد وعورت سے پیدا ہوئے اور عیسیٰ علیہ السلام عورت سے بغیر مرد کے پیدا ہوئے۔ چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام کے پیدا کرنے سے قدرت پر دلالت مکمل ہوگئی اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ ﴾ [مریم: ۲۱] چنانچہ یہ مقام تو آباء میں سے ہے اور مقامِ اول ابناء میں اور ان میں ہر ایک چار قسم ہے۔ فسبحان العلیم القدیر.

وحی کی کیفیت:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے مقامات کا ذکر ہے۔ وہ یہ ہے کہ کبھی تو اللہ تعالیٰ کوئی شے نبیِ مکرم ﷺ کے قلب مبارک میں ڈال دیتا ہے کہ وہ اس کے اللہ پاک کی طرف سے ہونے میں شک نہیں کرتے، جیسا کہ صحیح ابن حبان میں رسول اللہ ﷺ سے آیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ رُوحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِي رَوْعِي أَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوتَ حَتَّى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا وَأَجَلَهَا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَجْمِلُوا فِي الطَّلَبِ »[1] یعنی بے شک جبرائیل علیہ السلام نے میرے دل میں یہ بات پھونک دی کہ کوئی نفس ہرگز نہیں مرے گا یہاں تک کہ اپنے رزق اور اجل کو پورا کر لے، چنانچہ تم اللہ سے ڈرو اور طلب میں اجمال کرو، یعنی جب یہ بات ٹھہر چکی کہ آدمی اپنی روزی مکمل کیے بغیر نہیں مرتا تو روزی کو سرسری طور پر اور دستور کے مطابق طلب کرو، اس کی طلب میں زیادہ منہمک مت ہو اور جان مت دے ڈالو، کیوں کہ جو لکھی ہے وہ ضرور ملنی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ ﴾ جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام نے باتیں کیں، اس لیے کہ انھوں نے کلام کرنے کے بعد رویت (اللہ کو دیکھنے) کا سوال کیا تو اس سے روک دیے گئے۔ صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے فرمایا کہ اللہ نے کسی سے کلام نہیں کیا مگر پردے کے پیچھے سے۔ « وَإِنَّهُ كَلَّمَ أَبَاكَ كِفَاحًا »[2] (أي: مواجهة ليس بينهما حجاب ولا رسول.[3] كذا في مجمع البحار)۔ یعنی اور بے شک اس نے تیرے باپ سے بالمشافہ کلام کیا۔ حدیث شریف اسی طرح آئی ہے۔ عبد اللہ رضی اللہ عنہ اُحد کے دن شہید ہوئے تھے، لیکن یہ کلام عالمِ برزخ میں ہے اور آیت دارِ دنیا کے بارے میں ہے۔ قولہ عزوجل: ﴿ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ

---

[1] شعب الإيمان (۲۹۹/۷) صحيح ابن حبان (۳۲/۸) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۲۸۶۶)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۰۱۰) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۹۰) صحيح الجامع، رقم الحديث (۷۹۰۵)

[3] مجمع بحار الأنوار (۴۱۵/۴)

مَا يَشَآءُ ﴾ جس طرح کہ جرائیل علیہ السلام وغیرہ فرشتے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتے تھے۔ ﴿ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ ﴾۔ فَهُوَ عَلِيٌّ عَلِيمٌ خَبِيرٌ حَكِيمٌ.[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ آسمان و زمین میں اسی کا تصرف ہے، اس شے کے ساتھ جس کا ارادہ کرتا ہے: «لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَى وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعَ»۔ ﴿ مُلْكُ ﴾ بالضم مستولی ہونا ہے شے پر اور اس میں تصرف کرنے پر قادر ہونا ہے۔ مصباح میں ہے: "وَمَلَكَ عَلَى النَّاسِ أَمْرَهُمْ مَلْكًا مِنْ بَابِ ضَرَبَ إِذَا تَوَلَّى السَّلْطَنَةَ فَهُوَ مَلِكٌ وَالإِسْمُ اَلْمُلْكُ بِضَمِّ الْمِيمِ"[2] انتھٰی.

﴿ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ﴾ یعنی جو خلق چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ ﴿ يَهَبُ لِمَنْ يَشَآءُ إِنٰثًا ﴾ بدل مفصل ہے مجمل سے، یعنی جس کو چاہتا ہے بیٹیاں بخشتا ہے کہ ان کے ساتھ بیٹے نہیں ہوتے۔ یہ قول امام مجاہد، حسن، ضحاک، ابو مالک اور ابو عبیدہ رحمہ اللہ کا ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مراد لوط علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام ہیں، اس لیے کہ ان کی صرف بیٹیاں تھیں۔ ﴿ وَيَهَبُ لِمَنْ يَشَآءُ الذُّكُورَ ﴾ اور جس کو چاہتا ہے بیٹے بخشتا ہے، ان کے ساتھ بیٹیاں نہیں ہوتیں، یہ قول بھی امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مراد ابراہیم علیہ السلام ہیں، اس لیے کہ ان کے بیٹے ہی تھے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ یہاں "ذکور" کو معرف بہ الف و لام اس لیے ذکر کیا ہے کہ ان کا "اناث" پر شرف بتانا منظور ہے۔ اس وجہ کی رد میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ "إناث" کو پہلے ذکر کرنا مذکورہ وجہ سے معارض ہے تو اب آیت میں اس بات پر دلالت نہیں ہے کہ "ذکور" کو معرف بہ الف و لام ان کا "إناث" پر شرف بتانے کے لیے کیا ہے، کیوں کہ اگر یہ بات منظور تھی تو "ذکور" کا ذکر بھی پہلے کرتے، تاکہ ان کا شرف معلوم ہو، بلکہ آیت کا سیاق کسی اور معنی کے لیے ہوا ہے۔

رہا "ذکور" کا "إناث" پر شرف تو اس کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ [النساء: ٣٤] "مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔" اس کے سوا اور دلیلیں ہیں جو "إناث" پر "ذکور" کے شرف پر دلالت کرتی ہیں۔ اب اس کی وجہ کہ "إناث" کا ذکر پہلے کیوں کیا ہے؟ تو کسی نے کہا: اس لیے کہ ان کے باپوں کے دل خوش ہو جائیں، کیونکہ وہ بیٹیوں سے ناخوش ہوتے تھے۔ اس کے سوا اور وجہ بھی ذکر کی ہیں، جن کو بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چونکہ اللہ پاک نے "إناث" کا ذکر پہلے فرمایا تو اس سے معلوم ہوا کہ پہلے پہل لڑکی پیدا ہونا مبارک ہے۔ چنانچہ

[1] تفسير ابن كثير (١٥٣،١٥٢/٤) [2] المصباح المنير (٢٩٩/١)
[3] تفسير القرطبي (٤٨/١٦) [4] تفسير الرازي (١٥٩/٢٧)

امام ابن مردویہ اور ابن عساکر رحمہ اللہ نے عن واثلہ بن الاسقع عن النبی ﷺ روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے:
«مِنْ بَرَكَةِ الْمَرْأَةِ ابْتِكَارُهَا بِالْأُنْثَى لِأَنَّ اللّٰهَ قَالَ: ﴿ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴾ »[1]
یعنی عورت کی برکت سے پہلے پہل اس کا لڑکی جننا ہے۔

﴿ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ﴾ یعنی یا قران کرتا ہے "إناث" اور "ذکور" کے درمیان اور ان کو جوڑے کرتا ہے، چنانچہ اپنی بعض خلق کو بیٹے اور بیٹیاں دونوں بخشتا ہے۔ مراد نبی کریم ﷺ ہیں۔ اس لیے کہ صحیح قول کی بنا پر آپ ﷺ کے تین تو فرزند تھے: قاسم، عبداللہ، ابراہیم رضی اللہ عنہم اور چار صاحبزادیاں تھیں: زینب، رقیہ، اُم کلثوم اور فاطمہ رضی اللہ عنہن[2] (كما قاله ابن عباس)۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس کے یہ معنی ہیں کہ عورت لڑکا جنے، پھر لڑکی، پھر لڑکا جنے، پھر لڑکی۔ امام محمد بن حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ معنی ہیں کہ توام جنے، یعنی ایک ساتھ لڑکا اور لڑکی جنے۔ امام قتیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہاں تزویج سے مراد بیٹوں اور بیٹیوں کے درمیان جمع کرنا ہے۔ عرب لوگ جب چھوٹے بڑے اونٹوں کو جمع کرتے ہیں تو اپنے محاورے میں بولتے ہیں: "زَوَّجْتُ إِبِلِيْ".[3] آیت کے معنی اس بات سے واضح تر ہیں کہ اس جیسے امر میں اختلاف کیا جائے، کیوں کہ اللہ پاک نے تو یہ خبر دی ہے کہ وہ اپنی بعض مخلوق کو تو بیٹیاں دیتا ہے اور بعض کو بیٹے اور بعض کو بیٹے بیٹیاں دونوں بخشتا ہے۔

﴿ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ﴾ یعنی جس کو چاہتا ہے عقیم کر دیتا ہے کہ جس کے نہ لڑکا پیدا ہو نہ لڑکی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: مراد یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام ہیں۔[4] اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ یہ بات بطور تمثیل ہے اور حکم سب لوگوں میں عام ہے۔ اس لیے کہ مقصد اس امر کا بیان کرنا ہے کہ اللہ پاک کی قدرتِ تامہ چیزوں کے وقوع پذیر ہونے میں نافذ ہے، جس طرح وہ چاہتا ہے اسی طرح ہوتا ہے تو اب تخصیص کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ "عَقِيْم" وہ ہے جس کے بچہ نہیں ہوتا اس لفظ کا اطلاق مرد و عورت دونوں پر ہوتا ہے۔ "رَجُلٌ عَقِيْمٌ وَامْرَأَةٌ عَقِيْمٌ" بولتے ہیں: "عَقَمَتِ الْمَرْأَةُ تَعْقِمُ عَقْمًا"۔ "عقم" کی اصل قطع ہے۔ "وَيُقَالُ: نِسَاءٌ عُقُمٌ وَعَقْمَاءُ وَعِقَامٌ" (قاموس اور مصباح سے یہ مفہوم ہے کہ "عقیم" جب مرد کی صفت ہو تو اس کی جمع "عَقْمَاءُ وَعِقَامٌ وَعُقْمَى" آئے گی۔ مصباح میں صرف آخری کو ذکر نہیں کیا۔ اور "عقیم" جب عورت کی صفت ہو تو اس کی جمع "عَقَائِمُ وَعُقُمٌ" آتی ہے)۔[5] ﴿ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴾ یعنی بے شک اللہ پاک بلیغ العلم عظیم القدرت ہے، جو چاہتا ہے جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔

---

[1] تاریخ دمشق (۲۲۵/۴۷) اس کی سند میں "حکیم بن حزام" سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٥١٩)
[2] اللباب في علوم الكتاب (۲۲۰/۱۷)
[3] تفسير القرطبي (٤٨/١٦)
[4] تفسير القرطبي (٤٩/١٦)
[5] المصباح المنير (۲۱۰/۱) القاموس المحيط (۱٤٧١/۱)

﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا ﴾ یعنی کسی فرد کے لیے صحیح نہیں ہے افرادِ بشر سے، یہ کہ اس سے اللہ تعالیٰ ان طریقوں میں سے کسی ایک طریقے کے علاوہ بات کرے، مگر اس طرح سے کہ اس کی طرف وحی کرے یا اس کو خواب میں الہام کرے اور وہ بات اس کے دل میں ڈال دے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "نَفَثَ يَنْفُثُ فِيْ قَلْبِهِ" یعنی ایک پھونک ہے کہ اس کے دل میں پھونک دے، چنانچہ وہ اس کی طرف سے الہام ہو،[1] جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف وحی کی اور ابراہیم علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ اپنے بیٹے کو ذبح کریں۔ وحی کہتے ہیں: اشارہ، رسالت اور کتابت کو اور ہر وہ شے جس کو تو دوسرے کی طرف القا کرے، تاکہ وہ اس کو جان جائے تو وہ یہی وحی ہے کسی طرح سے ہو۔ (قاله ابن فارس) وحی مصدر ہے: "وَحَى إِلَيْهِ يَحِيْ" کا باب "وَعٰى" سے اور الف کے ساتھ "أَوْحٰى إِلَيْهِ" بھی اس کے مثل ہے۔ پھر زیادہ تر وحی کا استعمال اس شے کے لیے کیا گیا جس کا اللہ تعالیٰ کے پاس سے انبیاء علیہم السلام کی طرف القا کیا جاتا ہے۔ قرآن شریف کا لغتِ فاش "أَوْحٰى" بہ الف ہے۔

﴿ اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ ﴾ یعنی یا پردے کے پیچھے سے جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا۔ مراد یہ ہے کہ اس کا کلام ایسی جگہ سے سنائی دیتا ہے کہ کہنے والا دکھائی نہیں دیتا۔ یہ محتجب بادشاہ کے حال کے ساتھ تمثیل ہے جو اپنے خاص لوگوں سے پردے کے پیچھے سے باتیں کرتا ہے۔ کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ سامع کو دنیا میں رویت سے محجوب رکھا گیا ہے۔ ﴿ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ﴾ یعنی یا کسی فرشتے کو بھیجے تو وہ رسول بشر کی طرف اللہ کے حکم اور تیسیر سے اس چیز کی وحی کرے جو اللہ اس کی طرف وحی کرنا چاہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت کی تفسیر میں مروی ہے: مگر یہ کہ بھیجے کسی فرشتے کو جو اس کے پاس سے اس کی طرف وحی کرے یا اس کو الہام کرے اور اس کے دل میں ڈال دے یا پردے کے پیچھے سے اس سے کلام کرے۔[2] امام زجاج رحمہ اللہ کہتے ہیں: معنی یہ ہیں کہ بشر کے لیے اللہ تعالیٰ کا کلام یا تو الہام کے ساتھ ہوتا ہے کہ اس کو الہام کر دیتا ہے یا اس سے پردے کے پیچھے سے کلام کرتا ہے جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا، یا اس کی طرف فرشتے کی رسالت سے کلام کرتا ہے۔ تقدیرِ کلام یہ ہے: "مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا أَنْ يُّوْحِيَ وَحْيًا أَوْ يُكَلِّمَهُ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا" اور جس نے ﴿ يُرْسِلَ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے تو اس کی مراد "وَهُوَ يُرْسِلُ" ہے چنانچہ یہ ابتداء و استیناف ہے۔ انتھٰی.

جمہور نے بہ نصب ﴿ يُرْسِلَ ﴾ اور بہ نصب ﴿ فَيُوْحِيَ ﴾ پڑھا ہے بر تقدیر "أَنْ" اور ﴿ اَنْ ﴾ اور اس کا مدخول ﴿ وَحْيًا ﴾ پر معطوف ہوگا اور ﴿ وَحْيًا ﴾ محلِ حال میں ہوگا۔ تقدیر یہ ہے: "إِلَّا مُوْحِيًا" اور "مُرْسِلًا"

[1] تفسير القرطبي (٥٣/١٦) [2] فتح القدير (٧١٤/٤)

اور ﴿ اَوْ يُرْسِلَ ﴾ کا ﴿ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ ﴾ پر عطف صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ تقدیر یہ ہوگی: "وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّرْسِلَ اللّٰهُ رَسُوْلًا" حالاں کہ یہ فاسد ہے لفظاً و معنیً۔ جمہور کی قراءت کی توجیہہ میں اور بھی کچھ کہا ہے جو ضعف سے خالی نہیں ہے۔ امام نافع رحمہ اللہ نے ﴿ اَوْ يُرْسِلُ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے اور اسی طرح ﴿ فَيُوْحِيْ ﴾ کو بہ سکون پڑھا ہے، یا اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے، بایں تقدیر "أَوْ هُوَ يُرْسِلُ"، جیسا کہ امام زجاج رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے۔[1] ﴿ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴾ تعلیل ہے ماقبل کی، یعنی اللہ پاک بشر سے تین طرح پر کلام کرتا ہے جن کا ذکر ہوا، اس لیے کہ وہ صفاتِ نقص سے برتر و بلند و بالا ہے اور اپنے تمام احکام میں حکیم ہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت کا سببِ نزول یہ ہے کہ یہود نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: تم اللہ سے کلام کیوں نہیں کرتے اور اس کی طرف نظر کیوں نہیں کرتے اگر تم نبی ہو، جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کلام کیا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[2]

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝52 صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ۝53

اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے ایک روح (قرآن) کی وحی کی۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا اور ایمان کیا ہے؟ لیکن ہم نے اسے نور بنا دیا، ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں اس کے ذریعے سے ہدایت دیتے ہیں اور بلاشبہہ آپ سیدھے راستے ہی کی طرف راہنمائی کرتے ہیں (52) اس اللہ کے راستے کی طرف جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہے۔ آگاہ رہو! اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹتے ہیں (53)

نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف قرآن کی وحی:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تیری طرف قرآن کی وحی کی۔ تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ہی ایمان کو جانتا تھا، یعنی وہ تفصیل تجھے معلوم نہ تھی جو تیرے لیے قرآن میں مشروع کی گئی۔ لیکن ہم نے قرآن کو ایک روشنی کیا جس کے ساتھ ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں راہ دیتے ہیں، جیسا کہ

[1] فتح القدير (٧١٣/٤) [2] فتح البيان (٣١٩/١٢_٣٢١)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ۚ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۚ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ﴾ [حٰمٓ سجدة: ٤٤] ''آپ کہہ دیجیے! کہ یہ تو ایمان والوں کے لیے ہدایت وشفا ہے اور جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں تو (بہرا پن) اور بوجھ ہے اور یہ ان پر اندھا پن ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو کسی بہت دور دراز جگہ سے پکارے جا رہے ہیں۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ یعنی اور بے شک اے محمد! البتہ تو سیدھی راہ، یعنی حق قویم کا راستہ بتاتا ہے۔ قویم ومستقیم کے ایک معنی ہیں، یعنی سیدھی راہ جو منزلِ مقصود کو پہنچا دے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ یعنی اور بے شک اے محمد! البتہ تو سیدھی راہ، یعنی حق قویم کا راستہ بتاتا ہے۔ قویم ومستقیم کے ایک معنی ہیں، یعنی سیدھی راہ جو منزلِ مقصود کو پہنچا دے۔

پھر اللہ پاک نے صراط کی یہ تفسیر فرمائی: ﴿صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ﴾ یعنی وہ سیدھی راہ اللہ کی شریعت ہے، جس کا اس نے امر فرمایا ہے، کون سا اللہ؛ جو آسمانوں اور زمین کا رب اور مالک ہے اور ان میں تصرف کرنے والا ہے اور ایسا زبردست حاکم ہے کہ کوئی اس کے حکم کو پیچھے ڈالنے والا نہیں ہے۔ ﴿اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ﴾ یعنی خبردار کام اللہ ہی کی طرف رجوع ہوتے ہیں، پھر وہ ان کا فیصلہ کرے گا اور ان کے بارے میں حکم دے گا۔ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ وَالْجَاحِدُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا.[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ یعنی جس طرح ہم نے ان نبیوں کو وحی کی جو تجھ سے پہلے تھے اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تیری طرف روح کی وحی کی۔ روح سے مراد قرآن شریف ہے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔[2] امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی "اَلْوَحْيُ بِأَمْرِنَا"[3] اس کے معنی بھی قرآن ہیں۔ قرآن کو جو روح فرمایا تو اس لیے کہ لوگ اس سے ہدایت کی راہ پاتے ہیں۔ چنانچہ اس میں کفر کی موت سے حیات ہے۔ یا یوں کہو کہ جب قرآن دل میں حلول کرتا ہے تو دل ایمان کی حیات سے زندہ ہو جاتا ہے، جس طرح کہ حقیقی روح جس وقت جسم میں حلول کرتی ہے تو وہ حیاتِ روح سے زندہ ہو جاتا ہے۔ یا یوں کہو کہ قرآن کے سبب سے دل کو وہ شے حاصل ہو جاتی ہے جو حیات کے مثل ہے، یعنی علم نافع۔

امام مالک بن دینار رحمہ اللہ کا قول ہے کہ روح سے مراد قرآن ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد نبوت ہے۔ خطیب رحمہ اللہ نے اس قول کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ خطیب رحمہ اللہ نے اس کو حسن رحمہ اللہ کی طرف سے منسوب کیا ہے۔ کسی نے کہا کہ مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ خطیب رحمہ اللہ نے اس قول کو ربیع کی طرف منسوب کیا ہے (اس معنی میں کہ "أرسلناه إليك بالوحي"، یعنی ہم نے

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/١٥٣) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٨٠) [3] فتح القدير (٤/٧١٣)

جبرائیل علیہ السلام کو وحی دے کر تیری طرف بھیجا)۔ ایک یہ قول امام سدی رحمہ اللہ کا نقل کیا ہے کہ وحی مراد ہے،[1] وحی کو روح اس لیے ٹھہرایا کہ وحی روح کی مدبر ہے، جس طرح کہ حقیقی روح بدن کی مدبر ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ مِّنْ اَمْرِنَا ﴾ حال ہے ﴿ رُوْحًا ﴾ سے اور کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ہم نے تیری طرف روح کی، یعنی قرآن کی وحی کی، درآنحالیکہ وہ ہمارے امر سے ہوئی ہے۔ تبعیض کی وجہ یہ ہے کہ جس شے کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی گئی ہے، وہ قرآن شریف میں منحصر نہیں ہے، بلکہ قرآن کے سوا اور امور کی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی گئی۔ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حال جو وحی کے آنے سے پہلے تھا اس کا ذکر کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ ﴾ یعنی وحی آنے سے پہلے تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا شے ہے اور نہ ہی تو ایمان کو جانتا تھا، اس لیے کہ آپ تو اُمّی تھے نہ پڑھتے تھے نہ لکھتے تھے۔

اس بات کو اعجاز (معجزے) میں زیادہ دخل ہے اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے صحیح ہونے کی دلیل ہے، کیوں کہ جس شخص کا یہ حال ہو، پھر وہ اچانک دنیا والوں میں سب سے زیادہ عالم ہو جائے تو یہ محض اللہ پاک کی طرف سے نہیں ہے تو پھر کیا ہے! جملہ استفہامیہ معلق ہے فعلِ درایت کا عمل سے، چنانچہ محلِ نصب میں ہے، اس لیے کہ ﴿ تَدْرِيْ ﴾ کے ہر دو فعل کے قائم مقام ہے اور جملہ منفیہ پورا محلِ نصب میں ہے بنا بر حال ﴿ اِلَيْكَ ﴾ کے کاف سے، یعنی ہم نے اپنے امر سے تیری طرف روح کی وحی کی، اس حال میں کہ تو نہ جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے۔

﴿ مَا الْكِتٰبُ ﴾ کا ﴿ مَا ﴾ استفہامیہ ہے اور مبتداء ہے اور ﴿ الْكِتٰبُ ﴾ خبر ہے اور عبارت میں مضاف مقدر ہے۔ "أَيْ: مَا كُنْتَ تَدْرِيْ" جواب ﴿ مَا الْكِتٰبُ ﴾، یعنی وحی آنے سے قبل تو اس سوال کا جواب نہیں جانتا تھا، کیوں کہ آپ پڑھے لکھے نہ تھے۔ اب اگر کوئی کہے کہ ﴿ وَلَا الْاِيْمَانُ ﴾ کس طرح فرمایا، حالاں کہ سارے انبیاء علیہم السلام وحی آنے سے پہلے اپنی عقلوں کے دلائل سے مومن تھے اور ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابراہیم علیہ السلام کے دین پر عبادت کرتے تھے اور حج اور عمرہ ادا فرماتے تھے اور خلیل جلیل علیہ السلام کی ملت کے متبع تھے؟ تو کہیں گے کہ یہ سب ٹھیک ہے، لیکن یہاں ایمان کے نہ جاننے سے یہ مراد ہے کہ آپ شریعتوں کی تفاصیل کو نہیں جانتے تھے اور ان کے معالم، یعنی علامت ونشان اور احکام کی طرف راہ یاب نہیں ہوتے تھے، مثلاً: نماز، روزہ، زکات، ختنہ اور طلاق کا واقع کرنا، جنابت سے نہانا، نسب اور سسرال کی عورتوں میں سے جو محرم ہیں ان کی تحریم وغیرہ۔

حق بات یہی ہے کہ ایمان کا خاص طور پر اس لیے ذکر کیا ہے کہ وہ سارے شرائع و احکام کا راس و اساس ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہاں ایمان سے مراد نماز ہے۔ اہلِ علم کی ایک جماعت اسی کی قائل ہے، ان میں امام الائمہ محمد بن اسحاق بن خزیمہ رحمہ اللہ بھی ہیں۔ (فتح البیان و فتح القدیر میں اسی طرح ہے اور خازن میں یوں ہے: "وقال

---

[1] تفسیر البغوي (۲۰۱/۷)

محمد بن إسحاق عن ابن خزيمة: الإيمان في هذا الموضع الصلاة و دليله وما كان الله ليضيع إيمانكم... الخ" والله أعلم)۔ اور اس آیت سے حجت پکڑی ہے: ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ﴾[1] [البقرۃ: ۱۴۳] ''اللہ تعالیٰ تمھارے ایمان ضائع نہ کرے گا۔''

دیکھو یہاں نماز کا نام ایمان رکھا ہے۔ اور ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا، مگر اس حال میں کہ وہ اس پر ایمان لانے والا تھا اور کہا کہ اس آیت کے معنی یہ تھے کہ وحی سے پہلے تو یہ نہ جانتا تھا کہ قرآن کو کس طرح پڑھے اور نہ یہ جانتا تھا کہ مخلوق کو ایمان کی طرف دعوت کس طرح دے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ حال بلوغت سے پہلے تھا، جبکہ آپ بچے تھے اور گہوارے میں تھے۔ حسین بن فضل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہاں مضاف محذوف ہے: "أَيْ: وَلَا أَهْلَ الإِيْمَانِ"[2] یعنی تو اہلِ ایمان کو نہ جانتا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ ایمان سے دینِ اسلام مراد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہاں ایمان عبارت ہے ہر اس شے کے اقرار کے ساتھ جس کا اللہ تعالیٰ نے بندوں کو مکلّف کیا ہے۔ کواشی کہتے ہیں: جائز ہے کہ ایمان سے نفسِ کتاب مراد لی جائے۔

دونوں لفظوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے ایک کا دوسرے پر عطف کر دیا ہے، معنی یہ ہیں کہ تو نہ تو قرآن کو پہچانتا تھا اور نہ ان حکموں کو جو اس میں ہیں۔ اس تاویل کی دلیل یہ ہے کہ ﴿ جَعَلْنٰهُ ﴾ میں واحد کی ضمیر ذکر کی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ایمان سے وہ کلمہ مراد ہے جس کے ساتھ ایمان اور توحید کی دعوت ہوتی ہے، یعنی "لا إله إلا الله محمد رسول الله" اور آپ نے جو ایمان کو اس تفسیر کے ساتھ جانا تو وحی سے جانا عقل سے نہیں جانا۔ (قاله الكرخي)

امام ابو نعیم رحمہ اللہ نے دلائل میں اور ابن عساکر رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے کہا گیا کہ آیا آپ نے کبھی کسی بت کو پوجا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ لوگوں نے کہا: پھر کیا آپ نے کبھی شراب پی؟ فرمایا: نہیں، اور میں ہمیشہ اس بات کو جانتا رہا کہ وہ جس شے پر ہیں، وہ کفر ہے اور میں نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ہی ایمان کو جانتا تھا اور اسی بات کو قرآن لے کر نازل ہوا: ﴿ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ ﴾[3]

قاضی رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے: یعنی وحی سے قبل اور یہ اس پر دلیل ہے کہ نبوت سے پہلے آپ کسی شریعت کے ساتھ متعبد نہ تھے، اس لیے کہ تعبد شریعت کے ساتھ اس پر ایمان لانے کی فرع (شاخ) ہے۔ ایک قول بہ لفظِ "قیل" یہ ذکر کیا ہے کہ مراد اس شے پر ایمان ہے جس کی طرف راہ نہیں ہے، مگر سمع[4] انتھٰی.

مطلب یہ ہے کہ جو ایمان سمع پر موقوف ہے، اس کو آپ وحی سے پہلے نہیں جانتے تھے اور جو ایمان عقل سے معلوم ہوتا ہے، اس کو آپ جانتے تھے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ﴿ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ ﴾ یعنی تو نہیں جانتا تھا

[1] فتح القدير (٧١٤،٧١٣/٤) فتح البيان (٣٢٢/١٢) تفسير الخازن (١٢٩/٦)
[2] تفسير القرطبي (٥٩/١٦)
[3] الدر المنثور (٣٦٤/٧)
[4] تفسير البيضاوي (١٣٧/٥)

کہ قرآن کیا ہے اور نہ ہی ایمان کے شرائع کو جانتا تھا۔ یا یہ معنی ہیں کہ تو ایمان بالکتاب کو نہیں جانتا تھا، اس لیے کہ جب آپ کو اس کا علم نہ تھا کہ کتاب آپ پر نازل ہو گی تو آپ اس کتاب کے بھی عالم نہ تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ ایمان کئی چیزوں پر مشتمل ہے، ان میں سے بعض تو وہ ہیں جن کی طرف عقل کو راہ ہے، یعنی عقل سے معلوم ہوتی ہیں اور بعض سمع (سننے) سے معلوم ہوتی ہیں۔

چنانچہ یہاں جو ایمان کی نفی کی ہے، اس سے مراد وہی ہیں جو صرف سمع سے معلوم ہوتی ہیں، عقل سے ان کا علم نہیں ہوتا اور یہ وہی ہیں کہ آپ ﷺ کو ان کا علم نہ تھا، یہاں تک کہ ان کو وحی سے حاصل کیا۔[1] یہ ان کے بیان کا حاصل ہے۔ غرضیکہ ﴿ وَلَا الْإِيْمَانُ ﴾ کی وجوہ، جو یہاں تک بیان کی گئیں، ان کی بنا اس پر ہے کہ مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام بعثت سے پہلے اور بعد میں کبائر اور صغائر سے معصوم ہیں جو لوگوں کی اُن سے نفرت کا سبب ہیں۔ اہلِ کلام کا اس بات پر اجماع ہے کہ رسول وحی سے قبل مومن ہیں، چنانچہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

بالجملہ جب قرآن شریف روح ٹھہرا تو چاہیے تھا کہ ساری خلق کے دل اس سے زندہ ہو جاتے اور سب ایمان لے آتے اور راہ پر لگ جاتے، حالاں کہ واقع میں ایسا نہیں ہے، اس لیے یوں ارشاد فرمایا: ﴿ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ﴾ یعنی لیکن ہم نے اس روح کو جس کی تیری طرف وحی کی ایک روشنی کر دیا اور دلیل کیا۔ ہم اس سے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں توحید و ایمان کی ہدایت دیتے ہیں۔ یہاں ہدایت سے مراد وہ ہدایت ہے جو مقصود کو پہنچا دیتی ہے۔ اس کی دلیل ﴿ مَنْ نَّشَآءُ ﴾ ہے۔ یعنی جس بندے کی ہدایت ہم چاہتے ہیں تو اس کو دینِ حق کی طرف راہ بتا دیتے ہیں، چنانچہ وہ راہ پا لیتا ہے۔

﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ یہ ہدایت پہلی ہدایت سے عام ہے، یعنی اور بے شک تو ہر مکلّف کو سیدھی راہ بتاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیرا کام صرف دینِ حق کی راہ بتا دینا ہے اور بس، منزلِ مقصود تک پہنچا دینا ہمارا کام ہے۔ امام قتادہ، سدی و مقاتل رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اور بے شک تو البتہ اسلام کی طرف دعوت دیتا ہے، چنانچہ صراطِ مستقیم یہی ہے۔ جمہور نے ﴿ لَتَهْدِيْۤ ﴾ بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے اور شہر بن حوشب رحمہ اللہ نے بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور امام ابن سمیفع رحمہ اللہ نے بہ ضم تاء "أَهْدَی" سے اور سیدنا اُبی رضی اللہ عنہ کی قراءت میں "إِنَّكَ لَتَدْعُوْ" ہے۔[2]

پھر اللہ پاک نے صراطِ مستقیم کا بیان کیا: ﴿ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ یہ صراط بدل ہے صراطِ اول سے، بدل معرفہ کا نکرہ سے۔ صراط کی اضافت جو اسم شریف کی طرف کی تو اس لیے کہ صراط کی تعظیم و اہمیت ظاہر ہو، چنانچہ وہ مخفی نہیں ہے، یعنی وہ صراطِ مستقیم جس کی طرف تو راہ بتاتا ہے، وہ اللہ کی راہ ہے۔

---

[1] تفسير النسفي (١٠٨/٤) [2] فتح القدير (٧١٤/٤)

کون اللہ! وہ جس کی ملکیت ہے اور مخلوق اور غلام ہے ہر وہ شے جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے اور وہ اس میں تصرف کرنے والا ہے۔ ﴿ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ﴾ یعنی سنتے ہو! جس کا ان سب میں تصرف ہے اور جس کی یہ سب ملکیت ہیں اور غلام ہیں، اسی کی طرف قیامت کے دن خلائق کے سارے کام رجوع ہوں گے، اس طرح سے کہ سارے رشتے اور تعلقات دور ہو جائیں گے، کسی کا کوئی تعلق باقی نہ رہے گا۔ ﴿ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ [المؤمن: ١٦] ''آج کس کی بادشاہی ہے؟ فقط اللہ واحد وقہار کی۔'' کا ڈنکا بجے گا۔ اللہ ہی اللہ ہو گا۔

اس میں بعث کی وعید ہے جس سے جزا اور سزا کا لازم ہونا ظاہر ہوتا ہے اور نعمتوں والی جنات کا وعدہ ہے، چنانچہ نیک کو تو ثواب دے گا اور بد کو سزا دے گا۔ اس معنی کی بنا پر مضارع اپنے ظاہر پر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس مضارع سے مراد دیمومت ہے، یعنی دوام اور استمرار جس طرح کہ یہ قول ہے: ''زَيْدٌ يُعْطِي وَيَمْنَعُ'' یعنی اس کی شان سے عطا کرنا اور روکنا ہے، کسی زمانے کی قید نہیں۔ اسی طرح یہاں حقیقت مستقبل کی مراد نہیں ہے، کیوں کہ ہر وقت سارے امور اللہ تعالیٰ سے متعلق ہیں، اسی کے حکم و مشیت سے سب کچھ ہوتا ہے۔ سہیل بن ابی الجعد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک مصحف جل گیا اور اس سے سوائے اس آیت کے کچھ باقی نہ رہا۔[1] واللّٰه أعلم. (ذكره القرطبي)

الحمد للّٰه و المنة کہ اس سورت مبارکہ کی تفسیر شب بستم ونہم (۲۹) ماہ مبارک رمضان شریف ۱۳۱۴ھ شب یک شنبہ (اتوار) وقت نہ ساعت محلہ امیر گنج میں تمام ہوئی۔ اللہ سبحانہٗ قبول فرمائے اور آیندہ لکھنے کی توفیق دے۔ اللهم اشرح لي صدري، ويسرلي أمري، واحلل عقدة من لساني، يفقهوا قولي. اللهم إنك عفو تحب العفو فاعف عنا، و اغفرلنا و ارحمنا وتب علينا، و أحسن عواقبتنا في الأمور كلها، وأجرنا من خزي الدنيا و عذاب الآخرة. ربنا آتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار. اللهم اغفرلي ولوالدي ولمن توالدا و ارحمنا ولأزواجي وذرياتي ولأساتذتي ولمشائخي ولأحبابي، ولمن أحسن إلي ولمن أساء إلي ولجميع المؤمنين والمؤمنات والمسلمين والمسلمات الأحياء منهم والأموات، يا أرحم الراحمين و إله الأكرمين وصلى اللّٰه على النبي الأمين محمد وعلى صحبه أجمعين، آمين، آمين، آمين. والحمد للّٰه أولا وآخرًا وظاهرًا و باطناً.

---

[1] تفسير القرطبي (٦٠/١٦) فتح البيان (٣٢٢/١٢_٣٢٤)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الزُّخْرُفِ

اس سورت مبارکہ کی نواسی (۸۹) آیتیں ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ سورت بالاجماع مکی ہے۔[1]
امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سورت حم الزخرف مکے میں نازل ہوئی ہے۔[2] امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سوائے اس آیت کے: ﴿ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ ﴾[3]
[الزخرف: ٤٥] یعنی یہ آیت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
حٰمٓ ۝۱ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝۲ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ
تَعْقِلُوْنَ ۝۳ وَاِنَّهٗ فِيْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝۴ اَفَنَضْرِبُ
عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ۝۵ وَكَمْ
اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ۝۶ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا
كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۷ فَاَهْلَكْنَاۤ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّمَضٰى مَثَلُ
الْاَوَّلِيْنَ ۝۸

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔
حٰم ① قسم ہے (اس) واضح کتاب کی ② بے شک ہم نے اسے عربی (زبان کا) قرآن بنایا ہے، تا کہ تم سمجھو ③ اور بلاشبہ وہ ہمارے پاس اصل کتاب (لوحِ محفوظ) میں، بہت بلند مرتبہ، نہایت حکمت والا ہے ④ کیا پھر ہم تم سے اس بنا پر منہ موڑ کر ذکر ونصیحت روک لیں گے کہ تم حد سے گزرنے والے لوگ ہو ⑤ اور ہم نے پہلے لوگوں میں کتنے ہی نبی بھیجے ⑥ اور ان کے پاس جو بھی نبی آتا، وہ اس سے مذاق ہی کرتے تھے ⑦ پھر ہم نے ان سے کہیں زیادہ زور آور لوگ ہلاک کر دیے، اور اگلے لوگوں کی مثال گزر چکی ہے ⑧

---

[1] تفسير القرطبي (٦١/١٦) [2] الدر المنثور (٣٦٥/٧) [3] تفسير القرطبي (٦١/١٦)

قرآنِ مجید پند و نصیحت سے بھرپور ایک عمدہ کتاب:

کیا ہم اس نصیحت کو تم سے اس بنا پر ہٹالیں کہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو، یعنی اس وجہ سے کہ تم نہیں مانتے ہم حکم کو بھیجنا موقوف کر دیں گے۔ انتہٰی۔

اللہ پاک فرماتا ہے ﴿ حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴾ یعنی قسم ہے کتاب کی جو واضح اور ظاہر ہے، اس کے الفاظ و معانی جلی ہیں، اس لیے کہ عرب کی لغت میں اتاری گئی ہے، جو لوگوں کے درمیان بات چیت کرنے کے لیے فصیح ترین زبان ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا ﴾ یعنی ہم نے اس کو قرآن عرب کی زبان میں اتارا جو فصیح زبان ہے۔ ﴿ لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ یعنی شاید تم اس کو سمجھو بوجھو، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴾ [الشعراء: ١٩٥] ''صاف عربی زبان میں ہے۔''

پھر اللہ پاک نے ملائے اعلیٰ میں اس کا شرف بیان کیا، تاکہ زمین والے اس کی تعظیم و تکریم کریں اور اس کے مطیع ہوں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَاِنَّهٗ ﴾ یعنی بے شک یہ قرآن ﴿ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ ﴾ یعنی لوحِ محفوظ میں ہے، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ ﴿ لَدَيْنَا ﴾ ''أَيْ: عِنْدَنَا'' یہ قول قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔ ﴿ لَعَلِيٌّ ﴾ ''أَيْ: ذُوْ مَكَانَةٍ عَظِيْمَةٍ وَشَرَفٍ وَفَضْلٍ'' یہ قول بھی امام قتادہ رحمہ اللہ کا ہے،[1] یعنی ہمارے پاس بڑے رتبے اور فضیلت والا ہے۔ ﴿ حَكِيْمٌ ﴾ یعنی محکم، پختہ مضبوط، درست اور استوار ہے، شبہہ اور ملاوٹ سے پاک ہے۔ یہ سب اوصاف بیان کر کے قرآن شریف کے شرف و فضیلت سے آگاہ فرمایا ہے، جیسا کہ اور جگہ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الواقعة: ٧٧-٨٠] ''بے شک یہ قرآن بہت بڑی عزت والا ہے جو ایک محفوظ کتاب میں درج ہے جسے صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں یہ رب العالمین کی طرف سے اترا ہوا ہے۔'' نیز فرمایا ہے: ﴿ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍۢ بَرَرَةٍ ﴾ [عبس: ١١- ١٦] ''یہ ٹھیک نہیں۔ قرآن تو نصیحت (کی چیز) ہے جو چاہے اس سے نصیحت لے۔ (یہ تو) پرعظمت صحیفوں میں (ہے)۔ جو بلند و بالا اور پاک صاف ہیں۔ ایسے لکھنے والوں کے ہاتھ میں ہے جو بزرگ اور پاکباز ہیں۔''

اسی لیے علمائے کرام نے ان دو آیتوں سے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے کہ مُحدث، یعنی بے وضو شخص قرآن شریف کو نہ چھوئے۔ چنانچہ اس بارے میں ایک حدیث شریف وارد ہوئی ہے، اگر وہ صحیح ہو، اس لیے کہ ملائے اعلیٰ میں فرشتے ان مصاحف کی تعظیم کرتے ہیں جو قرآن پر مشتمل ہیں تو زمین والے تو اس کے زیادہ مستحق ہیں، کیوں کہ وہ ان پر

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١٥٤/٤)

نازل ہوا ہے اور اس سے خطاب بھی انہیں کو ہے، پس ان کا زیادہ حق اور ذمے داری ہے کہ وہ اس سے تعظیم اور اکرام کے ساتھ پیش آئیں اور اس کو قبول کر کے اس کے مطیع اور فرماں بردار ہوں، اس لیے کہ اللہ سبحانہ اس کی شان میں یوں فرماتا ہے: ﴿ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴾.

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ﴾ اس کے معنی میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ کسی نے کہا: اس کے معنی یہ ہیں: کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم تم سے درگزر کریں اور تم کو عذاب نہ کریں اس بات پر کہ تم اس شے کو نہ کرو کہ جس کا تم کو حکم کیا گیا۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، ابوصالح اور سدی رحمہم اللہ کا ہے اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے اس کے معنی میں یہ کہا ہے: واللہ! اگر یہ قرآن اٹھا لیا جاتا، جب اس اُمت کے پہلے لوگوں نے اس کو رد کیا تو وہ ہلاک ہو جاتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے احسان اور رحمت کی ان پر بارش کی اور اس قرآن کی ان پر تکرار کی اور بیس برس یا جس قدر اللہ تعالیٰ نے چاہا، ان کو اس کی طرف بلایا۔[1] یہ قول امام قتادہ رحمہ اللہ کا ہے جو معنی کے لحاظ سے نہایت درجہ لطیف ہے۔ ان کے قول کا حاصل یہ ہے کہ اللہ پاک اپنے لطف و رحمت سے اپنی خلق کو خیر کی طرف اور ذکرِ حکیم، یعنی قرآن شریف کی طرف بلانا نہیں چھوڑتا، اگرچہ وہ مسرفین ہیں اور اس سے منہ موڑنے والے ہیں، بلکہ وہ اس کے ساتھ امر کیے جاتا ہے، تاکہ جس کے لیے ہدایت مقدر کی گئی ہے، وہ راہ پائے اور جس کی قسمت میں شقاوت (بدبختی) لکھی جا چکی ہے، اس پر حجت قائم ہو جائے۔

قریش کی تکذیب پر نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی:

پھر اللہ پاک اپنے نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو، ان لوگوں کے جھٹلانے پر جنھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی، تسلی دیتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امر فرماتا ہے کہ ان کی ایذا پر صبر کریں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ یعنی ہم نے اگلی امتوں میں بہت نبی بھیجے اور جب بھی ان کے پاس کوئی نبی آتا تھا تو اس کو جھٹلاتے اور اس سے مسخرا پن کرتے تھے۔ ﴿ فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا ﴾ یعنی پھر ہم نے رسولوں کے جھٹلانے والوں کو ہلاک کر ڈالا، حالانکہ اے محمد! وہ ان لوگوں سے زیادہ سخت اور زور والے تھے، جنھوں نے آپ کی تکذیب کی، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً ﴾ [المؤمن: ٨٢] ''کیا انھوں نے زمین میں چل پھر کر اپنے سے پہلوں کا انجام نہیں دیکھا؟ جو ان سے تعداد میں زیادہ تھے اور قوت میں سخت تھے۔'' اس بارے میں بہت آیات ہیں۔

[1] تفسیر الطبري (٢١/٥٦٧، ٥٦٨)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَّمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "سُنَّةُ الْأَوَّلِيْنَ"۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "عُقُوْبَتُهُمْ"۔[1] ان کے علاوہ لوگوں نے کہا: "عِبْرَتُهُمْ" یعنی اگلوں کا طریقہ یا ان کی عقوبت یا ان کی عبرت اسی طرح چلی آئی ہے، یعنی ہم نے ان کو ان لوگوں کے لیے عبرت ٹھہرایا جو ان کے بعد تکذیب کرنے والے ہیں کہ ان کو وہ عذاب پہنچے جو اُن کو پہنچا، جس طرح کہ اللہ پاک نے اسی سورت کے آخر میں فرمایا ہے۔ ﴿ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ﴾ "پس ہم نے ان کو گیا گزار کر دیا اور پچھلوں کے لیے مثال بنا دی۔" اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ﴾ [المؤمن: ٨٥] "اللہ نے اپنا معمول یہی مقرر کر رکھا ہے جو اس کے بندوں میں برابر چلا آ رہا ہے۔" نیز فرمایا: ﴿ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴾ [الأحزاب: ٦٢] "اور تو اللہ کے دستور میں ہرگز رد و بدل نہ پائے گا۔"[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

﴿ حٰمٓ ﴾ کے اعراب میں کلام ویسا ہے جیسا کہ ﴿ يٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴾ میں گزر چکا ہے۔ اگر ﴿ حٰمٓ ﴾ قسم ٹھہرائی جائے گی تو ﴿ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴾ میں حرفِ واو عاطفہ ہوگا اور اگر قسم قرار نہ دی جائے گی تو حرفِ واو قسم کا ہوگا۔ اور جوابِ قسم ﴿ اِنَّا جَعَلْنٰهُ ﴾ قرار پائے گا۔ امام ابن انباری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس نے ﴿ حٰمٓ ﴾ کو ﴿ وَالْكِتٰبِ ﴾ کا جواب ٹھہرایا ہے جس طرح کہ تم کہتے ہو: "نَزَلَ وَاللّٰهِ"، "وَجَبَ وَاللّٰهِ"، تو اس نے ﴿ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴾ پر وقف کیا ہے۔[3] ﴿ اَلْمُبِيْنِ ﴾ یا تو "أَبَانَ" متعدی سے ہے اور معنی یہ ہیں کہ اس کی قسم، یعنی قرآن شریف کی قسم جس نے ہدایت کی راہیں گمراہی کی راہوں سے ظاہر کر دیں اور اس شریعت کو بیان کر دیا جس کی کہ امت محتاج ہے۔ یا "أبان" لازم سے ہے، یعنی اس کتاب کی قسم جو سوچنے والوں کے لیے واضح اور ظاہر ہے! یہ قسم حسین اور انوکھی قسموں سے ہے، اس لیے کہ قسم و مقسم علیہ باہم متناسب ہیں، یعنی قرآن کی قسم کھائی اس پر کہ اس کو قرآنِ عربی کیا۔ اللہ تعالیٰ جو اشیاء کے ساتھ قسم کھاتا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ ان میں جو مقسم علیہ پر دلیل ہے، اس سے استشہاد فرماتا ہے۔

عرب کے ہاں قسم و مقسم علیہ کا ایک وادی سے ہونا کلام کی بلاغت سے ہے۔ اس جگہ اگر کتابِ مبین سے قرآن شریف مراد لو گے تو یہ مقام اسی قبیل سے ٹھہرے گا اور اگر کتاب سے مراد نازل شدہ کتابوں کی قسم مراد لو گے تو اس باب سے نہ ہوگا۔ اول کی بنا پر ضمیر ﴿ جَعَلْنٰهُ ﴾ میں کتاب کی طرف راجع ہوگی، کیوں کہ اس سے قرآن شریف مراد لیا ہے اور ثانی کی بنا پر ضمیر قرآن شریف کی طرف پھرے گی، کتاب کی طرف نہیں، کیوں کہ کتاب سے مراد نازل شدہ

[1] تفسير الطبري (٥٧١/٢١) [2] تفسير ابن كثير (١٥٤/٤، ١٥٥) [3] تفسير القرطبي (٦١/١٦)

کتابیں لی ہیں اور وہ عربی نہ تھیں، گو پہلے قرآن کے ذکر کی تصریح نہیں ہوئی، لیکن ﴿ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا ﴾ سے تو بالضرور معلوم ہوجاتا ہے، چنانچہ اب قرآن کی طرف ضمیر پھیرنا ٹھیک ہے۔

بالجملہ یہ بات کہ قسم اور مقسم علیہ کا ایک جنس سے ہونا نادر قسموں میں سے ہے تو اس کی یہ وجہ ہے کہ جب کسی مدعا کو قوت دینا منظور ہوتا ہے تو عرب کی عادت ہے کہ کسی عظیم الشان شے کی قسم کھا کر اس مطلب کو بیان کرتے ہیں اور جب پرلے سرے کا مبالغہ کرنا ہوتا ہے تو خود اسی شے کی قسم کھا کر اس کا وصف کرتے ہیں، اس غرض سے کہ دنیا میں اس شے سے زیادہ عظیم القدر کوئی اور شے نہیں ہے کہ اس کی قسم کھائی جائے۔ اگر ہے تو وہی ہے، اس لیے اسی کی قسم کھا کر اس کا وصف کرتے ہیں، جیسے: کسی کی تعریف میں کہتے ہیں کہ فلاں خود اپنی نظیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا کوئی مثل نہیں ہے۔ دیکھو ابو تمام نے محبوبہ کے دانتوں کے حسن سے مبالغہ کرنا چاہا تو خود دانتوں کو مقسم بہ ٹھہرایا ان کی قسم کھا کر، پھر اُن کی تعریف کی کہ اُن سے بڑھ کر کوئی حسین چیز نہیں کہ ان کی تعریف کے لیے اس کی قسم کھائی جائے، چنانچہ کہا: ؎

وَثَنَايَاكِ إِنَّهَا إِغْرِيضُ ۔۔۔ وَلَآلٍ تُؤْمٌ وَبَرْقٌ وَمِيضُ

(إغريض و غريض طلع، ويقال هو كل أبيض طرى ويقال: هو البرد يعني أولا تؤم جمع تؤمة وهي حبة تعمل من الفضة كالدرة وقيل[هي الؤلؤة يقال: ومض البرق يمض فهو وميض إذا لمع لمعانا خفيفا ولم يعترض في نواحي الغيم)۔ یعنی او محبوبہ! تیرے دانتوں کی قسم! بے شک وہ تو شگوفۂ خرما ہیں، یعنی سفید و تروتازہ ہیں اور چاندی کے موتی ہیں اور چمکتی بجلی ہیں۔

اب یہاں سمجھو کہ قرآن کے مدعا کو عربی زبان میں نازل کرنا ہے، اس کے اثبات اور سچ ثابت کرنے کے لیے خود قرآن کی قسم کھائی تو اس قسم سے قرآن شریف کا شرف اور عزت بہت موثر اور واضح طور پر معلوم ہوا، کیوں کہ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ پاک کے نزدیک اس سے بڑھ کر عظیم القدر اور بلند مرتبہ کوئی اور شے نہیں جس کی قسم کھائی جائے، جس طرح کہ اس کے اوصاف سے زیادہ اہم کوئی شے نہیں ہے کہ اس کے اثبات کا اہتمام کرنے کے لیے قسم کھائی جائے، اس لیے اس کا وصف کرنے کے لیے خود اسی کی قسم کھائی، تاکہ معلوم ہوجائے کہ اس سے اعلیٰ و برتر اور زیادہ بزرگ کوئی شے نہیں ہے۔ یعنی قسم ہے قرآن کی! ایسا قرآن جو ہدایت کی راہوں کو باطل کی راہوں سے ظاہر کرتا ہے اور اس شریعت کو بیان کرتا ہے جس کی اُمت کو ضرورت ہے اور اس بات پر کھلی دلیلیں واضح کرتا ہے کہ وہ نہ سحر ہے نہ شعر ہے اور نہ اللہ پر جھوٹ باندھا ہوا ہے اور نہ اگلوں کی کہانیاں ہیں۔

یہ تو قسم ہوئی اور جس مقصد کے لیے قسم کھائی وہ یہ ہے: ﴿ إِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا ﴾۔ ایک تاکید تو قسم کی

ہوئی اور دوسری ''إِنَّ'' کی، تیسری جملہ اسمیہ کی۔ ان تاکیدوں کے ساتھ نہایت شد و مد کے ساتھ فرمایا کہ بے شک ہم ہی نے اس کو قرآنِ عربی نازل کیا ہے، یعنی خود اللہ پاک عظیم الشان، جلی البرہان، خالقِ زمین و آسمان، بارئِ انس وجان اس کے نازل کرنے کا متولی ہوا ہے۔ عربی زبان میں کامل درجے کی فصاحت اور بلاغت میں اس کو اتارا ہے۔ قرآن شریف کے مذکورہ اوصاف اس بات کی پوری گواہی دیتے ہیں کہ وہ مالک الملک برحق کا اتارا ہوا ہے۔ حقیقت میں مقسم بہ مقسم علیہ سے نکلتا ہے۔ یعنی مقسم بہ میں مذکورہ اوصاف اس لیے ہیں کہ یہ ایسی عظیم الشان ذات کا اتارا ہوا ہے، جس ذات پاک کی یہ عظمت و عزت و قدرت ہے، اس کی اتاری ہوئی شے ایسی ہی نفع بخش وسود مند اور اعجاز والی ہوتی ہے۔ اسی نے اس کو یہ وصف بخشا ہے، اس کے سوا کوئی اس پر قادر نہیں ہے۔

﴿ جَعَلْنٰهُ ﴾ کے معنی ہیں: ''سَمَّيْنَاهُ'' یا ''وَصَفْنَاهُ'' یا ''صَيَّرْنَاهُ''، اسی لیے دو مفعول کی طرف متعدی ہوا ہے، یعنی ہم نے اس کا نام رکھا یا وصف کیا یا ہم نے اس کو قرآنِ عربی کر دیا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ''أَيْ: أَنْزَلْنَاهُ'' امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''قُلْنَاهُ''۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''بَيَّنَّاهُ'' یعنی ہم نے اس کو اتارا یا کہا: ہم نے اس کو بیان کیا قرآنِ عربی۔ اسی طرح امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے، یعنی زبانِ عرب میں نازل کیا گیا، اس لیے کہ ہر نبی کی کتاب اس کی قوم کی زبان میں نازل کی گئی۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: اس لیے کہ اہلِ جنت کی زبان عربی ہے۔[1] علامہ قاضی اور نسفی رحمہما اللہ نے ''صَيَّرْنَاهُ'' کو اختیار کیا ہے[2] اور امام محلی رحمہ اللہ نے ''أَوْجَدْنَا الْكِتَابَ'' کہا ہے۔[3] ان سب معانی کا منشا گویا اس شبہے کا جواب ہے۔ کسی نے کہا کہ ﴿ جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا ﴾ کس طرح فرمایا، حالاں کہ قرآن شریف مجعول نہیں ہے، کیوں کہ ﴿ جَعَلَ ﴾، ''خَلَقَ'' کے معنی میں آتا ہے، اسی معنی سے یہ آیت ہے: ﴿ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ﴾ [الأنعام: ۱] ''اور اس نے تاریکیوں اور نور کو بنایا۔''

جواب کی وضاحت یہ ہے کہ ﴿ جَعَلَ ﴾ کچھ ''خَلَقَ'' ہی کے ساتھ مختص نہیں ہے، بلکہ وہ تو قرآن شریف میں کئی طرح سے آیا ہے: ''أَحْدَثَ'' اور ''أَنْشَأَ'' کے معنی میں آیا ہے، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ ﴾ [حم السجدة: ۱۰] ''اور اس نے زمین میں پہاڑ رکھ دیے۔'' اور ''بَعَثَ'' کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ﴾ [الفرقان: ۳۵] ''اور ان کے ہمراہ ان کے بھائی ہارون کو ان کا وزیر بنا دیا۔'' اور ''قال'' کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ﴾ [الزخرف: ۱۵] ''اور انھوں نے اللہ کے بعض بندوں کو اس کا جزو ٹھہرا دیا۔'' چنانچہ آیندہ اس کا بیان آئے گا۔ اور

---

[1] تفسير القرطبي (٦١/١٦) فتح القدير (٧١٥/٤، ٧١٦) [2] تفسير البيضاوي (١٣٨/٥) تفسير النسفي (١٠٨/٤)

[3] تفسير الجلالين (٦٤٧/١)

"صیر" کے معنی میں آتا ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً ﴾ [الأنعام: ٢٥] "اور ہم نے ان کے دلوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔" (كذا ذكره الكرخي)

امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ ﴿ جَعَلَ ﴾ بہ معنی "تصییر" ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے جو اس کو "خَلَقْنَاهُ" کے معنی میں تجویز کیا ہے تو اس نے خطا کی ہے۔ اس کی طرف توجہ نہ کی جائے۔ امام خطیب رحمہ اللہ نے حدوثِ قرآن کے قائل حضرات کے دلائل اور امام رازی رحمہ اللہ کا جواب ذکر کیا ہے، وہ جمل میں مسطور ہے۔ اہلِ سنت ۔کثرهم الله۔ کا مذہبِ منصور یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ پاک کا کلام مجید غیر مخلوق ہے، اسی مسئلے کی بدولت عہدِ عباسیہ میں کیا فتنے اہلِ سنت میں برپا ہوگئے اور امام احمد رحمہ اللہ کو سخت ایذا پہنچی۔ متوکل علی اللہ عباسی تک یہ فتنہ باقی رہا۔ اس نے مسندِ خلافت پر جلوس فرما ہوتے ہی اس فتنے کو رفع کیا اور اہلِ سنت کی مدد کی، چنانچہ اسی اظہارِ سنت کے طفیل اللہ پاک نے اس کو بخش دیا، باوجود عیوب ونقصان اور مشکل و دشوار امور کے جو اس کے عہد میں واقع ہوئے، رحمه الله تعالیٰ۔ درحقیقت اظہارِ سنت اور دفعِ بدعت عجیب نیکی ہے کہ یہ بہت سی نیکیوں سے بلند وبالا ہے۔ اللهم أحينا على السنة وأمتنا عليها واحشرنا في زمرة أهل السنة آمين.

بالجملہ، پھر اللہ پاک نے قرآن شریف کے عربی میں نازل کرنے کی یہ وجہ ذکر فرمائی: ﴿ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ یعنی ہم نے اس کو قرآنِ عربی اس لیے کیا، تاکہ تم اس کو اور اس کے معانی کو سمجھو بوجھو اور اس میں جو مطالب اور معانی ہیں، ان کا احاطہ کرو، کیوں کہ وہ عربی مبین ہے اور تمھاری زبان بھی عربی ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: "لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ"[1] یعنی تاکہ تم فکر کرو، سوچو۔ چونکہ اللہ پاک کے حق میں ترجی (امید) وتوقع کی حقیقت ممنوع ہے، کیوں کہ یہ دونوں خاص طور پر اس شخص کے ساتھ متعلق ہیں جو انجام کار کو نہیں جانتا اس لیے کلمۂ "لَعَلَّ" کو لام کے معنی میں بطور استعارہ ٹھہرایا ہے۔ "أَيْ: لِكَيْ تَفْهَمُوْا" اور امام زمخشری رحمہ اللہ نے بہ معنی ارادہ ٹھہرایا ہے: "أَيْ: إِرَادَةَ أَنْ تَعْقِلُوْا"[2]

پھر قرآن شریف کا دوسرا وصف ذکر فرمایا: ﴿ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴾ یعنی بے شک قرآن ہمارے نزدیک ﴿ اُمِّ الْكِتٰبِ ﴾ میں البتہ ﴿ لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴾ ہے، یعنی لوحِ محفوظ میں بلند قدر والا اور بہت منظّم ہے اور بلاغت اور فصاحت کے اعلیٰ اور بلند ترین درجوں میں ہے، اس میں نہ کسی طرح کا اختلاف پایا جاتا ہے نہ کسی طرح کا تضاد۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قرآن شریف کے مقام وشرف وفضیلت کی خبر دی ہے، یعنی اے مکے والو! اگر تم نے اس کی تکذیب کی تو بے شک وہ ہمارے نزدیک تو باطل سے شریف و بلند مرتبہ اور محکم ہے، یعنی باطل سے محفوظ ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ کہتے ہیں: "أُمُّ الْكِتَابِ" بہ معنی "أَصْلُ الْكِتَابِ" ہر شے کی اصل اس شے کی ام ہے

[1] تفسير القرطبي (٦١/١٦) [2] الكشاف (٢٤١/٤)

اور قرآن اللہ تعالیٰ کے پاس لوحِ محفوظ میں ثبت کیا ہوا ہے، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴾[1] [البروج: ۲۱۔ ۲۲] ''بلکہ یہ قرآن ہے بڑی شان والا۔ لوحِ محفوظ میں (لکھا ہوا)۔''

امام ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا ﴾ سے مراد مخلوق کے اعمال ہیں: ایمان، کفر، طاعت اور معصیت،[2] یعنی یہ سب اعمال لوحِ محفوظ میں ثبت ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سب سے پہلے جو شے اللہ تعالیٰ نے پیدا کی وہ قلم ہے، پھر اس کو حکم دیا کہ قیامت کے دن تک جو کچھ ہونے والا ہے اسے لکھ لے اور وہ کتاب اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، پھر یہ آیت پڑھی۔[3] امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے بھی انس رضی اللہ عنہ سے اس کے مثل مرفوعاً روایت کیا ہے۔[4] بالجملہ یہاں دو قول ہوئے: ایک یہ ہے کہ ﴿ اِنَّهٗ ﴾ کی ضمیر قرآن شریف کی طرف راجع ہے تو یہ جملہ جوابِ قسم پر معطوف ہوگا اور قسم کے معنی کے تحت داخل ہوگا۔ یا جملۂ ماقبل کا جملہ مستانفہ مقرر مؤکد ہوگا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مراد مخلوق کے اعمال ہیں، اس کی بنا پر ﴿ لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴾ کے معنی شاید یہ ہوں کہ مخلوق کے اعمال لوحِ محفوظ میں ثبت کیے ہوئے ہیں، بلند جگہ میں محکم ومحفوظ ہیں، ان کے تغیر وتبدل پر کسی کو قدرت نہیں۔ واللّٰہ أعلم۔ تو اس صورت میں ماقبل سے علاحدہ ایک جملہ ہوگا۔

''اِنَّ'' کی خبر ﴿ لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴾ ہے اور ﴿ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ ﴾ اس خبر سے متعلق ہے۔ مابعد لام کا ماقبل میں عمل کرنا اس لیے جائز ہوا کہ اصل اس کی یہی ہے کہ شروع میں ہو، یہاں اس کو آخر میں صرف ''إِنَّ'' کی وجہ سے رکھا ہے اور ﴿ لَدَيْنَا ﴾ بھی خبر سے متعلق ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ اُمِّ الْكِتٰبِ ﴾ سے بدل ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ دونوں اپنے مابعد سے حال ہوں اس لیے کہ اصل میں وصف تھے۔ پھر جب ''عَلِيٌّ'' پر مقدم ہوئے تو بنا بر حال منصوب ہوگئے، چنانچہ محذوف سے متعلق ہوں گے اور یہ جائز نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی ''إِنَّ'' کی خبر ہو۔ (کذا قال الشیخ) تقدیر یہ ہے: ''وَإِنَّ الْقُرْآنَ لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ فِيْ أُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا'' یعنی بے شک قرآن کتبِ آسمانی میں رفیع الشان ہے، اس لیے کہ ان میں سے معجز یہی ہے، صاحبِ حکمتِ بالغہ ہے۔ یا محکم ہے کوئی اور کتاب اس کو منسوخ نہیں کرتی، لوحِ محفوظ میں ہے، ہمارے پاس ہے، تغیر وتبدیل سے محفوظ ہے۔

﴿ اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا ﴾۔ ''ضرب'' کے صلے میں جب ''عن'' آتا ہے تو ترک و امساک کے معنی میں ہوتا ہے۔ جب تم کسی شے کو ترک کرو اور اس سے رک جاؤ تو یوں کہیں گے: ''ضَرَبْتُ عَنْهُ وَأَضْرَبْتُ عَنْهُ''، یعنی میں نے اس کو ترک کیا اور اس سے رک رہا۔ امام فراء اور زجاج رحمہما اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔[5] ''صَفْحٌ'' مصدر ہے عرب کے اس قول کا کہ ''صَفَحْتُ عَنْهُ إِذَا أَعْرَضْتَ عَنْهُ''، یعنی صفح کے معنی اعراض کرنا

---

[1] معاني القرآن (٤/٤٠٥) [2] تفسير القرطبي (١٦/٦١) [3] تفسير الطبري (٢١/٥٦٦)
[4] فتح القدير (٤/٧٢٠) [5] فتح القدير (٤/٧١٦)

ہیں۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ جب تم کسی سے اعراض کرتے ہو تو اپنے صفحۂ رو و گردن کو اس کی طرف سے پھیر لیتے ہو۔ صفحہ بہ معنی جانب ہے۔ ﴿ صَفْحًا ﴾ کا نصب یا تو بنا بر مفعول مطلق ہے، اس لیے کہ "نَضْرِبُ" بہ معنی "نُعْرِضُ" ہے۔ یا بنا بر حال "أَيْ: صَافِحِيْنَ"۔ ﴿ الذِّكْرَ ﴾ سے یہاں مراد قرآن شریف ہے اور استفہام انکار اور ملامت کا ہے اور حرفِ فاء کا عطف ہے محذوف پر "أَيْ: أَنُهْمِلُكُمْ فَنَضْرِبُ عَنْكُمْ" كذا قال الحفناوي في فتح القدير)

یعنی کیوں جی ہم تم کو مہمل و بے کار چھوڑ دیں، پھر تم سے اعراض کریں، یعنی قرآن کو تم سے دور کر لیں، یا اس حال میں کہ ہم اعراض کرنے والے ہوں۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ "أَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ طَيًّا" یعنی کیا تم سے قرآن کو لپیٹ کر روک رکھیں نہ تم کو وعظ و نصیحت کریں نہ کسی چیز کا حکم کریں۔ امام مجاہد، ابو صالح اور سدی رحمہم اللہ نے کہا: "اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الْعَذَابَ"[1] یعنی کیا پھر روک رکھیں تم سے عذاب کو اور تمھاری زیادتی اور کفر پر تم کو سزا نہ دیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ معنی ہیں کہ کیا پھر تم کو ہلاک کر ڈالیں اور نہ تم کو امر کریں نہ نہی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ سے یہ معنی بھی مروی ہیں: کیا پھر ہم رک رہیں قرآن کے نازل کرنے سے اس وجہ سے کہ تم اس پر ایمان نہیں لاتے ہو۔ کسی نے کہا کہ ﴿ الذِّكْرَ ﴾ بہ معنی تذکیر ہے۔ گویا یوں کہا: کیا ہم تمھاری تذکیر اور وعظ و نصیحت کو چھوڑ دیں۔[2]

﴿ اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ﴾ امام نافع، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے بہ کسرِ "إِنْ" پڑھا ہے، اس بنا پر کہ "إِنْ" شرطیہ ہے اور جزا محذوف ہے، اس لیے کہ ماقبل اس پر دال ہے: "أَيْ: نَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا" یعنی اگر تم قوم مسرف ہو تو ہم قرآن کو موڑ کر تم سے پھیر دیں۔ باقی قراء کی قراءت بہ فتح ﴿ اَنْ ﴾ ہے تعلیل کی بنا پر "أَيْ: لِأَنْ كُنْتُمْ" یعنی اس لیے کہ تم ایک اسراف میں انہماک کرنے والی قوم ہو اور اس پر جمے ہوئے ہو اور جہالت میں افراط کو پہنچنے والے اور گمراہی میں حد سے بڑھنے والے ہو۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے قراءتِ فتح کو اختیار کیا ہے۔[3] مطلب یہ ہے کہ ہم تمھارے اسراف کی وجہ سے قرآن کے نازل کرنے سے باز نہ رہیں گے۔ جس کی تقدیر میں ایمان لکھا ہوا ہے وہ ضرور ایمان لائے گا اور تم نہ مانو گے تو تم پر حجت قائم ہو گی۔

پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کی تسلی و تشفی فرمائی: ﴿ وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ﴾. ﴿ كَمْ ﴾ خبریہ بہ معنی کثیر ہے، یعنی ہم نے پہلی اُمتوں میں بہت نبی بھیجے، پھر ان کا یہ حال تھا: ﴿ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ یعنی جو نبی ان کے پاس آیا، اس سے ٹھٹھا کیا، جس طرح کہ تیری قوم تجھ سے ٹھٹھا کرتی ہے۔ ﴿ فَاَهْلَكْنَا اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا ﴾۔ "بطش" شدت سے پکڑنے کو کہتے ہیں اور یہ تمیز ہے یا حال "أَيْ: بَاطِشِيْنَ" (فاعل "أَهْلَكْنَا" سے حال ہے: "أَيْ: أَهْلَكْنَاهُمْ بَاطِشِيْنَ" یعنی ہم نے ان کو ہلاک کیا اس حال میں کہ ہم سخت گیر

---

[1] تفسیر الطبري (٥٦٧/٢١) فتح القدير (٧١٦/٤) [2] تفسیر القرطبي (٦٢/١٦) [3] فتح القدير (٧١٦/٤)

تھے)۔ اول بہتر ہے، یعنی پھر ہم نے اس قوم کو ہلاک کر ڈالا جو ان لوگوں میں زور اور قوت کے لحاظ سے بہت سخت تھی۔

﴿ وَمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ یعنی قرآن میں بہت جگہ ان کا عجیب وغریب قصہ گزر چکا ہے جو اپنی شہرت کی وجہ سے اس بات کا مستحق ہے کہ وہ ایک مثال کی طرح مشہور ہو۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ان کی صفت ہلاک کرنے میں مشہور رہی ہے۔ کلمۂ ﴿ مَثَلُ ﴾ وصف اور خبر کے معنی میں آتا ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تو وعدہ ہے اور کفار کے لیے سخت ملامت ہے۔ اس لیے کہ اس کلام میں یہ بات شامل ہے کہ پہلے لوگ رسولوں کی تکذیب کے سبب سے ہلاک کر دیے گئے اور اگر یہ لوگ تیری تکذیب پر جمے رہیں گے اور تیرا انکار کرتے رہیں گے اس شے پر جو تو لے کر آیا ہے تو یہ بھی اُن کی طرح ہلاک ہوں گے۔[1]

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۝ وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ۝ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۝ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

اور اگر آپ ان سے سوال کریں: کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا؟ تو یقیناً وہ یہی کہیں گے کہ انھیں نہایت غالب، خوب جاننے والے نے پیدا کیا⑨ وہ (اللہ) جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور اس میں تمھارے لیے راستے بنائے، تاکہ تم راہ پاؤ⑩ اور وہ (اللہ) جس نے آسمان سے پانی ایک اندازے سے نازل کیا، پھر ہم نے اس کے ذریعے سے مردہ شہر کو زندہ کر دیا، اسی طرح تم دوبارہ (قبروں سے) نکالے جاؤ گے⑪ اور وہ جس نے سب جوڑے پیدا کیے اور تمھارے لیے کشتیاں اور چوپایے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو⑫ تاکہ تم

[1] فتح البیان (۳۲۷/۱۲۔۳۲۹)

ان کی پیٹھ پر جم کر بیٹھو، پھر جب ان پر متوازن ہو کر بیٹھ جاؤ تو تم اپنے رب کی نعمت یاد کرو اور تم کہو: وہ (اللہ) پاک ہے، جس نے اسے ہمارے تابع کر دیا، ورنہ ہم اسے قابو میں کر لینے والے نہیں تھے ⑬ اور یقیناً ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں ⑭ اور انھوں نے اللہ کے بعض بندوں کو اس کا جز (اولاد) ٹھہرا دیا، بلاشبہ انسان تو کھلم کھلا ناشکرا ہے ⑮

مشرکین کا توحیدِ خلق کو تسلیم کرنا:

زمین کو تمھارے لیے فرش بنایا اور اس میں تمھارے لیے راستے کر دیے، یعنی جہاں تک انسان بستے ہیں، آپس میں مل سکیں، ایک دوسرے کی طرف راہ پا سکیں۔ دنیا کے سفر سے آخرت کا سفر یاد کرو۔ نبی اکرم ﷺ جب سوار ہوتے تو یہی تسبیح پڑھتے تھے۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے: اے محمد! اگر تو ان لوگوں سے پوچھے جو اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں اور اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو پوجتے ہیں کہ آسمان و زمین کو کس نے بنایا ہے؟ تو کہیں گے کہ ان کو عزیز و علیم نے بنایا ہے، یعنی اقرار کریں گے کہ اس کا بنانے والا اللہ وحدہ لاشریک لہ ہے اور وہ اس اقرار کے باوجود اللہ کے ساتھ اس کے غیر کو جو اصنام اور انداد سے ہوتے ہیں، پوجتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کے شاہ کار:

پھر فرمایا: ﴿ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا ﴾ یعنی وہی ہے جس نے زمین کو تمھارے لیے بچھونا اور ٹھہرنے کی جمی ہوئی جگہ بنا دیا، جس پر تم چلتے پھرتے ہو، قائم ہوتے ہو، سوتے ہو اور اس میں تصرف کرتے ہو، اس کے باوجود کہ وہ پانی کے اوپر بنائی گئی ہے، لیکن اس نے پہاڑوں سے اس کو جما دیا ہے، تاکہ اِدھر اُدھر ہلے جلے نہیں۔

﴿ وَجَعَلَ لَکُمْ فِیْهَا سُبُلًا ﴾ یعنی اس میں تمھارے لیے راہیں بنا دیں پہاڑوں اور وادیوں کے درمیان ﴿ لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ یعنی تاکہ تم راہ پاؤ۔ ایک شہر سے دوسرے شہر میں آنے جانے کے لیے اور ایک قطر سے دوسرے قطر کی طرف اور ایک اقلیم سے دوسری اقلیم کی طرف جانے کے لیے راستے پاؤ۔ ﴿ وَالَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ ﴾ یعنی وہی ہے جس نے اندازے کے مطابق آسمان سے **پانی اتارا، تاکہ وہ تمھارے** کھیتوں اور پھلوں کے لیے اور تمھارے اور تمھارے جانوروں کے پینے کے لیے کافی ہو۔ ﴿ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا ﴾ یعنی، پھر ہم نے اس سے ایک مردہ زمین کو اُبھارا، پس جب اس پر پانی آیا تو وہ ہلی اور اُبھری اور ہر قسم کی بارونق روئید گی اُگائی۔

پھر اللہ پاک نے زمین کے زندہ کرنے سے اس بات سے آگاہ فرمایا کہ قیامت کے دن جسموں کو ان کے مرجانے کے بعد زندہ کرے گا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ کَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴾ یعنی اسی طرح تم نکالے جاؤ گے۔

پھر فرمایا: ﴿ وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا ﴾ یعنی اور جس نے سارے جوڑے بنا دیے، یعنی وہ روئیدگی اور کھیتوں کی اور پھلوں اور پھلوار کی ساری قسمیں جن کو زمین اُگاتی ہے اور حیوانات اپنی جنسوں اور قسموں کے مختلف ہونے کے ساتھ۔ ﴿ وَجَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْکَبُوْنَ ﴾ یعنی اور تمھارے لیے کشتیاں اور چوپائے بنا دیے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو تمھارا فرماں بردار کر دیا اور انھیں تمھارے کھانے کے لیے میسر و مہیا کر دیا، تم ان کا گوشت کھاتے ہو، دودھ پیتے ہو اور اُن کی پیٹھ پر سوار ہوتے ہو۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ لِتَسْتَوٗا عَلٰی ظُهُوْرِهٖ ﴾ تاکہ ان کی پشتوں پر بہ آسانی نفع لیتے ہوئے چڑھ بیٹھو۔ ﴿ ظُهُوْرِهٖ ﴾ کی ضمیر جنس کی طرف راجع ہے، یعنی اس جنس کی پشتوں پر سوار ہو جاؤ۔

﴿ ثُمَّ تَذْکُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّکُمْ اِذَا اسْتَوَیْتُمْ عَلَیْهِ ﴾، پھر جب تم ان چیزوں پر بیٹھ چکو جن کو تمھارا مسخر بنایا تو اپنے رب کا احسان یاد کرو۔ ﴿ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا کُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ﴾ اور کہو: وہ ذات پاک ہے جس نے ان کو ہمارے بس میں کر دیا اور ہم اس کی مقارنت (برابری) کرنے والے نہ تھے اور اگر اللہ ان کو ہمارا مسخر نہ کر دیتا تو ہم ان پر قابو نہ پاتے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام قتادہ، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مُقْرِنِیْنَ ﴾ کے معنی ”مُطِیْقِیْنَ“[1] ہیں۔ یعنی طاقت رکھنے والے۔ ﴿ وَاِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴾ اور بے شک ہم اپنے رب ہی کی طرف البتہ رجوع ہونے والے ہیں اپنے مرنے کے بعد اور اسی کی طرف ہمارا بڑا چلنا ہے اور یہ اس باب سے ہے کہ دنیا کے چلنے کے ساتھ آخرت کے چلنے پر آگاہی بخشی ہے جس طرح کہ دنیوی زادِ راہ سے اُخروی زادِ راہ پر تنبیہ کی ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی ﴾ [البقرة: ١٩٧] ”اور اپنے ساتھ سفر خرچ لے لیا کرو، سب سے بہتر توشہ اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے۔“ اور لباسِ دنیوی سے لباسِ اخروی پر تنبیہ کی ہے اس آیتِ کریمہ میں: ﴿ وَرِیْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِكَ خَیْرٌ ﴾ [الأعراف: ٢٦] ”تمھارا لباس موجبِ زینت ہے اور تقویٰ کا لباس یہ اس سے بڑھ کر ہے۔“

سواری کی دعائیں:

ان دعاؤں کا ذکر جو سواری پر پڑھی جاتی ہیں جن کا بیان احادیث میں آیا ہے:

1 امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث: امام احمد رحمہ اللہ نے علی بن ربیعہ سے روایت کیا ہے (پوری سند یہ ہے: ”حدثنا يزيد، حدثنا شريك بن عبد الله عن أبي إسحاق عن علي بن ربيعة... الخ“) کہا میں نے دیکھا علی رضی اللہ عنہ کو کہ ان کے پاس ایک سواری کا جانور لائے، تو جب انھوں نے اپنا پاؤں رکاب میں

[1] تفسير الطبري (٢١/ ٥٧٦، ٥٧٧)

رکھا تو فرمایا: «بِسْمِ اللّٰهِ»، پھر جب اس پر بیٹھ چکے تو فرمایا: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، سُبْحَانَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ، وَإِنَّا إِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ»، پھر تین بار اللہ کی حمد کی اور تین بار تکبیر کہی۔ پھر فرمایا: «سُبْحَانَكَ لَآ إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ قَدْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ» پھر ہنسے تو میں نے عرض کی: اے امیر المومنین! آپ کس شے سے ہنسے؟ فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے ایسا کیا، جیسا کہ میں نے کیا، پھر آپ ﷺ ہنسے تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ کس شے سے ہنسے؟ تو فرمایا کہ رب تبارک وتعالیٰ اپنے بندے سے تعجب کرتا ہے، جب وہ کہتا ہے: "رَبِّ اغْفِرْ لِيْ" (یعنی راضی ہوتا ہے اور ثواب دیتا ہے۔ والله أعلم بتعجبه) اور فرماتا ہے کہ میرے بندے نے یہ جان لیا کہ میرے علاوہ گناہوں کو کوئی نہیں بخشتا۔[1]

(وهكذا رواه أبو داود والترمذي والنسائي من حديث أبي الأحوص، زاد النسائي ومنصور عن أبي إسحاق السبيعي عن علي بن ربيعة الأسدي الوالبي به. وقال الترمذي: حسن صحيح، وقد قال عبدالرحمن بن مهدي عن شعبة قلت لأبي إسحاق السبيعي: ممن سمعت هذا الحديث؟ قال: من يونس بن خباب، فلقيت يونس بن خباب، فقلت: ممن سمعته؟ فقال: من رجل سمعه من علي بن ربيعة، ورواه بعضهم عن يونس بن خباب عن شقيق بن عقبة الأسدي عن علي بن ربيعة الوالبي به)

2 عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث: امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنی سواری پر پیچھے بٹھایا، پھر جب آپ ﷺ اس پر بیٹھ چکے تو آپ ﷺ نے تین بار تکبیر کہی اور تین بار حمد اور تین بار تسبیح کی اور ایک بار تہلیل کی، پھر اس پر چت لیٹ گئے اور ہنسے، پھر ان پر متوجہ ہوئے اور فرمایا: نہیں ہے کوئی مسلمان مرد کہ وہ کسی سواری کے جانور پر سوار ہو، پھر کرے جیسا میں نے کیا، مگر اللہ عزوجل اس پر متوجہ ہوتا ہے، پھر اس کی طرف ہنستا ہے، جیسا میں تیری طرف ہنسا۔[2] ("ضحك" سے مراد رضا اور ارادۂ خیر ہے۔ والله أعلم بضحكه). (تفرد به أحمد)

3 عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث: امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا کہ نبی مکرم ﷺ جس وقت اپنی سواری پر سوار ہوتے تو تین بار تکبیر کہتے، پھر فرماتے: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۝13 وَاِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾ پھر فرماتے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ فِيْ سَفَرِيْ هٰذَا الْبِرَّ وَ التَّقْوٰى وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰى، اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا السَّفَرَ وَاطْوِلَنَا الْبُعْدَ، اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْأَهْلِ، اَللّٰهُمَّ أَصْحِبْنَا فِيْ سَفَرِنَا وَاخْلُفْنَا فِيْ أَهْلِنَا» اور

---

[1] مسند أحمد (٩٧/١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٠٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٤٦) سنن النسائي الكبرى (٢٤٨/٥) تفسير ابن كثير (١٥٦/٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٦٥٣)

[2] مسند أحمد (٣٣٠/١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه أبو بكر بن أبي مريم وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ١٨٦/١٠)

آپ ﷺ جب اپنے گھر کی طرف لوٹتے تو فرماتے: « آيِبُوْنَ تَآئِبُوْنَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ » یعنی ہم رجوع ہونے والے ہیں، توبہ کرنے والے ہیں، اگر چاہے اللہ اپنے رب کی عبادت کرنے والے ہیں اور اپنے رب کی حمد کرنے والے ہیں۔[1] (وهكذا رواه مسلم وأبو داود والنسائي من حديث ابن جريج والترمذي من حديث حماد بن سلمة كلاهما عن أبي الزبير به)

4 دوسری حدیث: امام احمد رحمہ اللہ نے ابو لاس خزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو حج پر جانے کے لیے صدقے کے اونٹوں پر سوار کیا تو ہم نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم نہیں دیکھتے کہ یہ اونٹ ہم کو اٹھا لیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں ہے کوئی اُونٹ مگر اس کے ذِروے میں شیطان ہے (ذروہ اونٹ کی کوہان کا اوپر کا حصہ ہے اور ہر چیز کا ذِروہ اس کی سب سے بلند جگہ ہے)۔ چنانچہ تم ان پر اللہ کا نام ذکر کرو جب تم ان پر سوار ہو، جس طرح کہ میں تم کو حکم دیتا ہوں، پھر ان کو اپنی جانوں کے لیے پست کرو، پس سوا اس کے نہیں کہ سوار کرتا ہے اللہ عزوجل۔[2] (اصل روایت کے الفاظ « امتهنوا لأنفسكم » ہیں، مطلب یہ ہے کہ اللہ کا نام لے کر ان سے اپنا کام لو)۔ ابو لاس کا نام محمد بن الاسود بن خلف ہے۔

5 اس معنی ومفہوم کی ایک اور حدیث: امام احمد رحمہ اللہ نے محمد بن حمزہ سے روایت کیا ہے کہ اس نے اپنے باپ کو سنا کہ وہ کہتا تھا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہر اونٹ کی پشت پر ایک شیطان ہے، لہٰذا جس وقت تم ان پر سواری کرو تو اللہ عزوجل کا نام لو، پھر اپنی ضروریات سے کوتاہی مت کرو۔[3]

اللہ تعالیٰ کی اولاد ٹھہرانے پر مشرکین کی تردید:

پھر اللہ پاک نے مشرکوں کی طرف سے خبر دی کہ انھوں نے افترا کیا اور جھوٹ باندھا اس بات میں کہ بعض چوپائے تو اپنے بتوں کے لیے ٹھہرائے اور بعض اللہ تعالیٰ کے لیے۔ جس طرح کہ اللہ عزوجل نے سورۃ الانعام میں ان کی طرف سے ذکر کیا ہے: ﴿ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١٣٦] ''اور اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی اور مویشی پیدا کیے ہیں ان لوگوں نے ان میں سے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کیا اور بزعم خود کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا ہے اور یہ ہمارے معبودوں کا ہے، پھر جو چیز ان کے معبودوں کی ہوتی

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٤٢) مسند أحمد (١٤٤/٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٩٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٤٧) سنن النسائي الكبرىٰ (١٤١/٦)

[2] مسند أحمد (٢٢١/٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٦٩٩)

[3] مسند أحمد (٤٩٤/٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٠٣١)

ہے وہ تو اللہ کی طرف نہیں پہنچتی اور جو چیز اللہ کی ہوتی ہے وہ ان کے معبودوں کی طرف پہنچ جاتی ہے۔ کیا برا فیصلہ وہ کرتے ہیں۔'' اور اسی طرح بیٹیوں اور بیٹوں میں جو خسیس تر اور ردی قسم تھی، یعنی بیٹیاں، وہ اللہ کے لیے ٹھہرائی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿٢١﴾ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴾ [النجم: ٢١۔ ٢٢] ''کیا تمھارے لیے لڑکے اور اللہ کے لیے لڑکیاں ہیں؟ یہ تو اب بڑی بے انصافی کی تقسیم ہے۔'' اور اس جگہ یوں فرمایا: ﴿ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ۭ ﴾[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ لَىِٕنْ ﴾ کا لام تو طیہ قسم کا ہے اور ﴿ لَيَقُوْلُنَّ ﴾ قسم کا جواب ہے شرط کا نہیں ہے۔ اس قاعدے کی بنا پر کہ جب شرط اور قسم جمع ہوں تو پہلے کا جواب تو مذکور ہوتا ہے اور بعد والے کا جواب محذوف ہوتا ہے، چنانچہ یہاں پر قسم کا لام حرفِ شرط سے پہلے ہے، اس لیے قسم کا جواب مذکور ہوگا اور شرط کا جواب محذوف ہوگا۔ ﴿ لَيَقُوْلُنَّ ﴾ اصل میں "لیقولونن" ہے، نون رفع کا تو اس لیے محذوف ہوا کہ تین نون کا اکٹھا آنا ثقیل ہے اور واو جمع کا اس لیے محذوف ہوا کہ جمع کا واو اور نون مدغم دو ساکن جمع ہو گئے، پس واو کو حذف کر دیا۔ ﴿ خَلَقَهُنَّ ﴾ کو تاکید کے لیے دوبارہ ذکر کیا، ورنہ اگر صرف ﴿ الْعَزِيْزُ ﴾ ہوتا تو کافی تھا۔

مثلاً کوئی پوچھے: ''مَنْ قَامَ؟'' تم اس کے جواب میں کہو: ''زید'' تو یہ کافی ہے، کیوں کہ فعل تو سوال سے ظاہر معلوم ہوتا ہے، معنی یہ ہیں: اللہ کی قسم! اگر تو اپنی قوم کے ان کافروں سے پوچھے کہ آسمان و زمین یعنی یہ اجرامِ علوی وسفلی کس نے بنائے تو البتہ کہیں کہ ان کو صاحبِ عزت و صاحبِ علم نے بنایا، یعنی اقرار کر لیں کہ اللہ اُن کا خالق ہے اور اس کا انکار نہ کریں، یہ اقرار ان کے حال کو بدحال کرنے والا اور اُن کی سزا کو نہایت سخت کرنے والا ہے، کیوں کہ انھوں نے تو اللہ پاک کی بعض مخلوقات کو پوجا اور اس کو اس کا شریک ٹھہرایا، بلکہ مخلوقات میں سے اس مخلوق کی طرف قصد کیا جو نہ سنے نہ دیکھے اور نہ نفع دے نہ ضرر پہنچائے، یعنی یہی پتھر، چاندی اور سونے وغیرہ کے بت۔ چنانچہ ان کو عزیز، علیم، سمیع، بصیر، نافع، ضار کے لیے شریک ٹھہرایا۔ کفار کا جواب تو ﴿ الْعَلِيْمُ ﴾ پر پورا ہو چکا، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذاتِ مقدس کے پانچ وصف ایسے ذکر فرمائے جو اس کی عظیم نعمت پر اور کمال قدرت پر دال ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بندوں پر احسانِ عظیم ہے اور مخلوقات میں اس کو پوری قدرت حاصل ہے۔

پہلا وصف یہ ہے: ﴿ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا ﴾ پہلے زمین سے شروع کیا، اس لیے کہ یہ سب سے قریب تر ہے، رہنا بسنا، کھانا پینا، چلنا پھرنا، مرنا جینا سب کچھ اسی میں ہوتا ہے۔ دیکھو زمین اس کی کیسی عظیم الشان

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/١٥٥۔١٥٧)

نعمت ہے کہ اس نے زمین کو تمھاری گزران کے لیے بچھونا بنایا، جیسے بچے کا گہوارہ ہوتا ہے کہ تم اس پر راحت و آرام سے بسر کرتے ہو اور اگر وہ چاہتا تو اس کو پھسلنی کر دیتا کہ اس میں کوئی شے نہ جمتی جس طرح کہ تم بعض پہاڑوں کو دیکھتے ہو اور اگر چاہتا تو اس کو ہلتی ہوئی بنا دیتا، پس کھیتی اور مکانوں میں اس سے نفع لینا ممکن نہ ہوتا، اس سے جو نفع حاصل ہوا، وہ اسی لیے کہ وہ بچھی ہوئی اور ساکن ہے، یعنی برابر اور جمی ہوئی ہے۔ اس کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔ جمہور نے "مِهَادًا" پڑھا ہے اور کوفیوں نے ﴿ مَهْدًا ﴾ پڑھا ہے، یہ آیت ابتدائے کلام ہے ماقبل سے متصل نہیں ہے اور اگر من جملہ مقولہ کفار ہوتی تو وہ یوں کہتے: "اَلَّذِيْ جَعَلَ لَنَا الْأَرْضَ مِهَادًا" چنانچہ پہلے اس طرف اشارہ ہو چکا ہے۔

دوسرا وصف یہ ہے: ﴿ وَجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا ﴾ یعنی اور تمھارے لیے اس میں راستے بنا دیے کہ تم ان میں چلتے ہو جس طرف چاہتے ہو اور اگر وہ چاہتا تو اس کو ایسا کر دیتا کہ اس کی کسی جگہ پر چلا نہ جاتا جس طرح کہ بعض پہاڑوں کو اسی طرح کا بنایا ہے۔ کسی نے کہا: ﴿ سُبُلًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ "مَعَايِشَ تَعِيْشُوْنَ بِهَا"، یعنی اس میں تمھارے لیے معاش کمانے کی راہیں بنا دیں کہ تم ان سے گزران کرو۔ ﴿ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ یعنی شاید تم ان راستوں پر چل کر اپنے سفروں میں اپنے مقاصد اور منافع حاصل کرنے کی راہ پاؤ۔

﴿ وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ﴾ یعنی اور وہ ہے جس نے آسمان سے بقدرِ ضرورت پانی اتارا، اس قدر جو مصلحت کا تقاضا ہے۔ تمھاری حاجت سے زیادہ نہیں اتارا کہ تمھاری کھیتیوں کو تباہ کر دے اور گھروں کو گرا دے اور تم کو ڈبو کر ہلاک کر دے اور نہ ہی حاجت سے کم اتارا کہ تمھاری حاجت بھی پوری نہ ہو اور اپنی مشیت کے تقاضے کے مطابق کبھی تو اپنے بندوں کی روزی میں فراخی کے ساتھ اور کبھی تنگی کے ساتھ پانی اتارا، چونکہ پانی سے مردہ زمین کو زندہ کر دینا ایک عظیم الشان قدرت اور نعمت ہے، اس لیے صیغۂ غائب سے صیغۂ متکلم کی طرف التفات کر کے فرمایا: ﴿ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ﴾ یعنی پھر ہم نے اس پانی سے ایک بستی کو زندہ کر دیا جو روئیدگی سے خالی پڑی ہوئی تھی۔ جمہور نے ﴿ مَيْتًا ﴾ کو بہ تخفیف پڑھا اور عیسی اور امام ابوجعفر رحمہما اللہ نے بہ تشدید پڑھا ہے۔

﴿ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴾ یعنی اس زمین کے زندہ کرنے کی طرح کہ اس کی روئیدگی نکالی اس کے بعد کہ اس میں کچھ روئیدگی نہ تھی، تم بھی اپنی قبروں سے زندہ ہو کر اٹھائے جاؤ گے، کیوں کہ جو ذات پاک اس پر قادر ہے، وہ اس پر بھی قادر ہے۔ سورت آل عمران اور اعراف میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ جمہور نے ﴿ تُخْرَجُوْنَ ﴾ بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور امام اعمش رحمہ اللہ وغیرہ (یحییٰ بن وثاب، حمزہ، کسائی، ابن ذکوان عن ابی عامر) نے بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے۔[1]

﴿ وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا ﴾ اس جگہ "أزواج" سے مراد مختلف قسمیں ہیں، جیسے: میٹھا اور کھٹا، سفید

[1] فتح القدير (٧١٧/٤)

اور سیاہ۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اَلْاَصْنَافُ کُلُّھَا"۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: سردی و گرمی، شب و روز، آسمان و زمین، جنت و نار۔[1] کسی نے کہا: حیوان کے جوڑے نر و مادہ۔ کسی نے کہا: نبات کی قسمیں یعنی انواع واقسام کی روئیدگی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ﴾ [یٰس: ٣٦] ''وہ پاک ذات جس نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے، خواہ وہ زمین کی اگائی ہوئی چیزیں ہوں، خواہ خود ان کے نفوس ہوں، خواہ وہ (چیزیں) ہوں جنھیں یہ جانتے بھی نہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِیْجٍ ﴾ [قٓ: ٧] ''اور اس میں ہم نے قسم قسم کی خوشنما چیزیں اُگا دی ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِیْمٍ ﴾ [لقمان: ١٠] ''ہر قسم کے نفیس جوڑے۔'' کسی نے کہا: "أزواج" سے مراد وہ حالات ہیں جن میں انسان لوٹتا پوٹتا رہتا ہے، یعنی خیر وشر، ایمان وکفر، نفع وضر، فقر وغنا، صحت و بیماری۔ یہ قول اپنے عموم کے لحاظ سے سب قولوں کو عام ہے اور سب کا جامع ہے۔ کسی نے کہا: دوسرا قول اولیٰ ہے۔ بعض محققین نے کہا کہ کل شی جو اللہ پاک کے سوا ہے وہ زوج ہے، جیسے: فوق وتحت، ربیع وخریف، یمین و یسار، قدام وخلف یعنی آگے پیچھے، ماضی ومستقبل، ذوات و صفات۔ ساری اشیاء کا ازواج ہونا اس پر دال ہے کہ وہ ممکن الوجود ومحدث و مسبوق بعدم ہیں، رہا حق تعالیٰ تو وہ فرد و یکتا ہے ضد وند، مقابل ومعاضد سے منزہ ومبرا ہے۔

﴿ وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ﴾ یعنی اور تمھارے واسطے کشتیاں اور چوپائے بنا دیے جن پر تم سوار ہوتے ہو دریا اور خشکی میں۔ اس جگہ انعام سے مراد وہ حیوان ہیں جن پر سوار ہوتے ہیں، یعنی اونٹ، گھوڑے، خچر اور گدھے۔ سورۃ النحل میں اس کا قرینہ یہ آیت ہے: ﴿ وَّالْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِیْنَةً ﴾ [النحل: ٨] ''گھوڑوں کو، خچروں کو، گدھوں کو اس نے پیدا کیا کہ تم ان کی سواری لو اور وہ باعثِ زینت بھی ہیں۔'' چنانچہ اب یہاں انعام میں تغلیب ہے، کیوں کہ ''انعام'' یہی اونٹ، گائے اور بکری ہے۔ شیخ شیوخنا علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس جگہ ''انعام'' سے مراد خاصتاً اونٹ ہیں۔[2] کسی نے کہا: اونٹ اور گائے۔ پہلا قول صحیح مناسب ہے۔ انتہیٰ.

﴿ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ﴾ حرفِ لام علت کے لیے ہے اور یہی ظاہر ہے، یا صیرورت کے لیے ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے جائز رکھا ہے کہ لامِ امر ہو۔[3] اس میں بُعد ہے، اس لیے کہ امر مخاطب پر لام کا دخول قلیل ہے۔ ﴿ ظُهُوْرِهٖ ﴾ میں ضمیر "ما" کی طرف راجع ہے، یہ قول امام ابو عبید رحمہ اللہ کا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظہور کی اضافت واحد کی طرف اس لیے کی کہ اس سے مراد جنس ہے تو اب واحد جمع کے معنی میں بہ منزلہ جنس ہو گیا، پس اسی وجہ سے اس کو مذکر رکھا گیا۔ ظہور کو جمع ذکر کیا، اس لیے کہ اس سے مراد اس جنس کی ظہور ہیں۔[4] استواء بہ معنی

[1] تفسير القرطبي (٦٥/١٦) [2] فتح القدير (٧١٨/٤) [3] روح المعاني (٦٨/٢٥) [4] تفسير القرطبي (٦٥/١٦)

استعلاء ہے، یعنی تاکہ تم اس شے کی پشتوں پر چڑھو جس پر تم کشتیوں اور چوپایوں میں سے سوار ہوتے ہو۔

﴿ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ ﴾ یعنی، پھر تم اپنے رب کی نعمت کو یاد کرو جس کا اس نے تم پر انعام کیا، وہ یہی ہے کہ دریا اور خشکی میں اس سواری کو تمھارا مسخر کر دیا۔ ﴿ عَلَيْهِ ﴾ میں بھی "مَا" کی رعایت کی، یعنی جب تم اس سواری پر بیٹھ چکو جس پر تم سوار ہوتے ہو۔ امام مقاتل اور کلبی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ نعمت کا ذکر کرنا یہ ہے کہ یوں کہو: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ رَزَقَنِيْ هٰذَا وَحَمَلَنِيْ عَلَيْهِ" یعنی اس اللہ کی حمد ہے جس نے مجھے یہ عطا کیا اور اس پر مجھے سوار کیا۔

﴿ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا ﴾ اور اپنی زبانوں سے یہ دعا کہو، تاکہ نعمت کا ذکر دل اور زبان دونوں سے جمع ہو جائے۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے یوں پڑھا ہے: "سُبْحَانَ مَنْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا" امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو سکھایا ہے کہ کس طرح سے کہو جب کہ تم سوار ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ مُقْرِنِيْنَ ﴾ بہ معنی "مُطِيْقِيْنَ" ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "أَقْرَنَ هٰذَا الْبَعِيْرَ إِذَا أَطَاقَهُ" امام اخفش اور ابو عبیدہ رحمہما اللہ نے کہا: بہ معنی "ضَابِطِيْنَ"۔ کہتے ہیں:[1] "فُلَانٌ مُقْرِنٌ لِفُلَانٍ" یعنی فلاں فلاں کا ضابط ہے۔ کسی نے کہا: "مُمَاثِلِيْنَ" یعنی قوت میں ہم اس کے مماثل نہیں تھے۔ یہ معنی اس محاورے سے ماخوذ ہیں کہ "هُوَ قَرْنُ فُلَانٍ" یعنی وہ فلاں کا مماثل ہے جب کہ قوت میں اس جیسا ہو۔ معنی یہ ہیں: پاک ذات ہے وہ جس نے اس کو ہمارے لیے مسخر کیا اور ہمیں اس کی طاقت نہیں تھی اور بے شک ہم اپنے رب کی طرف رجوع ہونے والے ہیں۔ امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "هٰذَا أَيْ: اَلَّذِيْ رَكِبْنَاهُ سَفِيْنَةً كَانَ أَوْ دَابَّةً" یعنی پاک ذات ہے وہ جس نے ہمارے لیے اس مرکب کو ہمارے لیے تابع کر دیا جس پر ہم سوار ہوئے۔ یہ کشتی ہو یا چوپایہ۔

اس قول کا تقاضا یہ ہے کہ سوار ہونے کے وقت یہ دعا پڑھنی چاہیے، وہ سواری کشتی ہو یا چوپایہ۔ غیر خطیب نے کہا: یہ دعا چوپائے کے ساتھ خاص ہے۔ رہی کشتی تو اس پر سوار ہوتے وقت یوں کہے: ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ﴾ [هود: ٤١] "اللہ ہی کے نام سے اس کا چلنا اور ٹھہرنا ہے۔" (مدارک میں "إن ربي لغفور رحيم" زیادہ کیا ہے[2])۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ﴾ اس قول کا مؤید ہے، اس لیے کہ سرتابی، سرکشی، توحش اور امتناع جو حاصل ہوتا ہے وہ انہیں چوپایوں میں ہے، اگر اللہ پاک ان کو مسخر اور رام نہ کر دے۔ کشتیاں تو آدمی کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ہیں، اس لیے اپنی قوت کے سبب سے ان میں امتناع (انکار) نہیں، جیسے: چوپایوں میں ہوتا ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي (٦٦/١٦) فتح القدير (٧١٧/٤) [2] تفسير النسفي (١١٠/٤)

﴿وَاِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾ میں کفار کے قیامت کے انکار کرنے میں پر رد ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہا ہے کہ دنیا کی سواریوں پر سوار ہوتے وقت اپنی آخرت کی سواری کو یاد کریں اور وہ جنازہ ہے۔ حکایت کی گئی ہے کہ ایک قوم سوار ہوئی اور کہا: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا﴾ اور ان میں ایک شخص ایسی اونٹنی پر سوار تھا جو لاغری کے مارے حرکت نہیں کرتی تھی، چنانچہ اس نے کہا کہ میں اس کا مقرن ہوں تو وہ اس سے گر پڑا اس کے جست لگانے کی وجہ سے اور اس شخص کی گردن ٹوٹ گئی۔ چاہیے یہ کہ عاقل کا سوار ہونا تماشے کے لیے اور لذت حاصل کرنے کے لیے نہ ہو، بلکہ عبرت لینے کے لیے ہو اور اس وقت یہ سوچ کہ وہ ضرور ہلاک ہونے والا ہے اور اللہ کی طرف رجوع ہونے والا ہے اور اس کی قضا سے چھٹنے والا نہیں ہے۔[1]

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہمیں وہ بات سکھائی ہے جس کو ہم اسی وقت کہیں جب چوپایوں پر سوار ہوں۔ اور دوسری آیت میں نوح علیہ السلام کی زبان سے ہم کو وہ بات بتائی ہے جس کو ہم اس وقت کہیں جب ہم کشتیوں پر سوار ہوں۔ چنانچہ بہت سے چوپایوں کے سوار ایسے ہیں کہ وہ ان کو لے کر ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ یا سرکشی کرتے ہیں، یا بے سوچے سمجھے کہیں گھس پڑتے ہیں، یا خود سوار اُن کی پشت سے گر پڑتا ہے اور ہلاک ہو جاتا ہے۔ اور بہت سے کشتی کے سوار ہیں کہ وہ ان کو لے کر ٹوٹ گئی اور وہ ڈوب گئے۔

پھر جب چوپایہ اور کشتی پر سوار ہونا ایک خوفناک امر کا مباشر (ساتھ) ہونا ٹھہرا اور ہلاکت اور ضائع ہو جانے میں سے کسی سبب کے ساتھ متصل ہونا قرار پایا تو اس بات کا حکم دیا گیا کہ جس حال میں موت کا سبب اس کے ساتھ لگا ہوا ہے، اس وقت اپنی موت کو نہ بھولے اور اپنے دل اور زبان سے اس کی یاد کو ترک نہ کرے، یہاں تک کہ اللہ پاک کی قضا کے لیے دل سے تیار رہے اور اپنے نفس کی اصلاح کرے اس بات سے ڈر کر کہ کہیں اس کا یہی سوار ہونا، اللہ تعالیٰ کے علم میں اس کے اسبابِ موت میں سے ہو اور وہ اس سے غافل ہو۔ امام ابن العربی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کا ذکر زبان سے واجب نہیں،[2] بلکہ مستحب ہے۔ واجب جو ہے وہ دل سے اس کا اعتقاد ہے، لیکن زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ جمع افضل ہے، یعنی دل سے اعتقاد کرے اور زبان سے بھی کہے۔

بالجملہ اللہ پاک نے اپنی ذاتِ مقدس کے پانچ وصف ذکر کیے جو ظاہری طور پر قدرت اور نعمت پر دال ہیں۔ اس سے منظور کفار کو ترکِ توحید پر ملامت اور سرزنش کرنا ہے کہ ایسے منعم و قادر کو چھوڑ کر بتوں کو پوجتے ہیں جو نہ سن سکیں نہ دیکھ سکیں اور نہ نفع وضرر کی قدرت رکھیں۔ پھر جن کفار کا ذکر پہلے ہو چکا ہے انہیں کا ذکر پھر کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا﴾ "أَيْ: بَعْدَ ذٰلِكَ الْاِعْتِرَافِ" جیسا کہ قاضی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[3] یا "مَعَ ذٰلِكَ الْاِعْتِرَافِ" جیسا کہ امام زمخشری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔[4] اور جملہ حالیہ ہے۔ یعنی حال یہ ہے کہ بس اقرار

[1] تفسير النسفي (١١٠/٤) [2] تفسير القرطبي (٦٧/١٦) [3] تفسير البيضاوي (١٤١/٥) [4] الكشاف (٢٤٥/٤)

کے بعد، یا اس اعتراف کے ساتھ کہ خالق اللہ ہی ہے انھوں نے اس کے بندوں میں سے اس کا جز ٹھہرایا۔

"جعل" یہاں تصییر قولی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ٹھہرانا اور کر دینا "جزء" کا نفس الامری (حقیقی طور پر) نہیں ہے، صرف زبانی جمع خرچ ہے۔ معنی یہ ہیں کہ حکم کیا اور ثابت کیا یا نام رکھا اور اعتقاد کیا کہ اس کے بندے اس کا جزد ہیں۔ "جزء" سے مراد بیٹا ہے۔ ولد کا نام جو جزو رکھا تو اس سے منظور یہ بات بتانا ہے کہ جو معبود اپنی ذات میں واحد ہے، اس کے لیے جزو کا ہونا محال ہے، کیوں کہ "جزء" اس شے کی ہوتی ہے جو مرکب ہو اور مرکب واحد الذات نہیں ہوتا۔ نیز یہ بات ہے کہ جو مرکب ہوتا ہے، وہ اتصال وانفصال (مل جانا اور جدا کرنا)، اجتماع اور افتراق (اکٹھے ہونا اور علاحدہ ہونا) کو قبول کرتا ہے اور جو شے ایسی ہے تو وہ محدث ہوتی ہے، پس وہ الٰہ قدیم نہیں ہو سکتی ہے۔ (كذا قال الكرخي)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "جزء" بہ معنی "عدلا" ہے،[1] یعنی جو شے اللہ کے سوا پوجی گئی، اس کو اللہ تعالیٰ کا مثل اور ہمسر ٹھہرایا۔ امام زجاج اور مبرد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ "جزء" سے مراد بیٹیاں ہیں، کیوں کہ کفار فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اہلِ عربیت کے نزدیک کلمۂ "جزء" بنات ہیں۔ جب عورت بیٹیاں جنتی ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: "قَدْ أَجْزَأَتِ الْمَرْأَةُ" یعنی اس عورت نے بیٹیاں جنیں۔ اسی معنی سے شاعر کا قول ہے ؎

إِنْ أَجْزَأَتْ حُرَّةٌ يَومًا فَلَا عَجَبٌ قَدْ تُجْزِئُ الْحُرَّةُ الْمِذْكَارُ أَحْيَانَا

یعنی اگر کسی دن کوئی آزاد شریف عورت بیٹی جنے تو کچھ تعجب نہیں ہے، کیوں کہ جس آزاد عورت کی عادت لڑکے جننے کی ہے اتفاقاً کبھی وہ بھی بیٹی جن دیتی ہے۔

صاحبِ کشاف نے "جزء" کی تفسیر بنات کے ساتھ بدع تفسیر (یعنی نئی تفسیر خلاف محاورۂ عرب) سے ٹھہرائی ہے اور تصریح کی کہ یہ عرب پر جھوٹ باندھی گئی ہے۔[2] اس کا یوں جواب دیں گے کہ اس کو تو امام زجاج اور مبرد رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے اور یہ دونوں عربی زبان کے امام اور حافظ ہیں اور اس کی معرفت میں "جزء" کی تفسیر بنات کے ساتھ انہیں کی طرف منتہی ہوتی ہے۔ اس کی تائید یہ آیتیں کرتی ہیں جو آگے آتی ہیں: ﴿ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ ﴾ "کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے بیٹیاں تو خود رکھ لیں۔" نیز فرمایا: ﴿ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ﴾ "ان میں سے کسی کو جب اس چیز کی خبر دی جائے جس کی مثال اس نے (اللہ) رحمان کے لیے بیان کی ہے۔" نیز فرمایا: ﴿ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ﴾ "اور انھوں نے فرشتوں کو جو رحمان کے عبادت گزار ہیں عورتیں قرار دے لیا۔" کسی نے کہا کہ یہاں "جزء" سے مراد فرشتے ہیں، کیوں کہ کفار نے ان کو اللہ کی اولاد ٹھہرایا ہے۔ سبحانہ و تعالیٰ۔ یہ قول امام مجاہد اور حسن رحمہما اللہ کا ہے۔ امام ازہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ آیت کے یہ معنی ہیں: انھوں نے اللہ کے لیے اس کے بندوں میں سے نصیب ٹھہرایا اس معنی میں کہ انھوں نے ولدان

---

[1] تفسير الطبري (٥٧٨/٢١) [2] الكشاف (٢٤٥/٤)

سے اللہ کا نصیب (حصہ) ٹھہرایا۔[1] ﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ یعنی بے شک انسان جو قولِ مذکور کا قائل ہے، البتہ بڑا ہی صریح ناشکرا ہے، یعنی ظاہر الکفران ہے۔ کفران اور ناشکری میں مبالغہ کرنے والا ہے۔ جس پاک ذات کی قدرت اور انعام کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اس کی یہ قدر کی کہ اس کے لیے اولاد میں سے بدتر قسم ٹھہرائی، اس سے بڑھ کر اور کیا ناشکری ہو گی؟! کہا ہے کہ یہاں انسان سے مراد کافر ہے، کیوں کہ جو اس پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، ان کا کھلا انکار وہی کرتا ہے۔ پھر اللہ عزوجل نے ان کے قولِ مذکور کو رد کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ﴿16﴾ وَاِذَا
بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا
وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿17﴾ اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ
غَيْرُ مُبِيْنٍ ﴿18﴾ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ
اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْــَٔلُوْنَ ﴿19﴾ وَقَالُوْا
لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ اِنْ هُمْ اِلَّا
يَخْرُصُوْنَ ﴿20﴾

کیا اس نے ان میں سے جو وہ پیدا کرتا ہے (اپنے لیے تو) بیٹیاں بنا لیں اور تمھیں بیٹوں سے نواز دیا؟ ⑯ اور جب ان میں سے کسی کو اس (بیٹی پیدا ہونے) کی بشارت دی جاتی ہے جس کی اس نے رحمان کے لیے مثال بیان کی، تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے، جبکہ وہ غم سے بھرا ہوتا ہے ⑰ کیا (وہ اللہ کی اولاد ہے؟) جس کی زیور میں پرورش کی جاتی ہے اور وہ جھگڑے میں اپنی بات واضح نہیں کر پاتی ⑱ اور انھوں نے فرشتوں کو، جو رحمان کے بندے ہیں، (رحمان کی) بیٹیاں ٹھہرایا ہے۔ کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے؟ ان کی شہادت ضرور لکھی جائے گی اور ان سے (اس چیز کی) پوچھ گچھ ہو گی ⑲ اور انھوں نے کہا: اگر رحمان چاہتا تو ہم ان (جھوٹے معبودوں) کی عبادت نہ کرتے۔ انھیں اس کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ وہ تو صرف تیر تکے چلاتے ہیں ⑳

مشرکین کی ٹیڑھی تقسیم کا بیان:

یہ جو فرمایا کہ رحمان کے بندے یعنی بیٹیاں نہیں اور معلوم ہوا کہ فرشتے اگرچہ نہ مرد ہیں نہ عورت پر بولی مردانی بولی۔

[1] فتح القدير (٧١٨/٤) [2] فتح البيان (٣٢٩/١٢_٣٣٤)

انھیں اس کی کچھ خبر نہیں۔ یعنی یہ تو سچ ہے کہ اللہ کے بغیر چاہے کوئی چیز نہیں ہوتی پر اس کا بہتر ہونا نہیں نکلتا۔ اسی نے قوت (کھانا) بھی پیدا کی اور زہر بھی۔ زہر کون کھاتا ہے۔ (ترجمۂ قلمی میں یوں ہے: اس نے قوت بھی پیدا کیا اور زہر بھی) انتہی۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ ان پر انتہا درجے کا انکار (رد) ہے، پھر اللہ پاک نے تمام انکار کا ذکر کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴾ یعنی جب ان میں سے کسی کو اس شے کی خوش خبری دی جائے جس کو انھوں نے اللہ کے لیے ٹھہرایا ہے، یعنی بیٹیاں تو اس سے انتہا درجے کی عار کرے اور جس شے کی اسے خوش خبری دی گئی اس کی برائی کی وجہ سے اس کے چہرے پر رنج وکلفت چڑھ جائے اور اس کی ذلت کی وجہ سے قوم سے چھپتا پھرے۔ اللہ پاک فرماتا ہے: پھر جب تم اس سے عار کرتے ہو تو اللہ عزوجل کی طرف اس کی نسبت کیوں کرتے ہو؟!

پھر فرمایا: ﴿ اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ﴾ یعنی عورت ناقص ہوتی ہے، زیور پہنا کر اس کے نقص کو دور کیا جاتا ہے جب سے کہ وہ بچی ہوتی ہے، اور جب جھگڑتی ہے تو اپنے مافی الضمیر کو پورے طور پر ادا نہیں کر سکتی، بلکہ عاجز وبستہ دہن ہو جاتی ہے۔ بھلا جس کی یہ حالت ہو اس کی نسبت اللہ عظیم کی بارگاہ عالی جاہ کی طرف کس طرح کی جائے! پس عورت صورت اور معنی میں ظاہری اور باطنی طور پر ناقص ہے تو اس کے ظاہر اور شکل وصورت کا نقص تو زیور پہنا کر دور کیا جاتا ہے، جیسا کہ بعض شعرائے عرب نے کہا ہے۔

وَمَا الْحُلِيُّ إِلَّا زِيْنَةٌ مِنْ نَقِيْصَةٍ يُتَمِّمُ مِنْ حُسْنٍ إِذَا الْحُسْنُ قَصَّرَا
وَأَمَّا إِذَا كَانَ الْجَمَالُ مُوَفَّرًا كَحُسْنِكِ لَمْ يَحْتَجْ إِلَى أَنْ يُزَوَّرَا

یعنی نہیں ہے زیور مگر بناؤ ہے بسبب نقصان کے، وہ حسن کے نقصان کو پورا کرتا ہے جبکہ حسن نے کمی کی۔ اور جبکہ جمال بھرپور ہو، جیسا کہ تیرا حسن کامل ہے تو اس کی حاجت نہیں ہے کہ اس کی زیور سے آراستگی کی جائے۔

رہا نقص اس کے معنی کا تو وہ بدلہ لینے کے وقت بدلہ لینے سے ضعیف وعاجز ہے، نہ وہ اپنا مدعا ادا کر سکتی ہے نہ اس کو کچھ ہمت ہے، جیسا کہ بعض عرب نے کہا ہے جبکہ اس کو بیٹی کی خوش خبری دی گئی: "مَا هِيَ بِنِعْمَ الْوَلَدِ نَصْرُهَا بُكَاءٌ وَبِرُّهَا سَرِقَةٌ" (یعنی بیٹی کچھ اچھی اولاد نہیں ہے۔ مدد کرنا اس کا تو رو دینا ہے اور احسان ونیکی اس کی چوری ہے، یعنی نیک بیٹا تو اپنے مال سے ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہے اور بیٹی کا یہ حال ہے کہ جو کچھ ماں باپ کے گھر سے ہاتھ لگتا ہے چرا کر خاوند کے گھر لے جاتی ہے)۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ﴾ یعنی کفار نے فرشتوں کے بارے میں اعتقاد کیا کہ وہ عورت ہیں تو اللہ پاک نے ان کی اس بات کو رد کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ﴾ یعنی کیا انھوں نے ان کے پیدا کرنے کا مشاہدہ کیا ہے، اس حال میں کہ اللہ پاک نے ان کو عورت بنایا ہے۔ ﴿ سَتُكْتَبُ

شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ﴾ یعنی اس بات کی جو انھوں نے گواہی دی ہے اب لکھ رکھی جائے گی اور قیامت کے دن ان سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ یہ ان کے لیے ایک تہدیدِ شدید اور وعیدِ اکید ہے۔

﴿ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ﴾ یعنی اگر اللہ چاہتا تو ہمارے اور ان بتوں کی عبادت کے درمیان حائل ہو جاتا، کون سے بت؟ جو فرشتوں کی صورت پر ہیں، کون سے فرشتے؟ جو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، کیوں کہ وہ اس کو جانتا ہے اور ہم کو اس پر برقرار رکھتا ہے۔ کفار نے خطا کی بہت سی قسمیں جمع کیں: ایک خطا تو ان کا اللہ پاک کے لیے اولاد ٹھہرانا ہے، حالاں کہ وہ اس سے بالکل پاک اور مبرا ہے۔ دوسری خطا ان کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے بیٹوں پر بیٹیوں کو پسند کیا ہے، چنانچہ فرشتوں کو، جو رحمان کے بندے ہیں، عورت ٹھہرایا ہے۔ تیسری یہ ہے کہ باوجود اس سب کے ان کا بغیر کسی دلیل و برہان کے اور بغیر اللہ عزوجل کے اذن کے ان کو پوجنا ہے جو صرف اپنی رائے کاسد (کھوٹی رائے) اور خواہشِ فاسد سے اور اپنے سرداروں اور باپ دادوں کی تقلید سے اور جہلاء کی جاہلیت کے خبط سے کرتے ہیں۔

چوتھی خطا یہ ہے کہ انھوں نے اس پر ازروئے قدر کے تقدیر کے ساتھ حجت پکڑی، حالاں کہ اس حجت پکڑنے میں بڑی نادانی کی، اس لیے کہ اللہ پاک نے اس کی سخت تردید کی، کیوں کہ اس نے جب سے رسول بھیجے اور کتابیں نازل کیں تو وہ اپنی عبادت کا حکم دیتا ہے کہ اکیلے اسی کو پوجیں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور اپنے علاوہ کسی اَور کے پوجنے سے منع فرماتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۭ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴾ [النحل: ٣٦] ''ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ (لوگو!) صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمام معبودوں سے بچو۔ پس بعض لوگوں کو تو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور بعض پر گمراہی ثابت ہوگئی، پس تم خود زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا کچھ ہوا؟'' نیز اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٤٥] ''اور ہمارے ان نبیوں سے پوچھو! جنھیں ہم نے آپ سے پہلے بھیجا تھا کہ کیا ہم نے سوائے رحمان کے اور معبود مقرر کیے تھے جن کی عبادت کی جائے؟'' اور اس آیت میں ان کی حجت ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ﴿ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۤ ﴾ یعنی جو بات انھوں نے کہی اور جس کے ساتھ حجت پکڑی اس کی صحت کا ان کو کچھ علم نہیں ہے۔ ﴿ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴾ یعنی نہیں ہیں وہ مگر جھوٹ بولتے ہیں اور زبردستی باتیں بناتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: یعنی اس پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کو نہیں جانتے۔[1]

[1] تفسیر الطبري (٥٨٣/٢١) تفسیر ابن كثیر (١٥٧، ١٥٨)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ ﴾ میں تقریع وتوبیخ کا استفہام ہے اور کلمۂ ﴿ اَمْ ﴾ منقطعہ بہ معنی ہمزۂ انکار ہے اور بعض نے اس کی تقدیر "بل" انتقالی کے ساتھ کی ہے اور بعض نے بل و ہمزہ دونوں کے ساتھ کی ہے اور سب قول صحیح ہیں، اس لیے کہ اس میں تین مذہب ہیں، جیسا کہ امام ابوحیان رحمہ اللہ نے اس کو نقل کیا ہے۔

جملۂ ﴿ وَاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ﴾ ﴿ اِتَّخَذَ ﴾ پر معطوف ہے اور اس کے ساتھ انکار کے تحت میں داخل ہے۔ "اَصْفَاء" بہ معنی ایثار واخلاص ہے دیکھو جب تم کسی کو کسی شے کے ساتھ اختیار اور پسند کرو گے تو یوں کہو گے: "اِصْفَيْتُهٗ بِكَذَا" یعنی میں نے اس کو فلاں شے کے ساتھ اختیار کیا اور جب کسی کے ساتھ خالص اور صاف دوستی کرو گے تو کہو گے: "اِصْفَيْتُهُ الْوُدَّ" یعنی میں نے اس کے لیے خالص دوستی کی۔ اس آیت کی طرح یہ آیت ہے: ﴿ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴾ [النجم: ٢١۔ ٢٢] "کیا تمھارے لیے لڑکے اور اللہ کے لیے لڑکیاں؟ یہ تو اب بڑی بے انصافی کی تقسیم ہے۔" معنی یہ ہیں: کیا تم کہتے ہو کہ تمھارے رب نے اپنے لیے تو بیٹیاں ٹھہرائیں اور تم کو بیٹوں کے ساتھ خالص اور خاص کیا، پس دونوں قسموں میں سے جو ردی تھی وہ تو اپنی ذات کے لیے ٹھہرائی اور اُن میں سے فاضل (اعلیٰ) قسم تمھارے لیے ٹھہرائی۔

پھر ان کی ملامت میں اور زیادتی فرمائی: ﴿ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ﴾ یہ جملہ یا تو مستانفہ ہے یا حال ہے۔ ﴿ مَثَلًا ﴾ بہ معنی شبہ ومشابہ ہے عجیب وغریب صفت کے معنی میں نہیں ہے۔ اور صیغۂ مخاطب سے صیغۂ غائب کی طرف اس لیے التفات کیا کہ اس بات سے آگاہ کرنا مقصود ہے کہ ان کی برائیوں کا تقاضا ہے کہ ان سے اعراض کیا جائے اور ان کے غیر سے ان کو بیان کیا جائے، تاکہ وہ ان سے تعجب کریں۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے تو بیٹیاں رکھیں اور تم کو چن کر بیٹے دیے۔ لوگو! ان کی حماقت کو تو دیکھو اور اس سے تعجب کرو، کیوں کہ جو شے رحمان کے لیے ٹھہرائی ہے، اس کی حالت یہ ہے کہ جس وقت ان میں سے کسی کو یہ خوش خبری دی جاتی ہے کہ اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے تو اس خبر کو سن کر غمناک ہو جاتا ہے اور اس کا برا اثر اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے۔

یہی معنی ہیں اس قول کے کہ ﴿ ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا ﴾ یعنی لڑکی پیدا ہونے کے سبب سے اس کا چہرا کالا ہو جاتا ہے، اس وجہ سے کہ اس کے ہاں لڑکی کے بجائے لڑکا نہ ہوا۔ ﴿ وَهُوَ كَظِيْمٌ ﴾ جملہ حالیہ ہے۔ یعنی اس کا منہ سیاہ پڑ جاتا ہے، اس حال میں کہ وہ سخت رنجیدہ اور انتہائی بے قرار اور کبیدۂ خاطر اور بے چینی اور بے قراری سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كَظِيْمٌ ﴾ بہ معنی حزین ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: "مکروب" (بے چین)۔ کسی نے کہا ہے: "ساکت"۔

---

① تفسير القرطبي (٧١/١٦)

پھر ان کی ملامت اور توبیخ میں زیادتی فرمائی: ﴿ اَوَ مَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ ﴾ یعنی کیا اللہ کے لیے بیٹی ٹھہراتے ہیں، جس کی یہ ردی صفت ہے کہ وہ اپنی کمی کی وجہ سے زیور اور زینت کے ساتھ پالی جاتی ہے، کیوں کہ وہ اگر اپنی ذات میں خود کامل ہوتی تو زینت کے ساتھ تکلفاً کمال حاصل نہ کرتی۔ ''نشوء'' بہ معنی تربیت ہے، یعنی پالنا پرورش کرنا۔ ''حلية'' بہ معنی زینت اور کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ سے مراد ''أنثى'' ہے اور ہمزہ انکار کا ہے اور حرفِ واؤ جملہ محذوف پر عطف کے لیے ہے اور ﴿ مَنْ ﴾ محلِ نصب میں ہے، فعل محذوف کا مفعول ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''أَيَجْتَرِؤُنَ وَيَبْلُغُوْنَ الْغَايَةَ فِيْ إِسَاءَةِ الْأَدَبِ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَنْ يُنَشَّأُ فِي الْحِلْيَةِ'' یعنی کیا جراٴت کرتے ہیں اور بے ادبی میں غایت کو پہنچتے ہیں اور اللہ کے واسطے اسی ''أنثى'' کو ٹھہراتے ہیں جو زینت میں پالی جاتی ہے۔

جمہور نے ''يَنْشَأُ'' بہ فتح تحتیہ وسکون نون پڑھا ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ (امام ضحاک، ابن وثاب، حفص، حمزہ، کسائی اور خلف رحمہم اللہ) نے بہ ضمِ یاء وفتحِ نون وتشدیدِ شین پڑھا ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے پہلی قراءت کو اختیار کیا ہے اور امام ابو عبید رحمہ اللہ نے دوسری کو پسند فرمایا ہے۔ امام ہروی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ فعلِ اول کی بنا پر لازم ہے اور دوسرے کی بنیاد پر متعدی ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت کی تقدیر یہ ہے: ''وَيَجْعَلُوْنَ لَهُ مَنْ يَنْبُتُ فِي الزِّيْنَةِ'' یعنی اور اس کے لیے اس شخص کو ٹھہراتے جو زیور میں اُگتا ہے اور پرورش پاتا ہے۔

یہ معنی جمہور کی قراءت کی بنیاد پر ہیں۔ ثانی کی بنا پر یہ معنی ہیں کہ ''يُرَبّٰى وَيَكْبُرُ فِي الْحِلْيَةِ'' یعنی پرورش کی جاتی ہے اور بڑی ہوتی ہے زیور میں۔ امام ابن زید اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ وہ جو زیور میں پرورش کیا جاتا ہے، ان کے بت ہیں جن کو سونے اور چاندی سے گھڑا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ عورتیں ہیں۔ ان کے لباس اور مردوں کے لباس میں فرق کیا ہے اور وراثت میں اَن کو ناقص کیا اور گواہی میں بھی اور اُن کو گھر میں بیٹھنے کا حکم کیا اور ان کا نام خوالف رکھا۔[2]

پھر دوسری ردی صفت بیان فرمائی: ﴿ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ﴾ یعنی وہ اس بات سے عاجز ہے کہ اپنی ذات کے کام کے ساتھ قائم ہو اور جس وقت اس سے جھگڑا کیا جائے تو اپنی حجت کے قائم کرنے پر اور اپنے دعوے کو منوانے پر قادر نہ ہو اور جس کے ساتھ اس کا دشمن جھگڑتا ہے، اس کو اپنی عقل اور اپنی رائے کی کمزوری کے سبب سے دور نہ کر سکے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: بہت ہی کم ہے کہ کوئی عورت اپنی حجت کے ساتھ تکلم کرے، مگر وہ ایسی گفتگو کر بیٹھتی ہے کہ خود اس پر حجت قائم ہو جاتی ہے۔[3]

علامہ نسفی رحمہ اللہ کہتے ہیں اور جب وہ ضرورت پڑنے پر جھگڑنے والوں کے ساتھ دو زانو بیٹھے اور مردوں سے مقابلہ کرے تو غیر مبین ہوتی ہے، نہ اس کے پاس بیان ہوتا ہے نہ کوئی برہان لاتی ہے، یعنی اپنی عقل کی کمزوری کے

[1] تفسير القرطبي (٧٢،٧١/١٦) فتح القدير (٧١٩/٤) [2] الدر المنثور (٣٧٠/٧) [3] تفسير الطبري (٥٨٠/٢١)

باعث اپنا مطلب خوش بیانی سے ادا نہیں کر سکتی۔ آیت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ زیور میں پرورش پانے کو ایک عیب ٹھہرایا ہے تو مرد پر لازم ہے کہ زیور اور زینت سے بچے اور لباسِ تقویٰ سے متزین ہو۔[1] انتھٰی.

جملہ ﴿ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ﴾ حالیہ ہے اور ﴿ فِي الْخِصَامِ ﴾ میں ہو سکتا ہے کہ محذوف سے متعلق ہو جس پر مابعد دال ہے۔ تقدیر یہ ہے: "وَهُوَ لَا يَبِيْنُ فِي الْخِصَامِ" اور یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ مُبِيْنٍ ﴾ سے متعلق ہو اور مضاف الیہ کا ماقبل مضاف میں عمل کرنا جائز ہو، اس لیے کہ ﴿ غَيْرُ ﴾ بہ معنی "لا" ہے۔ (کما قال السمین) امام ابو السعود رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ ﴿ غَيْرُ ﴾ کی اضافت اس کے مابعد کے اس جار میں عمل کرنے کو منع نہیں کرتی جو اس پر متقدم ہے، اس لیے کہ ﴿ غَيْرُ ﴾ بہ معنی نفی ہے۔[2] انتھٰی.

پھر اللہ پاک نے کفار کی کفریات میں سے ایک اور نوع ذکر کی تو فرمایا: ﴿ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ﴾ یہاں "جعل" بہ معنی "اَلْقَوْلُ وَالْحُكْمُ عَلَى الشَّيْءِ" ہے، جس طرح تم یوں کہتے ہو: "جَعَلْتُ زَيْدًا أَفْضَلَ النَّاسِ" یعنی میں اس کا قائل ہوا کہ زید بہترین مردم ہے اور میں نے اس کے لیے اس کا حکم لگایا۔ اسی طرح اس جگہ ہے، یعنی انھوں نے نام رکھا اور حکم کیا اور اس بات کے قائل ہوئے کہ فرشتے عورت ہیں اور اپنے کفر میں تین کفر جمع کیے: ایک تو یہ ہے کہ اللہ پاک کی طرف اولاد کی نسبت کی۔ دوسرا یہ ہے کہ دونوں قسموں میں جو خسیس تر قسم تھی، اس کی نسبت اللہ کی طرف کی۔ تیسرا یہ ہے کہ اللہ پاک کے ملائکہ مکرمین کو عورت ٹھہرایا، چنانچہ ان کی سبکی کی۔

جمہور نے ﴿ عِبٰدُ ﴾ بہ جمع پڑھا ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی یہی پڑھا ہے اور باقی قراء نے "عِنْدَ الرَّحْمَانِ" بہ نونِ ساکنہ پڑھا ہے۔ پہلی قراءت کو امام ابو عبید رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، اس لیے کہ اس میں اسناد اعلیٰ ہے اور اس لیے کہ اللہ پاک نے جو ان کی تکذیب کی ہے تو ان کے اس قول میں کی ہے کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، چنانچہ ان کو یہ خبر دی کہ وہ اس کے بندے ہیں۔[3] علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وَهُوَ أَلْزَمُ فِي الْحِجَاجِ مَعَ أَهْلِ الْعِنَادِ لِتَضَادٌ بَيْنَ الْعُبُوْدِيَّةِ وَالْوِلَادَةِ.[4] انتھی" یعنی یہ عناد والوں کے ساتھ جھگڑنے میں بڑا الزام ہے، اس لیے کہ عبودیت اور ولادت کے درمیان تضاد ہے اور اس قراءت کی مؤید یہ آیت ہے: ﴿ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٢٦] ''بلکہ وہ سب اس کے باعزت بندے ہیں۔''

امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے دوسری قراءت کو اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس قراءت کی تصدیق یہ آیت کرتی ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ ﴾[5] [الأعراف: ٢٠٦] ''یقیناً جو تیرے رب کے نزدیک ہیں۔'' امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ

---

[1] تفسير النسفي (١١١/٤) [2] تفسير أبي السعود (٤٦/٨) [3] تفسير القرطبي (٧٢/١٦)
[4] تفسير النسفي (١١/٤) [5] تفسير القرطبي (٧٢/١٦)

میں اس حرف کو پڑھا کرتا تھا: "اَلَّذِیْنَ هُمْ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ إِنَاثًا"، پھر میں نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا تو فرمایا: ﴿ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ ﴾۔ میں نے عرض کی کہ وہ تو میرے مصحف میں ہے۔ فرمایا: اب اس کو مٹا دے اور اس کو ﴿ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ ﴾ لکھ۔[1]

پھر اللہ پاک نے اس پر ان کو ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ کی۔ فرمایا: ﴿ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ﴾ یہ شہادت بہ معنی حاضر ہونا ہے اور اضافت خلق کی مفعول کی طرف ہے، یعنی اللہ کا ان کو پیدا کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ کفار جو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے ہیں سو کیا یہ ان کے پیدا کرنے کے وقت حاضر تھے۔ اس میں ان کے ساتھ ٹھٹھا کرنا اور ان کو جاہل بنانا ہے۔ جمہور نے ﴿ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ ﴾ کو بہ ضمِ فوقیہ و بہ صیغۂ مجہول ورفع ﴿ شَهَادَتُهُمْ ﴾ پڑھا ہے اور سلمی وغیرہ (امام ابن سمیفع اور ہُبیرہ عن حفص) نے بہ نون و بہ صیغۂ معروف ونصب "شَهَادَتَهُمْ" پڑھا ہے اور امام ابو رجا رحمہ اللہ نے "شَهَادَتِهِمْ" بہ جمع پڑھا ہے،[2] یعنی اب ہم یہ شہادت ان کے نامۂ اعمال میں لکھیں گے، جس کے ساتھ انھوں نے گواہی دی ہے، تاکہ اس پر ہم ان کو جزا دیں۔

﴿ وَيُسْـَٔلُوْنَ ﴾ یعنی قیامت کے دن آخرت میں ان سے اس گواہی کا سوال ہوگا۔ یہ وعید ہے۔ امام سلیمان جمل رحمہ اللہ نے خطیب رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ امام کلبی اور مقاتل رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ جب کفار نے یہ بات کہی تو نبیِ مکرم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم کو یہ کس نے معلوم کرایا کہ وہ عورتیں ہیں؟ کہا: ہم نے اپنے باپوں سے سنا ہے اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ انھوں نے جھوٹ نہیں کہا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ﴾ یعنی آخرت میں اسی کے بارے میں ان سے سوال ہوگا۔[3] یہ اس بات پر دال ہے کہ کوئی قول بغیر دلیل کے منکر ہے اور تقلید حرام ہے اور موجبِ ذمِ عظیم ہے۔

تنبیہ:

بقاعی کہتے ہیں: جائز ہے کہ سین میں توبہ کی طرف استعطاف ہو اس بات کے لکھنے سے پہلے جو انھوں نے کہی اور ان کو اس کا کچھ علم نہیں، اس لیے کہ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ نبیِ مکرم ﷺ نے فرمایا: نیکیوں کو لکھنے والا مرد کے دائیں جانب پر ہے اور برائیوں کو لکھنے والا آدمی کی بائیں جانب پر ہے۔ اور نیکیوں کو لکھنے والا برائیوں کو لکھنے والے پر امین ہے۔ جب اس نے کوئی نیکی کی تو دائیں طرف والے نے اس کو دس گنا لکھ لیا اور جب اس نے کوئی برائی کی تو دائیں ہاتھ والے نے بائیں جانب والے سے کہا: اسے سات گھڑی چھوڑے رکھ، شاید وہ اللہ کی تسبیح کرے یا استغفار کرے۔[4] انتھی۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٨١/١٠) [2] تفسير القرطبي (٧٣/١٦) [3] تفسير البغوي (٢٠٩/٧)

[4] شعب الإيمان (٣٩٠/٥) تفسير البغوي (٣٥٩/٧) اس کی سند میں "جعفر بن زبیر" سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢٢٣٧)

اللہ پاک کے انعام کو اور اس کی مغفرت اور رحمت کو دیکھو کہ اپنے گناہ گار بندوں پر کس قدر ہے! اب اگر ہم خرافات بکنے کے بعد تسبیح اور استغفار نہ کریں تو ہمارا قصور ہے۔ غضب تو یہ ہے کہ ابلیس لعین نے ہم کو یہ دھوکا دے رکھا ہے کہ ہم جو واہیات بکتے ہیں اور لوگوں کی غیبت بغیر کسی شرعی ضرورت کے کرتے ہیں، اس کو برا نہیں سمجھتے، بلکہ نیکی سمجھتے ہیں تو اب کیوں مغفرت مانگیں۔ گناہ سمجھیں تو مغفرت مانگنے کا خیال ہو، نفس کے دھوکے سے اس کو شرعی ضرورت سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ واللہ باللہ! کوئی شرعی ضرورت نہیں ہے، بلکہ نری خواہشِ نفس ہے، ایسی باتوں سے مزہ آتا ہے، نقلِ مجلس ہے۔ اب ہم کو یہ لازم ہے کہ ابلیس لعین کتنے ہی شرعی ضرورت کے وسوسے دل میں ڈالے تو ہم اس کو سیہ (برائی) ہی سمجھیں اور حتی الامکان اس ذکر وفکر میں نہ پڑیں اور اگر ہو جائے تو ہر ذکر کے بعد استغفار کر لیا کریں، اس میں کیا برائی ہے۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو سیہ کا تو کچھ ذکر ہی نہیں۔ ہمارے حسنات خود سیہ سے بڑھے ہوئے ہیں۔ بہرحال کوئی ذکر ہو استغفار ضرور چاہیے، اسی لیے رحمۃ للعالمین نے کفارۂ مجلس کا حکم دیا ہے۔ اللھم غفرا وتوفیقاً.

پھر اللہ پاک نے ان کے کفر کی ایک اور قسم ذکر فرمائی: ﴿ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ﴾ یعنی استہزاء اور ٹھٹھا کے طور پر کہا کہ اگر تمھارے زعم کے مطابق رحمان فرشتوں کا پوجنا نہ چاہتا تو ہم ان فرشتوں کو نہ پوجتے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو اُن فرشتوں کی عدمِ عبادت کو نہ چاہا، اس سے انھوں نے اس بات پر استدلال کیا کہ ان کی عبادت کی ممانعت نہیں ہے، یا ان کی عبادت کرنا اچھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار نے کہا کہ اگر رحمان فرشتوں کا نہ پوجنا چاہتا تو ہم ان کو نہ پوجتے، حالاں کہ ہم نے ان کو پوجا تو معلوم ہوا کہ اس نے ہمارا فرشتوں کو پوجنا چاہا اور جب چاہا تو اس سے منع کرنا درست نہیں ہے اور ان کو پوجنا اچھا ہے، حالاں کہ ان کا یہ قول باطل ہے، اس لیے کہ مشیت تو بعض ممکنات کو بعض پر ترجیح دینا ہے، وہ ممکنات مامور ہوں (جن کا حکم دیا گیا) یا ممنوع ہوں، حسن ہوں یا غیر حسن۔ بالجملہ یہ ایک کلامِ حق ہے جس سے باطل کا ارادہ کیا ہے۔ اس کا بیان سورت انعام میں گزر چکا ہے۔

پھر اللہ پاک نے ان کی جہالت کا بیان کیا کہ ﴿ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ﴾ یعنی یہ بات جو انھوں نے کہی کہ اگر اللہ پاک ان کا فرشتوں کو پوجنا نہ چاہتا تو وہ ان کو نہ پوجتے سو اس کا ان کو کچھ علم نہیں ہے، بلکہ جہالت کے طور پر یہ بات کہی ہے اور جس بات کی صورت حق کی صورت ہے، اس سے باطل کا ارادہ کیا ہے اور یہ زعم کیا کہ جب اس نے چاہا تو وہ اس سے راضی ہوا۔ امام قتادہ، مقاتل اور کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ذلك" کا اشارہ اس قول کی طرف ہے: ﴿ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ﴾. امام مجاہد اور ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ذلك" کا اشارہ اوثان کی عبادت کی طرف ہے،[1] یعنی بتوں کے پوجنے کا ان کو کچھ علم نہیں ہے۔ پھر ان کے

---

[1] تفسير القرطبي (١٦/ ٧٣، ٧٤)

انتفائے علم کا یہ بیان فرمایا: ﴿ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴾ یعنی وہ اس بات میں صرف جھوٹ بولتے ہیں جو انھوں نے کہی اور باطل طور پر تکلف کرتے ہیں۔

نکتہ:

یہاں تو ﴿ يَخْرُصُوْنَ ﴾ فرمایا اور سورۃ الجاثیہ میں ﴿ يَظُنُّوْنَ ﴾ [الجاثية: ٢٤] فرمایا۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ یہاں تو اس مضمون سے متصل ہے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور اللہ نے ہم سے ان کا پوجنا چاہا ہے، حالانکہ یہ جھوٹ ہے، چنانچہ اس کے مناسب ﴿ يَخْرُصُوْنَ ﴾ ہوا اور وہاں کی آیت اس مضمون سے متصل ہے کہ انھوں نے صدق کو کذب کے ساتھ خلط کیا ہے، کیوں کہ ان کا یہ کہنا: ﴿ نَمُوْتُ وَنَحْيَا ﴾ سچ ہے اور بعث کا انکار کیا اور کہا: ﴿ وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ﴾ یہ جھوٹ ہے، لہٰذا اس کے لیے ﴿ يَظُنُّوْنَ ﴾ مناسب ہوا، یعنی اپنے قول میں شک کرتے ہیں۔ فرقۂ معتزلہ نے اس آیت کے ظاہر سے اپنے اس مذہب پر استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافر سے کفر نہیں چاہا جو چاہا پس وہ ایمان ہے۔

ان کی دلیل یہ ہے کہ دیکھو کفار نے یہ دعویٰ کیا کہ اللہ نے ان سے کفر چاہا اور بتوں کی عبادت کو چھوڑ دینا نہیں چاہا، اس لیے کہ انھوں نے یوں کہا: ﴿ لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ﴾ یعنی اگر اللہ ہم سے ترکِ عبادتِ اصنام چاہتا تو ہم کو ان کے پوجنے سے روک دیتا، لیکن اس نے ہم سے بتوں کا پوجنا چاہا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے قول و اعتقاد کو ان پر یوں رد کیا کہ ﴿ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴾ یعنی وہ جھوٹ بولتے ہیں جب اللہ پاک نے ان کے قول کی تکذیب کی تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کافر سے کفر نہیں چاہا۔ اہلِ سنت ۔کثرهم الله تعالیٰ وأیدهم ونصرهم وأعلی کلمتهم۔ فرماتے ہیں ہمارے نزدیک آیت کے معنی یہ ہیں کہ کفار کی مشیت سے رضا مراد ہے۔ انھوں نے یوں کہا کہ اگر اللہ اس سے راضی نہ ہوتا تو جلد ہم کو سزا دے دیتا، یا مقہور و مضطر کر کے ہم کو فرشتوں کے یا بتوں کے پوجنے سے روک دیتا اور جب اس نے یہ نہ کیا تو مقرر وہ اس سے راضی ہوا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر یوں رد فرمایا: ﴿ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ... الآية ﴾ یا یہ معنی ہیں کہ کفار نے یہ بات بطور استہزاء کہی، ارادے اور اعتقاد سے نہیں کہی۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ان کو کاذب کہا اور جاہل قرار دیا، اس لیے کہ انھوں نے یہ بات اعتقاد سے نہیں کہی۔ دیکھو اس کی نظیر یہ بات ہے جس کی اللہ پاک نے کفار کی طرف سے خبر دی ہے: ﴿ اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ﴾ [يٰس: ٤٧] ”ہم انھیں کیوں کھلائیں؟ جنھیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا پلا دیتا۔“ حالانکہ یہ بات اصل میں حق ہے لیکن جب انھوں نے بطور استہزاء کہی تو اللہ پاک نے اس میں ان کی یوں تکذیب فرمائی: ﴿ اِنْ اَنْتُمْ

﴿اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ [یٰس: ٤٧] ''تم تو ہو ہی کھلی گمراہی میں۔'' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی طرف سے یہ بات نقل کی: ﴿قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ﴾ ''کہیں کہ ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں۔'' فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ﴾ [المنافقون: ١] ''اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعاً جھوٹے ہیں۔'' یہ اس لیے فرمایا کہ انھوں نے یہ بات اعتقاداً نہیں کہی تھی۔ یہ مضمون علامہ نسفی رحمہ اللہ کا ہے۔①

اہلِ سنت کا مذہب یہ ہے کہ ساری کائنات کی طاعت، معصیت، کفر اور ایمان اللہ پاک کے ارادے اور مشیت سے ہے اور بندوں کے افعال سے جو طاعت ہے تو وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی مشیت، ارادے، قضا، قدر، رضا، محبت اور امر سے ہے اور جو اُن میں سے معصیت ہے تو وہ اس کی مشیت، ارادے، قضا اور قدر سے ہے اور اس کے امر، رضا اور محبت سے نہیں ہے۔ معتزلہ کا قول یہ ہے کہ معاصی اللہ تعالیٰ کے ارادے ومشیت سے نہیں ہے، بلکہ اس کی کراہت سے ہیں۔ (كذا في شيخ زاده)

اہلِ سنت کے علماء نے ان کے دلائل کے خوب مفصل جواب دیے ہیں جو کتبِ مبسوط میں لکھے ہوئے ہیں۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کفار نے مشیت کو اپنے لیے اس شے میں حجت ٹھہرایا جس کو اپنے اختیار سے کیا اور یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کو سزا نہ دے گا اس شے پر جس کو انھوں نے اس کی مشیت سے کیا اور اپنے نفوس کو اس میں معذور ٹھہرایا۔ چنانچہ اللہ پاک نے ان پر اس بات کا یوں رد فرمایا:②

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿٢١﴾ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿٢٢﴾ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿٢٣﴾ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ۭ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿٢٤﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٢٥﴾

یا ہم نے انھیں اس سے پہلے کوئی کتاب دی ہے، سو وہ اسے مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں؟ ﴿21﴾ (نہیں) بلکہ انھوں نے کہا: بلاشبہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا اور بے شک ہم تو انھی کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں ﴿22﴾ اور اسی طرح آپ سے پہلے ہم نے جس بستی میں

① تفسير النسفي (١١١/٤، ١١٢) ② تفسير النسفي (١١٢/٤) فتح البيان (٣٣٤/١٢_٣٣٧)

بھی کوئی ڈرانے والا بھیجا، تو ان کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا: بلاشبہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا، اور ہم تو انھی کے نقشِ قدم کی پیروی کرنے والے ہیں ﴿23﴾ نبی نے کہا: اگرچہ میں تمھارے پاس اس سے زیادہ راستی کا طریقہ لایا ہوں جس پر تم نے اپنے باپ دادوں کو پایا؟ وہ کہنے لگے: یقیناً تمھیں جس کے ساتھ بھیجا گیا ہے، ہم تو اس کا انکار کرتے ہیں ﴿24﴾ چناں چہ ہم نے ان سے انتقام لیا، پھر دیکھیے جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا؟ ﴿25﴾

مشرکوں کے پاس شرک کی کوئی دلیل نہیں ہے:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مشرکوں نے جو غیر اللہ کو بغیر کسی دلیل و برہان و حجت کے پوجا، تو اللہ پاک اس بارے میں ان پر اس طرح انکار فرماتا ہے: کیا ہم نے ان کے شرک کرنے سے پہلے ان کو کوئی کتاب دی ہے تو وہ اس کے ساتھ اس بات میں مضبوطی کرنے والے ہیں، جس میں وہ مبتلا ہیں۔ یعنی بات اس طرح نہیں ہے، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ﴾ [الروم: ٣٥] ''کیا ہم نے ان پر کوئی دلیل نازل کی ہے جو اسے بیان کرتی ہے جسے یہ اللہ کے ساتھ شریک کر رہے ہیں۔'' یعنی یہ نہیں ہوا۔

پھر فرمایا: ﴿ بَلْ قَالُوْۤا اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ ﴾ یعنی جس شرک میں وہ گرفتار ہیں اس میں ان کے پاس سوائے باپ دادوں کی تقلید کے کوئی سند نہیں ہے، اس طرح سے کہ وہ ایک امت، یعنی دین پر تھے۔ اور اس آیت میں فرمایا: ﴿ وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ﴾ [المؤمنون: ٥٢] ''یقیناً تمھارا یہ دین ایک ہی دین ہے۔'' اور ان کا یہ قول ﴿ وَاِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ ﴾ أَيْ: وَرَائِهِمْ ﴿ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ ان کی طرف سے ایک بے دلیل دعویٰ ہے۔

پھر اللہ پاک نے بیان کیا کہ جو بات ان کافروں نے کہی، ویسی ہی بات پہلی اُمتوں کے کافر پہلے کہہ چکے ہیں۔ جنھوں نے رسولوں کی تکذیب کی ہے، ان کے دل ایک دوسرے کے مشابہ ہوئے ہیں، چنانچہ انھوں نے بھی ان ہی جیسی بات کہی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ مَاۤ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿52﴾ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴾ [الذاريات: ٥٢۔ ٥٣] ''اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں ان کے پاس جو بھی رسول آیا انھوں نے کہہ دیا کہ یا تو یہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔ کیا یہ اس بات کی ایک دوسرے کو وصیت کرتے گئے ہیں (نہیں)، بلکہ یہ سب کے سب سرکش ہیں۔'' اسی طرح اللہ پاک نے یہاں فرمایا ہے: ﴿ وَكَذٰلِكَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴾۔

پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ۚ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ

بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴾ (حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے قراءت بہ صیغۂ امر اختیار کی ہے) یعنی اے محمد! تو ان مشرکوں سے کہہ کہ اگر میں تم کو اس سے زیادہ سوجھ کی راہ بتا دوں، جس پر تم نے اپنے باپ دادوں کو پایا تو وہ یہی کہنے لگیں کہ ہم تو تمھارے ساتھ بھیجی ہوئی چیز کو نہیں مانتے، یعنی اگر وہ اس شے کی صحت کو جان لیتے اور اس پر یقین بھی کر لیتے جو تو ان کے پاس لایا ہے تو بھی وہ اس کے مطیع اور فرماں بردار نہ ہوتے، اپنے برے ارادے کی وجہ سے اور حق اور اہلِ حق کے ساتھ مکابرہ (مقابلہ) کرنے کی وجہ سے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ﴾ یعنی پھر ہم نے طرح طرح کا عذاب کر کے جھٹلانے والی اُمتوں سے بدلہ لیا جس طرح کہ اللہ سبحانہ نے ان کے قصوں میں اس کی تفصیل فرمائی ہے۔ ﴿ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴾ یعنی تو دیکھ کہ وہ کیسے ہلاک ہو کر مٹی ہو گئے اور کس طرح اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو نجات دی۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ کلمۂ ﴿ اَمْ ﴾ منقطعہ بہ معنی "بَلْ"، و ہمزۂ استفہام انکاری ہے اور ﴿ مِنْ قَبْلِهٖ ﴾ کی ضمیر قرآن شریف کی طرف راجع ہے، یعنی بلکہ کیا ہم نے قرآن سے قبل ان کو کوئی کتاب دی ہے جس میں ان کا یہ مدعا ہے کہ غیر اللہ کو پوجیں، چنانچہ وہ اس شے میں سے یہ بات لیتے ہیں اور اس سے حجت پکڑتے ہیں اور اس کو اپنے لیے دلیل ٹھہراتے ہیں۔ ہرگز ان کو کوئی ایسی کتاب نہیں دی۔ پہلے یہ کہا تھا کہ ان کے پاس اپنے دعوے پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے۔ پھر اس سے انتقال کر کے (پھر کر) اب یہ فرمایا کہ کوئی نقلی دلیل بھی نہیں ہے۔ کسی نے کہا: ﴿ مِنْ قَبْلِهٖ ﴾ کی ضمیر ان کے دعوے کی طرف پھرتی ہے، یعنی کیا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے، ان کے دعویٰ کرنے سے پہلے جو اس شے کی صحت پر گواہ ہو جس کے وہ مدعی ہیں۔ کسی نے کہا: کلمۂ ﴿ اَمْ ﴾ معادل (برابر، مساوی) ہے "أشهدوا" کا، تو اب متصلہ ہوگا۔ معنی یہ ہیں: کیا وہ فرشتوں کے پیدا کرنے کے وقت حاضر ہوئے، یا ہم نے ان کو اس دعوے کے قبل کوئی کتاب دی ہے جس میں یہ ہے کہ فرشتے عورت ہیں؟ یہ قول معنی وسیاق سے بعید ہے۔[2] (كما أفاده الشهاب) چنانچہ زیادہ راجح اور بہتر قول پہلا ہے جس کی طرف اکثر مفسرین گئے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ ان کے ہاتھ میں نہ کوئی حجت ہے نہ شبۂ حجت، لیکن انھوں نے گمراہی میں اپنے باپ دادوں کی پیروی کی ہے۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ یعنی بلکہ بولے کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے اور مذہب پر پایا ہے اور ہم ان کے قدموں پر چل کر ان سے راہ پانے والے

[1] تفسیر ابن کثیر (١٥٨/٤، ١٥٩) [2] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٤٣٧/٧، ٤٣٨)

ہیں اور وہ غیر اللہ کو پوجا کرتے تھے اب اس کا اقرار کر لیا کہ ان کے پاس کچھ سند نہیں ہے۔ نہ تو صاف ظاہری طور پر اور نہ عقل کی رو سے اور نہ سمع و بیان کی رو سے، سوائے اپنے گمراہ باپ دادوں کی تقلید کے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اُمَّةٍ ﴾ بہ معنی طریقہ اور دین ہے۔ اسی کے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ قائل ہیں۔ جوہری رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ اُمَّةٍ ﴾ کے معنی طریقہ اور دین ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''فُلَانٌ لَا أُمَّةَ لَهُ وَلَا نحلة'' یعنی اس کا کوئی دین نہیں ہے، اسی معنی میں قیس بن حطیم کا شعر ہے:

وَكُنَّا عَلَى أُمَّةِ آبَائِنَا وَنَقْتَدِيْ بِالْأَوَّلِ الْأَوَّلِ

امام فراء رحمہ اللہ وقطرب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی قبلہ ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی استقامت ہے اور سند میں نابغہ کا قول پڑھا:

حَلَفْتُ فَلَمْ أَتْرُكْ لِنَفْسِكَ رِيْبَةً وَهَلْ يَأْثَمَنْ ذُوْ أُمَّةٍ وَهُوَ طَايِعٌ

یعنی میں نے قسم کھا لی تو اب میں نے تیرے جی کے لیے کوئی شک نہیں چھوڑا اور آیا گناہ گار ہوتا ہے صاحب استقامت اور راستی کا اس حال میں کہ وہ مطیع ہو۔

جمہور نے ﴿ اُمَّةٍ ﴾ کو بہ ضم ہمزہ پڑھا ہے اور امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے اور عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے بہ کسرِ ہمزہ پڑھا ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''إِمَّةٌ'' بالکسر نعمت ہے اور نیز ''إِمَّةٌ'' ایک لغت ہے ''أُمَّةٌ'' میں۔ اسی معنی سے عدی بن زید (یہ عدی نعمان بن منذر کا مصاحب ہے۔ یہ شعر اس کے اشعارِ پند آمیز میں سے ہے۔ کہتا ہے کہ پھر بعد فیروزی، ملک، سلطنت اور گروہ و جماعت کے چھپا لیا ان کو وہاں قبروں نے۔ یہاں شاید ''إِمّة'' بالکسر مروی ہوگا، ورنہ ﴿ اُمَّةٍ ﴾ بالضم بھی درست ہے۔ یہاں امت کے معنی گروہ کے بن سکتے ہیں اور اگر اس کو ''لَأَمَةٌ'' بہ معنی سلاح کہیں تو بھی معنی ٹھیک بن سکتے ہیں۔ شاید یہ بھی روایت ہو۔ واللّٰہ أعلم) کا یہ قول ہے:

ثُمَّ بَعْدَ الْفَلَاحِ وَالملك وَالإِمَّةِ وَأرتهم هُنَاكَ الْقُبُوْر [1]

(سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ''أَمَّةٍ'' بالفتح پڑھا ہے۔ ''أَمَّةٍ'' بالفتح ''مَرَّةٌ مِنَ الْأَمِّ'' ہے اور مراد اس سے قصد و حال ہے۔ ذکرہ السمین امام سمین رحمہ اللہ نے جوہری رحمہ اللہ سے یوں نقل کیا ہے کہ ''إمة'' بالکسر طریقہ حسنہ ہے، ایک لغت ہے ''أُمَّةٌ'' بالضم میں)۔[2] غرضیکہ ﴿ اُمَّةٍ ﴾ ماخوذ ہے ''أَمَّ'' بہ معنی ''قَصَدَ'' سے۔ چنانچہ ﴿ اُمَّةٍ ﴾ وہ طریقہ ہوا جس کا قصد کیا جاتا ہے۔ خازن نے اس آیتِ کریمہ کی تفسیر کے تحت کہا ہے کہ انھوں نے خود کو مہتدین ٹھہرایا، اپنے باپ داداوں کی پیروی کرنے اور بغیر کسی حجت کے ان کی تقلید کرنے

---

[1] تفسیر القرطبي (٧٤/١٦، ٧٥) فتح القدير (٧٢١/٤)
[2] اللباب في علوم الكتاب (٢٤٩/١٧)

کے سبب سے۔[1] انتھیٰ. مفتی امام ابو السعود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ نہ کوئی عقلی حجت لائے اور نہ نقلی، بلکہ اس بات کا اقرار کیا کہ ان کے لیے سوائے اپنے جاہل باپ دادوں کی تقلید کے کوئی سند نہیں ہے، وہ باپ دادا بھی ان کے مثل ہیں۔[2] انتھیٰ.

نکتہ:

یہاں تو ﴿ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ کہا اور بعد میں ﴿ مُّقْتَدُوْنَ ﴾؟ اس کی یہ وجہ ہے کہ پہلا تو ان کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جھگڑنے میں اور اس کا دعویٰ کرنے کے دوران میں واقع ہوا کہ ان کے آباء مہتدین تھے اور وہ خود اپنے آباء کی طرح مہتدین ہیں تو اس کے مناسب حال ﴿ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ ہوا اور دوسرا ایک قوم سے حکایت کے طور پر واقع ہوا، جنھوں نے اپنے آباء کی اقتدا کا دعویٰ کیا تھا نہ کہ "اهتداء" کا تو اس کے لیے ﴿ مُّقْتَدُوْنَ ﴾ مناسب ہے۔ (أفاده الكرخي)

بالجملہ پھر اللہ پاک نے یہ خبر دی کہ ان کے سوا اور کفار اس بات کی طرف سبقت کر چکے ہیں اور اس کے قائل ہوئے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ ﴾ یعنی امر ویسا ہے جو مذکور ہوا کہ حجت سے عاجز ہوئے اور تقلید سے تمسک کیا اور قولہ تعالیٰ: ﴿ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴾۔ "ذلك" کا استیناف مبین ہے، اس بات پر دال ہے کہ ان کی آپس میں تقلید ایک قدیم گمراہی ہے، ان کے اسلاف کے لیے بھی سوائے تقلید کے اور کوئی سند نہ تھی۔[3] (كما قاله أبو السعود)

امام کرخی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے اور اس بات پر دلالت ہے کہ اس جیسی بات میں تقلید کرنا ایک پرانی گمراہی ہے اور اُن سے پہلے لوگوں کے لیے بھی کوئی سند نہیں تھی جس کی طرف نظر کی جائے۔ "مُتْرَفِيْنَ" کا ذکر خاص کر کے اس لیے کیا کہ منظور یہ بات بتانا ہے کہ "تنعم" (نعمتیں اور آسودہ حالی) موجب بطر (اترانا، گھمنڈ کرنا) کا ہوا اور اسی نے ان کو نظر وغور سے تقلید کی طرف پھیرا۔ انتھیٰ۔ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ آیت تسلی ہے واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور بیان ہے اس بات کا کہ تقلید آباء ایک قدیم بیماری ہے۔[4] انتھیٰ۔

"مُتْرَفُوْنَ" سے مراد غنی، رئیس، سردار اور آسودہ حال لوگ ہیں، یہ "مُتْرَف" کی جمع ہے اور "إِتْرَافٌ" سے اسم مفعول ہے۔ "أَتْرَفَتْهُ النِّعْمَةُ" کے معنی یہ ہیں کہ نعمت نے اس کو متکبر اور سرکش کر دیا۔ "تَرِفٌ كَفَرِحٌ" بہ معنی "تنعم" ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مُّقْتَدُوْنَ ﴾ بہ معنی "مُتَّبِعُوْنَ" ہے۔[5]

امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اگر کتاب اللہ میں تقلید کے غلط ثابت کرنے کے لیے صرف یہی

---

[1] تفسير الخازن (١٣٣/٦) [2] تفسير أبي السعود (٤٣/٨) [3] تفسير أبي السعود (٤٤/٨)
[4] تفسير النسفي (١١٢/٤) [5] تفسير الطبري (٥٨٧/٢١) تفسير القرطبي (٧٥/١٦)

آیتیں ہوتیں تو کافی تھیں۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ یہ کفار جس شے کی طرف گئے، اسے ثابت کرنے کے لیے نہ تو انھوں نے کوئی نقلی دلیل پکڑی اور نہ عقلی دلیل۔ پھر یہ بیان فرمایا کہ وہ جو اس طرف گئے تو یہ صرف آباء و اسلاف کی تقلید تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو ان معانی کا ذکر فرمایا ہے تو یہ مذمت اور تہجین (ذلیل کرنے) کے لیے ہے۔ یہ اس پر دال ہے کہ تقلید کی بات کرنا باطل ہے۔ اور عقلی لحاظ سے بھی جو باتیں اس پر دال ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ تقلید ایک ایسا امر ہے جو باطل اور حق کے درمیان مشترک ہے اور یہ اس لیے ہے کہ جس طرح اس گروہ میں ایک قوم مقلدہ سے حاصل ہوئی ہے، اسی طرح ان کی مخالفت کے لیے اقوامِ مقلدہ سے حاصل ہوئی ہیں۔

پس اگر تقلید حق ہوتی تو کسی چیز کا اور اس کی متضاد چیز کا حق ہونا واجب ہوتا، حالاں کہ یہ بات معلوم ہے کہ یہ باطل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کیا کہ جو بات تقلید کی طرف بلاتی ہے یا اس کا باعث ہوتی ہے، وہ یہی طیباتِ دنیا میں سے نعمتوں اور آسایشوں کی محبت ہے اور سستی، کاہلی اور بے کاری کی محبت ہے اور غور و فکر اور استدلال پر تحمل کرنے سے دشمنی ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَآ ﴾ اور مترفین وہی ہیں جن کو نعمتوں نے گھمنڈ میں ڈال دیا اور متکبر اور سرکش بنا دیا ہے، لہٰذا وہ انھیں شہوات اور کھیل کود کو دوست رکھتے ہیں اور طلبِ حق میں محنت و مشقت اٹھانے کو ناپسند کرتے ہیں۔[1] انتہی.

شیخنا وسیدنا ابو الوفاء الصدیق رحمہ اللہ فتح البیان میں فرماتے ہیں کہ فقہاء و اہلِ نظر میں سے ایک جماعت نے نظری و عقلی حجتوں سے اس شخص پر حجت قائم کی ہے جس نے تقلید کو جائز رکھا ہے۔ ان میں سے وہ دلیل ہے جو حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے اور میں اس کو یہاں ذکر کرتا ہوں۔ حافظ صاحب نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی مقدمے کا تقلید سے فیصلہ کیا اس سے یوں کہیں کہ کیا تمھارے لیے اس فیصلے کے لیے کوئی حجت ہے؟ پھر اگر وہ کہے کہ ہاں تو تقلید باطل ہوگئی، کیوں کہ اس کے نزدیک اس حکم کا موجب حجت ہوئی نہ کہ تقلید۔ اور اگر وہ کہے کہ میں نے اس کا فیصلہ بغیر دلیل و حجت کے کیا تو اس سے کہیں گے، پھر تم نے خون کیوں بہائے، شرمگاہیں کیوں مباح کیں اور مال کیوں تلف کیے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حجت کے بغیر حرام کیا ہے۔ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ إِنْ عِندَكُم مِّن سُلْطَٰنٍۭ بِهَٰذَآ ﴾ [یونس: ٦٨] "تمھارے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں۔" "أَيْ: مِنْ حُجَّةٍ بِهَذَا"

چنانچہ جب وہ یوں کہے: میں جانتا ہوں کہ واقعی میں صواب (صحیح فیصلے) کو پہنچا، اگرچہ میں نے حجت نہیں پہچانی، اس لیے کہ میں نے تو بہت سے علماء کی تقلید کی ہے اور وہ نہیں کہتے مگر حجت سے جو مجھ پر پوشیدہ رہی ہے تو اس سے کہیں گے کہ جب تیرے معلم کی تقلید جائز ہوئی، اس لیے کہ وہ صرف حجت سے کہتا ہے جو تجھ پر مخفی رہی ہے تو

[1] تفسير الرازي (١٧٧/٢٧)

تیرے معلم کے معلم کی تقلید تو زیادہ صحیح ہوئی، اس لیے کہ وہ نہیں کہتا ہے مگر حجت سے جو تیرے معلم پر مخفی رہی جس طرح کہ تیرے معلم نے نہیں کہا، مگر حجت سے جو تجھ پر مخفی رہی۔

اب اگر وہ کہے کہ ہاں تو اس نے اپنے معلم کی تقلید کو چھوڑا اور اپنے معلم کے معلم کی تقلید کی اور اسی طرح اس شخص کا حال ہے جو اس سے اوپر کے درجے میں ہے، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب تک انتہائی امر ہو گا اور اگر وہ اس کا انکار کرے تو اپنے قول کو توڑے گا اور اس سے کہیں گے کہ اس شخص کی تقلید کیسے جائز ہے جو علم میں کم تر ہے، حالاں کہ اس کی تقلید جائز نہ ہو جو علم میں کبیر تر اور اکثر ہے، حالاں کہ یہ تناقض (متضاد، ایک دوسرے کی ضد) ہے۔

پھر اگر وہ کہے کہ یہ اس لیے ہوا کہ میرا معلم گو صغیر تر ہے، اس نے اپنے علم کے ساتھ اس شخص کا علم جمع کیا ہے جو اس سے بلند مرتبہ ہے، چنانچہ جو بات اس نے لی ہے، اس کی اسے خوب بصیرت ہے اور جو بات اس نے چھوڑی ہے، اسے خوب جانتا ہے تو اس سے کہیں گے اور اسی طرح وہ شخص ہے جس نے تیرے معلم سے سیکھا ہے، چنانچہ اس نے اپنے علم کے ساتھ تیرے معلم کا علم اور اس سے بلند درجے والے کا علم جمع کیا ہے تو اب اسے لازم ہے کہ اس کی تقلید کرے اور تیرے معلم کی تقلید چھوڑ دے اور اسی طرح تو اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اپنے معلم کی نسبت خود اپنی تقلید کرے، کیوں کہ تو نے اپنے علم کے ساتھ اپنے معلم کا علم جمع کیا ہے اور اس شخص کا علم جو اس سے بلند درجے کا ہے، چنانچہ اگر اس نے اپنے قول کی تقلید کی تو صغیر تر کو اور چھوٹے چھوٹے علماء کو جو پیدا ہوتے جائیں گے، تقلید کے لیے زیادہ صحیح ٹھہرایا بہ نسبت رسول اللہ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کے۔

اسی طرح جو مصاحب اس کے پاس ہے، اس کو تابع کی تقلید لازم ہے اور تابع کو اپنے سے نچلے درجے والے کی اور اعلیٰ کو ادنیٰ کی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور جس قول کا نتیجہ یہ نکلے، وہ تضاد اور فساد کے لیے کافی ہے۔ امام ابو عمرو رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اہلِ علم ونظر نے کہا ہے کہ علم کی حد تبیین ہے اور ادراک ہے معلوم کا ''علی ما ھو بہ''۔ چنانچہ جس شخص کو شے ظاہر ہو گئی تو اس نے اس کو یقیناً جان لیا، کہا: اور مقلد کو کچھ علم نہیں ہے۔ اس بارے میں اختلاف نہیں کیا ہے۔ واللہ أعلم۔ اسی جگہ کے مناسب حال تجری نے یہ شعر کہے ہیں:

عَرَفَ الْعَالِمُوْنَ فَضْلَكَ بِالْعِلْمِ ۔۔۔ وَقَالَ الْجُهَّالُ بِالتَّقْلِيْدِ

وَأَرَى النَّاسَ مُجْمِعِيْنَ عَلَى فَضْلِكَ ۔۔۔ مِنْ بَيْنِ سَيِّدٍ وَّمَسُوْدِ

ابو عبد اللہ بن خواز منداد بصری مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شرع میں تقلید کے معنی شریعت کے معاملے میں ایک ایسے قول کی طرف رجوع ہونا ہے جس کے قائل کے پاس کوئی حجت نہیں ہے اور شریعت میں اس سے منع کیا گیا ہے اور اتباع وہ ہے جس پر حجت ثابت ہوئی۔ اور اپنی کتاب میں دوسری جگہ پر یوں کہا ہے کہ ہر وہ شخص جس کے قول کا تو

نے اتباع کیا بغیر کسی دلیل کے جو اس کے قول کو ماننا واجب کرے، تو تو اس کا مقلد ہے۔ اور اللہ کے دین میں تقلید کرنا صحیح نہیں ہے۔ اور ہر وہ شخص جس کے قول کو ماننے پر تجھے دلیل نے مجبور کیا تو اس کا متبع ہے۔ اور دین میں اتباع کرنا ''مُسَوَّغ'' (لازم، آسان کیا گیا) ہے اور تقلید ممنوع ہے۔ انتہٰی. ابن الحارث رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ واللہ! یہ دین کامل اور عقل راجح ہے، نہ کہ اس شخص کی طرح جو ہذیان بکتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے قول کو دلوں میں بہ منزلہ قرآن نازل کرے۔[1] انتہٰی.

بالجملہ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ ان پر یوں رد کریں: ﴿ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ﴾ یعنی تو کہہ: کیا تم اپنے باپ دادوں کی پیروی کرو گے اور ان کی تقلید کرو گے، اگرچہ میں تم کو ایک ایسا دین لا دوں جو تمھارے باپ دادوں کے دین سے زیادہ راہ بتانے والا ہو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تو ان سے کہہ کہ اگرچہ میں تمھارے پاس تمھارے باپ دادا کے دین سے زیادہ اچھی راہ بتانے والی شے لے آؤں تو تم پھر بھی اسی شے کی پیروی کرو گے جس پر تم نے اپنے آباء کو پایا، یعنی وہ گمراہی جس میں ہدایت کی کوئی بات نہیں ہے۔

جمہور نے ''قُلْ'' بہ صیغہ امر پڑھا ہے اور ابن عامر و حفص رحمہما اللہ نے ''قَالَ'' بہ صیغہ ماضی پڑھا ہے۔[2] اس کی وجہ یہ ہے کہ ''منذرین'' (ڈرانے والے رسول) اور ان کی قوموں کے درمیان جو معاملہ گزرا ہے اللہ پاک نے اس کو بیان فرمایا ہے۔ یعنی ان منذرین میں سے ہر منذر نے اپنی اپنی امت سے قولِ مذکور کہا۔ کسی نے کہا: دونوں قراءتیں اس ماجرا کا بیان ہے جو انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے درمیان گزرا ہے۔ ان منذروں میں سے ہر منذر نے اپنی امتِ مقلد کو یہ بات کہی۔ گویا اللہ پاک نے ہر نبی سے یوں کہا: ''قُل''۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ﴿ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴾ میں بہ صیغہ جمع ہے۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ ''قُل'' امرِ ماضی کی حکایت ہے، جس کی وحی ﴿ نَذِيْرٍ ﴾ کی طرف کی گئی۔ یا رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے۔ پہلی بات کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ امام ابن عامر اور حفص رحمہما اللہ نے ﴿ قٰلَ ﴾ پڑھا ہے۔[3] انتہٰی. شہاب نے اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ جائز ہے کہ ''قُل'' کا مامور بہ ﴿ نَذِيْرٍ ﴾ ہو تو اب ''قل'' امرِ ماضی ہوگا اور پہلے گزرے ہوئے ﴿ نَذِيْرٍ ﴾ سے متعلق ہوگا، جس کا بیان اللہ پاک نے اپنے نبی اکرم ﷺ سے کیا ہے، اس طرح سے کہ ''فَقُلْنَا لَهٗ: قُلْ'' اور یہ بھی جائز ہے کہ امرِ حالی ہو، رسول اللہ ﷺ سے متعلق ٹھہرے۔[4] انتہٰی. پہلے قول کی مؤید قراءت ''قَالَ'' ہے اور جو ﴿ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ ﴾ کو بہ لفظِ جمع کہا

---

[1] أعلام الموقعین (۱۹۶/۲، ۱۹۸) فتح البیان (۳۴۰/۱۲، ۳۴۱) [2] فتح القدیر (۷۲۲/۴)

[3] تفسیر البیضاوي (۱۴۳/۵) [4] حاشیة الشهاب علی تفسیر البیضاوي (۴۳۸/۷)

ہے یہ بھی مؤید ہے، کیوں کہ اگر ''قل'' کا خطاب نبی اکرم ﷺ کو ہوتا تو ظاہر یہ تھا کہ جواب میں یوں کہتے: ''اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتَ بِهٖ كٰفِرُوْنَ'' (كذا قال الشيخ زاده)

امام ابوالسعود رحمہ اللہ کا حاصل یہ ہے کہ ﴿ قٰلَ ﴾ بیان ہے امر ماضی کا جس کی وحی ہر نذیر کو اپنے وقت میں کی گئی اور نبی مکرم ﷺ کو اس کا خطاب نہیں ہے، جیسا کہ بعض نے کہا ہے، اس لیے کہ ﴿ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴾ قطعاً اُمتوں کی طرف سے حکایت ہے، یعنی ہر امت نے اپنے اپنے نذیر سے کہا: ''اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتَ بِهٖ كَافِرُوْنَ'' حکایت کے واسطے ایجاز کے طور پر اجمال کر کے جمع کا صیغہ کہہ دیا ہے۔ چنانچہ یہ بات ﴿ يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ ﴾ [المؤمنون: ۵۱] ''اے نبیو! حلال چیزیں کھاؤ۔'' میں گزر چکی ہے۔

یہ کہنا کہ ''قُلْ'' کا خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے اور ﴿ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ ﴾ آپ کی قوم کی طرف حکایت ہے اور آپ ﷺ کو باقی انبیاء علیہم السلام پر تغلیب دے کر آپ ﷺ کو بہ صیغۂ جمع خطاب کرنا اور آپ ﷺ کے نہ ماننے کو سارے نبیوں کا نہ ماننا قرار دینا، یہ سب تکلفِ بعید ہے۔ ﴿ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ﴾ اس قول کا بالکل رد کرتا ہے، کیوں کہ آپ ﷺ کی قوم کو استیصال (مکمل طور پر تباہ کرنا) کے عذاب سے کہاں ہلاک کیا گیا اور یہاں انتقام سے مراد وہی استیصال کا عذاب ہے۔ بعد کو فرمایا: ﴿ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴾[1] یعنی دیکھو اگلی اُمتوں میں سے جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۔ یہ وہی انتقام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کی قوم اور عاد اور ثمود پر واقع کیا جس کے وہ اس لیے مستحق تھے کہ اپنے گمراہ آباء کی تقلید پر جمے رہے۔ چنانچہ تو اپنی قوم کے جھٹلانے کی کچھ پروا مت کر۔

''أهدٰى'' اسم تفضیل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس دین پر ان کے باپ دادا تھے وہ ہدایت ہے، حالاں کہ وہ گمراہی تھا۔ چنانچہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ تنزل کرنے کو اور باگ ڈھیلی چھوڑنے کو کہا ہے جس طرح کہ سورۃ المومن میں ہے: ﴿ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ﴾ [المومن: ۲۸] ''اور اگر وہ سچا ہو تو جس (عذاب) کا وہ تم سے وعدہ کر رہا ہے، اس میں سے کچھ نہ کچھ تو تم پر آ پڑے گا۔'' فتح البیان میں اس جگہ تقلید کے بارے میں علامہ شوکانی رحمہ اللہ کی ایک نفیس تقریر مذکور ہے، طوالت کے خوف سے وہ یہاں نہیں لکھی۔[2]

پھر جب اللہ پاک نے اگلی آیت میں یہ بیان فرمایا کہ ان کافروں کو ان باطل قولوں کی طرف کوئی بلانے والا نہیں سوائے آباء واسلاف کی تقلید کے اور بیان کیا کہ آباء کی تقلید ایک باطل طریقہ اور فاسد راستہ ہے اور دلیل کی طرف رجوع ہونا تقلید پر اعتماد کرنے سے زیادہ صحیح ہے تو اس کے بعد ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان کیا جنھوں نے آباء کی تقلید چھوڑی اور دلیل کا اتباع کیا، چنانچہ فرمایا:[3]

---

[1] تفسير أبي السعود (٤٤/٨) [2] فتح القدير (٧٢٢/٤، ٧٢٣) [3] فتح البيان (٣٣٨/١٢-٣٤٤)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۶﴾
اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ﴿۲۷﴾ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾ بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ
الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۹﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا
بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ
الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿۳۱﴾ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا
بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ
دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۳۲﴾
وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ
بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾
وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾ وَزُخْرُفًا ؕ وَاِنْ كُلُّ
ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾

اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: بلاشبہ میں ان (بتوں) سے بَری الذمہ ہوں، جن کی تم عبادت کرتے ہو⑳ سوائے اس (اللہ) کے جس نے مجھے پیدا کیا، تو بے شک وہی جلد میری راہنمائی فرمائے گا㉗ اور ابراہیم اسی (کلمۂ توحید) کو (اپنی اولاد میں) اپنے پیچھے ایک پائندہ و تابندہ بات بنا گئے، تاکہ وہ (اللہ کی طرف) رجوع کریں㉘ بلکہ میں نے انھیں اور اُن کے باپ دادوں کو فائدہ پہنچایا، حتی کہ ان کے پاس حق اور کھول کر بیان کرنے والا رسول آ گیا㉙ اور جب ان کے پاس حق آیا تو انھوں نے کہا: یہ تو جادو ہے اور بلاشبہ ہم اس کے منکر ہیں㉚ اور انھوں نے کہا: یہ قرآن ان دونوں شہروں میں سے کسی بڑے آدمی پر نازل کیوں نہیں کیا گیا؟㉛ کیا وہ آپ کے رب کی رحمت تقسیم کرتے ہیں؟ ہمی نے دنیاوی زندگی میں ان کے درمیان ان کی روزی تقسیم کی ہے اور ہمی نے درجات میں انھیں ایک دوسرے پر برتری دی ہے، تاکہ وہ ایک دوسرے کو خدمت گار بنالیں، اور آپ کے ربّ کی رحمت اس سے بہت بہتر ہے، جو وہ جمع کرتے ہیں㉜ اور اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تمام لوگ

ایک ہی گروہ (کافر) ہو جائیں گے تو ہم ان لوگوں کے لیے جو رحمان کے ساتھ کفر کرتے ہیں، ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور سیڑھیاں بھی، جن پر وہ چڑھتے ﴿33﴾ اور اُن کے گھروں کے دروازے اور تخت بھی (چاندی کے بنا دیتے) جن پر وہ تکیے لگا کر بیٹھتے ﴿34﴾ اور سونے کے بھی، اور یہ سب کچھ تو بس دنیاوی زندگی کا سازوسامان ہے اور آخرت آپ کے رب کے نزدیک متقین کے لیے ہے ﴿35﴾

ابراہیم خلیل علیہ السلام کا اعلانِ توحید:

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے، جو اُن کی عبادتِ غیر اللہ سے بیزاری کا اظہار کیا تو یہاں یہ قصہ آ پڑا کہ تمھارے پیشوا نے باپ کی غلط راہ دیکھ کر چھوڑ دی تم بھی وہی کرو۔ یہ قرآن دو بستیوں، یعنی مکہ اور طائف کے کسی سردار پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟ اللہ نے ان کی تجویز پر دنیا کی روزی تو نہیں بانٹی، پھر ان کی تجویز پر پیغمبری کیسے دے دے؟! کافر کو اللہ نے پیدا کیا کہیں تو اس کو آرام دے۔ آخرت میں تو عذاب ہے، دنیا ہی میں آرام ملتا، مگر ایسا ہو تو سب وہی کفر پکڑ لیں۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے اور رسول و خلیل علیہ السلام کے بارے میں خبر دیتا ہے وہ خلیل جو یک رنگوں (یکسو ہو کر صرف اللہ کی عبادت کرنے والوں) کے پیشوا ہیں اور ان نبیوں کے والد ہیں جو ان کے بعد مبعوث ہوئے اور جن کی طرف قریش اپنے آپ کو نسباً و مذہباً منسوب کرتے ہیں۔ اس بات کی خبر کہ وہ اپنے باپ سے اور اس کی قوم سے اس بارے میں بے زار ہوئے کہ انھوں نے بتوں کو پوجا اور کہا کہ میں اس چیز سے بے زار ہوں جس کو تم پوجتے ہو، مگر وہ ذات جس نے مجھے پیدا کیا۔ چنانچہ بے شک وہ مجھے راہ بتائے گا اور اس کلمے کو اپنے عقب میں باقی ٹھہرایا۔ کلمے سے مراد اللہ وحدہ لاشریک لہٗ کی عبادت ہے اور اس شے کو جو اللہ کے سوا ہے بتوں سے اس کو چھوڑ دینا ہے اور وہ ”لا إله إلا الله“ یعنی اس کلمے کو اپنی اولاد میں دائم ٹھہرایا کہ اولادِ ابراہیم علیہ السلام میں سے وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت کرے اس کلمے کی اقتدا کرے۔ شاید وہ اس کلمے کی طرف رجوع کریں۔ امام عکرمہ، مجاہد، ضحاک، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہ نے ﴿وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے، یعنی ”لا إله إلا الله“ ان کی اولاد میں ہمیشہ رہے گا۔ اسی کی طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: کلمة الاسلام۔[1] یہ قول بھی اسی طرف راجع ہے جو جماعتِ مذکورہ نے کہا ہے۔

[1] تفسیر الطبري (٢١/٥٨٩، ٥٩٠)

رسول اللہ ﷺ پر اعتراض اور اس کا جواب:

پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴾ یعنی، بلکہ فائدہ اٹھانے دیا میں نے ان مشرکوں کو اور ان کے باپ دادا کو، یعنی اپنی گمراہی میں ان کی عمریں دراز ہوگئیں، یہاں تک کہ ان کے پاس حق اور رسولِ مبین آیا، یعنی ایسا رسول جس کی رسالت و نذارت ظاہر و باہر تھی اور جب ان کے پاس حق آیا تو کہا: یہ جادو ہے اور ہم اس کے منکر ہیں، یعنی کفر، حسد اور سرکشی کے مارے اس کا مقابلہ اور عناد کیا اور صدور و رواح سے اس کو دور کیا۔① (كذا في ابن كثير) (لیکن صحیح رماح معلوم ہوتا ہے، یعنی اپنے سینوں اور نیزوں سے حق کو دفع کیا۔ واللّٰه أعلم)۔ اور جس شے کو اللہ تعالیٰ عزوجل نے نازل کیا اس پر اعتراض کر کے یوں کہا کہ یہ قرآن ان دو بستیوں کے کسی بڑے شخص پر نازل کیوں نہ ہوا، گویا اس پر اعتراض کر کے یوں کہا کہ اس قرآن کا نزول کسی ایسے شخص پر کیوں نہ ہوا جو ان کی نظروں میں عظیم و کبیر ہوتا۔ دو بستیوں سے مراد مکہ و طائف ہے۔

یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما و عکرمہ و محمد بن کعب قرظی و قتادہ و سدی و ابن زید رحمہم اللہ کا ہے۔ کئی ایک اہلِ علم نے ذکر کیا ہے جن میں سے قتادہ رحمہ اللہ بھی ہیں کہ ﴿ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴾ سے ان کی مراد ولید بن مغیرہ اور عروہ بن مسعود ثقفی ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ سے روایت کیا ہے کہ ان کی مراد ولید بن مغیرہ اور مسعود بن عمرو ثقفی ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ عمیر بن عمرو بن مسعود ثقفی ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ سے ایک قول یہ مروی ہے کہ اس سے مراد عتبہ بن ربیعہ ہے۔ ان سے تیسرا قول یہ مروی ہے کہ عتبہ بن ربیعہ تو مکے میں اور ابن عبد یالیل طائف میں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جبابرۂ قریش میں سے کوئی جبار ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ولید بن مغیرہ اور حبیب بن عمرو بن عمیر ثقفی ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد ولید بن مغیرہ اور کنانہ بن عمرو بن عمیر ثقفی ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ان کی مراد دونوں شہروں میں سے کسی شہر کا کوئی بڑا آدمی ہے۔②

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے اس اعتراض کو رد کر کے فرمایا: ﴿ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ﴾ یعنی یہ کام ان کے سپرد نہیں ہے، بلکہ اللہ کے حوالے ہے ﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾ [الأنعام: ١٢٤] ”اس موقع کو تو اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کہاں وہ اپنی پیغمبری رکھے۔“ یعنی اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جہاں اپنے پیغام رکھتا ہے، کیوں کہ وہ ان کو صرف اسی شخص پر نازل کرتا ہے جو تمام مخلوق میں سے قلب و نفس میں سب سے زیادہ پاکیزہ ہوتا ہے اور اس کا تعلق سب سے زیادہ شریف خاندان کے ساتھ ہوتا ہے اور اصلیت کے لحاظ سے سب سے پاک ہوتا ہے۔

① تفسير ابن كثير (١٥٩/٤) ② تفسير الطبري (٢١/٥٩٢_٥٩٤) تفسير ابن كثير (١٥٩، ١٦٠)

پھر فرمایا کہ اس نے اپنی خلق کو جو کچھ مال و رزق و عقل وفہم وغیرہ ظاہری اور باطنی قوی عطا فرمائے ہیں، ان میں ان کے درمیان فرق رکھا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ ﴾ یعنی اللہ پاک نے جس طرح یہ امور اپنے ذمے رکھے ہیں اسی طرح رسالت کا معاملہ بھی ہے، اس میں خلق کی رائے کا کچھ دخل نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ﴾ کے یہ معنی ہیں تاکہ بعض ان کا بعض کو کام کاج کے لیے مسخر کرے اس سبب سے کہ وہ شخص اس کا محتاج ہے اور یہ اس کا محتاج ہے۔ یہ قول سدی رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔ امام قتادہ و ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: تاکہ مالک ہو ان کا بعض بعض کا، [1] یہ قول بھی پہلے قول کی طرف راجع ہے۔ پھر فرمایا: ﴿ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴾ یعنی اللہ کی جو رحمت اپنی خلق پر ہے وہ ان کے لیے اس مال و متاع سے بہتر ہے جو دنیا میں ان کے ہاتھوں میں ہے۔

مال اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی علامت نہیں ہے:

پھر فرمایا: ﴿ وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴾ یعنی اگر یہ بات نہ ہوتی کہ بہت سے جاہل لوگ یہ اعتقاد کر لیتے کہ ہمارا مال عطا کرنا، اس شخص کے ساتھ ہماری محبت کی دلیل ہے جو ہم نے عطا کیا، پھر وہ اس مال کے سبب سے کفر پر جمع ہو جاتے۔ یہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام حسن، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم کے قول کے معنی ہیں۔ تو البتہ ہم ان لوگوں کے گھروں کی چھت چاندی کی کر دیتے جو رحمان کا انکار کرتے ہیں اور ان کی سیڑھیاں بھی چاندی کی کر دیتے جن پر وہ چڑھتے ہیں اور اُن کے گھروں کے دروازے بھی اور تخت بھی جن پر وہ چڑھ بیٹھیں، یہ سب سامان چاندی اور سونے کا ہوتا۔ (﴿ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا ﴾ "أَيْ: أَغْلَاقًا عَلَى أَبْوَابِهِمْ" (كذا في ابن كثير) "غلق في التحريك" بہ معنی کلید ہے۔ (كذا في الصراح) شاید یہ معنی ہوں کہ ان کے دروازوں کے قفل اور کنجیاں چاندی سونے کی ہوں۔ ظاہر یہ ہے کہ ابواب سے مراد کواڑ ہیں، یعنی ان کے دروازوں کے کواڑ چاندی سونے کے ہوتے۔ والله أعلم)۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد، قتادہ، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم نے ﴿ مَعَارِجَ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے: "سَلَالِمَ وَدَرَجًا مِنْ فِضَّةٍ"، ﴿ وَزُخْرُفًا ﴾ "أَيْ: وَذَهَبًا" [2] یعنی چاندی اور سونے کی سیڑھیاں۔

پھر فرمایا: ﴿ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ یعنی نہیں ہے یہ سب کچھ مگر دنیائے فانی و زایل کا برتنا جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک حقیر اور بے قدر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں جلدی سے ان کو اُن کی

[1] تفسير الطبري (٢١/٥٩٥، ٥٩٦) [2] تفسير الطبري (٢١/٥٩٨_٦٠٢) تفسير ابن كثير (٤/١٦٠)

نیکیوں کے عوض دنیا میں دے دی جاتی ہیں۔ یہ چیزیں ان کو یہاں اس لیے دے دی جاتی ہیں کہ جب وہ آخرت میں آئیں تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس کوئی نیکی نہ ہو جس کا ان کو بدلے دے۔ چنانچہ یہ بات صحیح حدیث میں وارد ہوئی ہے۔[1] ایک اَور حدیث شریف میں یوں مروی ہے کہ اگر اللہ کے نزدیک دنیا مچھر کے ایک پَر کے برابر ہوتی تو اس سے کسی کافر کو پانی کا ایک گھونٹ نہ پلاتا۔[2] (أسنده البغوي من رواية زكريا بن منظور عن أبي حازم عن سهل بن سعد ﷺ عن النبي ﷺ فذكره) اور طبرانی رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود عن سہل بن سعد رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ ان الفاظ سے اس کو روایت کیا ہے: «لَوْعَدَلَتِ الدُّنْيَا عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا أَعْطَى كَافِرًا مِنْهَا شَيْئًا»[3]

پھر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ یعنی آخرت خاص طور پر متقی لوگوں کے لیے ہے، اس میں کوئی ان کا شریک نہیں ہے۔ اسی لیے نبیِ مکرم ﷺ نے عمر رضی اللہ عنہ سے یوں فرمایا: "اے ابن خطاب! کیا تو شک میں ہے؟ پھر فرمایا: «أُولَئِكَ قَوْمٌ عُجِّلَتْ لَهُمْ طَيِّبَاتُهُمْ فِيْ حَيَاتِهِمُ الدُّنْيَا»[4] یعنی یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کو ان کے مزے کی چیزیں ان کو جلدی سے دنیا کی زندگی میں دے دی گئی ہیں۔ ایک روایت میں اس طرح ہے: کیا تو اس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ ان کے لیے تو دنیا ہو اور ہمارے لیے آخرت؟[5]

اس کا قصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی بیبیوں سے ایلا کیا تھا، یعنی قسم کھائی تھی کہ مہینا بھر اُن کے پاس تشریف نہ لائیں۔ آپ ﷺ ایک بالاخانے میں تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی طرف چڑھے تو آپ ﷺ کو دیکھا کہ ایک بوریے کی بناوٹ پر بغیر بستر کے لیٹے ہوئے ہیں اور اس کے نشان آپ ﷺ کے پہلو مبارک پر پڑ گئے ہیں۔ اس حال کو دیکھ کر عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں جلد ہی آنسو آ گئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! یہ کسریٰ اور قیصر تو اس عیش وعشرت میں ہیں اور راحت میں ہیں کہ جس میں ہیں اور آپ اللہ کی مخلوق میں سے اس کے برگزیدہ ہیں۔ آپ ﷺ تکیہ لگائے ہوئے تھے تو بیٹھ گئے اور وہ بات فرمائی جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔

یہ بھی صحیحین وغیرہما میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سونے اور چاندی کے برتن میں نہ پیو اور نہ ان کی رکابیوں میں کھاؤ، بے شک وہ دنیا میں ان کے لیے ہیں اور آخرت میں ہمارے لیے ہیں[6] اور اللہ تعالیٰ نے جو ان کو دنیا میں عطا کیا ہے تو وہ ان چیزوں کے حقیر ہونے کے سبب سے دیا ہے، جس طرح کہ ترمذی اور ابن ماجہ نے من طریق

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٠٨)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٢٠) سنن ابن ماجه (٤١١٠) تفسير البغوي (٢١٢/٧، ٢١٣) السلسلة الصحيحة (٦٨٦)

[3] المعجم الكبير (١٧٨/٦) [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧٩)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٢٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧٩)

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٦٧)

ابی حازم عن سہل بن سعد رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَزِنُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقَى مِنْهَا كَافِرًا شُرْبَةَ مَاءٍ أَبَدًا»[1] (قال الترمذي: حسن صحيح)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کو امر فرمایا کہ اپنی قوم سے اس وقت کا ذکر کر کہ جس وقت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کی تقلید کیے بغیر اپنے باپ اور قوم سے کہا، جنھوں نے اپنے آباء کی تقلید کی اور بتوں کو پوجا، کہ بے شک میں اس شے سے بے زار ہوں جس کو تم پوجتے ہو۔ تم نے بھی اپنے آباء کی اسی طرح تقلید کی ہے، جس طرح ابراہیم علیہ السلام کے باپ اور اس کی قوم نے کی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام جو ان کے بڑے سے بڑے دادا ہیں اور جن پر ان کے فخر اور شرف کا انحصار ہے اور جن کی محبت اور جن کے دین کی حقیقت پر ان کا اور ان کے غیر کا اجماع و اتفاق ہے وہ تو اس دین سے بے زار ہوئے، جس پر ان کی قوم قائم تھی اور دلیل و برہان کو پکڑا۔ تمھیں چاہیے کہ استدلال میں ان کی، یعنی ابراہیم علیہ السلام کی چال چلو۔

کلمہ ﴿ بَرَآءٌ ﴾ مصدر ہے واحد، مثنیٰ، جمع اور مذکر و مؤنث کے لیے برابر استعمال ہوتا ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: "وَتَبَرَّأْتُ مِنْ كَذَا وَأَنَا مِنْهُ بَرَاءٌ وَخَلَاءٌ"، یعنی میں فلاں شے سے بے زار ہوا اور میں اس سے بے زار ہوں۔ اس کا تثنیہ اور جمع نہیں کیا جاتا، اس لیے کہ اصل میں مصدر ہے۔[2] امام کسائی، مبرد اور زجاج رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ یہاں ابراہیم علیہ السلام نے خود کو ﴿ بَرَآءٌ ﴾ کے ساتھ موصوف کیا۔ چاہیے یوں تھا کہ "إِنَّنِي بَرِيْءٌ" فرماتے، کیوں کہ ﴿ بَرَآءٌ ﴾ مصدر ہے اور "بَرِيْءٌ" صفت ہے۔ چنانچہ اس سے غرض مبالغہ ہے، یعنی میں اتنا بے زار ہوں کہ بے زاری کے مارے خود بے زاری بن گیا ہوں۔ زبان کی خوبی ملاحظہ فرمائیں کہ "بريء" کی جگہ ﴿ بَرَآءٌ ﴾ کہہ دینے سے کس قدر مبالغہ ہو گیا۔

بالجملہ پھر بے زاری سے اپنے خالق پاک کا استثناء کیا تو یوں بولے: ﴿ إِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ﴾۔ یہ استثناء منقطع ہے ﴿ إِلَّا ﴾ بہ معنی "لٰکن" ہے۔ یا کلمہ "ما" کے عموم سے متصل ہے، کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اور بتوں کو پوجتے تھے، یعنی مگر اس ذات سے بے زار نہیں ہوں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور عدم کی تاریکی سے نکال کر وجود کا نور بخشا ہے۔ یا کلمہ ﴿ إِلَّا ﴾ صفت بہ معنی "غیر" ہے اور کلمہ "ما" نکرہ موصوفہ ہے۔[3] (كما قاله الزمخشري) یعنی میں بیزار ہوں اس شے سے جس کو تم پوجتے ہو ایسی شے جو اس ذات کے علاوہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ ﴿ فَإِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ﴾ یعنی میں اس سے بے زار نہیں ہوں، اس لیے کہ وہ تو ضرور مجھے اپنے دین کی راہ بتائے گا اور اپنی اطاعت کی توفیق دے گا اور

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱۵۹/۴۔ ۱۶۱) البتہ مرفوع روایت کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[2] تفسیر القرطبي (۷۶/۲۱) [3] الکشاف (۲۵۰/٤)

حق پر ثابت رکھے گا۔ چونکہ اللہ پاک پر ان کو پورا اعتماد تھا اور ان کا یقین مضبوط تھا، اس لیے حتمی طور پر یوں خبر دی کہ "سَيَهْدِينِي" بہتر توجیہ یہ ہے کہ حرفِ سین تاکید کے لیے ہے تسویف (تاخیر) کے لیے نہیں ہے۔ اور مضارع کا صیغہ اس لیے ہے کہ استمرار معلوم ہو، یعنی وہ ضرور مجھے راہ بتاتا رہے گا۔

﴿ وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ ﴾ میں ضمیر مؤنث ﴿ اَلَّذِيْ فَطَرَنِيْ ﴾ کی طرف راجع ہے۔ یہ جملہ توحید کے معنی میں ہے۔ گویا یوں کہا کہ کلمۂ توحید کو اپنے عقب میں باقی ٹھہرایا۔ عقب سے مراد ان کی ذریت اور اولاد ہے۔ چنانچہ ان میں ہمیشہ وہ شخص رہے گا جو اللہ پاک کی توحید کرے گا۔ ﴿ جَعَلَهَا ﴾ کے فاعل ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنی اولاد کو توحید کی وصیت کی اور ان کو حکم دیا کہ توحید کو اپنا دین ٹھہرائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهِمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ [البقرہ: ١٣٢] "اسی کی وصیت ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کو کی کہ ہمارے بچو! اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے اس دین کو پسند فرما لیا ہے، خبردار! تم مسلمان ہی مرنا۔" کسی نے کہا کہ فاعل اللہ عزوجل ہے، یعنی اللہ پاک نے عقبِ ابراہیم میں کلمۂ توحید کو ٹھہرایا اور عقب "من بعد" ہے، یعنی جو لوگ ان کے بعد ہوں گے۔ مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ کلمہ "لا إله إلا الله" ہے، ان کے عقب میں قیامت تک ہمیشہ وہ شخص رہے گا جو اللہ کو پوجے گا اور اس کی توحید کرے گا اور اس کی توحید کی طرف بلائے گا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلمۂ اسلام ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ کلمۂ ﴿ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [البقرة: ١٣١] ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ کلمۂ باقیہ "لا إله إلا الله" ہے اور عقبِ ابراہیم ان کی اولاد ہیں۔[1]

﴿ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ تعلیل ہے جعل کی، یعنی اس کو باقی ٹھہرایا اس امید میں کہ اس شخص کے بلانے سے جو توحید کرتا ہے وہ شخص جو اُن میں سے شرک کرتا ہے، اس کی طرف رجوع کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ لَعَلَّهُمْ ﴾ کی ضمیر اہلِ مکہ کی طرف راجع ہے، یعنی شاید مکہ والے تیرے دین کی طرف رجوع کریں جو ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے۔ کسی نے کہا کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر یہ ہے: "فَإِنَّهُ سَيَهْدِينِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ وَجَعَلَهَا ... الخ". امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شاید وہ توبہ کریں اور اس شے سے جس پر وہ ہیں اللہ کی عبادت کی طرف رجوع کریں۔[2]

پھر اللہ پاک نے اپنی نعمت کا ذکر کیا جو قریش پر ہے اور ان کے ہم عصر کافروں پر ہے جو ان کے موافق ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴾ اللہ پاک نے پہلے کلام سے پھر کر اس شے کا ذکر کیا جس کے ساتھ ان کو دنیا کا عارضی فائدہ دیا، وہ یہی ان کے جان و مال اور گھر والے ہیں اور درازیِ عمر ہے اور طرح طرح کی نعمتیں اور بدن کی بلاؤں اور آفتوں سے سلامتی ہے۔ اسی طرح ان چیزوں سے

---

[1] تفسير الطبري (٢١/٥٨٩، ٥٩٠) تفسير القرطبي (١٦/٧٧)
[2] فتح القدير (٤/٧٢٣)

ان کے باپ دادا کو عارضی فائدہ دیا اور جلدی سے ان پر عذاب نہیں ڈالا تو وہ مہلت سے مغرور ہو گئے اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے اور نعمتوں اور لذتوں اور عیش وعشرت کے سبب سے کلمۂ توحید سے غافل ہو گئے اور تکبر کرنے لگے اور اترانے لگے اور باطل پر جم گئے، یہاں تک کہ ان کے پاس حق، یعنی قرآن شریف آ گیا اور رسولِ مبین، یعنی محمد ﷺ تشریف لے آئے جن کی رسالت ظاہر اور واضح ہے۔ یا ﴿ مُّبِيْنٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جس امرِ دین کی ان کو حاجت ہوتی ہے، اس کو ان کے لیے بیان کرنے والے ہیں، چنانچہ ایسے رسول کو نہ مانا اور جو کچھ ان پر نازل ہوا اس پر عمل نہ کیا۔

اس غایت میں خفا ہے۔ کشاف میں اور اس کی شرحوں میں اس کو بیان کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ حق کا اور رسولِ مبین کا آنا تمتیع کی انتہا نہیں ہے، اس لیے کہ دونوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے، اس کے ساتھ کہ مخالفت اس کی مابعد کے واسطے ماقبل کے اس میں غیر مرعی ہے۔ جواب یہ ہے کہ تمتیع سے مراد وہ شے ہے کہ جس کے سبب تمتیع پڑی ہے۔ یعنی تمتیع (فائدہ لینا) کے ساتھ ان کا منعمِ حقیقی کے شکر سے غافل ہو جانا۔ گویا یوں کہا کہ وہ تمتیع کے سبب سے مشغول ہو گئے، یہاں تک کہ ان کے پاس حق اور رسولِ مبین آیا۔[1] اور حقیقت میں یہ ان کے مشغول ہونے کی انتہا ہے، کیوں کہ حق اور رسول کا آنا اس قسم سے ہے کہ ان کو ہوشیار کرتا ہے اور تنبیہ کرتا ہے کہ لو کتاب آ گئی، رسول آ گیا اب تو ہوشیار ہو جاؤ اور منعم کا شکر ادا کرنے میں غفلت مت کرو، شرک چھوڑ دو، اپنے منعم کا شکر ادا کر کے موحد بن جاؤ، لیکن انھوں نے اپنی سرکشی کے مارے اس کے برعکس کیا، اب بھی ہوشیار نہ ہوئے اور اپنی گمراہی پر جمے رہے۔ چنانچہ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ﴾ [البينة: ٤] ''اہلِ کتاب اپنے پاس ظاہر دلیل آ جانے کے بعد ہی (اختلاف میں پڑ کر) متفرق ہو گئے۔''[2] (كما أفاده الشهاب)

پھر حق آنے کے وقت انھوں نے جو کچھ کیا اللہ پاک نے اس کا ذکر فرمایا: ﴿ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴾ یعنی جب ان کے پاس حق آیا تو بولے کہ یہ جادو ہے اور ہم اس کے منکر ہیں۔ چنانچہ قرآن شریف کا نام تو جادو رکھا اور اس کے منکر ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کی حقارت کی وجہ یہ ہے کہ جب انھوں نے اپنے گمراہ آباء واسلاف کی تقلید پر اعتماد کیا تو دلیل میں فکر نہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے جو دنیا کا ساز وسامان ان کو برتنے کے لیے دیا اور ان کو لمبی مہلت دی تو وہ اس سے مغرور ہو گئے اور حق سے اعراض کیا۔ اس کلام سے غرض اس شخص کو ملامت کرنا ہے جو اپنے گمراہ اور خطا کار آباء کا مقلد ہے۔

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴾ یعنی باطل کے ساتھ تحکم کر کے بولے: کیوں نہیں اُتارا گیا یہ قرآن دو بستیوں، یعنی مکہ اور طائف کے کسی بڑے آدمی پر۔ ''قَرْيَتَيْنِ'' کے معنی ''أَحَدُ الْقَرْيَتَيْنِ'' ہیں، یعنی دونوں بستیوں میں سے کسی ایک بستی کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ عرب کے

---

[1] الكشاف (٤/٢٥١) [2] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/٤٣٩)

استعمال میں سے ایک یہ ہے کہ تثنیہ بولتے ہیں اور ایک مراد لیتے ہیں جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴾ [الرحمن: ٢٢] ''ان دونوں میں سے موتی اور مونگے برآمد ہوتے ہیں۔'' ﴿ مِنْهُمَا ﴾ سے مراد ''مِنْ أَحَدِهِمَا'' ہے، ورنہ مرجان کھارے دریا سے نکلتے ہیں۔

''رَجُلَيْنِ'' سے مراد مکے سے ولید بن مغیرہ اور طائف سے عروہ بن مسعود ثقفی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔[1] باقی اقوال پہلے گزر چکے ہیں۔ ظاہر نظمِ قرآنی یہ ہے کہ دونوں بستیوں میں سے کسی ایک کا عظیم جاہ وجلال اور کثیر مال والا اپنی قوم کا سردار مراد ہے۔ ان کی غرض یہ ہے کہ اگر یہ قرآن ہوتا تو دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر نازل ہوتا۔ ان مساکین نے کہا کہ اللہ کی رسالت کا منصب ایک شریف منصب ہے، جو کسی شریف مرد ہی کے لائق ہے۔ اس بات میں تو وہ سچے ہیں، مگر آفت یہ ہے کہ اس کے ساتھ ایک مقدمۂ فاسد جوڑا، وہ یہ کہ ان کے نزدیک شریف مرد وہی ہے جو بڑے مال اور عزت والا ہو۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے نہیں ہیں۔

چنانچہ اللہ پاک نے ان کو اس بات کا یہ جواب دیا: ﴿ أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ﴾۔ رحمت سے مراد نبوت ہے، یا وہ شے جو نبوت سے عام تر ہے۔ اور استفہام سے ان کی بات کا انکار کرنا اور اُن کو مستقل طور پر جاہل بنانا منظور ہے۔ اور نبوت کے لائق شخص کو اختیار کرنے میں جو انھوں نے زبردستی کا دعویٰ کیا، اس پر تعجب دلانا ہے، یعنی اے لوگو! ان نادانوں کی نادانی تو دیکھو کہ نبوت کے جلیل القدر منصب کو اپنی پسند کے مطابق ٹھہراتے ہیں۔ کیا رب العالمین کی رحمت بانٹنے والے یہی ہیں؟! ہرگز نہیں۔ ان کی بات پر تعجب کرو، کہاں نبوت کا منصب اور کہاں ان جاہلوں کی پسند۔

امام مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کیا ان کے ہاتھوں میں رسالت کی کنجیاں ہیں کہ جہاں چاہیں اس کو رکھیں۔[2] انتھی.

ہرگز نبوت میں ان کو کچھ دخل نہیں۔ نبوت تو ایک عظیم الشان منصب ہے جس پر دین و دنیا کی صلاح اور درستی موقوف ہے، بھلا اس میں ان جاہلوں کا کیوں داخل ہونے لگا۔ دنیا کے کاروبار جن سے ایک قلیل مدت کے لیے زندگی بسر کرتے ہیں، ان میں بھی ان کا کچھ اختیار نہیں ہے۔ اللہ پاک نے خود اپنی مرضی کے مطابق ان میں معیشت کی تقسیم کی ہے، اس لیے یوں فرمایا: ﴿ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا ﴾ یعنی بندوں کے درمیان معیشت کا یہ فرق ہم نے پیدا کیا ہے، چنانچہ ہم نے کسی کو تو غنی کیا اور کسی کو فقیر، کسی کو مالک کیا اور کسی کو مملوک، کسی کو قوی بنایا اور کسی کو ضعف۔ یہ کام ہم نے ان کو نہیں سونپا اور نہ ہی بندوں میں سے کسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ کسی شے میں تحکم کرے (جبری طور پر حکم کرے)، بلکہ حکم تو خاص اللہ وحدہ لا شریک لہ کے لیے ہے۔ پھر جب اللہ پاک ہی نے ان کے درمیان ان کی روزیاں بانٹیں تو پھر امرِ نبوت میں اس کے بانٹنے کو کیوں تسلیم نہیں کرتے اور کیوں نہیں سمجھتے کہ

[1] تفسیر الطبري (٢١/٥٩٣) [2] تفسیر البغوي (٧/٢١١)

جس طرح اس نے اپنے اختیار سے بندوں میں رزق تقسیم کیا، اسی طرح اسے اختیار ہے کہ اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہے نبوت کا منصب سونپ دے۔ جمہور نے ﴿ مَّعِيْشَتَهُمْ ﴾ بہ افراد پڑھا ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور ابن محیصن رحمہ اللہ نے "مَعَايِشَهُمْ" بہ جمع پڑھا ہے۔[1]

تنبیہ: اس رحمت کا حرفِ "تا" رسم مصحف امام کی اتباع میں لمبا لکھا جاتا ہے جس طرح کہ ابن جزری رحمہ اللہ نے اس پر تصریح کی ہے۔ کلمۂ ﴿ رَحْمَتَ ﴾ سات جگہ لمبے "تا" سے لکھا جاتا ہے: دو جگہ تو سورت زخرف میں تیسری جگہ سورت اعراف میں: ﴿ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٥٦] "بے شک اللہ کی رحمت نیک کام کرنے والوں کے نزدیک ہے۔" چوتھی جگہ سورۃ الروم میں: ﴿ فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ ﴾ [الروم: ٥٠] "پس آپ رحمتِ الٰہی کے آثار دیکھیں۔" پانچویں جگہ سورت ھود میں: ﴿ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ﴾ [هود: ٧٣] "اے اس گھر کے لوگو! تم پر اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں نازل ہوں۔" چھٹی جگہ سورت مریم میں: ﴿ رَحْمَتِ رَبِّكَ ﴾ [مریم: ٢] "تیرے رب کی مہربانی" اور ساتویں جگہ سورۃ البقرہ میں: ﴿ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ﴾ [البقرہ: ٢١٨] "یہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔" ان سات جگہوں کے علاوہ اور جگہ پر "رحمة" بہ تائے مدوّر لکھا گیا ہے۔

پھر فرمایا: ﴿ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ ﴾ یعنی ہم نے بعض کو بعض پر درجوں میں بلند کیا۔ مطلب یہ کہ لوگوں کے درمیان تفاضل کیا ہے، یعنی دنیا میں بعض کو بعض سے افضل اور بہتر ٹھہرایا ہے، رزق، ریاست، قوت، حریت، عقل اور علم کے ساتھ۔ پھر رفعِ درجات کی یہ وجہ بیان فرمائی: ﴿ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ﴾ یعنی تاکہ اس کا بعض دوسرے سے خدمت لے، چنانچہ غنی تو فقیر سے خدمت لے اور رئیس یعنی سردار مرؤس (ماتحت) سے خدمت لے، قوی ضعیف سے، آزاد غلام سے خدمت لے اور عقل مند اس شخص سے خدمت لے جو عقل میں اس سے کم ہے اور عالم جاہل سے خدمت لے۔

یہ بات اہلِ دنیا کے حالات میں عام ہے اور اسی سے ان کے مصالح پورے ہوتے ہیں اور ان کی معاش کا انتظام ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنا مطلب حاصل کرتا ہے، اس لیے کہ ہر دنیاوی پیشے کا یہ حال ہے کہ ایک قوم اس کو اچھی طرح سے انجام دے سکتی ہے اور دوسری قوم کو اس پر قدرت نہیں ہوتی۔ بعض کو بعض کا محتاج کیا گیا، تاکہ دنیا میں رہن سہن اور برتنے کے لیے ان کو آپس میں مواسات حاصل ہو (یعنی یاری اور غمخواری حاصل ہو)۔ ایک دوسرے کی مدد کریں، یہ شخص اس کا محتاج ہو اور وہ اس کا کام بنا دے اور یہ اس کو دے۔

امام سدی و ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ سُخْرِيًّا ﴾ "خَوَلًا وَخَدَمًا"[2] غنی لوگ فقراء کو مسخر کریں، یعنی ان سے کام لیں تو بعض بعض کے روزگار کا سبب بن جائیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ سُخْرِيًّا ﴾ ماخوذ ہے "سخرية" بہ معنی

[1] فتح القدير (٧٢٤/٤)
[2] تفسير الطبري (٥٩٥/٢١، ٥٩٦) فتح القدير (٧٢٤/٤)

استہزاء سے۔ یہ قول اگرچہ لغوی معنی کے مطابق ہے، لیکن قرآن شریف کے معنی سے بعید ہے اور سیاقِ کلام سے جو بات مقصود ہے، اس کے منافی ہے۔ اس قول کی بنا پر حرفِ لام صیرورت اور عاقبت کا ہوگا، علت اور سببیت کے لیے نہ ہوگا۔ غرضیکہ اللہ پاک نے جو بعض کو بعض پر رزق وغیرہ میں فضیلت دی تو اس سے مقصود یہ ہے کہ اپنی حاجتوں میں ایک دوسرے سے کام لیں۔ ایک تو کام کرے اور دوسرا اس کو اُجرت دے، باہم ایک دوسرے سے فائدہ حاصل کریں، تاکہ دنیا کا نظام ٹھیک ہو۔

غنا اور فقر کا یہ فرق اس لیے نہیں ہے کہ جس پر روزی کی فراخی کی گئی اس میں کوئی کمال ہے اور جس پر تنگی کی گئی ہے اس میں کوئی نقص ہے، جیسا کہ کفار نے خیال کیا کہ جو بڑا مالدار ہے وہی اللہ کے نزدیک بڑا آدمی ہے۔ یہ ان کی بے عقلی ہے، بلکہ عظیم اور جلیل وہی ہے جس کو اپنے رب کی رحمت ملی ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴾ یعنی تیرے رب کی رحمت اس مال و منال اور تمام متاعِ دنیا سے بہتر ہے جس کو وہ جمع کرتے ہیں، کیوں کہ دنیا تو اپنی ساری زینت اور تازگی کے ساتھ زوال اور انقراض (کٹ جانے) کے کنارے پر لگی ہوئی ہے اور اللہ پاک کا فضل اور رحمت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہے گا۔ پھر بھلا باقی رہنے والی چیز کو فنا ہو جانے والی چیز کے ساتھ کیا نسبت ہے! رحمت سے مراد آخرت میں وہ باقی رہنے والی نعمتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے صالح بندوں کے لیے تیار کر رکھا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد نبوت ہے، اس لیے کہ اگلی رحمت سے یہی نبوت مراد ہے تو اس رحمت سے بھی وہی مراد ہونی چاہیے، حالاں کہ اس بات سے کوئی مانع نہیں ہے کہ ہر وہ شے مراد لی جائے جس پر اسمِ رحمت کا اطلاق بہ طور شمول کے یا بہ طریق بدل کے کیا جاتا ہے۔

چونکہ کفار دنیا ہی دنیا پر ریجھ رہے تھے اور اسی کو فخر اور شرف کا سبب سمجھتے تھے، اس لیے اللہ پاک نے اس کی ذلت اور حقارت بیان کی کہ اس کے نزدیک وہ محض بے حقیقت ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴾ یعنی اگر یہ بات نہ ہوتی کہ لوگ دنیا اور اس کی زینت کی طرف مائل ہو کر کفر پر جمع ہو جائیں، یا اس میں رغبت کریں جب کفار کو عیش اور نعمتوں کی فراوانی میں دیکھیں تو ہم رحمان کے منکرین کے گھروں کی چھتوں کو چاندی کا کر دیتے۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: معنی یہ ہیں کہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ان کے دنیا کی طرف جھکنے اور آخرت کو بھول جانے کے سبب سے سب لوگ کافر ہو جاتے تو ہم البتہ ان کو وہ شے دنیا میں عطا کرتے جس کا ہم نے دنیا کی ذلت کا سبب بیان کیا جو ہمارے نزدیک ہے۔ اکثر مفسرین بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام ابن زید رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر یہ بات نہ ہوتی کہ لوگ دنیا کی طلب میں اور آخرت پر اس کے اختیار کرنے میں ایک اُمت ہو جاتے تو ہم انھیں وہ عطا کرتے۔ امام کسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

معنی یہ ہیں کہ اگر نہ ہوتی یہ بات کہ کفار میں غنی اور فقیر ہوں اور اسی طرح مسلمانوں میں ہوں تو البتہ ہم کفار کو دنیا سے، یعنی اشیائے مذکورہ دیتے بہ سبب ذلتِ دنیا کے۔[1]

"بیوتھم" میں جمع کی ضمیر اور ﴿ يَكْفُرُ ﴾ میں واحد کی ضمیر کلمۂ "مَن" کے معنی اور لفظ کے لحاظ سے ہے۔ ﴿ لِبُيُوْتِهِمْ ﴾ بدلِ اشتمال ہے موصول سے اور حرفِ لام اختصاص کے لیے ہے۔ "سُقُف" جمع ہے "سَقف" کی جیسے: "رَهن" کی جمع "رُهُن" بہ ضمتین ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان کے سوا تیسرا کلمہ ایسا نہیں ہے۔ جمہور نے اسی طرح بہ ضمِ سین و قاف پڑھا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "سَقِيفٌ" کی جمع ہے، جیسے: "كَثِيبٌ" کی جمع "كُثُبٌ" اور "رَغِيفٌ" کی جمع "رُغُفٌ"۔ کسی نے کہا ہے کہ "سُقُوفٌ" کی جمع ہے تو اب جمع الجمع ہوگی، یعنی "سَقفٌ" کی جمع "سُقُوفٌ" اور "سُقُوفٌ" کی جمع "سُقُفٌ"۔ امام ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہما اللہ نے بہ فتحِ سین اور سکونِ قاف پڑھا ہے بنا بر افراد اور اس کے معنی جمع ہیں، اس لیے کہ جنس ہے۔[2]

﴿ وَمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴾ معطوف ہے ﴿ سُقُفًا ﴾ پر مع قید ﴿ مِنْ فِضَّةٍ ﴾ کے، یعنی اور ہم ان کے گھروں کے لیے چاندی کی سیڑھیاں کر دیتے جن پر وہ اٹاریوں کی طرف چڑھتے۔ جمہور نے ﴿ مَعَارِجَ ﴾ پڑھا ہے، اور یہ "مِعْرَجٌ" بہ فتح و کسرِ میم کی جمع ہے۔ "مِعْرَجٌ" کہتے ہیں "سُلَّمٌ" کو، یعنی سیڑھی۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم چاہو تو واحد کو "مَعْرج و مِعرج" ٹھہراؤ۔ یعنی چاہو بہ فتحِ میم کہو چاہو بہ کسرِ میم۔ طلحہ نے "معاريج" پڑھا ہے "معراج" کی جمع۔[3] یہ بعض تمیم کا لغت ہے۔ یہ ایسا ہے، جیسے: "مفاتح"، "مفتح" کی جمع ہے اور "مفاتح" "مفتاح" کی جمع ہے۔ بالجملہ "معارج" بہ معنی مصاعد ہے، یعنی چڑھنے کی جگہیں۔ یہ سیڑھی کی وہ لکڑیاں ہیں جو اس کے عرض میں لگتی ہیں، جن پر چڑھتے ہیں۔ ان کا نام "معارج" اس لیے رکھا ہے کہ ان پر چلنا ایسا ہوتا ہے، جیسا کہ لنگڑا چلتا ہے۔ گویا "عرج" سے ماخوذ ہے، "عرج" بہ معنی لنگڑا پن ہے۔ ﴿ يَظْهَرُوْنَ ﴾ بہ معنی "يَرْتَقُوْنَ وَيَصْعَدُوْنَ" ہے۔ "رقی و صعود" چڑھنے کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "ظَهَرْتُ عَلَى الْبَيْتِ، أَيْ: عَلَوْتُ عَلَى سَطْحِهِ" یعنی میں گھر کے بام پر چڑھ گیا، اسی معنی سے نابغہ کا قول ہے:

بَلَغْنَا السَّمَا مَجْدًا وفَخْرًا وسُودَدًا وَإِنَّا لَنَرْجُوْ فَوْقَ ذٰلِكَ مَظْهَرًا[4]

یعنی ہم آسمان کو پہنچ گئے از روئے بزرگی و فخر و سرداری کے اور اب ہم البتہ اس سے اوپر چڑھنے کی امید رکھتے ہیں۔ ﴿ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ﴾ یعنی اور ہم ان کے لیے ان کے دروازے چاندی کے کر دیتے اور تخت چاندی کے کر دیتے جن پر وہ ٹیک کر بیٹھتے۔ لفظ "بیوت" کو دوبارہ زیادتِ تقریر کے لیے کہا۔ "سرر" جمع

---

[1] تفسير القرطبي (٤٨/١٦) [2] تفسير القرطبي (٨٤/١٦)
[3] تفسير القرطبي (٨٥/١٦) [4] فتح القدير (٧٢٥/٤)

ہے "سریر" کی۔ کسی نے کہا ہے کہ "أسرة" کی جمع ہے تو اب جمع الجمع ہوگی۔ "اتکاء و توکؤ" "تحامل علی الشيء" ہے یعنی کسی شے پر بہ تکلف لد جانا، اس پر زور دینا۔ اسی معنی میں یہ آیت ہے: ﴿ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا ﴾ [طٰہٰ: ۱۸] "یہ میری لاٹھی ہے، جس پر میں ٹیک لگاتا ہوں۔" محاورے میں بولتے ہیں: "اِتَّكَأَ عَلَى الشَّيْءِ تَوَكَّأً فَهُوَ مُتَّكِئٌ" اور ظرف کا صیغہ "مُتَّكَأً" ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً ﴾ [یوسف: ۳۱] "اور ان کے لیے ایک مجلس مرتب کی۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَزُخْرُفًا ﴾ یعنی اور ہم ان کے لیے سونا کر دیتے، تاکہ اس کو چھتوں میں اور سیڑھیوں میں لگائیں اور دروازوں میں اور تختوں میں لگائیں، تاکہ ان میں سے کوئی چیز چاندی کی ہو جاتی اور کوئی سونے کی، یا ہر چیز میں کچھ حصہ سونے کا ہو جاتا اور کچھ چاندی کا، اس لیے کہ اس میں انتہائی درجے کی زینت اور آرائش ہے۔ یہ معنی تو اس بنا پر تھے کہ ﴿ زُخْرُفًا ﴾ "جَعَلْنَا" کا مفعول ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کا نصب بہ نزعِ خافض ہے۔ "أَيْ: مِنْ زُخْرُفٍ" یعنی ہم ان کے گھروں کے دروازے اور تخت چاندی اور سونے کے کر دیتے۔

پھر جب کلمۂ "مِنْ" جار حذف کیا گیا تو "زُخْرُفًا" منصوب ہو گیا۔ "زُخْرُفٌ" سونے کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ زینت کے لیے، عام ہے سونا ہو یا اس کے علاوہ کچھ۔ امام ابن زید رحمہ اللہ کہتے ہیں: "زخرف" وہ امتعہ و اثاث ہے (یعنی مال و اسباب) جس کو لوگ اپنے گھروں میں رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ گھروں میں انواع و اقسام کا سامان رکھ کر آرائش کرنے کا نام "زخرف" ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: نقوش۔[1] "زخرف" کی اصل زینت ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "زَخْرَفْتُ الدَّارَ زَيَّنْتُهَا" یعنی میں نے گھر کی آرائش کی۔ "وَتَزَخْرَفَ فُلَانٌ أَيْ: تَزَيَّنَ" یعنی فلاں نے بناؤ کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے: اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ہم سارے لوگوں کو کافر کر دیں تو البتہ ہم کفار کے گھروں کے چھت چاندی کے اور معارج یعنی سیڑھیاں چاندی کی کر دیتے، جن پر چڑھ کر وہ بالاخانوں پر جاتے اور ان کے تخت چاندی اور سونے کے کر دیتے۔[2]

مستورد بن شداد رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں ان شتر سواروں میں سے تھا جو رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ بکری کے ایک مرے ہوئے بچے کے پاس ٹھہرے تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم اس کو دیکھتے ہو کہ اپنے لوگوں پر ذلیل ہوا ہے، جبکہ انھوں نے اس کو پھینک دیا ہے؟ عرض کی کہ یا رسول اللہ! انھوں نے اس کی ذلت کی وجہ سے اس کو پھینک دیا ہے۔ فرمایا: چنانچہ دنیا اللہ کے نزدیک اس بکری سے زیادہ ذلیل ہے۔[3] (أخرجه الترمذي وحسنه) سیدنا قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب اللہ کسی بندے کو دوست رکھتا ہے تو اس کو دنیا سے اس طرح بچاتا

---

[1] تفسير القرطبي (۸۷/۱٦) [2] تفسير ابن أبي حاتم (۳۲۸۲/۱۰)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۳۲۱) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١١١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۲٤۸۲)

ہے: ''كَمَا يَظَلُّ أَحَدُكُمْ يَحْمِيْ سَقِيْمَهُ الْمَاءَ'' یعنی جس طرح تم سے کوئی دن بھر اپنے بیمار کو پانی سے بچاتا رہتا ہے۔[1] (أخرجه الترمذي وقال: حسن غريب) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: دنیا مومن کا قید خانہ ہے اور کافر کی جنت ہے۔[2] (أخرجه مسلم) بقاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گھروں کی آرایش اور چھتوں کو زر و جواہرات سے مزین کرنا اور اُن کے سوا اور کام جو فتنے کا باعث ہیں جس کی طرف فاسق و جابر لوگ متوجہ ہوں گے کچھ بعید نہیں کہ اس کی وجہ سے قیامت کے قریب لوگ کفر پر اکٹھے ہو کر ایک اُمت ہو جائیں، تاکہ اللہ کا نام لینے والے پر قیامت قائم نہ ہو، یا یہ دجال کے زمانے میں ہو، کیوں کہ اس وقت حق پر باقی رہنے والے لوگ اس درجہ قلیل ہوں گے کہ کفار کے مقابلے میں ان کا کچھ بھی شمار وقطار نہ ہوگا۔ اس توجیہ کی وجہ یہ ہے کہ بادشاہوں کی بات حقیقت سے خالی نہیں ہوتی گو مخرجِ شرط میں خارج ہوئی ہو۔ پھر اللہ پاک کی بات، جو علی الاطلاق شہنشاہ ہے، کیوں کر خالی ہوگی۔[3]

پھر اللہ پاک نے خبر دی کہ اس سب ساز و سامان سے تو صرف دنیا ہی میں برت لیا جاتا ہے، اس کے علاوہ اس کی کچھ حیثیت نہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ یعنی نہیں ہے یہ سب مگر برتنا ہے زندگی کا اور تیرے رب کے نزدیک آخرت یعنی جنت ان لوگوں کے لیے ہے جو شرک اور معاصی سے بچے اور اکیلے اللہ پر ایمان لائے اور اس کی اطاعت کے ساتھ عمل کیا اور دنیا کو چھوڑا اور آخرت کو اختیار کیا، اس لیے کہ وہ ایسی باقی رہنے والی ہے کہ کبھی فنا نہ ہوگی اور اس کی نعمتیں ایسی لازوال ہیں کہ کبھی منقطع نہ ہوں گی۔ جمہور نے ﴿ لَمَّا ﴾ کو بہ تخفیف پڑھا ہے اور امام عاصم، حمزہ اور ہاشم رحمہم اللہ نے ابن عامر رحمہ اللہ سے بہ تشدید روایت کیا ہے۔ پس پہلی قراءت کی بنا پر تو ﴿ اِنْ ﴾ مخففہ ہوگا مثقلہ سے اور دوسری قراءت کی بنا پر نافیہ ٹھہرے گا اور ﴿ لَمَّا ﴾ بہ معنی ''إِلَّا''، أَيْ: مَا كُلُّ ذَلِكَ إِلَّا مَا يُتَمَتَّعُ بِهِ فِيْ الدُّنْيَا'' اور امام ابو رجاء رحمہ اللہ نے بہ کسرِ لام ''لِمَا'' بنا بر لامِ علت اور ''ما'' موصولہ پڑھا ہے اور ''عائد'' محذوف ''أَيْ: لِلَّذِيْ هُوَ مَتَاعٌ''۔[4]

بالجملہ اللہ پاک نے یہ بیان کیا کہ دنیا کی زینت ایک برتنے کی چیز ہے کہ ذرا سی مدت میں انسان اس کو برت لیتا ہے، پھر وہ زائل ہو جاتی ہے۔ پھر یہ حکم لگایا کہ جنت اور آخرت کی نعمتیں ان کے لیے ہیں جو شرک اور معاصی سے بچتے ہیں۔ مشرکوں کے لیے نہیں ہیں جن کو دنیا کی خواہشوں میں منہمک رہنے نے، اس شے کے لیے سعی کرنے سے باز رکھا جو آخرت کی نیک بختی کی طرف پہنچاتی ہے، کیوں کہ جس شے میں انھوں نے اپنی عمریں برباد کیں وہ تو ان سے ضائع ہو گئی اور وہ آخرت کی سعادت سے محروم ہوئے بہ خلاف متقی لوگوں کے کہ آخرت کی سعادت انہیں کے واسطے ہے۔

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٣٦)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٥٦)
[3] نظم الدرر للبقاعي (٢٧/٧)
[4] تفسير القرطبي (٨٧/١٦، ٨٨) فتح القدير (٧٢٥/٤، ٧٢٦)

چنانچہ معلوم ہوا کہ عظیم وہی ہے جو آخرت میں عظیم ہے، وہ نہیں ہے جو دنیا میں عظیم ہے، جیسا کہ کفار نے خیال کیا تھا۔ اب اگر کوئی کہے کہ جب یہ بات قرار پائی کہ کفار پر دنیا کی فراخی اس سبب سے ہے کہ لوگ کفر پر جمع ہو جائیں تو مومنوں پر دنیا کی وسعت کیوں نہ کی، تاکہ لوگ ایمان پر جمع ہو جاتے تو کہیں گے کہ جس طرح کراہت کے ساتھ کفار کے فتنے پر وسعت نہیں کی، اسی طرح مومنین پر بھی فراخی نہیں فرمائی، اس لیے کہ دنیا کی متاع اس کے قلیل المیعاد اور ذلیل ہونے کے سبب سے اس لائق نہیں کہ مقصود بذاتہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ وہ آخرت کے ثواب میں خلل انداز ہے اور اس کو ضائع کرنے والی ہے، اس لیے کہ اس میں آفتیں ہیں۔

من جملہ ان کے ایک آفت یہ ہے کہ اگر ان پر فراخی کی جاتی تو اس کو محبوب رکھتے اور اس کی وجہ سے اسلام کو اختیار کرتے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اور اس کی رضا چاہنے کے لیے اور دلائل قطعی کی اتباع کرنے کے لیے۔ اور وہ خواہشات میں زیادہ حرص کرتے اور منہمک ہوتے اور یہ بات اس طرف پہنچاتی کہ اللہ تعالیٰ ان پر شیطان کو مسلط کرے کہ وہ ان کو باطل اچھا کر دکھائے اور راہِ حق سے بہکائے اس سزا میں کہ انھوں نے باطل کو حق پر اختیار کیا، جس طرح کہ اللہ پاک نے اس کی طرف اس قول میں اشارہ فرمایا: [1]

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ
قَرِيْنٌ ﴿٣٦﴾ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿٣٧﴾
حَتّٰۤى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ
الْقَرِيْنُ ﴿٣٨﴾ وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ
مُشْتَرِكُوْنَ ﴿٣٩﴾ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ
وَمَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٤٠﴾ فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ
مُّنْتَقِمُوْنَ ﴿٤١﴾ اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ﴿٤٢﴾
فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٤٣﴾ وَاِنَّهٗ
لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿٤٤﴾ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا
مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴿٤٥﴾

اور جو رحمان کے ذکر سے اندھا (غافل) ہو جائے تو ہم اس کے لیے ایک شیطان کو مقرر کر دیتے ہیں، پھر وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے (36) اور بلاشبہہ وہ (شیاطین) انھیں (سیدھے)

[1] فتح البیان (۱۲/۳۴۵۔۳۵۳)

راستے سے روکتے ہیں، جب کہ وہ خیال کرتے ہیں کہ بے شک وہ ہدایت پر ہیں (37) کہ جب وہ (گمراہ شخص) ہمارے پاس آئے گا تو (شیطان سے) کہے گا: کاش! میرے اور تیرے درمیان مشرق ومغرب کی دوری ہوتی، تو تُو بڑا بُرا ساتھی ہے (38) اور جب تم ظلم کر چکے ہو تو آج یہ بات تمھیں ہرگز نفع نہ دے گی کہ تم (سب) عذاب میں شریک ہو (39) کیا پھر آپ بہروں کو سنا سکتے ہیں، یا اندھوں کو راہ دکھا سکتے ہیں اور (ان کو) جو کھلی گمراہی میں ہیں؟ (40) پھر اگر ہم آپ کو (دنیا سے) لے جائیں تو بہر حال ہم ان سے انتقام لینے والے ہیں (41) یا ہم آپ کو وہ (عذاب) دکھا دیں، جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے، تو بلاشبہ ہم ان پر قدرت رکھتے ہیں (42) لہٰذا آپ اس چیز کو مضبوطی سے تھام لیں جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے، یقیناً آپ سیدھے راستے پر ہیں (43) اور یقیناً یہ (قرآن) آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے ایک نصیحت ہے اور جلد تم لوگوں سے پوچھ گچھ ہو گی (44) اور ہم نے جو اپنے رسول آپ سے پہلے بھیجے تھے ان سے پوچھیے، کیا ہم نے رحمان کے سوا کوئی اور معبود مقرر کیے تھے کہ اُن کی عبادت کی جائے (45)

رحمان سے منہ موڑنے والے کا دوست شیطان ہے:

جو شخص رحمان کی یاد سے غفلت کرے، ہم اس کا شیطان ساتھی مقرر کر دیتے ہیں، یعنی دنیا میں شیطان کے مشورے پر چلتا ہے اور آخرت میں اس کی صحبت سے پچھتائے گا، اس طرح کا شیطان ساتھی کسی کو جن ملتا ہے اور کسی کو آدمی۔ جب تم ظالم ٹھہر چکے تو آج تم سب کا عذاب میں شریک ہونا تمھیں کوئی فائدہ نہ دے گا، یعنی کافر کہیں گے کہ اچھا ہوا، انھوں نے ہم کو عذاب میں ڈلوایا، یہ بھی نہ بچے، لیکن دوسرے کے بھی پکڑے جانے سے اس کو کیا فائدہ ہوا۔ ہم نے کسی دین میں شرک جائز نہیں رکھا۔ ان سے پوچھ کر دیکھ لو، یعنی جس وقت ان کی روحوں سے ملاقات ہو، یا کتابوں میں سے ان کے احوال پڑھ کر تحقیق کر لو۔ انتہٰی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "عشی" آنکھ کا ضعفِ بصر ہے اور اس جگہ ضعفِ بصیرت مراد ہے، یعنی جو شخص اندھا بنے اور رحمان کی یاد سے تغافل اور اعراض کرے تو ہم اس کے لیے ایک شیطان متعین کر دیں، وہ اس کا ساتھی ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۚ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ [النساء: ۱۱۵] "جو شخص باوجود راہِ ہدایت کے واضح ہو جانے کے بھی رسول (ﷺ) کا خلاف کرے اور تمام مومنوں کی راہ چھوڑ کر چلے، ہم اسے ادھر ہی متوجہ کر دیں گے

جدھر وہ خود متوجہ ہو اور دوزخ میں ڈال دیں گے، وہ پہنچنے کی بہت ہی بری جگہ ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ﴾ [الصف: ٥] ''پس جب وہ لوگ ٹیڑھے ہی رہے تو اللہ نے ان کے دلوں کو (اور) ٹیڑھا کر دیا، اور اللہ تعالیٰ نافرمان قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔''

نیز فرمایا: ﴿وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ﴾ [حٰم السجدة: ٢٥] ''اور ہم نے ان کے کچھ ہم نشین مقرر کر رکھے تھے جنھوں نے ان کے اگلے پچھلے اعمال ان کی نگاہوں میں خوبصورت بنا رکھے تھے اور ان کے حق میں بھی اللہ کا قول ان امتوں کے ساتھ پورا ہوا جو ان سے پہلے جنوں انسانوں کی گزر چکی ہیں۔ یقیناً وہ زیاں کار ثابت ہوئے۔'' اسی لیے یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ یعنی اور بے شک وہ شیاطین البتہ ان کو راہ سے روکتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ وہ راہ پائے ہوئے ہیں یہاں تک کہ جس وقت یہ ہدایت سے تغافل کرنے والا شخص ہمارے پاس آئے گا تو ہم اس کے لیے شیاطین میں سے ایک شیطان متعین کریں گے جو اس کو بہکائے گا اور اسے دوزخ کی راہ بتائے گا۔

پھر جب وہ قیامت کے دن اللہ کے سامنے حاضر ہو گا تو اس شیطان سے بے زار ہو گا جو اس پر متعین کیا گیا تھا اور کہے گا: اے کاش! مجھ میں اور تجھ میں مشرق اور مغرب جتنی دوری ہوتی، تو برا ساتھی ہے۔ بعض نے ''حَتّٰٓی إِذَا جَآءَانَا'' بہ صیغۂ تثنیہ پڑھا ہے، یعنی جس وقت ہمارے پاس آئیں گے وہ شخص اور اس کا قرین۔ امام سعید جریری رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ کافر جس وقت قیامت کے دن اپنی قبر سے اٹھایا جائے گا تو اس کے ہاتھ کے ساتھ ایک شیطان جوڑا جائے گا جو اس سے علاحدہ نہ ہو گا یہاں تک کہ اللہ عزوجل دونوں کو نار کی طرف پہنچا دے گا، چنانچہ وہ اس وقت کہے گا ﴿يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ﴾[1] مشرقین سے اس جگہ وہ مسافت مراد ہے جو مشرق اور مغرب کے درمیان ہے، یہاں صرف تغلیب کے لیے اس کا استعمال کیا گیا ہے، جس طرح کہ چاند اور سورج کو ''قَمَرَان'' اور عمر اور صدیق رضی اللہ عنہما کو ''عمران'' اور ماں باپ کو ''أبوان'' بولتے ہیں۔ یہ قول امام ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔[2]

پھر فرمایا: ﴿وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ﴾ یعنی آج کے دن تمھارا عذابِ نار میں جمع ہونا اور درد ناک عذاب میں شریک ہونا ہرگز تمھارے کام نہ آئے گا۔ قوله جلت عظمته: ﴿اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَمَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ یعنی بہروں کو سنانا اور اندھوں کو دکھانا اور صریح بھکوں

---

(1) تفسير الصنعاني (١٩٦/٣) (2) تفسير الطبري (٦٠٧/٢١)

ہوؤں کو راہ پر لانا تیرے ذمے نہیں ہے۔ تیرے ذمے تو صرف ان کو پہنچا دینا ہے، ان کی ہدایت تجھ پر لازم نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے راہ پر لاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بہکاتا ہے اور وہ اس بات میں عادل حاکم ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں سے انتقام ضرور لیا جائے گا:

پھر فرمایا: ﴿ فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ﴾ یعنی یہ ضرور ہے کہ ہم ان سے انتقام لیں گے اور ان کو عذاب کریں گے، گو تو دنیا سے چلا جائے، یا ہم تجھ کو وہ شے دکھا دیں جس کا ہم نے ان کو وعدہ دیا ہے۔ چنانچہ ہم ان پر قدرت رکھنے والے ہیں، یعنی ہم دونوں باتوں پر قادر ہیں۔ اللہ پاک نے اپنے نبیِ کریم ﷺ کو اس دنیا سے نہیں اٹھایا، جب تک کہ آپ ﷺ کی چشمِ مبارک کو آپ ﷺ کے دشمنوں سے ٹھنڈا نہیں کیا اور آپ ﷺ کو ان کی چوٹیوں میں حاکم بنا دیا اور ان کے قلعوں میں جو کچھ سامان و اسباب تھا، اس سب کا آپ ﷺ کو مالک بنا دیا۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ.

یہ معنی امام سدی رحمہ اللہ کے قول کے ہیں اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے معمر سے روایت کیا ہے، کہا ہے کہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ﴾.

پھر کہا کہ نبی اکرم ﷺ چلے گئے اور انتقام باقی رہا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیِ مکرم ﷺ کو ان کی امت میں کوئی شے نہیں دکھائی جس کو آپ ﷺ ناپسند رکھیں یہاں تک کہ آپ ﷺ تشریف لے گئے اور کبھی کوئی نبی نہیں ہوا مگر اس نے اپنی امت میں عقوبت دیکھی مگر تمھارے نبیِ کریم ﷺ نے نہ دیکھی۔ اور ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو وہ شے دکھا دی گئی تھی جو آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی امت کو پہنچے گی، پس آپ ﷺ ہنستے ہوئے یا خوش ہوتے ہوئے نہیں دیکھے گئے، یہاں تک کہ اللہ عزوجل نے آپ ﷺ کو قبض فرمایا۔

بروایت سعید بن ابی عروبہ عن قتادہ بھی اس کے مثل بیان کیا گیا ہے۔ پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے حسن رحمہ اللہ سے بھی اس کے مثل روایت کیا ہے۔[1] حدیث شریف میں ہے: «اَلنُّجُوْمُ أَمَنَةٌ لِّلسَّمَاءِ فَإِذَا ذَهَبَتِ النُّجُوْمُ أَتَى السَّمَاءَ مَا تُوْعَدُ وَأَنَا أَمَنَةٌ لِأَصْحَابِيْ فَإِذَا ذَهَبْتُ أَتَى أَصْحَابِيْ مَا يُوْعَدُوْنَ»[2] یعنی تارے آسمان کے لیے امان ہیں، چنانچہ جب تارے جاتے رہیں گے تو آسمان کو وہ شے آ لے گی جس کا اس کو وعدہ دیا جاتا ہے اور میں اپنے اصحاب کے لیے امان ہوں، پھر جب میں چلا گیا تو میرے اصحاب کو وہ شے آ لے گی جس کا ان کو وعدہ دیا جاتا ہے۔

وحی کو مضبوط تھامنے کا حکم:

پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ یعنی تو قرآن کو مضبوط پکڑ جو تیرے دل پر نازل کیا گیا ہے، بے شک وہی حق ہے اور جس شے کی طرف وہ راہ بتاتا ہے وہی حق ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (٢١/٦٠٩، ٦٠٨) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣١)

اور اللہ تعالیٰ کے صراطِ مستقیم کی طرف پہنچا دیتا ہے جو جنّاتِ نعیم اور ہمیشہ قائم رہنے والی خیر کی طرف پہنچانے والا ہے۔ پھر اللہ جل جلالہ نے فرمایا: ﴿ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ﴾ یعنی بے شک قرآن البتہ تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے شرف ہے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، قتادہ، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ کا ہے اور اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ [1] اس کے سوا اور کوئی قول بیان نہیں کیا۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے اس جگہ معاویہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث روایت کی ہے، کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ فرماتے تھے کہ بے شک یہ امر قریش میں ہے، اس بارے میں جو بھی ان سے جھگڑے گا، اس کو اللہ تعالیٰ منہ کے بل اوندھا کر دے گا، جب تک کہ وہ دین کو قائم رکھیں گے۔ [2] (أخرجه البخاري)

﴿ ذِكْرٌ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ان کے لیے قرآن شریف ہے، اس لحاظ سے کہ وہ ان کی زبان میں اتارا گیا ہے، چنانچہ وہ سب لوگوں سے بڑھ کر اس کو سمجھتے ہیں، اس لیے کہ وہ سب سے بڑھ کر اس کے ساتھ قیام کرنے والے ہوں اور سب سے زیادہ اس کے مقتضا پر عمل کرنے والے ہوں۔ ان کے بہتر، برگزیدہ اور خاص لوگ اسی طرح کے تھے، مہاجرین سابقین اولین میں سے اور جو اُن کے مشابہ و تابع ہیں۔ کسی نے کہا: اس کے یہ معنی ہیں کہ بے شک قرآن البتہ تذکیر (نصیحت) ہے، تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے۔ اور خاص طور پر ان لوگوں کا ذکر کرنے سے ان کے سوا دوسرے لوگوں کی نفی نہیں ہوتی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ١٠] ”یقیناً ہم نے تمھاری جانب کتاب نازل فرمائی ہے جس میں تمھارے لیے ذکر ہے، کیا پھر بھی تم عقل نہیں رکھتے؟“ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٢١٤] ”اور اپنے قریبی رشتے داروں کو ڈرا دے۔“ قوله تعالیٰ: ﴿ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ﴾ یعنی تم سے اس قرآن کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ تم اس پر عمل کرنے میں کیسے تھے اور اس کے ماننے میں کیسے تھے۔

قوله تعالیٰ: ﴿ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴾ یعنی سارے رسولوں نے اس شے کی طرف دعوت دی جس کی طرف تو نے لوگوں کو بلایا، یعنی اللہ وحدہ لا شریک لہ کو پوجنا اور بتوں کو پوجنے سے منع کیا، جیسا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل: ٣٦] ”ہم نے ہر اُمت میں رسول بھیجا کہ (لوگو!) صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمام معبودوں سے بچو۔“ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں یوں ہے: ”وَاسْأَلِ الَّذِيْنَ أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ رُسُلَنَا“ اور اسی طرح امام قتادہ، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ نے بھی سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس کو روایت کیا ہے۔ گویا یہ تفسیر ہے تلاوت نہیں ہے۔ واللّٰه أعلم۔

[1] تفسیر الطبري (٢١/ ٦١٠، ٦١١) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٣٠٩) تفسیر البغوي (٧/ ٢١٥)

عبدالرحمان بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا: اور پوچھ اُن سے شبِ معراج میں، اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام آپ کے لیے جمع کیے گئے تھے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے۔[1] واللہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ "عَشَوْتُ إِلَی النَّارِ" کے یہ معنی ہیں کہ میں نے آگ کا قصد کیا اور "عَشَوْتُ عَنِ النَّارِ" کے معنی یہ ہیں کہ میں نے آگ سے اعراض کیا جس طرح کہ "عَدَلْتُ إِلَی فُلَانٍ" کے معنی ہیں کہ میں فلاں کی طرف مائل ہوا اور "عَدَلْتُ عَنْهُ" کے معنی ہیں کہ میں اس سے مائل ہوا۔ امام فراء، زجاج، ابوالہیثم اور ازہری رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ اس بنا پر یہ معنی ہیں کہ جو کوئی رحمان کی یاد سے اعراض کرے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو کوئی قرآن سے اور اس حکمت سے جو اس میں ہے، گمراہ کرنے والوں کے باطل کی طرف اعراض کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو ایک شیطان کے ساتھ عقاب کرے گا کہ اس کو اس کے ساتھ متعین کر دے گا، یہاں تک کہ وہ اس کو گمراہ کرے گا اور ہر وقت اس کا ساتھی رہے گا۔ پھر وہ راہ نہ پائے گا واسطے اس کے جزا دینے کے جبکہ ظاہرِ حق پر باطل کو اختیار کیا۔ امام خلیل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "عشو" کمزور نظر ہے۔

امام ابوعبیدہ اور اخفش رحمہما اللہ نے کہا کہ ﴿وَمَنْ يَعْشُ﴾ کے معنی ہیں: "مَنْ تُظْلِمُ عَيْنُهُ" یعنی جس کسی کی آنکھ تاریک ہو جائے۔ یہ قول امام خلیل رحمہ اللہ کے قول کی طرح ہے۔ یہ معنی جمہور کی قراءت کی بنا پر ہیں کہ انھوں نے "یعش" کو بہ ضمِ شین پڑھا ہے "عَشَا يَعْشُوْ" سے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام عکرمہ رحمہ اللہ نے بہ فتحِ شین پڑھا ہے اس محاورے سے کہ جب آدمی اندھا ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں: "عَشِيَ الرَّجُلُ يَعْشَى عَشْيًا"۔ امام جوہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "عَشَا" مقصور "أَعْشَى" کا مصدر ہے۔ "عشی" اس شخص کو کہتے ہیں جسے رات کو دکھائی نہیں دیتا اور دن کو دکھائی دیتا ہے اور ایسی عورت کو "عَشْوَى" کہتے ہیں۔ کسی نے "يَعْشُوْا" واو کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ کلمۂ ﴿مَنْ﴾ موصولہ ہے، اس میں شرط کے معنی شامل نہیں ہیں۔ جمہور نے ﴿نُقَيِّضْ﴾ بہ نون پڑھا ہے اور سُلمی وغیرہ، (ابن ابی اسحاق، یعقوب، عصمہ عن عاصم اور اعمش رحمہم اللہ) نے بہ یائے تحتیہ بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بہ یائے تحتیہ بہ صیغۂ مجہول و رفعِ "شیطان" پڑھا ہے بنا بر نائب فاعل۔[2]

حاصل یہ ہے کہ جو کوئی اعراض کرے اور اندھا بنے اور رحمان کی یاد سے تجاہل اور تغافل کرے، اس کے عذاب سے نہ ڈرے اور اس کے ثواب کا ارادہ نہ کرے، یا قرآن سے اپنی پیٹھ پھیرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک شیطان متعین کرے اس کے کفر کا بدلہ لینے کے لیے اور وہ شیطان اس کا ساتھی ہو دنیا میں تو اس کو حلال سے روکے

---

[1] تفسیر الطبري (٦١١/٢١، ٦١٢) تفسیر ابن کثیر (١٦١/٤، ١٦٢)
[2] تفسیر القرطبي (٨٩/١٦، ٩٠) فتح القدیر (٧٢٦/٤، ٧٢٧)

اور حرام پر آمادہ کرے اور اللہ کی اطاعت سے اس کو روکے اور معصیت کا اسے حکم دے اور اس سے جدا نہ ہو۔ یا یوں کہو کہ یہ شخص شیطان کا ملازم ہو، اس سے علاحدہ نہ ہو، بلکہ اپنے تمام معاملات میں اس کی پیروی کرے اور ہر وسوسے میں اس کا مطیع ہو۔ کسی نے کہا کہ آخرت میں جب اپنی قبر سے کھڑا ہوگا۔[1] یہ قول سعید جریری رحمہ اللہ کا ہے اور پہلے گزر چکا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں شیطان اس کے ساتھ ہو۔ امام قشیری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صحیح قول یہی ہے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے محمد بن عثمان مخزومی سے روایت کیا ہے کہ قریش نے کہا کہ محمد ﷺ کے اصحاب میں سے ہر شخص کے لیے ایک آدمی کو متعین کرو کہ وہ اسے پکڑ لے۔ چنانچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے طلحہ بن عبیداللہ کو مقرر کیا تو وہ ان کے پاس آیا اور اس کے ساتھ اس کی قوم بھی تھی۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو مجھے کس چیز کی طرف دعوت دیتا ہے؟ طلحہ نے کہا کہ میں تجھے لات اور عزیٰ کی عبادت کی طرف بلاتا ہوں۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ بولے: لات کیا ہے؟ طلحہ نے کہا: اللہ کی اولاد۔ فرمایا: اور عزیٰ کیا ہے؟ کہا: اللہ کی بیٹیاں۔ فرمایا: پھر ان کی ماں کون ہے؟ طلحہ چپ ہو گیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ پھر طلحہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس مرد کو جواب دو تو قوم چپ رہی۔ چنانچہ طلحہ نے کہا: اے ابوبکر! تو کھڑا ہو "أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی۔[2]

صحیح مسلم وغیرہ میں ثابت ہوا ہے کہ ہر مسلمان کے ساتھ جنوں میں سے ایک ساتھی ہے۔[3] ﴿ وَإِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ ﴾ یعنی اور بے شک وہ شیاطین جن کو اللہ پاک ہر اس شخص کے لیے متعین کرتا ہے جو رحمان کی یاد سے اعراض کرتے ہیں۔ چنانچہ ﴿ مَنْ ﴾ کے معنی یہی ہیں، البتہ وہ ان کو راہ سے روکتے ہیں، یعنی ان کے اور راہِ حق کے درمیان حائل ہوتے ہیں اور ان کو اس سے منع کرتے ہیں اور ان کے جی میں یہ وسوسہ ڈالتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں، یہاں تک کہ وہ ان کے وسوسے کو سچا سمجھیں۔ یہ اس قول کے معنی ہیں: ﴿ وَيَحْسَبُوْنَ أَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ یعنی کفار یہ خیال کرتے ہیں کہ شیاطین راہ پائے ہوئے ہیں تو وہ اُن کی اطاعت کریں۔ یا اس وسوسے کے سبب سے کفار یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ خود راہ پائے ہوئے ہیں۔

چار فعلوں میں صیغۂ مضارع اس لیے ہے کہ استمرار تجددی معلوم ہو اس قول کے سبب سے: ﴿ حَتّٰٓى إِذَا جَآءَنَا ﴾ کیوں کہ اگرچہ ﴿ حَتّٰٓى ﴾ ابتدائیہ ہے اور جملہ شرطیہ پر داخل ہے، لیکن وجوباً اس بات کا مقتضی ہے کہ غایت ہو ایک امرِ ممتد کے لیے۔ چنانچہ یہ بات کئی بار گزر چکی ہے۔[4] (قاله أبو السعود)

جمہور نے "جَاءَا" بہ صیغۂ تثنیہ پڑھا ہے، یعنی کافر اور اس کا ساتھی شیطان۔ جب کہ ابوعمرو وغیرہ (امام حمزہ، کسائی اور حفص رحمہم اللہ) نے بہ افراد پڑھا ہے، یعنی یہاں تک کہ جب کافر یا اُن میں سے ہر ایک ہمارے پاس آئے

---

[1] تفسير الطبري (٦٠٧/٢١) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٨٣/١٠)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨١٤) [4] تفسير أبي السعود (٤٧/٨)

گا تو کافر شیطان سے مخاطب ہو کر کہے گا: اے کاش! دنیا میں میرے اور تیرے درمیان اتنی دوری ہوتی جتنی مشرق اور مغرب کے درمیان ہے۔ مشرق کو مغرب پر تغلیب دے کر ﴿ اَلْمَشْرِقَيْنِ ﴾ فرمایا ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کافر اس بات کی تمنا کرے گا کہ دونوں میں اتنی دوری ہوتی جتنی کہ سال میں مشرق اور مغرب کے سب سے دور والے کنارے میں ہوتی ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے اور امام فراء رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[1] ﴿ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴾ کا مخصوص بالذم محذوف ہے "أَيْ: أَنْتَ أَيُّهَا الشَّيْطَانُ"، یعنی چنانچہ اے شیطان! تو کیا بُرا ساتھی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس بات کی حکایت فرمائی جو قیامت کے دن ان سے کہی جائے گی۔

﴿ وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴾ جمہور نے ﴿ اَنَّكُمْ ﴾ کو بہ فتحِ "أَنَّ" پڑھا ہے، اس بنا پر کہ "أَنَّ" مع اپنے ما بعد کے محلِ رفع میں ہے بنا بر فاعلیت، یعنی دنیا میں تمھارے اپنی جانوں کو ظلم کرنے کے سبب سے تمھارا عذاب میں اکٹھے شریک ہونا کوئی فائدہ نہ دے گا۔ مفسرین نے کہا ہے کہ ان کے اشتراک کے سبب سے ان سے کچھ عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا، اس لیے کہ کفار اور شیاطین میں سے ہر ایک کے لیے عذاب کا پورا پورا حصہ ہے۔ یہ معنی تو اس بنیاد پر تھے کہ کلمۂ ﴿ اِذْ ﴾ سببیہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اِذْ ﴾ بدل ہے ﴿ اَلْيَوْمَ ﴾ سے، اگرچہ ﴿ اَلْيَوْمَ ﴾ حاضر کے لیے ہے اور ﴿ اِذْ ﴾ زمانۂ ماضی کے لیے ہے، لیکن چونکہ اس دن یہ بات ظاہر ہو گئی کہ دنیا میں انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اس لیے بدل ہونا ٹھیک ہوسکتا ہے۔ یعنی تم کو تمھارا عذاب میں شریک ہونا ہرگز نفع نہ دے گا، اس وقت جب کہ تم پر یہ بات کھل گئی کہ دنیا میں تم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا۔ کسی نے کہا کہ کلمۂ "إن" فائدہ نہ ہونے کی وجہ بتانے کے لیے ہے، یعنی آج کے دن عذر کرنا اور پشیمان ہونا تم کو ہرگز فائدہ نہ دے گا، اس لیے کہ تم اور تمھارے ساتھی آج عذاب میں شریک ہو جیسے تم دنیا میں اس کام میں شریک تھے جو اس عذاب کا سبب بنا ہے۔ "إنّ" کی قراءت بالکسر اس معنی کو تقویت دیتی ہے۔ (یہ قراءت ابن عامر رحمہ اللہ کی ہے۔ علی اختلاف علیه فیها.)[2]

پھر اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ جس شخص کے لیے بدبختی سابق ہو چکی ہے، اس کو وعظ و نصیحت کچھ فائدہ نہیں دیتی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ ﴾ ہمزہ انکار اور تعجب کے لیے ہے۔ تعجب اس بات سے ہے کہ جو لوگ کفر کے خوگر ہو رہے ہیں اور گمراہی میں غرق ہیں یہاں تک کہ ان کی آنکھیں نابینا ہو گئی ہیں اور اس کے ساتھ بہرا پن مل گیا ہے۔ اس حالت کے بعد ہمارے چاہنے کے بغیر تو اُن کی ہدایت پر قادر نہیں ہو گا، یعنی یہ کام تیرا نہیں ہے، چنانچہ اگر وہ کفر کریں تو تیرا سینہ تنگ نہ ہو۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کی تسلی فرمائی ہے اور آپ ﷺ کو یہ خبر دی ہے کہ اللہ عزوجل کے سوا کوئی اور اس پر قدرت نہیں رکھتا۔ امام خطیب رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے، مروی ہے کہ آپ ﷺ ان کی دعا میں کوشش فرماتے تھے اور وہ کفر پر اور زیادہ جم جاتے تھے۔ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی۔ واللہ أعلم.

---

[1] تفسیر القرطبي (١٦/٩٠، ٩١) [2] فتح القدير (٤/٧٢٨)

﴿ وَمَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ معطوف ہے ﴿ اَلْعُمْيَ ﴾ پر مختلف عنوان کی وجہ سے، وگرنہ مصداق ایک ہے۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ یہ کافر بہروں کی طرح ہیں جو اس شے کو سمجھتے نہیں جسے تو لے کر آیا ہے اور اندھوں کی طرح ہیں جو دیکھتے نہیں، اس لیے کہ گمراہی میں بہت اونچے درجے کو پہنچ چکے ہیں اور جہالت پر خوب جمے ہوئے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ﴾ یعنی، پھر اگر ہم تجھ کو لے جائیں اس طرح سے کہ تجھ کو ان پر عذاب نازل کرنے سے پہلے وفات دیں۔ کسی نے کہا ہے کہ مکے سے تجھ کو نکال لیں، بے شک ہم ان سے بدلہ لینے والے ہیں، یا تو دنیا میں یا آخرت میں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو لے گیا اور اس کا انتقام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں میں باقی رہا۔[1]

﴿ اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ﴾ یعنی یا ہم تجھ کو تیری وفات سے پہلے وہ عذاب دکھا دیں جس کا ہم نے ان کو وعدہ دیا ہے، ہم ان پر قدرت رکھنے والے ہیں، جب چاہیں گے ان کو عذاب کریں گے۔ بہت سے مفسروں نے کہا ہے کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ بدر کے دن دکھایا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اس کے قائل ہیں۔ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت اسلام کے حق میں ہے،[2] مراد وہ فتنے ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سخت فتنہ ہوا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اکرام کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے گیا اور اس میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں کچھ نہیں دکھایا۔ جب کہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

﴿ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ﴾ یعنی جس عذاب کا ہم نے وعدہ کیا ہے، اس کو ہم جلدی نازل کر دیں، یا اس کو قیامت کے دن تک مؤخر کر دیں، کچھ بھی ہو، لیکن تو اس شے کو خوب پکڑے رہ جس کی تیری طرف وحی کی گئی ہے، یعنی قرآن شریف، اگرچہ اس کی تکذیب کی جس نے کی۔ ﴿ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ یعنی اس لیے کہ بے شک تو ایک واضح راہ پر ہے۔ یہ وجہ ہے "استمساك" کی یا "استمساك" کے حکم کی۔

﴿ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ﴾ اور بے شک قرآن البتہ تیرے لیے اور تیری قوم قریش کے لیے شرف ہے، کیوں کہ وہ تجھ پر نازل ہوا ہے اور تو اُن میں سے ہے اور یہ تیری اور اُن کی زبان میں ہے۔ اسی طرح کی یہ آیت ہے: ﴿ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ﴾ [الأنبياء: ۱۰] کسی نے کہا ہے کہ تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے اس شے کا بیان ہے جس کی تم کو حاجت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک تذکرہ ہے کہ اس سے دین کے امر کو یاد کرو اور اس پر عمل کرو۔

سیدنا علی اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے قبائل کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرتے تھے اور ان کو غلبے کا وعدہ دیتے تھے، پھر جب وہ کہتے کہ تمھارے بعد ملک کس کے لیے ہو گا؟ تو

---

[1] الدر المنثور (۷/۷۹) [2] تفسير القرطبي (۱۶/۹۲)

آپ ﷺ خاموش ہو جاتے اور ان کو کچھ جواب نہ دیتے، اس لیے کہ اس بارے میں آپ ﷺ کو کچھ امر نہیں کیا گیا تھا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ﴾، پھر اس کے بعد جب آپ ﷺ سے پوچھا جاتا تو فرماتے کہ ملک قریش کے لیے ہوگا تو وہ اس کو قبول نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ انصار نے اس پر اس کو قبول کیا۔[1] (أخرجه ابن عدي وابن مردويه) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ امر قریش میں ہمیشہ رہے گا، جب تک کہ ان میں دو افراد بھی باقی رہیں گے۔[2] (أخرجه الشيخان)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ﴾ یعنی عن قریب تم سے پوچھا جائے گا اس شرف کے متعلق جو اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے ٹھہرایا ہے۔ امام زجاج وکلبی رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ قیامت کے دن ان سے اُن امور کے متعلق سوال کیا جائے گا جو اُن پر لازم ہیں، یعنی جو کچھ اس میں ہے اس پر قائم رہنا، اس پر عمل کرنا، اس کی تعظیم کرنا اور اس نعمت کا شکر ادا کرنا۔ غرضیکہ قرآن شریف جو قریش کے لیے شرف تھا، اس کو تو قبول نہ کیا اور توحید جو سارے رسولوں کا دین تھا، اس کو چھوڑا اور بغیر دلیل کے بتوں کی پرستش کی۔

اس لیے اللہ پاک نے مشرکینِ قریش کی ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت کے لیے اپنے نبیِ مکرم ﷺ کو یہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴾ یعنی تو ہمارے ان رسولوں سے پوچھ جن کو ہم نے تجھ سے پہلے بھیجا کہ کیا ہم نے رحمان کے سوا اور معبود ٹھہرائے جو پوجے جائیں۔ امام زہری، سعید بن جبیر اور ابن زید رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ یہ بات نبیِ کریم ﷺ سے جبرائیل علیہ السلام نے کہی، جب آپ ﷺ کو معراج ہوئی۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام سے اس وقت پوچھنا مراد ہے جب آپ ﷺ ان سے ملے۔ سلف کی ایک جماعت بھی اسی کی قائل ہے۔ امام مبرد اور زجاج رحمہ اللہ اور علماء کی ایک جماعت نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ان رسولوں کی اُمتوں سے سوال کر جن کو ہم نے بھیجا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ امام مجاہد، سدی، ضحاک، قتادہ، عطاء اور حسن رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔[4]

رہی یہ بات کہ سوال کو رسولوں پر واقع کیا اس کے باوجود کہ ان کی اُمتیں مراد ہیں، چنانچہ اس سے مقصود اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ جس بات کے متعلق پوچھا جاتا ہے، وہ بعینہٖ وہی چیز ہے جو رسولوں نے اپنی زبان سے ادا کی ہے نہ کہ وہ بات جس کو ان کے علماء اپنی طرف سے کہتے ہیں۔ پہلے قول کی بنا پر یہ آیت مکی ہوگی، کیوں کہ معراج شریف مکے میں واقع ہوئی ہے اور دوسرے قول کی بنیاد پر آیت مدنی ٹھہرے گی، اس لیے کہ اہلِ کتاب مدینے میں تھے۔

دونوں قولوں کی بنا پر آیت کے معنی ان سے یہ پوچھنا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے پہلی ملتوں میں سے کسی ملت میں

---

[1] الكامل لابن عدي (٤٣٥/٣) الدر المنثور (٣٨٠/٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٢٠)

[3] فتح القدير (٧٢٨/٤) [4] تفسير القرطبي (٩٥/١٦، ٩٦) فتح القدير (٧٢٨/٤، ٧٢٩)

بت پوجنے کی اجازت دی ہے اور اُن میں سے کسی کے لیے اس کو جائز رکھا ہے۔ اس سوال کا مقصد مشرکینِ قریش کو اس طرح سے ڈانٹنا ہے کہ جس بات پر وہ جمے ہوئے ہیں، وہ کسی ایک شریعت میں نہیں آئی۔ کسی نے کہا کہ رسولوں سے سوال سے حقیقی سوال مراد نہیں ہے، بلکہ مجاز ہے نظر سے، یعنی ان کے دینوں میں غور وفکر اور نظر کر اور ان کی ملتوں میں جستجو کر کہ کیا کبھی کسی نبی کی ملت میں بتوں کا پوجنا آیا ہے۔ آپ ﷺ کے لیے تو یہی تلاش ونظر کافی ہے کہ اللہ پاک کی کتاب معجز میں دیکھیں اور تلاش کریں کون سی کتاب؟ وہ جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس میں یہ خبر دی ہے کہ وہ اللہ کے سوا اس شے کو پوجتے ہیں جس کے ساتھ اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی اور خود یہی آیت کافی ہے، اس کے علاوہ کسی اور آیت کی ضرورت نہیں ہے۔

بالجملہ جبکہ اللہ پاک نے اپنے نبی ﷺ کو یہ خبر دی کہ وہ ان کے لیے ان کے دشمنوں سے انتقام لینے والا ہے اور توحید پر تمام انبیاء علیہم السلام کے اتفاق کا ذکر کیا تو اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ بیان کیا اور جو انتقام اور عذاب فرعون اور اس کی قوم پر نازل ہوا اس کا بیان کیا۔ یا یوں کہو کہ جب کفارِ قریش نے رسول اللہ ﷺ کی نبوت میں یہ طعن کیا کہ آپ فقیر ہیں اور جاہ و مال نہیں رکھتے تو اللہ پاک نے یہ بیان کیا کہ اس کے بعد کہ موسیٰ علیہ السلام اتنے زبردست معجزے لایا جن کی صحت میں کوئی عقل مند شک نہیں کرتا تو فرعون نے اس پر بھی شبہہ وارد کیا جس کا ذکر کفارِ قریش نے کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:[1]

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّيْ
رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٤٦ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ۝٤٧
وَمَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ۫ وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝٤٨ وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ
عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ۝٤٩ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ
يَنْكُثُوْنَ ۝٥٠ وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ
مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝٥١ اَمْ
اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ۝٥٢ فَلَوْلَآ
اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ۝٥٣
فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝٥٤ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا

[1] فتح البیان (۱۲/۳۵۳_۳۵۸)۔

انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٥٥﴾ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ﴿٥٦﴾

اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس (کی قوم) کے سرداروں کی طرف بھیجا، چناں چہ موسیٰ نے کہا: بے شک میں رب العالمین کا رسول ہوں ﴿46﴾ پھر جب وہ ان کے پاس ہماری نشانیاں لے کر آیا تو وہیں وہ ان کی ہنسی اُڑانے لگے ﴿47﴾ اور ہم انھیں جو بھی نشانی دکھاتے تھے، وہ اس جیسی (پہلی نشانی) سے زیادہ ہی بڑی ہوتی تھی اور ہم نے انھیں عذاب میں پکڑا، تاکہ وہ (کفر سے) باز آئیں ﴿48﴾ اور انھوں نے کہا: اے ساحر! تیرے رب نے جو تجھ سے (دعا قبول کرنے کا) عہد کر رکھا ہے، اس کے مطابق تو ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر (اب) ہم ضرور ہدایت پانے والے ہیں ﴿49﴾ پھر جب ہم ان سے عذاب دور کر دیتے تو وہیں وہ عہد توڑ دیتے ﴿50﴾ اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کرائی، اس نے کہا: اے میری قوم! کیا میرے لیے مصر کی بادشاہی اور کیا یہ نہریں نہیں جو میرے (محلات کے) نیچے بہتی ہیں؟ کیا پھر تم دیکھتے نہیں؟ ﴿51﴾ بلکہ میں تو اس (موسیٰ) سے کہیں بہتر ہوں جو حقیر ہے اور صاف بول بھی نہیں سکتا ﴿52﴾ پھر اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں اُتارے گئے یا اس کے ساتھ فرشتے صفیں باندھے آتے؟ ﴿53﴾ تب اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا (اور اس کی عقل مار دی) تو انھوں نے اس کی اطاعت کی۔ بلاشبہ وہی لوگ فاسق تھے ﴿54﴾ پھر جب انھوں نے ہمیں غصہ دلایا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور سب کو ڈبو دیا ﴿55﴾ تو یوں ہم نے انھیں گئے گزرے کر دیا اور پچھلوں کے لیے (عبرت کی) مثال بنا دیا ﴿56﴾

موسیٰ علیہ السلام کی فرعون اور اس کی قوم کی طرف بعثت:

اس گرد و پیش کے ملک میں مصر کا حاکم بڑا ہوتا تھا اور نہریں اسی کی بنائی ہوئی تھیں۔ دریائے نیل کا پانی کاٹ کر اپنے باغ میں لایا تھا۔ یہ جو کہا کہ صاف بول بھی نہیں سکتا، یہ موسیٰ علیہ السلام کو کہا۔ یہ جو کہا کہ اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں آ پڑے، یہ اس لیے کہا کہ وہ خود کنگن پہنتا تھا جن میں جواہر جڑے ہوتے تھے، وہ جس امیر پر مہربان ہوتا اس کو سونے کے کنگن پہناتا تھا اور اس کی فوج پرا باندھ کر کھڑی ہوتی تھی۔ انتھٰی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے اور رسول موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ اس نے ان کو فرعون اور اس کی جماعت کی طرف بھیجا، یعنی اس کے امراء، وزراء اور لشکر کے سرداروں کی طرف اور اس کے مطیع، فرمانبردار لوگوں اور بنی اسرائیل کی قبطی رعایا کی طرف بھیجا کہ ان کو اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کی طرف بلائیں

اور ان کو اس کے سوا کی عبادت سے منع کریں۔ ان کے ساتھ بڑی بڑی نشانیاں بھیجیں، جیسے: یدِ بیضا وعصا اور ان کے سوا اور نشانیاں جو اُن کے ساتھ بھیجی گئی تھیں، جیسے: طوفان، ٹڈیاں، چیچڑیاں، خون، کھیتوں، جانوں اور پھلوں کا نقصان۔

اس سب کے باجود انھوں نے ان نشانیوں کی پیروی کرنے اور ان کے لیے مطیع ہونے سے تکبر کیا اور اُن کی تکذیب کی اور اُن سے مسخرا پن کیا اور جو شخص اُن کو لے کر آیا تھا، اس سے ہنسی مذاق کیا۔ جو نشانی ان کے پاس آتی وہ دوسری سے بڑی ہوتی۔ اس کے باوجود وہ اپنی گمراہی اور جہالت اور فساد سے باز نہ آئے۔ جب کبھی ان نشانیوں میں سے کوئی نشانی ان کے پاس آتی تو موسیٰ علیہ السلام کے پاس آ کر زاری کرتے اور ان کے ساتھ لطافت اور نرمی سے پیش آتے اور یوں کہتے کہ اے ساحر! یعنی اے عالم! یہ قول امام ابن جریر رحمہ اللہ کا ہے۔[1] ان کے وقت کے علماء ساحر لوگ تھے، ان کے زمانے میں ان کے نزدیک سحر قابلِ مذمت نہیں تھا۔ چنانچہ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو جو ساحر کہا تو یہ ان کی طرف سے بطور تنقیص نہ تھا، کیوں کہ یہ حالت تو ان کی ضرورت کی حالت تھی، ایسی ضرورت کی حالت میں تنقیص مناسب نہیں ہے، ان کے زعم میں یہ ساحر کہنا موسیٰ علیہ السلام کی تعظیم ہی تھی۔

چنانچہ ہر دفعہ موسیٰ علیہ السلام سے یہ وعدہ کرتے کہ اگر ان سے یہ عذاب دور کر دیا جائے تو ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو اُن کے ساتھ بھیج دیں گے اور ہر بار اپنے عہد و پیمان کو توڑ ڈالتے تھے۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَىِٕنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۱۳۳۔ ۱۳۵] ''پھر ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور ٹڈیاں اور گھن کا کیڑا اور مینڈک اور خون کہ یہ سب کھلے کھلے معجزے تھے۔ سو وہ تکبر کرتے رہے اور وہ لوگ کچھ تھے ہی جرائم پیشہ۔ اور جب ان پر کوئی عذاب واقع ہوتا تو یوں کہتے کہ اے موسیٰ! ہمارے لیے اپنے رب سے اس بات کی دعا کر دیجیے! جس کا اس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے، اگر آپ اس عذاب کو ہم سے ہٹا دیں تو ہم ضرور ضرور آپ کے کہنے سے ایمان لے آئیں گے اور ہم بنی اسرائیل کو بھی (رہا کر کے) آپ کے ہمراہ کر دیں گے۔ پھر جب ان سے اس عذاب کو ایک خاص وقت تک کہ اس تک ان کو پہنچنا تھا ہٹا دیتے، تو وہ فوراً ہی عہد شکنی کرنے لگتے۔''

فرعون کا اپنی قوم سے خطاب اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مؤاخذہ:

پھر اللہ پاک نے فرعون کی اور اس کی سرکشی و کفر و عناد کی خبر دی کہ اس نے اپنی قوم کو جمع کیا، پھر مصر پر اپنی

[1] تفسیر الطبري (۲۱/ ٦١٥)

حکومت اور غلبے پر خوش ہو کر اور فخر و ناز کر کے ان میں منادی کرائی کہ کیا میرے لیے ملکِ مصر کی بادشاہت نہیں ہے اور یہ جو نہریں میرے نیچے سے بہہ رہی ہیں؟ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان کے باغ تھے اور پانی کی نہریں تھیں۔[1] اور کہا: کیا تم میری اس عظمت اور حکومت کو نہیں دیکھتے جس میں کہ میں ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ موسیٰ اور ان کے اتباع فقیر اور ضعیف ہیں۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿23﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿24﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴾ [النازعات: ۲۳۔ ۲۵] ”پھر سب کو جمع کر کے پکارا: میں تمھارا سب سے بڑا رب ہوں۔ تب اللہ نے بھی اسے آخرت کے اور دنیا کے عذاب میں گرفتار کر لیا۔“

امام سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ﴾ میں کلمۂ ﴿ اَمْ ﴾ بہ معنی ”بل“ ہے، یعنی فرعون بولا: بلکہ میں اس شخص سے بہتر ہوں جو ذلیل ہے۔ اسی طرح بعض بصری نحویوں نے بھی کہا ہے کہ اس جگہ ﴿ اَمْ ﴾ بہ معنی ”بل“ ہے۔ اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے جو امام فراء رحمہ اللہ نے بعض قراء سے روایت کی ہے کہ انھوں نے یوں پڑھا ہے: ”أَمَا أَنَا خَيْرٌ مِنْ هَذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ“. امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر یہ قراءت صحیح ہوتی تو اس کے معنی بھی صحیح اور واضح ہوتے، لیکن یہ قراءت امصار کے خلاف ہے، کیوں کہ انھوں نے ﴿ اَمْ اَنَا خَيْرٌ ﴾ پڑھا ہے بنا بر استفہام۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہر تقدیر پر فرعون ۔لعنه الله۔ کی مراد یہی ہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام سے بہتر ہے، حالاں کہ اس نے اس بات میں صریح جھوٹ بولا ہے۔ فعليه لعائن الله المتتابعة إلى يوم القيامة.[2]

﴿ مَهِيْنٌ ﴾ سے اس کی مراد حقیر ہے، جیسا کہ سفیان رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ امام قتادہ وسدی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد ضعیف ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی اس کے لیے نہ ملک ہے نہ سلطان اور نہ مال۔[3] ﴿ وَلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴾ یعنی وہ اپنی بات کو خوب صاف طور پر کہہ بھی نہیں سکتا، چنانچہ وہ غبی اور زباں بستہ (کند ذہن اور زباں بند) ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”لَا يَكَادُ يُفْهِمُ“ یعنی وہ اپنی بات دوسرے کو سمجھا نہیں سکتا۔ امام قتادہ، سدی اور ابن جریر رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یعنی ”عيي اللسان“ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی زبان بات کرنے سے عاجز ہے۔ امام سفیان رحمہ اللہ کہتے ہیں: مراد یہ ہے کہ اس انگارے کی وجہ سے جو موسیٰ علیہ السلام نے بچپن میں اپنے منہ میں رکھ لیا تھا، ان کی زبان میں کچھ نقص تھا۔[4] یہ جو فرعون نے کہا یہ بالکل جھوٹ ہے اور کفر و عناد سے اس کو بنایا ہے۔ وہ موسیٰ علیہ السلام کو کافر اور بدبخت کی آنکھ سے دیکھتا تھا، حالانکہ وہ جلالت اور عظمت اور رونق کی وجہ سے ایسی صورت میں تھے جو عقل والوں کو حیران کرتے تھے۔ اس کا موسیٰ علیہ السلام کو ﴿ مَهِيْنٌ ﴾ کہنا سراسر جھوٹ تھا، بلکہ پیدائش، اخلاق اور دین کے

---

[1] تفسير الطبري (٢١/٦١٦، ٦١٧) [2] تفسير الطبري (٢١/٦١٧، ٦١٨) تفسير ابن كثير (٤/١٦٣)

[3] تفسير الطبري (٢١/٦١٨) [4] تفسير الطبري (٢١/٦١٩) تفسير ابن كثير (١٦٣، ١٦٤)

لحاظ سے وہی ﴿ مَهِيْنٌ ﴾ اور حقیر تھا اور شریف، رئیس، صادق، نیکوکار، راشد اور راہ یاب موسیٰ علیہ السلام ہی تھے اور اس کا ﴿ وَلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴾ کہنا بھی افتراء اور جھوٹ تھا، اگرچہ ان کی کم سنی کی حالت میں اس انگارے سے ان کی زبان میں کچھ نقص ہو گیا تھا۔

چنانچہ انھوں نے اللہ عزوجل سے یہ دعا مانگی تھی کہ ان کی زبان سے ایک گرہ کھول دے، تاکہ لوگ ان کی بات سمجھ لیں۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی۔ چنانچہ اس کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴾ [طٰہٰ: ٣٦] ''اے موسیٰ! تیرے تمام سوالات پورے کر دیے گئے۔'' اور برتقدیر اس کے کہ کوئی شے باقی رہ گئی جس کو دور کرنے کا سوال نہ کیا، جیسا کہ حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے اور صرف اس قدر زائل ہونے کا سوال کیا کہ اس کے ساتھ وہ رسالت کو پہنچا سکیں اور سمجھا سکیں۔ پھر بھی جو چیزیں پیدایشی ہوں اور بندے کے فعل سے نہیں ہیں، ان کے سبب سے عیب نہیں لگایا جاتا اور نہ ہی ان کی وجہ سے مذمت کی جاتی ہے۔ فرعون اگرچہ اس بات کو سمجھتا تھا اور اس کو عقل تھی، چنانچہ وہ اس کو جانتا تھا، لیکن اس نے صرف اپنی رعایا پر اس بات کا رواج دینا چاہا، اس لیے کہ وہ جاہل اور کند ذہن تھے۔ اسی طرح اس کی یہ بات ہے: ﴿ فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ ﴾۔ ﴿ اَسْوِرَةٌ ﴾ وہ زیور ہے جو ہاتھوں میں ڈالا جاتا ہے، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے اور امام قتادہ رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ یعنی اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں ڈالے گئے۔[1] ﴿ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴾ یعنی یا اس کے ساتھ فرشتے آتے جو اس کی خدمت کے لیے اس کو گھیرے رہتے اور اس کی تصدیق کرتے اور راستی کی گواہی دیتے۔

یہ بات اس نے ظاہری شکل کی طرف نظر کر کے کہی اور اس کے معنی کی حقیقت کو نہیں سمجھا جو اس شے سے زیادہ ظاہر و واضح تھی، جس کی طرف اس نے نظر کی۔ اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ﴾ یعنی ان کی عقلیں ہلکی کر دیں اور ان کو گمراہی کی طرف بلایا، چنانچہ انھوں نے اسی کا کہا مانا۔ ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴾ بے شک وہ نافرمان لوگ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ لفظ روایت کیا ہے ''أَسْخَطُوْنَا'' اور ضحاک رحمہ اللہ نے ان سے ''أَغْضَبُوْنَا'' روایت کیا ہے اور اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ، سعید بن جبیر، محمد بن کعب قرظی، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہ مفسرین نے بھی کہا ہے،[2] یعنی پھر جب انھوں نے ہم کو خفا کیا تو ہم نے ان سب کو ڈبو دیا۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب تو دیکھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ بندے کو عطا کرے جو کچھ وہ چاہے، حالاں کہ وہ معاصی پر مقیم ہے تو یہ صرف اس کی طرف

[1] تفسير الطبري (٢١/٦١٩) [2] تفسير الطبري (٢١/٦٢٢)

سے اس کے لیے استدراج ہے، (یعنی بندے کو آہستہ آہستہ اتارنا کہ وہ معصیت کرتا رہے اور وہ اس کی مرضی کے مطابق نعمتیں اس کو دیتا رہے، تاکہ معاصی میں خوب غرقاب ہو جائے اور آخر کو پھر پکڑ ہے۔) پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾۔[1] طارق بن شہاب رحمہ اللہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں، کہا: میں عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھا تو ان کے پاس ناگہانی موت کا ذکر کیا گیا تو فرمایا کہ وہ مومن پر تخفیف ہے اور کافر پر حسرت ہے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾۔[2] عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے نعمت کو غفلت کے ساتھ پایا، یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ قول: ﴿ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ﴾ ابو مجلز رحمہ اللہ کہتے ہیں: پھر کر دیا ہم نے ان کو سلف اس شخص کے لیے جس نے ان کے عمل جیسا عمل کیا اور امام ابو مجلز اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَمَثَلًا ﴾ یعنی اور اس شخص کے لیے عبرت جو اُن کے بعد ہے۔[3] واللّٰہ سبحانہ وتعالٰی الموفق للصواب وإلیه المرجع والمآب.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ اللہ پاک فرماتا ہے کہ البتہ واقعی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کے ملاء کی طرف اپنی نشانیاں دے کر بھیجا۔ یہ وہی نو نشانیاں ہیں جن کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔ مراد قبط کے شرفاء ہیں۔ چنانچہ کہا: میں رب العالمین کا بھیجا ہوا ہوں، یعنی اسی نے مجھ کو تمھاری طرف بھیجا ہے۔ اس بات کے کہنے کے وقت جو جواب انھوں نے دیا، وہ محذوف ہے۔ ﴿ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جواب یہ ہے کہ ان سے ان کے دعویٰ پر دلیل طلب کی اور معجزوں کا مطالبہ کیا، پھر جب وہ ان کے پاس ہماری نشانیاں لے کر آیا یعنی ان کے حسبِ فرمائش، تب وہ ان سے استہزاء اور ٹھٹھے کے طور پر ہنسنے لگے۔

"لَمَّا" کا جواب ﴿ اِذَا ﴾ فجائیہ ہے۔ اس لیے تقدیر یہ ہے: "فَاجَاءُوْا وَقْتَ ضِحْكِهِمْ مِنْهَا" یعنی معجزوں کے دیکھتے ہی بغیر سوچے سمجھے اور غور کیے ان سے مسخرا پن کرنے لگے۔ اور ہم ان کو جو بھی نشانی دکھاتے تھے وہ اس کے ساتھ والی، یعنی پہلی نشانی سے بڑی ہوتی تھی، یعنی موسیٰ علیہ السلام کے معجزوں میں سے ہر معجزہ پہلے والے معجزے سے بڑا تھا اور قدر کے لحاظ سے بڑا تھا، اس کے باوجود کہ پہلے والا معجزہ بھی فی نفسہٖ عظیم تھا۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۲۸۳/۱۰، ۳۲۸٤) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے، البتہ آیت کے ذکر کے علاوہ یہ روایت صحیح ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث: ٤١٣)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۲۸٤/۲۱)

[3] تفسیر الطبري (٦٢٤/۲۱) تفسیر ابن کثیر (١٦٢/٤-١٦٤)

کسی نے کہا: اس عبارت سے مراد یہ ہے کہ وہ سب معجزے بڑے تھے اور ایسے نہیں لگتے تھے کہ بڑائی میں ان میں کوئی فرق ہو۔ اسی معنی کی بنا پر لوگوں کا یہ قول ہے: ''هُمَا أَخَوَانِ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا أَكْبَرُ مِنَ الآخَرِ'' یعنی وہ دونوں دو بھائی ہیں، ان میں سے ہر ایک اکبر ہے دوسرے سے۔ مطلب یہ کہ بڑے پن میں دونوں برابر ہیں۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ پہلا معجزہ مقتضی ہے علم کا اور دوسرا بھی مقتضی ہے علم کا، پھر جب دوسرا پہلے کے ساتھ ملایا گیا تو اس کی وضاحت اور اظہار اور زیادہ ہوگیا۔ نشانیوں کے درمیان ''إخوة'' کے یہ معنی ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی سچائی بتانے میں وہ سب معجزے باہم ہم شکل وہم صورت ہیں اور ایک دوسرے سے مناسبت اور مشابہت رکھتے ہیں جس طرح کہ بھائی بہنوں کے درمیان آپس میں مناسبت اور مشابہت ہوتی ہے جس طرح کہ بولتے ہیں: ''هٰذِهِ صَاحِبَةُ هَذِهِ'' یعنی یہ عورت اس عورت کی مصاحب ہے۔ یعنی باہم ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ اسی طرح یہاں ہے کہ ایک معجزہ مقصد کے لحاظ سے دوسرے کا قرین (ساتھی) ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نشانیوں میں سے ہر نشانی جب اکیلی ہو تو گمان کرنے والا یہ گمان کرے کہ وہ باقی نشانیوں سے بڑی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ ﴾ یعنی ہم نے ان کو عذاب کے ساتھ پکڑا اس سبب سے کہ انھوں نے ان نشانیوں کی تکذیب کی۔ عذاب سے مراد وہی قحط سالی، طوفان، جراد، قمل، ضفادع، دم اور طمس ہے جس کا ذکر اللہ پاک نے اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٣٠] ''اور ہم نے فرعون والوں کو مبتلا کیا قحط سالی میں اور پھلوں کی کم پیداواری میں، تاکہ وہ نصیحت قبول کریں۔'' پھر اللہ پاک نے ان کے پکڑنے کی وجہ بیان کی وہ یہ ہے کہ ﴿ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ یعنی تاکہ وہ کفر سے ایمان کی طرف رجوع کریں۔

پھر جب ظاہر ظاہر نشانیاں اور واضح واضح دلیلیں دیکھیں جن کو موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس لائے تو خیال کیا کہ یہ سب سحر کے قبیل سے ہے اور بولے: ﴿ يٰۤاَيُّهَ السّٰحِرُ ﴾۔ وہ لوگ علماء کو ساحر کہتے تھے اور ان کی تعظیم وتوقیر کیا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک سحر ایسی صفت نہیں تھی جو مذموم ہو۔ امام زجاج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو ساحر کے نام سے مخاطب کیا جو قوم کے نزدیک ان کے لیے مقدم ہو چکا ہے۔[1] یا ان کو اس حال میں ساحر کہہ کر پکارا اپنی طبیعت کی سختی اور حماقت کے سبب سے، یعنی وہ انتہا درجے کے احمق اور سخت طبیعت والے تھے کہ ایسی حالت میں بھی شرارت سے باز نہ آئے اور خوشامد کے وقت بھی ساحر کہہ کر پکارا۔ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو پکارنا ان کے اسم علم کے ساتھ تھا، جیسا کہ سورت اعراف میں ہے: ﴿ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ﴾ [الأعراف: ١٣٤]

[1] معاني القرآن (٤/٤١٤)

اللہ پاک نے اس جگہ ان کا کلام ان کی عبارت سے نقل نہیں فرمایا، بلکہ ان کے اعتقاد کے مطابق ذکر کیا ہے جس کو ان کے دل چھپاتے تھے وہ یہی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ساحر ہیں، اس لیے کہ مقامِ تسلی اسی کا مقتضی ہے کہ یہاں ان کے اعتقاد کے مطابق ساحر کا کلمہ ذکر کیا جائے، کیوں کہ قریش نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ساحر اور قرآن شریف کا نام سحر رکھا تھا۔ (كما أفاده الكرخي) معنی یہ ہیں کہ اے ساحر! تو ہمارے لیے اپنے رب کو اس شے کے ساتھ پکار جس کی تو نے ہم کو خبر دی ہے کہ اس نے تجھ سے عہد کیا ہے کہ ہم جب ایمان لے آئیں تو ہم سے اس عذاب کو دور کر دے جو ہم پر نازل ہوا ہے۔ ﴿ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ﴾ یعنی بے شک ہم زمانۂ آیندہ میں راہ پر آنے والے ہیں اور اس چیز پر ایمان لانے والے ہیں جس کو تو لے کر آیا ہے۔

﴿ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴾ یہاں عبارت محذوف ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کو پکارا تو اس نے ان سے عذاب دور کر دیا۔ پھر جب ان سے عذاب ہٹا دیا اسی وقت بلا تاخیر اپنے راہ پر آنے کے عہد کو توڑ دیا جس کو اپنی جانوں پر لازم ٹھہرایا تھا۔ "نکث" بہ معنی "نقض" اور "نقض" بہ معنی شکستن (توڑنا) ہے۔ ہر دفعہ کے عذاب میں عہد کرتے، پھر اس کو توڑ ڈالتے تھے۔

﴿ وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ﴾ کہتے ہیں کہ جب فرعون نے یہ نشانیاں دیکھیں تو ڈرا کہ کہیں میری قوم موسیٰ علیہ السلام کی طرف مائل نہ ہو جائے، چنانچہ ان کو جمع کیا اور انھیں اپنی آواز سے پکارا، یا کسی منادی کو حکم دیا کہ اس کے اس قول کی ندا کرے: اے میری قوم! کیا میرے لیے مصر کی بادشاہت نہیں ہے جس میں کوئی مجھ سے جھگڑنے والا اور مخالفت کرنے والا نہیں ہے اور حال یہ ہے کہ یہ نہریں میرے نیچے سے، یعنی میرے محل کے نیچے سے بہتی ہیں، مراد نیل کی نہریں ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ میرے روبرو اور میرے باغوں میں بہتی ہیں۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میرے حکم سے بہتی ہیں، یعنی میرے زیرِ حکم جاری ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ اَلْاَنْهٰرُ ﴾ سے مراد قواد (قائدین)، رؤسا اور جبابرہ ہیں، یعنی لشکر کے افسر اور سردار اور جبار لوگ، یہ سب اس کے نشان (جھنڈے) کے نیچے چلتے تھے۔[1] کسی نے کہا کہ "أنهار" سے مراد اموال ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ ﴿ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ یعنی کیا پھر تم اس کو نہیں دیکھتے ہو اور میرے ملک کی قوت اور میری قدر کی عظمت پر استدلال نہیں کرتے ہو اور اس بات پر کہ موسیٰ (علیہ السلام) میرے مقابلے سے عاجز ہے۔

حکایت:

ہارون الرشید سے مروی ہے کہ جس وقت انھوں نے یہ آیت پڑھی تو کہا کہ البتہ میں اپنے غلاموں میں سے

[1] تفسير القرطبي (٩٨/١٦) فتح القدير (٧٣١،٧٣٠/٤)

سب سے خسیس غلام کو اس کا حاکم بناؤں گا، پھر خصیب کو اس کا حاکم بنا دیا، یہ شخص ہارون کا خادمِ وضو تھا۔

حکایت:

عبد اللہ بن طاہر سے مروی ہے کہ وہ مصر کے والی ہوئے تو اس کی طرف نکلے، پھر جب اس کے قریب پہنچے تو کہا: کیا یہ وہی گاؤں ہے جس کے ساتھ فرعون نے فخر کیا تھا، یہاں تک کہا کہ ﴿ اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ ﴾ واللہ! البتہ وہ میرے نزدیک اس سے کم تر ہے کہ میں اس میں داخل ہوں، چنانچہ اپنی باگ موڑ لی۔[1]

حکایت:

خاکسار ۔عفا اللہ عنہ۔ نے سنا ہے کہ شاہجہان رحمہ اللہ بادشاہِ ہندوستان نے جب تختِ طاؤسی کئی کروڑ روپے خرچ کر کے تیار کرایا اور اس کا شاہانہ جشن کیا تو پہلے شیخ عبد الحق محدث دہلوی ۔قدس سرہ۔ سے اس پر وعظ کہلوایا، پھر خود یوں کہا کہ الٰہی! فرعون لعین نے مصر کی ذرا سی سلطنت پر فخر کر کے خدائی کا دعویٰ کیا اور اس عاجز کو تو نے اپنے فضل سے سارے ہندوستان کی بادشاہت عطا فرمائی اور یہ تیرا بندہ بندگی کا اقرار کرتا ہے، پھر سجدۂ شکر ادا کیا، پھر تخت پر جلوس فرمایا۔ رحمه الله تعالىٰ رحمة واسعة. دیکھو بادشاہانِ اسلام ایسے ہوتے ہیں کہ باجود ملک کی وسعت اور دنیا کی جاہ کے اپنے رب کے سامنے عاجزی اور فروتنی کرتے ہیں اور آخری نعمت کے مقابلے میں دنیا کی ظاہری اور فانی رونق کو ہیچ و حقیر سمجھتے ہیں۔

بالجملہ فرعون لعین نے مصر کی حکومت پر اور نہروں کے جاری ہونے پر فخر کر کے، پھر یوں کہا: ﴿ اَمْ اَنَاْ خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِىْ هُوَ مَهِيْنٌ ﴾ بلکہ میں اس شخص سے بہتر ہوں جو اپنی ذات میں ضعیف، حقیر اور ذلیل ہے جس کی کچھ عزت نہیں، کیوں کہ وہ اپنے کام خود کرتا ہے نہ اس کی کوئی حکومت ہے، نہ کسی طرح کی قوت ہے کہ جس سے کوئی نہر جاری کرے اور کوئی حکم نافذ فرمائے۔

کلمۂ ﴿ اَمْ ﴾ منقطعہ ہے جس کی تقدیر "بل" اضرابی کے ساتھ کی جاتی ہے ہمزۂ انکاری کے بغیر۔ معنی "بَلْ أَنَا خَيْرٌ" ہیں۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ اَمْ ﴾ بہ معنی "بَلْ" ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ کہتے ہیں اگر تم چاہو تو ﴿ اَمْ ﴾ کو اس استفہام سے ٹھہراؤ جو ﴿ اَمْ ﴾ کے ساتھ کیا جاتا ہے ماقبل کے کلام کے ساتھ اس کے متصل ہونے کے لیے۔ کسی نے کہا کہ ﴿ اَمْ ﴾ زائد ہے۔ امام ابو زید رحمہ اللہ نے عرب سے نقل کیا ہے کہ وہ ﴿ اَمْ ﴾ کو زاید ٹھہراتے ہیں، معنی یہ ہیں: ﴿ اَنَاْ خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا ﴾ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا کہ کلام میں حذف ہے، معنی یہ ہیں: "أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ أَمْ تُبْصِرُوْنَ"، یعنی کیا پھر تم نہیں دیکھتے ہو یا دیکھتے ہو۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٦/٩٩)

یہ بات پوری ہوگئی، پھر اور بات شروع کی تو کہا ﴿ اَنَا خَيْرٌ ﴾ یعنی میں بہتر ہوں۔ امام خلیل وسیبویہ رحمہ اللہ سے بھی اخفش رحمہ اللہ کے قول کی طرح مروی ہے۔ اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ عیسیٰ ثقفی اور یعقوب حضرمی رحمہ اللہ نے کلمۂ ﴿ اَمْ ﴾ پر وقف کیا ہے بر تقدیر: "أَمْ تُبْصِرُوْنَ"، پھر چونکہ پہلا ﴿ تُبْصِرُوْنَ ﴾ اس پر دال ہے، اس لیے اس کو حذف کر دیا۔ اس قول کی بنا پر ﴿ اَمْ ﴾ متصلہ ہوگا نہ منقطعہ، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کلمۂ ﴿ اَمْ ﴾ بہ معنی "بَلْ" کی سند میں یہ شعر پڑھا ہے:

بَدَتْ مِثْلَ قَرْنِ الشَّمْسِ فِيْ رَوْنَقِ الضُّحٰى وَصُوْرَتُهَا أَمْ أَنْتِ فِي الْعَيْنِ أَمْلَحُ

"أَيْ: بَلْ أَنْتِ"۔ امام فراء رحمہ اللہ نے بعض قراء سے "أَمَا أَنَا خَيْرٌ" نقل کیا ہے۔ "أَيْ: أَلَسْتُ خَيْرًا"[1] یعنی کیا میں بہتر نہیں ہوں، چنانچہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ غرضیکہ لعین نے اپنی عزت اور موسیٰ علیہ السلام کی ذلت اس سے ثابت کی کہ اس کے پاس دنیاوی جاہ وحکومت ہے جو اُن کے پاس نہیں ہے۔ پھر ان کو ایک عیب لگایا، وہ یہ ہے: ﴿ وَلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴾ یعنی اپنی بات صاف نہیں کہہ سکتا، یعنی اس گرہ کے سبب سے جو ان کی زبان میں تھی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں "لثغة" تھا۔[2] "لثغة" بالضم یہ ہے کہ حرفِ راء غین یا لام ہو جائے یا حرفِ سین ثاء ہو جائے۔ اس کا فعل "لثغ" ہے باب طرب سے اور صفت "الثغ" ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ وہ اس قابل نہیں کہ اپنی حجت کو بیان کرے، وہ حجت جو اس کی اس بات کی سچائی پر دلالت کرتی ہے جس کا دعویٰ کرتا ہے، اس کی یہ مراد نہیں ہے کہ بات کرنے پر اس کو قدرت نہیں ہے، لیکن قولِ اول زیادہ موزوں ہے۔

پھر لعین نے ایک اور شبہہ وارد کیا، چنانچہ یوں کہا: ﴿ فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ ﴾ یعنی اگر وہ عظیم ومقدم وسردار ہے تو اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں ڈالے گئے، اس کے بھیجنے والے کے پاس سے جس کا دعویٰ کرتا ہے کہ حقیقت میں بادشاہ وہی ہے۔ یہ بات اپنے یہاں کے قاعدے کی بنا پر کہی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ جب کسی شخص کو سردار بناتے تو اسے دو کنگن پہناتے تھے اور سونے کا ایک طوق اس کی گردن میں ڈالتے تھے، اس کی سرداری کی علامت کے طور پر۔ اس پر کنگن ڈالنے سے ان کی مراد ملک کی کنجیوں کو اس کی طرف ڈالنا ہے۔ جمہور نے "أَسَاوِرَةٌ" پڑھا ہے، یہ ﴿ اَسْوِرَةٌ ﴾ کی جمع ہے اور ﴿ اَسْوِرَةٌ ﴾ "سِوَارٌ" کی جمع ہے۔ امام ابو عمرو بن العلاء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "أَسَاوِرَةٌ وَأَسَاوِرُ وَأَسَاوِيْرُ" کا واحد "أَسْوَارٌ" ہے۔ یہ "سِوَارٌ" میں ایک لغت ہے اور امام حفص رحمہ اللہ نے ﴿ اَسْوِرَةٌ ﴾ پڑھا ہے جو "سِوَارٌ" کی جمع ہے۔ سیدنا ابی رضی اللہ عنہ نے "أَسَاوِرُ" پڑھا ہے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے "أَسَاوِيْرُ" پڑھا ہے۔[3]

---

[1] تفسير القرطبي (١٦/٩٩، ١٠٠) [2] الدر المنثور (٣٨٣/٧) [3] تفسير القرطبي (١٦/١٠٠)

پھر ملعون نے ایک اور شبہہ ذکر کیا تو یوں کہا: ﴿ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴾ یہ ﴿ اُلْقِيَ ﴾ پر معطوف ہے، یعنی اس کے ساتھ فرشتے ایک دوسرے کے پے در پے ساتھی ہو کر کیوں نہیں آئے، اگر وہ سچا ہے تو وہ فرشتے اس کے کام پر اس کی اعانت کرتے یا اس کے لیے نبوت کی گواہی دیتے اور اس کے ساتھ چلتے، چنانچہ لعین نے اپنی قوم کے وہم میں یہ بات ڈالی کہ ضروری ہے کہ اللہ کے رسول جبابرہ کی ہیئت پر ہوں اور فرشتے ان کو گھیرے ہوئے ہوں۔

اللہ پاک فرماتا ہے: ﴿ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ﴾ یعنی فرعون نے اپنے مکر و فریب سے اپنی قوم کو جہالت اور کم عقلی پر آمادہ کیا اور ان کو اپنی بات سے بھڑکایا اور پھسلا دیا۔ اس کی بات نے ان پر اثر کیا تو انھوں نے اس کی ہر بات میں جو اس نے کہی اطاعت کی اور اس کی بات مان لی اور موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلا دیا۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ اس نے اطاعت میں ان سے خفت طلب کی۔ خفت سرعت کرنے کو کہتے ہیں۔

امام ابن اعرابی رحمہ اللہ کہتے ہیں: معنی یہ ہیں کہ "فَاسْتَجْهَلَ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوْهُ لِخِفَّةِ أَحْلَامِهِمْ وَقِلَّةِ عُقُوْلِهِمْ"، یعنی اپنی قوم کا جہل چاہا تو اپنی عقلوں کی خفت اور قلت کے سبب سے انھوں نے اس کی اطاعت کی۔ محاورے میں بولتے ہیں: "اِسْتَخَفَّهُ الْفَرَحُ أَيْ: أَزْعَجَهُ وَاسْتَخَفَّهُ أَيْ: حَمَلَهُ"۔ اسی معنی سے یہ آیت ہے: ﴿ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴾ [الروم: ٦٠] [1] کسی نے کہا کہ "اِسْتَخَفَّ قَوْمَهُ" کے معنی ہیں: "وَجَدَهُمْ خِفَافَ الْعُقُوْلِ"، یعنی اپنی قوم کو کم عقل پایا، اس بنا پر استفعال کا صیغہ وجدان کے لیے ہے اور اس کی نسبت میں قوم کی طرف مجاز ہے، یعنی قوم کو خفیف پایا۔ مراد یہ ہے کہ ان کی عقلوں کو خفیف پایا۔ ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴾ یعنی بے شک وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت سے نکلنے والی ایک قوم تھی۔

قولہ سبحانہ و تعالیٰ: ﴿ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ﴾ مفسرین نے کہا ہے کہ "أَغْضَبُوْنَا"۔ "أسف" بہ معنی "غضب" ہے۔ کسی نے کہا کہ "أشد غضب"۔ کسی نے کہا: "سخط"، معنی یہ ہیں کہ پھر جب انھوں نے ہم کو خفا کیا، یعنی فساد اور نافرمانی میں زیادتی کے سبب سے۔ کسی نے کہا کہ ہمارے رسولوں کو خفا کیا تو ہم نے ان سے بدلہ لیا۔ پھر وہ عذاب بیان کیا جس کے ساتھ انتقام واقع ہوا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ یعنی پھر ہم نے ان سب کو دریا میں ڈبو دیا۔ ان کی ہلاکت جو غرق سے ہوئی، چنانچہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ہلاکت اس چیز کے ساتھ ہوئی جس کے ساتھ انھوں نے اپنی عزت سمجھی تھی، یعنی پانی جس کا ذکر اس قول میں ہے: ﴿ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ﴾ چنانچہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو کوئی اللہ کے سوا کسی اور شے کے ساتھ عزت حاصل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اسی شے کے ساتھ ہلاک کرتا ہے۔ لعین نے موسیٰ علیہ السلام کو ضعیف سمجھا اور ان کو فقیر ہونے کا عیب لگایا تھا تو اللہ پاک نے انھیں کو اس پر مسلط کیا۔ اس سے منظور اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے

[1] تفسیر القرطبي (١٠١/١٦)

کہ جو کوئی کسی شے کو ضعیف سمجھتا ہے تو وہی شے اس پر غالب ہو جاتی ہے۔ (كما أفاده القشيري)

﴿ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا ﴾ یعنی پس ہم نے ان کو اس شخص کے لیے پیشوا کر دیا جو کفار میں سے ان جیسے عمل کرے کہ وہ عذاب کا مستحق ہو گا۔ یہ بات ان کے عبرت لینے کے لیے ہے۔ جمہور نے ﴿ سَلَفًا ﴾ بہ فتحِ سین و لام پڑھا ہے "سَالِفٌ" کی جمع، جیسے: "خَدَمٌ وَخَادِمٌ" اور "رَصَدٌ وَرَاصِدٌ" اور "حَرَسٌ وَحَارِسٌ"۔ جب کوئی متقدم ہو اور گزر جائے تو بولیں گے: "سَلَفَ" یعنی وہ گزر گیا، اس کا مضارع "یَسْلِفُ" ہے۔ امام فراء و زجاج رحمہما اللہ کہتے کہ ہم نے ان کو متقدم اور سابق کر دیا تاکہ بعد میں آنے والے اور ان کے ساتھ والے ان سے نصیحت حاصل کریں۔ امام حمزہ و کسائی رحمہما اللہ نے "سُلُفًا" بہ ضمِ سین و لام پڑھا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ "سَلِيفٌ" کی جمع ہے، جیسے: "سُرُرٌ وَسَرِيرٌ"۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "سَلَف" کی جمع ہے، جیسے: "خَشَب و خُشُب"۔ سیدنا علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما، امام علقمہ، ابو وائل، نخعی اور حمید بن قیس رحمہم اللہ نے بہ ضمِ سین و فتحِ لام پڑھا ہے، جمع "سُلْفَة" کی، جیسے: "غُرْفَة وَغُرَف"۔ "سُلْفَة" فرقۂ متقدم کو کہتے ہیں۔ نضر بن شمیل رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[1] سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ سَلَفًا ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے: "أَهْوَاءً مختلفةً"[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ﴾ یعنی اور ہم نے ان کو ان لوگوں کے لیے عبرت اور موعظت کر دیا جو ان کے بعد آئیں گے، یا ایک عجیب قصہ کر دیا جو امثال کے قائم مقام ہوتا ہے۔ جب اللہ پاک نے ﴿ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ ﴾ نازل کی تو مشرکین عیسیٰ علیہ السلام کے قصے سے متعلق ہوئے اور کہنے لگے کہ محمد تو صرف یہ چاہتا ہے کہ ہم اس کو معبود ٹھہرائیں، جیسا کہ نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو ٹھہرایا ہے۔ اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی۔[3] (كذا قال مجاهد و قتادة)

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴿٥٧﴾ وَقَالُوْٓا
ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ؕ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ
خَصِمُوْنَ ﴿٥٨﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ
اِسْرَآءِيْلَ ﴿٥٩﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ
يَخْلُفُوْنَ ﴿٦٠﴾ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ؕ هٰذَا
صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٦١﴾ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٦٢﴾

---

[1] تفسير القرطبي (١٠٢/١٦) فتح القدير (٧٣٢/٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٨٤)

[3] تفسير الطبري (٦٢٤/٢١، ٦٢٥) فتح البيان (٣٥٩/١٢-٣٦٥)

وَلَمَّا جَآءَ عِيسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ
وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۶۳﴾
اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۴﴾
فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ
عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۶۵﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ
بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۶﴾ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَىِٕذٍۭ بَعْضُهُمْ
لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۷﴾

اور جب (عیسیٰ) ابن مریم کی مثال بیان کی گئی تو آپ کی قوم اس (خوشی) سے چلا اُٹھی 57 اور انھوں نے کہا: کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ (عیسیٰ؟) انھوں نے آپ سے یہ مثال محض جھگڑنے کے لیے بیان کی، بلکہ یہ لوگ نرے جھگڑالو ہیں 58 وہ (عیسیٰ) تو صرف ایک بندہ ہے جس پر ہم نے انعام کیا اور اسے بنی اسرائیل کے لیے (اپنی قدرت کا) ایک نمونہ بنا دیا 59 اور اگر ہم چاہتے تو تم سے فرشتے بنا دیتے جو زمین میں (تمھارے) جانشین ہوتے 60 اور بے شک وہ (عیسیٰ) قیامت کی ایک نشانی ہے، لہٰذا تم اس (قیامت کے آنے) میں شک نہ کرو اور تم میری پیروی کرو، یہی سیدھا راستہ ہے 61 اور شیطان تمھیں (راہِ حق سے) ہرگز نہ روک دے، بلاشبہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے 62 اور جب عیسیٰ کھلی کھلی (نشانیاں) لے کر آیا تو اس نے کہا: تحقیق میں تمھارے پاس حکمت لایا ہوں اور تاکہ میں تم پر بعض وہ باتیں واضح کر دوں جن میں تم اختلاف کرتے ہو، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو 63 بلاشبہ اللہ ہی میرا اور تمھارا رب ہے، لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے 64 پھر انھی (بنی اسرائیل) میں سے جماعتوں نے باہم اختلاف کیا، تو جن لوگوں نے ظلم کیا ان کے لیے المناک دن کے عذاب سے ہلاکت ہے 65 وہ قیامت ہی کا انتظار تو کر رہے ہیں کہ وہ ان پر اچانک آپڑے، جبکہ انھیں خبر تک نہ ہو 66 اس دن متقین کے سوا تمام (جگری) دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے 67

قریش کی طرف سے عیسیٰ علیہ السلام کی توہین اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا مقام و مرتبہ:

قرآن میں عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر آئے تو اعتراض کرتے ہیں کہ ان کو بھی تو لوگ پوجتے ہیں، انھیں خوبی سے کیوں

یاد کرتے ہو اور ہمارے بتوں کو برا کہتے ہو۔ عیسیٰ علیہ السلام ایک بندہ ہے، اس میں فرشتوں کے آثار تھے، اس سے وہ معبود نہیں بن گئے، ہم چاہیں تو تمھاری نسل سے بھی ایسے لوگ پیدا کر دیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کا آنا قیامت کی نشانی ہے۔ یہود ان کے منکر ہوئے اور نصاریٰ قائل ہوئے، پھر بعد میں نصاریٰ کے کئی فرقے ہو گئے، کوئی عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بتائیں، کوئی کہیں کہ تین اللہ ہیں، کوئی کچھ اور کہیں۔ اس دن دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے، یعنی دوست سے دوست بھاگے گا کہ اس کے سبب سے کہیں میں نہ پکڑا جاؤں۔ انتھٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قریش کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ وہ اپنے کفر میں سرکش ہیں اور دشمنی اور جھگڑے کا ارادہ کرتے ہیں۔ کئی ایک اہلِ علم نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ سے روایت کیا ہے کہ ﴿ یَصِدُّوْنَ ﴾ بہ معنی ''یَضْحَكُوْنَ'' ہے۔ ''أَيْ: أَعْجَبُوْا بِذٰلِكَ''۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''یَجْزَعُوْنَ وَیَضْحَكُوْنَ''. امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے کہا: ''یُعْرِضُوْنَ''[1]

﴿ وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴾ کا سببِ نزول وہ ہے جو محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے سیرت میں ذکر کیا ہے۔ کہا: جو بات مجھے پہنچی ہے، اس میں یہ ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولید بن مغیرہ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے کہ نضر بن حارث آیا، یہاں تک کہ لوگوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس مجلس میں قریش کے بہت سے آدمی تھے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گفتگو کی تو نضر بن حارث آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے باتیں کیں، یہاں تک کہ اس کو خاموش کر دیا، پھر اس پر اور اہلِ مجلس پر یہ آیت پڑھی: ﴿ إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ۞ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ۖ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۞ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ۹۸۔ ۱۰۰] ''تم اور اللہ کے سوا جن جن کی عبادت کرتے ہو، سب دوزخ کا ایندھن بنو گے، تم سب دوزخ میں جانے والے ہو۔ اگر یہ (سچے) معبود ہوتے تو جہنم میں داخل نہ ہوتے، اور سب کے سب اسی میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ وہ وہاں چلا رہے ہوں گے اور وہاں کچھ بھی نہ سن سکیں گے۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھ گئے اور عبداللہ بن زبعریٰ تمیمی آیا، یہاں تک کہ بیٹھ گیا تو ولید بن مغیرہ نے اس سے کہا: واللہ! نضر بن حارث تو ابن عبدالمطلب کے واسطے کھڑا ہوا اور نہ بیٹھا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے مقابلے میں اس سے کچھ بات نہ بنی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے زعم کیا کہ ہم اور ہمارے یہ معبود جن کو ہم پوجتے ہیں دوزخ کا ایندھن ہیں۔ اس پر عبداللہ بولا: واللہ! اگر میں اس کو پاتا تو بحث میں اس پر غالب آتا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھو: کیا ہر شے جو اللہ کے سوا پوجی جاتی ہے وہ اس شخص کے ساتھ جہنم میں ہے جس نے اس کو پوجا؟ ہم تو فرشتوں کو پوجتے ہیں اور یہود عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ مسیح عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو پوجتے ہیں۔ چنانچہ عبداللہ کی بات سے ولید اور جو لوگ اس کے ساتھ مجلس میں تھے،

[1] تفسیر ابن کثیر (۱٦٥/٤)

وہ سب خوش ہوئے اور خیال کیا کہ واقعی عبد اللہ نے حجت میں غلبہ پایا اور جھگڑا۔

پھر رسول اللہ ﷺ سے اس بات کا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر وہ شخص جس نے اس بات کو دوست رکھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا جائے تو وہ اس شخص کے ساتھ ہے جس نے اس کو پوجا، کیوں کہ وہ جو ہیں، وہ شیطان کو پوجتے ہیں اور اس کو پوجتے ہیں جس نے ان کو اپنے پوجنے کا حکم دیا ہے۔ اس پر اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى اُولٰٓىِٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ۱۰۱] ''البتہ بے شک جن کے لیے ہماری طرف سے نیکی پہلے ہی ٹھہر چکی ہے وہ سب جہنم سے دور ہی رکھے جائیں گے۔'' یعنی عزیر اور عیسیٰ علیہما السلام اور جو احبار اور رہبان ان کے ساتھ پوجے گئے جو اللہ عزوجل کی اطاعت پر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

پھر ان کے بعد کے گمراہ لوگوں نے اللہ کے سوا ان کو ارباب ٹھہرایا اور وہ جو یہ کہتے ہیں کہ وہ فرشتوں کو پوجتے ہیں اور وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں تو اس بارے میں یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی ﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۚ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ۲۶] ''(مشرک لوگ) کہتے ہیں کہ رحمان اولاد والا ہے۔ (غلط ہے) اس کی ذات پاک ہے۔ بلکہ وہ سب اس کے باعزت بندے ہیں۔'' وہ کسی بات میں اللہ پر پیش دستی نہیں کرتے، بلکہ اس کے فرمان پر کاربند ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کا حال جو ذکر کیا جاتا ہے اور وہ اللہ کے سوا پوجے جاتے ہیں۔ اور ولید اور جو لوگ اس کے پاس حاضر تھے عبد اللہ کی حجت اور خصومت سے خوش ہوئے، اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴾۔ ''أَيْ: يَصِدُّوْنَ عَنْ أَمْرِكَ بِذٰلِكَ مِنْ قَوْلِكَ.

پھر اللہ پاک نے عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر فرمایا: ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ ... تا ... وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ ﴾ یعنی جو نشانیاں ان کے ہاتھوں پر رکھی گئیں، یعنی مردوں کا زندہ کرنا اور بیماریوں کا اچھا کر دینا، چنانچہ علم ساعت پر یہی دلیل کافی ہے۔ فرماتا ہے: ﴿ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴾[1] یعنی پس تم اس میں شک مت کرو اور میری پیروی کرو یہ سیدھی راہ ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بروایتِ عوفی سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے: ﴿ وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴾ یعنی قریش جبکہ ان سے یہ کہا گیا کہ ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿98﴾ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَاۗءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ۭ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿99﴾ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ۹۸۔ ۱۰۰] تو قریش نے آپ ﷺ سے کہا، پھر ابن مریم کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور اس کا رسول ہے۔ چنانچہ وہ بولے کہ نہیں ارادہ کرتا یہ (محمد ﷺ) مگر یہ کہ ہم اس کو رب ٹھہرائیں، جیسا کہ نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو رب ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ﴾[2]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام (۲۰۴/۲) [2] تفسير الطبري (۶۲۵/۲۱)

امام احمد رحمہ اللہ نے ابو یحییٰ مولائے ابن عقیل سے روایت کیا ہے، کہا: سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: البتہ قرآن کی ایک آیت مجھے معلوم ہے جس کے متعلق کبھی مجھ سے کسی شخص نے سوال نہیں کیا اور میں نہیں جانتا کہ کیا لوگوں نے اس کو جان لیا ہے، اس لیے اس کے متعلق نہیں پوچھا، یا اس کے بارے میں سوال کرنے کی ان کو خبر نہیں ہوئی۔ کہا: پھر انھوں نے ہم سے حدیث بیان کرنا شروع کیا، چنانچہ جب وہ کھڑے ہو گئے تو ہم نے ایک دوسرے کو اس بارے میں ملامت کی کہ ہم نے ان سے اس کے متعلق نہیں پوچھا، پھر میں نے کہا کہ میں اس کا ذمہ لیتا ہوں، جب وہ کل بعد زوال آئیں گے تو میں اُن سے پوچھوں گا۔ پھر جب وہ کل زوال کے بعد آئے تو میں نے عرض کی: اے ابن عباس! آپ نے کل یہ ذکر فرمایا تھا کہ قرآن کی ایک آیت ایسی ہے کہ کبھی کسی شخص نے اس کے بارے میں آپ سے سوال نہیں کیا، چنانچہ آپ نہیں جانتے کہ آیا لوگوں نے اس کو جان لیا ہے، یا وہ اس کے لیے ہوشیار نہیں ہوئے۔

چنانچہ میں عرض کرتا ہوں کہ آپ مجھے اس کے بارے میں بتائیں اور ان آیتوں کے بارے میں خبر دیں جو آپ نے اس سے قبل پڑھیں۔ فرمایا: ہاں بے شک رسول اللہ ﷺ نے قریش سے فرمایا: اے گروہِ قریش! بے شک حال یہ ہے کہ نہیں کوئی جو اللہ کے سوا پوجا جاتا ہے کہ اس میں خیر ہو اور قریش اس بات کو جان چکے تھے کہ نصاریٰ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو پوجتے ہیں اور اس شے کو جو نبی اکرم ﷺ کے حق میں کہتے ہیں تو قریش بولے: اے محمد! تو یہ زعم نہیں کرتا کہ عیسیٰ علیہ السلام نبی تھے اور اللہ کے بندوں میں سے ایک نیک بندے تھے، پھر اگر تو سچا ہے کہ ان کے معبود ویسے ہوں گے جیسے وہ کہتے ہیں، اس پر اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ﴾.

میں نے عرض کی کہ ﴿ يَصِدُّونَ ﴾ کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا: "يَضْحَكُونَ" یعنی ہنستے ہیں۔ ﴿ وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ ﴾۔ فرمایا: یہ عیسیٰ علیہ السلام کا قیامت کے دن سے پہلے نکلنا ہے۔[1] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بروایتِ عاصم بن ابی النجود عن ابی احمد مولی الانصار عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے گروہِ قریش! بے شک حالت یہ ہے کہ نہیں ہے کوئی جو اللہ کے سوا پوجا جاتا ہے کہ اس میں خیر ہو۔ تو وہ بولے کیا تو یہ گمان نہیں کرتا کہ عیسیٰ علیہ السلام نبی اور ایک بندۂ صالح تھے اللہ کے بندوں سے؟ چنانچہ بے شک وہ اللہ کے سوا پوجے جاتے تھے تو اس پر اللہ عزوجل نے آیتِ مذکورہ نازل فرمائی۔[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں یوں کہا ہے کہ قریش بولے کہ محمد تو یہی چاہتا ہے کہ ہم اسے پوجیں، جیسا کہ ایک قوم نے عیسیٰ علیہ السلام کو پوجا ہے؟ اسی کے مثل امام قتادہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[3]

قولہ سبحانہ: ﴿ ءَأَلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ ﴾ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ کہتے ہیں کہ ہمارے معبود اس سے بہتر ہیں اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یوں پڑھا ہے: "وَقَالُوا ءَآلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هٰذَا"۔

---

(1) مسند أحمد (٣١٧/١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٠٨)

(2) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٨٤/١٠) (3) تفسير الطبري (٦٢٤/٢١، ٦٢٥)

"هٰذَا" سے ان کی مراد رسول اللہ ﷺ ہیں۔[1] قولہ تبارک تعالیٰ: ﴿ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ﴾ یعنی انھوں نے یہ مثال تیرے لیے صرف جھگڑنے کے لیے بیان کی ہے، حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ مثال اس آیت پر وارد نہیں ہوتی، کیوں کہ کلمۂ ﴿مَا﴾ غیر عاقل کے لیے بولا جاتا ہے، وہ آیت یہ ہے: ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾ [الأنبياء: ٩٨]

پھر یہ آیت قریش کو خطاب ہے اور وہ انہیں اصنام اور انداد کو پوجتے تھے، مسیح علیہ السلام کے عابد نہ تھے، تاکہ اس مثل کو وارد کریں۔ اب یہ امر متعین ہو گیا کہ ان کی بات صرف جھگڑنے کے لیے تھی، وہ کچھ اس کے صحیح ہونے کے معتقد نہ تھے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ کوئی قوم گمراہ نہیں ہوئی بعد ہدایت کے جس پر وہ تھی مگر وارث کی گئی جدل کو، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ﴾[2] (وقد رواه الترمذي وابن ماجه وابن جرير من حديث حجاج بن دينار به ثم قال الترمذي: حسن صحيح لا نعرف إلا من حديثه كذا قال)

یہ حدیث دیگر وجوہ سے بھی کچھ زیادتی کے ساتھ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ چنانچہ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ان سے روایت کیا ہے، کہا کہ کوئی قوم اپنے نبی کے بعد گمراہ نہیں ہوئی، مگر اس کی پہلی گمراہی تقدیر کو جھٹلانے سے ہوئی اور نہیں گمراہ ہوئی کوئی اُمت اپنے نبی کے بعد مگر وہ دیے گئے جدل یعنی جھگڑنا، پھر آیتِ مذکورہ پڑھی۔ حماد راوی کہتے ہیں: میں نہیں جانتا کہ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو مرفوع کہا ہے یا نہیں۔[3] نیز امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ان سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں پر نکلے اور وہ قرآن کے بارے میں جھگڑ رہے تھے تو آپ ﷺ سخت خفا ہوئے، یہاں تک کہ ایسا لگا گویا آپ کے چہرۂ مبارک پر سرکہ ڈالا گیا ہو۔ پھر فرمایا: اللہ کی کتاب کے بعض کو بعض کے ساتھ مت مارو، بے شک حال یہ ہے کہ کوئی قوم کبھی گمراہ نہیں ہوئی مگر وہ دی گئی جدل، پھر آیتِ مذکورہ پڑھی۔[4] قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ ﴾ یعنی نہیں تھے عیسیٰ علیہ السلام مگر اللہ عزوجل کے بندوں میں سے ایک بندے جن پر اللہ تعالیٰ نے نبوت اور رسالت کا انعام کیا تھا۔ ﴿ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ یعنی ہم نے اس کو اپنی قدرت پر ایک دلالت و حجت و برہان ٹھہرایا کہ ہم جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔

قولہ عزوجل: ﴿ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓىِٕكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ﴾ یعنی اگر ہم چاہتے تو تمھارے

---

(1) تفسير ابن كثير (١٦٦/٤)

(2) مسند أحمد (٢٥٦/٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٥٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٨) تفسير الطبري (٦٢٩/٢١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٦٣٣)

(3) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٨٤/١٠) (4) تفسير الطبري (٦٢٩/٢١)

بدلے فرشتوں کو کرتے کہ وہ خلافت کرتے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی وہ زمین میں تمھارے خلیفہ ہوتے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ بعض ان کا بعض کا خلیفہ ہوتا، جس طرح کہ بعض تمھارا بعض کا خلیفہ ہوتا ہے۔ یہ قول پہلے قول کو مستلزم ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ تمھارے بدلے زمین کو آباد کرتے۔ [1]

قولہ سبحانہ و تعالیٰ: ﴿ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ ﴾ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے کہ اس سے مراد وہ معجزے ہیں جن کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے، یعنی مُردوں کا زندہ کرنا اور مادر زاد اندھے اور کوڑھی وغیرہ بیماروں کا اچھا کرنا۔ اس قول میں نظر ہے اور اس سے بھی زیادہ بعید وہ قول ہے جس کو امام قتادہ رحمہ اللہ نے امام حسن بصری اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ سے روایت کیا ہے کہ ﴿ اِنَّهٗ ﴾ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے۔ [2] بلکہ صحیح قول یہ ہے کہ ضمیر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے، اس لیے کہ کلام کا سیاق انھی کے ذکر میں ہے۔

پھر اس سے مراد قیامت سے قبل ان کا نزول ہے، جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ﴾ [النساء: ۱۵۹] ''اہلِ کتاب میں ایک بھی ایسا نہ بچے گا جو عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لا چکے۔'' یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے۔ نیز فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴾ [النساء: ۱۵۹] ''اور قیامت کے دن وہ خود ان پر گواہ ہوں گے۔'' اس معنی کی مؤید دوسری قراءت "وَاِنَّهٗ لَعَلَمٌ لِّلسَّاعَةِ" یعنی وہ قیامت کے وقوع پر علامت، نشانی اور دلیل ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا روزِ قیامت کے قبل خروج قیامت کے لیے نشانی ہے۔ اسی طرح سیدنا ابو ہریرہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام ابو العالیہ، ابو مالک، عکرمہ، حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم سے بھی مروی ہے۔ [3] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر متواتر حدیثیں وارد ہوئی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسیٰ علیہ السلام کے روزِ قیامت سے قبل نزول کی خبر دی ہے کہ وہ امامِ عادل و حاکمِ مقسط ہو کر اتریں گے۔

قولہ عزوجل: ﴿ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴾ یعنی پس تم اس میں شک مت کرو، بے شک وہ ضرور ہونے والی ہے اور اس بات میں جس کی میں تم کو خبر دیتا ہوں میری پیروی کرو۔ یہ سیدھی راہ ہے۔ شیطان تم کو اتباعِ حق سے نہ روکے، بے شک وہ تمھارا صریح دشمن ہے۔ اور جب عیسیٰ علیہ السلام کھلی نشانیاں لے کر آئے تو کہا کہ تحقیق میں تمھارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں، یعنی نبوت، تاکہ تمھارے لیے بعض اس چیز کا بیان کروں جس میں تم پھوٹ رہے ہو۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: یعنی بعض دینی امور نہ کہ دنیاوی امور۔ یہ بات جو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہی، یہ حسن جید ہے۔ پھر جس نے یہ خیال کیا کہ اس جگہ "بعض" بہ معنی "کل" ہے، اس کی سند میں لبید شاعر کے اس قول کو شاہد ٹھہرایا ہے:

[1] تفسیر الطبري (۲۱/۶۳۰، ۶۳۱) [2] تفسیر الطبري (۲۱/۶۳۳) [3] تفسیر الطبري (۲۱/۶۳۱، ۶۳۲)

تَرَّاكُ أَمْكِنَةٍ إِذَا لَمْ أَرْضَهَا   أَوْ يَعْتَلِقُ بَعْضَ النُّفُوْسِ حِمَامُهَا

(یعنی میں مکانوں کا بڑا ترک کرنے والا ہوں جبکہ میں ان سے راضی نہ ہوؤں مگر یہ کہ میرے نفس کو اس کی موت آ لگے تو مجبوری ہے۔ شاعر اپنی جلادت، قوت و بے تعلقی بیان کرتا ہے، یعنی جس جگہ سے میں راضی نہیں ہوتا تو اسے چھوڑ دیتا ہوں اپنے نفع کا کچھ خیال نہیں کرتا، لیکن اگر وہاں موت آ جائے تو پھر مجبوری ہے۔) اور اس کی تاویل یہ کی ہے کہ مراد جمیع نفوس ہیں۔ چنانچہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو رد کیا اور کہا ہے کہ بعض نفوس سے لبید کی مراد فقط اپنا نفس ہے۔ اس کی تعبیر بہ لفظ بعض سے کی ہے۔[1] یہ بات جو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہی محتمل ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴾ یعنی پس تم اللہ سے اس بات میں ڈرو جس کا میں تم کو امر کرتا ہوں اور اس شے میں میرا کہا مانو جس کو میں تمھارے پاس لایا ہوں۔ بے شک اللہ وہی ہے میرا اور تمھارا رب، چنانچہ تم اس کو پوجو، یہ سیدھی راہ ہے، یعنی میں اور تم اس کے غلام ہیں، اسی کے محتاج ہیں اور اسی وحدہ لاشریک لہ کے پوجنے میں مشترک ہیں۔ یہ راہ جس کو میں لے کر تمھارے پاس آیا ہوں، یہی سیدھی راہ ہے، یعنی اکیلے رب جل وعلا کی عبادت کرنا۔

قولہ سبحانہ: ﴿ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ﴾ پھر ان فرقوں نے اختلاف کیا اور ان کے بارے میں فرقے فرقے ہو گئے۔ ان میں سے کوئی تو یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں، حق یہی ہے اور ان میں سے کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ کے فرزند ہیں اور کوئی یہ کہتا ہے کہ وہ اللہ ہیں۔ تعالی اللّٰه عن قولهم علوا كبيرا. اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴾ یعنی پس ظالموں کے لیے دردناک دن کے عذاب سے خرابی ہے۔

قیامت کا اچانک ظہور:

قوله تبارك وتعالىٰ سبحان ربي الأعلى: ﴿ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ یعنی یہ مشرک اور رسولوں کی تکذیب کرنے والے نہیں انتظار کرتے مگر قیامت کا کہ وہ اچانک آ جائے اور ان کو خبر نہ ہو، یعنی وہ تو ضرور ہی واقع ہونے والی ہے اور یہ اس سے غافل اور بے خبر ہو رہے ہیں اور اس کے لیے تیاری نہیں کر رہے، پس جب وہ آئے گی تو آ ہی جائے گی اور اُن کو اس کی خبر نہ ہو گی تو اس وقت انتہا درجے کے نادم ہوں گے، جبکہ ندامت ان کو کوئی نفع نہ دے گی اور نہ اُن سے کسی شے (تکلیف) کو دور کرے گی۔

جب اللہ کے سوا کسی اور کے لیے کی گئی رفاقت دشمنی میں بدل جائے گی:

قولہ: ﴿ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَىِٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴾ یعنی غیر اللہ کے لیے ہر قسم کی دوستی اور

---

[1] تفسير الطبري (٢١/ ٦٣٤، ٦٣٥)

یاری قیامت کے دن منقلب ہو کر دشمنی ہو جائے گی، مگر وہ دوستی جو صرف اللہ عزوجل کے لیے تھی تو وہ اس کے دوام کے ساتھ دائم و قائم رہے گی۔ یہ ویسی بات ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمائی تھی: ﴿ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴾ [العنکبوت: ۲۵] ''تم نے جن بتوں کی پرستش اللہ کے سوا کی ہے انھیں تم نے اپنی آپس کی دنیوی دوستی کی بنا ٹھہرا لی ہے، تم سب قیامت کے دن ایک دوسرے سے کفر کرنے لگو گے اور ایک دوسرے پر لعنت کرنے لگو گے اور تمھارا سب کا ٹھکانہ دوزخ ہو گا اور تمھارا کوئی مددگار نہ ہو گا۔''

امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: دو خلیل مومن ہیں اور دو خلیل کافر ہیں۔ دو مومنوں میں سے ایک وفات پا گیا اور جنت کی خوش خبری دیا گیا تو اپنے دوست کو یاد کیا اور کہا: اے اللہ! بے شک فلاں شخص میرا دوست تھا، وہ تیری اطاعت اور تیرے رسول کی اطاعت کا مجھے حکم کیا کرتا تھا اور خیر کا حکم دیتا تھا اور برائی سے مجھے منع کرتا تھا اور مجھے اس بات کی خبر دیتا تھا کہ میں تجھ سے ملنے والا ہوں۔ اے اللہ! تو میرے بعد اس کو گمراہ نہ کرنا، یہاں تک کہ تو اسے بھی وہ شے دکھائے جو تو نے مجھے دکھائی ہے اور تو اس سے ایسا راضی ہو، جیسا مجھ سے راضی ہوا۔ چنانچہ اس سے کہا جاتا ہے کہ تو جا، اب اگر تو اس شے کو جان لے جو اس کے لیے میرے پاس ہے تو البتہ تو ہنسے زیادہ اور روئے کم۔ فرمایا: پھر دوسرا دوست فوت ہوتا ہے تو اُن کی روحیں ملتی ہیں۔ پھر کہا جاتا ہے کہ تم ایک دوسرے کی تعریف کرو، چنانچہ ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی سے کہتا ہے تو کتنا اچھا بھائی ہے، کتنا اچھا یار ہے اور کیا عمدہ دوست ہے۔

اور جب دو کافروں میں سے ایک فوت ہوا اور آگ کی بشارت دیا گیا تو اس نے اپنے دوست کو یاد کیا۔ چنانچہ کہتا ہے کہ اے اللہ! بے شک میرا فلاں دوست مجھے تیری معصیت کا امر کرتا تھا اور تیرے رسول کی نافرمانی کا، مجھے برائی کا حکم دیتا تھا اور بھلائی سے منع کرتا تھا اور مجھے کہتا تھا کہ میں تم سے ملنے والا نہیں ہوں (یعنی قیامت کا انکار کرتا تھا)۔ اے اللہ! چنانچہ تو میرے بعد اس کو ہدایت نہ دینا، یہاں تک کہ تو اس کو بھی اس شے کے مثل دکھائے جو تو نے مجھے دکھائی اور تو اس پر ویسا ہی خفا ہو جیسا کہ تو مجھ پر خفا ہوا ہے۔ فرمایا: پھر دوسرا کافر مرتا ہے تو دونوں کی روحیں اکٹھی کی جاتی ہیں، پھر کہا جاتا ہے کہ تم میں سے ہر ایک دوسرے کی ثنا کرے تو ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی سے کہتا ہے: تو کیا برا بھائی ہے، کیا برا یار ہے اور کیا برا دوست ہے۔ اس کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن ہر دوستی عداوت بن گئی سوائے متقین کی دوستی کے۔[2] حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے ترجمہ ہشام بن احمد میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ

---

[1] تفسیر الصنعاني (۱۹۹/۳، ۲۰۰) تفسیر الطبري (۶۳۸/۲۱) [2] تفسیر الطبري (۶۳۸/۲۱)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَوْ أَنَّ رَجُلَيْنِ تَحَابَّا فِي اللّٰهِ أَحَدُهُمَا بِالْمَشْرِقِ وَالْآخَرُ بِالْمَغْرِبِ لَجَمَعَ اللّٰهُ تَعَالٰى بَيْنَهُمَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَقُوْلُ: هٰذَا الَّذِي أَحْبَبْتَهُ فِيَّ »[1] یعنی اگر دو آدمی آپس میں صرف اللہ کی خاطر محبت کریں ان میں ایک مشرق میں ہو اور دوسرا مغرب میں تو البتہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن دونوں کو جمع کر دے گا اور فرمائے گا کہ یہ وہ ہے جس کو تو نے میری خاطر دوست رکھا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ﴿ وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴾ کی شانِ نزول کے بارے میں دو قول ذکر فرمائے ہیں: ایک قول تو وہی ہے جو اس آیت کی تمہید میں پہلے بیان ہو چکا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اکثر مفسرین اس پر ہیں کہ یہ آیت مجادلہ ابن زبعریٰ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (زبعریٰ بہ کسرِ زائے معجمہ و فتحِ بائے موحدہ وسکونِ عین و رائے مہملہ و الف مقصور، اس کے معنی "سئ الخلق" یعنی بد خلق ہیں) جو نبی مکرم ﷺ کے ساتھ واقع ہوا تھا، جب آیت ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٩٨] نازل ہوئی۔ ابن زبعریٰ بولا میں جھگڑنے میں تجھ پر غالب ہو گیا۔ ربِ کعبہ کی قسم! کیا نصاریٰ مسیح علیہ السلام کو اور یہود عزیر علیہ السلام کو اور بنی ملیح ملائکہ کو نہیں پوجتے۔ چنانچہ اگر یہ لوگ آگ میں ہیں تو بے شک ہم اس سے راضی ہوئے کہ ہم اور ہمارے معبود اُن کے ساتھ ہوں۔

قریش اس بات سے خوش ہوئے اور ہنسے اور ان کی آوازیں بلند ہوئیں۔ چنانچہ اللہ سبحانہ نے ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى اُولٰٓىِٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ١٠١] نازل فرمائی اور یہ آیت جو اس جگہ مذکور ہے اتاری۔[2] یہ پورا قصہ پہلے بیان ہو چکا ہے اور سورۃ الانبیاء میں بھی اس کا بیان ہوا ہے۔ یہ بات مخفی نہ رہے کہ ابن زبعریٰ نے جو بات کہی وہ اصل سے مندفع (دور) ہے اور بالکل باطل ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ فرمایا ہے "من تعبدون" نہیں کہا، تاکہ اس میں عقلاء داخل ہوں، جیسے: مسیح علیہ السلام، عزیر علیہ السلام اور ملائکہ۔ امام شہاب خفاجی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ ابن زبعریٰ عبداللہ نام صحابی مشہور ہیں۔ یہ قصہ اس کی صحت کی تقدیر پر ان کے مسلمان ہونے سے پہلے کا ہے۔[3]

"قوم" سے اس جگہ مراد کفارِ قریش ہیں۔ حاصل معنی یہ ہے کہ جب ابن مریم کی مثال بیان کی گئی تو اے محمد! اس مثال سے تیری قوم خوشی کے مارے چیخنے چلانے لگی، کیوں کہ کفارِ قریش نے یہ خیال کیا کہ ابن زبعریٰ نے اس مثل سے نبی کریم ﷺ کو الزام دیا اور خاموش کر دیا۔ حالاں کہ آپ ﷺ نے تو صرف وحی کے انتظار میں خاموشی

---

[1] مختصر تاريخ دمشق (٧٩/٢٧) تفسير ابن كثير (١٦٥/٤ـ١٦٩) اس کی سند میں "حکیم بن نافع" ضعیف راوی ہے۔

[2] فتح القدير (٧٣٣/٤) [3] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٤٤٦/٧)

اختیار کی تھی۔ جمہور نے ﴿ يَصِدُّوْنَ ﴾ کو بہ کسرِ صاد اور نافع، ابن عامر اور کسائی رحمہم اللہ نے بہ ضمِ صاد پڑھا ہے۔ یہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ امام کسائی، فراء، زجاج اور اخفش رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں دو لغت ہیں اور اُن کے معنی "يَضِجُّوْنَ" ہیں۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: "صَدَّ يَصِدُّ صَدِيْدًا أَيْ: ضَجَّ". امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا کہ بالضم بہ معنی اعراض ہے اور بالکسر "ضجیج" سے ہے۔ "ضج وضجیج" بہ معنی "بانگ وفریاد کردن" ہے۔ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر یہ کلمہ "صدود عن الحق" سے ہوتا تو "إِذَا قَوْمُكَ عَنْهُ يَصُدُّوْنَ" فرماتا، یعنی بہ ضمِ صاد وصلۂ عن۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "منه وعنه" دونوں برابر ہیں۔ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بالضم کے معنی "یعدلون" ہیں، یعنی حق سے مائل ہوتے ہیں اور بالکسر کے معنی "یضجون" ہیں[1] یعنی چیختے چلاتے ہیں۔

غرضیکہ ابن زبعریٰ کی بات سے خوش ہو کر ہنسنے اور چلانے لگے اور یہ کہا: ﴿ ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ﴾ یعنی کیا تیرے نزدیک ہمارے معبود بہتر ہیں یا مسیح علیہ السلام (یعنی ہمارے معبود تیرے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام سے بہتر نہیں ہیں، پھر جب عیسیٰ علیہ السلام حصب نار سے ہوئے تو ہمارے معبودوں کا حال تو سہل ہوگا۔[2] كذا قال النسفي)۔ امام سدی اور ابن زید رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ کفار نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑے اور کہا کہ جو کوئی اللہ کے سوا پوجا گیا، اگر وہ نار میں ہے تو ہم اس سے راضی ہیں کہ ہمارے معبود عیسیٰ اور عزیر علیہما السلام اور ملائکہ کے ساتھ ہوں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ کلمہ ﴿ هُوَ ﴾ سے ان کی مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، یعنی کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم؟

اس قول کو تقویت دینے والی قراءت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہے۔ انھوں نے یوں پڑھا ہے: "ءَآلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هَذَا"، جمہور نے ﴿ ءَاٰلِهَتُنَا ﴾ کو بہ تسہیلِ ہمزۂ ثانیہ بین بین پڑھا ہے اور کوفیوں اور یعقوب نے بہ تحقیقِ ہمزہ پڑھا ہے۔[3] اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ﴾ یعنی انھوں نے یہ مثال تیرے لیے بیان کی، مگر اس لیے کہ تجھ سے جھگڑیں۔ یہ طلبِ حق کے لیے بیان نہیں کی کہ جب وہ واضح اور ظاہر ہو جائے تو اس کی وجہ سے اپنی گمراہی سے رجوع کریں۔ یہ معنی اس بنا پر ہیں کہ ﴿ جَدَلًا ﴾ منصوب ہے بنا بر علت، یا منصوب ہے بنا بر حال "أَيْ: مُجَادِلِيْنَ"، اس بنا پر کہ مصدر حال کے موضع میں واقع ہے۔ مقسم نے "جِدَالًا" پڑھا ہے۔

پھر اگر یہ خیال ہو کہ کفار نے یہی ایک مثل جھگڑنے کے لیے بیان کی ہمیشہ جھگڑنے کی عادت نہ ہو۔ اس لیے فرمایا: ﴿ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ﴾ یعنی بلکہ یہ لوگ بڑے جھگڑالو ہیں، ان کی عادت جھگڑنے کی ہے۔ "جَدَل" یہی ہے کہ حق کو جان کر اپنے غلبے کے لیے جھگڑے اور حق بات کو نہ مانے۔ دیکھو ابن زبعریٰ اہلِ زبان تھا اور خوب جانتا تھا کہ کلمہ ﴿ مَا ﴾ غیر ذوی العقول کے لیے ہے اور ﴿ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ سے فقط ان کے بت مراد ہیں، مگر جب

[1] تفسير القرطبي (١٠٣/١٦) [2] تفسير النسفي (١١٨/٤) [3] تفسير الطبري (٦٢٨/٢١) تفسير القرطبي (١٠٤/١٦)

کہ اس نے کلامِ الٰہی کے لفظ کو وجہِ عموم کا محتمل دیکھا تو حیلے کی راہ پا کر لفظ کو شمول اور احاطے کی طرف پھیرا اور جھگڑنے اور بحث کرنے کی غرض سے اس سے ہر معبود غیر اللہ مراد لیا اور اس میں بے شرمی اور بے حیائی کی اور نبی مکرم ﷺ نے وقار کا برتاؤ کیا۔

یہاں تک کہ خود اللہ پاک نے ان کی طرف سے یہ جواب دیا: ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ یعنی عیسیٰ علیہ السلام رب نہیں ہے، وہ تو صرف ایک بندہ ہے کہ ہم نے نبوت کے ساتھ اس کا اکرام کیا ہے اور اس پر رفعتِ منزلت اور ذکر کے ساتھ انعام فرمایا ہے اور اس کو بنی اسرائیل کے لیے ایک آیت اور عبرت ٹھہرایا ہے کہ اس سے اللہ پاک کی قدرت کو پہچانیں، اس لیے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور مردوں کو زندہ کرتے تھے اور مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اور ہر بیمار کو اللہ کے اذن سے اچھا کرتے تھے، جب ان کے یہ اوصاف ہیں تو وہ ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ میں کس طرح داخل ہوں گے۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ مشرکین رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور عرض کی کہ آپ ہم کو ان لوگوں کے متعلق خبر دیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا پوجے جاتے ہیں کہ وہ کہاں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آگ میں۔ عرض کی کہ سورج اور چاند؟ فرمایا کہ سورج اور چاند۔ عرض کی: پھر عیسیٰ بن مریم علیہما السلام؟ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾[1]

پھر قریش کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ﴾ یعنی اے قریش! ہم تم سے اور تمھاری عبادت سے بے نیاز ہیں، بلکہ اگر ہم چاہتے تو تم کو ہلاک کر دیتے اور تمھارے بدلے زمین میں ملائکہ مکرمین کو کر دیتے کہ وہ اس کو آباد کرتے اور ہماری عبادت کرتے۔ یہ قریش کو سرزنش اور ملامت ہے۔ آیت کا مقصود یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے تو فرشتوں کو زمین میں بسا دیتے۔ ہم نے جو اُن کو آسمان میں بسایا ہے، چنانچہ اس میں کوئی ایسا شرف نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے ان کی عبادت کی جائے۔

امام سمین رحمہ اللہ نے کہا کہ کلمۂ "من" میں اقوال ہیں: ایک یہ ہے کہ بہ معنی بدل ہے "أَيْ: لَجَعَلْنَا بَدْلَكُمْ"۔ اسی معنی سے یہ آیت ہے: ﴿ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ﴾ [التوبة: ٣٨] "کیا تم آخرت کے عوض دنیا کی زندگانی پر ہی ریجھ گئے ہو" دوسرا قول یہ ہے کہ ابتدائیہ ہے۔ مشہور یہی قول ہے، اس کی بنا پر آیت کی تاویل یہ ہے: اے مردو! اگر ہم چاہتے تو تم سے زمین میں فرشتے جنا دیتے، وہ تمھارے خلیفہ ہوتے جیسے تمھاری اولاد تمھاری خلیفہ ہوتی ہے۔ جس طرح کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو عورت سے بغیر مرد کے جنا دیا۔ اس کو امام زمخشری رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[2] تیسرا قول یہ ہے کہ تبعیضیہ ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا: البتہ ہم بعض تمھارے کو فرشتے تحویل کر

[1] الدر المنثور (٣٨٦/٧) [2] الکشاف (٢٦٤/٤)

دیتے[1] (بنا دیتے)۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے بہ معنی بدل کہا ہے۔[2] فتح القدیر میں اسی کو اولیٰ فرمایا ہے۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا روزِ قیامت سے پہلے خروج۔[4] (وأخرجه الحاکم وابن مردویه عنه مرفوعاً وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ نحوه أخرجه عبد بن حميد) امام مجاہد، ضحاک، سدی اور قتادہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ مراد مسیح علیہ السلام ہیں اور ان کا خروج،[5] یعنی نزول ان امور سے ہے جن سے قیامت کے قائم ہونے کا قرب معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، کیوں کہ اللہ پاک ان کو قیامت کے قائم ہونے سے پہلے آسمان سے نازل کرے گا جس طرح کہ دجال کا نکلنا قیامت کی علامتوں میں سے ہے۔ امام حسن اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ مراد قرآن شریف ہے،[6] اس لیے کہ وہ قربِ قیامت کی آمد پر دال ہے اور اس سے اس کے آنے کا وقت اور اس کی ہولناکیاں اور احوال معلوم ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ مسیح علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا اور ان کا مُردوں کو زندہ کرنا، قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے کے صحیح ہونے پر دلیل ہے۔ کسی نے کہا کہ ضمیر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے، جب کہ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

جمہور نے ﴿ لَعِلْمٌ ﴾ بہ صیغۂ مصدر پڑھا ہے۔ مبالغہ کے لیے مسیح علیہ السلام کو علمِ ساعت ٹھہرایا ہے، اس لیے کہ ان کے نزول کے وقت قیامت کے حصول کا علم حاصل ہوگا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم وغیرہم (ابو مالک غفاری، قتادہ، مالک بن دینار، ضحاک اور زید بن علی رحمہم اللہ) نے بہ فتحِ عین و لام پڑھا ہے، یعنی مسیح علیہ السلام کا خروج قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے۔ امام ابونضرہ اور عکرمہ رحمہما اللہ نے "لَلْعَلَمُ لِلسَّاعَةِ" پڑھا ہے بہ دو لام مع فتحِ عین و لام، یعنی عیسیٰ علیہ السلام البتہ وہ علامت ہیں جس سے قیامت کا قائم ہونا پہچانا جاتا ہے۔[7]

﴿ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴾ پس تم قیامت کے وقوع میں شک مت کرو اور اس کو مت جھٹلاؤ، کیوں کہ وہ تو ضرور ہی ہونے والی ہے اور جن کاموں کا میں تم کو حکم دیتا ہوں، ان میں میری پیروی کرو، یعنی توحید اور بطلانِ شرک کا، اور اللہ کے فرائض جن کو تم پر فرض کیا ہے ادا کرو۔ یہ شے جس کا میں تم کو امر کرتا ہوں اور اس کی طرف تم کو بلاتا ہوں ایک سیدھی راہ ہے جو حق کی طرف بلانے والی ہے۔ جمہور نے ﴿ وَاتَّبِعُوْنِ ﴾ کو بہ حذفِ یاء پڑھا ہے وصل و وقف میں اور اسی طرح "أَطِيْعُوْنِ" کو بہ حذفِ یاء دونوں حال میں پڑھا ہے۔ ابوعمرو رحمہ اللہ نے بہ حذفِ یاء وصل میں نہ وقف میں پڑھا ہے اور نافع سے بھی یہ ایک روایت ہے۔[8]

---

[1] التبيان في إعراب القرآن (١١٤١/٢) [2] البحر المحيط (٢٥/٨) [3] فتح القدير (٧٣٤/٤)

[4] مستدرك الحاكم (٢٧٨/٢) الدر المنثور (٣٨٦/٧، ٣٨٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٠٨)

[5] تفسير الطبري (٦٣٢/٢١) [6] تفسير الطبري (٦٣٣/٢١) تفسير القرطبي (١٠٥/١٦)

[7] تفسير القرطبي (١٠٥/١٦) فتح القدير (٧٣٤/٤) [8] فتح القدير (٧٣٤/٤)

﴿ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ﴾ یعنی تم کو شیطان ہرگز نہ روکے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس کے وسوسوں اور شبہوں سے دھوکا مت کھاؤ جن کو وہ تمھارے دلوں میں ڈالتا ہے، تاکہ میری اتباع سے یا قیامت پر ایمان لانے سے تم کو روکے، اس لیے کہ جس شے کی طرف میں نے تم کو بلایا ہے وہ اللہ کا دین ہے جس پر اس کے رسولوں اور کتابوں کا اتفاق ہے۔ پھر اس ممانعت کی وجہ یہ بیان فرمائی: ﴿ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ یعنی تم اس سے دھوکا مت کھاؤ، اس لیے کہ بے شک وہ ایک بڑا دشمن ہے جو تمھارے لیے اپنی عداوت ظاہر کرنے والا ہے نہ اس سے تحاشی کرتا ہے (الگ ہوتا ہے) نہ اس کو چھپاتا ہے جس طرح کہ وہ قصہ اس پر دال ہے جو اس کے اور آدم علیہ السلام کے درمیان واقع ہوا اور وہ جو اس نے اپنے نفس پر سارے بنی آدم کو گمراہ کرنا لازم کر لیا سوائے اللہ کے مخلص بندوں کے۔

غرض یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے جو بات کہی اللہ پاک نے اس کا ذکر فرمایا: ﴿ وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ ﴾ یعنی جب عیسیٰ علیہ السلام واضح معجزے اور روشن احکام لے کر بنی اسرائیل کی طرف آئے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اس جگہ "بینات" سے مراد انجیل ہے۔[1] تو کہا کہ میں یقیناً تمھارے پاس حکمت، یعنی نبوت لے کر آیا ہوں۔ کسی نے کہا: انجیل۔ کسی نے کہا: وہ شے جو نیک بات کی رغبت دلاتی ہے اور بری بات سے روکتی ہے۔ اور میں تمھارے پاس اس لیے آیا ہوں، تاکہ تمھارے لیے بعض اس شے کا بیان کروں جس میں تم اختلاف کرتے ہو۔ یعنی تورات کے احکامِ دین مراد ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ بَعْضَ ﴾ سے مراد ان فرقوں کا اختلاف ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرقے فرقے بن گئے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: وہ شے جس کو عیسیٰ علیہ السلام انجیل میں لائے، سوائے اس کے نہیں کہ وہ بعض ہے اس شے کی جس میں انھوں نے اختلاف کیا۔ چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل کے علاوہ وہ شے بیان کی جس کی طرف وہ محتاج ہوئے۔ کسی نے کہا کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کی موت کے بعد امرِ دین میں کئی باتوں میں اختلاف کیا۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اس جگہ ﴿ بَعْضَ ﴾ بہ معنی کل ہے جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ يُصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ﴾ [المؤمن: ۲۸] "جس (عذاب) کا وہ تم سے وعدہ کر رہا ہے، اس میں سے کچھ نہ کچھ تو تم پر آ پڑے گا۔" (اس آیت میں بعض بہ معنی کل ہونے میں اختلاف ہے، بہتر یہ ہے کہ بعض اپنے معنی پر ہے)۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ﴾[2] [آل عمران: ۵۰] "اور میں اس لیے آیا ہوں کہ تم پر وہ بعض چیزیں حلال کروں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔" یعنی وہ شے جو انجیل میں حلال کی گئی، ان چیزوں میں سے جو تورات میں حرام تھیں، جیسے: اونٹ کا گوشت اور ہر حیوان کی چربی اور ہفتے کے دن مچھلی کا شکار۔

---

[1] تفسير الطبري (٦٣٤/٢١) [2] فتح القدير (٧٣٤/٤، ٧٣٥)

﴿ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ ﴾ میں حرفِ لام معطوف ہے مقدر پر، گویا یوں کہا: "قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ لِأُعَلِّمَكُمْ إِيَّاهَا وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ"، یعنی تحقیق میں تمھارے پاس حکمت لے کر آیا، تاکہ میں وہ تم کو سکھاؤں اور تاکہ تمھارے لیے بیان کروں۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ بِالْحِكْمَةِ ﴾ پر معطوف ہے۔ "أَيْ: وَجِئْتُكُمْ لِأُبَيِّنَ لَكُمْ"۔ حرفِ عطف اس لیے لایا گیا تاکہ علت کی شان کی اہمیت معلوم ہو اس طرح سے کہ اس کے لیے خاص طور پر علاحدہ فعل لائے۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے کہ عاطف کا ترک نہیں کیا گیا، تاکہ ما قبل سے متعلق ہو، اس لیے کہ علت کی اہمیت سے آگاہ کرنا منظور ہے، یہاں تک کہ گویا یہ علت ایک مستقل کلام ٹھہرائی گئی۔

پھر ان کو تقویٰ اور طاعت کا حکم دیا تو یوں کہا: ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴾ پس تم اللہ کے معاصی سے بچو اور اس بات میں میرا کہا مانو جس کا میں تم کو حکم دیتا ہوں اور اللہ کی طرف سے وہ پہنچاتا ہوں، یعنی توحید اور شریعت کے احکام۔ پھر ان کو جس بات میں اطاعت کرنے کا امر فرمایا، اس کا یہ بیان کیا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ﴾ یعنی بے شک اللہ وہی ہے جو میرا اور تمھارا رب ہے، لہٰذا تم اس کی عبادت کرو۔ ﴿ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴾ یعنی اکیلے اللہ کا پوجنا اور اس کی شریعت اور احکام پر عمل کرنا ہی سیدھی راہ ہے۔ یہ عیسیٰ علیہ السلام کے کلام کا تتمہ ہے، یا اللہ پاک کی طرف سے استیناف ہے۔ اس شے پر دال ہے جو اس بارے میں طاعت کی مقتضی ہے۔

﴿ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ﴾ امام مجاہد اور سدی رحمہما اللہ نے کہا کہ یہ احزاب اہلِ کتاب ہیں، یعنی یہود و نصاریٰ۔ امام کلبی و مقاتل رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ نصاریٰ کے فرقے ہیں جنھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے حال میں اختلاف کیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ انھوں نے آپس میں اختلاف کیا۔[1] بیانِ واضح یہ ہے کہ ﴿ بَيْنِهِمْ ﴾ کی ضمیر یا تو نصاریٰ کی طرف راجع ہے اور ﴿ اَلْاَحْزَابُ ﴾ بہ معنی فرقے اور طائفے ہے، یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے بعد نصاریٰ نے ان کے بارے میں اختلاف کیا اور اُن میں سے تین فرقے ہوئے: ایک تو نسطوریہ، یہ کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام ابن اللہ ہیں۔ دوسرا یعقوبیہ، یہ کہتے ہیں کہ اللہ وہی مسیح علیہ السلام ہے۔ تیسرا مثلثہ ہے، یہ تین اللہ بتاتے ہیں: مسیح علیہ السلام، ان کی ماں اور ان کے باپ۔ اور ایک گروہ مومن ہے یہ کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

اس بنا پر ﴿ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ﴾ حال ہوگا ﴿ اَلْاَحْزَابُ ﴾ سے اور ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کا، یعنی فرقوں نے اختلاف کیا، درآنحالیکہ وہ نصاریٰ میں سے بعض ہیں، اس لیے کہ ان میں سے ایک فرقہ مومن ہے۔ یا ﴿ اَلْاَحْزَابُ ﴾ سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں، یہ دونوں ان کے بارے میں فرقے فرقے بنے۔ یہود ـلعنهم اللهـ نے تو ان کو ولدِ زنا ٹھہرایا اور نصاریٰ نے اللہ کا بیٹا کہا۔ اس بنیاد پر ﴿ بَيْنِهِمْ ﴾ کی ضمیر کل بنی اسرائیل کی طرف راجع ہوگی، اس لیے

---

[1] فتح القدير (٧٣٥/٤)

کہ وہ نبوت کے ساتھ ان کی طرف مبعوث ہوئے تو انھوں نے سب کو خطاب کر کے کہا: ﴿ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ ﴾.
پھر ان میں سے بعض نے ان کو مانا اور بعض نے تکذیب کی اور یہودیت پر جمے رہے، اس معنی پر بھی ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کا ہوگا۔ ایک قول یہ ہے کہ ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے اور ضمیر ﴿ اَلْاَحْزَابُ ﴾ کی طرف راجع ہے، یعنی احزاب نے آپس میں اختلاف کیا۔

اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴾ پس ان لوگوں کی خرابی ہے جنھوں نے ان اختلاف کرنے والوں میں سے ظلم کیا۔ یہ وہی ہیں جنھوں نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اور اس کی شریعت پر عمل نہ کیا اور عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں وہ بات کہی جس کے سبب سے کافر ہو گئے۔ اس دن کے عذاب سے جس کا عذاب دردناک ہے، مراد روزِ قیامت ہے۔ ﴿ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ استفہام انکاری ہے، یعنی یہ احزاب نہیں انتظار کرتے مگر قیامت کا کہ ان کو اچانک آ جائے اور ان کو خبر نہ ہو، اس لیے کہ وہ تو اپنے امورِ دنیا میں مشغول ہیں اور اس کا انکار کر رہے ہیں۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ۴۹] ''وہ (سخت چیخ) انھیں پکڑے گی اور یہ باہم لڑائی جھگڑے میں ہی ہوں گے۔'' کسی نے کہا کہ ''احزاب'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جمع ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی اور یہی مراد ہے ﴿ هَلْ يَنْظُرُوْنَ ... الآية ﴾ سے، لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

غرضیکہ یہ فرقے جدا جدا بن گئے ہیں اور ہر فرقہ اپنے اپنے طریقے کو محبوب رکھتا ہے اور باہم دوست ہو رہا ہے، قیامت کے دن یہ دوستی دشمنی میں تبدیل ہو جائے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلْاَخِلَّاۗءُ يَوْمَىِٕذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ﴾ یعنی دنیا میں باہم دوستی رکھنے والے جس دن ان پر قیامت قائم ہوگی تو ایک دوسرے کا دشمن ہو جائے گا، کیوں کہ ان کے آپس میں جو علاقے تھے وہ ٹوٹ گئے اور ان میں سے ہر ایک اپنی ذات کے کام میں مشغول ہو گیا اور جن باتوں میں دوستی تھی ان کو عذاب کا سبب پایا تو دشمن ہو گئے۔ پھر متقین کا استثناء فرمایا کہ ﴿ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴾ یعنی مگر متقی لوگ کہ یہ دنیا اور آخرت میں دوست ہیں، اس لیے کہ ان کے درمیان جو دوستی تھی اس کو انھوں نے خیر اور ثواب کا سبب پایا تو وہ اپنے حال، یعنی دوستی پر باقی قائم رہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث جو دو دوستوں کے متعلق وارد ہوئی ہے، اس کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔[1] امام عبد الرزاق، عبد بن حمید اور حمید بن زنجویہ نے اپنی ترغیب میں اور امام ابن جریر، بیہقی، ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے اس کو روایت کیا ہے۔[2] غرضیکہ جو متقی لوگ خاص اللہ پاک کے لیے آپس میں دوستی اور محبت رکھتے ہیں تو ان کی عزت، شرف اور تکریم کے لیے اور ان کے دل خوش کرنے کے لیے قیامت کے دن ان سے یوں کہا جائے گا:

---

① اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ ② فتح البیان (۱۲/ ۳۶۵۔ ۳۷۱)

يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿٦٨﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿٦٩﴾ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ﴿٧٠﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٧١﴾ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٧٢﴾ لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٧٣﴾

(انھیں کہا جائے گا:) اے میرے بندو! تم پر آج کوئی خوف نہیں اور نہ تم غمگین ہو گے (68) (یعنی) جو لوگ ہماری آیات پر ایمان لائے اور وہ فرماں بردار تھے (69) تم جنت میں داخل ہو جاؤ، تم اور تمھاری بیویاں خوش حال ہو گے (70) ان پر سونے کی رکابیوں اور ساغروں کے دور چل رہے ہوں گے، اور اس (جنت) میں جس شے کو ان کے دل چاہیں گے اور (ان کی) آنکھیں متلذذ ہوں گی (وہ موجود ہو گی) اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے (71) اور یہی وہ جنت ہے جس کے تم وارث بنائے گئے ہو ان اعمال کے بدلے جو تم کرتے رہے (72) اس میں تمھارے لیے بہت سے پھل ہوں گے جن میں سے تم کھاؤ گے (73)

پرہیز گاروں کو روزِ قیامت جنت میں داخلے کی بشارت:

یعنی چن چن کر۔ انتہیٰ. اللہ پاک نے متقی لوگوں کو خوش خبری دی اور ان کو اپنی طرف منسوب کر کے فرمایا کہ اے میرے بندو! آج تم پر نہ کچھ ڈر ہے اور نہ تم غم کھاؤ اور خوش خبری دے کر ان کی صفت بیان کی کہ یہ وہ ہیں کہ جن کے دل اور باطن ہماری آیتوں پر ایمان لائے اور ان کے اعضاء اور ظاہری حصے ہماری شریعت کے مطیع اور فرماں بردار ہوئے۔ معتمر بن سلیمان رحمہ اللہ نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ جب قیامت کا دن ہو گا تو جس وقت لوگ مبعوث ہوں گے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہو گا جو گھبرا نہ جائے گا، پھر ایک پکارنے والا پکارے گا: ﴿ يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴾ تو سارے لوگ اس کی امید کریں گے، اس کے بعد وہ یہ ندا کرے گا: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴾ کہا: چنانچہ مومنوں کے سوا اور لوگ اس سے ناامید ہو جائیں گے۔[1] ان سے کہا جائے گا: ﴿ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ﴾ یعنی تم اور تمھاری شبیہ ونظیر جنت میں داخل ہو جاؤ، تم کو نعمتیں اور عیش وعشرت کا سامان ملے گا اور تمھیں سعادت اور بہرہ مندی نصیب ہو گی۔ اس کی تفسیر سورۃ الروم میں گزر چکی ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (٦٣٩/٢١)

﴿ یُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ﴾ ”صحاف“ کھانے کے برتن اور ﴿ اَكْوَابٍ ﴾ پانی پینے کے برتن ہیں جن کی نہ تو ٹونٹیاں ہیں اور نہ کڑے۔ ان پر سونے کی رکابیاں اور آبخورے لیے پھریں گے۔ ”وَفِيهَا مَا تَشْتَهِي الْأَنْفُسُ“ اور اس میں وہ چیز ہے جس کو جی چاہیں۔ بعض نے ﴿ تَشْتَهِيهِ الْاَنْفُسُ ﴾ پڑھا ہے۔ ﴿ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ﴾ اور آنکھیں مزا پائیں۔ یعنی وہاں وہ شے ہے جو خوش مزا، خوشبو اور خوش شکل خوبصورت ہے۔

امام عبد الرزاق رحمہ اللہ نے بروایتِ عکرمہ رحمہ اللہ مولائے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اہلِ جنت میں منزلت کے اعتبار سے سب سے ادنیٰ اور درجے کے لحاظ سے سب سے نیچے البتہ وہ شخص ہے کہ اس کے بعد جنت میں اور کوئی داخل نہ ہوگا۔ اس شخص کے لیے سو برس کی راہ تک اس کی نظر میں جگہ فراخ کی جائے گی، جس میں سونے کے محلات اور موتیوں کے خیمے ہوں گے، ان میں ایک بالشت بھر بھی جگہ ایسی نہیں ہوگی جو آباد نہ ہو۔ صبح و شام اس کے پاس سونے کی ستر ہزار رکابیاں لائی جائیں گی، ہر رکابی میں ایسا کھانا ہوگا جو کسی دوسری رکابی میں نہیں ہوگا۔ آخری رکابی میں بھی اس کی خواہش اور رغبت ایسی ہوگی جیسی کہ پہلی رکابی میں تھی، اگر اس کے پاس سارے زمین والے آ جائیں تو یہ کھانا ان کے لیے بہت ہوتا اور اس سے اس شے میں سے کچھ بھی کم نہ ہوتا جو اسے دی گئی۔[1]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے حدیث کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حدیث کی اور جنت کا ذکر کیا۔ چنانچہ فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے! تم میں سے ایک شخص اپنے منہ میں ایک لقمہ ڈالے گا، پھر اس کے دل میں کسی اور کھانے کا خیال آئے گا تو اس کے منہ میں جو کھانا ہے وہ اس کھانے میں تبدیل ہو جائے گا جس کو اس نے چاہا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْاَنْفُسُ ﴾۔[2]

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک اہلِ جنت میں سے از روئے منزلت ادنیٰ وہ شخص ہے کہ اس کے لیے سات درجے ہیں اور وہ چھٹے پر ہے اور اس سے اوپر ساتواں درجہ ہے اور بے شک اس کے لیے تین سو خادم ہیں اور ہر روز صبح و شام اس کے پاس تین سو رکابیاں لائی جائیں گے: ”وَلَا أَعْلَمُهُ إِلَّا قَالَ مِنْ ذَهَبٍ“ یعنی سونے کی، ہر رکابی میں کھانے کی ایسی قسم ہوگی جو دوسری میں نہ ہوگی اور بے شک اس کا پہلا حصہ بھی ایسا ہی لذیذ ہوگا جیسا کہ آخری حصہ۔ اور پینے کی چیزوں میں سے تین سو برتن ہوں گے ہر برتن میں پینے کی ایسی قسم ہوگی جو دوسرے میں نہ ہوگی اور بے شک اس کا پہلا حصہ ایسا ہی لذیذ ہوگا

---

(1) تفسير الصنعاني (۲۰۱/۳) یہ روایت مرسل ہے۔

(2) تفسير ابن أبي حاتم (۳۲۸۶/۱۰) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

جیسا کہ آخری حصہ اور بے شک وہ البتہ کہے گا کہ اے میرے رب! اگر تو مجھے اذن دیتا تو البتہ میں اہلِ جنت کو کھلاتا اور پلاتا اور میرے پاس جو کچھ ہے، اس میں سے کچھ کم نہ ہوتا۔ اور بے شک اس کے لیے حورِ عین سے البتہ بہتر (۷۲) بیویاں ہیں جو دنیا میں اس کی بیویوں کے علاوہ ہوں گی اور بے شک ان میں سے ہر ایک اپنی نشست کے لیے زمین کی ایک میل جگہ کے برابر لے گی۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ یعنی جنت والے جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، نہ اس سے نکلیں گے اور نہ وہاں سے منتقل ہونا چاہیں گے۔ پھر فضل و کرم اور احسان کے طور پر ان سے کہا جائے گا: ﴿ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی تمھارے عمل صالح اس کے سبب ہوئے کہ اللہ پاک کی رحمت تم کو شامل ہوئی، اس لیے کہ کسی کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا، لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل سے اس میں داخل ہو گا۔

رہے اس کے درجے تو ان کا فرق ان کے اعمالِ صالح کے مطابق ہو گا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہر اہلِ نار حسرت کے طور پر جنت میں اپنی منزل کو دیکھے گا اور کہے گا کہ اگر اللہ مجھے ہدایت کرتا تو البتہ میں متقین میں سے ہوتا اور ہر اہلِ جنت نار میں اپنی منزل کو دیکھے گا تو کہے گا کہ اگر اللہ ہم کو ہدایت نہ کرتا تو ہم البتہ ہدایت نہ پاتے۔ اس کا یہ کہنا اس کے لیے شکر ہو گا۔ کہا: اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر شخص کے لیے ایک مقام جنت میں ہے اور ایک منزل نار میں۔ چنانچہ کافر مومن کا وارث ہو گا اس کی آگ والی منزل کا اور مومن کافر کا وارث ہو گا اس کی جنت والی منزل کا۔ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴾ یعنی تمھارے لیے بہت سی اقسام کے میوے ہیں، تم ان میں سے وہ کھاتے ہو جو تمھیں پسند ہوں اور جو تم چاہو۔ جب اللہ پاک نے کھانے پینے کا ذکر کیا تو اس کے بعد میوے کا بھی ذکر فرما دیا، تا کہ نعمت و غبطہ (رشک کرنا) اور خوشی پوری ہو جائے۔[3] وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى أَعْلَمُ.

(كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴾ "عِبَادِيْ" کی

[1] مسند أحمد (۵۳۷/۲) اس کی سند میں "شہر بن حوشب اور سکین بن عبدالعزیز" متکلم فیہ راوی ہیں۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦١٠٥)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (۳۲۸٦/۱۰) تفسير ابن كثير (۱۷۰/٤) [3] تفسير ابن كثير (۱٦۹/٤، ۱۷۰)

صفت ہوسکتی ہے، یا اس سے بدل ہوسکتا ہے کہ اس کا عطفِ بیان ہو، یا اس سے مقطوع ہو محلِ نصب میں بنا بر مدح، یا محلِ رفع میں ہو اس بنیاد پر کہ مبتداء ہو اور اس کی خبر ﴿ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ ﴾ ہو بر تقدیر: "وَيُقَالُ لَهُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ"، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے اور زجاج رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس وقت قیامت کے دن خوف واقع ہوگا تو ایک منادی ندا کرے گا: ﴿ يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴾.

پھر جب وہ ندا سنیں گے تو خلائق اپنے سر اٹھائیں گے، پھر کہا جائے گا: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴾ تو مسلمین کے سوا بتوں والے اپنے سر جھکالیں گے۔ امام نافع، ابن عامر، ابوعمرو اور ورش رحمہم اللہ نے "يَا عِبَادِيْ" وصل و وقف میں بہ اثباتِ یائے ساکنہ پڑھا ہے اور امام ابو بکر اور زر بن حبیش رحمہما اللہ نے دونوں حال میں بہ اثبات و فتحِ یاء پڑھا ہے۔ باقی قراء نے بہ حذفِ یاء در ہر دو حال پڑھا ہے۔[1] مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن جو لوگ متقی اللہ کے لیے دوستی رکھنے والے ہیں، ان کی تعظیم و تکریم کے لیے کہا جائے گا: اے میرے بندو! آج کے دن تم پر کچھ خوف نہیں اور نہ ہی تم غم کھاؤ، ایسے بندے جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے اور وہ مسلمان تھے۔ یعنی اللہ پاک کے مطیع اور فرماں بردار تھے اور دین کے معاملے میں مخلص تھے۔ چنانچہ اس ندا کے سننے سے ان کا خوف اور حزن جاتا رہے گا۔ پھر ان سے کہا جائے گا کہ تم اور تمھاری ازواج جنت میں داخل ہو جاؤ۔ ازواج سے مراد ان کی مومن بیویاں ہیں۔ کسی نے کہا کہ مومنین میں سے ان کے ساتھی ہیں۔ کسی نے کہا کہ حورِ عین میں سے ان کی بیویاں ہیں۔

﴿ تُحْبَرُوْنَ ﴾ کے معنی "تُكْرَمُونَ" ہیں، یعنی تمھارا اکرام کیا جائے گا۔ یا "تُنْعَمُونَ" یعنی تم کو عیش و آرام ملے گا۔ کسی نے کہا کہ "تفْرَحُونَ"۔ کسی نے کہا ہے کہ "تُسِرُّونَ"۔ کسی نے کہا کہ "تُعْجَبُونَ" یعنی تم خوش کیے جاؤ گے۔ کسی نے کہا کہ "تَلَذَّذُونَ بِالسَّمَاعِ" یعنی تم کو سماع کی لذت دی جائے گی۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس کی تفسیر فرح اور سرور کے ساتھ کی جائے، یہ دونوں کرامت اور نعمت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ پاک نے چار چیزوں کے ساتھ ان کو نداء کی: پہلی تو خوف کی نفی۔ دوسری حزن کی نفی۔ تیسری جنت میں داخل ہونے کا حکم اور چوتھی سرور کی خوشخبری۔ اس کے بعد اس ساز و سامان کا ذکر کیا جو ان کو وہاں عطا کیا جائے گا۔

﴿ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ﴾ "صحاف"، "صحفة" کی جمع ہے۔ "صحفة" واسع اور عریض قصعہ، یعنی چوڑے چکلے پیالے کو کہتے ہیں۔ امام کسائی رحمہ اللہ کہتے ہیں قصاع میں سب سے بڑا جفنہ ہے۔ پھر قصعہ جو دس آدمیوں کو سیر کرتا ہے۔ پھر "صحفة" یہ پانچ کو سیر کرتا ہے۔ پھر مکیلہ یہ دو یا تین کا پیٹ بھرتا ہے۔ أكواب"، "كوب" کی جمع ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "كوب" وہ کوزہ ہے جس کا دستہ نہیں ہوتا۔

[1] فتح القدير (٧٣٥/٤)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ''کوب'' وہ ہے جو مدور، کوتاہ گردن، کوتاہ دستہ ہوتا ہے اور ابریق وہ ہے جس کی گردن لمبی اور دستہ بھی لمبا ہوتا ہے۔

امام اخفش رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ''أکواب'' وہ ابریق ہیں جن کی ٹونٹیاں نہیں ہوتیں۔ امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''أکواب'' وہ ابریق ہیں جن کے عروہ نہیں ہوتے۔[1] عروہ وہ ہے جس سے اس کو پکڑتے ہیں اور اس کا نام ''اُذُن'' بھی ہے، مراد دستہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اَلْأَکْوَابُ: اَلْجِرَارُ مِنَ الْفِضَّةِ''۔[2] ''جِرَارُ'' جمع ''جرۃ'' بہ معنی ''سبوئی'' ہے، یعنی چاندی کی مٹکیاں۔ مطلب یہ ہے کہ جنت میں ان کے لیے انواع و اقسام کے کھانے ہیں جن کو سونے کی رکابیوں میں ڈالے ہوئے ان پر پھریں گے اور ان کے وہاں پینے کی چیزیں ہیں جن کو ان کے لیے آبخوروں میں لیے ہوئے ان پر طواف کریں گے۔ چونکہ کھانے پینے پر عیش کا مدار ہے، اس لیے پہلے ان کا ذکر کیا اور اس کے بعد فرمایا: ﴿وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ﴾۔

جمہور نے ''تَشْتَهِي'' پڑھا ہے اور نافع و ابن عامر و حفص رحمہم اللہ نے ﴿تَشْتَهِيهِ﴾ پڑھا ہے بہ اثباتِ ضمیر جو موصول کی طرف راجع ہے اور اسی طرح عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں بھی ہے (اس کے ساتھ ''تَلَذُّ الْأَعْيُن'' بھی ہے)۔[3] یعنی اور جنت میں وہ چیزیں ہیں جن کو جنت والوں کے جی چاہیں، یعنی انواع و اقسام کے کھانے پینے کی چیزیں اور اشیائے معقولہ و مسموعہ و ملموسہ اور ان کی طرح کی وہ شے جس کو جی چاہتا ہے اور اس کی خواہش کرتا ہے، وہ کوئی سی بھی چیز ہو۔ یہ اس کا بدلہ ہے کہ انھوں نے دنیا میں اپنی جانوں کو خواہشات سے روکا۔

﴿وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ﴾ یعنی اور وہاں وہ شے ہے جس سے آنکھیں لذت لیتی ہیں، یعنی کل لذت کی چیزیں جن سے لذت لی جاتی ہے اور ان کو دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ ان سب سے اعلیٰ رب العالمین کا دیدارِ فائز الانوار ہے۔ اللهم ارزقنا بکرمك یا مولانا وسیدنا آمین۔ یہ اشتیاق اور شوق کی ان مشقتوں کا بدلہ ہے جن کا انھوں نے دنیا میں تحمل کیا، یعنی اٹھائیں۔ غرضیکہ یہ ان قسم قسم کی نعمتوں کا حصر ہے، یعنی احاطہ کرنا ہے۔ وہ یا تو ''مشتهيات في القلوب'' ہیں، یا ''مستلذات في العيون'' ہیں۔

عبد الرحمان بن سابط رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا جنت میں گھوڑے ہیں، اس لیے کہ میں گھوڑوں کو محبوب رکھتا ہوں؟ فرمایا: اگر اللہ تجھے جنت میں داخل کرے گا تو کیا تو نہ چاہے گا کہ ایک یاقوت کے سرخ گھوڑے پر سوار ہو، وہ تجھے اڑا کر جس جنت میں تو چاہے لے جائے، مگر وہ تجھے لے جائے گا۔ ایک اور شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اور کہا: یا رسول اللہ! کیا جنت میں اونٹ ہیں؟ کیوں کہ میں اونٹوں کو دوست رکھتا

---

[1] تفسير القرطبي (١٦/١١٣، ١١٤) فتح القدير (٤/٧٣٦) [2] تفسير الطبري (٢٣/١٠١) [3] فتح القدير (٤/٧٣٦)

ہوں، کہا: پھر آپ ﷺ نے اس سے وہ بات نہیں فرمائی جو اس کے ساتھی سے فرمائی تھی۔ چنانچہ فرمایا اگر اللہ تجھے جنت میں داخل کرے گا تو تیرے لیے وہ چیز ہو گی جس کو تیرا جی چاہے گا اور اس سے تیری آنکھ لذت لے گی۔[1] اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔ "لَذَّۃ" بہ معنی مزہ ہے، اس کی جمع "لذات" ہے۔ "لذاذ و لذاذة" بہ معنی خوش مزہ یا فتن ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "لَذَا الشَّيْءَ يَلُذُّ لَذَاذًا وَّلَذَاذَةً إِذَا وَجَدَهُ لَذِيْذًا أَوِ الْتَذَّ بِهِ"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تم نہ مرو گے نہ اس سے نکلو گے اور قیامت کے دن ان سے کہا جائے گا: ﴿ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی یہ وہ جنت ہے جو تمھاری طرف نقل کر آئی جس طرح کہ میراث وارث کی طرف نقل کر آتی ہے، ان اعمالِ صالحہ کے سبب سے جن کو تم دنیا میں کیا کرتے تھے۔ ﴿ تِلْكَ ﴾ مبتداء ہے اور ﴿ اَلْجَنَّةُ ﴾ اس کی صفت ہے اور موصول مع اپنے صلہ کے جنت کی صفت ہے اور ﴿ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ خبر ہے۔ کسی نے کہا کہ خبر موصول مع صلہ ہے، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ اس آیت میں صیغۂ غائب سے صیغۂ خطاب کی طرف التفات ہے تشریف اور تکریم کے لیے اور مخاطب اہلِ جنت میں سے ہر ایک شخص ہے، چنانچہ اسی لیے ﴿ تِلْكَ ﴾ کے کاف کو مفرد ذکر کیا اور "تِلْكُمْ" نہ کہا جو ﴿ اُوْرِثْتُمُوْهَا ﴾ کا مقتضا تھا، اس لیے کہ یہ بات بتانا منظور تھا کہ ہر ایک مقصود بذاتہ ہے۔

﴿ لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ ﴾ یعنی اس میں تمھارے لیے طعام و شراب کے علاوہ بہت سے انواع و اقسام کے میوے ہیں۔ ﴿ فَاكِهَةٌ ﴾ سے مراد سارے تر اور خشک میوے ہیں۔ کلمۂ ﴿ مِنْهَا ﴾ کو ﴿ تَاْكُلُوْنَ ﴾ پر فاصلہ کی وجہ سے مقدم کر دیا ہے، حرف "مِنْ" تبعیض کا ہے، یا ابتداء کا۔ تبعیض کے یہ معنی ہیں کہ ان میووں میں سے بعض کو کھاؤ گے۔ ہر میوہ جو کھایا جائے گا اسی وقت اس جیسا اور میوہ اس کی جگہ لے لے گا، جیسے: ابلتا پانی کہ کتنا ہی اس کو استعمال کرو، وہ ویسا ہی رہتا ہے، اس میں سے کچھ کم نہیں ہوتا۔ جنت کے درخت میووں سے بھرے رہیں گے، کبھی میوے سے خالی نہ ہوں گے، پھر جب اللہ پاک وعدہ ذکر کر چکا تو قرآن شریف کے انداز کے مطابق وعید کا ذکر کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝۷۴ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ۝۷۵ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ۝۷۶ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ۝۷۷

[1] تفسیر الطبري (۲۱/۶۴۴) یہ روایت مرسل ہے، البتہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کو اپنی سنن، رقم الحدیث (۲۵۴۳) میں مرفوعاً روایت کیا ہے۔ نیز اس کی سند میں "عبدالرحمان بن عبداللہ مسعودی" ضعیف راوی ہے۔

[2] فتح البیان (۱۲/۳۷۲۔۳۷۵)

لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۸﴾
اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا
نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۸۰﴾ قُلْ اِنْ
كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا
حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۸۳﴾ وَهُوَ الَّذِيْ
فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۴﴾
وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ
وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ
يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ
يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ
فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا
يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ؕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

بے شک مجرم لوگ عذابِ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے (74) ان سے وہ (عذاب) ہلکا نہیں کیا جائے گا اور وہ اس میں نا اُمید پڑے رہیں گے (75) اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، بلکہ خود ہی ظالم تھے (76) اور وہ (داروغۂ جہنم کو) پکاریں گے: اے مالک! تیرا ربّ ہمارا کام ہی تمام کر دے، وہ کہے گا: بے شک تم تو ہمیشہ (اسی عذاب میں) رہو گے (77) بلاشبہ ہم تمھارے پاس حق لائے تھے، اور لیکن تمھارے اکثر لوگ حق کو ناپسند ہی کرنے والے تھے (78) کیا انھوں (مشرکینِ مکہ) نے (کسی اقدام کا) پختہ فیصلہ کر لیا ہے تو ہم بھی قطعی فیصلہ کرنے والے ہیں (79) کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ بے شک ہم ان کی خفیہ باتیں اور سرگوشیاں نہیں سنتے۔ کیوں نہیں! اور ہمارے پیغمبر (بھیجے ہوئے فرشتے) ان کے پاس ہی لکھتے رہتے ہیں (80) (اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: اگر رحمان کی کوئی اولاد ہوتی تو سب سے پہلے میں ہی (اس کی) عبادت کرنے والا ہوتا (81) آسمانوں اور زمین کا رب ہی عرش کا رب ہے، وہ ان باتوں سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے

ہیں ⑧② چنانچہ آپ انھیں چھوڑ دیجیے، وہ (اپنے باطل خیالات میں) اُلجھے رہیں اور کھیل تماشے میں لگے رہیں، حتیٰ کہ وہ اپنے اس دن کو پالیں جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے ⑧③ اور وہی (اللہ) آسمان میں بھی معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے اور وہ بہت حکمت والا، خوب جاننے والا ہے ⑧④ اور وہ بہت بابرکت ذات ہے جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اس (سب) کی بادشاہی ہے، اور اسی کے پاس قیامت کا علم ہے، اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ⑧⑤ اور وہ اللہ کو چھوڑ کر جنھیں پکارتے ہیں، وہ سفارش کا اختیار نہیں رکھتے، سوائے ان کے جنھوں نے حق کی گواہی دی اور وہ علم بھی رکھتے ہیں ⑧⑥ اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انھیں کس نے پیدا کیا تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے! پھر وہ کہاں بہکائے جاتے ہیں؟ ⑧⑦ اس (رسول) کے اس قول کی قسم ہے کہ اے میرے رب! بے شک یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے ⑧⑧ لہٰذا (اے نبی!) ان سے عفو و درگزر کیجیے اور کہہ دیجیے: سلام ہے، پھر عن قریب وہ جان لیں گے ⑧⑨

مجرموں کا انجام بد:

مالک فرشتے کا نام ہے جو دوزخ کا داروغہ ہے۔ کہتے ہیں کہ دوزخی ہزار برس چلائیں گے، تب وہ ایک جواب دے گا کہ تمھارے بارے میں فیصلہ ہو چکا، یعنی عذاب کی مار میں ڈال چکے۔ کیا انھوں نے مل کر کسی کام کا پختہ ارادہ کر لیا ہے، یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ کافروں نے مل کر مشورہ کیا کہ تمھاری غفلت کی وجہ سے اس نبی کی بات پھیلی ہے۔ اب جو کوئی اس کے دین میں آئے تو اس کے رشتے دار ہی اس کو مار مار کر اسے واپس اپنے دین میں پھیریں اور اگر کوئی شہر میں باہر سے اوپرا آدمی آئے تو اس کو پہلے ہی سے بتا دو کہ اس شخص کے پاس نہ بیٹھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی خرابی کا فیصلہ کیا۔ ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں۔ ہر آدمی کے ساتھ فرشتے رہتے ہیں، اس کا ہر کام لکھ لیتے ہیں۔ شفاعت کے بارے میں کہا کہ شفاعت کرنے والے اتنی سفارش کر سکتے ہیں کہ جس نے کلمۂ اسلام کہا ان کی خبر میں اس کی گواہی دیتے ہیں۔ اگر کسی نے کلمۂ اسلام نہیں کہا تو ان کی سفارش بھی نہیں ہے۔ اتنی سفارش بھی نیک کریں گے۔ پیغمبر کا یہ کہنا کہ یہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے، یعنی اس پر رحم کرتا ہے۔ انتھٰی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے جب نیک بختوں کا حال بیان کیا تو اس کے بعد بدبختوں کا ذکر کیا۔ چنانچہ ارشاد کیا: ﴿ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴾ یعنی بے شک گناہ گار جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ ان سے گھڑی بھر کے لیے بھی عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا اور وہ اس میں ہر قسم کی خیر سے ناامید ہیں

اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ مگر وہی اپنے بد اعمال کے سبب سے ظالم تھے۔ اس کے بعد ان پر حجت قائم ہوئی اور ان کی طرف رسول بھیجے گئے تو انھوں نے تکذیب کی اور نافرمان ہوئے، چنانچہ وہ اس سبب سے پوری جزا دیے گئے۔ ﴿وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ [حمٓ السجدة: ٤٦] ''اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے عن صفوان بن یعلیٰ عن ابیہ روایت کیا ہے، کہا: میں نے سنا رسول اللہ ﷺ کو کہ آپ ﷺ منبر پر پڑھتے تھے: ﴿وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ﴾[1] یعنی اے مالک! چاہیے کہ تیرا رب ہماری روحیں قبض کرلے اور ہم کو اس شے سے راحت دے جس میں ہم ہیں، چنانچہ بے شک ان کا حال ویسا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا﴾ [الفاطر: ٣٦] ''اور جو لوگ کافر ہیں ان کے لیے دوزخ کی آگ ہے نہ تو ان کی قضا ہی آئے گی کہ مر ہی جائیں اور نہ دوزخ کا عذاب ہی ان سے ہلکا کیا جائے گا۔'' نیز فرمایا ہے: ﴿وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۝ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۝ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى﴾ [الأعلىٰ: ١١۔ ١٣] ''بدبخت اس سے گریز کرے گا جو بڑی آگ میں جائے گا، جہاں پھر نہ وہ مرے گا نہ جیے گا (بلکہ حالتِ نزع میں پڑا رہے گا)۔'' پھر جب انھوں نے مرنے کا سوال کیا تو مالک نے ان کو یہ جواب دیا کہ ﴿اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہزار برس ٹھہرے گا، پھر کہے گا ﴿اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ﴾ یعنی تم کو تو رہنا ہے۔[2] (رواه ابن أبي حاتم) مطلب یہ ہے کہ تم کو وہاں سے نکلنا نہیں ہے اور نہ تم کو اس سے بھاگنے کی کوئی جگہ ہے۔

پھر ان کی بدبختی کا سبب بیان کیا، وہ یہی حق سے ان کی مخالفت اور دشمنی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ﴾ یعنی البتہ یقیناً ہم نے تمھارے لیے حق کو بیان کر دیا اور اس کو ظاہر اور واضح کیا ﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ﴾ یعنی لیکن تمھاری طبیعتیں اس کو قبول نہیں کرتی تھیں اور نہ اس پر متوجہ ہوتیں۔ وہ تو باطل کے لیے مطیع ہوتی تھیں اور اس کی تعظیم کرتی تھیں اور حق سے باز رہتیں اور اہلِ حق کے ساتھ بغض رکھتی تھیں، چنانچہ اب تم اپنی ہی جانوں کو ملامت کرو اور نادم اور پشیمان ہو ایسی جگہ میں کہ ندامت تم کو کچھ فائدہ نہ دے گی۔

پھر اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ انھوں نے بڑے مکر و فریب کا ارادہ کیا تو ہم نے ان سے کید کیا۔[3] یہ جو امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا، ایسا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ﴾ [النمل: ٥٠] ''انھوں نے مکر (خفیہ تدبیر) کیا اور ہم نے بھی اور وہ اسے سمجھتے ہی نہ تھے۔'' اور یہ اس لیے ہوا کہ مشرک لوگ باطل کے ساتھ حق کو رد کرنے میں حیلہ و مکر کرتے تھے اور اس کی تدبیریں سوچتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان سے کید کیا اور اس کا وبال انھی پر لوٹا دیا۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ﴾ یعنی کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کی چھپی کھلی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٤٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٨٦/١٠) [3] تفسير الطبري (٦٤٦/٢١)

باتوں کو نہیں سنتے؟ کیوں نہیں؟ ہمارے رسول ان کے پاس لکھتے ہیں، یعنی جس بات پر وہ ہیں اس کو ہم جانتے ہیں اور فرشتے بھی ان کے چھوٹے بڑے اعمال کو لکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی کوئی اولاد نہیں ہے:

پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴾ یعنی اگر رحمان کی اولاد فرض کی جاتی تو البتہ میں اس کو پوجتا، کیوں کہ میں تو اس کے بندوں میں سے ایک بندہ ہوں اور جو کچھ وہ مجھے حکم کرتا ہے، اس سب کے لیے میں مطیع وفرماں بردار ہوں، میرے لیے اس کی عبادت سے کسی طرح کا تکبر اور انکار ممکن نہیں ہے، چنانچہ بالفرض اگر اولاد ہوتی تو پوجنا بھی ہوتا، لیکن یہ تو اس کے حق میں ممنوع ہے اور شرط سے نہ تو وقوع لازم آتا ہے نہ جواز، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾ [الزمر: ٤] ''اگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ اولاد ہی کا ہوتا تو اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا چن لیتا (لیکن) وہ تو پاک ہے، وہ وہی اللہ تعالیٰ ہے یگانہ اور قوت والا۔''

بعض مفسرین نے ﴿ اَلْعٰبِدِيْنَ ﴾ کی تفسیر میں ''آنِفِین'' کہا ہے، ان میں سے امام سفیان ثوری رحمہ اللہ ہیں اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اس قول کو روایت کیا ہے، یوں کہا ہے: ''وَيُقَالُ: ﴿ اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴾ اَلْجَاحِدِيْنَ'' ماخوذ ''عَبِدَ يَعْبَدُ'' سے۔[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کے شواہد میں سے ایک یہ شاہد ذکر کیا ہے جس کو بہ سندِ خود نعجہ بن بدر جہنی سے روایت کیا ہے کہ قبیلہ جہینہ کی ایک عورت اپنے خاوند پر داخل ہوئی اور یہ شخص بھی انھی میں سے تھا، پھر اس عورت نے اپنے خاوند کے لیے چھے ماہ کا بچہ جنا تو اس کے خاوند نے عثمان رضی اللہ عنہ سے اس کا ذکر کیا، انھوں نے حکم دیا کہ وہ رجم کی جائے، پھر علی رضی اللہ عنہ ان کے پاس داخل ہوئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں یوں فرماتا ہے: ﴿ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ ﴾ [الأحقاف: ١٥] ''اس کے حمل کا اور اس کے دودھ چھڑانے کا زمانہ تیس مہینے کا ہے۔'' نیز فرماتا ہے: ﴿ وَفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ ﴾ [لقمان: ١٤] ''اور اس کی دودھ چھڑائی دو برس میں ہے۔'' راوی نے کہا: ''فَوَ اللّٰهِ مَا عَبِدَ عُثْمَانُ رضی اللہ عنہ أَنْ بَعَثَ إِلَيْهِمَا تُرَدُّ''، یعنی عثمان رضی اللہ عنہ نے عار نہ کیا اس بات سے کہ اس عورت کی طرف آدمی بھیجا کہ وہ پھیر لائی جائے۔ یونس رحمہ اللہ نے کہا کہ امام ابن وہب رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''عبِد: استنکف''، یعنی عار وانکار کیا۔ اور شاعر نے کہا ہے:

مَتَى مَا يَشَاءُ ذُو الْوُدِّ يَصْرِمْ خَلِيْلَهُ ... وَيَعْبَدُ عَلَيْهِ لَا مَحَالَةَ ظَالِمًا[2]

اس قول میں نظر ہے، اس لیے کہ شرط کے ساتھ یہ کس طرح جوڑے گا۔ تقدیر یہ ہوگی: ''إِنْ كَانَ هٰذَا فَأَنَا مُمْتَنِعٌ مِنْهُ'' اس میں نظر ہے، اب چاہیے کہ اس میں غور کیا جائے، الٰہی مگر یوں کہیں کہ ﴿ اِنْ ﴾ شرطیہ نہیں ہے یہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٢١/٤)
[2] تفسير الطبري (٢١/ ٦٥٠، ٦٥١)

﴿ اِنْ ﴾ جو ہے تو یہ نافیہ ہے جس طرح کہ علی بن ابی طلحہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ "لَمْ یَکُنْ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الشَّاهِدِيْنَ"، یعنی رحمان کے لیے اولاد نہیں ہے۔ چنانچہ میں اول شاہدین میں سے ہوں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ﴾ کلامِ عرب سے ایک کلمہ ہے: "أَيْ: إِنْ ذٰلِكَ لَمْ يَكُنْ فَلَا يَنْبَغِيْ"، یعنی یہ بات نہیں ہوئی تو یہ دوسری سزاوار نہیں ہے۔ امام ابوصخر رحمہ اللہ کہتے ہیں: "أَيْ: فَأَنَا أَوَّلُ مَنْ عَبَدَهُ بِأَنْ لَّا وَلَدَ لَهُ وَأَوَّلُ مَنْ وَحَّدَهُ"، یعنی اگر رحمان کی اولاد ہوتو میں ان لوگوں میں سے اول ہوں جو اس کی یوں عبادت کریں کہ اس کی اولاد نہیں ہے اور ان لوگوں کا اول ہوں جو اس کی توحید کریں۔ اسی طرح امام عبدالرحمان بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ: أَوَّلُ مَنْ عَبَدَهُ وَوَحَّدَهُ وَكَذَّبَكُمْ"[1] یعنی میں ان لوگوں کا اول ہوں جو اس کو پوجیں اور اس کی توحید کریں اور تم کو جھٹلائیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴾ "اَلْاٰنِفِيْنَ" یہ دو لغت ہیں: "رَجُلٌ عَابِدٌ وَعَبِدٌ"[2] یعنی دونوں کے ایک معنی ہیں اور اول قریب تر ہے، اس بنا پر کہ شرط و جزا ہیں، لیکن یہ ممتنع ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: اگر رحمان کی اولاد ہوتی تو میں ان لوگوں میں سے پہلا ہوتا جو اس کو اس طرح سے پوجتے کہ اس کی اولاد ہے، لیکن اس کی تو کوئی اولاد نہیں ہے۔ یہ قول امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے[3] اور جس شخص نے یہ زعم کیا ہے کہ ﴿ اِنْ ﴾ نافیہ ہے، اس کے قول کو رد کیا ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴾ یعنی اشیاء کا پیدا کرنے والا بلند و بالا و متقدس و منزہ و برتر و پاک اس بات سے کہ اس کی اولاد ہو، کیوں کہ وہ تو فرد، احد، صمد ہے، یعنی اکیلا، ایک ہے۔ نہ اس کا کوئی نظیر ہے نہ اس کا کوئی جوڑ ہے تو اس کے لیے کوئی اولاد نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴾ یعنی پس تو ان کو چھوڑ دے کہ وہ اپنی جہالت اور گمراہی میں خوض کریں اور اپنی دنیا میں کھیلیں، یہاں تک کہ اپنے اس دن سے ملاقات کریں جس کا ان کو وعدہ ملتا ہے۔ وہ دن قیامت کا دن ہے، یعنی پھر عن قریب انھیں معلوم ہو جائے گا کہ اس دن ان کا ٹھکانا اور انجام اور حال کیسا ہوگا۔

توحیدِ باری تعالیٰ کا بیان:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴾ اور ان لوگوں کا معبود وہی ہے جو آسمان میں ہیں اور ان لوگوں کا معبود ہے جو زمین میں ہیں۔ آسمان اور زمین والے اس کو پوجتے ہیں اور وہ سب اس

[1] تفسير الطبري (٢١/ ٦٤٨، ٦٤٩) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤/ ١٨٢١) [3] تفسير الطبري (٢١/ ٦٤٩-٦٥١)

کے سامنے ذلیل و پست ہیں اور وہ بڑی حکمت والا اور بڑا جاننے والا ہے۔ یہ آیتِ کریمہ اس آیت کی طرح ہے:
﴿ وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ﴾ [الأنعام: ۳] ''وہ تمھارے پوشیدہ احوال کو بھی اور تمھارے ظاہر احوال کو بھی جانتا ہے اور تم جو کچھ عمل کرتے ہو اس کو بھی جانتا ہے۔'' یعنی وہی اللہ آسمانوں میں اور زمین میں پکارا جاتا ہے۔

﴿ وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ﴾ یعنی وہ خالق و مالک ہے آسمان و زمین اور ﴿ وَمَا بَيْنَهُمَا ﴾ کا اور ان میں بلا مدافعت و ممانعت کے تصرف کرنے والا ہے، یعنی اس کے تصرف کو کوئی دور نہیں کر سکتا، نہ منع کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اولاد سے پاک اور برتر ہے۔ ﴿ تَبٰرَكَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس کا عیوب اور نقائص سے سلامت ہونا مقرر اور ثابت شدہ ہے، کیوں کہ وہ تو رب ہے بلند و برتر و عظیم ہے اور اشیاء کا مالک ہے، جس کے ہاتھ میں سب کاموں کی باگ ڈور ہے، یعنی سب کاموں کا توڑ پھوڑ اور جوڑ اس کے اختیار میں ہے۔
﴿ وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ﴾ یعنی قیامت کی خبر اس کے پاس ہے، وہی اس کو اس کے وقت پر ظاہر کرے گا۔ ﴿ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ اور تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے، پھر وہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلا دے گا۔

بتوں وغیرہ کی شفاعت کی نفی:

پھر فرمایا: ﴿ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ ﴾ یعنی اور بت وغیرہ جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ سفارش کے مالک نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو ان کے لیے سفارش کرنے کی قدرت نہیں ہے۔
﴿ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ یہ استثناء منقطع ہے، یعنی لیکن وہ شخص جس نے بصیرت اور علم کے ساتھ حق کی گواہی دی تو بے شک اس کی سفارش اللہ کے اذن سے اس کے پاس اس کو نفع دے گی۔

مشرکین کا اعتراف کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق ہے:

پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ یعنی البتہ اگر تو ان مشرکوں سے پوچھے جو اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کے غیر کو پوجتے ہیں کہ ان کو کس نے پیدا کیا؟ تو کہیں گے کہ اللہ نے، یعنی اس بات کا اقرار کریں گے کہ ساری اشیاء کا خالق وہی اللہ ہے جو اکیلا ہے، اس کام میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور اس اقرار کے باوجود وہ اللہ کے ساتھ ان غیروں کو پوجتے ہیں جو نہ تو کسی شے کے مالک ہیں اور نہ ہی کسی شے پر قادر ہیں، چنانچہ وہ اس بات میں انتہا درجے کی جہالت اور کم عقلی میں ہیں، اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴾ یعنی اس اقرار کے باوجود پھر کہاں سے پھیرے جاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا اللہ تعالیٰ کے حضور شکوہ:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ "أَيْ: وَقَالَ مُحَمَّدٌ قِيْلَهُ"۔ یعنی اپنے رب کی طرف اپنی قوم کی شکایت کی جنھوں نے آپ کو جھٹلایا، چنانچہ کہا: ﴿ يٰرَبِّ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی اے میرے رب! بے شک یہ لوگ ایک ایسی قوم ہے جو ایمان نہیں لاتے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں خبر دی ہے: ﴿ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴾ [الفرقان: ۳۰] "اور رسول کہے گا کہ اے میرے پروردگار! بے شک میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔" یہ جو ہم نے کہا یہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اور امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ کا قول ہے اور اسی پر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے تفسیر کی ہے۔[1] امام بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبداللہ، یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یوں پڑھا ہے: "وَقَالَ الرَّسُوْلُ يَا رَبِّ"۔[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں یوں کہا ہے: "يُؤْثِرُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ قَوْلَ مُحَمَّدٍ" امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "هُوَ قَوْلُ نَبِيِّكُمْ ﷺ يَشْكُوْ قَوْمَهُ إِلَى رَبِّهِ عَزَّ وَجَلَّ"

پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ﴿ وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ ﴾ میں دو قراءتیں بیان کی ہیں: ایک تو نصب ہے، اس کی دو توجیہ ہیں: ایک یہ ہے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ﴾ پر معطوف ہے۔ دوسری یہ ہے کہ فعل مقدر کیا جائے۔ "وَقَالَ قِيْلَهُ"۔ دوسری قراءت خفض ہے ﴿ وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ﴾ پر معطوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "وَعِلْمُ قِيْلِهِ"۔[3] قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ ﴾ یعنی تو مشرکوں سے اعراض کر ﴿ وَقُلْ سَلٰمٌ ﴾ یعنی وہ جس بری بات کے ساتھ تجھ کو خطاب کرتے ہیں تو ان کو ویسی بات کے ساتھ جواب مت دے، لیکن تو ان سے الفت کر اور فعل و قول میں ان سے درگزر کر ﴿ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴾ چنانچہ وہ عن قریب جان لیں گے۔ یہ اللہ پاک کی طرف سے ان کو دھمکی ہے اسی لیے اس نے ان پر وہ عذاب نازل کیا جو رد نہیں کیا جاتا اور اپنے دین اور کلمے کو بلند کیا اور اس کے بعد جہاد اور جنگ کو مشروع فرمایا، یہاں تک کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہو گئے اور مشارق و مغارب، یعنی دنیا کے چاروں طرف اسلام، سلمہ الله تعالیٰ، پھیل گیا۔ واللّٰه أعلم۔ آخر تفسیر سورة الزخرف۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ اَلْمُجْرِمِيْنَ ﴾ سے مراد جرم والے کفار ہیں، چناں چہ اس پر یہ بات دال ہے کہ ان کا ذکر ان مومنوں کے مقابلے میں کیا ہے جن کے لیے وہ شے ہے جس کا ذکر اللہ پاک نے

---

[1] تفسير الطبري (۲۱/۶۵۵، ۶۵۶) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۴/۱۸۲۱)

[3] تفسير الطبري (۲۱/۶۵۵، ۶۵۶) [4] تفسير ابن كثير (۴/۱۷۰-۱۷۲)

اس سے پہلے فرمایا ہے، یعنی بے شک جرم والے کفار جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، ان سے عذاب کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ پھر اگر یہ خیال ہو کہ عذاب میں تو ہمیشہ رہیں گے، لیکن کبھی تخفیف کی جائے، اس لیے جملہ حالیہ کے ساتھ اس وہم کو بھی دور کر دیا اور یوں فرمایا: ﴿ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴾ یعنی وہ اس حال میں ہوں گے کہ نجات سے نا امید ہوں گے۔ کسی نے کہا کہ بہ سکوتِ یاس ساکت ہوں گے۔

اس کے معنی کی تحقیق سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے،[1] لیکن اس معنی پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ آگے ﴿ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ ﴾ آتا ہے تو پھر سکوت کیسے ٹھیک ہوگا، اس کا جواب یہ ہے کہ وہ تو ازمنہ متطاولہ (لمبی مدت) واحقاب ممتدہ (مدت دراز) ہیں تو وہاں ان کے حال مختلف ہوں گے۔ کبھی ان پر نا اُمیدی کا غلبہ ہوگا اور وہ جانیں گے کہ کسی طرح کی کشایش، یعنی نرمی نہیں ہے تو اس سبب سے سکوت کریں گے اور کبھی ان پر عذاب کی شدت ہوگی تو فریاد رسی چاہیں گے۔ اس دوسری شق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کبھی سختی ہوگی اور کبھی نہیں ہوگی، حالانکہ ﴿ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ ﴾ سے برابر ہمیشہ کی سختی معلوم ہوتی ہے۔ ہاں اگر یوں کہو کہ عذاب کی شدت تو ہمیشہ رہے گی مگر کبھی چلاتے چلاتے تھک جائیں گے تو چپ ہو رہیں گے، پھر چلانے لگیں گے تو البتہ ٹھیک ہے۔ دوزخیوں کا چیخنا چلانا قرآن شریف میں مذکور ہے۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے "هُمْ فِيْهَا" پڑھا ہے۔ "أَيْ: فِي النَّارِ" اس لیے کہ عذاب نار پر دال ہے۔[2]

غرضیکہ یہ خلود اور عذاب کی شدت کفار کے لیے ظلم نہیں ہے، بلکہ وہ اس کے مستحق ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ یعنی ہم نے ان کو بغیر گناہ کے عذاب نہیں کیا اور نہ ہی اس عذاب سے زیادہ عذاب دیا ہے جس کے وہ مستحق تھے۔ لیکن وہی اپنی جانوں پر ان گناہوں کے سبب سے ظلم کرتے تھے جو انھوں نے کیے۔ جمہور نے ﴿ اَلظّٰلِمِيْنَ ﴾ بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ "كَانَ" کی خبر ہے اور ﴿ هُمْ ﴾ ضمیرِ فصل ہے اور ابو زید نحوی نے "اَلظَّالِمُوْنَ" بہ رفع پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ ضمیر مبتداء ہے اور اس کا مابعد خبر اور جملہ "كَانَ" کی خبر ہے۔[3] بالجملہ مجرم لوگ عذاب کی سختی کے مارے موت کا سوال کریں گے اور آگ کے داروغہ مالک کو پکاریں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ﴾ یعنی اے مالک! چاہیے کہ تیرا رب ہم پر موت کا حکم جاری کر دے، مطلب یہ ہے کہ ہم کو مار ڈالے۔ یہ اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ "قَضٰی عَلَيْهِ إِذَا أَمَاتَهُ"، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ﴾ [القصص: ١٥] "موسیٰ علیہ السلام نے اس کے مکا مارا جس سے وہ مر گیا۔"

مجرموں نے آگ کے داروغہ کے ساتھ اللہ پاک کی طرف توسل کیا تاکہ وہ ان کے لیے اس سے یہ سوال کرے کہ ان پر موت کا حکم جاری کر دے، تاکہ عذاب سے راحت پائیں۔ بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ان کے

---

[1] رقم الآية (٤٤) [2] اللباب في علوم الكتاب (٢٩٢/١٧) [3] فتح القدير (٧٣٨/٤)

ابلاس (نا امیدی) کی نفی نہیں ہے، کیونکہ یہ تو جؤار (تضرع وزاری) اور عذاب کی شدت کے مارے موت کی تمنا کرنا ہے۔[1] ﴿ نَادَوْا ﴾ میں صیغۂ ماضی ﴿ اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ ﴾ کی طرح ہے، یعنی اس کی حقیقت کے لحاظ سے مستقبل کو ماضی کے پیرائے میں ادا کیا ہے۔ جمہور نے "مَالِكُ" کو بدون ترخیم (مختصر کیے بغیر) پڑھا ہے اور سیدنا علی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما، امام یحییٰ بن وثاب اور اعمش رحمہ اللہ نے "يَا مَالِ" ترخیم کے ساتھ پڑھا ہے۔[2]

بالجملہ واللہ ان کا مالک کو اور اپنے رب کو پکارنا ذلیل ہوا۔ کہا ہے کہ سو برس ان کو جواب دینے سے مالک سکوت کرے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ چالیس برس سکوت کرے گا، جیسا کہ خازن نے ذکر کیا ہے۔ کسی نے کہا: اسّی (۸۰) برس۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ہزار برس سکوت کرے گا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ برس تین سو ساٹھ دن کا اور دن ان برسوں کے ہزار برس کی طرح جن کو تم شمار کرتے ہو۔[3] پھر اس کے بعد ان کو یہ جواب دے گا کہ ﴿ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴾ یعنی تم کو تو عذاب میں رہنا ہے۔ امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا کہ تم کو اس سے خلاصی نہیں ہے، نہ تو موت کے ساتھ نہ موت کے علاوہ کسی اور چیز کے ساتھ۔ امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مالک آگ کے داروغوں کا سردار ہے، اس کی بات ان پر چلتی ہے، اس کا مقام نار کے درمیان میں ہے اور نار میں پل ہیں، عذاب کے فرشتے ان پر گزرتے ہیں، چنانچہ مالک نار کے پرلے سرے کو ایسے دیکھتا ہے جیسا کہ اس کے سب سے قریب والے سرے کو دیکھتا ہے۔[4]

پھر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے مالک کا جواب بیان کیا اور آگ میں ان کے رہنے کا سبب بیان کیا اور ان کو ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ کی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ ﴾ یعنی نار میں تم ہمیشہ اس لیے رہو گے کہ البتہ مقرر ہم تمھارے پاس حق لائے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمھاری طرف رسول بھیجے اور کتابیں نازل کیں اور انھوں نے تم کو حق کی طرف بلایا اور تم نے اس کو قبول نہ کیا اور نہ ہی تصدیق کی۔ یہ اس قول کے معنی ہیں: ﴿ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴾ یعنی لیکن تم میں سے بہت سے لوگ حق کو برا جانتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کو قبول نہیں کرتے ہو اور اس سے نفرت کرتے ہو، اس لیے کہ باطل کے ساتھ راحت اور آرام ہے اور حق کے ساتھ محنت اور مشقت ہے۔ کسی نے کہا کہ ﴿ اَكْثَرَكُمْ ﴾ کے معنی "كُلُّكُمْ" ہیں۔ کسی نے کہا کہ مراد ان کے رؤسا اور پیشوا ہیں اور جو اُن کے علاوہ ہیں وہ ان کے اتباع (پیروکار) ہیں۔ حق سے مراد ہر وہ شے ہے جس کا اللہ پاک نے اپنے رسولوں کی زبانوں سے ان کو حکم کیا اور اپنی کتابوں میں اس کو نازل فرمایا۔ کسی نے کہا کہ حق خاص ہے قرآن کے ساتھ۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴾ میں دو احتمال ہیں: ایک یہ ہے کہ اللہ پاک کے

---

[1] تفسير البيضاوي (١٥٤/٥) [2] تفسير القرطبي (١١٦/١٢) فتح القدير (٧٣٨/٤)

[3] تفسير القرطبي (١١٧/١٢) [4] تفسير القرطبي (١١٧/١٢)

کلام سے ہے، زیادہ ظاہر یہی ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ مالک کے کلام سے ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ﴾ ایک کلامِ مستانف ہے جو مشرکین کو اس مکر و فریب کی بری خبر سناتا ہے جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا اور اس میں اہلِ نار کی ڈانٹ ڈپٹ سے اور ان کی حالت کے بیان سے پھر کر اس چیز کا بیان ہے جو ان مشرکوں سے واقع ہوتی ہے۔ "إبرام" بہ معنی اتقان و احکام ہے، یعنی کسی شے کا پختہ اور درست کرنا۔ محاورے میں بولتے ہیں: "أَبْرَمْتُ الشَّيْءَ أَيْ: أَحْكَمْتُهُ وَاَتْقَنْتُهُ" یعنی میں نے اس شے کو پختہ اور مضبوط کیا۔ جب کوئی شخص رسی کے بٹنے کو مضبوط کرے تو کہتے ہیں: "أَبْرَمَ الْحَبْلَ"۔ کلمہ ﴿ اَمْ ﴾ منقطعہ بہ معنی "بل" و ہمزہ ہے۔ "أَيْ: بَلْ أَبْرَمُوْا أَمْرًا" یعنی بلکہ کیا انھوں نے نبی کریم ﷺ کے لیے پکا فریب کیا، چنانچہ ہم بھی ان کے لیے فریب پختہ کرنے والے ہیں۔ یہ قول امام مجاہد، قتادہ اور ابن زید رحمہ اللہ کا ہے۔ اسی کے مثل یہ آیت ہے: ﴿ اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۭ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ﴾ [الطور: ٤٢] "کیا یہ لوگ کوئی فریب کرنا چاہتے ہیں؟ تو یقین کر لیں کہ فریب خوردہ وہ کافر ہی ہیں۔" کسی نے کہا: معنی یہ ہیں: بلکہ کیا انھوں نے کوئی امر جاری کیا، چنانچہ ہم بھی ان پر عذاب کے ساتھ اپنا امر جاری کرنے والے ہیں۔ یہ قول کلبی رحمہ اللہ کا ہے۔[1]

﴿ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ۭ ﴾ یعنی بلکہ کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم وہ بات نہیں سنتے جس کو وہ اپنے دلوں میں چھپاتے ہیں، یا وہ بات جس کے بارے میں کسی اکیلی جگہ میں سرگوشیاں کرتے ہیں اور وہ بات جس کے بارے میں اکیلے گفتگو کرتے ہیں۔ ﴿ بَلٰى ﴾ یعنی کیوں نہیں، ہم اس کو سنتے ہیں اور جانتے ہیں۔ جملہ ﴿ وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال، یا اس جملے پر معطوف ہے جس پر ﴿ بَلٰى ﴾ دال ہے، یعنی اور اُن کے پاس ہمارے نگہبان فرشتے سارے قول و فعل جو اُن سے صادر ہوتے ہیں، لکھتے ہیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ تین آدمی کعبے کے اور اس کے پردوں کے درمیان تھے، دو قرشی اور ایک ثقفی، یا دو ثقفی اور ایک قرشی، ان میں سے ایک نے کہا: کیا تم خیال کرتے ہو کہ اللہ ہماری بات سنتا ہے؟ تو ایک نے کہا کہ جب تم اونچی آواز میں بات کرتے ہو تو سنتا ہے اور جب تم پوشیدہ کہتے ہو تو نہیں سنتا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[2] امام یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے لوگوں سے اپنے گناہ چھپائے اور ان کو اس شخص کے لیے ظاہر کیا جس پر کوئی شے مخفی نہیں رہتی تو تحقیق اس نے اس کو نظر کرنے والوں میں سے ذلیل تر ٹھہرایا جو اس کی طرف نظر کرتے ہیں اور یہ بات نفاق کی علامتوں میں سے ہے۔[3]

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو یہ حکم دیا کہ کفار سے ایک ایسی بات کہیں کہ جس سے ان پر حجت لازم

[1] تفسیر القرطبي (١٦/ ١١٨) [2] تفسیر الطبري (٢١/ ٦٤٧) [3] تفسیر الرازي (٢٧/ ١٩٥)

کریں اور جو شبہ وہ وارد کرتے ہیں، اس کو زائل کر دیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴾ یعنی اگر رحمان کے لیے اولاد ہو اور یہ قطعی برہان سے صحیح ہو، یا اگر تمھارے قول اور زعم میں رحمان کی اولاد ہو تو میں ان لوگوں میں سب سے پہلا ہوں جس نے اللہ وحدہ کو پوجا، کیوں کہ جس شخص نے اللہ وحدہ کو پوجا تو یقیناً اس نے اس بات کی تردید کی کہ اس کے لیے اولاد ہو۔ یہ قول امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ کا ہے۔ امام حسن اور سدی رحمہما اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ رحمان کی اولاد نہیں ہے اور ﴿ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴾ ابتدائے کلام ہے۔[1]

امام زید بن اسلم رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ کلامِ عرب میں یہ بات معروف ہے کہ "إِنْ كَانَ هٰذَا الْأَمْرُ قَطُّ أَيْ: مَا كَانَ"، یعنی محاورۂ عرب میں یہ بات مشہور و معروف ہے کہ کلمۂ "إِنْ" نافیہ بھی آتا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ سے زید رحمہ اللہ کے قول کی طرح مروی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: "إِنْ يَّكُنْ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَابِدِيْنَ أَيْ: شَاهِدِيْنَ۔"[2] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اے محمد! تو کہہ دے کہ اگر اللہ کے لیے اولاد ثابت ہو جائے تو میں اُن لوگوں میں سے سب سے پہلا شخص ہوں گا جو اس اولاد کو پوجیں، جس کے ثبوت کا تمھیں زعم ہے، لیکن یہ تو محال ہے کہ اس کا ولد ہو۔ اس میں سب سے زیادہ مؤثر وجہ سے اور اتم عبارت اور احسن اسلوب پر اولاد کی نفی ہے اور نظمِ قرآنی سے بھی یہی ظاہر ہے، کیوں کہ یہ فرض کے طریق پر وارد ہے اور مراد اولاد کی نفی ہے اور یہ اس لیے کہ عبادت کو اس بات سے معلق کیا گیا ہے کہ اس کی اولاد ہو اور یہ اولاد کا ہونا فی نفسہٖ محال ہے تو جو شے اس کے ساتھ معلق کی گئی ہے وہ بھی اسی کی طرح محال ہوئی۔ اسی قبیل سے یہ آیت ہے: ﴿ وَاِنَّاۤ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [سبا: ٢٤] "اور ہم یا تم یا تو یقیناً ہدایت پر ہیں یا کھلی گمراہی میں ہیں۔" اسی طرح یہ اس شخص کے لیے کہا جاتا ہے جو کسی سے مناظرہ کرتا ہے کہ جو تو بات کہتا ہے اگر وہ دلیل سے ثابت ہو جائے تو میں اس کے معتقد اور قائل ہونے والے لوگوں میں سے پہلا شخص ہوں گا۔

پس ﴿ اِنْ كَانَ ﴾ میں کلمۂ ﴿ اِنْ ﴾ شرطیہ ٹھہرے گا۔ ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔[3]
کسی نے کہا کہ ﴿ اَلْعٰبِدِيْنَ ﴾ کے معنی "آنِفِيْنَ مِنَ الْعِبَادَةِ" ہیں، یعنی عبادت سے عار اور انکار کرنے والے۔ اور یہ ایک تکلف ہے جس کی طرف کوئی شے مضطر کرنے والی نہیں ہے۔ لیکن ابو عبدالرحمان یمانی نے "اَلْعَبِدِيْنَ" بغیر الف پڑھا ہے، جو اس محاورے سے ماخوذ ہے: "عَبِدَ يَعْبَدُ عَبَداً بِتَحْرِيْكٍ: إِذَا أَنِفَ وَغَضِبَ فَهُوَ عَبِدٌ، وَالْإِسْمُ اَلْعَبَدَةُ مِثْلُ الْأَنَفَةِ"، جو شے قاری کو اس شاذ اور بعید قراءت کا باعث ہوئی وہ شاید ﴿ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴾ کے معنی کا بعید جاننا ہے، حالاں کہ یہ نہ تو مستبعد ہے اور نہ مستنکر ہے۔

---

[1] تفسیر القرطبي (١١٩/١٦)، فتح القدير (٧٣٩/٤) [2] تفسیر الطبري ٦٤٩/٢١، ٦٤٨) [3] تفسیر الطبري (٦٤٨/٢١)

امام جوہری رحمہ اللہ نے ابوعمرو رحمہ اللہ سے ﴿ اَلْعٰبِدِيْنَ ﴾ کی تفسیر میں حکایت کیا ہے کہ یہ "أَنِفَ وَغَضِبَ" سے ماخوذ ہے۔ امام ماوردی رحمہ اللہ نے بھی کسائی اور قتیبی رحمہما اللہ سے اس کو حکایت کیا ہے اور امام فراء رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں اور اسی طرح امام ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے کہ ﴿ اَلْعٰبِدِيْنَ ﴾ کے معنی "اَلْغِضَابِ الْآنِفِيْنَ" ہیں۔ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی "جَاحِدِيْنَ" ہیں اور یہ محاورہ بیان کیا کہ "عَبِدَنِي حَقِّي أَيْ: جَحَدَنِي" یعنی اس نے میرے حق کا مجھ سے انکار کیا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ "عَبِدَ وَأَعْبَدَ" بہ معنی "أَنِفَ" یا "غَضِبَ" لغتِ عرب میں ثابت ہے اور ان اماموں کی نقل حجت میں کافی ہے، لیکن قرآن شریف میں جو ہے، اس کو اسباب سے ٹھہرانا، اس تکلف سے ہے جس کی طرف کوئی ملجی نہیں اور تعسفِ واضح (بے راہ روی) کی قسم سے ہے۔ امام ابن عرفہ رحمہ اللہ نے ان لوگوں کے قول کو اس طرح رد کیا ہے کہ جو بولتے ہیں وہ "عَبَدَ يَعْبُدُ فَهُوَ عَبْدٌ" ہے اور "عابد" بہت ہی کم کہتے ہیں اور قرآن قلیل اور شاذ لغت کو نہیں لاتا ہے۔ جمہور نے "ولد" بہ افراد پڑھا ہے اور اہلِ کوفہ نے عاصم کے سوا بہ ضمِ واؤ وسکونِ لام "وُلْدٌ" پڑھا ہے۔[1]

﴿ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴾ یعنی اللہ پاک کے لیے تنزیہ، تقدیس اور پاکی ہے جو رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور رب عرش کا، اس شے سے جو وہ جھوٹ کہتے ہیں کہ اس کے لیے اولاد ہے اور اس پر اس شے کا افتراء کرتے ہیں جو اس کی بارگاہِ عالی جاہ کے لائق نہیں ہے۔ یہ آیت اگر اللہ پاک کے کلام سے ہے تو اس نے اپنے نفسِ کریم کی اس بات سے تنزیہ (پاکی) کی جو کفار نے کہی۔ اور اگر یہ بات نبی اکرم ﷺ کے تتمۂ کلام سے ہے جس کے کہنے کا آپ ﷺ کو حکم دیا اس طرح کہ کفار کے زعمِ باطل میں جو بات ہے تو اس کی نقل کرنے کے ساتھ اپنے رب کی تنزیہ وتقدیس بھی شامل کر دے۔

﴿ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴾ یعنی جس شے کے ساتھ تو نے کفار کو ہدایت کی، جب وہ اس سے راہ یاب نہ ہوئے اور نہ ہی انھوں نے اس شے میں تیرا کہا مانا، جس کی طرف تو نے ان کو دعوت دی تو تُو ان کو چھوڑ دے کہ وہ اپنی باطل باتوں میں غلطاں وپیچاں رہیں اور اپنی دنیا میں کھیلتے رہیں، یہاں تک کہ اپنے اس دن سے آ ملیں جس کا ان کو وعدہ دیا جاتا ہے۔ اس دن سے قیامت کا دن مراد ہے، یا دنیا میں عذاب کا دن، یا موت کا دن، ظاہر یہی ہے، اس لیے کہ ان کا کھیل کود میں مشغول رہنا ان کی موت کے دن ہی میں ختم ہوگا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت آیتِ سیف سے منسوخ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ منسوخ نہیں ہے صرف مخرجِ تہدید میں خارج کی گئی ہے، یعنی انھیں ملامت کی گئی ہے اور دھمکی دی گئی ہے۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ کفار جو کچھ

[1] تفسير القرطبي (١٢٠/١٦) فتح القدير (٧٣٩/٤، ٧٤٠)

کہتے ہیں، وہ جہالت اور کھیل کود کی باتوں سے ہے۔ جمہور نے ﴿ يُلٰقُوْا ﴾ پڑھا ہے اور امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی ابن محیصن، حمید اور ابن السمیفع رحمہم اللہ) نے ''يَلْقوا'' بہ فتحِ یاء وسکونِ لام بغیر الف پڑھا ہے۔ (یہی قراءت ابو عمرو رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے)۔[1]

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ﴾ جار و مجرور دونوں جگہ ﴿ اِلٰهٌ ﴾ سے متعلق ہے، اس لیے کہ معبود یا مستحق للعبادۃ کے معنی میں ہے، یعنی وہی آسمانوں میں معبود ہے اور زمین میں معبود ہے، یا آسمان میں عبادت کے لیے مستحق ہے اور زمین میں عبادت کا مستحق ہے۔ یہ بات جو قرار پائی کہ الٰہ سے مراد معبود ہے، اس سے وہ بات رد ہو گئی جو کہی ہے کہ یہ تعددِ آلہہ کی مقتضی ہے، اس لیے کہ جب نکرہ کو دہرا کر نکرہ لاتے ہیں تو وہ متعدد ہوتا ہے، جیسے یہ قول ہے کہ ''أَنْتِ طَالِقٌ وَطَالِقٌ'' یعنی دو طلاقیں پڑیں گی، کیوں کہ جب نکرے کو لوٹا کر نکرہ لاتے ہیں تو دوسرا غیر اول ہوتا ہے اور اگر یوں کہو کہ ''أَنْتِ طَالِقٌ وَالطَّلَاقُ'' ایک طلاق پڑے گی، کیوں کہ جب نکرے کو عود کر کے معرفہ لاتے ہیں تو ثانی عین اول ہوتا ہے۔

اس اعتراض کے دفع ہونے کی توضیح یہ ہے کہ الٰہ اس جگہ بہ معنی معبود ہے اور اللہ تعالیٰ آسمان و زمین میں معبود ہے اور جو فرق ہے وہ صرف آسمانوں میں اس کی معبودیت اور زمین میں اس کی معبودیت میں ہے، اس لیے کہ معبودیت اضافی امور سے ہے تو اس میں تغایر احد الطرفین سے کافی ہوگا۔ پس جب آسمان میں عبادت کرنے والا زمین میں عبادت کرنے والے کا غیر، یعنی مختلف ہوا تو یہ بات سچ ہوئی کہ اس کی آسمان میں معبودیت زمین میں اس کی معبودیت سے مختلف ہوئی، اگرچہ معبود ایک ہی ہے۔ جار و مجرور کو جو ﴿ اِلٰهٌ ﴾ سے پہلے رکھا تو اس میں اس بات کی دلالت ہے کہ الوہیت خاص طور پر صرف اسی کا حق ہے، اس لیے کہ تقدیم اختصاص پر دلالت کرتی ہے۔ (كما أفاده الكرخي)

امام ابو علی فارسی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿ اِلٰهٌ ﴾ دونوں جگہ مرفوع ہے، اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ ''أَيْ: هُوَ الَّذِيْ فِيْ السَّمَاءِ هُوَ إِلٰهٌ وَفِيْ الْأَرْضِ هُوَ إِلٰهٌ''۔ طولِ کلام کی وجہ سے مبتداء کا حذف حسین ہوا۔ کہا اور معنی ''عَلَى الْإِخْبَارِ بِالْإِلٰهِيَّةِ'' ہیں نہ ''عَلَى الْكَوْنِ فِيْهِمَا''[2] یعنی اس سے منظور الٰہیت کی خبر دینا ہے کہ آسمان و زمین میں معبود وہی ہے، دونوں جگہ اسی کی عبادت ہوتی ہے، یہ خبر دینا منظور نہیں ہے کہ اس کا ہونا دونوں میں ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ آسمان اور زمین میں عبادت کیا جاتا ہے۔[3] کسی نے کہا کہ ﴿ فِيْ ﴾ بہ معنی ''علی'' ہے، یعنی وہ آسمان پر اور زمین پر قادر ہے جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ﴾ [طٰهٰ: ۷۱] ''تم سب کو میں کھجور کے تنوں میں سولی پر لٹکوا دوں گا۔'' ''أَيْ: عَلَى جُذُوْعِ النَّخْلِ'' سیدنا عمر، علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم نے یوں پڑھا ہے: ''وَهُوَ الَّذِيْ فِيْ السَّمَاءِ اللّٰهُ وَفِيْ الْأَرْضِ اللّٰهُ'' اس بنا پر

---
[1] تفسير القرطبي (١٦/١٢١) فتح القدير (٤/٧٤٠)
[2] فتح القدير (٤/٧٤٠)
[3] تفسير الطبري (٢١/٦٥٣)

کہ علم کو مشتق کے معنی میں شامل کیا ہے کہ اس حیثیت سے جار و مجرور اس سے متعلق ہو جائے۔[1] ﴿ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴾ یعنی اور وہی بلیغ الحکمت اور کثیر العلم ہے۔ ﴿ تَبٰرَكَ ﴾ تفاعل کا وزن ہے برکت سے۔ برکت کا معنی خیرات کی کثرت ہے۔ ﴿ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ﴾ یعنی بابرکت ہے وہ ذات جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے اور اس چیز کی جو ان کے درمیان میں ہے۔ مراد ہوا اور وہ حیوانات ہیں جو اس میں ہیں۔

﴿ وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ﴾ یعنی اسی کے پاس اس وقت کا علم ہے جس میں قیامت قائم ہو گی ﴿ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ اور اسی کی طرف تم پھیرے جاؤ گے، پھر وہ ہر ایک کو اس خیر و شر کی جزا دے گا جس کا وہ مستحق ہو گا۔ اس میں سخت قسم کی وعید ہے۔ جمہور نے یہ تائے فوقیہ پڑھا ہے، تاکہ صیغۂ غائب سے صیغۂ حاضر کی طرف التفات ہو جائے۔ امام ابن کثیر، حمزہ اور کسائی رحمہ اللہ نے یہ یائے تحتیہ پڑھا ہے[2] ﴿ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ ﴾ یعنی وہ لوگ جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، یعنی اصنام وغیرہ، وہ اللہ کے نزدیک شفاعت کے مالک نہیں ہیں جس طرح کہ کافروں کا یہ زعم ہے کہ وہ ان کی شفاعت کریں گے۔ جمہور نے ﴿ يَدْعُوْنَ ﴾ کو یہ یائے تحتانی پڑھا ہے اور امام سلمی اور ابن وثاب رحمہ اللہ نے یہ تائے فوقانی پڑھا ہے۔[3]

﴿ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی مگر وہ شخص جس نے توحید کی گواہی دی اور اسے اس شے کا علم اور بصیرت بھی حاصل ہے جس کی گواہی دی۔ اس استثناء میں احتمال ہے کہ متصل ہو اور معنی یہ ہوں کہ مگر وہ جنھوں نے حق کے ساتھ گواہی دی۔ یہ لوگ مسیح علیہ السلام، عزیر علیہ السلام اور ملائکہ ہیں، اس لیے کہ یہ اس شخص کی شفاعت کے مالک ہوں گے جو اس کا مستحق ہے۔ کسی نے کہا کہ منقطع ہے۔ معنی یہ ہیں: لیکن وہ شخص جس نے حق کی گواہی دی اس کے بارے میں یہ لوگ شفاعت کریں گے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مستثنیٰ منہ محذوف ہو، یعنی کسی کے حق میں شفاعت کے مالک نہ ہوں گے، سوائے اس شخص کے جس نے حق کی گواہی دی۔ کسی نے کہا کہ اس استثناء میں اتصال کا مدار اس بات پر ہے کہ ﴿ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ ﴾ عام ٹھہرایا جائے ہر اس شے کے لیے جو اللہ کے سوا پوجی جاتی ہے اور انقطاع کا مدار اس پر ہے کہ اس کو بتوں کے ساتھ خاص ٹھہرائیں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ شفاعت کے مالک نہیں ہوں گے مگر اس شخص کے لیے جس نے حق کی گواہی دی اور علم و بصیرت پر ایمان لایا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اپنے پوجنے والوں کے لیے شفاعت نہ کریں گے، بلکہ اس شخص کے لیے شفاعت کریں گے جس نے وحدانیت کی گواہی دی۔[4]

---

[1] فتح القدير (٧٤٠/٤) [2] تفسير القرطبي (١٢١/١٦) [3] فتح القدير (٧٤١/٤) [4] تفسير القرطبي (١٢٢/١٦)

﴿ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ ﴾ میں حرف لام توطیہ قسم کا ہے اور ﴿ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ میں جوابِ قسم کا اور جوابِ شرط کا بنا بر قاعدہ محذوف ہے، یعنی قسم ہے اللہ کی! اگر تو ان مشرکوں بتوں کے پوجنے والوں سے پوچھے کہ ان کو کس نے پیدا کیا؟ تو البتہ وہ کہیں گے کہ اللہ نے، یعنی اس بات کا اعتراف اور اقرار کریں کہ ان کا خالق اللہ پاک ہے اور اس بات کے واضح اور جلی ہونے کے سبب سے اس امر کا انکار نہ کر سکیں۔ ﴿ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴾ یعنی جب اللہ پاک کے خالق ہونے کا اقرار کر چکے تو اللہ کی عبادت سے کس طرح منحرف ہو کر اس کے غیر کی عبادت کی طرف پھرتے ہیں، باوجود اس اقرار کے، کیوں کہ جو شخص اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اس کا خالق اللہ ہے، پھر جب وہ کسی بت یا حیوان کی طرف قصد کرے اور اللہ کے ساتھ اس کو بھی پوجے یا صرف اسی کو پوجے تو واقعی اس نے اللہ کی بعض مخلوقات کو پوجا، اس میں وہ جہالت اور نادانی ہے جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اگر تو مسیح علیہ السلام، عزیر علیہ السلام اور ملائکہ کے متعلق پوچھے کہ ان کو کس نے پیدا کیا؟ تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے، پھر یہ کفار کہاں سے پھیرے جاتے ہیں اس بات میں کہ ان کو اپنا معبود بناتے ہیں۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اگر تو عابدین اور معبودین دونوں کے متعلق پوچھے کہ ان کو کس نے بنایا؟ تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے۔ "اِفْك" کے معنی "قَلْب و صَرْف" ہے، یعنی کسی شے کا کسی شے سے پھیر دینا۔ یُقَال: أَفَكَهُ يَأْفِكُهُ إِفْكًا إِذَا قَلَّبَهُ وَصَرَّفَهُ عَنِ الشَّيْءِ.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ "قَوْلٌ وَقَالَ وَقِيلٌ وَمَقَالٌ" یہ سب ان وزنوں پر مصدر ہیں اور اُن کے معنی ایک ہی ہیں، یعنی کہنا۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: محاورے میں بولتے ہیں: "قُلْتُ قَوْلًا وَّقَالًا وَّقِيلًا"[1] بالجملہ ﴿ وَقِيْلِهٖ ﴾ میں تین قراءتیں ہیں: نصب، جر اور رفع۔ جمہور نے بہ نصب پڑھا ہے، اس کی توجیہ میں کئی وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ "الساعة" کے محل پر معطوف ہے، گو لفظ میں مجرور ہے مگر محل اس کا نصب ہے بنا بر مفعولِ علم۔ گویا یوں کہا گیا کہ "إِنَّهُ يَعْلَمُ السَّاعَةَ وَيَعْلَمُ قِيلَهُ"، یعنی اللہ قیامت کو جانتا ہے اور اپنے رسول کی بات کو جانتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ﴾ پر معطوف ہے۔ "أَيْ: يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ وَيَعْلَمُ قِيلَهُ"، یعنی وہ کفار کی پوشیدہ باتوں کو اور ان کی سرگوشی کو جانتا ہے اور اپنے رسول کی بات کو جانتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ يَكْتُبُوْنَ ﴾ کے مفعول محذوف پر معطوف ہے: "أَيْ: يَكْتُبُونَ ذٰلِكَ وَيَكْتُبُونَ قِيلَهُ"، یعنی ہمارے فرشتے جو ان کے پاس ہیں وہ ان کے سارے اقوال و افعال کو لکھتے ہیں اور رسول کی بات کو لکھتے ہیں۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ ﴿ يَعْلَمُوْنَ ﴾ کے مفعول محذوف پر معطوف ہے: "أَيْ: يَعْلَمُونَ ذٰلِكَ وَيَعْلَمُونَ قِيلَهُ"، یعنی مگر وہ جنھوں

---

[1] فتح القدير (٧٤١/٤، ٧٤٢)

نے حق کی گواہی دی، وہ حق کو جانتے ہیں اور رسول کی بات کو جانتے ہیں۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے: ''أَيْ: قَالَ قِيلَهُ يَعْنِي قَالَ مُحَمَّدٌ ﷺ قوله: ﴿ يٰرَبِّ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ نداء اور اس کا مابعد ''قیل'' کا معمول ہے۔ چھٹی وجہ یہ ہے کہ یہ اضمار فعل منصوب ہے: ''أَيْ: اَللّٰهُ يَعْلَمُ قِيلَ رَسُولِهِ'' یعنی اللہ اپنے رسول کی بات کو جانتا ہے۔ ساتویں وجہ یہ ہے کہ ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ کے محل پر معطوف ہے: ''أَيْ: إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَبِقِيلِهِ'' آٹھویں وجہ یہ ہے کہ بنا بر حذف حرف قسم منصوب ہے۔ من جملہ وجۂ اول کے مجوزین امام مبرد اور ابن انباری رحمہ اللہ ہیں اور وجۂ ثانی کے امام فراء اور اخفش رحمہ اللہ۔ اور نصب بہ مفعول مطلق کے قائل بھی یہی دونوں ہیں۔ امام حمزہ اور عاصم رحمہ اللہ نے بہ جر پڑھا ہے، اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ اَلسَّاعَةِ ﴾ کے لفظ پر معطوف ہے: ''أَيْ: وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَعِلْمُ قِيلِهِ'' دوسرے یہ ہے کہ حرف واؤ قسم کا ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ، (یعنی امام مجاہد، حسن، ابو قلابہ، اعرج، ابن ہرمز اور مسلم بن جندب رحمہم اللہ) نے بہ رفع پڑھا ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ عِلْمُ السَّاعَةِ ﴾ پر معطوف ہے: ''أَيْ: وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَعِنْدَهُ قِيلُهُ'' دوسری یہ ہے کہ ''قِيلُهُ'' مبتداء ہے اور اس کی خبر مابعد کا جملہ ہے۔ یا خبر محذوف ہے، تقدیر یہ ہے: ''وَقِيلُهُ كَيْتَ وَكَيْتَ'' یا ''وَقِيلُهُ مَسْمُوعٌ''۔ ﴿ وَقِيْلِهٖ ﴾ کی ضمیر نبی ﷺ کی طرف راجع ہے۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ تمھارے نبی ہیں کہ اپنے رب سے اپنی قوم کا شکوہ فرماتے ہیں۔[2] کسی نے کہا: ضمیر مسیح علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے دونوں وجہوں پر۔ معنی یہ ہیں کہ اپنے رب کو نداء کر کے کہا: اے میرے رب! بے شک یہ لوگ جن کی طرف تو نے مجھے بھیجا یہ ایک قوم ہے جو ایمان نہیں لاتی۔

پھر جب اپنے رب کو پکار کر یہ کہا تو اس نے ان کو یہ جواب دیا: ﴿ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ﴾ یعنی پس تو ان کی دعوت سے اعراض کر اور کہہ ''سَلَامٌ'' أَيْ: أَمْرِيْ تَسْلِيمٌ مِنكُمْ وَمُتَارَكَةٌ لَكُمْ'' یعنی میرا کام تم سے تسلیم اور تم کو چھوڑنا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ''سلام'' بہ اضمار ''علیکم'' مرفوع ہے۔ امام عطاء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مراد ''مداراۃ'' ہے، یہاں تک کہ میرا حکم نازل ہو، اس کے معنی ''متارکۃ'' ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴾ [القصص: ٥٥] ''تم پر سلام ہو، ہم جاہلوں سے (الجھنا) نہیں چاہتے۔''

اس آیت میں کفار پر سلام کرنے کی مشروعیت نہیں ہے، جیسا کہ کسی نے کہا ہے، بلکہ یہ سلام تو ترکِ معاملہ کا ہے جس طرح کہ کہتے ہیں کہ تم کو سلام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے ان سے اعراض کرنے کا آپ ﷺ کو امر فرمایا۔ پھر آپ ﷺ کو ان سے لڑنے کا حکم دیا تو آیتِ سیف سے صفح منسوخ ہو گیا۔ کسی نے کہا ہے کہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں ہوئی۔ ﴿ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴾

[1] تفسیر القرطبي (١٢٤،١٢٣/١٦) فتح القدیر (٧٤٢،٧٤١/٤) [2] تفسیر الطبري (٦٥٦/٢١)

میں اللہ عزوجل کی طرف سے کفار کو سخت دھمکی اور بڑی وعید ہے اور نبی اکرم ﷺ کے لیے تسلی ہے یعنی تم صبر کرو اور تسلی رکھو، وہ عن قریب اپنے اعمال کی سزا جان لیں گے۔ جمہور نے ﴿ يَعْلَمُونَ ﴾ کو بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے اور امام نافع اور ابن عامر رحمہما اللہ نے بہ تائے فوقیہ پڑھا ہے۔[1]

الحمد للّٰه الذي بنعمته تتم الصالحات وبحوله وقوته تقضى الحاجات وبفضله وكرمه تنال الدرجات، وقت نصف شب یک شنبہ (اتوار) بست ششم (۲۶) ماہ ذی قعدہ ۱۳۱۳ ہجری کو اس سورت مبارکہ کی تفسیر مکمل ہوئی۔ اللهم تقبله بفضلك وكرمك يا مولانا وسيدنا، وبحولك وقوتك وطولك يسرلنا تحرير باقيه بصحة وعافية في الجوارح والأولاد والأهل والأقارب والأحباب، ووفقنا للأعمال الصالحات، واغفرلنا وارحمنا وتب علينا وأحسن عواقبتنا في الأمور كلها وأجرنا من خزي الدنيا وعذاب الآخرة، آمين، وصل وسلم على النبي الأمين محمد. وعلى آله وصحبه وأشياعه أجمعين إلى يوم الدين، الحمد للّٰه أولا وآخرا وظاهراً وباطناً.

---

[1] فتح القدير (٧٤٢/٤) فتح البيان (٣٧٥/١٢_٣٨٣)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُوْرَۃُ الدُّخَانِ

اس سورت مبارکہ کی ستاون (۵۷) یا انسٹھ (۵۹) آیتیں ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سورت بالاتفاق مکی ہے سوائے اس آیت کے: ﴿ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا ﴾۔[1] امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ سورۃ الدخان مکے میں نازل ہوئی۔[2]

بیانِ فضیلت:

1 ترمذی اور بیہقی نے شعب میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جس شخص نے رات کو ﴿ حٰمٓ ﴾ الدخان پڑھی، وہ صبح کو اس حال میں اٹھے گا کہ اس کے لیے ستر ہزار فرشتے بخشش مانگتے ہوں گے۔ ترمذی نے اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد یوں کہا ہے: ''غَرِيْبٌ لَا نَعْرِفُ إِلَّا مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ، وَعُمَرُ بْنُ أَبِي خَثْعَمٍ يُضَعَّفُ، قَالَ الْبُخَارِيُّ: مُنْكَرُ الْحَدِيْثِ''۔[3]

2 امام ترمذی، محمد بن نصر، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہ اللہ نے عن الحسن عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے جمعے کی شب میں ﴿ حٰمٓ ﴾ الدخان پڑھی تو وہ صبح کو اس حال میں اُٹھے گا کہ اس کی بخشش کی گئی ہوگی (فتح القدیر و فتح البیان کے الفاظ: ''أَصْبَحَ مَغْفُوْراً لَهُ'' ہیں اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ ''غفر له'' ہیں)۔

ترمذی نے اس حدیث کی روایت کے بعد یہ کہا ہے: ''غَرِيْبٌ لَا نَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ وَهِشَامُ بْنُ الْمِقْدَامِ يُضَعَّفُ وَالْحَسَنُ لَمْ يَسْمَعْ مِنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ كَذَا قَالَ أَيُّوْبُ وَيُوْنُسُ بْنُ عُبَيْدٍ وَعَلِيُّ ابْنُ زَيْدٍ'' (فتح القدیر و فتح البیان میں ''هشام بن المقدام'' اور تفسیر ابن کثیر میں ''هشام أبو المقدام'' ہے)۔

اس حدیث کی شاہد اور کئی حدیثیں ہیں۔ ایک وہ ہے جس کو امام ابن ضریس اور بیہقی رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے

---

[1] تفسير القرطبي (١٢٥/١٦) [2] الدر المنثور (٣٩٧/٧)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٨٨) شعب الإيمان (٤٨٤/٢) اس کی سند میں ''عمر بن ابی خثعم'' سخت ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٥٧٦٦)

روایت کیا ہے: "قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَذَكَرَهُ". دوسری وہ ہے جس کو ابن ضریس نے "عن الحسن مرفوعاً بنحوہ" روایت کیا ہے اور وہ مرسل ہے۔[1]

تیسری وہ ہے جس کو امام دارمی و محمد بن نصر رحمہ اللہ نے ابورافع رحمہ اللہ سے بایں لفظ روایت کیا ہے: "مَنْ قَرَأَ الدُّخَانَ فِيْ لَيْلَةِ الْجُمُعَةِ أَصْبَحَ مَغْفُوْرًا لَهُ وَزُوِّجَ مِنَ الْحُوْرِ الْعِيْنِ"[2] چوتھی وہ ہے جس کو امام ابن مردویہ نے سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جس شخص نے سورت دخان شبِ جمعہ میں یا روزِ جمعہ میں پڑھی تو اللہ اس کے لیے اس کے عوض جنت میں ایک گھر بنائے گا۔[3] (كذا في فتح البيان وفتح القدير)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مسندِ بزار میں بروایتِ ابوالطفیل عامر بن واثلہ عن زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابن صیاد سے فرمایا: «إِنِّيْ قَدْ خَبَأْتُ خَبأً فَمَا هُوَ؟» یعنی میں نے ایک شے پوشیدہ رکھی ہے؟ پس وہ کیا ہے اور آپ ﷺ نے اس کے لیے سورۃ الدخان پوشیدہ کی تھی۔ چنانچہ اس نے کہا: «هُوَ الدُّخُّ» یعنی وہ پوشیدہ شے دُخ ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: «اِخْسَأْ مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ»[4] یعنی تو چپ رہ جو کچھ اللہ نے چاہا وہ ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے جی میں ﴿يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ﴾ مضمر کیا تھا، تاکہ اس کو آزمائیں کہ وہ اس مضمر کو جانتا ہے یا نہیں، تاکہ اس کا حال ظاہر ہوجائے کہ وہ ساحر ہے یا کاہن۔ یا ان میں سے ہے جن کے پاس جن آتا ہے، چنانچہ اس نے دخ کہا، اس سے زیادہ کہنے کی اسے قدرت نہ ہوئی۔

امام شہاب رحمہ اللہ نے سورۃ الواقعہ میں کہا ہے کہ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے سورتوں کے فضائل میں قرآن کے شروع سے یہاں تک کوئی حدیث غیر موضوع ذکر نہیں کی سوا اس کے جو اس جگہ ہے اور وہ جو سورت یٰس اور سورۃ الدخان میں گزر چکا ہے۔[5] مطلب یہ ہے کہ سورت یٰس، سورۃ الدخان اور سورۃ الواقعہ میں حدیث غیر موضوع ذکر کی ہے، ان کے سوا اور سب سورتوں کے فضائل میں موضوع حدیثیں وارد کی ہیں۔

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٨٩) شعب الإيمان (٤٨٤/٢) فتح القدير (٧٤٣/٤) فتح البيان (٣٨٥/١٢) تفسير ابن كثير (١٧٣/٤) اس کی سند میں "ہشام" ضعیف راوی ہے، نیز حسن رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٥٧٦٧)

[2] سنن الدارمي (٥٥٠/٢)

[3] المعجم الكبير (٢٦٤/٨) فتح القدير (٧٤٣/٤) فتح البيان (٣٨٥/١٢) اس کی سند میں "فضال بن جبیر" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥١١٢)

[4] مسند البزار (١٦٨/٤) تفسير ابن كثير (١٧٣/٤)

[5] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (١٥١/٨)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۙ﴿۲﴾ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِیْنَ ﴿۳﴾ فِیْهَا یُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِیْمٍ ﴿۴﴾ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ؕ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِیْنَ ۚ﴿۵﴾ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۙ﴿۶﴾ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ ﴿۷﴾ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ؕ رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۸﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

حم ① قسم ہے واضح کتاب کی ② بلاشبہ ہم نے اسے ایک بابرکت رات میں نازل کیا، بے شک ہم ڈرانے والے ہیں ③ اسی (رات) میں ہر محکمہ معاملے کا فیصلہ کیا جاتا ہے ④ خاص ہمارے حکم سے، بے شک ہم ہی (رسول) بھیجنے والے ہیں ⑤ آپ کے رب کی خاص رحمت ہے، بلاشبہ وہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے ⑥ جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، اور (ان کا بھی) جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہیں، اگر تم یقین کرنے والے ہو ⑦ اس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں، وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے، وہی تمھارا اور تمھارے اگلے باپ دادوں کا رب ہے ⑧

قرآنِ مجید کا شبِ قدر میں نزول:

ہم ڈرانے والے ہیں، یعنی ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے۔ برکت کی رات شبِ قدر ہے جیسا کہ ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ ﴾ میں فرمایا۔ اسی رات میں ہر ایک مضبوط کام کا فیصلہ ہوتا ہے، یعنی لوحِ محفوظ میں سے جدا کر کے اس کام والوں کو لکھ دیتے ہیں۔ ہم ہی رسول بنا کر بھیجنے والے ہیں، یعنی فرشتوں کو ہر کام پر بھیجتے ہیں۔ انتھی۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ اس نے قرآنِ عظیم کو لیلۂ مبارکہ میں نازل فرمایا۔ یہ برکت والی رات شبِ قدر ہے، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ﴾ [القدر: ۱] اور قرآن شریف کا نزول ماہِ رمضان میں ہوا، جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ ﴾ [البقرۃ: ۱۸۵] ”ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا۔“

اس بارے میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں، ان کو ہم نے سورۃ البقرہ میں اس طرح ذکر کیا ہے کہ یہاں ان کو

دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور جس شخص نے کہا کہ وہ رات نصف شعبان کی رات ہے، جیسا کہ عکرمہ رحمہ اللہ سے مروی ہے[1] تو بے شک اس نے ابعادِ نجعہ کیا ہے (حقیقت سے دور نکل گیا ہے)، کیوں کہ قرآن شریف نے اس پر نص کی ہے کہ وہ رمضان میں ہے اور وہ حدیث جو عثمان بن محمد بن مغیرہ بن اخنس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ شعبان سے شعبان تک اجلیں قطع کی جاتی ہیں، یہاں تک کہ بے شک ایک مرد البتہ نکاح کرتا ہے اور اس کے لیے بچہ پیدا کیا جاتا ہے، حالاں کہ اس کا نام مُردوں میں نکل چکا ہوتا ہے۔[2] چنانچہ یہ حدیث مرسل ہے، ایسی حدیث سے نصوص کا معارضہ (مقابلہ) نہیں کیا جاتا۔

﴿ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگوں کو شرعی طور پر اس شے سے آگاہ کرنے والے ہیں جو ان کو نفع ونقصان دیتی ہے، تاکہ اللہ کی حجت بندوں پر قائم ہو جائے۔ ﴿ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ سال بھر کا کام لوحِ محفوظ سے شبِ قدر میں لکھنے والوں کی طرف جدا کیا جاتا ہے، اور جو اجلیں اور مخلوق کی روزیاں اس سال میں ہوتی ہیں یا جو کام اس میں آخر سال تک ہونا ہوتا ہے، اس کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، ابو مالک، ضحاک اور بہت سے سلف رحمہم اللہ سے مروی ہے۔[3]

﴿ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ہر محکم اور پختہ کام جو نہ بدلا جائے اور نہ اس کا تغیر کیا جائے۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ﴾ یعنی سب کچھ جو ہوتا ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ مقدر کرتا ہے اور جس کی وحی فرماتا ہے، یہ سب اسی کے امر و اذن اور علم سے ہے۔ ﴿ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴾ یعنی بے شک ہم لوگوں کی طرف رسول بھیجنے والے ہیں جو ان پر اللہ تعالیٰ کی کھلی آیتیں پڑھتا ہے، اس لیے کہ اس بات کی ضرورت تھی۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ یعنی جس ذات پاک نے قرآن نازل کیا، وہ آسمانوں کا اور زمین کا اور جو شے ان کے درمیان ہے ان سب کا وہ رب، خالق اور مالک ہے۔ ﴿ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴾ یعنی اگر تم یقین کرنے والے اور اس کو سچ جاننے والے ہو۔

پھر اللہ سبحانہ نے فرمایا: ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٥٨] ''آپ کہہ دیجیے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہوں، جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا

[1] تفسیر الطبري (١٠/٢٢) [2] تفسیر الطبري (١٠/٢٢) یہ روایت مرسل ہے۔
[3] تفسیر الطبري (٩/٢٢، ١٠) تفسیر ابن أبي حاتم (٣٢٧٨/١٠)

ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اس کے نبی اُمی پر جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا اتباع کرو، تاکہ تم راہ پر آجاؤ۔'' [1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ اس سے پہلے ﴿حٰمٓ﴾ پر کلام گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اس سے اپنی مراد کو خوب جانتا ہے۔ ﴿وَالْكِتٰبِ﴾ میں حرفِ واؤ قسم کا ہے اور کتاب سے مراد قرآن شریف ہے۔ ﴿الْمُبِيْنِ﴾ یعنی قسم ہے قرآن کی جو اس شے کے بیان پر مشتمل ہے جس کی طرف اپنے دین و دنیا میں لوگوں کو حاجت ہے۔ ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ﴾ قسم کا جواب ہے اور اگر ﴿حٰمٓ﴾ کو جواب ٹھہراؤ گے تو یہ جملہ مستانفہ ہوگا۔ بعض نحویوں نے انکار کیا ہے کہ یہ جملہ قسم کا جواب ہو۔ یہ تو مقسم بہ کی صفت ہے اور مقسم بہ کی صفت قسم کا جواب نہیں ہوتی ہے۔ (﴿حٰمٓ﴾ میں کئی قول ہیں۔ سورت غافر میں ان کا بیان ہو چکا ہے، ان میں سے ایک معنی یہ ہیں: ''حَمَ أَمْرُ اللهِ أَيْ: قَرُبَ نَصْرُهُ لِأَوْلِيَاءِهِ وَانْتِقَامُهُ مِنْ أَعْدَائِهِ'' اس معنی کی بنا پر ﴿حٰمٓ﴾ جواب مقدم ہے اور ﴿وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ﴾ قسم موخر) اور کہا کہ قسم کا جواب ﴿اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ﴾ ہے۔

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے [2] اور یہ بھی کہا ہے کہ جملہ ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ﴾ معترضہ ہے جس کا مقصد کتاب کی تعظیم ہے۔ پہلے قول کو اس لیے ترجیح دی ہے کہ وہ سابق ہے اور سابق لاحق کی نسبت اس کا زیادہ مستحق ہے کہ جواب ہو۔ ترجیح کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اول من جملہ بدائع ہے، یعنی قرآن کا نازل کیا جانا ایک ایسا عظیم الشان امر ہے کہ اس کو بیان کرنے کے لیے سوائے قرآن کے کوئی شے اس لائق نہیں کہ اس کی قسم کھائی جائے، اس قسم کی قسم بدیع ہوتی ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ قولِ اول میں فکِ نظم (بدنظمی) سے سلامتی ملتی ہے، کون فک؟ جو امام ابن عطیہ رحمہ اللہ کے اختیار کردہ قول پر لازم آتا ہے، کیوں کہ ﴿فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ﴾ بقیہ جملہ معترضہ سے ہے اور دونوں کے درمیان میں مقسم علیہ متخلل ہوگیا۔ کسی نے کہا کہ ﴿اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ﴾ جوابِ ثانی ہے، یا جملہ مستانفہ ہے، انزال کے لیے مقرر و موکد ہے اور اس کے لیے حکمِ علت میں ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ ہم نے اس کو نازل کیا، اس لیے کہ ہماری شان اِنذار ہے۔

﴿اَنْزَلْنٰهُ﴾ میں ضمیر کتاب، یعنی قرآن شریف کی طرف راجع ہے۔ [3] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اسی پر اکتفا کیا ہے۔ اور جلال محلی رحمہ اللہ نے بھی انہیں کی پیروی اختیار کی ہے۔ [4] اس بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے اس بات پر قسم کھائی کہ اس نے قرآن نازل فرمایا۔ اس قسم کا کلام قرآن شریف کی انتہائی عظمت پر دلالت کرتا ہے، جب کوئی شخص کسی ایسے شخص

---

[1] تفسير ابن كثير (٤/١٧٣، ١٧٤) [2] فتح القدير (٧٤٤/٤) [3] تفسير البيضاوي (١٥٧/٥) [4] تفسير الجلالين (٦٥٦/١)

کی تعظیم کا ارادہ کرتا ہے جس کی طرف اس کو حاجت ہوتی ہے تو یوں کہتا ہے: ”أَتَشَفَّعُ بِكَ إِلَيْكَ“ (تشفع شفاعت کردن)۔ یہاں مشفوع بہ اور مشفوع الیہ تعظیم کے لیے ایک ہی کو ٹھہرایا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تو ایسا عظیم الشان ہے کہ تیرے سوا کوئی اس رُتبے کا نہیں ہے کہ تیرے پاس شفاعت کرے، اس لیے میں تجھی کو تیری طرف شفیع کرتا ہوں اور ”أُقْسِمُ بِحَقِّكَ عَلَيْكَ“ میں مقسم بہ اور مقسم علیہ ایک ہی قرار دیا ہے، یعنی تجھ سے بڑھ کر عالی رتبہ کوئی شے نہیں ہے کہ تجھ پر اس کی قسم کھاؤں۔ چنانچہ میں تیرے حق کی قسم تجھ پر کھاتا ہوں۔ حدیث شریف میں آیا ہے: «أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِعَفْوِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَا أُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ»[1] (”أَيْ: وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ“ یعنی تو عظیم الشان مالک ہے تیرے مقابلے کا کوئی نہیں کہ اس کے ساتھ تجھ سے پناہ مانگوں سو میں تیرے ساتھ تجھی سے پناہ مانگتا ہوں)۔ کسی نے کہا کہ کتاب سے مراد باقی نازل شدہ کتابیں ہیں اور ﴿ اَنْزَلْنٰهُ ﴾ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے اس معنی میں کہ اللہ پاک نے تمام نازل شدہ کتابوں کی قسم کھائی، اس بات پر کہ اس نے قرآن نازل فرمایا، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ قرآن کی جو خوبی اور تعظیم اس قول میں ہے، وہ دوسرے قول میں کہاں ہے۔ اس آیت سے ایسی وجوہ سے حدوثِ قرآن پر استدلال کیا ہے جن میں حدوث پر کسی طرح کی دلیل نہیں ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ سُوْءِ الْفَهْمِ.

﴿ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾ میں دو قول پر اختلاف ہے: پہلا قول یہ ہے کہ مراد لیلۃ القدر ہے۔ امام قتادہ اور ابن زید رحمہ اللہ اور اکثر مفسر اسی کے قائل ہیں۔[2] اس قول کی دلیلیں یہ ہیں:

1. اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ﴾ [القدر: ١] چنانچہ واجب ہے کہ ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾ سے مراد وہی رات ہو جس کا نام لیلۃ القدر رکھا گیا ہے، تاکہ تضاد پیدا نہ ہو۔
2. اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ﴾ [البقرة: ١٨٥] ”رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔“ چنانچہ اس جگہ جو یہ فرمایا ہے: ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾ تو واجب ہے کہ یہ لیلہ مبارکہ رمضان میں ہو۔ اس لیے ثابت ہوا کہ وہ لیلۃ القدر ہے۔
3. اللہ پاک نے لیلۃ القدر کی صفت میں فرمایا: ﴿ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ الرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ﴾ [القدر: ٤] ”اس میں (ہر کام) کے سرانجام دینے کو اپنے رب کے حکم سے فرشتے اور روح (جبرائیل) اترتے ہیں۔“ اور یہاں یوں فرمایا: ﴿ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ﴾ نیز اس جگہ فرمایا: ﴿ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ﴾ اور لیلۃ القدر میں فرمایا: سلام ہے اور جب اوصاف باہم ایک جیسے ہوئے تو اس بات کا قائل ہونا واجب ہوا کہ ان

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٨٦) [2] تفسير الطبري (٨/٧/٢٢)

دونوں میں بیان کی گئی ایک ہی رات ہے، یعنی وہی دوسری۔

4 محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں امام قتادہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان کی پہلی رات میں نازل ہوئے اور تورات رمضان کی چھٹی رات میں نازل ہوئی اور زبور اس کی بارھویں رات میں نازل ہوئی اور قرآن شریف اس کی چوبیسویں رات میں نازل ہوا[1] اور لیلۂ مبارکہ لیلۃ القدر ہی ہے۔

5 لیلۃ القدر کا جو یہ نام رکھا گیا تو اسی لیے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی قدر و منزلت اور بزرگی عظیم ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ اس کی قدر اور بزرگی زمانے کے سبب سے نہیں ہے، اس لیے کہ زمانہ تو ذات اور صفات میں ایک شے ہے، چنانچہ یہ صحیح نہیں کہ بعض زمانہ بعض سے اشرف ہو تو اب یہ بات ثابت ہوگئی کہ زمانے کی بزرگی اور قدر و منزلت اس سبب سے ہے کہ اس میں کچھ ایسے شریف امور حاصل ہوئے کہ ان کی بڑی قدر ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ دین کا مقام دنیا کے مناصب سے سب سے عظیم ہے اور دین میں از راہِ شعب، یعنی شاخوں کے لحاظ سے، سب چیزوں سے بڑھ کر عظیم اور شریف قرآنِ مجید ہے، اس لیے کہ اسی سے نبی کریم ﷺ کی نبوت ثابت ہوئی اور اسی سے حق و باطل میں فرق ظاہر ہوا جس طرح کہ اللہ پاک نے اس کی صفت میں فرمایا ہے: ﴿ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ ﴾ [المائدۃ: ٤٨] اور اسی سے سعادت والوں کے درجات اور بدبخت لوگوں کے طبقات ظاہر ہوئے۔ چنانچہ اس تقریر کی بنا پر کوئی شے ایسی نہیں ہے کہ قرآن شریف اپنی قدر و منزلت میں اس سے اعظم نہیں ہے اور ذکر میں اعلیٰ نہیں ہے اور منصب میں بزرگ تر نہیں ہے۔ اور جب اس پر اتفاق ہوگیا کہ لیلۃ القدر وہی ہے جو رمضان میں واقع ہوئی ہے تو ہم نے جان لیا کہ قرآن شریف اسی رات میں نازل کیا گیا۔ یہ دلائل واضح و ظاہر ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾ شبِ براءت ہے، یعنی نصف شعبان کی شب۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ اور ایک گروہ اسی کا قائل ہے،[2] اس قول والوں کے دلائل یہ ہیں:

1 اس رات کے چار نام ہیں: "ليلة المباركة"، "ليلة البراءة"، "ليلة الصك" (صک، چک کا معرب ہے۔ چک بہ معنی رقعہ ہے۔ چونکہ اس شب میں روزی اور اجل وغیرہ کی چھٹیاں تقسیم ہوتی ہیں اس لیے اس کا نام لیلۂ صک رکھا) اور "ليلة الرحمة"۔

2 یہ رات پانچ خصلتوں کے ساتھ مختص ہے: پہلی خصلت تو یہ آیت: ﴿ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ﴾ ہے۔ دوسری یہ ہے کہ اس میں عبادت کی فضیلت ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی اس رات میں سو رکعتیں پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سو فرشتے بھیجے، تیس تو اس کو جنت کی بشارت دیں اور تیس اس کو آگ کے عذاب سے امن دیں (بچائیں) اور تیس اس سے دنیا کی آفتیں دور کریں اور دس اس سے شیطان کے مکر و فریب اور چالیں دور کریں۔ تیسری خصلت نزولِ رحمت ہے، نبیِ کریم ﷺ نے

---

1 تفسير الطبري (٢٤/٣٧٧) 2 تفسير الطبري (٢٢/١٠)

فرمایا ہے کہ بے شک اللہ اس رات میں میری امت پر بنی کلب کی بکریوں کے بالوں کی تعداد کے برابر رحم کرتا ہے۔ چوتھی خصلت یہ ہے کہ اس میں مغفرت حاصل ہوتی ہے۔ نبیِ مکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ بے شک اللہ اس رات میں سارے مسلمانوں کی مغفرت فرماتا ہے، سوائے کاہن و جادوگر اور ہمیشہ شراب پینے والے اور اپنے ماں باپ کے نافرمان اور زنا پر اصرار کرنے والے کے۔ پانچویں خصلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس رات میں رسول اللہ ﷺ کو آپ ﷺ کی امت میں تمام شفاعت عطا فرمائی ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا: اس کی یہ وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے شعبان کی تیرھویں رات میں اپنی اُمت کے حق میں سوال کیا تو اس میں آپ ﷺ کو تہائی دی گئی۔ پھر آپ ﷺ نے چودھویں رات کو سوال کیا تو دو تہائی دی گئی، پھر پندرھویں رات کو سوال کیا تو ساری دے دی گئی "إِلَّا مَنْ شَرَدَ عَنِ اللّٰهِ شَرْدَ الْبَعِيْرِ".[1] یعنی مگر وہ شخص جو اللہ سے بدکا اونٹ کے بدکنے کی طرح۔ (كذا ذكر الخطيب على ما نقله الجمل)

بالجملہ نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم کے "بَابُ صَوْمِ التَّطَوُّعِ" میں کہا ہے کہ نصف شعبان کی شب کے بارے میں قول خطا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ﴿ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾ لیلۃ القدر ہے، علماء اس کے قائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾ نیز فرمایا: ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ﴾ [القدر: ۱] چنانچہ دوسری آیت پہلی آیت کا بیان ہے۔ لیلۃ القدر اس کا نام اس لیے رکھا ہے کہ اللہ پاک اس میں اپنے امر سے جو کچھ چاہتا ہے آیندہ سال کی لیلۃ القدر تک کے معاملات مقدر کرتا ہے۔ یعنی موت واجل ورزق کے متعلق یہاں تک کہ بیت اللہ کے حاجی اپنے ناموں اور اپنے باپ دادوں کے ناموں کے ساتھ لکھے جاتے ہیں اور ان کو فرشتوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو ان امور کو انجام دیتے ہیں، یعنی اسرافیل، میکائیل، عزرائیل اور جبرائیل علیہم السلام۔ یہ قول امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ فیصلوں کی نصف شعبان کی شب میں قضا کرتا ہے اور ان کو ان کے انجام دینے والوں کے سپرد لیلۃ القدر میں کرتا ہے۔[2] (ذكره الكرخي)

تفسیر قرطبی میں ہے: کسی نے کہا کہ لوحِ محفوظ سے اس کے لکھنے کی ابتدا شبِ براءت میں کی جاتی ہے اور لیلۃ القدر میں کام مکمل کر کے فراغت حاصل ہوتی ہے۔ پھر ارزاق (روزیوں) کا نسخہ تو میکائیل علیہ السلام کو دے دیا جاتا ہے اور لڑائیوں کا نسخہ جبریل علیہ السلام کو دیا جاتا ہے اور اسی طرح زلازل، صعق وخسف (زلزلوں، بجلیوں اور زمین میں دھنسانے یعنی عذاب) کا نسخہ بھی انھی کے حوالے ہوتا ہے اور اعمال کا نسخہ اسماعیل علیہ السلام کو دیا جاتا ہے۔ یہ صاحبِ سمائے دنیا اور ملکِ عظیم ہے۔[3] امام ابن عادل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اسرافیل علیہ السلام کو، اور مصائب کا نسخہ ملک الموت علیہ السلام کو دیا جاتا ہے۔[4] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے ﴿ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾ کے بارے میں کہا ہے کہ لیلۃ القدر ہے، یا نصف شعبان کی شب۔

---

(1) الكشاف (٢٧٢/٤، ٢٧٣) (2) تفسير القرطبي (١٣٠/٢٠)

(3) تفسير القرطبي (١٢٨/١٦) (4) اللباب في علوم الكتاب (٣١١/١٧)

کسی نے کہا ہے کہ اس کے اور لیلۃ القدر کے درمیان چالیس راتیں ہیں۔ جمہور پہلے قول پر ہیں، ان کی دلیل آیت: ﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ﴾ [القدر: ١] اور آیت ﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ﴾ [البقرة: ١٨٥] ہے۔ اور اکثر اقوال کے مطابق لیلۃ القدر ماہِ رمضان میں ہے۔[1] انتھی۔

فتح البیان میں ہے کہ حق وہی ہے جس طرف جمہور گئے ہیں کہ یہ ﴿ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾ وہی لیلۃ القدر ہے، نصف شعبان کی شب نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے یہاں تو اس کو مجمل رکھا ہے اور سورۃ البقرہ میں اس کو اس قول سے بیان فرمایا ہے: ﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ﴾ [البقرة: ١٨٥] اور سورۃ القدر میں اس قول سے بیان فرمایا ہے: ﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ﴾ [القدر: ١] چنانچہ اب اس واضح بیان کے بعد کوئی شے باقی نہ رہی جو اس میں کسی قسم کے اختلاف اور شبہہ کا موجب ہو۔[2]

رہی یہ حدیث جس کو امام ابن زنجویہ اور دیلمی رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يُقْطَعُ الْآجَالُ مِنْ شَعْبَانَ إِلَى شَعْبَانَ...» إلى آخره كما تقدم[3] (وأخرجه ابن أبي الدنيا و ابن جرير عن عثمان بن محمد) چنانچہ یہ روایت مرسل ہے، اس کے ساتھ حجت قائم نہیں ہوتی اور نہ ہی ایسی حدیث کے ساتھ قرآن شریف کے صریح احکام کا معارضہ (مقابلہ) کیا جاتا ہے اور اس بارے میں جو مروی ہے تو وہ یا تو مرسل ہے یا غیر صحیح۔ صاحبِ درمنثور نے اس کو وارد کیا ہے اور جو نصف شعبان کی شب کی فضیلت میں وارد ہوا ہے، اس کو بھی لائے ہیں۔

چنانچہ اس سب سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ﴿ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾ میں مراد ہے، یعنی اس کی فضیلت بجائے خود ثابت ہی ہوا کرے اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہ لازم نہیں آتا کہ ﴿ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾ سے وہی مراد ٹھہرے۔ واللہ أعلم.

غرضیکہ اللہ پاک نے قرآن شریف کو لیلۃ القدر میں نازل فرمایا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سارا قرآن لیلۃ القدر میں نازل کیا گیا۔ "أم الكتاب"، یعنی لوحِ محفوظ سے بیت العزت کی طرف جو آسمانِ دنیا میں ہے۔

پھر اللہ پاک نے اپنے نبیِ کریم ﷺ پر تئیس ۲۳ برس کی مدت میں طرح طرح کے واقعات اور حادثات میں حالات کے مطابق کبھی راتوں کو اور کبھی دنوں میں نازل فرمایا۔[4] اس کی تحقیق سورۃ البقرہ میں ﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ﴾ [البقرة: ١٨٥] کی تفسیر کے تحت گزر چکی ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لوحِ محفوظ سے ہر لیلۃ القدر میں وحی کے ذریعے اتنی مقدار میں نازل ہوتا تھا کہ جس کو لے کر جبریل علیہ السلام سال بھر میں دوسری لیلۃ القدر تک نازل ہوتے۔[5] کسی نے کہا ہے کہ نزولِ قرآن کی ابتداء لیلۃ القدر میں تھی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ قرآن شریف لیلۃ القدر میں نازل کیا گیا اور جبریل علیہ السلام اس کو لوگوں کے جواب کے لیے ٹکڑے ٹکڑے لے کر نازل ہوئے۔[6]

---

1. تفسير النسفي (١٢٢/٤) 2. فتح البيان (٣٨٩/١٢، ٣٩٠) 3. اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
4. تفسير القرطبي (١٢٦/١٦) 5. فتح القدير (٧٤٤/٤) 6. الدر المنثور (٣٩٨/٧)

بالجملہ اللہ پاک نے اس رات کا یہ وصف کیا کہ وہ مبارک ہے، اس لیے کہ اس میں قرآن نازل ہوا اور وہ دین ودنیا کے مصالح پر مشتمل ہے اور اس لیے کہ اس میں ملائکہ اور روح نازل ہوتے ہیں، جس طرح کہ ۔إن شاء اللہ۔ سورۃ القدر میں آئے گا۔ کسی نے کہا کہ ''مبارک'' بہ معنی کثیر الخیر ہے اور اس رات میں خیر و برکت نازل ہوتی ہے اور دعا قبول کی جاتی ہے، اس لیے اس کو مبارک کہا اور اگر اس رات میں انزالِ قرآن کے سوا اور کچھ نہ پایا جاتا تو اسی کی برکت کافی ہوتی۔

جملہ ﴿ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ﴾ مستانفہ ہے، یا جوابِ ثانی ہے قسم کا بغیر عاطف کے، یعنی جس قرآن کو ہم نے برکت والی رات میں نازل کیا ہے، ہم اس کے ساتھ بندوں کو اپنی سزا سے ڈرانے والے ہیں۔ پھر اللہ پاک نے اس رات کی برکات میں سے ایک یہ برکت بیان فرمائی کہ ﴿ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ﴾۔ ''فرق'' اس محاورے سے ماخوذ ہے: ''فَرَقْتُ الشَّيْءَ أَفْرِقُهُ فَرْقًا'' یعنی میں نے اس شے کو جدا کیا۔ مطلب یہ ہے کہ اس رات ہر محکم ومبرم (پکا) اور پختہ کام جدا کیا جاتا ہے اور بیان کیا جاتا ہے جس میں نہ کچھ تغیر حاصل ہوتا ہے اور نہ کسی طرح کا نقض (انقطاع) واقع ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ پاک اس رات میں سال بھر میں ہونے والے کام، ان کے اوقات اور جگہیں لکھتا ہے، یعنی جینا، مرنا، خیر وشر، رزق اور روزی کی تنگی وفراخی، اجل و فتح وشکست وارزانی وقحط وغیرہ مختلف قسم کے حادثات اور اُن کے جزئیات وغیرہ فرشتوں کے لیے بیان کرتا ہے، اس سال سے لے کر آیندہ سال تک، پھر وہ اس کو برابر پاتے ہیں تو ان کا ایمان اور زیادہ ہوتا ہے۔ امام مجاہد، قتادہ اور حسن رحمہم اللہ وغیرہم نے اسی طرح کہا ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ لیلۃ القدر میں ام الکتاب میں سے وہ شے لکھی جاتی جو سال میں واقع ہونا ہوتی ہے، یعنی رزق، موت، حیات اور بارش، یہاں تک کہ حاجی لکھے جاتے ہیں کہ فلاں فلاں حج کرے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ایک سال سے لے کر دوسرے سال تک کا کام لکھا جاتا ہے، سوائے شقاوت (بدبختی) اور سعادت (نیک بختی) کے، چنانچہ بے شک وہ اللہ کی کتاب میں ہے نہ بدلا جاتا ہے نہ تبدیل کیا جاتا ہے۔[2] (أخرجه ابن أبي حاتم)

امام عبد بن حمید رحمہ اللہ وغیرہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ بے شک تو البتہ دیکھتا ہے کسی آدمی کو کہ بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، حالاں کہ اس کا نام مردوں میں شامل ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس رات میں دنیا کا کام جو اگلے سال اسی رات تک ہونا ہے، وہ جدا کیا جاتا ہے، یعنی موت یا حیات یا رزق اور دنیا کا کل کام اس رات میں جدا کیا جاتا ہے اگلے سال کی اسی رات تک۔ کسی نے کہا ﴿ حَكِيْمٍ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ وہ کام حکمت

---

[1] تفسير الطبري (٢٢/٨، ٩) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٨٧)

کے تقاضے کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اور ﴿ اَمْرٍ ﴾ کو جو ﴿ حَكِيْمٍ ﴾ کہا تو یہ اسنادِ مجازی کے باب سے ہے، کیوں کہ حقیقت میں حکیم تو امر دینے والا ہے اور امر کو اس کے ساتھ مجازاً موصوف کیا ہے۔ یہ جملہ یا تو ﴿ لَيْلَةٍ ﴾ کی دوسری صفت ہے اور جو کچھ دونوں صفتوں کے مابین ہے وہ معترضہ ہے۔ یا جملہ مستانفہ ہے جو ماقبل کی تقریر کے لیے آیا ہے۔ جمہور نے ﴿ يُفْرَقُ ﴾ کو بہ ضمِ یائے تحتیہ و فتحِ رائے مخفف پڑھا ہے اور امام حسن، اعرج اور اعمش رحمہ اللہ نے بہ فتحِ یاء و ضمِ راء اور ﴿ كُلُّ اَمْرٍ ﴾ کو بہ نصب اور ﴿ حَكِيْمٍ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ فاعل ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ﴾ کا نصب ﴿ يُفْرَقُ ﴾ سے ہے۔ "أَيْ: يُفْرَقُ فَرْقًا" اس لیے کہ ﴿ اَمْرًا ﴾ بہ معنی "فَرْقًا" ہے، یعنی ہر امرِ حکیم ہمارے پاس سے پوری طرح جدا کیا جاتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ہم اس کے جدا کرنے اور بیان کرنے کا حکم دیتے ہیں، یعنی لوحِ محفوظ سے نقل کرنے کا امر کرتے ہیں۔ اس بنا پر ﴿ اَمْرًا ﴾ منصوب ہے بنابر مصدریت "يَضْرِبُ ضَرْبًا" کی طرح۔ یہ قول امام زجاج اور فراء رحمہ اللہ کا ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿ اَمْرًا ﴾ موضعِ مصدر میں ہے، تقدیر یہ ہے: "أَنْزَلْنَاهُ إِنْزَالًا مِنْ عِنْدِنَا" یعنی ہم نے قرآن کو اپنے پاس سے اتارا جس طرح کہ اتارا جاتا ہے۔

امام اخفش رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ﴿ اَمْرًا ﴾ کا نصب بنا بر حال ہے۔ "أَيْ: آمِرِيْنَ مِنْ عِنْدِنَا" یعنی ہم نے قرآن کو اس حال میں نازل کیا کہ ہم اپنے پاس سے امر کرنے والے ہیں۔ کسی نے کہا کہ اختصاص کی بنا پر منصوب ہے۔ "أَيْ: أَعْنِيْ بِهٰذَا الْأَمْرِ أَمْرًا حَاصِلًا مِنْ عِنْدِنَا" یعنی اس امر سے میں وہ امر مراد لیتا ہوں جو ہمارے پاس سے حاصل ہوتا ہے۔ امام مبرد اور اخفش رحمہ اللہ کے قول میں شانِ قرآن کی تعظیم اور بڑائی ہے۔ بعض اہلِ علم نے ﴿ اَمْرًا ﴾ کے نصب میں بارہ وجہیں ذکر کی ہیں، ان میں سے ظاہر وہی ہیں جو ہم نے ذکر کی ہیں۔ زید بن علی رحمہ اللہ نے "أَمْرٌ" بہ رفع پڑھا ہے: "أَيْ: هُوَ أَمْرٌ مِنْ عِنْدِنَا"[1]

جملہ ﴿ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴾ یا تو ﴿ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ﴾ کا بدل ہے، یا قسم کا تیسرا جواب ہے، یا مستانفہ ہے، یعنی بے شک ہم رسولوں کو بھیجنے والے ہیں اور نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کو بھیجنے والے ہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: معنی یہ ہیں کہ ہم نے یہ انذار اس لیے کیا کہ ہم نبیوں کو بھیجنے والے ہیں۔[2] امام ابن خطیب رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ ﴿ رَحْمَةً ﴾ کا نصب بنا بر علت ہے۔ "أَيْ: أَنْزَلْنَاهُ لِلرَّحْمَةِ" یعنی ہم نے قرآن کو رحمت کے لیے نازل کیا۔ یہ قول زجاج رحمہ اللہ کا ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿ مُرْسِلِيْنَ ﴾ کا مفعول ہے، یعنی ہم رحمت کو بھیجنے والے ہیں۔ کسی نے کہا کہ موضعِ حال میں مصدر ہے: "أَيْ: رَاحِمِيْنَ" یہ امام اخفش رحمہ اللہ کا قول ہے، یعنی ہم بھیجنے والے ہیں اس حال میں کہ ہم رحم کرنے والے ہیں۔ کسی نے کہا کہ فعل مقدر

---

(1) تفسير القرطبي (١٢٨/١٦) فتح القدير (٤/ ٧٤٤، ٧٤٥) (2) تفسير الرازي (٢٠٦/٢٧)

کا مفعول مطلق ہے "أَيْ: رَحِمْنَا رَحْمَةً"، یعنی ہم نے رحمت کی جس طرح رحمت کرنا چاہیے۔ حسن رحمہ اللہ نے ﴿ رَحْمَةً ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے[1]: "أَيْ: هِيَ رَحْمَةٌ بِالْمُرْسَلِ إِلَيْهِمْ" یعنی رسولوں کو بھیجنا ان لوگوں پر رحمت ہے جن کی طرف رسول بھیجے گئے۔

﴿ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ متعلق ہے ﴿ رَحْمَةً ﴾ سے۔ یا محذوف سے متعلق ہے، اس بنا پر کہ وہ صفت ہے: "أَيْ: رَحْمَةً كَائِنَةً مِنْ رَّبِّكَ" اس میں صیغۂ حاضر سے صیغۂ غائب کی طرف التفات ہے۔ اگر ماقبل کے طریقے پر کام چلتا تو "رَحْمَةً مِنَّا" ہوتا۔ معنی یہ ہیں کہ ہماری طرف سے ہماری مخلوق پر رحمت ورافت ونعمت ہے رسولوں کے سبب سے جن کو ہم نے ان کی طرف بھیجا۔ ذکرِ رب میں اس طرف اشارہ ہے کہ رسولوں کا مخلوق کی طرف بھیجنا آثارِ ربوبیت سے ہے۔ پھر خطاب کے کاف کی طرف اس کی اضافت کی، اس سے یہ بات بتانا منظور ہے کہ جس نے تجھے رسول بنا کر بھیجا ہے، وہ تیری تربیت کرے گا جس طرح کہ پہلے رسولوں کی تربیت کی ہے۔

پھر فرمایا: ﴿ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴾ یعنی بے شک وہ ایسا رب ہے کہ پکارنے والے کی پکار کو خوب سنتا ہے اور ہر شے کو خوب جانتا ہے۔ پھر اپنی ذاتِ مقدس کو ایسی صفت کے ساتھ موصوف کیا جو بڑی ظاہر و باہر قوت پر دال ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ﴾ جمہور نے بہ رفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ عطفِ بیان ہے ﴿ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴾ کا، یا مبتداء ہے اور ﴿ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ﴾ اس کی خبر ہے۔ یا مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ "أَيْ: هُوَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ" کوفیوں نے زیر سے پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ ﴿ رَبِّكَ ﴾ سے بدل ہے۔ یا اس کا بیان ہے، یا نعت ہے ﴿ إِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴾ کی، یعنی اگر تم اس بات کا یقین کرنے والے ہو کہ وہ آسمانوں کا اور زمین کا رب ہے اور اس چیز کا جو ان کے درمیان میں ہے اور وہ اس کا اقرار کرنے والے تھے۔ چنانچہ اللہ پاک نے بہت جگہ ان سے اس اقرار کو نقل فرمایا ہے تو تم اس بات کا یقین کرو کہ محمد ﷺ اس کے رسول ہیں۔

جملۂ ﴿ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ﴾ مستانفہ ہے جو اپنے ماقبل کی تقریر و تاکید کرتا ہے۔ یا ﴿ رَبِّ السَّمٰوٰتِ ﴾ کی خبر ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے اور اسی طرح جملۂ ﴿ يُحْيِ وَيُمِيْتُ ﴾ بھی مستانفہ ہے اور ماقبل کی تقریر کرتا ہے۔ ﴿ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْأَوَّلِيْنَ ﴾ کو جمہور نے بہ رفع پڑھا ہے بنا بر استیناف بہ تقدیرِ مبتداء "أَيْ: هُوَ رَبُّكُمْ"، یا بدل ہے ﴿ رَبِّ السَّمٰوٰتِ ﴾ سے، یا اس کا بیان ہے، یا اس کی نعت اور کسائی وغیرہ ("في رواية الشيرازي عنه و ابن محيصن وابن أبي إسحاق وأبو حيوة وحسن") نے بہ جر پڑھا ہے، اس کی وجہ وہی ہے جو ﴿ رَبِّ السَّمٰوٰتِ ﴾ کی قراءتِ جر میں مذکور ہوئی ہے[2] اور انطاکی نے بہ نصب بنا بر مدح پڑھا ہے۔[3]

---

[1] فتح القدير (٤/٧٤٥) [2] فتح القدير (٤/٧٤٥) [3] روح المعاني (٢٥/١١٦) فتح البيان (١٢/٣٨٧۔٣٩١)

بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ یَّلْعَبُوْنَ ۝۹ فَارْتَقِبْ یَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ
مُّبِیْنٍ ۝۱۰ یَّغْشَی النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝۱۱ رَبَّنَا
اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ۝۱۲ اَنّٰی لَهُمُ الذِّكْرٰی وَ قَدْ
جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِیْنٌ ۝۱۳ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا مُعَلَّمٌ
مَّجْنُوْنٌ ۝۱۴ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِیْلًا اِنَّكُمْ عَآىِٕدُوْنَ ۝۱۵ یَوْمَ نَبْطِشُ
الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰی ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ۝۱۶

(مگر کفار کو یقین نہیں) بلکہ وہ شک وشبہہ میں پڑے کھیل رہے ہیں ⑨ تو آپ اس دن کا انتظار کیجیے جب آسمان صاف دھواں لائے گا ⑩ جو لوگوں کو ڈھانپ لے گا (کہا جائے گا:) یہ ہے دردناک عذاب! ⑪ (کافر کہیں گے:) اے ہمارے رب! ہم سے یہ عذاب ہٹا دے، بلاشبہہ ہم ایمان لانے والے ہیں ⑫ ان کے لیے نصیحت کیوں کر ہو گی جبکہ ان کے پاس ایک ظاہر و باہر رسول آ گیا ⑬ پھر وہ اس سے پھر گئے اور (بعض نے) کہا: یہ تو سکھایا پڑھایا ہے (اور بعض نے کہا:) دیوانہ ہے ⑭ بے شک ہم تھوڑی دیر کے لیے عذاب دور کرنے والے ہیں، بلاشبہہ تم لوٹنے والے ہو ⑮ جس دن ہم بہت بڑی پکڑ پکڑیں گے، یقیناً ہم انتقام لینے والے ہیں ⑯

مشرکین کو اس دن سے ڈراوا جس دن دھواں نکلے گا:

جس دن آسمان دھواں لائے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کے دھوئیں کا ذکر ہے کہ اس وقت سمجھ نہیں آتا۔ قیامت میں یہ دھواں گھیر لے گا، نیک آدمی کو زکام سا ہو گا اور بد آدمی کو سر میں چڑھ جائے گا، وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے گا۔ ہم عذاب کو تھوڑا دور کر دیں گے تو تم پھر اپنی اسی حالت پر آ جاؤ گے، یعنی عادت اسی طرح سے ہے۔ آخرت کا عذاب بالکل نہیں ٹلتا۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بلکہ یہ مشرک شک میں پڑے کھیل رہے ہیں، یعنی ان کے پاس تو حقِ یقین آ چکا اور وہ اس میں شک وشبہہ کر رہے ہیں اور اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ پھر اللہ عزوجل ان کو وعید سناتا ہے اور ملامت کرتا ہے، چنانچہ تو راہ دیکھ، یعنی انتظار کر جس دن کہ آسمان صریح دھواں لائے۔ سلیمان بن مہران اعمش عن ابی الضحی مسلم بن صبیح عن مسروق روایت کرتے ہیں کہ ہم منقش دروازوں کے پاس کوفہ کی مسجد میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنے ساتھیوں کو ﴿ یَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیْنٍ ﴾ کے متعلق وعظ کر رہا

ہے کہ کیا تم جانتے ہو: یہ دخان کیا ہے؟ یہ ایک دھواں ہے جو قیامت کے دن آئے گا تو منافقوں کے کانوں اور آنکھوں کو پکڑے گا اور مومنین کو اس سے صرف زکام سا ہو گا۔

امام مسروق رحمہ اللہ کہتے ہیں، پھر ہم سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ہم نے ان سے اس کا ذکر کیا اس حال میں کہ وہ لیٹے ہوئے تھے۔ وہ گھبرا گئے اور اُٹھ بیٹھے اور کہا کہ اللہ عزوجل نے تمھارے نبیِ کریم ﷺ سے فرمایا ہے: ﴿ قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴾ [صٓ: ٨٦] ''کہہ دیجیے کہ میں تم سے اس سے کوئی بدلہ طلب نہیں کرتا اور نہ میں تکلف کرنے والوں میں سے ہوں۔'' بے شک یہ بات علم سے ہے کہ آدمی جس شے کو نہیں جانتا، اس کے متعلق یہ کہہ دے: ''اَللّٰهُ أَعْلَمُ'' یعنی میں نہیں جانتا اللہ خوب جانتا ہے۔

میں ابھی تم سے اس کا قصہ بیان کرتا ہوں۔ جب قریش نے اسلام لانے میں دیر کی اور رسول اللہ ﷺ پر سرکش ہوئے تو آپ ﷺ نے ان پر بددعا فرمائی کہ ان پر یوسف علیہ السلام کے زمانے کے قحط جیسے سال آئیں۔ تو سخت تکلیف اور گرسنگی سے ان کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہڈیاں اور مردار کھا گئے اور اپنی آنکھیں جب آسمان کی طرف اٹھاتے تو اپنے اور آسمان کے درمیان سخت مشقت کی وجہ سے دھواں ہی دھواں دیکھتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۝ يَّغْشَى النَّاسَ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾

پھر لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ سے عرض کی: یارسول اللہ! آپ مضر کے لیے اللہ سے پانی مانگیں، وہ تو ہلاک ہو گئے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان کے لیے پانی مانگا تو ان کو پانی ملا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآىِٕدُوْنَ ﴾. سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا پھر قیامت کے دن ان سے عذاب کھولا جائے گا۔ پھر جب ان کو رفاہیت پہنچی (فائدہ ہوا) تو وہ اپنے حال کی طرف لوٹ گئے، اس پر اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴾ کہا: یعنی بدر کے دن۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پانچ چیزیں گزر چکیں: ''دخان، روم، قمر، بطشة اور لزام'' یہ حدیث صحیحین میں ہے۔[1] (ورواه الإمام أحمد في مسنده وهو عند الترمذي والنسائي في تفسيرهما وعنه ابن جرير وابن أبي حاتم من طريق متعددة عن الأعمش به) اس آیت کی یہ تفسیر اور دخان گزر چکا۔ سلف کی ایک جماعت نے اس میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی موافقت کی ہے، جیسے: امام مجاہد، ابو العالیہ، ابراہیم نخعی، ضحاک، عطیہ عوفی اور ابن جریر رحمہم اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔[2]

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٩٨) مسند أحمد (١/ ٣٨٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٥٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٥٥) تفسير الطبري (٢٢/ ١٣، ١٤)

② تفسير الطبري (٢٢/ ١٦، ١٨)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبدالرحمان اعرج رحمہ اللہ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ یہ فتح مکہ کے دن تھا۔[1] یہ قول انتہائی غریب، بلکہ منکر ہے۔ دوسروں نے کہا ہے کہ دخان ابھی تک نہیں گزرا، بلکہ یہ علاماتِ قیامت سے ہے، چنانچہ ابوسریحہ حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے گزر چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرے سے نکل کر ہمارے پاس آ کھڑے ہوئے اور ہم آپس میں قیامت کا ذکر کر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت تک قیامت قائم نہ ہو گی جب تک تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو: سورج کا اپنے مغرب سے نکلنا، دخان و دابہ، یاجوج وماجوج کا نکلنا، عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا نکلنا، دجال کا نکلنا، تین خسف: ایک خسف مشرق میں، ایک خسف مغرب میں، ایک خسف جزیرۂ عرب میں (خسف کے معنی زمین میں دھنسایا جانا) اور قعرِ عدن سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو ہانک لے جائے گی یا لوگوں کو حشر کرے گی، وہ رات بسر کرے گی، جہاں لوگ رات بسر کریں گے اور قیلولہ کرے گی ان کے ساتھ جہاں وہ قیلولہ کریں گے۔[2] (تفرد بإخرجه مسلم)

صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ابن صیاد سے فرمایا: میں نے تیرے لیے ایک پوشیدہ شے پوشیدہ کی ہے، اس نے کہا: وہ درخ ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: «اِخْسَأْ» یعنی چپ رہ تو ہرگز اپنی قدر سے تجاوز نہ کرے گا۔ راوی نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے: ﴿ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ﴾ پوشیدہ کیا تھا۔ اس حدیث میں اس بات کی سمجھ آتی ہے کہ دخان منتظر و مرتقب کے جملے سے ہے۔ ابن صیاد کاہنوں کے طریقے پر کاشف تھا جنوں کی زبان میں۔ یہ لوگ عبارت کی تقریظ کرتے ہیں، یعنی اس پر رائے دیتے ہیں، اس لیے اس نے کہا کہ وہ درخ ہے، یعنی دخان، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کلمے کے کہنے کے وقت اس کے مادے کو پہچان لیا اور جان لیا کہ وہ شیطانی مادہ ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: «اِخْسَأْ فَلَنْ تَعْدُوَ قَدْرَكَ»[3]

پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (سند یہ ہے: "حدثني عصام بن رواد بن الجراح، حدثنا أبي، حدثنا سفيان بن سعيد الثوري، حدثنا منصور بن المعتمر عن ربعي بن حراش قال: سمعت حذيفة بن يمان رضي الله عنه يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم... الخ) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک ان نشانیوں میں سے پہلی نشانی دجال ہے، پھر عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور ایک آگ جو قعرِ عدن سے نکلے گی اور لوگوں کو محشر کی طرف ہانک لے جائے گی، وہ ان کے ساتھ قیلولہ کرے گی جب وہ قیلولہ کریں گے اور دخان۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! دخان کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۝ يَّغْشَى النَّاسَ ۭ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٨٧) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٠١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٩٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٣٠)

پھر دخان سے مابین مشرق و مغرب کو چالیس رات دن تک بھر دے گا۔ مومن کو تو اس سے زکام کی طرح تکلیف پہنچے گی اور رہا کافر تو وہ مست کی طرح ہوگا، اس کے دونوں نتھنوں سے اور کانوں سے اور پیٹھ سے نکلے گا۔[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو البتہ فاصل ہوتی اور میں جو اس کی صحت کی گواہی نہیں دیتا تو اس لیے کہ محمد بن خلف عسقلانی نے محمد سے بیان کیا کہ اس نے رواد سے اس حدیث کے متعلق پوچھا تھا کہ کیا اس نے اس کو سفیان سے سنا ہے؟ تو رواد نے محمد سے کہا کہ نہیں۔ محمد نے کہا: پھر میں نے کہا: کیا تو نے اس کو سفیان پر پڑھا ہے؟ کہا: نہیں۔ کہا: پھر میں نے کہا: کیا یہ اس پر تیری موجودگی میں پڑھی گئی؟ تو کہا: نہیں۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا: پھر تو اس کو کہاں سے لایا؟ تو کہا: اس کو ایک قوم میرے پاس لائی اور اس کو مجھ پر عرض کی۔اور مجھ سے کہا: تو اس کو ہم سے سن لے۔ چنانچہ انھوں نے اس کو مجھ پر پڑھا۔ پھر وہ لوگ چلے گئے، چنانچہ لوگوں نے اس کی مجھ سے حدیث کی، یا جیسا کہا۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہاں اس حدیث کے بارے میں امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عمدہ بات کہی، کیوں کہ یہ حدیث تو اس سند سے موضوع ہے، اس تفسیر میں کئی جگہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس حدیث کے سیاق کو کثرت سے ذکر کیا ہے اور اس میں بہت سی منکرات ہیں، خصوصاً سورت بنی اسرائیل کے شروع میں مسجدِ اقصیٰ کے ذکر میں۔[3] والله أعلم.

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک تمھارے رب نے تم کو تین چیزوں سے ڈرایا ہے: ایک تو دخان ہے جو مومن کو زکام کی طرح پکڑے گا اور کافر کو اس طرح پکڑے گا کہ وہ پھول جائے گا، یہاں تک کہ اس کے ہر سوراخ سے نکلے گا۔ دوسری چیز دابہ ہے اور تیسری دجال۔[4] (ورواه الطبراني عن هاشم بن يزيد عن محمد بن إسماعيل بن عياش به وهذا إسناد جيد)۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن الحسن عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: دھواں ان لوگوں کو برانگیختہ کرے گا، لیکن مومن تو اس کو وہ مثل زکام کے پکڑے گا اور لیکن کافر تو وہ اس کو پھلا دے گا، یہاں تک کہ اس کے ہر سوراخ سے نکلے گا۔[5] (ورواه سعيد بن أبي عروبة عن قتادة عن الحسن عن أبي سعيد الخدري رضی اللہ عنہ موقوفا و روى سعيد بن عوف عن الحسن قوله)[6]

---

[1] تفسیر الطبري (۲۲/۱۷، ۱۸) اس کی سند میں ''رواد بن الجراح عن سفیان الثوري'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر الطبري (۲۲/۱۸)   [3] تفسیر ابن کثیر (٤/۱۷۵، ۱۷٦)

[4] تفسیر الطبري (۲۲/۱۸) المعجم الکبیر (۳/۲۹۲) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ شریح بن عبید کا سیدنا ابو مالک رضی اللہ عنہ سے اور محمد بن اسماعیل کا اپنے والد سے سماع ثابت نہیں ہے۔

[5] تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/۳۲۸۷، ۳۲۸۸) اس کی سند میں انقطاع ہے ''حسن رحمہ اللہ'' کا سماع سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[6] تفسیر الطبري (۲۲/۱۷)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ دخان کی نشانی ابھی تک نہیں گزری، وہ مومن کو زکام کی صورت میں پکڑے گا اور کافر کو پھلائے گا یہاں تک کہ نافذ ہوگا۔[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ دخان نکلے گا اور وہ مومن کو زکام کی صورت میں پکڑے گا اور کافر و منافق کے تمام سوراخوں میں سے داخل ہوگا، یہاں تک کہ وہ ایسے ہو جائے گا جیسے گرم پتھر پر بھنا ہوا سر ہوتا ہے۔

پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عبداللہ بن ابی ملیکہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں ایک دن صبح کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں آج کی رات نہیں سویا، یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ میں نے عرض کی: کیوں؟ فرمایا: لوگوں نے کہا کہ دُمدار تارا طلوع ہوا تو میں اس سے ڈرا کہ دخان رات کو آ گیا ہو، اس لیے میں نہ سویا، یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔[2] (وهكذا رواه ابن أبي حاتم عن أبيه عن ابن عمر عن سفيان عن عبدالله بن أبي يزيد عن عبدالله بن أبي مليكة عن ابن عباس رضي الله عنهما فذكره وهذا إسناد صحيح إلى ابن عباس رضي الله عنهما حبر الأمة و ترجمان القران، و هكذا قول من وافقه من الصحابة و التابعين مع الأحاديث المرفوعة الصحاح و الحسان وغيرهما التي أوردوها مما فيه مقنع ودلالة ظاهرة على أن الدخان من الآيات المنتظرة مع أنه ظاهر القرآن)

اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ﴾ یعنی پس تو اس دن کا انتظار کر جس دن آسمان ظاہر و واضح دھواں لائے جس کو ہر کوئی دیکھے گا۔ اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جو اس کی تفسیر کی ہے، اس کی بنا پر صرف وہ ایک خیال ہے جس کو انھوں نے سخت مشقت اور شدید تکلیف کے مارے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اسی طرح یہ آیت ہے: ﴿ يَغْشَى النَّاسَ ﴾ یعنی وہ دھواں سب لوگوں کو ڈھانک لے گا اور اگر وہ مشرکینِ مکہ کے ساتھ ایک خیالی امر ہوتا تو اس کے متعلق ﴿ يَغْشَى النَّاسَ ﴾ نہ کہا جاتا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ یعنی ان کی ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت کے لیے ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے درد دینے والا عذاب، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ﴿13﴾ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴾ [الطور: ١٣۔ ١٤] ''جس دن وہ دھکے دے دے کر آتشِ جہنم کی طرف لائے جائیں گے۔ یہی وہ آتشِ دوزخ ہے جسے تم جھوٹ بتلاتے تھے۔'' یا یہ معنی ہیں کہ یہ بات بعض بعض سے کہیں گے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی جب کفار اللہ پاک کے عذاب اور سزا کو دیکھ لیں گے تو اس کو دور کرنے کا سوال کریں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٧] ''اور اگر آپ اس وقت دیکھیں جب کہ یہ دوزخ کے پاس کھڑے کیے جائیں گے تو کہیں گے ہائے! کیا اچھی بات ہو کہ ہم پھر واپس بھیج دیے جائیں اور اگر

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٨٨/١٠) [2] تفسير الطبري (١٧/٢٢)

ایسا ہو جائے تو ہم اپنے رب کی آیات کو جھوٹا نہ بتلائیں اور ہم ایمان والوں میں سے ہو جائیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ﴾ [إبراهيم: ٤٤] ''لوگوں کو اس دن سے ہوشیار کر دے جب کہ ان کے پاس عذاب آجائے گا، اور ظالم کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہمیں بہت تھوڑے قریب کے وقت تک کی ہی مہلت دے کہ ہم تیری تبلیغ مان لیں اور تیرے پیغمبروں کی تابعداری میں لگ جائیں۔ کیا تم اس سے پہلے بھی قسمیں نہیں کھا رہے تھے کہ تمھارے لیے دنیا سے ٹلنا ہی نہیں؟''

نیز اسی طرح اللہ جل جلالہٗ نے یہاں فرمایا ہے: ﴿ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۝ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ﴾ یعنی اب ان کے لیے کیسے نصیحت پذیر ہونا ہے حالانکہ ہم تو ان کی طرف ایسا رسول بھیج چکے جس کی رسالت و نذارت ظاہر و باہر تھی اور اس کے باوجود انھوں نے اس سے اعراض کیا اور اس کی موافقت نہ کی، بلکہ اس کو جھٹلایا اور کہا کہ سکھایا ہوا دیوانہ ہے۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسٰنُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴾ [الفجر: ٢٣] ''اس دن انسان کو سمجھ آئے گی مگر آج اس کے سمجھنے کا فائدہ کہاں؟!''

نیز اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ۝ وَّقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ۝ وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ۝ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴾ [سبا: ٥١۔ ٥٤] ''اور اگر آپ (وہ وقت) ملاحظہ کریں جبکہ یہ کفار گھبرائے پھریں گے، پھر نکل بھاگنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور قریب کی جگہ سے گرفتار کر لیے جائیں گے۔ اس وقت کہیں گے کہ ہم اس قرآن پر ایمان لائے لیکن اس قدر دور جگہ سے (مطلوبہ چیز) کیسے ہاتھ آسکتی ہے۔ اس سے پہلے تو انھوں نے اس سے کفر کیا تھا، اور دور دراز سے بن دیکھے ہی پھینکتے رہے۔ ان کی چاہتوں اور ان کے درمیان پردہ حائل کر دیا گیا جیسے کہ اس سے پہلے بھی ان جیسوں کے ساتھ کیا گیا، وہ بھی (انھیں کی طرح) شک وتردد میں (پڑے ہوئے) تھے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ﴾ دو معنی کا احتمال ہے: ایک معنی یہ ہیں: اگر ہم تم سے عذاب کھول دیتے اور تم کو دارِ دنیا کی طرف پھیر لے جاتے تو جس کفر و تکذیب میں تم تھے اسی کی طرف پھر رجوع کرتے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ٧٥] ''اور اگر ہم ان پر رحم فرمائیں اور ان کی تکلیفیں دور کر دیں تو یہ تو اپنی اپنی سرکشی میں جم کر بہکنے لگیں۔'' اور فرمایا: ﴿ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٨] ''اور اگر یہ لوگ پھر واپس بھیج دیے جائیں تب بھی یہ وہی کام کریں گے جس سے ان کو منع کیا گیا تھا اور یقیناً یہ بالکل جھوٹے ہیں۔''

دوسرے معنی یہ ہیں: مراد یہ ہے کہ ہم تم سے عذاب کی تاخیر کرنے والے ہیں اس کے اسباب کے منعقد ہونے کے تھوڑے دنوں کے بعد اور اس کے تمھاری طرف پہنچنے کے بعد اور تم اس سرکشی اور گمراہی پر ہی جمے رہنے والے ہو جس میں کہ تم ہو۔ ان سے عذاب کے کشف (دور کرنا) سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عذاب ان کو مباشر ہوا ہو، یعنی پہنچا ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ﴾ [يونس: ٩٨] ''سوائے یونس علیہ السلام کی قوم کے جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے رسوائی کے عذاب کو دنیوی زندگی میں ان پر سے ٹال دیا اور ان کو ایک وقت (خاص) تک کے لیے زندگی سے فائدہ اٹھانے کا (موقع) دیا۔''

حالانکہ عذاب ان کو مباشر اور متصل نہیں ہوا تھا، بلکہ اس کا سبب ان پر منعقد ہو چکا تھا۔ اور یہ بھی لازم نہیں آتا کہ وہ اپنے کفر سے باز آئے، پھر اس کی طرف رجوع ہوئے، دیکھو اللہ پاک نے شعیب علیہ السلام کی طرف سے خبر دی ہے کہ انھوں اپنی قوم سے کہا جب ان کی قوم نے ان سے یوں کہا: ﴿ لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۚ قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كَارِهِينَ ۞ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُمْ بَعْدَ إِذْ نَجَّانَا اللَّهُ مِنْهَا ۚ ﴾ [الأعراف: ٨٨۔ ٨٩] ''ہم آپ کو اور جو آپ کے ہمراہ ایمان لائے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال دیں گے الا یہ کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آ جاؤ، شعیب علیہ السلام نے جواب دیا کہ کیا ہم تمھارے مذہب میں آ جائیں گو ہم اس کو مکروہ ہی سمجھتے ہوں؟ ہم تو اللہ تعالیٰ پر جھوٹی تہمت لگانے والے ہو جائیں گے اگر ہم تمھارے دین میں آ جائیں اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس سے نجات دی۔'' حالانکہ شعیب علیہ السلام کبھی ان کی ملت اور طریقے پر نہ تھے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ إِنَّكُمْ عَائِدُونَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ تم عذاب اللہ کی طرف رجوع کرنے والے ہو۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنْتَقِمُونَ ﴾ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر روزِ بدر سے کی ہے اور یہ قول ان لوگوں کی ایک جماعت کا ہے جنھوں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی تفسیر دخان پر موافقت کی ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور بروایتِ عوفی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے اور ایک جماعت، جو اُن سے روایت کرتی ہے،[2] سے اُس قول کا بھی احتمال ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ بطشہ قیامت میں ہوگا، اگرچہ روزِ بدر بھی یوم بطشہ تھا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بروایتِ عکرمہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ بطشۂ کبریٰ روزِ بدر ہے، اور میں کہتا ہوں کہ وہ روزِ قیامت کو ہوگا۔ یہ قول بہ اسنادِ صحیح ان سے مروی ہے اور امام حسن بصری اور عکرمہ رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں[3] ان صحیح روایتوں کے مطابق جو اُن سے مروی ہیں۔[4] واللّٰه أعلم.

---

1. تفسیر الطبري (٢١/٢٢)
2. تفسیر الطبري (٢٣،٢٢/٢٢)
3. تفسیر الطبري (٢٣/٢٢)
4. تفسیر ابن کثیر (١٧٤/٤۔١٧٧)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اللہ پاک نے کفار کے موقنین ہونے سے اعراض کرکے فرمایا: ﴿ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ ﴾ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے ﴿ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ﴾ ہونے کا کیا یقین کریں گے، بلکہ وہ تو توحید اور بعث کے بارے میں اور اس اقرار میں کہ اللہ ان کا اور ساری مخلوق کا خالق ہے، شک میں ہیں۔ یہ جو کہتے ہیں تو بغیر علم ویقین کے صرف اپنے باپ دادوں کی تقلید میں کہتے ہیں۔ ﴿ يَلْعَبُوْنَ ﴾ یعنی اس کے کہنے میں کھیلتے ہیں، ان کا یہ کہنا دین کے ساتھ کھیل اور مذاق کے طور پر ہے۔ جو کچھ اُن کو ظاہر ہو جاتا ہے بغیر حجت کے وہ کہہ دیتے ہیں، ایسا نہیں کہ یقینِ کامل سے کہتے ہوں۔ ﴿ يَلْعَبُوْنَ ﴾ کا محل رفع ہے، اس بنا پر کہ ﴿ هُمْ ﴾ کی خبر ثانی ہے، یا نصب ہے بنا برحال۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ﴾ میں حرفِ فاء ما بعد کی ترتیب ماقبل پر کے لیے ہے، اس لیے کہ ان کے شک اور لعب میں ہونے کا تقاضا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے یوں کہا جائے کہ اب تو اُن کے لیے اس دن کا انتظار کر کہ آسمان صریح دھواں لائے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تو ان کی اس بات کو محفوظ رکھ، تاکہ تو ان پر اس دن گواہی دے جس دن آسمان صریح دھواں لائے۔ یہ دخان جو یہاں مذکور ہے، اس کے بارے میں اختلاف ہے کہ کب آئے گا۔ کسی نے تو کہا کہ قیامت کی علامات سے ہے اور زمین میں چالیس دن ٹھہرے گا۔ صحیح میں یہ ثابت ہوا ہے کہ دس نشانیوں میں سے ہے جو قیامت سے پہلے ہوں گی۔[1] کسی نے کہا کہ یہ ایک امر ہے جو ہو چکا ہے۔ یہ وہی ہے جو نبی اکرم ﷺ کی دعا سے قریش کو پہنچا تھا جب کہ آدمی زمین و آسمان کے درمیان دھواں دیکھتا تھا۔ یہ بات صحیحین وغیرہما میں ثابت ہے[2] اور اسی کے امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ قائل ہیں۔

کسی نے کہا کہ فتح مکہ کے دن ہوا۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں دو وجہیں ہیں: پہلی یہ ہے کہ قحط کے سال میں بارش کے نہ ہونے کی وجہ سے زمین انتہا درجے کی خشک ہوتی ہے اور غبار بہت زیادہ اُٹھتا ہے اور ہوا تاریک ہو جاتی ہے اور یہ دھوئیں کے مشابہ ہو جاتا ہے اور محاورے میں بولتے ہیں: "كَانَ بَيْنَنَا أَمْرٌ اِرْتَفَعَ لَهُ دُخَانٌ" یعنی ہمارے درمیان ایک ایسا امر ہوا کہ اس کے لیے دھواں بلند ہوگیا اور اسی لیے قحط کے سال کو "غبراء" کہتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عرب غالب شے کا نام دخان رکھتے ہیں۔ اس میں سبب یہ ہے کہ جب آدمی کا خوف اور ضعف سخت ہوتا ہے تو اس کی آنکھیں تاریک ہو جاتی ہیں اور دنیا کو ایسے دیکھتا ہے جیسے آنکھیں دھوئیں سے بھری ہوں۔[3] اس کے بعد بہ تخریجِ بخاری و مسلم وغیرہما بروایتِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ قریش کا قصد ذکر کیا ہے۔[4]

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٩٨)

[3] اللباب في علوم الكتاب (٣١٥/١٧)

[4] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

پھر کہا ہے: ''عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کئی طریق سے اس طرح روایت کیا گیا ہے اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت سے بھی اس طرح مروی ہے، جیسے: مقاتل اور مجاہد۔

پھر وہی امام ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ کی روایت ذکر کی ہے، اس کے بعد کہا ہے: حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ یہ اسناد صحیح ہے اور اسی طرح سیوطی نے اسے صحیح کہا ہے۔① پھر کہا ہے: لیکن اس میں یہ نہیں ہے کہ آیت کے نزول کا سبب یہی ہے۔ ہم تم کو بتا چکے ہیں کہ اس کے درمیان کہ یہ آیت نازل ہوا اس دخان کے بارے میں جو قریش کو بھوک کی شدت کے مارے دکھائی دیتا تھا اور اس کے کہ دخان قیامت کی علامات وآیات اور اشراط سے ہو کوئی تضاد نہیں۔ صحیح، حسن اور ضعیف حدیثیں اس بارے میں وارد ہو چکی ہیں اور ان میں یہ بات نہیں ہے۔ آیت کے نزول کا یہ سبب ہے تو اب کوئی ضرورت نہیں کہ ان روایات کو بیان کر کے طول دیں۔

واجب یہ ہے کہ جو بات صحیحین وغیرہما میں ثابت ہوئی ہے اس کے ساتھ تمسک کریں، وہ یہ ہے کہ آیت کے نزول کا سبب دخانِ قریش ہے جو مشقت اور تکلیف کے وقت ان کو دکھائی دیتا تھا۔ اس سے تم جان لو گے کہ جس کسی نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ وہی دخان ہے جو قیامت کی علامات سے ہے، اس کی ترجیح دور ہو گئی، جس طرح کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اور دیگر مفسرین نے اپنی تفسیر میں ترجیح دی ہے۔② اسی طرح اس شخص کا قول بھی رد ہوتا ہے جس نے کہا ہے کہ یہ وہ دخان ہے جو فتح مکہ کے دن ہوا، اس حدیث سے تمسک کر کے جس کو ابن سعد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ فرمایا: فتح مکہ کے دن دخان تھا۔③ اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ﴾ کیوں کہ یہ حدیث اپنی صحتِ اسناد کی بنا پر اس بات کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو صحیحین میں ثابت ہو چکی ہے۔

دوسرے یہ احتمال بھی ہے کہ وہ دخان جو فتح مکہ کے دن واقع ہوا، اس نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ گمان کر لیا ہو کہ اس آیت سے وہی مراد ہے اور اسی لیے یہ تصریح نہیں کی کہ وہ اس آیت کے نزول کا سبب ہے۔ بالجملہ قولہ تعالیٰ: ﴿ يَغْشَى النَّاسَ ﴾ دخان کی صفتِ ثانی ہے، یعنی وہ ایسا دخان ہے کہ لوگوں کو شامل ومحیط ہو گا۔ ﴿ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ یعنی لوگ کہیں گے کہ یہ عذابِ الیم ہے۔ یا وہ دخان لوگوں کو گھیر لے گا اس حال میں کہ وہ کہتے ہوں گے: ﴿ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ یا اللہ تعالیٰ ان سے یہ فرمائے گا۔

﴿ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی وہ لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے رب! تو ہم سے اس عذاب کو کھول دے بے شک ہم ایمان لانے والے ہیں۔ مروی ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی کہ اگر اللہ ہم سے عذاب کو کھول دے گا تو ہم اسلام لے آئیں گے اور عذاب سے مراد وہی بھوک ہے جس کے سبب سے

---

① اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ ② تفسیر ابن کثیر (١٧٦/٤) ③ الطبقات لابن سعد (١٤٢/٢)

دخان دیکھتے تھے، یا یہ بات اسی وقت کہیں گے جب اس دخان کو دیکھیں گے جو قیامت کی علامات سے ہے، یا جب اس کو فتحِ مکہ کے دن دیکھیں گے اقوال کے اس اختلاف کی بنا پر جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ ان میں سے راجح قول یہ ہے کہ یہ وہی دخان ہے جس کو وہ اس بھوک اور شدتِ تکلیف کی وجہ سے خیال کرتے تھے جو اُن پر نازل ہوئی تھی۔ اس قول کو ترجیح دینا اس کے منافی نہیں جو وارد ہوا ہے کہ دخان علاماتِ قیامت سے ہے، کیوں کہ وہ اور دخان ہے، اسی طرح اس قول کے بھی منافی نہیں ہے جو کہا گیا ہے کہ وہ فتحِ مکہ کے دن تھا، اس لیے کہ بالفرض اس کی صحتِ وقوع کے وہ اور دخان ہے۔

﴿ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴾ یعنی وہ اس بلا سے کیوں کر نصیحت پذیر ہوں گے جو ان پر نازل ہوئی، حالانکہ ان کے پاس تو ایسا رسول آچکا جو حاجت مند کے لیے دنیا و دین کے امور میں سے ہر شے خوب کھول کر بیان کرتا ہے۔ ﴿ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ ﴾ یعنی جو رسول ان کے پاس آیا اس سے اعراض کیا، اس کی بات نہ سنی اور صرف اعراض کرنے پر ہی بس نہ کیا، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھے اور بولے: ﴿ مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ﴾ یعنی ایسے خیر خواہ خوش بیان رسول کے بارے میں کبھی تو یوں کہا کہ اس کو تو کوئی بشر ہی قرآن سکھاتا ہے (یہ بشر ایک نصرانی لوہار تھا، نبیِ کریم ﷺ اس کے پاس جاتے تھے، اس کا نام جبر تھا اور یہ عامر بن الحضرمی کا غلام تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ جبر و یسار مکے میں دو شخص تھے جو تلواریں بنایا کرتے تھے اور تورات اور انجیل پڑھتے تھے اور نبیِ کریم ﷺ ان کے پاس جاتے تھے اور ان کا پڑھنا سنتے تھے۔ کسی نے کچھ اور بھی کہا ہے)۔ اور کبھی یوں بولے کہ وہ تو دیوانہ ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ بعض نے وہ بات کہی اور بعض نے یہ بات کہی۔ چنانچہ جب ان لوگوں نے اللہ کے رسولِ صادق کی یہ قدر کی تو کس طرح نصیحت پذیر ہوں گے اور کہاں سے ان کو نصیحت نفع دے گی!

پھر جب اللہ پاک سے یہ دعا کی کہ عذاب کو ان سے کھول دے اور جس وقت وہ اس کو ان سے دور کر دے گا تو ایمان لے آئیں گے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس کا ان کو یہ جواب دیا: ﴿ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ﴾ یہ جواب ﴿ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴾ کا ہے جو اللہ پاک کی طرف سے التفات کے طور پر اور مزید ڈانٹ اور دھمکی کے لیے ہے۔ سوال اور جواب کے درمیان کی عبارت جملہ معترضہ ہے، یعنی اے لوگو جو عذاب کے دور ہونے پر ایمان کا وعدہ کرتے ہو! تو ہم اس کو تم سے تھوڑی مدت کے لیے روزِ بدر تک دور کر دیں گے۔ یا اس مدت تک جو تمھاری عمروں میں باقی رہ گئی ہے، لیکن تم اس شرک سے باز نہ آؤ گے جس پر تم تھے اور نہ ہی ایمان لانے کے وعدے کو پورا کرو گے۔ تم تو اسی شرک کی طرف رجوع کرو گے جس پر تم تھے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جس وقت اللہ پاک نے عذاب کو ان سے کھول دیا تو اسی کفر وعناد کی طرف پھر گئے جس پر وہ تھے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تم ہماری

طرف بعث ونشور کے ساتھ لوٹ کر آنے والے ہو۔ لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

﴿ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴾ جمہور نے بہ فتح نون وکسرِ طاء پڑھا ہے: "أَيْ: نَبْطِشُ بِهِمْ" اور امام حسن اور ابوجعفر رحمہ اللہ نے بہ ضم طاء پڑھا ہے، یہ بھی ایک لغت ہے اور امام ابورجاء اور طلحہ رحمہما اللہ نے بہ ضم نون وکسرِ طاء پڑھا ہے۔[1] کلمۂ ﴿ يَوْمَ ﴾ منصوب ہے "اُذْكُرْ" محذوف سے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ ﴾ سے بدل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مُنْتَقِمُوْنَ ﴾ سے متعلق ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس فعل سے متعلق ہے جس پر ﴿ مُنْتَقِمُوْنَ ﴾ دال ہے، یعنی "نَنْتَقِمُ"۔ "بطشة کبریٰ" روزِ بدر ہے۔ یہ اکثر کا قول ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جب انھوں نے عذاب ہٹ جانے کے بعد کفر اور تکذیب کی طرف عود کیا تو اللہ پاک نے جنگِ بدر میں ان سے انتقام لیا۔

امام حسن اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد قیامت کے دن آگ کا عذاب ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اسی کو پسند کیا ہے،[2] لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ بطشۂ کبریٰ روزِ بدر ہے اور میں کہتا ہوں: وہ روزِ قیامت ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا تھا کہ یہ اسناد صحیح ہے۔[3] امام ابن الخطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ روزِ بدر اس مرتبے کو نہیں پہنچتا جو اس وصفِ عظیم کے ساتھ موصوف ہو۔ پورا انتقام جو حاصل ہو گا تو وہ قیامت ہی کے دن ہو گا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں یوں فرمایا ہے: ﴿ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ﴾ [المؤمن: ١٧] ''آج ہر نفس کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے گا۔''

پہلے گزر چکا ہے کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے روزِ قیامت کے قول کو ظاہر کہا ہے۔ شیخ شیوخنا شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بلکہ ظاہر یہ ہے کہ وہ روزِ بدر ہے، اگرچہ روزِ قیامت ہر بطشے سے بڑا بطشہ ہے، اس لیے کہ سیاقِ کلام قریش کے ساتھ ہے تو اس کی تفسیر اس بطشے کے ساتھ زیادہ بہتر ہے جو قریش کے لیے خاص ہے، بہ نسبت بطشے کی اس تفسیر سے جو قیامت کے دن انسانوں اور جنوں میں سے ہر گناہ گار کے لیے ہو گا۔[4] انتھیٰ.

جب اللہ تعالیٰ نے یہ بات بیان کی کہ کفارِ مکہ یقین کرنے والے نہیں ہیں، بلکہ شک میں رہ کر لہو ولعب کرتے ہیں اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ اس دن کا انتظار کریں جس دن کہ آسمان شدت اور بھوک کو لائے تو اس کے بعد یہ بیان کیا کہ بہت سے پہلے لوگ بھی ایسے ہی تھے اور ان میں سے قومِ فرعون ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

---

[1] فتح القدير (٧٤٦/٤)
[2] تفسير القرطبي (١٣٤/١٦)
[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[4] فتح القدير (٧٤٨/٤) فتح البيان (٣٩٢/١٢-٣٩٦)

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ﴿١٧﴾ اَنْ
اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٨﴾ وَّاَنْ لَّا
تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّيْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٩﴾ وَاِنِّيْ
عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴿٢٠﴾ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا
لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴿٢١﴾ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴿٢٢﴾
فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿٢٣﴾ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ
اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ﴿٢٤﴾ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿٢٥﴾ وَّزُرُوْعٍ
وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿٢٦﴾ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴿٢٧﴾ كَذٰلِكَ ۟
وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿٢٨﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ
وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ﴿٢٩﴾ وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ
الْمُهِيْنِ ﴿٣٠﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣١﴾ وَلَقَدِ
اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٢﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ
مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ ﴿٣٣﴾

اور البتہ ان سے پہلے ہم نے قومِ فرعون کو آزمایا اور ان کے پاس ایک معزز رسول آیا تھا (17)
(اس نے کہا:) کہ اللہ کے بندوں (بنی اسرائیل) کو میرے حوالے کر دو، بے شک میں
تمھارے لیے امانت دار رسول ہوں (18) اور یہ کہ تم اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو، بلاشبہ
میں تمھارے سامنے واضح دلیل پیش کرتا ہوں (19) اور بلاشبہ میں نے اپنے رب اور تمھارے
رب کی پناہ لی ہے، اس سے کہ تم مجھے سنگسار کر دو (20) اور اگر تم میری بات پر ایمان نہیں لاتے
تو تم مجھ سے الگ ہو جاؤ (21) پھر اس نے اپنے رب کو پکارا کہ بلاشبہ یہ لوگ تو مجرم ہیں (22)
(حکم ہوا کہ) اب میرے بندوں کو راتوں رات لے چل، یقیناً تمھارا پیچھا کیا جائے گا (23) اور تو
سمندر کو ساکن و خشک چھوڑ جا، بلاشبہ یہ لوگ (آلِ فرعون) غرق شدہ لشکر ہیں (24) وہ کتنے ہی
باغات اور چشمے چھوڑ گئے (25) اور کھیتیاں اور شاندار محل (26) اور سامانِ عیش جن میں وہ مزے کر
رہے تھے (27) اسی طرح (ہوا) اور ہم نے ایک دوسری قوم کو ان (سب) کا وارث بنا دیا (28) پھر

ان پر آسمان اور زمین نہ روئے، اور نہ انھیں مہلت دی گئی (29) اور یقیناً ہم نے بنی اسرائیل کو رسوا کن عذاب سے نجات دی (30) (یعنی) فرعون سے، بلاشبہہ وہ بڑا ہی سرکش (اور) حد سے گزرنے والوں میں سے تھا (31) اور بے شک ہم نے بنی اسرائیل کو جانتے بوجھتے ہوئے جہانوں پر ترجیح دی (32) اور ہم نے انھیں نشانیاں دی تھیں، جن میں کھلی آزمائش تھی (33)

بنی اسرائیل کی فرعون سے نجات کا ذکر:

اللہ تعالیٰ کے بندوں کو میرے حوالے کر دو، یعنی بنی اسرائیل کو رخصت کر دو۔ شاید وہ ڈرتے ہوں گے کہ کہیں مجھے سنگسار نہ کر دیں اس لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی۔ مجھ سے الگ رہو، یعنی میں اپنی قوم کو لے جاؤں تم راستے میں نہ روکو۔ ان سب کا وارث دوسری قوم کو بنا دیا، یعنی بنی اسرائیل کو، جیسا کہ سورۃ الشعراء میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل مصر میں داخل ہوئے۔ ان پر نہ زمین و آسمان روئے اور نہ انھیں مہلت ملی۔ حدیث میں فرمایا ہے کہ مسلمان کے مرنے پر آسمان کا وہ دروازہ روتا ہے جس سے اس کی روزی اترتی تھی اور زمین روتی ہے جہاں وہ نماز پڑھتا ہے۔[1] ہم نے بنی اسرائیل کو دنیا جہاں والوں پر فوقیت دی، یعنی اگرچہ ان میں کچھ برائیاں بھی تھیں۔ اور ہم نے ان کو ایسی نشانیاں دیں جن میں صریح آزمائش تھی، یعنی موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے وہ نشانیاں دیں۔ انتہیٰ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان مشرکوں سے پہلے ہم فرعون کی قوم کی آزمائش کر چکے ہیں۔ یہ لوگ مصر کے قبطی تھے اور ان کے پاس عزت والا رسول آیا، یعنی موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلاۃ والسلام یہ بات لے کر کہ اللہ کے بندوں کو یعنی بنی اسرائیل کو میرے سپرد کرو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴾ [طٰہٰ: ٤٧] ”تو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے، ان کی سزائیں موقوف کر۔ ہم تو تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی اسی کے لیے ہے جو ہدایت کا پابند ہو جائے۔“

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴾ یعنی بے شک میں تمھارے لیے ایسا رسول ہوں جو اس پیغام پر امانت دار بنایا گیا ہے، جسے میں تم کو پہنچاتا ہوں۔ ﴿ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ؕ ﴾ اور یہ کہ اس کی آیتوں کی پیروی کرنے اور اس کی حجتوں کا مطیع ہونے اور اس کی برہانوں پر ایمان لانے سے تکبر نہ کرو، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴾ [المؤمن: ٦٠] ”یقین مانو کہ جو لوگ میری عبادت سے خودسری کرتے ہیں وہ ابھی ابھی ذلیل ہو کر جہنم میں پہنچ جائیں گے۔“

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں آگے آئے گی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنِّیْۤ اٰتِیْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴾ یعنی میں تمھارے پاس ظاہر اور واضح حجت لاتا ہوں، یہ وہی کھلی نشانیاں اور قطعی دلیلیں ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھیجا تھا۔ ﴿ وَاِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس رجم سے مراد ''رجم باللسان'' ہے، یعنی گالی گلوچ۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد ''رجم بالحجارۃ'' ہے، [1] یعنی میں اللہ کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں جس نے مجھے اور تمھیں پیدا کیا، اس سے کہ تم برے قول اور فعل کے ساتھ میری طرف پہنچو۔ ﴿ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴾ یعنی اگر تم مجھ پر یقین نہیں کرتے تو مجھ سے کچھ تعرض مت کرو اور میرے اور اپنے درمیان کام کو صحیح سالم جوں کا توں چھوڑ دو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور تمھارے درمیان فیصلہ کر دے۔

پھر جب موسیٰ علیہ السلام کا قیام ان کے درمیان دراز ہوا اور ان پر اللہ تعالیٰ کی حجتیں قائم کر چکے اور اس سب سے ان کے کفر اور عناد میں اضافہ ہی ہوا تو اپنے رب سے ان پر ایسی بد دعا کی جو ان میں نفوذ کر گئی، جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِیْنَةً وَّاَمْوَالًا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ﴿88﴾ قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِیْمَا ﴾ [یونس: ۸۸۔ ۸۹] ''اور موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے ہمارے رب! تو نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو سامانِ زینت اور طرح طرح کے مال دنیاوی زندگی میں دیے۔ اے ہمارے رب! (اسی واسطے دیے ہیں کہ) وہ تیری راہ سے گمراہ کریں۔ اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو نیست ونابود کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے سو یہ ایمان نہ لانے پائیں یہاں تک کہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی، لہٰذا تم ثابت قدم رہو۔'' اسی طرح اس جگہ فرمایا: ﴿ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴾

چنانچہ اس وقت اللہ پاک نے ان کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو لے کر ان کے درمیان سے نکل جائیں فرعون کے حکم اور اس سے مشورہ کیے بغیر اور اس کی اجازت کے بغیر۔ اسی لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یوں فرمایا: ﴿ فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴾ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴾ [طٰہٰ: ۷۷] ''ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی نازل فرمائی کہ تو راتوں رات میرے بندوں کو لے چل اور اُن کے لیے دریا میں خشک راستہ بنا لے، پھر نہ تجھے کسی کے آ پکڑنے کا خطرہ ہو گا نہ ڈر۔'' اور اس جگہ اللہ عزوجل کا یہ قول: ﴿ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ﴾۔

اس کے یہ معنی ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل دریا کے پار ہو گئے تو موسیٰ علیہ السلام نے چاہا کہ دریا کو اپنے عصا سے ماریں کہ پھر ویسا ہی ہو جائے، جیسا کہ تھا، تاکہ ان کے اور فرعون کے درمیان حائل ہو جائے تو وہ اُن کی

[1] تفسیر الطبري (۲۲/۲۶، ۲۷)

طرف نہ پہنچ سکے، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ حکم دیا کہ تو دریا کو اپنے حال پر تھا ہوا چھوڑ دے اور ان کو یہ مژدہ سنایا کہ وہ تو ایک ڈوبنے والا لشکر ہے اور وہ اُن کے پیچھا کرنے کا خوف نہ کریں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ﴾ كَهَيْئَتِهِ وَامْضِهِ" یعنی دریا کو اس کی ہیئت پر چھوڑ دے اور چلا جا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ رَهْوًا ﴾ "طَرِيقًا يَبِسًا كَهَيْئَتِهِ يَقُولُ: لَا تَأْمُرْهُ يَرْجِعُ، أُتْرُكْهُ حَتَّى يَرْجِعَ آخِرُهُمْ" اسی طرح امام عکرمہ، ربیع بن انس، ضحاک، قتادہ، ابن زید، کعب احبار اور سماک بن حرب رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے بھی کہا ہے۔[1]

پھر اللہ پاک نے غرق کے بعد کا حال ذکر فرمایا: ﴿ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴾ جنات تو باغ ہوئے اور ﴿ عُيُوْنٍ ﴾ سے مراد نہریں اور کنویں ہیں اور ﴿ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴾ سے مراد عمدہ عمدہ رہنے بسنے کی جگہیں اور حسین اور خوبصورت مکانات ہیں۔ امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴾ منبر ہیں۔[2] امام ابن لہیعہ رحمہ اللہ نے عن وہب بن عبداللہ المغافری عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، فرمایا کہ نیلِ مصر سید الانہار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مشرق و مغرب کے درمیان ہر نہر کو مسخر کر دیا ہے۔ چنانچہ جب اللہ عزوجل ارادہ کرتا ہے کہ نیلِ مصر کو جاری کرے تو ہر نہر کو امر فرماتا ہے کہ اس کو مدد دے، چنانچہ وہ نہریں اپنے پانی سے اس کو مدد دیتی ہیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کے لیے زمین کو پھوڑ کر چشمے نکال دیے ہیں۔

پھر جب اس کا بہاؤ وہاں تک پہنچتا ہے جہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا ہے تو ہر پانی کو وحی کرتا ہے کہ اپنے عنصر کی طرف لوٹ جائے۔ اور ﴿ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴾ [الشعراء: ٥٧] کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ نہرِ نیل کے دونوں کناروں پر باغ تھے جس کے شروع سے لے کر آخر تک دونوں اطراف میں اسوان سے لے کر رشید تک اور اس کی نو خلیجیں تھیں (محشی مصر نے لکھا ہے کہ ہمارے پاس جو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے اصل نسخے موجود ہیں، ان میں اسی طرح ہے، نو کا عدد پورا نہیں ہے، گنتی میں چھے خلیجیں ہوتی ہیں۔ واللّٰہ أعلم)۔ خلیجِ اسکندریہ، خلیجِ دمیاط، خلیجِ سردوس، خلیجِ منف، خلیجِ فیوم، خلیجِ منتہی، یہ سب متصل تھیں، ان میں سے کوئی کسی سے منقطع نہیں ہوتی تھی، کھیتیاں تھیں، سب کی سب دو پہاڑوں کے درمیان تھیں، مصر کے شروع سے لے کر آخر تک جہاں تک پانی پہنچتا ہے اور مصر کی ساری زمین سیراب ہوتی تھی، سولہ ذراع سے ان پلوں اور خلیجوں کے ذریعے سے جن کو اندازہ اور تدبیر کر کے بنایا گیا تھا۔[3]

﴿ وَنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴾ یعنی اور اس عیش و عشرت سے جس میں باتیں بنایا کرتے تھے، جو چاہتے کھاتے تھے اور جو پسند کرتے وہ پہنتے تھے، اپنے مالوں اور جاہ و جلال اور شہروں میں اپنی حکومت کے ساتھ تھے۔ ایک صبح ان سے یہ سب کچھ چھین لیا گیا اور وہ دنیا سے مفارقت کر گئے اور جہنم کی طرف جا پہنچے جو لوٹ کر جانے کی کیا بری

---

[1] تفسير الطبري (٢٢/٢٩، ٢٩) تفسير ابن كثير (١٧٨/٤) [2] تفسير الطبري (٢٢/٣١، ٣٢) [3] تفسير ابن كثير ١٧٨/٤، ١٧٩)

جگہ ہے۔ اور بلادِ مصر پر اور ان فرعونی حواصل اور قبطی ممالک پر بنی اسرائیل مستولی ہو گئے، یعنی غالب ہو گئے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ ۖ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ [الشعراء: ٥٩] ''اسی طرح ہوا اور ہم نے ان (تمام) چیزوں کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا۔'' نیز دوسری آیت میں فرمایا: ﴿ وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ڏ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٣٧] ''اور ہم نے ان لوگوں کو جو بالکل کمزور شمار کیے جاتے تھے۔ اس سرزمین کے پورب پچھم کا مالک بنا دیا، جس میں ہم نے برکت رکھی ہے اور آپ کے رب کا نیک وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کی وجہ سے پورا ہو گیا اور ہم نے فرعون کے اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں کو اور جو کچھ وہ اونچی اونچی عمارتے بنواتے تھے، سب کو درہم برہم کر دیا۔'' اور اس جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴾ یہ قوم بنی اسرائیل ہیں، جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔

﴿ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاۗءُ وَالْاَرْضُ ﴾ یعنی ان کے اعمالِ صالح نہ تھے کہ آسمان کے دروازوں میں سے اوپر چڑھتے اور ان کے گم ہونے پر وہ روئیں اور نہ زمین میں ان کے لیے ایسے قطعات تھے جن میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ہو کہ وہ ان کو گم پائیں، چنانچہ اسی لیے اس کے مستحق ہوئے کہ ان کو ان کے کفر، گناہوں اور سرکشی وعناد کے سبب سے مہلت اور تاخیر نہ دی جائے۔

حافظ ابو یعلیٰ نے اپنی مسند میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں ہے کوئی بندہ مگر حال یہ ہے کہ اس کے لیے آسمان میں دو دروازے ہیں: ایک وہ دروازہ ہے جس سے اس کا رزق نکلتا ہے اور ایک وہ دروازہ ہے جس سے اس کا عمل اور کلام داخل ہوتا ہے۔ پھر جب وہ مرتا ہے تو اس کو گم پاتے ہیں اور اس پر روتے ہیں اور یہ آیت پڑھی: ﴿ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاۗءُ وَالْاَرْضُ ﴾ اور ذکر کیا ہے کہ انھوں نے زمین پر کوئی عمل صالح نہیں کیا تھا کہ وہ ان پر روئے اور نہ اُن کا کوئی کلام پاک اور عملِ صالح آسمان کی طرف چڑھا تھا کہ وہ ان کو گم پاتا اور ان پر روتا۔[1] (ورواه ابن أبي حاتم من حديث موسى بن عبيدة وهو الربذي)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے شریح بن عبید حضرمی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک اسلام غریب شروع ہوا اور عن قریب پھر غریب ہو جائے گا، جیسا کہ شروع ہوا تھا۔ خبردار! نہیں ہے کوئی غربت مومن پر۔ نہیں مرا کوئی مومن غربت میں کہ اس پر رونے والیاں غائب ہوئیں، مگر اس پر آسمان رویا اور زمین روئی۔

[1] مسند أبي يعلىٰ (١٦٠/٧) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٨٨/١٠، ٣٢٨٩) اس کی سند میں ''یزید رقاشی اور موسیٰ بن عبیدہ ربذی'' ضعیف راوی ہیں۔

پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ ﴾ پھر فرمایا: وہ دونوں کافر پر نہیں روتے۔[1]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عباد بن عبداللہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ ایک شخص نے علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا آسمان و زمین کسی پر روتے ہیں؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا کہ تو نے مجھ سے ایک ایسی شے کے بارے میں پوچھا ہے کہ تجھ سے پہلے اس کے متعلق کسی نے مجھ سے نہیں پوچھا، بے شک حال یہ ہے کہ نہیں ہے کوئی بندہ مگر اس کے لیے زمین میں جائے نماز ہے، یعنی نماز پڑھنے کی جگہ اور آسمان میں اس کے اعمال کے چڑھنے کی جگہ ہے۔ اور بے شک آلِ فرعون کے لیے نہ تو زمین میں کوئی عملِ صالح تھا اور نہ کوئی ایسا عمل تھا جو آسمان میں چڑھے، پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ ﴾[2]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس ایک شخص آیا۔ پھر عرض کی: اے عبداللہ بن عباس! آپ مجھے اللہ تعالیٰ کے قول ﴿ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ ﴾ کے متعلق خبر دیں تو کیا آسمان و زمین کسی پر روتے ہیں؟ فرمایا: ہاں۔ حال یہ ہے کہ خلائق میں سے کوئی نہیں ہے مگر حال یہ ہے کہ اس کے لیے آسمان میں ایک دروازہ ہے جس سے اس کا رزق اترتا ہے اور جس میں اس کا عمل چڑھتا ہے، جب مومن مرتا ہے تو آسمان میں وہ دروازہ بند کر دیا جاتا ہے جس میں اس کا عمل چڑھتا تھا اور جس سے اس کا رزق اترتا تھا، پھر وہ دروازہ اسے گم پاتا ہے تو اس پر روتا ہے اور جس وقت زمین میں سے اس کی نماز کی جگہ جب اسے گم پاتی ہے جس میں وہ نماز پڑھتا تھا اور اللہ عزوجل کا ذکر کیا کرتا تھا تو اس پر روتی ہے اور بے شک قومِ فرعون کے لیے زمین میں نہ کچھ آثارِ صالح تھے اور نہ اللہ عزوجل کی طرف ان سے کوئی خیر چڑھتی تھی، چنانچہ آسمان و زمین ان پر نہ روئے۔

عوفی نے بھی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے مثل روایت کیا ہے۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے عن ابی یحییٰ القتات عن مجاہد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، فرمایا: کہا جاتا تھا کہ زمین مومن پر چالیس صبح روتی ہے۔ اسی طرح امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے بھی کہا ہے۔[3] نیز امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں: نہیں مرا کوئی مومن مگر آسمان و زمین چالیس صبح اس پر روئے۔ امام ابو یحییٰ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چنانچہ میں نے مجاہد رحمہ اللہ سے عرض کی: کیا زمین روتی ہے؟ تو فرمایا: کیا تو تعجب کرتا ہے، حالاں کہ زمین کے لیے کیا ہے کہ وہ ایسے بندے پر نہ روئے جو اپنے رکوع و سجود سے اس کو آباد رکھا کرتا تھا اور کیا ہے آسمان کے لیے کہ وہ ایسے بندے پر نہ روئے جس کی تکبیر و تسبیح کے لیے اس میں مہوک کی بھنبھناہٹ کی طرح ایک بھنبھناہٹ تھی۔[4]

---

[1] تفسیر الطبري (٣٥/٢٢) یہ روایت مرسل ہے۔
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٢٨٩/١٠) تفسیر ابن کثیر (١٨٠،١٧٩/٤)
[3] تفسیر الطبري (٣٥،٣٤/٢٢)
[4] تفسیر ابن کثیر (١٨٠)

امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ عزوجل کے نزدیک قوم فرعون ذلیل تر تھی اور اس قابل نہ تھی کہ آسمان و زمین ان پر روئیں۔ مستورد بن سابق کہتے ہیں کہ میں نے اپنے استاد عبید مکتب سے کہا، جو ابراہیم سے راوی ہیں، کیا آسمان و زمین مومن پر نہیں روتے ہیں؟ امام عبید رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ تو اس کا وہ مقام ہے جہاں سے اس کا عمل چڑھتا ہے۔ کہا اور تو جانتا ہے کہ آسمان کا رونا کیا ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ کہا: "تَحْمَرُّ وَتَصِيرُ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ" یعنی سرخ ہو اور گلابی ہو جائے، جیسے: تیل کی تلچھٹ۔ بے شک یحییٰ بن زکریا علیہ السلام جب قتل کیے گئے تو آسمان سرخ ہو گیا اور خون ٹپکایا اور بے شک سیدنا حسین رضی اللہ عنہ جب قتل کیے گئے تو آسمان سرخ ہو گیا۔[1] نیز ابن ابی حاتم نے یزید بن ابی زیاد سے روایت کیا کہ جب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ قتل کیے گئے تو آسمان کے اطراف چار مہینے سرخ رہے۔ یزید رحمہ اللہ نے کہا: اس کا سرخ ہونا اس کا رونا ہے۔ اسی طرح امام سدی کبیر رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔

امام عطا خراسانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کا رونا یہ ہے کہ اس کے اطراف سرخ ہو جائیں[2] اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے مقتل میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس دن نہیں لوٹا جاتا تھا کوئی پتھر مگر اس کے نیچے تازہ خون پایا جاتا تھا اور سورج کو گہن لگا اور اُفق سرخ ہو گیا اور پتھر گر پڑے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ان سب قولوں میں نظر ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ سب شیعہ کے خسف اور کذب سے ہے، تاکہ اس امر کی عظمت بیان کریں۔ اور کچھ شک نہیں کہ یہ ایک امرِ عظیم ہے، لیکن یہ بات جو اپنی طرف سے بنائی اور جھوٹ کہی واقع نہیں ہوئی۔

دیکھو جو امر حسین رضی اللہ عنہ کے قتل سے زیادہ عظیم تھا وہ واقع ہو چکا ہے، حالاں کہ یہ باتیں جو ذکر کی ہیں، ان میں سے کوئی بھی واقع نہیں ہوئی، کیوں کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے والد ماجد علی رضی اللہ عنہ قتل کیے گئے اور وہ بالاجماع ان سے افضل تھے، حالاں کہ ان امور میں سے کوئی امر بھی واقع نہ ہوا اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ محصور و مظلوم ہو کر قتل کیے گئے اور ان میں سے کچھ نہ ہوا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ صبح کی نماز میں محراب میں قتل کیے گئے اور مسلمانوں پر اس سے پہلے کوئی مصیبت نہیں آئی، حالاں کہ ان میں سے کچھ نہ ہوا۔ اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حالانکہ دنیا اور آخرت میں سید البشر ہیں، جس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو امورِ مذکورہ میں سے کوئی امر نہیں ہوا۔ اور جس دن ابراہیم رضی اللہ عنہ فرزندِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال کیا، اس دن سورج گہن لگا تو لوگ بولے کہ ابراہیم رضی اللہ عنہ کی موت کی وجہ سے اس کو گہن لگا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کسوف کی نماز پڑھائی اور ان کو خطبہ سنایا اور ان سے یہ بات بیان کر دی کہ سورج اور چاند کو کسی کی موت کے سبب سے اور کسی کی حیات کے سبب سے گہن نہیں لگتا۔[3]

کاتب الحروف ۔عفا اللہ عنہ۔ عرض کرتا ہے کہ طی الفراسخ میں بھی آسمان و زمین کے رونے کا ذکر ہے اور

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۲۸۹/۱۰) [2] تفسیر الطبري (۳۳/۲۲)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۰۱۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۱۵) تفسیر ابن کثیر (۱۸۰/٤، ۱۸۱)

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے آسمان کا سرخ ہونا مذکور ہے۔ شرح الصدور وشرح برزخ سے وہ اقوال لکھے گئے ہیں اور شاہ عبدالعزیز صاحب ۔قدس سرہ۔ نے بھی یہی اقوال سر الشہادتین میں تحریر فرمائے ہیں، لیکن اس وقت حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی تحقیق پر اطلاع نہ تھی کہ یہ بھی وہاں لکھ دی جاتی، چونکہ یہ تقریر نہایت عمدہ ہے، اس لیے عرض ہے کہ جن لوگوں کے پاس طی الفراغ ہے وہ اقوالِ مذکورہ کے بعد اس تقریر کو ضرور لکھ دیں "وَالسَّلَامُ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَى وَتَجَنَّبَ عَنْ سَبِيلِ الْغَيِّ وَالرَّدٰى"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِينِ ۝ مِن فِرْعَوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک بنی اسرائیل پر اس انعام کا احسان رکھتا ہے کہ فرعون نے جو اُن کو ذلیل وخوار کیا تھا اور ذلیل اور دشوار کام کے بیگار میں ان کو لگا رکھا تھا، اس سب سے ان کو نجات دی۔ ﴿ إِنَّهُ كَانَ عَالِيًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ فرعون متکبر اور جبار عنید تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ ﴾ [القصص: ٤] "یقیناً فرعون نے زمین میں سرکشی کر رکھی تھی۔" نیز فرمایا: ﴿ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا عَالِينَ ﴾ [المؤمنون: ٤٦] "چنانچہ انھوں نے تکبر کیا اور تھے ہی وہ سرکش لوگ۔" قولہ تعالیٰ: ﴿ مِنَ الْمُسْرِفِينَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اپنے کام میں حد سے بڑھنے والا اور اپنے نفس پر سخیف الرای (کم عقل) تھا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدِ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی ہم نے ان کو جان بوجھ کر ان لوگوں پر پسند کیا جن کے درمیان میں وہ تھے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اپنے اس زمانے کے لوگوں پر اختیار کیے گئے اور کہا جاتا تھا کہ ہر زمانے کے لیے ایک عالم ہے۔[1] یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ قَالَ يَا مُوسَىٰ إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ ﴾ [الأعراف: ١٤٤] "ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ! میں نے اور لوگوں پر تم کو امتیاز دیا ہے۔" یعنی اے موسیٰ! میں نے تیرے اس زمانے کے لوگوں پر تجھ کو پسند کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مریم علیہا السلام سے کہا تھا:

﴿ وَاصْطَفَاكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ ﴾ [آل عمران: ٤٢] "اور سارے جہاں کی عورتوں میں سے تیرا انتخاب کر لیا۔"

مراد ان کے زمانے کی عورتیں ہیں، اس لیے کہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا یا تو مریم علیہا السلام سے افضل ہیں یا فضیلت میں ان کے برابر ہیں اور اسی طرح آسیہ بنت مزاحم زنِ فرعون۔ اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی عورتوں پر فضیلت اس طرح ہے جس طرح ثرید کی فضیلت باقی طعام پر ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَآتَيْنَاهُم مِّنَ الْآيَاتِ مَا فِيهِ بَلَاءٌ مُّبِينٌ ﴾ یعنی اور دی ہم نے ان کو حجتوں، برہانوں اور خوارقِ عادات سے وہ شے جس میں اس شخص کے لیے ظاہر اور واضح آزمائش ہے جو اس سے راہ یاب ہو۔[2] (كذا في ابن كثير)

---

[1] تفسير الطبري (٣٧/٢٢) [2] تفسير ابن كثير (١٧٨/٤، ١٨١)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿فَتَنَّا﴾ کو کسی نے بہ تشدید پڑھا ہے مبالغے کی بنا پر، یا تکثیر کی بنا پر اس کے متعلق کی کثرت کے لیے، یعنی البتہ مقرر ہم نے ان عرب لوگوں سے پہلے فرعون کی قوم کو فرعون کے ساتھ جانچا، تاکہ ان کی گذشتہ خبر ان کے لیے عبرت ہو جائے۔ اس جگہ فتنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے فرعون والوں کی طرف اپنے رسول بھیجے اور جو امور ان کے لیے مشروع کیے، ان کا ان کو امر کیا۔ چنانچہ قوم نے ان کو جھٹلایا۔ یا یہ معنی ہیں کہ ان پر روزی فراخ کی، جس سے وہ طاغی، باغی اور سرکش ہو گئے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "بَلَوْنَاهُمْ" یعنی ہم نے ان کا امتحان کیا اور ان کے ساتھ ممتحن جیسا سلوک کیا، یعنی آزمانے والے کا سا ان سے معاملہ کیا، اس طرح سے کہ ان کی طرف رسول بھیجے اور زمین میں ان کو جماؤ دیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ﴾ یعنی ان کے پاس رسول آیا جو عزت والا تھا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور اپنی قوم میں باعزت تھا، یعنی اپنی ذات میں حسب نسب والا تھا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کے سردار اور شریف لوگوں میں سے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "حَسَنُ الْخُلُقِ بِالتَّجَاوُزِ وَالصَّفْحِ" یعنی کریم کے یہ معنی ہیں کہ خوش خلق تھا، قوم کی لغزشوں سے عفو و درگزر کرتا تھا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنے رب پر کریم تھا، اس لیے کہ نبوت اور اپنا کلام سنانے کے ساتھ اس کو مختص کیا تھا۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ رسول موسیٰ علیہ السلام ہیں۔[2]

﴿اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ﴾ کلمہ ﴿اَنْ﴾ تفسیر یہ ہے، اس لیے کہ جو شے قول کے معنی میں ہے وہ سابق ہو چکی ہے، یعنی رسولِ کریم ﷺ کا آنا۔ یا ﴿اَنْ﴾ مخففہ ہے ثقیلہ سے۔ "أَيْ: أَنَّ الشَّانَ وَالْحَدِيْثَ أَدُّوْا". یا مصدریہ ہے: "أَيْ: بِأَنْ أَدُّوْا" مطلب یہ ہے کہ اس رسول نے قومِ فرعون سے یہ درخواست کی کہ بنی اسرائیل کو اس کے سپرد کر دیں جن کو فرعون نے غلام بنا لیا تھا۔ چنانچہ ان کا ادا کرنا اطلاق اور ارسال کے معنی میں استعارہ ہے، یعنی بنی اسرائیل کو رہا کر دیں اور اس کے ساتھ بھیج دیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں: معنی یہ ہیں کہ میرے ساتھ اللہ کے بندوں کو بھیج دو اور ان کو عذاب سے رہا کر دو۔[3] اس بنا پر ﴿عِبَادَ اللّٰهِ﴾ مفعول بہ ہے، جیسا کہ سورت طٰہٰ کی اس آیت میں ہے: ﴿فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ﴾ [طٰہٰ: ٤٧] "ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے اور ان کی سزائیں موقوف کر۔" کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اے اللہ کے بندو! میری طرف ادا کرو اللہ کے وہ حق جو تم پر واجب ہوئے ہیں۔ اس بنا پر ﴿عِبَادَ اللّٰهِ﴾ منصوب ہے، اس وجہ سے کہ منادیٰ مضاف ہے اور ﴿عِبَادَ﴾

---

[1] فتح القدير (٧٤٨/٤) [2] فتح القدير (٧٥٢/٤) [3] تفسير القرطبي (١٣٤/١٦)

سے مراد قبطی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ میری طرف اپنے کان پہنچاؤ، تاکہ میں تم کو اپنے رب کی رسالت پہنچاؤں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: میری پیروی کرو اس حق کی طرف جس کی طرف میں تم کو بلاتا ہوں۔[1] پھر امرِ مذکور کی وجہ یہ بیان کی: ﴿ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴾ یعنی یہ کام اس لیے کرو کہ بے شک میں تمھاری طرف اللہ کے پاس سے بھیجا گیا ہوں، رسالت پر امانت دار ہوں اور تہمت کیا ہوا نہیں ہوں۔ ﴿ وَاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ﴾ یعنی اور وہ رسولِ کریم ان کے پاس یہ بات لے کر آیا کہ اللہ پر تجبر وتکبر اور زور اور بڑائی مت کرو، اس طور سے کہ اپنی جانوں کو اس کی اطاعت سے اور اس کے رسولوں کی پیروی کرنے سے بڑا سمجھو اور اس کی وحی کی اہانت (توہین) کرو۔ یہ معنی زیادہ واضح ہیں۔ کسی نے کہا: "لَا تَبْغُوْا عَلَى اللّٰهِ" یعنی اللہ پر بغاوت نہ کرو۔ کسی نے کہا: اس پر افتراء مت کرو۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔[2]

فتح القدیر و فتح البیان میں پہلے قول کو زیادہ بہتر کہا ہے۔[3] بغی اور افتراء میں فرق یہ ہے کہ بغی تو فعل سے ہوتی ہے اور افتراء قول سے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول "لَا تَعْثَوْا" بھی مروی ہے،[4] یعنی فساد مت ڈالو۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: "لَا تَتَعَظَّمُوْا" یعنی اللہ پر بڑے مت بنو۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: "لَا تَسْتَكْبِرُوْا" دونوں قولوں میں فرق یہ ہے کہ تعاظم تو مقتدر کا تطاول (تکبر کرنا، گردن اونچی کرنا) ہے اور استکبار، محتقر کا ترفع (حقیر آدمی کا بلندی کو ڈھونڈنا) ہے۔[5] (أفاده الماوردي)

پھر اس نہی کی وجہ یہ ذکر فرمائی: ﴿ اِنِّيْۤ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴾ یعنی تم یہ کام مت کرو، اس لیے کہ بے شک میں تمھارے پاس ایک ایسی ظاہر اور واضح حجت لانے والا ہوں جس کی صحت کا ہر عاقل اقرار کرے گا اور اس کے انکار کی طرف کوئی راہ نہ ہوگی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "بِعُذْرٍ بَيِّنٍ" یعنی ایک کھلا ہوا عذر۔[6] جب کہ پہلا قول زیادہ مناسب ہے اور یحییٰ بن سلام نے بھی یہی کہا ہے۔ جمہور نے ﴿ اِنِّيْۤ ﴾ بہ کسرِ ہمزہ اور کسی نے بہ فتحِ ہمزہ بہ تقدیرِ لام پڑھا ہے۔ پھر جب ان کو قتل کی وعید سنائی تو اللہ سے پناہ مانگی اور کہا: "وَإِنِّي عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ أَنْ تَرْجُمُوْنِ، أَيْ: مِنْ أَنْ" یعنی میں اپنے اور تمھارے رب کی پناہ میں آیا اس سے کہ تم مجھے قتل کرو۔ باقی اقوال پہلے گزر چکے ہیں۔

﴿ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴾ یعنی اگر تم میری تصدیق نہیں کرتے اور میری نبوت کا اقرار نہیں کرتے اور بہ سبب میری برہان کے اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے۔ اس بنا پر ﴿ لِيْ ﴾ میں حرفِ لام لام الاجل ہے، یعنی علت کا لام۔ کسی نے کہا: لام بہ معنی حرفِ باء ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ﴾ [العنكبوت: ٢٦]

[1] تفسير الطبري (٢٤/٢٢) [2] تفسير الطبري (٢٦/٢٢) [3] فتح القدير (٧٤٩/٤) فتح البيان (٣٩٧/١٢)
[4] تفسير القرطبي (١٣٥/١٦) [5] فتح القدير (٧٥٢/٤) [6] تفسير الطبري (٢٦/٢٢) فتح القدير (٧٥٢/٤)

''پس ابراہیم علیہ السلام پر لوط علیہ السلام ایمان لائے۔'' ''أَيْ: بِهٖ'' یعنی اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو مجھے چھوڑ دو اور مجھ سے ایذاء کے ساتھ پیش نہ آو۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: ''دَعُوْنِيْ كِفَافًا لَا عَلَيَّ وَلَا لِيُ''[1] یعنی مجھے برابر سرابر چھوڑ دو، نہ مجھے ضرر دو نہ نفع پہنچاؤ۔ کسی نے کہا: تم مجھ سے کنارے ہو جاؤ اور میں تم سے کنارے ہو جاؤں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فیصلہ کرے۔ کسی نے کہا کہ میری راہ چھوڑ دو۔

یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے[2] اور اس کے معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ پھر جب فرعون کی قوم نے ان کی تصدیق نہ کی اور نہ ہی ان کی دعوت کا جواب دیا تو دعا کرنے کے لیے اپنے رب کی طرف رجوع ہوئے، جس طرح کہ اللہ پاک نے ان کی طرف سے بیان فرمایا ہے: ﴿ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴾۔ جمہور نے بہ فتحِ ہمزہ پڑھا ہے بنا بر اضمارِ حرفِ جر ''أَيْ: بِأَنَّ'' اور حسن رحمہ اللہ وغیرہ، (یعنی امام ابن ابی اسحاق اور عیسی بن عمر رحمہم اللہ) نے بہ کسرِ ''إِنَّ'' بنا بر اضمارِ قول ''أَيْ: قَالَ: إِنَّ'' پڑھا ہے۔ اس جگہ کلام میں حذف ہے: ''أَيْ: فَكَفَرُوْا وَدَعَا رَبَّهٗ''[3] اور ﴿ مُّجْرِمُوْنَ ﴾ سے مراد ''کافرون'' ہے، یعنی پھر قومِ فرعون نے کفر کیا تو اس نے اپنے رب کو یوں پکارا کہ بے شک یہ لوگ ایک کافر قوم ہیں۔ اس قول کا نام دعا رکھا باوجود اس کے کہ انھوں نے ذکر نہیں کیا مگر صرف ان کے مجرم ہونے کا، تو اس لیے کہ وہ اس کی وجہ سے بددعا کے مستحق ہو چکے تھے۔ کسی نے کہا: ان کی دعا یہ تھی: ''اَللّٰهُمَّ عَجِّلْ لَهُمْ مَا يَسْتَحِقُّوْنَهٗ بِأَجْرَامِهِمْ'' یعنی اے اللہ! ان کے لیے وہ شے جلدی کر جس کے وہ اپنے جرموں کے سبب سے مستحق ہیں۔ کسی نے کہا: وہ دعا یہ ہے: ﴿ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [يونس: ٨٥] پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

بالجملہ اللہ پاک نے ان کی دعا قبول فرمائی اور یہ حکم دیا: ﴿ فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴾ یہ جملہ بہ تقدیرِ قول ہے: ''أَيْ: فَقَالَ اللّٰهُ لِمُوْسَى: أَسْرِ بِعِبَادِيْ... الخ'' یعنی پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: میرے بندوں کو یعنی بنی اسرائیل کو رات میں لے نکل، بے شک فرعون اور اس کے لشکر تمھارا پیچھا کریں گے۔ فرعون کا ان کے بعد نکلنا کئی جگہ گزر چکا ہے۔ محاورے میں ''سَرَى'' اور ''أَسْرَى'' بولتے ہیں: دونوں لغتِ جید ہیں۔ جمہور نے ''أَسْرِ'' بہ قطعِ ہمزہ پڑھا ہے ''أَسْرَى'' سے اور اہلِ حجاز نے بہ وصلِ ہمزہ پڑھا ہے ''سَرَى'' سے۔ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اہلِ حجاز کی موافقت کی ہے۔

پھر دوسرا امر فرمایا: ﴿ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ﴾ یعنی اور چھوڑ تو دریا کو ساکن۔ جب دریا تھما ہوتا ہے ہلتا نہیں ہے تو بولتے ہیں: ''رَهَا يَرْهُوْ رَهْوًا''۔ امام جوہری رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''يُقَالُ: اِفْعَلْ ذٰلِكَ رَهْوًا أَيْ: سَاكِنًا عَلٰى

[1] تفسير القرطبي (١٣٥/١٦) [2] فتح القدير (٧٥٢/٤) [3] فتح القدير (٧٤٩/٤)

هَيْئَتِكَ" یعنی تو اس کام کو کر اس حال میں کہ تو اپنی ہیئت پر ساکن ہو اور "عَيْشٌ رَاهٍ أَيْ: سَاكِنٌ وَرَهَا الْبَحْرُ، سَكَنَ" امام ہروی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ لغت میں یہی معنی معروف ہیں، یعنی تو دریا کو اس کی صفت پر ساکن چھوڑ اس کے بعد کہ تو نے اپنے عصا سے اس کو مارا ہے اور اس کو یہ حکم مت دے کہ جیسا تھا ویسا ہو جائے، تاکہ تیرے بعد اور بنی اسرائیل کے بعد جب آلِ فرعون اس میں داخل ہوں تو وہ ان پر برابر ہو جائے اور وہ ڈوب جائیں۔

امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: "رَهَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ يَرْهُو رَهْوًا أَيْ: فَتَحَ" یعنی اس نے اپنے دونوں پاؤں کو کشادہ کیا، کہا اور اسی باب سے ﴿ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ﴾ ہے، یعنی تو اس کو اسی طرح منفرج اور کشادہ چھوڑ، جیسا وہ تمھارے اس میں داخل ہونے کے بعد تھا۔ اسی طرح امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے اور امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ امام ابن عرفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ دونوں قول ایک معنی کی طرف راجع ہیں گو ان کے الفاظ مختلف ہیں، اس لیے کہ جب دریا کا بہنا ساکن ہوا تو وہ منفرج ہو گیا۔ امام ہروی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ رَهْوًا ﴾ موسیٰ علیہ السلام کی نعت ہو۔ "أَيْ: سِرْ سَاكِنًا عَلَى هَيْئَتِكَ" یعنی تو اپنی ہیئت پر تھما ہوا چل۔ کعب اور حسن رحمہما اللہ نے کہا: ﴿ رَهْوًا ﴾ "طَرِيْقًا"۔

امام ضحاک اور ربیع رحمہما اللہ نے کہا: "سَهْلًا"۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "يَبَسًا"[1] اس قول کی طرح: ﴿ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ﴾ "اور ان کے لیے دریا میں خشک راستہ بنا لے۔" بر ہر تقدیر معنی یہ ہیں: "أُتْرُكْهُ ذَا رَهْوٍ أَوِ اتْرُكْهُ رَهْوًا" یعنی تو دریا کو صاحبِ سکون چھوڑ، یا تو اس کو چھوڑ، سکون اس بنا پر کہ مصدر کے ساتھ وصف کرنے میں مبالغہ کیا مثل "زَيْدٌ عَدْلٌ" کے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول ﴿ رَهْوًا ﴾ کی تفسیر میں "سَمْتًا" ہے[2] (سمت بہ معنی راہ وروش نیکو۔ كذا في الصراح)۔ ایک قول پہلے گزر چکا ہے اور ایک یہ ہے: "أَنْ يَتْرُكَ كَمَا كَانَ" یعنی ویسا چھوڑ دیا جائے، جیسا تھا۔ پھر امرِ مذکور کی یہ علت بیان فرمائی: ﴿ إِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ﴾ "إِنَّ" کو کسی نے بہ فتح پڑھا ہے بر تقدیر "لِأَنَّهُمْ" یعنی تو دریا کو ویسا ہی چھوڑ دے، جیسا ہے، اس لیے کہ فرعون اور اس کا لشکر تمھارے نکلنے کے بعد ایک غرق کیا ہوا گروہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ڈوبنے کے وصف میں خوب کامل ہیں، گو ان کا ایک وصف قوت اور جتھہ بندی ہے جس کی شان قوت اور دلیری ہے جو کاموں میں علو اور غلبہ کی موجب ہوتی ہے مگر یہ وصف ان کے کچھ کام نہ آئے گا اور وہ اس قوت وشوکت کے باوجود سب کے سب دریا برد ہوں گے۔ جمہور نے ﴿ إِنَّهُمْ ﴾ بالکسر پڑھا ہے بنا بر استیناف، غرق کی خبر دینے کے لیے۔ اللہ پاک نے اس کی خبر دی تاکہ ان کا دل ساکن اور مطمئن ہو جائے۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٣٧/١٦) فتح القدير (٧٤٩/٤، ٧٥٠) [2] تفسير الطبري (٢٩/٢٢)

﴿ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴾ کلمۂ ﴿ كَمْ ﴾ خبریہ مفیدِ تکثیر اور مفعول بہ ہے۔ "أَيْ: تَرَكُوْا أُمُوْرًا كَثِيْرَةً" اس سے پہلے "فَأُغْرِقُوْا" مقدر ہے، یعنی پھر وہ سب ڈبو دیے گئے اور پانی سے سیدھے جہنم رسید ہوئے اور اپنا بہت سا عیش وعشرت کا ساز وسامان دوسروں کے لیے چھوڑ گئے جس کا بیان اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے کلام سے یوں فرمایا ہے: ﴿ مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴾ یعنی ہرے بھرے اور میووں سے لدے ہوئے باغ اور بہتے ہوئے چشمے اور مقامِ کریم۔

جمہور نے "مَقَامُ" بہ فتحِ میم پڑھا ہے، اس بنا پر کہ اسمِ مکان ہے، یعنی قیام گاہ خاص اور امام ابن ہرمز، قتادہ اور ابن سمیفع رحمہ اللہ نے بہ ضمِ میم پڑھا ہے بنا بر اسمِ مکان اقامت۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ﴿ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴾ منابر ہیں۔[2] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے بھی اس کے مثل مروی ہے۔[3] کسی نے کہا: ﴿ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴾ سے مراد منازلِ حسنہ، مجالسِ شریفہ اور محافلِ مزینہ ہیں جو اُن کے واسطے تھے۔ ﴿ نَعْمَةٍ ﴾ بہ فتحِ نون بہ معنی تنعم ونضارت ولذاذتِ عیش ہے، یعنی آرام وآسایش کی تر وتازگی ولذت ومزہ۔ "يُقَالُ: نَعَّمَهُ اللّٰهُ وَنَاعَمَهُ فَتَنَعَّمَ" اور بہ کسرِ نون بہ معنی منت ہے اور وہ شے جس کا تجھ پر انعام کیا گیا۔ "وَفُلَانٌ وَاسِعُ النِّعْمَةِ أَيْ: وَاسِعُ الْمَالِ"

امام جوہری رحمہ اللہ نے اس کے یہ معنی ذکر کیے ہیں۔ امام محلی رحمہ اللہ نے ﴿ نَعْمَةٍ ﴾ کی تفسیر "مُتْعَةٍ" ذکر کی ہے،[4] یعنی وہ امور جن سے تمتع ونفع لیتے ہیں، جیسے: پوشاک اور سواری۔ جمہور نے "فَاكِهِيْنَ" بہ الف پڑھا ہے اور امام ابو رجاء رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی حسن، ابو الاشہب، اعرج، ابو جعفر اور شیبہ رحمہ اللہ) نے بغیر الف پڑھا ہے۔ پہلی قراءت کی بنا پر معنی یہ ہیں: "مُتَنَعِّمِيْنَ طَيِّبَةً أَنْفُسِهِمْ" یعنی وہ عیش وعشرت جس میں مزے اٹھاتے تھے اور خوش دل تھے۔ اور دوسری قراءت کی بنا پر "أَشِرِيْنَ بَطِرِيْنَ" یعنی وہ نعمت جس میں تبختر اور مال مستی کرتے اور اتراتے تھے، ہوش وحواس باختہ وسرگشتہ ہو رہے تھے۔ امام جوہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فَكِهَ الرَّجُلُ بِالْكَسْرِ فَهُوَ فَكِهٌ إِذَا كَانَ طَيِّبَ النَّفْسِ مَزَّاحًا وَالْفَكِهُ أَيْضًا الْأَشِرُ الْبَطِرُ فَقَالَ: وَفَاكِهِيْنَ أَيْ: نَاعِمِيْنَ" یعنی "فَكِهٌ" بہ دون الف مردِ خوش طبع وظریف کو کہتے ہیں اور متبختر ومال مست کو بھی۔ اور "فَاكِهٌ" بہ الف وہ ہے جو عیش وآرام میں بسر کرتا ہے۔ امام ثعلبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: "فَاكِهٌ وَفَكِهٌ" دو لغت ہیں، جیسے: "حَاذِرٌ وَحَذِرٌ وَفَارِهٌ وَفَرِهٌ" کسی نے کہا ہے کہ "فَاكِهٌ" وہ ہے جو انواعِ لذت سے نفع لیتا ہے، جس طرح کہ آدمی انواعِ فاکہہ سے تمتع اٹھاتا ہے۔

﴿ كَذٰلِكَ ﴾ محلِ رفع میں ہے بنا بر خبر مبتدائے محذوف۔ امام زجاج نے کہا ہے کہ "أَيْ: اَلْأَمْرُ كَذٰلِكَ"[5] یعنی حال ایسا ہی ہے کہ وہ سب اشیاء چھوڑ گئے۔ یہ بھی جائز ہے کہ محلِ نصب میں ہو بنا بر صفت مفعول مطلق محذوف اور "ذلك" کا اشارہ مصدر فعل کی طرف ہو جس پر کہ ﴿ تَرَكُوْا ﴾ دال ہے۔ "أَيْ: مِثْلَ ذٰلِكَ السَّلْبِ سَلَبْنَاهُمْ إِيَّاهَا"

[1] فتح القدير (٤/٧٥٠) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٨٨) [3] الدر المنثور (٧/٤١١)
[4] تفسير الجلالين (١/٦٥٨) [5] تفسير القرطبي (١٦/١٣٩) فتح القدير (٤/٧٥٠)

یعنی ہم نے ان سے وہ چیزیں چھین لیں اس چھیننے کی طرح۔ کسی نے کہا ہے کہ "مِثْلَ ذٰلِكَ الْإِخْرَاجِ أَخْرَجْنَاهُمْ مِنْهَا"، یعنی ہم نے ان کو ان اشیاء سے اس طرح نکال دیا جس طرح نکالنے کا حق ہے۔ کسی نے کہا: "مِثْلَ ذٰلِكَ الْإِهْلَاكِ أَهْلَكْنَاهُمْ" یعنی ہم نے ان کو ہلاک کیا جس طرح ہلاک کرنے کا حق ہے۔

چنانچہ پہلی وجہ کی بنا پر ﴿ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴾، ﴿ تَرَكُوْا ﴾ پر معطوف ہوگا اور ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ جملہ معترضہ ٹھہرے گا ماقبل کی تقریر وتاکید کے لیے اور اس پر وقف ہوگا۔ معنی یہ ہیں کہ فرعون والے بہت سی اشیاء چھوڑ گئے اور ہم نے اس کا وارث ایک قوم کو کر دیا۔ اور باقی تین وجہوں پر فعل مقدر پر معطوف ہوگا اور ان صورتوں میں ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ پر وقف نہ ہوگا، یعنی فرعون والے بہت سی اشیاء چھوڑ گئے۔ ہم نے ان چیزوں کو ان سے چھین لیا جس طرح کہ چھیننے کا حق ہے اور ہم نے ان کا وارث ایک اور قوم کو کر دیا، اسی کے مثل دو وجہ باقی کے معنی ہیں۔ ﴿ قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴾ سے مراد بنی اسرائیل ہیں، اس لیے کہ اللہ پاک نے ان کو مصر کا مالک بنا دیا، اس کے بعد کہ وہ اس میں غلام بنے ہوئے تھے، پھر وہ اس کے وارث ہوگئے۔ وارث ہونے کے یہ معنی ہیں کہ مصر ان کو ایسے بلاتکلف مل گیا، جیسے وارث کو میراث ملتی ہے۔ یہ قول حسن رحمہ اللہ کا ہے۔ کسی نے کہا کہ بنی اسرائیل مصر کی طرف لوٹ کر نہیں آئے اور ﴿ قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴾ بنی اسرائیل کے سوا کوئی اور قوم ہے۔ یہ قول نہایت درجہ ضعیف ہے۔ (كما قاله الكرخي)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ ﴾ معنی میں "فَأُغْرِقُوا" پر معطوف ہے جو ﴿ كَمْ تَرَكُوْا ﴾ سے قبل مقدر ہے، یعنی چنانچہ وہ غرق کر دیے گئے اور بہت سی اشیائے مذکورہ چھوڑ گئے، پھر نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین۔ یہ اس بات کا بیان ہے کہ ان کے ہلاک ہونے کی کسی کو کچھ پروا نہ ہوئی اور نہ ان کا وجود کسی شمار و قطار میں تھا، جیسے اس کی ضد میں بولتے ہیں: "بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَكَسَفَتْ لِمَهْلِكِهِمُ الشَّمْسُ" یعنی آسمان ان پر رویا اور اُن کے ہلاک ہونے کی وجہ سے سورج گہن ہوگیا۔ آیت کا مقصد ان کی بے قدری کو بیان کرنا ہے، کیوں کہ لوگوں میں یہ دستور ہے کہ جس شخص کے نزدیک جس آدمی کی قدر و منزلت ہوتی ہے تو اس کے مرنے پر وہ روتا ہے اور جس کی اس کو کچھ پروا نہیں ہوتی تو اس کے مرنے پر نہیں روتا۔ چنانچہ رونا اور نہ رونا مسبب ہے اور پروا اور عدمِ پروا سبب ہیں۔ یہاں نہ رونے سے بے پروائی اور بے قدری مراد لی تو یہ مجاز مرسل ہوا کہ مسبب ذکر کیا اور سبب مراد لیا۔

پھر اس کے ساتھ ہی یہ امر ضروری ہے کہ آیت کو استعارہ بالکنایہ کے باب سے ٹھہرائیں، اس طور پر کہ آسمان وزمین کو ایک شخص کے ساتھ تشبیہ دیں کہ جس سے پروا اور عدمِ پروا درست ہوسکتی ہے اور اس شخص مشبہ بہ کا ذکر نہ کریں یہ استعارہ بالکنایہ ہوا۔ پھر پروا اور عدمِ پروا جو مشبہ بہ کے لوازم سے ہے، اس کی نسبت ان کی طرف کریں یہ استعارہ تخییلیہ ہوا۔ عرب کی عادت تھی کہ اپنے سردار کے مرنے کے وقت یوں کہا کرتے تھے: "بَكَتْ لَهُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ"، یعنی وہ ایسا عزت والا تھا کہ اس کے لیے آسمان وزمین روئے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی مصیبت عام ہوئی اس بنا پر یہ معنی ہوئے کہ قومِ فرعون بے قدر تھی اس لائق نہ تھی کہ اس کے حق میں آسمان وزمین کا رونا ذکر کیا

جائے۔ حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کلام میں مضاف محذوف ہے۔ "أَيْ: فَمَا بَكَى عَلَيْهِمْ أَهْلُ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ مِنَ الْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ"[1] یعنی پھر ان پر آسمان اور زمین والے نہ روئے، مراد فرشتے اور آدمی ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان کے گم ہونے اور ہلاک ہونے سے آسمان اور زمین والوں میں سے کوئی بھی رنجیدۂ خاطر نہ ہوا، کیوں کہ وہ بے قدر تھے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آسمان اور زمین کے رونے کا ذکر بطور مذاق کیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ اپنی جانوں کو عظیم سمجھتے تھے اور یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اگر وہ مریں تو آسمان و زمین ان پر روئیں، حالاں کہ وہ اس مرتبے کے نہ تھے، بلکہ اس سے کم تر تھے، چنانچہ یہ بات ان سے تحریہ کرنے کے لیے ذکر کی۔[2] غرضیکہ آسمان و زمین کے رونے میں دو وجہ ہیں: ایک یہی وجہ ہے جس کا بیان کئی طور پر ہوا۔ دوسری وجہ بکائے معروف (عام طور پر رونا) حیوان کا ہے۔ جو احادیث کے لحاظ سے زیادہ ظاہر اور موافق ہے اور نظمِ قرآن کے مطابق یہی وجہ ہے۔ اس بارے میں حدیثیں پہلے گزر چکی ہیں۔

بالجملہ اللہ پاک نے قومِ فرعون کو غرق کر دیا اور بنی اسرائیل کو ان کے مال اسباب کا مالک بنا دیا اور آسمان و زمین ان پر نہ رویا، جیسا کہ مومن پر روتا ہے اور ان کو مہلت نہ ملی، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ﴾ یعنی ان کو نہ توبہ کے لیے تاخیر دی گئی اور نہ ہی کسی اور وقت تک مہلت ملی، بلکہ ان کے کفر کی زیادتی اور عناد کی شدت کے سبب سے ان کو جلد سزا دی گئی۔ غرضیکہ جب ان کو ہلاک کرنے کا وقت آ گیا تو نہ توبہ کے لیے مہلت ملی اور نہ ہی اپنے گناہوں کے تدارک کے لیے وقت ملا۔ چونکہ بنی اسرائیل کا قبطیوں کے ہاتھوں سے رہا کرنا ایک بہت بعید الوقوع کام تھا، اس کا کیا ذکر کہ وہ رہائی ان کے دشمنوں کو ہلاک کر کے حاصل ہو۔ اس لیے اللہ پاک نے اس کا ذکر یہ بتانے کے لیے کیا کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ ایسا ہی اس نبی اور اس کے متبعین کے ساتھ کرے، گو مشرکین اس کو محال سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ﴾ یعنی البتہ واقعی ہم نے بنی اسرائیل کو رہائی بخشی اور ان کے دشمن کو ہلاک کر کے انھیں اس ذلیل کرنے والے عذاب سے نجات دی جس میں وہ مبتلا تھے، اس طرح کہ فرعون نے ان کو غلام بنا لیا تھا، ان کے لڑکوں کو قتل کر دیتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا تھا اور مشقت کے کاموں کی ان کو تکلیف دیتا تھا۔

﴿مِنْ فِرْعَوْنَ﴾ بدل ہے عذاب سے، یا تو بنا بر حذفِ مضاف "أَيْ: مِنْ عَذَابِهِ"، یعنی فرعون کے عذاب سے یا بنا بر مبالغہ۔ گویا خود فرعون ہی عذاب ہے، یا حال ہے عذاب سے، یعنی درآنحالیکہ وہ عذابِ مہین فرعون سے صادر ہونے والا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿مَنْ فِرْعَوْنَ﴾ بہ فتحِ میم پڑھا ہے بنا بر استفہام تحقیری جس طرح کہ کوئی شخص اپنے حسب یا نسب کے ساتھ فخر کرے تو اس سے کہیں "مَنْ أَنْتَ"[3] یعنی تو کون ہے؟ اسی طرح

[1] فتح القدير (٧٥١/٤) [2] اللباب في علوم الكتاب (٣٢٤/١٧) [3] فتح القدير (٧٥١/٤)

یہاں ہے، یعنی کون فرعون؟ حقیر و ذلیل و بے قدر۔

پھر اللہ پاک نے فرعونِ لعین کا حال بیان فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا ﴾ یعنی بے شک وہ تکبر و تجبر میں بلند ہونے والا تھا۔ ﴿ مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴾ یعنی کفر کرنے میں حد سے بڑھنے والوں میں سے تھا اور اس کے ساتھ معاصی کے ارتکاب میں بھی بہت بڑھا ہوا تھا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ ﴾ [القصص: ٤] ''یقیناً فرعون نے زمین میں سرکشی کر رکھی تھی۔'' اس کے اسراف میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے اپنی حقارت، خست اور ذلت کے باوجود خدائی کا دعویٰ کیا۔

پھر جب اللہ پاک نے بنی اسرائیل سے ضرر دور کرنے کی کیفیت بیان کی تو جس شے کے ساتھ ان کا اکرام کیا اس کا ذکر کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی البتہ ہم نے بنی اسرائیل کے مومنین کا حال جان بوجھ کر ان کو ان کے زمانے کے لوگوں پر یقیناً برگزیدہ کیا۔ وہ حال یہ ہے کہ وہ برگزیدہ کرنے کے لائق ہیں، یا یہ کہ کجروی کریں گے اور بعض احوال میں ان سے لغزشیں واقع ہوں گی۔ اور ان کو اختیار کرنے سے یہ مراد نہیں کہ ان کو سارے عالموں پر اختیار کیا اس آیت کے مطابق: ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ [آل عمران: ١١٠] ''تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے۔'' یعنی نبی مکرم ﷺ کی امتِ مرحومہ سب سے افضل ہے۔ کسی نے کہا کہ ﴿ اَلْعٰلَمِيْنَ ﴾ سے مراد کل عالمین ہیں، اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام کی کثرت بنی اسرائیل ہی میں ہوئی، یہ انھیں کا خاصا ہے غیر کے لیے نہیں ہے۔ اس قول کو امام ابن عیسیٰ اور زمخشری رحمہما اللہ وغیرہ نے حکایت کیا ہے۔[1] کسی نے کہا: یہ اختیار اس طرف راجع ہے کہ ان کو غرق ہونے سے بچایا اور فرعون کے بعد مصر کی سرزمین کا ان کو وارث کیا، لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ ﴿ عَلٰى عِلْمٍ ﴾ کا محل نصب ہے بنا بر حالِ فاعل ﴿ اخْتَرْنٰهُمْ ﴾ سے ''أَيْ: حَالَ كَوْنِ اخْتِيَارِنَا لَهُمْ عَلٰى عِلْمٍ مِنَّا'' اور ﴿ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴾، ﴿ اخْتَرْنٰهُمْ ﴾ سے متعلق ہے۔

﴿ وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ ﴾ یعنی ہم نے ان کو موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ایسے معجزے عطا فرمائے جن میں ظاہری امتحان اور واضح آزمائش تھی، تاکہ ہم دیکھیں کہ وہ کیسے اعمال کرتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: آیات یہ ہیں کہ ان کو دریا میں غرق ہونے سے بچانا اسے پھاڑ کر، بادل کا ان پر سایہ کرنا، ان کے لیے من و سلویٰ کا نازل کرنا۔[2] امام ابن زید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیات سے مراد وہ شر ہے جس سے ان کو روکا اور وہ خیر جس کا ان کو حکم دیا۔ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ کا یہ قول ہے کہ ﴿ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ ﴾ نعمتِ ظاہرہ ہے جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ﴾[3] [الأنفال: ١٧] ''اور تاکہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے ان کی محنت کا

---

(1) تفسير القرطبي (١٦/١٤٣) (2) تفسير الطبري (٢٢/٣٨) (3) فتح القدير (٤/٧٥١)

خوب عوض دے۔'' اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَنَبۡلُوكُم بِالشَّرِّ وَالۡخَيۡرِ فِتۡنَةً ﴾[1] [الأنبياء: ۳۵] ''ہم بہ طریقِ امتحان تم میں سے ہر ایک کو برائی بھلائی میں مبتلا کرتے ہیں۔''

بالجملہ جب اللہ پاک نے مشرکینِ قریش سے یہ بات نقل کی کہ انھوں نے نبی اکرم ﷺ سے اعراض کیا اور آپ سے طعن و تشنیع کی اور اس پر ان کو بطشۂ کبریٰ کی تہدید سنائی اور عبرت کے لیے فرعون کی قوم کا قصہ اور ان کی ہلاکت کا ذکر کیا تو اس کے بعد مشرکین کی قبیح باتوں میں سے وہ شے بیان کی جو پہلے سے بھی زیادہ بڑی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تکذیب کرتے ہیں۔ کہتے ہیں نہ مر کر دوبارہ اٹھنا ہے نہ حساب و جزا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ ۝٣٤ إِنْ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ
بِمُنشَرِينَ ۝٣٥ فَأْتُوا بِآبَائِنَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝٣٦ أَهُمْ
خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ أَهْلَكْنَاهُمْ ۖ إِنَّهُمْ
كَانُوا مُجْرِمِينَ ۝٣٧ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا
لَاعِبِينَ ۝٣٨ مَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝٣٩
إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ ۝٤٠ يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى
عَن مَّوْلًى شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۝٤١ إِلَّا مَن رَّحِمَ اللَّهُ ۚ إِنَّهُ
هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝٤٢

بلاشبہ یہ لوگ تو بڑے عزم سے کہتے ہیں: (34) ہمیں مرنا تو بس پہلی بار ہے، اور ہمیں دوبارہ تو نہیں اُٹھایا جائے گا (35) پھر اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادوں کو لے آؤ (36) کیا یہ لوگ بہتر ہیں یا قومِ تبّع اور وہ لوگ جو اُن سے پہلے ہوئے؟ ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، بلاشبہ وہ مجرم تھے (37) اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے، اسے کھیل تماشا کے طور پر پیدا نہیں کیا (38) ہم نے یہ دونوں تو حق (ایک مقصد) ہی کے ساتھ پیدا کیے ہیں اور لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے (39) بلاشبہ فیصلے کا دن ان سب کے لیے طے شدہ ہے (40) اس دن کوئی دوست کسی دوست کے کچھ کام نہیں آئے گا اور نہ ان کی مدد ہی کی جائے گی (41) سوائے اس کے جس پر اللہ نے رحم کیا۔ بلاشبہ وہ نہایت غالب، خوب رحم کرنے والا ہے (42)

[1] فتح البيان (۳۹٦/۱۲-۴۰۳)

قیامت کے منکرین کی تردید:

تبع یمن کا بادشاہ تھا، اس کی سب قوم بت پرست تھی۔ اس کو تورات پر یقین آیا، اپنی قوم کے سامنے آزمایا کہ سچا دین کون سا ہے، ایک بڑی آگ جلائی۔ یہود کے دو حبر (عالم) تورات بغل میں لے کر اس میں گھس گئے وہ جلے نہیں۔ بت پرست بت کو بغل میں لے کر چلے تو جلنے لگے، اُلٹے بھاگے۔ اس کی قوم اس کی دشمن ہوگئی۔ بالآخر خراب ہوئی۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک مشرکوں کا اس بات میں رد کرتا ہے کہ بعث اور معاد کا انکار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ وہاں اس دنیا کی حیات کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور مرنے کے بعد کوئی حیات نہیں ہے، نہ جی کر اُٹھنا ہے اور نہ قبروں سے نکلنا ہے اور ان کے اگلے باپ دادا جو گئے تو پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ ان سے حجت پکڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر مر کر دوبارہ زندہ ہونا حق ہے تو ہمارے باپ دادوں کو لے آؤ، اگر تم سچے ہو۔ یہ ایک باطل حجت اور غلط قسم کا شبہہ ہے، کیوں کہ معاد جو ہے وہ قیامت کے دن ہوگا، دنیا میں نہ ہوگا، بلکہ اس دنیا کے اپنے انجام کو پہنچ جانے اور فنا ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ ایک نئی پیدایش کر کے عالم کے لوگوں کو دوبارہ لائے گا اور ظالموں کو آتشِ دوزخ کا ایندھن بنائے گا جس دن اے مسلمانو! تم گواہ ہوگے لوگوں پر اور رسول تم پر گواہ ہوگا۔

قوم تبع کون تھے؟

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کو وعید وتہدید کی اور اپنے عذاب اور سزا سے ان کو ڈرایا، کون سا عذاب؟ جو ہرگز نہیں ٹلے گا، جیسا کہ ان کی طرح کے مشرکین اور قیامت کے منکرین پر عذاب نازل ہو چکا ہے، جیسے: تبع کی قوم۔ یہ لوگ سبا والے ہیں۔ جب اللہ پاک نے ان کو ہلاک کیا اور ان کے شہروں کو اُجاڑ ڈالا اور ان کو اور شہروں سے بھگا کر تتر بتر کر دیا، چنانچہ یہ بات سورت سبا میں گزر چکی ہے۔ اس کا شروع مشرکین اور قیامت کے منکرین کے انکار سے کیا گیا ہے، اسی طرح یہاں ان کی تشبیہ قومِ تبع سے دی ہے۔ وہ لوگ عرب تھے اور قحطان سے تعلق رکھتے تھے، جیسے: یہ لوگ عرب ہیں اور عدنان سے تعلق رکھتے ہیں۔ حمیر، یعنی سبا میں جب کبھی کوئی شخص بادشاہ ہوتا تو اس کا نام تبع رکھتے تھے، جیسے: فرس کے بادشاہ کو کسریٰ کہتے ہیں اور روم کے بادشاہ کو قیصر کہتے ہیں اور جو کوئی کافر مصر کا بادشاہ ہوتا تو اس کو فرعون کہتے اور حبشہ کے ملک کے بادشاہ کو نجاشی کہتے تھے، ان کے سوا اور اعلام اور اجناس تھے، لیکن ان تبابعہ میں کوئی تبع اتفاقاً یمن سے نکلا اور شہروں میں چلا پھرا، یہاں تک کہ سمرقند پہنچا اور اس کا ملک اور غلبہ اور لشکر بہت قوی اور عظیم ہوا اور اس کی بادشاہت وسیع شہروں پر پھیل گئی اور اس کی رعایا بہت کثیر ہوگئی، یہی وہ شخص ہے جس نے حیرہ کو شہر بنایا۔

پھر یہ اتفاق ہوا کہ اس نے مدینۂ نبویہ پر گزر کیا۔ یہ زمانۂ جاہلیت میں ہوا، پھر اس نے مدینے والوں سے لڑنا چاہا تو انھوں نے اس کو منع کیا اور دن میں اس سے لڑے اور رات کو اس کی مہمانی کرنے لگے تو وہ ان سے شرمایا اور

ان سے باز رہا اور یہودیوں کے احبار میں سے دو حبر (عالم) اپنے ہمراہ لے گیا، ان دونوں نے اس کو نصیحت کی تھی اور یہ خبر دی تھی کہ اس شہر پر اس کے لیے کوئی راہ نہیں ہے۔ یہ تو اس نبی کی ہجرت گاہ ہے جو آخر زمانے میں ہوگا۔ اس پر وہ وہاں سے واپس آگیا اور ان دونوں کو اپنے ساتھ بلادِ یمن میں لے گیا۔ پھر جب مکہ مکرمہ سے گزرا تو کعبہ مکرمہ کو گرانا چاہا، اس سے بھی انہیں دونوں نے اس کو منع کیا اور اس کو اس گھر کی عظمت کے بارے میں خبر دی اور کہا کہ یہ ابراہیم خلیل علیہ السلام کی بنیاد سے ہے اور آیندہ اس کی ایک عظیم شان ہوگی، اس نبی کے ہاتھوں سے جو آخر زمانے میں مبعوث ہوگا۔

پھر اس نے اس کی تعظیم کی اور اس کا طواف کیا اور اس کو ملاء و وصائل وحبر پہنائے، پھر یمن کی طرف لوٹ گیا اور وہاں کے لوگوں کو اپنے ساتھ یہودی بننے کی دعوت دی۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام کا دین تھا، اس دین پر وہ شخص ہوتا جو ہدایت پر ہوتا، یہ مسیح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے تھا۔ چنانچہ عام اہلِ یمن اس کے ساتھ یہودی ہوگئے۔ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے اپنی کتاب سیرت میں اس قصے کو تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں تبع کا بڑا ترجمہ لکھا ہے، اس میں بہت سی چیزیں ذکر کی ہیں، ان میں وہ باتیں بھی ہیں جو ہم نے ذکر کی ہیں اور وہ بھی ہیں جو ذکر نہیں کیں۔ اور یہ ذکر کیا ہے کہ وہ مصر کا بادشاہ ہوا اور جب گھوڑوں کی حاضری لینا چاہتا تو اس کے لیے دمشق سے یمن تک ان کی صفیں باندھی جاتی تھیں۔

پھر بہ سندِ خود عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا، فرمایا: میں نہیں جانتا کہ اپنے اہل کے لیے حدودِ طہارت ہیں کہ نہیں اور میں نہیں جانتا کہ تبع لعین تھا یا نہیں اور میں نہیں جانتا کہ ذوالقرنین نبی تھا یا بادشاہ اور اُن کے علاوہ کسی اور نے کہا ہے کہ آیا عزیر نبی تھا یا نہیں۔[1] (كذا رواه ابن أبي حاتم عن محمد بن حماد الظهراني عن عبد الرزاق قال الدارقطني: تفرد به عبد الرزاق) پھر امام ابن عساکر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ کیا عزیر نبی تھا یا نہیں اور میں نہیں جانتا کہ تبع کو لعنت کروں یا نہیں۔[2] پھر جو اس کو برا بھلا کہنے اور لعنت کرنے کی ممانعت میں آیا ہے، اس کا ذکر کیا ہے۔ كما سيأتي إن شاء الله تعالى. والله أعلم.

گویا وہ (تبع) کافر تھا، پھر مسلمان ہوگیا اور دینِ کلیم علیہ السلام کی پیروی کی اس شخص کے ہاتھوں پر جو اس وقت احبارِ یہود میں سے حق پر تھا اور مسیح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے تھا اور زمانۂ جرہمیین میں بیت اللہ کا حج کیا اور اس کو ریشم کے ملاء اور وصائل اور حبر پہنائے اور اس پر چھے ہزار اُونٹ قربان کیے اور اس کی تعظیم اور تکریم کی۔ پھر یمن کی طرف لوٹ گیا۔ حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے اس کا قصہ متعدد طرق سے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان لوگوں میں سے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور کعب احبار رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس سب میں مرجع

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٧٤) مستدرك الحاكم (١٧/٢) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] تاريخ دمشق (٣/١١_٥)

انہیں کی طرف ہے اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی طرف بھی اور یہ اثبت، اکرم اور اعلم ہیں اور اسی طرح اس کا قصہ امام وہب بن منبہ اور محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے سیرت میں ذکر کیا، جیسا کہ وہ اس میں مشہور ہے۔ بعض سیاقات میں اس تبع کا ترجمہ حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ پر مختلط ہوگیا ہے دوسرے تبع کے ترجمے کے ساتھ جو اس سے ایک طویل زمانے کے بعد ہوا ہے، کیوں کہ یہ تبع جس کی طرف قرآن شریف میں اشارہ کیا گیا ہے، اس کی قوم اس کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئی، پھر جب وہ مرگیا تو اس کے بعد اس کی قوم پھر سے آگ اور بتوں کی پوجا کرنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب کیا، چنانچہ سورت سبا میں اس کا ذکر کیا ہے اور ہم نے وہاں پر ان کا قصہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ تبع نے کعبے کو لباس پہنایا۔ سعید اس کے برا کہنے سے منع کرتے تھے۔[1] یہ تبع تبعِ اوسط ہے، اس کا نام اسعد ابو کرب بن ملکیکرب یمانی ہے۔ ذکر کیا ہے کہ اس نے اپنی قوم پر تین سو چھبیس برس بادشاہت کی۔ حمیر میں اس سے بڑھ کر کوئی طویل المدت نہیں تھا۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے قریباً سات سو برس پہلے اس نے وفات پائی۔ ذکر کیا ہے کہ جب مدینے کے یہود میں سے دو حبر (عالم) نے اس سے ذکر کیا کہ یہ شہر نبی آخرالزمان کی ہجرت گاہ ہے، جن کا نامِ مبارک احمد ہے تو اس نے اس بارے میں شعر کہے اور اہلِ مدینہ کے پاس امانت رکھے، یہ لوگ ان کے وارث ہوتے اور خلف ان کو سلف سے روایت کرتے رہتے تھے۔ جو لوگ ان کو یاد رکھتے تھے، ان میں ابو ایوب خالد بن زید رضی اللہ عنہ ہیں جن کے گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول فرمایا۔ وہ شعر یہ ہیں:

شَهِدتُّ عَلَى أَحْمَد أَنَّهُ رَسُوْلٌ مِنَ اللّٰهِ بَارِي النَّسَمِ
فَلَوْ مُدَّ عُمُرِيْ إِلَى عُمُرِهِ لَكُنْتُ وَزِيْرًا لَهُ وَابْنَ عَمِّ
وَجَاهَدتُّ بِالسَّيْفِ أَعْدَاءَهُ وَفَرَّجْتُ عَنْ صَدْرِهِ كُلَّ غَمِّ

"میں نے احمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس بات کی گواہی دی کہ بے شک وہ اس اللہ کی طرف سے رسول ہیں جو جانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ چنانچہ اگر میری عمر ان کی عمر تک دراز کی جاتی تو البتہ میں ان کا وزیر اور ان کے چچا کا بیٹا ہوتا اور ان کے دشمنوں سے تلوار کے ساتھ جہاد کرتا اور ان کے سینے سے ہر غم دور کر دیتا۔"

امام ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ صنعا میں ایک قبر کھودی گئی، اسلام کے زمانے میں تو اس میں دو عورتوں کو صحیح و سالم پایا گیا، ان کے سر کے پاس چاندی کی ایک تختی تھی جس پر سونے سے یہ لکھا ہوا تھا: "هٰذَا قَبْرُ حُبَّى وَلَمِيْس وَرُوِيَ حُبَّى وَتُمَاضِرُ اِبْنَتَي تُبَّعٍ مَاتَتَا وَهُمَا تَشْهَدَانِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَا تُشْرِكَانِ بِهِ شَيْئًا وَعَلَى ذٰلِكَ مَاتَ الصَّالِحُوْنَ قَبْلَهُمَا"، یعنی یہ حبی اور لمیس کی قبر ہے اور مروی ہے کہ حبی و تماضر، تبع کی دو بیٹیاں تھیں، جو اس حال میں مریں کہ اس کی گواہی دیتی تھیں کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ اور اس کے ساتھ کسی شے

[1] تفسیر الطبري (٢٢/٤٠)

کو شریک نہ کرتی تھیں اور اسی پر ان سے پہلے کے نیک لوگ مرے۔ ہم نے سورت سبا میں اس بارے میں سبا کے شعر بھی ذکر کیے ہیں۔[1]

امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ کعب کہتے تھے: تبع میں نعت ہے۔ نعت کیا گیا مردِ صالح۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی قوم کی مذمت کی ہے، اس کی مذمت نہیں کی۔ کہا اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں کہ تبع کو گالی مت دو، اس لیے کہ بے شک وہ ایک صالح مرد تھا۔[2] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: مت گالی دو تبع کو، چنانچہ بے شک واقعی وہ اسلام لایا تھا۔[3] (ورواه الإمام أحمد في مسنده عن حسن بن موسى عن ابن لهيعة به) طبرانی نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے: «لَا تَسُبُّوا تُبَّعًا فَإِنَّهُ قَدْ أَسْلَمَ»[4] عبدالرزاق نے عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کیا ہے، میں نہیں جانتا کہ تبع نبی تھا یا غیر نبی۔[5] (وقد تقدم بهذا السند من رواية ابن ابي حاتم كما أورده ابن عساكر لا أدري تبع كان لعينا أم لا، فالله أعلم ورواه ابن عساكر من طريق زكريا بن يحيى المدني عن عكرمة عن ابن عباس موقوفا) عبدالرزاق نے عطاء بن ابی رباح سے روایت کیا ہے کہ تبع کو مت گالی دو، چنانچہ بے شک نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو گالی دینے سے منع کیا ہے۔[6] وَاللّٰهُ تَعَالٰى أَعْلَمُ.

دنیا بے مقصد نہیں ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴾ اللہ پاک اپنے عدل کی اور اپنی ذات کے لعب و بے فائدہ اور باطل سے پاک ہونے کی خبر دیتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۚ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴾ [ص: ٢٧] ''اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو ناحق پیدا نہیں کیا، یہ گمان تو کافروں کا ہے چنانچہ کافروں کے لیے خرابی ہے آگ کی۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴾ [المؤمنون: ١١٥۔ ١١٦] ''کیا تم یہ گمان کیے ہوئے ہو کہ ہم نے تمھیں یونہی بے کار پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے ہی نہ جاؤ گے، اللہ تعالیٰ بادشاہ ہے وہ بڑی بلندی والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی بزرگ عرش کا مالک ہے۔''

پھر فرمایا: ﴿ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ خلائق کے درمیان فیصلہ کر

---

(1) تفسير ابن كثير (١٨٢/٤، ١٨٣) (2) تفسير الطبري (٤٠/٢٢)

(3) مسند أحمد (٣٤٠/٥) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٨٩/١٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٤٢٣)

(4) المعجم الكبير (٢٩٦/١١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٤٢٣)

(5) اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ (6) تفسير الصنعاني (٢٠٩/٣)

دے گا، پھر کافروں کو عذاب کرے گا اور مومنوں کو ثواب دے گا۔ ﴿ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ان کے اگلے پچھلے سب لوگوں کو جمع کرے گا، جس دن کوئی قریبی کسی قریبی کو نفع نہ دے گا، جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ١٠١] ''پس جب کہ صور پھونک دیا جائے گا اس دن نہ تو آپس کے رشتے ہی رہیں گے نہ آپس کی پوچھ گچھ۔'' اور جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۝ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ﴾ [المعارج: ١٠] ''اور کوئی دوست کسی دوست کو نہ پوچھے گا، حالانکہ ایک دوسرے کو دکھا دیے جائیں گے۔'' یعنی اپنے بھائی سے اس کا حال نہ پوچھے گا، حالانکہ ظاہری طور پر اس کو دیکھتا ہوگا۔ ﴿ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ کوئی قریبی اپنے قریبی کی مدد نہ کرے گا اور نہ اس کو کسی اور جگہ یعنی باہر سے کوئی مدد آئے گی۔ ﴿ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴾ یعنی اس دن نفع نہ دے گی کوئی شے مگر اللہ عزوجل کی رحمت اپنی مخلوق پر، بے شک وہ غالب ہے اور وسیع رحمت والا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ بے شک یہ کفارِ قریش البتہ کہتے ہیں کہ یہی جو ہماری پہلی موت ہے کہ ہم دنیا میں مریں گے، اس کے بعد نہ کوئی حیات ہے نہ بعث ہے۔ یہ ﴿ وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ﴾ کے معنی ہیں، یعنی ہم مبعوث نہ ہوں گے۔ نشر کے معنی بعث ہیں۔ "يُقَالُ: أَنْشَرَ اللّٰهُ الْمَوْتَى وَنَشَرَهُمْ إِذَا بَعَثَهُمْ" اس کلام میں دوسری موت کو ثابت کرنے کا ارادہ نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ انجام اور انتہا بس یہی پہلی موت ہے جو دنیا کی زندگی کو ختم کرنے والی ہے۔ امام رازی اور ابن الخطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ ہمیں سخت احوال پیش آنے سے پہلے موت آجائے گی۔ یہ کلام اس پر دال ہے کہ دوسری موت ان کو ہرگز نہیں آئے گی تو اب اس تکلف کی حاجت نہیں ہے جو امام زمخشری رحمہ اللہ نے اس جگہ ذکر کیا ہے۔[2]

پھر جس شخص نے ان کو بعث کا وعدہ دیا، اس پر وہ شے وارد کی جس کو انھوں نے دلیل سمجھا، حالاں کہ وہ ایک بیکار حجت ہے۔ چنانچہ یوں بولے: ﴿ فَاْتُوْا بِاٰبَاۗىِٕنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ یعنی اگر تم سچے ہو بعث کے عقیدے میں جس کے تم قائل ہو اور جس کی ہم کو خبر دیتے ہو تو ہمارے باپ دادوں کو ان کے مرنے کے بعد دنیا میں پھیر لاؤ۔ امام فراء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿ فَاْتُوْا ﴾ کا خطاب صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔[3] رہا جمع کا صیغہ تو یہ ﴿ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴾ [المؤمنون: ٩٩] کی طرح ہے، یعنی خطاب تو ایک کو ہے مگر کثرت خطاب کے لحاظ سے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیرو مسلمانوں کو ہے، تاکہ جمع کا صیغہ بلاتکلف صحیح ہو جائے۔

---

(1) تفسير ابن كثير (١٨١/٤ـ١٨٣) (2) تفسير الرازي (٢١٣/٢٧) (3) تفسير القرطبي (١٤٤/١٦)

پھر اللہ پاک نے ان پر اپنے اس قول سے رد کیا: ﴿ اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ﴾ یعنی کیا وہ قوت اور نعمت میں بہتر ہیں یا تبع حمیری کی قوم جس نے اپنے لشکر لے کر دنیا کا گشت کیا اور اس کے لوگوں کو مغلوب و مقہور کیا اور حیرہ کو شہر بنایا اور سمرقند کی بنیاد ڈالی۔ کسی نے کہا کہ اس کو گرا دیا۔ یہ شخص مومن تھا اور اس کی قوم کافر تھی اور یمن کے بادشاہوں میں سے تھا۔ اس کے متبعین کی کثرت کی وجہ سے اس کا نام تبع رکھا گیا۔ کسی نے کہا ہے کہ یمن کے بادشاہوں میں سے ہر ایک کا نام تبع رکھا جاتا ہے، اس لیے کہ وہ اپنے صاحب کا اتباع کرتا ہے جو اس سے پہلے تھا جس طرح کہ اسلام میں خلیفہ نام رکھا جاتا ہے اور یہ تبع آگ کو پوجا کرتا تھا، پھر مسلمان ہو گیا اور اپنی قوم حمیر کو اسلام کی طرف بلایا تو انھوں نے اس کو جھٹلایا۔ کسی نے کہا ہے کہ قومِ تبع سے مراد سارے تبابعہ ہیں، ایک مخصوص تبع مراد نہیں ہے۔

امام حفناوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ تبع مسلمان ہوا اور آپ ﷺ کی ولادت سے نو سو سال پہلے نبی اکرم ﷺ پر ایمان لایا، جبکہ یہود نے اس کو اپنی کتاب میں سے آپ ﷺ کی خبر دی۔ شہاب نے کہا ہے کہ تبع اکبر ابو کرب ہے، اس کا نام اسعد ہے اور انصار اسی کی طرف منسوب ہیں اور اس کی وصیت کو اپنے باپ دادوں سے محفوظ رکھنے کے سبب سے اسلام کی طرف مبادرت (جلدي، سَبقت) کی۔ اور سب سے پہلے اسی نے کعبے کو لباس پہنایا۔[1] امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ خط اور شعر ابو ایوب خالد بن زید رضی اللہ عنہ کے پاس تھے۔ شعر وہی ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں۔

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ جو خط اس نے لکھا تھا، اس میں یہ تھا: اما بعد! پس بے شک میں ایمان لایا تجھ پر اور تیری کتاب پر جو تجھ پر نازل کی جائے گی اور میں تیرے دین اور ملت پر ہوں اور میں ایمان لایا تیرے رب پر اور ہر شے کے رب پر اور میں ایمان لایا ہر اس شے پر جو تیرے رب سے آئی شرائعِ اسلام میں سے، پھر اگر میں نے تجھے پالیا، تو خوب ہے، اور اگر میں نے تجھے نہ پایا تو تو میرے لیے شفاعت کرنا اور قیامت کے دن مجھے مت بھولنا، چنانچہ بے شک میں تیری اول امت سے ہوں اور میں نے تیرے آنے سے قبل تجھ سے بیعت کی اور میں تیری اور تیرے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر ہوں، پھر اس پر مہر لگائی اور اس پر یہ نقش کیا۔ "لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ" اور اس کے عنوان پر یہ لکھا: "إِلَى مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ نَبِيِّ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ وَرَسُوْلِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ﷺ مَنْ تُبَّعِ الْاَوَّلِ" اس دن سے جس دن تبع مرا اس دن تک جس میں رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے ہزار برس تھے نہ زیادہ نہ کم۔ اس میں اختلاف ہے کہ نبی تھا یا بادشاہ۔

چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ تبع نبی تھا اور کعب نے کہا ہے کہ تبع بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا اور اس کی قوم کہان تھی اور ان کے ساتھ اہلِ کتاب میں سے ایک اور قوم تھی۔ پھر اس نے دونوں فریق کو حکم دیا کہ ہر فریق ایک قربانی کرے تو انھوں نے ایسا کیا، چنانچہ اہلِ کتاب کی قربانی قبول کی گئی تو وہ مسلمان ہو گیا۔ کلبی

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (۱۰/۸)

نے کہا ہے کہ یہ تبع ابوکرب اسعد بن ملکیکرب ہے، اس کا نام تبع صرف اس لیے رکھا کہ اس نے اس شخص کی پیروی کی جو اس سے پہلے تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے پہلے کا نام تبع اس لیے رکھا گیا کہ اس نے قرنِ شمس کا اتباع کیا اور لشکروں کے ساتھ مشرق میں سفر کیا۔[1] انتھیٰ۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ سے مراد عاد وثمود اور ان کی طرح کی کافر امتیں ہیں۔ ﴿ اَهْلَكْنٰهُمْ ﴾ جملہ مستانفہ ہے جو ان کے حال اور انجام کار کے بیان کے لیے ہے۔ ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴾ ان کی ہلاکت کی وجہ ہے۔ اس آیت میں وعیدِ شدید اور تہدید اکید ہے، یعنی کیا قریش دنیا کی قوت اور شان وشوکت اور مال اور عزت کی کثرت اور تعداد میں بہتر ہیں یا قومِ تبع اور ان سے پہلے کے لوگ۔ ہرگز نہیں ان کی نسبت قریش انتہائی ضعیف اور قلیل ہیں۔ اللہ پاک نے ان کو ہلاک کر ڈالا اس سبب سے کہ وہ کافر تھے اور بعث کے منکر تھے۔ چنانچہ جو ان سے بھی ضعیف اور کمزور اور کم قدرت رکھنے والا ہے تو وہ مجرم ہونے کی وجہ سے اپنی ہلاکت کا زیادہ مستحق ہے۔

پھر جب اللہ پاک نے بعث اور جزا کے صحیح ہونے کی قطعی دلیل ذکر فرمائی تو ارشاد فرمایا: ﴿ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴾ یعنی ہم نے آسمان وزمین اور جو شے ان کے درمیان ہے، اس کو اس لیے نہیں بنایا کہ ہم کھیلنے والے ہوں، یعنی ان کو کسی صحیح غرض کے بغیر نہیں بنایا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: ہم نے ان کو اس حال میں نہیں بنایا کہ ہم عبث کرنے والے ہوں اور اس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: "لَاهِيْنَ". کسی نے کہا ہے کہ "غَافِلِيْنَ"، یعنی اس حال میں کہ ہم غفلت کرنے والے ہوں، جمہور نے ﴿ مَا بَيْنَهُمَا ﴾ پڑھا ہے اور امام عمرو بن عبید رحمہ اللہ نے "وَمَا بَيْنَهُنَّ" پڑھا ہے، اس لیے کہ ﴿ اَلسَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ﴾ جمع ہے۔

﴿ مَا خَلَقْنٰهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ ﴾ استثناء مفرغ ہے اعم احوال سے، مگر اس حال میں کہ وہ امرِ حق کے ساتھ ملتبس ہیں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مگر واسطے حق کے۔ اسی طرح امام حسن رحمہ اللہ نے بھی فرمایا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مگر حق کے قائم اور ظاہر کرنے کے لیے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ عدل کے ساتھ، یعنی طاعت پر ثواب اور معصیت پر سزا دینے کے لیے۔ کسی نے کہا ہے کہ "بِالْجِدِّ"، ضد لعب، یعنی مگر ارادے اور قصد کے ساتھ نہ کہ کھیل کے طور پر۔

﴿ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی ان کے اکثر لوگ اپنی قلتِ نظر وغور وفکر کے سبب سے یہ بات نہیں جانتے کہ امر ایسا ہے کہ یہ سب کارخانہ حق بنایا گیا ہے۔ یہ مشرکین ہیں اور اس میں بعث اور حشر کا انکار کرنے والوں کی بڑی جہالت ظاہر ہوتی ہے، اس لیے کہ ان کے انکار سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ساری کائنات ہی باطل ہے اور وہ اس کو ایک معمولی اور آسان بات سمجھتے ہیں، حالاں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ایک عظیم الشان بات ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں حشر کے صحیح ہونے اور واقع ہونے پر دلیل ہے، اس لیے کہ اگر بعث اور جزا نہ ہوتی تو یہ سب مخلوق

[1] تفسير القرطبي (١٦/١٤٥، ١٤٦) [2] تفسير القرطبي (١٦/١٤٧) فتح القدير (٤/٧٥٤)

بے فائدہ ہوتی، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کو پیدا کیا اور ان چیزوں کو پیدا کیا جن سے انسان کی زندگی بسر کرنے کے اسباب منتظم ہوتے ہیں، یعنی یہ آسمان جو ایک اونچا چھت ہے اور زمین کا بچھا ہوا بچھونا اور وہ عجیب مصنوعات اور بدائعِ احوال جو ان دونوں میں اور اُن کے درمیان ہیں، بنائے۔

پھر ان کو ایمان لانے اور اطاعت کرنے کا مکلف ٹھہرایا تو اس بات کا تقاضا تھا کہ اطاعت کرنے والا اور نافرمانی کرنے والا الگ ہوجائیں، اس طرح سے کہ اس کے فضل واحسان کا تعلق تو اطاعت کرنے والے کے ساتھ ہو اور اس کے عدل اور سزا کا تعلق نافرمان سے ہو۔ اور یہ معاملہ دنیا میں تو ہوتا نہیں، اس لیے کہ اس کا زمانہ تھوڑا ہے اور اس کے فوائد ہیچ ہیں جو کسی گنتی اور شمار میں نہیں ہوتے، کیوں کہ اس میں طرح طرح کی آزمایشیں اور تکالیف بھی ملی ہوئی ہیں، چنانچہ ضروری ہوا کہ دوبارہ جی اٹھنا ہو، تاکہ ہر نفس کو اس عمل کا بدلہ دیا جائے جو اس نے کیا ہے۔

﴿ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ یعنی بے شک روزِ قیامت ہی ہے جس میں حق باطل سے جدا کیا جائے گا۔ اس بنا پر کہ اضافت بہ معنی "في" ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ بہ معنی لام ہے، یعنی فیصلے کا دن ان سب کا میقات ہے، ان میں سے کوئی بھی اس سے خارج نہ ہوگا۔ یعنی وہ ایسا وقت ہے جو نیک کو بد سے اور حق پر چلنے والے کو باطل پر چلنے والے سے علاحدہ کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ قراء نے ﴿ مِيْقَاتُهُمْ ﴾ کے رفع پر اتفاق کیا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ اِنَّ ﴾ کی خبر ہے اور اس کا اسم ﴿ يَوْمَ الْفَصْلِ ﴾ ہے۔ امام کسائی اور فراء رحمہ اللہ نے اس کا نصب جائز رکھا ہے، اس بنا پر کہ اس کا اسم ہے اور ﴿ يَوْمَ الْفَصْلِ ﴾ خبر ہے۔[1]

بالجملہ پھر اللہ پاک نے اس دن کا یہ وصف بیان فرمایا: ﴿ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا ﴾ یعنی وہ ایسا دن ہے کہ کوئی قریبی کسی قریبی کو کوئی فائدہ نہ دے، نہ ہی اس سے کچھ دور کر سکے گا۔ ﴿ يَوْمَ ﴾ بدل ہے ﴿ يَوْمَ الْفَصْلِ ﴾ سے، یا اس فعل سے منصوب ہے جس پر فصل دال ہے۔ "أَيْ: يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ"، اور فصل کا معمول نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ دونوں میں اجنبی کے ساتھ فصل واقع ہوگئی ہے۔ ﴿ مَوْلًى ﴾ کا اطلاق ولی پر کیا جاتا ہے اور وہ قریب اور ناصر ہے۔ مختار میں کہا ہے کہ مولیٰ معتِق، معتَق، ابن عم، ناصر، جار اور حلیف،[2] یعنی ابن عم اپنے ابن عم سے کچھ دور نہ کرے گا اور نہ ہی دوست اپنے دوست سے دور کرے گا، پہلا ﴿ مَوْلًى ﴾ مرفوع بہ فاعلیت اور دوسرا مجرور بہ ﴿ عَنْ ﴾۔ دونوں کا اعراب اسم مقصور کا اعراب ہے مثل "فَتًى وَعَصًا وَرَحًى" کے۔

﴿ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴾ میں ضمیر ﴿ مَوْلًى ﴾ کی طرف راجع ہے، گو لفظ میں مفرد ہی ہو، کیوں کہ معنی میں تو جمع ہے، اس لیے کہ نکرہ نفی کے تحت میں واقع ہے اور یہ من جملہ صیغہ ہائے عموم ہوتا ہے اور اس مولیٰ سے مراد دوسرا مولیٰ ہے، کیوں کہ اس سے مراد کافر ہے اور پہلے مولیٰ سے مراد مومن ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جس دن کام نہ آئے مومن مولیٰ کافر مولیٰ کے کچھ۔ چنانچہ یہ آیت اس آیت کی نظیر ہے: ﴿ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ

[1] تفسير القرطبي (١٦/١٤٨) [2] مختار الصحاح (١/٧٤٠)

﴿مِنۡهَا شَفَٰعَةٌ وَّلَا يُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ﴾ [البقرة: ٤٨] یہ جملہ ماقبل کی تاکید ہے، یعنی مومن کافر کی کوئی مدد نہ کرے گا، گو دنیا میں ان کا آپس میں قرابت کا یا دوستی کا کوئی تعلق ہو، یا اس کے سوا اور کسی قسم کا تعلق ہو، جیسا کہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار کو اللہ کے عذاب سے کوئی نہ بچائے گا۔

﴿اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ اللّٰهُ﴾ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ استثناء منقطع ہے۔ "أَيْ: لٰكِنْ مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ"، یعنی لیکن وہ شخص جس پر اللہ مہربان ہو۔ اسی طرح امام فراء رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[1] کسی نے کہا متصل ہے، معنی یہ ہیں کہ کوئی قریبی کسی قریبی کے کام نہ آئے گا مگر مومنین، کیوں کہ ان کو شفاعت کا اذن دیا جائے گا تو وہ اپنے بعض کے حق میں شفاعت کریں گے۔ یا مرفوع المحل ہے بنا بر بدل اول ﴿مَوۡلًى﴾ سے اور ﴿يُغۡنِيۡ﴾ بہ معنی "ينفع" ہے۔ (كما قاله الحوفي) یا مرفوع المحل ہے بنا بر بدل ﴿يُنۡصَرُوۡنَ﴾ کے واو سے، یعنی اللہ کے عذاب سے روکا نہ جائے مگر وہ شخص جس پر اللہ نے رحم کیا۔ (كما ذكره السمين)

﴿اِنَّهٗ هُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ﴾ یعنی بے شک وہ ایسا غالب ہے کہ وہ جس کے عذاب کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ وہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنَا بِرَحْمَتِكَ الَّتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ آمين.

پھر جب یوم فصل کی صفت بیان کرچکا تو اس کے بعد کفار کی وعید کا ذکر فرمایا:[2]

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوۡمِ ﴿٤٣﴾ طَعَامُ الۡاَثِيۡمِ ﴿٤٤﴾ كَالۡمُهۡلِ يَغۡلِيۡ فِي الۡبُطُوۡنِ ﴿٤٥﴾ كَغَلۡيِ الۡحَمِيۡمِ ﴿٤٦﴾ خُذُوۡهُ فَاعۡتِلُوۡهُ اِلٰى سَوَآءِ الۡجَحِيۡمِ ﴿٤٧﴾ ثُمَّ صُبُّوۡا فَوۡقَ رَاۡسِهٖ مِنۡ عَذَابِ الۡحَمِيۡمِ ﴿٤٨﴾ ذُقۡ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡكَرِيۡمُ ﴿٤٩﴾ اِنَّ هٰذَا مَا كُنۡتُمۡ بِهٖ تَمۡتَرُوۡنَ ﴿٥٠﴾ اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِيۡ مَقَامٍ اَمِيۡنٍ ﴿٥١﴾ فِيۡ جَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍ ﴿٥٢﴾ يَّلۡبَسُوۡنَ مِنۡ سُنۡدُسٍ وَّاِسۡتَبۡرَقٍ مُّتَقٰبِلِيۡنَ ﴿٥٣﴾ كَذٰلِكَ وَزَوَّجۡنٰهُمۡ بِحُوۡرٍ عِيۡنٍ ﴿٥٤﴾ يَدۡعُوۡنَ فِيۡهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيۡنَ ﴿٥٥﴾ لَا يَذُوۡقُوۡنَ فِيۡهَا الۡمَوۡتَ اِلَّا الۡمَوۡتَةَ الۡاُوۡلٰى وَوَقٰهُمۡ عَذَابَ الۡجَحِيۡمِ ﴿٥٦﴾ فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّكَ ذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ﴿٥٧﴾ فَاِنَّمَا يَسَّرۡنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ ﴿٥٨﴾ فَارۡتَقِبۡ اِنَّهُمۡ مُّرۡتَقِبُوۡنَ ﴿٥٩﴾

[1] تفسير القرطبي (١٤٨/١٦) [2] فتح البيان (٤٠٤/١٢-٤٠٨)

بے شک تھوہر کا درخت 43 گناہ گار کا کھانا ہے 44 پگھلے تانبے (یا تلچھٹ) کے مانند، وہ پیٹوں میں کھولے گا 45 تیز گرم پانی کے کھولنے کی طرح 46 (حکم ہوگا:) اسے پکڑو اور گھسیٹتے ہوئے جہنم کے درمیان لے جاؤ 47 پھر اس کے سر پر تیز گرم پانی کا عذاب انڈیلو 48 (مزہ) چکھ! بے شک تو بڑا عزت والا، بڑا تکریم والا (بنا پھرتا) تھا 49 بلاشبہہ یہی وہ (عذاب) ہے جس میں تم شک کرتے تھے 50 بے شک متقین سکھ چین کی جگہ ہوں گے 51 باغات اور چشموں میں 52 وہ باریک اور موٹا ریشم پہنیں گے، آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے 53 اسی طرح ہوگا۔ اور ہم غزال چشم (بڑی بڑی آنکھوں والی) حوروں کو ان کی بیویاں بنا دیں گے 54 وہاں وہ اطمینان سے ہر قسم کا پھل طلب کریں گے 55 وہاں وہ موت (کا مزہ) نہ چکھیں گے، سوائے پہلی موت کے اور وہ (اللہ) انھیں دوزخ کے عذاب سے بچالے گا 56 (یہ) آپ کے رب کا فضل ہوگا۔ یہی بہت بڑی کامیابی ہے 57 بس (اے نبی!) ہم نے تو اس (قرآن) کو آپ کی زبان میں آسان کر دیا ہے، تاکہ وہ نصیحت پکڑیں 58 لہٰذا (اب) آپ انتظار کیجیے۔ بلاشبہہ وہ بھی منتظر ہیں 59

روزِ قیامت مشرکین کو دیے جانے والے عذاب:

یہ جو کہا کہ تو تو بڑا ذی عزت اور بڑے اکرام والا تھا، یہ اس لیے کہ وہ دنیا میں اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتا تھا۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اس شے کی خبر دیتا ہے، جس کے ساتھ ان لوگوں کو عذاب کیا جائے گا جو اس سے ملاقات کے منکر ہیں۔ بے شک زقوم کا درخت اس شخص کا کھانا ہوگا جو اپنے قول و فعل میں گناہ گار ہے، یعنی کافر۔ کئی ایک اہلِ علم نے ذکر کیا ہے کہ یہ شخص ابو جہل ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ بھی اس آیت میں داخل ہے، لیکن یہ آیت صرف اسی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ہمام بن حارث سے روایت کیا ہے کہ سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ ایک شخص کو یہ پڑھاتے تھے: ﴿ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ﴾ تو اس نے کہا: "طعام الیتیم" تو سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو یوں کہہ: "اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْفَاجِرِ" یعنی اس کے لیے اس کے سوا اور کوئی کھانا نہیں ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ اگر اس کا ایک قطرہ زمین پر گر پڑتا تو زمین والوں پر ان کے معاش کو بگاڑ ڈالتا۔[1] اسی کے مثل مرفوعاً بھی گزر چکا ہے۔[2] ﴿ كَالْمُهْلِ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ۝ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ﴾ کہا ہے کہ تیل کے تلچھٹ کی طرح پیٹوں میں کھولتا ہے اپنی حرارت اور رداءت کی وجہ سے، گرم پانی کے کھولنے کی طرح ہے۔ ﴿ خُذُوْهُ ﴾ یعنی اس کافر کو پکڑو۔ وارد ہوا ہے

---

(1) تفسیر الطبري (٢٢/٤٣) (2) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٨٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٢٥)

کہ جس وقت اللہ تعالیٰ زبانیہ (فرشتوں) سے کہے گا کہ ﴿ خُذُوْهُ ﴾ تو ان میں سے ستر ہزار اس پر دوڑ پڑیں گے۔
﴿ فَاعْتِلُوْهُ ﴾ یعنی پھر اس کو گھسیٹ کر اور اس کی پیٹھ میں دھکے دے کر اسے ہانکو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ ﴾ "أَيْ: خُذُوْهُ فَادْفَعُوْهُ"[1] یعنی اس کو پکڑو، پھر اس کو دھکیلو۔ فرزدق نے کہا ہے:

لَيْسَ الْكِرَامُ بِنَاحِلِيْكَ أَبَاهُمُ حَتَّى تَرِدَ إِلَى عَطِيَّةَ تُعْتَلُ

﴿ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴾ یعنی اس کو وسطِ دوزخ کی طرف دھکیلو، پھر اس کے سر کے اوپر گرم پانی ڈالو، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۝ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴾ [الحج: ١٩۔ ٢٠] "اور ان کے سروں کے اوپر سے سخت کھولتا ہوا پانی بہایا جائے گا جس سے ان کے پیٹ کی سب چیزیں اور کھالیں گلا دی جائیں گی۔" پہلے گزر چکا ہے کہ فرشتہ لوہے کی موگری سے اس کو مارے گا تو وہ اس کے دماغ کو کھول دے گی، پھر اس کے سر پر گرم پانی ڈالا جائے گا تو وہ اس کے بدن میں اتر جائے گا، پھر وہ اس کے پیٹ سے آنتوں کو سونت ڈالے گا، یہاں تک کہ اس کے ٹخنوں سے نکل پڑیں گی۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ تَعَالَى مِنْ ذٰلِكَ.

قولہ تعالیٰ: ﴿ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴾ یعنی اس سے ملامت اور استہزاء کے طور پر یہ بات کہو۔
امام ضحاک رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، یعنی تو نہ عزیز ہے اور نہ کریم ہے۔[2] اموی نے اپنی مغازی میں عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوجہل -لعنہ اللہ- سے ملے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تجھ سے یہ کہوں: ﴿ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴾ [القيامة: ٣٤۔ ٣٥] "افسوس ہے تجھ پر حسرت ہے تجھ پر۔ وائے ہے خرابی ہے تیرے لیے۔" کہا: پھر اس نے اپنا کپڑا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے کھینچا اور کہا کہ تو اور تیرا صاحب میرے لیے کوئی طاقت نہیں رکھتا اور البتہ تو نے جان لیا ہے کہ میں اہلِ بطحاء میں سے امنع (سب سے زیادہ قوی، سخت) ہوں اور میں عزیز اور کریم ہوں۔ کہا: پھر اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن اس کو قتل کیا اور ذلیل کیا اور اس کی بات کے ساتھ اس کو عار دلائی اور یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴾[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴾ یعنی بے شک یہ وہ شے ہے جس میں تم شک کرتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۝ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ [الطور: ١٣۔ ١٥] "جس دن وہ دھکے دے دے کر آتشِ جہنم کی طرف لائے جائیں گے۔ یہی وہ آتشِ دوزخ ہے جسے تم جھوٹ بتلاتے تھے (اب بتاؤ) کیا یہ جادو ہے؟ یا تم دیکھتے ہی نہیں ہو۔" اور اسی لیے یہاں یوں فرمایا: ﴿ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴾

---

[1] تفسير الطبري (٤٧/٢٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٩٠/١٠) [3] تفسير ابن كثير (١٨٤/٤) یہ روایت مرسل ہے۔

متقین کے لیے جنت کی نعمتیں:

پھر جب اللہ پاک نے بدبختوں کا ذکر کیا تو اس کے بعد نیک بخت لوگوں کا بیان کیا اور اسی لیے قرآن شریف کا نام مثانی رکھا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴾ یعنی بے شک دنیا میں اللہ سے ڈرنے والے آخرت میں مقامِ امین میں ہیں، یعنی جنت میں کہ اس میں جا کر موت اور اس سے نکلنے سے امن میں ہو گئے اور ہر رنج وغم، گھبراہٹ اور ماندگی اور تھکاوٹ سے اور شیطان اور اس کے مکر اور ساری آفتوں اور مصیبتوں سے بے خوف ہو گئے۔ ﴿ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴾ یعنی باغوں میں اور چشموں میں۔ یہ اس کے مقابلے میں فرمایا ہے کہ دوزخ والے زقوم کھائیں گے اور گرم پانی پئیں گے۔

﴿ يَلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ ﴾ ﴿ سُنْدُسٍ ﴾ رفیع حریر (ریشم) ہے جو کرتوں اور اس جیسے لباس کی طرح ہے۔ اور ﴿ اِسْتَبْرَقٍ ﴾ وہ ہے جس میں چمک دمک ہوتی ہے، جیسے: ریاش اور وہ لباس جو کپڑوں کے اوپر پہنا جاتا ہے۔ ﴿ مُتَقٰبِلِيْنَ ﴾ یعنی تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوں گے، ان میں سے کوئی اس طرح نہ بیٹھے گا کہ اس کی پشت اپنے ساتھی کی طرف ہو۔ ﴿ كَذٰلِكَ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴾ یعنی یہ عطا اور بخشش ہے ان بیبیوں کے ہمراہ جو حورِ عین خوبصورت حسین وجمیل ہیں۔ ﴿ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴾ [الرحمن: ٥٦] ''ان کو ان سے پہلے کسی جن وانس نے ہاتھ نہیں لگایا۔'' ﴿ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ﴾ [الرحمن: ٥٨] ''وہ حوریں مثل یاقوت اور مونگے کے ہوں گی۔'' ﴿ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴾ [الرحمن: ٦٠] ''احسان کا بدلہ احسان کے سوا کیا ہے۔'' امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ اگر ایک حور بحرِ لجی میں تھوک دیتی تو البتہ اس کی تھوک کی شیرینی کے سبب سے وہ پانی شیریں ہو جاتا۔[1]

﴿ يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ﴾ یعنی میوں کے اقسام میں سے جو قسم طلب کریں گے وہ ان کے لیے حاضر کر دی جائے گی اور وہ اس کے انقطاع اور ختم ہو جانے سے بے خوف ہوں گے، بلکہ وہ ان کی طرف حاضر کر دی جائیں گی جس وقت وہ ارادہ کریں گے۔ ﴿ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ﴾ یہ استثناء نفی کی تاکید کرتا ہے، اس لیے کہ یہ استثناء منقطع ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس میں موت کو کبھی نہ چکھیں گے، چنانچہ صحیحین میں ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن موت ایک چتکبرے دنبے کی شکل میں جنت اور دوزخ کے درمیان لائی جائے گی، پھر ذبح کر دی جائے گی اور کہا جائے گا: اے جنت والو! خلود ہے (ہمیشہ کا ٹھکانا)

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٩٠) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا، نیز سند میں ''نصر بن مزاحم عطار'' سخت ضعیف راوی ہے۔

اور کوئی موت نہیں اور اے دوزخ والو! خلود ہے اور کوئی موت نہیں ہے۔ ① حدیث سورت مریم میں گزر چکی ہے۔ ②

عبدالرزاق نے ابو سعید اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اہلِ جنت سے کہا جائے گا: بے شک تمھارے لیے یہ ہے کہ تم تندرست رہو کبھی بیمار نہ ہو اور بے شک تمھارے لیے یہ ہے کہ تم جیو، پھر کبھی نہ مرو اور بے شک تمھارے لیے یہ ہے کہ آسودہ رہو اور کبھی محتاج نہ ہو اور بے شک تمھارے لیے یہ ہے کہ جوان رہو اور کبھی بوڑھے نہ ہو۔ ③ (رواه مسلم عن إسحاق بن راهويه و عبد بن حميد كلاهما عن عبد الرزاق به هكذا يقول أبو إسحاق وأهل العراق أبو مسلم الأعز وأهل المدينة يقولون أبو عبد الله الأعز) (اصل سند یہ ہے: "قال عبدالرزاق: حدثنا سفيان الثوري عن أبي إسحاق عن أبي مسلم الأعز عن أبي سعيد... الخ")۔ امام ابوبکر عن ابی داود سجستانی رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ سے ڈرا، وہ جنت میں داخل ہوا، وہ اس میں آسودہ حال رہے گا، محتاج نہ ہو گا، اس میں زندہ رہے گا اور نہ مرے گا، اس کے کپڑے بوسیدہ نہ ہوں گے اور اس کی جوانی فنا نہ ہو گی۔ ④

امام ابو القاسم طبرانی رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے کسی نے پوچھا: کیا اہلِ جنت سوئیں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ خواب برادرِ مرگ ہے اور اہلِ جنت نہ سوئیں گے۔ ⑤ اسی طرح امام ابوبکر بن مردویہ رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «اَلنَّوْمُ أَخُوْ الْمَوْتِ وَأَهْلُ الْجَنَّةِ لَا يَنَامُوْنَ» ⑥ امام ابو بکر بزار رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! کیا اہلِ جنت سوتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، "اَلنَّوْمُ أَخُوْ الْمَوْتِ"۔ پھر امام بزار رحمہ اللہ نے کہا: ہمارے علم کے مطابق اسے ابن المنکدر عن جابر رضی اللہ عنہ کے واسطے سے صرف ثوری ہی نے روایت کیا ہے اور ثوری سے صرف فریابی نے۔ ⑦ انھوں نے ایسے ہی کہا ہے جب کہ اس کے برخلاف پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَوَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ﴾ یعنی باوجود اس عظیم ومقیم نعمت کے اللہ تعالیٰ نے ان کو بچایا اور سلامت رکھا اور ان کو عذابِ الیم سے نجات دی اور اس سے دور رکھا اور انھیں جہنم کے طبقات میں جانے نہیں دیا۔ چنانچہ جس چیز کی طلب تھی وہ تو اُن کے لیے حاصل کر دی اور جس چیز کا خوف تھا اس سے ان کو نجات دی۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ یعنی یہ سب جو ہوا تو محض اللہ کے فضل و احسان کے سبب

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤٩) ② رقم الآية (٣٩)
③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٣٧) ④ المعجم الأوسط (٨٦/٨)
⑤ المعجم الأوسط (٢٨٢/١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٨٧)
⑥ حلية الأولياء (٩٠/٧) ⑦ كشف الأستار عن زوائد البزار (١٩٣/٤)

سے ہوا، چنانچہ صحیح میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: « اِعْمَلُوْا وَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاعْلَمُوْ أَنَّ أَحَدًا لَنْ يُّدْخِلَهُ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ » قَالُوْا: وَلَا أَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، قَالَ ﷺ: « وَلَا أَنَا إِلَّا أَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهِ مِنْهُ وَفَضْلٍ »①

قولہ سبحانہ وتعالیٰ: ﴿ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ یعنی سوا اس کے نہیں کہ ہم نے آسان کیا اس قرآن کو جس کو ہم نے نازل کیا آسان، واضح اور ظاہر کھلا ہوا تیری زبان میں جو سب زبانوں سے زیادہ فصیح وجلی وشیریں اور بلند تر ہے، شاید وہ سمجھیں اور عمل کریں۔ پھر جب باجود اس وضاحت اور بیان کے لوگوں میں ایسے تھے جنھوں نے کفر اور مخالفت اور دشمنی کو اختیار کیا تو اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو تسلی دی اور آپ ﷺ کو مدد اور کامیابی کا وعدہ دیا اور جھٹلانے والوں کو ہلاکت اور تباہی کی وعید سنائی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ﴾ یعنی تو انتظار کر وہ بھی انتظار کرتے ہیں، چنانچہ وہ عن قریب جان لیں گے کہ اللہ کی مدد اور کامیابی کس کے لیے ہوگی اور دنیا اور آخرت میں بول بالا کس کا ہوگا۔ بے شک وہ اے محمد! تیرے لیے ہے اور تیرے بھائی انبیاء ومرسلین ﷺ کے لیے ہے اور مومنوں کے لیے ہے، جنھوں نے تیری پیروی کی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ [المجادلۃ: ۲۱] ''اللہ تعالیٰ لکھ چکا ہے کہ بے شک میں اور میرے پیغمبر غالب رہیں گے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ زور آور اور غالب ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴾ [المومن: ۵۱۔ ۵۲] ''یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد زندگانیِ دنیا میں بھی کریں گے اور اس دن بھی جب گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے جس دن ظالموں کو ان کی (عذر) معذرت کچھ نفع نہ دے گی ان کے لیے لعنت ہی ہوگی اور ان کے لیے برا گھر ہوگا۔'' آخر تفسير سورة الدخان ولله الحمد والمنة وبه التوفيق والعصمة.②

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴾ وہ درخت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے شجرِ دنیا کی شکل پر جہنم میں پیدا کیا ہے اور اس کا نام شجرۂ ملعونہ رکھا ہے۔ زقوم اس کا پھل ہے اور زقوم ہر طعامِ ثقیل ہے۔ شجرۂ زقوم کا بیان سورۃ الصافات میں گزر چکا ہے۔③ غرضیکہ دوزخ والے جب بھوکے ہوں گے تو اس کی طرف مضطر ہوں گے، پھر اس سے کھائیں گے۔ ''شجرت'' بہ تائے مجرورہ لکھا جاتا ہے۔ امام ابو عمرو، ابن کثیر اور کسائی ﷫ نے بہ ہاء لکھا اور اس پر وقف کیا ہے اور باقی قراء نے بہ تاء بنا بر رسم پڑھا ہے۔ (قالہ الخطیب)

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨١٦)
② تفسير ابن كثير (١٨٤/٤۔١٨٦) ③ رقم الآية (٦٢)

تفسیر قرطبی میں ہے کہ ہر شجرہ جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے تو اس پر ہاء کے ساتھ وقف ہے سوائے سورۃ الدخان کے ایک حرف کے ﴿ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴾[1] انتھی. یعنی اس پر بہ تاء اور ہاء کے ساتھ دونوں طرح وقف جائز ہے۔ قاموس میں "زَقْمٌ" اور "زَقُّوْمٌ" پر بہت تفصیل سے کلام ہے، اگر طالب کو زیادہ تحقیق منظور ہو تو اس کی طرف رجوع فرمائے۔ "أثیم" بہ معنی "کثیر الاثم" ہے۔ صحاح میں ہے "أَثِمَ الرَّجُلُ بِالْكَسْرِ يَأْثَمُ إِثْمًا وَمَأْثَمًا إِذَا وَقَعَ فِي الْإِثْمِ فَهُوَ آثِمٌ وَأَثِيمٌ وَمَأْثُومٌ"[2] چنانچہ ﴿ طَعَامُ الْاَثِیْمِ ﴾ کے معنی "طَعَامُ ذِي الْإِثْمِ" ہیں، یعنی گناہ والے کا کھانا۔

"مُهْلٌ" تیل کی تلچھٹ ہے اور قطران کی تلچھٹ۔ کسی نے کہا: پگھلا ہوا تانبا۔ کسی نے کہا: ہر شے جو آگ میں پگھلتی ہے سونا یا چاندی اور ہر پگھلنے والی شے برابر ہے وہ پیتل ہو یا لوہا یا سیسہ۔ کسی نے کہا: پیپ۔ ﴿ یَغْلِیْ فِی الْبُطُوْنِ ﴾ کو جمہور نے بہ تاء پڑھا ہے، اس بنا پر کہ فاعل ضمیر ہے اور شجرہ کی طرف راجع ہے اور جملہ خبر ثالث ہے، یا حال ہے، یا خبر ہے مبتداء محذوف کی۔ "أَيْ: هُوَ يَغْلِيْ" یا "هِيَ تَغْلِيْ" اور ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی حفص، ابن محیصن اور ورش عن یعقوب) نے بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ فاعل ضمیر طعام کی طرف راجع ہے[3] اور طعام شجرہ کے معنی میں شامل ہے۔ "مُهل" کی طرف ضمیر پھیرنا درست نہیں ہے، اس لیے کہ "مُهل" کے ساتھ تو تشبیہ دی گئی ہے اور جو شے جوش مارتی ہے وہ وہ ہے جس کی "مُهل" سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ﴿ كَغَلْیِ الْحَمِیْمِ ﴾ صفت ہے مصدر محذوف کی۔ "أَيْ: غَلْيًا كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ"

﴿ خُذُوْهُ ﴾ یعنی ان فرشتوں سے کہا جائے گا جو جہنم کے داروغے ہیں کہ اس اثیم کو پکڑو۔ ﴿ فَاعْتِلُوْهُ ﴾ "عتل" سختی سے کھینچنے کو کہتے ہیں، جب کوئی کسی کو کھینچ کر مکروہ کی طرف لے جائے تو یوں بولتے ہیں کہ "عَتَلَهُ يَعْتِلُهُ"۔ کسی نے کہا: "عتل" یہ ہے کہ تو آدمی کے کپڑے کے اطراف کو پکڑے، پھر اس کو کھینچے۔ جمہور نے بہ کسرِ تاء پڑھا ہے اور امام نافع، ابن کثیر اور ابن عامر رحمہم اللہ نے بہ ضمِ تاء پڑھا ہے۔ دونوں دو لغت ہیں[4] اور دونوں سبعیہ ہیں۔ ﴿ سَوَآءِ ﴾ بہ معنی وسط و معظم ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ﴾ [الصّافات: ٥٥] "اسے بیچوں بیچ جہنم میں (جلتا ہوا) دیکھے گا۔"

کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیضیہ ہے اور عذاب کی اضافت بیانی ہے، یعنی اس کے سر کے اوپر بعض اس قسم کا عذاب ڈالو کہ وہ حمیم ہے۔ حمیم نہایت درجہ گرم پانی کو کہتے ہیں، یا موصوف کی طرف صفت کی اضافت ہے، یعنی ایسا حمیم کہ عذاب ہے، یا مسبب کی اضافت سبب کی طرف ہے۔ پس جو شے ڈالی گئی وہ حمیم ہے نہ کہ عذاب حمیم۔ "صب" عذاب کا استعارہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: ﴿ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا ﴾ [البقرة: ٢٥٠] "ہمیں صبر دے۔"

[1] تفسير القرطبي (١٤٨/١٦)   [2] الصحاح (١٣٥/٦)
[3] تفسير القرطبي (١٤٩/١٦)   [4] فتح القدير (٧٥٥/٤)

عذاب کو مائع رقیق شے سے تشبیہ دی، پھر اس کی طرف تخییل کے طور پر "صب" کی نسبت کی گئی۔ ﴿ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴾ میں حکم توہین کے لیے ہے۔ کہتے ہیں: ابوجہل یہ زعم کرتا تھا کہ وہ سارے مکے والوں سے بڑھ کر عزت والا اور کریم ہے۔ چنانچہ فرشتوں سے کہا جائے گا کہ اس سے ہنسنے اور سرزنش کرنے کے لیے یوں کہو کہ اے اپنے زعم میں عزیز کریم بننے والے! اور اسی قسم کی بات جو تو کہتا تھا تو اب عذاب چکھ۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: اس بات کے سبب سے جو تو نے دنیا میں کہی۔ جمہور نے ﴿ اِنَّكَ ﴾ بہ کسرِ ہمزہ پڑھا ہے اور امام کسائی رحمہ اللہ نے بہ فتحِ ہمزہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ "أَيْ: لِأَنَّكَ"[1]

﴿ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴾ میں عذاب کی طرف یا امر کی طرف اشارہ ہے۔ جمع کا صیغہ "أثیم" کی جنس کے اعتبار سے ہے، یعنی بے شک یہ عذاب، یا یہ امر وہ شے ہے جس میں تم شک کرتے تھے، جبکہ دنیا میں تھے۔ پھر جب اللہ پاک بدوں کا حال بیان کر چکا تو قرآن شریف کی عادت کے مطابق نیکوں کے مقام کا ذکر فرمایا کہ بے شک جو لوگ کفر و معاصی سے بچے وہ امن والی جگہ میں ہیں۔ جمہور نے ﴿ مَقَامٍ ﴾ بہ فتحِ میم پڑھا ہے، یعنی قیام کی جگہ نافع و ابن عامر نے بہ ضمِ میم پڑھا ہے اقامت کے معنی میں۔ یہ کسائی وغیرہ کا قول ہے اور دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ امام جوہری رحمہ اللہ کہتے ہیں: ان دونوں میں سے ہر ایک کبھی تو اقامت کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی قیام کی جگہ کے معنی میں اور مراد مکان ہے اور یہ من جملہ اس خاص کے ہے جو عموم کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ پھر ﴿ مَقَامٍ ﴾ کو ﴿ اَمِيْنٍ ﴾ کے ساتھ موصوف فرمایا ہے، یعنی ایسا مقام جس میں جانے والا ساری خوفناک چیزوں سے امن پاتا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿ اَمِيْنٍ ﴾ اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ "أَمِنَ الرَّجُلُ أَمَانَةً فَهُوَ أَمِيْنٌ" یہ ﴿ اَمِيْنٍ ﴾ خائن کی ضد ہے۔ اس کے ساتھ مکان کو موصوف کیا استعارے کے طور پر اس لیے کہ خوفناک مکان گویا اپنے صاحب کی خیانت کرتا ہے ان تکلیفات کے سبب سے جو اس کو اس مکان میں پیش آتی ہیں۔[2] انتہیٰ۔

امن کی اصل نفس کی طمانینت اور خوف کا دور ہو جانا ہے اور امن و امان و امانت اصل میں مصدر ہیں اور امان کبھی تو اسم مستعمل ہوتا ہے، اس حالت کے لیے جس میں انسان امن میں ہوتا ہے اور کبھی اس شے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس پر انسان امین بنایا جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ ﴾ [الأنفال: ٢٧] "اور اپنی قابلِ حفاظت چیزوں میں خیانت مت کرو۔" أَيْ: مَا ائْتُمِنْتُمْ عَلَيْهِ.

قولہ تعالیٰ: ﴿ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴾ بدل ہے مقامِ امین سے۔ اس سے یہ بات بتانا مقصود ہے کہ وہ مقام ایسا ہے جو بے خوف ہے اور صاف پاک ہے اور کھانے پینے کی چیزوں پر مشتمل ہے جن سے لذت لی جاتی ہے۔ یا اس کا بیان ہے، یا "اِنَّ" کی خبرِ ثانی ہے۔ بالجملہ جب کھانے وغیرہ کا ذکر کیا تو لباس کا بیان فرمایا: ﴿ يَلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ

[1] فتح القدير (٧٥٥/٤) [2] تفسير النسفي (١٢٧/٤)

﴿ وَّاِسْتَبْرَقٍ ﴾ خبرِ ثانی یا ثالث ہے، یا حال ہے جار و مجرور کے متعلق کی ضمیر مستکن سے، یعنی دنیا میں مومنوں کو حریر پہننے سے منع فرمایا تھا اور جنت میں باریک اور موٹے حریر کی نفیس پوشاک پہنیں گے جو کبھی فنا پذیر نہیں ہو گی۔

﴿ سُنْدُسٍ ﴾ باریک ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں جس کا تانا بانا دونوں ریشمی ہوں۔ ﴿ اِسْتَبْرَقٍ ﴾ وہ ہے جو اس قسم کا گاڑھا ہو۔ یہ لفظ ''استبر'' کا معرب ہے اور لفظ جب معرب کیا جاتا ہے تو عجمی نہیں رہتا، کیوں کہ معرب کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اس کو عربی کر لیں اس طرح سے کہ اس میں تصرف کریں اور اس کی راہ و روش سے اس کو بگاڑ ڈالیں اور اعراب کے طریقوں پر اس کو جاری کریں۔ جب یہ سب کچھ ہوا تو قرآن عربی میں اس کا واقع ہونا درست ہو گیا، اس کی تفسیر سورۃ الکہف میں گزر چکی ہے۔[1] اور امام سیوطی رحمہ اللہ مرحوم نے معرب الفاظ کی بحث اتقان میں خوب لکھی ہے۔[2]

﴿ مُتَقٰبِلِيْنَ ﴾ حال ہے ﴿ يَلْبَسُوْنَ ﴾ کی ضمیر سے۔ یعنی ریشمی لباس پہن کر اپنی مجلسوں میں آمنے سامنے بیٹھیں گے، ایک دوسرے کی طرف نظر کرتے ہوں گے، اس حالت میں انھیں پورا پورا انس اور سرور حاصل ہو گا، یہ کہنا کہ اس طریقے سے بیٹھنا وحشت میں ڈالنے والا ہے، اس لیے کہ جب کم ثواب والا بہت ثواب والے کا حال معلوم کرے گا تو اس کا عیش دھندلا ہو جائے گا، حالانکہ آمنے سامنے بیٹھنے کا مقصد یہ تھا کہ ایک کو دوسرے سے انس ہو۔ چنانچہ یہ ٹھیک نہیں ہے، اس لیے کہ آخرت کے احوال دنیا کے احوال کے برعکس ہیں، ہر جنتی اپنی نعمت پر راضی اور خوش دل ہو گا۔ حسد وغیرہ بری صفات تو پہلے سے ہی ان کے دل سے دور کر دی جائیں گی، وہاں تو سرور ہی سرور ہو گا۔ ان باتوں کے لیے تو دنیا ہے جو دار الامتحان ہے اور ہمیشہ کی زندگی کا گھر تو دار الرضوان (رضا مندی) کا گھر ہے۔ اس قسم کے اوہام تو صرف قیاس مع الفارق سے پیدا ہوتے ہیں۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ کوئی کسی کی گدی کی طرف نظر نہیں کرے گا، اس لیے کہ تخت ان کو لے کر دور کریں گے۔[3]

﴿ كَذٰلِكَ ﴾ میں کاف یا تو مصدر محذوف کی صفت ہے۔ ''أَيْ: نَفْعَلُ بِالْمُتَّقِيْنَ فِعْلًا كَذٰلِكَ''، یعنی ہم پرہیزگاروں کے ساتھ ایسا معاملہ کرتے ہیں جس کا ذکر ہوا۔ یا مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ ''أَيْ: اَلْأَمْرُ كَذٰلِكَ'' یعنی بات ایسی ہے جو مذکور ہوئی کہ کفر و معاصی سے بچنے والے ایک ایسی قیام گاہ میں ہیں، جہاں کوئی خوف نہیں، وہ ہرے بھرے باغوں میں ہیں جن میں چشمے بہہ رہے ہیں۔ وہ قیمتی ریشمی لباس پہنے ہوئے آمنے سامنے مجلسوں میں جلوس فرمائیں گے۔

جب اس سب عیش و عشرت کا ذکر ہو چکا تو جو چیز اس سارے عیش کا راس اور رئیس ہے، اس کا ذکر فرمایا:

﴿ وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴾ یعنی ہم نے ان کا اکرام اس طرح سے کیا کہ حورِ عین سے ان کا نکاح کر دیا۔ ''حُوْرٌ''

[1] رقم الآية (٣١) [2] الإتقان (٣٩٣/١) [3] تفسير الجلالين (٦٥٩/١)

جمع ہے "حَوْرَاءُ" کی "حَوْرَاءُ" گوری عورت کو کہتے ہیں۔ ﴿ عِيْنٍ ﴾ "عَيْنَاءُ" کی جمع ہے۔ "عَيْنَاءُ" فراخ چشم عورت کو بولتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں: "حَوْرَاءُ" کا نام حوراء اس لیے رکھا ہے کہ اس کی آنکھ حسن میں حیرت کرتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حورِ عین سے ماخوذ ہے۔ حور یہ ہے کہ آنکھ کی سیاہی میں سفیدی شدید ہو۔ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آنکھ کی سفیدی اور سیاہی خوب گہری ہو۔ امام اصمعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نہیں جانتا کہ آنکھ میں حور کیا شے ہے۔ امام ابوعمرو رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حور یہ ہے کہ آنکھ ساری سیاہ ہو، جس طرح کہ ہرن اور وحشی گائے کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ کہا: اور بنی آدم میں حور نہیں ہے۔ اور عورتوں کو جو حور کہتے ہیں وہ اس لیے کہ انھیں ہرنوں اور وحشی گائے سے تشبیہ دی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ زَوَّجْنٰهُمْ ﴾ سے مراد "قَرَنَّاهُمْ" ہے، یعنی ہم نے ان کو حورِ عین کے ساتھ قرین (ساتھی) کر دیا۔ یہ تزویج عقدِ تزویج سے نہیں ہے، اس لیے کہ محاورے میں "زَوَّجْتُهُ بِامْرَأَةٍ" نہیں بولتے۔

امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے متقیوں کو ان کے لیے ازواج کر دیا جس طرح کہ نعل کو نعل کے ساتھ جوڑا کیا جاتا ہے، یعنی ہم نے ان کو دو دو کر دیا۔ اسی طرح امام اخفش رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ دونوں میں سے افضل کون ہیں۔ جنت میں بنی نوع انسان کی عورتیں یا حوریں؟ امام ابن مبارک رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ آدمی عورتیں جو جنت میں داخل ہوئی ہیں، ان کو حورِ عین پر فضیلت دی گئی ہے، اس عمل کے سبب سے جو انھوں نے دنیا میں کیا ہے۔ مرفوعاً مروی ہے کہ آدمی عورتیں حورِ عین سے ستر ہزار گناہ افضل ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ حورِ عین افضل ہیں، اس لیے کہ نبی مکرم ﷺ نے ایک شخص کے حق میں یوں فرمایا: «فَأَبْدِلْهُ زَوْجًا خَيْراً مِنْ زَوْجِهِ»[2] واللّٰه أعلم

﴿ يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ مومن جنت میں ہر قسم کے میوے جو ان کا جی چاہے گا حاضر کرنے کا حکم دیں گے، اس حال میں کہ ان کو تخمہ (بدہضمی) اور بیماری اور درد کا ڈر نہیں ہوگا برعکس دنیا کے کہ بعض وقت زیادہ میوہ کھانے سے تخمہ وغیرہ کا ڈر ہوتا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موت و وصب (بیماری) اور شیطان سے امن سے ہوں گے۔[3] کسی نے کہا: جن نعمتوں میں وہ ہوں گے، ان کے منقطع ہونے کا کوئی خوف نہ ہوگا۔

﴿ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ﴾ یعنی وہاں کبھی نہ مریں گے سوائے اس موت کے جس کو دنیا میں چکھ چکے۔ یہ استثناء منقطع ہے۔ "أَيْ: لٰكِنَّ الْمَوْتَةَ"۔ امام زجاج اور فراء رحمہما اللہ وغیرہما نے اسی طرح کہا ہے۔[4] یہ آیت اس آیت کے مثل ہے: ﴿ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ﴾ [النساء: ٢٢] "اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمھارے باپوں نے نکاح کیا ہے مگر جو گزر چکا ہے۔" کسی نے کہا کہ

[1] تفسیر القرطبي (١٦/ ١٥٣، ١٥٤) فتح القدير (٤/ ٧٥٥۔ ٧٥٦)
[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٦٣)
[3] تفسیر الطبري (٢٢/ ٥٣)
[4] فتح القدير (٤/ ٧٥٦)

﴿ إِلَّا ﴾ بہ معنی "بُعد" ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ نے اس کو پسند کیا ہے جس طرح کہ تم یوں بولتے ہو: "مَا كَلَّمْتُ رَجُلًا الْيَوْمَ إِلَّا رَجُلًا عِنْدَكَ، أَيْ: بَعْدَ رَجُلٍ عِنْدَكَ"[1] یعنی میں نے آج اس شخص کے بعد جو تیرے پاس ہے کسی شخص سے بات نہیں کی۔

جمہور نے اس کا انکار کیا ہے، اس لیے کہ ﴿ إِلَّا ﴾ کا بعد کے معنی میں آنا ثابت نہیں ہوا۔ کسی نے کہا کہ ﴿ إِلَّا ﴾ بہ معنی "سوی" ہے۔ "أَيْ: سِوَى الْمَوْتَةِ الْأُولَى" امام طبری نے اس قول کو نقل کیا ہے اور ضعیف کہا ہے۔[2] امام ابن عطیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کو ضعیف کہنا صحیح نہیں ہے، بلکہ ﴿ إِلَّا ﴾ کا "سِوَی" کے معنی میں ہونا صحیح اور متحقق ہے۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ موتِ اولیٰ کا جو استثناء کیا، حالاں کہ وہ دنیا میں ہے تو اس لیے کہ نیک بخت لوگ جب مرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور قدرت سے جنت کے اسباب کی طرف جاتے ہیں، روح اور ریحان سے ملتے ہیں اور جنت میں اپنی منازل کو دیکھتے ہیں اور اس کے دروازے ان کے لیے کھلتے ہیں، چنانچہ جب وہ دنیا میں مرے تو گویا جنت میں مرے، اس لیے کہ ان کو اس کے اسباب کے ساتھ اتصال ہوا اور انھوں نے اس کا مشاہدہ کیا، چنانچہ اس بنا پر استثناء متصل ہوگا۔[3]

امام زمخشری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: پھر اگر تم کہو کہ پہلی موت جس کو جنت میں داخل ہونے سے پہلے چکھا، اس کا استثناء کیسے کیا اس موت سے جس کے چکھنے کی جنت میں نفی کی گئی ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ مراد یہ ہے کہ یوں کہیں کہ ہرگز اس میں موت نہ چکھیں گے۔ اس کے بجائے ﴿ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ﴾ کو رکھا، اس لیے کہ گذشتہ موت کا آیندہ میں چکھنا محال ہے۔ تو یہ بات تعلیقِ محال کے باب سے ہے، گویا یوں کہا کہ اگر گذشتہ موت کا آیندہ میں چکھنا ٹھیک ہوتا ہے تو وہ بھی اس کو جنت میں چکھیں گے۔[4] انتہیٰ۔ فتح البیان میں فرمایا ہے کہ اس کا نام علمائے بیان کے ہاں "نَفْيُ الشَّيْءِ بِدَلِيلِهِ" ہے۔[5]

﴿ وَوَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴾ یعنی اللہ پاک نے جنت والوں کا اکرام کیا اور ان کو باقی نعمتیں عطا فرمائیں اور ایک یہ بڑا انعام کیا کہ ان کو عذابِ جحیم سے بچایا۔ جمہور نے ﴿ وَقٰهُمْ ﴾ بہ تخفیف اور امام ابوحیوہ رحمہ اللہ نے بہ تشدید پڑھا ہے بنا بر مبالغہ،[6] یعنی بالکل ان کو بچا لیا۔ ﴿ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ﴾ مفعول لہ ہے ﴿ يَدْعُوْنَ ﴾ کا، یا ﴿ اٰمِنِيْنَ ﴾ کا، یا ﴿ وَقٰهُمْ ﴾ کا، یا فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔ "أَيْ: تَفَضَّلْنَا فَضْلًا أَيْ: تَفَضُّلًا مِنْ رَبِّكَ" یعنی ہم نے تفضّل کیا جس طرح تفضّل کرنا چاہیے تیرے رب کی طرف سے۔ یا مصدر محذوف کی صفت ہے۔ "أَيْ: أَعْطَاهُمْ ذٰلِكَ عَطَاءً فَضْلًا مِنْ رَبِّكَ" یعنی ان کو یہ سب عیش و عشرت کا سامان عطا کیا، جس طرح عطا کرنے کا حق ہے جو تیرے رب کے فضل سے ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (٥٤/٢٢) [2] تفسير الطبري (٥٣/٢٢) [3] فتح القدير (٧٥٦/٤)
[4] الكشاف (٢٨٦/٤) [5] فتح البيان (٤١٣/١٢) [6] فتح القدير (٧٥٦/٤)

﴿ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ یعنی عذاب کا پھیرنا اور جنت میں داخل ہونا یہی عظیم کامیابی ہے کہ جس سے بڑھ کر کوئی کامیابی نہیں ہے۔ وہ عظمت میں انتہا کو پہنچی ہوئی ہے، کیوں کہ تکالیف سے خلاصی پانا ہے اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہونا ہے۔ پھر جب اللہ پاک دلائل کا بیان کر چکا اور وعد و وعید کا ذکر کر چکا تو ارشاد فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ یہ اس تفصیل کا اجمال ہے جو اس سورت میں بیان ہوئی ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے پہلے کتابِ مبین کی قسم کھائی، اس بات پر کہ اس نے اس کو لیلہ مبارکہ میں نازل کیا اور جو شے اس کے نازل کرنے کی مقتضی تھی اس کا بیان کیا اس طرح سے کہ یہ اس کا دستور ہے کہ وہ رسول بھیجتا ہے اور آسمانی کتابوں سے ان کی تائید کرتا ہے اپنے بندوں پر رحمت کرنے کے لیے اس طرح سے کہ جو شے اُن کو نیک بخت کرتی ہے، اس کو اس شے سے واضح کر کے بیان کر دیتا ہے جو اُن کو بد بخت کرتی ہے۔ پھر آخر سورت تک اس کی تفصیل اور تشریح کی، پھر اس سب کا اجمال اس بات کے ساتھ کیا جس کے یہ معنی ہیں کہ تو اپنی قوم کو کتابِ مبین کے ساتھ وعظ و نصیحت کر، اس لیے کہ ہم نے اس کو تیری اور ان کی زبان میں نازل کیا ہے اور اس کی تلاوت تجھ پر آسان کر دی ہے اور اس کو ان کو پہنچانا سہل کر دیا ہے، شاید وہ نصیحت حاصل کریں تو ایمان لے آئیں، لیکن وہ ایمان نہیں لاتے۔

﴿ فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ﴾ یعنی تو ان پر مدد کیے جانے کا انتظار کر اور ان کے تیرے ہاتھ پر ہلاک ہونے کا انتظار کر جس کا ہم نے تجھ سے وعدہ کیا ہے۔ وہ بھی اس شے کا انتظار کرنے والے ہیں جو تجھ پر نازل ہو، موت یا اور کچھ۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تو اس بات کا انتظار کر کہ اللہ تیرے اور اُن کے درمیان فیصلہ کرے، کیوں کہ وہ بھی زمانے کے حوادث کا تجھ پر نازل ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ دونوں قولوں کے معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

امام محلی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ حکم جہاد کے حکم سے پہلے کا ہے۔[1] مطلب یہ ہے کہ یہ حکم منسوخ ہے غور کرو! اسی طرح بعض نے بھی کہا ہے، حالاں کہ یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ رفعِ اباحتِ اصلیہ کا نسخ نہیں ہوتا ہے۔ نسخ جو ہے وہ اس حکم کا رفع ہے جو شرع میں ثابت ہوا ہے اسی قسم کے اور حکم کے ساتھ۔[2] (مگر یہ تعلیل محلِ تأمل میں ہے، کیوں کہ صفح و عفو و ہجران اباحتِ اصلیہ سے نہیں، بلکہ محکوم بہا کتاب اللہ میں ہیں، چنانچہ اب نسخ میں کوئی اشکال باقی نہ رہا۔ مصحح سلمه الله تعالیٰ و عافاه آمین)۔ (كذا قال الجمل)

الحمد لله والمنة کہ سورۃ الدخان کی تفسیر ۲۹ رمحرم ۱۳۱۴ ہجری بعد نصف شب بروز اتوار مکمل ہوئی۔ اللہ پاک قبول فرمائے اور آیندہ تحریر کی توفیق دے۔ لا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم وصلى الله تعالى وبارك على خير خلقه سيدنا محمد وعلى آله وصحبه و ذريته وأتباعه عدد ما علم وزنة ما علم، وملأ ما علم، آمين.

---

[1] تفسير الجلالين (١/٦٦٠) [2] فتح البيان (١٢/٤٠٨-٤١٤)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

سُوْرَةُ الْجَاثِيَةِ

اس کو شریعہ بھی کہتے ہیں، جیسا کہ خازن نے ذکر کیا ہے۔[1] اس کی چھتیس (۳۶) یا سینتیس (۳۷) آیتیں ہیں۔ امام حسن، جابر اور عکرمہ رحمہم اللہ کے قول کے مطابق یہ ساری سورت مکی ہے۔[2] امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ مکے میں نازل ہوئی ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ سے یہ بھی مروی ہے کہ اس میں سے ایک آیت کے سوا جو یہ ہے: ﴿ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ ﴾۔ چنانچہ یہ آیت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے حق میں مدینے میں نازل ہوئی ہے۔ امام ماوردی رحمہ اللہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ امام مہدوی اور نحاس رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، جبکہ ہجرت سے پہلے مکے میں مشرکوں میں سے ایک شخص نے ان کو گالی دی تو انھوں نے چاہا کہ اس پر دباؤ ڈالیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ ﴾ پھر یہ آیت، آیتِ قتال سے منسوخ ہو گئی۔ چنانچہ اس بنا پر یہ ساری سورت بغیر استثناء کے مکی ہے۔[4]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۵﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

حم ① اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو بڑا زبردست، نہایت حکمت والا ہے ②

---

① تفسير الخازن (١٥٠/٦) ② تفسير القرطبي (١٥٦/١٦)
③ الدر المنثور (٤٢٣/٧) ④ تفسير القرطبي (١٥٦/١٦)

بلاشبہ آسمانوں اور زمین میں مومنوں کے لیے واقعی نشانیاں ہیں③ اور تمھاری پیدائش میں اور ان چلنے پھرنے والوں میں جو وہ پھیلاتا ہے، ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو یقین رکھتے ہیں④ اور رات اور دن کے آنے جانے میں، اور اس رزق (پانی) میں جو اللہ نے آسمان سے اُتارا، پھر اس کے ذریعے سے زمین کو، اس کے مردہ ہو جانے کے بعد، زندہ کیا، اور ہواؤں کے (رُخ) بدلنے میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں⑤

اللہ تعالیٰ کی قدرتوں پر غور وفکر کی دعوت:

اللہ پاک اپنی خلق کو غور وفکر کی طرف راہ بتاتا ہے کہ اس کی نعمتوں میں اور عظیم قدرت میں غور وفکر کریں جس سے اس نے آسمانوں کو اور زمین کو بنایا ہے اور ان مخلوقات کو بنایا ہے جو اُن میں ہیں جن کی قسمیں مختلف ہیں، یعنی فرشتے، جن اور انسان، چوپائے زمین پر چلنے والے جانور، پرندے، وحشی جانور، درندے، زمین کے کیڑے مکوڑے اور گوناگوں قسم کی مخلوق جو دریا میں ہیں۔ اور رات اور دن کا اختلاف کہ ہمیشہ ایک کے پیچھے دوسرا آتا رہتا ہے۔ رات اپنی تاریکی کو لاتی رہتی ہے اور دن اپنی روشنی کو لاتا رہتا ہے، وہ دونوں اس کام میں سست نہیں ہوتے۔ ضرورت کے وقت بادلوں سے پانی نازل کیا۔ بارش کا نام رزق اس لیے رکھا کہ رزق اس سے حاصل ہوتا ہے، پھر اس سے زمین کو زندہ کیا، اس کے بعد کہ وہ مردہ تھی، دبی پڑی تھی، نہ اس میں روئیدگی تھی نہ کچھ اور شے تھی۔ اور ہواؤں کو گردش دینا، کوئی ہوا جنوبی ہے کوئی شمالی، کوئی مغربی کوئی مشرقی، کوئی جنگلی کوئی دریائی، کوئی رات کی کوئی دن کی۔ کوئی ان میں سے بادل کے باردار کرنے کی ہوا ہے اور کوئی روحوں کی غذا ہے، کوئی عقیم ہے کہ کچھ نتیجہ نہ دے۔

اللہ پاک نے پہلے تو ﴿ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ فرمایا، پھر ﴿ يُّوْقِنُوْنَ ﴾، پھر ﴿ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ فرمایا۔ یہ عزت کی حالت سے اس حالت کی طرف ترقی ہے جو اس سے اشرف اور اعلیٰ ہے۔ یہ آیتیں آیت بقرہ کے مشابہ ہیں۔ وہ آیت یہ ہے: ﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٦٤] ''آسمانوں اور زمین کی پیدائش، رات دن کا ہیر پھیر، کشتیوں کا لوگوں کو نفع دینے والی چیزوں کو لیے ہوئے سمندروں میں چلنا، آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو زندہ کر دینا، اس میں ہر قسم کے جانوروں کو پھیلا دینا، ہواؤں کے رخ بدلنا، اور بادل، جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں، ان میں عقل مندوں کے لیے قدرتِ الٰہی کی نشانیاں ہیں۔'' انسان کا اخلاطِ اربعہ

سے پیدا کرنا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس بارے میں امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے ایک طویل اور عجیب وغریب اثر اس جگہ روایت کیا ہے۔ واللہ أعلم۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

﴿ حٰمٓ ﴾ پر سورت غافر میں اور اس کے بعد کی سورتوں میں کلام گزر چکا ہے۔ اس سے جو مراد ہے اس کو اللہ پاک ہی خوب جانتا ہے۔ کتاب کا، یعنی قرآن شریف کا اتارنا اللہ پاک کی طرف سے ثابت ہے جو اپنے ملک میں غالب ہے اور اپنے کام میں حکمت والا ہے۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ قرآن اللہ ہی کا نازل کیا ہوا ہے تو اس کے بعد وہ بات بیان کی جو اس کی قوتِ ظاہرہ وباہرہ پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ فرمایا: بے شک آسمانوں کے اور زمین کے پیدا کرنے میں البتہ نشانیاں ہیں جو ایمان والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ بات کہ ﴿ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ سے مراد "فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" ہے، اس پر یہ قول دال ہے: ﴿ وَفِیْ خَلْقِكُمْ ﴾ یعنی آسمان وزمین کے بنانے میں اور خود تمھارے بنانے میں مختلف طوروں پر نشانیاں ہیں۔

امام مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مٹی سے، پھر نطفے سے، یہاں تک کہ انسان ہو جاتا ہے۔[2] جو دلائل یہاں پر مذکور ہیں ان کا حاصل چھے دلیلیں ہیں تین وقفوں سے: اول ﴿ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾، دوسرا ﴿ يُّوْقِنُوْنَ ﴾، تیسرا ﴿ يَعْقِلُوْنَ ﴾۔ ان کے آپس میں مختلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انصاف کرنے والا جب آسمانوں اور زمین میں بذاتِ خود غور کرے گا اور یہ سوچے گا کہ ان کا بنانے والا کوئی ہے تو ایمان لے آئے گا اور جب اپنے آپ میں اور دوسری ایسی مخلوق کی پیدائش میں غور کرے گا تو ایمان زیادہ ہوگا اور یقین لے آئے گا اور جب باقی حوادث میں غور وفکر کرے گا تو جان لے گا اور اس کا علم مستحکم ہو جائے گا۔

﴿ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴾ یعنی تمھارے پیدا کرنے میں اور ان جانوروں کے پیدا کرنے میں جن کو بکھیرتا ہے اور متفرق ومنتشر کرتا ہے، ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو اس بات کا یقین کرتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ﴿ اٰيٰتٌ ﴾ کا رفع اس بنا پر ہے کہ مبتداء موخر ہے اور خبر اس کے ماقبل کا ظرف ہے۔ جمہور نے بہ رفع پڑھا ہے اور امام حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے بہ نصب۔ اسم ﴿ اِنَّ ﴾ پر عطف کیا ہے اور خبر ﴿ وَفِیْ خَلْقِكُمْ ﴾ ہے۔ گویا یوں کہا گیا: "وَإِنَّ فِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيَاتٍ". یا اس بنا پر کہ آیات اولیٰ کی تاکید ہے۔[3]

﴿ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ﴾ یعنی اور شب وروز کے تعاقب میں، یا ان کے طول اور قصر (کم ہونا) کے فرق

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١٨٧/٤) [2] فتح القدير (٦/٥) [3] فتح القدير (٦/٥)

میں اور تاریکی و روشنی کے درمیان فرق اور ان کے جانے اور آنے میں۔ ﴿وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ معطوف ہے ﴿اِخْتِلَافِ﴾ پر، یعنی اور اس شے میں جو اللہ نے روزی آسمان سے نازل کی، پھر اس سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کیا اور ہواؤں کو ان کے چلنے کی جگہوں میں گردش دینے میں، یعنی کبھی تو ایک طرف سے چلتی ہے، کبھی دوسری طرف سے چلتی ہے اور کبھی گرم ہوتی ہے، کبھی سرد، کبھی نفع دینے والی اور کبھی ضرر پہنچانے والی ہوائیں۔ جہت کے لحاظ سے افق چار ہیں، یعنی ان سب باتوں میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو اللہ پاک کی کتاب میں بیان کی گئی مراد کو سمجھتے ہیں اور دلیل کو سمجھتے ہیں تو ایمان لے آتے ہیں۔ ﴿رِزْقٍ﴾ سے مراد مطر (بارش) ہے، اس لیے کہ وہ ہر اس شے کا سبب ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو روزی دیتا ہے۔ زمین کے زندہ کرنے سے مراد اس کی روئیدگی نکالنا ہے اور زمین کی موت اس کا روئیدگی سے خالی ہونا اور اس کا خشک ہونا ہے۔

جمہور نے ﴿اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے اور امام حمزہ اور کسائی رحمہ اللہ نے بہ نصب پڑھا ہے۔ مع اس کے کہ ﴿وَاخْتِلَافِ﴾ کے جر پر سب متفق ہیں۔ جر ﴿وَاخْتِلَافِ﴾ کا برتقدیر حرفِ جر ہے "أَيْ: وَفِيْ اخْتِلَافِ اللَّيْلِ...الخ" چنانچہ جس نے آیات کو رفع دیا ہے تو اس بنا پر کہ وہ مبتداء ہے اور "فِي اخْتِلَافِ" اس کی خبر ہے۔ اور جس نے نصب دیا ہے تو وہ عطف علی معمولین عاملین مختلفین کے باب سے ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رفع بنا بر استیناف ہے۔ اس جگہ نحویوں کا طویل کلام ہے اور معمولین عاملین مختلفین پر عطف کرنے کے مسئلے میں بحث ہے، اس کے مجوزین کی حجتیں اور مانعین کے جوابات علم نحو کی مطول کتابوں میں تفصیل سے موجود ہیں۔[1] (كذا في فتح البيان)

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝٦ وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝٧ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝٨ وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝٩ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ جَهَنَّمُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْـًٔا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝١٠ هٰذَا هُدًى وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝١١

[1] فتح القدير (٦/٥) فتح البيان (٤١٧/١٢، ٤١٨)

یہ اللہ کی آیات ہیں، ہم آپ پر حق کے ساتھ ان کی تلاوت کرتے ہیں، پھر اللہ اور اس کی آیات کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟⑥ ہر سخت جھوٹے، گناہ گار کے لیے ہلاکت ہے⑦ جو اللہ کی آیات سنتا ہے، جب کہ وہ اس پر تلاوت کی جاتی ہیں، پھر وہ تکبر کرتے ہوئے (اپنی بات پر) اڑ جاتا ہے، گویا اس نے سنا ہی نہیں، تو (اے نبی!) آپ اُسے دردناک عذاب کی خوش خبری دے دیجیے⑧ اور جب اس نے ہماری کچھ آیات جان لیں تو انھیں مذاق بنالیا، یہی لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کن عذاب ہے⑨ ان کے آگے جہنم ہے اور جو کچھ انھوں نے کمایا ہے ان کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ وہ (دیوتا کام آئیں گے) جنھیں انھوں نے اللہ کے سوا کارساز بنا لیا اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے⑩ یہ (قرآن) تو ہدایت ہے اور وہ لوگ جنھوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا، ان کے لیے سخت قسم کا دردناک عذاب ہے⑪

جھوٹے گناہ گار کی نشانیاں اور اس کی سزا:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں یہ اللہ کی آیتیں ہیں، یعنی قرآن شریف مع ان حجتوں اور کھلی دلیلوں کے جو اس میں ہیں۔ ہم ان کو تجھ پر پڑھتے ہیں اس حال میں کہ وہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور جو کچھ ان میں بیان ہے وہ بھی حق ہے۔ پھر جب وہ ان پر ایمان نہیں لاتے اور نہ اُن کے لیے مطیع ہوتے ہیں تو پھر اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد کون سی حدیث کے ساتھ ایمان لائیں گے۔ پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴾ یعنی ہر اس شخص کے لیے خرابی ہے جو بڑا جھوٹ بنانے والا ہے، اپنی بات میں بڑا جھوٹا ہے، بڑا قسم کھانے والا، ذلیل اور بڑا گناہ گار ہے۔ اپنے فعل اور دل میں اللہ کی آیتوں کا منکر ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا کہ وہ اللہ کی آیتوں کو سنتا ہے جو اس پر پڑھی جاتی ہیں، پھر اپنے کفر اور انکار پر جما رہتا ہے تکبر اور عناد کی وجہ سے گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں۔ تو تُو اس کو اس بات کی خبر دے کہ اس کے لیے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے پاس درد دینے والا عذاب ہے۔

﴿ وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ یعنی اور جب قرآن میں سے کسی شے کا علم ہوا اور یاد رکھا تو اس کا منکر ہوا اور اس کو ٹھٹھا ٹھہرایا، ایسے لوگوں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے، یعنی اس کے اس فعل کے مقابلے میں کہ قرآن کی اہانت کی اور اس کا ٹھٹھا کیا۔ اسی لیے امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ قرآن کو لے کر

دشمن کی زمین کی طرف سفر کیا جائے، اس خوف سے کہ کہیں دشمن نہ اس کو پا لے۔[1]

پھر اس کے معاد (لوٹنے) کے دن جو عذاب اس کو حاصل ہوگا اس کی تفسیر کی، چنانچہ فرمایا: ﴿مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ جَهَنَّمُ﴾ یعنی وہ لوگ جو اس صفت کے مالک ہیں، وہ عن قریب قیامت کے دن جہنم کی طرف جائیں گے۔ ﴿وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْـًٔا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ یعنی ان کے مال واولاد ان کو کوئی فائدہ دیں گے اور نہ ہی وہ معبود کوئی فائدہ دیں گے جن کو اللہ کے سوا پوجا تھا اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿هٰذَا هُدًى﴾ یعنی یہ قرآن شریف ہدایت ہے اور وہ لوگ جو اپنے رب کی آیتوں کے منکر ہوئے ان کے لیے بے چین کرنے والا اور درد دینے والا عذاب ہے۔[2] وَاللّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى أَعْلَمُ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ یہ آیتیں جن کا ذکر کیا گیا یہ اللہ تعالیٰ کی حجتیں اور براہین ہیں جن کو ہم تجھ پر اس حال میں پڑھتے ہیں کہ ہم حق بیان کرنے والے ہیں۔ یا وہ آیتیں متلبس ہیں ساتھ حق کے، یا بہ سبب حق کے ﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ﴾ یعنی پھر اللہ کی حدیث اور اس کی حجتوں کے بعد اور کون سی حدیث کے ساتھ ایمان لائیں گے۔ کسی نے کہا: مقصود یہ ہے کہ اللہ کی آیتوں کے بعد پھر کون سی حدیث کے ساتھ ایمان لائیں گے۔ اسم شریف کا ذکر آیت کی تعظیم کے لیے ہے۔ اس بنا پر یہ ترکیب "أَعْجَبَنِيْ زَيْدٌ وَكَرَمُهٗ" کے باب سے ہوگی۔ کسی نے کہا: مراد "بعد حديث الله" ہے اور ﴿حَدِيْثٍ﴾ سے مراد قرآن شریف ہے جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ﴾ [الزمر: ٢٣] "اللہ تعالیٰ نے بہترین کلام نازل فرمایا ہے جو ایسی کتاب ہے کہ آپس میں ملتی جلتی اور بار بار دھرائی ہوئی آیتوں کی ہے۔" اور یہی مراد آیات سے بھی ہے تو اس سورت میں "بعد حديث الله و آيته" دونوں ایک ہوئے، عطف صرف عنوان مختلف ہونے کی وجہ سے ہے۔ جمہور نے "تُؤْمِنُوْنَ" بہ تائے فوقیہ پڑھا ہے۔ امام حمزہ اور کسائی رحمہ اللہ نے بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے، معنی "يُؤْمِنُوْنَ بِأَيِّ حَدِيْثٍ" ہیں۔ ﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ﴾ کو ﴿يُؤْمِنُوْنَ﴾ سے پہلے اس لیے رکھا کہ استفہام کے لیے صدرِ کلام ہوتا ہے۔[3] ﴿وَيْلٌ﴾ جہنم میں ایک وادی ہے۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهَا. یا کلمۂ عذاب ہے۔

﴿اَفَّاكٍ﴾ بہ معنی کذاب ہے۔ ﴿اَثِيْمٍ﴾ یعنی "كَثِيْرِ الْإِثْمِ" ہے، اس شے کا مرتکب ہے جو اثم کا موجب ہوتی ہے۔ پھر اس ﴿اَفَّاكٍ﴾ کی ایک اور صفت بیان فرمائی وہ یہ ہے کہ ﴿يَسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ یعنی ایسا افاک ہے کہ قرآن شریف کو سنتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال، یعنی افاک اس حال میں کہ قرآن کو سنتا

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٦٩) [2] تفسير ابن كثير (١٨٧/٤، ١٨٨) [3] فتح القدير (٦/٥)

ہے۔ یا استیناف ہے اور پہلی بات زیادہ بہتر ہے اور ﴿ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال، یعنی اللہ کی آیتوں کو سنتا ہے، اس حال میں کہ وہ اس پر پڑھی جاتی ہیں، پھر اپنے کفر پر اصرار کرتا ہے اور جس حال پہ تھا اسی پر جما رہتا ہے، اس طرح سے کہ اپنے کفر پر قائم رہتا ہے، ایمان سے تکبر کرتا ہے اور اپنے آپ کو حق کا تابع ہونے سے ماوراء، یعنی بڑا سمجھتا ہے۔

"إصرار" ماخوذ ہے: "إِصْرَارُ الْحِمَارِ عَلَى الْعَانَةِ" سے "وَهُوَ أَنْ يُنْحِي عَلَيْهَا صَارًا أُذُنَيْهِ"۔ کلمہ ﴿ ثُمَّ ﴾ عقل کے نزدیک رُتبے کی سمجھ میں تاخیر کے لیے ہے، یعنی اس کے کفر پر جمے رہنے کی وجہ سے باوجود اس کے کہ اس کے لیے مذکورہ دلائل بیان کیے گئے اور اس نے سن لیے، مگر اس کی عقل میں بات نہیں آتی۔ امام مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس وقت قرآن کی آیات میں سے کوئی چیز سنتا ہے تو ان کو ٹھٹھا ٹھہراتا ہے۔[1]

جملہ ﴿ كَأَنْ لَمْ يَسْمَعْهَا ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال۔ یا مستانفہ ہے اور کلمہ "أَنْ" مخففہ ہے مثقلہ سے اور اس کا اسم ضمیرِ شان محذوف ہے۔ "أَيْ: كَأَنَّ الشَّانَ لَمْ يَسْمَعْهَا" یعنی گویا شان یہ ہے کہ ان کو سنا ہی نہیں۔ ﴿ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴾ بشارت کا ذکر تکبر اور ٹھٹھا کرنے کے باب سے ہے، یعنی اس نے جو کفر پر اصرار کیا اور ایمان سے تکبر کیا اور آیتوں کے سننے کے لیے کان نہ رکھا تو اس پر تو اس کو سخت درد والے عذاب کی خوش خبری دے۔ کہا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس لیے کہ وہ عجم کے قصے کہانیاں خریدتا تھا اور ان کے ذریعے سے لوگوں کی توجہ قرآن کے سننے سے ہٹاتا تھا۔ آیت عام اور ہر اس شخص کے حق میں ہے جو اللہ کے دین کو نقصان پہنچانے والا ہو۔

﴿ وَإِذَا عَلِمَ مِنْ آيَاتِنَا شَيْئًا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ﴾ یعنی جس وقت اس کے پاس کوئی شے پہنچی اور اس نے جان لیا کہ وہ اللہ کی آیتوں سے ہے تو ان آیتوں کو ٹھٹھا ٹھہرایا۔ کسی نے کہا کہ ﴿ اتَّخَذَهَا ﴾ کی ضمیر شے کی طرف راجع ہے، اس لیے کہ اس سے مراد آیات ہیں، لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے کہ ضمیر ﴿ آيَاتِ ﴾ کی طرف پھرتی ہے۔ جمہور نے ﴿ عَلِمَ ﴾ بہ صیغہ معروف پڑھا ہے اور امام قتادہ اور مطر وراق رحمہما اللہ نے بہ صیغہ مجہول پڑھا ہے۔[2] ﴿ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴾ "کل أفاك" کی طرف اشارہ ہے جو اوصافِ مذکورہ کا حامل ہے تو اب جمع ٹھیک ہو گی، یعنی یہ سب چھوٹے بڑے جن میں مذکورہ اوصاف پائے جاتے ہیں، ان کے لیے عذابِ مہین ہے جو اذلال اور فضیحت پر مشتمل ہے، یعنی ذلت آمیز ہے، وہ اس سبب سے ہے کہ انھوں نے کفر پر اصرار کیا اور اللہ کی آیتوں کو سننے سے تکبر کیا اور اُن کو ٹھٹھا ٹھہرایا۔

[1] فتح القدیر (۷/۵) [2] فتح القدیر (۷/۵)

﴿ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ جَهَنَّمُ ﴾ یعنی جس حال میں وہ ہیں کہ دنیا میں عزت دار بن رہے ہیں اور حق سے تکبر کر رہے ہیں اس حالت کے پرے جہنم ہے، کیوں کہ وہ ان کے آگے ہے، اس لیے کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہونے والے ہیں۔ یہاں "قدام" کی تعبیر "وراء" کے ساتھ کی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ جَهَنَّمُ ﴾. "وراء" بہ معنی "أمام" (آگے) مستعمل ہوتا ہے جس طرح کہ بہ معنی "خلف" استعمال کیا جاتا ہے، دونوں معنوں میں مشترک ہے، چنانچہ کسی چیز اور اس کی ضد میں استعمال کیا جاتا ہے، جیسے: کلمۂ "جون" کہ سفید وسیاہ میں مشترک استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی نے کہا: اس اعتبار سے کہ انھوں نے اس سے اعراض کیا اس کو ایسا ٹھہرایا، گویا وہ ان کے پیچھے ہے۔ کسی نے کہا: "وراء" اس جہت کا نام ہے جس کو آدمی چھپاتا ہے پیچھے سے یا آگے سے۔ یہ تو مسلم ہے کہ کلمۂ "وراء" اضداد میں سے ہے، "أمام و خلف" دونوں میں مستعمل ہوتا ہے، مگر یہاں جو کلمۂ ضد لایا گیا، اس کے لیے شاید کوئی حسین نکتہ ضرور ہے۔ واللہ أعلم.

وہ نکتہ یہ ہو کہ وہ تو یہ خیال کرتے ہیں کہ اب تو خوب مزے سے گزر رہی ہے، دنیا میں خوب عیش میسر ہے، اگر جہنم ہو بھی تو آگے ہو اور واقع میں بھی وہ آگے ہے، مگر ان کے کرتوت ایسے برے ہیں کہ ضرور ہی جہنم میں پہنچائیں گے، چنانچہ اس کے آگے ہونے کو ایسے کلمے سے بیان کیا جس کے دونوں معنی ہیں۔ یعنی گو وہ آگے ہے، مگر تمھارے کام ایسے ہیں کہ گویا وہ تمھارے ورے ہے اور تم کو گھیر رہی ہے اور تم اس میں پہنچ چکے، اس میں انتہا درجے کی ملامت اور دھمکی ہے جو "أمامکم" کہنے میں نہیں ہے۔ دیکھیے اس کی نظیر کلمۂ ﴿ شَرَوْهُ ﴾ ہے جو سورت یوسف میں ہے۔ "شِرَاء" بہ معنی خرید وفروخت آتا ہے، یہاں ﴿ شَرَوْهُ ﴾ بہ معنی "بَاعُوهُ" ہے جو خوبی یہاں ﴿ شَرَوْهُ ﴾ میں ہے وہ "بَاعُوهُ" میں ہرگز نہیں۔ اس سے مراد برادرانِ یوسف کی توبیخ ہے۔ یعنی شفقتِ برادرانہ کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر اپنے بھائی کو کسی نے پکڑ لیا ہو اور اس کو بیچتا ہو تو اسے خرید لے اور تم نے اس کے برعکس کیا کہ خود اپنے بھائی کو بیچا اور بیچا بھی کھوٹے داموں، یہ اَور توبیخ ہوئی۔ غرضیکہ ایک دوسرے کے ضد کلمات جو وضع کیے گئے ان کے استعمال کے مقام حسین وجمیل ہیں، ہر جگہ ان کا نیا رنگ نیا ڈھنگ ہے۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ وَعِلْمُهُ أَتَمُّ.

غرضیکہ کفار کو جو چیز قرآن شریف کے نہ ماننے کا باعث ہوئی وہ یہی مال ومتاع اور اولاد اور دنیوی شان وشوکت ہے، اس لیے فرمایا: ﴿ وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْـًٔا ﴾ یعنی ان کے مال واولاد جو انھوں نے کمائے اور جن پر ان کو ناز اور فخر ہے وہ ان سے نہ تو اللہ کا عذاب کچھ بھی دور کریں گے اور نہ ان کو کسی طرح کا فائدہ دیں گے۔ دوسرا باعث یہ تھا کہ اپنے بتوں پر اعتماد کیا تھا کہ اگر کوئی بلا آئے گی تو وہ دور کریں گے، اس لیے فرمایا: ﴿ وَلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ﴾ یعنی جن بتوں کو انھوں نے اللہ کے سوا اپنا حمایتی ٹھہرایا ہے وہ ان کے کچھ کام نہ آئیں گے۔ ﴿ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ یعنی نہ مال و اولاد کام آئے گا اور نہ ہی بت، اور ان کے لیے بڑا عذاب

ہے، اس جہنم میں جو ان کے آگے ہے۔ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ دونوں جگہ یا مصدر یہ ہے یا موصولہ اور دوسرے جملے میں جو کلمۂ ''لا'' زیادہ کیا ہے وہ تاکید کے لیے ہے۔

﴿ هٰذَا هُدًى ۚ ﴾ جملہ مستانفہ ہے، یعنی کفار جو قرآن شریف کو نہیں مانتے وہ بے شک نہ مانیں وہ اپنا ہی برا کریں گے۔ یہ قرآن تو ان لوگوں کے لیے ایک بڑی ہدایت ہے جو راہ پاتے ہیں۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴾ یعنی اور جو لوگ اپنے رب کی آیات قرآنی سے منکر ہوئے ان کے لیے سخت درد دینے والا عذاب ہے۔ ﴿ رِجْزٍ ﴾ سخت تر عذاب کو کہتے ہیں۔ جمہور نے ﴿ اَلِيْمٌ ﴾ کو بہ جر پڑھا ہے بنا بر صفت ﴿ رِجْزٍ ﴾ اور امام ابن کثیر، حفص اور ابن محیصن رحمہ اللہ نے بہ رفع پڑھا ہے بنا بر صفتِ عذاب۔[1] پھر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنے اوصاف وانعام ذکر فرمائے:

اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۲ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۱۳ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۱۴ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَاۗءَ فَعَلَيْهَا ۡ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝۱۵

اللہ وہی ہے جس نے سمندر کو تمھارے تابع کر دیا، تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو⑫ اور اس نے اپنی طرف سے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، سب تمھارے تابع کر دیا۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور وفکر کرتے ہیں⑬ (اے نبی!) آپ ایمان والوں سے کہہ دیجیے: کہ وہ ان لوگوں سے عفو و درگزر کریں، جو اللہ کے ایام (گرفت کے دنوں) کی اُمید نہیں رکھتے، تاکہ اللہ کچھ لوگوں کو ان (اعمال) کی سزا دے، جو وہ کماتے رہے⑭ جس نے نیک عمل کیا تو اپنے (فائدے کے) لیے ہی کیا اور جس نے برا کیا تو اس کا وبال اسی پر ہے، پھر تم اپنے رب ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے⑮

---

[1] تفسير القرطبي (١٦/١٦٠) فتح البيان (١٢/٤١٨-٤٢١)

سمندر وغیرہ کی تسخیر بھی قدرتِ الٰہی کی ایک نشانی ہے:

درگزر کریں، یعنی اپنے بدلے کا فکر نہ کریں اللہ پر چھوڑ دیں۔ انتھی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں اس کے بندوں پر ہیں ان کا ذکر فرماتا ہے، اس بات میں کہ اس نے دریا ان کے قابو میں کر دیا کہ اس میں اس کے حکم سے جہاز چلیں، کیوں کہ اسی نے دریا کو حکم دیا ہے کہ جہازوں کو اٹھالیں اور تاکہ تم اس کے فضل کو تلاش کرو، یعنی تجارتوں میں اور کمائیوں میں اور شاید اس کا شکر کرو ان منافع کے حاصل ہونے پر جو دور دراز کے ملکوں اور اطراف سے تمھاری طرف کھینچ کر لائے جاتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ تمھارے کام میں وہ شے لگا دی جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، یعنی تارے اور پہاڑ اور دریا اور ندیاں اور ساری چیزیں جن سے تم فائدہ حاصل کرتے ہو، یعنی سب اس کے فضل اور احسان وامتنان سے ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿جَمِيْعًا مِّنْهُ﴾ یعنی یہ سب کچھ اسی اکیلے کے پاس سے ہے، اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے، جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ﴾ [النحل: ٥٣] ''تمھارے پاس جتنی بھی نعمتیں ہیں، سب اسی کی دی ہوئی ہیں، اب بھی جب تمھیں کوئی مصیبت پیش آجائے تو اسی کی طرف نالہ وفریاد کرتے ہو۔''

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بہ طریقِ عوفی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ ہر شے اللہ ہی سے ہے اور اس اسم میں اس کے اسماء سے ایک اسم ہے، چنانچہ یہ سب اسی سے ہے اور نزاع کرنے والے اس میں اس سے نزاع نہیں کرتے اور یقین کر لیا ہے کہ وہ ایسا ہی ہے۔[1] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابو اراکہ سے روایت کیا ہے، کہا: ایک شخص نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما (ابن کثیر میں اسی طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما راء کے بعد بغیر واؤ کے واقع ہوا ہے اور فتح البیان میں عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما واقع ہوا ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن کثیر میں ناسخ سے کتابت میں واؤ رہ گیا۔ واللہ اعلم) سے پوچھا کہ مخلوق کس شے سے پیدا کی گئی؟ فرمایا: نور ونار وظلمات وثری سے۔ کہا: میں نے دیکھا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو، چنانچہ اس نے ان سے سوال کیا، پھر وہ ان کے پاس آیا تو اس سے ایسا ہی کہا، پھر کہا: تو اس کی طرف لوٹ جا اور اس سے پوچھ کہ یہ سب کس شے سے پیدا کیا گیا تو وہ ان کی طرف لوٹ کر آیا اور ان سے سوال کیا تو انھوں نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ﴾[2] یہ اثر غریب ہے اور اس میں نکارت ہے۔

مشرکین کی ایذا رسانی پر صبر کرنے کا حکم:

قولہ تعالیٰ: ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ﴾ یعنی چاہیے کہ ان سے اعراض کریں

[1] تفسیر الطبري (٦٥/٢٢) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٢٩١/١٠)

اور ان کی ایذاء رسانی پر تحمل کریں۔ یہ ابتدائے اسلام میں تھا، ان کو حکم ہوا تھا کہ مشرکوں اور اہلِ کتاب کی ایذاء پر صبر کریں، تاکہ ان کے لیے یہ بات تألیف (الفت پیدا کرنے) کی طرح ہو جائے۔ پھر جب انھوں نے عناد اور دشمنی پر اصرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو لڑنے بھڑنے کی اجازت دے دی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ ﴾: "لَا يَنَالُوْنَ نِعَمَ اللّٰهِ تَعَالٰى"[1]

(اس ترجمے کا حاصل یہ ہے کہ "ایام" بہ معنی "نعم" ہے۔ مصحح سلمه الله تعالىٰ وعافاه. آمین)۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ یعنی جس وقت انھوں نے ان سے دنیا میں اعراض کیا تو اللہ عزوجل ان کو ان کے اعمالِ بد کی جزا آخرت میں دینے والا ہے اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۫ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴾ یعنی تم قیامت کے دن اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر تم اس پر اپنے اعمال کے ساتھ پیش کیے جاؤ گے اور وہ تم کو تمھارے اچھے برے اعمال کی جزا دے گا۔[2] والله سبحانهٗ وتعالى أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے: اللہ وہ ہے جس نے دریا کو ایسی صفت عطا فرمائی، جس سے تم اس پر سوار ہونے کے قابل ہوتے ہو اس طرح سے کہ اس کو املس السطح بنایا، یعنی اس کے اجزاء متساوی بنائے کہ جو شے اس میں متخلخل (پریشان) ہوتی ہے، وہ اس کی سطح پر چڑھ آتی ہے، جیسے: لکڑیاں، اور وہ دریا غوطہ مارنے کو منع نہیں کرتا، اگر ایسا نہ ہوتا تو کشتیاں اوپر نہ چل سکتیں۔ پھر دریا کے مسخر کرنے کے فائدے بیان فرمائے: ایک یہ ہے کہ اس میں کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور اسی کی دی ہوئی قدرت سے تم ان کشتیوں کو چلا سکو۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس کے فضل میں سے تلاش کرو، کبھی تجارت کر کے اور کبھی موتیوں کے لیے غوطہ لگا کر، کبھی شکار کے لیے جال وغیرہ ڈال کر اور کبھی اس کے سوا اَور کچھ کر کے۔ تیسرا فائدہ یہ ہے: تاکہ تم ان نعمتوں کا شکر کرو جو اس تسخیر کے سبب سے تم کو حاصل ہوتی ہیں۔

پھر ایک اور انعام ذکر فرمایا اور وہ یہ ہے کہ اپنے بندوں کے لیے ان تمام چیزوں کو مسخر کر دیا جن کو آسمانوں میں اور زمین میں پیدا کیا، جن کے ساتھ بندوں کے مصالح (فائدے) متعلق ہوتے ہیں اور جن سے ان کی گزران اور زندگی بسر کرنے کی چیزیں قائم ہوتی ہیں۔ آسمانوں کی مخلوقات میں سے جو چیزیں ان کے لیے مسخر کیں ان میں سے سورج، چاند، چمکتے تارے، پانی، بادل اور ہوائیں ہیں۔ ﴿ جَمِيْعًا ﴾ حال ہے ﴿ مَا فِي السَّمٰوٰتِ ﴾ سے، یا اس کی

---

[1] تفسير الطبري (٢٢/٦٦، ٦٧) [2] تفسير ابن كثير (٤/١٨٨)

تاکید ہے اور ﴿ مِّنْهُ ﴾ محذوف سے متعلق ہے جو ﴿ جَمِيْعًا ﴾ کی صفت ہے۔ "أَيْ: كَائِنًا مِنْهُ"، یعنی آسمان وزمین کی ساری چیزیں، ایسی ساری چیزیں جو ہونے والی ہیں اس سے، یا متعلق ہے ﴿ سَخَّرَ ﴾ سے، یعنی مسخر کیا تمھارے لیے ﴿ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ کو اپنی طرف سے، یا حال ہے ﴿ مَا فِي السَّمٰوٰتِ ﴾ سے، یعنی مسخر کیا ﴿ مَا فِي السَّمٰوٰتِ ﴾ کو اس حال میں کہ وہ ہونے والا ہے اس کی طرف سے۔ یا مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ "أَيْ: إِنَّ كُلَّ ذٰلِكَ رَحْمَةٌ مِنْهُ لِعِبَادِهِ"، یعنی یہ سب اس کی طرف سے اپنے بندوں کے لیے رحمت ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ﴿ جَمِيْعًا مِّنْهُ ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: یعنی اسی سے ہے نور اور سورج چاند، اور ہر شے اللہ ہی کی طرف سے ہے۔[1] طاؤس کہتے ہیں: ایک شخص عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی طرف آیا اور اُن سے سوال کیا کہ مخلوق کس شے سے پیدا کی گئی ہے؟ فرمایا: پانی اور نور اور ظلمت وہوا اور مٹی سے۔ کہا: پھر یہ چیزیں کس شے سے پیدا کی گئیں؟ فرمایا: میں نہیں جانتا۔ پھر وہ شخص سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور ان سے سوال کیا تو انھوں نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے قول کی طرح کہا۔ پھر وہ شخص عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا تو ان سے پوچھا کہ مخلوق کسی چیز سے پیدا کی گئی؟ فرمایا: پانی، نور، ظلمت، ہوا اور مٹی سے۔ کہا پھر یہ چیزیں کس شے سے پیدا کی گئیں؟ تو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیت پڑھ دی: ﴿ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ﴾ چنانچہ وہ شخص بولا: "مَا كَانَ لِيَأْتِيَ بِهٰذَا إِلَّا رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ بَيْتِ النَّبِيِّ ﷺ"[2] یعنی یہ بات وہی شخص لاسکتا ہے جو نبی کریم ﷺ کے گھر والوں سے ہے۔

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾ یعنی بے شک یہ تسخیر جس کا ذکر ہوا اس میں البتہ رب العالمین کی توحید کی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سوچتے ہیں۔ سوچنے والوں کا خاص کر کے اس لیے ذکر کیا کہ ان سے وہی شخص نفع لیتا ہے جو ان میں غور وفکر کرتا ہے، کیوں کہ تفکر سے فائدہ اسی شخص کو حاصل ہوتا ہے جو اُن سے توحید پر استدلال کرے۔

پھر جب اللہ پاک نے توحید کے دلائل اور کامل علم اور اپنی قدرتِ بالغہ بیان کی تو اس کے بعد اخلاق اور افعالِ حمیدہ کا ذکر کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ ﴾ اس آیت کی شانِ نزول میں اختلاف ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ غزوۂ بنی المصطلق میں لوگ ایک کنویں پر اترے جس کو مریسیع کہتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن ابی نے اپنے غلام کو بھیجا، تاکہ پانی بھر لائے، چنانچہ اس نے اس کے پاس آنے میں دیر لگائی، پھر جب وہ اس کے پاس آیا تو اس نے پوچھا کہ تجھے کس شے نے روکا؟ غلام بولا کہ عمر کنویں کے کنارے پر بیٹھا تھا اور اس نے اس وقت تک کسی کو پانی

[1] تفسير الصنعاني (٣/٢١٣) تفسير الطبري (٢٢/٦٥) [2] مستدرك الحاكم (٢/٤٩٠)

بھرنے نہیں دیا جب تک کہ اس نے نبی کریم ﷺ کی مشکیں اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مشکیں نہ بھرلیں تو عبداللہ بولا کہ نہیں ہے ہماری مثل اور اُن لوگوں کی مثل مگر جیسا کہا گیا ہے: ''سَمِّنْ كَلْبَكَ يَأْكُلْكَ'' یعنی اپنے کتے کو موٹا کر کہ تجھے کھالے، چنانچہ یہ بات سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو انھوں نے اپنی تلوار گلے میں ڈالی اور اس کی طرف متوجہ ہونے کا ارادہ کرتے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، چنانچہ اس بنا پر یہ آیت مدنی ہوگی۔[1]

امام مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بنی غفار کے ایک شخص نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو مکے میں گالی دی، چنانچہ انھوں نے ارادہ کیا کہ اس پر دباؤ ڈالیں، اس پر یہ آیت معافی اور درگزر کا حکم لے کر نازل ہوئی۔[2] میمون بن مہران نے روایت کیا ہے کہ جس وقت آیت: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ [البقرة: ٢٤٥] ''ایسا بھی کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دے۔'' نازل ہوئی تو فنحاص یہودی نے کہا کہ محمد ﷺ کا رب محتاج ہوا۔ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات سنی تو اپنی تلوار گلے میں ڈالی اور اس کی تلاش میں نکلے، چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے ان کی طرف آدمی بھیجا جو اُن کو واپس لایا۔[3] امام قرطبی اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کچھ لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو مکے والے اصحابِ رسول اللہ ﷺ میں سے تھے۔ یہ لوگ مشرکین کی طرف سے بہت ایذاء میں تھے، اس سے پہلے کہ ان کو جہاد کا حکم ہو، چنانچہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی شکایت کی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر آیتِ قتال نے اس کو منسوخ کیا۔[4] (كذا ذكر الخطيب) اس بنیاد پر یہ آیت مکی ٹھہرے گی۔

بالجملہ ﴿ يَغْفِرُوْا ﴾ کے مجزوم ہونے میں تین قول ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ قُلْ ﴾ کا جواب ہے، شرط اور جزاء کے ساتھ اس کو تشبیہ دی ہے، جیسے: ''قُمْ تُصِبْ خَيْرًا'' یعنی تو کھڑا رہ خیر کو پہنچے گا۔ دوسرا یہ ہے کہ لامِ امر محذوف ہے۔ ''أَيْ: لِيَغْفِرُوْا''. تیسرا قول یہ ہے کہ امر محذوف کا جواب ہے جو ﴿ قُلْ ﴾ کا مقولہ ہے، چونکہ جواب اس پر دال ہے اس لیے اس کو حذف کر دیا ہے۔ ''أَيْ: قُلِ اغْفِرُوْا يَغْفِرُوْا'' یہ قول علی بن عیسیٰ رحمہ اللہ کا ہے اور اسی کو امام ابن العربی رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔

﴿ اَيَّامَ اللّٰهِ ﴾ سے مراد ''وَقَائِعَ اللّٰهِ'' ہیں جن میں اس نے اپنے اعداء کو ہلاک کیا ہے۔ ماخوذ ہے اس قول سے کہ ایام العرب ان کے وقائع کو بولتے ہیں جن میں ان کے باہم لڑائیاں ہوئی ہیں، جس طرح کہ ﴿ وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ﴾ [إبراهيم: ٥] کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ اس بنا پر ﴿ لَا يَرْجُوْنَ ﴾ کے معنی ''لَا يَتَوَقَّعُوْنَ'' ہوں گے، یعنی رجا کے معنی مجازاً توقع کے لیے جائیں گے، اس لیے کہ ''رجا'' محبوب کے ساتھ مختص ہوتی ہے اور وہ اس معنی کی بنا پر غیر مناسب ہے، اسی لیے امام مقاتل رحمہ اللہ نے یہ معنی کیے ہیں: ''لَا يَخْشَوْنَ مِثْلَ عَذَابِ اللّٰهِ لِلْأُمَمِ الْخَالِيَةِ''[5]

---

[1] تفسير القرطبي (١٦/١٦١) [2] تفسير البغوي (٧/٢٤٢، ٢٤٣) [3] تفسير القرطبي (١٦/١٦١)
[4] تفسير البغوي (٧/٢٤٣) [5] فتح القدير (٥/٨)

یعنی وہ گذشتہ اُمتوں کے عذاب کی طرح کے عذاب سے نہیں ڈرتے اور یہ اس لیے کہ وہ اس پر ایمان نہیں لاتے تو اس کے عقاب سے نہیں ڈرتے۔ کسی نے کہا کہ بعث کا خوف نہیں رکھتے۔ مطلب یہ ہے کہ "رجا" بہ معنی خوف ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "رجا" اپنے حقیقی معنی پر ہے، یعنی امید اور ﴿ أَيَّامَ ﴾ سے مراد مطلق اوقات ہیں، یعنی امید نہیں رکھتے ان وقتوں کی جن کو اللہ تعالیٰ نے مومنین کی مدد اور ثواب کے لیے مقرر کر رکھا ہے اور ان سے وعدہ کیا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں: "لَا يَأْمُلُونَ نَصرَ اللّٰهِ لِأَوْلِيَائِهِ وَإِيقَاعِهِ بِأَعْدَائِهِ" یعنی اس بات کی امید نہیں رکھتے کہ اللہ اپنے دوستوں کی مدد کرنے اور اپنے دشمنوں کو برائی میں ڈالے اور انھیں ضرر پہنچائے۔ کچھ بھی ہو حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ تو مومنوں سے کہہ دے کہ وہ مذکورہ لوگوں سے عفو و درگزر کریں، ان کی ایذاء پر صبر کریں، ان سے بدلہ نہ لیں۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت آیتِ سیف سے منسوخ ہے۔ قریب تر بات یہ ہے کہ یوں کہیں کہ یہ آیت اس بات پر محمول ہے کہ ان کے ساتھ جھگڑنا ترک کریں اور ان ایذاء دینے والے کلمات سے، جو اُن سے صادر ہوتے ہیں، درگزر کریں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ مشرکین سے اعراض فرماتے تھے جب وہ آپ ﷺ کو ایذاء دیتے اور آپ ﷺ سے ٹھٹھا کرتے اور آپ ﷺ کی تکذیب کرتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ سارے مشرکین سے لڑیں، چنانچہ یہ منسوخ ہو گیا[1] اور زیادہ مناسب قول یہ ہے کہ منسوخ نہیں ہوا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴾ یہ وجہ ہے کہ درگزر کرنے کا حکم کیوں دیا گیا۔ اور قوم سے مراد وہ مومنین ہیں جن کو معاف کرنے کا حکم ہو۔ اس بنا پر قوم پر تنوین تعظیم کے لیے ہے، یعنی تم مشرکوں کو معاف کرو اور درگزر کرو، تاکہ اللہ ایک معظم قوم کو قیامت کے دن ان نیک اعمال کی جزا دے جو وہ دنیا میں کرتے تھے، ان اعمال میں سے کفار کی اذیت پر صبر کرنا اور چشم پوشی کرنا ہے، غصہ کو پی کر اور برائی کو برداشت کر کے۔ کسی نے کہا: قوم سے مراد کفار ہیں۔ اس بنا پر تنوین تحقیر کے لیے ہوگی، یعنی اللہ ایک حقیر قوم کو، جو کفار ہیں، ان کے برے کاموں کا بدلہ دے جو وہ کیا کرتے تھے۔ گویا یوں کہا کہ تم خود اُن سے مکافات مت کرو (بدلہ نہ لو)، تاکہ ہم خود ان سے مکافات کریں اور پورا پورا بدلہ لیں۔ کسی نے کہا: قوم سے مراد مومنین اور کافرین ہیں، اس بنا پر تنوین تنویع (دونوں قسم) کی ہوگی، پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔

﴿ بِمَا ﴾ میں حرف باء سببیہ ہے، یا مقابلے کے لیے ہے، یا "یجزی" کا صلہ ہے بہ حذفِ مضاف "أَيْ: بِمِثْلِ كَسْبِهِمْ"۔ امام ابن عامر، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے "لِنَجْزِيَ" بہ نون پڑھا ہے۔ "أَيْ: لِنَجْزِيَ نَحْنُ" اور باقی سبعہ نے بہ یائے تحتیہ بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے۔ امام ابو جعفر، شیبہ اور عاصم رحمہم اللہ نے بہ تحتیہ بہ صیغۂ مجہول

[1] تفسير الطبري (٦٦/٢٢)

پڑھا ہے مع نصب ﴿ قَوْمًا ﴾ کے، چنانچہ نائب فاعل یا تو مصدر فعل ہے۔ "أَيْ: لِيَجْزِيَ الْجَزَاءُ قَوْمًا" یا جار و مجرور ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ اور کوفیوں نے اس کو جائز رکھا ہے اور بصریوں نے منع کیا ہے۔[1]

بالجملہ پھر اللہ پاک نے مومنین کا اور ان کے اعمال کا اور مشرکین کا اور ان کے اعمال کا ذکر کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۚ ﴾ یعنی ہر گروہ کا عمل اچھا ہو یا برا اس کے عمل کرنے والے کے لیے ہے، اس سے ہٹ کر اس کے غیر کی طرف نہ جائے گا۔ اس میں ترغیب اور ترہیب ہے اور جملہ مستانفہ ہے جزاء کی کیفیت بیان کرنے کے لیے۔ ﴿ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴾ یعنی پھر تم اپنے ہی رب کی طرف پھر کر جاؤ گے اور وہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا، خیر ہے تو خیر اور شر ہے تو شر۔[2]

پھر اللہ تبارک و تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا قصہ بیان فرمایا، اس سے یہ بات بتانا منظور ہے کہ نبی مکرم ﷺ کی قوم کا طریقہ ویسا ہی ہے جیسا کہ اگلی اُمتوں کا طریقہ تھا، کیوں کہ اللہ پاک نے بنی اسرائیل پر دین و دنیا کی بہت سی نعمتوں کا انعام کیا اور اس کے باوجود انھوں نے ان نعمتوں کا شکر نہ کیا، بلکہ سرکشی اور حسد کے طور پر دین کے معاملے میں مختلف ہوگئے اس کے بعد کہ ان کو حقیقتِ حال کا علم ہو چکا، اس لیے کہ ہر فریق نے چاہا کہ وہی سب سے بڑا متبوع (جس کی اتباع کی جائے) ہو۔ حسد اور خواہشات کی پیروی کے مارے نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپس میں عداوت اور مار پیٹ ہوئی، انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا۔ حقیقتِ حال کا علم ہو جانے کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ حق پر متفق ہو جاتے اور آپس کے اختلافات دور کر دیتے، مگر وہ علم ان کے باہمی اختلاف کا سبب بن گیا۔ اسی طرح آپ ﷺ کی قوم کا حال ہے کہ ان کے پاس کھلی کھلی دلیلیں آئیں جو آپ ﷺ کے دین کے سچا ہونے پر دال تھیں، لیکن انھوں نے کفر پر اصرار کیا اور حسد اور عداوت کے مارے ایمان اور اطاعت سے تکبر کیا، چنانچہ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ
مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ
مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ
بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا
فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰي شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا
تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ
مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ

[1] تفسیر القرطبي (١٦/١٦٢) فتح القدير (٥/٨) [2] فتح البيان (١٢/٤٢١_٤٢٣)

وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹﴾ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ
يُّوْقِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور یقیناً ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکومت اور نبوت دی اور ہم نے انھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور ہم نے انھیں جہانوں پر فضیلت دی ⑯ اور ہم نے انھیں دین کی بابت واضح واضح (نشانیاں) دیں، پھر انھوں نے اپنے پاس علم آ جانے کے بعد ہی، محض آپس کی بغاوت و عداوت سے، اختلاف کیا۔ بے شک آپ کا رب روزِ قیامت ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے گا، جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں ⑰ پھر ہم نے (اے نبی!) آپ کو دین کے (واضح) راستے پر لگا دیا، لہٰذا آپ اس کی پیروی کریں اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جو علم نہیں رکھتے ⑱ بلاشبہہ وہ اللہ (کے عذاب) سے آپ کے کچھ بھی کام نہیں آئیں گے۔ اور بے شک ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور اللہ متقین کا دوست ہے ⑲ یہ (قرآن) لوگوں کے لیے بصیرت افروز دلائل پر مشتمل ہے اور ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو یقین رکھتے ہیں ⑳ کیا جن لوگوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انھیں ان لوگوں کے مانند کر دیں گے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان کا جینا اور مرنا برابر ہے۔ برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں ㉑

بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کا فضل وانعام:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس انعام کا ذکر کرتا ہے جو اس نے بنی اسرائیل پر کیا کہ ان پر کتابیں نازل کیں، ان کی طرف رسول بھیجے، ان میں حکومت رکھی، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ﴾ یعنی ان کو کھانے پینے کی چیزیں دیں۔ ﴿ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی اور ان کو ان کے زمانے میں فضیلت دی۔ ﴿ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ﴾ اور ان کو حجتیں براہین اور قطعی دلیلیں دیں، چنانچہ حجتیں ان پر قائم ہوگئیں۔ پھر انھوں نے قیامِ حجت کے بعد اختلاف کیا اور یہ جو ہوا تو اس لیے کہ ان میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی۔ اے محمد! تیرا رب ان کے درمیان اس بات میں فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے تھے، یعنی عن قریب اپنے حکمِ عدل سے ان میں فیصلہ کر دے گا۔

بنی اسرائیل کے طریقے پر نہ چل پڑنا:

اس میں اس اُمت کے لیے تحذیر (دھمکی) ہے کہ کہیں ان کی راہ چلیں اور ان کے راستے کا قصد کریں۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا ﴾ یعنی تو اس شے کا اتباع کر جو تیرے رب کی طرف سے تیری طرف وحی کی گئی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور مشرکوں سے اعراض کر۔ اور اس جگہ اللہ جل جلالہ نے فرمایا: ﴿ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ ﴾ یعنی ان کی آپس کی دوستی ان کو کیا کام آئے گی، کیوں کہ وہ تو ایک دوسرے کو نقصان اور ہلاکت ہی زیادہ کریں گے اور اللہ ڈرنے والوں کا رفیق ہے اور وہ ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے اور جو منکر ہیں ان کے رفیق طاغوت ہیں جو ان کو روشنی سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں۔ پھر فرمایا: ﴿ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴾ یعنی یہ قرآن لوگوں کے لیے عقل اور سمجھنے بوجھنے کی باتیں ہیں اور جو یقین رکھتے ہیں ان کے لیے ہدایت، مہر و محبت اور رحمت ہے۔

مومن و کافر برابر نہیں ہیں:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ یعنی مومن اور کافر برابر نہیں ہوتے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ﴾ [الحشر: ۲۰] ''اہلِ نار اور اہلِ جنت (باہم) برابر نہیں۔ جو اہلِ جنت ہیں وہی کامیاب ہیں (اور جو اہلِ نار ہیں وہ ناکام ہیں)۔'' اور یہاں یوں فرمایا: ﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ یعنی کیا ان لوگوں نے جنھوں نے برائیاں کمائیں، یہ خیال کیا کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر کر دیں گے جو ایمان لائے اور بھلائیاں کیں اور ان کا جینا اور مرنا برابر کر دیں گے، یعنی ہم دنیا اور آخرت میں ان دونوں کو برابر کر دیں گے۔ ان کا یہ خیال جو انھوں نے ہمارے بارے میں کیا اور ہمارے عدل کے ساتھ کیا برا ہے کہ ہم نیکوں اور بدوں کے درمیان دنیا میں اور آخرت میں برابری کر دیں۔

حافظ ابو یعلی رحمہ اللہ نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی بنیاد چار ارکان پر کی ہے، چنانچہ جس نے ان کے ساتھ صبر کیا اور نہ ان پر عمل کیا تو وہ اللہ سے فاسقین میں سے ہو کر ملے گا۔ کہا گیا: اے ابوذر! وہ کیا رکن ہیں؟ فرمایا: ''يُسَلِّمُ حَلَالَ اللّٰهِ لِلّٰهِ وَحَرَامَ اللّٰهِ لِلّٰهِ، وَأَمْرَ اللّٰهِ لِلّٰهِ، وَنَهْيَ اللّٰهِ لِلّٰهِ، لَا يُؤْتَمَنُ عَلَيْهِنَّ إِلَّا اللّٰهُ'' یعنی اللہ کے حلال کو اللہ کے لیے تسلیم کرے۔ اور اللہ کے حرام کو اللہ کے لیے تسلیم کرے اور اللہ کے امر کو اللہ کے لیے تسلیم کرے اور اللہ کی نہی کو اللہ کے لیے تسلیم کرے امین نہیں بنایا جاتا ان پر مگر اللہ۔

ابوالقاسم ﷺ نے فرمایا: جیسی یہ بات ہے کہ کانٹوں سے انگور نہیں چنا جاتا، ایسے ہی بدکار لوگ نیکوکاروں کے مقام کو نہیں پہنچیں گے۔[1] اس وجہ سے یہ حدیث غریب ہے۔ محمد بن اسحاق نے "كتاب السيرة" میں ذکر کیا ہے کہ لوگوں نے مکے میں کعبے کی بنیاد کے اندر ایک پتھر پایا، اس پر یہ لکھا ہوا تھا: "تَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ وَتَرْجُوْنَ الْحَسَنَاتِ؟ أَجَلْ كَمَا يُجْنَى مِنَ الشَّوْكِ الْعِنَبُ"[2] یعنی تم برائیاں کرتے ہو اور بھلائیوں کی امید کرتے ہو، جیسے: کانٹوں سے انگور چنے جاتے ہیں، یعنی ایسا ہرگز نہیں ہوتا، بلکہ جیسا کرو گے ویسا پاؤ گے۔ کسی نے خوب کہا ہے:

از مکافاتِ عمل غافل مشو — گندم از گندم بروید جو ز جو

"گندم ہمیشہ گندم ہی سے اُگتی اور جو سے جو پیدا ہوتا ہے۔ (اس لیے) اپنے عمل کی پاداش سے غافل نہ رہ۔"

کسی اور نے کہا ہے:

يَرْجُو النَّجَاةَ وَلَا يَسْلُكُ مَسْلَكَهَا — إِنَّ السَّفِيْنَةَ لَا تَجْرِيْ عَلَى الْيَابِسِ

یعنی:

رکھے امیدِ نجات اور چلے نہ اس کی راہ — خیال اس کا ہے یہ جو ہوا بڑا گمراہ
مثال اس کی کہوں تجھ سے اے ہنر پرور — چلے ہے بیٹھ کے کشتی میں سوئے خشکی وبَر

حکایت:

امام طبرانی رحمہ اللہ نے مسروق سے روایت کیا ہے کہ تمیم داری رضی اللہ عنہ نے ایک رات قیام کیا، یہاں تک کہ صبح کر دی اور اس آیت کو بار بار پڑھتے رہے: ﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾۔[3] اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴾[4] یعنی برے دعوے ہیں جو وہ کرتے ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ "کتاب" سے مراد تورات شریف ہے۔ کشاف میں اسی طرح ہے۔[5] قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی اسی کا اتباع فرمایا ہے۔[6] شاید زیادہ مناسب یہ ہے کہ کتاب کو جنس پر محمول کیا جائے، تاکہ کتاب میں انجیل اور زبور بھی شامل ہو جائے، لیکن جمہور مفسرین اس جگہ اسی بات پر ہیں کہ کتاب کی تفسیر تورات کے ساتھ کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تورات کے بعد حکم اور نبوت کا ذکر کیا گیا ہے اور انجیل و زبور میں حکم نہیں ہے، اس لیے کہ زبور تو دعائیں اور مناجات ہے اور انجیل کے احکام نہایت تھوڑے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کو تورات پر عمل کرنے کا حکم کیا گیا تھا اور "حکم" سے مراد فہم اور فقہ ہے جن سے لوگوں کے درمیان حکم اور ان کے جھگڑوں کا

[1] تفسير ابن كثير (١٨٩/٤) [2] السيرة النبوية لابن هشام (١٨/٢) [3] المعجم الكبير (٥٠/٢)
[4] تفسير ابن كثير (١٨٩/٤، ١٩٠) [5] الكشاف (٢٩٢/٤) [6] تفسير البيضاوي (١٧٠/٥)

فیصلہ ہوتا ہے اور نبوت سے مراد وہ انبیاء علیہم السلام ہیں جن کو اللہ پاک نے ان میں مبعوث فرمایا تھا۔ غرضیکہ پہلے تو دینی نعمتوں کا ذکر کیا، وہ یہی کتاب اور حکم و نبوت ہے۔

پھر دنیاوی نعمتوں کا ذکر فرمایا، وہ یہ ہیں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کھانے پینے کی لذیذ چیزیں عطا فرمائیں جن کو ان کے لیے حلال کیا، ان میں سے من وسلویٰ ہیں۔ دینی اور دنیوی نعمتوں کے ذکر کے بعد فرمایا کہ ان کے وقت کے لوگوں پر ہم نے ان کو اس طرح سے فضیلت دی کہ ہم نے جو کچھ اُن کو دیا وہ ان کے غیر کو نہیں دیا۔ یعنی ان میں سے انبیاء علیہم السلام کی کثیر تعداد کی۔ دریا ان کے لیے پھاڑا، ان کے دشمن کو غرق کر دیا اور اس طرح کے اُور امور جن کا بیان سورۃ الدخان میں گزر چکا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ان کے وقت میں جہان والوں میں سے اللہ کے نزدیک کوئی ان سے بڑھ کر عزت والا نہ تھا اور نہ ہی ان سے زیادہ اس کو کوئی محبوب تھا۔[2]

﴿ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ﴾ سے مراد حلال وحرام کے متعلق واضح احکام تھے، یا کھلے کھلے معجزے۔ کسی نے کہا کہ مراد نبی اکرم ﷺ کے مبعوث ہونے کا علم اور آپ ﷺ کی نبوت کے شواہد اور آپ ﷺ کی ہجرت گاہ کی تعیین ہے۔ پھر اس امر میں ان کے درمیان اختلاف واقع نہیں ہوا، مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آچکا تھا، اس طرح سے کہ اس کو بیان کر دیا گیا اور اس کے معنی واضح کر دیے گئے، چنانچہ انھوں نے اس چیز کو، جو اختلاف کو دور کرنے کا موجب تھی، اختلاف پیدا کرنے کا سبب بنا لیا۔ کسی نے کہا کہ ﴿ الْعِلْمُ ﴾ سے مراد یوشع بن نون علیہ السلام ہیں۔ اس لیے کہ ان میں سے بعض تو اُن پر ایمان لے آئے اور بعض ان کے منکر ہوئے۔ کسی نے کہا کہ مراد نبی کریم ﷺ کی نبوت ہے، چنانچہ حسد اور بغی (ضد) کے مارے اس میں اختلاف کیا۔ کسی نے کہا کہ ان کے بعض کی بعض پر طلبِ ریاست کے سبب سے ضد کے مارے اختلاف کیا۔ اللہ پاک نے فرمایا: بے شک تیرا رب قیامت کے دن اُن کے درمیان اس امرِ دین کے بارے میں فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ پھر نیک کو اس کی نیکی کی جزا دے گا اور بد کو اس کی بدی کی سزا دے گا۔

﴿ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ ﴾ کلمۂ ﴿ ثُمَّ ﴾ استیناف کے لیے ہے، یعنی یہاں سے ایک الگ کلام شروع ہوا۔ ﴿ شَرِيْعَةٍ ﴾ لغت میں مذہب، ملت اور منہاج کو کہتے ہیں، یعنی راستہ۔ "مشرعة الماء" کو بھی ﴿ شَرِيْعَةٍ ﴾ کہتے ہیں، یعنی پانی کا گھاٹ جس پر اس کے پینے والے وارد ہوتے ہیں۔ اسی معنی سے راہ کو شارع کہتے ہیں اس لیے کہ وہ مقصد کی طرف ایک راستہ ہے۔ ﴿ شَرِيْعَةٍ ﴾ کی جمع "شرائع" ہے۔ پھر دین کے لیے اس کا استعارہ کیا گیا، اس لیے کہ بندے اس شے پر وارد ہوتے ہیں جس سے اِن کے نفوس زندہ ہوتے ہیں۔

---

① رقم الآية (٣٢) ② تفسير البغوي (٧/٢٤٣)

مطلب یہ ہے کہ جس طرح پانی کے گھاٹ پر وارد ہونے سے پیاس بجھتی ہے، جان بچتی ہے، بدن زندہ رہتا ہے، اسی طرح دین کے گھاٹ پر وارد ہونے سے نفس زندہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس جگہ شریعت سے مراد وہ دین ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے مشروع کیا ہے۔ معنی یہ ہیں: اے محمد! ہم نے تجھ کو دین کی ایک ایسی واضح اور ظاہر راہ پر قائم کیا ہے جو تجھے حق کی طرف پہنچا دے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''عَلَى هُدًى مِنْ أَمْرِ دِينِهِ'' یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے امرِ دین سے ایک بڑی ہدایت پر تجھ کو قائم کیا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ شریعت امر و نہی و حدود اور کھلے کھلے فرائض ہیں۔ اس لیے کہ یہ سب امورِ حق کی طرف راہ ہیں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سنت ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ اپنے سے پہلے کے نبیوں کے طریقے کا اقتداء کرتے ہیں۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دین ہے، اس لیے کہ یہ نجات کی طرف جانے کا راستہ ہے۔ امام ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امر لغت میں دو معنی میں وارد ہوتا ہے: ایک تو بہ معنی شان، یعنی حال، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴾ [هود: ٩٧] ''پھر بھی ان لوگوں نے فرعون کے احکام کی پیروی کی اور فرعون کا کوئی حکم درست تھا ہی نہیں۔'' دوسرا کلام کی قسموں میں سے ایک قسم ہے جو نہی کی ضد ہے، یہاں دونوں معنی کا مراد ہونا صحیح ہے۔ اس کی تقدیر یہ ہے کہ پھر ہم نے تجھ کو دین کے ایک طریقے پر کیا اور وہ ملتِ اسلام ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ ﴾[1] [النحل: ١٢٣] ''پھر ہم نے آپ کی جانب وحی بھیجی کہ آپ ملتِ ابراہیم حنیف کی پیروی کریں۔''

اس میں کچھ اختلاف نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف شریعتوں کے عقائد، یعنی توحید، اخلاقیات اور مصالح میں کوئی فرق نہیں کیا۔ ان کے درمیان جو اختلاف ہے وہ فروع میں ہے، اس بات کے مطابق جس کو اللہ پاک جان چکا ہے۔ ﴿ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی پس تو اس شریعت کے احکام پر عمل کر جو تیری اُمت کے لیے ہیں اور اُن لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کر جو اللہ کی توحید کو نہیں جانتے اور اس شریعت کو نہیں مانتے جس کو اس نے اپنے بندوں کے لیے مشروع فرمایا ہے۔ یہ لوگ کفارِ قریش ہیں اور جو لوگ ان کے موافق ہیں۔

پھر اس نہی کی علت یہ ذکر فرمائی کہ وہ ہرگز تجھ سے کسی ایسی شے کو دور نہ کر سکیں گے جس کا اللہ تیرے ساتھ ارادہ کرے اگر تو نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی۔ ﴿ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۚ ﴾ یعنی بعض ظالم بعض کے انصار ہیں، ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، اس لیے کہ جنسیت انضمام (آپس میں ملنے) کی علت (باعث) ہوتی ہے، جیسا کہ کہا گیا: ؎

[1] تفسير الطبري (٢٢/٧٠، ٧١) تفسير القرطبي (١٦/١٦٣، ١٦٤).

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز کبوتر باکبوتر زاغ با زاغ

''ہم جنس اپنے ہم جنس سے مل کر پرواز کرتا ہے۔ کبوتر کبوتر کے ساتھ اور زاغ (کوا) زاغ کے ساتھ۔''

امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منافقین یہود کے اولیاء ہیں۔[1] ﴿وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾ اور اللہ متقین کا ناصر ومددگار ہے۔ ان سے مراد وہ ہیں جو شرک و معاصی سے بچے۔ ﴿هٰذَا بَصَآىِٕرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴾، ﴿هٰذَا﴾ مبتداء ہے اور ﴿بَصَآىِٕرُ﴾ خبر ہے۔ خبر کو جمع لانا تعددِ آیات و براہین کے اعتبار سے ہے جو مبتداء میں ہے۔ کسی نے ''ھذہ'' پڑھا ہے: ''أَيْ: هٰذِهِ الْآيَاتُ''. اس لیے کہ قرآن بہ معنی آیات ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے: ع

سَائِلْ بَنِيْ أَسَدٍ مَا هَذِهِ الصَّوْتُ

اس لیے کہ ''صوت'' بہ معنی ''صیحة'' ہے۔ معنی یہ ہیں کہ یہ قرآن، یا اتباعِ شریعت، یا یہ آیات لوگوں کے لیے احکامِ دین میں براہین اور دلیلیں ہیں جن کی ان کو ضرورت ہوتی ہے اور کھلی کھلی باتیں ہیں جو ان کو فلاح اور کامیابی کا چہرہ دکھاتی ہیں اور ایسے نشان اور علامات ہیں کہ احکام و حدود میں ان سے بصیرت اور بینائی و راہنمائی لیتے ہیں۔ واضح دلائل کو بصائر فی القلوب کی طرح ٹھہرایا، تاکہ ان میں سے ہر ایک کو عرفان و یقین حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا جائے۔ غرض یہ ہے کہ بصائر کا اطلاق دلائلِ واضحہ پر مجازاً ہے، لیکن مختار میں کہا ہے کہ بصیرتِ حجت اور کسی شے کی بصیرت حاصل کرنا ہے[2] اور قاموس میں ہے کہ بصیرت عقیدۃ القلب وفطنۃ (دانائی) و حجت ہے۔[3] اس بنا پر مجاز نہیں ہے، بلکہ خود بصیرت کے معانی میں سے ایک معنی حجت ہیں۔ بالجملہ قرآن شریف روشن دلائل ہے اور رُشد و ہدایت ہے اور ایک ایسی راہ ہے کہ جس نے اس پر عمل کیا، اس کو جنت کی طرف پہنچا دیتا ہے اور آخرت میں ان کے لیے اللہ کی طرف سے رحمت ہے جن کا حال یہ ہے کہ وہ یقین رکھتے ہیں اور شک وشبہہ میں نہیں پڑتے اور اس سے متزلزل نہیں ہوتے۔

﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ﴾ کلمہ ﴿اَمْ﴾ منقطعہ ہے جو بل و ہمزہ کے ساتھ تقدیر کیا جاتا ہے اور اس میں جو ''بل'' کے معنی ہیں وہ بیانِ ثانی کی طرف پھرنے کے لیے ہیں اور اس میں جو ہمزہ کے معنی ہیں تو وہ حسبان کے انکار کے لیے ہیں، اس کے واقع ہونے سے انکار کے طور پر اور اس کو برا سمجھنے کے طور پر اور اس پر توبیخ کرنے کے طور پر۔ ''اجتراح'' بہ معنی اکتساب ہے، یعنی کمانا۔ اسی معنی سے ''جوارح'' بہ معنی اعضاء ہیں، اس لیے کہ ان سے کسب کیا جاتا ہے۔ سورۃ المائدہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔[4]

یہ جملہ مستانفہ ہے، اس سے یہ بیان کرنا منظور ہے کہ بدکاروں کا حال نیکوکاروں کے حال سے مختلف ہے، یہ ظالموں اور متقیوں کا حال بیان کرنے کے بعد واضح ہوتا ہے۔ یہ معنی ہیں اس قول کے: ﴿اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

---

[1] فتح القدير (١٠/٥) [2] مختار الصحاح (٧٣/١) [3] القاموس المحيط (٤٤٨/١) [4] رقم الآية (٤)

﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ یعنی کیا سیئات کمانے والوں نے یہ خیال کیا ہے کہ ہم برابری کریں گے درمیان ان کے باوجود ان کی برائیاں کرنے کے اور درمیان مومنین اہلِ حسنات کے، ان کا دنیا میں جینا مرنا اور آخرت کی زندگی ہرگز برابر نہیں۔ ان میں سے کسی شے میں وہ برابر نہ ہوں گے، اس لیے کہ دونوں جہانوں میں نیکوکاروں کا حال بدبختوں کے حال کی طرح نہیں ہے۔ نیکوکار تو دنیا میں ایمان اور طاعت کی عزت وشرف میں ہیں اور مرنے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور رضوان میں ہیں اور یہ لوگ دنیا میں ذلت وخواری میں ہیں اور مرنے میں اللہ تعالیٰ کی لعنت اور ہمیشہ کے عذاب میں ہیں، دونوں فرقوں میں بڑا فرق ہے۔ کسی نے کہا: انکار ہے اس بات کا کہ وہ مرنے میں برابر ہوں جیسے زندگی میں برابر ہوئے۔ کہا ہے کہ یہ آیت مشرکوں میں سے ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی۔ کسی نے کہا کہ بدکار لوگ تو یہ ہیں: عتبہ اور شیبہ فرزندانِ ربیعہ اور ولید بن عتبہ اور نیک لوگ یہ ہیں: سیدنا علی، حمزہ اور عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہم جبکہ بدر کے دن اُن کے ساتھ مقابلے کے لیے میدان میں آئے اور ان کو قتل کر دیا، لیکن عام معنی لینا زیادہ مناسب ہے اگرچہ نزول کا سبب خاص ہو۔

جمہور نے ﴿سَوَآءً﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ خبر مقدم ہے اور متبداء ﴿مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ﴾ ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ان کے اس خیال کا انکار ہے کہ ان کا جینا اور مرنا برابر ہے۔ امام حمزہ، کسائی اور حفص رحمہم اللہ نے بہ نصب پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ ﴿كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے جار ومجرور میں جو ضمیر مستتر ہے اس سے حال ہے، یا اس بنا پر کہ ﴿حَسِبَ﴾ کا مفعولِ ثانی ہے۔ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے قراءتِ نصب کو اختیار کیا ہے اور کہا کہ اس کے معنی یہ ہیں: ''نَجْعَلَهُمْ سَوَاءً'' یعنی ہم ان کو برابر کریں گے۔ امام اعمش اور عیسی بن عمر رحمہما اللہ نے ﴿مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ﴾ پڑھا ہے بہ نصب اس معنی میں ''سَوَاءً فِيْ مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتِهِمْ'' چنانچہ جب حرفِ جر گر گیا تو منصوب ہوگیا، یا بنا بر بدل ﴿نَجْعَلَهُمْ﴾ کے مفعول سے بدلِ اشتمال۔

﴿سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ﴾ یعنی برا ہے ان کا حکم یہ جس کے ساتھ انھوں نے حکم کیا۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ مومن دنیا اور آخرت میں مومن ہے اور کافر دنیا اور آخرت میں کافر ہے۔[2] امام مسروق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مکے والوں میں سے ایک شخص نے مجھ سے کہا: یہ تیرے بھائی تمیم داری کا مقام ہے اور البتہ میں نے واقعی اس کو دیکھا کہ ایک رات قیام کیا، یہاں تک کہ صبح کر دی۔ یا قریب تھا کہ صبح کر دے کتاب اللہ کی ایک آیت پڑھتا تھا، اسی کے ساتھ رکوع وسجدہ کرتا تھا اور روتا تھا، وہ آیت یہ تھی: ﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ﴾۔

حکایت:

سیدنا فضیل رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ اس آیت پر پہنچے تو اس کو بار بار پڑھنے لگے اور روتے اور کہتے تھے:

---

[1] تفسير القرطبي (١٦/١٦٥، ١٦٦) فتح القدير (٥/١١) [2] تفسير الطبري (٢٢/٧٣)

”يَا فُضَيْلُ لَيْتَ شِعْرِيْ مِنْ أَيِّ الْفَرِيْقَيْنِ أَنْتَ“[1] یعنی اے فضیل! کاش میں جان لیتا کہ تو دونوں فریق میں سے کس فریق میں ہے۔

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۲۲ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۭ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۲۳ وَقَالُوْا مَا هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝۲۴ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَاۗىِٕنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۲۵ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۲۶

اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق و عدل کے ساتھ پیدا کیا، تاکہ ہر شخص کو اس کے بدلے میں ٹھیک ٹھیک جزا دی جائے، جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا (22) کیا پھر آپ نے اسے دیکھا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا اور اللہ نے اسے گمراہ کر دیا، جبکہ اسے (حق کا) علم تھا اور اس کے کانوں اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا، پھر کون ہے جو اللہ کے بعد اسے ہدایت دے؟ کیا پھر تم نصیحت نہیں پکڑتے؟ (23) اور انھوں نے کہا: بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، ہم مرتے اور زندہ ہوتے ہیں اور ہمیں بس زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے اور انھیں اس کا کوئی علم نہیں، وہ تو بس گمان کرتے ہیں (24) اور جب ان پر ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں، جو واضح ہوتی ہیں تو ان کی دلیل بس یہی ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں: اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادوں کو لاؤ (25) (اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: اللہ ہی تمھیں زندہ کرتا ہے، پھر وہی تمھیں مارتا ہے، پھر وہی تمھیں روزِ قیامت جمع کرے گا، جس میں کوئی شک نہیں اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (26)

---

[1] تفسير القرطبي (١٦/١٦٦) فتح البيان (١٢/٤٢٣_٤٣٧)

خواہشات کے پجاری:

زمانہ دھر کا نام ہے وہ کچھ کام کرنے والا نہیں مگر کسی اور چیز کو کہتے ہیں جو معلوم نہیں ہوتی اور دنیا میں تصرف اس کا چلتا ہے۔ پھر اللہ ہی کو کیوں نہ کہیں۔ ایسے معنی پر حدیث میں آیا ہے کہ "دَھر" اللہ ہے اس کو برا نہ کہیے، انتھٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے آسمان و زمین کو عدل کے ساتھ بنایا۔ ﴿ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ﴾ کا مطلب یہ ہے: کیا پھر تو نے اس شخص کو دیکھا جو اپنی خواہش کا کہا مانتا ہے جس شے کو اچھا خیال کیا اس کو کر لیا اور جسے برا خیال کیا اسے چھوڑ دیا۔ اس آیتِ کریمہ سے کبھی معتزلہ پر دلیل قائم کی جاتی ہے ان کے اس قول میں کہ کسی شے کو اچھا یا برا سمجھنا عقل سے تعلق رکھتا ہے، شرع کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے، ان کی یہ بات صحیح نہیں ہے، کیوں کہ ساری اشیاء ایسی نہیں ہیں کہ ان کی اچھائی اور برائی صرف عقل سے معلوم ہو جائے، بلکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی خوبی اور نقص عقل سے معلوم نہیں ہو سکتی، بلکہ شریعت سے معلوم ہوتی ہے، اگر صرف عقل سے معلوم ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کی کیوں مذمت فرماتا۔ اس کی بحث علمِ عقائد وغیرہ میں خوب تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ بالجملہ امام مالک رحمہ اللہ سے جو تفسیر مروی ہے اس میں اس کی یہ تفسیر ہے کہ "لَا يَهْوِيْ شَيْئًا إِلَّا عَبَدَهٗ"[1] یعنی نہیں خواہش کرتا کسی شے کی مگر اس کو پوجتا ہے، مطلب یہ ہے کہ جو شے جی کو اچھی لگی اسے پوجنے لگا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ ﴾ میں دو قول کا احتمال ہے: ایک یہ ہے کہ اللہ نے اس کو گمراہ کیا، اس بات کو جاننے کے سبب سے کہ وہ گمراہ کرنے کا مستحق ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کے بعد گمراہ کیا کہ علم اس کو پہنچ گیا اور اس پر حجت قائم ہو چکی۔ دوسرا قول پہلے قول کا لازمی نتیجہ ہے، اس کے برعکس نہیں۔ ﴿ وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ﴾ یعنی پھر وہ نہ اس شے کو سنتا ہے جو اسے فائدہ دے اور نہ اس شے کو یاد رکھتا ہے جس سے ہدایت پائے اور نہ اس حجت کو دیکھتا ہے جس سے روشنی حاصل کرے۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴾. جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٨٦] "جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے، اس کو کوئی راہ پر نہیں لا سکتا اور اللہ تعالیٰ ان کو ان کی گمراہی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیتا ہے۔"

پھر اللہ پاک دھریوں کے قول کی خبر دیتا ہے جو کفار میں سے ہیں اور مشرکینِ عرب میں سے قیامت کا انکار کرنے میں جو اُن کے موافق ہیں: ﴿ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا ﴾ یعنی وہاں نہیں ہے مگر یہی گھر کہ ایک قوم مرتی ہے اور دوسری جیتی ہے اور وہاں نہ کچھ معاد ہے نہ قیامت ہے۔ یہ بات مشرکینِ عرب کہتے ہیں جو

[1] تفسیر ابن کثیر (١٩٠/٤)

قیامت کے منکر ہیں اور فلاسفہ بھی اسی کے قائل ہیں اور ان میں سے الٰہیین ہیں، یہ لوگ بداءۃ ورجعت (لوٹائے جانے) کے منکر ہیں اور اسی کے قائل فلاسفہ، دہریہ دوریہ ہیں جو خالق و پروردگار کے منکر ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ہر چھتیس ہزار برس میں ہر شے اس حال کی طرف لوٹ کر آتی ہے جس میں وہ تھی اور گمان کیا ہے کہ یہ عمل کئی بار ہو چکا ہے اور یہ سلسلہ ختم نہیں ہوتا، چنانچہ ان لوگوں نے معقول شے کا مقابلہ کیا اور منقول شے کو جھٹلایا، اسی لیے یوں کہا: ﴿ وَمَا يُهْلِكُنَآ إِلَّا الدَّهْرُ ﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴾ یعنی ان کو اس کی کچھ خبر نہیں ہے، وہ تو یہی وہم اور خیال کرتے ہیں، اٹکل پچو باتیں بناتے ہیں۔ اب رہی وہ حدیث شریف جس کو صاحبِ صحیح، ابو داود اور نسائی رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود پا سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مجھ کو ابنِ آدم ایذا دیتا ہے، وہ دھر کو گالی دیتا ہے اور میں دھر ہوں، میرے ہاتھ میں کام ہے، میں اس کے شب و روز کو لوٹتا پوٹتا ہوں۔[1] ایک روایت میں ہے کہ دھر کو گالی مت دو، چنانچہ بے شک اللہ تعالیٰ ہی دھر ہے۔[2] اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے نہایت درجے کے غریب سیاق سے عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو روایت کیا ہے، فرمایا کہ اہلِ جاہلیت کہا کرتے تھے کہ ہم کو تو یہی شب و روز ہلاک کرتا ہے اور یہی وہ ہے جو ہم کو ہلاک کرتا ہے مارتا ہے اور ہم کو زندہ کرتا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ إِلَّا الدَّهْرُ ﴾ اور دھر کو گالی دیتے تھے تو اللہ عزوجل نے فرمایا کہ دھر کو ابن آدم گالی دیتا ہے اور میں دھر ہوں، اس طرح مجھے تکلیف دیتا ہے۔ میرے ہاتھ میں کام ہے، میں شب و روز کو اُلٹ پلٹ کرتا ہوں۔[3] (وكذا رواه ابن أبي حاتم عن أحمد بن منصور عن شريح بن النعمان عن أبي عيينة مثله) پھر عن ابن وہب عن یونس عن الزہری عن ابی سلمۃ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، کہا: میں نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابنِ آدم دھر کو گالی دیتا ہے اور میں دھر ہوں، میرے ہاتھ میں شب و روز ہیں۔[4] (وأخرجه صاحب الصحيح و النسائي من حديث يونس بن يزيد به)

محمد بن اسحاق نے عن العلاء بن عبدالرحمٰن عن ابیہ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندے سے قرض مانگا اور اس نے مجھے نہیں دیا اور میرے بندے نے مجھے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٤٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢٧٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٥٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٤٦) [3] تفسير الطبري (٢٢/٧٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٤٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٥٧)

گالی دی، وہ کہتا ہے: «وَا دَهْرَاهُ وَأَنَا الدَّهْرُ» یعنی زمانے کو روتا اور کوستا ہے اور میں دھر ہوں۔[1] (یہ جملہ بہ ظاہر جوابِ شرط ہے اور جملہ شرطیہ اوپر گزر چکا ہے۔ اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے اب رہی وہ حدیث الخ)۔

چنانچہ امام شافعی اور ابو عبیدہ رحمہ اللہ وغیرہما نے من جملہ ائمہ تفسیر میں نبی کریم ﷺ کے اس قول «لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ» کے متعلق کہا ہے کہ عرب اپنی جاہلیت میں جب ان کو کوئی سختی یا آزمائش یا خواری پہنچتی تو کہتے تھے: ''يَا خَيْبَةَ الدَّهْرِ'' چنانچہ ان افعال کی نسبت دھر کی طرف کرتے اور اس کو گالیاں دیتے تھے، حالانکہ ان کا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے تو گویا انھوں نے اللہ عزوجل ہی کو گالی دی، اس لیے کہ حقیقتاً ان کا کرنے والا وہی ہے، اسی لیے دھر کو گالی دینے سے منع کیا گیا، اس لحاظ سے کیوں کہ اللہ تعالیٰ ہی وہ دھر ہے جس کو وہ مراد رکھتے تھے اور اس کی طرف ان افعال کی نسبت کرتے تھے۔ یہ قول ان قولوں میں سے بہتر اور خوب تر ہے جو اس کی تفسیر میں کہے گئے ہیں اور یہی مراد ہے۔ واللہ أعلم.

امام ابن حزم رحمہ اللہ نے اور ظاہریہ میں سے اس شخص نے جو اُن کی چال چلا ہے، اس بات میں غلطی کی کہ اس حدیث شریف سے اَخذ کر کے دھر کو اسمائے حسنیٰ میں شمار کیا،[2] یعنی اس لیے کہ اللہ پاک کے نام توقیفی ہیں، جب تک کہ شارع علیہ السلام سے کسی نام کی تصریح نہ آجائے تب تک اس کا اطلاق درست نہیں ہے، گو قرآن شریف ہی سے ماخوذ کیوں نہ ہو۔ مثلاً ''ماھد'' یا ''زارع'' ﴿الْمٰهِدُوْنَ﴾ اور ﴿الزّٰرِعُوْنَ﴾ سے اَخذ کر کے اطلاق نہ کریں گے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت ان پر دلیل قائم کی جائے اور ان سے حق بیان کیا جائے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ بدنوں کے فنا اور متفرق ہو جانے کے بعد ان کے دہرانے پر قادر ہے تو اُن کی حجت یہی ہوتی ہے کہ ہمارے باپ دادوں کو لے آؤ، یعنی اگر وہ بات جو تم کہتے ہو سچ ہے تو ان کو زندہ کر دو۔ اللہ پاک نے فرمایا: تو کہہ دے کہ اللہ تم کو زندہ کرتا ہے، پھر تم کو مارتا ہے، یعنی جس طرح تم اس کا مشاہدہ کر رہے ہو کہ تم کو عدم سے وجود کی طرف نکالا، کیوں کر منکر ہوتے ہو اللہ کے، حالاں کہ تم مردے تھے پھر اس نے تم کو زندہ کیا، پھر تم کو مارے گا، پھر زندہ کرے گا۔

یعنی جو ذات پاک ابتداء پر قادر ہے، وہی بہ طریقِ اولیٰ لوٹانے پر بھی قادر ہے اور وہی ہے جو مخلوق کو پہلی دفعہ بناتا ہے، پھر اس کو دہرائے گا اور یہ دھرانا اس پر بہت آسان ہے، پھر تم کو روزِ قیامت کی طرف جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں ہے، یعنی وہ تو تم کو قیامت ہی کے دن جمع کرے گا، تم کو دنیا کی طرف نہیں لوٹائے گا یہاں تک کہ تم یوں کہو: ﴿ائْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ﴾ [التغابن: ٩] ''جس دن تم سب کو اس جمع ہونے کے دن جمع کرے گا۔'' نیز فرمایا: ﴿لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ﴿12﴾

[1] مسند أحمد (٢/٣٠٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٧٩٧٥)
[2] تفسیر ابن کثیر (٤/١٩١)

﴿ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ﴾ [المرسلات: ١٢۔ ١٣] ''کس دن کے لیے (ان سب کو) موخر کیا گیا ہے؟ فیصلے کے دن کے لیے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴾ [ھود: ١٠٤] ''اسے ہم جوملتوی کرتے ہیں وہ صرف ایک مدتِ معین تک ہے۔''

نیز اس جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ یعنی اس میں کسی طرح کا شک نہیں ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، یعنی اسی لیے معاد کا انکار کرتے ہیں اور جسموں کے اٹھنے کو بعید سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ﴾ [المعارج: ٦۔ ٧] ''بے شک یہ اس (عذاب) کو دور سمجھ رہے ہیں اور ہم اسے قریب ہی دیکھتے ہیں۔'' یعنی وہ تو اس کے واقع ہونے کو بعید خیال کرتے ہیں اور مومنین اس کو آسان اور قریب اعتقاد کرتے ہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع توضیح و اتقان یہ ہے کہ ﴿ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ﴾ نفیِ استواء (برابر نہ ہونا) کے لیے دلیل کی طرح ہے جس کا ذکر پہلے ہوا ہے۔ اور ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال فاعل سے یا مفعول سے۔ یا حرفِ باء سببیہ ہے، یعنی مومنین اور کافرین مرنے اور جینے میں برابر نہ ہوں گے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو بنایا ہے، اس حال میں کہ وہ حق ہیں، یا وہ دونوں حق کے ساتھ متلبس ہیں جو اس بات کا مقتضی ہے کہ بندوں کے درمیان عدل کیا جائے۔ یا ان کو بہ سبب حق کے پیدا کیا ہے اور ﴿ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴾ معطوف ہے ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ پر، اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک سبب ہے تو سبب کا سبب پر عطف کیا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ محذوف پر معطوف ہو ''أَيْ: خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ، لِيَدُلَّ بِهِمَا عَلَى قُدْرَتِهِ''

﴿ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴾ یعنی اللہ نے آسمان و زمین کو حق کے ساتھ بنایا تاکہ ان سے اپنی قدرت بتائے اور تاکہ ہر نفس اس شے کا بدلہ دیا جائے جو اس نے کمائی، معصیت اور طاعت۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے جائز رکھا ہے کہ حرفِ لام صیرورت کے لیے ہو ''أَيْ: صَارَ الْأَمْرُ مِنْ حَيْثُ اهْتَدَى بِهَا قَوْمٌ وَضَلَّ بِهَا قَوْمٌ آخَرُوْنَ''[2] یعنی اللہ نے آسمان و زمین کو حق کے ساتھ بنایا اور اس لیے کہ ہر شخص اپنی کمائی کا بدلہ دیا جائے۔ یعنی آسمان و زمین کے بنانے کا انجام کار یہ ہوگیا کہ ہر جی کو اس کی کمائی کا بدلہ ملے اس لحاظ سے کہ ایک قوم نے تو ان سے ہدایت پائی، وہ سمجھے کہ ان کا بنانے والا کوئی عظیم القدرت ذات ہے تو اس پر ایمان لائے، اس کی توحید کے مطیع اور فرماں بردار ہوئے اور نیکیاں کیں۔ اور ایک قوم کے لوگ ان سے گمراہ ہوگئے، وہ سمجھ بیٹھے کہ جو کچھ ہے یہی ہے، اس کا کوئی بنانے والا نہیں، یہ کارخانہ ہمیشہ سے یوں ہی چلا آتا ہے تو وہ صانع اور مالک کے اور روزِ معاد کے منکر ہوئے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١٩٠/٤، ١٩١) [2] المحرر الوجیز لابن عطیة (٨٦/٥)

چونکہ جزا کا ذکر ہوا تو شاید یہ وہم ہو کہ جزا ہو، مگر پوری پوری نہ ہو، اس لیے فرمایا ﴿ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴾ یعنی وہ تمام نفوس ظلم نہ کیے جائیں گے، اس طرح سے کہ ثواب میں کمی یا عذاب میں زیادتی ہو، ایسا ہرگز نہ ہوگا، بلکہ پوری پوری کانٹے کی تول جزا ملے گی۔ اہلِ سنت ۔كَثَّرَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى۔ کے ہاں قاعدہ ہے کہ مالک کو اپنے ملک پر اختیار ہے، وہ جو چاہے اس میں تصرف کرے، وہ ظالم نہیں کہ اسے اختیار ہے جس کے ثواب میں چاہے کمی کر دے اور جس کو چاہے اس کا عذاب زیادہ کر دے۔ اللہ پاک کے حق میں یہ ہرگز ظلم نہیں۔ چنانچہ اس قاعدے کی بنا پر ثواب کی کمی اور عذاب کی زیادتی کا نام ظلم رکھ کر اس کی نفی کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بات کا بیان کرنا منظور ہے کہ اللہ پاک کے لطف وکرم کی بارگاہِ عالی جاہ اس امر سے حد درجہ منزہ اور پاک ہے۔ اس کے بے پایاں لطف وکرم کو ملاحظہ کرو کہ جو شے اس کے حق میں ظلم نہیں ہے، اس کو ظلم کے قائم مقام ٹھہرایا، کون سا ظلم جس کا اس سے صادر ہونا محال ہے، پھر اس کی نفی کی، یا اس کا نام ظلم رکھا بہ نظر اس کے کہ اس کا صدور ہم سے ہوتا ہے جس طرح کہ ابتلاء واختبار میں ہے، یعنی بہ نسبت اللہ تعالیٰ کے کوئی فعل ظلم نہیں ہوتا اور وہ لوگوں کے ساتھ وہ فعل نہیں کرتا کہ اگر اس کو اس کے علاوہ کوئی اور کرے تو وہ ظلم ہو، چنانچہ ابتلاء واختبار سے مراد اس شے کا کرنا ہے کہ اگر اس کو کوئی اور کرتا تو وہ ابتلاء واختبار ہوتا۔

بالجملہ پھر اللہ پاک نے کفار کے حال کی اور ان کی قباحتوں کی تشریح کرنا شروع کیا اور ان کے حال سے، تعجب دلایا، چنانچہ ارشار فرمایا: ﴿ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ﴾ یعنی کیا پھر تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود ٹھہرایا۔ امام حسن اور قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ کافر ہے کہ اس نے اپنا دین اس شے کو ٹھہرایا جس کو وہ چاہتا ہے اور جو اس کے جی کی خواہش ہے۔ چنانچہ وہ جس شے کی خواہش کرتا ہے اس پر سوار ہو جاتا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اس شے کو پوجتا ہے جس کی خواہش کرتا ہے، یا اس کو مستحسن سمجھتا ہے، چنانچہ جب کسی شے کو اچھا سمجھا اور اس کی خواہش کی تو اس کو معبود ٹھہرا لیا۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک پتھر کو پوجا کرتا، پھر جب کوئی ایسا پتھر دیکھتا جو اس سے خوبصورت ہے تو اس کو پھینک دیتا اور دوسرے کو پوجنے لگتا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: یہ کافر ہے کہ اس نے اپنا دین اللہ کی ہدایت کے اور کسی برہان کے بغیر ٹھہرا لیا۔[1] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ نفسانی خواہش کا بڑا مطیع ہے، وہ اس شے کی پیروی کر لیتا ہے جس طرف اس کی خواہش اسے بلاتی ہے تو گویا وہ اس کو پوجتا ہے جس طرح کہ آدمی اپنے معبود کو پوجتا ہے۔[2]

﴿ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ ﴾ یعنی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اس علم پر بہکایا جس کو وہ جان چکا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اس کو اللہ نے اپنے سابق علم میں بہکایا۔[3] کسی نے کہا ہے کہ اللہ نے اس کو ثواب سے

[1] تفسير الطبري (٧٦/٢٢) تفسير القرطبي (١٦٦/١٦، ١٦٧) [2] تفسير النسفي (١٣٢/٤) [3] تفسير الطبري (٢٦/٢٢)

بہکایا، اس سے اس بات کو جان لینے پر کہ وہ اس ثواب کا مستحق نہیں ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے اس بات کو جان لینے پر کہ وہ گمراہ ہے، اس لیے کہ وہ یہ جانتا ہے کہ بت نہ نفع دیتا ہے نہ ضرر۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "عَلَى سَبْقٍ فِي عِلْمِهِ أَنَّهُ ضَالٌّ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَهُ"[1] یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کو بہکایا، اس کے علم میں اس کی پیدائش سے پہلے یہ بات سابق ہونے پر کہ وہ گمراہ ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ کہتے ہیں: "أَضَلَّهُ وَهُوَ عَالِمٌ بِالْحَقِّ" یعنی اس کو اللہ نے گمراہ کیا اس حال میں کہ وہ شخص حق کا عالم تھا۔ یہ بات اس پر زیادہ سخت سرزنش کی ہے۔ اس معنی کی بنا اس پر ہے کہ ﴿عَلٰى عِلْمٍ﴾ حال ہے ﴿اَضَلَّهٗ﴾ کی ضمیر مفعول سے، اس پر کہ سب معانی کی بنیاد اس پر تھی کہ حال ہے فاعل سے۔

﴿وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً﴾ یعنی اس کے کان پر مہر لگا دی کہ وعظ نہ سنے اور اس کے دل پر مہر لگا دی تاکہ ہدایت کو نہ سمجھے بوجھے اور اس کی آنکھ پر ظلمت کا پردہ ڈال دیا کہ سیدھی راہ کو نہ دیکھ سکے۔ جمہور نے ﴿غِشٰوَةً﴾ بہ الف مع کسرِ غین پڑھا ہے اور امام حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے "غَشْوَةً" بغیر الف مع فتحِ غین پڑھا ہے اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور امام اعمش رحمہ اللہ نے جمہور کی قراءت کی طرح مع فتحِ غین پڑھا ہے، یہ ربیعہ کا لغت ہے اور امام حسن اور اعمش رحمہما اللہ نے بہ ضمِ غین پڑھا ہے یہ عُکل کا لغت ہے۔[2] ﴿فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾ یعنی پھر کون اس کو اللہ کے بے راہ کرنے کے بعد راہ پر لائے، یعنی وہ راہ پر نہ آئے گا، کیا پھر تم سوچتے نہیں ہو عبرت کی نگاہ سے، تاکہ تم حقیقت حال کو جان لو۔

پھر اللہ پاک نے بعث کے منکرین کی بعض جہالات اور ضلالات بیان کیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَقَالُوْا مَا هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا﴾ یعنی بعث کے منکروں نے کہا: نہیں ہے حیات مگر وہی جس میں ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں، یعنی دنیا میں ہم کو موت اور حیات پہنچتی ہے اور اس کے سوا کوئی حیات نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہم خود تو مرتے ہیں اور ہماری اولاد اس میں زندہ رہتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہم نطفۂ مردہ ہوتے ہیں، پھر ہم زندہ ہو جاتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ آیت میں تقدیم و تاخیر ہے "أَيْ: نَحْيَى وَنَمُوتُ" اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔[3] ہر تقدیر پر اس قول سے ان کی مراد بعث کا انکار اور آخرت کی تکذیب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ بات تناسخ والوں کے کلام سے ہے، یعنی آدمی مرتا ہے، پھر اس کی روح کسی مردے میں رکھی جاتی ہے تو وہ اس سے زندہ ہو جاتا ہے۔

﴿وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ﴾ اصل میں "دہر" بقائے عالم کی مدت کو کہتے ہیں۔ یہ ماخوذ ہے: "دَهَرَهُ إِذَا غَلَبَهُ" سے۔ قاموس میں ہے: "دَهَرَهُمْ أَمْرٌ كَمَنَعَ: نَزَلَ بِهِمْ مَكْرُوْهٌ فَهُمْ مَدْهُوْرٌ بِهِمْ وَمَدْهُوْرُوْنَ"[4]

[1] فتح القدير (٥/١١) [2] فتح القدير (٥/١١) [3] تفسير القرطبي (١٦/١٧٠) [4] القاموس المحيط (١/٥٠٥)

کسی نے "إِلَّا دَهْرٌ يَمُرُّ" پڑھا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ نہیں ہلاک کرتا ہم کو مگر راتوں کا اور دونوں کا گزرنا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی برسوں کا اور دنوں کا گزرنا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "إِلَّا الْعُمُرُ"یعنی مگر عمر کا گزرنا، معنی ایک ہی ہیں۔ امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الْمَوْتُ"، یعنی ہلاک نہیں کرتی ہم کو مگر موت۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مگر اللہ۔[1] اس کی بنا اس پر ہے کہ "دھر" اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ وفيه ما فيه۔ چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔

بالجملہ اس حصر سے ان کی مراد اس بات کا انکار ہے کہ موت ملک الموت کے واسطے سے ہو۔ وہ ملک الموت کا اور اللہ کے اِذن سے روحوں کے قبض کرنے کا انکار کرتے تھے اور ہر حادثہ جو رونما ہوتا، اس کی نسبت دھر اور زمانے کی طرف کرتے۔ دیکھو ان کے اشعار شکوہ روزگار سے پُر ہیں اور وہ یہ خیال کرتے تھے کہ جانوں کے ہلاک ہونے میں اسی شب و روز کے گزرنے کا اثر ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ﴾ یعنی وہ جو مستقل طور پر حادثات کی نسبت افلاک کی حرکت کی طرف کرتے ہیں اور اس شے کی طرف جو اس سے متعلق ہے تو ان کو اس کا کچھ علم نہیں ہے۔

پھر بیان فرمایا کہ یہ بات ان سے علم کے بغیر صادر ہوئی ہے: ﴿ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴾ یعنی وہ نہیں ہیں مگر ایک ہی قوم کہ جو کچھ اُن کے پاس ہے وہ یہی ظن ہے، چنانچہ اسی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں اور اس کی سند لاتے ہیں، اس کی حقیقت کو نہیں جانتے۔ پھر ان کی ایک اور جہالت ذکر فرمائی: ﴿ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ ﴾ یعنی جب ان پر قرآن کی آیتیں اس حال میں پڑھی جاتی ہیں کہ ان کے معنی ظاہر ہیں اور بعث پر کھلی کھلی دلالت کرتے ہیں، یا وہ اس شے کو بیان کرتے ہیں جو ان کے اعتقاد کے خلاف ہے۔ (كما قاله الكرخي)

تو ان کی حجت صرف یہی ہوتی ہے کہ ہمارے آباء کو زندہ کر کے لے آؤ، اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ ہم موت کے بعد مبعوث ہوں گے۔ یعنی ان کے پاس کوئی ایسی حجت اور سند نہیں ہوتی جس سے وہ حق کا مقابلہ کریں، سوائے اسی قولِ باطل کے جس کا حجت سے کچھ تعلق نہیں۔ اس کا نام جو حجت رکھا، باوجود اس کے کہ یہ کوئی حجت نہیں ہے تو صرف اس لیے کہ انھوں نے اس کو اس طرح سے پیش کیا ہے جس طرح کہ حجت کرنے والا اپنی حجت پیش کرتا ہے اور حجت کی جگہ اس کو لائے ہیں، چنانچہ بطور سخریہ (مذاق) اس کا نام حجت رکھ دیا ہے، یا اس لیے کہ ان کے خیال اور اندازے کے مطابق وہ حجت ہے۔

پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو امر فرمایا کہ ان کی بات کو یوں رد کر دیں: ﴿ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی تو کہہ دے کہ اللہ تم کو دنیا میں زندگی بخشتا ہے، پھر تمھاری اَجلوں کے پورا ہو جانے پر تم کو مارتا ہے، پھر تم کو قیامت کے دن بعث اور نشور (زندہ اور کھڑا کر کے) کے ساتھ جمع کرے گا۔ تمھارے جمع کرنے میں کسی طرح کا شک نہیں ہے، اس لیے کہ جو

---

[1] تفسير القرطبي (١٦/ ١٧٠، ١٧١)

ذات پاک تمھاری پہلی دفعہ پیدائش پر قادر ہے، وہی اس کے اعادے پر بھی قادر ہے۔ اس میں ان کے اس قول کا رد ہے: ﴿ وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ ﴾ لیکن اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے، اس لیے کہ انھوں نے دلیلوں میں غور وفکر کرنے سے اعراض کیا، اسی لیے ان کو بعث میں شک ہوا ہے اور اس کو دور کرنے میں ایسی دلیل لائے جو مکڑی کے جالے سے بھی بڑھ کر کمزور ہے اور اگر وہ اس طرح غور کرتے، جیسا کہ غور کرنے کا حق ہے تو ان کو علم یقین حاصل ہو جاتا اور وہ اپنی جان کو شک وحیرت میں ڈالنے سے بچا لیتے۔ پھر جب اللہ پاک مشرکوں کی حجت اور اس کا جواب ذکر کر چکا تو بادشاہت کے ساتھ اپنی خصوصیت کا ذکر کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ
يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿٢٧﴾ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ
اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٨﴾ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ
اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٩﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿٣٠﴾ وَاَمَّا
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۫ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ
قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿٣١﴾ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ
فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا
نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ﴿٣٢﴾ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا
كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٣٣﴾ وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ
يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٣٤﴾ ذٰلِكُمْ
بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ
فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿٣٥﴾ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ
السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٦﴾ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۪ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٣٧﴾

اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور جس دن قیامت برپا ہوگی، اس دن

---

[1] فتح البیان (۱۲/۴۲۷۔۴۳۱)

باطل پرست خسارے میں رہیں گے ㉗ اور آپ ہر امت گھٹنوں کے بل (گری) دیکھیں گے، ہر اُمت اپنے نامۂ اعمال کی طرف بلائی جائے گی (انھیں کہا جائے گا:) آج تمھیں ان (اعمال) کا بدلہ دیا جائے گا جو عمل تم کرتے رہے تھے ㉘ (کہا جائے گا:) یہ ہماری کتاب ہے، یہ تمھارے متعلق سچ سچ بولتی ہے۔ بلاشبہ ہم لکھواتے تھے جو تم عمل کرتے رہے تھے ㉙ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، تو اللہ انھیں اپنی رحمت (جنت) میں داخل کرے گا۔ یہی واضح کامیابی ہے ㉚ اور ہاں! جن لوگوں نے کفر کیا (ان سے کہا جائے گا:) کیا پھر تم پر میری آیات تلاوت نہیں کی جاتی تھیں؟ تو تم نے تکبر کیا اور تم مجرم لوگ تھے ㉛ اور جب (تم سے) کہا جاتا کہ بلاشبہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت (کے آنے) میں کوئی شک نہیں تو تم کہتے تھے: ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہے ہمیں (قیامت کا) یونہی خیال سا آتا ہے اور ہم (اس پر) یقین نہیں کر سکتے ㉜ اور ان کے سامنے ان کے اعمال کی برائیاں ظاہر ہو جائیں گی اور انھیں وہ عذاب گھیر لے گا، جس کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے ㉝ اور (ان سے) کہا جائے گا: آج ہم تمھیں بھول جائیں گے، جیسے تم اپنے اس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے اور تمھارا ٹھکانا آگ ہے اور تمھارا مددگار کوئی نہیں ㉞ یہ اس لیے کہ بے شک تم نے اللہ کی آیات کو مذاق بنا لیا اور تمھیں دنیاوی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا تھا، لہٰذا آج وہ اس (آگ) سے نہیں نکالے جائیں گے اور نہ ان سے اللہ کو راضی کرنے کا مطالبہ ہی کیا جائے گا ㉟ چناں چہ تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں کا رب ہے اور زمین کا رب ہے، جہانوں کا رب ہے ㊱ اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے بڑائی ہے اور وہی نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے ㊲

قیامت کے دن کی ہولناکیاں:

ہر امت زانو پر گری ہوئی ہے، یعنی عاجزی کرنے کے لیے گھٹنوں پر بیٹھے ہیں۔ یہ جو کہا کہ آج ہم تمھیں بھلا دیں گے، یعنی پھر تم پر مہربانی نہ کریں گے۔ دنیا کی زندگی نے تمھیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا کہ جیسے ہم کافر دنیا میں مسلمانوں کے مقابلے میں زور آور ہیں، وہاں پر بھی یہی زور چلے گا۔ انتھٰی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ وہ آسمانوں کا اور زمین کا مالک ہے اور دنیا اور آخرت میں ان کا حاکم ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا اور جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن جھٹلانے والے لوگ نقصان میں ہوں

گے، یہ وہ ہیں جنھوں نے اللہ کے ساتھ کفر کیا اور اس نے جو آیاتِ بینات اور واضح دلائل اپنے رسولوں پر نازل کیے ان کا انکار کیا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سفیان ثوری رحمہ اللہ مدینے میں آئے تو انھوں نے معافری کو سنا کہ وہ کچھ باتیں کر کے لوگوں کو ہنساتا ہے، تو سفیان رحمہ اللہ نے اس سے کہا: اے شیخ! کیا تم نے جانا کہ اللہ کے لیے ایک دن ہے کہ اس میں مبطل لوگ زیاں کار ہوں گے، پھر اس بات کا اتنا اثر ہوا کہ معافری پر پہچانا جاتا تھا، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملے۔[1] یعنی اس بات کی تاثیر اس کے جی میں رہی اور اس کا اثر معلوم ہوتا تھا، کیوں کر نہ ہو سفیان جیسا واعظ اور ایسی موثر تبلیغ اور جس کو کہا گیا وہ ایسا قابل مادہ اور اللہ پاک کی تائید۔ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى.

پھر فرمایا اور دیکھے تو ہر گروہ کو کہ اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھے ہیں مارے شدت وعظمت کے۔ کہتے ہیں: یہ اس وقت ہوگا جب جہنم کو لائیں گے تو وہ ایک ایسی چیخ مارے گی کہ کوئی نہ بچے گا مگر وہ اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ جائے گا، یہاں تک کہ ابراہیم خلیل علیہ السلام بھی اور کہیں گے: "نَفْسِي نَفْسِي نَفْسِي" یعنی آج میں تجھ سے سوال نہیں کرتا ہوں مگر اپنے نفس کا اور یہاں تک کہ عیسیٰ علیہ السلام البتہ کہیں گے: آج میں سوال نہیں کرتا مگر اپنے نفس کا اور سوال نہیں کرتا تجھ سے مریم علیہا السلام کا جس نے مجھے جنا ہے۔ امام مجاہد، کعب احبار اور حسن بصری رحمہم اللہ فرماتے ہیں: ﴿ كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ﴾ "أَيْ: عَلَى الرُّكَبِ" یعنی ہر گروہ اپنے گھٹنوں پر بیٹھے گا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ جَاثِيَةً ﴾ "مُتَمَيِّزَةً عَلَى نَاحِيَتِهَا وَلَيْسَ عَلَى الرُّكَبِ"[2] یعنی جاثیہ سے یہ مراد ہے کہ ہر فرقہ اپنے کنارے پر جدا جدا بیٹھا ہوگا۔ گھٹنوں پر بیٹھنا مراد نہیں ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ لغوی معنی کے مطابق ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبداللہ بن باباہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: « كَأَنِّي أَرَاكُمْ جَاثِيْنَ بِالْكَوْمِ دُوْنَ جَهَنَّمَ »[3] ("کوم" بالفتح "کومة" کی جمع ہے، یعنی متفرق بلند جگہیں)۔ یعنی گویا میں تم کو دیکھ رہا ہوں کہ جہنم کے پاس متفرق بلند جگہوں پر بیٹھے ہوئے ہو۔ اسماعیل بن رافع مدینی عن محمد بن کعب عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً حدیثِ صور میں راوی ہیں: "فَيَتَمَيَّزُ النَّاسُ وَتَجْثُو الْأُمَمُ" یعنی جدا جدا ہو جائیں گے لوگ اور اُمتیں گھٹنوں کے بل بیٹھیں گی۔ یہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ﴾[4] اس قول میں جمع بین القولین ہے اور کچھ تضاد نہیں ہے۔ واللہ أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ﴾ "أَيْ: كِتَابِ أَعْمَالِهَا" یعنی ہر امت اپنے نامۂ اعمال کی طرف بلائی جائے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ

[1] تفسیر ابن کثیر (۱۹۱/٤) [2] تفسیر الطبري (۸۲/۲۲) تفسیر ابن کثیر (۱۹۲/٤)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۲۹۲/۱۰) یہ روایت مرسل ہے۔

[4] تفسیر ابن کثیر (۱۹۲/٤) اس کی سند میں "اسماعیل بن رافع" ضعیف راوی ہے۔

﴿ وَالشُّهَدَآءِ ﴾ [الزمر: ٦٩] ''اور نامۂ اعمال حاضر کیے جائیں گے، نبیوں اور گواہوں کو لایا جائے گا۔'' اسی لیے اللہ سبحانہ نے فرمایا ہے: ﴿ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی آج تم اپنے اعمال کے خیر وشر کا بدلہ دیے جاؤ گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ ۝ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ﴾ [القیامۃ: ١٣۔ ١٥] ''آج انسان کو اس کے آگے بھیجے ہوئے اور پیچھے چھوڑے ہوئے سے آگاہ کیا جائے گا۔ بلکہ خود انسان اپنے اوپر آپ حجت ہے اگرچہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔''

اسی لیے اللہ جل جلالہ نے یوں فرمایا: ﴿ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ﴾ یعنی تمھارے سارے اعمال بغیر کمی بیشی کے حاضر کیے جائیں گے، جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴾ [الکہف: ٤٩] ''اور نامۂ اعمال سامنے رکھ دیے جائیں گے پس تو دیکھے گا کہ گناہ گار اس کی تحریر سے خوفزدہ ہو رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے: ہائے ہماری خرابی یہ کیسی کتاب ہے جس نے کوئی چھوٹا بڑا بغیر گھیرے کے باقی ہی نہیں چھوڑا، اور جو کچھ انھوں نے کیا تھا سب موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم وستم نہ کرے گا۔''

قولہ عزوجل: ﴿ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی ہم نگہبان فرشتوں کو حکم کرتے تھے کہ تمھارے اعمال تم پر لکھتے جائیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ فرماتے ہیں کہ فرشتے بندوں کے اعمال لکھتے ہیں، پھر ان کو لے کر آسمان کی طرف چڑھتے ہیں، پھر ان فرشتوں سے مقابلہ کرتے ہیں جو اعمال کے دفتر میں ہیں اس شے پر جو فرشتوں کے ہاتھوں میں ہے، اس شے کے ساتھ جس کو لوحِ محفوظ سے ان کے لیے ظاہر کیا ہے۔ ہر رات میں اس شے کے اندازے کے مطابق جس کو اللہ تعالیٰ بندوں کو پیدا کرنے سے پہلے ہی ان کے ہر قدم کے بارے میں لکھ چکا ہے، پھر نہ تو ایک حرف کو زیادہ کرتا ہے نہ کم کرتا ہے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾[1]

مومنوں کی جزاء اور کافروں کی سزا:

قولہ سبحانہ وتعالیٰ: ﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ﴾ اللہ پاک اپنی خلق میں جو حکم قیامت کے دن کرے گا اس کی خبر دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: پھر وہ لوگ جن کے دل ایمان لائے اور اُن کے اعضاء نے وہ اعمالِ صالح کیے جو خالص اسی کے لیے ہیں اور شریعت کے مطابق ہیں تو اُن کو اپنی رحمت یعنی بہشتِ عنبر سرشت میں داخل کرے گا، جیسا کہ صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت سے فرمایا: تو میری رحمت ہے، میں تیرے ساتھ اس شخص پر رحم کرتا ہوں جس کو چاہتا ہوں۔[2] ﴿ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴾ یعنی جنت میں

[1] تفسير ابن كثير (١٩٢/٤) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤٦)

داخل ہونا یہی ہے کہ ظاہر اور واضح مراد لی جائے۔

پھر فرمایا: ﴿ وَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَفَلَمْ تَكُنْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰى عَلَیْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ ﴾ یعنی جو منکر ہوئے ان کو ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکانے کے لیے یوں کہیں گے: کیا تم پر اللہ کی آیتیں نہیں پڑھی گئیں، پھر تم نے ان کی پیروی کرنے سے تکبر کیا اور ان کے سننے کے وقت منہ موڑا اور تم اپنے افعال کے لحاظ سے ایک مجرم قوم تھے، اس تکذیب کے ساتھ جس پر تمھارے دل مشتمل تھے۔ ﴿ وَ اِذَا قِیْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ السَّاعَةُ لَا رَیْبَ فِیْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِیْ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت تم سے کہا جاتا، یعنی مومن لوگ تم سے کہتے کہ اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے اور قیامت میں کچھ دھوکا نہیں ہے تو تم کہتے کہ ہم ساعت کو پہچانتے نہیں ہیں ہم تو اس کے واقع ہونے کا وہم نہیں کرتے مگر ایک تو ہم مرجوح (جھولے کی طرح کا وہم)۔ اسی لیے یوں کہا: ﴿ وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ ﴾ یعنی ہم تو اس کے یقین کرنے والے اور حق سمجھنے والے نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ بَدَا لَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ یعنی ان کو ان کے بداعمال کی سزا ظاہر ہوگئی اور اُن کو اس عذاب اور تکلیف نے گھیر لیا جس کے ساتھ ٹھٹھا کیا کرتے تھے۔ ﴿ وَ قِیْلَ الْیَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا وَ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴾ اور کہا گیا: آج ہم تم سے اس شخص کا سا معاملہ کریں گے جو تم کو جہنم کی آگ میں بھول جائے، جیسے: تم اس دن کے ملنے کو بھول گئے تھے۔ یعنی پھر تم نے اس دن کے لیے عمل نہ کیا، اس لیے کہ تم نے اس کی تصدیق نہیں کی اور تمھارا ٹھکانا آگ ہے اور تمھارا کوئی مددگار نہیں ہے۔ صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض بندوں سے قیامت کے دن فرمائے گا: کیا میں نے تیری شادی نہیں کر دی؟ کیا میں نے تیرا اکرام نہیں کیا؟ کیا میں نے تیرے لیے گھوڑے اور اُونٹ مسخر نہیں کر دیے تھے؟ «وَأَذَرْكَ تَرْأَسُ وَتَرْبَعُ» (”وَأَلَمْ أَذَرْكَ“ معلوم ہوتا ہے۔ واللّٰه أعلم)۔ یعنی اور کیا میں نے تجھ کو اس حال میں نہیں چھوڑا کہ تو سرداری کرتا ہے؟ اور چار زانو ہو کر مسند پر بیٹھتا ہے؟ تو وہ عرض کرے گا: ہاں، یا رب! پھر فرمائے گا: کیا پھر تو نے یہ خیال کیا کہ تو مجھ سے ملنے والا ہے؟ تو وہ کہے گا: نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: پس آج میں تجھ کو بھولتا ہوں جس طرح تو مجھ کو بھولا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ﴾ یعنی ہم نے جو تم کو یہ بدلہ دیا، وہ اس لیے کہ اللہ کی جو حجتیں تم پر تھیں، تم نے ان کو ٹھٹھا ٹھہرایا، یعنی تم ان سے ہنسی اور ٹھٹھا کرتے تھے اور تم کو دنیا کی زندگی نے مغرور کر دیا، یعنی اس نے تم کو فریب دیا اور تم اس کی طرف سے مطمئن ہو بیٹھے، اس لیے تم زیاں کاروں میں سے

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۹۶۸)

ہو گئے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُونَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴾ یعنی پس آج وہ آگ سے نہ نکلیں گے اور نہ اُن سے کوئی منانا (وضاحت) طلب کیا جائے گا، بلکہ بغیر حساب کتاب کے عذاب کیے جائیں گے، جس طرح کہ مومنوں کا ایک گروہ بغیر حساب وعذاب کے جنت میں داخل ہوگا۔

پھر جب اللہ پاک مومنوں اور کافروں کے بارے میں اپنا حکم اور فیصلہ بیان کر چکا تو ارشاد فرمایا: ﴿ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ ﴾ یعنی سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اور اس شے کا مالک ہے جو ان دونوں میں ہے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی جو مالک ہے سارے جہانوں کا۔ پھر اللہ جل جلالہ نے فرمایا: ﴿ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَيْ: سُلْطَانٌ"، یعنی اسی کے لیے سلطان اور غلبہ ہے آسمانوں اور زمین میں، یعنی وہی ایسا عظیم مجد (بزرگی دیا ہوا) ہے کہ جس کے سامنے ہر شے ذلیل و پست ہے اور اس کی طرف محتاج ہے۔ صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: «اَلْعَظْمَةُ إِزَارِيْ وَالْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ فَمَنْ نَازَعَنِيْ وَاحِدًا مِنْهُمَا أَسْكَنْتُهُ نَارِيْ»[1] یعنی عظمت میرا تہبند ہے اور بڑائی میری چادر ہے، پس جس نے مجھ سے اس میں سے کسی ایک کو چھینا تو اس کو میں اپنی آگ میں بساؤں گا۔ (رواہ مسلم من حديث الأعمش عن أبي إسحاق عن الأغر بن مسلم عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ وأبي سعيد رضی اللہ عنہ عن النبي ﷺ بنحوه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ یعنی وہی ایسا عزیز وغالب ہے کہ نہ کوئی اس پر غلبہ کر سکتا ہے اور نہ اس کو روکنے کی طاقت رکھتا ہے۔ وہ اپنے اقوال وافعال وشرع وقدرت میں حکمت والا ہے۔ تعالیٰ وتقدس لا إله إلا هو[2]۔ آخر تفسير سورة الجاثية، ولله الحمد والمنة وبه التوفيق والعصمة. گیارہ پنج شنبہ (جمعرات) شبِ جمعہ وقت دہ ساعت (دس بجے) ماہِ صفر ۱۳۱۴ ہجری محلہ امیر گنج میں مکمل ہوئی۔ اللہ سبحانہ قبول فرمائے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ اللہ پاک ہی اکیلا آسمانوں اور زمین میں تصرف کرنے والا ہے، جس طرح اس نے ارادہ کیا۔ بندوں میں سے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ پہلے خاص قدرت کا ذکر کیا تھا کہ وہ زندہ کرنے، مارنے اور اکٹھا کرنے پر قادر ہے، اب خاص قدرت کے بعد عام قدرت کا ذکر فرمایا کہ آسمان و زمین میں اسی کا تصرف وغلبہ ہے، اس میں زندہ کرنا، مارنا اور اس کے بعد جمع کرنا شامل ہے اور دوبارہ زندہ کرنا اور اٹھانا شامل ہے اور مخاطبین وغیر مخاطبین وغیرہ کو شامل ہے۔ پھر اہلِ باطل کو وعید سنائی کہ جس دن قیامت قائم ہوگی، اس دن باطل لوگ خائب و خاسر ہوں گے، یہ وہی ہیں جنھوں نے تکذیب کی اور کفر کیا اور باطل باتوں سے چمٹے رہے۔ اس دن ان کا خسران اور نقصان کھل جائے گا، اس لیے کہ وہ آگ کی طرف جائیں گے۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٢٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٩٠) [2] تفسير ابن كثير (١٩١/٤-١٩٣)

کلمۂ ﴿ يَوْمَ ﴾ میں عامل ﴿ يَخْسَرُ ﴾ ہے اور ﴿ يَوْمَئِذٍ ﴾ اس سے بدل ہے اور تنوین مضاف الیہ کے عوض ہے جو ﴿ يَوْمَ ﴾ مبدل منہ کے مضاف الیہ سے معلوم ہوتا ہے تو اب تقدیرِ عبارت یہ ہوئی: ''وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ'' چنانچہ یہ بدل تاکیدی ہوگا۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ ﴿ يَوْمَ ﴾ میں عامل ﴿ مُلْكُ ﴾ ہو۔ ''أَيْ: وَلِلّٰهِ مُلْكُ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ'' یعنی اللہ ہی کے لیے ہے ملک اس دن جس دن قیامت قائم ہوگی اور ﴿ يَوْمَئِذٍ ﴾، ﴿ يَخْسَرُ ﴾ کا معمول ہوگا اور یہ جملہ من حیث اللفظ مستانفہ ہو، گو معنی کی جہت سے اس کو ماقبل سے تعلق ہے۔ (كما أفاده السمين)

مطلب یہ ہے کہ پہلی صورت میں کوئی زیادہ فائدہ نہیں، بدل صرف تاکیدی ہے اور دوسری صورت میں ایک جدید فائدہ ہے، اس لیے کہ قیامت ایک تیسری حالت ہے کہ وہ نہ آسمان سے ہے نہ زمین سے، کیوں کہ یہ دونوں تو بدل جائیں گے تو گویا یوں کہا گیا کہ آسمانوں اور زمین کی اور اس دن کی بادشاہت، جس دن قیامت قائم ہوگی، اللہ کے لیے ہے اور ﴿ يَوْمَئِذٍ ﴾، ﴿ يَخْسَرُ ﴾ کا معمول ہو کر علاحدہ جملہ ہو جائے گا۔ علامہ تفتازانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ زیادہ تر تاکید کے مشابہ ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ دوسرا ﴿ يَوْمَ ﴾ تو مقصود بہ نسبت ہے اور پہلا ﴿ يَوْمَ ﴾ نہیں ہے۔ علامہ کی غرض یہ ہے کہ ﴿ يَوْمَئِذٍ ﴾، ﴿ يَوْمَ تَقُوْمُ ﴾ کا بدل تاکیدی ہے اور یہی ٹھیک ہے، کیوں کہ بدل میں اصل یہی ہے کہ مقصود بہ نسبت ہو اور یہ اس جگہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مقصود بہ نسبت پہلا ﴿ يَوْمَ ﴾ نہیں ہے اور دوسرا ﴿ يَوْمَ ﴾ ہے، کیوں کہ وہ ایک ہی دن ہے تو معلوم ہوا کہ دوسرا ﴿ يَوْمَ ﴾ صرف پہلے ﴿ يَوْمَ ﴾ کی تاکید ہے۔

اس پر امام کرخی رحمہ اللہ کے شیخ نے کہا ہے کہ بدل میں ﴿ يَوْمَ ﴾ بہ معنی وقت ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جس وقت قیامت قائم ہوگی اور اس میں مردے حشر کیے جائیں گے، یہ وقت ﴿ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ﴾ کا ایک جزو ہے، کیوں کہ وہ ایک وسیع دن ہے، اس کی ابتداء نفخۂ اولیٰ سے ہے تو ﴿ يَوْمَئِذٍ ﴾، ﴿ يَوْمَ تَقُوْمُ ﴾ کے بعض کا بدل ہوا اور عائد مقدر ہے: ''أَيْ: يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ فِيْهِ'' اور جبکہ کفار کا خسران ان کے حشر کے وقت میں تھا تو مقصود بہ نسبت وہی ہوا۔ (كما ذكره الكرخي) اس سے غرض علامہ پر رد ہے۔

﴿ تَرٰى ﴾ کا خطاب ہر اس شخص کو ہے جو اس کی صلاحیت رکھتا ہے، یا نبی ﷺ کو خطاب ہے۔ ﴿ أُمَّةٍ ﴾ بہ معنی ملت ہے اور رؤیتِ بصری ہے یا علمی۔ ﴿ جَاثِيَةً ﴾ حال یا صفت ہے، اس بنا پر کہ رویتِ بصری ہو اور مفعول ثانی ہے اگر رؤیتِ علمی ہو اور اس میں بُعد ہے۔ ﴿ جَاثِيَةً ﴾ میں پانچ تاویلیں ہیں: پہلی یہ ہے کہ بہ معنی ''مُسْتَوْفِزَة'' ہے۔ امام سفیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''مستوفز'' وہ شخص ہے کہ اس کے اعضاء میں سے صرف دونوں گھٹنے اور اس کے پوروں کے کنارے زمین پر لگیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بیٹھنا حساب کے وقت ہے۔ دوسری تاویل بہ معنی ''مجتمعة'' ہے۔ (قاله ابن عباس)

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تو ہر دین والے کو دیکھے گا کہ مجتمع ہونے والے ہیں۔ تیسری تاویل بہ معنی "متمیزة" ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر اُمت کو متمیز ہونے والی اپنے غیر سے۔ چوتھی تاویل بہ معنی "خاضعة" ہے۔ مورج نے کہا ہے کہ یہ قریش کے لغت میں ہے۔ پانچویں تاویل بہ معنی "بارکة علی الرکب" ہے۔ (قاله الحسن) "جثو" زانو پر بیٹھنے کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "جَثَا يَجْثُوْ وَيُجْثِيْ جَثْوًا وَجِثِيًّا إِذَا جَلَسَ عَلَى رُكْبَتَيْهِ" فتح البیان میں ہے کہ پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔[1] اس لفظ کا زبانِ عرب میں اور معنی پر آنا ممنوع نہیں ہے۔ لغتِ عرب میں "جثوة" کا اطلاق ہر شے کی جماعت پر وارد ہوا ہے۔ اسی بارے میں طرفہ کا قول ہے، وہ دو قبروں کا وصف کرتا ہے:

تَرَى جُثْوَتَيْنِ مِنْ تُرَابٍ عَلَيْهِمَا صَفَائِحُ صُمٌّ مِنْ صَفِيْحٍ منضد[2]

عبداللہ بن باباہ رضی اللہ عنہ کی روایت پہلے گزر چکی ہے: «كَأَنِّيْ أَرَاكُمْ بِالْكَوْمِ دُوْنَ جَهَنَّمَ جَاثِيْنَ...[3] الخ» (أخرجه البيهقي في البعث و عبد الله بن أحمد في زوائد الزهد و ابن أبي حاتم و سعيد بن منصور) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں مروی ہے کہ ہر اُمت اپنے نبی کے ساتھ ہوگی، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کوم پر تشریف لائیں گے، یعنی ٹیلے پر تمام مخلوق سے بلند ہوں گے، یہ وہی مقامِ محمود ہے۔[4]

بالجملہ ظاہر آیت یہ ہے کہ مذکورہ صفت ہر امت کے لیے ہوگی اور امتوں میں ان لوگوں کے درمیان جو دین والے ہیں، یعنی رسولوں کے پیرو ہیں اور ان کے علاوہ کے درمیان جو مشرکین ہیں کوئی فرق نہ ہوگا۔ یحییٰ بن سلام کہتے ہیں کہ مذکورہ صفت کافروں کے ساتھ خاص ہے،[5] لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ اسی کی تاکید اللہ پاک کے اس قول سے ہوتی ہے: ﴿ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا ﴾ اور اگلے قول سے: ﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ ﴾.

﴿ اِلٰى كِتٰبِهَا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ہر اُمت اپنی کتاب کی طرف بلائی جائے گی جو اس پر نازل کی گئی۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنے نامۂ اعمال کی طرف۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنے حساب کی طرف۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد لوحِ محفوظ ہے۔ پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ جمہور نے ﴿ كُلُّ اُمَّةٍ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے بنا بر ابتداء، اس کی خبر ﴿ تُدْعٰى ﴾ ہے اور یعقوب حضرمی رحمہ اللہ نے بہ نصب پڑھا ہے، بنا بر بدل ﴿ كُلَّ اُمَّةٍ ﴾ ہے۔[6]

بالجملہ پھر ان سے کہا جائے گا: ﴿ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی آج تم اس خیر و شر کا بدلہ دیے جاؤ گے جو تم کرتے تھے۔ ﴿ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ﴾ یہ بھی من جملہ اس بات کے ہے جو اُن سے کہی جائے گی، اس کے کہنے والے فرشتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک کے قول سے ہے، یعنی یہ ہماری کتاب تم پر

---

[1] فتح البیان (۴۳۲/۱۲) [2] تفسير القرطبي (۱۷٤/۱٦) [3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[4] الدر المنثور (٤۲۹/۷) [5] فتح القدیر (۱٤/۵) [6] تفسير القرطبي (۱۷۵/۱٦)

بولتی ہے اور بتاتی ہے کہ تم نے کون سا کام کیا اور اس میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں کرتی۔ یہاں ﴿ كِتٰبُنَا ﴾ فرمایا اور پہلے ﴿ كِتٰبِهَا ﴾ کہا تو اس میں کوئی تضاد نہیں، اس لیے کہ وہ ان کی کتاب ہے، اس معنی میں کہ ان کے اعمال پر مشتمل ہے اور اللہ کی کتاب اس معنی میں ہے کہ اسی نے فرشتوں کو اس کے لکھنے کا حکم دیا ہے۔ تقریر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ (كما قاله الكرخي)

﴿ يَنْطِقُ ﴾ کے معنی "يَشْهَدُ" ہیں بطور استعارہ، یعنی وہ تم پر گواہی دیتی ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "نَطَقَ الْكِتَابُ بِكَذَا" یعنی کتاب نے فلاں بات بیان کی۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ اس کو پڑھیں گے تو وہ اُن کو وہ کام یاد دلائے گی جو انھوں نے کیے، گویا وہ ان پر بولتی ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴾ [الكهف: ٤٩] "وہ کہہ رہے ہوں گے: ہائے ہماری خرابی یہ کیسی کتاب ہے جس نے کوئی چھوٹا بڑا بغیر گھیرے کے باقی ہی نہیں چھوڑا، اور جو کچھ انھوں نے کیا تھا سب موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم وستم نہ کرے گا۔"

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مراد اُم الکتاب ہے، اس میں بنی آدم کے اعمال ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ حافظین کا دفتر ہے۔ ﴿ يَنْطِقُ ﴾ کا محل نصب ہے بنا بر حال، یا رفع ہے اس بنا پر کہ اسم اشارے کی دوسری خبر ہے اور جملہ ﴿ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ تعلیل ہے نطق بحق کی، یعنی کتاب تم پر حق کے ساتھ بولتی ہے، اس لیے کہ ہم فرشتوں کو تمھارے اعمال کو لکھنے کا اور ثابت کرنے کا حکم دیتے تھے۔ نسخ سے مراد کسی شے کو مٹانا اور اس کی جگہ دوسری شے کو قائم کرنا نہیں ہے، کیوں کہ یہ بات وارد ہوئی ہے کہ فرشتہ جس وقت عمل لے کر چڑھتا ہے تو اس کو حکم کیا جاتا ہے کہ جو شے لوحِ محفوظ میں ہے، اس سے اس کا مقابلہ کیا جائے۔

امام واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکثر مفسرین اس بات پر ہیں کہ یہ استنساخ لوحِ محفوظ سے ہے، اس لیے کہ فرشتے اس میں سے وہ شے لکھتے ہیں جو بنی آدم کے اعمال سے ہوتی ہے، پھر وہ اس کو اس شے کے موافق پاتے ہیں جس کو بنی آدم کرتے ہیں۔ کہا یہ اس لیے ہے کہ استنساخ صرف اصل سے ہوتا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ فرشتے ہر روز وہ شے لکھتے ہیں جس کو بندہ کرتا ہے، پھر جس وقت وہ لوٹ کر اپنے مقام کی طرف جاتے ہیں تو اس سے حسنات اور سیئات کو لکھ لیتے ہیں اور مباحات کو چھوڑ دیتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ جس وقت فرشتے بندوں کے اعمال اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف اٹھا کر لے جاتے ہیں تو اللہ عزوجل حکم فرماتا ہے کہ اس کے پاس ان میں سے وہ شے ثبت کی جائے جس میں ثواب اور عقاب ہے اور اس میں سے وہ شے ساقط کر دی جائے جس میں نہ کچھ ثواب ہے اور نہ عقاب۔

---

[1] تفسير الطبري (٨٤/٢٢) [2] فتح القدير (١٤/٥)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ فرشتے اعمالِ بنی آدم کو استنساخ کرتے ہیں، چنانچہ ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کی: اے عبداللہ بن عباس! ہم نہیں خیال کرتے تھے کہ اس کو ہر روز و شب میں فرشتے لکھتے ہیں تو انھوں نے فرمایا: تم کیا قومِ عرب نہیں ہو؟ نہیں استنساخ کی جاتی شے مگر کتاب سے۔ مطلب یہ ہے کہ استنساخ عربی زبان میں یہ ہے کہ لکھے ہوئے سے نقل کرنا جیسے کاتب ایک کتاب سے دوسری کتاب نقل کرتا ہے۔ علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرشتے ہر روز کوئی شے لے کر اترتے ہیں، اس میں بنی آدم کے اعمال لکھتے ہیں۔[1] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی مثل مروی ہے۔ نیز سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی مروی ہے کہ نگہبان فرشتے اُم الکتاب سے اس چیز کو استنساخ کرتے ہیں جسے بنی آدم کرتے ہیں۔ چنانچہ انسان وہی عمل کرتا ہے جس کو فرشتہ اُم الکتاب سے نقل کر لایا ہے۔[2] (وأخرج نحوه الحاكم عنه و صححه)

امام طبرانی رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں ان سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو مقرر فرما دیا ہے، وہ ایک سال کے رمضان کی شبِ قدر سے لے کر دوسرے سال کی شبِ قدر تک زمین میں ہونے والے حادثات کو لکھتے ہیں، پھر وہ ہر پنج شنبہ کے عشیہ میں یعنی ہر جمعرات کی شام کو اس کا مقابلہ اللہ کے ان فرشتوں سے کرتے ہیں جو بندوں پر نگہبان ہیں تو جو نگہبان فرشتے اٹھا کر لے گئے ہیں، اس کو اس شے کے مطابق پاتے ہیں جو اُن کی اس کتاب میں ہے تو اس میں نہ زیادتی ہوتی ہے نہ کمی۔[3]

غرضیکہ جن کے اعمال لکھے جاتے ہیں وہ یا تو مومن ہیں یا کافر ہیں، چنانچہ اللہ پاک نے ان کی جزا کا فرق بیان کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ﴾ یعنی پھر وہ لوگ جو ایمان لائے اور بھلائیاں کیں تو ان کو ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا جس کے جملے میں جنت ہے۔[4] (كما قاله البيضاوي) اور امام محلی رحمہ اللہ نے زمخشری رحمہ اللہ کی طرح رحمت کی تفسیر نفسِ جنت سے کی ہے۔[5] یہ تفسیر زیادہ ظاہر ہے۔ ﴿ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴾ یعنی یہ اپنی رحمت میں داخل کرنا ہی ظاہری اور واضح طور پر مراد کا ملنا ہے، اس لیے کہ وہ ان کدورتوں اور ملونیوں سے پاک ہے جو اس میں ملیں۔

یہ تو مومنین کے فریق کا حال ہوا۔ پھر دوسرے فریق کا حال ذکر فرمایا: ﴿ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ﴾ یعنی اور وہ لوگ جو منکر ہوئے تو ان سے کہا جائے گا: ﴿ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ ﴾ آیات سے مراد قرآن شریف ہے، یا اللہ کی نازل کردہ آیات ہیں۔ اور استفہام ملامت کا ہے، اس لیے کہ رسول ان کے پاس آئے اور ان پر اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھیں تو انھوں نے ان کی تکذیب کی اور ان پر عمل نہ کیا، یعنی کیا پھر میری آیتیں تم پر پڑھی نہیں جاتی تھیں؟

---

[1] تفسير الطبري (٢٢/٨٤، ٨٥) [2] الدر المنثور (٧/٤٣٠) فتح القدير (٥/١٦) [3] المعجم الكبير (١٠/٢٤٧)
[4] تفسير البيضاوي (٥/١٧٣، ١٧٤) [5] تفسير الجلالين (١/٦٦٤) الكشاف (٤/٢٩٦)

﴿ فَاسْتَكْبَرْتُمْ ﴾ تو تم نے ان کو قبول کرنے اور ان پر ایمان لانے سے تکبر کیا۔ ﴿ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴾ اور تم اہلِ اجرام میں سے تھے۔ ''اجرام'' آثام کے معنی میں ہے، یعنی گناہ۔ ''اجترام'' بہ معنی اکتساب ہے۔ جب کوئی شخص اپنے گھر والوں کا کمائی کرنے والا ہو تو محاورے میں بولتے ہیں کہ فلاں اپنے اہل کا جریمہ ہے۔ چنانچہ مجرم وہ ہوا جس نے معاصی کر کے گناہ کمائے۔

﴿ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ﴾ جمہور نے بہ کسرِ ﴿ اِنَّ ﴾ پڑھا ہے، اس لیے کہ محکی بالقول ہے اور کسی نے بہ فتح پڑھا ہے لغتِ سلیم کی بنا پر۔ یہ لوگ قول کو مطلقاً ظن کے قائم مقام کرتے ہیں۔ (كما قاله السمين) جمہور نے ﴿ وَالسَّاعَةُ ﴾ بہ رفع پڑھا ہے بنا بر ابتداء یا بنا بر عطف موضع اسم پر اور حمزہ نے بہ نصب پڑھا ہے بنا بر عطف بر اسم ﴿ اِنَّ ﴾، معنی یہ ہیں کہ تم ایسے تھے کہ جس وقت تم سے کہا جاتا تھا کہ اے کافرو! اللہ کا بعث و حساب و جزا کا اور تمام امور کا وعدہ جن کا اس نے وعدہ کیا ہے وہ ضرور ہی واقع ہونے والا ہے اور قیامت کے واقع ہونے میں کسی طرح کا شک نہیں ہے تو تم اس کو غریب اور بعید سمجھ کر اور اس کا انکار کر کے کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا چیز ہے۔ ﴿ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا ﴾ یعنی ہم تو اسے ایک تخمین اور وہم سمجھتے ہیں۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی تقدیر یہ ہے: ''إِنْ نَحْنُ إِلَّا نَظُنُّ ظَنًّا''[1] یعنی ہم نہیں ہیں مگر گمان ہی کرتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ صرف گمان ہی گمان ہے اعتقاد کا اَتا پتا نہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ تقدیر یہ ہے: ''إِنْ نَظُنُّ إِلَّا أَنَّكُمْ تَظُنُّوْنَ ظَنًّا''، یعنی ہم نہیں گمان کرتے ہیں مگر یہ کہ اے مومنو! تم صرف گمان ہی کرتے ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ ''نظن'' میں ''نعتقد'' کے معنی شامل ہیں، یعنی ہم اعتقاد نہیں کرتے مگر ظن کا نہ کہ علم کا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ ظَنًّا ﴾ کی ایک صفت مقدر ہے: ''أَيْ: إِلَّا ظَنًّا بَيِّنًا''، یعنی ہم گمان نہیں کرتے مگر ایک ظاہر گمان۔ کسی نے کہا ہے کہ ظن بہ معنی علم و شک ہوتا ہے تو گویا یوں کہا کہ ہم کو اعتقاد نہیں ہے مگر شک کا اور شاید یہ اُن کے بعض کا قول ہے۔ حیران ہو گئے اس شے کے درمیان جس کو اپنے دادوں سے سنا اور اس شے کے جوان پر پڑھی گئی ساعت کے بارے میں۔ ﴿ وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ﴾ یعنی ہم کو اس کا کچھ یقین نہیں ہے اور ہمارے پاس سوائے مجرد ظن کے سوا کچھ نہیں کہ قیامت آنے والی ہے۔

﴿ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ یعنی ان کے لیے ان کے اعمال کی برائیاں ظاہر ہو گئیں اس صورت پر جس پر وہ تھے۔ یعنی جزائے اعمال اور ان کو گھیر لیا اور اُن پر ان کے اعمال کی جزا اس طرح نازل ہوئی کہ وہ آگ میں داخل ہو گئے۔ اور کہا گیا کہ آج ہم تم کو بھولیں گے جس طرح تم اپنے اس دن کے ملنے کو بھولے تھے، یعنی ہم تم کو آگ میں چھوڑ رکھیں گے، جیسا تم نے اس دن کے لیے عمل کرنا چھوڑا تھا۔ نسیان سے

---

[1] تفسير القرطبي (١٧٧/١٦)

مراد بطور مجاز ترک لیا گیا، یا تو سببیت کے اعتبار سے یا بے پروائی میں اس کی تشبیہ کے سبب سے۔ ﴿ لِقَآءَ ﴾ کی اضافت ﴿ يَوْمَ ﴾ کی طرف اس کا وسیع مفہوم لینے کے لیے کی۔ اس لیے کہ شے کی طرف اس چیز کی اضافت کی جو اس میں واقع ہے۔ جیسے "مَكْرُ اللَّيْلِ" میں "مَكْرُ" کی اضافت "لَيْل" کی طرف اس لیے کی کہ مکر لیل میں واقع ہے۔ ﴿ وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تمھارا مسکن و مستقر جس کی طرف تم ٹھکانا پکڑو گے، وہ آگ ہے۔ ﴿ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴾ اور تمھارے لیے کوئی مددگار نہیں ہیں جو تمھاری مدد کریں اور عذاب کو تم سے روکیں۔

﴿ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا ﴾ یعنی یہ عذابِ عظیم اس سبب سے ہے کہ تم نے قرآن شریف کو مذاق اور بازی ٹھہرایا اور تم کو دنیا کی زندگی نے فریب دیا اور تم اپنی زینتوں اور باطل چیزوں میں مشغول ہو کر یہ گمان کر بیٹھے کہ اس کے سوا کوئی اور گھر نہیں ہے اور نہ بعث ہے نہ نشور ہے۔ چنانچہ آج وہ آگ سے نکالے نہ جائیں گے۔ جمہور نے ﴿ لَا يُخْرَجُوْنَ ﴾ بہ ضم یائے تحتیہ و فتحِ راء بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور امام حمزہ اور کسائی رحمہ اللہ نے بہ فتحِ یاء و ضمِ راء بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے[1] اور دونوں سبعیہ ہیں۔ صیغۂ غائب سے صیغۂ حاضر کی طرف جو پھرے تو اس سے ان کی تحقیر منظور ہے اور یہ بتانا منظور ہے کہ ان کو رتبۂ خطاب سے گرایا ہے۔ ﴿ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴾ یعنی اور نہ ان سے رضا چاہی جائے گی اور نہ ان سے طاعتِ الٰہی کی طرف رجوع طلب کیا جائے گا، کیوں کہ وہ ایک ایسا دن ہے کہ اس میں نہ توبہ قبول کی جائے گی نہ اس میں کوئی معذرت فائدہ دے گی۔

﴿ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ چنانچہ اس پر تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں کہ اس نے مکذبین کے حق میں اپنا وعدہ پورا کیا، کون سا اللہ؟ وہ جو آسمانوں کا اور زمین کا اور سارے جہان کا خالق ہے، اس کے سوا حمد کے لائق کوئی نہیں۔ عالم ماسوی اللہ کو کہتے ہیں، اس کی مختلف قسمیں ہونے کی وجہ سے اس کو جمع کے صیغے سے ذکر کیا ہے۔ جمہور نے تینوں جگہ ﴿ رَبِّ ﴾ کو بہ جر پڑھا ہے، اس بنا پر کہ اسم شریف کی صفت ہے، یا بیان ہے یا بدل ہے۔ امام مجاہد، حمید اور ابن محیصن رحمہ اللہ نے تینوں کو بہ رفع پڑھا ہے برتقدیر مبتداء "أَيْ: هُوَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ...[2] الخ"

﴿ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۠ ﴾ یعنی آسمانوں میں اور زمین میں جلال و عظمت و سلطان اسی کے لیے ہے۔ ﴿ اَلسَّمٰوٰتِ ﴾ اور ﴿ اَلْاَرْضِ ﴾ کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا کہ ان میں کبریائی کے آثار اور احکام ظاہر ہیں۔ چنانچہ دونوں میں مظروف آثارِ کبریا ہے اور یہ آثار قہر و تصرف، یعنی غلبہ ہے نفسِ کبریا مظروف نہیں ہے، اس لیے کہ وہ تو رب تعالیٰ کی ایک ذاتی صفت ہے۔ ﴿ اَلسَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ کا موضع اضمار میں ذکر کیا، یعنی "وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِيْهِمَا" نہ کہا تو اس سے منظور شانِ کبریا کی بڑائی مقصود ہے۔ یعنی دیکھو کہ اس کی کیا عظیم الشان کبریائی ہے

---

[1] تفسير القرطبي (١٦/١٧٨) [2] تفسير القرطبي (١٦/١٧٨)

کہ جس کے آثار، یعنی قہر اور مکمل غلبہ اس بلند اور وسیع آسمان میں اور پست وفراخ زمین میں ظاہر وباہر ہیں کہ اس کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہلتا ؎

نبارد ہوا تا نہ گوئی ببار ۔ زمین نہ آورد تا نگوئی بیار

''ہوا بارش نہیں برساتی جب تک تو نہ کہے کہ بارش برسا۔ زمین اُگاتی نہیں جب تک تو نہ کہے کہ اُگا۔''

مُرٗ اورا رسد کبریاء و منی ۔ کہ ملکش قدیم ست و ذاتش غنی

''بزرگی اور تکبر خاص کر اسی (اللہ) کو سزاوار ہے۔ کہ اس کی بادشاہت قدیم اور اس کی ذات بے پروا ہے۔''

﴿ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ یعنی وہی اپنے سلطان اور غلبے میں عزیز و غالب ہے۔ چنانچہ کوئی غلبہ کرنے والا اس پر غالب نہیں ہوسکتا اور وہ اپنے تمام اقوال و افعال میں حکیم ہے اور اپنے حکموں میں دانا ہے اور ایسا حکمت والا ہے کہ ہر شے کو اپنی جگہ میں رکھتا ہے اور کسی شے کو بے جا نہیں رکھتا جس طرح کہ اس نے اپنے امر و نہی کو اور ساری شریعت کو محکم کیا اور اس قرآن شریف کی نظم کو اور اس کے جملوں، آیتوں، فاصلوں اور غایتوں کو محکم اور پختہ فرمایا، اس کے بعد کہ اس کے معانی وتنزیل کی تحریر وتہذیب فرمائی تو وہ اپنے نظم اور معنی میں اعجاز والا ہوگیا۔[1] فأقول کما قال سیدنا أبو الوفاء التوفیق غفر اللّٰہ لنا ولہ وجعل القرآن لنا ولہ خیر رفیق آمین. ؎

حضرتِ فرقانِ من برد دل وجانِ من ۔ برد دلٍ و جانِ من حضرت فرقانِ من

''میری حق وباطل کی تمیز (روشنی) نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ میری حق و باطل میں فرق کرنے والی روشنی (قرآنِ مجید) نے اپنا قیدی بنا لیا۔''

الحمد للّٰہ و المنۃ کہ ۱۲ر ماہ صفر ۱۳۱۴ ہجری وقت نصف شب ہفتے کو اس سورت کی تفسیر محلہ امیر گنج میں تمام ہوئی۔ اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور آیندہ لکھنے کی ہمت اور قوت دے۔ فلا حول ولا قوۃ إلا باللّٰہ، اللھم اغفرلنا ولوالدینا ولأشیاخنا ولمن أخذ عنا ولأحبابنا و للحافظ محمد حسن الشاب الصالح البر التقي، فإنہ مات في التاریخ المذکور بعد صلاۃ الجمعۃ ودفن بعد المغرب في مقبرۃ قلندر شاہ، ولجمیع المؤمنین والمؤمنات والمسلمین والمسلمات الأحیاء منھم والأموات، اللھم ادفع عنا البلایا کلھا ببرکۃ کلامك القدیم، وصل وسلم و بارك علیٰ نبینا محمد و علی آلہ وصحبہ أجمعین إلی یوم الدین. آمین.

---

[1] فتح البیان (۱۲/ ٤٣١ـ٤٣٧)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُوْرَةُ الْاَحْقَافِ

اس سورت مبارکہ کی چونتیس (۳۴) یا پینتیس (۳۵) آیتیں ہیں۔اس اختلاف کی بنا اس پر ہے کہ ﴿حٰمٓ﴾ آیت ہے یا نہیں۔ یہ مکی سورت ہے۔امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: سب کے قول کے مطابق۔[1] امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ مکے میں نازل ہوئی ہے۔[2] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مکی ہے سوائے اس آیت کے: ﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [الأحقاف: ۱۰] اور سوائے اس آیت کے: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [الأحقاف: ۳۵] اورسوائے اس آیت کے: ﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ... الثلاث آیات﴾ یعنی ان کا آخر یہ ہے: ﴿اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ [الأحقاف: ۱۷][3]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے سورۃ الاحقاف پڑھائی اور دوسرے شخص کو پڑھائی، چنانچہ اس کی قراءت مختلف کی تو میں نے کہا: تجھے یہ کس نے پڑھائی؟ اس نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے پڑھائی تو میں نے کہا: واللہ! البتہ مجھ کو رسول اللہ ﷺ نے اس کے سوا پڑھائی۔ پھر ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا آپ نے مجھ کو ایسے ایسے نہیں پڑھایا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ اور دوسرے شخص نے کہا: کیا آپ نے مجھ کو ایسے ایسے نہیں پڑھایا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ پھر فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک وہ پڑھے جو اس نے سنا، سو اس کے نہیں کہ ہلاک ہوئے وہ لوگ جو تم سے پہلے تھے اختلاف کے سبب سے۔[4] (أخرجه ابن الضريس والحاكم وصححه) احقاف یمن میں ایک وادی ہے جس میں عاد کے مکانات تھے۔کسی نے کہا: یہ ”حقف“ کی جمع ہے، ”حقف“ ریت کے ٹیلے کو کہتے ہیں۔

---

[1] تفسير القرطبي (۱۷۸/۱٦۔ دار الكتب المصرية، القاهرة)
[2] الدر المنثور (۴۳۳/۷)
[3] تفسير الجلالين (٦٦٥/۱)
[4] مسند أحمد (۱۸/۵) الدر المنثور (۴۳۳/۷)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ۝١ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝٢ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۝٣ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۭ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝٤ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَاۗىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝٥ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَاۗءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝٦

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

حٰمٓ ① (اس) کتاب کا نزول اللہ غالب وحکمت والے کی طرف سے ہے ② ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور (اس کو) جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، صحیح صحیح (غرض وغایت) اور مقررہ مدت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا، وہ ان چیزوں سے اعراض کیے ہوئے ہیں، جن سے انھیں ڈرایا گیا ہے ③ آپ کہہ دیجیے: بھلا بتاؤ تو! جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، مجھے دکھاؤ کہ انھوں نے زمین میں سے کیا چیز پیدا کی ہے۔ یا ان کا آسمانوں میں کوئی حصہ ہے۔ اس (قرآن) سے پہلے کی (نازل شدہ) کوئی کتاب یا علمی اثاثہ میرے پاس لاؤ، اگر تم سچے ہو ④ اور اس سے زیادہ گمراہ کون شخص ہے، جو اللہ کے سوا اس کو پکارتا ہے جو اُسے قیامت تک جواب نہیں دے سکتا؟ جبکہ وہ ان کی پکار ہی سے غافل ہیں ⑤ اور جب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ (جھوٹے معبود) ان کے دشمن ہوں گے، اور وہ ان کی عبادت کے منکر ہوں گے ⑥

قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ اس نے اپنے بندے اور رسول محمد ﷺ ۔دائما إلی یوم الدین۔ پر اپنی کتاب نازل فرمائی اور اپنی ذاتِ مقدس کو ایسی عزت کے ساتھ موصوف کیا کہ جس کا قصد نہیں کیا

جاتا اور اقوال وافعال میں حکمت کے ساتھ موصوف کیا۔ پھر فرمایا کہ ہم نے آسمان وزمین کو اور جو اُن کے درمیان میں ہے صرف حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، یعنی بے فائدہ اور باطل طور پر پیدا نہیں کیا اور ان کو ایک مقررہ مدت تک کے لیے بنایا جو نہ زیادہ ہو نہ کم۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ﴾ یعنی اور وہ لوگ جو منکر ہوئے وہ کھیل کود میں ہیں اور اس شے سے غافل ہیں جس کا ان کے ساتھ ارادہ کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف کتاب نازل کر چکا اور رسول بھیج چکا اور ان کا یہ حال ہے کہ وہ اس سب سے منہ موڑنے والے ہیں اور عن قریب وہ اس کے بعد جان لیں گے۔

تردیدِ مشرکین:

پھر فرمایا: ﴿ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ؕ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ یعنی تو ان مشرکوں سے کہہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر کو پوجتے ہیں کہ تم زمین میں سے مجھے وہ جگہ دکھاؤ جو صرف تمھارے معبودوں نے، اللہ تعالیٰ کے سوا، پیدا کی ہے یا ان کی آسمانوں میں کچھ شرکت ہے، یعنی نہ تو ان کی کوئی شرکت آسمانوں میں ہے نہ زمین میں۔ وہ تو ایک قطمیر کے بھی مالک نہیں۔ سارا ملک اور تصرف (قبضہ) اللہ عزوجل ہی کا ہے تو پھر اس کے ساتھ اس کے غیر کو کیوں پوجتے ہو اور اس کے ساتھ شریک کرتے ہو؟

اس بات کی طرف کس نے تم کو راہ بتائی ہے اور کس نے تمھیں اس طرف بلایا ہے اور اس کا حکم دیا ہے؟ یا یہ کوئی ایسی شے ہے جو خود تم نے اپنی طرف سے نئی نکال لی ہے؟ اسی لیے یوں فرمایا کہ میرے پاس اس قرآن سے پہلے کی کوئی کتاب لاؤ، یعنی اللہ کی کتابوں میں سے جو انبیاء علیہم السلام پر نازل کی گئی ہیں، کوئی ہی ایسی کتاب لاؤ جو تم کو ان بتوں کے پوجنے کا حکم کرتی ہے، یا کوئی کھلی دلیل اس راہ پر چلنے کی لاؤ جس پر تم چل رہے، اگر تم سچے ہو۔ یعنی تمھارے پاس اس کے لیے نہ کوئی نقلی دلیل ہے نہ عقلی۔ اسی لیے اور لوگوں نے یوں پڑھا ہے: "أَوْ أَثَرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ" یعنی یا کوئی صحیح علم جس کو تم پہلے لوگوں سے نقل کرتے آئے ہو جیسا کہ مجاہد نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: "أَوْ أَحَدٌ يَأْثُرُ عِلْمًا" یعنی یا کوئی ایسا ہے جو علم کو نقل کرتا ہے۔

امام عوفی رحمہ اللہ سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے یہ الفاظ مروی ہیں: "أَوْ بَيِّنَةٍ مِنَ مِنَ الْأَمْرِ".[1] امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور "أَوْ أَثَرَةٍ مِنْ عِلْمٍ" فرمایا کہ خط۔ سفیان امام احمد رحمہ اللہ کے استاذ الاستاذ کہتے ہیں: میں اس کو نہیں جانتا مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔[2] یعنی میرے علم میں یہ تفسیر مرفوع ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (٩٤،٩٣/٢٢) [2] مسند أحمد (٢٢٦/١)

امام ابوبکر بن عیاش رحمہ اللہ نے کہا: "أَوْ بَقِيَّةٍ مِنْ عِلْمٍ" امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: "أَوْ أَثَارَةِ شَيْءٍ يَسْتَخْرِجُهُ فَيُثِيرُهُ" سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد رحمہ اللہ نیز ابوبکر عیاش رحمہ اللہ نے کہا: یعنی "الخط"۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "خَاصَّةٍ مِنْ عِلْمٍ"[1] یہ سب اقوال ایک دوسرے کے قریب ہیں اور اس قول کی طرف راجع ہیں جو ہم نے کہا ہے اور وہی امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[2] رَحِمَهُ اللّٰهُ وَأَكْرَمَهُ وَأَحْسَنَ مَثْوَاهُ.

قولہ تبارک وتعالیٰ: ﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ﴾ یعنی اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہے جو بتوں کو پکارتا ہے اور ان سے وہ شے طلب کرتا ہے جس کو وہ قیامت تک نہ کر سکیں گے اور وہ اس بات سے غافل ہیں جو وہ کہتا ہے۔ نہ وہ سنتے ہیں نہ دیکھتے، کیوں کہ وہ تو جمادات ہیں، یعنی سخت پتھر ہیں۔ یہ تو دنیا کا حال ہے اور آخرت میں یہ گت ہے کہ جس وقت لوگ حشر کیے جائیں گے تو وہ اُن کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کے پوجنے کے منکر ہوں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۝ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴾ [مریم: ۸۱۔ ۸۲] "انھوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں کہ وہ ان کے لیے باعثِ عزت ہوں۔ لیکن ایسا ہرگز ہونا نہیں۔ وہ تو ان کی پوجا سے منکر ہو جائیں گے، اور الٹے ان کے دشمن بن جائیں گے۔" یعنی عن قریب وہ ان کو دعا دیں گے ایسے وقت میں کہ ان کو ان کی سخت ضرورت ہو گی۔

نیز خلیل جلیل علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ؗ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴾ [العنکبوت: ۲۵] "تم نے جن بتوں کی پرستش اللہ کے سوا کی ہے انھیں تم نے اپنی آپس کی دنیوی دوستی کی بنا ٹھہرا لی ہے، تم سب قیامت کے دن ایک دوسرے سے کفر کرنے لگو گے اور تمھارا سب کا ٹھکانا دوزخ ہو گا اور تمھارا کوئی مددگار نہ ہو گا۔"[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ حٰمٓ ﴾ کا بیان پورے طور پر پہلے ہو چکا ہے اور یہ بات بھی بیان ہو چکی ہے کہ سورتوں کے ابتدائی کلمات ان متشابہات میں سے ہیں جس کے علم کو اللہ تعالیٰ ہی کے سپرد کرنا واجب کیا ہے، جس نے ان کو نازل کیا ہے، اسی لیے بہتر یہ ہے کہ یوں کہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جو اس سے مراد ہے وہی اس کو خوب جانتا ہے۔ ﴿ اِلَّا بِالْحَقِّ ﴾ استثنائے مفرغ ہے اعم احوال سے۔ ﴿ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ معطوف ہے

---

[1] تفسیر الطبري (۲۲/۹۳، ۹۴) [2] تفسیر الطبري (۲۲/۹۴) [3] تفسیر ابن کثیر (۴/۱۹۴، ۱۹۵)

﴿ بِالْحَقِّ ﴾ پر برتقدیرِ مضاف "أَيْ: وَبِتَقْدِيرِ أَجَلٍ مُسَمًّى" یعنی نہیں بنایا اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو اور اس ساری مخلوق کو جو ان کے درمیان ہے کسی بھی حال میں مگر اس کو اللہ تعالیٰ نے حق کے ساتھ بنایا ہے جو اس کی مشیت کا تقاضا تھا اور اس کو ایک مقررہ مدت تک کے لیے بنایا ہے، تا کہ یہ سب اس کی قدرت اور وحدانیت پر دلالت کرے۔

﴿ أَجَلٍ ﴾ سے مراد روزِ قیامت ہے، اس لیے کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے وہ اس دن میں ختم ہو جائیں گے اور اس زمین و آسمان کو دوسرے زمین و آسمان سے تبدیل کر دیا جائے گا۔ کسی نے کہا کہ ﴿ أَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ سے مراد تمام مخلوقات میں سے ہر ایک کی انتہائے اجل ہے، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت ہوگی اور دنیا کی مدت ختم ہو جائے گی۔ اور اللہ پاک نے اپنی مخلوق کو باطل و عبث و بے فائدہ نہیں بنایا، بلکہ اس کو ثواب و عقاب کے لیے پیدا کیا ہے۔

جملہ ﴿ وَالَّذِينَ كَفَرُوا عَمَّا أُنذِرُوا مُعْرِضُونَ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال، یعنی اللہ پاک نے تو مخلوق کو بے کار نہیں بنایا اور حال یہ ہے کہ کفار اس کو بے کار سمجھتے ہیں اور قرآن شریف میں جو اُن کو بعث و حساب و جزا و عذاب کا خوف دلایا گیا ہے اس سے اعراض کرتے ہیں اور اس کے لیے تیاری نہیں کرتے اور آمادہ نہیں ہوتے اور نہ ہی اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ﴿ عَمَّا ﴾ میں کلمۂ "ما" موصولہ ہے اور مصدریہ بھی ہو سکتا ہے۔ بالجملہ جب آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے اللہ پاک کا بنایا ہوا ہے تو مشرکین غیر اللہ کو اللہ کے ساتھ کیوں شریک کرتے ہیں؟ کیا بتوں نے کوئی قطعۂ زمین بنایا ہے، یا آسمانوں میں کسی طرح کی ان کی شرکت ہے کہ اس کی وجہ سے عبادت کے لائق ہوئے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

چنانچہ اللہ پاک نے کفار کی سرزنش کے لیے اور ان کو عاجز کرنے کے لیے نبی ﷺ کو ارشاد فرمایا کہ تم ان سے یوں کہو: ﴿ أَرَءَيْتُم مَّا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ ... الآية ﴾ یعنی تم مجھے اس شے کی خبر دو جس کو تم پکارتے ہو اور اللہ تعالیٰ کے سوا پوجتے ہو، یعنی بت وغیرہ۔ تم مجھے دکھاؤ کہ انھوں نے زمین سے کیا چیز پیدا کی، بلکہ کیا ان کی آسمانوں میں کچھ شرکت ہے۔ جب وہ ایسے نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کو شریک کرنے کی کیا وجہ ہے؟! یہ تو عقلی دلیل ہوئی۔

پھر نقلی دلیل کی طرف اشارہ فرمایا کہ تم میرے پاس کوئی کتاب لاؤ جو اس قرآن سے پہلے اتاری گئی ہو، کیونکہ اس نے تو اس بات کی تصریح کر دی کہ شرک باطل ہے اور اللہ وحدہ لاشریک لہ ہے اور قیامت حق ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے، پھر کیا مشرکوں کے پاس کوئی کتاب اس کتاب کے مخالف ہے، یا کوئی حجت اس حجت کے خلاف ہے، یا کچھ پہلے لوگوں کے علم میں سے کچھ بقیہ ہے۔ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ اللہ کا شریک ہے، یا اللہ نے بتوں کو پوجنے کا تم کو حکم دیا ہے۔ چنانچہ جب ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہ لائے تو ظاہر ہو گیا کہ ان کا قول باطل ہے، اس لیے کہ عقلی اور نقلی دلیلیں اس کے خلاف قائم ہیں۔ ﴿ أَرُونِي ﴾ یا تو ﴿ أَرَءَيْتُم ﴾ کی تاکید ہے: "أَيْ: أَخْبِرُونِي"۔

﴿ أَرُونِي ﴾ اور ﴿ أَرَءَيْتُم ﴾ کا مفعولِ ثانی "مَاذَا" ہے: "أَيْ: أَيَّ شَيْءٍ"

یہ بھی احتمال ہے کہ تاکید نہ ہو بلکہ تنازع کے باب سے ٹھہرے، اس لیے کہ ﴿ أَرَءَيْتُم ﴾ تو مفعولِ ثانی چاہتا ہے اور اسی طرح ﴿ أَرُونِي ﴾ بھی۔ کلمۂ ﴿ أَمْ ﴾ منقطعہ مقدر بہ "بل و همزة" ہے: "أَيْ: بَلْ أَلَهُمْ شِرْكَةٌ مَعَ اللّٰهِ فِيهَا" اور استفہام سرزنش اور ملامت کے لیے ہے۔ شرک کو جو ﴿ السَّمٰوٰتِ ﴾ کے ساتھ خاص کیا عام نہ کیا کہ زمین کے ساتھ بھی شامل ہو جاتا تو اس کا مقصد یہ ہے کہ اس بات سے بچا جائے کہ کہیں یہ وہم نہ ہو کہ حوادثِ سفلی کے پیدا کرنے میں وسائط شریک ہیں۔

﴿ اِيْتُوْنِيْ ﴾ میں حکم ان کی سرزنش کے لیے اور اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ وہ کتاب کے لانے سے عاجز و قاصر ہیں۔ صحاح میں کہا ہے کہ ﴿ أَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ ﴾ کے معنی "بَقِيَّةٍ مِنْ عِلْمٍ" ہیں اور اسی طرح ﴿ أَثَرَةٍ ﴾ بہ تحریک ہے۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: "أَيْ: بَقِيَّةٍ مِنْ عِلْمِ الْأَوَّلِيْنَ". امام فراء اور مبرد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ "مَا يُؤْثَرُ عَنْ كُتُبِ الْأَوَّلِيْنَ" یعنی وہ شے جو اگلوں کی کتابوں سے نقل کی جاتی ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قولِ مفسرین کے یہ معنی ہیں۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا: یا کوئی شے جس کو تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے کسی نبی سے نقل کرتے ہو۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: یا انبیاء سے علم کی کوئی روایت۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ أَوْ أَثٰرَةٍ ﴾ "أَيْ: عَلَامَةٍ"۔ ﴿ أَثٰرَةٍ ﴾ مصدر ہے، جیسے: "سَمَاحَةٍ وَشَجَاعَةٍ" اصل کلمہ "أَثَرَ" سے ماخوذ ہے۔ اثر روایت کو کہتے ہیں۔ جب تم حدیث کو اپنے غیر سے ذکر کرو گے تو محاورے میں یوں کہو گے: "أَثَرْتُ الْحَدِيْثَ، آثُرُهُ أَثْرَةً وَأَثَارَةً وَأَثْرًا"

جمہور نے "أثارة" پڑھا ہے بنا بر مصدر مثل "سماحة وغواية" کے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ (یعنی زید بن علی، عکرمہ، سلمی، حسن اور ابو رجاء رحمہم اللہ) نے "أَثَرَةٍ" بہ فتح ہمزہ و ثاء بہ دون الف پڑھا ہے اور امام کسائی رحمہ اللہ نے "أُثْرَةٍ" بہ ضمِ ہمزہ وسکونِ ثاء پڑھا ہے۔[1] امام احمد، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ وغیرہ نے بطریق ابوسلمہ بن عبدالرحمان سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ أَثٰرَةٍ ﴾ کی تفسیر میں خط روایت کیا ہے۔[2] چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « كَانَ نَبِيٌّ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ (قِيْلَ: ذٰلِكَ النَّبِيُّ إِدْرِيْسُ وَقِيْلَ: دَانِيَال، سُئِلَ ﷺ عَنِ الْخَطِّ فَقَالَ: كَانَ نَبِيٌّ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ يَخُطُّ فَمَنْ وَافَقَ خَطَّهُ عَلِمَ مِثْلَ عِلْمِهِ رُوِيَ فَمَنْ وَافَقَ خَطُّهُ فَذَاكَ حَظُّهُ بِالنَّصْبِ عَلَى الْمَشْهُوْرِ وَرُوِيَ بِالرَّفْعِ فَالْمَفْعُوْلُ مَحْذُوْفٌ.[3] كَذَا فِي مَجْمَعِ الْبِحَارِ وَذُكِرَ فِيْهِ تَفْسِيْرُ الْخَطِّ مَنْ شَاءَ فَلْيَرْجِعْ إِلَيْهِ) يَخُطُّ فَمَنْ صَادَفَ مِثْلَ خَطِّهِ عَلِمَ »[4] (أخرجه عبد بن حميد وابن مردويه) اور اس کے معنی صحیح میں ثابت ہیں۔

---

[1] تفسیر القرطبي (١٨٢/١٦) فتح القدير (١٨/٥)
[2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[3] مجمع بحار الأنوار (٦٢/٢، ٦٣)
[4] الدر المنثور (٤٣٤/٧)

اہلِ علم کی اس میں مختلف تفسیریں ہیں۔ ہم کو کہاں سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ رمل کے خطوط اس خط کے موافق ہیں اور اس نبی تک یا ہمارے نبی تک اس کی سند کہاں ہے کہ یہ خط اسی فلاں صورت پر ہے۔ اب جو کچھ اہلِ رمل کرتے ہیں یہ سوائے جہالتوں اور گمراہیوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: ”عَنْ أَبِي سَعِيْدٍ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ ﴿اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ﴾ کی تفسیر میں ”حَسَنُ الْخَطِّ“ ہے[1] اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرمایا کہ ایک خط تھا جس کو عرب زمین میں لکھا کرتے تھے۔[2]

بالجملہ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ مشرکین کے پاس شرک پر کوئی عقلی و نقلی دلیل نہیں ہے تو اللہ پاک نے ان کی گمراہی بیان کی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ﴾ سوالیہ انداز ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت کے لیے ہے، یعنی اس سے بڑھ کر کوئی گمراہ اور جاہل نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا اس شخص کو پکارتا ہے جو اسے قیامت تک جواب نہ دے گا، کیوں کہ اس نے تو ایسے کو پکارا ہے جو سنتا ہی نہیں، پھر وہ اس کے جواب دینے کا طمع کیسے کرتا ہے، نفع پہنچانے اور تکلیف کو دور کرنے کا تو ذکر ہی کیا۔ تو اب یہ بات ظاہر ہوگئی کہ وہ سب جاہلوں اور گمراہوں سے بڑھ کر جاہل اور گمراہ ہے۔

﴿اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ جواب نہ دے سکنے کی آخری حد ہے، اس سے مراد ہے کہ ابد تک وہ جواب نہیں دے سکتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ [ص: ۷۸] ”اور تجھ پر قیامت کے دن تک میری لعنت و پھٹکار ہے۔“[3] (كذا قال الشهاب) صاحبِ انتصاف نے کہا ہے کہ اس غایت میں ایک نکتہ ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے ان کے جواب نہ دے سکنے کی انتہا یومِ قیامت تک ٹھہرائی تو اس سے موثر اور مکمل طور پر یہ خبر دی کہ قیامت کے دن تو جواب دینا نہ ہوگا اور اس کو ایسا واضح کر دیا کہ اس کو ایک انتہا درجے کی ظاہر شے کے ساتھ ملا دیا وہ شے جس کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں، اس لیے کہ وہاں تو معبودوں اور عابدوں کے درمیان عداوت اور دوری ہو جائے گی اور وہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔

پھر اگر یہ خیال ہو کہ معبود عابدوں کے پکارنے کا اگرچہ جواب نہیں دیتے مگر اس کو سنتے ہیں اور قیامت کے دن ان کے سفارشی ہو جائیں گے، اس لیے فرمایا: ﴿وَهُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ﴾ پہلی ضمیر اصنام کی اور دوسری عابدوں کی ہے، یعنی بت جن کو مشرک لوگ پکارتے ہیں مشرکوں کے پکارنے سے غافل ہیں۔ نہ وہ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں، اس لیے کہ وہ جمادات ہیں اور ان کو سننے سمجھنے کی اصلاً صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اس لیے غفلت سے ان کے فہم نہ ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ”مَن“ کے معنی کے اعتبار سے دونوں ضمیروں میں جمع کا لفظ استعمال کیا ہے

---

[1] الدر المنثور (٤٣٤/٧) [2] تفسير الطبري (٩٣/٢٢) [3] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٢٥/٨، ٢٦)

اصنام کے لیے عقلاء کی ضمیر اس لیے ذکر کی کہ مشرک اعتقاد رکھتے تھے کہ ان میں عقل ہے۔

یہ تو دنیا کا حال ہے کہ بت مشرکوں کی پکار کو سنتے اور سمجھتے نہیں ہیں اور قیامت کے دن یہ کیفیت ہے: ﴿ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً ﴾ یعنی جس وقت بتوں کو پوجنے والے حشر کیے جائیں گے تو وہ بت اپنے عابدوں کے دشمن ہو جائیں گے، ایک دوسرے سے بیزار ہوں گے اور ایک دوسرے پر لعنت کریں گے۔ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ بتوں میں زندگی پیدا کر دے گا تو وہ اپنے عابدوں کی تکذیب کریں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ زبانِ حال سے ان کی تکذیب کریں گے اور ان سے دشمنی کا اظہار کریں گے نہ کہ زبانِ مقال سے۔ رہے فرشتے اور مسیح اور عزیر علیہم السلام اور شیاطین تو یہ سب قیامت کے دن اپنے عابدوں سے بیزار ہوں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ﴾ [القصص: ٦٣] ''ہم تیری سرکار میں اپنی دست برداری کرتے ہیں، یہ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴾ یعنی معبود لوگ اس بات کا انکار اور تکذیب کریں گے کہ مشرکوں نے ان کو پوجا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ كَانُوْا ﴾ کی ضمیر عابدوں کی طرف راجع ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: ﴿ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٣] ''قسم اللہ کی اپنے پروردگار کی! ہم مشرک نہ تھے''۔ پہلی بات بہتر ہے۔[1] پھر اللہ پاک نے مشرکوں کی ایک اور جہالت کا ذکر فرمایا:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

اور جب ان پر ہماری واضح آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو کافر لوگ، اس حق (قرآن) کے

[1] فتح البیان (١٣/٩۔١٢)

بارے میں جب کہ وہ ان کے پاس آچکا، کہتے ہیں: یہ تو کھلا جادو ہے⑦ بلکہ وہ کہتے ہیں: اس نے یہ خود گھڑ لیا ہے۔ آپ کہہ دیجیے: اگر میں نے یہ خود گھڑا ہے تو تم مجھے اللہ (کے عذاب) سے بچانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ جو گفتگو تم اس (قرآن) کے بارے میں کرتے ہو، وہ اس کو خوب جانتا ہے۔ وہ میرے اور تمھارے درمیان (بطور) گواہ کافی ہے۔ اور وہ نہایت بخشنے والا، خوب رحم کرنے والا ہے⑧ کہہ دیجیے: میں رسولوں سے انوکھا نہیں، اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ اور تمھارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ میں تو بس اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے اور میں تو فقط صاف صاف ڈرانے والا ہوں⑨ کہہ دیجیے: بھلا بتاؤ تو! اگر یہ (قرآن) اللہ ہی کی طرف سے ہو اور تم نے اس کا انکار کر دیا (تو تمھارا انجام کیا ہوگا؟) اور بنی اسرائیل کا ایک گواہ اس جیسی (کتاب اترنے) کی گواہی دے چکا، پھر وہ ایمان لے آیا اور تم نے تکبر کیا، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا⑩

قرآن و صاحبِ قرآن کے بارے میں مشرکین کے اقوال کی تردید:

مکے میں یہود کا ایک عالم کسی کام سے آیا تو اس سے کافروں نے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ اس شہر میں سے ایک رسول اور کتاب کا آنا یقینی ہے، یہ وہی بنی اسرائیل کا گواہ لگتا ہے جس کا ان آیات میں ذکر ہے۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ عزوجل مشرکوں کے کفر وعناد کی خبر دیتا ہے کہ جس وقت ان پر اللہ کی ظاہر و باہر اور واضح و روشن آیتیں پڑھی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ کھلا جادو ہے، حالاں کہ وہ اس بات میں جھوٹ، افتراء پرداز، گمراہ اور کافر ہیں۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ اس کو محمد ﷺ بنا لایا ہے۔ اللہ عزوجل نے فرمایا کہ آپ کہہ دیں کہ اگر میں اس کو بنا لایا تو تم میرے لیے اللہ سے کسی شے کے مالک نہ ہوتے، یعنی اگر میں اللہ پر جھوٹ بناتا اور وہ یہ دعویٰ کرتا کہ اس نے مجھ کو بھیجا اور درحقیقت ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھ کو سخت سزا دیتا تو پھر پوری زمین والوں میں کوئی بھی، نہ تم نہ کوئی اور، اس بات پر قادر نہ ہوتا کہ اس سے مجھ کو بچا لیتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ﴾ [الجن: ۲۲، ۲۳] ''کہہ دیجیے کہ مجھے ہرگز کوئی اللہ سے بچا نہیں سکتا اور میں ہرگز اس کے سوا کوئی جائے پناہ بھی پا نہیں سکتا۔ البتہ (میرا کام) اللہ کی بات اور اس کے پیغامات (لوگوں کو) پہنچا دینا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴾ [الحاقۃ: ٤٤۔٤٧] ''اور اگر یہ ہم پر کوئی بھی بات بنا لیتا تو البتہ ہم اس کا داہنا

ہاتھ پکڑ لیتے، پھر اس کی شہ رگ کاٹ دیتے۔ پھر تم میں سے کوئی بھی مجھے اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔'' اس لیے اس جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ... الآیۃ﴾ یہ ان کے لیے سرزنش اور سخت وعید اور دھمکی ہے۔

نیز ﴿ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ ان کو توبہ کرنے اور رجوع الی اللہ کی ترغیب ہے، یعنی اس سب کے باوجود اگر تم رجوع ہو اور توبہ کرو تو اللہ تمھاری توبہ قبول کرے گا اور تم کو معاف کر دے گا اور مغفرت اور رحم فرمائے گا۔ یہ آیت سورۃ الفرقان کی اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَقَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [الفرقان: ٥۔ ٦] ''اور یہ بھی کہا کہ یہ تو اگلوں کے افسانے ہیں جو اس نے لکھا رکھے ہیں، بس وہی صبح و شام اس کے سامنے پڑھے جاتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ اسے تو اس اللہ نے اتارا ہے جو آسمان و زمین کی تمام پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔ بے شک وہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ ﴾ یعنی تو کہہ کہ میں کوئی پہلا رسول نہیں ہوں جو عالم میں آیا، بلکہ مجھ سے پہلے رسول آئے، پس میں کوئی ایسا امر نہیں ہوں کہ اس کی کوئی نظیر نہ ہو کہ تم مجھے اوپرا سمجھو اور بعید جانو۔ اللہ نے مجھے تمھاری طرف بھیجا ہے، چنانچہ بے شک وہ مجھ سے پہلے سارے نبیوں کو اپنی اُمتوں کی طرف بھیج چکا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''مَا أَنَا بِأَوَّلِ رَسُوْلٍ'' [1] امام ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس کے سوا اور کوئی قول نقل نہیں کیا۔

﴿ وَمَاۤ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ﴾ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ ﴿ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ﴾ [الفتح: ٢] ''تاکہ جو کچھ تیرے گناہ آگے ہوئے اور جو پیچھے سب کو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔'' اسی طرح امام عکرمہ، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ نے بھی کہا ہے۔ یہ آیت ﴿ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ ... الآیۃ﴾ سے منسوخ ہے۔ ان سب نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں میں سے ایک شخص نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ کے ساتھ جو کچھ اللہ تعالیٰ کرنے والا ہے وہ تو اس نے یہ بیان کر دیا، پھر وہ شے کیا ہے جو ہمارے ساتھ کرنے والا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ [الفتح: ٥] ''تاکہ مومن مردوں اور عورتوں کو ان جنتوں میں لے جائے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔'' [2] (ھکذا قال) اور صحیح میں جو بات ثابت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ مومنوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ کو مبارک ہو، پھر ہمارے لیے کیا ہے تو اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی۔ [3]

---

[1] تفسیر الطبري (٢٢/٩٨، ٩٩) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٩٣) [2] تفسير الطبري (٢٢/٩٩، ١٠٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٣٩)

امام ضحاک رحمہ اللہ نے ﴿ وَمَآ اَدۡرِیۡ مَا یُفۡعَلُ بِیۡ وَلَا بِکُمۡ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے: میں نہیں جانتا کہ اس کے بعد مجھے کیا حکم ہو اور کس چیز سے منع کیا جائے۔ امام ابوبکر ہذلی رحمہ اللہ نے حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ آخرت میں تو معاذ اللہ یقیناً آپ ﷺ جان چکے ہیں کہ جنت میں ہیں، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ دنیا میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ اور تمھارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ کیا نکالا جاؤں گا جیسے کہ مجھ سے پہلے انبیاء علیہم السلام نکالے گئے، یا قتل کیا جاؤں گا جیسے کہ مجھ سے پہلے انبیاء علیہم السلام قتل کیے گئے اور میں نہیں جانتا کہ تم دھنسا دیے جاؤ گے یا پتھروں سے مارے جاؤ گے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قول پر اعتماد کیا ہے[1] اور اس کے سوا جائز نہیں ہے اور بے شک نبی کریم ﷺ کے ساتھ یہی لائق ہے، کیوں کہ آخرت کے متعلق تو آپ کو حتمی طور پر معلوم ہے کہ آپ ﷺ جنت میں جائیں گے اور وہ لوگ بھی جنھوں نے آپ ﷺ کی پیروی کی ہے۔

رہا دنیا میں تو آپ ﷺ کو معلوم نہیں کہ آپ ﷺ کا حال اور مشرکینِ عرب کا حال کیسا ہوگا، وہ ایمان لائیں گے یا کافر رہیں گے تو عذاب کیے جائیں گے اور اپنے کفر کے سبب سے جڑ سے اُکھاڑ ڈالے جائیں گے۔ اب رہی وہ حدیث جس کو امام احمد رحمہ اللہ نے بروایت خارجہ بن زید بن ثابت ام العلاء سے روایت کیا ہے جو انصار کی عورتوں میں سے ایک عورت ہے، اس نے خارجہ کو خبر دی اور اس نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی تھی۔ یہ بی بی کہتی ہے کہ جس وقت انصار نے مہاجرین کے بسانے پر قرعہ ڈالا، یعنی جس مہاجر کا جس انصاری کے گھر میں رہنے کے لیے قرعہ پڑے وہی اس کے گھر میں رہے تو اس عورت کے گھر والوں پر عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کا قرعہ پڑا، پھر عثمان بیمار ہو گئے تو ہم نے ان کی تیمار داری کی، یہاں تک کہ جب ان کا انتقال ہو گیا تو ہم نے ان کو کفن پہنایا۔ پھر رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر میں داخل ہوئے تو میں نے کہا: اے ابو السائب! تجھ پر اللہ کی رحمت ہو، میری تجھ پر گواہی ہے کہ البتہ یقیناً اللہ عزوجل نے تیرا اکرام کیا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تجھے کس نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا اکرام کیا؟ تو میں نے عرض کی کہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں! میں نہیں جانتی، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: لیکن وہ جو ہے تو واقعی اس کو اپنے رب کی طرف سے یقین یعنی موت آئی اور بے شک میں البتہ اس کے لیے امید رکھتا ہوں خیر کی، واللہ! میں نہیں جانتا، حالانکہ میں اللہ کا رسول ہوں کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ وہ بی بی کہتی ہے: پھر میں نے کہا: واللہ! اس کے بعد میں کبھی کسی کا تزکیہ نہ کروں گی اور اس بات نے مجھے رنج میں ڈالا اور میں سو گئی۔ پھر میں نے عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے ایک جاری چشمہ دیکھا، پھر میں رسول اللہ ﷺ کی طرف آئی اور میں نے آپ ﷺ کو اس کی خبر دی، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اس کا عمل ہے۔[2] اس حدیث کے اخراج کے ساتھ امام بخاری رحمہ اللہ منفرد ہیں امام مسلم رحمہ اللہ کے علاوہ۔

[1] تفسير الطبري (۲۲/۱۰۰، ۱۰۱) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۷۱٤) مسند أحمد (٤٣٦/٦)

اس حدیث کی ایک روایت میں یوں ہے: «مَا أَدْرِي وَأَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مَا يُفْعَلُ بِهِ» یعنی میں نہیں جانتا اور میں اللہ کا رسول ہوں کہ اس کے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ یہ روایت اس کے زیادہ مشابہ ہے کہ یہی محفوظ ہو اس دلیل سے کہ اس بی بی نے یوں کہا: ''فَأَحْزَنَنِيْ ذٰلِكَ'' یعنی آپ ﷺ کے اس فرمانے نے مجھے غمگین کیا۔ اس حدیث میں اور اس جیسی اور حدیثوں میں اس بات کی دلیل ہے کہ کسی معین شخص کے لیے قطعی طور پر جنت کی گواہی نہ دی جائے، سوائے ان لوگوں کے جن کے تعین پر شارع علیہ السلام نے نص فرما دی ہے، جیسے: عشرۂ مبشرہ، یعنی دس صحابی جن کو جنت کی خوش خبری دے دی گئی اور ابن سلام، عمیصاء، بلال، سراقہ، عبداللہ بن عمرو بن حرام والدِ جابر اور ستر قاری جو بئرِ معونہ میں شہید ہوئے اور زید بن حارثہ، جعفر، ابن رواحہ اور جو اُن کے مشابہ ہیں رضی اللہ عنہم۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ وَمَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ یعنی میں جو ہوں تو اسی وحی کی پیروی کرتا ہوں جس کو اللہ مجھ پر نازل کرتا ہے اور میں نہیں ہوں مگر کھول کر ڈرانے والا۔ ہر عقل والے پر میرا حال ظاہر و واضح ہے۔ واللہ أعلم۔

قرآنِ کریم سچا کلامِ الٰہی:

قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ ﴾ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے محمد! تو ان مشرکوں قرآن کے منکروں سے کہہ کہ تم مجھے خبر دو اگر یہ قرآن اللہ کے پاس سے ہے اور تم نے اس کا انکار کیا۔ یعنی تمھارا کیا خیال ہے کہ اللہ تمھارے ساتھ کیا کرنے والا ہے، اگر یہ کتاب جس کو میں لے کر تمھارے پاس آیا ہوں، اللہ نے اس کو مجھ پر نازل کیا ہے، تاکہ میں اسے تم تک پہنچاؤں اور تم نے اس کا انکار کیا اور اس کو جھٹلایا، حالانکہ بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ اس کی گواہی دے چکا، یعنی اگلی کتابیں جو مجھ سے پہلے انبیاء علیہم السلام پر نازل کی گئی، اس کی سچائی اور درست ہونے کی گواہی دے چکیں اور اس کی بشارت دی اور اس شے کے مثل خبر دی جس کی اس قرآن نے خبر دی ہے۔

قولہ عزوجل: ﴿ فَاٰمَنَ ﴾ یعنی پھر ایمان لے آیا یہ شخص جس نے بنی اسرائیل میں سے اس کی حقیقت کو پہچان کر اس کے صدق کی گواہی دی۔ ﴿ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ﴾ یعنی اور تم نے اس کے اتباع سے تکبر کیا۔ امام مسروق رحمہ اللہ کہتے ہیں، یعنی پھر یہ گواہ اپنے نبی اور کتاب پر ایمان لے آیا اور تم نے اپنے نبی اور کتاب کا انکار کیا۔[1] ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ یعنی بے شک اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔ یہ شاید اسمِ جنس ہے، عام ہے، یہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے علاوہ دوسروں کو بھی شامل ہے، اس لیے کہ یہ آیت مکی ہے اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے اسلام سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

---

(1) تفسير الطبري (٢٢/١٠٣، ١٠٤)

یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَاِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ ﴾ [القصص: ٥٣] ''اور جب اس کی آیتیں ان کے پاس پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ اس کے ہمارے رب کی طرف سے حق ہونے پر ہمارا ایمان ہے ہم تو اس سے پہلے ہی مسلمان ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًاۙ۝ وَّ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٠٧- ١٠٨] ''جنھیں اس سے پہلے علم دیا گیا ہے ان کے پاس تو جب بھی اس کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا رب پاک ہے، ہمارے رب کا وعدہ بلاشک وشبہہ پورا ہو کر رہنے ہی والا ہے۔''

امام مسروق اور شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ شاہد عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نہیں ہیں، یہ آیت مکی ہے اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا اسلام مدینے میں ہوا ہے۔[1] امام ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس قول کو دونوں سے روایت کیا ہے اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو پسند فرمایا ہے۔[2] امام مالک رحمہ اللہ نے ''عن أبي النضر عن عامر بن سعد عن أبيه'' روایت کیا ہے، کہا: میں نے نہیں سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایسے شخص کے لیے فرماتے ہوں جو روئے زمین پر چلتا ہے کہ وہ اہلِ جنت سے ہے مگر عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے لیے اور انھیں کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی۔ ﴿ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی مِثْلِهٖ ﴾[3] (رواه البخاري و مسلم و النسائي من حديث مالك به) اور اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، ضحاک، قتادہ، عکرمہ، یوسف بن عبداللہ بن سلام، ہلال بن یساف، سدی، ثوری، مالک بن انس اور ابن زید رحمہم اللہ ان سب نے کہا کہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہیں۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے جس وقت ان پر ہماری یعنی قرآن کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں، اس حال میں کہ ان کے معانی ظاہر ہیں اور ان کی دلالتیں اپنی مراد پر واضح ہیں تو کافر لوگوں کے پاس جب حق آ گیا تو بغیر غور وفکر کیے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایسا جادو ہے جس کا جادو ہونا صاف ظاہر ہے اور اس کا باطل ہونا واضح ہے۔ حق سے مراد آیات ہیں، جیسا کہ قاضی نے کہا ہے مثل کشاف کے اور اسی طرف تقریر میں اشارہ کیا ہے۔[5] یہاں جو دو ضمیروں کی جگہ دو اسم ظاہر کیے ہیں، کیوں کہ اصل یہ ہے کہ ''قَالُوْا لَهَا''، تو اس سے منظور یہ ہے کہ آیتوں پر تو حکم لگایا جائے کہ وہ حق ہیں اور جن پر وہ پڑھی جاتی ہیں، ان کے بارے میں یہ حکم لگانا ہے کہ وہ کافر ہیں اور گمراہی میں منہمک ہو

---

① تفسير الطبري (٢٢/١٠٢، ١٠٣) ② تفسير الطبري (٢٢/١٠٧)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٨٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/٧٠)

④ تفسير الطبري (٢٢/١٠٤-١٠٦) تفسير ابن كثير (٤/١٩٥-١٩٧) ⑤ تفسير البيضاوي (٥/١٧٧) الكشاف (٤/٣٠٠)

رہے ہیں۔ چونکہ ان باتوں کا اظہار منظور تھا اس لیے ضمیروں کے بجائے ظاہر نام لیا۔

بالجملہ پہلے تو اللہ پاک نے کفار کے بارے میں یہ ذکر کیا کہ انھوں نے آیاتِ الٰہی کا نام سحر رکھا، پھر اس سے ایسی بات کی طرف پھر گئے جو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ﴾ یعنی بلکہ کیا وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے اس شے کا افتراء کیا جس کو وہ لے کر آیا ہے۔ کلمۂ ﴿ اَمْ ﴾ منقطعہ بہ معنی ''بل و ہمزۂ'' ہے۔ چنانچہ ''بل'' تو ایک بات سے دوسری طرف پھرنے کے لیے ہے۔ سو یہاں اس بات سے کہ انھوں نے آیات کا نام سحر رکھا، اس بات کی طرف پھرنا ہے کہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے افتراء کیا اور یہ بات پہلی بات سے زیادہ سخت اور بدتر ہے، اس لیے کہ انھوں نے جو آیات کا نام سحر رکھا تو اس میں اس بات کا اقرار ہے کہ وہ ان سے عاجز ہوئے جبھی تو سحر کہا اور اگر عاجز نہ ہوتے تو سحر نہ کہتے، ویسی آیتیں بنا لاتے۔ ظاہر ہے کہ افتراء علی اللہ کا سحر سے زیادہ ہونا محتاجِ بیان نہیں اگر چہ یہ دونوں کفر ہیں۔

رہا ہمزہ تو وہ استفہامِ انکار کے لیے اور تعجب کرنے کے لیے ہے، اس لیے کہ قرآن ایک اعجاز والا کلام ہے جو بشر کی قدرت سے باہر ہے، یعنی قرآن کو سحر کہا، چنانچہ کہا کہ اس سے بھی بڑھ کر ایک اچنبھے کی بات یہ سنو۔ کہتے ہیں کہ رسول نے اس کو اللہ پر باندھ لیا ہے، حالاں کہ وہ تو معجزہ ہے اور بشر کی طاقت سے باہر ہے، پھر رسول ﷺ نے اس کو کیسے بنا لیا!! اس میں جو سرزنش اور ملامت ہے وہ پوشیدہ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار کی یہ باتیں باطل ہیں۔ قرآن نہ جادو ہے نہ ہی رسول ﷺ نے اپنی طرف سے بنایا ہے، بلکہ بے شک سچا پکا اللہ پاک کا کلام ہے۔ اس نے اپنے رسول ﷺ پر نازل کیا ہے۔

پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو حکم فرمایا کہ کفار کو یوں جواب دیں: ﴿ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ﴾ یعنی تو کہہ کہ بالفرض اگر میں اس کو بنا لایا ہوں، جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو تو تم میں اس بات کی طاقت نہیں ہے کہ اللہ کے عذاب کو مجھ سے ہٹا سکو، پھر میں تمھارے لیے اللہ پر کیوں افتراء کروں گا، حالانکہ تم اس پر قادر نہیں ہو کہ اس کے عذاب کو مجھ سے دور کرو۔

﴿ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ﴾ یعنی وہ اس تکذیب کو خوب جانتا ہے جس میں تم غور و فکر کر رہے ہو۔ ''أَفَاضَهُ فِيْ الشَّيْءِ'' کے معنی ہیں: شے میں غور و فکر و اندفاع (غور شروع) کرنا۔ ''يُقَالُ: أَفَاضُوْا فِيْ الْحَدِيْثِ، أَيْ: اِنْدَفَعُوْا فِيْهِ'' یعنی بات چیت میں گھسے اور لگ گئے۔ ''أَفَاضَ الْبَعِيْرُ'' اس وقت بولتے ہیں جب اونٹ اپنی اوجھ سے اپنی جگالی کو دفع کرتا ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس شے کو خوب جانتا ہے جو تم قرآن کے بارے میں کہتے ہو اور اس میں غور و فکر کرتے ہو، یعنی اس کو جھٹلاتے ہو اور کہتے ہو کہ وہ سحر ہے، کہانت ہے۔

﴿ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ﴾ یعنی وہ میرے اور تمھارے درمیان گواہ کافی ہے، کیوں کہ میرے لیے تو یہ گواہی دیتا ہے کہ قرآن اس کے پاس سے ہے اور اس بات کی کہ واقعی میں نے تم کو پہنچا دیا اور تم پر تمھارے انکار اور تکذیب کی گواہی دیتا ہے۔ اس میں اس بات کی سخت وعید ہے کہ ان کے خوض کرنے کا ان کو بدلہ دیا جائے گا۔ ﴿ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ اور وہ اس شخص کے لیے بڑا بخشنے والا بڑا مہربان ہے جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور قرآن کی تصدیق کی اور جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل کیا، یعنی وہ کثیر اور وسیع رحمت و مغفرت والا ہے، اس میں اس بات کو سمجھایا گیا ہے کہ اللہ پاک ان سے حلم کرتا ہے باوجود اس بات کے کہ ان کا جرم عظیم ہے۔

جب اللہ پاک نے کفار سے یہ بات نقل فرمائی کہ جو آیتیں ان پر پڑھی گئیں، انھوں نے ان میں طعن کیا اور ان کی شان میں کہا کہ سحرِ مبین ہے اور جس نے ان کو ان پر پڑھا اس کے بارے میں کہا کہ اس نے اپنی طرف سے ان کو بنا لیا ہے اور اللہ کی طرف ان کو منسوب کر دیا ہے اور وہ رسالت کے دعوے میں جھوٹا ہے، اس کے سوا اور بھی باطل باتیں کہا کرتے تھے، جیسے یہ قول کہ: ﴿ اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٤] ''کیا اللہ نے ایک انسان کو ہی رسول بنا کر بھیجا؟'' اور کہا: ﴿ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ﴾ [الفرقان: ٧] ''یہ کیسا رسول ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔'' نیز کہا: ﴿ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ﴾ [صٓ: ٥] ''کیا اس نے اتنے سارے معبودوں کا ایک ہی معبود کر دیا یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔''

بڑے بڑے معجزوں کی آپ ﷺ سے فرمایش کرتے اور غیب کی جن باتوں کی آپ ﷺ کی طرف وحی نہیں کی گئی ان کا آپ ﷺ سے سوال کرتے تھے تو اللہ پاک نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ ان سے یوں کہہ دیں: ﴿ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ ﴾ یعنی میں کوئی پہلا بھیجا ہوا نہیں ہوں کہ بشر کی طرف بھیجا گیا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کھاتا پیتا، بازاروں میں چلتا پھرتا تھا اور وہ توحید کی طرف بلاتے تھے اور شرک اور بتوں کی پرستش سے منع کرتے تھے اور عام عادات سے ہٹ کر وہی خارق اور معجزہ لاتے تھے جو اللہ نے اپنی نشانیوں سے ان کو دیا تھا اور ان سے جو غیب کی خبریں پوچھتے تھے ان سب کے بارے میں نہیں بتاتے تھے اور صرف اسی بات کی خبر دیتے تھے جس کی ان کی طرف وحی کی جاتی تھی اور میں ان میں سے ایک ہوں، پھر تم میرے دعوائے رسالت کو اوپرا کیوں سمجھتے ہو اس کے ساتھ کہ میں بشر ہوں اور بشریت کے لوازمات مجھ میں موجود ہیں اور میں تم کو توحید کی طرف دعوت دیتا ہوں اور شرک سے منع کرتا ہوں اور میں تمھاری ساری فرمائشیں پورا کرنے پر قادر نہیں ہوں جس طرح وہ قادر نہ تھے۔ چنانچہ یہ امور میری نبوت میں قادح (عیب لگانے والے) نہیں ہیں جیسے ان کی نبوت میں قادح نہ تھے۔

"بدع" ہر شے سے مبداء (شروع کرنے کی جگہ) ہے۔ کسی نے کہا کہ "بدع" کے معنی "بدیع" ہیں، جیسے "خف و خفیف"۔ "بدیع" وہ شے ہے جس کے لیے مثل نہ دیکھی گئی ہو۔ "ابتداع" سے ماخوذ ہے اور یہ معنی اختراع ہے۔ "شَيْءٌ بِدْعٌ" بالکسر بہ معنی مبتدع ہے، یعنی نوپید "أَوْ فُلَانٌ بِدْعٌ فِي هَذَا الْأَمْرِ أَيْ: بَدِيْعٌ"۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ یعنی فلاں شخص اس کام میں نادرۂ روزگار ہے۔ امام عکرمہ، ابوحیوہ، ابن ابی عبلہ رحمہم اللہ نے بہ فتح دال بر تقدیرِ مضاف پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مصدر ہے۔ "أَيْ: مَا كُنْتُ ذَا بِدَعٍ"[1] (قاله أبو البقاء) امام مجاہد رحمہ اللہ نے بہ فتح باء و کسرِ دال بنا بر وصف پڑھا ہے،[2] مثل "حَذِر"۔

﴿ وَمَآ اَدۡرِیۡ مَا یُفۡعَلُ بِیۡ وَلَا بِکُمۡ ﴾ یعنی میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ آیندہ زمانے میں کیا کیا جائے گا۔ آیا مکے میں باقی رکھا جاؤں گا یا اس سے نکالا جاؤں گا اور آیا مروں گا یا مارا جاؤں گا، جیسا کہ مجھ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کیا گیا اور میں نہیں جانتا کہ تمھارے ساتھ کیا کیا جائے گا، آیا تمھارے ساتھ جلد ہی عقوبت کی جائے گی، ان جھٹلانے والوں کی طرح جو تم سے پہلے تھے یا تم کو مہلت ملے گی۔ یہ تو صرف دنیا میں ہے، رہا آخرت میں تو یقیناً آپ ﷺ جان چکے ہیں کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی امت جنت میں ہیں اور کافر لوگ آگ میں ہیں۔

کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ قیامت کے دن میرے ساتھ اور تمھارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو مشرکوں نے عیب جوئی کی اور کہا کہ ہم ایسے نبی کی پیروی کیوں کریں جو یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کے ساتھ اور ہمارے ساتھ کیا کیا جائے گا اور اس کو ہم پر کسی طرح کی فضیلت نہیں ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ لِیَغۡفِرَ لَکَ اللّٰہُ ... الآية ﴾ [الفتح: ٢] اور پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ لِیَغۡفِرَ لَکَ اللّٰہُ ... الآية ﴾ [الفتح: ٢] اور یہ آیت ﴿ لِیُدۡخِلَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ... الآية ﴾ [الفتح: ٥] ۔ چنانچہ اللہ پاک نے اپنے نبی ﷺ کو وہ شے معلوم کرا دی جو ان کے ساتھ اور مومنین کے ساتھ کی جائے گی، دونوں کا حال بتا دیا[3] اور کافروں کی ناک خاک میں آلودہ کر دی۔

امام ابوداود نے اپنی ناسخ میں ان سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت ﴿ لِیَغۡفِرَ لَکَ اللّٰہُ ... الآية ﴾ سے منسوخ ہے[4] اور ام العلاء رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث پہلے گزر چکی ہے۔[5] ﴿ یُفۡعَلُ ﴾ بہ صیغۂ معروف و مجہول پڑھا گیا ہے اور حرف ﴿ مَا ﴾ استفہامیہ ہے، جیسا کہ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[6] یا موصولہ ہے جیسا کہ ا... ی رحمہ اللہ نے جائز رکھا ہے۔[7] ﴿ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ﴾ جمہور نے بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور امام ابن ابی ... بن علی رحمہما اللہ

---

(1) التبيان في إعراب القرآن (١١٥٤/٢) (2) فتح القدير (١٩/٥، ٢٠)

(3) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٩٣/١٠) الدر المنثور (٤٣٥/٧) (4) الدر المنثور (٤٣٥/٧، ٤٣٦)

(5) اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ (6) تفسير الجلالين (٦٦٧/١) (7) الكشاف (٣٠٢/٤)

نے بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے اور فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔[1] یعنی میں پیروی نہیں کرتا مگر قرآن کی اور اپنے پاس سے کوئی نئی شے نہیں نکالتا، مراد آپ ﷺ کے افعال کو وحی پر قصر کرنا ہے نہ کہ آپ ﷺ کے اتباع کا وحی پر قصر کرنا۔ ﴿ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ یعنی میں تم کو واضح طور پر اللہ کی سزا سے ڈراتا ہوں اور اس کے عذاب سے خوف دلاتا ہوں۔

جب اللہ پاک نے کفار کی طرف سے یہ بات نقل کی کہ انھوں نے قرآن کی شان میں کہا کہ ﴿ هٰذَا سِحْرٌ ﴾، ﴿ هٰذَا مُفْتَرًى ﴾ تو اپنے نبی ﷺ کو حکم فرمایا کہ تو ان سے یوں کہہ: ﴿ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ... الآية ﴾ یعنی تم مجھے خبر دو کیا حال ہے تمھارا اگر وہ قرآن جس کی میری طرف وحی کی گئی اللہ کے پاس سے ہے۔ کسی نے کہا کہ مراد نبی کریم ﷺ ہیں، یعنی اگر وہ درحقیقت اللہ کے پاس سے بھیجا ہوا ہے اور حال یہ ہے کہ تم نے واقعی اس کا انکار کیا اور بنی اسرائیل میں سے ایک عالم نے گواہی دی جو اس شے کے عالم ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے تورات میں نازل کیا ہے۔ وہ گواہی قرآن کی طرح کے اِن معانی پر دی جو تورات میں موجود ہیں اور قرآن کے مطابق ہیں، یعنی توحید و بعث ونشور وغیرہ کے اثبات کی گواہی۔ یہ مثلیتِ معانی کی مطابقت کے لحاظ سے ہے اگرچہ الفاظ مختلف ہیں۔

امام جرجانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کلمۂ مثل زاید ہے۔ "أَيْ: شَهِدَ شَاهِدٌ عَلَيْهِ أَنَّهُ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ" یعنی ایک گواہ نے قرآن پر اس بات کی گواہی دی کہ وہ اللہ کے پاس سے ہے۔ اسی طرح امام واحدی نے بھی کہا ہے۔[2]

﴿ فَاٰمَنَ ﴾ یعنی پھر وہ شاید قرآن پر ایمان لایا، جب اس کو یہ بات ظاہر ہوگئی کہ وہ اللہ کے کلام سے ہے اور اس شے کی جنس سے ہے جس کو اللہ اپنے اصولوں پر نازل کرتا ہے۔ ﴿ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ﴾ یعنی تم نے ایمان لانے سے تکبر کیا۔ جوابِ شرط میں اختلاف ہے۔ چنانچہ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "أَتُؤْمِنُونَ"[3] یعنی کیا تم ایمان لاؤ گے۔ کسی نے کہا ہے کہ تقدیر یہ ہے: "فَقَدْ ظَلَمْتُمْ" یعنی تو واقعی تم نے ظلم کیا۔ اس تقدیر پر ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ دال ہے۔

کسی نے کہا: "فَمَنْ أَضَلُّ مِنْكُمْ" ہے، یعنی تو تم سے بڑھ کر کون گمراہ ہے جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴾ [حم السجدة: ٥٢] "بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے آیا ہوا ہو، پھر تم نے اسے نہ مانا بس اس سے بڑھ کر بہکا ہوا کون ہوگا جو مخالفت میں (حق سے) دور چلا جائے۔" امام ابوعلی فارسی رحمہ اللہ نے کہا: تقدیر یہ ہے: "أَتَأْمَنُونَ عُقُوْبَةَ اللّٰهِ"[4] یعنی کیا تم اللہ کی عقوبت سے بے خوف ہو گے۔ کسی نے کہا: ﴿ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ﴾ ہے۔ کسی نے کہا: "أَلَسْتُمْ ظَالِمِيْنَ" ہے، یعنی کیا تم ظالم نہیں ہو۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ چنانچہ اللہ پاک نے ان کو اس

[1] روح المعاني (١١/٢٦) [2] فتح القدير (٢١/٥) [3] تفسير القرطبي (١٨٩/١٦) [4] فتح القدير (٢٢/٥)

سبب سے ہدایت سے محروم کر دیا کہ انھوں نے کفر کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اس کے بعد کہ وجوبِ ایمان پر ظاہری حجت قائم ہوگئی اور جس نے اپنے لیے اللہ کی ہدایت گم کی تو وہ گمراہ ہوا۔

بنی اسرائیل کے شاہد سے مراد عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہیں، جیسا کہ امام حسن رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے اور پہلے گزر چکا ہے۔[1] اس قول میں نظر ہے، اس لیے کہ سورت بالا جماع مکی ہے اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا اسلام ہجرت کے بعد ہوا تو شاہد سے مراد بنی اسرائیل کا کوئی اور شخص ٹھہرے گا جو مکہ میں قرآن پر ایمان لایا اور اس کی تصدیق کی۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو اختیار کیا ہے۔[2]

فتح البیان میں فرمایا ہے کہ راجح یہ ہے کہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ آیت مدنی ہے مکی نہیں۔ امام مسروق رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اس شخص سے مراد موسیٰ علیہ السلام ہیں اور ان کی شہادت وہ ہے جو تورات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت اور تعریف میں ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے شاہد ہونے پر جو امور دال ہیں ان میں سے یہ ہے کہ بخاری ومسلم وغیرہما نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے نہیں سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایسے شخص کے بارے میں، جو روئے زمین پر چلتا پھرتا ہے، یہ فرماتے ہوں کہ وہ اہلِ جنت میں سے ہے سوائے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے اور انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ ﴾[4]

امام ترمذی، ابن جریر اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میرے حق میں کتاب اللہ میں سے یہ آیتیں نازل ہوئیں: ﴿ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ (آیتِ باب) اور: ﴿ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴾[5] [الرعد: ۴۳] ''آپ کہہ دیجیے کہ مجھ میں اور تم میں اللہ گواہی دینے والا کافی ہے اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔'' اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے کہ وہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہیں[6] اور اسی طرح تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ یہ آیت مدنی ہے۔

چنانچہ مفسرین کا یہ قول کہ ساری سورۃ الاحقاف مکی ہے، تو اس کا عموم اس آیت کے ساتھ خاص کیا جائے گا اور اسی کو کواشی نے ذکر کیا ہے اور اس کا خبر دینا واقع ہونے سے پہلے ظاہر کے خلاف ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ کوئی اس طرف نہیں گیا کہ یہ آیت مکی ہے جبکہ ﴿ شَاهِدٌ ﴾ کی تفسیر عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے کی جائے اور اس میں بحث ہے، اس لیے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَشَهِدَ شَاهِدٌ ﴾ معطوف ہے شرط پر کہ جس سے ماضی مستقبل ہو جاتی ہے تو اب آیت

---

[1] تفسير الطبري (۱۰٦/۲۲) [2] تفسير الطبري (۱۰۷/۲۲)
[3] فتح البيان (۱۷/۱۳) [4] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۲٥٦) تفسير الطبري (۱۰٤/۲۲) الدر المنثور (٤۳۸/۷) [6] تفسير الطبري (۱۰٤/۲۲، ۱۰٥)

کے نزول کے بعد شاہد کی شہادت میں کوئی ضرر نہیں ہے۔ یہ دعویٰ کرنا کہ سلف میں سے کوئی اس کا قائل نہیں ہے باوجود شروحِ کشاف میں اس کے ذکر کے، تو اس کی کوئی وجہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ سلف سے مفسرین مراد لیے جائیں۔[1] (كذا قال الشهاب)

سیدنا عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چلے اور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، یہاں تک کہ ہم کنیسۂ یہود میں ان کی عید کے دن داخل ہوئے تو انھوں نے ہمارے داخل ہونے کو ناپسند کیا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: تم مجھے بارہ مرد دکھاؤ جو اس بات کی گواہی دیتے ہوں کہ ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ'' تو اللہ تعالیٰ ہر اس یہودی سے جو آسمان کے زیرِ سایہ ہے غضب کو اتار دے گا، تو یہود خاموش رہے، پھر کسی نے ان میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب نہ دیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ وہی فرمایا تو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی نے جواب نہ دیا، تین بار ایسا ہی ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے انکار کیا، پس قسم ہے اللہ کی! میں حاشر ہوں اور میں عاقب ہوں اور میں مقفی ہوں، تم ایمان لاؤ یا تکذیب کرو۔ (حاشر یعنی لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے حشر کیے جائیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملت پر نہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر کی ملت پر، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، عاقب یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخرِ انبیاء علیہم السلام ہیں۔ مقفی اسم فاعل ہے بہ معنی مولی ذاہب، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخرِ انبیاء ہیں، ان کے متبع ہیں۔ مراد یہ ہے کہ آپ کے یہ نام ان کتابوں میں ہیں جو ان اُمتوں پر نازل کی گئی ہیں جنھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تکذیب کی، یہ نام ان پر حجت ہیں)۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوٹے اور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، یہاں تک کہ ہم قریب تھے کہ نکلیں تو اچانک ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ہے، پھر اس نے کہا: ''كَمَا أَنْتَ يَا مُحَمَّد'' یعنی آپ یہاں ٹھہرے رہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم متوجہ ہوئے، پھر اس شخص نے کہا: اے گروہِ یہود! تم اپنے اندر مجھ کو کیسا شخص جانتے ہو؟ تو وہ بولے: واللہ! ہم اپنے اندر کسی اور شخص کو تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کا جاننے والا اور تم سے زیادہ فقیہ نہیں جانتے اور نہ تیرے باپ سے زیادہ اور نہ تیرے دادا سے زیادہ عالم اور فقیہ کوئی اور تھا تو وہ بولا: پس میں تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ بے شک وہ نبی ہے جس کو تم تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہو۔ وہ بولے: تو نے جھوٹ کہا، پھر اس پر رد کیا اور برا کہا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے جھوٹ کہا، تم سے تمھاری بات ہرگز قبول نہ کی جائے گی، پھر ہم نکلے تو ہم تین تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور میں اور ابن سلام رضی اللہ عنہ، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ

---

(1) حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي.

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾[1] (أخرجه أبو يعلىٰ وابن جرير والطبراني والحاكم وصححه السيوطي)

﴿ اَرَءَیْتُمْ ﴾ کے دونوں مفعول محذوف ہیں، تقدیر یہ ہے: "أَرَأَيْتُمْ حَالَكُمْ إِنْ كَانَ كَذَا أَلَسْتُمُ الظَّالِمِينَ" اور شرط کا جواب بھی محذوف ہے، تقدیر یہ ہے: "فَقَدْ ظَلَمْتُمْ"۔ اس کی اور تقادیر پہلے گزر چکی ہیں۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَرَءَیْتُمْ ﴾ ایک لفظ موضوع ہے سوال و استفہام کے لیے، مفعول کا مقتضی نہیں ہے اور اس قول کی طرف امام قرطبی رحمہ اللہ گئے ہیں اور یہ بھی احتمال ہے[2] کہ جملہ ﴿ اِنْ كَانَ ﴾ اور اس کے معمول سے مل کر ﴿ اَرَءَیْتُمْ ﴾ کے دو مفعول کے قائم مقام ہو[3] اور جملہ ﴿ كَفَرْتُمْ بِهٖ ﴾ حالیہ ہے بہ تقدیر "قد" اور بعض "قد" کی تقدیر نہیں کرتے اور جب یہ جملہ حالیہ ٹھہرایا جائے گا تو اس کے بعد کے تین جملے بھی اسی طرح حالیہ ٹھہریں گے اور بعض نے چاروں جملے فعلِ شرط پر معطوف ٹھہرائے ہیں۔ (كذا في الجمل) بالجملہ پھر اللہ پاک نے کفار کی باطل باتوں میں سے، جو انھوں نے قرآن کے بارے میں اس پر ایمان لانے والوں کے بارے میں کہی ہیں، ایک اور قسم کا ذکر فرمایا:[4]

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَیْرًا مَّا سَبَقُوْنَاۤ اِلَیْهِ ؕ وَ اِذْ لَمْ یَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَیَقُوْلُوْنَ هٰذَاۤ اِفْكٌ قَدِیْمٌ ۝۱۱ وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤی اِمَامًا وَّ رَحْمَةً ؕ وَ هٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِیًّا لِّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۖۗ وَ بُشْرٰی لِلْمُحْسِنِیْنَ ۝۱۲ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝۱۳ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝۱۴

اور کفر کرنے والوں نے ایمان لانے والوں سے کہا: اگر وہ (دین) بہتر ہوتا تو وہ (عام لوگ) اس (کو قبول کرنے) میں ہم سے پہل نہ کرتے اور جب انھوں نے اس (قرآن) کے ذریعے سے ہدایت نہ پائی تو اب وہ ضرور کہیں گے کہ یہ قدیم جھوٹ ہے (11) اور اس (قرآن) سے پہلے موسیٰ کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی اور یہ (قرآن) عربی زبان میں تصدیق کرنے والی

---

[1] تفسير الطبري (٢٢/١٠٦، ١٠٧) المعجم الكبير (١٨/٤٦) مستدرك الحاكم (٣/٤٦٩) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "رواه الطبراني ورجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٧/٢٣٣)

[2] تفسير القرطبي (١٦/١٨٩) [3] روح المعاني (٢٦/١٢) [4] فتح البيان (١٣/١٣-١٨)

کتاب ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کو ڈرائے جنھوں نے ظلم کیا اور نیکی کرنے والوں کے لیے خوش خبری ہے ⑫ بے شک جن لوگوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ (اس پر) قائم رہے تو ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ⑬ یہی لوگ جنتی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (یہ) ان اعمال کی جزا ہے جو وہ کیا کرتے تھے ⑭

کافروں کا قرآنِ مجید کو نہ ماننے کا ایک بہانہ:

قدیمی جھوٹ ہے۔ ہمیشہ لوگ ایسی باتیں کہا کرتے ہیں۔ انتھٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ یعنی کافروں نے ایمان لانے والوں کی شان میں کہا کہ اگر قرآن کچھ بہتر ہوتا تو یہ لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت نہ کرتے۔ مراد سیدنا بلال، عمار، صہیب اور خباب رضی اللہ عنہم ہیں۔ ان کی طرح کے ضعیف لوگوں میں سے غلاموں اور لونڈیوں سے یہ بات صرف اس لیے کہی کہ وہ لوگ اپنے جی میں اعتقاد رکھتے تھے کہ اللہ کے نزدیک ان کی وجاہت ہے، اس لیے ان کے حال پر اس کی عنایت ہے، حالاں کہ اس میں انھوں نے سخت غلطی کی اور ظاہری طور پر خطا کی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ﴾ [الأنعام: ٥٣] ”اور اسی طرح ہم نے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمایش میں ڈال رکھا ہے تاکہ یہ لوگ کہا کریں، کیا یہ لوگ ہیں کہ ہم سب میں سے ان پر اللہ تعالیٰ نے فضل کیا ہے۔“

یعنی وہ تعجب کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے ہمارے سوا کیوں کر ہدایت پائی اور اسی لیے یوں کہا: ﴿ لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ﴾ اہلِ سنت و جماعت ۔نَصَرَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی۔ جو ہیں تو کہتے ہیں کہ ہر وہ قول اور فعل جو صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں ہوا وہ بدعت ہے، اس لیے اگر وہ کچھ بہتر ہوتا تو وہ اس کی طرف ہم سے سبقت کرتے، کیوں کہ انھوں نے خیر کی باتوں اور خصلتوں میں سے کوئی خصلت نہیں چھوڑی مگر حال یہ ہے کہ اس کی طرف دوڑے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ﴾ یعنی جب انھوں نے قرآن سے ہدایت نہ پائی تو اب کہیں گے کہ یہ پرانا جھوٹ ہے، یعنی پہلے لوگوں سے نقل ہوتا چلا آیا ہے۔ چنانچہ قرآن کو اور قرآن والوں کو گھٹاتے ہیں۔ یہ وہی تکبر ہے جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: « بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ »[1] یعنی حق کو نہ ماننا اور لوگوں کو حقیر جاننا۔ پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ﴾ یعنی اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩١)

کتاب پیشوا اور رحمت ہے، مراد تورات ہے۔ اور یہ کتاب یعنی قرآن شریف عربی زبان میں ان کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس سے پہلی ہیں۔ یعنی فصاحت والا اور وضاحت والا ہے، تاکہ ان لوگوں کو ڈرائے جنھوں نے ظلم کیا اور خوش خبری ہو نیکی کرنے والوں کے لیے، یعنی یہ دو باتوں پر مشتمل ہے، کافروں کو ڈراتا ہے اور مومنوں کو خوش خبری دیتا ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ کی تفسیر سورت حم السجدہ میں گزر چکی ہے۔[1] ﴿فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ یعنی ان پر زمانہ آیندہ پر کچھ خوف نہیں ہے اور نہ ہی اس کا غم ہے جس کو پیچھے چھوڑا۔ یہ جنت کے لوگ ہیں اور اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ یہ اس چیز کا بدلہ ہے جو وہ کرتے تھے، یعنی جو انھوں نے رحمت پائی اور اس کی جو کثرت ان پر ہوئی اس کا سبب ان کے اعمال ہیں۔[2] واللّٰہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ میں حرفِ لام تعلیل کا ہے۔ ''أَيْ: لِأَجْلِهِمْ'' یا بہ معنی ''في'' ہے۔ ''أَيْ: فِيْ حَقِّهِمْ'' یا خطاب سے صیغۂ غائب کی طرف لام تبلیغ و التفات کا ہے، کیوں کہ اگر مقتضائے خطاب پر چلتے تو یوں کہتے: ''مَا سَبَقْتُمُوْنَا إِلَيْهِ'' لیکن التفات کیا تو کہا: ''مَا سَبَقُوْنَا إِلَيْهِ''. ﴿كَانَ﴾ اور ﴿اِلَيْهِ﴾ میں دونوں ضمیریں قرآن کی طرف راجع ہیں یا ''مَا جَاءَ بِهِ الرَّسُوْلُ'' کی طرف، یا رسول کی طرف، یعنی کفارِ مکہ نے مومنوں کے حق میں کہا ہے کہ اگر قرآن و نبوت جس کو محمد ﷺ لے کر آئے ہیں، کچھ بہتر ہوتا تو وہ اس کی طرف ہم سے سبقت نہ کرتے، اس لیے کہ عالی مرتبے کے کام رذیل لوگوں کے ہاتھ نہیں پہنچتے، کیوں کہ یہ لوگ گرے ہوئے ہیں، ان کے عام لوگ تو فقیر، محتاج، غلام اور چرواہے ہیں۔

یہ بات اس لیے کہی کہ اپنے متعلق یہ خیال کیا کہ ہر بزرگی کی طرف سبقت کرنے میں مستحق وہی ہیں اور دینی ریاست و سرداری اس قسم سے ہے کہ دنیاوی اسباب سے ہاتھ آتی ہے اور یہ بات ان کے خیال سے جاتی رہی کہ وہ تو نفسانی کمالات اور روحانی ملکات سے وابستہ ہے جن کی بنیاد دنیائے فانی کی زینت و آرایش میں منہ موڑنا اور آخرت پر متوجہ ہونا ہے اور جو کوئی نفسانی کمالات سے بہرہ مند ہوا تو یقیناً اس نے پوری ریاستِ دینی کو پا لیا اور جو اس سے محروم رہا تو اس کے لیے اس میں سے کچھ حصہ نہیں ہے اور یہ نہ جانا کہ اللہ پاک جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اپنے دین کے لیے چن لیتا ہے، اس میں کسی کا زور نہیں ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

---

[1] رقم الآیة (۳۰) [2] تفسیر ابن کثیر (۱۹۷/٤)

''یہ خوش قسمتی کسی کے بازوؤں کی طاقت، یعنی کوشش کا نتیجہ نہیں، جب تک عطا کرنے والا عطا نہ کرے۔''

امام قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ مشرکوں میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم زیادہ عزت والے ہیں، ہم ایسے ہیں، ہم ایسے ہیں، اگر وہ کچھ بہتر ہوتا تو فلاں فلاں اس کی طرف ہم سے سبقت کرتے؟! اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1] عون بن ابی شداد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی ایک لونڈی تھی، وہ ان سے پہلے مسلمان ہو گئی، اس کا نام زنیرہ تھا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اسلام لانے پر اس کو مارتے تھے اور کفارِ قریش کہتے تھے کہ اگر وہ کچھ بہتر ہوتا تو زنیرہ اس کی طرف ہم سے سبقت نہ کرتی، اس پر اللہ تعالیٰ نے اس کی شان میں یہ آیت اتاری۔[2] سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنو غفار و اسلم بہت سے لوگوں کے لیے فتنہ ہو گئے، کہتے ہیں اگر وہ خیر ہوتا تو اللہ اس میں ان کو پہلے شامل ہونے والے لوگوں میں سے نہ کرتا۔[3]

﴿ وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَٰذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جب قرآن سے ہدایت نہ پائی، یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے، یا ایمان کے ساتھ، تو اب کہیں گے کہ انھوں نے اس کی بھلائی کی نفی کرنے پر ہی بس نہ کیا، بلکہ کہا کہ یہ افکِ قدیم ہے، چنانچہ قرآن کی بھلائی کی نفی کرنے سے بڑھ کر اس دعوے کی طرف گئے کہ وہ کذبِ قدیم ہے، جیسا کہ اس کے حق میں ﴿ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴾ [الأحقاف: ١٧] کہا۔ کلمۂ ﴿ إِذْ ﴾ میں عامل مقدر ہے ''أَيْ: ظَهَرَ عِنَادُهُمْ'' (امام ابو السعود رحمہ اللہ نے اس کو ''لَيْسَ بِذَاكَ'' کہا ہے)[4] یعنی قرآن سے ہدایت نہ پائی تو ان کا عناد کھل کر سامنے آ گیا۔

یہ جائز نہیں ہے کہ ﴿ فَسَيَقُولُونَ ﴾ اس میں عمل کرے، کیوں کہ دو زمانوں، یعنی ماضی و مستقبل کا تضاد ہے اور حرفِ فاء کے سبب سے بھی۔ (یہ قول تو امام سمین رحمہ اللہ کا تھا۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا: یوں کہہ سکتے ہیں کہ ﴿ إِذْ ﴾ ظرف کا نہ ہو تعلیل کا ہو، یا یوں کہیں کہ ﴿ فَسَيَقُولُونَ ﴾ تینوں زمانوں میں استمرار کے لیے ہے اور سین صرف تاکید کا ہے اور حرفِ فاء ماقبل میں عمل کرنے سے مانع نہیں ہے۔ رضی وغیرہ نے اس پر نص کی ہے۔ سمین نے کہا تھا کہ ''ظَهَرَ عِنَادُهُمْ'' سے ﴿ فَسَيَقُولُونَ ﴾ متسبب ہوا ہے۔ اس پر امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا: ہو سکتا ہے کہ یہ تسبب ان کے کفر سے ہو) کسی نے کہا: اس میں عامل فعل مقدر ہے فعلِ مذکور کی جنس سے ''أَيْ: لَمْ يَهْتَدُوا''، یعنی جب قرآن سے راہ نہ پائی تو راہ نہ پائی۔

امام ابو السعود رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿ إِذْ ﴾ محذوف کا ظرف ہے جس پر ماقبل دال ہے اور اس کا مابعد اس پر مترتب ہے۔ ''أَيْ: وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِالْقُرْآنِ قَالُوا مَا قَالُوا فَسَيَقُولُونَ غَيْرَ مُكْتَفِينَ بِنَفْيِ خَيْرِيَّتِهِ هَذَا

[1] تفسير الطبري (٢٢/١٠٨، ١٠٩) الدر المنثور (٧/٤٤٠)
[2] الدر المنثور (٧/٤٤٠)
[3] المعجم الكبير (٧/٢٦٨) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔
[4] تفسير أبي السعود (٨/٨١)

إِفْكٌ قَدِيمٌ كَمَا قَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ"۔[1] امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ إِفْكٌ قَدِيمٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ آپ کے غیر نے اس کو بنایا ہے اور آپ نے اس پر اطلاع پائی اور اس کو لائے اور اللہ کی طرف اس کی نسبت کی، جیسا کہ ﴿ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴾ [الأحقاف: ۱۷] کہا۔

﴿ وَمِنْ قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ ﴾ جمہور نے ﴿ مِنْ ﴾ کو بہ کسر میم پڑھا ہے اس بنا پر کہ حرف جر ہے اور ﴿ مِنْ ﴾ اپنے مجرور کے ساتھ خبر مقدم ہے اور ﴿ كِتَابُ مُوسَىٰ ﴾ مبتدائے موخر اور جملہ محل نصب میں ہے بنا بر حال، یا مستانفہ ہے، اس کلام سے ان کے اس قول کا رد منظور ہے کہ ﴿ هَٰذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ ﴾ یعنی قرآن إفکِ قدیم کس طرح ہو سکتا ہے، اس سے پہلے تو کتابِ موسیٰ، یعنی تورات نازل ہو چکی ہے اور شرعی اصولوں میں دونوں ایک جیسی ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ قرآن حق ہے اور وہ جو اس کو ﴿ إِفْكٌ قَدِيمٌ ﴾ کہتے ہیں، ان کا یہ کہنا باطل ہے۔ کسی نے کہا "مَنْ" کو بہ فتح میم پڑھا ہے، اس بنا پر کہ "مَنْ" موصولہ ہے اور ﴿ كِتَابُ ﴾ کو نصب دیا ہے (یہ قراءت امام کلبی رحمہ اللہ سے مروی ہے) "أَيْ: وَآتَيْنَا مَنْ قَبْلِهِ كِتَابَ مُوسَىٰ" یعنی ہم نے اس شخص کو جو اس سے پہلے ہے کتابِ موسیٰ دی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ إِمَامًا وَرَحْمَةً ﴾ منصوب ہیں بنا بر حال۔ یہ قول امام زجاج رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے، یعنی قرآن سے پہلے کتابِ موسیٰ ہے درآنحالیکہ امام ہے، دین میں اس کی پیروی کی جاتی ہے اور اس شخص کے لیے رحمت ہے جو اس پر ایمان لایا۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منصوب ہیں بنا بر قطع "أَيْ: أَعْنِي إِمَامًا وَرَحْمَةً" امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ: جَعَلْنَاهُ إِمَامًا وَرَحْمَةً"[2] یعنی ہم نے کتابِ موسیٰ کو امام و رحمت کیا ہے۔ ﴿ وَهَٰذَا كِتَابٌ مُصَدِّقٌ ﴾ یعنی اور یہ قرآن ایک تصدیق کرنے والی کتاب ہے کتابِ موسیٰ کی جو امام اور رحمت ہے اور اس کے سوا اور کتبِ الٰہیہ کی تصدیق کرنے والی کتاب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنے والی ہے۔

﴿ لِسَانًا عَرَبِيًّا ﴾ کا نصب بنا بر حال موطئہ ہے اور ذو الحال ﴿ مُصَدِّقٌ ﴾ میں ضمیر ہے جو کتاب اللہ کی طرف راجع ہے۔ یعنی تصدیق کرنے والی ہے وہ کتاب درآنحالیکہ عربی زبان میں ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے جائز رکھا ہے کہ ﴿ مُصَدِّقٌ ﴾ کا مفعول ہو،[3] یعنی وہ کتاب تصدیق کرنے والی ہے زبانِ عربی کو، لیکن پہلا قول بہتر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بنا بر حذفِ مضاف "أَيْ: ذَا لِسَانٍ عَرَبِيٍّ" یعنی تصدیق کرنے والی ہے عربی زبان والے کی، مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ بنا بر اسقاط حرفِ جر "أَيْ: بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ" یہ قول ضعیف ہے۔ ﴿ لِيُنْذِرَ الَّذِينَ ظَلَمُوا ﴾ یعنی تاکہ وہ کتاب یا اللہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو ڈرائے جنھوں نے ظلم کیا۔ پہلی بات بہتر ہے۔

جمہور نے ﴿ لِيُنْذِرَ ﴾ بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے اور امام نافع، ابن عامر اور بزی رحمہم اللہ نے بہ تائے فوقیہ پڑھا

---

[1] تفسير أبي السعود (۸/۸۱) [2] فتح القدير (۵/۲۲) [3] التبيان في إعراب القرآن (۲/۱۱۵۵)

ہے، اس بنا پر کہ فاعل نبی اکرم ﷺ ہیں۔ اس کو امام ابو حاتم اور ابو عبید رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[1] ﴿ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ﴾ محلِ نصب میں ہے اور معطوف ہے ﴿ لِيُنْذِرَ ﴾ کے محل پر، اس لیے کہ وہ مفعول لہ ہے۔ یہ قول امام زمخشری رحمہ اللہ کا ہے اور امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے اس کی پیروی کی ہے۔[2] تقدیر یہ ہے: "لِلْإِنْذَارِ وَالْبُشْرَى"، کسی نے کہا ہے کہ فعل محذوف سے مصدریت کی بنا پر منصوب ہے: "أَيْ: وَيُبَشِّرُ بُشْرَى" امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: زیادہ بہتر یہ ہے کہ محلِ رفع میں ہے "أَيْ: وَهُوَ بُشْرَى"[3] کسی نے کہا ہے کہ محلِ رفع میں ہے، معطوف ہے ﴿ مُّصَدِّقٌ ﴾ پر اور ﴿ لِلْمُحْسِنِيْنَ ﴾ ﴿ بُشْرٰى ﴾ سے متعلق ہے اور ﴿ لِيُنْذِرَ ﴾ ﴿ مُّصَدِّقٌ ﴾ سے متعلق ہے۔

غرضیکہ ایمان کی دعوت قبول کرنے میں لوگوں کا حال مختلف ہے۔ بعض تو سرکشی اور نافرمانی کرتے ہیں، چنانچہ ان کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، اب ان کا ذکر ہے جنھوں نے ایمان کی دعوت قبول کی اور اس پر جمے رہے۔ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ یعنی بے شک وہ لوگ جنھوں نے عقیدۂ توحید، جو علم کا خلاصہ ہے اور شریعت پر قائم رہنے کے عمل کو، جو علم کا اصل مقصد ہے، اپنایا یعنی ان دونوں کو جمع کیا تو ان پر نہ تو اس بات کا کچھ خوف ہے کہ آخرت میں کوئی مکروہ ان کو پہنچے اور نہ ہی دنیا میں کسی پسندیدہ شے کے فوت ہونے کا غم کھائیں گے اور یہ بات دائم اور مستقل رہے گی۔ کلمۂ ﴿ ثُمَّ ﴾ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ عمل کا رتبہ بعد میں ہے اور وہ توحید پر موقوف ہے۔ حرفِ فاء موصول کی خبر میں زیادہ اس لیے ہے کہ اس میں شرط کے معنی ہیں اور ﴿ اِنَّ ﴾ نے اس سے منع نہیں کیا، اس لیے کہ ابتداء کے معنی باقی ہیں بخلاف "لَيْتَ"، و "لَعَلَّ"، و "كَأَنَّ" کے۔

﴿ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ﴾ یعنی یہ لوگ جو مذکورہ اوصاف کے حامل ہیں، وہ اصحابِ جنت ہیں جو مومنوں کا گھر ہے۔ اس حال میں کہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اس آیت میں ایک عظیم ترغیب ہے، اس لیے کہ ہمیشہ کے لیے خوف اور غم کا دور ہو جانا اور جنت میں ہمیشہ کے لیے مقیم ہو جانا اس قسم کی نعمتوں میں سے ہے کہ سوا اس کے جانیں اور کچھ طلب نہیں کرتیں اور روحیں اس کے سوا کسی چیز کا شوق نہیں رکھتیں۔ ﴿ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی اپنے ان اعمال کے سبب سے جو انھوں نے دنیا میں کیے، یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت کی اور اس کی نافرمانیوں کو ترک کیا، وہ جزا دیے جائیں گے۔ چونکہ اللہ کی خوشی والدین کی خوشی میں ہے اور اس کی ناراضی والدین کی ناراضی میں ہے، جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے،[3] اس لیے اللہ پاک نے اس کی ترغیب دلائی، چنانچہ فرمایا:[4]

---

[1] تفسير القرطبي (١٦/١٩١) [2] الكشاف (٤/٣٠٥) التبيان في إعراب القرآن (٢/١١٥٥) [3] معاني القرآن (٤/٤٤١)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٩٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥١٦) [4] فتح البيان (١٣/١٨-٢١)

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا
وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ
أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ
نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ
صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي ۖ إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ
وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٥﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ
مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ ۖ وَعْدَ
الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿١٦﴾

اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا، اس کی ماں نے اسے تکلیف سے پیٹ میں اُٹھائے رکھا اور تکلیف سے جنا اور اس کا حمل اور دودھ چھڑانا تیس ماہ (کی مدت) ہے، حتی کہ جب وہ اپنی قوت و طاقت (کمال جوانی) کو پہنچا اور چالیس برس کا ہو گیا تو اس نے دعا کی: اے میرے رب! تو مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کی اور یہ کہ میں نیک عمل کروں جو تو پسند کرے اور تو میرے لیے میری اولاد میں اصلاح کر، بلاشبہ میں نے تیری طرف توبہ کی اور بلاشبہ میں مسلمانوں میں سے ہوں⑮ یہ وہ لوگ ہیں جن سے ہم اچھے عمل قبول کرتے ہیں، جو انھوں نے کیے، ان کی برائیوں سے ہم درگزر کرتے ہیں، (تو یہ) جنتیوں میں ہوں گے۔ (یہ) سچا وعدہ ہے جو ان سے کیا جاتا رہا ہے⑯

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی وصیت:

حمل کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھڑانا تیس مہینے میں ہے۔ بچہ اگر قوی ہو تو اکیس مہینے میں دودھ چھوڑتا ہے اور نو مہینے حمل کے۔ یہ آیت کسی کے حال کا بیان نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ماں باپ کے حق میں دعا نہیں کی۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ چالیس برس کی عمر میں مسلمان ہوئے اور ان کے ماں باپ بھی مسلمان ہوئے، یہ بات اور کسی صحابی کو میسر نہیں ہوئی۔ لیکن باپ اس وقت مسلمان نہیں ہوا تو یہ احوال فرضی ہے، یعنی سعادت مند لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ انتھٰی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید اور اخلاص میں عبادت واستقامت

کا ذکر کیا تو اس کے بعد والدین کے بارے میں وصیت کی جیسا کہ قرآن کی کئی آیتوں میں اس کا ذکر ہے جو ایک دوسرے سے ملتی جلتی آیات ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ﴾ [بني إسرائيل: ٢٣] ''اور تیرا رب صاف صاف حکم دے چکا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ﴾ [لقمان: ١٤] ''کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کر۔'' ان کے سوا اور بہت سی آیتیں ہیں۔

اس جگہ اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسَانًا ﴾ یعنی ہم نے آدمی کو حکم دیا ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ نیکی اور شفقت کرے۔ امام ابو داود طیالسی رحمہ اللہ نے سیدنا سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ام سعد نے کہا: کیا اللہ نے والدین کی اطاعت کا حکم نہیں فرمایا ہے؟ تو میں نہ کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی، یہاں تک کہ تو اللہ کے ساتھ کفر کرے، پھر وہ کھانے پینے سے باز رہی، یہاں تک کہ گھر والے لکڑی سے اس کا منہ کھولنے لگے اور یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسَانًا ﴾[1] (ورواہ مسلم و أهل السنن إلا ابن ماجه من حديث شعبة بإسناد نحوه و أطول منه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ﴾ یعنی اس کی ماں نے حمل کی حالت میں اس کے سبب سے مشقت وتھکان اٹھائی اور اکوئی (حاملہ عورت کی متلی) اور متلی وگرانی و بے قراری کی تکلیف برداشت کی۔ اس کے سوا تکلیف اور مشقت کے اُور امور جو حاملہ عورتوں کو لاحق ہوتے ہیں اور اس کو جنا بھی، جس کے لیے دردِ زہ اور مشقت اور تکلیف کی شدت اٹھائی۔ ﴿ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ﴾ یعنی اس کا حمل اور دودھ چھڑانا تیس مہینے میں ہے، اس مدت میں بھی تکلیف اور مشقت سے خالی نہیں رہتی۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس آیت سے اور سورت لقمان کی آیت سے ﴿ وَفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ ﴾ [لقمان: ١٤] اور آیت: ﴿ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾ [البقرة: ٢٣٣] ''مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلائیں جن کا ارادہ دودھ پلانے کی مدت بالکل پوری کرنے کا ہو'' سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ حمل کی کم سے کم مدت چھے ماہ ہے۔ یہ استنباط مضبوط اور صحیح ہے اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے اس پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی موافقت کی ہے۔

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود بعجہ بن عبداللہ جہنی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ہم میں سے ایک شخص نے جہینہ کی ایک عورت سے نکاح کیا، پھر چھے مہینے گزرنے کے بعد اس نے اس کا ایک بچہ جنا تو اس کا خاوند سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف گیا اور اس کا ان سے ذکر کیا تو انھوں نے اس عورت کی طرف آدمی بھیجا، چنانچہ جب وہ کھڑی

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٤٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٨٩) مسند الطيالسي (٢٨/١)

ہوئی کہ اپنے کپڑے پہنے تو اس کی بہن نے رو دیا۔ اس نے کہا: تجھے رونا کیوں آیا، پس اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے اس کے سوا کبھی کوئی مجھ سے نہیں لگا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ میرے حق میں جو چاہے گا فیصلہ کرے گا، پھر جب اس کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس لائے تو انھوں نے اس کے رجم کا حکم دیا۔

پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو یہ خبر پہنچی تو وہ اُن کے پاس آئے اور ان سے فرمایا: تم کیا کرتے ہو؟ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ بولے کہ اس نے پورے چھے مہینے میں بچہ جنا ہے اور کیا ایسا ہوتا ہے، یعنی ایسا نہیں ہوتا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے ہو؟ کہا: کیوں نہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تم نے اللہ عزوجل کو نہیں سنا کہ فرماتا ہے: ﴿ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ﴾ نیز فرمایا ہے: ﴿ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ﴾ اب باقی صرف چھے مہینے رہے۔ راوی نے کہا: چنانچہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: واللہ! میں اس کو نہیں سمجھا تھا، اس عورت کو میرے پاس لے آؤ، پھر اس کو پایا کہ اس سے فراغت ہو چکی تھی۔ راوی نے کہا: پھر معمر نے کہا: پس قسم ہے اللہ کی! کوا کوے سے اور انڈا انڈے سے اتنا مشابہ نہیں ہوتا، جتنا وہ بچہ اپنے باپ سے مشابہ تھا، پھر جب اس کو اس کے باپ نے دیکھا تو کہا: واللہ! یہ میرا بیٹا ہے، میں اس میں شک نہیں کرتا ہوں۔ کہا اور اللہ تعالیٰ نے قرحۂ آکلہ (ایسا زخم جو انسان کو کھاتا جائے) میں اس کو مبتلا کر دیا جو اس کے چہرے میں ظاہر ہوا، وہ اس کو کھاتا رہا، یہاں تک کہ مر گیا۔[1] (رواه ابن أبي حاتم)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ﴿ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴾ [الزخرف: ٨١] کی تفسیر میں بہ وجہ دیگر اس کو ذکر کیا ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ جب عورت نو مہینے میں جنے تو اکیس مہینے تک دودھ پلانا اس کے لیے کافی ہے اور جب سات مہینے کا جنے تو اس کو تئیس ٢٣ ماہ تک دودھ پلانا کافی ہے اور جب چھے مہینے کا جنے تو پورے دو سال تک دودھ پلانا چاہیے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ﴾[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ﴾ یعنی یہاں تک کہ جس وقت قوی اور جوان ہوا اور مرد بنا اور چالیس برس کی عمر کو پہنچا، یعنی اس کی عقل انتہا کو پہنچی اور اس کا فہم اور حلم کامل ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ غالباً چالیس برس کا آدمی جس حالت پر ہوتا ہے اس سے متغیر نہیں ہوتا۔ امام ابوبکر بن عیاش رحمہ اللہ نے عن اعمش عن قاسم بن عبدالرحمان روایت کیا ہے کہ میں نے امام مسروق رحمہ اللہ سے کہا کہ مرد کب اپنے گناہوں سے پکڑا جاتا ہے؟ کہا: جب تو چالیس برس کی عمر کو پہنچے تو اپنا بچاؤ کرے۔[3]

حافظ ابو یعلیٰ موصلی رحمہ اللہ نے عن عثمان عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے (اس کی سند میں ایک راوی عزرہ بن قیس ازدی سو برس کی عمر کو پہنچے تھے) کہ بندۂ مسلم جس وقت چالیس برس کی عمر کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے حساب کو ہلکا

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٩٣، ٣٢٩٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٩٤) [3] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٩٤)

کرتا ہے اور جب وہ ساٹھ برس کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف انابت عطا فرماتا ہے (یہاں پچاس برس کا ذکر نہیں ہے۔ واللّٰه أعلم۔ رہ گیا ہے یا اس روایت میں یوں ہی ہے۔ غرضیکہ تفسیر ابن کثیر میں نہیں ہے، لیکن طی الفراسخ، شرح برزخ میں بہ روایتِ حاکم عن انس عن النبی ﷺ یوں ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اسلام میں چالیس برس زندہ رکھتا ہے، اس سے جذام، برص، جنون اور عتقِ شیطان کو پھیر دیتا ہے اور جس کو پچاس برس کی عمر دیتا ہے۔ اس کے لیے حساب آسان کرتا ہے۔ اس کے بعد نوے برس تک کا ذکر ہے اور نوے میں پچھلے گناہ کا ذکر نہیں ہے)۔ اور جب وہ ستر برس کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس کو آسمان والے دوست رکھتے ہیں اور جب وہ اسی برس کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی نیکیوں کو ثبت کرتا ہے اور اس کی برائیوں کو مٹاتا ہے اور جب نوے برس کی عمر کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی اپنے گھر والوں کے بارے میں شفاعت قبول کرتا ہے اور آسمان میں لکھتا ہے کہ وہ اللہ کا اس کی زمین میں قیدی ہے۔[1] (وقد روي هذا من غير هذا الوجه وهو في مسند الإمام أحمد) حجاج بن عبداللہ حلیمی دمشق میں امرائے بنی اُمیہ میں سے ایک امیر تھے، یہ کہتے ہیں کہ میں نے چالیس برس تک تو لوگوں سے شرما کر معاصی اور گناہ ترک کیے۔ پھر اللہ عزوجل سے حیا کر کے ان کو چھوڑا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

صَبَا مَا صَبَا حَتَّى عَلَا الشَّيْبُ رَأْسَهُ   فَلَمَّا عَلَاهُ قَالَ لِلْبَاطِلِ إِبْعَدِ[2]

"لڑکپن میں کیا جو کچھ کیا، یہاں تک کہ بڑھاپا اس پر چڑھ آیا، پھر جب وہ اس پر چڑھ آیا تو باطل سے کہہ دیا کہ دور ہو۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ یعنی جب چالیس برس کو پہنچا تو کہا: اے رب! تو مجھے اس بات کا الہام کر کہ میں تیری نعمت کا شکر کروں جس کا تو نے مجھ پر انعام کیا ہے اور میرے والدین پر اور اس بات کا الہام کر کہ میں آیندہ نیک عمل کروں جس کو تو پسند کرے اور میرے لیے میری نسل اور اولاد کی اصلاح کر، بے شک میں تیری طرف رجوع ہوا اور بے شک میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ اس میں اس شخص کو جو چالیس برس کی عمر کو پہنچ جائے، یہ نصیحت کی گئی ہے کہ اللہ عزوجل سے توبہ کرنے اور اس کی طرف رجوع کرنے کی تجدید کرے اور اس پر پختہ اور محکم ہو۔

امام ابو داود نے اپنی سنن میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان کو، یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تعلیم فرماتے تھے کہ تشہد میں اس طرح کہیں: "اَللّٰهُمَّ أَلِّفْ بَيْنَ قُلُوْبِنَا وَأَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِنَا

[1] تفسیر ابن کثیر (۱۹۹/٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "رواه أبو يعلىٰ في الكبير وفيه عزرة بن قيس الأزدي وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ۳٤۲/۱۰)

[2] تفسیر ابن کثیر (۱۹۹/٤)

وَاهْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَنَجِّنَا مِنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّوْرِ وَجَنِّبْنَا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَبَارِكْ لَنَا فِي أَسْمَاعِنَا وَأَبْصَارِنَا وَقُلُوْبِنَا وَأَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ، وَاجْعَلْنَا شَاكِرِيْنَ لِنِعْمَتِكَ، مُثْنِيْنَ بِهَا قَابِلِيْهَا وَأَتِمَّهَا عَلَيْنَا"[1] اللہ عز وجل نے فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ ﴾ یعنی یہ لوگ جو مذکورہ اوصاف کے حامل ہیں جو اللہ کی طرف توبہ کرنے والے اور رجوع کرنے والے ہیں اور توبہ و استغفار کے ساتھ اپنی گزشتہ لغزشوں کا تدارک کرنے والے ہیں، وہی جن سے ہم بہتر سے بہتر عمل قبول کر لیں گے جو انھوں نے کیا اور اُن کے گناہوں سے درگزر کریں گے، چنانچہ ان کی بہت سی لغزشوں کو بخش دیں گے اور ان کا ذرا سا عمل بھی قبول کر لیں گے۔

﴿ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ﴾ یعنی وہ جنت والوں کے جملے میں ہیں اور اللہ کے نزدیک ان کے بارے میں یہ حکم ہے، جیسا کہ اللہ عز وجل نے اس شخص سے وعدہ کیا ہے جس نے اس کی طرف توبہ و انابت کی اور اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴾ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الروح الامین علیہ السلام روایت کیا ہے، کہا ہے کہ بندے کی نیکیاں اور بدیاں لائی جائیں گی، پھر ان کے بعض کا بعض سے بدلہ لیا جائے گا، پھر اگر ایک نیکی باقی رہ جائے گی تو اللہ تعالیٰ جنت میں وسعت دے گا۔" قَالَ: فَدَخَلْتُ عَلَى يَزْدَادَ فَحَدَّثَ بِمِثْلِ هٰذَا قَالَ: قُلْتُ: فَأَيْنَ ذَهَبَتِ الْحَسَنَةُ؟ قَالَ: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴾[2] (وهكذا رواه ابن أبي حاتم عن أبيه عن محمد بن عبد الأعلى الصنعاني عن المعتمر بن سليمان بإسناده مثله وزاد وعن الروح الأمين قال: قال الرب -جل جلاله- "يؤتى بحسنات العبد وسيئاته" فذكره، وهو حديث غريب وإسناده جيد لا بأس به)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن یوسف بن سعد عن محمد بن حاطب رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے۔ یوسف نے کہا ہے کہ محمد میرے گھر میں اترے، جبکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بصرہ پر غالب ہوئے تو محمد نے ایک دن مجھ سے کہا کہ البتہ ایک دن میں امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا اور ان کے پاس عمار، صعصعہ، اشتر اور محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہم تھے تو اُن سب نے عثمان رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا اور اُن کی برائی کی تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ تخت پر تھے اور اُن کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی۔ ان میں سے ایک قائل نے کہا کہ تمھارے پاس وہ شخص ہے جو تم میں فیصلہ کر دے گا، پھر ان سے پوچھا تو علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ ان میں سے تھے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ ... الآية ﴾ کہا: واللہ! سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور اصحابِ عثمان۔ اس کو تین بار کہا۔ یوسف کہتے ہیں: پھر میں نے محمد حاطب سے کہا: قسم ہے اللہ کی! کیا تو نے اس کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے سنا؟ تو کہا کہ اللہ کی قسم! البتہ میں نے اس کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے سنا۔[3]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٦٩) [2] تفسير الطبري (١١٦/٢٢) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٩٤)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٩٥/١٠) تفسير ابن كثير (١٩٨/٤۔٢٠٠)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ جمہور نے "حُسْنًا" بہ ضمِ حاء وسکونِ سین پڑھا ہے اور سیدنا علی اور سلمی رضی اللہ عنہما نے بہ فتحِ ہر دو پڑھا ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور کوفیوں نے ﴿ اِحْسٰنًا ﴾ پڑھا ہے۔[1] سورۃ العنکبوت میں ﴿ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ﴾ [العنکبوت: ۸] گزر چکا ہے، جس کے متعلق قراء میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور سورۃ الانعام اور سورت بنی اسرائیل میں ﴿ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ﴾ گزر چکا ہے، چنانچہ شاید اس جگہ کی قراءت اور ان سب قراءتوں کی بنیاد پر قاریوں کے درمیان اختلاف ہوا ہو۔

اس کا نصب مصدریت کی بنا پر ہے: "أَيْ: وَصَّيْنَاهُ أَنْ يُحْسِنَ إِلَيْهِمَا حُسْنًا أَوْ إِحْسَانًا" یعنی ہم نے انسان کو اس بات کی وصیت کی کہ ان کے ساتھ اچھی طرح نیکی کرے۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے بہت ہی اچھا برتاؤ کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ نصب بنا بر مفعول بہ ہے اور ﴿ وَصَّيْنَا ﴾ میں "أَلْزَمْنَا" کے معنی شامل ہیں، یعنی ہم نے انسان پر اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کو لازم کر دیا۔ کسی نے کہا ہے کہ بنا بر مفعول لہ ہے، یعنی ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ احسان کرنے کی وصیت کی۔ حسن، قبح (برائی) کے متضاد کو کہتے ہیں اور احسان، اساءت کے متضاد کو کہتے ہیں اور توصیہ بہ معنی حکم ہے۔

"کُرْہ" کو جمہور نے دونوں جگہ بہ ضمِ کاف پڑھا ہے اور امام ابو عمرو اور اہلِ حجاز نے بہ فتحِ کاف پڑھا ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ دو لغت ہیں، ایک ہی معنی ہیں۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "کَرْہ" بالفتح خوب نہیں ہے، کیوں کہ اس کے معنی غضب اور غلبہ کے ہیں اور امام ابو عبید رحمہ اللہ نے فتح کو اختیار کیا ہے اور کہا: یہ اس لیے کہ پورے قرآن میں "کُرْہ" کا لفظ بالفتح ہے سوائے اس کے جو سورۃ البقرہ میں ہے: (امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کلیات میں کہا ہے: "كُلُّ مَا فِي الْقُرْآنِ مِنَ الْكُرْهِ جَازَ فِيهِ الْفَتْحُ إِلَّا قَوْلُهُ: ﴿ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ﴾")[2] ﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ﴾[3] [البقرۃ: ۲۱۶] "تم پر جہاد فرض کیا گیا، گو وہ تمھیں دشوار معلوم ہو۔" کسی نے کہا ہے کہ "کُرْہ" بالضم وہ ہے جس کو آدمی اپنے نفس پر اٹھاتا ہے اور بالفتح وہ ہے جس کو اپنے غیر پر لادتا ہے۔

بالجملہ جملۂ ﴿ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ﴾ تعلیل ہے توصیۂ مذکورہ کی اور اس میں صرف ماں کا ذکر کرنے پر اکتفا اس لیے کیا کہ اس کا حق بہت زیادہ ہے اور اسی لیے اس کے ساتھ نیکی کرنے کے دو تہائی حصے ہیں، جیسا کہ الخطیب نے کہا۔ اور ماں کے حمل اور وضعِ حمل کا جو ذکر فرمایا تو اس سے اس کے ساتھ احسان کو واجب کرنے کی تاکید کرنا منظور ہے۔ کون سا احسان؟ وہ احسان جس کی اللہ پاک نے وصیت فرمائی ہے۔ معنی یہ ہیں:

---

[1] فتح القدير (۲۳/۵) [2] كتاب الكليات (۷٤۱/۱) [3] فتح القدير (۲۳/۵)

"إِنَّهَا حَمَلَتْهُ ذَاتَ كُرْهٍ وَوَضَعَتْهُ ذَاتَ كُرْهٍ" یعنی ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ سے نیکی کرنے کی وصیت کی، اس لیے کہ اس کی ماں نے اس کو پیٹ میں رکھا، اس حال میں کہ وہ مشقت اٹھانے والی تھی اور اس کو جنا اس حال میں کہ تکلیف سہنے والی تھی۔ یہ معنی تو اس بنیاد پر تھے کہ ﴿كُرْهًا﴾ حال ہے ﴿حَمَلَتْهُ﴾، ﴿وَضَعَتْهُ﴾ سے۔ ﴿كُرْهًا﴾ مصدر محذوف کی صفت ہے: "أَيْ: حَمْلًا كُرْهًا وَوَضْعًا كُرْهًا" مطلب یہ ہے کہ ماں کا حق سب سے بڑا ہے، اس لیے کہ حمل کے دوران میں اس نے ایذاء اٹھائی اور جننے کے وقت مشقت کھینچی۔

پھر اللہ پاک نے انسان کے حمل اور فصال کی مدت ذکر فرمائی: ﴿وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ یہاں مضاف مقدر ہے: "أَيْ: مُدَّةُ حَمْلِهِ" یعنی ان دونوں کی مدت تیس مہینے ہیں، ابتدائے حمل سے لے کر دودھ چھڑانے تک۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ماں کا حق باپ کے حق سے زیادہ ہے، کیوں کہ اس نے اس کو پیٹ میں اٹھایا تو مشقت کی اور جب جنا تو مشقت کی اور اتنی مدت اس کو رنج اور تکلیف سے دودھ پلایا۔ اور ان کاموں میں سے کسی کام میں باپ اس کا شریک نہیں ہوتا۔ جمہور نے "فِصَالُهُ" الف کے ساتھ پڑھا ہے اور امام حسن رحمہ اللہ وغیرہ نے (یعنی امام یعقوب قتادہ اور جحدری رحمہم اللہ) نے "فَصْلُهُ" پڑھا ہے بہ فتحِ فاء وسکونِ صاد بغیر الف کے۔[1] "فصل وفصال" کے ایک ہی معنی ہیں، جیسے: "فطم و فطام" اور "قطف و قطاف" (میوہ چننا)۔

اس آیتِ کریمہ سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ حمل کی کم سے کم مدت چھے مہینے ہیں، اس لیے کہ رضاعِ کامل (دودھ پلانے کی پوری) مدت دو سال ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ... الآية﴾ [البقرة: ٢٣٢] پس اللہ پاک نے اس آیت میں حمل کی کم سے کم مدت اور دودھ پلانے کی زیادہ سے زیادہ مدت ذکر فرمائی ہے۔

امام نافع بن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے خبر دی، البتہ میں اس عورت کے قصے کو خوب جانتا ہوں جس کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لائے، وہ میرے روبرو ہوا ہے، میں نے اس کے مقدمے میں فیصلہ کیا ہے۔ اس نے پورے چھے ماہ میں بچہ جنا تھا اور لوگوں نے اس کو اوپرا سمجھا۔ چنانچہ میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ کیوں ظلم کرتے ہیں؟ فرمایا: کیسے؟ میں نے کہا: آپ پڑھیں: ﴿وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾۔ اور ﴿وَالْوٰلِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ حول کتنی ہے؟ فرمایا: ایک برس۔ میں نے کہا: برس کتنا ہے؟ فرمایا: بارہ مہینے۔ میں نے کہا: تو چوبیس مہینے کے پورے دو سال ہوئے اور اللہ تعالیٰ موخر کرتا ہے حمل سے جو چاہتا ہے اور مقدم کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے میرے قول کی طرف راحت لی۔[2]

---

[1] تفسير القرطبي (١٩٣/١٦) فتح القدير (٢٤/٥) [2] الدر المنثور (٤٤٢/٧)

"أَشُدَّ" جمع ہے، اس کا واحد اس کے لفظ سے نہیں ہے۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ کہا کرتے تھے کہ اس کا واحد "شدة" ہے۔ بلوغِ اشد انسان کی عقل اور قوت کے استحکام اور اس کے شباب اور استواء کی انتہاء ہے اور یہ ہے کہ ادھیڑ ہو جائے اور اس عمر کو پورا کر لے جس میں اس کی قوت اور عقل مستحکم ہوتی ہے، یہ اس وقت ہوتا ہے جب تیس برس سے آگے بڑھتا ہے اور چالیس برس کے لگ بھگ ہوتا ہے، اس کا بیان پورے طور پر پہلے گزر چکا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اٹھارہ برس کی عمر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "اَلْاَشَدُّ: اَلْحُلُمُ" ہے۔ یہ قول امام شعبی اور ابن زید رحمہ اللہ کا ہے۔

امام حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بلوغِ اشد چالیس برس کی عمر کو پہنچنا ہے۔[1] لیکن پہلا قول بہتر ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی دلیل سے: ﴿ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ﴾ اس لیے کہ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ چالیس برس کو پہنچنا بلوغِ اشد کے بعد ایک شے ہے، جبھی تو اس کے بعد اس کا ذکر کیا۔ مفسرین نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی کوئی نبی مبعوث نہیں فرمایا مگر چالیس برس کی عمر کے بعد، سوائے دو خالہ زاد بھائیوں کے، یعنی عیسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام۔

بالجملہ یہاں ایک جملے کی تقدیر ضرور ہے کہ "حتی" اس کی غایت ہو۔ "أَيْ: عَاشَ وَاسْتَمَرَّتْ حَيَاتُهُ ﴿حَتَّى إِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ﴾ الاية" مطلب یہ ہے کہ اس کی ماں نے اسے مشقت سے پیٹ میں رکھا اور مشقت سے جنا اور اس کا حمل اور فصال تیس ماہ کی مدت میں ہوا اور زندہ رہا اور اس کی حیات قائم رہی، یہاں تک کہ جب وہ اپنی عقل کی پختگی کو پہنچا، چالیس برس کی عمر کو تو کہا: اے رب! تو مجھ کو الہام کر اور رغبت دے اور توفیق دے ("إیزاع" بہ معنی الہام ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ کہتے ہیں: "اِسْتَوْزَعْتُ اللّٰهَ فَأَوْزَعَنِي، أَيْ اِسْتَلْهَمْتُهُ فَأَلْهَمَنِي"[2] یعنی میں نے اللہ تعالیٰ سے الہام طلب کیا تو اس نے مجھے الہام کیا) اس بات کی کہ میں تیری نعمت کا شکر ادا کروں جس کا تو نے مجھے انعام کیا، یعنی تو نے مجھ پر ہدایت کا انعام فرمایا اور میرے ماں باپ پر کہ انھوں نے مجھ پر شفقت اور مہربانی کی، جب کہ میں چھوٹا سا تھا اور مجھے پالا پوسا۔

کسی نے کہا ہے کہ مجھ پر تو صحت اور عافیت کا انعام کیا اور میرے والدین پر غنا اور ثروت کا کہ انھوں نے اپنا مال صرف کر کے میری پرورش کی۔ بہتر یہ ہے کہ اس کی نعمت اور اس کے والدین کی نعمت کسی خاص نعمت کے ساتھ مقید نہ کی جائے، تاکہ ہر قسم کی نعمت اس میں شامل ہو جائے۔ اور مجھے اس بات کا الہام کر کہ میں نیک عمل کروں، جس کو تو مجھ سے پسند کرے اور میرے لیے میری اولاد میں اصلاح کر، یعنی ان کو صالح اور نیک بنا کہ وہ نیکی کرنے میں خوب پکے اور مضبوط ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہر یہ تھا: ﴿ اَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ﴾ اس لیے کہ اصلاح خود متعدی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ﴾ [الأنبياء: ٩٠] "اور ان کی بیوی کو ان کے لیے درست کر دیا۔"

---

[1] تفسیر القرطبي (١٩٤/١٦) [2] الصحاح للجوهري (٤٣٢/٤)

اس کا نکتہ یہ ہے کہ "اصلاح" کو کلمۂ ﴿ فِیْ ﴾ سے متعدی کیا، اس لیے کہ اس میں "لطف" کے معنی شامل ہیں "أَيْ: اُلْطُفْ بِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ" یا یوں کہو کہ اس کو بہ منزلہ لازم ٹھہرایا، پھر اسے کلمۂ ﴿ فِیْ ﴾ سے متعدی کیا، تاکہ اس سے یہ ظاہر ہو کہ صلاح ان میں جاری وساری ہو اور وہ صلاح کے لیے ظرف کی طرح ہو جائیں، صلاح کے ان میں جگہ پکڑنے کے سبب سے۔ ﴿ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَ اِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴾ یعنی بے شک میں اپنے گناہوں سے تیری طرف رجوع ہوا اور بے شک میں ان لوگوں میں سے ہوں جو تیرے مطیع ہیں اور تیری طاعت کے لیے منقاد (فرمانبردار) ہیں اور تیری توحید کے لیے مخلص ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ جس کی عمر چالیس سال کی ہو جائے تو اس کو ضروری ہے کہ یہ دعائیں بہت کیا کرے۔ ﴿ اُولٰٓىِٕكَ ﴾ "انسان" مذکور کی طرف اشارہ ہے (﴿ اُولٰٓىِٕكَ ﴾ مبتداء اور ﴿ الَّذِیْنَ... الخ﴾ خبر ہے) جمع اس لیے کہا کہ اس سے مراد جنس ہے۔ ﴿ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ نَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ ﴾ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن سے ہم بہترین اعمالِ خیر کو قبول کرتے ہیں جو انھوں نے دنیا میں کیے۔ ﴿ اَحْسَنَ ﴾ سے مراد حسن ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَ اتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ ﴾ [الزمر: ۵۵] "اور پیروی کرو اس بہترین چیز کی جو تمھاری طرف تمھارے پروردگار کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔"

چنانچہ قبولیت صرف ان کی افضل اور احسن عبادات کے لیے ہی نہیں ہے، بلکہ ان کی تمام طاعاتِ فاضل ومفضول کے لیے عام ہے اور قبولِ عمل سے مراد راضی ہونا اور اس پر ثواب دینا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اسم تفضیل اپنے معنی پر ہے اور اس سے وہ اعمال مراد ہیں جن پر بندے کو ثواب دیا جاتا ہے نہ کہ وہ جن پر ثواب نہیں دیا جاتا، جیسے مباح کہ وہ حسن ہے احسن نہیں ہے۔ اور ہم ان کی برائیوں سے درگزر کرتے ہیں اور ان پر ان کو سزا نہیں دیتے۔

جمہور نے "يَتَقَبَّلُ وَيَتَجَاوَزُ" بہ صیغۂ مجہول پڑھا اور امام حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے دونوں کو بہ نون پڑھا ہے،[1] اس بنا پر کہ ان کی اسناد اللہ پاک کی طرف ہے۔ "تجاوز" بہ معنی غفران ہے، اس کی اصل "جُزْتُ الشَّيْءَ" سے ہے، یعنی میں اس شے سے گزر گیا، جبکہ تو اس پر ٹھہرے نہیں۔ ﴿ فِیْۤ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ اصحابِ جنت میں شمار ہونے والے ہیں اور ان کی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ جار و مجرور محلِ نصب میں ہے بنا بر حال جیسے تم کہو: "أَكْرَمَنِي الْأَمِيْرُ فِي الصَّحَابَةِ، أَيْ: كَائِنًا مِنْ جُمْلَتِهِمْ" کسی نے کہا ہے کہ ﴿ فِیْۤ ﴾ بہ معنی "مَعَ" ہے "أَيْ: مَعَ أَصْحَابِ الْجَنَّةِ"۔ کسی نے کہا ہے کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے: "أَيْ: هُمْ فِيْ أَصْحَابِ الْجَنَّةِ"

[1] تفسیر القرطبي (۱۶/۱۹۶)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴾ جملہ سابقہ کے مضمون کے لیے مصدر مؤکد ہے، اس لیے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ ﴾ وعدۂ تقبل وتجاوز کے معنی میں ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فعل محذوف کے لیے مصدر ہو۔ "أَيْ: وَعَدَهُمُ اللّٰهُ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ" یعنی ان سے اللہ نے سچا وعدہ کیا جس کا ان کو دنیا میں رسولوں کی زبان پر وعدہ دیا جاتا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی تو ان کے ساتھ ان کے ماں باپ اور ان کے اخوان اور ان کی ساری اولاد مسلمان ہو گئے اور یہ آیت بھی ان کی شان میں نازل ہوئی: ﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ۝ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ۝ فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۝ لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۝ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴾ [الليل: ٥- ٢١] "جس نے دیا (اللہ کی راہ میں) اور ڈرا (اپنے رب سے)۔ اور نیک بات کی تصدیق کرتا رہے گا۔ تو ہم بھی اس کو آسان راستے کی سہولت دیں گے۔ لیکن جس نے بخیلی کی اور بے پروائی برتی۔ اور نیک بات کی تکذیب کی۔ تو ہم بھی اس کی تنگی ومشکل کے سامان میسر کریں گے۔ جس کا مال اسے (اوندھا) کرنے کے وقت کچھ کام نہ آئے گا۔ بیشک راہ دکھادینا ہمارے ذمے ہے۔ اور ہمارے ہی ہاتھ آخرت اور دنیا ہے۔ میں نے تو تمھیں شعلے مارتی ہوئی آگ سے ڈرا دیا ہے۔ جس میں صرف وہی بدبخت داخل ہوگا جس نے جھٹلایا اور (اس کی پیروی سے) منہ پھیر لیا۔ اور اس سے ایسا شخص دور رکھا جائے گا جو بڑا پرہیزگار ہوگا۔ جو پاکی حاصل کرنے کے لیے اپنا مال دیتا ہے۔ کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں کہ جس کا بدلہ دیا جا رہا ہو۔ بلکہ صرف اپنے پروردگار بزرگ وبلند کی رضا چاہنے کے لیے۔ یقیناً وہ (اللہ بھی) عنقریب رضامند ہوجائے گا۔"[1] (أخرجه ابن مردويه)

علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہا ہے کہ یہ آیت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں اور ان کے والد ابو قحافہ رضی اللہ عنہ اور ان کی والدہ ام الخیر رضی اللہ عنہا اور ان کی اولاد کے بارے میں نازل ہوئی اور ان کے حق میں ان کی دعا قبول ہونے کے متعلق نازل ہوئی، اس لیے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سی وہشت (۳۸) سال کی عمر میں ایمان لائے اور چالیس سال کی عمر میں اپنے والدین کے لیے دعا کی۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سوا مہاجرین وانصار صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ اور اس کے والدین، بیٹے اور بیٹیاں اسلام لائے ہوں۔[2]

---

(1) الدر المنثور (٤٤٣/٧) (2) تفسير النسفي (١٣٩/٤)

بالجملہ جب اللہ پاک نے اس شخص کا ذکر کیا جس نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کیا جو اس پر اور اس کے والدین پر تھی تو اس کے بعد اس شخص کا ذکر فرمایا جس نے والدین سے ایسی بات کہی جو اُن سے ملول ہونے پر دال ہے، جبکہ انھوں نے اس کو ایمان کی طرف بلایا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِيْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ
الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ ۚ وَهُمَا يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ ۖ اِنَّ
وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَيَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۷
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ
قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ۝۱۸ وَلِكُلٍّ
دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۱۹
وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ۭ اَذْهَبْتُمْ
طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ
عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ
وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ۝۲۰

اور جس نے اپنے والدین سے کہا: تم دونوں پر اُف (افسوس) ہے! کیا تم دونوں مجھے وعدہ دیتے ہو کہ مجھے (قبر سے) نکالا جائے گا، حالاں کہ مجھ سے پہلے بہت سی اُمتیں گزر چکی ہیں، جبکہ وہ دونوں اللہ سے فریاد کرتے (اور کہتے) ہیں: تو ہلاک ہو جائے! ایمان لے آ، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے، تب وہ کہتا ہے: یہ تو بس اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں⑰ یہ وہ لوگ ہیں جن پر (اللہ کے عذاب کی) بات ثابت ہو گئی، جنوں اور انسانوں کے ان گروہوں کے ساتھ جو ان سے پہلے گزرے ہیں، بے شک وہ خسارہ پانے والے تھے⑱ اور ہر ایک کے لیے اس کے اعمال کے مطابق درجے ہیں، تاکہ وہ (اللہ) انھیں ان کے اعمال کا پورا بدلہ دے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا⑲ اور جس دن اہلِ کفر کو آگ کے سامنے پیش کیا جائے گا، (تو کہا جائے گا:) تم نے دنیاوی زندگی ہی میں اپنی لذتوں کا (پورا) حصہ لے لیا، اور تم نے ان سے فائدہ

[1] فتح البیان (۱۳/۲۱۔۲۵)

اُٹھا لیا، چنانچہ آج تمھیں ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی، اس لیے کہ تم زمین میں ناحق تکبر کرتے رہے، اور اس لیے کہ تم فسق و فجور کرتے رہے ﴿20﴾

نافرمان اولاد کا انجام بد:

ان آیات میں اس شخص کا حال بیان ہوا ہے جو کافر ہے اور ماں باپ ایمان کی بات سمجھاتے ہیں اور وہ نہیں سمجھتا۔ جس طرح جنت والوں کے کئی درجے ہیں اسی طرح دوزخ والے بھی اپنے اپنے اعمال کے مطابق سزا پائیں گے۔ جن لوگوں نے آخرت نہ چاہی فقط دنیا ہی چاہی ان سب کو نیکیوں کا بدلہ اسی دنیا میں مل چکا۔ انتھٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب اللہ پاک نے ان لوگوں کا حال بیان کیا جو والدین کے لیے دعا کرنے والے اور اُن کے ساتھ نیکی کرنے والے ہیں اور ان کے لیے جو کامیابی اور نجات اس کے پاس ہے، اس کا بیان کیا تو اس کے بعد ان شقی اور بدبخت لوگوں کا ذکر کیا جو والدین کی نافرمانی کرنے والے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَاۤ ﴾ یہ عام ہے ہر اس شخص کے بارے میں جس نے یہ بات کہی اور جس کا یہ زعم ہے کہ عبدالرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہے، اس کا قول ضعیف ہے، اس لیے کہ عبدالرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہ اس کے بعد اسلام لائے اور اس کا اسلام اچھا ہوا اور وہ اپنے زمانے کے بہترین لوگوں میں سے تھے۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایک فرزند کے حق میں نازل ہوئی ہے،[1] اس قول کی صحت میں نظر ہے۔ واللّٰہ تعالیٰ أعلم.

امام ابن جریج رحمہ اللہ امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا اور دوسروں نے کہا کہ عبدالرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ (یعنی جیسے عوفی کی روایت ہے ویسے ہی یہ بھی ہے۔ امام سدی صغیر رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ سخت ضعیف ہے۔ كما في كتب الرجال والله أعلم) یہ آیت جو ہے سو عام ہے ہر اس شخص کے بارے میں ہے جس نے اپنے والدین کی نافرمانی کی اور حق کو جھٹلایا، چنانچہ اپنے ماں باپ سے کہا: ﴿ اُفٍّ لَّكُمَاۤ ﴾ ان کی نافرمانی کی۔[2]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبداللہ مدینی سے روایت کیا ہے (فتح الباری میں عبداللہ مدنی ہے۔ واللہ أعلم) کہا: میں البتہ مسجد میں تھا، جب مروان نے خطبہ پڑھا اور کہا: بے شک اللہ تعالیٰ نے واقعی امیر المومنین کو یزید کے حق میں ایک رائے خوب دکھائی ہے۔ اگر وہ اس کو خلیفہ بنائیں تو سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما خلیفہ بنا چکے، اس پر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبدالرحمان رضی اللہ عنہ بولے: کیا ہر قلی طریقہ ہے۔ بے شک سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے واللہ خلافت کو اپنی اولاد

---

[1] تفسير الطبري (۱۱۸/۲۲) [2] تفسير ابن كثير (۲۰۰/٤)

میں سے یا اپنے گھر والوں میں سے کسی کے لیے نہیں ٹھہرایا اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنے بیٹے کے لیے صرف رحمت وکرامت کے لیے ٹھہرایا۔ (تفسیر ابن کثیر میں یوں ہے: ''وَلَا جَعَلَهَا مُعَاوِيَةُ فِيْ وَلَدِهِ إِلَّا رَحْمَةً وَّكَرَامَةً لِوَلَدِهِ'' لیکن یہ غلط ہے۔ فتح الباری میں یوں ہے: ''وَمَا جَعَلَهَا مُعَاوِيَةُ إِلَّا كِرَامَةً لِوَلَدِهِ'' یہ صحیح ہے۔)

چنانچہ مروان بولا: کیا تو وہ نہیں ہے جس نے اپنے والدین سے کہا: ﴿ اُفٍّ لَّكُمَآ ﴾ تو سیدنا عبدالرحمان رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تو اس لعین کا بیٹا نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرے باپ پر لعنت کی۔ راوی نے کہا اور ان دونوں کو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے سنا تو وہ بولیں: او مروان! تو نے عبدالرحمان رضی اللہ عنہ سے ایسا ایسا کہا ہے جو جھوٹ ہے، یہ آیت اس کے بارے میں نہیں اتری، بلکہ یہ تو فلاں بن فلاں کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ پھر مروان نے نالہ وفریاد کی اور منبر سے اتر پڑا، پھر وہ ان کے حجرے کے دروازے پر آیا اور ان سے باتیں کرنے لگا، یہاں تک کہ لوٹ گیا۔[1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے دوسرے الفاظ کے ساتھ دوسری سند سے یوسف بن ماہک سے اس کو روایت کیا ہے، کہا کہ مروان کو حجاز پر معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے عامل بنایا تھا۔ چنانچہ اس نے خطبہ پڑھا اور یزید بن معاویہ کا ذکر کیا، تاکہ اس کے باپ کے بعد اس کی بیعت کی جائے، تو عبدالرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے اس سے کچھ کہا (یعنی یہ کہا: ''مَا هِيَ إِلَّا هِرَقْلِيَّةٌ'' یعنی نہیں ہے یہ طریقہ مگر ہرقلی کہ اپنے بعد اپنی اولاد کو بادشاہ بناتے ہیں، کسی روایت میں یہ ہے کہ ''سُنَّةُ هِرَقْل وَقَيْصَر''[2] کسی روایت میں یہ ہے: ''أَجِئْتُمْ بِهَا هِرَقْلِيَّةً تُبَايِعُوْنَ لِأَبْنَاءِكُمْ'')۔[3] تو اس نے کہا: اس کو پکڑو تو وہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں گھس گئے، پھر وہ ان پر قادر نہ ہوئے تو مروان نے کہا: بے شک یہ وہ ہے جس کے بارے میں یہ آیت نازل کی گئی ہے: ﴿ وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِيْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ ﴾، چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پردے کے پیچھے سے بولیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے بارے میں قرآن میں سے کوئی شے نازل نہیں کی، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے میرا عذر نازل کیا ہے۔[4]

دوسرے طریق سے امام نسائی رحمہ اللہ نے محمد بن زیاد سے روایت کیا ہے، کہا: جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کے لیے بیعت لی تو مروان بولا کہ یہ سیدنا ابی بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی سنت ہے۔ پس عبدالرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ ہرقل اور قیصر کی سنت ہے۔ تو مروان بولا: یہ وہ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے: ﴿ وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ ﴾ پھر جب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ بات پہنچی تو فرمایا: مروان نے جھوٹ کہا، واللہ! وہ یہ نہیں اور اگر میں چاہتی کہ اس کا نام لے دوں جس کے بارے میں یہ آیت نازل کی گئی ہے تو البتہ میں اس کا نام

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٩٥/١٠) فتح الباري (٥٧٧/٨) تفسير ابن كثير (٢٠٠/٤، ٢٠١) [2] سنن النسائي الكبرىٰ (٤٥٨/٦)
[3] تفسير القرطبي (١٩٧/١٦) [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٥٠)

لے دیتی، لیکن رسول اللہ ﷺ نے مروان کے باپ پر لعنت کی ہے اور مروان اس کی پیٹھ میں تھا۔ "فَمَرْوَانُ فَضَضٌ مِنْ لَعْنَةِ اللّٰهِ"[1] یعنی مروان ایک ٹکڑا ہے اللہ کی لعنت سے ("فضض" بالتحریک شکستہ وریزہ ریزہ۔ "أنت فضض من لعنة الله" یعنی "ما انفضض من نطفة الرجل وتردد في صلبه أيْ: قطعة من لعنة الله")۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَتَعِدٰنِنِيْٓ اَنْ اُخْرَجَ ... الآية ﴾ یعنی کیا تم مجھ کو اس کا وعدہ دیتے ہو کہ میں اٹھایا جاؤں گا، حالاں کہ مجھ سے پہلے لوگ گزر چکے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی لوٹ کر نہیں آیا کہ آ کر خبر دیتا۔ اور وہ دونوں اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ اسے ہدایت دے اور اپنے بیٹے سے کہتے ہیں کہ خرابی ہو تیری تو ایمان لے آ، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو صرف اگلے لوگوں کی نقلیں ہیں۔ فرمایا: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ ... الآية ﴾ یعنی یہ وہ ہیں جن پر یہ بات ثابت ہوئی کہ وہ اپنی طرح کے کافروں کے زمرے میں داخل ہوئے جو جنوں اور انسانوں میں سے ان سے پہلے گزر چکے ہیں جو قیامت کے دن اپنی اور اپنے گھر والوں کی جانوں کو گنوانے والے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ ﴾ جو ﴿ وَالَّذِيْ قَالَ ﴾ کے بعد ہے، اس بات کی دلیل ہے جو ہم بیان کر آئے ہیں کہ وہ ہر اس شخص کے لیے عام ہے جو ایسا ہے۔ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ وہ کافر اور فاجر ہے جو اپنے والدین کا نافرمان ہے اور بعث کا منکر اور جھٹلانے والا ہے۔[2] امام ابن عساکر رحمہ اللہ نے ترجمہ سہل بن داود میں ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ چار آدمی ایسے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنے عرش کے اوپر سے لعنت کی ہے اور فرشتوں نے اس پر آمین کہی ہے۔ مساکین کو بہکانے والا۔

خالد راوی نے کہا ہے کہ وہ وہ شخص ہے جو اپنے ہاتھ سے مسکین کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تو آ میں تجھے دوں گا اور جب وہ اس کے پاس آیا تو کہا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اور وہ جو نابینے بندے کو کہے کہ چارپائے سے بچو، جب کہ اس کے آگے کوئی چیز نہ ہو۔ اور آدمی کسی قوم کا گھر یا پتا پوچھتا ہے تو اس کے سوا کوئی اور گھر اس کو بتا دیتے ہیں اور وہ شخص جو اپنے والدین کو مارتا ہے، یہاں تک کہ وہ استغاثہ یعنی فریاد کرتے ہیں۔[3] یہ حدیث شریف نہایت درجہ غریب ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴾ یعنی ہر ایک کے لیے اس کے عمل کے مطابق عذاب ہے اور البتہ ان کے اعمال کا پورا بدلہ دے گا اور ظلم نہ کیے جائیں گے، یعنی ان پر ذرہ

---

(1) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٥٨/٦) (2) تفسير الطبري (١١٨/٢٢)

(3) المعجم الكبير (٩٩/٨) مختصر تاريخ دمشق (٢٢١/١٠) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "حماد بن عبدالرحمن العكلي عن خالد بن الزبرقان كلاهما ضعيف" (مجمع الزوائد: ٤٦١/٤)

برابر یا اس سے بھی کم ظلم نہ کرے گا۔عبدالرحمان بن زید بن اسلم نے کہا کہ جہنم کے درجے تو نیچے جاتے ہیں اور جنت کے درجے اوپر جاتے ہیں۔[1] قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ ﴾ یعنی جس دن کافر آگ پر پیش جائیں گے تو ملامت اور سرزنش کے لیے ان سے کہا جائے گا کہ تم نے اپنے مزے کی چیزیں دنیا میں استعمال کر لیں اور انھیں ضائع کر دیا۔امیرالمومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے بہت سی کھانے پینے کی مزے دار چیزوں سے تورع وتنزہ (پرہیز) کیا اور فرماتے تھے: میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ان لوگوں میں سے ہو جاؤں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور ان کو سرزنش اور ملامت کی ہے کہ ﴿ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ﴾ امام ابومجلز رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کئی قومیں ان نیکیوں کو گم پائیں گی جو ان کی تھیں دنیا میں تو ان سے کہا جائے گا: ﴿ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ ... الآية ﴾۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ ﴾ یعنی ان کو ان کے عمل کی جنس سے بدلہ دیا جائے گا، چنانچہ جس طرح انھوں نے دنیا میں اپنی جانوں کو عیش اور آرام میں رکھا اور حق کے اتباع سے تکبر کیا اور فسق ومعاصی میں ڈوبے رہے، اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو ان چیزوں سے جزا دی: عذاب، توہین اور رسوائی اور پے در پے حسرات اور جہنم کے مختلف طبقات میں ڈالا جانا۔أَجَارَنَا اللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ مِنْ ذَٰلِكَ كُلِّهِ.[3] آمین.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ موصول سے مراد جنس ہے جو اس بات کی کہنے والی ہو، اسی لیے اس کی خبر جمع ذکر فرمائی ہے۔ ﴿ أُفٍّ ﴾ ایک کلمہ ہے جو انسان سے اس وقت صادر ہوتا ہے جب اس پر کوئی شے وارد ہوتی ہے اور جب اس سے ملول ہوتا ہے اور اُکتاتا ہے۔امام نافع اور حفص رحمہما اللہ نے بہ کسرِ فاء مع تنوین پڑھا ہے اور امام ابن کثیر، ابن عامر اور ابن محیصن رحمہم اللہ نے بہ فتحِ فاء بہ دون تنوین پڑھا ہے اور باقی قراء نے بہ کسرِ فاء بغیر تنوین پڑھا ہے، یہ تین لغت ہیں اور تینوں سبعیہ ہیں اور ہمزہ سب میں مضموم ہے۔اس کا بیان سورت بنی اسرائیل میں گزر چکا ہے۔ ﴿ لَكُمَا ﴾ میں حرفِ لام "موفف له" کے بیان کے لیے ہے، یعنی جس سے یہ کلمہ کہا گیا جیسا کہ ﴿ هَيْتَ لَكَ ﴾ میں ہے۔

جمہور نے ﴿ أَتَعِدَانِنِي ﴾ کو دونوں نونوں کے ساتھ مخفف پڑھا ہے اور اہلِ مدینہ اور مکہ نے اس کے حرفِ یاء کو فتح دیا ہے۔باقی قراء نے اس کو بہ سکون پڑھا ہے اور امام ابوحیوہ، مغیرہ اور ہشام رحمہم اللہ نے بہ ادغام ایک کو دوسرے میں مدغم کیا ہے۔یہ قراءت نافع سے بھی مروی ہے اور حسن رحمہ اللہ وغیرہ (امام شیبہ، ابوجعفر، عبدالوارث عن ابی عمرو رحمہم اللہ) نے

---

[1] تفسیر الطبري (۱۱۹/۲۲) [2] تفسیر الطبري (۱۲۰) تفسیر ابن کثیر (۲۰۲/٤)

[3] تفسیر ابن کثیر (۲۰۰/٤_۲۰۲)

بہ فتح نونِ اولیٰ، گویا تو الین مثلین مکسورین سے بھاگے۔ جمہور نے ﴿ اَنْ اُخْرَجَ ﴾ کو بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور امام حسن رحمہ اللہ وغیرہ (امام نصر، ابو العالیہ، اعمش اور ابو معمر رحمہم اللہ) نے بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے۔[1]

﴿ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ ﴾ کا جملہ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال اور اسی طرح جملہ ﴿ وَهُمَا يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ ﴾ بھی حالیہ ہے۔ استغاث کبھی تو بہ نفسہٖ متعدی ہوتا ہے اور کبھی حرفِ باء کے ساتھ "اِسْتَغَاثَ اللّٰهَ" اور "اسْتَغَاثَ بِهِ" دونوں طرح بولتے ہیں۔ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: معنی یہ ہیں: "يَسْتَغِيْثَانِ بِاللّٰهِ مِنْ كُفْرِهِ" پھر جب حرفِ جار حذف کیا گیا تو فعل وصل کیا گیا۔[2] کسی نے کہا ہے کہ استغاثہ دعا ہے تو اب حرفِ باء کی کچھ حاجت نہیں ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: یوں بولتے ہیں کہ "أَجَابَ اللّٰهُ دُعَاءَهُ وَغَوَاثَهُ"[3] امام ابن مالک کا خیال یہ ہے کہ بہ نفسہٖ متعدی ہوتا ہے فقط اور نحویوں کے قول مستغاث بہ کو معیوب کہا ہے۔

فتح البیان میں فرمایا ہے، لیکن قرآن شریف میں نہیں آیا ہے مگر متعدی بہ نفسہٖ۔ قال تعالیٰ: ﴿ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ ﴾ [الأنفال: ٩] "اس وقت کو یاد کرو جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے۔" نیز فرمایا: ﴿ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ ﴾ [القصص: ١٥] "اس کی قوم والے نے اس سے فریاد کی۔" نیز فرمایا: ﴿ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ ﴾[4] [الکھف: ٢٩] "اگر وہ فریاد رسی چاہیں گے تو ان کی فریاد رسی اس پانی سے کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ جیسا ہوگا۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيْلَكَ ﴾ بہ تقدیرِ قول ہے: "أَيْ: يَقُوْلَانِ لَهُ: وَيْلَكَ" اس سے مراد اس پر بد دعا نہیں ہے، بلکہ اس کو ایمان پر آمادہ کرنا ہے، اسی لیے اس سے یوں کہا کہ ﴿ اٰمِنْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ﴾ جمہور نے بہ کسرِ ﴿ اِنَّ ﴾ پڑھا ہے بنا بر استیناف یا تعلیل۔ اور عمر بن فائد نے اور اعرج رحمہ اللہ نے بہ فتح "أَنَّ" پڑھا ہے اس بنیاد پر کہ ﴿ اٰمِنْ ﴾ کا معمول ہے بہ تقدیرِ حرفِ باء "أَيْ: آمِنْ بِأَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ لَا خُلْفَ فِيْهِ"[5]

یہ قول من جملہ مقولہ والدین ہے۔ معنی یہ ہیں: اور جس نے اپنے ماں باپ سے کہا: اف ہے تم کو! کیا تم مجھ کو اس بات کا وعدہ دیتے ہو کہ میں موت کے بعد اٹھایا جاؤں گا اور حال یہ ہے کہ جو لوگ مجھ سے پہلے مر چکے ہیں، انھیں زمانے گزر چکے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی نہیں اٹھایا گیا اور حال یہ ہے کہ ماں یا باپ اس کے لیے ایمان کی توفیق طلب کرتے ہیں، اس سے کہتے ہیں: تیری خرابی ہو تو بعث پر ایمان لا اور اس کا اقرار اور تصدیق کر، اس لیے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، یا اس بات پر ایمان لا کہ اللہ کا بعث اور نشور کے متعلق وعدہ سچا ہے، اس میں کسی طرح کا خلاف نہیں تو وہ اس وقت ان کی بات کو جھٹلا کر کہتا ہے کہ یہ بعث جس کا تم ذکر کرتے ہو یہ سوائے پہلے لوگوں کے قصے

---

[1] تفسیر القرطبي (١٦/١٩٧) فتح القدير (٥/٢٧) [2] تفسير الرازي (٢٨/٢١) [3] تفسير القرطبي (١٦/١٩٨)

[4] فتح البيان (١٣/٢٧) [5] فتح القدير (٥/٢٧)

کہانیوں کے اور کچھ نہیں جن کو انھوں نے کتابوں میں لکھ رکھا ہے، اس کے بغیر کہ ان کی کچھ حقیقت ہو۔

اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ ﴾ یعنی یہ لوگ جو اس قسم کی باتیں کہنے والے ہیں وہی ہیں جن پر عذاب واجب ہو چکا ہے۔ اللہ پاک کے اس قول کے مطابق جو ابلیس سے فرمایا: ﴿ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكَ وَمِمَّن تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ﴾ [صٓ: ٨٥] ''میں (بھی) تجھ سے اور تیرے تمام ماننے والوں سے جہنم کو بھر دوں گا۔'' جس طرح کہ یہ قول اس بات کو ظاہر کرتا ہے: ﴿ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ ﴾

اور ﴿ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ ﴾ کا جملہ ماقبل کی تعلیل ہے، یعنی ان پر عذاب واجب و ثابت ہو چکا ہے جنوں اور انسانوں کی ان اُمتوں کے جملے میں جو اُن سے پہلے گزر چکی ہیں اور واجب اس لیے ہو چکا ہے کہ وہ خسارہ پانے والے تھے، یعنی وہ اسی کے مستحق تھے کہ ان پر عذاب واجب ہو۔ پہلے جو گزر چکا ہے کہ آیت کا سببِ نزول عبدالرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہما یا عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما ہیں اور انھوں نے والدین سے قولِ مذکور کہا، سو یہ آیت اس کو رد کرتی ہے، اس لیے کہ عبدالرحمان رضی اللہ عنہ فضیلت والے مومنین میں سے ہیں اور اسی طرح عبداللہ رضی اللہ عنہ ہیں اور وہ ان میں سے نہیں ہیں جن پر عذاب کا کلمہ واجب ہوا۔ صحیح یہ ہے کہ آیت سے کوئی معین شخص مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جس میں یہ صفت پائی جاتی ہو، یعنی ہر شخص جس کو اس کے والدین نے صحیح دین اور قیامت پر ایمان لانے کی طرف بلایا اور اس نے انکار کیا۔ کسی نے کہا کہ ہر کافر کے حق میں نازل ہوئی ہے جو اپنے والدین کا نافرمان ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا ۖ ﴾ یعنی دشمن اور کافروں کے ہر فریق کے لیے اور نیکوکاروں اور ابروں کے ہر فریق کے لیے، وہ جنوں سے ہوں یا انسانوں سے، اللہ کے نزدیک قیامت کے دن ان کے اعمال کے سبب سے ان کے مراتب ہیں۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اہلِ نار کے مراتب کو جحیم کے درجات کہیں، چنانچہ اسی بنا پر ابن زید نے دونوں پر درجات کا اطلاق کیا ہے[1] اور حدیث شریف میں ان کو درکات فرمایا ہے؟ تو اس کا جواب یوں دیں گے کہ اہلِ نار کے مراتب حقیقت میں درکات ہی ہیں، مگر یہاں پر تغلیب کے طور پر ان پر درجات کا اطلاق کیا گیا ہے۔ یا ان سے مراد مطلقاً مراتب ہیں، وہ اوپر کی طرف ہوں یا نیچے کی طرف۔

﴿ وَلِيُوَفِّيَهُمْ أَعْمَالَهُمْ ﴾ جملہ محذوف کی تعلیل ہے "أَيْ: وَجَازَاهُمْ بِذَلِكَ لِيُوَفِّيَهُمْ" اور مضاف مقدر ہے "أَيْ: جَزَاءُ أَعْمَالِهِمْ"، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ جزا دی، اس لیے کہ ان کو ان کے اعمال کی پوری جزا دے اور ان کے حقوق کو کم نہ کرے۔ ان کی جزاء کا ان کے اعمال کے مطابق ان کے حقوق کو اندازہ کیا ہے۔ چنانچہ ثواب

[1] تفسیر الطبري (١١٩/٢٢)

کو تو درجات ٹھہرایا اور عقاب کو درکات۔ جمہور نے "لِنُوَفِّيَهُمْ" بہ نون پڑھا ہے اور ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ (امام ابن محیصن، عاصم، ابوعمرو اور یعقوب رحمہم اللہ) نے بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے پہلی قراءت کو اور امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے دوسری قراءت کو اختیار کیا ہے۔[1]

جملۂ ﴿وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ حالیہ موکدہ یا مستانفہ مقرر ماقبل ہے، یعنی وہ ظلم نہ کیے جائیں گے، اس طرح سے کہ نہ تو گناہ گار کے گناہوں میں زیادتی کی جائے گی اور نہ نیک کی نیکیوں سے کچھ کم ہوگا۔ بلکہ ہر فریق کو وہی خیر اور شر پورا دیا جائے گا جس کا وہ مستحق ہے۔ ﴿وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ﴾ ظرف محذوف سے متعلق ہے "أَيْ: اُذْكُرْ لَهُمْ يَا مُحَمَّدُ يَوْمَ يَنْكَشِفُ الْغِطَاءُ"، یعنی اے محمد! تو ان سے اس دن کا ذکر کر جس میں پردہ کھل جائے گا تو آگ کی طرف نظر کریں گے اور اس سے قریب ہوں گے۔

مطلب یہ ہے کہ کفار آگ پر پیش کیے جائیں گے، کیوں کہ کسی شخص کا آگ پر پیش کیا جانا اس کی سخت ذلت اور توہین ہے، کیوں کہ اس کا آگ پر پیش کیا جانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایندھن کی طرح ہے جو جلنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ چونکہ جس پر کوئی شے پیش کی جائے، وہ ذی شعور ہوتا ہے اور آگ ذی شعور نہیں ہے اس لیے "يُعْرَضُوْنَ" کے معنی "يُعَذَّبُوْنَ" ہیں اور یہ اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ "عُرِضَ بَنُوْ فُلَانٍ عَلَى السَّيْفِ" یہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ تلوار سے مارے جائیں۔ یہ معنی تو بطور مجاز ہوئے۔ یا عرض کو اپنے اصلی معنی پر رکھیں اور کلام کو قلب پر محمول کریں، اصل یہ ہے: "تُعْرَضُ النَّارُ عَلَيْهِمْ" یعنی آگ کفار پر ظاہر کی جائے گی۔ لو اب معروض علیہ ذی شعور ہوا۔

امام زمخشری رحمہ اللہ نے بھی اس کو بابِ قلب سے ٹھہرایا ہے۔[2] اس کی امام ابوحیان رحمہ اللہ نے اس طرح تردید کی ہے کہ قلب ضرورت میں ہوتا ہے،[3] یعنی ضرورتِ شعری میں کلام کو قلب پر محمول کرتے ہیں نثر میں کیا ضرورت ہے! لیکن شیخ نے یہ خیال نہیں کیا کہ یہاں قلب کے اعتبار کرنے میں بلاغت ہے، یعنی مبالغہ ہے اس طرح سے کہ اس بات کا دعویٰ کیا کہ نار صاحبِ تمیز وقہر وغلبہ ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ﴾ کو جمہور نے بہ یک ہمزہ پڑھا ہے اور حسن رحمہ اللہ وغیرہ (امام نصر، ابوالعالیہ، یعقوب اور ابن کثیر رحمہم اللہ) نے بہ دو ہمزہ مخفف پڑھا ہے، ایک ہمزہ استفہام کا ہے اور استفہام کا معنی یہاں سرزنش اور ملامت کے لیے ہیں۔ فراء اور زجاج رحمہما اللہ نے کہا: عرب لوگ استفہام اور بغیر استفہام کے توبیخ کرتے ہیں تو دونوں قراءتوں کی بنا پر توبیخ ہو جائے گی۔ اس کے قبل قول مقدر ہے: "أَيْ: يُقَالُ لَهُمْ ذٰلِكَ" اور بعض کے نزدیک یہی قول ظرف کا ناصب ہے، چنانچہ امام سمین رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں، لیکن پہلا قول بہتر ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ

[1] تفسير القرطبي (١٦/١٩٩) [2] الكشاف (٤/٣٠٩) [3] البحر المحيط (٨/٦٣)

نے کہا ہے کہ "طیبات" سے مراد لذات ہیں اور وہ عیش و عشرت کی چیزیں جن میں تم پڑے تھے، یعنی ہر وہ شے جو تمھارے لیے لذات و طیبات میں سے مقدر کی گئی تھی، چنانچہ تم نے اس کو لے لیا اور اس سے نفع اٹھالیا اب ان میں سے پورا حصہ لینے کے بعد تمھارے لیے کچھ باقی نہیں رہا۔ کسی نے کہا ہے کہ تم نے کفر و معاصی میں اپنی جوانی فنا کر دی۔ امام ابن بحر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "طیبات" جوانی اور قوت ہے جو عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے: "ذَهَبَ أَطْيَبَاهُ، أَيْ: شَبَابُهُ وَقُوَّتُهُ" امام ماوردی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے ضحاک رحمہ اللہ کو پایا کہ وہ بھی یہی کہتے ہیں۔

فتح البیان میں ہے کہ پہلا قول سب سے زیادہ ظاہر ہے اور دوسرے میں بُعد ہے۔[1] مطلب یہ ہے کہ کفار نے شہوات و لذات کی پیروی کی جو اللہ پاک کی نافرمانیوں میں ہیں اور گناہ کی کچھ پروا نہ کی، اس لیے کہ ثواب و عقاب اور حساب کا وعدہ جس کو رسول لائے اسے جھٹلایا۔ ﴿ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ ﴾ یعنی آج تم کو اس عذاب کی جزا دی جائے گی جس میں تمھاری ذلت اور رسوائی ہے۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لغتِ قریش میں "هُون" بمعنی "هوان" ہے۔[2]

﴿ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ﴾ یعنی اللہ کی عبادت سے اور اس پر ایمان لانے سے اور اس کی توحید سے تکبر کرنے کے سبب سے اور اس سبب سے کہ تم اللہ کی طاعت سے نکلتے تھے اور اس کی نافرمانی والے عمل کرتے تھے۔ ان کے عذاب کا سبب دو امر ٹھہرائے گئے ہیں: ایک تو اتباعِ حق سے تکبر، دوسرے اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں۔ یہ کافروں کی شان ہے، اس لیے کہ ان میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔ کہا ہے: چونکہ طیبات کے ساتھ متمتع ہونے کے سبب سے کفار کو اللہ پاک نے توبیخ فرمائی، اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے اور ان کے بعد صالحین رحمہم اللہ نے دنیا میں لذات سے اجتناب کیا، تاکہ آخرت میں ثواب کی امید رکھیں۔

اس بارے میں اخبار و آثار ہیں جو دنیا کی لذات کے تمتع کی مذمت کرتے ہیں، چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول پہلے گزر چکا ہے۔[3] بالجملہ "عرض" میں پہلے دو قول گزر چکے ہیں: ایک تو عرض اپنے اصل معنی پر ہے اور کلام میں قلب ہے۔ دوسرا عرض بہ معنی عذاب ہے مجازاً اور قلب نہیں ہے۔ چنانچہ پہلے کی بنا پر قولِ مذکور کفار سے آگ میں داخل ہونے سے پہلے کہا جائے گا، جب وہ اس کو دیکھ لیں گے اور دوسرے کی بنیاد پر ان سے اس حال میں کہا جائے گا کہ وہ آگ کے اندر ہوں گے۔ واللہ أعلم. أَجَارَنَا اللّٰهُ مِنَ النَّارِ وَأَصْحَابِ النَّارِ. آمین.

بالجملہ جب اللہ پاک نے یہ بات ذکر فرمائی کہ کفارِ مکہ لذاتِ دنیا میں منہمک ہونے کی وجہ سے شرک پر جمے ہوئے ہیں، چنانچہ ان کے حق میں جو یہ فرمایا کہ ﴿ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ ﴾ تو اس کے بعد عاد کا قصہ ذکر فرمایا، تاکہ وہ عبرت لیں اور ڈریں کہ کہیں ان کا حال بھی ویسا ہی ہو، کیوں کہ عاد کی قوم مال و قوت و جاہ میں اہلِ مکہ سے کہیں بڑھی

---

[1] تفسیر القرطبي (١٦/١٩٩، ٢٠٠) فتح القدير (٥/٢٨) فتح البيان (١٣/٢٩)
[2] تفسیر القرطبي (١٦/٢٠٠)
[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

ہوئی تھی۔ بایں ہمہ اللہ پاک نے ان پر عذاب مسلط کر دیا ان کے کفر کے سبب سے تو چاہیے کہ ان کے حال سے عبرت حاصل کریں اور دنیا کی آرائش و زینت جو اُن کے پاس ہے، اس سے مغرور نہ ہوں اور دینِ حق کی طلب پر متوجہ ہوں، کیوں کہ مراد پانے والا وہی ہے جس نے حق کا اتباع کیا نہ کہ وہ جس نے خواہشاتِ نفس کی پیروی کی۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرمایا کہ اپنی قوم سے اس قصے کا ذکر کریں:[1]

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٢١﴾ قَالُوا أَجِئْتَنَا لِتَأْفِكَنَا عَنْ آلِهَتِنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٢٢﴾ قَالَ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِندَ اللَّهِ وَأُبَلِّغُكُم مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ وَلَٰكِنِّي أَرَاكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ﴿٢٣﴾ فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ أَوْدِيَتِهِمْ قَالُوا هَٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۚ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُم بِهِ ۖ رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢٤﴾ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ﴿٢٥﴾

اور عاد کے بھائی (ہود) کو یاد کیجیے جب اس نے احقاف (یمن) میں اپنی قوم کو ڈرایا اور یقیناً اس سے پہلے بھی کئی ڈرانے والے گزر چکے اور اس کے بعد بھی، یہ کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ بلاشبہ میں تم پر ایک بہت بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں (21) انھوں نے کہا: کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ تو ہمیں ہمارے معبودوں (کی پرستش) سے پھیر دے۔ چنانچہ اگر تو سچوں میں سے ہے تو ہمارے پاس وہ (عذاب) لے آ، جس کا تو ہمیں وعدہ دیتا ہے (22) (ہود نے) کہا: بس (اس کا) علم تو اللہ ہی کے پاس ہے اور میں تمھیں وہ چیز پہنچا رہا ہوں جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا اور لیکن میں تمھیں ایسے لوگ دیکھتا ہوں کہ تم جہالت کرتے ہو (23) پھر جب انھوں نے اس (عذاب) کو دیکھا کہ ان کی وادیوں کے سامنے ایک

[1] فتح البیان (۱۳/۲۵-۲۹)

بادل چلا آرہا ہے تو وہ کہنے لگے: یہ بادل ہم پر بارش برسانے والا ہے (ہود نے کہا: نہیں!) بلکہ یہ تو وہ (عذاب) ہے جسے تم جلدی طلب کرتے تھے۔ (یہ) آندھی ہے، اس میں نہایت دردناک عذاب ہے (24) وہ اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کردے گی، پھر وہ ایسے ہو گئے کہ ان کے گھروں کے سوا وہاں کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا، ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں (25)

قوم عاد کا قصہ:

ہود علیہ السلام نے جو یہ کہا کہ میں تم پر بڑے دن کے عذاب سے خوف کھاتا ہوں تو اس سے اپنی قومِ عاد کو ڈرایا۔ احقاف یمن میں ایک ضلع ہے، اس کے معنی ریت کا ٹیلہ ہیں۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نبی کریم ﷺ کو تسلی دیتا ہے ان لوگوں کے جھٹلانے پر جنھوں نے آپ ﷺ کی قوم میں سے آپ ﷺ کی تکذیب کی اور فرماتا ہے کہ عاد کے بھائی، یعنی ہود علیہ السلام کا ذکر کر۔ اللہ عزوجل نے ان کو عادِ اولیٰ کی طرف بھیجا تھا، وہ لوگ احقاف میں بستے تھے۔ "أحقاف" "حقف" کی جمع ہے، "حقف" ریت کے پہاڑ کو کہتے ہیں۔ یہ امام ابن زید رحمہ اللہ کا قول ہے۔[1] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أحقاف" پہاڑ اور غار ہے۔

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "أحقاف" حضر موت میں ایک وادی ہے، اس کو برہوت کہتے ہیں، اس میں کفار کی روحیں ڈالی جاتی ہیں۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ عاد یمن میں ریت والے دریا کے کنارے پر ایک قبیلہ تھا جس جگہ پر یہ قبیلہ آباد تھا، اس کو شحر کہتے ہیں۔[3] امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے "بَابٌ: إِذَا دَعَا فَلْيَبْدَأْ بِنَفْسِهِ" میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «يَرْحَمُنَا اللّٰهُ وَأَخَا عَادٍ»[4] یعنی اللہ ہم پر اور عاد کے بھائی پر رحم کرے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖٓ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بلاد کے آس پاس کی بستیوں میں رسول اور نذیر بھیجے، یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾ [البقرة: ٦٦] ''اسے ہم نے اگلوں پچھلوں کے لیے عبرت کا سبب بنا دیا'' اور اس آیت کی طرح: ﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ۝ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ

[1] تفسیر الطبري (١٢٥/٢٢) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٢٩٦/١٠) [3] تفسیر الطبري (١٢٤/٢٢)

[4] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٥٢) اس کی سند میں ''زيد بن الحباب عن الثوري'' متکلم فیہ راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الصحيحة، رقم الحديث: ٤٨٩٢)

﴿ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ ﴾ [حمٓ السجدة: ١٣۔ ١٤] ''اب بھی یہ روگرداں ہوں تو آپ کہہ دیجیے کہ میں تمھیں اس کڑک (عذابِ آسمانی) سے ڈراتا ہوں جو مثل عادیوں اور ثمودیوں کی کڑک کے ہوگی۔ ان کے پاس جب ان کے آگے پیچھے سے پیغمبر آئے کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔''

﴿ اِنِّيۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ﴾ یعنی ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ مت پوجو مگر اللہ کو، بے شک میں تم سے ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ تو قوم نے ان کو یہ جواب دیا: کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم کو ہمارے معبودوں سے روکے تو ہمارے پاس اس شے کو لے آ جس کا تو ہم کو وعدہ دیتا ہے اگر تو سچوں میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب وسزا کے واقع ہونے کو بعید سمجھ کر اس کی جلدی چاہی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿ يَسۡتَعۡجِلُ بِهَا الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِهَا ﴾ [الشوریٰ: ١٨] ''اس کی جلدی انھیں پڑی ہے جو اسے نہیں مانتے۔''

﴿ قَالَ اِنَّمَا الۡعِلۡمُ عِنۡدَ اللّٰهِ ﴾ یعنی اللہ تم کو خوب جانتا ہے اگر تم تعجیلِ عذاب کے مستحق ہو تو وہ جلد تم پر عذاب لے آئے گا۔ ﴿ وَاُبَلِّغُكُمۡ مَّاۤ اُرۡسِلۡتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيۡۤ اَرٰىكُمۡ قَوۡمًا تَجۡهَلُوۡنَ ﴾ اور میری شان یہ ہے کہ میں تم کو وہ شے پہنچا دوں جس کو دے کر میں بھیجا گیا ہوں، لیکن میں تم کو ایک ایسی قوم دیکھتا ہوں جو نادانی کرتی ہے۔ یعنی سمجھتے بوجھتے نہیں ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا رَاَوۡهُ عَارِضًا مُّسۡتَقۡبِلَ اَوۡدِيَتِهِمۡ قَالُوۡا هٰذَا عَارِضٌ مُّمۡطِرُنَا ﴾ یعنی پھر جب عذاب کو آتے ہوئے دیکھا تو سمجھے کہ وہ بارش کی بدلی ہے اور اس سے خوش وخرم ہوئے اور وہ قحط زدہ اور پانی کے محتاج تھے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ بَلۡ هُوَ مَا اسۡتَعۡجَلۡتُمۡ بِهٖ رِيۡحٌ فِيۡهَا عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴾ یعنی بلکہ وہ تو وہ عذاب ہے جس کے لیے تم نے کہا تھا: ﴿ فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴾ ایک ہوا ہے جس میں دردناک عذاب ہے۔ ﴿ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيۡءٍ بِاَمۡرِ رَبِّهَا ﴾ یعنی وہ ایسی ہوا ہے جو اُن کے بلاد کی ہر شے کو خراب کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں اس کو اذن دیا ہے جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَا تَذَرُ مِنۡ شَيۡءٍ اَتَتۡ عَلَيۡهِ اِلَّا جَعَلَتۡهُ كَالرَّمِيۡمِ ﴾ [الذاریات: ٤٢] ''وہ جس جس چیز پر گرتی تھی اسے بوسیدہ ہڈی کی طرح (چورا چورا) کر دیتی تھی۔'' ''أَيْ: كَالشَّيْءِ الْبَالِيْ'' یعنی بوسیدہ شے کی طرح، اسی لیے اللہ عزوجل نے یہاں پر یوں فرمایا: ﴿ فَاَصۡبَحُوۡا لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمۡ ﴾ یعنی پھر وہ صبح کو ایسے رہ گئے کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ سب کے سب ناس ہو گئے اور ان میں سے کوئی نہ بچا۔

﴿ كَذٰلِكَ نَجۡزِي الۡقَوۡمَ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴾ یعنی یہ ہمارا اس کے بارے میں حکم ہے جس نے ہمارے رسولوں کی تکذیب کی اور ہمارے حکم کا مخالف ہوا۔ ایک حدیث جو غریب اور افراد حدیثوں میں سے نہایت غریب ہے، ان کے قصے میں وارد ہوئی ہے، جو امام احمد رحمہ اللہ نے حارث بکری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، کہا: میں نکلا تاکہ علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ

کی شکایت رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جاؤں تو میں ربذہ پر گزرا (ربذہ بالتحریک مدینے کے قریب ایک بستی ہے جو اس سے تین منزل پر ہے۔ ل م، سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کی قبر ہے) تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں بنو تمیم کی ایک بڑھیا سفر سے منقطع ہو کر بیٹھی ہے، اس نے مجھ سے کہا: اے اللہ کے بندے! بے شک رسول اللہ ﷺ سے مجھے ایک کام ہے تو کیا تو مجھے ان تک پہنچا دے گا؟ کہا: پھر میں نے اس کو اپنی سواری پر بٹھا لیا اور اسے مدینے میں لے آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مسجد اپنے لوگوں سے بھری ہوئی ہے اور ایک سیاہ جھنڈا لہرا رہا ہے اور سیدنا بلال رضی اللہ عنہ گلے میں تلوار ڈالے رسول اللہ ﷺ کے روبرو کھڑے ہیں تو میں نے کہا: لوگوں کا کیا حال ہے؟ کہا کہ آپ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو کسی طرف بھیجنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ یعنی کہا: پھر میں بیٹھ گیا۔

چنانچہ آپ ﷺ اپنے گھر میں داخل ہوئے تو میں نے آپ پر اِذن چاہا، آپ ﷺ نے مجھے اِذن دیا تو میں اندر گیا اور میں نے سلام کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمھارے اور تمیم کے درمیان کچھ تھا؟ میں نے کہا: ہاں اور ہمارے لیے ان پر غلبہ تھا اور میں بنو تمیم کی ایک بڑھیا کے پاس سے گزرا جو سفر سے منقطع ہو رہی تھی، اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کو سوار کر کے آپ کے پاس لے آؤں، چنانچہ لیجیے وہ بڑھیا دروازے پر ہے، چنانچہ اس کو اِذن دیا تو وہ اندر آئی اور میں نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! اگر آپ کی یہ رائے ہو کہ ہمارے اور تمیم کے درمیان کوئی حاجز (پردہ اور آڑ) ٹھہرا دیں تو دَہنا (تمیم میں ایک موضع) کو ٹھہرا دیجیے، اس پر وہ بڑھیا غصے کے مارے گرم ہوئی اور پاؤں کے سروں پر بیٹھ گئی (اصل روایت کا لفظ ''استوفزت'' ہے۔ ''استیفاز'' کے معنی اکڑوں یا پاؤں کے پوروں پر بیٹھنا، مضطر ہو کر اور غیر مطمئن طور پر بیٹھنا) اور بولی: اے اللہ کے رسول! ''فَإِلَى أَيْنَ يَضْطَرُّ مُضْطَرُّكَ''، یعنی پھر آپ کا پناہ پکڑنے والا کہاں پناہ پکڑے گا۔

راوی کہتا ہے: بے شک میری مثل وہ ہے جو پہلے نے کہی ہے کہ ''مَعْزِى حَمَلَتْ حَتْفَهَا'' یعنی بکری خود اپنی موت کو لاد لائی، میں اس کو لاد لایا، حالاں کہ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ میری خصم (مدعی، جھگڑا کرنے والی) ہے۔ میں اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں کہ میں مثل وافدِ عاد کے ہوں۔ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: کیا ہے وافد عاد کا، حالانکہ آپ ﷺ اس قصے کو اس سے زیادہ جانتے تھے (راوی نے خود کو غائب کر کے کہا ہے، ورنہ سیاقِ کلام یہ ہے کہ مجھ سے ہو۔ واللہ أعلم)، لیکن اس سے چاہا کہ وہ قصہ بیان کرے اور آپ ﷺ کو اپنے بیان کا مزہ چکھائے۔ میں نے کہا کہ عاد قحط میں مبتلا ہوئے تو انھوں نے اپنے ایک وافد کو بھیجا، جس کو قَیل کہتے تھے۔ (وافد وہ ہے جو شہروں میں جاتا ہے، امراء سے ملاقات کرتا ہے اور ان سے عطا کا طالب ہوتا ہے۔ بہ معنی قاصد و ایلچی بھی ہے)۔

اس کا گزر معاویہ بن بکر پر ہوا تو اس کے پاس مہینا بھر ٹھہرا، وہ اس کو شراب پلاتا تھا اور دو لونڈیاں اس کو گانا سناتی تھیں، ان کو جرادتین کہتے تھے، پھر جب مہینا گزر چکا تو وہ مَہرہ کے پہاڑوں کی طرف نکلا (مَہرہ بن حیدان ایک

قبیلے کا باپ ہے) اور کہا: الٰہی! بے شک تو جانتا ہے کہ میں کسی بیمار کی طرف نہیں آیا کہ اس کا علاج کروں، نہ کسی قیدی کی طرف آیا ہوں کہ اس کا فدیہ دوں۔ اے اللہ! تو عاد کو وہ پانی پلا جو تو اس کو پلایا کرتا تھا، چنانچہ اس پر کالی بدلیاں گزریں، پھران میں سے اس کو ندا کی گئی کہ اختیار کر! تو اس نے ان میں سے ایک سیاہ بدلی کی طرف اشارہ کیا، پھر ان میں سے اس کو ندا کی گئی کہ "خُذْهَا رَمَادًا وَمَدَدًا لَا تُبْقِيُ مِنْ عَادٍ أَحَدًا" (یعنی ہلاک کہ راکھ کی طرح کر دے۔ اور مدد بہ معنی ناصر و معاون ہے، اس کی جمع امداد ہے، گویا یہ بدلی ہلاک کرنے والی اور ہلاک کی مددگار ہے ۔واللّٰہ أعلم)۔ یعنی لے تو اس بدلی کو اس حال میں کہ وہ راکھ ہے اور ہلاک کی مدد کرنے والی ہے، باقی نہ چھوڑے گی عاد میں سے کسی کو۔

راوی نے کہا: چنانچہ جو بات مجھے پہنچی ہے، وہ یہ ہے کہ ان پر ہوا اس مقدار یا اندازے کے برابر بھیجی گئی جو میری اس انگوٹھی میں سے جاری ہوتی ہے (یعنی بقدرِ جوفِ انگشتری)، یہاں تک کہ وہ سب ہلاک ہو گئے۔ ابو وائل جو حارث سے راوی ہیں، کہتے ہیں کہ حارث نے سچ کہا، مرد و عورت جس وقت اپنے وافد کو بھیجتے تو کہتے کہ وافدِ عاد کی طرح مت ہو۔[1] (و رواہ الترمذي والنسائي و ابن ماجه کما تقدم في سورة الأعراف)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا ہنستے ہوئے نہیں دیکھا، جس سے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لہوات، یعنی حلق کے کوے کو دیکھوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو صرف مسکراتے تھے اور فرمایا کہ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدلی کو یا ہوا کو دیکھتے تو اس کا اثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر پہچانا جاتا تھا۔ کہا: اے اللہ کے رسول! لوگ تو جب بدلی کو دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں، اس امید سے کہ اس میں بارش ہو اور میں آپ کو دیکھتی ہوں کہ جس وقت آپ اس کو دیکھتے ہیں تو آپ کے چہرۂ مبارک میں کراہیت پہچانتی ہوں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ! مجھے اس بات سے کون سی چیز امن دیتی ہے کہ اس میں عذاب ہو۔ ایک قوم کو تو واقعی ہوا سے عذاب ہوا اور واقعی ایک قوم نے عذاب دیکھا اور کہا: یہ بدلی ہے ہم کو پانی دے گی۔[2] (وأخرجاہ من حدیث ابن وهب)

بہ طریقِ دیگر امام احمد رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت ناشی کو دیکھتے (ناشی وہ بدلی ہے جس کا اجتماع ابھی کامل نہیں ہوا ہے، اول ہی اول میں اٹھی ہے) آسمان کے کناروں میں سے کسی کنارے میں تو اپنا کام چھوڑ دیتے، گو اپنی نماز میں ہوتے، پھر فرماتے: "اَللّٰهُمَّ إِنِّيُ أَعُوذُ بِكَ مِنُ شَرِّ مَا فِيُهِ" یعنی اے اللہ! میں اس برائی سے جو اس میں ہے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ چنانچہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کو کھول دیا تو اللہ عزوجل کی حمد کرتے اور اگر برسا تو فرماتے: "اَللّٰهُمَّ صَيِّبًا نَّافِعًا"[3] یعنی اے اللہ تو اس بارش کو نافع کر۔

---

① مسند أحمد (٤٨٢/٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٧٤) سنن النسائي الكبرىٰ (١٨١/٥)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٥١) صحيح مسلم (٨٩٩) مسند أحمد (٦٦/٦) ③ مسند أحمد (١٩٠/٦)

بہ طریقِ دیگر امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریف تھی کہ جس وقت تیز ہوا چلتی تو فرماتے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَيْرَهَا وَخَيْرَ مَا فِيهَا وَخَيْرَ مَا أُرْسِلَتْ بِهِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا فِيهَا وَشَرِّ مَا أُرْسِلَتْ بِهِ» یعنی اے اللہ! میں تجھ سے اس کی خیر کو مانگتا ہوں اور اس شے کی خیر کو جو اس میں ہے اور اس شے کی خیر جس کے ساتھ وہ بھیجی گئی ہیں اور تیری پناہ مانگتا ہوں، اس کی برائی سے اور اس شے کے شر سے جو اس میں ہے اور اس شے کے شر سے جس کے ساتھ وہ بھیجی گئی ہے۔

فرمایا: "وَإِذَا تَخَيَّلَتِ السَّمَاءُ" یعنی جس وقت آسمان گرجتا چمکتا یہ خیال ہوتا کہ اس میں پانی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی باہر آتے اور کبھی اندر آتے، آگے آتے پیچھے جاتے، پھر جب بادل برس پڑتا تو یہ کیفیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دور ہو جاتی۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اس بات کو پہچان گئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ! شاید وہ ویسا ہو، جیسا کہ قومِ عاد نے کہا تھا: ﴿فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا﴾[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے قومِ عاد کے ہلاک ہونے کا قصہ سورۃ الاعراف اور سورت ہود میں اس طرح سے بیان کیا ہے کہ اس جگہ اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔[2] وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.

امام طبرانی رحمہ اللہ نے عن مجاہد وسعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نہیں کھولا گیا عاد پر ہوا سے مگر ایک انگوٹھی کی جگہ جتنی، پھر وہ جنگل سے شہر تک چھوڑی گئی، پھر جب اس کو شہر والوں نے دیکھا تو کہا کہ یہ ہم کو پانی دینے والی بدلی ہے ہمارے نالوں کے سامنے۔ اور جنگل والے ان نالوں میں تھے تو جنگل والوں کو شہر والوں پر ڈال دیا، یہاں تک کہ سب ہلاک ہو گئے۔ کہا: وہ اپنے داروغوں پر سرکش ہو گئے تھے، یہاں تک کہ دروازوں کی دراڑوں سے نکل گئے۔[3] وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى أَعْلَمُ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ اے محمد! تو اپنی قوم سے عاد کے بھائی کا ذکر کر۔ اس سے مراد ہود بن عبداللہ بن رباح ہیں۔ یہ نسب میں ان کے بھائی تھے، دین میں ان کے بھائی نہ تھے۔ ﴿اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ﴾ بدلِ اشتمال ہے ﴿اَخَا عَادٍ﴾ سے: "أَيْ: وَقْتَ إِنْذَارِهِ إِيَّاهُمْ" یعنی اس وقت کا ذکر کر جس میں ہود علیہ السلام نے احقاف میں اپنی قوم کو ڈرایا۔ "أحقاف" دیارِ عاد ہیں، جمع ہے "حقف" کی۔ "حقف" بڑی لمبی ٹیڑھی ریت کو کہتے ہیں۔ یہ قول امام خلیل رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔ ان لوگوں نے اپنی قوت سے زمین والوں کو مغلوب کر دیا تھا۔

---

① صحیح مسلم، رقم الحدیث (۸۹۹) ② تفسیر ابن کثیر (۲۰٤/٤)

③ المعجم الکبیر (٤٢/١٢) تفسیر ابن کثیر (٢٠٢/٤-٢٠٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں 'فیہ مسلم الملائي وھو ضعیف' (مجمع الزوائد: ٢٤٥/٧)

مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ اپنی قوم سے ان کا قصہ بیان کریں، تاکہ وہ نصیحت پذیر ہوں اور ڈریں اور عبرت حاصل کریں کہ ان لوگوں نے اپنے رسول کی تکذیب کی تو اس کا پھل پایا، کہیں ایسا ہی معاملہ ان کے ساتھ بھی ہو۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اللہ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ اپنی ذات میں وہ قصہ یاد کریں جو ہود علیہ السلام کے ساتھ واقع ہوا، تاکہ آپ ہود علیہ السلام کی اقتداء کریں اور آپ ﷺ کی قوم کی تکذیب آپ پر سہل ہو۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا: "أحقاف" بلادِ شحر کی ریت کے ٹیلے ہیں اور شحر عدن سے قریب ہے۔ قاموس میں ہے کہ بروزن "منع" منہ کھولنا ہے اور عمان و عدن کے درمیان دریا کا کنارہ ہے۔[1]

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أحقاف" ملکِ یمن کے شہر حضر موت میں ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لمبے دریا کے کنارے پہاڑوں کی طرح کے ریت کے اونچے ٹیلے بچھے ہوئے ہیں، مگر اس درجے کو نہیں پہنچے کہ پہاڑ ہو جائیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "أحقاف" وہ ہے جو ریت سے مستدیر ہو گیا ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "أحقاف" شام میں ایک پہاڑ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ عمان اور مَہرہ کے درمیان ایک وادی ہے اور اہلِ مہرہ یہ اسی کی طرف منسوب ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ عاد قبیلۂ اِرم سے تھے۔

﴿ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖٓ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ہود علیہ السلام سے پہلے اور بعد میں رسول گزر چکے ہیں۔[2] امام فراء رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں "مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ بَعْدِهٖ" ہے۔ یہ جملہ بنا بر حال محلِ نصب میں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ معترضہ ہو ہود علیہ السلام کے انذار اور ان کے اس قول کے درمیان جو اپنی قوم سے کہا: ﴿ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ ﴾ لیکن پہلا قول بہتر ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے ان کو یہ خبر دی کہ جو رسول ہود علیہ السلام سے پہلے بھیجے گئے اور جو ان کے بعد آئندہ بھیجے جائیں گے وہ سب کے سب ان کے ڈرانے کی طرح ڈرانے والے ہیں۔

چنانچہ ہود علیہ السلام سے پہلے تو چار ہیں: آدم، شیث، ادریس اور نوح علیہم السلام اور اُن کے بعد والے، جیسے: صالح، ابراہیم، اسماعیل، اسحاق علیہم السلام اور اسی طرح بنی اسرائیل کے سارے انبیاء علیہم السلام۔ پھر ہود علیہ السلام کا وہ کلام نقل فرمایا جو انھوں نے اپنی قوم سے کہا: ﴿ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ﴾ یعنی قوم کو اس طرح سے ڈرایا کہ ان سے یوں کہا: مت پوجو مگر اللہ وحدہ کو۔ پھر اس کی یہ علت بیان کی: ﴿ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴾ یعنی اس لیے کہ میں تمھارے شرک کے سبب سے تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

﴿ عَظِيْمٍ ﴾ بہ معنی "ھائل" ہے، جیسا کہ قاضی نے کہا ہے۔[3] اس میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ ﴿ عَظِيْمٍ ﴾

---

[1] القاموس المحيط (۵۳۱/۱) [2] تفسير القرطبي (۲۰۳/۱٦، ۲۰٤) فتح القدير (۲۹/۵) [3] تفسير البيضاوي (۱۸۲/۵)

مجاز ہے ''ھائل'' سے، کیوں کہ ہول بڑے پن کو لازم ہے۔ اس لحاظ سے ﴿ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴾ کہا اور روزِ ہولناک مراد لیا۔ قوم نے ان کے ڈرانے کا جواب یہ دیا: ﴿ اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ﴾ ''أَيْ: لِتَصْرِفَنَا'' یا ''لِتُزِيْلَنَا'' یا ''لِتَمْنَعَنَا'' یہ سب معانی ایک دوسرے کے لگ بھگ ہیں۔ یعنی کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم کو اپنے معبودوں کے پوجنے سے پھیر دے، یا پھسلا دے، یا روک دے۔ اسی معنی میں عروہ بن اذینہ کا قول ہے۔ ؎

إِنْ تَكُ عَنْ حُسْنِ الصَّنِيْعَةِ مَأْ فُوْكًا فَفِيْ آخَرِيْنَ قَدْ أُفِكُوْا[1]

یعنی اگر تو ایسا ہے کہ نیک کام سے روکا گیا ہے تو تو اور لوگوں میں ہے کہ وہ روکے گئے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تجھے احسان کی توفیق نہیں دی گئی تو تُو ایسی قوم میں ہے کہ وہ اس سے روکے گئے ہیں۔ غرضیکہ ہم تو اپنے معبودوں سے پھرنے والے نہیں ہیں، تجھے جو کرنا ہے کر ڈال۔ ﴿ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ یعنی ہم پر یومِ عظیم کا عذاب لے آ جس کا تو ہم کو وعدہ دیتا ہے اگر تو اپنے وعدے میں سچوں میں سے ہے۔ ہود علیہ السلام نے جواب دیا: ﴿ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَ اُبَلِّغُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ لٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴾ یعنی اس کے آنے کا جو وقت ہے وہ اللہ ہی کے پاس ہے۔ میرے پاس نہیں ہے کہ میں اس کی جلدی چاہوں۔ اور میں جو ہوں تو میرا کام صرف اس چیز کو پہنچا دینا ہے جو میں تمھارے رب کی طرف سے دے کر بھیجا گیا ہوں، وہ چیز یہی عذاب سے ڈرانا اور اللہ کی حجت پہنچا کر عذر کو دور کرنا ہے اور بس۔ میرا کام عذاب لے آنا نہیں، کیوں کہ وہ میرے مقدور کی بات نہیں ہے، بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے مقدورات میں سے ہے، لیکن میں تو تم کو خیال کرتا ہوں کہ تم ایک نادان قوم ہو، اس لیے کہ تم اپنے کفر پر جمنے والے ہو اور جس شے کو لے کر میں تمھارے پاس آیا ہوں تم نے اس سے راہ نہ پائی، بلکہ مجھ سے اس شے کی فرمائش کی جو رسولوں کے اختیار سے نہیں ہے۔

امام ابو عمرو رحمہ اللہ نے ﴿ اُبَلِّغُكُمْ ﴾ کو بہ سکونِ بائے موحدہ وتخفیفِ لام پڑھا ہے باقی قراء نے بہ فتح وتشدید لام پڑھا ہے اور امام نافع، بزی اور ابو عمرو رحمہم اللہ نے ﴿ لٰكِنِّيْۤ ﴾ کی یاء کو بہ فتح اور باقیوں نے بہ سکونِ یاء پڑھا ہے اور ورش نے الف کا بعد لام کے امالہ بین بین اور امام ابو عمرو، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے امالۂ محضہ کیا ہے اور باقی قراء نے بہ فتح پڑھا ہے۔ غرضیکہ قوم نے ہود علیہ السلام کی ایک نہ سنی اور اپنے کفر پر جمے رہے اور قائم رہے تو اللہ پاک نے ان پر عذاب نازل کیا۔

﴿ فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا ﴾ ضمیر کلمۂ ''ما'' کی طرف راجع ہے جو ﴿ بِمَا تَعِدُنَاۤ ﴾ میں ہے۔ کوئی یہ وہم نہ کرے کہ اس بنا پر یہ معنی ہیں کہ ''لَمَّا رَأَوْا مَا تَعِدُنَا'' حالانکہ یہ ٹھیک نہیں ہے، اس لیے کہ ''مَا تَعِدُنَا'' سے مراد عذاب ہے، چنانچہ یہ معنی ہوئے: ''فَلَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ'' اور ﴿ عَارِضًا ﴾ حال یا تمیز ہے۔ ''عارض'' سحاب کو کہتے ہیں

[1] تفسیر القرطبي (٢٠٥/١٦)

جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے، اس لیے کہ وہ آسمان کے عرض میں ظاہر ہوتا ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ سحاب کے معنی میں آتا ہے، اتنا زیادہ کیا ہے: "يَعْتَرِضُ فِي الْأُفُقِ"[1] یعنی عارض وہ بادل ہے جو آسمان کے اُفق میں معترض ہوتا ہے، اسی معنی سے قولہ تعالیٰ: ﴿ هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ﴾ ہے۔ معنی یہ ہیں: پھر جب اس عذاب کو دیکھا دراں حالیکہ وہ ایک بدلی تھی یا بدلی کی طرح۔ مطلب یہ ہے کہ جب عذاب کی بدلی دیکھی۔

بالجملہ محلی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ ضمیر "ما" کی طرف راجع ہے۔[2] امام مبرد اور زجاج رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ ضمیر مذکور کی طرف پھرتی ہے، یعنی ضمیر مبہم ہے اور اس کا بیان ﴿ عَارِضًا ﴾ سے کیا ہے تو اب سحاب کی طرف راجع ہوگی: "أَيْ: فَلَمَا رَأَوُا السَّحَابَ عَارِضًا" چنانچہ ﴿ عَارِضًا ﴾ منصوب ہوگا بنا بر تکریر بہ معنی تفسیر۔[3] امام زمخشری رحمہ اللہ نے بھی ان دو اماموں کے قول پر اعتماد کر کے اس کو جائز رکھا ہے اور کہا ہے کہ ضمیر مبہم ہو اور اس کا ابہام ﴿ عَارِضًا ﴾ سے رفع کیا گیا، تمیز یا حال ڈال کر اور یہ وجہ اعرب وافصح ہے،[4] یعنی اس لیے کہ اس کے ابہام کے بعد بیان اور تعمیہ کے بعد ایضاح ہے، لیکن امام کرخی رحمہ اللہ نے اس وجہ میں یہ فی (غلطی) نکالی ہے کہ جس ضمیر کی اس کا ما بعد تفسیر کرتا ہے، وہ "رب ونعم وبئس" میں محصور ہے اور یہ ان میں سے نہیں ہے اور کوئی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ حال یا تمیز ضمیر کی تفسیر کرتے ہیں، امام کرخی رحمہ اللہ کا کلام تمام ہوا۔

دیکھو امام کرخی رحمہ اللہ تو یہ کہتے ہیں کہ کوئی قائل نہیں ہے، حالاں کہ امام زجاج اور مبرد رحمہما اللہ کا قول ابھی گزر چکا ہے۔ خیر یہاں تو امام زمخشری رحمہ اللہ کے ساتھ دو امام ہیں اور بالفرض اگر کوئی بھی نہ ہو صرف وہی کسی بات کے ساتھ منفرد ہوں تو وہ خود عربیت میں ایک امام ہیں، ان کی بات مانی جائے گی، مگر اتنی شرط ہے کہ اعتزال کی بات نہ ہو، اس لیے کہ آدمی اپنے مذہب کی پیچ میں مضطر ہوتا ہے تو خواہ مخواہ اس کو بناتا ہے گو نفس الامر میں نہ بنے اور عقلِ سلیم اسے قبول نہ کرے۔ اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا آمِیْنَ.

قولہ تعالیٰ: ﴿ مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ﴾ صفت ہے ﴿ عَارِضًا ﴾ کی، اس لیے کہ صفت کی اپنے معمول کی طرف اضافت لفظی ہوتی ہے معنوی نہیں ہوتی تو اب اس کے ساتھ نکرہ کا موصوف کرنا صحیح ہوا۔ اسی طرح ﴿ مُّمْطِرُنَا ﴾ بھی ﴿ عَارِضٌ ﴾ کی صفت ہے۔ مفسرین نے فرمایا ہے کہ ان سے ایک زمانے کے لیے بارش روک دی گئی تھی، پھر اللہ پاک ان کی طرف ایک سیاہ بدلی ہانک لایا۔ ان کی ایک وادی تھی جسے معتب کہتے تھے، وہ بدلی اس وادی سے ان پر نکلی، جب اس کو دیکھا کہ ایک بدلی ہے، ایسی بدلی جو اُن کی وادیوں کی طرف آ رہی ہے تو خوش ہوئے اور بولے کہ یہ ایک ایسی بدلی ہے جس میں پانی ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي (٢٠٥/١٦) [2] تفسير الجلالين (٦٧٠/١)
[3] فتح القدير (٣٠/٥) [4] الكشاف (٣١١/٤)

پھر جب وہ یہ بولے تو ہود علیہ السلام نے یا اللہ عزوجل نے ان کو یہ جواب دیا: ﴿ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۚ رِيْحٌ ﴾ ﴿ رِيْحٌ ﴾ بدل ہے ﴿ مَا ﴾ سے، یا مبتدائے محذوف کی خبر ہے "أَيْ: هُوَ"۔ اور ﴿ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ ﴿ رِيْحٌ ﴾ کی صفتِ اول ہے اور ﴿ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا ﴾ ﴿ رِيْحٌ ﴾ کی صفتِ ثانی ہے، یعنی بارش نہیں ہے جیسا تم خیال کرتے ہو، بلکہ وہ عذاب ہے جس کی تم نے جلدی چاہی تھی جبکہ تم نے یوں کہا تھا: ﴿ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ ﴾ وہ ایک ایسی ہوا ہے کہ اس میں دردناک ہوا ہے، ایسی ہوا ہے جو ہر اس شے کو ہلاک کر ڈالتی ہے جس پر گزرے، یعنی عاد کی جان و مال کو۔ یہ ہوا اسی بدلی سے اٹھی تھی جس کو انھوں نے دیکھا۔ "تدمیر و دمار" ہلاک کرنے کے معنی میں ہے۔ کسی نے "یدمر" بہ یائے تحتیہ مفتوحہ و سکونِ دال وضم میم ورفع لفظِ "کل" بنا بر فاعلیت پڑھا ہے "دَمَرَ دَمَارًا" سے اس بنا پر "دَمَرَ" لازم بہ معنی "هَلَكَ" ہوگا۔ ﴿ بِاَمْرِ رَبِّهَا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ یہ کام اللہ پاک کی قضا و قدر سے ہوتا ہے۔ غرضیکہ ان پر ہوا آئی اور ان کو ہلاک کر ڈالا۔

﴿ فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ۚ ﴾ یعنی ان کے مالوں کے خراب ہونے اور جانوں کے چلے جانے کے بعد ایسے ہو گئے کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ امام حمزہ اور عاصم رحمہ اللہ نے بہ تحتیہ مضمومہ بہ صیغۂ مجہول ورفع ﴿ مَسٰكِنُهُمْ ﴾ پڑھا ہے۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا: اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کے اشخاص دکھائی نہیں دیتے تھے اور صرف ان کے گھر دکھائی دیتے تھے۔ امام کسائی اور زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یہ معنی ہیں کہ کوئی شے دکھائی نہ دیتی تھی سوائے ان کے گھروں کے، چنانچہ یہ اس معنی پر محمول ہے جیسے تم کہو کہ "مَا قَامَ إِلَّا هِنْدٌ أَيْ: مَا قَامَ أَحَدٌ إِلَّا هِنْدٌ"، جمہور نے "لَا تَرَى" بہ تائے خطاب ونصب "مَسَاكِنَهُمْ" پڑھا ہے۔[1] یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے، یا ہر اس شخص کو جو دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

﴿ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴾ یعنی اس جزاء کی طرح ہم مجرموں کو جزاء دیتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے، پہلے پہل جو انھوں نے پہچانا کہ وہ عذاب ہے وہ اس طرح سے کہ انھوں نے اپنے آدمیوں اور مویشیوں کو جو باہر تھے دیکھا کہ آسمان و زمین کے درمیان پروں کی طرح اڑ رہے ہیں تو وہ اپنے گھروں میں گھس گئے اور دروازے بند کر لیے، ہوا آئی تو اس نے ان کے دروازے کھول ڈالے اور ریت لے کر ان پر جھکی تو وہ ریت کے نیچے دب گئے سات رات اور آٹھ دن۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حکم دیا تو ان سے ریت کھول دی اور ان کو دریا میں پھینک دیا، چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ۚ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴾[2] یہ بھی ان سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عاد پر ہوا صرف میری اس انگوٹھی کے پیٹ (سوراخ) کے برابر بھیجی۔[3] اس قصے کی تفسیر سورۃ الاعراف میں

---

[1] تفسير القرطبي (١٦/٢٠٧، ٢٠٨) [2] الدر المنثور (٧/٤٥٠) [3] تفسير الطبري (٢٢/١٢٩)

گزر چکی ہے۔[1] شیخ زادے نے مذکورہ قصہ بڑی تفصیل سے لکھا ہے، اس کے آخر میں کہا ہے کہ سوائے ہود علیہ السلام اور ان لوگوں کے جو ایمان لائے تھے کوئی بھی باقی نہ بچا۔ یہ لوگ ان سے کنارے ہو گئے تھے اور ایک حظیرے (قبرستان کی چار دیواری) میں گھس گئے تھے، جو ہوا ان کو لگتی تھی وہ ایک خوش کن اور ساکن ہوا تھی۔ ان کے حق میں ہوا کا ایسا ہونا اور کفار کے حق میں ایسی شدت کے ساتھ ہونا ہود علیہ السلام کا ایک معجزہ ہے۔ غرضیکہ اللہ پاک نے رسول کے ساتھ کفر اور تکذیب کرنے کے سبب عاد جیسی قوی اور زور آور اور مال دار طویل العمر قوم کو ہلاک کر ڈالا۔ مکے والے تو کسی بات میں بھی ان کے مثل نہیں ہیں، پھر کیوں کفر و شرک اور رسول کی تکذیب کیے جاتے ہیں۔ اگر یہ باز نہ آئیں گے تو ان کو بھی اپنے کیے کی سزا ملے گی، اس لیے یوں ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٢٧﴾ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ۭ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٢٨﴾

اور یقیناً ہم نے قومِ عاد کو اس چیز کی قدرت دی تھی، جس کی تمھیں قدرت نہیں دی اور ہم نے انھیں کان اور آنکھیں اور دل دیے تھے، تو ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں اور ان کے دلوں نے انھیں کوئی فائدہ نہ دیا، جبکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے اور انھیں اس (عذاب) نے گھیر لیا، جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے (26) اور البتہ تحقیق ہم نے تمھارے آس پاس کی بستیاں ہلاک کر دیں، اور ہم نے آیات پھیر پھیر کر بیان کیں، تاکہ وہ (ہماری طرف) رجوع کریں (27) پھر ان لوگوں نے ان کی مدد کیوں نہ کی جنھیں انھوں نے قربِ الٰہی حاصل کرنے کے لیے اللہ کو چھوڑ کر معبود بنا رکھا تھا، بلکہ وہ (معبود) ان سے گم ہو گئے، اور یہ تھا ان کا جھوٹ اور جو یہ افتراء بازی کرتے تھے (28)

---

[1] رقم الآیة (٦٥) فتح البیان (١٣/٣٠-٣٣)

بطور عبرت تباہ شدہ قوموں کا ذکر:

ان کو دل اور کان اور آنکھ دی تھی، یعنی دنیا کے کام میں عقلمند تھے۔ وہ عقل کام نہ آئی۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے پہلی امتوں کو دنیا میں مال واولاد سے مقدور (بہت کچھ) دیا تھا اور ان چیزوں میں سے ان کو وہ شے عطا کی تھی جس کی مثل تم کو عطا نہیں کی اور نہ اس کے قریب تم کو عطا کی۔ ان کو کان اور آنکھیں اور دل دیے تھے مگر نہ تو ان کے کان ان کے کام آئے، نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل کسی شے میں ان کے کام آئے جب وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور ان کو عذاب اور سزا نے گھیر لیا جس کی تکذیب کرتے تھے اور جس کے وقوع کو بعید سمجھتے تھے۔ یعنی اے مخاطب لوگو! تم اس سے بچو کہ تم ان جیسے ہو جاؤ اور تمھیں بھی ان جیسا عذاب دنیا اور آخرت میں پہنچے جیسا ان کو پہنچا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جو بستیاں مکہ کے آس پاس رسولوں کو جھٹلانے والی تھیں، ان کو اللہ پاک نے ہلاک کر ڈالا، جیسے قوم عاد کو جو یمن کے نزدیک حضرموت کے احقاف میں تھی اور ثمود جن کے منازل ان کے اور شام کے درمیان تھے۔ اسی طرح سبا، یہ لوگ یمن والے تھے اور مدین، یہ غزہ کی طرف مکے والوں کی راہ اور گزر میں تھا۔ اسی طرح قومِ لوط کا بحیرہ اس پر سے بھی مکے والے گزرا کرتے تھے، غرضیکہ اردگرد کی عذاب شدہ بستیوں پر سے گزرتے ہیں اور عذاب کے آثار دیکھتے ہیں، پھر کفر اور تکذیب سے باز کیوں نہیں آتے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝27 فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ ﴾ یعنی ہم نے خوب واضح اور ظاہر کر کے آیتیں سنائیں شاید کہ وہ کفر سے باز آجائیں، پھر اس کے باوجود وہ باز نہ آئے تو عذاب آیا اور سب کو ہلاک کر ڈالا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے پھر ان کی مدد کیوں نہیں کی ان لوگوں نے جن کو درجے قریب کرنے کے لیے معبود ٹھہرایا تھا، یعنی انھوں نے ان کی مدد کیوں نہ کی جبکہ پوچنے والوں کو ان کی سخت حاجت تھی جن کو معبود ٹھہرایا تھا بلکہ وہ ان سے غائب ہو گئے، جاتے رہے اس حال میں کہ جس وقت وہ سب سے بڑھ کر ان کے محتاج تھے۔ ﴿ ذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴾ یعنی یہ اس بات میں ان کا جھوٹ اور افتراء ہے کہ انھوں نے ان کو معبود ٹھہرایا اور ان کو پوج کر اور ان پر اعتماد کر کے نہایت خائب وخاسر اور زیاں کار اور نامراد ہوئے۔[1] واللہ أعلم بالصواب.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے: امام مبرد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قولہ تعالیٰ ﴿ فِيْمَآ ﴾ میں کلمۂ "ما"

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٢٠٤، ٢٠٥)

بہ منزلہ "الذي" ہے اور کلمۂ ﴿ اِنْ ﴾ بمنزلہ مائے نافیہ ہے، تقدیر یہ ہے: "وَلَقَدْ مَكَّنَاهُمْ فِي الَّذِي مَا مَكَّنَاهُمْ فِيهِ"[1] یعنی ہم نے عاد کو اس شے میں مقدور دیا تھا کہ اس میں ہم نے تم کو مقدور نہیں دیا، اس سے مراد مال کی کثرت اور عمر کی درازی اور جسمانی قوت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ان سب امور میں تم سے بڑھے ہوئے تھے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔ وہ ﴿ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "لَمْ نُمَكِّنْكُمْ"۔[2] ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ عاد کو زمین میں اس سے افضل شے کا مقدور دیا گیا جس کا اس امت کو مقدور دیا گیا اور وہ قوت میں زیادہ سخت تھے اور ان کے پاس مال بھی زیادہ تھے اور ان کی عمریں بھی زیادہ لمبی تھیں۔[3] کسی نے کہا ہے کہ کلمۂ "إن" زاید ہے۔ تقدیر یہ ہے: "وَلَقَدْ مَكَّنَاهُمْ فِيمَا مَكَّنَاكُمْ فِيهِ" امام قتیبی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں اور اسی کے مثل شاعر کا قول ہے:

فَمَا إِنْ طِبُّنَا جُبْنٌ وَلَكِنْ مَنَايَانَا وَدَوْلَةُ آخَرِينَا[4]

یعنی ہماری خو نامردی و بزدلی نہیں ہے لیکن ہم کیا کریں ہم کو تو موتوں نے آلیا اور دوسروں کا غلبہ ہو گیا۔

پہلا قول زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ اس میں زیادہ تر مبالغہ ہے، کفارِ قریش اور ان جیسے لوگوں کی توبیخ اور ڈانٹ ڈپٹ ہے۔ ﴿ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْـِٕدَةً ﴾ یعنی انھوں نے حجت کو قبول کرنے سے اعراض کیا اور نصیحت پذیر نہ ہوئے، باوجود اس کے کہ اللہ پاک نے ان کو حواس اور فہم کے تمام آلات عطا کیے تھے جن سے دلیلوں کو سمجھا جاتا ہے اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَ لَاۤ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ﴾ ﴿ مِنْ شَيْءٍ ﴾ میں کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ زاید ہے اور استغراق کے لیے ہے۔ تقدیر یہ ہے: "فَمَا أَغْنَى عَنْهُمْ شَيْئًا مِنَ الْإِغْنَاءِ وَلَا نَفَعَهُمْ بِوَجْهٍ مِنْ وُجُوهِ النَّفْعِ" یعنی یہ حواس جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کیے تھے تو ان کے کچھ کام نہ آئے اور نہ ہی ان کو کچھ فائدہ دیا، اس لیے کہ ان سے وہ توحید اور وعد و وعید کے اعتقاد کی صحت کی طرف نہ پہنچے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾

ظرف ﴿ اَغْنٰى ﴾ سے متعلق ہے اور اس میں تعلیل کے معنی ہیں: "أَيْ: لِأَنَّهُمْ كَانُوا جَاحِدِينَ" یعنی وہ حواس ان کے کچھ کام نہ آئے، اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ کان اس لیے دیے تھے کہ ان سے وعظ و نصیحت سنتے اور آنکھیں اس لیے عطا کی تھیں کہ ان سے اللہ تعالیٰ کی قدرتیں دیکھتے، دل اس لیے دیے تھے کہ ان سے دلیلیں سمجھتے اور ان سب کو توحید کا اور اللہ تعالیٰ کے وعد و وعید کو سچا سمجھنے کا وسیلہ ٹھہراتے، مگر انھوں نے یوں نہ کیا، ان سے کچھ کام نہ لیا، ان کو بے کار چھوڑ دیا اور اللہ کی آیتوں کا انکار کیا تو جو انکار کی سزا ہے اس نے آدبایا۔

﴿ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ یعنی اور ان کو اس عذاب نے گھیر لیا جس کی استہزاء کے طور پر

---

[1] تفسير القرطبي (٢٠٨/١٦) [2] تفسير الطبري (١٣١/٢٢) [3] الدر المنثور (٤٥١/٧) [4] تفسير القرطبي (٢٠٨/١٦)

جلدی چاہتے تھے، جب کہ یہ کہا تھا: ﴿ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ ﴾۔ سمع کو واحد ذکر کیا، اس لیے کہ اس سے صرف آواز کا اور جو اس کے تابع ہے، اس کا ادراک کیا جاتا ہے، اس کے خلاف بصر سے بہت سی اشیاء کا ادراک کیا جاتا ہے، بعض کا بالذات اور بعض کا بالواسطہ اور فواد کا ادراک ہر شے کو عام ہے۔ (ذکرہ الکرخي) سمع کو واحد ذکر کرنے اور بصر کو جمع ذکر کرنے پر پہلے ایسے طور پر کلام گزر چکا ہے کہ اس جگہ اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو عاد کا قصہ ہو چکا کہ وہ رسول کی تکذیب اور کفر کی وجہ سے ہلاک کر دیے گئے۔

پھر فرمایا کہ تمھارے اردگرد کی بستیاں بھی اسی سبب سے ہلاک ہو چکی ہیں، وہ بستیاں جن کو تم جانتے بوجھتے ہو اور ان کی خبریں متواتر سنتے ہو۔ چنانچہ ارشاد کیا: ﴿ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى ﴾ خطاب اہلِ مکہ کو ہے اور قریٰ سے مراد ثمود کی بستیاں ہیں، یعنی حجر اور سدوم، قومِ لوط کے قریات شام میں اور ان کی طرح کی اور بستیاں جو بلادِ حجاز کے ہمسائے ہیں اور ان کی خبریں مکے والوں کے نزدیک متواتر ہیں۔

پھر اگر یہ وہم ہو کہ سرسری طور پر ان کی فہمایش ہوئی ہو خوب ٹھونک بجا کر نہ سمجھایا ہو تو فرما دیا: ﴿ وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ یعنی ہم نے خوب کھول کھول کر حجتیں بیان کیں اور ہم نے ان کو رنگا رنگ کے پیرایوں میں ادا کیا اس امید پر کہ وہ اپنے کفر سے باز آ جائیں، لیکن وہ باز نہ آئے اور عذاب کے مستحق ہو گئے تو ان پر عذاب آ گیا۔ پھر اللہ پاک نے ذکر کیا کہ کسی مددگار نے مدد کر کے ان کو اللہ کے عذاب سے نہیں چھڑایا، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ﴾ یعنی جب ان پر عذاب آ گیا اور کسی نے ان کو نہ بچایا، جن کو اللہ کے ساتھ شفاعت کی غرض سے پوجتے تھے وہ کچھ کام نہ آئے۔

اللہ سبحانہ فرماتا ہے کہ پھر اُن کی مدد اُن معبودوں نے کیوں نہیں کی جن کے ساتھ اللہ کی طرف تقرب چاہتے تھے اپنے خیال اور دعوے میں، تاکہ وہ ان کے لیے سفارش کریں، جبکہ انھوں نے کہا تھا کہ ﴿ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ [یونس: ۱۸] یعنی یہ لوگ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں اور ان کو اس ہلاکت سے کیوں نہیں روکا جو ان پر واقع ہوئی۔ فرمایا: ﴿ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ﴾ یعنی کوئی نہیں، وہ کیا مدد کریں گے، بلکہ وہ تو ان کی مدد سے غائب ہو گئے اور جس وقت ان کی ضرورت تھی اس وقت وہ بالکل حاضر نہ ہوئے۔ کسی نے کہا ہے: بلکہ ہلاک ہو گئے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ ضَلُّوْا ﴾ میں ضمیر کفار کی طرف راجع ہے، یعنی کفار نے بتوں کو چھوڑ دیا اور ان سے بے زار ہو گئے۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

﴿ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ ﴾ یعنی اور یہ ضلال اور ضیاع ان کے افک کا اثر ہے، وہ افک یہ ہے کہ انھوں نے ان کو معبود ٹھہرایا اور یہ خیال کیا کہ وہ ان کو اللہ کے قریب کر دیں گے۔ ﴿ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴾ معطوف ہے ﴿ اِفْكُهُمْ ﴾ پر، یعنی ان کے افتراء کا اثر ہے، یا اس شے کا اثر ہے جس کا وہ افتراء کرتے تھے۔ معنی یہ ہیں کہ یہ ان کا جھوٹ ہے، وہ کہتے تھے کہ وہ ان کو اللہ کے قریب کر دیں گے اور ان کے لیے سفارشی ہوں گے اور وہ شے ہے جو جھوٹ کہتے ہیں کہ وہ معبود ہیں۔

امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "قُرْبَان" ہر وہ شے ہے جس کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل کیا جاتا ہے طاعت ونسیکہ یعنی ذبیحہ، اس کی جمع "قَرَابِيْنُ" ہے، جیسے: "رُهْبَانٌ" و "رَهَابِيْنُ"۔[1] اور ﴿ اِتَّخَذُوْا ﴾ کا ایک مفعول تو ضمیر محذوف راجع طرف موصول کے ہے اور دوسرا مفعول ﴿ اٰلِهَةً ﴾ ہے اور ﴿ قُرْبَانًا ﴾ حال ہے۔ اور یہ صحیح نہیں ہے کہ ﴿ قُرْبَانًا ﴾ مفعولِ ثانی ہو اور ﴿ اٰلِهَةً ﴾ اس سے بدل ٹھہرے بہ سبب فسادِ معنی کے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ صحیح ہے اور معنی فاسد نہیں ہیں۔ امام ابن عطیہ، ابو البقاء اور ابو حیان رحمہم اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے اور یہ انکار کیا ہے کہ اس وجہ پر معنی میں فساد ہو۔[2]

جمہور نے ﴿ اِفْكُهُمْ ﴾ بہ کسرِ ہمزہ وسکونِ فاء پڑھا ہے مصدر "أَفَكَ يَأْفِكُ إِفْكًا أَيْ: كِذْبُهُمْ"۔ سیدنا عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم، امام مجاہد رحمہ اللہ نے بہ فتحِ ہمزہ و فاء و کاف بنا بر فعل پڑھا ہے: "أَيْ: ذٰلِكَ الْقَوْلُ"۔ "صَرَفَهُمْ عَنِ التَّوْحِيْدِ"، یعنی اس قول نے ان کو توحید سے پھیرا ہے اور امام عکرمہ رحمہ اللہ نے بہ فتحِ ہمزہ وتشدیدِ فاء پڑھا ہے۔ "أَيْ: صَيَّرَهُمْ آفِكِيْنَ"، امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا: یعنی "قَلَّبَهُمْ عَمَّا كَانُوْا عَلَيْهِ مِنَ النَّعِيْمِ"، یعنی اس بات نے ان کو اس عیش سے لوٹ دیا جس میں وہ تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ انھوں نے بہ مدِ ہمزہ و کسرِ فاء پڑھا ہے، بہ معنی "صَارَفَهُمْ"۔[3] جب اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ آدمیوں میں وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ان میں وہ ہیں جو کافر ہوئے تو بیان کیا کہ جنوں میں بھی اسی طرح دو فریق ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[4]

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿٢٩﴾ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٣٠﴾ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٣١﴾ وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٢﴾

اور (یاد کیجیے) جب ہم نے جنوں کی ایک جماعت کو آپ کی طرف متوجہ کیا، جب کہ وہ قرآن

---

① تفسير القرطبي (١٦/ ٢٠٩)
② التبيان في إعراب القرآن (٢/ ١٢٥٨) البحر المحيط (٨/ ٦٦)
③ تفسير القرطبي (١٦/ ٢٠٩، ٢١٠) فتح القدير (٥/ ٣٢)
④ فتح البيان (١٣/ ٣٣ـ ٣٦)

سنتے تھے، پھر جب وہ اس (کی تلاوت سننے) کو حاضر ہوئے، تو (ایک دوسرے سے) کہا: خاموش رہو، چناں چہ جب (تلاوت) ختم ہوگئی تو وہ اپنی قوم کی طرف ڈرانے والے بن کر پھرے ﴿29﴾ انھوں نے کہا: اے ہماری قوم! بے شک ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، وہ ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے کی ہیں، وہ حق کی طرف اور صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتی ہے ﴿30﴾ اے ہماری قوم! اللہ کے داعی کی بات کو قبول کرلو اور اس پر ایمان لے آؤ، وہ تمھارے لیے تمھارے (کچھ) گناہ بخش دے گا اور وہ تمھیں نہایت دردناک عذاب سے پناہ دے گا ﴿31﴾ اور جو کوئی اللہ کے داعی کی بات قبول نہیں کرے گا تو وہ زمین میں (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکے گا اور اللہ کے سوا اس کے کوئی حمایتی نہیں ہوں گے، یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں ﴿32﴾

نبی کریم ﷺ حج کے دنوں میں مکے سے باہر صبح کی نماز اپنے یاروں کے ساتھ پڑھنے لگے، اس وقت کئی جن قرآن سن گئے اور مسلمان ہو گئے، پھر اپنی قوم کو جا کر سمجھایا، اس وقت نبی اکرم ﷺ سے نہیں ملے، پھر بہت سے لوگ (جن) مسلمان ہوکر ایک رات مکے سے باہر آئے، آپ ﷺ اکیلے باہر گئے، سب نے قرآن سیکھا اور دین قبول کیا۔ سورۃ الجن میں ان کی باتیں تفصیل سے دی گئی ہیں اور جب سے نبی اکرم ﷺ پر وحی آئی ہے، تب سے جنوں پر آسمان کی خبر بند ہوئی، ان کو اس کا سبب معلوم نہ تھا۔ جب قرآن سنا تو سمجھ گئے کہ اس کا نزول ہوتا ہے، اسی سے خبر بند کی ہے۔ سلیمان علیہ السلام کے وقت سے ان میں تورات مشہور تھی۔ زمین میں بھاگنا اس طرح ہے کہ اوپر سے فرشتے مارتے ہیں تو زمین ہی کو بھاگتے ہیں۔ انتہیٰ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ کلمۂ ﴿اِذْ﴾ میں عامل "اُذْكُرْ" محذوف ہے اور "نَفَر" کا کلمہ دس سے کم میں بولا جاتا ہے۔ ﴿مِّنَ الْجِنِّ﴾ صفتِ اول ہے "نَفَر" کی اور ﴿يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ﴾ دوسری صفت ہے "نَفَر" کی، یا حال ہے "نَفَر" سے، اس لیے کہ گو یہ نکرہ ہے، مگر پہلی صفت سے اس کی تخصیص ہوگئی تو اب ذوالحال ہوسکتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اس وقت کو یاد کرو جس وقت ہم نے جنوں کے ایک گروہ کو تیری طرف متوجہ کیا اور ہم نے ان کو قرآن سننے کے لیے تیری طرف بھیجا۔

﴿فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْۤا اَنْصِتُوْا﴾ یعنی پھر جب وہ قرآن کے پاس اس کی تلاوت کے وقت حاضر ہوئے۔

کسی نے کہا: پھر جب نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اس قول کی بنا پر کلام میں التفات ہو گا خطاب سے غیبت کی طرف۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے، تو بعض نے بعض سے کہا کہ چپ رہو، ایک نے دوسرے کو چپ رہنے کا امر اس لیے کیا تا کہ قرآن سنیں۔ ﴿فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ﴾ جمہور نے ﴿قُضِيَ﴾ بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے: ''أَيْ: فَرَغَ مِنْ تِلَاوَتِهِ'' اور حبیب بن عبدالزبیر، لاحق بن حمید اور ابومجلز نے بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے: ''أَيْ: فَلَمَّا فَرَغَ النَّبِيُّ ﷺ''۔

پہلی قراءت اس بات کی تائید کرتی ہے کہ ﴿حَضَرُوْهُ﴾ کی ضمیر قرآن شریف کی طرف راجع ہے اور دوسری قراءت اس کی تائید کرتی ہے کہ ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف پھرتی ہے۔[1] ﴿مُنْذِرِيْنَ﴾ کا نصب بنا برحالِ مقدرہ ہے (اس لیے کہ زمانہ تولی اور انذار کا ایک نہیں ہے، بلکہ جب اپنی قوم کے پاس پہنچے تب ان کو ڈرایا۔) ''أَيْ: مُقَدِّرِيْنَ الْإِنْذَارَ'' معنی یہ ہیں: پھر جب قرآن کی تلاوت سے فراغت کی گئی، یا پھر جب نبی کریم ﷺ اس کے پڑھنے سے فارغ ہو چکے تو وہ (جن) اپنی قوم کے ان لوگوں کی طرف لوٹے جو اُن کے پیچھے تھے اس حال میں کہ ان کو قرآن کی مخالفت سے ڈراتے اور خوف دلاتے تھے۔ یہ بات اس پر دال ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ پر ایمان لے آئے۔ یہ جن یہود تھے اور مسلمان ہوئے (یہ عطاء رحمہ اللہ کا قول ہے[2])۔ جیسے آدمیوں میں ملتیں اور مذہب ہیں، ویسے ہی جنوں میں بھی ہیں۔ چنانچہ ان میں یہود ونصاریٰ، مجوس اور بت پرست ہیں اور ان کے مسلمانوں میں بدعتی ہیں اور قدر وخلقِ قرآن کے قائل ہیں اور ان جیسے اور مذاہب اور بدعات کے عامل ہیں۔[3] (كما قاله الخازن)

﴿قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ یہاں حذف ہے۔ ''أَيْ: فَوَصَلُوْا إِلَى قَوْمِهِمْ فَقَالُوْا'' یعنی پھر وہ اپنی قوم کی طرف پہنچے اور کہا: اے ہماری قوم! بے شک ہم نے ایک کتاب سنی ہے، یعنی قرآن شریف، جو موسی علیہ السلام کے بعد اتاری گئی ہے، وہ ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے اتاری گئی ہیں، جیسے: تورات، انجیل، زبور اور صحفِ ابراہیم علیہ السلام وغیرہ اور دینِ حق، یعنی صحیح عقائد کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور اللہ کی راہ کی طرف جو سیدھی ہے، یعنی شرائعِ فرعیہ اور احکامِ دینیہ۔ امام مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ سے پہلے کوئی نبی جنوں اور انسانوں کی طرف نہیں بھیجا،[4] اس کی مناسب بحث آئندہ آئے گی۔ إن شاء الله.

﴿يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ﴾ یعنی اے ہماری قوم! اللہ کے بلانے والے کو قبول کرو اور اس پر ایمان لاؤ، یعنی نبی کریم ﷺ یا قرآن شریف کو۔ ﴿يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ﴾ جواب ہے امر کا اور کلمۂ ﴿مِنْ﴾ تبعیضیہ

---

[1] فتح القدير (٣٤،٣٣/٥) [2] تفسير القرطبي (٢١٧/١٦) [3] تفسير الخازن (١٦٧/٦) [4] فتح القدير (٣٤/٥)

ہے، یعنی تمھارے لیے تمھارے بعض گناہ بخشے گا، اس سے مراد وہ گناہ ہیں جو حقوق العباد کے علاوہ ہیں، کیوں کہ حقوق العباد حق والے اصحاب کی رضا کے بغیر بخشے نہیں جاتے۔ کسی نے کہا ﴿ مِنْ ﴾ اس جگہ ابتدائے غایت کا ہے، یعنی بخشش کی ابتداء گناہوں سے ہوگی، پھر اس کی انتہا ان کی بخشش پر ہوگی جو اولیٰ کے ترک کر دینے پر گناہ ہوں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْ ﴾ زاید ہے۔ مفعول میں ﴿ مِنْ ﴾ زاید ہوتا ہے۔ "أَيْ: يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوبَكُمْ" لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ اعمال بہتر ہے اہمال (یوں ہی چھوڑ دینے) سے۔ ﴿ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ یعنی اور تم کو دردناک عذاب، یعنی آگ کے عذاب سے بچائے گا۔

آیتِ کریمہ میں اس بات پر دلیل ہے کہ ثواب اور عقاب اور اوامر ونواہی کے ساتھ متعبد ہونے میں جنوں کو بھی انسانوں کی طرح مکلّف کیا گیا ہے، یعنی ان کو ایک جیسا حکم ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مومن جنوں کے لیے آگ کے عذاب سے نجات کے سوا کوئی ثواب نہیں ہے۔ اسی کے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بھی قائل ہیں اور پہلے قول کے قائل امام مالک، امام شافعی اور ابن ابی لیلی رحمہم اللہ ہیں۔ فتح البیان اور فتح القدیر میں قولِ اول کو زیادہ مناسب فرمایا ہے۔

دوسرے قول کی بنا پر اس کے قائلین نے کہا ہے کہ آگ سے ان کے نجات پانے کے بعد ان سے کہا جائے گا کہ مٹی ہو جاؤ، جیسے جانوروں سے کہا جائے گا۔ پہلا قول زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔[1] دیکھو اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو خطاب کر کے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۚ﴿46﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ [الرحمن: ٤٦۔ ٤٧] "اور اس شخص کے لیے جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا دو جنتیں ہیں۔ پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟"

اللہ پاک نے ثقلین (جنوں اور انسانوں) کے لیے یہ احسان کیا ہے کہ اس نے ان کے نیک کی جزاء جنت ٹھہرائی اور یہاں جو ان کے عذابِ الیم سے بچانے پر اکتفا فرمایا ہے تو یہ اس کے منافی نہیں ہے۔ اس کی مویدات میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ پاک نے ان کے کافر کو تو نار کی جزاء دی، یہ مقامِ عدل ہے تو اُن کے نیک کو جنت کی جزاء کیوں کر نہ دے گا، حالاں کہ وہ مقامِ فضل ہے۔ اس کی مویدات میں سے یہ بھی ہے جو بہت جگہ قرآنِ کریم میں آیا ہے کہ مومنین کی جزاء جنت ہے اور عاملِ صالحات کی جزاء جنت ہے اور "لا إله إلا الله" کہنے والے کی جزاء جنت ہے، ان کے سوا اور اطلاقات کثیر ہیں جو کتابِ عزیز اور سنتِ مطہرہ میں وارد ہوئے ہیں۔ اہلِ علم نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں کی طرف ان میں سے کوئی رسول بھیجا ہے یا نہیں؟

آیاتِ قرآنیہ سے ظاہر یہ بات ہے کہ رسول آدمیوں میں سے ہیں، جیسا کہ اس آیتِ کریمہ میں ہے: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ﴾ [یوسف: ١٠٩] "آپ سے پہلے ہم نے بستی والوں

[1] فتح القدیر (٣٤/٥) فتح البیان (٣٨/١٣)

میں جتنے رسول بھیجے ہیں سب مرد ہی تھے جن کی طرف ہم وحی نازل فرماتے گئے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ﴾ [الفرقان: ٢٠] ''ہم نے آپ سے پہلے جتنے رسول بھیجے سب کے سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے۔'' نیز اللہ پاک نے ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ فرمایا ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ ﴾ [العنكبوت: ٢٧] ''اور ہم نے نبوت اور کتاب ان کی اولاد میں ہی کر دی۔'' چنانچہ ہر نبی جس کو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے بعد مبعوث فرمایا تو وہ اُن کی اولاد میں سے ہے۔

اب رہی وہ آیت جو سورۃ الانعام میں ہے: ﴿ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ ﴾ [الأنعام: ١٣٠] ''اے جنات اور انسانوں کی جماعت! کیا تمھارے پاس تم میں سے ہی پیغمبر نہیں آئے تھے۔'' (منکم أَيُ: من مجموع الجنسين و صدق على أحدهما وهم الإنس)۔ کسی نے کہا ہے کہ ''مجموع الجنسین'' سے مراد وہ ہے جس پر ایک دو جنسوں کا صادق آنا ہے اور وہ انس ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴾ [الرحمن: ٢٢] ''ان دونوں میں سے موتی اور مونگے برآمد ہوتے ہیں۔'' ''أَيُ: مِنْ أَحَدِهِمَا'' (یہ کلام عرب کا محاورہ ہے)۔

غرضیکہ پھر جنوں نے کہا: ﴿ وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ ﴾ یعنی جو کوئی اللہ کے بلانے والے کو قبول نہ کرے گا تو وہ اللہ کی دسترس سے باہر نہیں ہوگا اور نہ اس سے آگے بڑھ جائے گا اور نہ اس سے بھاگنے پر قادر ہوگا اور اگر وہ ہر بھاگنے کی جگہ میں بھاگے پھر بھی وہ زمین ہی میں رہے گا، اس سے نکلنے کا اسے کوئی راستہ نہ ملے گا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

ہر زمین کہ رسیدیم آسماں پیداست

یہ تو اس کا بیان ہوا کہ اس کو خود اپنی جان کا بچانا محال ہے۔ اب یہ بیان کیا کہ کسی اور کے واسطے سے بھی اس کی نجات محال ہے۔ چنانچہ کہا: ﴿ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ﴾ یعنی اس کے لیے اس کے سوا کوئی مددگار نہیں ہیں جو اس کو اللہ کے عذاب سے روکیں۔ اس میں ایک سخت ترہیب (ڈراوا) ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کسی طرح نہیں بچ سکتا۔ ﴿ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ یعنی یہ لوگ جو اللہ کے بلانے والے کو قبول نہیں کرتے بڑی واضح اور ظاہر گمراہی میں ہیں۔ یہ ان جنوں کی آخری بات ہے جنھوں نے قرآن سنا۔ غریبہ: اس جگہ دو ہمزۂ مضموم دو کلموں سے جمع ہوئے ہیں، ان کی نظیر قرآن شریف میں اس کے سوا اور نہیں ہے۔ ایک ہمزہ تو ﴿ اَوْلِيَآءُ ﴾ کے آخر کا اور دوسرا ہمزہ ﴿ اُولٰٓئِكَ ﴾ کے شروع کا۔

قصہ جنوں کے قرآن سننے کا:

لو یہ بیان تو فتح البیان کا سن چکے،[1] اب حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا طویل بیان سنو۔

(1) امام احمد رحمہ اللہ نے عکرمہ عن الزبیر رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے: ﴿ وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ﴾ یعنی اور جب ہم نے جنوں کا ایک گروہ تیری طرف قرآن سننے کے لیے متوجہ کیا۔ کہا کہ نخلہ (ایک جگہ کا نام ہے۔ كذا في مجمع البحار) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشائے آخر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ ﴿ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴾ [الجن: ١٩] یعنی قریب تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس طرح ہو جائیں جیسے کوئی ایک دوسرے سے چمٹ جائے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے استاد سفیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "أَلْبَدَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ كَاللِّبَدِ بَعْضُهُ عَلَى بَعْضٍ" کہ ان کا بعض بعض سے چپک گیا تھا، جیسے نمدہ کہ اس کا بعض بعض پر ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنوں کے ٹھٹھ لگے تھے۔[2] (تفرد به أحمد و سيأتي من رواية ابن جرير عن عكرمة عن ابن عباس رضی اللہ عنہما إنهم سبعة من جن نصيبين)

(2) امام احمد رحمہ اللہ نے اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے "دلائل النبوة" میں عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ جنوں پر پڑھا اور نہ ان کو دیکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کے ایک گروہ کے ساتھ بازارِ عکاظ کی طرف جانے کے ارادے سے چلے اور شیطانوں اور آسمانوں کی خبر کے درمیان رکاوٹ پیدا کی گئی تھی اور ان پر شعلے بھیجے گئے تھے تو شیاطین اپنی قوم کی طرف لوٹے۔ قوم نے کہا: تمھیں کیا ہے؟ تو وہ بولے کہ ہمارے اور آسمان کی خبر کے درمیان رکاوٹ ڈال دی گئی اور ہم پر شعلے بھیجے گئے۔ قوم نے کہا کہ تمھارے اور آسمان کی خبر کے درمیان کوئی خاص شے واقع ہوئی، اس لیے تم زمین کے مشرق و مغرب کی جانب پھرو اور دیکھو کہ یہ کون سی شے ہے جو تمھارے اور آسمان کی خبر کے درمیان حائل ہوگئی ہے تو وہ پھرے اور زمین کے چاروں طرف پھرتے اور اس شے کی تلاش کرتے تھے جو اُن کے اور آسمان کی خبر کے درمیان حائل ہوئی۔ پھر جو گروہ تہامہ کی طرف گیا تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم موضعِ نخلہ میں تھے اور بازارِ عکاظ کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کو فجر کی نماز پڑھا رہے تھے، چنانچہ جب انھوں نے قرآن سنا تو اس کی طرف کان لگایا، پھر بولے: واللہ! یہ ہے جو تمھارے اور آسمان کی خبر کے درمیان حائل ہوا ہے، چنانچہ جب وہاں سے اپنی قوم کی طرف لوٹے تو کہا: ﴿ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ﴾ [الجن: ١۔ ٢] "اور کہا کہ ہم نے عجیب قرآن سنا ہے جو راہِ راست کی

---

(1) فتح البيان (١٣/٣٦۔٣٩)

(2) مسند أحمد (١/١٢٧) اس کی سند میں انقطاع ہے "عکرمہ رحمہ اللہ کا سماع سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔"

طرف راہنمائی کرتا ہے ہم اس پر ایمان لاچکے (اب) ہم ہرگز کسی کو بھی اپنے رب کا شریک نہ بنائیں گے۔"
نیز اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ پر یہ آیت نازل فرمائی: ﴿قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ﴾ [الجن: ۱] "(اے محمد!) آپ کہہ دیں کہ مجھے وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے (قرآن) سنا" اور آپ کی طرف جو وحی کی گئی وہ جن کا قول ہے۔[1] (رواه البخاري عن مسدد بنحوه و أخرجه مسلم عن شيبان بن فروخ عن أبي عوانة به و رواه الترمذي والنسائي في التفسير من حديث أبي عوانة)

(3) امام احمد رحمہ اللہ نے عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ جن وحی کو سننے کے لیے کان لگاتے تھے تو جو کلمہ سن لیتے اس میں دس کلمے بڑھا لیتے تو جو سنا تھا وہ حق ہوتا اور جو اس میں بڑھایا وہ باطل ہوتا تھا اور اس سے پہلے تاروں سے ان کو مارنے کے لیے شعلے نہیں پڑتے تھے۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تو ان میں کا ایک جب اپنی بیٹھک میں آتا تو شعلے سے مارا جاتا، جو ہر اس شے کو جلا ڈالتا جس کو وہ لگتا تھا تو انھوں نے ابلیس سے اس کی شکایت کی تو وہ بولا کہ یہ کسی ایسے امر کی وجہ سے ہے جو ابھی نیا واقع ہوا ہے، پھر اس نے اپنے لشکر پھیلائے تو کیا دیکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نخلہ کے دو پہاڑوں کے درمیان نماز پڑھ رہے ہیں، چنانچہ وہ ابلیس کے پاس آئے اور اسے بتایا، اس نے کہا: یہ ہے وہ نئی بات جو دنیا میں پیدا ہوئی ہے۔[2] (ورواه الترمذي والنسائي في كتابي التفسير من سننيهما من حديث إسرائيل به، وقال الترمذي: حسن صحيح، وهكذا رواه أيوب عن سعيد بن جبير عن ابن عباس رضي الله عنهما وكذا رواه العوفي عن ابن عباس رضي الله عنهما أيضا بمثل هذا السياق بطوله) اور اسی طرح حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو اُن کے حال کی خبر نہ ہوئی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی خبر آپ ﷺ پر نازل فرمائی۔[3]

(4) امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے عن یزید بن رومان عن محمد بن کعب القرظی نبی اکرم ﷺ کا قصہ ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ طائف کی طرف نکلے اور ان کو اللہ عزوجل کی طرف بلایا اور انھوں نے آپ ﷺ کا کہنا نہ مانا، پھر قصہ بطولہا ذکر کیا ہے اور یہ دعائے حسن وارد کی ہے: "اَللّٰهُمَّ إِلَيْكَ أَشْكُوْ ضُعْفَ قُوَّتِيْ وَقِلَّةَ حِيْلَتِيْ وَهَوَانِيْ عَلَى النَّاسِ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ، أَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ وَأَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ، وَأَنْتَ رَبِّيْ إِلٰى مَنْ تَكِلُنِيْ إِلٰى عَدُوٍّ بَعِيْدٍ يَتَجَهَّمُنِيْ أَمْ إِلٰى صَدِيْقٍ قَرِيْبٍ مَلَّكْتَهُ أَمْرِيْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ بِكَ غَضَبٌ عَلَيَّ فَلَا أُبَالِيْ غَيْرَ أَنَّ عَافِيَتَكَ أَوْسَعُ لِيْ، أَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِيْ أَشْرَقَتْ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٣٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٤٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٢٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٩٩) مسند أحمد (١/٢٥٢) دلائل النبوة (٢/٢٢٥، ٢٢٦)

[2] مسند أحمد (١/٢٧٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٢٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٥٠٠) [3] تفسير الطبري (٢٢/١٣٦)

لَهُ الظُّلُمَاتُ وَصَلَحَ عَلَيْهِ أَمْرُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ أَنْ يَنْزِلَ بِي غَضَبُكَ أَوْ يَحِلَّ بِي سَخَطُكَ وَلَكَ الْعُتْبَى حَتَّى تَرْضَى وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِكَ" "اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور کس مپرسی کی شکایت صرف تیرے سامنے کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو دراصل سب سے زیادہ رحم وکرم کرنے والا ہے اور کمزوروں کا رب تو ہی ہے، میرا پالنے والا بھی تو ہی ہے، تو مجھے کسی کو سونپ رہا ہے، کسی دوری والے دشمن کو جو مجھے عاجز کر دے یا کسی قریبی دوست کو جسے تو نے میرے بارے میں اختیار دے رکھا ہو، اگر تیری کوئی خفگی مجھ پر نہ ہو تو مجھے اس درد دکھ کی کوئی پروا نہیں، لیکن تاہم اگر تو مجھے عافیت کے ساتھ ہی رکھے تو وہ میرے لیے بہت راحت رساں ہے، میں تیرے چہرے کے اس نور کے باعث جس کی وجہ سے تمام اندھیریاں جگمگا اٹھی ہیں اور دین ودنیا کے تمام امور کی اصلاح کا مدار اس پر ہے تجھ سے اس بات کی پناہ طلب کرتا ہوں کہ مجھ پر تیرا عتاب اور تیرا غصہ نازل ہو یا تیری ناراضی مجھ پر آ جائے، میری تیری ہی رضا مندی اور خوشنودی درکار ہے اور نیکی کرنے اور بدی سے بچنے کی طاقت تیری ہی مدد سے ہے۔" کہا: پھر جب ان کی طرف سے لوٹے تو موضعِ نخلہ میں رات بسر کی، چنانچہ آپ ﷺ نے اس رات قرآن میں سے پڑھا تو نصیبین والے جنوں نے اس کو سنا۔[1] یہ صحیح ہے، لیکن یہ قول کہ جنوں نے اس رات سنا اس میں نظر ہے، اس لیے کہ جنوں کا سننا تو ابتدائے وحی میں ہوا ہے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث اس پر دال ہے اور آپ ﷺ کا طائف کی طرف نکلنا آپ ﷺ کے چچا کی وفات کے بعد واقع ہوا تھا اور یہ واقعہ ہجرت سے ایک یا دو سال قبل تھا، جیسا کہ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کو ثابت کیا ہے۔ واللّٰه أعلم.

5 ابوبکر بن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: وہ اترے نبی اکرم ﷺ پر اور آپ ﷺ بطنِ نخلہ میں قرآن پڑھ رہے تھے، پھر جب انھوں نے اس کو سنا تو کہا: ﴿اَنْصِتُوْا﴾۔ راوی نے کہا: "صہ" یعنی چپ رہو اور یہ لوگ نو تھے، ان میں سے ایک زوبعہ ہے۔ چنانچہ اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ ... تا ... فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾[2] چنانچہ یہ اس چیز کے ساتھ جو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی اس بات کو مقتضی ہے کہ اس بار میں رسول اللہ ﷺ کو ان کے حاضر ہونے کی خبر نہ ہوئی اور انھوں نے صرف آپ کی قراءت سنی پھر اپنی قوم کی طرف لوٹ گئے۔

پھر اس کے بعد آپ ﷺ کے پاس گروہ گروہ ہو کر آئے۔ ایک قوم کے بعد دوسری قوم اور ایک گروہ کے بعد دوسرا گروہ، چنانچہ آیندہ اس کے متعلق اخبار وآثار بجائے خود آئیں گے، اس جگہ ہم ان کو۔ إن شاء اللّٰه تعالیٰ۔ وارد کریں گے اور اسی پر اعتماد ہے۔ چنانچہ بخاری ومسلم نے جو معن بن عبدالرحمان سے روایت کیا ہے کہ میں

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام (٢٦٧/٢) یہ روایت مرسل ہے۔

[2] مستدرك الحاكم (٤٩٥/٢) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

نے اپنے باپ کو یہ کہتے سنا کہ میں نے امام مسروق رحمہ اللہ سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کو کس نے خبر دی جس رات انھوں نے قرآن سنا؟ تو امام مسروق رحمہ اللہ نے کہا: مجھے تیرے باپ نے، یعنی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی کہ ایک درخت نے آپ ﷺ کو ان کی خبر دی۔[1]

چنانچہ اس روایت میں تین احتمال ہیں: ایک یہ ہے کہ یہ پہلی بار میں ہوا اور اثبات سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی نفی پر مقدم ٹھہرا۔ دوسرا یہ ہے کہ یہ پہلی بار میں ہوا، لیکن آپ ﷺ کو ان کی خبر نہ ہوئی ان کے سننے کی حالت میں یہاں تک کہ درخت نے آپ ﷺ کو ان کی خبر دی، یعنی ان کے جمع ہونے کا آپ ﷺ کو بتایا۔ واللّٰہ أعلم۔ تیسرا احتمال یہ ہے کہ یہ اخیر کے بعض مرات میں ہو۔ واللّٰہ أعلم۔ حافظ بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ جو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے نقل فرمایا ہے تو یہ وہی ہے جو پہلے پہل جنوں نے رسول اللہ ﷺ کی قراءت سنی اور آپ ﷺ کا حال جانا، اس وقت نہ آپ ﷺ نے ان پر پڑھا اور نہ ان کو دیکھا، پھر اس کے بعد جنوں کا داعی آپ ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے ان پر قرآن پڑھا اور ان کو اللہ عزوجل کی طرف دعوت دی، جیسا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کو روایت کیا ہے۔[2]

اس روایت کا ذکر جو اُن سے اس بارے میں آئی:

1 امام احمد رحمہ اللہ نے علقمہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے عرض کی: آیا جنوں کی رات میں تم میں سے کوئی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گیا تھا؟ تو فرمایا کہ ہم میں سے کوئی بھی آپ ﷺ کے ہمراہ نہیں گیا تھا، لیکن مکے میں ہم نے آپ ﷺ کو ایک رات گم پایا تو ہم نے کہا: ''أُغْتِيلَ؟ اُسْتُطِيرَ؟ مَا فَعَلَ؟'' یعنی آپ خفیہ قتل کیے گئے، بسرعت آپ کو لے گئے، گویا پری اٹھالے گئی، آپ ﷺ کا کیا حال ہوا؟ کہا: پھر ہم نے بہت ہی بُری رات بسر کی جو کسی قوم نے بسر کی ہو، یعنی ہمارے لیے رات بہت لمبی ہوگئی۔ ''فَلَمَّا كَانَ فِي وَجْهِ الصُّبْحِ أَوْ قَالَ فِي السَّحَرِ إِذَا نَحْنُ بِهِ يَجِيْءُ مِنْ قِبَلِ حِرَاء'' یعنی پھر جب رات اخیر ہوئی اور چہرۂ صبح نمودار ہوا یا کہا: سحر کا وقت ہوا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہم آپ ﷺ کے ساتھ موجود ہیں، آپ ﷺ کوہِ حراء کی جانب سے تشریف لا رہے ہیں تو ہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! پھر آپ سے اپنی کیفیت بیان کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: قصہ دراصل یہ ہے کہ جنوں کا ایک قاصد میرے پاس آیا مجھے بلانے کے لیے تو میں اُن کے پاس چلا گیا اور ان پر پڑھا، پھر آپ ﷺ چلے اور ہم کو ان کے نشان اور ان کی آگوں کے نشان دکھائے۔ داود راوی نے کہا ہے کہ شعبی رحمہ اللہ نے کہا: ''سَأَلُوهُ الزَّادَ'' یعنی جنوں نے آپ ﷺ سے توشے کا سوال کیا۔ عامر، یعنی شعبی رحمہ اللہ نے کہا کہ آپ ﷺ سے مکے میں سوال کیا اور وہ جزیرے کے جنوں میں سے تھے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٤٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٥٠)
[2] دلائل النبوة للبيهقي (٢/ ٢٢٧)

تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر ہڈی جس پر اللہ کا نام ذکر کیا گیا «يَقَعُ فِيْ أَيْدِيْكُمْ أَوْفَرَ مَا يَكُوْنُ لَحْمًا» یعنی وہ تمھارے ہاتھوں میں اس حال میں پڑے گی کہ اس کا گوشت بہت وافر اور کثیر ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خوب پُرگوشت ہو کر تم کو ملے گی (یعنی کھانے کے بعد جو گوشت ہڈی پر باقی رہ جاتا ہے، اس سے وہ خوب پُرگوشت ہو جائے گی، ظاہر تر یہی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر خوب گوشت پیدا کر دے گا۔ اس کی بحث پوری تفصیل کے ساتھ "مجمع البحار" میں ہے)۔ اور ہر مینگنی یا روثہ ("روث رجيع ذوات الحافر" کو کہتے ہیں، یعنی پس افگندہ سم والوں کا اور روثہ اخص ہے، تو روث لید ہوئی۔[1] كذا في مجمع البحار. صراح میں کہا ہے: روثہ سرقین) تمھارے جانوروں کا چارہ ہے۔ پس استنجا مت کرو ان دونوں سے، بے شک وہ تمھارے جن بھائیوں کا زاد ہے۔[2] (وهكذا رواه مسلم في صحيحه عن علي بن حجر عن إسماعيل بن علية به نحوه)

2 نیز امام مسلم رحمہ اللہ نے عامر، یعنی شعبی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے علقمہ سے پوچھا کہ کیا سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنوں کی رات میں موجود تھے؟ کہا: تو علقمہ نے کہا کہ میں نے عبداللہ بن مسعود سے پوچھا کہ کیا تم میں سے کوئی جنوں سے ملاقات کی رات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا؟ فرمایا: نہیں، لیکن ایک رات ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے کہ ہم نے آپ ﷺ کو گم پایا تو ہم نے آپ ﷺ کو وادیوں اور پہاڑوں کے دروں میں ڈھونڈا۔ فَقِيْلَ: اُسْتُطِيْرَ؟ أُغْتِيْلَ؟ قَالَ: فَبِتْنَا بِشَرِّ لَيْلَةٍ بَاتَ بِهَا قَوْمٌ، فَلَمَّا أَصْبَحْنَا إِذَا هُوَ جَاءَ مِنْ قِبَلِ حِرَاء، قَالَ: فَقُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَدْنَاكَ فَطَلَبْنَاكَ فَلَمْ نَجِدْكَ فَبِتْنَا بِشَرِّ لَيْلَةٍ بَاتَ بِهَا قَوْمٌ فَقَالَ ﷺ: «أَتَانِيْ دَاعِيْ الْجِنِّ فَذَهَبْتُ مَعَهُمْ فَقَرَأْتُ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنَ» قَالَ: فَانْطَلَقَ بِنَا فَأَرَانَا آثَارَهُمْ وَآثَارَ نِيْرَانِهِمْ وَسَأَلُوْهُ الزَّادَ، فَقَالَ ﷺ: «كُلُّ عَظْمٍ ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ يَقَعُ فِيْ أَيْدِيْكُمْ أَوْفَرَ مَا يَكُوْنُ لَحْمًا وَكُلُّ بَعْرَةٍ أَوْ رَوْثَةٍ عِلَفٌ لِدَوَابِّكُمْ» قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «فَلَا تَسْتَنْجُوْا بِهِمَا فَإِنَّهُمَا طَعَامُ إِخْوَانِكُمْ»۔[3] اس کا ترجمہ پہلے کی طرح ہے۔

3 طریقِ دیگر: امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عبیداللہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے سنا، رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ میں نے آج کی رات جنوں کے درمیان حجون میں بسر کی (حجون بہ فتح حائے مہملہ مکہ معظمہ میں ایک جگہ کا نام ہے) اور میں ان پر پڑھتا تھا۔[4]

4 طریقِ دیگر: اس میں یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جنوں سے ملاقات کی رات میں آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابو عثمان بن شبہ خزاعی سے روایت کیا ہے، یہ شخص اہلِ شام میں سے تھا، کہا کہ

---

(1) مجمع بحار الأنوار (٢/٣٨٦) (2) صحيح مسلم (٤٥٠) مسند أحمد (١/٤٣٦) (3) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٥٠)

(4) تفسير الطبري (٢٢/١٣٨) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عبیداللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکے میں تھے کہ تم میں سے کوئی اگر آج کی رات جنوں کے امر میں حاضر ہونا پسند کرے تو چاہیے کہ آئے تو اُن میں سے میرے سوا کوئی حاضر نہ ہوا، پھر ہم چلے، یہاں تک کہ جب ہم مکہ کی بلند جگہ پر پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے اپنے پاؤں سے ایک لکیر کھینچی، پھر مجھے حکم دیا کہ میں اس میں بیٹھ جاؤں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن شریف کی تلاوت شروع کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اسودۂ کثیرہ نے ڈھانک لیا، یعنی بہت سے اشخاص یا بہت سی جماعتوں نے؛ وہ میرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان میں حائل ہو گئے، یہاں تک کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز نہیں سنتا تھا، پھر وہ بادل کے ٹکڑوں کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگے، یعنی جانے لگے، یہاں تک کہ ان میں سے ایک گروہ باقی رہ گیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کے ساتھ فارغ ہوئے، ”فَانْطَلَقَ فَتَبَرَّزَ“ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلے اور قضائے حاجت سے فارغ ہوئے، پھر میرے پاس آئے، پھر فرمایا: کیا کیا اس گروہ نے؟ میں نے عرض کی: وہ یہ ہیں اے اللہ کے رسول! پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہڈی اور روث عطا فرمایا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع کیا کہ کوئی لید یا ہڈی سے استنجا کرے۔[1] (ورواه ابن جرير عن محمد بن عبد الله بن الحكم عن أبي زرعة وهب بن راشد عن يونس بن يزيد الأيلي به ورواه البيهقي في الدلائل من حديث عبد الله بن صالح كاتب الليث عن يونس به وقد روى إسحاق بن راهويه عن جرير عن قابوس بن أبي ظبيان عن أبيه عن ابن مسعود رضي الله عنه فذكر نحوها تقدم و رواه الحافظ أبو نعيم من طريق موسى بن عبيدة عن سعيد بن الحارث عن أبي المعلىٰ عن ابن مسعود رضي الله عنه عنه فذكر نحوه أيضا)

5 طریقِ دیگر: امام ابونعیم رحمہ اللہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تابع بنایا اور ہم چلے یہاں تک کہ فلاں فلاں جگہ پر آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے ایک خط کھینچا، پھر فرمایا کہ اس قطعے کے درمیان رکے رہنا، اس سے باہر مت نکلنا۔ بے شک اگر تو اس سے نکلے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔[2] پھر لمبی حدیث ذکر کی، اس میں سخت غرابت ہے۔

6 طریقِ دیگر: ابن جریر نے عبداللہ بن عمرو بن غیلان ثقفی سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم ہم سے بیان کرو کہ کیا تم اس رات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے جس رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوں کے ایلچیان سے ملاقات کی؟ فرمایا: ہاں، عبداللہ نے کہا، پھر کیسے ہوا؟ تو انھوں نے ساری حدیث بیان کی اور یہ کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر ایک خط کھینچا اور فرمایا کہ اس قطعے سے باہر نہ نکلنا، پھر بیان کیا کہ ایک سیاہ غبار کی طرح کسی چیز نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈھانک لیا تو وہ گھبرائے، تین بار یہاں تک کہ جس وقت صبح کا وقت قریب ہوا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آئے اور فرمایا: کیا تو سو گیا تھا؟ میں نے کہا: واللہ! نہیں اور البتہ میں

---

(1) تفسير الطبري (۱۳۸/۲۲) دلائل النبوة (۲۳۰/۲)

(2) مسند أحمد (۳۹۹/۱) اس کی سند میں انقطاع ہے، عمرو بکالی کا سماع سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

نے کئی بار ارادہ کیا کہ لوگوں سے فریاد رسی چاہوں، یہاں تک کہ میں نے آپ کی آواز سنی، آپ اپنے عصا سے ان کو ڈانٹتے تھے، فرماتے تھے کہ بیٹھ جاؤ۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تو باہر نکلتا تو مجھے ڈر تھا کہ ان میں سے کوئی تجھے جھپٹ لے۔ پھر فرمایا: کیا تو کوئی شے دکھایا گیا؟ میں نے کہا: میں نے سیاہ مرد دیکھے جو سفید کپڑوں کے لنگوٹ چڑھائے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ نصیبین کے جن ہیں، انھوں نے مجھ سے متاع کا سوال کیا۔ متاع زاد ہے، چنانچہ میں نے ان کو ہر عظمِ حائل کا توشہ دیا (یعنی ہر ہڈی جو پرانی ہو کر متغیر ہو گئی) یا مینگنی یا لید کا۔ چنانچہ میں نے عرض کی: یہ ان کے کیا کام آئے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ نہ پائیں گے کسی ہڈی کو مگر اس پر اتنا گوشت پائیں گے جس دن وہ کھائی گئی تھی اور نہ لید کو پائیں گے مگر اس کے دانے ایسے ہوں گے جس دن وہ کھائی گئی، چنانچہ تم میں سے جب کوئی پاخانے سے نکلے تو کسی ہڈی یا مینگنی یا لید کے ساتھ استنجا نہ کرے۔ [1]

7 طریقِ دیگر: حافظ ابوبکر بیہقی رحمہ اللہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: مجھ کو رسول اللہ ﷺ نے تابع بنایا اور فرمایا کہ جنوں کا ایک گروہ ہے پندرہ اشخاص جو بھائیوں کے اور چچا کے بیٹے ہیں، وہ آج کی رات میرے پاس آئیں گے، میں اُن پر قرآن پڑھوں گا۔ پھر میں آپ ﷺ کے ساتھ چلا اس جگہ کی طرف جس کا آپ ﷺ نے ارادہ کیا۔ پھر آپ ﷺ نے میرے لیے ایک خط کھینچ دیا اور مجھے اس میں بٹھا دیا اور مجھ سے فرمایا تو اس جگہ سے مت نکلنا، چنانچہ میں نے اس میں رات بسر کی، یہاں تک کہ سحر ہوتے ہی رسول اللہ ﷺ میرے پاس آئے۔ آپ ﷺ کے ہاتھ میں عظمِ حائل، روثہ اور حممہ تھا (یعنی بوسیدہ ہڈی، روثہ یعنی لید اور حممہ یعنی کوئلہ اس کے ساتھ استنجا کرنے کو منع کیا، اس لیے کہ اس میں جنوں کا رزق ٹھہرایا، اس میں سے رزق حاصل ہونے کی کیفیت بیان نہیں کی۔ رزق کچھ کھانے ہی میں منحصر نہیں ہے، شاید وہ کسی اور طریقے سے نفع لیتے ہیں)۔ پھر فرمایا: جب تو پاخانے کی طرف جائے تو اُن چیزوں میں سے کسی چیز کے ساتھ استنجا مت کرنا۔ کہا: پھر جب میں صبح کو اٹھا تو میں نے کہا: البتہ میں جان لوں اس جگہ کو جہاں رسول اللہ ﷺ تھے۔ کہا: پھر میں گیا تو میں نے ساٹھ اُونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ دیکھی۔ [2]

8 طریقِ دیگر: امام بیہقی رحمہ اللہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ چلا جنوں کی رات یہاں تک کہ موضع حجون میں آئے تو میرے لیے ایک خط کھینچ دیا، پھر آپ ﷺ ان کی طرف آگے بڑھے تو انھوں نے آپ ﷺ پر ازدحام کیا، چنانچہ ان کے ایک سردار نے جس کو وردان کہتے تھے، کہا کہ میں ان کو تمھاری طرف سے کوچ کرا دوں گا، پھر اس نے کہا: ''إِنِّي لَنْ يُّجِيرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ أَحَدٌ'' [3]

---

1. تفسیر الطبري (۱۳۷/۲۲، ۱۳۸) اس کی سند میں ''عبداللہ ثقفی'' مجہول راوی ہے۔
2. دلائل النبوة (۲۳۱/۲) اس کی سند میں ''روح بن صلاح'' ضعیف راوی ہے۔
3. دلائل النبوة (۲۳۱/۲، ۲۳۲) اس کی سند میں انقطاع ہے ''ابوالجوزاء'' کا سماع سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

9 طریقِ دیگر: امام احمد رحمہ اللہ نے ان سے روایت کیا ہے کہ جب جنوں کی شب ہوئی تو آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: تیرے ساتھ پانی ہے؟ میں نے کہا: میرے ساتھ پانی نہیں ہے، لیکن میرے ساتھ ایک چھاگل ہے، اس میں نبیذ ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: «تَمْرَةٌ طَيِّبَةٌ وَمَاءٌ طَهُوْرٌ» یعنی کھجور پاک ہے اور پانی پاک ہے۔[1] (ورواه أبو داود والترمذي وابن ماجه من حديث ابن زيد به)

10 طریقِ دیگر: امام احمد رحمہ اللہ نے عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ وہ شبِ جنّ میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے عبداللہ! کیا تیرے ساتھ پانی ہے؟ عرض کی کہ میرے ساتھ چھاگل میں نبیذ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر ڈال، چنانچہ آپ ﷺ نے وضو کیا۔ پھر فرمایا: اے عبداللہ! «شَرَابٌ وَطَهُوْرٌ» یعنی پینے کی شے اور وضو کرنے کی شے ہے۔[2] (تفرد به أحمد من هذا الوجه وقد أورده الدارقطني من طريق آخر عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ به)

11 طریقِ دیگر: امام احمد رحمہ اللہ نے عن میناء عن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، کہا: میں شبِ ایلچیانِ جنّ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھا، پھر جب لوٹے تو لمبی سانس لی۔ چنانچہ میں نے عرض کی: آپ کا کیا حال ہے؟ فرمایا: مجھے میرے نفس کی موت کی خبر سنائی گئی اے ابن مسعود۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں میں نے مسند احمد میں اسی طرح اس کو مختصر کیا ہے۔[3] اور حافظ ابو نعیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "دلائل النبوة" میں بہ سندِ خود عن میناء عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس کو روایت کیا ہے، کہا: میں شبِ ایلچیانِ جن میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے سانس کھینچی تو میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ کو کیا ہوا؟ فرمایا: اے ابن مسعود! مجھے میرے نفس کی موت کی خبر سنائی گئی۔ میں نے عرض کی: آپ خلیفہ بنائیں۔ فرمایا: کس کو؟ میں نے کہا: ابوبکر رضی اللہ عنہ کو، کہا: پھر آپ ﷺ خاموش رہے۔ پھر گھڑی بھر چلے، پھر آپ ﷺ نے سانس کھینچی تو میں نے عرض کی: میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں! آپ کا کیا حال ہے اے اللہ کے رسول؟ فرمایا: مجھے میرے نفس کی موت کی خبر سنائی گئی اے ابن مسعود! میں نے کہا: آپ خلیفہ بنائیں، فرمایا: کس کو؟ میں نے عرض کی: عمر رضی اللہ عنہ کو تو آپ ﷺ خاموش رہے۔ پھر گھڑی بھر چلے پھر سانس کھینچی تو میں نے کہا: آپ کا کیا حال ہے؟ فرمایا: مجھے میرے نفس کی موت کی خبر سنائی گئی۔ میں نے کہا: آپ خلیفہ بنائیں، فرمایا: کس کو؟ میں نے کہا: علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: خبردار! قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! البتہ اگر وہ اطاعت کریں اس کی تو البتہ

---

[1] مسند أحمد (۱/۴۴۹) سنن أبي داود، رقم الحديث (۸۴) سنن الترمذي، رقم الحديث (۸۸) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳۸۴) اس کی سند میں ''ابو زید'' مجہول راوی ہے۔

[2] مسند أحمد (۳۹۸) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔

[3] مسند أحمد (۱/۴۴۹) تفسير ابن كثير (۴/۲۰۹) اس کی سند میں ''ضیاء بن ابی میناء'' سخت ضعیف راوی ہے۔

داخل ہوں جنت میں ''أَجْمَعِيْنَ أَكْتَعِيْنَ''[1] یعنی سب کے سب۔ یہ حدیث نہایت درجہ غریب ہے اور اس کے لائق ہے کہ محفوظ نہ ہو اور برتقدیر اس کی صحت کے پس ظاہر یہ ہے کہ یہ قصہ اس کے بعد کا ہے کہ جن مدینے میں آپ ﷺ کی طرف آئے، اس بیان کی بنا پر جس کو ہم ۔إن شاء الله تعالىٰ۔ آیندہ بیان کریں گے، اس لیے کہ یہ قصہ اس وقت آخر میں ہوا ہے جبکہ مکہ فتح ہو گیا اور آدمی اور جن اللہ کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہوئے۔ سورت ﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ﴾ نازل ہوئی۔ یہ وہی سورت ہے جس میں آپ کے نفسِ کریمہ کی موت کی خبر دی گئی، چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس پر نص فرمائی ہے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر ان کی موافقت کی ہے۔[2] (وقد ورد في ذلك حديث سنورده إن شاء الله تعالىٰ عند تفسيرها والله أعلم و قد رواه أبو نعيم أيضا عن الطبراني بسنده عن ابن مسعود رضي الله عنه فذكره و ذكر فيه قصة الاستخلاف و هذا إسناد غريب و سياق عجيب.

12 طریقِ دیگر: امام احمد رحمہ اللہ نے عن ابی رافع عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے: ''أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ خَطَّ حَوْلَهُ فَكَانَ أَحَدُهُمْ مِثْلَ سَوَادِ النَّخْلِ (یعنی مثل پرہ زنبور) وَقَالَ: لَا تَبْرَحْ مَكَانَكَ فَأَقْرَئَهُمْ كِتَابَ اللّٰهِ فَلَمَّا رَأَى الْمُرْعَى قَالَ: كَأَنَّهُمْ هٰؤُلَاءِ وَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ أَمَعَكَ مَاءٌ؟ قُلْتُ: لَا، قَالَ: أَمَعَكَ نَبِيْذٌ قُلْتُ: نَعَمْ، فَتَوَضَّأَ بِهِ''[3]

13 طریقِ دیگر مرسل: امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عکرمہ سے ﴿ وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا... الآية ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے، کہا: وہ بارہ ہزار تھے، جزیرۂ موصل سے آئے تھے، چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تو میرا انتظار کرنا، یہاں تک کہ میں تیرے پاس آؤں اور ان پر ایک خط کھینچ دیا اور فرمایا کہ یہاں سے مت ٹلنا، یہاں تک کہ میں تیرے پاس آؤں، پھر سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان سے ڈرے اور قریب تھا کہ چلے جائیں، پھر آپ ﷺ کا فرمانا یاد کیا تو وہاں سے نہ ٹلے، چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا: اگر تو جاتا تو قیامت تک ہم نہ ملتے۔[4]

14 طریقِ دیگر نیز مرسل: امام سعید بن ابی عروبہ رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے ﴿ وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا... الآية ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ آپ ﷺ کی طرف پھیر لائے گئے تھے نینویٰ سے اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے واقعی امر کیا گیا ہے کہ میں جنوں پر پڑھوں، چنانچہ تم میں سے کون میرے ساتھ چلتا ہے؟ سب نے سر نیچا کر لیا۔ آپ ﷺ نے پھر ان سے ساتھ چلنے کی درخواست کی تو سب نے سر نیچا کر لیا، پھر تیسری بار ساتھ چلنے کی درخواست کی تو ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول! ''إِنَّ ذَاكَ لَذُوْ نُدْبَةٍ''

---

[1] المعجم الكبير (٦٧/١٠) اس کی سند میں ''ضیاء بن ابی ہیناء'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[2] صحيح البخاري (٣٤٢٨) [3] مسند أحمد (٤٥٥/١) اس کی سند میں ''علی بن زید بن جدعان'' ضعیف راوی ہے۔

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٩٦/١٠) یہ روایت مرسل ہے، نیز سند میں ''حفص بن عمر عدنی'' ضعیف راوی ہے۔

(شاید یہ معنی ہوں کہ یہ کام ندبہ والے کا ہے، یعنی جو کوئی جائے گا وہ زندہ واپس نہیں آئے گا اور اس کے گھر والے اسے روئیں گے۔ واللّٰہ أعلم)۔ پھر سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اخو ہذیل (یعنی قبیلۂ ہذیل کے ایک شخص ہیں) آپ ﷺ کے ساتھ گئے، کہا: پھر نبی اکرم ﷺ ایک پہاڑی درے میں داخل ہوئے، اس کو شعب الحجون کہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے اپنے اوپر اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پر ایک خط کھینچا، تاکہ اس سے ان کو مضبوط کریں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: پھر میں ہول کھانے لگا اور میں ان کو دیکھتا تھا کہ گدوں کی طرح اپنے پروں پر چل رہے ہیں اور میں نے ایک سخت شوروغل سنا، یہاں تک کہ مجھے نبی کریم ﷺ کے بارے میں خوف ہوا، پھر آپ ﷺ نے قرآن پڑھا، چنانچہ جب آپ ﷺ لوٹے تو میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! وہ شور کیا تھا جو میں نے سنا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ ایک مقتول کے بارے میں جھگڑتے تھے، چنانچہ اُن میں حق کے ساتھ فیصلہ کیا گیا۔[1] (رواہ ابن جریر و ابن أبي حاتم)

چنانچہ یہ سارے طریق اس بات پر دال ہیں کہ نبی اکرم ﷺ قصداً جنوں کی طرف گئے اور ان پر قرآن شریف پڑھا اور ان کو اللہ عزوجل کی طرف بلایا اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی زبان پر اُن کے لیے وہ شے مشروع فرمائی جس کی طرف وہ اس وقت محتاج تھے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ پہلی بار انھوں نے آپ ﷺ کو قرآن پڑھتے سنا، آپ ﷺ کو ان کی خبر نہ ہوئی، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے۔ پھر اس کے بعد آپ ﷺ کی طرف ایلچی ہو کر آئے، جیسا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ لیکن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس حالت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہ تھے جس میں آپ ﷺ نے جنوں سے باتیں کیں اور ان کو دعوت دی۔ وہ جو تھے وہ آپ ﷺ سے دور تھے اور ان کے سوا آپ ﷺ کے ساتھ کوئی نہیں نکلا اور اس کے باوجود جنوں سے خطاب کی حالت میں وہ حاضر نہ ہوئے۔ یہ طریق تو بیہقی رحمہ اللہ کا ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ آپ ﷺ پہلی بار جنوں کی طرف نکلے اور آپ ﷺ کے ساتھ نہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے نہ ان کے علاوہ کوئی اور جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ کے طریق سے پہلی روایت کا ظاہری سیاق ہے اور وہ روایت امام مسلم رحمہ اللہ کی ہے۔ پھر اس کے بعد کسی اور رات کو آپ ﷺ کے ساتھ نکلے ہوں۔ واللّٰہ أعلم۔ جیسا کہ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ﴿قُلْ اُوْحِيَ﴾ کی تفسیر میں امام ابن جریج رحمہ اللہ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبدالعزیز بن عمر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو جن موضعِ نخلہ میں آپ ﷺ سے ملے، وہ نینویٰ کے جن تھے اور جو جن مکے میں آپ ﷺ سے ملے وہ نصیبین کے جن تھے۔[2] امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کی تاویل کی ہے باوجود اس کے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: "فَبِتْنَا بِشَرِّ لَيْلَةٍ بَاتَ بِهَا قَوْمٌ" کہا کہ اس کا قائل عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی اور ہے ان لوگوں میں سے جن کو آپ ﷺ کے جنوں کی طرف نکلنے کا علم نہیں ہوا۔[3] یہ ایک بعید احتمال ہے۔ واللّٰہ أعلم۔

---

[1] تفسیر الطبري (۱۳۶/۲۲) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۲۹۶/۱۰) [3] دلائل النبوۃ (۲۳۰/۲، ۲۳۱)

حافظ ابوبکر بیہقی رحمہ اللہ نے سعید بن عمرو سے روایت کیا ہے، کہا کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے وضو اور حاجت کے لیے چھاگل لے کر آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے جایا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے آپ ﷺ کو پالیا تو فرمایا: یہ کون ہے؟ عرض کی کہ میں ہوں ابوہریرہ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میرے پاس کچھ پتھر لے کر آ میں ان سے استنجا کروں اور میرے پاس ہڈی اور لید لے کر نہ آنا۔ تو میں کئی پتھر اپنے کپڑے میں ڈال کر آپ کے پاس لایا اور ان کو آپ ﷺ کے پہلو کی طرف رکھ دیا یہاں تک کہ جب آپ ﷺ فارغ ہوئے اور کھڑے ہو گئے تو میں آپ ﷺ کے پیچھے ہولیا۔ پھر میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہڈی اور لید کا کیا حال ہے؟ فرمایا کہ میرے پاس نصیبین کے جنوں کے ایلچی آئے اور مجھ سے زاد کا سوال کیا، چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے دعا کی کہ وہ نہ گزریں کسی لید پر اور نہ کسی ہڈی پر، مگر اس کا طعام پائیں۔[1] (أخرجه البخاري في صحيحه عن موسى بن إسماعيل عن عمرو بن يحيىٰ بإسناده قريبا منه) چنانچہ یہ ماتقدم کے ساتھ اس پر دال ہے کہ وہ آپ ﷺ کے پاس اس کے بعد آئے اور ہم عن قریب وہ بات ذکر کریں گے جو اس کی تکرار پر دال ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جو مروی ہو چکا ہے اس کے سوا اور جید وجہ سے مروی ہے۔ چنانچہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ﴿ وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا... الآیة ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ وہ اہلِ نصیبین میں سے سات نفر تھے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو ان کی قوم کی طرف پیامبر ٹھہرایا۔[2] چنانچہ یہ اس پر دال ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے دونوں قصے روایت کیے ہیں۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن ابن جریج عن مجاہد روایت کیا ہے کہ وہ اہلِ نصیبین کے سات نفر تھے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے تین کو اہلِ حران سے اور چار کو اہلِ نصیبین سے قرار دیا اور ان کے نام یہ تھے: حیی، حسی، مسی، شاصر، ناصر اردوابیان، احقم۔[3]

امام ابوحمزہ ثمالی نے ذکر کیا ہے کہ جنوں کے اس قبیلے کو بنوشیصبان کہتے تھے، یہ گنتی میں سب جنوں سے بڑھ کر تھے اور نسب میں سب سے زیادہ شریف تھے اور عام جنودِ ابلیس تھے۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے عن عاصم عن زر عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ وہ نو تھے، ایک ان کا زوبعہ ہے، وہ اصلِ نخلہ سے آپ ﷺ کے پاس آئے تھے اور ان سے پہلے گزر چکا ہے کہ پندرہ تھے (یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اصل میں "تقدم عنهم" ہے، لیکن "عَنْهُ" صحیح معلوم ہوتا ہے۔ واللہ أعلم)۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ساٹھ سواریوں پر تھے اور ان سے گزر چکا ہے کہ ان کے سردار کا نام وردان تھا۔ کسی کے کہا ہے کہ تین سو تھے اور امام عکرمہ رحمہ اللہ سے گزر چکا ہے کہ بارہ ہزار تھے۔[4]

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٤٧) دلائل النبوة (٢/٢٣٣) (2) تفسير الطبري (٢٢/١٣٥)

(3) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٩٧) (4) تفسير ابن كثير (٤/٢١١)

شاید یہ اختلاف اس پر دلیل ہو کہ وہ آپ ﷺ کے پاس بار بار آئے۔ جو امور تکرار پر دال ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا کہ میں نے عمر رضی اللہ عنہ کو کبھی کسی شے کے لیے یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ بے شک البتہ میں اس کو ایسے گمان کرتا ہوں، مگر وہ ویسے ہی ہوتی، جیسے وہ گمان کرتے۔ اس اثنا میں کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ان کے پاس سے ایک خوبصورت شخص گزرا، فرمایا: البتہ واقعی میرا ظن خطا کر گیا، یا تو یہ شخص اپنے دین پر ہے جاہلیت میں، یا البتہ یہ مقرر اُن کا کاہن تھا۔ اس شخص کو میرے پاس لاؤ۔ پھر وہ ان کے لیے بلایا گیا تو اس سے یہ بات کہی تو اس نے کہا ہے کہ میں نے آج کے دن کی طرح نہیں دیکھا کہ کسی مسلمان مرد کو اس کا سامنا ہوا ہو۔ (یعنی جیسا یہ دن مجھے پیش آیا کسی مسلمان کو کبھی پیش نہیں آیا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ بات اُسے بُری لگی اس کو انوکھا سمجھا)۔ فرمایا: بے شک میں تجھے قسم دیتا ہو کہ تو مجھے خبر دے۔ کہا میں جاہلیت میں ان کا کاہن تھا، فرمایا: پھر کیا زیادہ تعجب کی بات ہے جس کو تیری جنیہ تیرے پاس لائی، کہا: اس اثنا میں کہ ایک دن میں بازار میں تھا کہ وہ میرے پاس اس حال میں آئے کہ اس کے اندر خوف اور گھبراہٹ پہچان رہا ہوں، پھر اس نے کہا:

أَلَمْ تَرَ الْجِنَّ وَإِبْلَاسَهَا ... وَيَأْسَهَا مِنْ بَعْدِ إِنْكَاسِهَا
وَلُحُوقِهَا بِالقلاص وَأَحْلَاسِهَا

(کیا نہیں دیکھا تو نے جنوں کو اور ان کے تجرد و دہشت کو اور اُن کے ناامید ہونے کو، ان کے اپنے کام سے منقلب ہونے کے بعد آسمان کی خبریں سننے سے اور ان کے جوان اُونٹنیوں کے ساتھ ملنے کو اور ان کے ٹاٹوں کے ساتھ ملنے کو، یعنی وہ اسلام کی کراہت سے متفرق ہوں گے اور بھاگیں گے۔

مجمع البحار میں "بَعْدَ أيناسها" ہے، یعنی ان کے ناامیدی کو آسمان کی خبر سننے سے بعد اس کے کہ اس کے مالوف ہو رہے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ قلوص سے مراد اہلِ قلوص ہیں، یہ کنایہ ہے عرب سے۔[1]) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس نے سچ کہا اس اثناء میں کہ میں ان کے معبودوں کے پاس سوتا تھا کہ ایک شخص ایک بچھڑا لایا، پھر اس نے اس کو ذبح کیا، پھر اس سے ایک چلانے والا چلایا، اس سے زیادہ سخت آواز سے چلانے والے کو میں نے نہیں سنا، وہ یوں کہہ رہا ہے: "يَا جَلِيحُ أَمْرٌ نَجِيحٌ رَجُلٌ فَصِيحٌ يَقُولُ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ" ("جلیح" ایک شخص کا نام ہے، اس کو پکارا: اے جلیح! ایک امر سریع ہے یا ظفر مند ہے، ایک خوش بیان مرد کہتا ہے کہ کوئی معبود نہیں مگر اللہ)۔ فرمایا: پھر قوم اُٹھ کھڑی ہوئی تو میں نے کہا: میں نہ ٹلوں گا یہاں تک کہ جان لوں اس شے کو جو اس سے پرے ہو گی، پھر اس نے ندا کی: "يَا جَلِيحُ أَمْرٌ نَجِيحٌ رَجُلٌ فَصِيحٌ يَقُولُ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ" چنانچہ میں کھڑا ہوا، پھر ہم نہ ٹھہرے کہ کہا گیا: یہ نبی ہے، یعنی یہ قصہ واقع ہوا، پھر بعد میں مشہور ہو گیا کہ نبی اکرم ﷺ مبعوث ہوئے۔[2] (هذا سياق البخاري وقد رواه البيهقي من حديث ابن وهب مثله)

---

[1] مجمع بحار الأنوار (٢١٢/١) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٥٣)

پھر کہا: اس روایت کا ظاہر یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ خود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس چلانے والے کو سنا کہ وہ اس بچھڑے سے چلاتا ہے جو ذبح کیا گیا اور اسی طرح یہ بات سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں صریح ہے۔ اور باقی روایتیں اس پر دال ہیں کہ کاہن نے اسے اس کی خبر دی اپنے دیکھنے اور سننے کی[1] ۔واللّٰہ أعلم۔ یہ بات جو امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہی، متجہ یہی ہے اور یہ شخص سواد بن قارب ہے۔ میں نے اس کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی سیرت میں پورے طور پر ذکر کیا ہے۔ جو کوئی اسے دیکھنا چاہے اسے چاہیے کہ وہاں سے اخذ کرے۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.

امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حدیثِ سواد بن قارب اس کے مشابہ ہے کہ یہ وہی کاہن ہو جس کا نام حدیثِ صحیح میں مذکور نہیں ہوا۔ پھر اس حدیث کو بہ سندِ خود سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: اس اثنا میں کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ لوگوں کو منبر رسول پر خطبہ سنا رہے تھے کہ ایک دم فرمایا: لوگو! کیا تم میں سواد بن قارب ہے؟ تو اس برس کسی نے ان کو جواب نہ دیا، پھر آیندہ سال جب آیا تو فرمایا: لوگو! کیا تم میں سواد بن قارب ہے؟ سیدنا براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے عرض کی: اے امیر المومنین! سواد بن قارب کیا ہے؟ راوی نے کہا: پھر عمر رضی اللہ عنہ نے براء رضی اللہ عنہ سے کہا کہ سواد بن قارب کی ابتدائے اسلام ایک عجیب شے ہے۔

سیدنا براء رضی اللہ عنہ نے کہا: پھر اس اثنا میں کہ ہم اسی طرح تھے کہ اچانک سواد بن قارب ظاہر ہوا، کہا: تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سواد! تو ہم سے اپنے ابتدائے اسلام کا قصہ بیان کر کہ کیسے ہوا؟ سواد رضی اللہ عنہ نے کہا: بے شک میں ہند میں نزول کرنے والا تھا اور جنوں میں سے میرا ایک تابع تھا، کہا کہ اس دوران میں کہ ایک رات میں سو رہا تھا کہ اچانک وہ خواب مین میرے پاس آیا اور کہا: کھڑا ہو "فَافْهَمْ وَاعْقِلْ" یعنی پھر سمجھ اور بوجھ اگر تو عقل رکھتا ہے، واقعی ایک رسول لوی بن غالب سے معبوث ہو گیا، پھر وہ یہ شعر پڑھنے لگا:

عَجِبْتُ لِلْجِنِّ وَتَحْسَاسِهَا　　　وَشَدِّهَا الْعِيسَ بِأَحْلَاسِهَا

یعنی میں نے جنوں کے لیے تعجب کیا اور ان کی جستجو کی اور ان کے اونٹوں کو ان کے ٹاٹوں سے باندھنے کی جستجو کی۔

تَهْوِيْ إِلَى مَكَّةَ تَبْغِيْ الْهُدَى　　　مَا خَيْرُ الْجِنَّ كَأَنْحَاسِهَا

یعنی مکے کی طرف جھکتے ہیں ہدایت کو ڈھونڈتے ہوئے، نہیں ہیں بہترین جن مثل ان کے منحوسوں کے۔

فَانْهَضْ إِلَى الصَّفْوَةِ مِنْ هَاشِمٍ　　　وَاسْمُ بِعَيْنَيْكَ إِلَى رَأْسِهَا

یعنی پس تو کوچ کر روانہ ہو برگزیدہ و چیدہ شخص کی طرف قبیلۂ بنی ہاشم سے اور اپنی آنکھوں کو اس کے سردار کی طرف اونچا کر۔

---

[1] دلائل النبوة (٢/٢٤٣_٢٤٥)

کہا: پھر اس نے مجھے بیدار کر دیا تو مجھے گھبرا دیا اور کہا: او سواد بن قارب! بے شک اللہ عزوجل نے ایک نبی مبعوث کیا ہے پس تو اس کی طرف روانہ ہو، راہ یاب ہوگا اور ہدایت پائے گا۔ پھر جب دوسری رات ہوئی تو میرے پاس آیا اور مجھے بیدار کیا اور یہ شعر پڑھنے لگا:

عَجِبْتُ لِلْجِنِّ وَتَطْلَابِهَا وَشَدِّهَا الْعِيسَ بِأَقْتَابِهَا

("اقتاب" جمع "قتب" بہ معنی پالان)

تَهْوِيْ إِلَى مَكَّةَ تَبْغِيْ الْهُدَى وَلَيْسَ قدماها كَأَذْنَابِهَا

فَانْهَضْ إِلَى الصَّفْوَةِ مِنْ هَاشِمٍ وَاسْمُ بِعَيْنَيْكَ إِلَىٰ قَابِهَا

("قدماها" شاید اس سے یہ مراد ہو کہ ان کے پیشوا ان کے توابع کے مثل نہیں ہیں۔ والله أعلم "قابها" بہ معنی مقدار ہے اور قاب بہ معنی صدر بھی آیا ہے، یعنی تو اپنی آنکھ کو بلند کر بنی ہاشم صدر اور سردار کی طرف۔ والله أعلم) پھر جب تیسری رات ہوئی تو میرے پاس آیا، پھر مجھے جگایا اور کہا:

عَجِبْتُ لِلْجِنِّ وَتَخْبَارِهَا وَشَدِّهَا الْعِيسَ بِأَكْوَارِهَا

تَهْوِيْ إِلَى مَكَّةَ تَبْغِيْ الْهُدَى لَيْسَ ذُوو الشَّرِّ كَأَخْيَارِهَا

("أكوار" جمع "كور"۔ "كور" بالضم "الرحل بأداته" یعنی کجاوہ و پالان مع اپنے ساز و سامان کے) یعنی شر والے ان کے اخیار کی طرح نہیں ہیں۔

فَانْهَضْ إِلَى الصَّفْوَةِ مِنْ هَاشِمٍ مَا مُؤْمِنُوا الْجِنِّ كَكُفَّارِهَا

یعنی جنوں کے مومنین اُن کے کفار کی طرح نہیں ہیں۔ راوی کہتا ہے: میں نے کہا: اس کو میں نے بار بار ایک رات کے بعد دوسری رات کو سنا تو میرے دل میں اسلام کی محبت اور رسول اللہ ﷺ کی محبت پیدا ہوئی، جیسا کہ اللہ نے چاہی۔ کہا: پھر میں اپنے پالان کی طرف چلا اور میں نے اپنی سواری پر کسا، پھر میں نے نہ کوئی تسمہ کھولا اور نہ دوسرا باندھا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو اس وقت وہ مدینے میں تھے، یعنی مکے میں تھے، (دیہات کی نسبت مکے کو مدینہ کہا۔ مدینہ مطلق شہر کو کہتے ہیں)۔ اور لوگ آپ پر ایال گھوڑے کی طرح تھے، یعنی مجتمع ہو رہے تھے اور جب آپ ﷺ نے مجھے دیکھا تو فرمایا: "مَرْحَبًا بِكَ يَا سَوَادَ بْنَ قَارِبٍ" یعنی ایک سواد بن مقارب تجھے خوش آمدید ہو۔ مقرر ہم نے جان لی وہ شے جو تجھے لائی ہے، کہا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! مقرر میں نے شعر کہے ہیں تو آپ مجھ سے ان کو لیجیے۔ آپ ﷺ نے کہا: اے سواد! کہہ: پھر میں نے کہا:

أَتَانِيْ رَئِيِّ بَعْدَ لَيْلٍ وَهَجْعَةٍ وَلَمْ يَكُ فِيْمَا قَدْ بَلَوْتُ بِكَاذِبِ

ثَلَاثَ لَيَالٍ قَوْلُهُ كُلَّ لَيْلَةٍ أَتَاكَ رَسُوْلٌ مِنْ لُؤَيِّ بْنِ غَالِبِ
فَشَمَّرْتُ عَنْ سَاقِي الْإِزَارَ وَوَسَّطَتْ بِيَ الذِّعْلِبُ الْوَجْنَاءُ بَيْنَ السَّبَاسِبِ
فَاشْهَدُ أَنَّ اللّٰهَ لَا شَيْءَ غَيْرَهُ وَأَنَّكَ مَأْمُوْنٌ عَلٰى كُلِّ غَائِبِ
وَإِنَّكَ أَدْنَى الْمُرْسَلِيْنَ شَفَاعَةً إِلَى اللّٰهِ يَا ابْنَ الْأَكْرَمِيْنَ الْأَطَايِبِ
فَمُرْنَا بِمَا يَأْتِيْكَ يَا خَيْرَ مُرْسَلٍ وَإِنْ كَانَ فِيْمَا جَاءَ شَيْبُ الذَّوَائِبِ
وَكُنْ لِيْ شَفِيْعًا يَوْمَ لَا ذُوْ شَفَاعَةٍ سِوَاكَ بِمُغْنٍ عَنْ سَوَادِ بْنِ قَارِبِ

("رئِيّ" بروزن "كمي"،فعیل یا فعول ہے، تابع جن کو کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ اپنے متبوع کو دکھائی دیتا ہے۔اس کے حرفِ راء کو ما بعد کی تبعیت میں کسرہ بھی دیتے ہیں)۔یعنی میرے پاس میرا تابع جن رات کے وقت سونے کے بعد آیا تین رات اور وہ اس بات میں جھوٹا نہیں تھا جس میں، مَیں نے آزمایا۔اس کا قول ہر رات یہی تھا کہ تیرے پاس لوئی بن غالب سے رسول آئے۔پس میں نے اپنی پنڈلی سے تہمد چڑھایا، یعنی مستعد اور آمادہ ہوا۔اور مجھ کو میری تیز اور بڑے بڑے گال والی اونٹنی جنگلوں کے بیچوں بیچ میں سے لائی۔

مطلب یہ ہے کہ ایسی قوی و تیز رفتار مادہ شتر پر سوار ہو کر جنگلوں میں سے سفر کرتا ہوا حاضر ہوا ہوں۔سو میں گواہی دیتا ہوں اس بات کی کہ بے شک اللہ کے سوا کوئی شے نہیں ہے اور اس بات کی کہ آپ ہر غائب شے پر امین بنائے گئے ہیں اور اس بات کی کہ آپ سب رسولوں سے بڑھ کر شفاعت میں اللہ کے قریب ہیں۔اے فرزندِ ارجمند لوگوں کے بزرگ و پاک کے پس اے بہترین پیغمبر! آپ مجھے اس شے کا امر فرمائیں جو آپ کے پاس آتی ہے، اگرچہ جو شے آئی ہے اس سے بال سفید ہوتے ہوں، یعنی اگرچہ ایسا سخت اور دشوار کام ہو، اس کی شدت سے آدمی بوڑھا ہو جائے تو بھی آپ ہم کو اس کا حکم دیں، ہم بسر و چشم اس حکم کی بجا آوری کریں گے اور آپ میرے لیے شفیع ہوں جس دن کہ آپ کے سوا کوئی شفاعت کرنے والا سوادؓ بن قارب کے کام نہ آئے گا۔

کہا: پھر نبی اکرم ﷺ ہنسے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کی کچلیاں ظاہر ہو گئیں اور مجھ سے فرمایا: "أَفْلَحْتَ يَا سَوَادُ" یعنی اے سواد! تو نے مراد پالی۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سواد رضی اللہ عنہ سے فرمایا: کیا اب تیرا تابع جن تیرے پاس آتا ہے؟ تو اس نے عرض کی کہ جب سے میں نے قرآن شریف پڑھا ہے، وہ میرے پاس نہیں آیا۔ "وَنِعْمَ الْعِوَضُ كِتَابُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ مِنَ الْجِنِّ" یعنی اللہ عزوجل کی کتاب جن کا بہتر عوض ہے۔[1] (ثم أسنده البيهقي من وجهين آخرين)

جو حدیثیں اس پر دال ہیں کہ مدینے کی طرف ہجرت کرنے کے بعد جن آپ ﷺ کے پاس آئے، ان میں سے وہ حدیث ہے جس کو حافظ ابو نعیم رحمہ اللہ نے کتاب "دلائل النبوة" میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا

① دلائل النبوة (٢/٢٤٩-٢٥١) اس کی سند میں ایک سے زیادہ راویوں کا ترجمہ نہیں ملا، البتہ صحیح بخاری کی روایت اس سے مستغنی کرتی ہے۔

ہے۔ عمرو بن غیلان ثقفی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، پھر میں نے اُن سے عرض کی کہ آپ نے یہ حدیث بیان کی تھی کہ جن کی شب میں آپ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے؟ کہا: ہاں۔ میں نے عرض کی: آپ مجھے بیان کریں کہ اس کا حال کس طرح تھا؟ چنانچہ فرمایا کہ اہلِ صفہ میں سے ہر ایک شخص کو ایک ایک شخص نے لے لیا تھا کہ اس کو شام کا کھانا کھلائے گا اور میں چھوڑا گیا۔ مجھے ان میں سے کسی نے نہیں لیا۔

پھر میرے پاس سے رسول اللہ ﷺ گزرے اور فرمایا: یہ کون ہے؟ میں نے عرض کی کہ میں ہوں ابن مسعود! تو فرمایا: تجھے کسی نے شام کو کھانا کھلانے کے لیے نہیں لیا؟ میں نے کہا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: چل شاید میں تیرے لیے کوئی شے پاؤں، پھر ہم چلے، یہاں تک کہ آپ ﷺ حجرۂ ام سلمہ رضی اللہ عنہا پر آئے اور مجھے کھڑا کر کے اپنے اہل کی طرف داخل ہوئے، پھر لونڈی نکلی اور کہا: اے ابن مسعود! رسول اللہ ﷺ نے تیرے لیے رات کا کھانا نہیں پایا لہٰذا تو اپنے بستر کی طرف لوٹ جا اور میں مسجد کی طرف لوٹ آیا۔ میں نے مسجد کی کنکریاں جمع کیں اور ان کا تکیہ بنایا اور اپنے کپڑے میں لپٹ گیا۔

پھر میں نہیں ٹھہرا مگر تھوڑی دیر کہ لونڈی آئی اور کہا: ''أَجِبْ رَسُوْلَ اللّٰهِ'' یعنی رسول اللہ ﷺ تجھے یاد فرماتے ہیں۔ چنانچہ میں اس کے پیچھے ہو لیا اور میں شام کے کھانے کی اُمید رکھتا تھا، یہاں تک کہ اپنے کھڑے رہنے کی جگہ پر پہنچا۔ رسول اللہ ﷺ نکلے اور آپ ﷺ کے دستِ مبارک میں کھجور کی ایک شاخ تھی تو آپ ﷺ نے اس کو میرے سینے پر آڑا رکھا، پھر فرمایا: کیا تو میرے ساتھ چلتا ہے جہاں میں چلوں؟ میں نے عرض کی: جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہے، پھر آپ ﷺ نے تین بار مجھ سے یہی بات کہی، میں ہر بار ماشاء اللہ کہتا تھا۔ پھر آپ ﷺ چلے اور میں آپ ﷺ کے ہمراہ چلا، یہاں تک کہ ہم بقیع الغرقد میں آئے تو آپ ﷺ نے اپنے عصا سے خط کھینچا اور فرمایا: اس میں بیٹھ جا اور یہاں سے ٹلنا نہیں جب تک میں تیرے پاس آؤں، پھر آپ ﷺ چلے، آپ ﷺ جاتے رہے اور میں کھجوروں کے درمیان میں آپ ﷺ کی طرف دیکھتا تھا، یہاں تک کہ جس وقت ایسی جگہ پر پہنچے جہاں سے مجھے نظر نہیں آتے تھے تو آپ ﷺ کی طرف سیاہ غبار اُٹھا۔

چنانچہ میں ڈرا اور اپنے جی میں کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے جا ملوں، اس لیے کہ مجھے خیال آیا کہ قبیلۂ ہوازن نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکر کیا تھا کہ آپ ﷺ کو قتل کر ڈالیں۔ میں نے سوچا کہ میں گھروں کی طرف دوڑوں اور لوگوں سے فریاد رسی چاہوں۔ پھر مجھے یاد آیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے یہ وصیت کی ہے کہ میں اپنی جگہ سے نہ ٹلوں جس میں ہوں، پھر میں نے آپ ﷺ کی آواز سنی کہ اپنی لکڑی سے ان کو ڈانٹ رہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ بیٹھو، پھر وہ بیٹھ گئے، یہاں تک کہ قریب تھا کہ صبح کا ستون شق ہو، یعنی صبح کاذب، پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور چل دیے۔ آپ ﷺ میرے پاس آئے اور فرمایا: تو میرے بعد سو گیا تھا؟ میں نے عرض کی: نہیں اور البتہ میں پہلے تو گھبرا

گیا، یہاں تک کہ میں نے خیال کیا کہ گھروں میں جا کر لوگوں سے استغاثہ کروں، یہاں تک کہ میں نے آپ کو سنا کہ آپ ان کو اپنے عصا سے ڈانٹتے تھے اور میں ان کو ہوازن کی طرح خیال کرتا تھا کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکر کیا ہے کہ ان کو مار ڈالیں۔

چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تو اس حلقے سے نکلتا تو میں تجھ سے بے خوف نہ ہوتا اس سے کہ ان میں سے بعض تجھے جھپٹ لیں۔ پھر کیا تو نے ان سے کوئی شے دیکھی؟ تو میں نے عرض کی کہ میں نے کالے مرد دیکھے سفید کپڑوں کے لنگوٹ چڑھائے ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ لوگ نصیبین کے جنوں کے ایلچی تھے جو میرے پاس آئے اور مجھ سے زاد و متاع کا سوال کیا تو میں نے ان کے برتنے کے لیے ہر متغیر ہڈی یا لید یا مینگنی دی۔

میں نے عرض کی: پھر یہ کیا ان کے کام آئے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک وہ نہ پائیں گے کسی ہڈی کو مگر اس پر وہ گوشت پائیں گے جو اس پر تھا جس دن وہ کھایا گیا تھا اور نہ پائیں گے لید کو مگر اس میں اس کے دانے ہوں گے جو اس میں تھے جس دن وہ کھائی گئی تھی۔ چنانچہ تم میں سے کوئی کسی ہڈی سے یا کسی مینگنی سے استنجا نہ کرے۔[1] یہ اسناد نہایت درجے کی غریب ہے، لیکن اس میں ایک مرد مبہم ہے جس کا نام نہیں لیا گیا (لفظ لیکن کا استعمال اس جگہ مناسب نہیں ہے۔ از مصحح سلمه الله تعالیٰ) والله تعالیٰ أعلم.

حافظ ابونعیم رحمہ اللہ نے زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینے کی مسجد میں ہم کو صبح کی نماز پڑھائی، پھر جب فارغ ہوئے تو فرمایا: تم میں سے آج کی رات میرے ساتھ ایلچیانِ جن کی طرف کون چلے گا؟ تو لوگ چپ رہے۔ آپ ﷺ نے اس کلمے کو تین بار فرمایا، پھر آپ ﷺ میرے پاس آئے اور میرا ہاتھ پکڑ لیا، چنانچہ میں آپ ﷺ کے ساتھ چلنے لگا، یہاں تک کہ مدینے کے سارے پہاڑ ہم سے رو کے گئے اور ہم ایک وسیع زمین میں پہنچے تو وہاں دیکھا کہ دراز قد کے مرد ہیں، گویا نیزے ہیں، اپنے پاؤں کے درمیان اپنے کپڑوں سے لنگوٹ چڑھائے ہوئے۔ پھر جب میں نے ان کو دیکھا تو مجھے سخت کپکپی آئی، یعنی میں خوب کانپنے لگا۔ پھر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث کی طرح بیان کیا۔[2] یہ حدیث غریب ہے۔ والله أعلم.

جنوں کے وفود کے متعلق جو امور ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جس کو حافظ ابونعیم نے ابراہیم سے روایت کیا ہے، کہا کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ کے اصحاب کا ایک گروہ حج کے ارادے سے نکلا، یہاں تک کہ جب راستے میں ایک جگہ پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سفید سانپ راستے پر پیچ کھا رہا ہے اور اس سے مشک کی خوشبو آ رہی ہے تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم چلے جاؤ، میں تو یہاں سے ٹلنے والا نہیں ہوں اس وقت تک جب تک کہ میں دیکھوں کہ یہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢١٣/٤، ٢١٤) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا۔

[2] المعجم الکبیر (١٢٥/١) اس کی سند میں ''قحافہ بن ربیعہ اور نمیر بن زید'' مجہول راوی ہیں۔

سانپ کیا کرتا ہے۔ کہا کہ پھر میں ٹھہرا تو وہ سانپ مر گیا تو میں نے ایک سفید کپڑا لیا اور اس کو اس میں لپیٹ لیا، پھر اس کو راستے سے ایک طرف کو لے گیا اور اس کو دفن کر دیا اور میں اپنے ساتھیوں کے پاس شام کے کھانے تک پہنچ گیا۔ قسم ہے اللہ کی! بے شک ہم بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک مغرب کی جانب سے چار عورتیں آئیں اور ان میں سے ایک نے کہا کہ تم میں سے کس نے عمرو کو دفن کیا؟ ہم نے کہا: کون عمرو؟ وہ بولی کہ تم میں سے کس نے سانپ کو دفن کیا؟ کہا: تو میں بولا کہ میں نے۔ اس نے کہا: خبردار رہو، واللہ! البتہ یقیناً تو نے ایک بڑے روزے رکھنے والے تہجد پڑھنے والے کو دفن کیا، وہ اس شے کے ساتھ حکم کرتا تھا جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے اور البتہ وہ واقعی تمھارے نبی پر ایمان لایا تھا اور اس نے ان کے معبوث ہونے سے چار سو سال پہلے ان کی صفت آسمان سے سنی تھی۔ اس شخص نے کہا: ہم نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی، پھر ہم نے اپنا حج ادا کیا، پھر میں مدینہ میں سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور اُن کو سانپ کے قصے کی خبر دی تو انھوں نے فرمایا: تو نے سچ کہا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، وہ فرماتے تھے: البتہ مقرر مجھ پر میرے معبوث ہونے سے چار سو سال پہلے مجھ پر ایمان لایا۔[1] یہ حدیث نہایت درجہ غریب ہے۔ واللّٰه أعلم.

حافظ ابو نعیم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے "عن أبي إسحاق عن الشعبي عن رجل من ثقيف بنحوه" روایت کیا ہے۔ اور عبداللہ بن احمد وظہرانی نے صفوان بن معطل سے روایت کیا ہے کہ یہ وہی شخص ہے کہ صحابہ میں سے اترا اور اس سانپ کو دفن کیا (یعنی اپنے اصحاب میں سے۔ واللّٰه أعلم)۔ اور انھوں نے کہا کہ یہ جن مرنے میں ان نو جنوں میں سے سب سے آخری ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے اور قرآن سنتے تھے۔[2]

حافظ ابو نعیم رحمہ اللہ نے معاذ بن عبداللہ بن معمر سے روایت کیا ہے کہ میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص آیا اور عرض کی: اے امیر المومنین! بے شک میں ایک بیابان میں تھا، پھر کہا کہ اس نے دو اژدہے دیکھے جو لڑے اور ایک نے دوسرے کو مار ڈالا، کہا: میں ان کی لڑائی کی جگہ میں گیا تو میں نے بہت سے مقتول سانپ پائے اور دیکھا کہ بعض سانپوں سے مشک کی خوشبو آ رہی تھی۔ تو میں ان کو سونگھنے لگا ایک ایک کر کے، یہاں تک کہ میں نے وہ خوشبو ایک زرد باریک سانپ میں سے نکلتی ہوئی پائی۔ میں نے اس کو اپنے عمامے سے لپیٹا اور اس کو دفن کر دیا۔ اس اثنا میں کہ میں چل رہا تھا کہ اچانک مجھے ایک پکارنے والے نے پکارا: اے اللہ کے بندے! البتہ واقعی تو ہدایت کیا گیا، یہ جنوں کے دو قبیلے ہیں: بنو شعیبان و بنو قیس۔ دونوں لڑے تو مقتولوں میں سے وہ ہیں جو تو نے دیکھے اور وہ شہید کیا گیا جس کو تو نے دفن کیا اور وہ ان میں سے تھا جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وحی سنی۔ پھر عثمان رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے فرمایا: اگر تو سچا ہے تو واقعی تو نے ایک عجیب بات دیکھی اور اگر تو جھوٹا ہے تو تیرا قول تجھی پر ہے۔[3]

---

[1] دلائل النبوة لأبي نعيم (٣٦٢/١) اس کی سند میں "حصین بن عمر" سخت ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر ابن کثیر (٢١٤/٤) [3] دلائل النبوة لأبي نعيم (٣٦١/١)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ﴾

''نفر'' سے مراد ایک گروہ ہے۔ ﴿ اَنْصِتُوْا ﴾ سے مراد ''اسْتَمِعُوْا'' ہے، یعنی قرآن کے سننے کے لیے کان لگاؤ، یہ ان کی طرف سے ادب ہے۔ حافظ بیہقی رحمہ اللہ نے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے سورۃ الرحمٰن پڑھی، یہاں تک کہ اس کو ختم کیا۔ پھر فرمایا کہ مجھے کیا ہے کہ میں تم کو خاموش دیکھتا ہوں۔ ''لَلْجِنُّ كَانُوْا أَحْسَنَ مِنْكُمْ رَدًّا'' یعنی تم سے تو جن رد کرنے میں (جواب دینے میں) بہتر تھے۔ میں نے ان پر یہ آیت جب بھی پڑھی: ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ تو انھوں نے کہا: ''وَلَا بِشَيْءٍ مِنْ آلَائِكَ أَوْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ''[1] (و رواه الترمذي في التفسير عن أبي مسلم عبد الرحمن بن واقد عن الوليد بن مسلم به قال: خرج رسول الله ﷺ على أصحابه فقرأ عليهم سورة الرحمن فذكره، ثم قال الترمذي: غريب لا نعرفه إلا من حديث الوليد عن زهير كذا قال وقد رواه البيهقي من حديث مروان بن محمد الطاطري عن زهير بن محمد به مثله).

قولہ عزوجل: ﴿ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴾ یہ معنی ''فَرَغَ'' ہے۔ کقولہ تعالیٰ ﴿ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ ﴾ [الجمعة: ۱۰] ''پھر جب نماز ہو چکے۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ ﴾ [حٰمٓ السجدة: ۱۲] ''پس سات آسمان بنا دیے۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ ﴾ [البقرة: ۲۰۰] پھر جب تم ارکانِ حج ادا کر چکو۔'' یعنی پھر جب فراغت کی گئی تو اپنی قوم کی طرف لوٹے اور اُن کو اس کے ساتھ ڈرایا جس کو رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴾ [التوبة: ۱۲۲] ''تاکہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور تاکہ یہ لوگ اپنی قوم کو جب کہ وہ ان کے پاس آئیں، ڈرائیں تاکہ وہ ڈر جائیں۔''

اس آیتِ کریمہ سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ جنوں میں ڈرانے والے ہیں اور اُن میں رسول نہیں ہیں، بلاشک اللہ پاک نے جنوں میں سے کوئی رسول مبعوث نہیں فرمایا، اس لیے کہ اللہ سبحانہ نے یوں ارشاد فرمایا: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ﴾ [یوسف: ۱۰۹] ''اور آپ سے پہلے ہم نے مرد ہی (رسول بنا کر) بھیجے، ان کی طرف ہم وحی کرتے تھے (اور) وہ بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے۔'' ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ﴾ [الفرقان: ۲۰] ''ہم نے آپ سے پہلے جتنے رسول بھیجے سب کے سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے ہیں۔'' اور حضرت خلیل جلیل علیہ السلام کی شان میں فرمایا ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ ﴾ [العنکبوت: ۲۷] ''اور ہم نے نبوت اور کتاب ان کی اولاد میں ہی کر دی۔'' چنانچہ ہر نبی جس کو اللہ پاک نے ابراہیم علیہ السلام کے بعد مبعوث فرمایا، وہ انھی کی ذریت و نسل سے ہے۔

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۲۹۱) دلائل النبوة للبيهقي (۲/۲۳۲) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۲۱۵۰)

اب رہی سورۃ الانعام کی یہ آیت: ﴿ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ ﴾ [الأنعام: ١٣٠] ''اے جنات اور انسانوں کی جماعت! کیا تمھارے پاس تم میں سے ہی پیغمبر نہیں آئے تھے۔'' مراد مجموع جنسین سے ہے، چنانچہ یہ دونوں میں سے ایک جنس پر صادق آتا ہے اور وہ جنس انس ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴾ [الرحمن: ٢٢] ''ان دونوں میں سے موتی اور مونگے برآمد ہوتے ہیں۔'' "أَيْ: مِنْ أَحَدِهِمَا"

پھر جنوں نے جو اپنی قوم کو جا کر ڈرایا تو اللہ پاک نے اس کی تفسیر فرمائی، ان کی طرف سے یہ خبر دی: ﴿ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ﴾ یعنی قوم سے جا کر کہا: اے ہماری قوم! ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد اتاری گئی ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر نہیں کیا، اس لیے کہ ان پر انجیل نازل کی گئی جس میں وعظ اور رقت کی باتیں ہیں اور حلال اور حرام کے احکام کم ہیں۔ وہ حقیقت میں ایسی ہے، جیسے: تورات کی تکمیل شریعت تو عمدہ کتاب تورات ہی ہے، اسی لیے جنوں نے ﴿ اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ﴾ کہا اور اسی طرح جب کہ نبی کریم ﷺ نے ورقہ بن نوفل کو جبریل علیہ السلام کے پہلی بار نازل ہونے کی خبر دی تو اس نے کہا: "بَخٍ بَخٍ هَذَا النَّامُوْسُ الَّذِيْ كَانَ يَأْتِيْ مُوْسَى يَا لَيْتَنِيْ أَكُوْنُ فِيْهَا جَذَعًا" یعنی واہ واہ! یہ تو وہی صاحبِ سر ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا کرتا تھا، کاش میں ان دنوں میں قوی ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ ورقہ نے بھی بہ وجہِ مذکور موسیٰ علیہ السلام ہی کا ذکر کیا۔

﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾ یعنی ایسی کتاب ہے کہ اپنے سے پہلے کی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو نبیوں پر نازل کی گئی ہیں۔ ﴿ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ﴾ یعنی اعتقاد و اخبار میں حق کی طرف راہ بتاتی ہے۔ ﴿ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ اور اعمال میں سیدھی راہ کی طرف، اس لیے کہ قرآن دو چیزوں پر مشتمل ہے: ایک خبر، دوسری طلب۔ اس کی خبر تو صدق ہے اور اس کی طلب عدل ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ﴾ [الأنعام: ١١٥] ''آپ کے رب کا کلام سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے۔'' نیز فرمایا ہے: ﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ ﴾ [التوبة: ٣٣] ''اسی نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے۔'' پس ہدی تو علمِ نافع ہے اور دینِ حق عملِ صالح ہے۔ اسی طرح جنوں نے کہا کہ وہ کتاب اعتقادات میں حق کی طرف راہ بتاتی ہے۔ اور عملیات میں طریقِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔

﴿ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ ﴾ یعنی اے ہماری قوم! اللہ کے بلانے والے کو جواب دو۔ اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو ثقلین یعنی جنوں اور انسانوں کی طرف بھیجا ہے، جبھی تو آپ نے ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا اور ان پر وہ سورت پڑھی جس میں فریقین کو خطاب ہے اور اُن کے لیے احکام، وعدے اور وعید ہیں۔ وہ سورت سورۃ الرحمن ہے اور اسی لیے یوں کہا: ﴿ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ ﴾.

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ ﴾ کسی نے کہا: حرف ﴿ مِنْ ﴾ اس جگہ زاید ہے، اس میں نظر ہے، اس لیے کہ اثبات میں ﴿ مِنْ ﴾ کی زیادتی بہت کم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تبعیض کے لیے ہے۔ ﴿ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ یعنی تمھارے کچھ گناہ بخشے گا اور تم کو دردناک عذاب سے بچائے گا۔ اس آیتِ کریمہ سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو علماء میں سے اس طرف گئے ہیں کہ مومن جنّ جنت میں داخل نہ ہوں گے اور صرف ان کے نیک لوگوں کا یہ بدلہ ہوگا کہ قیامت کے دن وہ عذابِ الیم سے بچائے جائیں گے۔ اور اسی لیے انھوں نے اس مقام میں یہ کہا، حالاں کہ یہ مقام فراخی اور مبالغہ کا ہے، چنانچہ اگر ان کے لیے ایمان کی کوئی جزاء اس سے بڑھ کر ہوتی تو وہ ضرور اس کا ذکر کرتے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن مجاہد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ جنوں کے مومن جنت میں داخل نہ ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ ابلیس کی اولاد سے ہیں اور ابلیس کی اولاد جنت میں داخل نہ ہوگی۔[1] حق یہ ہے کہ ان کا مومن انسانوں کے مومن کی طرح ہے، وہ جنت میں داخل ہوں گے۔ چنانچہ سلف میں سے ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔ بعض نے اس کے لیے اس آیت سے استدلال کیا ہے: ﴿ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴾ [الرحمٰن: ٧٤] ''ان کو ہاتھ نہیں لگایا کسی انسان یا جنّ نے اس سے قبل۔'' لیکن اس استدلال میں نظر ہے اس سے خوب تر یہ آیت ہے: ﴿ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ [الرحمٰن: ٤٦۔ ٤٧] ''اور اس شخص کے لیے جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا دو جنتیں ہیں پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟''

چنانچہ اللہ پاک نے ثقلین پر یہ احسان رکھا کہ اس نے ان کے نیک کی جزاء جنت ٹھہرائی ہے اور زبانی شکر کے ساتھ جنوں نے انسانوں سے بڑھ کر اس آیت کا مقابلہ کیا، چنانچہ یوں کہا: ''وَلَا بِشَيْءٍ مِنْ آلَائِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ'' یعنی اے ہمارے رب! ہم تیری نعمتوں سے کسی نعمت کی تکذیب نہ کریں گے، پس تیرے لیے سب تعریفیں ہیں۔ سو اللہ پاک ایسا نہیں ہے کہ ان پر اس جزاء کا احسان رکھے جو اُن کو حاصل نہ ہوگی۔ اور نیز بات یہ ہے کہ جب ان کا کافر آگ کے ساتھ جزاء دیا جائے، حالانکہ یہ مقامِ عدل ہے تو بطریقِ اولیٰ واحریٰ ضروری ہیں کہ ان کے مومن کو جنت کے ساتھ جزاء دی جائے، حالانکہ یہ مقامِ فضل ہے۔ اور نیز جو دلائل اس پر دال ہیں ان میں سے اس آیتِ کریمہ کا عموم ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴾ [الکهف: ١٠٧] ''جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے کام بھی اچھے کیے، یقیناً ان کے لیے الفردوس کے باغات کی مہمانی ہے۔'' اور اس طرح کی اَور عام آیتیں ہیں۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٩٧)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس مسئلے کو ایک جز میں علاحدہ لکھا ہے۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.

اور دیکھو یہ جنت جس میں ہمیشہ بہت سی جگہ بچی رہے گی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک اور مخلوق ایجاد فرمائے گا، پھر بھلا کیا اس میں ان کو نہ بسائے گا جو اس پر ایمان لائے اور بھلائیاں کیں۔ اور جنوں نے جو یہاں پر ایمان کی جزاء گناہوں کا مٹانا اور عذابِ الیم سے بچانا ذکر کی ہے تو یہ خود جنت میں داخل ہونے کو لازم ہے، اس لیے کہ آخرت میں اور کچھ نہیں ہے، جنت ہے یا نار ہے اور جو کوئی نار سے بچا لیا گیا، وہ ضرور جنت میں داخل ہو گا اور ہمارے لیے شارع علیہ السلام سے کوئی نصِ صریح و ظاہر اس بات پر وارد نہیں ہوئی کہ جنوں کے مومن جنت میں داخل نہ ہوں گے، اگرچہ نار سے بچائے جائیں اور اگر وہ صحیح ہوتے تو ہم ضرور اس کے قائل ہوتے۔ واللّٰه أعلم.

دیکھو نوح علیہ السلام اپنی قوم سے یہ فرماتے ہیں: ﴿يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ [نوح: ٤] ''وہ تمھارے گناہ بخش دے گا اور تمھیں ایک وقتِ مقررہ تک چھوڑے گا۔'' اور بلا خوف ان کی قوم کے مومن جنت میں ہیں تو اسی طرح یہ جنّ لوگ بھی ہیں۔ جنوں کے بارے میں کئی غریب قول نقل کیے گئے ہیں، عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جنّ جنت کے بیچوں بیچ داخل نہ ہوں گے وہ تو صرف اس کے اِردگرد، آس پاس اور اس کے اطراف میں ہوں گے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ وہ جنت میں ہیں، بنی آدم ان کو دیکھیں گے اور وہ بنی آدم کو نہ دیکھیں گے، اس حالت کے برعکس جس میں وہ دنیا میں تھے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ جنت میں وہ نہ کھائیں گے اور نہ پئیں گے، ان کو تو کھانے پینے کے عوض صرف تسبیح، تحمید اور تقدیس کا الہام کیا جائے گا فرشتوں کی طرح، اس لیے کہ وہ انہیں کی جنس سے ہیں۔ ان سب قولوں میں نظر ہے اور ان پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

پھر ان کی طرف سے یہ خبر دی: ﴿وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءُ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ یعنی اور جو کوئی اللہ کے بلانے والے کو جواب نہ دے تو وہ زمین میں عاجز کرنے والا نہیں ہے، بلکہ اللہ کی قدرت اس کو شامل ہے اور اس کو گھیرے ہوئے ہیں اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی مددگار نہیں ہے۔ یعنی ان کو ترغیب و ترتیب کے ساتھ بلایا اسی لیے ان کے بہت لوگوں پر اس کا اثر ہوا اور وہ ایلچی ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے، چنانچہ اس کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔[1] وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ۔

پھر اللہ سبحانہ نے بعث پر ایک اور دلیل ذکر فرمائی:

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٢٠٥_٢١٧)

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ؕ بَلٰۤى
اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۳﴾ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ قَالَ
فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۴﴾ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ
اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ
يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ
فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۳۵﴾

کیا انھوں نے دیکھا (جانا) نہیں کہ بے شک اللہ، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور وہ ان کے پیدا کرنے سے اُکتایا نہیں، اس پر قادر ہے کہ مُردوں کو زندہ کرے۔ کیوں نہیں! بلاشبہ وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ﴿33﴾ اور جس دن اہلِ کفر آگ کے سامنے پیش کیے جائیں گے (تو ان سے کہا جائے گا:) کیا یہ (دوزخ) حق نہیں ہے؟ تو وہ کہیں گے: کیوں نہیں، ہمارے رب کی قسم! (یہ حق ہے) اللہ فرمائے گا: اب تم اپنے کفر کی وجہ سے عذاب (کے مزے) چکھو ﴿34﴾ تو (اے نبی!) آپ صبر کریں جس طرح عزم و ہمت والے رسولوں نے صبر کیا اور ان کے لیے جلدی (عذاب) طلب نہ کریں، گویا کہ وہ (کافر) جس دن اس (عذاب) کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے (تو سمجھیں گے کہ) وہ تو (دنیا میں) دن کی بس ایک گھڑی ہی ٹھہرے۔ یہ (تو پیغام) پہنچا دینا ہے، چناں چہ نافرمان لوگوں کے سوا کوئی ہلاک نہیں کیا جائے گا ﴿35﴾

حیات بعد الممات کی دلیل اور کافروں کی جہنم پر پیشی:

دنیا میں ڈھیل نہ پائی تھی مگر ایک گھڑی، یعنی اب تو دیر سمجھتے ہیں کہ عذاب جلد کیوں نہیں آتا، اس دن جانیں گے کہ بہت جلدی آ گیا، دنیا میں ہم ایک ہی گھڑی رہے۔ یا قبر میں رہنے کا زمانہ ایک گھڑی معلوم ہوگا۔ یہ دستور ہے کہ گزری ہوئی مدت تھوڑی معلوم ہوتی ہے۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان لوگوں نے جو قیامت کے دن مبعوث ہونے کا انکار

کرتے ہیں اور معاد کے دن جسموں کے اٹھنے کو بعید سمجھتے ہیں، یہ نہیں دیکھا کہ وہ اللہ جس نے آسمان و زمین بنائے اور ان کا بنانا اس پر سخت نہیں گزرا، بلکہ ان سے کہہ دیا کہ ہو جاؤ تو وہ بلا ممانعت و بلا مخالف ہو گئے، بلکہ اطاعت کرتے ہوئے، مانتے ہوئے ڈرتے، کانپتے اور لرزتے ہوئے وجود میں آ گئے۔ کیا پھر یہ ذات پاک جس کی یہ قدرت ہے اس پر قادر نہیں ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے، جیسا کہ اللہ عزوجل نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [المؤمن: ٥٧] ''آسمان و زمین کی پیدائش یقیناً انسان کی پیدائش سے بہت بڑا کام ہے، لیکن (یہ اور بات ہے کہ) اکثر لوگ بے علم ہیں۔'' اس لیے یہاں یوں فرمایا: ﴿ بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴾ یعنی کیوں نہیں وہ ہر شے کر سکتا ہے۔

پھر جو لوگ اس کے منکر ہیں ان کو یہ تہدید و وعید سنائی: ﴿ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ﴾ یعنی ان سے کہا جائے گا: کیا یہ ٹھیک نہیں ہے، کیا پھر یہ جادو ہے یا تم نہیں دیکھتے ہو؟ کہیں گے: ﴿ بَلٰى وَرَبِّنَا ﴾ کیوں نہیں، قسم ہے ہمارے رب کی! یعنی ان کو سوائے اقرار کے اور کچھ نہ بنے گا۔ فرمایا: ﴿ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴾ یعنی تو اب عذاب چکھو، یہ بدلہ ہے اس کا جو تم انکار کرتے تھے۔

پھر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو امر کیا کہ قوم میں سے جس نے ان کی تکذیب کی ہے اس کی تکذیب پر صبر کریں: ﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ﴾ یعنی تو صبر کر جیسا کہ رسولوں میں سے اولوا العزم رسولوں نے اپنی اپنی قوم کی تکذیب پر صبر کیا ہے۔ اولوا العزم کی تعداد میں کئی اقوال کی بنا پر اختلاف کیا گیا ہے۔ زیادہ مشہور یہ قول ہے کہ وہ نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام اور سارے نبیوں کے خاتم محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اللہ پاک نے سورۃ الاحزاب اور سورۃ الشوریٰ کی دو آیتوں میں سارے نبیوں میں سے ان کے ناموں پر نص فرمائی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اولوا العزم سے مراد سارے رسول ہیں تو اس بنا پر قولہ تعالیٰ: ﴿ مِنَ الرُّسُلِ ﴾ میں حرفِ ﴿ مِنْ ﴾ بیانِ جنس کے لیے ٹھہرے گا۔ واللّٰہ أعلم.

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے مسروق رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے مجھ سے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ دن بھر روزہ رکھے رہے، پھر اس کو خالی شکم طے کیا، پھر دن بھر روزہ دار رہے، پھر اس کو خالی شکم طے کیا، پھر دن بھر صائم رہے۔ فرمایا: اے عائشہ! بے شک دنیا لائق نہیں ہے محمد کے لیے اور نہ آلِ محمد کے لیے۔ اے عائشہ! بے شک اللہ تعالیٰ رسولوں میں سے اولوا العزم سے راضی نہ ہوا مگر تکالیف پر صبر کرنے اور اپنی پسندیدہ چیز سے باز رہنے کی وجہ سے۔ پھر وہ مجھ سے راضی نہ ہوا مگر یہ کہ مجھ کو اس شے کا مکلّف کرے جس کا ان کو مکلّف کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ﴾ اور بے شک میں واللہ! البتہ صبر کروں گا، جیسا کہ انھوں نے

صبر کیا، اپنی طاقت کے مطابق اور نہیں ہے کسی طرح کی قوت مگر اللہ کے ساتھ۔[1]

﴿ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ﴾ یعنی ان کے لیے عذاب نازل ہونے کو جلدی طلب نہ کر، جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ﴾ [المزمل: ۱۱] ''اور مجھے اور ان جھٹلانے والے آسودہ حال لوگوں کو چھوڑ دے اور انھیں ذرا سی مہلت دے۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴾ [الطارق: ۱۷] ''تو کافروں کو مہلت دے انھیں تھوڑے دنوں چھوڑ دے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ﴾ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴾ [النازعات: ٤٦] ''جس روز یہ اسے دیکھ لیں گے تو ایسا معلوم ہوگا کہ صرف دن کا آخری حصہ یا اول حصہ ہی (دنیا میں) رہے ہیں۔'' نیز جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴾ [یونس: ٤٥] ''اور ان کو وہ دن یاد دلایئے جس میں اللہ ان کو (اپنے حضور) جمع کرے گا (تو ان کو ایسا محسوس ہوگا) کہ گویا وہ (دنیا میں) سارے دن کی ایک آدھ گھڑی رہے ہوں گے اور آپس میں ایک دوسرے کو پہچاننے کو ٹھہرے ہوں۔ واقعی خسارے میں پڑے وہ لوگ جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے پاس جانے کو جھٹلایا اور وہ ہدایت پانے والے نہ تھے۔''

قولہ جل جلالہ: ﴿ بَلٰغٌ ﴾ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: دو معنی کا محتمل ہے: ایک معنی تو یہ ہیں کہ تقدیر اس کی یہ ہے: ''وَذٰلِكَ لَبِثَ بَلَاغٌ'' (یہ توجیہ تامل کے لائق ہے)۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ تقدیر اس کی یہ ہو ''هٰذَا الْقُرْآنُ بَلَاغٌ''۔[2] قولہ تعالیٰ: ﴿ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ یعنی ہلاک نہیں ہوتا ہے اللہ پر مگر ہلاک ہونے والا اور یہ اللہ عزوجل کے عدل سے ہے کہ وہ عذاب صرف اسی کو کرتا ہے جو عذاب کا مستحق ہے۔[3] وَاللّٰهُ سُبْحَانَهٗ أَعْلَمُ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ رؤیت یہاں قلبی ہے جو ''علم'' کے معنی میں ہوتی ہے اور ہمزہ انکار کے لیے ہے اور حرف واو مقدر پر عطف کے لیے ہے: ''أَيْ: أَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا وَلَمْ يَعْلَمُوْا أَنَّ الَّذِيْ خَلَقَ هٰذِهِ الْأَجْرَامَ الْعِظَامَ مِنَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ اِبْتِدَاءً'' ﴿ وَلَمْ يَعْيَ ﴾ مجزوم ہے بہ حذف الف۔ جمہور نے بہ سکونِ عین وفتحِ یائے تحتیہ پڑھا ہے، ''عَيِيَ'' کا صیغہ مضارع اور حسن رحمہ اللہ نے بہ کسرِ عین وسکونِ یاء پڑھا ہے،[4] معنی یہ ہیں: ''لَمْ يَتْعَبْ وَلَمْ يَنْصِبْ وَلَمْ يَعْجِزْ عَنْ ذٰلِكَ وَلَا ضَعُفَ عَنْهُ''

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۲۹۷/۱۰) اس کی سند میں ''مجالد بن سعید'' ضعیف راوی ہے۔
[2] تفسیر الطبري (۱٤٦/۲۲) [3] تفسیر ابن کثیر (۲۱۸،۲۱۷/٤) [4] تفسیر القرطبي (۲۱۹/۱٦)

محاورے میں بولتے ہیں: "عَيَّ بِالْأَمْرِ وَعَيِيَ إِذَا لَمْ يَهْتَدِ لِوَجْهِهِ" جب کوئی کسی کام کی راہ نہ پائے تو اس وقت کہتے ہیں کہ اس کام سے عاجز ہو گیا۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عدمِ عي مجاز ہے عدمِ انقطاع و نقص سے،[1] یعنی اس کو قدرت واجب ہے نہ ناقص ہوتی ہے اور نہ کبھی ایجاد سے منقطع ہوتی ہے۔ امام ابو عبیدہ اور اخفش رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ بِقٰدِرٍ ﴾ میں حرفِ باء زائد ہے تاکید کے لیے ہے جس طرح کہ ﴿ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴾ [الفتح: ٢٨] میں زائد ہے۔ امام کسائی، فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب لوگ حرفِ باء کو جحد واستفہام کے ساتھ داخل کرتے ہیں تو یوں بولتے ہیں: "مَا أَظُنُّكَ بِقَائِمٍ"۔ جحد سے مراد نفی ہے۔ جار و مجرور محلِ رفع میں ہے، اس بنا پر کہ ﴿ اِنَّ ﴾ کی خبر ہے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ (یعنی عیسیٰ بن عمرو، اعرج، جحدری، ابن ابی اسحاق، یعقوب اور زید بن علی رحمہ اللہ) نے "يَقْدِرُ" بہ صیغۂ مضارع پڑھا ہے۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے اول قراءت کو اختیار کیا ہے اور امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے دوسری کو۔[2] کہا: اس لیے کہ حرفِ یاء کا ﴿ اَنَّ ﴾ کی خبر میں دخول قبیح ہے۔

﴿ بَلٰۤى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ تعلیل ہے اس شے کی جس کا ﴿ بَلٰۤى ﴾ نے فائدہ دیا، یعنی تعلیل خاص کی ساتھ عام کے۔ معنی یہ ہیں: کیا انھوں نے فکر نہ کی اور اس بات کو نہ جانا کہ وہ اللہ جس نے پہلے پہل آسمان وزمین کے یہ بڑے بڑے جسم پیدا کیے اور اُن کو بنانے سے تھکا اور نہ عاجز اور کمزور ہوا، وہ اس بات پر قادر ہے کہ مردے زندہ کرے۔ ہاں اس کو کوئی چیز عاجز نہیں کرتی، اس لیے کہ وہ ہر شے پر بڑی قدرت رکھتا ہے۔ جب اللہ پاک بعث کو ثابت کر چکا تو بعث کے دن جو ہولناک امور پیش آئیں گے، ان میں سے بعض کا ذکر کیا۔

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ﴾ کلمۂ ﴿ يَوْمَ ﴾ قولِ مقدر سے متعلق ہے: "أَيْ: يُقَالُ ذَلِكَ الْيَوْمَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا" اور جملۂ ﴿ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ﴾ محکی بالقول ہے، یعنی قولِ مقدر کا مقولہ ہے، معنی یہ ہیں: اور جس دن کافر آگ پر پیش کیے جائیں گے، اس دن کہا جائے گا: کیا یہ حق نہیں ہے؟ یعنی ان کی زجر و توبیخ کرنے کے لیے یہ بات ان سے کہی جائے گی۔ ﴿ هٰذَا ﴾ کا اشارہ اس شے کی طرف ہے جس کو وہ مشاہدہ کر رہے ہوں گے جس دن اُن کو آگ پر پیش کریں گے۔ "أَلَيْسَتْ هَذِهِ النَّارُ بِالْحَقِّ" نہ کہا، بلکہ صرف اشارے پر اکتفا کیا تو اس میں مشار الیہ کی جو ہولناکی اور تعظیم ہے، وہ مخفی نہیں ہے۔ گویا وہ ایک ایسا ہولناک اور عظیم الشان امر ہے کہ وہ الفاظ سے ادا نہیں ہو سکتا۔

مطلب یہ ہے کہ اس کی ہولناکی اور عظمت و دہشت بیان سے باہر ہے۔ غرضیکہ جس وقت ان سے قولِ مذکور کہا جائے گا تو وہ جواب دیں گے: ﴿ بَلٰى وَرَبِّنَا ﴾ یعنی ہمارے رب کی قسم! کیوں نہیں؟ وہ حق ہے۔ اب اقرار کیا

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٣٧/٨) [2] تفسير القرطبي (٢١٩/١٦) فتح القدير (٣٥/٥)

تو ایسے وقت میں جب اقرار کرنا ان کو بالکل فائدہ نہ دے گا۔ اقرار کا فائدہ تو دنیا میں تھا اب تو دیکھا بھالا سودا ہو گیا۔ آنکھوں سے دیکھ کر اقرار کیا تو اس کا کیا فائدہ! اپنے اس اقرار کی تاکید جو قسم سے کی تو وہ اس لیے کہ مشاہدہ تو وہ حق الیقین ہے جس کا انکار ممکن نہیں ہے اور اس لیے کہ خلاصی کے لیے وہ طمع کرتے ہیں کہ جس حال میں ہیں اس کی حقیقت کا اقرار کر لیں تو اس کی وجہ سے چھٹکارا ہو جائے گا۔ یہ بالکل بے سود طمع ہے۔ اقرار کریں یا نہ کریں۔ ''فَالنَّارُ مَثْوًى لَهُمْ'' یعنی بہر حال ان کا ٹھکانا تو دوزخ ہے۔

فرمایا: ﴿ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴾ یعنی تو اب تم عذاب چکھو اس سبب سے کہ دنیا میں تم اس کا کفر و انکار کرتے تھے۔ یہ جو اُن کے عذاب کے چکھنے کا حکم کیا، اس میں انتہائی درجے کی توبیخ اور ان کا بڑا تمسخر ہے۔ پھر جب اللہ پاک نبوت اور توحید اور معاد پر دلائل بیان کر چکا اور ان کو اچھی طرح سے ثابت کر دیا تو اپنے رسول ﷺ کو صبر کا حکم دیا: ﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ﴾ صبر اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ وثوق اور اعتماد ہے اور بغیر غم اور رنج کے اور کراہت اور ناخوشی کے وثوق اور اعتماد کرنا ہے۔ (كما قاله القشيري) حرفِ ''فاء'' شرط محذوف کا جواب ہے: ''أَيْ: إِذَا عَرَفْتَ ذٰلِكَ وَقَامَتْ عَلَيْهِ الْبَرَاهِيْنُ وَلَمْ يَنْجَحْ فِي الْكَافِرِيْنَ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أَرْبَابُ الثَّبَاتِ وَالْحَزْمِ وَأُولُو الْجِدِّ وَالصَّبْرِ فَإِنَّكَ مِنْهُمْ'' یعنی جبکہ تو نے اس کو پہچان لیا اور اس پر دلیلیں قائم ہو چکیں اور کافروں کو کچھ اثر نہ ہوا تو اب تو صبر کر جیسا کہ ان لوگوں نے صبر کیا جو ثبات و حزم وجد وصبر والے تھے، بیشک تو انہیں میں سے ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اولوا العزم من الرسل پانچ ہیں: نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام اور نبی کریم ﷺ۔ یہ سب اصحابِ شرائع ہیں۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نوح، ہود اور ابراہیم علیہم السلام ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو امر فرمایا کہ آپ ان کے چوتھے ہوں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: چھے ہیں: ابراہیم، موسیٰ، داود، سلیمان، عیسیٰ علیہم السلام اور نبی اکرم ﷺ۔ کسی نے کہا ہے کہ نوح، ہود، صالح، شعیب، لوط، عیسیٰ علیہم السلام اور نبی ﷺ۔ کسی نے کہا ہے کہ نوح، ہود، صالح، شعیب، لوط اور موسیٰ علیہم السلام ہیں۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان میں سے اسماعیل، یعقوب، ایوب علیہم السلام ہیں اور یونس علیہ السلام ان میں سے نہیں ہیں۔ امام شعبی اور کلبی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ وہ ہیں جن کو جنگ کرنے کا حکم ہوا تو انھوں نے مکاشفہ کا اظہار کیا اور کافروں سے لڑے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ نجبائے رسل ہیں جن کا سورۃ الانعام میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب اٹھارہ ہیں: ابرہیم، اسحاق، یعقوب، نوح، داود، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، اسماعیل، الیاس، الیسع، یونس اور لوط علیہم السلام۔

اس قول کو حسین بن الفضل نے اختیار کیا ہے، اس لیے اللہ پاک نے انبیائے مذکورین کے ذکر کے بعد یوں فرمایا ہے: ﴿ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ﴾ [الأنعام: ٩٠] ''یہی لوگ ایسے تھے جن کو اللہ تعالیٰ

نے ہدایت کی تھی، چنانچہ آپ بھی ان ہی کے طریقے پر چلیں۔'' کسی نے کہا کہ سارے رسول اولوا العزم ہیں، اللہ عزوجل نے کوئی نبی مبعوث نہیں فرمایا، مگر وہ صاحبِ عزم وحزم ورائے وکمالِ عقل تھا۔ یہ قول پہلے بھی گزر چکا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ بارہ نبی ہیں جو بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ چار ہیں: ابراہیم، موسیٰ، داود اور عیسیٰ علیہم السلام۔[1] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ وہ ہیں جن کو قتال کا حکم ہوا، یہاں تک کہ اس پر گزر گئے: نوح، ہود، صالح، موسیٰ، داود اور سلیمان علیہم السلام۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، کہا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ اولوا العزم رسولوں میں سے تین سو تیرہ تھے۔[2] (محلی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ "من" بیانیہ ہے تو سارے رسول اولوا العزم تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ "من" تبعیض کا ہے تو ان میں سے آدم علیہ السلام نہیں تھے۔ لقولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴾ [طٰہٰ: ۱۱۵] ''اور ہم نے اس میں کوئی عزم نہیں پایا'' اور نہ ہی یونس علیہ السلام ہیں۔ لقولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ﴾[2] [القلم: ٤٨] ''اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جا'') کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت، آیتِ سیف سے منسوخ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ محکم ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظاہر تر یہ ہے کہ منسوخ ہے، اس لیے کہ سورت مکی ہے۔

امام مقاتل رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت اُحد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ امر کیا کہ اس شے پر صبر کریں جو آپ کو پہنچی ہے۔ جیسا کہ اولوا العزم نے صبر کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تکلیف کو آسان کرنے کے لیے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ثابت قدم رکھنے کے لیے یہ امر کیا۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ﴾ حرفِ لام تعلیل کا ہے: "أَيْ: لِأَجْلِهِمْ"، اور مفعول محذوف ہے، یعنی اے محمد! کفار کے لیے عذاب کو جلدی مت مانگ، کیوں کہ وہ تو ضرور ان پر نازل ہونے والا ہے، اگرچہ اس کے نزول میں تاخیر ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قوم سے ملول ہو گئے تو ان پر جلد عذاب چاہا۔ اللہ پاک نے منع فرمایا کہ عذاب کی جلدی مت چاہو، وہ تو ضرور ہی آئے گا۔ کسی نے کہا کہ اللہ پاک نے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کا حکم دیا اور قوم کے لیے جلدی عذاب مانگنے سے منع کیا تو اس اُمید پر کہ وہ ایمان لے آئیں۔ واللہ أعلم.

﴿ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ۭ بَلٰغٌ ﴾ یعنی گویا وہ جس دن آخرت میں اس کا عذاب دیکھیں گے جس کا دنیا میں ان کو وعدہ دیا جاتا ہے۔ وہ نہ ٹھہرے مگر دن کی ایک گھڑی، یعنی دنوں کی گھڑیوں میں سے ایک گھڑی، جتنا اس کے طول کے سبب سے اور اس ہولِ عظیم اور بلائے مقیم کے جس کا وہ مشاہدہ کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دن کی ہولناکی اور بلاء اور طول کی وجہ سے دنیا میں رہنے کی مدت کتنی ہی لمبی ہوئی ہو، ایسی معلوم ہوگی جیسے دن کی ایک گھڑی کی مدت ہوتی ہے۔ اس لیے عذاب کے جلدی مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي (٢٢٠/١٦) فتح القدير (٣٥/٥، ٣٦) [2] الدر المنثور (٤٥٥/٧) [3] تفسير القرطبي (٢٢١/١٦)

دنیا کی ساری مدت گو کسی قدر لمبی ہو آخرت میں اس کی یہ حالت ہے کہ گھڑی بھر نظر آتی ہے، جمہور نے ﴿ بَلٰغٌ ﴾ بہ رفع پڑھا ہے۔ اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ ''أَيْ: هٰذَا الَّذِيْ وَعَظْتَهُمْ بَلَاغٌ أَوْ تِلْكَ السَّاعَةُ بَلَاغٌ أَوْ هٰذَا الْقُرْآنُ بَلَاغٌ'' یعنی یہ شے جس کے ساتھ تو نے ان کو وعظ کیا، پہنچا دینا ہے، یا یہ معنی ہیں کہ وہ گھڑی پہنچا دینا ہے، یعنی دنیا میں رہنے کی ساری مدت آخرت میں ایسی معلوم ہو گی کہ ایک گھڑی تھی کہ اس نے دنیا سے آخرت میں پہنچا دیا یا یہ معنی ہیں کہ یہ قرآن اللہ سے لوگوں کی طرف پہنچا دینا ہے یا یوں کہ ﴿ بَلٰغٌ ﴾ مبتداء ہے اور خبر ﴿ لَهُمْ ﴾ کا کلمہ ہے جو ﴿ لَا تَسْتَعْجِلْ ﴾ کے بعد واقع ہوا ہے۔ ''أَيْ: لَهُمْ بَلَاغٌ'' اس بنا پر ﴿ وَلَا تَسْتَعْجِلْ ﴾ پر وقف ہو گا، لیکن یہ قول سخت ضعیف ہے، اس لیے کہ خبر و مبتداء کے جملۂ تشبیہیہ کے درمیان فصل واقع ہے۔ دوسرے ﴿ لَهُمْ ﴾ کا استعجال کے ساتھ تعلق ظاہر ہے۔ ظاہر کو چھوڑ کر غیر ظاہر کو اختیار کرنے سے کیا حاصل۔

امام زید بن علی، حسن اور عیسیٰ رحمہ اللہ نے بہ نصب پڑھا ہے بنا بر مفعول مطلق ''أَيْ: بَلِّغْ بَلَاغًا''، یعنی پہنچا دے اچھی طرح سے، اس کی مؤید ابو مجلز کی قراءت بہ صیغۂ امر ہے۔ کسی نے بہ صیغۂ فعل ماضی بھی پڑھا ہے، یعنی پہنچا دیا۔ ''بلاغاً'' کا نصب یوں بھی جائز ہے کہ ﴿ سَاعَةً ﴾ کی صفت ہو۔ امام حسن رحمہ اللہ نے ''بَلَاغٍ'' بہ جر بھی پڑھا ہے، اس کی توجیہ یہ ہے کہ نہار کی صفت ہے بنا بر حذفِ مضاف ''أَيْ: مِنْ نَهَارٍ ذِيْ بَلَاغٍ'' یا زمانے کا وصف بلاغ سے کیا بطور مبالغہ کے۔

﴿ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ جمہور نے ﴿ يُهْلَكُ ﴾ بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔ اور امام ابن محیصن رحمہ اللہ نے بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے، یعنی بہ فتحِ یاء و کسرِ لام۔ ان سے بہ فتحِ لام بھی مروی ہے، یہ بھی ایک لغت ہے اور ماضی ''هَلِكَ'' بہ کسرِ لام۔ امام ابن جنی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ لغت مرغوب عنہا ہے اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بہ ضمِ یاء و کسرِ لام پڑھا ہے اور فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور ''اَلْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ''، منصوب بہ مفعول بہ اور ''نُهْلِكُ'' بہ نون و نصبِ ''قوم''،[1] معنی یہ ہیں: چنانچہ ہلاک نہیں کیے جاتے اللہ کے عذاب سے مگر وہ لوگ کہ طاعت سے نکلنے والے اور اللہ کے معاصی میں واقع ہونے والے ہیں۔

امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہلاک نہیں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ پر مگر ہالک مشرک۔[2] کسی نے کہا کہ یہ آیت بابِ رجا میں قوی تر ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی تاویل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل کے ساتھ سوائے فاسقوں کی قوم کے کوئی ہلاک نہیں ہوتی۔[3] یہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بے پایاں وسعت کا طمع دلانا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ جس وقت عورت پر اس کے بچے کی

[1] اللباب في علوم الكتاب (٤٢٢/١٧) [2] تفسير القرطبي (٢٢٢/١٦) [3] معاني القرآن (٤٤٨/٤)

ولادت مشکل ہوتو یہ دو آیتیں اور دو کلمے ایک رکابی میں لکھے جائیں، پھر وہ دھوئی جائے اور اس کو پلا دیا جائے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْأَرْضِ وَرَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ. ﴿ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴾ [النازعات: ٤٦] ''جس روز یہ اسے دیکھ لیں گے تو ایسا معلوم ہوگا کہ صرف دن کا آخری حصہ یا اول حصہ ہی (دنیا میں) رہے۔'' اور ﴿ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ۭ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾. صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ.[1] والله أعلم.

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالْمِنَّةُ کہ سورۃ الاحقاف کی تفسیر دہم ماہِ ربیع الاول ۱۳۱۴ھ بہ وقت نصف شب جمعہ محلّہ امیر گنج میں مکمل ہوئی۔ اللہ پاک قبول فرمائے اور آیندہ لکھنے کی توفیق دے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ، وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِيْنَ. آمِيْن.

[1] تفسیر القرطبي (٢٢٢/١٦) فتح البيان (٤٠/١٣-٤٣)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُوْرَةُ مُحَمَّدٍ

اس سورت مبارکہ کو سورۃ القتال اور سورۃ ﴿ اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا ﴾ بھی کہتے ہیں۔ اس کی اڑتیس (۳۸) یا انتالیس (۳۹) یا چالیس (۴۰) آیتیں ہیں۔ اختلاف اس آیت میں ہے: ﴿ حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ﴾ [محمد: ٤] ''یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔'' اور اس آیت میں: ﴿ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ ﴾ [محمد: ١٥] ''جن میں پینے والوں کے لیے بڑی لذت ہے۔'' یہ سورت مدنی ہے۔ امام ماوردی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کے قول کے مطابق مگر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمہ اللہ ، چنانچہ ان دونوں نے کہا: مگر اس کی ایک آیت حجۃ الوداع کے بعد نازل ہوئی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکے سے نکلے اور بیت اللہ کی طرف نظر کرنے لگے اور اس پر رنج کر کے روتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَكَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ هِیَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْیَتِكَ ﴾[1] [محمد: ١٣] ''ہم نے کتنی بستیوں کو جو طاقت میں تیری اس بستی سے زیادہ تھیں۔''

اس کی بنا اس پر ہے کہ مکی وہ ہے جو مکے میں نازل ہوئی، گو ہجرت کے بعد ہو اور مشہور قول وہ ہے جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئی اور مدنی وہ ہے جو ہجرت کے بعد اتری، گو مکہ ہی میں نازل ہوئی ہو۔ تو اس بنا پر یہ آیت مدنی ہو گی اور اس سب کی بنا اس نقل پر ہے جو اس جگہ ماوری رحمہ اللہ نے نقل کی ہے اور اس جگہ قرطبی رحمہ اللہ نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ اور خازن رحمہ اللہ اور خطیب رحمہ اللہ نے اور ان کے علاوہ نے بلکہ اور قرطبی رحمہ اللہ نے بھی اس کو نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مہاجر ہو کر مکے سے غار کی طرف نکلے۔ صحیح یہی نقلِ ثانی ہے۔ اب رہی پہلی نقل تو اس کی بنا پر یہ وعید ظاہر نہیں ہے، اس لیے کہ حجۃ الوداع میں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختار ہو کر مکے سے مفارقت کی ہے اس کے بعد کہ وہ دارالاسلام ہو چکا تھا اور اس کے سارے لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور سنہ ۸ ھ میں اس کی فتح کی ابتداء کی گئی تھی۔

امام ثعلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور ابن ہبۃ اللہ نے امام ضحاک اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ سے اس کو نقل کیا ہے،[2] حالانکہ یہ ایک غلط قول ہے، پس سورت مدنی ہے۔ كَمَا لَا یَخْفٰی. امام ابن ضریس رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سورۃ القتال مدینے میں نازل ہوئی۔ امام نحاس، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہم اللہ

---

[1] تفسير القرطبي (١٦/٢٢٣) [2] تفسير القرطبي (١٦/٢٢٣)

نے دلائل میں ان سے روایت کیا ہے کہ سورت محمد مدینے میں نازل ہوئی۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سورۃ ﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ مدینے میں اتری ہے۔[1] امام طبرانی رحمہ اللہ نے "الأوسط" میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ مغرب میں پڑھتے تھے: ﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾[2]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۱ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝۲ ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ۝۳

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

جن لوگوں نے کفر کیا اور (دوسروں کو) اللہ کی راہ سے روکا، اللہ نے ان کے عمل ضائع کر دیے ① اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور وہ اس (قرآن) پر بھی ایمان لائے، جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کیا گیا، اور وہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے، اللہ نے ان سے ان کی برائیاں دور کر دیں اور ان کے حال کی اصلاح کر دی ② یہ اس لیے کہ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے باطل کی پیروی کی اور بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے انھوں نے اپنے رب کی طرف سے حق کی پیروی کی، اللہ اسی طرح لوگوں کے لیے ان کی مثالیں بیان کرتا ہے ③

کافروں اور مومنوں کی سزا و جزاء:

پہلے زمانے میں ایک شریعت سب لوگوں کے لیے نہیں ہوتی تھی۔ اب تمام جہان کے لیے ایک ہی حکم ہے، اب سچا دین یہی ہے اور اچھے اور برے کام مسلمان بھی کرتے ہیں اور کافر بھی۔ لیکن سچا دین ماننے کو یہ قبولیت ہے

[1] الدر المنثور (۴۵۶/۷)

[2] المعجم الأوسط (۲۰۶/۲) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ۲۹۷/۲)

کہ نیکی ثابت ہو اور برائی معاف اور نہ ماننے کی یہ سزا ہے کہ نیکی برباد اور گناہ لازم۔ انتھی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کیا اور دوسروں کو اللہ کے راستے سے روکا تو اس نے ان کے اعمال باطل کر دیے اور کھو دیے اور ان کے لیے نہ تو ثواب ٹھہرایا اور نہ جزاء۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴾ [الفرقان: ٢٣] ''اور انھوں نے جو جو اعمال کیے تھے ہم نے ان کی طرف بڑھ کر انھیں پراگندہ ذروں کی طرح کر دیا۔'' اور جن کے قلوب اور سرائر ایمان لائے اور ان کے اعضاء وظواہر اللہ کی شریعت کے مطیع اور فرمانبردار ہوئے۔ ﴿ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ ﴾ یعنی اور ایمان لائے اس شے پر جو اتاری گئی محمد ﷺ پر، یہ عطف خاص ہے عام پر اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ آپ ﷺ کے مبعوث ہونے کے بعد ﴿ مَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ ﴾ پر ایمان لانا ایمان کی درستی کے لیے شرط ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ﴾ جملہ معترضہ حسنہ ہے اور اسی لیے اللہ جل جلالہ نے فرمایا ہے: ﴿ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ﴿ بَالَهُمْ ﴾ کے معنی ''أَمْرَهُمْ'' ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''شَأْنَهُمْ'' ہیں۔ امام قتادہ و ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''حَالَهُمْ'' ہیں۔[1] یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ اور چھینکنے والے کا جواب دینے والی حدیث میں آیا ہے: « يَهْدِيكُمُ اللّٰهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ »[2] یعنی اللہ تمھیں ہدایت کرے اور تمھارے حالات درست کرے۔

پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا ﴾ یعنی ہم نے کافروں کے اعمال باطل کر دیے اور نیک لوگوں کی برائیوں سے جو درگزر کی تو اس لیے کہ جو منکر ہوئے انھوں نے باطل کو اختیار کیا حق پر اور جو یقین لائے انھوں نے اپنے رب کی طرف سے حق کی پیروی کی۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے اعمال کا انجام بیان کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ قیامت کے دن کس شے کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔[3] وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالىٰ أَعْلَمُ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ سے مراد کفارِ قریش ہیں۔ انھوں نے اللہ کے ساتھ کفر کیا اور اپنے آپ کو اور دوسروں کو اللہ کی راہ، یعنی دینِ اسلام سے اس طرح سے روکا ہے کہ لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے سے روکا۔ امام مجاہد، سدی رحمہ اللہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ کے معنی بیت اللہ ہیں کہ اس کی طرف قصد کرنے والوں کو روکا اور منع کیا۔[4] کسی نے کہا ہے کہ ان سے مراد اہلِ کتاب ہیں، یا ہر اس شخص کے لیے عام ہے جس نے کفر کیا اور روکا۔

---

[1] تفسیر الطبري (١٥٢/٢٢) [2] صحیح البخاري (٥٨٧٠) [3] تفسیر ابن کثیر (٢١٨/٤) [4] تفسیر القرطبي (٢٢٣/١٦)

موصول مبتداء ہے اور اس کی خبر ﴿ اَضَلَّ اَعۡمَالَهُمۡ ﴾ ہے، یعنی جنھوں نے یہ دو کام کیے اللہ پاک نے ان کو اس کا یہ بدلہ دیا کہ ان کے اعمال کو باطل اور ضائع کر دیا، یعنی ان کو حبط اور رائیگاں کر دیا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ ان کے مکر وفریب کو جو انھوں نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ کیا تھا، اس کو باطل کر دیا اور ان کے کفر میں سرگرداں رہنے کو اور ان کے دائرے اور بلا کو انہیں پر ڈال دیا۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ان کے وہ اعمال باطل کر دیے جو انھوں نے کفر میں کیے اور جن کا نام مکارمِ اخلاق رکھتے تھے، یعنی صلہ رحمی کرنا، قیدیوں کو چھڑانا، کھانا کھلانا، مسجدِ حرام کو آباد رکھنا، پناہ چاہنے والوں کو پناہ دینا، مہمانوں کی مہمان نوازی کرنا اور ان کی طرح کے اَور کام جن کو وہ اچھا سمجھتے تھے۔

یہ اعمال اگرچہ اصل ہی سے باطل تھے، لیکن معنی یہ ہیں کہ اللہ نے ان اعمال پر بطلان کا حکم لگا دیا تو اب وہ آخرت میں ان کا کچھ ثواب نہ دیکھیں گے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے دنیا میں ان کا بدلہ ان کو دے دیا جائے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ان کے لیے اعمال فاضلہ تھے۔ اللہ تعالیٰ کفر کے ساتھ کوئی عمل قبول نہیں کرتا۔[2] اللہ تعالیٰ نے جب کافروں کے فریق کا ذکر کیا تو اس کے بعد مومنین کے فریق کا بیان کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾.

اس کا ظاہر عموم ہے تو اس کے تحت میں ہر مومن داخل ہوگا جو نیک کام کرتا ہے اور اس عموم سے اس کا خصوصِ سبب مانع نہیں ہے جو کہا گیا ہے کہ انصار کے حق میں نازل ہوئی ہے، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔[3] اور کسی نے کہا ہے کہ قریش کے کچھ لوگوں کے بارے میں اتری ہے اور کسی نے کہا ہے کہ اہلِ کتاب کے مومنین کی شان میں اس آیت کا نزول ہوا ہے، لیکن اعتبار لفظ کی عمومیت کا ہوتا ہے نہ کہ سبب کے خاص ہونے کا۔ جمہور نے ﴿ نُزِّلَ ﴾ کو بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور زید بن علی اور ابن مقسم رحمہما اللہ نے بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے، فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے "أُنْزِلَ" بہ ہمزہ تعدیہ بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے[4] اور کسی نے "نَزَلَ" ثلاثی مجرد بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاٰمَنُوۡا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ ﴾ سے مراد قرآن شریف ہے تو اب یہ عطفِ خاص بر عام کے باب سے ہوا، اس لیے کہ بلاشک جس شے پر ایمان لانا واجب ہے، اس کے من جملۂ افراد اس شے پر ایمان لانا ہے جو نبی کریم ﷺ پر نازل کی گئی۔ پھر جب کہ اس ایمان میں شامل ہے جس کا اس سے پہلے ذکر کیا گیا ہے تو خاص کر اس کا ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے شرف اور علو مکان سے آگاہ کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا اور ایمان کی اصل یہی چیز ہے۔ اور اسی لیے اس قول سے اس کی تاکید کی ہے: ﴿ وَهُوَ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ﴾

[1] تفسير القرطبي (١٦/٢٢٣) [2] الدر المنثور (٧/٤٥٧) [3] تفسير الطبري (٢٢/١٥٢) [4] روح المعاني (٢٦/٣٨)

یہ جار و مجرور محلِ نصب میں ہے بنا بر حال اور مبتداء کے درمیان، یعنی ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ اور یہ خبر دی: ﴿ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ﴾ کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور بھلائیاں کیں اور اس قرآن پر ایمان لائے جو محمد ﷺ پر اتارا گیا اور یہی حق ہے، کیوں کہ وہ ان کے رب کی طرف سے ثابت ہے، ان سے ان کی وہ برائیاں دور کر دیں جو زمانہ ماضی میں کی تھیں۔ بلاشبہ ایمان اور عملِ صالح کی وجہ سے ان کی برائیوں کو ان کی خاطر بخش دیا۔ حق ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس دین نے اپنے سے پہلے کے دین منسوخ کر دیے ہیں اور اس قرآن نے پہلے کی کتابوں کو منسوخ کر دیا ہے اور نہ اب دین نے منسوخ ہونا ہے اور نہ ہی قرآن نے منسوخ ہونا ہے۔ اب قیامت تک اسلام اور قرآن کے سوا نہ کوئی دین ہے اور نہ کوئی کتاب۔ اَللّٰهُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ وَّاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ ﷺ آمین.

﴿ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ﴾ "بال" کے تین معنی پہلے گزر چکے ہیں۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ "بال" بہ معنی حال ہے، یعنی اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے حال کی اصلاح کر دی۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی زندگی میں معاصی سے بچایا اور اعمالِ خیر کی طرف ان کی راہنمائی فرمائی اور یہ مراد نہیں ہے کہ ان کی دنیا کے حال کی اصلاح کی کہ ان کو مال دیا۔ اس کے مثل نقاش نے کہا۔ معنی یہ ہیں کہ ان کی نیتیں درست کر دیں۔[1] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دین و دنیا میں ان کے حال کی اصلاح کر دی اپنی توفیق اور تائید کے ساتھ۔[2]

"بال" مثل مصدر کے ہے فعل اس سے معروف نہیں ہے اور عرب شعر کی ضرورت کے علاوہ اس کی جمع نہیں کرتے۔ کبھی "بال" بہ معنی "قلب" ہوتا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "مَا يَخْطُرُ فُلَانٌ عَلَى بَالِيْ أَيْ: قَلْبِيْ" یعنی فلاں میرے دل پر نہیں گزرتا۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "بال" بہ معنی رخائے عیش بھی ہے۔ "يُقَالُ: فُلَانٌ رَخِيُّ الْبَالِ أَيْ: رَخِيُّ الْعَيْشِ" یعنی فلاں فراخ عیش ہے، اس کی گزران فراخی سے ہوتی ہے اور "بال"، حوتِ عظیم ہے حیوان بحر سے، یہ لفظ عربی نہیں ہے۔[3] (كذا في القرطبي) قاموس میں ہے کہ "بالة" بہ معنی "قارورة" ہے یعنی شیشی اور بہ معنی "جراب" ہے یعنی توشہ دان اور بہ معنی وعائے طیب یعنی ظرفِ خوشبو اور حجاز میں ایک جگہ کا نام ہے۔[4] انتہی.

﴿ ذٰلِكَ ﴾ مبتداء ہے اس کی خبر ﴿ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ﴾ ہے۔ یا ﴿ ذٰلِكَ ﴾ مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ "أَيْ: اَلْأَمْرُ ذٰلِكَ" یعنی یہ بات جس کا ذکر ہوا کہ کفار کو وعید سنائی اور مومنوں کو خیر کا وعدہ دیا، یہ اس وجہ سے ہے کہ جو لوگ منکر ہوئے انھوں نے باطل کی پیروی کی اور جو ایمان لائے انھوں نے اپنے رب کی طرف سے حق کا اتباع کیا۔ چنانچہ باطل تو کفر و شرک ہے اور حق توحید و ایمان

[1] فتح القدير (٣٩/٥) [2] تفسير البيضاوي (١٨٨/٥) [3] تفسير القرطبي (٢٢٤/١٦) [4] القاموس المحيط (١٢٥٣/١)

ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافروں کے اعمال کا ضائع کرنا اس سبب سے ہے کہ انھوں نے باطل کی پیروی کی جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرنا اور اس کے معاصی کے ساتھ عمل کرنا ہے اور مومنوں کی برائیوں کو دور کرنا اور اُن کے حال کو سنوارنا اس سبب سے ہے کہ انھوں نے اس حق کا اتباع کیا جس کے اتباع کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، وہ حق توحید و ایمان و عمل طاعات ہے۔

﴿ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ﴾ یعنی اس طرح سے اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے فریقین کے احوال بیان کرتا ہے جو عجیب وغریب اور نادر ہونے میں امثال کے قائم مقام ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے جو مومنوں کی نیکیوں کی ہیں اور کافروں کے اعمال کے ضائع کرنے کی ہیں،[1] یعنی جو کوئی کافر ہوگا اللہ اس کے عمل کو باطل کر دے گا اور جو کوئی مومن ہوگا تو اس کی برائیاں مٹا دے گا، یا یوں کہو کہ اضلال کو کفار کی خیبت یعنی نقصان کی طرح ٹھہرایا گیا اور سیئات کی تکفیر (مٹا دینا) کو ابرار کی کامیابی کی مثل ٹھہرایا گیا۔ جب اللہ پاک فریقین کا حال بیان کر چکا ہے تو کفار کے ساتھ جہاد کا حکم دیا، چنانچہ فرمایا:[2]

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۛۚ ذٰلِكَ ۛؕ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا۠ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۴ سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝۵ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝۶ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝۷ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۸ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝۹ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۫ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ۝۱۰ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝۱۱

چناں چہ جب تم (جہاد میں) ان لوگوں سے ملو جنھوں نے کفر کیا تو (ان کی) گردنیں مارو، حتی

[1] تفسير البغوي (٢٧٤/٧) [2] فتح البيان (١٣/٤٧-٤٩)

کہ جب تم انھیں خوب قتل کر چکو تو (قیدیوں کو) بیڑیوں میں مضبوطی سے باندھ دو، پھر یا تو اس کے بعد ان پر احسان کرنا ہے یا فدیہ (تاوان) لینا ہے، حتیٰ کہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے، (حکم) یہی ہے اور اگر اللہ چاہتا (تو خود ہی) ان سے بدلہ لے لیتا، لیکن (اس نے تمھیں حکم دیا ہے) تاکہ وہ تمھیں ایک دوسرے سے آزمائے، اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل (شہید) کیے گئے، تو اللہ ان کے اعمال ہرگز ضائع نہیں کرے گا④ وہ جلد ان کی راہنمائی کرے گا اور اُن کے حال کی اصلاح کرے گا⑤ اور وہ انھیں (اس) جنت میں داخل کرے گا جس کی ان کو خوب پہچان کروا چکا ہے⑥ اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدم ثابت رکھے گا⑦ اور جن لوگوں نے کفر کیا، تو ان کے لیے ہلاکت ہے اور وہ (اللہ) ان کے اعمال ضائع کر دے گا⑧ یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے اس چیز کو ناپسند کیا، جو اللہ نے نازل کی، پھر اس نے بھی ان کے (نیک) اعمال ضائع کر دیے⑨ کیا پھر وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو اُن سے پہلے تھے؟ اللہ نے ان پر تباہی ڈال دی اور کافروں کے لیے اسی طرح کی سزائیں ہیں⑩ یہ اس لیے کہ بے شک اللہ ان لوگوں کا مددگار ہے جو ایمان لائے اور بے شک (جو) کافر ہیں، ان کا کوئی مددگار نہیں⑪

کافروں کی گردنیں مارنے کا حکم:

جب تک کافروں کا زور نہیں ٹوٹتا، تب تک ان کو قتل ہی کرنا چاہیے اور جب زور ٹوٹ چکا تب قید ہی کافی ہے، تاکہ ڈر کر مسلمان ہوں یا احسان رکھ کر چھوڑ دیں، تاکہ ہمیشہ احسان مانیں اور دین کی محبت پیدا ہو یا چھڑوائی لے کر چھوڑیں تو دو فائدے ہیں۔ اب اختلاف ہے اس بات میں کہ کافر قید میں آئے تو اس کو اپنے گھر جانے دیا جائے یا نہیں۔ اگر چھوڑیں تو اس طرح کہ رعیت ہو کر رہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو خود ہی کافروں کو مسلمان کر ڈالے، مگر یہ بھی منظور نہیں، ان کو آزمانا منظور ہے۔ سو بندے کی طرف سے کمر باندھنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کام بنانا۔ انتہیٰ.

اللہ تعالیٰ مومنوں کو وہ طریقہ اور تدبیر بتاتا ہے جس کے ساتھ مشرکوں سے لڑائیاں کریں اور اس طریقے پر اعتماد کریں اور اس پر چلیں، چنانچہ جب تم منکرین اور کفار کے مقابلے میں اور آمنے سامنے آؤ تو ان کو تلواروں سے خوب کاٹو جس طرح کھیتی کاٹتے ہیں، یہاں تک کہ ان کو قتل سے ہلاک کر چکو، تو جن کو تم قید کرو ان کو خوب مضبوطی سے باندھو۔ پھر جب ان کے ساتھ لڑائی اور مقابلہ ختم ہو جائے تو اُن کے بارے میں تم کو اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو ان کے قیدیوں کو مفت چھوڑ کر ان پر احسان کرو اور چاہے تو فدیے میں ان سے مال لے لو اور اس پر ان سے شرائط لگا دو۔

ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت واقعۂ بدر کے بعد نازل ہوئی، اس لیے کہ اس دن مومنوں نے فدیہ لینے کی غرض سے کم لوگوں کو قتل کیا اور زیادہ لوگوں کو قید کیا، اس پر اللہ نے ان پر ناراضی کا اظہار کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ [الأنفال: ٦٧۔ ٦٨] ”نبی کے ہاتھ میں قیدی نہیں چاہییں جب تک کہ ملک میں اچھی خون ریزی کی جنگ نہ ہو جائے۔ تم تو دنیا کے مال چاہتے ہو اور اللہ کا ارادہ آخرت کا ہے اور اللہ زور آور باحکمت ہے۔ اگر پہلے ہی سے اللہ کی طرف سے بات لکھی ہوئی نہ ہوتی تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس بارے میں تمھیں کوئی بڑی سزا ہوتی۔“

بعض علماء نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ آیت جس میں اختیار دیا گیا ہے کہ قیدی سے فدیہ لے لیا جائے، یا اس پر احسان کیا جائے، اس آیت سے منسوخ ہے: ﴿ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ﴾ [التوبة: ٥] ”پھر حرمت والے مہینوں کے گزرتے ہی مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو۔“ امام عوفی رحمہ اللہ نے اس کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور امام قتادہ، ضحاک، سدی اور ابن جریج رحمہ اللہ بھی اس کے قائل ہیں۔[1] دوسروں نے کہا اور یہ ان سے زیادہ ہیں کہ منسوخ نہیں ہے۔ پھر بعض نے کہا ہے کہ صرف امام کو اختیار دیا گیا ہے کہ قیدی پر احسان کرے یا اس سے فدیہ لے کر چھوڑ دے اور امام کے لیے جائز نہیں کہ اس کو قتل کرے۔

ان میں سے دوسروں نے یہ کہا ہے کہ امام کے لیے جائز ہے کہ اگر چاہے تو اسے قتل کرے، اس پر یہ حدیث دلیل ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں میں سے نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو قتل کیا اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثمامہ بن اثال سے فرمایا: اے ثمامہ! تیرے پاس کیا ہے تو اس نے عرض کی: اگر آپ قتل کریں گے تو ذودم کو، یعنی مستحق کو قتل کریں گے (یا یہ معنی ہیں کہ اگر مجھ کو قتل کیا تو ایسے شخص کو قتل کیا کہ جس کا خون طلب کیا جائے گا) اور اگر آپ احسان کریں گے تو ایک شکر گزار پر احسان کریں، یعنی میں آپ کے احسان کا شکر کروں گا اور اگر آپ مال چاہتے ہیں تو مانگیے آپ کو اس سے دیا جائے گا جو آپ چاہیں گے۔[2] امام شافعی رحمہ اللہ نے اتنا زیادہ فرمایا ہے کہ امام کو ان امور میں اختیار دیا گیا ہے کہ قیدی کو قتل کرے یا اس پر احسان کرے یا اس کا فدیہ لے یا اس کو غلام بنائے۔ یہ مسئلہ علم فروع میں تحریر کیا گیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہم نے بھی کتاب الأحکام میں اس کے دلائل بیان کر دیے ہیں۔[3] وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.

قولہ تعالیٰ: ﴿ حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یہاں تک کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نازل

[1] تفسیر الطبري (٢٢/١٥٤، ١٥٥) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤١١٤) [3] تفسیر ابن کثیر (٤/٢١٩)

ہوں۔[1] مجاہد نے یہ معنی گویا نبی ﷺ کے اس قول پاک سے اخذ کیے ہیں: «لَا تَزَالُ أُمَّتِي ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ حَتَّى يُقَاتِلَ آخِرُهُمُ الدَّجَّالَ»[2] امام احمد رحمہ اللہ نے جبیر بن نفیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ سلمہ بن نفیل رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو اس بات کی خبر دی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: بے شک میں نے گھوڑے چھوڑ دیے اور ہتھیار ڈال دیے اور لڑائی نے اپنے اوزار رکھ دیے اور میں نے اپنے جی میں کہا کہ لڑائی نہیں ہے تو نبی اکرم ﷺ نے اس سے فرمایا: «اَلْآنَ جَاءَ الْقِتَالُ» یعنی اب آئی لڑائی، میری اُمت کا ایک گروہ لوگوں پر ہمیشہ غالب رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کئی قوموں کے دل مائل کر دے گا (یعنی حق سے باطل کی طرف پھیر دے گا) تو وہ گروہ اُن سے لڑیں گے اور روزی دے گا ان کو اللہ تعالیٰ ان سے، یہاں تک کہ اللہ کا امر آجائے گا اور وہ اس حال پر ہوں گے۔ خبردار! مومنین کا عقد (حکومت، یعنی حکومت کے نشان قائم کرنا) شام میں ہے: «وَالْخَيْلُ مَعْقُوْدٌ فِيْ نَوَاصِيْهَا الْخَيْرُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ» یعنی قیامت تک گھوڑوں کی پیشانیوں کے بالوں میں خیر بندھی ہوئی ہے۔[3] (وهكذا رواه النسائي من طريقين عن جبير بن نفير عن سلمة بن نفيل السكوني به)

امام ابو القاسم بغوی رحمہ اللہ نے سیدنا نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ پر ایک فتح کی گئی تو لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! گھوڑے چھوڑ دیے گئے اور ہتھیار رکھ دیے گئے اور لڑائی نے اپنے اوزار رکھ دیے۔ لوگوں نے کہا کہ لڑائی نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ انھوں نے جھوٹ کہا، لڑائی تو اب آئی۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ایک قوم کے دل مائل کرتا رہے گا، وہ ان سے لڑیں گے تو اللہ ان کو ان سے روزی دے گا یہاں تک کہ اللہ کا امر آجائے گا اور وہ اس پر ہوں گے۔ اور دارِ مسلمین کا عقد شام میں ہے۔[4] (وهكذا رواه الحافظ أبو يعلىٰ الموصلي عن داود بن رشيد به والمحفوظ أنه من رواية سلمة بن نفيل كما تقدم)۔

یہ اس قول کو تقویت دیتا ہے جو منسوخ نہ ہونے کے متعلق ہے۔ یہ حکم لڑائی میں مشروع کیا گیا ہے، یہاں تک کہ لڑائی باقی نہ رہے گی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یہاں تک کہ شرک باقی نہ رہے۔[5] یہ قول اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ﴾ [البقرة: ١٩٣] ''ان سے لڑو جب تک کہ فتنہ نہ مٹ جائے اور اللہ تعالیٰ کا دین غالب نہ آجائے۔'' اور بعض نے کہا: یہاں تک کہ لڑائی اپنے اوزار رکھ دے، یعنی لڑنے والوں کے اوزار، یعنی مشرکین کے اوزار، اس طرح سے کہ اللہ عزوجل کی طرف توبہ کریں۔ کسی نے کہا: یہاں تک کہ لڑائی اپنے لوگوں کے اوزار رکھ دے اس طرح سے کہ وہ اپنی طاقت اللہ کی اطاعت میں خرچ کریں۔

---

[1] تفسير الطبري (١٥٧/٢٢) [2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٨٤) صحيح الجامع (٧٢٩٤)

[3] سنن النسائي، رقم الحديث (٣٥٦١) مسند أحمد (١٠٤/٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٩٣٥)

[4] صحيح ابن حبان (٢٩٦/١٦) [5] تفسير الطبري (١٥٧/٢٢)

قولہ تعالیٰ: ﴿ ذٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا۟ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ۗ ﴾ ''أَيْ: هٰذَا وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَانْتَقَمَ'' یعنی یہ بات جو مذکور ہوئی، اس کو سن چکے ذہن میں رکھو، اب دوسری سنو اور اگر چاہتا تو اپنے پاس کی عقوبت اور نکال ڈال کر کافروں سے بدلہ لیتا، لیکن اس نے تمھارے لیے جہاد اور دشمنوں سے جنگ کرنا مشروع کیا ہے، تاکہ تم کو آزمائے اور تمھارے اخبار و احوال جانچے، چنانچہ جہاد کے مشروع کرنے میں جو اللہ پاک کی حکمت ہے وہ خود اس نے سورت آلِ عمران اور سورت براءت کی آیتوں میں بیان کی ہے۔ سورت آل عمران میں فرمایا ہے: ﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ [آل عمران: ١٤٢] ''کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تم جنت میں چلے جاؤ گے، حالانکہ اب تک اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ تم میں سے جہاد کرنے والے کون ہیں اور صبر کرنے والے کون ہیں۔''

نیز سورت براءت میں اشارہ کیا ہے: ﴿ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ [التوبة: ١٤، ١٥] ''ان سے تم جنگ کرو اللہ تعالیٰ انھیں تمھارے ہاتھوں عذاب دے گا، انھیں ذلیل و رسوا کرے گا، تمھیں ان پر مدد دے گا اور مسلمانوں کے کلیجے ٹھنڈے کرے گا۔ اور ان کے دل کا غم و غصہ دور کرے گا اور وہ جس کی طرف چاہتا ہے رحمت سے توجہ فرماتا ہے اللہ جانتا بوجھتا حکمت والا ہے۔''

شہداء کی فضیلت:

پھر چونکہ جنگ کے حال میں سے یہ بات تھی کہ بہت سے مومن بھی قتل کیے جائیں، اس لیے ان کی تسلی اور سکون کی خاطر یہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴾ یعنی اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے، وہ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا بلکہ ان کو کثیر کرے گا اور بڑھائے گا اور کئی گنا کرے گا اور ان میں سے وہ شخص ہے کہ جب تک وہ عالم برزخ میں ٹھہرا رہے گا، اس کا عمل اس پر جاری رہے گا، جیسا کہ اس حدیث شریف میں وارد ہوا ہے جس کو امام احمد رحمہ اللہ نے قیس خزامی رضی اللہ عنہ (یہ ایک شخص ہیں جن کو شرفِ صحبت حاصل ہوا ہے) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شہید چھے خصلتیں دیا جاتا ہے: اس کے خون کے پہلے قطرے کے وقت اس کا ہر گناہ مٹا دیا جاتا ہے اور جنت میں اپنا ٹھکانا دکھایا جاتا ہے اور حورِ عین کے ساتھ اس کا نکاح کیا جاتا ہے، عذابِ قبر اور فزعِ اکبر، یعنی روزِ قیامت کی گھبراہٹ سے امن میں ہوتا ہے اور ایمان کا حلہ پہنایا جاتا ہے۔[1] (تفرد به أحمد)

[1] مسند أحمد (٤/ ٢٠٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الصحيحة: ٣٢١٣)

حدیثِ دیگر:

امام احمد رحمہ اللہ نے مقدام بن معدیکرب کندی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک شہید کے لیے اللہ کے نزدیک چھ خصلتیں ہیں: یہ کہ اس کے خون کے اول دفعہ میں اس کی بخشش کی جاتی ہے (اصل روایت میں اسی طرح ہے، لیکن "مجمع البحار" میں "أول دفعة بفاء" ہے، یعنی اول صبۃ، مراد خون کا پہلا قطرہ گرنا ہے)[1] اپنا ٹھکانا جنت میں دکھایا جاتا ہے اور ایمان کا حلہ پہنایا جاتا ہے اور حورِ عین سے نکاح کیا جاتا ہے، عذابِ قبر سے پناہ دیا جاتا ہے اور فزعِ اکبر سے امن میں ہوتا ہے اور اس کے سر پر وقار، یعنی حلم کا تاج جو موتی اور ایسے یاقوت سے جڑا ہوتا ہے جو دنیا وما فیہا سے بہتر ہے پہنایا جاتا ہے۔ اور بہتر (۷۲) حورِ عین بیویوں سے اس کا نکاح کر دیا جاتا ہے۔ "وَيُشَفَّعُ فِي سَبْعِينَ إِنْسَانًا مِنْ أَقَارِبِهِ"[2] (اصل میں اسی طرح ہے اور یہ الفاظ زائدہ معلوم ہوتے ہیں)۔ (وقد أخرجه الترمذي و صححه ابن ماجه)

صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عمرو اور ابو قتادہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شہید کے لیے ہر شے بخشی جاتی ہے سوائے قرض کے۔[3] (وروي من حديث جماعة من الصحابة ﷺ) سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شہید کی شفاعت اپنے گھر والوں میں سے ستر (۷۰) آدمیوں کے حق میں قبول کی جاتی ہے۔[4] (ورواه أبو داود) شہید کی فضیلت میں نہایت درجہ کثرت سے حدیثیں ہیں۔

جنت میں داخلے کا انداز:

قولہ تعالیٰ: ﴿ سَيَهْدِيهِمْ ﴾ یعنی ان کو جنت کی طرف راہ بتائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴾ [یونس: ۹] "یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے ان کا رب ان کو ان کے ایمان کے سبب ان کے مقصد تک پہنچا دے گا نعمت کے باغوں میں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔"

قولہ عزوجل: ﴿ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ﴾ یعنی اور درست کرے گا ان کے حال کو۔ ﴿ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ﴾ یعنی وہ ان کو اس جنت میں داخل کرے گا جو اس نے ان کو پہچنوا دی ہے اور ان کو اس کی راہ بتا دی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ جنت اپنے گھروں اور رہنے بسنے کی جگہوں کی طرف اور اس جگہ کی طرف راہ پائیں گے

---

[1] مجمع بحار الأنوار (۱۸۷/۲)

[2] مسند أحمد (۱۳۱/٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱٦٦۳) سنن ابن ماجه (۲۷۹۹) السلسلة الصحيحة (۳۲۱۳)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۸۸٦) [4] سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۵۲۲) صحيح الجامع (۸۰۹۳)

جو اللہ تعالیٰ نے ان کی قسمت میں کر دی ہے۔ وہ ان جگہوں میں پہنچنے میں غلطی نہیں کریں گے، گویا کہ وہ جب سے پیدا کیے گئے ہیں، انھیں میں رہتے بستے تھے، کسی سے ان کا راستہ نہیں پوچھیں گے۔[1] امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے اسی کے مثل روایت کیا ہے۔ امام محمد بن کعب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اپنے گھروں کو پہچان لیں گے جب وہ جنت میں داخل ہوں گے، جیسے تم اپنے گھروں کو پہچانتے ہو جب جمعہ سے لوٹتے ہو۔

امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا: ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ دنیا میں جو فرشتہ اس کے اعمال کی حفاظت پر مقرر کیا گیا تھا، وہ جنت میں اس کے آگے آگے چلے گا اور ابن آدم اس کے پیچھے پیچھے چلے گا، یہاں تک کہ وہ اس منزل کے پرلے کنارے پر آجائے گا جو اس کے لیے ہے اور اس کو ہر وہ شے بتا دے گا جو اللہ تعالیٰ نے اس کو جنت میں عطا فرمائی ہے، پھر جب وہ جنت میں اپنی منزل کے پرلے سرے تک پہنچے گا تو اپنی منزل اور بیبیوں کے پاس داخل ہو جائے گا اور فرشتہ واپس چلا جائے گا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس کو ذکر کیا ہے[2] اور اس بارے میں صحیح حدیث بھی وارد ہوئی ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو حدیث قتادہ سے عن ابی المتوکل الناجی عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس وقت آگ سے خلاصی پالیں گے تو جنت اور جہنم کے درمیان ایک پل پر روکے جائیں گے، وہ آپس میں ان مظالم کا مطالبہ کریں گے جو دنیا میں ان کے درمیان تھے، یہاں تک کہ جب خوب پاک صاف کر دیے جائیں گے تو اُن کے لیے جنت میں داخل ہونے کا اذن دیا جائے گا، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! ان میں سے ہر کوئی اپنے گھر کے راستے کو اس سے زیادہ جانتا ہو گا جتنا کہ وہ دنیا میں اپنے گھر کے راستے کو پہچانتا تھا۔[3] مطلب یہ ہے کہ دنیا میں آدمی اپنے گھر کے راستے کو خوب جانتا ہے اور بلا تکلف اپنے گھر میں چلا جاتا ہے، جنت میں اس سے بھی بڑھ کر اپنے گھر کو پہچان لے گا، گویا کہ وہ ہمیشہ سے اس میں رہتا بستا تھا۔

اللہ کی مدد کرو، وہ تمھاری مدد کرے گا:

پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ ﴾ یعنی اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ﴾ [الحج ٤٠] ''جو اللہ کی مدد کرے گا اللہ بھی ضرور اس کی مدد کرے گا۔'' یہ اس لیے فرمایا کہ جزا عمل کی جنس سے ہوتی ہے۔ اس لیے یہ ارشاد کیا ہے: ﴿ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ﴾ اور تمھارے پاؤں جما دے گا جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص صاحبِ حکومت کو اس شخص کی حاجت پہنچا دے جو اس کے پہنچانے کی طاقت نہیں رکھتا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے

[1] تفسير الطبري (١٦٠/٢٢) [2] تفسير ابن كثير (٢٢١/٤) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٠٨)

دن اس کے دونوں پاؤں پل صراط پر جما دے گا۔[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ ﴾ اور جو منکر ہوئے تو ان کو ٹھوکر لگے۔ یہ مومنین کے قدم جمانے کا عکس ہے جو اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی مدد کرنے والے ہیں۔ حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوا کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے: « تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ، تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ، تَعِسَ عَبْدُ الْخَمِيْصَةِ، تَعِسَ وَانْتَكَسَ وَإِذَا شِيْكَ فَلَا انْتُقِشَ »[2] یعنی بندۂ دینار کو ٹھوکر لگے، بندۂ درہم کو ٹھوکر لگے، کملی کے بندے کو ٹھوکر لگے، اسے ٹھوکر لگے اور سرنگوں کیا جائے اور جب اس کو کانٹا چبھے تو نکالا نہ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے شفا نہ دے جس کی خوشی اور ناخوشی دنیائے فانی کی اشیاء دینے اور نہ دینے پر ہے۔ شارع علیہ السلام نے ان کو ان اشیاء کا بندہ ٹھہرایا اور ان پر ہلاکت کی دعا کی۔ غرض یہ ہے کہ جو مومن اور مخلص چاک و چوبند ہو کر اللہ تعالیٰ کی مدد کے لیے کمر باندھیں گے تو وہ بھی ان کی مدد کرے گا اور ان کے پاؤں جما دے گا اور اس کے برعکس منکروں کے پاؤں اکھاڑ دے گا، وہ بھاگتے نظر آئیں گے وہ مقہور اور ذلیل وخوار ہوں گے۔

قولہ سبحانہ وتعالیٰ: ﴿ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴾ یعنی منکر لوگوں کے اعمال جن کو وہ اپنے خیال میں اچھے سمجھتے تھے، اللہ پاک نے ان کو ضائع اور بے کار کر دیا، اس لیے یوں فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴾ یعنی یہ اعمال کا باطل کرنا اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے اس شے کو ناپسند کیا جو اللہ نے نازل کی، یعنی اس کا ارادہ نہیں کرتے نہ اس کو دوست رکھتے ہیں تو اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ حرفِ فاء اس لیے آیا ہے کہ جو امر اس کے تحت میں ہے اس کو اپنے ماقبل پر مرتب کر دے، اس لیے کہ کافروں کے اعمال کا ضائع ہونا اور ان کا خائب و خاسر ہونا اور مومنوں کے حالات کی بہتری اور فلاح اور درستی، یہ باتیں اس قسم سے ہیں جو اس بات کو واجب کرتی ہیں کہ دونوں قسم کے لوگوں میں سے ہر ایک پر وہ احکام مرتب ہوں جو اس کے لائق ہیں، یعنی جب معاملہ ویسا ہے جیسا کہ مذکور ہوا تو جس وقت تم لڑائی میں مشرکوں سے ملو اور لڑو اور اُن لوگوں سے لڑو جو اہلِ کتاب ہیں اور ان کے ساتھ تمھارا کوئی معاہدہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ ذمی ہیں۔

﴿ فَضَرْبَ الرِّقَابِ ﴾ منصوب ہے اس بنا پر کہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ: فَاضْرِبُوا الرِّقَابَ ضَرْبًا"[4] یعنی تو گردنوں کو مارو اچھی طرح سے۔ مطلب یہ ہے کہ خوب قتل کرو۔ کسی نے

---

[1] ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے، البتہ تفسیر ابن کثیر (٢٢١/٤) میں اسی طرح ذکر ہے۔

[2] صحیح البخاري (٢٧٣٠) [3] تفسیر ابن کثیر (٢١٩/٤۔٢٢١) [4] معاني القرآن (٦/٥)

کہا ہے کہ منصوب بنا بر اغراء ہے "أَيْ: اِلْزَمُوْا ضَرْبَ الرِّقَابِ" یعنی لازم کرو گردنوں کا مارنا۔ ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ عرب کے قول کی طرح ہے: "یَا نَفْسُ صَبْرًا"[1] کسی نے کہا ہے کہ تقدیر یہ ہے: "اِقْصِدُوْا ضَرْبَ الرِّقَابِ" بہرحال نصب کی کوئی وجہ ہو، مراد قتل ہے۔ خاص کر کے رقاب کا ذکر اس لیے کیا کہ اکثر اوقات قتل گردن کے کاٹنے سے ہوتا ہے، یہ مراد نہیں کہ خاص طور پر گردن مارنا واجب ہے، کیوں کہ لڑائی کی حالت میں ممکن نہیں کہ ایسا ہو اور جو کام بن آتا ہے وہ قتل ہے، وہ اعضاء میں کسی جگہ میں ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ گردن مارنے کی وجۂ تخصیص یہ ہے کہ قتل کو گردن کے مارنے کے پیرائے میں ادا کرنے میں جو شدت اور سختی ہے، وہ صرف قتل کے لفظ میں نہیں ہے، کیونکہ ضربِ رقاب کیا ہے؟ یہ گردن کو کاٹ دینا ہے اور اس عضو کا اڑا دینا ہے جو بدن کا راس اور سردار ہے اور اس کا عضو تمام اعضاء میں سے عالی اور احسن ہے۔

﴿ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ ﴾ ماخوذ ہے "شے ثخین" "أَيْ: غَلِيْظٌ" سے، یعنی گاڑھی اور موٹی سخت شے کو ثخین کہتے ہیں۔ مصباح میں کہا ہے کہ "أَثْخَنَ فِي الْأَرْضِ إِثْخَانًا" کے یہ معنی ہیں کہ دشمنوں کی طرف چلا اور ان کو وسعت اور فراخی سے قتل کیا۔ "أَثْخَنْتُهُ" کے یہ معنی ہیں کہ میں نے اس کو زخم سے کمزور اور ضعیف کر ڈالا۔[2] اس کے معنی کی تحقیق سورۃ الانفال میں گزر چکی ہے۔[3] "وَثَاقٌ" بالفتح قید اور رسی کو کہتے ہیں اور بالکسر بھی آتا ہے۔ "وثاق" اس شے کا نام ہے جس سے کسی چیز کو باندھتے ہیں، جیسے: رباط۔

امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: "وَأَوْثَقَهُ فِي الْوَثَاقِ أَيْ: شَدَّهُ"[4] یعنی اس شے کو رسی وغیرہ سے باندھا۔ کہا اور "وِثَاقٌ" بالکسر "وَثَاقٌ" میں ایک لغت ہے، اس کی جمع "وُثُقٌ" ہے، جیسے: "رِبَاطٌ" کی جمع "رُبُطٌ" اور "عِنَاقٌ" کی جمع "عُنُقٌ"۔ جمہور نے "شُدُّوا" کو بہ ضم شین پڑھا ہے اور سلمی نے بہ کسرِ شین پڑھا ہے۔ غرضیکہ "حَتّٰى ضَرْبَ الرِّقَابِ" کے حکم کی انتہا ہے۔ غایت قتل کے بیان کے لیے نہیں ہے اور ﴿ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ﴾ سے پہلے دو جملے مقدر ہیں: "أَيْ: فَامْسِكُوْا عَنْهُمْ وَأْسِرُوْهُمْ وَاحْفَظُوْهُمْ بِالْوَثَاقِ"

اللہ پاک نے جو شدِ وثاق کا حکم دیا تو اس لیے کہ وہ فوت نہ ہو جائیں اور چھوٹ نہ جائیں، معنی یہ ہیں کہ تم کو ان کی گردنیں مارنے کا حکم دیا، یہاں تک کہ جس وقت تم نے ان کو بھاری کر دیا اور قتل اور زخموں نے ان کو چور کر ڈالا اور ان کو اُٹھنے اور حرکت کرنے سے روک دیا اور ان کے قتل میں خوب زیادتی کی اور ان میں قتل کی کثرت کر دی تو اب ان سے رک جاؤ اور ان کو قید کرو اور اُن کو قید کر کے محفوظ رکھو۔ ﴿ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً ﴾ جمہور نے بہ مد پڑھا ہے اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے "فَدًى" بہ قصر پڑھا ہے[5] دونوں منصوب ہیں بنا بر مفعول مطلق فعلِ مقدر سے۔ تقدیر

[1] تفسير القرطبي (٢٢٥/١٦) [2] المصباح المنير (٤٦/١) [3] رقم الآية (٦٧)
[4] الصحاح (٢٤٩/٥) [5] فتح القدير (٤٠/٥)

یہ ہے: ''فَإِمَّا أَنْ تَمُنُّوا عَلَيْهِمْ بَعْدَ الْإِسْرَاءِ وَشَدَّ الْوَثَاقِ مَنًّا وَإِمَّا أَنْ تَفْدُوا فِدَاءً'' یعنی یا تو تم ان کو قید کرنے کے بعد اور مضبوط باندھ لینے کے بعد ان پر بڑا احسان کرو گے، یا ان سے خوب فدیہ لے کر چھوڑ دو گے۔

مطلب یہ ہے کہ ان کو قید کر لینے کے بعد تم کو ان دو باتوں میں اختیار ہے۔ ''مَنّ'' سے مراد مفت چھوڑ دینا ہے بغیر معاوضہ لینے کے۔ اور ﴿ فِدَآءً ﴾ وہ شے ہے جس کو دے کر قیدی اپنے آپ کو قید سے چھڑاتا ہے۔ یہاں قتل کا ذکر نہ کیا، اس لیے کہ پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے، اس پر کفایت کی تو تین باتوں کا اختیار دیا گیا۔ ''مَنّ'' کو ﴿ فِدَآءً ﴾ سے پہلے اس لیے رکھا کہ ''مَنّ'' من جملہ مکارمِ اخلاق ہے اور اسی واسطے عرب لوگ اس کے ساتھ فخر کیا کرتے تھے، جیسا کہ ان کے شاعر نے کہا ہے:

وَلَا نَقْتُلُ الْأَسْرَى وَلَكِنْ نَفُكُّهُمْ إِذَا أَثْقَلَ الْأَعْنَاقَ حَمْلُ الْمَغَارِمِ

یعنی ہم وہ کریم الاخلاق لوگ ہیں کہ قیدیوں کو قتل نہیں کرتے، لیکن ان کو چھوڑ دیتے ہیں، جبکہ قرضوں کے لادنے سے گردنیں بھاری ہو جاتی ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ باوجود قرض کے بوجھ کے بھی قیدیوں سے نہ فدیہ لیتے ہیں نہ ان کو قتل کرتے ہیں، بلکہ ان کو مفت رہا کر دیتے ہیں، واہ کیا عالی ہمت ہیں! بالجملہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو اور مومنوں کو قیدیوں کے بارے میں اختیار دیا ہے کہ چاہیں تو ان کو قتل کر دیں، چاہیں ان کو غلام بنا لیں، چاہیں ان سے فدیہ لیں۔[1] ان کا دوسرا قول اس کے منسوخ ہونے کے متعلق پہلے گزر چکا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حجاج کے پاس قیدی لائے گئے تو اس نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو ایک قیدی دیا کہ اسے قتل کریں تو انھوں نے کہا کہ اس کا تو ہم کو حکم نہیں دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے، وہ صرف یہ ہے: ﴿ حَتَّىٰٓ إِذَآ أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا۟ ٱلْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَآءً ﴾[2] ان کی غرض یہ ہے کہ اس میں قتل کا ذکر نہی ہے، صرف ''من'' اور ''فداء'' کا ذکر ہے۔ لیث سے مروی ہے کہ میں نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے کہا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ قیدیوں کا قتل حلال نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَإِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَآءً ﴾ تو امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: تو اس کی پروا مت کر، میں نے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کو پایا ہے کہ وہ سب اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ منسوخ ہے۔ یہ تو صرف اس صلح میں تھی جو رسول اللہ ﷺ اور مشرکوں کے درمیان ہوئی تھی۔ پس لیکن آج کے دن یعنی اس وقت میں وہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ فَٱقْتُلُوا۟ ٱلْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ ﴾ [التوبة: ٥] ''مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو۔''

---

[1] الدر المنثور (٤٥٧/٧) [2] تفسير الطبري (١٥٥/٢٢)

نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ﴾ اگر مشرکینِ عرب ہیں تو ان سے قبول نہ کیا جائے گا مگر اسلام اور اگر وہ اسلام نہ لائیں تو قتل ہے اور اُن کے علاوہ جو لوگ ہیں وہ اگر قید کیے جائیں تو مسلمانوں کو ان کے بارے میں اختیار ہے چاہیں تو ان کو قتل کریں چاہیں ان کو زندہ رکھیں اور اگر وہ اپنا دین چھوڑ کر مسلمان نہ ہوں تو چاہیں تو ان سے فدیہ لیں اور اگر وہ اسلام ظاہر کریں تو ان سے فدیہ نہ لیا جائے اور رسول اللہ ﷺ نے بچوں اور عورتوں اور بوڑھے مردوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔[1]

پھر اللہ پاک نے ان چار امورِ مذکورہ (یعنی قتل و قید اور احسان رکھ کر چھوڑ دینا اور فدیہ لینا) کی انتہا کا ذکر فرمایا: ﴿ حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ﴾ یعنی امورِ مذکورہ اس وقت تک رہیں کہ لڑائی اپنے آلات و ہتھیار رکھ دے کہ جن کے بغیر اس کا قیام نہیں ہوتا مراد ہتھیار اور گھوڑے ہیں۔ وضع کی نسبت جو لڑائی کی طرف کی، حالانکہ وضع لڑائی کرنے والوں کا کام ہے تو یہ بطورِ مجاز ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان امورِ مذکورہ میں اختیار دیا گیا اس حد تک کہ کفار کے ساتھ جنگ نہ ہو اس طور سے کہ ان کی شان و شوکت باقی نہ رہے۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ یہاں تک کہ کوئی دین سوائے دینِ اسلام کے نہ رہے۔ امام حسن اور کلبی رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ یہ قول پہلے بھی گزر چکا ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہاں تک کہ مخلوق مسلمان ہو جائے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: یہاں تک کہ ایمان لے آئیں اور کفر جاتا رہے، یعنی صرف مسلم یا مسالم یعنی صلح کرنے والا باقی رہ جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ معنی ہیں: یہاں تک کہ لڑنے والے ہزیمت یا موادعت، یعنی صلح کے ساتھ اپنے ہتھیار رکھ دیں۔ امام حسن اور عطاء رحمہما اللہ سے مروی ہے، دونوں نے کہا کہ آیت میں تقدیم و تاخیر ہے۔ معنی یہ ہیں: "فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا فَإِذَا أَثْخَنْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ"[2]

علماء نے اس آیت میں اختلاف کیا ہے کہ آیا محکم ہے یا منسوخ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اہلِ اوثان کے حق میں منسوخ ہے اور یہ جائز نہیں کہ ان سے فدیہ لیا جائے اور نہ ہی ان پر احسان کیا جائے۔ اس کی ناسخ یہ آیت ہے: ﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ ﴾ [التوبة: ٥] اور یہ آیت ہے: ﴿ فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴾ [الأنفال: ٥٧] ''پس جب کبھی تو لڑائی میں ان پر غالب آ جائے انھیں ایسی مار مار کہ ان کے پچھلے بھی بھاگ کھڑے ہوں، ہوسکتا ہے کہ وہ عبرت حاصل کریں۔'' اور یہ آیت ہے: ﴿ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً ﴾ [التوبة: ٣٦] ''اور تم تمام مشرکوں سے جہاد کرو۔''

امام قتادہ، ضحاک، سدی اور ابن جریج رحمہم اللہ اور بہت سے کوفیین اسی کے قائل ہیں۔ ان لوگوں نے کہا ہے کہ سورۃ المائدہ سب سے آخری سورت ہے جو نازل کی گئی تو یہ واجب ہے کہ ہر مشرک کو قتل کیا جائے سوائے اس کے

[1] مصنف عبدالرزاق (٢١٠/٥) الدر المنثور (٤٥٨/٧، ٤٥٩) [2] تفسير القرطبي (٢٢٨/١٦، ٢٢٩)

جس کو چھوڑ دینے کی دلیل ہے، جیسے: عورتیں اور بچے اور وہ جن سے جزیہ لیا جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب سے یہی قول مشہور ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت ناسخ ہے: ﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ﴾ [التوبة: ٥] کی۔ یہ قول امام عطاء رحمہ اللہ وغیرہ سے مروی ہے۔ اور بہت سے علماء نے کہا ہے کہ آیت محکم ہے اور امام کو قتل کرنے اور قید کرنے کا اختیار دیا گیا ہے اور قید کے بعد احسان کے اور فدیے کے درمیان اختیار دیا گیا ہے۔ امام مالک، امام شافعی، ثوری، اوزاعی اور ابو عبید رحمہم اللہ وغیرہم اسی کے قائل ہیں۔

فتح البیان میں فرمایا ہے کہ راجح یہی قول ہے، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اس کو کیا ہے۔[1] امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فداء و اسراء نہیں ہوتا مگر اثخان اور قتل بالسیف کے بعد، اس کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ﴾ [الأنفال: ٦٧] ''نبی کے ہاتھ میں قیدی نہیں چاہئیں جب تک کہ ملک میں اچھی خونریزی کی جنگ نہ ہو جائے۔'' پھر جب اس کے بعد قید کرے تو جائز ہے کہ امام جو چاہے حکم کرے، یعنی ان کو قتل کرے یا نہ کرے۔[2] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریب ہے کہ تم میں سے جو شخص زندہ رہے وہ عیسیٰ علیہ السلام کو ملے، اس حال میں کہ وہ امام مہدی اور حاکمِ عادل ہوں گے، چنانچہ وہ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے اور جزیہ کو رکھ دیں گے اور لڑائی اپنے اوزار رکھ دے گی۔[3] (رواہ عبد بن حمید و ابن أبي حاتم و ابن مردویه و روی ابن مردویه وابن سعد وأحمد والنسائي والبغوي والطبراني عن سلمة بن نفیل رضي الله عنه عن النبي ﷺ من حدیث)

آپ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نہ رکھے گی لڑائی اپنے اوزار یہاں تک کہ نکلیں گے یاجوج اور ماجوج۔[4] امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بالجملہ ''حتی'' چار امور میں سے ایک کے لیے، یا سب کے لیے آخری حد ہے۔ اب رہے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تو ان کے نزدیک اگر حرب کو حربِ بدر پر محمول کیا جائے تو وہ احسان اور فدیے کے لیے آخری حد ہے اور اگر جنس پر محمول کیا جائے تو وہ ضرب و شد کے لیے آخری حد ہے۔ وضع سے مراد لڑائی کا ترک کرنا ہے، گو کوئی شخص اپنا ہتھیار گلے میں لٹکائے ہوئے ہو۔ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ محلِ رفع میں ہے اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے: ''أَيْ: اَلْأَمْرُ ذَلِكَ''، یعنی بات یہ ہے جس کا ذکر ہوا یا مفعولیت کی بنا پر محلِ نصب میں ہے بتقدیرِ فعل: ''أَيْ: اِفْعَلُوْا ذَلِكَ''، یعنی اس کام کو کرو جو مذکور ہوا۔ یا مبتداء ہے اور خبر محذوف ہے جس پر ماتقدم دال ہے: ''أَيْ: ذَلِكَ حُكْمُ الْكُفَّارِ'' یعنی اس کام کو کرو جو مذکور ہو چکا۔

اب دوسری بات سنو: ﴿ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَاۡ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ﴾ کا مطلب یہ

[1] فتح القدیر (٥/٤٠، ٤١) فتح البیان (١٣/٥١، ٥٢)
[2] تفسیر القرطبي (١٦/٢٢٧)
[3] الدر المنثور (٧/٤٦٠)
[4] سنن النسائي الكبرىٰ (٥/٢١٨) المعجم الكبير (٧/٥٣)

ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ کفار سے بدلہ لے اور ان کو ہلاک کرے اور عذاب کی قسموں میں سے جس قسم کے ساتھ چاہے ان کو عذاب کرے، مثلاً: زمین میں دھنسا دینا، یا زلزلہ آنا، یا اس کے سوا کسی اور طرح کا عذاب جو قتل کے علاوہ ہو، لیکن اس نے تم کو ان سے لڑنے کا حکم دیا، تاکہ تمھارے بعض کی بعض کے ساتھ آزمایش کرے تو اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کو اور اپنی آزمایش پر صبر کرنے والوں کو جان لے اور اُن کو بہت بڑا ثواب عطا کرے اور ان کے ہاتھوں سے کفار کو عذاب دے۔

پھر جو لوگ اس کی راہ میں شہید ہوئے ان کی جزا ذکر فرمائی: ﴿ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴾ جمہور نے ''قَاتَلُوْا'' بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے اور امام ابو عمرو اور حفص رحمہما اللہ نے ''قُتِلُوْا'' بہ صیغۂ مجہول، یعنی بہ تخفیف پڑھا ہے اور امام حسن رحمہ اللہ نے بہ تشدید بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔ اور جحدری، عیسی بن عمر اور ابو حیوہ رحمہم اللہ نے ''قَتَلُوا'' بہ صیغۂ معروف مع التخفیف بہ دوں الف پڑھا ہے۔[1] پہلے اور چوتھے کی بنا پر یہ معنی ہیں کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کا ثواب ضائع نہیں ہوتا۔ اور دوسرے اور تیسرے کی بنیاد پر یہ معنی ہیں کہ جو اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں، اسی طرح اللہ پاک ان کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: ہم سے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ یہ آیت اُحد کے دن نازل ہوئی اور مسلمانوں میں قتل اور زخم فاش (بڑے بڑے زخم) ہوئے تھے۔[2]

پھر اللہ پاک نے اس ثوابِ جزیل کا ذکر کیا جو اُن کے لیے اس کے پاس موجود ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ سَيَهْدِيْهِمْ ﴾ یعنی اللہ سبحانہ ان کو دنیا میں رشد کی راہ بتائے گا۔ رشد سے مراد عملِ صالح ہے اور اس میں اخلاص کرنا ہے اور آخرت میں ان کو ثواب عطا فرمائے گا۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کبھی ہدایت وارد ہوتی ہے اور اس سے مراد مومنوں کو جنت کے مسالک کی طرف راہنمائی کرنا اور ان راہوں کی طرف چلانا ہوتا ہے جو جنتوں کی طرف پہنچانے والی ہوتی ہیں۔ امام ابن زیاد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان کو قبر میں منکر و نکیر کے سوالوں کے جواب بتائے گا۔[3] مطلب یہ ہے کہ وہ ان کو پورا پورا جواب دیں گے، لیکن اس قول میں اتنی بات ہے کہ صحیح حدیثوں میں آچکا ہے کہ شہداء سے قبر میں سوال نہیں ہوتا تو پھر محاجۂ منکر و نکیر کی طرف ہدایت کرنے کے کیا معنی ہیں؟ ہاں! اگر ابن زیاد کے نزدیک شہید سے سوال ہوتا ہے تو ٹھیک ہے۔ واللّٰہ أعلم.

﴿ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ﴾ یعنی اور سنوار دے گا ان کے حال اور معاملے کو۔ کسی نے کہا ہے کہ ان سے جھگڑنے والوں کو راضی کر دے گا اور اُن کے اعمال قبول کرے گا۔ ﴿ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ ﴾ اور ان کو جنت میں داخل کرے گا۔ جملہ ﴿ عَرَّفَهَا لَهُمْ ﴾ مستانفہ ہے، یا حالیہ ہے بہ تقدیرِ ''قد''، یا بہ دوں تقدیر ''قد'' کے۔ (کما قالہ السمین)
یعنی اللہ پاک نے ان کے لیے جنت کو بیان کر دیا، یہاں تک کہ انھوں نے کسی سے پوچھنے کے بغیر اس کو پہچان لیا۔

---

[1] تفسیر القرطبي (١٦/٢٣٠) [2] تفسیر الطبري (٢٢/١٥٩) [3] فتح القدیر (٥/٤١)

یہ اس طرح ہے کہ جس وقت وہ جنت میں داخل ہوں گے تو اپنے منازل کی طرف متفرق ہو جائیں گے۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ عام مفسرین کا قول ہے۔

امام حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے دنیا میں ان کے لیے جنت کا وصف بیان کر دیا ہے، لہٰذا جب وہ اس میں داخل ہوں گے تو اس کی صفت سے اسے پہچان لیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس میں حذفِ مضاف ہے: "أَيْ: عَرَّفَ طُرُقَهَا وَمَسَاكِنَهَا وَبُيُوتَهَا" یعنی اس نے اس کے راستوں اور اس کے مساکن اور اس کے گھروں کی پہچان کرا دی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ پہچان کرانا ایک راہ بتانے والے کے ذریعے سے ہے جو اُن کو جنت بتا دے گا، یعنی وہ فرشتہ جو بندے پر متعین کیا گیا ہے، وہ اس کے آگے آگے چلے گا، یہاں تک کہ اس کو اس کی منزل میں داخل کر دے گا۔

امام مقاتل رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے،[1] لیکن اس قول کو وہ حدیث رد کرتی ہے جس کو امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور پہلے گزر چکی ہے،[2] یہ حدیث پہلے قول کی صحت پر دال ہے، یعنی جنت والے جب جنت میں داخل ہوں گے تو بلا تکلف بغیر بتائے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو پہچان لیں گے۔ کسی نے کہا: ﴿عَرَّفَهَا لَهُمْ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ "طَيَّبَهَا بِأَنْوَاعِ الْمَلَاذِ" یعنی اس کو ان کے لیے طرح طرح کی مزیدار چیزوں سے خوشبو دار کیا، ماخوذ ہے "عرف" سے۔ "عرف" خوشبو کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "حَدَّدَهَا لَهُمْ" یعنی ان کے لیے جنت کی حدیں مقرر کر دیں، اس طرح سے کہ ہر ایک کے لیے ایک علاحدہ اور الگ جنت ہو گی۔ کسی نے کہا ہے کہ آسمان والوں کو یہ بات معلوم کرا دی ہے کہ وہ جنت ان کے واسطے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی ان کو پہچان کرا دی، تاکہ اس میں ان کی کرامت ظاہر ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ مطیع لوگوں کو اُن کے اعمال کی پہچان کرا دی۔ پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔

پھر اللہ پاک نے ان کو وعدہ دیا کہ اگر وہ اس کے دین کی مدد کریں گے تو اللہ ان کی مدد کرے گا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ﴾ یعنی اے ایمان والو! اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے تو وہ کفار پر اور تمھارے دشمنوں پر تمھاری مدد کرے گا اور تم کو فتح دے گا۔ امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر تم اللہ کے نبی کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا۔[3] ﴿وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ﴾ اور تمھارے پاؤں جما دے گا اور لڑنے کے وقت میدانِ جنگ میں تم کو ثابت قدم رکھے گا۔ پس اقدام سے مراد لڑنے والوں کی پوری ذات ہے۔ ذات کو قدم کے پیرائے میں اس لیے ادا کیا کہ ثابت قدمی اور تزلزل (پھسلنا) کا ظہور پاؤں میں ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قدموں کی تثبیت سے مراد جنگ کے میدانوں میں مدد اور معاونت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تمھارے قدم اسلام پر

---

[1] فتح القدير (٤١/٥) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [3] تفسير القرطبي (٢٣٢/١٦)

ثابت رکھے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ پل صراط پر۔

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ ﴾ موصول محلِ رفع میں ہے بنا بر مبتداء اور خبر محذوف ہے۔ "فَتَعِسُوْا" (یعنی منہ کے بل گرائے جائیں) بہ دلیلِ ما بعد۔ حرفِ فاء کا خبر میں دخول اس لیے ہے کہ مبتداء کو شرط سے تشبیہ دی ہے اور "تَعْسًا" کا نصب اس بنا پر ہے کہ مفعول مطلق ہے فعل مقدر کا جو خبر ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مثل "سَقْيًا لَهُمْ وَرَعْيًا لَهُمْ" ہے: "أَيْ: سَقَاهُ اللّٰهُ سَقْيًا وَرَعَاهُ اللّٰهُ رَعْيًا"۔ "تَعْسٌ" کی اصل انحطاط اور عثار ہے، یعنی پشت ہونا اور ٹھوکر کھانا۔ امام ابن سکیت نے کہا کہ "تَعْسٌ" یہ ہے کہ اپنے منہ کے بل کھینچا جائے اور "نَكْسٌ" یہ ہے کہ اپنے سر کے بل کھینچا جائے۔ کہا: "تَعْسٌ" بہ معنی ہلاک بھی ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "تَعْسٌ" کی اصل "کب" ہے اور "کب" ضد ہے "انتعاش" کی۔ ("انتعاش" کے معنی گرے ہوئے کا اُٹھ کھڑا ہونا) اسی معنی سے مجمع بن ہلال کا قول ہے: ؎

تَقُوْلُ وَقَدْ أَفْرَدتُّهَا عَنْ حَلِيْلِهَا تَعِسْتَ كَمَا أَتْعَسْتَنِيْ يَا مُجَمِّعُ

یعنی وہ عورت کہتی ہے اس حال میں کہ میں نے اس کو اس کے خاوند سے علاحدہ کیا اور مجمع تو منہ کے بل گر یو، جیسا کہ تو نے مجھے منہ کے بل گرایا۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ: مَكْرَهًا لَهُمْ" یعنی ان کو مکروہ اور ناخوش شے لگی۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ: بُعْدًا لَهُمْ" یعنی ان کو ہر خیر سے دوری ہو۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ: خِزْيًا لَهُمْ" یعنی ان کو رسوائی ہو۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: "شِقَاءً لَهُمْ" یعنی ان کو بدبختی ہو۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: "شَتْمًا لَهُمْ" یعنی ان کو دشنام ہو۔ امام ثعلب رحمہ اللہ نے کہا: "هَلَاكًا لَهُمْ" یعنی ان کو ہلاکت ہو۔ امام ضحاک اور ابن زید رحمہما اللہ نے کہا: "خَيْبَةً لَهُمْ" یعنی ان کو نقصان اور زیاں ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ "قُبْحاً لَهُمْ" یعنی ان کو زبونی و زشتی ہو۔ اس قول کو نقاش رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔

نیز امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: "رَغْماً لَهُمْ" یعنی ان کی ناک خاک آلود ہو۔ نیز امام ثعلب رحمہ اللہ نے کہا: "شَرًّا لَهُمْ" یعنی ان کو برائی لگے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا: "شَقْوَةً لَهُمْ"[1] یعنی ان کو بدبختی ہو۔ "سَقُوْطاً لَهُمْ"[2] بھی ان سے مروی ہے، یعنی وہ گرے رہیں۔ کسی نے کہا: "وَالتَّعْسُ فِي الدُّنْيَا: اَلْعَثْرَةُ وَفِي الْآخِرَةِ اَلتَّرَدِّيْ فِي النَّارِ" یعنی تعس دنیا میں تو ٹھوکر کھانا اور آخرت میں نیچے گرنا ہے آگ میں۔

﴿ لَهُمْ ﴾ میں حرفِ لام بیان کے لیے ہے، جیسے: ﴿ هَيْتَ لَكَ ﴾ میں ہے۔ قولہ تعالیٰ ﴿ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴾ ماقبل پر معطوف ہے اور موصول کی خبریت میں داخل ہے، یعنی اور باطل کر دیے اللہ پاک نے ان کے اعمال، اس لیے

---

[1] تفسیر القرطبي (١٦/٢٣٢، ٢٣٣) [2] تفسیر البغوي (٧/٢٨١)

کہ وہ شیطان کی اطاعت میں تھے۔ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ مبتدائے محذوف کی خبر ہے: "أَيْ: الْأَمْرُ ذٰلِكَ" یا مبتداء ہے اور اس کی خبر محذوف ہے: "أَيْ: ذٰلِكَ الْأَمْرُ" یعنی بات یہ ہے کہ ان کو ہلاکت ہے اور ان کے اعمال ضائع کر دیے۔

پھر اس کی علت ذکر فرمائی: ﴿ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ یعنی یہ اس سبب سے ہوا کہ انھوں نے اس شے کو ناپسند کیا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر نازل کی، یعنی قرآن شریف جو شرعی احکام پر مشتمل ہے۔ ناپسندیدگی کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی مزین کی گئی خواہشوں میں مطلق العنانی اور آزادی کے عادی ہو رہے تھے۔ پھر جب قرآن ان چیزوں کو ترک کرنے کا حکم لے کر آیا تو اس کو مکروہ سمجھا اور اس سے ناخوش ہوئے۔ یا ﴿ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ سے مراد وہ کتابیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں پر نازل کیا، اس لیے کہ جو توحید اور بعث قرآن میں ہے، اسی پر وہ بھی مشتمل تھیں۔ ﴿ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴾ چنانچہ اللہ پاک نے اس سبب سے ان کے اعمال اکارت کر ڈالے۔ اعمال سے مراد وہ کام ہیں جو وہ کیا کرتے تھے، جن کی صورت خیر کی تھی اگرچہ وہ شروع ہی سے باطل تھے، اس لیے کہ کافر کا اس کے اسلام سے پہلے کا عمل مقبول نہیں ہوتا۔

پھر اللہ پاک نے کافروں کو ڈارایا اور ارشاد کیا کہ اگلے لوگوں کے حال سے عبرت لیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ یعنی کیا یہ لوگ قومِ عاد، قومِ ثمود اور قومِ لوط وغیرہم کی زمین میں چلے پھرے نہیں، تاکہ عبرت لیں اور دیکھیں کہ ان سے پہلے کے کافروں کا کیا حال ہوا، اس لیے کہ ان کے گھروں میں عذاب کے آثار اب تک باقی ہیں۔ پھر اللہ پاک نے پہلے کافروں کے ساتھ جو معاملہ کیا اس کا بیان فرمایا: ﴿ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ﴾ تدمیر بہ معنی ہلاک ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کر ڈالا اور جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ "يُقَالُ: دَمَّرَهُ وَدَمَّرَ عَلَيْهِ" دونوں کے ایک معنی ہیں اور دوسرے میں مبالغہ زیادہ ہے اس عموم کے سبب سے جو اس میں ہے، یعنی جان و مال اور اس کی طرح کی اور اشیاء تھیں جو اُن کے ساتھ خاص تھیں، ان سب کو ہلاک کر دیا۔

کلمۂ "علی" اس لیے ذکر کیا ہے کہ "دمر" میں "أطبق" کے معنی شامل ہیں اور "أطبق" کا صلہ "علی" آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان پر ہلاکت کو واقع کیا، اس حال میں کہ وہ ان کو احاطہ کیے ہوئے اور گھیرے ہوئے تھی، گویا کہ ہلاکت کا گھٹا ٹوپ اُن پر اور اُن کی ساری اشیاء پر ڈال دیا تھا اور اُن کی کوئی چیز ہلاکت کے دائرے سے باہر نہ رہی۔ یہ جملہ مستانفہ ہے جو سوالِ مقدر کا جواب ہے۔ گویا کسی نے کہا ہے کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوا تو یہ اس کا جواب ہے کہ ﴿ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ﴾

پھر اللہ پاک نے مشرکینِ مکہ کو وعید سنائی: ﴿ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ﴾ یعنی ان کافروں کے لیے جو اگلے کافروں کی چال چلنے والے ہیں: "أَمْثَالُ عَاقِبَةِ مَنْ قَبْلَهُمْ مِنَ الْأُمَمِ الْكَافِرَةِ" ہے، یعنی جیسا انجام ان سے پہلی کافر

اُمتوں کا ہوا، اسی کے مثل ان کا انجام ہونا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ اور ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَمْثَالُهَا ﴾ کی ضمیر ﴿ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ کی طرف راجع ہے۔[1] ''أمثال'' کو بہ صیغۂ جمع صرف اس لیے ذکر کیا کہ عذاب کی گئی اُمتوں کی تعداد کے لحاظ سے ان کے انجام مختلف ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ضمیر عقوبت کی طرف راجع ہے۔ کسی نے کہا: ''هلكة'' کی طرف راجع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''تدميرة'' کی طرف پھرتی ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ معنی صحیح ہونے کے باوجود ضمیر اسی شے کی طرف پھرتی ہے جو اس سے پہلے مذکور ہے۔ پھر جو شے مذکور نہیں ہے اس کی طرف پھیرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یعنی اے محمد! تیری قوم کے کافروں کے لیے مثال اس شے کی ہے جس کے ساتھ میں نے بستیوں کو ہلاک کیا ہے۔ پھر وہ تلوار سے ہلاک کیے گئے۔[2]

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ﴾ یعنی یہ جو ذکر کیا گیا کہ ان کافروں کے لیے امثال عاقبۃ من قبلہم بہ سبب اس کے ہے کہ اللہ مومنوں کا ناصر اور ولی ہے اور بہ سبب اس کے کہ کافروں کا کوئی ناصر نہیں ہے کہ اُن سے عذاب کو دور کرے۔ دوسرے ﴿ مَوْلٰى ﴾ سے مراد مددگار ہے، جیسا کہ اس کے مقابل سے لیا جاتا ہے اور یہ آیت کے مخالف نہیں ہے۔ ﴿ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ﴾ [الأنعام: ٦٢] ''پھر سب اپنے مالک حقیقی کے پاس لائے جائیں گے۔'' اس لیے کہ اس میں ﴿ مَوْلٰى ﴾ بہ معنی مالک ہے، بہ معنی ناصر نہیں ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ﴿ مَوْلَى الَّذِيْنَ ﴾ کے بجائے ''وَلِيُّ الَّذِيْنَ'' پڑھا ہے۔[3] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اُحد کے دن نازل ہوئی۔[4] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: کیا یہ اللہ کے ساتھ شریک کرنے والے اور اس کے رسول کو جھٹلانے والے زمین میں پھرے نہیں، تاکہ دیکھیں کہ ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو اُن سے پہلے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر اور تکذیب کی وجہ سے ان کو عذاب کیا اور مومنوں کو اُن کے درمیان سے نجات دی اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ﴾۔

پھر فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ﴾ اور اسی لیے جبکہ ابوسفیان صخر بن حرب جو اُحد کے دن مشرکوں کا رئیس تھا، اس نے کہا جب اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں پوچھا اور اس کو کسی نے جواب نہ دیا اور اس نے کہا کہ یہ لوگ تو واقعی ہلاک ہو چکے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو جواب دیا اور فرمایا: اے اللہ کے دشمن! تو نے جھوٹ کہا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے وہ شے باقی رکھی ہے جو تجھے بری لگے اور بے شک جن لوگوں کا تو نے شمار کیا ہے، البتہ وہ زندہ ہیں۔ چنانچہ ابوسفیان بولا: ''يَوْمٌ بِيَوْمِ

---

[1] معاني القرآن (٨/٥) تفسير الطبري (١٦٣/٢٢)
[2] الدر المنثور (٤٦٣/٧)
[3] تفسير الطبري (١٦٣/٢٢)
[4] تفسير القرطبي (٢٣٤/١٦) فتح البيان (٤٩/١٣_٥٧)

وَالْحَرْبُ سِجَالٌ“ یعنی یہ دن اُحد کا روزِ بدر کے عوض ہے اور لڑائی ڈول ہے، کبھی ہمارے ہاتھ میں کبھی تمھارے ہاتھ میں، خبردار! بے شک اب تم مثلہ پاؤ گے یعنی مقتولوں میں تم کو ناک کان کٹے لوگ ملیں گے، نہ تو میں نے اس کا حکم دیا اور نہ وہ مجھے برا لگا۔ پھر رجز پڑھنے لگا اور کہنے لگا: ”اُعْلُ هُبَلُ اُعْلُ هُبَلُ“ (”اعل علا یعلو“ سے صیغۂ امر ہے اور ”ھبل“ بہ ضمِ ہاء اُن کے ایک بت کا نام ہے) یعنی اے ہبل! تو بلند رُتبہ ہو، تیرے پوجنے والوں کو فتح ہوئی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم اس کو جواب کیوں نہیں دیتے؟ صحابہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! ہم کیا کہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یوں کہو: «اَللّٰهُ أَعْلَى وَأَجَلُّ» یعنی اللہ بلند تر و بزرگ تر ہے۔ پھر ابوسفیان بولا: ”لَنَا الْعُزّٰى وَلَا عُزّٰى لَكُمْ“ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اس کو جواب کیوں نہیں دیتے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! ہم کیا کہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہو: «اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ»[1] یعنی اللہ ہمارا ناصر ہے اور تمھارا کوئی ناصر نہیں ہے۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ ذکر کیا کہ اللہ مومنوں کا مولیٰ ہے تو اس کے بعد اپنی ولایت کا بیان کیا اور اس کا ثمرۂ اخروی ذکر فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴿١٢﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْۤ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴿١٣﴾

بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، اللہ انھیں ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں اور جن لوگوں نے کفر کیا، وہ (دنیا ہی کا) فائدہ اٹھاتے ہیں اور وہ یوں (بے فکرے ہوکر) کھاتے ہیں، جیسے چوپائے کھاتے ہیں، اور آگ ہی اُن کا ٹھکانا ہے ⑫ اور کتنی ہی بستیاں کہ وہ آپ کی اس بستی (مکہ) سے، جس (کے باشندوں) نے آپ کو نکال دیا ہے، کہیں زیادہ طاقتور تھیں، ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، پھر کوئی بھی اُن کی مدد کرنے والا نہ تھا ⑬

کفار کے لیے جہنم اور ابرار کے لیے جنت:

چوپایوں کی طرح کھانا یہ ہے کہ لالچ سے کھانا اور مسلمان ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کھاتے ہیں۔ انتھیٰ.

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٧٤) تفسير ابن كثير (٢٢١/٤، ٢٢٢)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، قیامت کے دن ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جو منکر ہوئے وہ اپنی دنیا میں ہی کھاتے ہیں اور تمام چیزیں برتتے ہیں اور اُن سے نفع اٹھاتے ہیں اور منہ بھر کر اور دانتوں کے کناروں سے کھاتے ہیں، اس طرح جیسے جانور کھاتے ہیں، کھانے پینے کے علاوہ ان کا کوئی کام اور فکر نہیں ہے۔ اس لیے صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ مومن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔[1] پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴾ یعنی اور آگ ان کی جزا کے دن اُن کی قیام گاہ ہے۔

اور کتنی بستیاں تھیں جو تیری اس بستی سے زیادہ زور اور طاقت والی تھیں جس نے تجھ کو نکالا، مراد مکہ معظمہ ہے۔ ہم نے ان کو برباد کر دیا اور اُن کا کوئی بھی مددگار نہ تھا۔ یہ اہلِ مکہ کے لیے ایک سخت دھمکی اور وعیدِ اکید ہے اس بارے میں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی، حالاں کہ آپ تمام رسولوں کے سردار اور خاتمِ انبیاء ہیں۔ جب اللہ عزوجل نے ان اُمتوں کو ہلاک کر ڈالا جنھوں نے آپ ﷺ سے پہلے کے رسولوں کی تکذیب کی اور اُن کی تکذیب کی وجہ سے ان کو تباہ و برباد کر دیا، حالانکہ وہ اُمتیں زور اور قوت میں ان لوگوں سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی تھیں تو پھر ان لوگوں کا کیا خیال ہے کہ دنیا اور آخرت میں ان کے ساتھ کیا کچھ معاملہ کرے گا۔ اگر رسول نبی الرحمۃ کے وجود کی برکت کے سبب سے دنیا میں ان کے بہت سوں سے عذاب اُٹھا لیا گیا تو جو اُن کے منکر ہیں ان پر قیامت کے دن تو ضرور عذاب کیا جائے گا اور اُن کے لیے دوگناہ عذاب کیا جائے گا۔ ﴿ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴾ [هود:٢٠]

"قرية" سے مراد قریہ والے ہیں، یعنی وہ لوگ جنھوں نے تجھ کو اپنے درمیان سے نکالا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب مکے سے غار کی طرف نکلے اور اس میں آئے تو مکے کی طرف منہ کیا اور فرمایا کہ تو اللہ کے سب شہروں سے زیادہ اللہ کو محبوب ہے اور تو اللہ کے سب شہروں سے بڑھ کر مجھے محبوب ہے اور اگر مشرک مجھے نہ نکالتے تو میں تجھ سے نہ نکلتا۔ سب دشمنوں سے بڑھ کر وہ دشمن ہے جس نے اللہ پر اس کے حرم میں زیادتی کی، یا کسی کو ناحق قتل کیا، یا کینہ و عداوت اور جاہلیت کے سبب سے قتل کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اکرم ﷺ پر یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ ﴾[2] (فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں: "لما خرج من مكة إلى الغار التفت إلى مكة وقال: أنت أحب بلاد الله إلي ولو لا أن أهلك

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٨٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٦٠)

[2] تفسير الطبري (١٦٥/٢٢) تفسير ابن كثير (٢٢٢/٤) اس کی سند میں "حنش حسین بن قیس" سخت ضعیف راوی ہے۔

أخرجوني منك لم أخرج. فأعتى الأعداء من عتا على الله في حرمه أو قتل غير قاتله أو قتل بذحول (الذحل الحقد و العداوة يقال: طلب بذحله أيْ: بثأره و الجمع ذحول[1] صحاح) الجاهلية فأنزل الله وكأين من قرية الآية")

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ آیت: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کی تفسیر کئی جگہ گزر چکی ہے اور اسی طرح باغوں کے نیچے نہریں بہنے کی کیفیت بیان ہو چکی ہے۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ منکر ہیں عاقبت میں غور و فکر نہ کر کے تھوڑے دنوں کے لیے متاعِ دنیا سے نفع اٹھاتے ہیں، اسی طرح کھاتے ہیں جس طرح سے جانور اپنی چراگاہ میں چرتے اور کھاتے ہیں اور نحر اور ذبح ہونا جو اُن کو عنقریب پیش آنے والا ہے، اس سے غافل ہو رہے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ گویا وہ جانور ہیں کہ سوا اپنے شکموں اور شرم گاہوں کے اور کچھ اُن کو فکر نہیں ہے اور اپنے انجام سے غافل ہیں اور جس عیش و عشرت میں لگے ہیں، اس میں مشغول ہو رہے ہیں، آخرت کی طرف توجہ نہیں کرتے۔[2]

جملہ ﴿ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال یہ مستانفہ ہے، یعنی یہ سب کچھ کر رہے ہیں، حالاں کہ آگ ان کا مقام ہے جس میں اقامت کریں گے اور منزل ہے جس میں نزول کریں گے اور جائے قرار ہے اس میں قرار پکڑیں گے، یا مثلاً: کسی نے پوچھا کہ اس کے بعد ان کا انجام کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آگ ان کی قیام گاہ ہے۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنَ النَّارِ وَأَهْلِ النَّارِ بِفَضْلِهِ وَكَرَمِهِ وَرَحْمَتِهِ الَّتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَى مُحَمَّدٍ وَّعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِيْنَ إِلَى يَوْمِ الدِّيْنِ، آمِين.

پھر اللہ پاک نے کفار کو خوف دلایا کہ جو قوت میں اُن سے بڑھ کر تھے، ان کو ہلاک کر چکا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ ﴾۔ پہلے گزر چکا ہے کہ "کأین" مرکب ہے کاف اور کلمہ "أي" سے اور بہ معنی کم خبریہ ہے (محل اس کا رفع بابتداء ہے) اور ﴿ مِّنْ قَرْيَةٍ ﴾ اس کی تمیز ہے اور ﴿ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ ... الخ ﴾ ﴿ قَرْيَةٍ ﴾ کی صفت ہے اور ﴿ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ﴾ صفت ہے ﴿ مِنْ قَرْيَتِكَ ﴾ کی اور ﴿ اَهْلَكْنٰهُمْ ﴾ خبر مبتداء ہے۔[3] كما في أبي السعود) "أَيْ: كَمْ مِنْ قَرْيَةٍ". امام اخفش رحمہ اللہ نے اس کی سند میں لبید کا شعر پڑھا ہے:

وَكَأَيِّنْ رَأَيْنَا مِنْ مُلُوْكٍ وَسُوْقَةٍ   وَمِفْتَاحِ قَيْدٍ لِلْأَسِيْرِ الْمُكَبَّلِ[4]

یعنی ہم نے بہت سے بادشاہوں کو اور رعایا کو دیکھا ہے اور ان لوگوں کو دیکھا ہے جو ان قیدیوں کی

---

[1] مختار الصحاح (۲۲۶/۱) [2] فتح البيان (۵۸/۱۳) [3] تفسير أبي السعود (۹۴/۸) [4] تفسير القرطبي (۲۳۵/۱٦)

بیڑیاں کھولنے والے تھے جن کو بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔

مضاف محذوف ہے، جیسا کہ "وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ" میں ہے: "أَيْ: وَكَمْ مِنْ أَهْلِ قَرْيَةٍ" یعنی بہت سے بستیوں والے تھے کہ وہ زور اور قوت میں تیری بستی والوں سے زیادہ سخت تھے، جنھوں نے تجھ کو اس سے نکالا۔ ہم نے ان کو ہلاک کر ڈالا۔ پس اسی طرح ہم تیری بستی والوں کے ساتھ کریں گے، لہٰذا تو صبر کر جیسا کہ ان بستیوں والوں کے رسولوں نے صبر کیا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے ان کو عذاب سے ہلاک کیا، جب انھوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا[1] ﴿فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ﴾ یعنی پھر ان کا کوئی مددگار نہیں تو قریشِ اہلِ مکہ، جو نبی کریم ﷺ کے بستی والے ہیں اور پہلی اُمتوں سے زیادہ ضعیف اور کمزور ہیں، بالاولیٰ ہلاک ہوں گے اور اُن کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

پہلے تو اللہ تعالیٰ نے ﴿أَهْلَكْنٰهُمْ﴾ سے یہ بیان کیا کہ ہم نے ان کو ہلاک کیا اور وہ خود اپنی جانوں سے عذاب کو دور نہ کر سکے، اس سے ان کو خلاصی نہ ہوئی۔ اس کے بعد ﴿فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ﴾ سے یہ بیان فرمایا کہ اعوان اور انصار کے واسطے سے بھی ان کو عذاب سے رہائی نصیب نہ ہوئی۔ اور حرفِ فاء سے ترتیب مقصود ہے ذکرِ عدم ما بالغیر کے عدم ما بالذات پر۔ قاعدہ یہ ہے کہ آدمی بلا کو خود آپ دور کرتا ہے اور آپ سے دور نہیں ہوتی تو کوئی مددگار اس کو دور کر دیتا ہے، چنانچہ نہ خود ان سے عذاب دور ہوا اور نہ کسی مددگار سے۔ اور یہ جملہ حالِ ماضی کی حکایت ہے، کیوں کہ ظاہر یہ تھا کہ یوں کہتے: "فَلَمْ يَنْصُرْهُمْ نَاصِرٌ" اس لیے کہ یہ قصۂ ماضی کی خبر دینا ہے۔ پھر اللہ پاک نے مومنوں اور کافروں کے فریق کا حال بیان کرنا شروع کیا اور یہ کہا کہ پہلا فریق تو اعلیٰ علیین میں ہے اور دوسرا فریق اسفل سافلین میں ہے اور ان میں سے ہر ایک کا جو حال ہے اس کی علت ذکر کی، چنانچہ فرمایا:[2]

أَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا أَهْوَآءَهُمْ ﴿14﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ فِيْهَآ أَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَأَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَأَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ وَأَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۭ وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ أَمْعَآءَهُمْ ﴿15﴾

کیا پھر وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر ہو، اس شخص کے مانند ہو سکتا ہے جس کے لیے اس کی بدعملی پرکشش بنا دی گئی اور انھوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی؟⑭ اس

[1] فتح القدير (٤٥/٥) [2] فتح البيان (١٣/ ٥٧، ٥٨)

جنت کی صفت جس کا متقین سے وعدہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اس میں (ایسے) پانی کی نہریں ہیں، جو بدلنے والا نہیں، اور ایسے دودھ کی نہریں ہیں، جس کا ذائقہ (کبھی) تبدیل نہ ہوا ہوگا، اور ایسی شراب کی نہریں ہیں، جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہے اور صاف شفاف شہد کی نہریں ہیں، اور وہاں ان (متقین) کے لیے ہر طرح کے پھل ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہوگی۔ (کیا یہ لوگ) ان لوگوں کے مانند ہو سکتے ہیں، جو آگ میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور انھیں گرم کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا، تو وہ اُن کی آنتیں ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا؟ ⑮

عبادت گزار اور خواہشِ نفس کا پجاری برابر نہیں:

وہاں کی شراب بامزہ ہے اور یہاں کی شراب بدمزہ ہے، بہشت میں ہر کسی کے گھر میں چار نہریں مقرر ہیں اور بعضوں کو اور زیادہ نہریں نصیب ہوں گی۔ انتہیٰ[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا پھر وہ شخص جو اللہ کے امر اور دین میں بصیرت اور یقین پر ہے اس ہدایت اور علم کے سبب سے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نازل کیا ہے اور اس فطرتِ مستقیم کے سبب سے جس پر اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے اس شخص کی طرح ہے جس کو اس کا برا انجام بھلا کر کے دکھایا گیا اور اس نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی۔ یعنی وہ شخص اس جیسا نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ﴾ [الرعد: ١٩] ''کیا وہ ایک شخص جو یہ علم رکھتا ہو کہ آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے جو اُتارا گیا وہ حق ہے، اس شخص جیسا ہوسکتا ہے جو اندھا ہو۔'' نیز فرمایا: ﴿ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ﴾ [الحشر: ٢٠] ''اہلِ نار اور اہلِ جنت (باہم) برابر نہیں۔ جو اہلِ جنت ہیں وہی کامیاب ہیں۔''

جنت کی نہروں کا ذکر:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: ''أَيْ: نَعْتُهَا'' یعنی مثل کے معنی نعت اور صفت کے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ غَيْرِ اٰسِنٍ ﴾ سے مراد غیرِ متغیر ہے۔ امام قتادہ، ضحاک اور عطا خراسانی رحمہم اللہ نے کہا: ''غَيْرِ مُنْتِنٍ'' یعنی وہ پانی بدبودار نہیں ہے۔ جب پانی کی بو متغیر ہو جاتی ہے تو عرب لوگ اپنے محاورے میں کہتے ہیں: ''أَسِنَ الْمَاءُ''.[1] حدیثِ مرفوع میں آیا ہے جس کو امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے وارد کیا ہے کہ مراد صاف پانی ہے کہ جس میں کسی طرح کا کدر نہیں ہے۔[2]

---

① تفسیر الطبري (٢٢/١٦٦، ١٦٧) تفسیر ابن کثیر (٤/٢٢٢)

② الدر المنثور (٧/٥٤٠، ٥٤١) یہ روایت مرسل ہے، نیز سند میں ''ابو معاذ سلیمان بن اَرقم بصری'' ضعیف راوی ہے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام مسروق رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ جنت کی نہریں مشک کے پہاڑ سے پھوٹتی ہیں۔① اور دودھ کی نہریں ہیں جن کا مزہ نہیں بدلا، یعنی نہایت درجے کی سفیدی، شیرینی اور چکنائی میں بالکل نہیں بدلیں۔

ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ وہ دودھ ماشیہ کے تھنوں سے نہیں نکلا۔② اور شراب کی نہریں ہیں جس میں پینے والوں کے لیے مزہ ہے۔ یعنی اس کا مزہ اور بو کریہ (برا) نہیں، جیسے: دنیا کی شراب ہوتی ہے، بلکہ اس کی صورت اور مزہ اور بوسب کچھ بہترین ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ﴾ [الصافات: ٤٧] ''اور نہ اس سے سر درد ہو اور نہ اس کے پینے سے بہکیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ لَا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ﴾ [الواقعة: ١٩] ''جس سے نہ سر میں درد ہو اور نہ عقل میں فتور آئے۔'' ﴿ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴾ [الصافات: ٤٦] حدیثِ مرفوع میں ہے کہ مردوں نے اپنے پاؤں سے اس کو نہیں نچوڑا ہے۔③ اور نہریں ہیں شہد کی جھاگ اتارا ہوا، یعنی انتہا درجے کی صفائی ہے اس کے رنگ، مزے اور خوشبو میں۔

مرفوع حدیث میں ہے کہ مہوک (شہد کی مکھی) کے پیٹوں سے نہیں نکلا۔④ امام احمد رحمہ اللہ نے عن حکیم بن معاویہ عن ابیہ روایت کیا ہے کہ میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: جنت میں دودھ کا دریا ہے اور پانی کا دریا ہے اور شہد کا دریا ہے اور شراب کا دریا ہے، پھر ان میں سے نہریں پھوٹتی ہیں۔⑤ (رواه الترمذي في صفة الجنة عن محمد بن بشار عن يزيد بن هارون عن سعيد بن إياس الجريري به وقال: حسن صحيح) امام ابوبکر بن مردویہ رحمہ اللہ نے عن یزید بن عبداللہ بن قیس عن ابیہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ نہریں جنتِ عدن کے ایک حوض سے بہتی ہیں، پھر اس کے بعد نہریں ہو کر پھٹتی ہیں۔⑥ صحیح میں ہے کہ جس وقت تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو اس سے فردوس کا سوال کرو، بے شک وہ اوسط الجنۃ و اعلی الجنۃ ہے، یعنی افضل جنت ہے اور جنت کی نہریں اسی سے پھوٹتی ہیں اور اس کے اوپر رحمان کا عرش ہے۔⑦

حافظ ابو القاسم طبرانی رحمہ اللہ نے عاصم بن لقیط سے روایت کیا ہے، کہا کہ لقیط بن عامر رضی اللہ عنہ ایلچی ہو کر رسول اللہ ﷺ کی طرف نکلا، میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! ''فَعَلٰى مَا يَطْلُعُ مِنَ الْجَنَّةِ'' یعنی پس

---

① تفسير ابن أبي حاتم (٦٦/١)

② الدر المنثور (٥٤٠/٧، ٥٤١) یہ روایت مرسل ہے، نیز سند میں ''ابو معاذ سلیمان بن ارقم بصری'' ضعیف راوی ہے۔

③ الدر المنثور (٥٤٠/٧، ٥٤١) یہ روایت مرسل ہے، نیز سند میں ''ابو معاذ سلیمان بن ارقم بصری'' ضعیف راوی ہے۔

④ الدر المنثور (٥٤٠/٧، ٥٤١) یہ روایت مرسل ہے، نیز سند میں ''ابو معاذ سلیمان بن ارقم بصری'' ضعیف راوی ہے۔

⑤ سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٧١) مسند أحمد (٥/٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢١٢٢)

⑥ تفسير ابن كثير (٢٢٣/٤) ⑦ صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٣٧)

کون سی شے پر طلوع کرتا ہے، یعنی ظاہر ہوتا ہے جنت سے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: عسلِ مصفی کی نہروں پر اور شراب کی نہروں پر کہ جس میں نہ سر درد ہے اور نہ ندامت ہے اور دودھ کی نہروں پر جس کا مزہ نہیں بگڑا اور ایسے پانی پر جو خراب نہیں ہوا اور میوے پر، البتہ قسم ہے تیرے معبود کی! جو کچھ تم جانتے ہو اور بہتر ہے اس کی مثل سے اور بیبیاں پاک۔ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا ہمارے لیے اس میں مصلحات بیویاں ہیں؟ فرمایا: صالحات واسطے صالحین کے، تم اُن سے اس طرح لذت لو گے جس طرح دنیا میں تمھاری لذت ہوتی تھی اور وہ لذت لیں گی تم سے سوائے اس کے کہ توالد نہیں ہے، یعنی اولاد پیدا نہیں ہو گی۔ [1]

امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: شاید تم خیال کرتے ہو کہ جنت کی نہریں زمین کے گڑھے میں بہتی ہیں۔ واللہ! بے شک وہ البتہ روئے زمین پر چلتی ہوئی بہتی ہیں، ان کے کناروں پر موتیوں کے قبے ہیں اور ان کی مٹی مشک ہے تیز خوشبو۔ [2] (وقد رواه أبو بكر بن مردويه من حديث مهدي بن حكيم عن يزيد بن هارون به مرفوعاً)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَهُمْ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ﴾ اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿ يَدْعُونَ فِيهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ آمِنِينَ ﴾ [الدخان: ٥٥] ''وہ دل جمعی کے ساتھ وہاں ہر طرح کے میووں کی فرمائشیں کرتے ہوں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجَانِ ﴾ [الرحمن: ٥٢] ''ان دو جنتوں میں ہر قسم کے میووں کی دو قسمیں ہوں گی۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَغْفِرَةٌ مِنْ رَبِّهِمْ ﴾ یعنی باوجود اس سب عیش و عشرت کے ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ ﴾ یعنی کیا یہ لوگ جن کا جنت میں مرتبہ ہم نے بیان کیا اس کی طرح ہیں جو ہمیشہ آگ میں رہنے والا ہے، یعنی وہ لوگ ان کی طرح نہیں ہیں اور وہ شخص جو درجات میں ہے اس کی طرح نہیں ہے جو درکات میں ہے۔ ﴿ وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ ﴾ یعنی اور نہایت درجہ گرم پانی پلائے گئے جس کی طاقت نہیں رکھی جاتی، پھر اس گرم پانی نے ان کے پیٹ کے اندر تمام چیزوں، یعنی انتڑیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ عِيَاذًا بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ۔ [3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت اور تفصیل کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ أَفَمَنْ ﴾ میں ہمزہ انکار کا ہے اور حرفِ فاء مقدر پر عطف کے لیے ہے، جیسا کہ اس کے نظائر میں ہوا کرتا ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''أَلَيْسَ الْأَمْرُ كَمَا ذُكِرَ'' ﴿ أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّهِ ﴾ میں کلمہ ﴿ مَنْ ﴾ مبتداء ہے اور اس کی خبر ﴿ كَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ ﴾ ہے۔

---

[1] المعجم الكبير (٢١١/١٩) مسند أحمد (١٣/٤) اس کی سند میں ''عبدالرحمان بن عیاش، دلہم اور اسود'' مجہول راوی ہیں۔

[2] حلية الأولياء (٢٠٥/٦) [3] تفسير ابن كثير (٢٢٢/٤_٢٢٤)

اس میں لفظ ﴿ مَنۡ ﴾ کا لحاظ کر کے فعلوں اور ضمیروں کو مفرد ذکر کیا ہے اور ﴿ وَاتَّبَعُوۡۤا اَهۡوَآءَهُمۡ ﴾ میں ﴿ مَنۡ ﴾ کے معنی کی رعایت کر کے فعل اور ضمیر کو جمع ذکر کیا ہے۔ معنی یہ ہیں: کیا بات ویسی نہیں ہے جیسی کہ ذکر کی گئی ہے، لہٰذا جو شخص کہ قرار پکڑنے والا اور اپنے رب کی طرف سے یقین پر جمنے والا ہے اور اللہ کے پاس سے حجت اور دلیل پر مستقر ہے، اس شخص کی طرح ہے جس کا برا عمل اس کے لیے اچھا کر دکھایا گیا ہے۔

برے عمل سے مراد بتوں کو پوجنا اور اللہ کے ساتھ شریک کرنا اور اللہ کی نافرمانیوں کے ساتھ عمل کرنا ہے، اور بتوں کے پوجنے میں اپنی خواہشوں کی پیروی کی اور طرح طرح کی گمراہیوں میں بغیر کسی شبہے اور شک کے منہمک ہوا، روشن دلیل کا تو ذکر ہی کیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں شخص برابر نہیں ہیں۔

پھر جب اللہ تعالیٰ دونوں فریقوں کے ہدایت یافتہ ہونے اور گمراہ ہونے میں فرق بیان کر چکا کہ ایک تو راہ پانے والا ہے اور دوسرا گمراہ ہے تو اس کے بعد اُن کے لوٹ کر جانے کی جگہ اور انجام کا فرق بیان کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ مَثَلُ الۡجَنَّةِ الَّتِىۡ وُعِدَ الۡمُتَّقُوۡنَ ؕ ﴾ یہ جملہ مستانفہ ہے اور اس لیے لایا گیا ہے کہ جنت کی خوبیوں کی تشریح کرے اور اس میں جو عجیب وغریب اشیاء ہیں ان کو بیان کرے، کون سی جنت؟ وہ جنت جس کا مومنوں کو وعدہ دیا گیا ہے۔ ﴿ مَثَلُ ﴾ سے مراد وہ عجیب صفت ہے جو غرابت اور ندرت میں "مثل" کی طرح ہے۔ اس کی ترکیب میں کئی وجہ ہیں۔ ایک یہ ہے کہ ﴿ مَثَلُ الۡجَنَّةِ ﴾ مبتداء ہے اور اس کی خبر مقدر ہے، پس نضر بن شمیل نے تو خبر کی تقدیر "مَا تَسۡمَعُوۡنَ" کی ہے۔

نیز قولہ تعالیٰ: ﴿ فِيۡهَاۤ اَنۡهٰرٌ ﴾ خبر کا مفسر ہے، یعنی اس جنت کا عجیب وصف، جس کا متقیوں کو وعدہ دیا گیا ہے، وہ ہے جو تم سنتے ہو۔ اس میں فلاں فلاں شے کی نہریں ہیں۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے یہ تقدیر کی ہے: "فِيۡمَا يُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ مَثَلُ الۡجَنَّةِ"[1] اور اس کے بعد کا جملہ بھی مثل کا مفسر ہے، یعنی جنت کی صفت اس شے میں ثابت ہے جو تم پر پڑھی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں فلاں فلاں شے کی نہریں ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کلمۂ ﴿ مَثَلُ ﴾ زائد ہے۔ تقدیر یہ ہے: "اَلۡجَنَّةُ الَّتِيۡ وُعِدَ الۡمُتَّقُوۡنَ فِيۡهَا أَنۡهَارٌ". تیسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ مَثَلُ الۡجَنَّةِ ﴾ مبتداء ہے اور ﴿ فِيۡهَاۤ اَنۡهٰرٌ ﴾ خبر ہے، لیکن یہ وجہ قابلِ امتناع ہے، اس لیے کہ اس جملے میں عائد نہیں ہے کہ مبتداء کی طرف راجع ہو۔ رہا مضاف الیہ کی طرف ضمیر کا پھرنا تو وہ نافع نہیں ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ ﴿ مَثَلُ الۡجَنَّةِ ﴾ مبتداء ہے اور ﴿ كَمَنۡ هُوَ خَالِدٌ فِى النَّارِ ﴾ اس کی خبر ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے اس کی یہ تقدیر کی ہے: "أَمَثَلُ أَهۡلِ الۡجَنَّةِ كَمَنۡ هُوَ خَالِدٌ" چنانچہ حرفِ انکار اور مضاف مقدر مانا

---

[1] فتح القدير (٤٥/٥)

ہے، تاکہ صحیح ہو جائے۔[1] امام زمخشری رحمہ اللہ نے اس وجہ کے بنانے کو یہ تقدیر کی ہے: "كَمَثَلِ جَزَاءِ مَنْ هُوَ خَالِدٌ"[2] اب اس وجہ کی بنا پر جملہ ﴿ فِيهَآ أَنْهَٰرٌ ﴾ میں تین وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ یہ جملہ حال ہے جنت سے: "أَيْ: مُسْتَقِرَّةً فِيهَا أَنْهَارٌ" یعنی مثل جنت کے کہ اس میں نہریں قرار پذیر ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے: "أَيْ: فِيهَا أَنْهَارٌ" گویا کسی کہنے والے نے کہا ہے کہ اس کی مثل کیا ہے؟ تو کہا گیا کہ ﴿ فِيهَآ أَنْهَٰرٌ ﴾۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ جملہ صلہ کے لیے تکرار ہو، اس لیے یہ صلہ کے حکم میں ہے، کیا تم دیکھتے نہیں کہ تمھارا یہ قول صحیح ہے: "اَلَّتِي فِيهَا أَنْهَارٌ"

بالجملہ چوتھی وجہ یہ ٹھہری کہ مثل سے پہلے ہمزہ مقدر اور جنت سے پہلے "أهل"، مضاف محذوف اور مجموعہ مل کر مبتداء اور خبر ﴿ كَمَنْ هُوَ خَٰلِدٌ فِي ٱلنَّارِ ﴾ ہے، جیسا کہ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ یا: ﴿ مَثَلُ ٱلْجَنَّةِ ﴾ کو جوں کا توں رہنے دو اور خبر کے جملے کی یہ تقدیر کرو: "كَمَثَلِ جَزَاءِ مَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ" جیسے کہ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کی ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ جب تقدیر یوں ٹھہری تو مثل کو حرفِ انکار سے کیوں خالی کیا اور "أهل" کا کلمہ کیوں محذوف ہوا؟ یا "مثل" اور "جزا" کا کلمہ کس لیے حذف کیا گیا؟ آخر اس کا کوئی نکتہ ہونا چاہیے، چنانچہ وہ نکتہ یہ ہے کہ جو شخص یہ مکابرہ (مقابلہ) کرتا ہے کہ ان دو شخصوں میں برابری کرتا ہے، ایک تو دلیل اور برہان پر ہے اور دوسرا ہوائے نفس کا تابع ہے تو منظور اس کے مکابرے کی تصویر بیان کرنا ہے، اس شخص کے مکابرے کے ساتھ جو جنت اور نار کے درمیان برابری کرتا ہے۔

وہ جنت جس کی صفاتِ جلیلہ بیان ہوئیں اور وہ نار جس کی اوصاف قبیحہ ہیں۔ ﴿ ءَاسِنٍ ﴾ بہ مد اور "أَسِنٍ" بہ قصر دونوں قراءتِ سبعیہ ہیں اور دو لغت ہیں، یعنی ایک معنی ہیں۔ امام اخفش رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ممدود سے مراد استقبال ہوتا ہے اور مقصور سے مراد حال۔ پہلے کا فعل "أَسَنَ يَأْسِنُ" مثل "ضَرَبَ يَضْرِبُ" ہے اور دوسرے کا فعل مثل "حَذَرَ يَحْذِرُ" ہے۔ "يُقَالُ: أَسَنَ الْمَاءُ يَأْسِنُ أَسُونًا إِذَا تَغَيَّرَتْ رَائِحَتُهُ" اسی کے مثل "أَجِنٍ" وزناً و معناً ہے۔ مد کے ساتھ جمہور کی قراءت ہے اور قصر کے ساتھ حمید و ابن کثیر رحمہما اللہ کی۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "غَيْرِ مُتَغَيِّرٍ"[4] یعنی دنیا کے پانی کے برخلاف، جو کسی عارض سے متغیر ہو جاتا ہے۔

﴿ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُۥ ﴾ یعنی اس دودھ کا مزہ نہیں بدلا۔ ترش نہیں ہوا، جیسے کہ دنیا کے دودھ متغیر ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ وہ اونٹ، گائے یا بکری کے تھنوں سے نہیں نکلا۔ اس لیے وہ نہ حامض ہو جاتا ہے اور نہ قارص اور نہ اس کا کوئی اور مکروہ مزہ ہو جاتا ہے (حامض کے معنی ہیں ترش اور قارص جو ترشی کی وجہ سے زبان کو کاٹتا ہے)۔ ﴿ لَّذَّةٍ

---

[1] اللباب في علوم الكتاب (١٧/٤٤١) [2] الكشاف (٤/٣٢٤)

[3] فتح القدير (٥/٤٥) [4] تفسير الطبري (٢٢/١٦٦، ١٦٧)

﴿ لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴾ جمہور نے بہ جر پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ خَمْرٍ ﴾ کی صفت ہے اور کسی نے بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مفعول مطلق ہے، یا مفعول لہ ہے اور کسی نے بہ رفع پڑھا ہے بنا بر صفت ﴿ اَنْهٰرٌ ﴾۔ محاورے میں بولتے ہیں "شَرَابُ لَذٌّ وَلَذِيذٌ وَفِيهِ لَذَّةٌ" بہ یک معنی۔ یعنی وہ شراب پینے والوں کے لیے لذیذ و مزیدار وخوش گوار ہوگی، اس سے کراہت نہ کریں گے بہ خلاف دنیا کی شراب کے جو پینے کے وقت کریہ ہوتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس میں نہ ترشی ہے نہ تندیٔ مزہ نہ تلخی ہے نہ گلوگیری ہے۔ اس کو نہ تو روندنے سے پاؤں نے میلا کیا ہے اور نہ نچوڑنے سے ہاتھوں نے چرک آلود کیا ہے۔ اس کے پینے سے نہ عقل جاتی ہے اور نہ دردِ سر ہوتا ہے، نہ خمار ہوتا ہے اور نہ شراب کی آفتوں میں سے کوئی اور آفت ہوتی ہے، بلکہ دنیا کی شرابوں کے ساتھ اس کی نسبت صرف لذت لینے اور طبیعت خوش کرنے کے لیے ہے اور بس۔

﴿ عَسَلٍ مُّصَفًّى ﴾ یعنی شہد میں جو موم اور کچرا اور تلچھٹ اور کدر ملا ہوا ہوتا ہے، وہ شہد اُن سب سے پاک وصاف ہے۔ علمائے لغت نے کلمۂ ﴿ عَسَلٍ ﴾ میں تذکیر و تانیث نقل کی ہے اور قرآن شریف میں مذکر آیا ہے، دیکھو اس کی صفت میں ﴿ مُّصَفًّى ﴾ صیغۂ مذکر فرمایا ہے۔ مصباح میں کہا ہے: "اَلْعَسَلُ يُذَكَّرُ وَيُؤَنَّثُ" اور تانیث اکثر ہے۔ "عُسَيْلَةٌ" اس کی تصغیر کی جاتی ہے۔[1] لغتِ تانیث کی بنا پر اس طرف گئے ہیں کہ وہ جنس سے ایک قطعہ و طائفہ ہے۔ مختار میں بھی اسی طرح ہے اور یہ کہا ہے کہ عاسل وہ شخص ہے جو مکھیوں کے چھتے سے شہد نکالتا ہے اور "اَلنَّحْلَةُ عُسَالَةٌ"[2] امام کعب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ نہرِ نیل نہرِ عسل ہے جنت میں اور نہرِ دجلہ جنت میں نہرِ لبن ہے اور نہرِ فرات جنت میں نہرِ خمر ہے اور نہرِ سیحان جنت میں نہرِ ماء ہے۔[3] (أخرجه حارث بن أبي أسامة في مسنده و البيهقي)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سیحان و جیحان و نیل و فرات ہر ایک جنت کی نہروں میں سے ہے۔[4] (أخرجه مسلم)۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سیحان و جیحان غیر سیحون و جیحون ہیں اور وہ دونوں جو جنت سے ہیں سو وہ بلادِ ارمن میں ہیں، چنانچہ سیحان تو نہرِ اردنہ ہے اور جیحان نہرِ مصیصہ ہے۔ یہ دونوں بہت بڑی نہریں ہیں، ان میں سے بڑی جیحان ہے۔ ان کے مقام کے بارے میں یہی قول صحیح ہے۔ پھر اس کے بعد ایک طویل کلام ذکر کیا ہے۔ پھر کہا ہے: اب رہا ان نہروں کا آبِ جنت سے ہونا تو اس میں دو تاویلیں ہیں، صحیح تاویل دوسری ہی ہے کہ وہ اپنے ظاہر پر ہیں اور اُن کے لیے جنت سے ایک مادہ ہے جو آج مخلوق و موجود ہے۔ یہ اہلِ سنت کا مذہب ہے۔[5]

﴿ وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ﴾ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ زاید ہے جو تاکید کے لیے ہے، یعنی جنت میں اہلِ جنت

---

(1) المصباح المنير (٢١٢/١) (2) مختار الصحاح (٤٦٧/١) (3) بغية الباحث عن زوائد مسند الحارث (٩٤٤/٢)

(4) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٣٩) (5) المنهاج للنووي (١٧٦/١٧، ١٧٧)

کے لیے ان پینے کی چیزوں کے علاوہ جن کا ذکر ہوا پھلوں کی تمام اقسام ہیں۔ مشروب کے بعد جو ثمرات کا ذکر کیا تو اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اہلِ جنت کا کھانا حاجت کے لیے نہیں ہے، بلکہ لذت کے لیے ہے۔ اسی لیے پھلوں کا ذکر مشروب کے بعد کیا گیا ہے، کیوں کہ میوے تفکہ اور لذت کے لیے ہوتے ہیں۔ ﴿ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ﴾ حرف واؤ مطلق جمع کے لیے ہے۔ وہ ترتیب اور مہلت کے لیے بالکل نہیں ہے۔ اور تنکیر تعظیم کے لیے ہے، یعنی ان کے لیے بڑی مغفرت ہے جو اُن کے رب کی طرف سے اُن کے جنت میں داخل ہونے سے پہلے ان کے گناہوں کے لیے ہونے والی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اہلِ جنت پر جو انعامات ہیں ان کا ذکر ہے کہ اُن کے لیے جنت میں قسم قسم کی پینے کی چیزیں ہیں اور طرح طرح کے میوے ہیں اور جنت میں داخل ہونے سے پہلے اُن کے گناہ بخش دیے گئے۔ یہی گناہوں کی بخشش ہی تو اُن کے جنت میں پہنچنے کا سبب بنی اور ہمیشہ کی عیش اور نعمتوں کی فراوانی نصیب ہوئی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مغفرت کا ذکر بعد میں کیا، اب یہ شبہہ نہ ہوگا کہ مغفرت تو جنت میں داخل ہونے سے پہلے ہوتی ہے نہ کہ جنت میں داخل ہونے کے بعد۔ یا یوں کہو کہ مغفرت سے مراد رضا ہے، یعنی اللہ پاک جنت والوں کو طرح طرح کی نعمتیں عطا فرمائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ ان سے راضی ہوگا۔

بہ خلاف اس کہ دنیا میں کبھی غلاموں کا مالک غلاموں پر احسان کرتا ہے اور ان پر خفا رہتا ہے۔ مگر جنت میں ایسا نہیں ہے، بلکہ وہاں تو روح و ریحان ورضائے رحمان ہے، یا یوں کہو کہ جنت والے وہاں پر جو کھائیں پئیں گے ان سے رفعِ تکلیف ہوگی بہ خلاف دنیا کے کہ اس کے کھانے پینے پر حساب و سزا مترتب ہوتے ہیں اور جنت کی نعمتوں پر نہ کچھ حساب ہے نہ اس پر کسی طرح کا عقاب ہے۔ تو مغفرت کے معنی تکلیف رفع کرنے کے ہوئے، لو اب تو عین جنت میں مغفرت ہونا درست ہوگیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ كَمَنْ هُوَ خَٰلِدٌ فِي النَّارِ ﴾ مبتدائے محذوف کی خبر ہے: "أَيْ: أَمَّنْ هُوَ فِيْ نَعِيْمِ الْجَنَّةِ عَلَى هَذِهِ الصِّفَةِ خَالِدًا فِيْهَا كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ" کیا وہ شخص جو جنت میں ہمیشہ ہمیشہ کے عیش و آرام میں ہے، اس شخص کی طرح ہے جو آگ میں ہمیشہ رہنے والا ہے؟ ہرگز یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ یا خبر ہے ﴿ مَثَلُ الْجَنَّةِ ﴾ کی، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے پہلی وجہ کو ترجیح دی ہے۔ چنانچہ کہا: مراد یہ ہے: "أَمَّنْ كَانَ فِيْ هَذَا النَّعِيْمِ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ" کواشی نے یہ تقدیر کی ہے "أَمَثَلُ هَذَا الْجَزَاءِ الْمَوْصُوْفِ كَمَثَلِ جَزَاءِ مَنْ هُوَ خَالِدٌ" یہ تقدیر لفظ سے ماخوذ ہے تو یہ بہت خوب ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ: أَفَمَنْ كَانَ عَلَى بَيِّنَةٍ مِنْ رَّبِّهِ وَأَعْطَى هَذِهِ الْأَشْيَاءَ كَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوْءُ

عَمَلِهِ وَهُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ» یعنی کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہے اور یہ چیزیں دیا گیا، وہ اس شخص کی طرح ہے جس کو اس کا برا عمل اچھا دکھایا گیا اور وہ آگ میں ہمیشہ رہنے والا ہے۔ امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا: "لَيْسَ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي فِيهَا الثِّمَارُ وَالْأَنْهَارُ كَمَثَلِ النَّارِ الَّتِي فِيهَا الْحَمِيمُ وَالزَّقُّومُ وَلَيْسَ مَثَلُ أَهْلِ الْجَنَّةِ فِي النَّعِيمِ كَمَثَلِ أَهْلِ النَّارِ فِي الْعَذَابِ الْأَلِيمِ"[1] یعنی اس جنت کی صفت جس میں میوے ہیں اور نہریں ہیں اس آگ کی صفت کی طرح نہیں ہے جس میں کھولتا ہوا پانی ہے اور زقوم کا درخت ہے اور اہلِ جنت کا وصف نعمتوں میں اہلِ نار کے عذابِ الیم میں وصف کی طرح نہیں ہے۔ اس کے سوا اور بھی کہا ہے۔

﴿ وَسُقُوا مَآءً حَمِيمًا ﴾ معطوف ہے صلہ پر۔ عطف جملہ فعلیہ کا جملہ اسمیہ پر، لیکن پہلے میں لفظ "من" کی رعایت کی ہے اور دوسرے میں "من" کے معنی کی رعایت کی ہے۔ "حمیم" گرم اور سخت جوش مارنے والا پانی ہے، لہٰذا جب وہ اس کو پییں گے تو وہ اُن کی آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ یہ اس قول کے معنی ہیں: ﴿ فَقَطَّعَ أَمْعَآءَهُمْ ﴾ یعنی ان کے مصارین کو قطع کر دے گا (مصارین جمع ہے "مصران" کی۔ اور "مصران" "مصیر" کی جمع ہے جیسے "رغیف ورغفان" "مصیر" بمعنی رودہ۔) تو وہ اُن کی دبروں سے نکل پڑیں گے اس کی گرمی کی وجہ سے۔ "أمعاء" جمع ہے "معي" بالقصر کی اس کا الف مبدل ہے یاء سے، اس لیے کہ اس کے تثنیہ میں "معیان" بولتے ہیں۔ "أمعاء" وہ حوایا ہیں جو پیٹوں میں ہیں۔[2] ("حوایا" جمع "حویة" بہ معنی چرب رودہ)

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ حَتَّىٰٓ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِندِكَ قَالُوا لِلَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ آنِفًا ۚ أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوٓا أَهْوَآءَهُمْ ﴿١٦﴾ وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ ﴿١٧﴾ فَهَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَن تَأْتِيَهُم بَغْتَةً ۖ فَقَدْ جَآءَ أَشْرَاطُهَا ۚ فَأَنَّىٰ لَهُمْ إِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرَاهُمْ ﴿١٨﴾ فَاعْلَمْ أَنَّهُۥ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوَاكُمْ ﴿١٩﴾

اور ان (منافقین) میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف کان لگاتے ہیں، حتی کہ جب وہ آپ کے پاس سے نکلتے ہیں تو ان لوگوں سے، جنھیں علم دیا گیا ہے، کہتے ہیں: اس (نبی) نے ابھی کیا کہا تھا؟ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور انھوں نے اپنی

[1] تفسیر القرطبي (۲۳۷/۱۶) [2] فتح البیان (۱۳/۵۸-۶۲)

خواہشات کی پیروی کی ⑯ اور جن لوگوں نے ہدایت پائی ہے، اللہ نے انھیں ہدایت میں زیادہ کیا اور انھیں ان کا تقویٰ عطا فرمایا ⑰ چناں چہ یہ لوگ تو بس قیامت ہی کے منتظر ہیں کہ وہ ان کے پاس اچانک آجائے، یقیناً اس کی نشانیاں آچکی ہیں، تو جب قیامت ان کے پاس آپہنچے گی تو ان کے لیے کہاں ہوگا نصیحت حاصل کرنا ⑱ پس (اے نبی!) آپ جان لیجیے کہ بلاشبہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور اپنے گناہ کی بخشش مانگیے اور مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی، اور اللہ تمھاری نقل وحرکت اور تمھارے ٹھکانے کو جانتا ہے ⑲

منافقین کا حال اور توحید واستغفار کا حکم:

انھیں ہدایت میں اور بڑھا دیا ہے، یعنی نبی اکرم ﷺ کے کلام کا اثر ہوا اور گناہوں سے بچنے لگے۔ قیامت کی علامتوں میں سے بڑی نشانی تو ہمارے نبی ﷺ کا پیدا ہونا ہے۔ سب نبی خاتم النبیین کی راہ دیکھتے تھے، جب وہ آچکے تو اب قیامت ہی باقی رہ گئی۔ اللہ کو تمھارے رہنے سہنے کی جگہ معلوم ہے، یعنی جتنے پردوں میں تم پھرو گے پھر جنت یا دوزخ میں اپنے اپنے گھر میں پہنچو گے۔ انتہی[1]۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ منافقوں کی بے پروائی اور کم فہمی کی خبر دیتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھتے تھے اور آپ ﷺ کی بات سنتے تھے مگر اس میں سے کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے، پھر جب آپ ﷺ کے پاس سے نکلتے تھے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہتے تھے جن کو علم دیا گیا تھا کہ اس شخص نے کیا کہا؟ ابھی جو کہا جاتا تھا اس کو نہ سمجھتے تھے اور نہ اس کی کچھ پروا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴾ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور انھوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی، لہٰذا نہ تو ان میں فہم ہے اور نہ ان کا سمجھنے کا ارادہ ہے۔ پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى ﴾ یعنی اور جنھوں نے ہدایت کا قصد کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کی توفیق دی، پھر اس کی طرف ان کو راہ بتائی اور اس پر ان کو ثابت رکھا اور اس سے ان کو زیادہ دیا۔ ﴿ وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴾ یعنی اور ان کو ان کی ہدایت کا الہام کیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ ﴾ یعنی اب جو لوگ ہدایت کے اسباب آجانے کے بعد اس کا ارادہ نہیں رکھتے تو وہ بس اس گھڑی کی راہ دیکھتے ہیں کہ ان پر اچانک آجائے اور وہ اس سے غافل ہوں، کیونکہ اس کے قریب ہونے کی نشانیاں آچکی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ان فرامین میں ہے: ﴿ هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ۝ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴾ [النجم: ٥٦۔ ٥٧] ''یہ (نبی) ڈرانے والے ہیں پہلے ڈرانے والوں میں سے۔ آنے والی گھڑی قریب آگئی ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴾ [القمر: ١] ''قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا۔'' نیز فرمایا:

﴿ اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ﴾ [النحل: ١] ''اللہ تعالیٰ کا حکم آ پہنچا، اب اس کی جلدی نہ مچاؤ۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ١] ''لوگوں کے حساب کا وقت قریب آ گیا پھر بھی وہ بے خبری میں منہ پھیرے ہوئے ہیں۔''

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا مبعوث ہونا قیامت کی نشانیوں میں سے ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ وہ خاتم رسل ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دین کو کامل کر دیا اور دنیا کے لوگوں پر اُن سے حجت قائم کر دی اور خود آپ ﷺ نے قیامت کی علامتوں کی خبر دی اور ان کو ایسا واضح طور پر بیان کر دیا کہ ویسی وضاحت آپ ﷺ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئی۔ چنانچہ اس کا بیان بجائے خود مبسوط (پھیلا ہوا) ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ محمد ﷺ کی بعثت قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔ بات ویسی ہی ہے جیسی انھوں نے فرمائی، اسی لیے آپ ﷺ کے اسمائے مبارک میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نبی التوبہ ہیں اور نبی الملحمہ اور حاشر ہیں جن کے قدموں پر لوگ حشر کیے جائیں گے اور عاقب ہیں کہ جن کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔[1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے اپنی دو انگلیوں سے اس طرح اشارہ کر کے فرمایا، یعنی بیچ کی انگلی اور اس کے ساتھ والی انگلی سے کہ میں اور قیامت مثل ان دو انگلیوں کے بھیجے گئے۔[2] پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ﴾ یعنی پھر کافروں کو نصیحت پذیر ہونا کیسے نصیب ہوگا جبکہ اُن پر قیامت آ پہنچی، کیوں کہ یہ ان کو کچھ فائدہ نہ دے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴾ [الفجر: ٢٣] ''اس دن انسان کو سمجھ آئے گی مگر آج اس کے سمجھنے کا فائدہ کہاں؟'' نیز فرمایا: ﴿ وَقَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴾ [سبا: ٥٢] ''اس وقت کہیں گے کہ ہم اس قرآن پر ایمان لے آئے لیکن اس قدر دور جگہ سے (مطلوبہ چیز) کیسے ہاتھ آ سکتی ہے۔''

قولہ عزوجل: ﴿ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ اس بات کی خبر دیتا ہے کہ نہیں کوئی معبود مگر اللہ۔ اس سے یہ نہیں بنتا (اس جگہ امر کا نہ ہونا محلِ خفا میں ہے۔ جب معتبر تفاسیر کی تاویل کو اختیار کیا جائے تو اس جگہ پر امر کا کوئی مانع نہیں۔ نیز حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی یہ عبارت جو آگے تحریر ہے: ''ولهذا عطف عليه بقوله واستغفر لذنبك'' اور بھی تعجب خیز ہے، کیوں کہ یہ عطف پہلے جملے کے امر ہونے کی تائید کرتا ہے، پھر اس سے امر نہ ہونے کی تائید کیسے ہو سکتی ہے، اس جگہ جو تفاسیر میں تاویل کی ہے، وہ یہ ہے کہ امر بہ علم سے مراد امر دوام وثبات بہ علم ہے یا مخاطب آپ ہیں اور مراد امت ہے۔ از مصحح سلمہ اللہ تعالیٰ) کہ اللہ پاک لا الہ الا اللہ کے جاننے کا آپ کو امر

---

[1] تفسير ابن كثير (٢٢٤/٤) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٥٢)

کرے، یعنی اس لیے کہ انبیاء تو نبوت سے پہلے ہی موحد ہوتے ہیں نبوت کے بعد کا ذکر کیا ہے اور اسی لیے اس پر اس قول کا عطف فرمایا ہے: ﴿ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ﴾.

صحیح میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي خَطِيئَتِي وَجَهْلِي وَإِسْرَافِي فِي أَمْرِي وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي هَزْلِي وَجِدِّي وَخَطَايَايَ وَعَمْدِي وَكُلُّ ذٰلِكَ عِنْدِي»[1] یعنی اے اللہ! تو بخش دے میرے لیے میرا گناہ اور میری نادانی اور اپنے کام میں میرا حد سے بڑھنا اور وہ شے جس کو تو مجھ سے بڑھ کر جانتا ہے۔ اے اللہ تو میرے لیے ہزل کو بخش دے اور میرے جد (کوشش) کو اور میری خطا کو اور میرے عمد کو اور یہ سب میرے پاس ہے۔

صحیح میں ہے کہ آپ ﷺ نماز کے آخر میں فرمایا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ وَمَا أَسْرَفْتُ وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي، أَنْتَ إِلٰهِي لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ»[2] یعنی اے اللہ! تو بخش دے میرے لیے وہ شے جو میں نے آگے کی ہے اور وہ شے جو میں نے پیچھے کی ہے اور وہ شے جو پوشیدہ کی ہے اور وہ شے جو ظاہر کی ہے اور وہ شے جو حد سے بڑھ کر کی ہے اور وہ شے جس کو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے، تو میرا معبود ہے، نہیں ہے کوئی معبود مگر تو۔ صحیح میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: لوگو! توبہ کرو اپنے رب کی طرف، بے شک میں مغفرت مانگتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں اس کی طرف ایک دن میں ستر بار سے زیادہ۔[3]

امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو میں نے کھایا آپ ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کے کھانے میں سے، پھر میں نے کہا: "غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ" یعنی اللہ آپ کو بخشے اے رسول اللہ! تو آپ ﷺ نے فرمایا: «وَلَكَ» یعنی اور تجھے بھی۔ چنانچہ میں نے عرض کی کہ میں آپ کے لیے مغفرت مانگوں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «نَعَمْ وَلَكُمْ» یعنی ہاں اور اپنے لیے بھی اور یہ آیت پڑھی: ﴿ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ﴾ پھر میں نے آپ کے دائیں کندھے کی طرف نظر کی یا بائیں کندھے کی طرف (یہ شک کرنے والے شعبہ ہیں جو امام احمد رحمہ اللہ کے استاذ الاستاذ ہیں) "فَإِذَا هُوَ كَهَيْئَةِ الْجُمْعِ عَلَيْهِ الثَّآلِيلُ"

"جُمْع" بہ ضم جیم یہ ہے کہ آدمی اپنی انگلیاں اکٹھی کرے۔ پھر ان کو ہتھیلی کے اندر کی طرف موڑے، یعنی میں نے جو دیکھا تو مہر نبوت بند مٹھی کی طرح تھی اس پر مسی تھی۔ "ثالیل" جمع ہے "ثولول" کی۔ "ثولول" وہ دانہ ہے جو دانہ نخود کی طرح یا اس سے چھوٹا ہے، یہ تشبیہ جو بند مٹھی کے ساتھ دی ہے، یہ شکل میں ہے یا مقدار میں اور مراد

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٣٦) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٦٠) صحيح مسلم (٧٦٩، ٧٧١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٤٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٢)

ہیئت ہے، تاکہ کبوتری کے انڈے کے برابر ہو جائے، یعنی کسی روایت میں اس کی تشبیہ کبوتری کے انڈے سے دی ہے۔ اس وقت "جُمع" سے مراد ہیئت میں تشبیہ لی جائے گی تو دونوں روایتیں موافق ہو جائیں گی۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی صورت ایسی تھی، جیسے بند مٹھی کی ہوتی ہے۔[1] (كذا في مجمع البحار و رواه مسلم و الترمذي والنسائي وابن جرير و ابن أبي حاتم من طرق عن عاصم الأحول به)

دوسری حدیث میں آیا ہے جس کو امام ابو یعلیٰ رحمہ اللہ نے عن ابی بکر الصدیق عن رسول اللہ ﷺ روایت کیا ہے فرمایا: لازم پکڑو تم "لا إله إلا الله" کو اور استغفار کرو۔ "فَأَكْثِرُوْا مِنْهَا" یعنی ان کی کثرت کرو، بے شک ابلیس نے کہا ہے کہ میں نے لوگوں کو گناہوں سے ہلاک کیا اور انھوں نے مجھے ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ سے اور استغفار سے ہلاک کیا، پھر جب میں نے یہ دیکھا تو ان کو "أهواء" سے ہلاک کیا، چنانچہ وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ راہ پاتے ہیں۔[2] ﴿ اَهْوَآءَ ﴾ جمع ہے "هوى" کی۔ "هوى" وہ ہے جس کی طرف نفس بلاتا ہے اور وہ اس کی خواہش اور چاہت ہے۔ اہلِ سنت کے سوا، كَثَّرَهُمُ اللّٰهُ تَعَالَى، سارے مذاہب اہلِ ہویٰ کے ہیں، طرح طرح کے فاسد عقیدے لوگوں کے دلوں میں جما دیے ہیں، ان کو ہدایت سمجھتے ہیں اور اُن کی طرف سے لڑتے بھڑتے ہیں، ان میں سے ہر مذہب والا دوسرے کو گمراہ اور خود کو ہدایت یافتہ جانتا ہے اور غور سے دیکھو تو وہ ہدایت کہاں گمراہی ہے: ؎

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

"ملت کے بہتر فرقوں، سب کا عذر قبول کر، جب حقیقت کو نہ پا سکے تو جھوٹ کے راہزن بن گئے۔"

اَللّٰهُمَّ أَحْيِنَا عَلَى السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ، وَأَمِتْنَا عَلَيْهَا وَاحْشُرْنَا فِيْ زُمْرَتِهَا وَاغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ، أَنْتَ إِلٰهِيْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ وَحْدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ، وَصَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلَى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَاتِّبَاعِهِ إِلَى يَوْمِ الدِّيْنِ. آمين.

اثر مروی ہے کہ ابلیس نے کہا: قسم ہے تیری عزت اور جلال کی! میں ہمیشہ ان کو بہکاتا رہوں گا، جب تک ان کی روحیں ان کے جسموں میں ہیں تو اللہ عزوجل نے فرمایا: میری عزت اور میرے جلال کی قسم! میں ان کو ہمیشہ بخشتا رہوں گا، جب تک وہ مجھ سے بخشش طلب کرتے رہیں گے۔[3] استغفار کی فضیلت میں بہت سی حدیثیں ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ﴾ یعنی اللہ دن میں تمھارے تصرف کو جانتا ہے، یعنی تمھارے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٤٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٥٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٦٠/٦) تفسير الطبري (١٧٤/٢٢) مسند أحمد (٨٢/٥)

[2] مسند أبي يعلىٰ (١٢٣/١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "فيه عثمان بن مطر وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٣٤٦/١٠)

[3] مسند أحمد (٢٩/٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٤)

چلنے پھرنے اور کام کاج کرنے کو اور تمھاری رات کی قرار گاہ کو جانتا ہے، جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ﴾ [الأنعام: ٦٠] ''اور وہ ایسا ہے کہ رات میں تمھاری روح کو (ایک گونہ) قبض کر دیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس کو جانتا ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ﴾ [هود: ٦] ''زمین میں چلنے پھرنے والے جتنے جاندار ہیں سب کی روزیاں اللہ پر ہیں وہی ان کے رہنے سہنے کی جگہ کو جانتا ہے اور ان کے سونپے جانے کی جگہ کو بھی۔'' امام ابن جریج رحمہ اللہ اس قول کی طرف گئے ہیں اور یہی امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: "مُتَقَلَّبَكُمْ فِي الدُّنْيَا وَمَثْوٰكُمْ فِي الْآخِرَةِ"[1] تمھارا لوٹنا پوٹنا دنیا میں اور آخرت میں تمھاری جائے اقامت۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: "متقلب" تمھارا دنیا میں اور "مثویٰ" تمھارا قبور میں، پہلی بات زیادہ مناسب ہے اور ظاہر ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت اور تشریح کے ساتھ یہ ہے کہ یعنی یہ کافر جو استعمال کرتے ہیں اور جانوروں کی طرح کھاتے ہیں، ان میں سے وہ شخص بھی ہے جو تیری طرف کان رکھتا ہے۔ اس سے مراد منافق لوگ ہیں۔ ضمیر کو لفظ ﴿ مَنْ ﴾ کے اعتبار سے واحد استعمال کیا ہے جس طرح کہ ﴿ حَتّٰى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ ﴾ میں ﴿ مِنْ ﴾ کے معنی کے اعتبار سے ضمیر کو جمع فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جمعہ کے دن جہاں رسول اللہ ﷺ وعظ و نصیحت فرماتے تھے اور مومنین کو خطبے لکھایا کرتے تھے، وہاں منافق لوگ حاضر ہوتے تھے۔ اس معنی کی بنا پر یہ آیت مدنی ٹھہرے گی، بلکہ اسی طرح اس کے بعد کی آیتیں بھی مدنی ٹھہریں گی تو یہ اس قول سے مستثنیٰ ہوں گی کہ سورت مکی ہے۔

﴿ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ﴾ یعنی یہاں تک کہ جب وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس سے نکلتے تھے تو اُن لوگوں سے کہتے ہیں جو علم دیے گئے ہیں، یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علماء سے کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے، کسی نے کہا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور کسی نے کہا کہ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے کہتے ہیں۔ پہلی بات زیادہ مناسب ہے، یعنی اہلِ علم سے سوال کرتے ہیں تو استہزاء کے طور پر ان سے یوں کہتے ہیں: ﴿ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ﴾ یعنی ابھی ابھی نبی اکرم ﷺ نے کیا بات کہی؟ مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کی بات کی طرف توجہ نہیں کی اور نہ ہم ان کی بات کی طرف رجوع ہوئے۔

امام بزی رحمہ اللہ نے اس کے خلاف "اَنِفًا" بہ قصر بر وزن "حَذِر" پڑھا ہے اور باقی قاریوں نے مد کے

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٩٨/١٠) [2] تفسير ابن كثير (٢٢٤/٤، ٢٢٥)

ساتھ بروزن "حَاذِرٌ" پڑھا ہے۔ یہ دونوں دو لغت ہیں اور دونوں اسمِ فاعل ہیں، ان کا فعل مجرد مستعمل نہیں ہے، بلکہ "اِئْتَنَفَ یَأْتَنِفُ وَاسْتَأْنَفَ یَسْتَأْنِفُ" مستعمل ہے۔ "اِئْتِنَافٌ وَاسْتِئْنَافٌ" بہ معنی ابتداء ہے۔[1] اس میں دو وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ منصوب ہے بنا بر حال ضمیرِ ﴿ قَالَ ﴾ سے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے اس کی یہ تقدیر کی ہے: "مَا ذَا قَالَ مُؤْتَنِفًا"[2] اور دوسرے نے یہ تقدیر کی ہے: "أَيْ: مَا الْقَوْلُ الَّذِيْ اِئْتَنَفَهُ الْآنَ قَبْلَ انْفِصَالِنَا عَنْهُ" دوسری وجہ یہ ہے کہ بنا بر ظرف منصوب ہے: "أَيْ: مَاذَا قَالَ السَّاعَةَ" یہ قول امام زمخشری رحمہ اللہ کا ہے۔[3]

شیخ ابو حیان رحمہ اللہ نے اس کا انکار کیا، کہا: اس لیے ہم نہیں جانتے کہ کسی نے اس کو ظروف میں سے شمار کیا ہو۔[4] اس کے معنی میں مفسرین کی عبارتیں مختلف ہیں۔ چنانچہ امام زمخشری رحمہ اللہ کی عبارت کا ظاہر یہ ہے کہ ظرف حال ہے: مثل "الآن" کے۔ اسی لیے اس کی تفسیر "الساعة" کی ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین کہتے ہیں: ﴿ اٰنِفًا ﴾ کے معنی ہیں: "اَلسَّاعَةُ الْمَاضِيَةُ الْقَرِيْبَةُ مِنَّا" یہ تفسیر بالمعنی ہے۔[5] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "اِسْتَأْنَفْتُ الشَّيْءَ إِذَا ابْتَدَأْتُهُ" سے ہے: "أَيْ: مَا ذَا قَالَ فِيْ أَوَّلِ وَقْتٍ يَقْرُبُ مِنَّا"[6] اس کی اصل "أَنْفُ الشَّيْءِ" سے ماخوذ ہے جو شے اس شے سے مقدم ہو، اس کو "أَنْفُ الشَّيْءِ" کہتے ہیں، یعنی اس کی ناک۔ "أنف" سے استعارہ کیا گیا ہے۔ "أنف" بہ معنی بنی ہے۔ "أَمْرٌ أُنُفٌ" بہ معنی متانف ہے اور "رَوْضَةٌ أُنُفٌ" وہ سبزہ زار ہے جس کو کسی نے نہیں چرا۔

بالجملہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرمایا: "كُنْتُ فِيْمَنْ يُّسْأَلُ"[7] ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ "أَنَا مِنْهُمْ"[8] یعنی میں ان لوگوں میں سے تھا جن سے سوال کیا جاتا تھا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر داخل ہوتے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے نکلتے تو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہتے: ﴿ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ﴾ تو وہ کہتے کہ آپ نے ایسا ایسا فرمایا ہے،[9] یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات لوگوں کو سمجھاتے تھے اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما قوم کے کم سن آدمی تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، چنانچہ وہ ان میں سے ہیں جو علم دیے گئے ہیں۔

اس میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے ایک بڑی منقبت ہے، اس لیے کہ وہ اس وقت بچے تھے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب وفات پائی تو وہ سنِ بلوغ میں تھے، چنانچہ لوگوں کا ان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں قرآن کے معانی کا پوچھنا اور اللہ پاک کا ان لوگوں کے بارے میں جن سے پوچھا جاتا تھا یہ فرمانا: ﴿ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ﴾

---

[1] اللباب في علوم الكتاب (١٧/٤٤٦، ٤٤٧) [2] التبيان في إعراب القرآن (٢/١١٦٢) [3] الكشاف (٤/٣٢٥)
[4] البحر المحيط (٨/٧٩) [5] اللباب في علوم الكتاب (١٧/٤٤٦) [6] معاني القرآن (٥/١٠)
[7] مستدرك الحاكم (٢/٤٩٦) [8] تفسير الطبري (٢٢/١٦٩) [9] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٩٨)

اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ان لوگوں میں سے ہیں، یہ ان کی وسعتِ علم اور اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنتِ مطہرہ کی سمجھ رکھنے کی بہت بڑی دلیل ہے، اس کے باوجود کہ ان کے ہم عمر بچے اس وقت لڑکوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔ ابن بریدہ سے مروی ہے کہ وہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔[1] ﴿ اُولٰٓئِكَ ﴾ مبتداء ہے اور اس کی خبر ﴿ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴾ ہے، یعنی یہ منافق لوگ جن کا ذکر ہوا وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے کفر کی مہر لگا دی ہے، چنانچہ وہ نہ ایمان لائے اور نہ ان کے دل کسی خیر کی طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے کفر وعناد میں اپنی خواہشوں کی پیروی کی۔

پھر اللہ پاک نے ان کی اضداد کا حال بیان کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى ﴾ یعنی اور وہ لوگ جنھوں نے راہِ خیر کی طرف راہ پائی، تو وہ اللہ پر ایمان لائے اور جس شے کا ان کو حکم دیا گیا، اس پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت کی اور زیادہ توفیق دی۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ ہدایت کی۔ کسی نے کہا ہے کہ قرآن شریف نے کی۔ کسی نے کہا ہے کہ منافقوں کے منہ پھیرنے اور استہزاء نے ان کی ہدایت کو زیادہ کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ ناسخ کے نازل ہونے نے کی۔ ہر تقدیر پر مراد یہ ہے کہ ان کو ایمان وعلم اور دین کی بصیرت میں زیادہ کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ جب قرآن نازل کیا گیا تو اس پر ایمان لائے اور وہ ہدایت تھا، پھر جب ناسخ منسوخ سے ظاہر ہوا تو اس نے ان کو ہدایت زیادہ کی۔[2]

﴿ وَاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴾ یعنی ان کو تقویٰ کا الہام کیا اور اس پر ان کی اعانت کی اس معنی میں کہ تقویٰ کو ان میں پیدا کر دیا، یا ان کے تقویٰ کا انھیں ثواب و جزا عطا کیا۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے اور تالیفِ نظم کے زیادہ مطابق ہے، اس لیے کہ اس سورتِ کریمہ کی زیادہ تر آیتوں میں مقابلے کا لحاظ رکھا گیا۔ چنانچہ طبع کا مقابلہ تو زیادتِ ہدیٰ سے کیا، اس لیے کہ طبع کا حصول زنگ کے زیادہ ہونے سے ہوتا ہے اور اس چیز کے پے در پے آنے سے جو کفر میں زیادتی کرتی ہے۔ اور اتباعِ ہویٰ کا مقابلہ ایتائے تقویٰ سے کیا گیا، چنانچہ یہ کمال تقویٰ پر محمول ہوگا۔ تقویٰ کا کمال یہ ہے کہ عارف اس شے سے پرہیز کرے جو اس کے سِرّ کو حق سے مشغول کرتی ہے اور سب طرف سے بالکل ٹوٹ کر اسی کی طرف متوجہ ہو جائے۔

حقیقی تقویٰ یہی ہے جو ﴿ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ﴾ [آلِ عمران: ۱۰۲] ''اللہ تعالیٰ سے اتنا ڈرو جتنا اس سے ڈرنا چاہیے۔'' سے مراد ہے، کیوں کہ جو شے مزید ہدیٰ پر مزید ہے، یہ ایسا مزید ہے کہ اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جاتا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ توفیق دینا ہے اس عمل کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ

[1] الدر المنثور (٤٦٦/٧) [2] تفسير الطبري (١٧١،١٧٠/٢٢)

ناسخ پر عمل کرنا اور منسوخ کو چھوڑنا۔ امام ربیع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تقویٰ خشیت ہے، یعنی اللہ پاک سے ڈرنا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ثواب آخرت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ رخصتوں کو ترک کرنا اور عزیمتوں کو اخذ کرنا۔ ﴿ فَهَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ ﴾. قولہ تعالیٰ: ﴿ أَن تَأْتِيَهُم بَغْتَةً ﴾ بدلِ اشتمال ہے ﴿ السَّاعَةَ ﴾ سے، یعنی کفارِ مکہ نہیں انتظار کرتے مگر قیامت کا، یعنی امر نہیں ہے مگر یہ کہ وہ ان پر اچانک آ جائے۔ اس میں کفار کو سخت وعید ہے۔ امام ابوجعفر رواسی رحمہ اللہ نے ﴿ أَن تَأْتِيَهُم ﴾ کو "بأن" شرطیہ پڑھا ہے۔[1]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سات چیزوں سے اعمال کے ساتھ جلدی کرو۔ پس کیا انتظار کرتے ہو، یعنی نہیں راہ دیکھتے ہو مگر ایسے فقر کی جو بھلا دے، یا ایسی غناء کی جو سرکش کر دے، یا ایسے مرض کی جو فاسد کر دے، یا ایسے بڑھاپے کی جو بٹھا دے، یا موت کی جو اچانک آ جائے، یا دجال کی۔ چنانچہ برا غائب ہے جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔ یا قیامت کی راہ دیکھتے ہو اور قیامت ﴿ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ ﴾ [القمر: ٤٦] ہے، یعنی انتہائی ہولناک اور کڑوی ہے۔[2] (أخرجه الترمذي وحسنه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَقَدْ جَاءَ أَشْرَاطُهَا ﴾ یعنی پس یقیناً قیامت کی علامات آ گئیں اور اہلِ کتاب اپنی کتابوں میں پڑھ چکے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت قیامت کی نشانیوں میں سے ہے، جیسا کہ امام حسن اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ اشراطِ ساعت سے مراد اس کے وہ اسباب ہیں جو اس کے بڑے اسباب سے کم درجے کے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ قیامت کی نشانیوں سے مراد انشقاقِ قمر اور دخان ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مال اور تجارت کی کثرت اور جھوٹی گواہی اور قطع رحمی اور شریف لوگوں کی کمی اور ملامت کیے گئے لوگوں کی زیادتی ہے۔

فتح البیان میں فرمایا ہے: جیسا کہ اب اور اس وقت میں مشاہدہ ہو رہا ہے۔[3] واللہ المستعان۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے: "أَوَّلُ السَّاعَاتِ"[4] صحیحین وغیرہما میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے ثابت ہوا ہے: قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ» وَأَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ وَالْوُسْطَى"[5] یعنی میں اور قیامت ان دو کے مثل بھیجے گئے اور کلمے اور بیچ کی انگلی سے اشارہ فرمایا۔ اسی کے مثل سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔[6] "أشراط" "شرط" کی جمع ہے۔ "شرط" بہ سکون و فتحِ رائے

---

[1] فتح القدير (٤٦/٥، ٤٧)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٠٦) اس کی سند میں "محرر بن ہارون" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ١٦٦٦)

[3] تفسير القرطبي (٢٤٠/١٦) فتح البيان (٦٥/١٣)

[4] الدر المنثور (٤٦٧/٧)

[5] صحيح البخاري (٦١٣٩) صحيح مسلم (٢٩٥١)

[6] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

مہملہ کے یہ معنی علامت ہے (اسی معنی سے ابو زید اسود رحمہ اللہ کا قول ہے:

فَإِنْ كُنْتِ قَدْ أَزْمَعْتِ بِالصَّرْمِ بَيْنَنَا ۔۔۔ فَقَدْ جَعَلَتْ أَشْرَاطُ أَوَّلِهِ تَبْدُوْ [1]

یعنی اگر تو آپس میں قطع تعلق کا عزم کر چکی ہے تو واقعی اس کے شروع کی علامتیں ظاہر ہونے لگی ہیں۔)

یہ جملہ مفاجاتِ ساعت کی تعلیل (وجہ) ہے، یا اس کے آنے کی وہ جہاں پر سے بھی ہو۔ یعنی قطع نظر مفاجات (اچانک آ جانا) یا غیر مفاجات سے، یا یہ فعل کے لیے علت کے مثل ہے بہ اعتبار تعلقِ فعل کے بدل سے، اس لیے کہ کسی شے کی علامت کا ظہور اس کے انتظار کا موجب ہوتا ہے۔ غرض کہ کفار جو ایمان نہیں لاتے تو معلوم ہوتا ہے کہ اب صرف قیامت کے آنے کے منتظر ہیں، اس لیے کہ اس کی علامتیں تو آ چکیں، نبی آخر الزمان اس جہان میں تشریف لا چکے، اب یہی انتظار ہے کہ قیامت آ جائے اور وہ جب آ گئی تو ان کو کیا فائدہ؟!

﴿ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ﴾ یعنی پھر ان کے لیے نصیحت پذیر ہونا کہاں ہے اور توبہ واخلاص کہاں ہے جبکہ اچانک ان پر قیامت آ گئی، کیونکہ یہ سب تو اس وقت فائدہ دیتا ہے جب کہ اس سے پہلے ہو اور اس کے بعد کچھ بھی نہیں۔ ﴿ ذِكْرٰىهُمْ ﴾ مبتداء مؤخر ہے اور ﴿ فَاَنّٰى لَهُمْ ﴾ خبر مقدم اور ﴿ اِذَا جَآءَتْهُمْ ﴾ جملہ معترضہ ہے مبتداء اور خبر کے درمیان۔ قیامت کی علامات کے بیان میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں ان میں ان علامتوں کا بیان ہے جو واقع ہو چکیں اور ان نشانیوں کا جو آیندہ بیان ہوں گی۔ یہ اتنی حدیثیں ہیں کہ ایک مستقل کتاب میں آتی ہیں، یہاں ان کے بیان کرنے میں طوالت ہے، اس بارے میں کتاب "اَلْإِشَاعَةُ لِأَشْرَاطِ السَّاعَةِ" انتہائی نفیس کتاب ہے۔

سیدنا ابو الوفاء الصدیق رحمہ اللہ صاحبِ فتح البیان نے اس بارے میں تین نہایت عمدہ کتابیں تالیف فرمائی ہیں: "حجج الكرامة في آثار القيامة" بہ زبانِ فارسی، "إذاعة لما كان وما يكون بين يدي الساعة" بہ زبانِ عربی اور "اقتراب الساعة" بہ زبانِ اردو۔ یہ تینوں طبع ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔ فَجَزَاهُ اللّٰهُ عَنَّا وَعَنْ سَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرًا، وَجَعَلَهَا لَهُ ذُخْرًا وَأَجْرًا. آمين.

﴿ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ یعنی جب تو یہ جان چکا کہ خیر کا دار ومدار توحید و اطاعت پر ہے اور شر کا دار ومدار شرک اور اللہ تعالیٰ کی معاصی پر ہے اور مومنوں کی سعادت اور کافروں کی شقاوت (بدبختی) معلوم کر چکا تو یہ جان رکھ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور نہ اس کے سوا کوئی رب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس جاننے پر قائم اور ثابت قدم رہ اور وحدانیت کے علم پر ہمیشہ یقین رکھ جس پر تو قائم ہے، اس لیے کہ قیامت کے دن فائدہ دینے والا یہی علم ہے۔ یہ مطلب اس لیے کہ نبی ﷺ اس حکم سے پہلے اس بات کے جاننے والے تھے کہ ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾۔ یہ بات کہ توحید کا علم قیامت کے دن فائدہ دینے والا ہے، اس پر آپ ﷺ کا یہ فرمان دال ہے: « مَنْ مَاتَ وَهُوَ

---

[1] تفسیر القرطبي (۲٤٠/۱٦)

يَعْلَمُ أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَّا اللهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ » (رواه مسلم)[1] یعنی جو کوئی مرا اور وہ جانتا ہے کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ تو وہ جنت میں داخل ہوا۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ جس شے کو تو نے استدلال سے جانا ہے تو اب اس کو خبرِ یقین سے جان رکھ۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ پس تو ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ کا ذکر کر۔

ذکر کو علم کے پیرائے میں ادا فرمایا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان آیتوں میں حرفِ فاء ایک جملے کے دوسرے جملے پر عطف کے لیے ہے جن جملوں کے آپس میں ایک قسم کا اتصال (تعلق) ہے۔ ﴿ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ ﴾ یعنی اور اللہ سے اس بات پر بخشش مانگ کہ کوئی گناہ تجھ سے واقع ہو۔ یا یہ معنی ہیں کہ اللہ سے مغفرت مانگ، تاکہ وہ تجھے معصوم رکھے یا اولیٰ چیز کو ترک کرنے پر، جو کبھی کبھی تجھ سے صادر ہو جاتا ہے، اللہ سے مغفرت مانگ۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس ''ذنب'' سے مراد ذکر سے فترات وغفلات ہیں، وہ ذکر جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال وشان ودوام تھا۔ چنانچہ جب اس میں کسی قسم کا فتور یا غفلت ہوئی تو وہ ذنب شمار کیا گیا اور اس سے مغفرت مانگی۔[2] کسی نے کہا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار شکر کے لیے ہو، لیکن ﴿ لِذَنْۢبِكَ ﴾ کا کلمہ اس سے مانع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنے اہلِ بیت کے گناہوں کے لیے مغفرت مانگ۔ یہ ایک ایسا تکلف ہے جس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کا حکم اس لیے ہوا تاکہ اس میں آپ کی اُمت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء اور پیروی کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ خطاب تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد اُمت ہے۔

لیکن قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ﴾ اس سے مانع ہے، کیوں کہ اس سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کے گناہوں کے لیے مغفرت مانگنا ہے، اس طرح سے کہ اُن کے لیے ان گناہوں کی بخشش مانگیں جو اُن سے ہو گئے ہیں۔ یہ اللہ عزوجل کی طرف سے اس اُمتِ مرحومہ کے لیے ایک بڑا اکرام ہے کہ اس نے اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ اُن کے گناہوں کے لیے مغفرت مانگیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے شفیع ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت ودعا اُن کے حق میں مجاب ومقبول ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

لبِ گوہر فشاں وا ہوں گے جب عرضِ شفاعت کو
تماشا گاہ محشر میں تکیں گے نیک منہ بد کا

امام طبرانی، ابن مردویہ اور دیلمی رحمہم اللہ نے عن ابن عمرو عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ افضل ذکر ''لا إله إلا الله'' ہے اور افضل دعا استغفار ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ﴾۔[3] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ﴿ اِسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ ﴾ کی تفسیر میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦) [2] المنهاج للنووي (٢٣/١٧)

[3] الدر المنثور (٤٩٣/٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''رواه الطبراني وفيه الإفريقي وغيره من الضعفاء'' (مجمع الزوائد: ٤٣٧/١)

''بے شک میں البتہ اللہ تعالیٰ سے دن میں ستر بار مغفرت مانگتا ہوں۔'' (رواه عبدالرزاق و عبد بن حميد و الترمذي وصححه و ابن المنذر و ابن أبي حاتم و ابن مردويه و البيهقي في الشعب) اس کی اصل بخاری شریف میں ہے۔ ایک روایت میں ستر بار سے زیادہ ہے۔[1] امام مسلم رحمہ اللہ نے اغر مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ فرماتے تھے: «إِنَّهُ لَيُغَانُ عَلَى قَلْبِي حَتَّى أَسْتَغْفِرَ اللّٰهَ فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ»[2] اس غین میں علماء کا ایک لمبا بیان ہے، یہ جگہ اس کے بیان کی گنجایش نہیں رکھتی۔ اس بارے میں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لیے اور اپنی امت کے لیے استغفار فرماتے اور استغفار میں ترغیب دیتے تھے، حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔

﴿ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ جانتا ہے تمھارا متقلب (چلنا پھرنا) دنیا میں اپنے کاموں میں اور اپنی معاش اور محنت مزدوری میں اور مثویٰ (ٹھکانا) تمھارا آخرت میں۔ کسی نے کہا ہے کہ دن کو تمھارا اپنے کاموں میں متقلب اور تمھارا تمھاری راتوں میں سوتے ہوئے مثویٰ، یعنی ٹھکانا۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ تمھارا اپنے آباء کی پشتوں سے تمھاری ماؤں کے رحموں میں لوٹنا پوٹنا جانتا ہے اور زمین میں تمھارا مثوی، یعنی مقام جانتا ہے۔ امام ابن کیسان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ دنیا میں تمھارا ایک پشت سے ایک شکم میں منتقل ہونا اور قبروں میں ٹھکانا۔[3] کسی نے کہا ہے کہ تمھارا اپنے کاموں میں چلنا پھرنا اور تمھارا جنت یا نار کی طرف لوٹنا۔

مطلب یہ ہے کہ وہ تمھارے سارے احوال کو جاننے والا ہے، اس میں سے کوئی شے اس پر مخفی نہیں ہے، گو کتنی ہی باریک اور چھپی ہوئی ہو۔ جس کے علم کا یہ حال ہے، وہ اس لائق ہے کہ اس سے ڈریں اور اس سے گناہوں اور خطاؤں کی بخشش طلب کریں۔ اَللّٰهُمَّ نَسْتَغْفِرُكَ لِذُنُوْبِنَا مَا نَعْلَمُ وَمَا لَا نَعْلَمُ، اَللّٰهُمَّ فَاغْفِرْ لَنَا بِجُوْدِكَ وَكَرَمِكَ وَرَحْمَتِكَ الَّتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ، اَللّٰهُمَّ فَصَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَأَشْيَاعِهٖ، آمين.

مومنوں نے اپنے رب عزوجل سے یہ سوال کیا کہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی ایسی سورت نازل فرمائے جس میں ان کو کفار کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دے۔ اس سوال سے جہاد کی حرص اور اس اجرِ عظیم کا پانا مقصود تھا جو اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کے لیے مہیا کر رکھا ہے۔ چنانچہ اس سوال کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول میں نقل فرمایا:[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٤٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٥٩) شعب الإيمان (٤٣٧/١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٢) [3] تفسير القرطبي (٢٤٣/١٦) [4] فتح البيان (٦٢/١٣_٦٧)

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰى لَهُمْ ﴿٢٠﴾ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۣ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۣ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴿٢١﴾ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ﴿٢٢﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ﴿٢٣﴾

اور جو لوگ ایمان لائے، وہ کہتے ہیں: (جہاد کے متعلق) کوئی سورت کیوں نہیں نازل کی گئی؟ پھر جب کوئی محکم سورت نازل کی جاتی ہے اور اس میں قتال (جہاد) کا ذکر کیا جاتا ہے تو آپ ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جن کے دلوں میں روگ ہے کہ وہ آپ کی طرف اس شخص کی طرح دیکھتے ہیں، جس پر موت کے باعث غشی طاری ہو، چناں چہ ان کے لیے ہلاکت ہے (20) اطاعت کرنا اور بھلی بات کہنا (بہتر ہے)، پھر جب (جہاد کا) قطعی فیصلہ ہو جاتا ہے، تو اگر وہ اللہ سے سچے رہیں تو یہ ان کے لیے بہتر ہے (21) پھر (اے منافقو!) تم سے یہی امید ہے کہ اگر تم حکمران بن جاؤ تو تم زمین میں فساد کرو اور اپنے رشتے ناتے توڑ ڈالو (22) یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے، پھر اس نے انھیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھیں اندھی کر دیں (23)

حکمِ جہاد کے وقت سچے مومن اور منافق کا حال:

مسلمان سورت مانگتے تھے، یعنی کافروں کی ایذاء دہی سے تنگ آ کر آرزو کرتے تھے کہ اللہ جہاد کا حکم دے تو جو ہو سکے گا، کر گزریں گے۔ جب جہاد کا حکم آیا تو کچے ایمان والے لوگوں پر یہ حکم بہت بھاری پڑا، مردے کی طرح بے رونق آنکھوں سے دیکھتے کہ کاش! ہمیں اس حکم سے معاف رکھیں۔ بہت زیادہ خوف میں بھی آنکھوں کی رونق نہیں رہتی، جیسے: مرتے وقت۔ شریعت کا حکم ماننا بہت بہتر ہے اگر نہیں مانو گے تو کافر ہو جاؤ گے۔ رسول بھی جانتا ہے کہ نامردوں کو کیوں لڑائے اور اگر بہت ہی تاکید ہو گی تو ضرور لڑنا پڑے گا، وگرنہ لڑنے والے اور بہت ہیں۔ تم جان سے تنگ ہو کر جہاد کی آرزو کرتے ہو اور اگر اللہ تم ہی کو غالب کر دے تو فساد برپا نہ کرنا۔ یعنی حکومت کے غرور میں ظلم کرنے لگ جاؤ اور کسی کے سمجھانے سے نہ سمجھو۔ انتہی[1].

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ انھوں نے جہاد کی اجازت کی تمنا کی، پھر جب اللہ عزوجل نے اس کو فرض کر دیا اور اس کا حکم دیا تو بہت سے لوگ اس سے باز رہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴾ [النساء: ۷۷] ”کیا تم نے انھیں نہیں دیکھا جنھیں حکم دیا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو اور نمازیں پڑھتے رہو اور زکاۃ ادا کرتے رہو، پھر جب انھیں جہاد کا حکم دیا گیا تو اسی وقت ان کی ایک جماعت لوگوں سے اس قدر ڈرنے لگی جیسے اللہ تعالیٰ کا ڈر ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ' اور کہنے لگے اے ہمارے رب! تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا؟ کیوں ہمیں تھوڑی سی زندگی اور نہ جینے دی؟ آپ کہہ دیجیے کہ دنیا کی سود مندی تو بہت ہی کم ہے اور پرہیزگاروں کے لیے تو آخرت ہی بہتر ہے اور تم پر ایک دھاگے کے برابر بھی ستم روا نہ رکھا جائے گا۔“

اور یہاں اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ ﴾ یعنی مومن کہتے ہیں: کیوں ایسی سورت نہ اتاری گئی جس میں قتال کا حکم ہوتا۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ ﴾ یعنی پھر جب ایک سورت محکم اتاری گئی اور اس میں لڑنے کا ذکر کیا گیا تو ان کو تو دیکھے جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ دشمنوں کے ساتھ مڈبھیڑ کے خوف سے تیری طرف اس شخص کی طرح دیکھتے ہیں جس پر موت کی بے ہوشی طاری ہو۔ پھر اُن کو شجاع اور بہادر بنانے کے لیے یوں فرمایا: ﴿ فَاَوْلٰى لَهُمْ ⑳ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۣ ﴾ یعنی اس موجودہ حالت میں ان کے لیے زیادہ بہتر اور لائق تھا کہ وہ حکم کو سنتے اور مانتے۔

﴿ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۣ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴾ یعنی پھر جب کام کی تاکید ہوتی اور حال کی جلدی ہوتی اور لڑائی حاضر ہوتی تو اگر وہ نیت کو اللہ کے لیے خالص کرتے تو اُن کے لیے بہتر ہوتا۔ ﴿ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ﴾ یعنی پھر کیا تم قریب ہو، اگر تم نے جہاد سے منہ موڑا اور اس طرح سے باز رہے، اس بات کے کہ ملک میں فساد کرو اور اپنے رشتے ناتے توڑ دو، یعنی پھر اسی جاہلیت کی طرف رجوع ہو جاؤ جس میں تھے کہ خون بہاؤ اور ناتے توڑو۔

صلہ رحمی پر وارد احادیث:

اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ﴾ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن پر

اللہ نے لعنت کی پھر ان کو بہرا کر دیا اور ان کی آنکھیں اندھی کر دیں۔ یہ زمین میں فساد کرنے کی عام طور پر اور ناتے توڑنے کی خاص طور پر ممانعت ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ زمین میں اصلاح اور درستی کی جائے اور ناتوں کو جوڑا جائے۔ صلہ ارحام یہ ہے کہ گفتار و کردار اور مال خرچ کرنے میں رشتے داروں کے ساتھ احسان کرے۔ اس بارے میں بہت طرق اور کثیر وجوہ کے ساتھ صحیح اور حسن حدیثیں رسول اللہ ﷺ سے وارد ہوئی ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق پیدا کی، پھر جب اس سے فارغ ہوا تو رحم کھڑا ہوا۔ « فَأَخَذَتْ بِحَقْوَيِ الرَّحْمٰنِ عَزَّ وَجَلَّ، فَقَالَ: مَهْ فَقَالَتْ: هٰذَا مُقَامُ الْعَائِذِ بِكَ مِنَ الْقَطِيْعَةِ، فَقَالَ تَعَالىٰ: أَلَا تَرْضِيْنَ أَنْ أَصِلَ مَنْ وَصَلَكِ وَأَقْطَعَ مَنْ قَطَعَكِ؟ قَالَتْ: بَلٰى! قَالَ: فَذَاكِ لَكِ، قَالَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ: اِقْرَءُوْا إِنْ شِئْتُمْ ﴿ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ﴾ »۔[1] "حقوي" تثنیہ ہے "حقو" بہ فتح حائے مہملہ وسکونِ قاف کا۔ کبھی اس کا حرفِ حاء مکسور بھی آتا ہے۔ اصل میں "حقو" تہہ باندھنے کی جگہ کو کہتے ہیں، یعنی کمر۔ کبھی مجاورت کے لحاظ سے خود تہہ کو بھی "حقو" بولتے ہیں، جب کوئی شخص کسی سے پناہ چاہے تو اس وقت محاورۂ عرب میں کہتے ہیں: "عَاذَ بِحَقْوِ فُلَانٍ" یعنی اس نے فلاں سے پناہ چاہی۔ کمر پکڑنا یا تہہ پکڑنا مجاز ہے پناہ چاہنے سے۔

یہاں حقوی رحمان سے مراد "كنفي رحمته" ہے، یعنی رحم کھڑا ہوا، پھر اس نے رحمان کی رحمت کے دو جانب پکڑے۔ مطلب یہ ہے کہ اس نے اس کی عزت کے ساتھ اس بات پر پناہ پکڑی کہ کوئی اس کو قطع کرے۔ چنانچہ فرمایا: پناہ پکڑنے سے باز رہ، تجھے کیا ہے تو نے کس سبب سے میرے ساتھ پناہ مانگی؟ تو رحم بولا: یہ تیرے ساتھ پناہ چاہنے والے کا مقام ہے، یعنی میرے پناہ مانگنے کا سبب، اس بات کا خوف ہے کہ کوئی مجھے قطع کرے۔ چنانچہ فرمایا: کیا تو اس سے راضی نہیں ہوتا کہ میں وصل کروں اس کو جو تجھے وصل کرے اور قطع کروں اس کو جو تجھے قطع کرے؟ عرض کی: کیوں نہیں، فرمایا: تو یہ تیرے لیے ہے، یعنی میں کروں گا جو میں نے کہا ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: تم اگر چاہو تو پڑھو: ﴿ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ﴾۔

اس حدیث شریف سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال و جواب واقعی ہوا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ ایک مثال بیان کی اور اس سے مراد رحم کی شان کی تعظیم ہے اور اس کے وصل کرنے والوں کی عظمت ہے اور اس کے قطع کرنے والوں کے گناہ کی عظمت ہے۔ (كذا في مجمع البحار ثم رواه البخاري من طريقين أخرين عن معاوية ابن أبي مزرد به قال: قال رسول الله ﷺ: اقرؤا إن شئتم ﴿ فَهَلْ عَسَيْتُمْ ﴾ إلا و رواه مسلم من حديث معاوية بن أبي مزرد به)[2] امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ کوئی گناہ بغی اور قطع رحمی سے (بغی کی اصل

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٥٢) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٥٢) صحيح مسلم (٢٥٥٤)

مجاوزتِ حد ہے، یعنی ظلم میں حد سے بڑھنا اور امام کی طاعت سے نکلنا) زیادہ اس لائق نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی سزا میں دنیا ہی میں جلدی کرے، اس کے ساتھ ساتھ جو آخرت کے لیے ذخیرہ کرے۔[1] (ورواه أبو داود والترمذي وابن ماجه من حديث إسماعيل هو ابن علية به وقال الترمذي: هذا حديث صحيح)

امام احمد نے عن ثوبان رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ ﷺ روایت کیا ہے: «مَنْ سَرَّهُ النَّسَاءُ فِيْ الْأَجَلِ وَالزِّيَادَةُ فِيْ الرِّزْقِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ»[2] (تفرد به أحمد وله شاهد في الصحيح) یعنی جو شخص چاہے کہ اس کی عمر لمبی ہو اور رزق زیادہ ہو تو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔ مطلب یہ ہے کہ صلہ رحمی سے عمر بڑھتی ہے اور روزی میں زیادتی ہوتی ہے۔ نیز امام احمد نے عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: یارسول اللہ! بے شک میرے ذوی ارحام، یعنی رشتے دار ہیں، میں تو وصل کرتا ہوں اور وہ قطع کرتے ہیں اور میں بخشتا ہوں اور وہ ظلم کرتے ہیں اور میں نیکی کرتا ہوں اور وہ بدی کرتے ہیں، کیا پھر میں اُن سے مکافات کروں، یعنی ان کو بدلہ دوں؟ فرمایا: «إِذَنْ تَتْرُكُوْنَ جَمِيْعًا» (والله أعلم. اس جواب کے معنی یہ ہیں کہ تو مکافات مت کر، بلکہ اپنے احسانات پر قائم رہ اور اگر تو اپنے ان احسانات کو چھوڑ دے گا اور وہ لوگ تو پہلے سے ان خصال حمیدہ کے تارک ہیں تو اس وقت تم سب مکارمِ اخلاق کے تارک ہو جاؤ گے اور یہ بات مناسب نہیں ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ اگر تو بھی بدلہ لینے کے خیال سے ان اچھی عادات کا عامل نہ ہوگا تو اس وقت تم سب اللہ کی طرف سے متروک اور صواب سے محروم ہو جاؤ گے، یعنی تمھارا طرزِ عمل صحیح نہیں رہے گا) لیکن تو سخاوت کر اور اُن سے صلہ رحمی کر، بے شک ایسا ہوگا کہ جب تک تو اس پر کاربند رہے گا تو ہمیشہ اللہ عزوجل کی طرف سے ایک مددگار تیرے ساتھ رہے گا۔[3] (تفرد به أحمد من هذه الوجه وله شاهد من وجه آخر)

امام احمد رحمہ اللہ نے عن مجاہد عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بے شک رحم عرش سے لٹکا ہوا ہے، واصل وہ نہیں ہے، یعنی رشتہ جوڑنے والا وہ نہیں ہے جو بدلہ لینے والا ہے، لیکن واصل وہ ہے کہ جس وقت کوئی اس سے قطع رحمی کرے تو وہ اس کو وصل کرے۔[4] (رواه البخاري) امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن رحم رکھا جائے گا۔ "لَهَا حُجْنَةٌ كَحُجْنَةِ

---

① مسند أحمد (٣٨/٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٠٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥١١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢١١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٩١٨)

② مسند أحمد (٢٧٩/٥) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٧)

③ مسند أحمد (١٢١/٢) اس کی سند میں "حجاج بن ارطاۃ" مدلس راوی ہے، البتہ اس کی اصل سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٨) میں مروی ہے۔

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٤٥) مسند أحمد (١٦٣/٢)

(أَيْ: "صِنَّارَتُهُ وَهِيَ الْمعوجة الَّتِي فِي رَأْسِهِ") الْمِغْزَلِ تَكَلَّمُ بِلِسَانٍ طَلْقٍ ذُلَقٍ" یعنی اس کے لیے ایک سرکج ہوگا تکلے کے سرکج کی طرح وہ تیز اور فصیح و بلیغ زبان کے ساتھ بات کرے گا، پھر وہ کاٹ دے گا اس کو جس نے اس کو قطع کیا اور وصل کرے گا اس کو جس نے اس کو وصل کیا ہے۔[1]

امام احمد نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے، فرمایا: رحم کرنے والے، رحم کرتا ہے ان پر رحمان۔ تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والے تم پر رحم کریں گے۔ اور رحم ایک شجنہ (ٹہنی) ہے رحمان سے جس نے اس کو وصل کیا تو وہ اس کو وصل کرے گا اور جس نے اس کو قطع کیا تو وہ اسے قطع کرے گا۔[2] (وقد رواه أبو داود والترمذي من حديث سفيان بن عيينة عن عمرو بن دينار به وهذا هو الذي يروى بتسلسل الأولية وقال الترمذي: حسن صحيح)

"شجنة" بالکسر والضم درخت کی شاخ کا ایک شعبہ ہے، یعنی رحم ایک قرابتِ متشبکہ ہے اشتباکِ عروق کی طرح، یعنی درخت کی جڑوں یا ٹہنیوں کی طرح گتھی ہوئی۔ اس سے واصلِ قرابت کی تشبیہ دی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے شین کا فتح بھی نقل کیا گیا ہے، معنی یہ ہے کہ رحمان سے مشتق ہے، یعنی اس کے آثارِ رحمت سے ایک اثر ہے، اس کے ساتھ متشبک (گتھا ہوا) ہے۔[3] (كذا في المجمع)

امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن قارظ سے روایت کیا ہے کہ وہ عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کے پاس داخل ہوئے اور وہ بیمار تھے تو عبدالرحمان رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: وصل کرے تجھ کو رحم، بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: میں رحمان ہوں، پیدا کیا میں نے رحم اور میں نے اس کے لیے ایک نام اپنے نام سے چیر کر رکھا، لہٰذا جو کوئی اس کو وصل کرے گا تو میں اس کو وصل کروں گا: "وَمَنْ يَّقْطَعُهَا أَقْطَعُهُ فَأَبَتَّهُ أَوْ قَالَ مَنْ بَتَّهَا أَبَتَّهُ"، یعنی اور جو کوئی قطع کرے گا اس کو تو میں اس کو قطع کروں گا۔[4] (تفرد به أحمد من هذه الوجه و رواه أحمد أيضا من حديث الزهري عن أبي سلمة عن الرداد أو أبي الرداد عن عبدالرحمن بن عوف به و رواه أبو داود و الترمذي من رواية أبي سلمة عن أبيه، والأحاديث فيه كثيرة)

امام طبرانی رحمہ اللہ نے سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «اَلْأَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ»[5] وَبِهِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «إِذَا ظَهَرَ الْقَوْلُ وَخُزِنَ الْعَمَلُ وَائْتَلَفَتِ الْأَلْسِنَةُ وَتَبَاغَضَتِ الْقُلُوْبُ وَقَطَعَ كُلُّ ذِيْ رَحِمٍ رَحِمَهُ فَعِنْدَ ذٰلِكَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ

---

① مسند أحمد (۱۸۹/۲) اس کی سند میں "ابو ثمامہ الثقفی" مجہول راوی ہے۔

② مسند أحمد (۱۶۰/۲) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٤١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٢٤) صحيح الجامع (٣٥٢٢)

③ مجمع بحار الأنوار (۱۸۲/۳)

④ مسند أحمد (۱۹۱/۱) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٩٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٠٧) السلسلة الصحيحة (٥٢٠)

⑤ المعجم الكبير (۲۶۳/۶) اس کی اصل صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٥٨) صحيح مسلم (٢٦٣٨) میں مروی ہے۔

وَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَى أَبْصَارَهُمْ ﴾[1] وَالْأَحَادِيثُ فِي هَذِهِ كَثِيرَةٌ. والله أعلم.[2] اس حدیث شریف میں وجودِ ارواح کے مبدءِ اوران کے جسموں سے مقدم ہونے کی خبر دی ہے، یعنی روحیں اپنی اول پیدائش میں دوقسم پر پیدا ہوئیں، ائتلاف و اختلاف، جیسے: لشکر جمع کیے ہوئے جس طرح ہم ایک دوسرے کے مقابل ہوتے ہیں۔

تقابلِ ارواح کے معنی وہی سعادت اور شقاوت (بدبختی) کے ہیں جس پر وہ پیدا کی گئیں۔ مطلب یہ ہے کہ جن جسموں میں روحیں ہیں، وہ دنیا میں ملتی ہیں تو اُن کے آپس میں ائتلاف (الفت) اور اختلاف ہوتا ہے، اس شے کے مطابق جس پر وہ پیدا کی گئیں، اسی لیے تم دیکھتے ہو کہ نیک تو نیکوں کو دوست رکھتا ہے اور شریر شریروں کو دوست رکھتا ہے اور اُن کی طرف مائل ہوتا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ وہ مجتمع مخلوق ہوئیں، یعنی اکٹھی پیدا کی گئیں، پھر اپنے اپنے جسموں میں علاحدہ علاحدہ کی گئیں، پس جو شخص صفت میں موافق ہوا تو اس سے الفت کی اور جو بعید ہوا اس سے نفرت کی۔ امام خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ روحیں جسموں سے پہلے پیدا کی گئیں، چنانچہ وہ آپس میں ملتی جلتی تھیں، پھر جب وہ جسموں کے ساتھ مل گئیں تو اسے پہلے ذکر کی وجہ سے آپس میں تعارف ہوا، چنانچہ ہر ایک اسی پہلے وقت کی بنا پر شناسا اور ناشناسا ہوتا ہے۔[3] (كذا في المجمع) اس کے سوا اور بھی کچھ کہا ہے۔ والله أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا ﴾ سے لے کر آخر سورت تک ظاہر یہی ہے کہ یہ مدنی ہے، اس لیے کہ قتال مدینے ہی میں مشروع ہوا ہے اور اسی طرح نفاق کا ظہور بھی اسی میں ہوا تو اب ماقبل میں جو کہا ہے کہ سورت مکی ہے تو یہ قول اس کے اغلب و اکثر پر محمول ہو گا اور اسی طرح اس کے مدنی ہونے کا قول اس کے بعض پر محمول ٹھہرے گا۔ بالجملہ مومنین کہتے ہیں: کیوں نہیں اتاری گئی ایک سورت جس میں قتال کا حکم ہوتا اور جہاد پر آمادہ کرنے کا امر مذکور ہوتا۔ پھر جب ایک ایسی سورت جہاد کے حکم کے ساتھ اتاری گئی جو محکم ہے، یعنی نہ منسوخ ہونے والی اور اس میں قتال ذکر کیا گیا، یعنی جہاد کا فرض ہونا ذکر ہوا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہر سورت جس میں جہاد کا ذکر کیا گیا، وہ محکم ہے اور یہ سورت منافقوں پر پورے قرآن میں سے زیادہ سخت ہے،[4] اس لیے کہ نسخ اس پر وارد نہیں ہوتا، اس لیے کہ درگزر کرنے اور مداہنت کے حکم کو قتال نے منسوخ کر دیا اور روزِ قیامت تک وہ غیر منسوخ ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں "فَإِذَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ مُحْدَثَةٌ"[5] ہے، یعنی "مُحْدَثَةُ النُّزُولِ"، مطلب یہ ہے کہ اس کا نزول محدث ہے، نئی اتری ہے۔ یہ معنی نہیں کہ وہ سورت خود محدث ہے۔ اس لیے کہ سارا قرآن شریف اللہ پاک کا کلامِ قدیم ہے۔ مخلوق اور محدث نہیں ہے۔ اس کا بیان سورۃ الانبیاء میں گزر چکا ہے۔ جمہور

---

[1] المعجم الكبير (٦/ ٢٦٣) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہے۔ [2] تفسير ابن كثير (٤/ ٢٢٥۔٢٢٧)

[3] مجمع بحار الأنوار (١/ ٤٠٠) [4] تفسير الطبري (٢٢/ ١٧٤، ١٧٥) [5] تفسير القرطبي (١٦/ ٢٤٣)

نے ﴿ أُنْزِلَتْ ﴾ اور ﴿ ذُكِرَ ﴾ کو بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور زید بن علی و ابن عمیر نے بہ صیغۂ معروف و بہ نصب ﴿ الْقِتَالُ ﴾ پڑھا ہے۔[1] ﴿ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ﴾ یعنی تو تو دیکھے ان کو جن کے دلوں میں شک ہے، یعنی منافقین، یا دین میں ضعف ہے، یعنی کچے مسلمان۔ ﴿ مَّرَضٌ ﴾ کی اصل فتور ہے، یعنی سستی، چنانچہ دلوں کا مرض ان کا سست ہونا ہے حق کے قبول کرنے سے۔ ظاہر تر اور قرآنِ کریم کے نظم کے مطابق تو پہلا قول ہی ہے۔

﴿ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ﴾ یعنی تیری طرف اس شخص کی طرح نظر کرتے ہیں جس کی نظر موت کے وقت اُوپر کو چڑھ گئی ہو۔ یہ اس لیے کہ قتال سے بزدل ہو رہے ہیں اور کفار کی طرف مائل ہیں۔ یا یوں کہو کہ آنکھ کو اوپر چڑھا کر نظر کرتے ہیں، جیسا وہ شخص نظر کرتا ہے جس کی نگاہ موت کو دیکھ کر اوپر کو چڑھنے والی ہے، اس لیے کہ وہ جہاد کو مکروہ سمجھتے ہیں اور دشمن کے ملنے سے بزدل ہوتے ہیں، یا یوں سمجھو کہ تو اُن کو دیکھے کہ بزدلی اور قلق کے مارے ان کی نگاہیں اوپر کو چڑھی جاتی ہیں، اس شخص کی طرح جس کو موت کی بے ہوشی طاری ہو۔

امام ابن قتیبہ اور زجاج رحمہ اللہ کہتے ہیں: مراد یہ ہے کہ وہ تیری طرف اپنی آنکھیں بلند کرتے ہیں اور تیری طرف سخت نظر کرتے ہیں، جیسے: وہ شخص نظر کرتا ہے جس کی آنکھ موت کے وقت اوپر کو چڑھنے والی ہے۔ غرضیکہ جن کا یہ حال ہے اللہ پاک نے ان کو یہ وعید سنائی: ﴿ فَاَوْلٰى لَهُمْ ﴾ یعنی خرابی ہے ان کی۔ امام جوہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عرب کا قول "أَوْلَى لَكَ" تہدید اور وعید ہے۔ اسی طرح امام مقاتل، کلبی اور قتادہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام اصمعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تہدید میں ان کا قول "أَوْلَى لَكَ" ہے، اس کے یہ معنی ہیں: "وَلِيَكَ وَقَارَبَكَ مَا تَكْرَهُ"، یعنی لگے تجھ کو اور قریب ہو تجھ سے وہ شے جس کو تو ناپسند کرتا ہے۔ اس بنا پر "أَوْلٰى"، فعل ماضی ہے۔ امام اصمعی رحمہ اللہ نے اس کی سند میں یہ شعر پڑھا ہے ؎

فَعَادَى بَيْنَ هَادِيَتَيْنِ مِنْهَا　　　وَأَوْلَى أَنْ يَّزِيْدَ عَلَى الثَّلَاثِ

"أَيْ: قَارَبَ أَنْ يَّزِيْدَ"، امام ثعلب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اصمعی رحمہ اللہ نے جو بات "أَوْلٰى" میں کہی، اس سے زیادہ بہتر کوئی بات نہیں کہی گئی۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس شخص نے غصے کا قصد کیا، پھر اس سے رہا ہوا تو محاورے میں اس سے یوں کہتے ہیں: "أَوْلَى لَكَ أَيْ: قَارَبَكَ الْغَضَبُ"، یعنی غصہ تجھ سے قریب ہو۔ یہ قول بھی امام اصمعی رحمہ اللہ کے قول کی طرح ہے۔ امام جرجانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ویل" سے ماخوذ ہے: "أَيْ: فَوَيْلٌ لَهُمْ" اسی طرح کشاف میں بھی کہا ہے۔[2] نیز امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: گویا یوں فرمایا: "اَلْعِقَابُ أَوْلَى لَهُمْ"[3] یعنی ان کو عذاب لائق تر ہے۔ اس بنیاد پر اسم ہوگا فعل نہ ہوگا، اکثر اسی پر ہیں۔

غرضیکہ کلمۂ "أَوْلٰى"، میں لغویین اور نحویین کا اختلاف ہے۔ امام اصمعی رحمہ اللہ کا تو یہ قول ہوا کہ فعل ماضی ہے۔

[1] فتح القدير (٥/٥٠)　[2] الكشاف (٤/٣٢٧)　[3] تفسير القرطبي (١٦/٢٤٣، ٢٤٤) فتح القدير (٥/٥٠)

"أَوْلَى لَهُ" کے معنی "قَارَبَهُ مَا يُهْلِكُهُ" ہیں اور اکثر کا قول یہ ہوا کہ اسم ہے۔ پھر انھوں نے اختلاف کیا کہ کس سے مشتق ہے۔ چنانچہ کسی نے تو کہا ہے کہ مشتق ہے "وَلِيَ" بہ معنی "قَرُبَ" سے۔ کسی نے کہا ہے کہ "وَيْلٌ" سے۔ یہ تو وہ بات ہے جو اس کے اشتقاق اور معنی سے متعلق تھی۔ اب رہا اس کا اعراب تو اگر تم اس کے اسم ہونے کے قائل ہو گے تو اس میں تین وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ "أَوْلَى" مبتداء ہے اور "لَهُمْ" اس کی خبر ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ "فَالْهَلَاكُ لَهُمْ" یعنی ان کے لیے ہلاکت ثابت ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ "أَوْلَى" خبر ہے مبتدائے مقدر کی تقدیر یہ ہے کہ "اَلْعِقَابُ أَوِ الْهَلَاكُ أَوْلَى لَهُمْ أَيْ: أَقْرَبُ وَأَدْنَى" یعنی عذاب یا ہلاکت ان کے قریب تر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ حرفِ لازم بہ معنی حرفِ باء ہو: "أَيْ: أَحَقُّ وَأَوْلَى بِهِمْ" یعنی عذاب ان کو لائق تر ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ "أَوْلَى" مبتدا اور "لهم" اس سے متعلق ہے اور حرفِ لام بہ معنی باء اور ﴿ طَاعَةٌ ﴾ اس کی خبر ہے۔ تقدیر یہ ہے: "فَأَوْلَى بِهِمْ طَاعَةٌ دُوْنَ غَيْرِهَا" یعنی زیادہ لائق ان کو طاعت ہی ہے نہ اس کے علاوہ اور کچھ۔ اور اگر امام اصمعی رحمہ اللہ کے قول کے قائل ہو گے تو "أَوْلٰى" فعل ماضی ہے اور اس کا فاعل مضمر ہے۔ سیاقِ کلام اس پر دال ہے۔ گویا یوں کہا گیا: "فَأَوْلٰى هُوَ" یعنی پس ہلاکت ان کو قریب ہو۔ امام زمخشری رحمہ اللہ کی عبارت ظاہر یہی ہے، کیوں کہ اس نے یوں کہا ہے کہ اس کے معنی ان پر اس کا یہ بد دعا کرنا ہے کہ قریب ہو ان کو ہلاکت۔ (كذا قال السمين)

قولہ تعالیٰ: ﴿ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ﴾ ایک کلامِ مستانف ہے ﴿ طَاعَةٌ ﴾ اور اس کا ما بعد مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ "أَيْ: أَمْرُهُمْ طَاعَةٌ" یعنی ان کا کام مطیع ہونا اور اچھی بات کہنا ہے، یا مبتداء ہے اور خبر محذوف ہے: "أَيْ: طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَعْرُوْفٌ خَيْرٌ لَكُمْ" یعنی تمھارے لیے مطیع ہونا اور دستور کی بات کہنا بہتر ہے۔ امام سیبویہ اور خلیل رحمہما اللہ نے کہا: تقدیر یہ ہے: "طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَعْرُوْفٌ أَحْسَنُ وَأَمْثَلُ بِكُمْ"[1] یعنی کہنا ماننا اور اچھی بات کہنا تمھارے لیے خوب اور بہتر ہے کوئی اور بات کہنے سے۔

امام سمین رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ اس میں کئی وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ اولیٰ کی خبر ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے، یعنی ان کو زیادہ مناسب یہ ہے کہ تیری اطاعت کریں اور بہتر بات کے ساتھ تجھ سے بات چیت کریں جو اذیت سے خالی ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سورت کی صفت ہے: "أَيْ: فَإِذَا أُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُحْكَمَةٌ طَاعَةٌ أَيْ: ذَاتُ طَاعَةٍ أَوْ مُطَاعَةٍ" امام مکی اور ابو البقاء رحمہما اللہ نے اس کو ذکر کیا ہے، اس میں بُعد ہے، اس لیے کہ فاصلوں کے درمیان میں کثرت ہے۔[2] تیسری وجہ وہی ہے جو تقدیرِ امام سیبویہ رحمہ اللہ ہے اور مکی رحمہ اللہ نے اس کی تقدیر "مِنَّا طَاعَةٌ" نکالی ہے، خبر کو تقدیر میں مقدم کیا ہے۔ چوتھی وجہ وہی اول ہے مگر تقدیر یوں کی ہے: "أَمْرُنَا طَاعَةٌ"۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ ﴿ لَهُمْ ﴾ خبر مقدم اور ﴿ طَاعَةٌ ﴾ مبتدائے مؤخر ہے اور وقف و ابتداء وجوہِ مذکورہ میں غور کرنے سے تم کو معلوم ہو

[1] تفسير القرطبي (١٦/٢٤٤) [2] اللباب في علوم الكتاب (١٧/٤٥٣)

جائے گا۔ فتح البیان اور فتح القدیر میں ہے کہ زیادہ مناسب پہلی وجہ ہے۔[1]

﴿ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ﴾ عزم قصد اور ارادہ کرنے کو کہتے ہیں۔ ﴿ عَزَمَ ﴾ کی ﴿ الْاَمْرُ ﴾ کی طرف نسبت مجاز ہے، کیوں کہ عزم اصحابِ امر کا کام ہے نہ کہ خود "امر" کا۔ امر سے مراد قتال ہے اور جواب ﴿ فَاِذَا ﴾ کا کہا ہے کہ ﴿ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴾ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے تو قتال کا حکم نازل ہونے کی تمنا کی، پھر جب حکم نازل ہوا تو بزدلی کے مارے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ لہٰذا جن کا یہ حال ہے، ان کا برا ہو۔ چاہیے تو یوں تھا کہ جب تمنا کے مطابق حکم نازل ہوا اور اُمید پوری ہوئی تو حکم مانتے اور اچھی بات کہتے کہ خوب ہوا، ہماری تمنا پوری ہوئی، ہم رسول کے ساتھ ہو کر خوب لڑیں گے، یہ کام تو حکم نازل ہونے کے وقت کا تھا۔

پھر جب لڑائی والے لڑائی کا عزم کر لیتے تو اگر اللہ کے وعدے میں سچے رہتے تو اُن کے لیے یہ سچا رہنا معصیت اور مخالفت سے بہتر ہوتا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ فَاِذَا ﴾ کا جواب محذوف ہے، تقدیر یہ ہے کہ "كَرِهُوْهُ". ﴿ عَزَمَ الْاَمْرُ ﴾ کے معنی ہیں: "جَدَّ الْأَمْرُ أَيْ: جَدَّ الْقِتَالُ وَوَجَبَ وَفَرَضَ" مفسرین نے کہا: اس کے معنی یہ ہیں: "إِذَا جَدَّ الْأَمْرُ وَلَزِمَ فَرْضُ الْقِتَالِ خَالَفُوْا وَتَخَلَّفُوْا، فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ فِيْ إِظْهَارِ الْإِيْمَانِ وَالطَّاعَةِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنَ الْمَعْصِيَةِ وَالْمُخَالَفَةِ" یعنی پھر جب قتال پختہ اور مضبوط ہو گیا اور لڑنا لازم، واجب اور فرض ہو گیا تو اس کو ناپسند کیا اور حکم کی مخالفت کی اور لڑائی سے پیچھے ہٹ کر بیٹھ رہے۔ چنانچہ اگر ایمان وطاعت کے ظاہر کرنے میں اللہ کے ساتھ سچے رہتے تو یہ ان کے لیے نافرمانی اور مخالفت سے بہتر تھا۔

پھر اللہ پاک نے ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ اور تشدید کے لیے صیغۂ غائب سے صیغۂ خطاب کی طرف کلام کو پھیرا اور بیمار دل والے لوگوں کو مخاطب کر کے یوں ارشاد فرمایا: ﴿ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ﴾ جمہور نے ﴿ تَوَلَّيْتُمْ ﴾ بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے، اس میں دو احتمال ہیں: ایک یہ ہے کہ "تَوَلّٰى" بہ معنی اعراض ہے، اس کی بنا پر معنی یہ ہیں، پھر کیا تم سے توقع کی جاتی ہے، اگر تم ایمان سے اعراض کرو، جس ایمان کے ساتھ تم ظاہر میں ملتبس ہوئے ہو۔ یعنی ظاہری طور پر ایمان لائے ہو، یہ توقع کہ تم زمین میں طرح طرح کے فساد کرو۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر تم اللہ عزوجل کی کتاب کی اطاعت سے اعراض کرو، اس طرح کہ زمین میں خون ریزی کر کے فساد کرو۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: اگر تم طاعت سے اعراض کرو، یہ کہ زمین میں معاصی کر کے فساد کرو۔ کسی نے کہا ہے کہ اگر تم اعراض کرو قتال سے اور اس کے احکام سے مفارقت کرو، پھر تم اپنی جاہلیت کی

[1] فتح القدیر (٥/٥٠) فتح البیان (٦٩/١٣)

طرف غور کرو۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ ''تَوَلّٰی'' بہ معنی حکومت سے ماخوذ ہے۔ اس کی بنیاد پر امام کلبی رحمہ اللہ نے معنی کیے ہیں کہ پھر کیا اگر تم امرِامت کے والی اور حاکم ہو تو تم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ تم زمین میں ظلم کے ساتھ فساد کرو۔ امام کعب رحمہ اللہ نے کہا: یہ کہ بعض تمھارا بعض کو قتل کرے، یا اگر تم حکم کے والی ہو، پھر تم حاکم بنائے جاؤ تو زمین میں رشوت لے کر فساد کرو۔

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ''تُوُلِّيْتُمْ'' کو بہ ضمِ تائے فوقیہ و واو و کسرِ لام بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔ (وَبِهَا قَرَأَ ابن أبي إسحاق و ورش عن يعقوب). اس کے معنی یہ ہیں: پھر کیا توقع رکھی جاتی ہے تم سے اگر تم پر ظالم والیان والی بنائے جائیں تو تم اُن پر فتنے میں خروج کرو اور اُن سے لڑو اور بغی، ظلم اور قتل کے ساتھ اپنے ظلم ناتے توڑو۔ جمہور نے ''تَقَطَّعُوْا'' کو بہ تشدید پڑھا ہے بنا بر تکثیر اور ابو عمرو نے ایک روایت میں جو قطع سے ہے بہ تخفیف پڑھا ہے۔ (اسی طرح سلام، عیسیٰ اور یعقوب نے بھی پڑھا ہے) محاورۂ عرب میں ''عَسَيْتُ إِنْ أَفْعَلُ كَذَا'' بہ فتح و کسرِ سین بولتے ہیں، یہ دو لغت ہیں۔[1] (كذا ذكر الجوهري) اور یہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔

﴿ اَنْ تُفْسِدُوْا ﴾ خبر ہے ﴿ عَسَيْتُمْ ﴾ کی اور جملہ شرطیہ معترضہ ہے اسم و خبر کے درمیان۔ چونکہ ﴿ فَهَلْ عَسَيْتُمْ ﴾ جیسی ترکیب میں متکلم کی طرف سے توقع ظاہر ہوتی ہے، حالاں کہ یہاں متکلم اللہ پاک ہے اور وہ ''مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ'' کا عالم ہے، اس کے کلام میں توقع بن نہیں سکتی، اس لیے امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ توقع کے معنی کا مرجع خلق کی طرف ہے، جس طرح کہ ﴿ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴾ [الصافات: ١٤٧] ''اور ہم نے انھیں ایک لاکھ بلکہ اور زیادہ آدمیوں کی طرف بھیجا'' میں مرجع شک کا مخلوق کی طرف ہے۔ اس بات کی توضیح قاضی صاحب کا قول کرتا ہے۔ انھوں نے کہا ہے: معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ دین میں اپنے ضعف کے سبب سے اور دنیا پر حریص ہونے کی وجہ سے اس بات کے مستحق ہیں کہ جس شخص نے ان کا حال پہچانا ہے، وہ اس کی ان سے توقع کرے اور ان سے کہے: ﴿ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ﴾.

﴿ اُولٰٓئِكَ ﴾ کا اشارہ مخاطبین سابقین کی طرف ہے اور مبتدا ہے، اس کی خبر ﴿ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ﴾ ہے، چونکہ ان کے گناہوں کا ذکر اس بات کا موجب ہوا کہ رتبۂ خطاب سے گرا دیے جائیں اور اُن کا حال ان کے غیر کے لیے نقل کیا جائے، اس لیے خطاب سے ہٹ کر اسمِ اشارہ سے ان کی طرف اشارہ فرمایا، یعنی لوگو! سنتے ہو، یہ مفسد وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے، چنانچہ حق کے سننے سے ان کو بہرا کیا اور اُن کی آنکھوں کو اس شے کو دیکھنے سے اندھا کر دیا جس کے ساتھ توحید اور بعث پر استدلال کریں اور باقی ساری اشیاء کی حقیقت پر دلیل قائم کریں جن کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلایا ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي (٢٤٥/١٦، ٢٤٦) فتح القدير (٥٠/٥، ٥١)

نکتہ:

"فَأَصَمَّ آذَانَهُمْ" نہ کہا، جیسا کہ ﴿ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ ﴾ کہا ہے اور "أَعْمَاهُمْ" نہ فرمایا، اس لیے کہ کانوں کے چلے جانے سے سننے کا جانا لازم نہیں آتا، اس لیے کانوں سے تعرض نہ کیا اور آنکھوں کے جانے سے ابصار کا جانا لازم ہوتا ہے، اس لیے ان کا ذکر کیا۔②

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ﴿٢٤﴾ إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ ﴿٢٥﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لِلَّذِينَ كَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللَّهُ سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ ۖ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِسْرَارَهُمْ ﴿٢٦﴾ فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ ﴿٢٧﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اتَّبَعُوا مَا أَسْخَطَ اللَّهَ وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ ﴿٢٨﴾

کیا پھر وہ لوگ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے یا اُن کے دلوں پر تالے (لگے ہوئے) ہیں؟㉔ بے شک جو لوگ، بعد اس کے کہ ان پر ہدایت ظاہر ہو گئی، اپنی پیٹھوں کے بل پلٹ گئے، شیطان نے ان کے لیے (ان کے عمل) مزین وخوشنما بنا دیے، اور (اللہ نے) انھیں ڈھیل دے دی㉕ یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے ان لوگوں (یہود) سے، جنھوں نے اس چیز (قرآن) کو ناپسند کیا جو اللہ نے نازل کی، کہا کہ بعض امور میں ہم آپ کی بات مانیں گے اور اللہ ان کے راز جانتا ہے㉖ پھر کیا حال ہو گا جب فرشتے ان کو فوت کریں گے؟ جبکہ وہ ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر مارتے ہوں گے㉗ یہ (مار) اس لیے کہ بے شک انھوں نے اس چیز کی پیروی کی، جس نے اللہ کو ناراض کر دیا، اور انھوں نے اس (اللہ) کی رضا مندی ناپسند کی، لہٰذا اللہ نے ان کے اعمال برباد کر دیے۔㉘

تدبرِ قرآن کا حکم:

قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے، یعنی منافق قرآن نہیں سمجھتے کہ جہاد میں کتنے فائدے ہیں اور قرارِ ایمان سے

① فتح البیان (۱۳/۶۸۔۷۱)

پھرے جاتے ہیں کہ لڑائی میں نہ جائیں گے تو دیر تک زندہ رہیں گے۔ یہ جو کہا کہ ہم عن قریب بعض کاموں میں تمھارا کہا مانیں گے۔ منافقون نے کافروں سے کہا کہ ہم مسلمان ہوئے ہیں، لیکن تم سے نہیں لڑیں گے۔ جب فرشتے ان کی روح کو قبض کریں گے، تب وہ موت سے کیسے بچیں گے اور اس وقت نفاق کا مزہ چکھیں گے۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف کے سوچنے سمجھنے کا امر کرتا ہے اور اس سے اعراض کرنے سے منع فرماتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے: کیا وہ قرآن کو سوچتے نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر قفل ہیں جس سے وہ بند کیے گئے ہیں، اس کے معانی میں سے کوئی شے ان کی طرف نہیں پہنچتی۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عروہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴾ تو یمن والوں میں سے ایک جوان نے کہا: بلکہ ان پر اُن کے قفل ہیں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہی ہو کہ ان کو کھولے یا ان کی کشایش کرے، چنانچہ وہ جوان ہمیشہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے جی میں رہا، یہاں تک کہ وہ والی بنائے گئے، پھر انھوں نے اس سے استعانت کی[1] (شاید یہ مطلب ہو کہ اس جوان نے چونکہ ایک سمجھ کی بات کہی، اس لیے وہ عمر رضی اللہ عنہ کے جی میں اثر کر گیا اور اُن کو پسند آیا، پھر جو کام اس کے کرنے کا تھا، اس سے اس میں مدد لی۔ واللّٰه أعلم. یہ حدیث مرسل ہے، عروہ رحمہ اللہ کبار تابعین میں سے ہیں، نبی اکرم ﷺ کو نہیں پایا، کیونکہ اُن کی ولادت ۲۲ رہجری میں ہوئی۔ اس حدیث کو بغوی رحمہ اللہ نے بھی بہ اسنادِ ثعلبی روایت کیا ہے)[2]

ارتداد کی مذمت:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰۤی اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْهُدَی الشَّیْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ وَاَمْلٰی لَهُمْ ﴾ یعنی جن لوگوں نے ایمان سے مفارقت کی اور کفر کی طرف رجوع ہوئے اس کے بعد کہ ان پر ہدایت کھل گئی، شیطان نے ان کو یہ کام مزین، حسین اور جمیل کر دکھایا اور ان کو فریب دیا۔ ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِیْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِیْعُكُمْ فِیْ بَعْضِ الْاَمْرِ ﴾ یعنی یہ اس لیے کہ انھوں نے خفیہ طور پر باطل میں کافروں کی معاونت اور خیر خواہی کی کہ ہم بعض کاموں میں تمھاری بات بھی مانیں گے۔ یہ منافقوں کی حالت ہے کہ جو ظاہر کرتے ہیں وہ باطن کے خلاف ہوتا ہے، اسی لیے اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴾ یعنی جو مشورہ وہ چھپاتے ہیں اللہ اس پر مطلع ہے اس کو جانتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ یَكْتُبُ مَا یُبَیِّتُوْنَ ﴾ [النساء: ۸۱]
''ان کی راتوں کی بات چیت اللہ لکھ رہا ہے۔''

پھر فرمایا: ﴿ فَكَیْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ﴾ یعنی پھر ان کا حال کیسا ہوگا، جبکہ

---

[1] تفسیر الطبري (۱۸۰/۲۲) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] تفسیر البغوي (۲۸۷/۷)

فرشتے اُن کے پاس روح قبض کرنے کے لیے آئیں گے اور روحیں ان کے جسموں سے نکلنے سے انکار کریں گی اور فرشتے سختی، درشتی اور زبردستی سے اور مار کر ان کو نکالیں گے، جیسا کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَٰٓئِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَٰرَهُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴾ [الأنفال: ٥٠] ''کاش کہ تو دیکھتا جب کہ فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں ان کے منہ پر اور سرینوں پر مارتے ہیں (اور کہتے ہیں) تم جلنے کا عذاب چکھو۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذِ الظَّٰلِمُونَ فِي غَمَرَٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَٰٓئِكَةُ بَاسِطُوٓا أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوٓا أَنفُسَكُمُ ۖ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنتُمْ عَنْ ءَايَٰتِهِۦ تَسْتَكْبِرُونَ ﴾ [الأنعام: ٩٣] ''اور اگر آپ اس وقت دیکھیں جب کہ یہ ظالم لوگ موت کی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے کہ ہاں اپنی جانیں نکالو۔ آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی، اس سبب سے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ذمے جھوٹی باتیں لگاتے تھے، اور تم اللہ کی آیات سے تکبر کرتے تھے۔'' اور اسی لیے یہاں یوں فرمایا: ﴿ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اتَّبَعُوا مَآ أَسْخَطَ اللَّهَ وَكَرِهُوا رِضْوَٰنَهُۥ فَأَحْبَطَ أَعْمَٰلَهُمْ ﴾[1]

اللہ پاک نے پہلے فرمایا: ﴿ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰٓ أَبْصَٰرَهُمْ ﴾ یعنی حق کے سننے سے ان کو بہرا کر دیا اور ہدایت کے دیکھنے سے ان کی آنکھیں اندھی کر دیں۔ پھر فرمایا: ﴿ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْءَانَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَآ ﴾ اس پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ جب اللہ پاک نے ان کو ویسا کر دیا تو پھر غور وفکر کے چھوڑ دینے پر ان کو توبیخ کیوں کرتا ہے یہ تو ایسا ہوا جیسا کوئی اندھے سے کہے کہ دیکھ اور بہرے سے کہے کہ سن؟!

علماء نے اس کے تین جواب دیے ہیں: ایک یہ ہے کہ تکلیف ما لا یطاق ہمارے ہاں جائز ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ جان چکا ہے کہ وہ ایمان نہ لائے گا پھر اس کو ایمان کا امر کیا ہے، چنانچہ اس لیے باوجود بہرا اور اندھا کرنے کے غور وفکر کے چھوڑ دینے پر اُن کو توبیخ کی۔ "وَاللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ"۔ اس پر کسی کو اعتراض نہیں پہنچتا۔ دوسرا یہ ہے کہ ﴿ يَتَدَبَّرُونَ ﴾ میں ضمیر ناس کی طرف راجع ہے، اس قید کے بغیر کہ اُن کو بہرا، اندھا کیا۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ آیت اگلی آیت کے معنی کی تحقیق کے لیے وارد ہوئی ہے، یعنی جب اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰٓ أَبْصَٰرَهُمْ ﴾ تو ﴿ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْءَانَ ﴾ تہییج کی مثل ہوا، یعنی ان کو اس کفر کے ترک پر آمادہ کرنا ہے جس میں غرق ہو رہے ہیں اور جس کے سبب سے لعنت کے مستحق ہوئے ہیں، یا مثل تبکیت کے ہے کہ جس کفر پر وہ جمے ہوئے ہیں اُن پر اُن کو توبیخ اور سرزنش فرماتا ہے۔ والله أعلم بمراده.

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢٢٧/٤، ٢٢٨)

یا یوں کہو: گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ﴾ یعنی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے خود سے دور کیا ہے، یا صدق سے یا خیر سے، یا اُن کے سوا اور اچھے کاموں سے دور کیا، پھر ان کو بہرا کیا کہ کلام کی حقیقت کو نہیں سنتے اور اندھا کیا کہ طریقۂ اسلام کو نہیں دیکھتے۔ تو اب وہ دو باتوں کے درمیان ہوئے یا تو وہ قرآن شریف کو نہیں سوچتے، چنانچہ اس سے دور ہوتے ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خیر و صدق سے ملعون و مبعد کیا ہے اور قرآن شریف ان دونوں میں سے ہے، بلکہ ان سے اشرف اور اعلیٰ ہے اور یا تدبر کرتے ہیں، لیکن اس کے معنی ان کے دلوں میں نہیں گھستے، اس لیے کہ ان پر قفل پڑے ہوئے ہیں۔ یہ سب مضمون خطیب اور خازن سے ماخوذ ہے۔ تدبر کی اصل شے کے انجام میں غور و فکر کرنا ہے اور اس شے میں غور کرنا ہے جس کی طرف اس امر کا رجوع ہوتا ہے اور قرآن میں غور نہیں ہوتا مگر پڑھتے وقت حضورِ قلب، ارادہ اور فکر کے اکٹھے ہونے کے ساتھ۔ اس میں شرط یہ ہے کہ حلال خرچ کرے، تھوڑی غذا لے اور نیت خالص ہو۔[1] (كذا في الخازن)

فتح البیان کا بیان:

ہمزۂ استفہام انکار کے لیے ہے، معنی یہ ہیں کہ کیا پھر خوب تکلف اور کوشش کر کے قرآن کو سمجھتے نہیں، تا کہ اس کے اندر جو نصائح اور ظاہری حجتیں اور قطعی براہین ہیں، ان کو جان لیں۔ یہ ایسی نصائح اور براہین ہیں کہ جسے فہم اور عقل ہے، اس کے لیے کافی ہوتی ہیں اور وہ نصائح اور براہین اسے اللہ کے ساتھ کفر اور شرک کرنے سے اور اس کے معاصی پر عمل کرنے سے روکتے اور ڈراتے ہیں۔ پھر ایک دھمکی سے دوسری دھمکی کی طرف انتقال کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ﴾ کلمۂ ﴿ أَمْ ﴾ بہ معنی بل و ہمزۂ استفہام ہے، یعنی بلکہ کیا ان کے دلوں پر قفل ہیں کہ وہ سمجھتے بوجھتے نہیں۔

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد اس سے یہ ہے کہ ان پر مہر کر دی ہے[2] اور "أَقْفَالٌ" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دل معرفتِ حق کے لیے بند ہیں، کہ ان پر مہر لگا دی ہے اور "أقفال" استعارہ ہے واسطے بند ہونے دل کے معرفتِ حق سے۔ تنکیرِ قلوب یا تو دلوں کے ڈر اور خوف کے لیے ہے یا تفظیع شانِ قلوب (دلوں کی تنگی اور گھٹن) کے لیے ہے، گویا یوں کہا گیا کہ ایسے دلوں پر جو منکر ہیں جن کا حال معلوم نہیں ہے، یا اس لیے کہ ان سے بعض لوگوں کے دل مراد ہیں اور وہ بعض لوگ منافق ہیں۔

اقفال کی اضافت جو قلوب کی طرف کی تو اس سے منظور اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ اقفال سے مراد وہ شے ہے جو دلوں کے لیے ایسی ہے جیسے دروازوں کے قفل ہوتے ہیں، یا یہ کہ وہ ایسے قفل ہیں جو خاص طور پر دلوں کے لیے ہیں اور اُن کے لیے مناسب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے دلوں میں نہ تو ایمان داخل ہوتا ہے اور نہ کفر و شرک

---

[1] تفسير الخازن (١٨٢/٦) [2] فتح القدير (٥١/٥)

ان سے نکلتا ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے ان پر مہر لگا دی ہے۔ آیتِ کریمہ بالعموم ہر اس شخص کے بارے میں ہے جو قرآن شریف میں تدبر اور غور نہیں کرتا اور اس کا پیرو نہیں ہوتا اور جن کے حق میں نازل ہوئی ہے وہ تو بہ دخولِ اولیٰ اس میں داخل ہیں۔ جمہور نے ﴿ اَقْفَالُهَا ﴾ بہ صیغۂ جمع پڑھا ہے اور کسی نے بہ کسرِ ہمزہ پڑھا ہے بنا بر مصدر مثل "إقبال"۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ﴾ یعنی جو لوگ کہ لوٹ کر کفار ہو گئے جیسے کہ شروع شروع میں تھے، اس کے بعد کہ ان پر ہدایت ان معجزاتِ ظاہرہ و آیاتِ قاہرہ و دلائلِ واضحہ و براہینِ باہرہ کے سبب سے کھل گئی جن کو لے کر نبی اکرم ﷺ اُن کے پاس تشریف لائے۔ ﴿ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ وَاَمْلٰى لَهُمْ ﴾ یہ جملہ ﴿ اِنَّ ﴾ کی خبر ہے، یعنی شیطان نے ان کے لینے ان کے گناہوں کو اچھا کر دکھایا۔ اور اُن کے لیے اُن گناہوں میں واقع ہونے کو آسان کر دیا اور کبیرہ گناہوں پر عمل پیرا ہونے کو سہل کر دیا اور اُن کے لیے لمبی لمبی اُمیدیں اور آرزوئیں کر دیں اور اُن کو درازیِ عمر کا وعدہ دیا۔ کسی نے کہا ہے کہ جس نے ان کو ڈھیل دی، وہ اللہ عزوجل ہے، اس طرح سے کہ ان پر عذاب کی جلدی نہیں کی۔ اس قول کو امام فراء اور مفضل رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ زیادہ بہتر اس قول کو اختیار کرنا ہے کہ وہ شیطان ہے، اس لیے کہ اس کا ذکر ابھی ابھی گزر چکا ہے۔

جمہور نے ﴿ اَمْلٰى ﴾ بہ صیغۂ معروف پڑھا اور امام ابو عمرو رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی ابن ابی اسحاق، عیسیٰ بن عمرو، ابو جعفر اور شیبہ رحمہ اللہ) نے بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔ اس کی بنا پر فاعل اللہ تعالیٰ ہو گا، یا شیطان پہلی قراءت کی طرح۔[1] بالجملہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا ﴾ سے مراد اہلِ کتاب کے کفار ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی صفت پہچان لینے کے بعد اُن کا انکار کیا۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اہلِ نفاق ہیں۔ امام ضحاک اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منافقین ہیں، قتال سے پیچھے ہٹ کر بیٹھ رہے۔[2] یہ زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ سیاقِ کلام منافقوں کے بارے میں ہے۔

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ﴾ یعنی یہ ارتداد یا تسویل و املاء، لیکن پہلا زیادہ مناسب ہے، بہ سبب اس کے ہے کہ یہ منافق جو اپنی پیٹھ پر پھر گئے، انھوں نے ان لوگوں سے کہا جنھوں نے اللہ کے نازل کیے ہوئے حکم کو ناپسند کیا، مراد مشرکین ہیں کہ ہم بعض کام میں تمھارا کہنا مانیں گے۔ اب بعض کام سے مراد رسول اللہ ﷺ کی عداوت ہے اور اس شے کی مخالفت ہے جس کو لے کر آپ آئے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ منافقوں نے یہود سے کہا: ہم بعض کام میں تمھاری اطاعت کریں گے، جیسے: جہاد سے بیٹھ رہنا اور اگر وہ نکلیں تو اُن کے ساتھ نکلنا اور باہم مل کر رسول اللہ ﷺ کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ کہنے والے تو یہود ہیں اور ﴿ لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا ﴾ منافقین ہیں۔

---

[1] تفسير القرطبي (٢٤٩/١٦) فتح القدير (٥١/٥) [2] تفسير الطبري (١٨١،١٨٠/٢٢) تفسير القرطبي (٢٤٩/١٦)

یہ بات کہ قائلین تو منافق ہیں اور کارہین یہود ہیں، اس کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَىِٕنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ﴾ [الحشر: ١١] ''کیا تو نے منافقوں کو نہ دیکھا؟ کہ اپنے اہلِ کتاب بھائیوں سے کہتے ہیں اگر تم جلا وطن کیے گئے تو ضرور بالضرور ہم بھی تمھارے ساتھ نکل کھڑے ہوں گے اور تمھارے بارے میں ہم کبھی بھی کسی کی بات نہ مانیں گے اور اگر تم سے جنگ کی جائے گی تو بخدا ہم تمھاری مدد کریں گے۔''

چونکہ منافقوں کی یہ بات یہود سے پوشیدہ طور پر ہوئی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴾ یعنی اگرچہ انھوں نے یہ مشورہ پوشیدہ طور پر کیا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ ان کے اسرار کو جانتا ہے، اس سے کوئی شے چھپی نہیں ہے۔ جمہور نے ''أسرار'' بہ فتحِ ہمزہ پڑھا ہے بنا بر جمع سر۔ امام ابوعبیدہ اور ابو حاتم رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے اور کوفیوں وغیرہ، (یعنی امام حمزہ، کسائی، حفص عن عاصم، ابن وثاب اور اعمش رحمہ اللہ) نے بہ کسرِ ہمزہ پڑھا ہے بنا بر مصدر[1] یعنی ''إِخْفَاءَهُمْ''۔

﴿ فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ﴾ حرفِ فاء مابعد کی ماقبل پر ترتیب کے لیے ہے۔ اور ''کیف'' محلِ رفع میں ہے، اس بنا پر کہ خبر مقدم ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ ''فَكَيْفَ عِلْمُهُ بِأَسْرَارِهِمْ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ'' یا محلِ نصب میں ہے بہ فعلِ محذوف: ''أَيْ: فَكَيْفَ يَصْنَعُوْنَ'' یا خبر ہے ''کان'' مقدر کی: ''أَيْ: فَكَيْفَ يَكُوْنُوْنَ'' اور ظرف معمول ہے فعل مقدر کا۔

جمہور نے ﴿ تَوَفَّتْهُمْ ﴾ پڑھا ہے اور امام اعمش رحمہ اللہ نے ''تَوَفَّاهُمْ'' پڑھا ہے۔[2] یہ یا تو جمہور کی قراءت کی طرح ماضی ہے، یا مضارع ہے، ایک حرفِ تاء حذف کر دیا گیا ہے۔ اور جملہ ﴿ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال ﴿ تَوَفَّتْهُمْ ﴾ کے فاعل سے، یا اس کے مفعول سے، یعنی جب کہ اللہ تعالیٰ ان کے اسرار کو جانتا ہے تو کیسا ہوگا اس کو جاننا اُن کے اسرار کو، یا وہ کیوں کر کریں گے، یا وہ کیسے ہوں گے جب فرشتے ان کو وفات دیں گے اس حال میں کہ ان کے چہروں اور پیٹھوں کو لوہے کے گرزوں سے مارتے جاتے ہوں گے۔ اس میں سخت قسم کی دھمکی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر عذاب کی ان سے تاخیر ہوئی تو عن قریب اُن کا یہ حال ہونے والا ہے، یہ تصویر ہے اس زبوں حالی اور تکلیف کی جو اُن کو وفات دینے کے وقت ہوگی۔ کہا ہے کہ جو شخص بھی اللہ کی معصیت پر وفات دیا جاتا ہے، فرشتے اس کے چہرے اور پیٹھ پر مارتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ حال جنگ کے وقت ہوگا جب فرشتے رسول اللہ ﷺ کی مدد کریں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ قیامت کے دن ہوگا۔ لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ شیخ زادہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ انھوں نے جو قتال کو ناپسند کیا اور اس کا کہا مانا جس نے ان کو اس کے چھوڑنے اور اس سے ہٹ کر بیٹھ

---

[1] تفسير القرطبي (٢٥٠/١٦) [2] فتح القدير (٥٢/٥)

رہنے کا امر کیا اور صرف اس خوف سے کہ اگر لڑائی میں ثابت رہے تو منہ کی طرف سے مارے جائیں گے اور اگر بھاگے تو پیٹھ کی طرف سے مارے جائیں گے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم نے کافروں کے ساتھ جنگ کرنے کو ناپسند کیا جس کا تم کو حکم ہوا، اس خوف سے کہ چہروں اور پیٹھوں کی طرف سے مارے جاؤ تو تم اس شے سے بچنے کے لیے جس سے ڈرتے ہو اس وقت کیا حیلہ کرو گے جب فرشتے تم کو اس حال میں وفات دیں گے کہ تمھارے چہروں اور پیٹھوں کو مارتے جاتے ہوں گے، کیوں کہ جو شخص کسی معصیت پر وفات دیا جاتا ہے تو عذاب کے فرشتے اس کی روح کو قبض نہیں کرتے، مگر اس کے بعد کہ اس کے چہرے اور پیٹھ کو مارتے ہیں، جیسا کہ یہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَاۤ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴾ یعنی اس صورت پر وفات دینا جس کا ذکر کیا گیا اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے اس کفر اور معاصی کی پیروی کی جو اللہ کو ناخوش کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کا چھپانا ہے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور تعریف کو جو تورات میں مذکور ہے، لیکن زیادہ مناسب پہلا قول ہے، اس عموم کے سبب سے جو کلمہ ''ما'' میں ہے۔ اور ناپسند کیا ایمان و توحید و طاعت کو کہ جس کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے تو اس سبب سے اس نے ان کے اعمال باطل کر دیے۔ مراد وہ اعمال ہیں جن کی صورت طاعت کی صورت تھی، ورنہ کافر کے لیے کوئی عمل نہیں ہے یا مراد وہ خیر ہے جو انھوں نے مرتد ہونے سے پہلے کی تھی۔ [1]

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿29﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ﴿30﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ ﴿31﴾

کیا ان لوگوں نے جن کے دلوں میں روگ ہے، یہ سمجھ رکھا ہے کہ اللہ ان کے کینے ہرگز ظاہر نہیں کرے گا ﴿29﴾ اور اگر ہم چاہتے تو یقیناً آپ کو وہ (منافق) دکھا دیتے، پھر آپ انھیں ان کے چہرے کی علامتوں سے ضرور پہچان لیتے، اور یقیناً آپ انھیں گفتگو کے لب و لہجے سے پہچان لیں گے، اور اللہ تمھارے اعمال جانتا ہے ﴿30﴾ اور ہم تمھیں ضرور آزمائیں گے، حتی کہ تم میں سے مجاہدین کو اور صبر کرنے والوں کو جان لیں، اور ہم تمھارے حالات جانچ لیں ﴿31﴾

---

[1] فتح البیان (۱۳/۷۱-۷۴)

منافقین کی پردہ دری کا بیان:

حافظ صاحب رحمہ اللہ کہتے ہیں: کیا منافق لوگ اس بات کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کا حال اپنے بندوں سے نہ کھولے گا، بلکہ وہ تو عن قریب ان کے کام کو واضح اور ظاہر کر دے گا، یہاں تک کہ بصیرت رکھنے والے ان کو سمجھ جائیں گے۔ اور واقعی اس کے متعلق اللہ پاک نے سورت براءت نازل فرمائی اور اس میں ان کی فضیحتیں اور وہ افعال بیان کر دیے جو اُن کے نفاق پر دال تھے، جن کا وہ قصد کر رہے تھے، اسی لیے اس سورت کا نام فاضحہ رکھا جاتا ہے، "أضغان"، "ضغن" کی جمع ہے، "ضغن" وہ حسد اور کینہ ہے جو اُن کے دلوں میں اسلام اور اہلِ اسلام کے لیے اور اُن لوگوں کے لیے تھا جو اسلام کی مدد کے لیے قائم رہتے تھے۔

﴿ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ ﴾ یعنی اے محمد! اگر ہم چاہتے تو تجھے اُن کے اشخاص دکھا دیتے تو تُو ان کو دیکھ کر پہچان لیتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے سارے منافقوں میں یہ کام نہیں کیا، اس لیے کہ اپنی مخلوق کا ستر رکھنا اور معاملات کا ان کے ظاہر پر محمول رکھنا اور سرائر کا ان کے عالم کی طرف رد کرنا منظور ہے۔ ﴿ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ ﴾ یعنی تو اُن کو اُن کے چہروں سے پہچان چکا ہے اور آگے چل کر ان کو اس شے سے پہچان لے گا جو اُن کے کلام سے ظاہر ہوتی جو اُن کے مقاصد پر دال ہے۔ کلام کرنے والا اپنے کلام کے معانی اور مطلب سے پہچان لیا جاتا کہ وہ دو گروہوں میں سے کس کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔

لحنِ قول سے مراد یہی معنی ہیں، جیسا کہ امیر المومنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ نہیں پوشیدہ کی کسی نے کوئی پوشیدہ بات مگر اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر کر دیتا ہے، اس کے چہرے پر اور اس کی زبان کے فلتات پر[1] ("فلتات"، "فلتة" کی جمع ہے، "فلتة" ہر وہ شے ہے جو بغیر فکر کے کی جاتی ہے، مثلاً جو بات بے سوچے سمجھے بے اختیار زبان سے نکل جاتی ہے، وہ فلتہ ہوئی) حدیث شریف میں ہے: « مَا أَسَرَّ أَحَدٌ سَرِيْرَةً إِلَّا كَسَاهُ اللّٰهُ تَعَالَى جِلْبَابَهَا إِنْ خَيْرًا فَخَيْرٌ وَإِنْ شَرًّا فَشَرٌّ »[2] جس شے سے آدمی کے نفاق پر استدلال کیا جاتا ہے، ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں اور عمل اور اعتقاد کے نفاق کا بھی بیان کر چکے ہیں۔ بخاری کی شرح کے شروع میں اس طرح پر کلام کیا ہے کہ یہاں اس کے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حدیث میں منافقوں کی ایک جماعت کا تعین وارد ہوا ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو مسعود عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک خطبہ سنایا تو اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کی ثنا کی۔ پھر فرمایا: بے شک تم میں سے منافق ہیں، چنانچہ میں جس کا نام لوں اس کو

---

[1] تفسیر ابن كثير (٢٢٨/٤)

[2] المعجم الكبير (١٧١/٢) اس کی سند میں "محمد بن عبید اللہ اور حامد بن آدم" سخت ضعیف راوی ہیں۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٢٣٧)

چاہیے کہ اٹھ کھڑا ہو۔ پھر فرمایا: اے فلاں! اٹھ کھڑا ہو، اے فلاں! اٹھ کھڑا ہو، اے فلاں! اٹھ کھڑا ہو، یہاں تک کہ آپ نے چھتیس مردوں کے نام لیے، پھر فرمایا کہ یقیناً تم میں یا تم میں سے منافق ہیں، چنانچہ اللہ سے ڈرو، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے جن کا نام لیا گیا تھا، ایک شخص کے پاس سے گزرے، یہ شخص منہ پر مقنع (خود۔ نقاب) ڈالے ہوئے تھا، وہ اس کو پہچانتے تھے، فرمایا: تجھے کیا ہوا؟ اس نے ان سے وہ بات بیان کی جو رسول اللہ ﷺ نے فرمائی تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "بُعْدًا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ"[1] یعنی تجھے دوری ہو سارے دنوں میں۔

قولہ عزوجل: ﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ وَنَبْلُوَا۠ اَخْبَارَكُمْ ﴾ یعنی البتہ ہم تم کو اوامر ونواہی کے ساتھ آزمائیں گے، یہاں تک کہ تم میں سے جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو جان لیں اور تمھاری خبریں جانچیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا پہلے سے ہی اس شے کا علم رکھنا جو ہونے والی ہے، یہ کہ وہ عن قریب ہونے والی ہے، اس میں کچھ شک وشبہہ نہیں ہے۔ چنانچہ مراد یہ ہے، یہاں تک کہ ہم جانیں اس کے واقع ہونے کو۔ اسی لیے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس کے مثل فرماتے ہیں: "إِلَّا لِنَعْلَمَ أَيْ: لِنَرَى"[2]

فتح البیان کا بیان:

کلمۂ ﴿ اَمْ ﴾ منقطع بہ معنی بل وہمزہ ہے اور ﴿ اَنْ لَّنْ ﴾ میں ﴿ اَنْ ﴾ مخففہ مثقلہ سے ہے اور اسم اس کا ضمیرِ شان مقدر: "أَيْ: أَنَّهُ لَنْ" اور "لن" مع اپنے ماتحت کے "أَنْ" کی خبر ہے اور "أن" مع اسم وخبر قائم مقام ہر دو مفعول "حسبَ" ہے۔ "اخراج" بہ معنی "اظهار" ہے۔ "أضغان" جمع "ضغن"۔ "ضغن" وہ مکروہ ہے جو جی میں پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ چنانچہ کسی نے تو کہا ہے کہ وہ عشق ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حسد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حقد ہے، یعنی کینہ۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ضغن و ضغينة" حقد ہے۔ امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ضغن" اس آیت میں عداوت کے معنی میں ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ اَضْغَانَهُمْ ﴾ ان کے اعمال، اُن کا خبث اور حسد جو اُن کے دلوں میں ہے۔

پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو منافقوں پر دلالت فرما دی تو آپ منافقوں میں کے مرد کا نام لے کر پکارتے تھے،[4] معنی یہ ہیں: بلکہ کیا وہ لوگ خیال کرتے ہیں جن کے دلوں میں بیماری ہے مراد وہی منافق ہیں جن کے احوال کی تفصیل کی گئی اور ان کے پہلے وصف کے سبب سے اس وصف کے ساتھ موصوف ہوئے جو اُن کے متعلق بری خبر دینے کا مدار ہے اس قول کے ساتھ: ﴿ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴾ یعنی کیا انھوں نے یہ خیال کیا ہے کہ اللہ ان کے کینے، حسد یا دشمنی اور عداوت کو ہرگز ظاہر نہ کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا خیال باطل ہے،

---

[1] مسند أحمد (٢٧٣/٥) اس کی سند میں "عیاض بن عیاض عن أبیہ" دونوں راوی مجہول ہیں۔
[2] تفسیر ابن کثیر (٢٢٨/٤، ٢٢٩) [3] تفسیر القرطبي (٢٥٢/١٦، ٢٥١) [4] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٢٩٩/١٠)

ان کا کینہ مومنوں پر ضرور ظاہر کر دے گا، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول میں بھی مذکور ہو چکا ہے۔

﴿ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ﴾ یعنی اور اگر ہم چاہتے تو البتہ ہم تجھ کو ان کے بارے میں بتا دیتے اور تجھ کو ان کی پہچان کروا دیتے۔ "بِأَعْيَانِهِمْ وَأَشْخَاصِهِمْ" ایسی پہچان جو دیکھنے کے قائم مقام ہوتی۔ عرب لوگ اراءت بہ معنی اعلام بولتے ہیں، جیسے کہتے ہیں: "سَأُرِيْكَ مَا أَصْنَعُ أَيْ: سَأُعَلِّمُكَ" یعنی اب میں تجھے معلوم کرا دوں گا جو کچھ کروں گا۔ صیغۂ غائب سے نونِ عظمت کی طرف جو التفات فرمایا تو اس سے مراد یہ ہے کہ ہم تجھے ان کی پوری پوری معرفت دے دیتے تو تو ان کو اُن کی خاص علامت سے پہچان لیتا جو اُن کا امتیازی نشان ہوتی۔

امام زجاج رحمہ اللہ کہتے ہیں معنی یہ ہیں: اگر ہم چاہتے تو البتہ ہم منافقوں پر ایک علامت ظاہر کر دیتے اور وہ سیما ہے، چنانچہ تو اُن کو اس علامت سے پہچان لیتا۔[1] حرفِ فاء اراءت پر ترتیبِ معرفت کے لیے ہے۔ اور فاء کا مابعد معطوف ہے ﴿ لَوْ ﴾ کے جواب پر۔ حرفِ لام کی تکرار تاکید کے لیے یا مبالغے کے لیے ہے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلَعَرَفْتَهُمْ ﴾ فائدے کی زیادتی کے لیے ہے، وہ یہ ہے کہ تعریف کبھی بولی جاتی ہے اور اس سے حقیقی معرفت لازم نہیں آتی، جیسے بولتے ہیں: "عَرَّفْتُهُ فَلَمْ يَعْرِفْ" یعنی میں نے اس کو پہچنوایا اور اس نے نہ پہچانا تو گویا اس جگہ معنی یہ ہیں کہ ہم تجھ سے اُن کی وہ تعریف بیان کرتے کہ تو اس سے اُن کو پہچان لے، چنانچہ اس میں اس تعریف کی قوت کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی شک وشبہہ واقع نہیں ہوتا۔[2] سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس آیت کے بعد منافقوں میں سے کوئی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مخفی نہ رہا اور آپ اُن کو ان کے چہروں سے پہچانتے تھے۔[3]

﴿ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ﴾ میں حرفِ لام قسم محذوف کا جواب ہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ لحنِ قول، قول کا مطلب اور مقصد ہے، یعنی اللہ کی قسم! البتہ تو پہچان لے گا ان کو بات کے مقصد و مطلب میں اور اس شے میں جس کے ساتھ وہ تیرا اور مسلمانوں کا کام حقارت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد جب بھی کوئی منافق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر گفتگو کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پہچان لیتے تھے۔ امام ابو زید رحمہ اللہ نے کہا: "لَحَنْتُ لَهُ اللَّحْنَ" یہ اس وقت کہو گے جب تم کسی سے کوئی بات کہو اور وہ تو اس کو تم سے سمجھ لے، مگر دوسروں پر وہ مخفی رہے۔

اسی بارے میں شاعر کا قول ہے جس میں وہ کسی کی تعریف کرتا ہے:

مَنْطِقٌ صَائِبٌ وَتَلْحَنُ أَحْيَانًا وَخَيْرُ الْكَلَامِ مَا كَانَ لَحْنًا[4]

یعنی تیری بات راست اور درست ہوتی ہے اور کبھی تو لحن کرتا ہے۔ بہترین کلام وہ ہے جو تعریضاً ہو کہ مخاطب تو اپنی ذہانت سے اس کو سمجھ لے اور دوسرا نہ سمجھے۔

---

① معاني القرآن (٥/١٥) ② تفسير الخازن (٦/١٨٣) ③ تفسير البغوي (٧/٢٨٩) ④ فتح القدير (٥/٥٣)

﴿ لَحْنِ ﴾ کی اصل کلام کا مائل کرنا اور اسے کسی غرض کے لیے اس طرح سے پھیرنا کہ اس کا اعراب زائل کیا جائے یا اس کی تصحیف (غلطی) کی جائے۔ پہلی قسم تو اچھی ہے اور دوسری قسم مذموم ہے۔ امام ابن مردویہ اور ابن عساکر رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اس کی تفسیر میں فرمایا ہے: "لَحْنُ الْقَوْلِ بِبُغْضِهِمْ عَلِيَّ ابْنَ أَبِي طَالِبٍ رضی اللہ عنہ"[1] یعنی البتہ تو ان کو بات کے ڈھب سے ان کے علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے کو پہچان لے گا۔

﴿ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال کو جانتا ہے، ان میں سے کوئی پوشیدہ کام اس پر مخفی نہیں ہے تو تم کو ان کا بدلہ دے گا۔ اس میں منافقوں کو تو سخت وعید ہے اور مومنوں کو وعدہ ہے اور اس بات کی خبر دینا ہے کہ ان کا حال منافقوں کے حال کے برخلاف ہے۔

﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ البتہ ہم تم سے ایسا معاملہ کریں گے کہ تمھیں جانچیں، اس طرح سے کہ تم کو جہاد کا حکم دیں گے، یہاں تک کہ ہم اس شخص کو ظاہری طور پر جان لیں جس نے جہاد کی بجا آوری کی اور اپنے دین پر صبر کیا اور جس حکم کا اس کو پابند کیا گیا، اس کی مشقتوں پر صابر رہا۔

﴿ وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ ﴾ یعنی تمھارے آزمانے کے لیے تمھاری خبروں اور حالتوں کا اظہار اور کشف کریں گے، تاکہ لوگوں پر یہ ظاہر ہو جائے کہ کس نے اس بات میں اللہ کی اطاعت کی جس کا اسے حکم دیا گیا اور کس نے نافرمانی کی اور حکم کو نہ مانا۔ جمہور نے افعالِ ثلاثہ کو نون کے ساتھ پڑھا ہے اور امام ابوبکر رحمہ اللہ نے عن عاصم تینوں کو بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے اور جمہور نے "نَبْلُوَ" کو بہ نصبِ واو پڑھا ہے اس بنا پر کہ ﴿ حَتّٰى نَعْلَمَ ﴾ پر عطف کیا ہے اور ورش نے عن یعقوب بہ سکونِ واو پڑھا ہے اس بنیاد پر کہ ماقبل سے اس کو قطع کیا ہے۔

حکایت:

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ جب اس آیتِ کریمہ کو پڑھتے تو روتے اور کہتے: "اَللّٰهُمَّ لَا تَبْتَلِنَا فَإِنَّكَ إِنْ بَلَوْتَنَا فَضَحْتَنَا وَهَتَكْتَ أَسْتَارَنَا وَعَذَّبْتَنَا"[2] یعنی الٰہی! تو ہم کو مت جانچ، بے شک تو اگر ہم کو جانچے گا تو ہم کو رسوا کرے گا اور ہمارے پردے پھاڑے گا اور ہم کو عذاب کرے گا۔[3] (كذا في فتح البيان) اس حکایت کو امام کرخی رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیا ہے۔ "روض الرياحين" امام یافعی رحمہ اللہ اور اس کے اردو ترجمہ "محاسن المحسنین" میں بھی ہے۔ اَللّٰهُمَّ غَفْرًا.

---

[1] الدر المنثور (٥٠٤/٧) [2] تفسير القرطبي (٢٥٤/١٦) [3] فتح البيان (٧٤/١٣، ٧٥)

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ شَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰهَ شَیْـًٔا ؕ وَ سَیُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴿۳۴﴾ فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْۤا اِلَى السَّلْمِ ۖۗ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖۗ وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ وَ لَنْ یَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۵﴾

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور (دوسروں کو) اللہ کی راہ سے روکا اور ان پر ہدایت واضح ہوجانے کے بعد رسول (ﷺ) کی مخالفت کی وہ اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے، اور عن قریب وہ ان کے اعمال برباد کر دے گا (32) اے ایمان والو! تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، اور اپنے عملوں کو باطل نہ کرو (33) بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کیا، اور (دوسروں کو) اللہ کی راہ سے روکا، پھر وہ اسی حالتِ کفر میں مر گئے تو اللہ انھیں ہرگز نہیں بخشے گا (34) چناں چہ تم کمزور نہ پڑو اور نہ تم صلح کی طرف بلاؤ، جبکہ تم ہی غالب ہو، اور اللہ تمھارے ساتھ ہے اور وہ تم سے تمھارے عملوں (کے ثواب) کو ہرگز کم نہیں کرے گا (35)

کفار کے اعمال کا ضائع ہونا:

جہاد کرنا اور کچھ محنت کرنا اسی وقت قبول ہے جبکہ حکم کے مطابق ہو۔ اپنی مرضی سے کوئی کام نہ کرے۔ یہ جو کہا کہ بودے بن کر صلح نہ کرو، اس کا مطلب ہے کہ محنت سے بھاگ کر صلح نہیں کرنی چاہیے اور اگر اس میں بہتری نظر آئے تو درست ہے۔ اس کا بیان آگے سورۃ الفتح میں آئے گا۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ اس بات کی خبر دیتا ہے کہ جس نے کفر کیا، اللہ کی راہ سے روکا، رسول کا مخالف ہوا، اس سے کنارہ کش ہوا اور ایمان سے پھر گیا، اس کے بعد کہ اس پر راہ کھل چکی، وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا اور وہ تو اپنی ہی جان کا نقصان کرے گا اور اسے قیامت کے دن ہار بیٹھے گا اور اللہ اس کا عمل ضائع کر دے گا، چنانچہ جس عمل کے بعد وہ ایمان سے پھر گیا ہے اس سے پہلے کا عمل جو ہو چکا ہے اس کو اس پر ثواب نہ دے گا مچھر کے برابر بھی، بلکہ اس عمل کو بالکل باطل کر دے گا اور اسے مٹا دے گا جس طرح کہ نیکیاں بدیوں کو لے جاتی ہیں، اسی

طرح اس کے مرتد ہونے کی یہ بدی اس کی ساری نیکیوں کو باطل کر دے گی۔

امام محمد بن نصر مروزی رحمہ اللہ نے ”کتاب الصلاۃ“ میں عن ربیع بن انس عن ابی العالیہ روایت کیا ہے، کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ ”لا إله إلا الله“ کے ساتھ کوئی گناہ ضرر نہیں کرتا، جیسا کہ شرک کے ساتھ کوئی عمل فائدہ نہیں دیتا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ﴾ تو اس بات سے ڈرے کہ گناہ عمل کو باطل کر دے گا۔

پھر عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، کہا کہ ہم خاص رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کا گروہ تھے جو اس بات کا اعتقاد رکھتے تھے کہ نہیں ہے کوئی شے حسنات میں سے مگر وہ مقبول ہے، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ﴾ تو ہم نے کہا: یہ کیا شے ہے جو ہمارے اعمال کو باطل کرتی ہے؟ تو ہم نے کہا کہ وہ کبیرہ گناہ اور فواحش ہیں، یہاں تک کہ یہ آیت اتری: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [النساء: ٤٨] ”یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ شریک ہوئے جانے کو نہیں بخشا اور اس کے سوا جسے چاہے بخش دیتا ہے۔“

پھر جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس بارے میں گفتگو کرنے سے ہم رک گئے، چنانچہ وہ اس شخص کے بارے میں ڈرتے تھے جو کبیرہ گناہوں اور فواحش کا مرتکب ہوتا تھا اور اس شخص کے لیے اُمید رکھتے تھے جو اُن سے بچتا تھا۔[1]

پھر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو اپنی اور اپنے رسول کی طاعت کا حکم دیا کیسی اطاعت؟ جو دنیا اور آخرت میں ان کی سعادت ہے اور ان کو ارتداد (ایمان سے پھر جانا) سے منع کیا جو اعمال کو باطل کر دیتا ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ﴾ یعنی ایمان سے پھر کر اپنے اعمال کو باطل مت کرو اور اسی لیے اس کے بعد یہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴾ جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قول ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾۔

پھر اللہ جل جلالہ نے اپنے مومن بندوں سے فرمایا: ﴿ فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ﴾ یعنی تم دشمنوں کے سامنے ضعیف نہ ہوئے جاؤ اور صلح پکارنے لگو، یعنی مہادنہ مسالمہ (اپنی سلامتی چاہنا) اور اپنے اور کفار کے درمیان لڑائی کو موقوف کرنا اس حال میں کہ تم کو قوت ہو اور تمھارے پاس لڑنے والوں کی اور سازوسامان کی کثرت ہو۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ﴾ یعنی تم کمزوری مت دکھاؤ کہ صلح پکارنے لگو اس حال میں کہ تم کو اپنے دشمنوں پر برتری اور غلبہ ہو۔

---

[1] تعظيم قدر الصلاة (٢/ ٦٤٥، ٦٤٦)

اب رہی یہ بات کہ جس وقت کفار میں قوت اور کثرت ہو سارے مسلمانوں کی نسبت اور امام مہادنہ و معاہدہ میں کوئی مصلحت دیکھے تو اس کو جائز ہے کہ وہ یہ کام کرے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت کیا، جب کفارِ قریش نے آپ ﷺ کو مکے سے روکا اور آپ ﷺ کو صلح کی طرف بلایا اور اس طرف کہ ان میں اور آپ ﷺ میں دس برس کے لیے لڑائی موقوف رہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان کی یہ بات مان لی۔ قولہ تعالیٰ: ﴿وَاللّٰهُ مَعَكُمْ﴾ اس میں اعداء پر مدد اور کامیابی کی ایک بشارتِ عظیم ہے۔ ﴿وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ﴾ یعنی ہرگز تمھارے اعمال کو ضائع اور باطل اور سلب نہ کرے گا، بلکہ تم کو ان کا بھرپور ثواب دے گا اور اُن میں سے کچھ کم نہ کرے گا۔[1] واللّٰہ سبحانہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ﴾ سے مراد منافقین ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اہلِ کتاب ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ مشرکوں میں سے روزِ بدر کے مطعمین ہیں (مراد وہ غنی مشرکین ہیں جو اپنی طرف کے لوگوں کو کھانا دیتے تھے کہ نبی اکرم ﷺ سے لڑو۔ بدر کی لڑائی قحط کے سال میں ہوئی تھی، اس کی تفصیل جمل نے مواہب و شرح مواہب سے خوب لکھی ہے) کسی نے کہا ہے کہ بنو قریظہ اور نضیر کے بارے میں نازل ہوئی۔ ﴿صَدُّوْا﴾ کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے لوگوں کو اسلام سے اور رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنے سے روکا۔ مشاقتِ رسول کا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے رسول سے دشمنی کی اور اس کے مخالف ہوئے۔

﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى﴾ کا یہ مطلب ہے کہ بعد اس کے کہ یہ بات جان چکے کہ آپ ﷺ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے پاس سے نبی ہیں۔ یہ بات اس سبب سے جانی کہ واضح حجتوں اور قطعی دلیلوں اور معجزوں کو دیکھ لیا، وہ اللہ کو اور اس کے رسول کو اس بات سے ہرگز ضرر نہ دیں گے کہ ایمان ترک کیا اور کفر پر جمے رہے اور اپنی ہی جانوں کا نقصان کیا اور اللہ اُن کے اعمال کو باطل کر دے گا۔ ان اعمال سے مراد وہ ہیں جو اعمالِ خیر کی طرح ہیں، جیسے: کھانا کھلانا، صلہ رحمی کرنا اور اس کے علاوہ اور خیر کے کام جو وہ کیا کرتے تھے، گو وہ اصل ہی سے باطل تھے، اس لیے کہ کفر مانع ہے۔ کسی نے کہا: اعمال سے مراد وہ مکر و فریب ہیں جن کو اللہ کے دین کو باطل کرنے کے لیے کیا تھا اور وہ دھوکے بازیاں ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کرنا چاہتے تھے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو اپنی اور اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ یعنی اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کہا مانو اللہ تعالیٰ کا اور کہا مانو رسول کا ان شرائع و احکام میں جن کا تم کو امر کیا گیا ہے جو کتاب اللہ میں اور سنتِ رسول اللہ ﷺ میں مذکور ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢٢٩/٤)

پھر ان کو اس بات سے منع کیا کہ اپنے اعمال کو باطل کریں جس طرح کہ کفار نے کفر پر اصرار کرکے اپنے اعمال باطل کر دیے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ﴾ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: یعنی مت باطل کرو اپنی نیکیاں معاصی سے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کبائر سے۔ زیادہ بہتر یہی ہے۔ امام کلبی اور ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ریاکاری اور دکھاوے سے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ احسان جتلانے سے۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نفاق اور شرک سے۔[1] فتح البیان میں فرمایا ہے کہ ظاہری ممانعت ہے ہر اس سبب کی جو اعمال کے بطلان کی طرف لے جائے، وہ کوئی سا سبب ہو، اس کے بغیر کہ کسی مقرر قسم کے ساتھ تخصیص کی جائے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول جو پہلے گزر چکا ہے، اس میں یہاں اتنا زیادہ ہے، چنانچہ ہم جب کسی ایسے شخص کو دیکھتے جو کبیرہ گناہوں اور فواحش میں سے کسی ایک کا ارتکاب کرتا تو ہم کہتے کہ وہ یقیناً ہلاک ہوا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾۔ پھر جب یہ نازل ہوئی تو ہم اس بارے میں گفتگو کرنے سے رک گئے اور ہم ایسے ہو گئے کہ جب ہم کسی کو دیکھتے کہ وہ ان گناہوں میں سے کسی کو پہنچا تو ہم اس پر خوف کرتے اور ان میں سے کسی شے کو نہ پہنچا تو اس کی امید کرتے۔[3] جو شخص ابطالِ نوافل کو جائز نہیں کہتا، اس نے اس آیت سے استدلال کیا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ نفلی نماز میں ہو یا نفلی روزے میں ہو تو اس کو اس عمل کا باطل کرنا اور اس سے نکلنا جائز نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک جائز ہے۔ اس آیت میں ان کے لیے دلیل یہ حجت نہیں ہے، اس لیے کہ سنت مبین ہوتی ہے، حالاں کہ صحیحین میں ثابت ہوا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صبح کو روزہ دار اٹھے، پھر جب گھر کی طرف لوٹے تو حیس پایا، چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا، اس کو قریب کر دے، البتہ میں نے صبح کی صائم ہو کر، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تناول فرمایا۔[4] اس حدیث شریف کے معنی ہیں، بلفظہ نہیں ہے۔ (مگر اس حدیث صحیحین میں قضا سے تعرض ہے اور قضا کے ساتھ افطارِ صوم وقطعِ صلاۃ بالاتفاق درست ہے۔ از مصحح سلمہ اللہ تعالیٰ)

اس آیتِ کریمہ میں کبیرہ گناہوں سے نیکیوں کے ضائع ہو جانے کی دلیل نہیں ہے، جیسا کہ امام زمخشری رحمہ اللہ نے معتزلہ اور خوارج کے زعم کی بنا پر خیال کیا ہے۔[5] ان کے جمہور اس پر ہیں کہ ایک کبیرہ گناہ ساری نیکیوں کو برباد کر دیتا ہے، یہاں تک کہ جس شخص نے اپنی تمام عمر اللہ کی عبادت کی، پھر اس نے ایک گھونٹ شراب کا پی لیا تو وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے کبھی اللہ کی عبادت ہی نہیں کی۔ واہ کیا تقوی ہے! تقویٰ کا ہیضہ اسی کو کہتے ہیں، باوجود اس تقویٰ اور طہارت کے حدیث شریف میں خارجیوں کو «كِلَابُ النَّارِ» (آگ کے کتے) فرمایا ہے۔[6] اَللّٰهُمَّ

---

(1) تفسير البغوي (۷/۲۹۰) تفسير القرطبي (۱۶/۲۵۴، ۲۵۵) (2) فتح البيان (۱۳/۷۷)

(3) الدر المنثور (۷/۵۰۵) (4) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۱۵٤) (5) الكشاف (٤/۳۳۱)

(6) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۷۳) صحيح الجامع، رقم الحديث (۳۳٤۷)

أَجِرْنَا مِنَ النَّارِ وَأَصْحَابِ النَّارِ وَأَحْيِنَا عَلَى السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ وَأَمِتْنَا عَلَيْهَا وَاحْشُرْنَا فِي زُمْرَتِهَا، آمین.

پھر اللہ پاک نے بیان کیا کہ جو لوگ کفر اور اللہ کی راہ سے روکنے پر اصرار کرنے والے ہیں ان کو نہ بخشے گا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ﴾ چنانچہ اللہ پاک نے بخشش نہ کرنے کو کفر پر مرنے کے ساتھ مشروط کیا ہے، اس لیے کہ اس شخص پر جو زندہ ہے توبہ کا دروازہ اور مغفرت کا راستہ بند نہیں کیا جاتا۔ آیت کا ظاہر عام ہے گو سبب خاص ہے کہ یہ اصحابِ قلیب کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جیسا کہ امام محلی رحمہ اللہ نے فرمایا۔[1] لیکن اس کا حکم ہر اس کافر کے لیے عام ہے جو اپنے کفر پر مر گیا۔

پھر اللہ پاک نے مومنوں کو وہن اور ضعف سے منع کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ ﴾ خطاب تو نبی اکرم ﷺ کے اصحاب کو ہے اور حکم سارے مسلمانوں کے لیے عام ہے، یعنی تم قتال سے کمزوری مت دکھاؤ اور اپنی طرف سے ابتداء کر کے کفار کو صلح کی طرف مت بلاؤ، کیونکہ یہ صرف ضعف کے وقت ہوتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اس بات سے منع کیا ہے کہ کفار کو صلح کی طرف بلائیں اور اُن کو حکم دیا ہے کہ ان سے لڑیں، یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: آیت کے معنی یہ ہیں کہ تم دو گروہ میں سے ایسے پہلے گروہ نہ ہوؤ، جس نے اپنے ساتھ والے کی طرف زاری کی۔[3]

اہلِ علم نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ آیا یہ آیت محکم ہے یا منسوخ ہے۔ چنانچہ کسی نے تو کہا ہے کہ محکم ہے اور اس آیت کو منسوخ کرنے والی ہے: ﴿ وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا ﴾ [الأنفال: ٦١] ''اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تو بھی صلح کی طرف جھک جا۔'' کسی نے کہا ہے کہ اس آیت سے منسوخ ہے۔ یہ مخفی نہ رہے کہ قول بالنسخ کا کوئی مقتضا نہیں ہے، اس لیے کہ اس آیت میں تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے نہی فرمائی ہے کہ خود ابتداءً صلح کی طرف بلائیں اور صلح کو قبول کرنے سے منع نہیں فرمایا، جبکہ مشرکین اس کی طرف مائل ہوں تو اب دونوں آیتیں محکم ہیں اور ایک موقع پر وارد نہیں ہوئیں کہ اس سے نسخ کے دعویٰ کی یا اس کو نسخ کے ساتھ مخصوص کرنے کی ضرورت پیش آئے، بلکہ دونوں دو مختلف حالات میں نازل ہوئی ہیں۔

جملۂ ﴿ وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ ﴾ حالیہ ہے، یا مستانفہ ہے جو نہیِ ماقبل کی تقریر کرتا ہے، یعنی سیف و حجت سے تم ہی قاہر اور غالب ہو۔[4] امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آخر الامر، یعنی انجام کار تمھارے ہی لیے ہے، گو بعض اوقات میں وہ تم پر غالب ہو جائیں۔ ﴿ وَاللَّهُ مَعَكُمْ ﴾ اور اللہ ان پر نصرت اور معونت کے ساتھ تمھارے ساتھ ہے۔ ﴿ وَلَنْ يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ ﴾ یعنی تمھارے اعمال کے ثواب میں سے کچھ کم نہ کرے گا۔ جب کوئی کسی کا حق کم کرتا ہے تو عرب کے محارے میں بولتے ہیں: ''وَتَرَهُ يَتِرُهُ وَتْرًا إِذَا نَقَصَهُ حَقَّهُ'' اس کی اصل ''وَتَرْتُ الرَّجُلَ'' سے ہے۔ یہ اس

[1] تفسیر الجلالین (٦٧٧/١) [2] معاني القرآن (١٦/٥) [3] تفسیر الطبري (١٨٨/٢٢) [4] تفسیر البغوي (٢٩٠/٧)

وقت کہے گا، جب تو ان کے کسی قریبی کو قتل کر ڈالے، یا اس کا مال لوٹ لے۔ جب کسی کے لیے کوئی مقتول مارا جائے اور اس کے خون کا عوض نہ لیا جائے تو اس وقت یوں کہیں گے کہ "فُلَانٌ مَأْتُورٌ"۔

امام جوہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہرگز تمھارے اعمال میں سے کم نہ کرے گا، جیسے تم کہتے ہو: "دَخَلْتُ الْبَيْتَ"، اور مراد اس سے "فِي الْبَيْتِ" ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "وتر" بہ معنی "ذحل" سے مشتق ہے (1) ("ذحل" بہ معنی کینہ و دشمنی) کسی نے کہا ہے کہ "وتر" بہ معنی "فرد" سے مشتق ہے (وِتر بالکسر بہ معنی تنہا و طاق اور بالفتح کینہ یہ اہلِ عالیہ کی لغت ہے و بالکسر "لأهل الحجاز في الثاني وبالفتح في الأول ولبني تيم بالكسر فيهما كذا في الصراح") تو یہ معنی ہوئے کہ "وَلَنْ يُّفْرِدَكُمْ بِغَيْرِ ثَوَابٍ" یعنی تم کو بغیر ثواب کے تنہا نہ کرے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ يَتِرَكُمْ ﴾ "يَظْلِمَكُمْ" (2) یعنی ہرگز تم پر تمھارے اعمال کا ظلم نہ کرے گا، مطلب یہ ہے کہ مثلاً کوئی عمل بغیر جزا کے چھوڑ دے، یا مقرر ثواب سے کم دے، ایسا نہ ہو گا، بلکہ پورا پورا ثواب ملے گا۔ (3) پھر اللہ پاک نے دنیا کی حقارت اور آخرت کی طلب کے لیے ترغیب بیان کی، چنانچہ فرمایا:

﴿ إِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَإِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ أُجُوْرَكُمْ وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ ﴿٣٦﴾ إِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ أَضْغَانَكُمْ ﴿٣٧﴾ هٰٓأَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا أَمْثَالَكُمْ ﴿٣٨﴾ ﴾

بس دنیاوی زندگی تو محض ایک کھیل اور تماشا ہے اور اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو (تو) اللہ تمھیں تمھارے اجر دے گا اور وہ تم سے تمھارے (تمام) مال نہیں مانگے گا (36) اگر اللہ تم سے اس مال کا سوال کرے، پھر وہ (اس پر) اصرار کرے تو تم بخل کرو گے اور وہ تمھارے کینے نکال باہر کرے گا (37) سنو! تم تو وہ لوگ ہو کہ تمھیں دعوت دی جاتی ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو، پھر تم میں سے بعض وہ ہیں جو بخل کرتے ہیں اور جو بخل کرتا ہے تو بس وہ اپنے آپ ہی

---

(1) فتح القدير (٥٥/٥) (2) تفسير الطبري (١٨٩/٢٢) (3) فتح البيان (٧٦/١٣-٧٩)

سے بخل کرتا ہے اور اللہ بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو، اور اگر تم پھرو گے تو اللہ تمھارے سوا دوسرے لوگ بدل لائے گا، پھر وہ تم جیسے (نافرمان) نہ ہوں گے ﴿38﴾

حقارتِ دنیا کا بیان:

حق تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے ملک فتح کر دیے اور تھوڑے ہی دنوں خرچ کرنا پڑا اور جتنا خرچ کیا تھا، اس سے سو سو گناہ مال ہاتھ لگا، اسی لیے فرمایا ہے کہ اللہ کو قرض دو۔ مال خرچ کرنے کی تاکید کی جاتی ہے، اس سے یہ نہ سمجھو کہ اللہ یا اس کا رسول مانگتا ہے، یہ تو تمھارے بھلے کے لیے فرماتا ہے، پھر ایک ایک کے بدلے ہزار ہزار پاؤ گے اور اللہ کو اور اس کے رسول کو کیا پروا ہے۔ انتہی۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دنیا کا حقیر ہونا اور اس کی حالت کی ذلت کا بیان فرماتا ہے کہ ﴿ اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ﴾ یعنی دنیا کے جینے کا حاصل تو یہی کھیل تماشا ہے مگر وہ جو اس میں سے خاص اللہ عزوجل کے لیے ہے، اس لیے یوں فرمایا: ﴿ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ﴾ یعنی اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو گے تو تم کو تمھارے اجر دے گا اور تم سے تمھارے مال نہ مانگے گا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تم سے بے نیاز ہے تم سے کوئی شے طلب نہیں کرتا اور یہ جو اموال پر صدقات تم پر فرض کیے ہیں تو یہ صرف تمھارے محتاج بھائیوں کی خبر گیری کے لیے ہے، تاکہ اس کا فائدہ بھی تمھیں پہنچے اور اس کا ثواب تمھاری ہی طرف پھر کر آئے۔

پھر فرمایا: ﴿ اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ﴾ یعنی اگر وہ تم سے مال مانگے، پھر تم کو حرج میں ڈالے، یعنی تنگ کرے تو تم بخیل ہو جاؤ اور تمھارے دل کی خفگیاں نکال دے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جان چکا ہے کہ اموال کے نکالنے میں دل کی خفگیوں کا نکالنا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے سچ کہا، اس لیے کہ مال آدمی کو محبوب ہے، وہ اس کو خرچ نہیں کرتا، مگر اسی شے میں جو اس سے بڑھ کر اس کو محبوب ہوتی ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ ﴾ یعنی تم سنتے ہو لوگ تم کو بلاتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو، پھر تم میں سے کوئی بخل کرتا ہے، یعنی اس بلانے کا جواب نہیں دیتا، اس کو قبول نہیں کرتا اور جو کوئی بخل کرے گا وہ اپنی ہی جان سے بخل کرے گا، یعنی وہ اپنا ہی نقصان کرے گا اجر سے اور اس کا وبال اسی پر رجوع کرے گا اور اللہ اپنے ماسوا ہر ایک سے بے نیاز ہے اور ہر شے ہمیشہ اس کی محتاج ہے، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ﴾ اور تم بالذات اسی کے محتاج ہو، چنانچہ اس کا غنا کے ساتھ وصف تو یہ اس کا وصفِ لازم ہے اور مخلوق کا وصف فقر کے ساتھ کیا یہ ان کا لازم وصف ہے، وہ کبھی اس سے جدا نہیں ہوتے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢٣٠/٤)

قولہ سبحانہ وتعالیٰ: ﴿ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴾ یعنی اگر تم اس کی اطاعت سے اور اس کی شرع کی پیروی کرنے سے پھرو گے تو وہ تمھاری جگہ کسی اور قوم کو بدل دے گا، پھر وہ تمھاری طرح کے نہ ہوں گے، یعنی لیکن وہ اس کے ہوں گے اور اس کے حکموں کو سننے اور ماننے والے ہوں گے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴾ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! یہ کون لوگ ہیں کہ اگر ہم پھر جائیں تو ہمارے عوض میں اُن کو بدل لے، پھر وہ ہماری طرح کے نہ ہوں؟ کہا: آپ نے اپنا دستِ مبارک سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے شانے پر مارا، پھر فرمایا: یہ اور اس کی قوم اور اگر دین ثریا کے نزدیک ہوتا تو البتہ لے لیتے اس کو فارس کے لوگ۔[1] (اس حدیث کی سند یہ ہے: حدثنا يونس بن عبد الأعلىٰ حدثنا ابن وهب أخبرني مسلم بن خالد عن العلاء بن عبدالرحمن عن أبيه عن أبي هريرة رضي الله عنه قال:... الخ) (تفرد به مسلم بن خالد الزنجي ورواه عنه غير واحد وقد تكلم فيه بعض الأئمة والله أعلم) آخر تفسير سورة القتال ولله الحمد والمنة.[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ دنیا کا جینا تو محض ایک باطل اور دھوکا ہے، اس میں سے کسی شے کی نہ کچھ اصل ہے نہ اس کو کسی طرح کا ثبات اور نہ اس کا کچھ شمار و قطار، نہایت جلد منقطع ہو جاتی ہے، پھر کچھ اس کا اتا پتا نہیں ملتا، یعنی دنیا تم کو طلبِ آخرت سے کس طرح باز رکھتی ہے، حالاں کہ تم جان چکے ہو کہ وہ سب کی سب لہو ولعب ہے، سوائے اس کے جو اس میں سے اللہ عزوجل کی عبادت اور اطاعت ہے۔ لعب وہ شے ہے جو انسان کو مشغول رکھتی ہے اور اس میں کوئی فائدہ نہیں، نہ حال میں نہ انجام کار میں۔ پھر جب آدمی اس کا استعمال کرے اور وہ اس کو اپنے علاوہ کسی اور سے مشغول نہ کرے اور نہ اس کو اس کے مہم اشغال بھلائے تو وہ لعب ہے اور اگر اس کو اپنے نفس کی مہمات سے باز رکھے تو وہ لہو ہے۔ اس کے بارے میں اس کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں، پہلے ان کا ذکر ہو چکا ہے۔

پھر دنیائے فانی کی جو چیز آخرت میں فائدہ دینے والی ہے اس کا ذکر فرمایا: ﴿ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ﴾ یعنی اگر تم اللہ پر ایمان لاؤ گے اور کفر و معاصی سے بچو گے تو تم کو اس کی آخرت میں جزا دے گا۔ طاعت پر جو ثواب ملتا ہے اس کو اجر کہتے ہیں اور وہ تم سے تمھارے مال نہیں مانگتا، یعنی تم کو یہ حکم نہیں دیتا کہ اپنے سارے مال زکاۃ میں اور طاعت کی اور چیزوں میں خرچ کر دو، بلکہ تم کو یہ امر فرمایا ہے کہ ان میں سے تھوڑا سا نکالو، "غَيْضًا مِنْ فَيْضٍ" یعنی بہت سے مال میں سے ذرا سا۔ مراد دسویں حصے کا چوتھائی حصہ ہے، زکات یہی ہے۔

---

1. تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٩٩/١٠) تفسير الطبري (٢٣٠/٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٦٠) السلسلة الصحيحة (١٠١٧)
2. تفسير ابن كثير (٢٣٠/٤)

امام ابن عیینہ رحمہ اللہ وغیرہ کا قول یہی ہے۔[1] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ وہ تم سے تمھارے مال نہیں مانگتا، وہ تو تم سے اپنے مال مانگتا ہے، کیوں کہ ان کا بڑا مالک تو وہی ہے اور وہی ان کو عطا کر کے تم پر انعام کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تم سے محمد ﷺ رسالت پہنچانے کے لیے اجر کے طور پر تمھارے مال نہیں مانگتے، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ﴾ [الفرقان: ٥٧] ''میں قرآن کے پہنچانے پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا۔'' قولِ اول بہتر ہے۔ غرضیکہ پھر سارے مال کے نہ مانگنے کی وجہ بیان فرمائی: ﴿ اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ﴾ یعنی اگر وہ تم سے تمھارے سارے مال مانگے، پھر اس کے مانگنے میں تم سے مبالغہ کرے۔

مفسرین کہتے ہیں کہ تم کو مشقت میں ڈالے اور سارے مال کا سوال کر کے تم پر الحاف و اصرار کرے (زبردستی کرے) تو تم ان کا بخل کرو اور حکم ماننے سے باز رہو اور دینِ اسلام کے لیے تمھارے کینے ظاہر کر دے، اس انداز سے کہ مال کی محبت جبلی و طبعی (فطری) ہوتی ہے اور جس سے اس کی محبوب شے میں جھگڑا کیا جائے تو وہ اپنے جی کی بات جس کو چھپاتا ہے کھول دیتا ہے۔ اسی لیے امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ جان چکا ہے کہ مال کے سوال میں کینوں کا نکلنا ہے، یعنی ظاہر ہونا۔[2] یہ قول پہلے بھی گزر چکا ہے۔ ''إحفاء'' کے معنی ہیں مبالغہ کرنا۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''أَحْفَا بِالْمَسْأَلَةِ وَأَلْحَفَ وَأَلَحَّ'' تینوں کے ایک معنی ہیں، یعنی مانگنے میں مبالغہ کیا، خوب چمٹ کر سوال کیا۔ محفی کہتے ہیں: ''مستقصي في السؤال'' کو، یعنی سوال میں خوب مبالغہ کرنے والا ''الإحفاء'' استقصاء فی الکلام ہے، یعنی بات کرنے میں خوب مبالغہ کرنا۔ اسی معنی میں ''إحفاء الشوارب'' ہے: ''أَيْ: اِسْتِئْصَالُهَا'' یعنی مونچھوں کا خوب رگڑ کر کترنا۔

﴿ اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا ﴾ شرط ہے ﴿ فَيُحْفِكُمْ ﴾ اس پر معطوف ہے ﴿ تَبْخَلُوْا ﴾ جوابِ شرط ہے ﴿ وَيُخْرِجْ ﴾ معطوف ہے جوابِ شرط پر، اسی لیے جمہور نے اس کو بہ جزم پڑھا ہے اور ابو عمرو رحمہ اللہ سے اس کا رفع مروی ہے بنا بر استیناف اور بہ فتحِ یاء وضمِ راء و رفع ﴿ اَضْغَانَكُمْ ﴾ بھی ان سے مروی ہے اور یعقوب حضرمی رحمہ اللہ سے ''نُخْرِجُ'' بہ نون روایت کیا گیا ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ، یعنی امام مجاہد، ابن محیصن اور حُمید نے ''تخرج'' بہ تائے فوقیہ مع ضمِ راء پڑھا ہے۔[3] جمہور کی قراءت پر فاعل ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے، یا فاعل بخل ہے جو ﴿ تَبْخَلُوْا ﴾ سے معلوم ہوتا ہے۔ ''أضغان'' ''ضغن'' کی جمع بہ معنی کینہ ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

﴿ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ ﴾ یعنی اے مخاطب لوگو! سنتے ہو تم یہ لوگ ہو جن کا وصف پہلے بیان کیا گیا، جملہ تمام ہو گیا۔

﴿ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ جملہ مستانفہ ہے جو ماقبل کی تقریر و تاکید کرتا ہے، اس لیے کہ دونوں کے معنی کا

---

[1] تفسير القرطبي (١٦/٢٥٧) [2] تفسير القرطبي (١٦/٢٥٧) [3] تفسير القرطبي (١٦/٢٥٧)

محصل ایک ہے، یعنی تم بلائے جاتے ہو، تاکہ جہاد میں اور خیر کی راہوں میں خرچ کرو۔ ﴿ فَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يَّبۡخَلُ ۚ ﴾ چنانچہ تم میں سے وہ ہے جو اس شے کا بخل کرتا ہے جو اس سے طلب کی جاتی ہے اور جس کی طرف وہ بلایا جاتا ہے، یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور جبکہ تم میں سے وہ ہے جو ذرا سے مال کا بخل کرتا ہے تو بہت سے مال کا بخل کیسے نہیں کرے گا، یعنی سارا مال دینے کے لیے۔ اس جملے کا مقابل یہ ہے کہ "وَمِنْكُمْ مَنْ يَّجُوْدُ"، یعنی اور تم میں سے وہ ہے جو جود (سخاوت) کرتا ہے، اس کو اس لیے حذف کیا کہ مراد بخل پر استدلال کرنا ہے۔ پھر اللہ پاک نے بیان کیا کہ بخل کا نقصان خود بخیل کی جان پر پھر کر آتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمَنۡ يَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا يَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِهٖ ؕ ﴾ یعنی اور جو بخل کرتا ہے تو اپنے ہی نفس سے اپنے بخل کے سبب سے اجر وثواب کو روکتا ہے۔

بخل اور ضَنّ دونوں کبھی تو بہ کلمۂ "علیٰ"، متعدی ہوتے ہیں اور کبھی بہ کلمۂ "عن" اس لیے کہ ان میں امساک و تعدی کے معنی شامل کیے جاتے ہیں۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ دونوں میں کلمۂ "عن" سے متعدی کر کے امساک کے معنی شامل کیے جائیں۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں: "يَبْخَلُ عَنْ دَاعِيْ نَفْسِهٖ لَا عَنْ دَاعِيْ رَبِّهٖ"، یعنی اپنے نفس کے باعث کی وجہ سے بخل کرتا ہے نہ اپنے رب کے داعی کی جہت سے۔ ﴿ وَاللّٰهُ الۡغَنِىُّ وَاَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ ۚ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ غنیِ مطلق ہے، منزہ، متقدس اور پاک ہے اس سے کہ تمھارے مالوں کی طرف محتاج ہو اور تم محتاج ہو اللہ پاک کی طرف اور اس خیر اور رحمت کی طرف جو اس کے پاس ہے۔

جملہ ﴿ وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا ﴾ معطوف ہے شرطیہ متقدمہ پر، یعنی ﴿ وَاِنۡ تُؤۡمِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا يُؤۡتِكُمۡ اُجُوۡرَكُمۡ وَلَا يَسۡـَٔلۡكُمۡ اَمۡوَالَكُمۡ ﴾ یعنی اگر تم ایمان اور تقویٰ سے اعراض کرو گے تو وہ اَور لوگوں کو تمھاری جگہ لے آئے گا، وہ تم سے بڑھ کر اللہ کے مطیع اور فرمانبردار ہوں گے۔ ﴿ ثُمَّ لَا يَكُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَكُمۡ ﴾ یعنی پھر وہ ایمان اور تقویٰ سے اعراض کرنے میں تمھاری طرح کے نہ ہوں گے، بلکہ اللہ عزوجل کے مطیع ہوں گے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے ساتھ بخل کرنے میں تمھاری طرح نہ ہوں گے۔[1]

کلمۂ ﴿ ثُمَّ ﴾ سے یہ بات بتانا منظور ہے کہ اس کا مدخول اس قبیل سے ہے جس کو مخاطب لوگ بعید سمجھتے ہیں، اس لیے کہ لوگ احوال میں ایک دوسرے کے قریب ہونے اور مال کی طرف مائل ہونے میں مشترک ہوتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یہ کون لوگ ہیں؟ اور سلمان رضی اللہ عنہ اس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کی طرف تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ فرس ہیں یہ اور اس کی قوم۔ (وفي إسناده مسلم الزنجي قد تفرد به وفيه مقال معروف) اس حدیث شریف کے کئی طریق صحیح میں ہیں۔

---

[1] تفسير القرطبي (٢٥٧/١٦)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث پہلے گزر چکی ہے، اس میں یہاں یہ الفاظ ہیں: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ كَانَ الْإِيْمَانُ مَنُوطًا بِالثُّرَيَّا لَتَنَاوَلَهُ رِجَالٌ مِنْ فَارِسٍ»[1] (أخرجه الترمذي و ابن مردويه من حديث جابر والطبراني في الأوسط والبيهقي في الدلائل و عبد بن حميد و عبد الرزاق وفي إسناده أيضا مسلم بن خالد الزنجي نحوه) امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ فارس اور روم ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: وہ عجم ہیں۔ امام شریح بن عبید رحمہ اللہ نے کہا: اہل یمن ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ انصار ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ملائکہ ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ تابعین ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "هُمْ مَنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالَى مِنْ سَائِرِ النَّاسِ" یعنی وہ ہیں جو تمام لوگوں میں سے اللہ چاہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کندہ اور نخع ہیں یمن کے عرب میں سے۔ محاسبی فرماتے ہیں کہ تمام عجمی لوگوں میں سے سوائے فارس کے لوگوں کے کوئی دین میں بہت خوب اور علماء نہیں ہوئے، جن کا شمار کیا جائے۔ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ مجھ کو دنیا سے بھی زیادہ محبوب ہے۔ واللہ أعلم۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو مخرج کے ذکر کے بغیر بیان کیا ہے،[2] اسی لیے فتح البیان میں فرمایا ہے۔ وَلْيُنْظَرْ فِي سَنَدِهِ وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى أَعْلَمُ بِمُرَادِهِ.[3]

الحمد للہ والمنة کہ اس سورت مبارکہ کی تفسیر سیوم ربیع الثانی ۱۳۱۴ ہجری روز جمعہ شبِ شنبہ (ہفتہ) قریب دو ساعت مکمل ہوئی۔ اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور آیندہ لکھنے کی توفیق دے۔ اللهم إني ضعيف فقوني في رضاك، اللهم نستعين بك على طاعتك لا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم، والحمد لله الذي بنعمته تتم الصالحات، والصلاة والسلام على سيدنا ومولانا محمد وعلى آله وصحبه وذريته وأهل بيته وأشياعه وأتباعه إلى يوم الدين، والحمد لله أولا وآخرا وظاهراً و باطناً.

---

① اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ ② تفسير القرطبي (١٦/٢٥٨) ③ فتح البيان (١٣/٧٩_٨٢)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُوْرَۃُ الْفَتْحِ

اس سورت مبارکہ کی انتیس (۲۹) آیتیں ہیں اور یہ مدنی ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بالاجماع مدنی ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورۃ الفتح مدینے میں نازل ہوئی۔ (أخرجه ابن الضريس والنحاس وابن مردويه والبيهقي) امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما سے بھی اس کے مثل روایت کیا ہے۔[2] مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ اور مروان کہتے ہیں کہ سورۃ الفتح مکہ اور مدینہ کے درمیان اول سے آخر تک حدیبیہ کی شان میں نازل ہوئی۔[3] (أخرجه ابن إسحاق والحاكم وصححه والبيهقي في الدلائل) اس کے مدنی ہونے پر جو اجماع ہے، یہ قول اس کے خلاف نہیں ہے، اس لیے کہ مدنی سورتوں سے مراد وہ سورتیں ہیں جو مکے سے ہجرت کرنے کے بعد نازل ہوئی ہیں۔

سورۃ الفتح کی فضیلت:

سیدنا عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فتح کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفر میں سواری پر سورۃ الفتح پڑھی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں ترجیع فرمائی (ترجیع تردیدِ آواز کو کہتے ہیں، ترجیع کی حکایت آواز کے بڑھانے سے کی گئی ہے، جیسے آ ا اُا سے پہلے ہمزہ ہے پھر الف۔ واللّٰہ أعلم۔ یہ آواز اس لیے پیدا ہوئی کہ آپ سوار تھے اور اونٹنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حرکت دیتی تھی تو ترجیع پیدا ہو گئی۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ترجیع نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوار نہ تھے کے بارے میں اور قول بھی ہیں)[4] (أخرجه البخاري ومسلم وغيرهما)

صحیحین میں عن زید بن اسلم عن ابیہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کسی سفر میں چل رہے تھے اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی رات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جا رہے تھے۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی شے کا سوال کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہ دیا، پھر ان سے سوال کیا تو بھی ان کو جواب نہ دیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، پھر بھی ان کو جواب نہ دیا، چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہلاک ہو عمر کی ماں! تو نے تین بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اور وہ تجھے جواب نہیں دیتے۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: پھر میں نے اپنے اونٹ کو حرکت دی اور میں لوگوں سے آگے بڑھ گیا اور میں اس بات سے ڈرا کہ میرے حق میں کچھ قرآن نازل ہو، پھر تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ میں نے ایک

---

[1] تفسير القرطبي (۲۵۹/۱٦) [2] الدر المنثور (۵۰۷/۷) [3] مستدرك الحاكم (٤٩٨/٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٩٤)

پکارنے والے کو سنا کہ مجھے اونچی آواز سے پکارتا ہے تو میں نے اپنے جی میں کہا: البتہ میں واقعی ڈرا تھا کہ میرے حق میں کچھ قرآن نازل ہو۔ پھر میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ کو سلام کیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: البتہ اتاری گئی مجھ پر ایک سورت جو مجھے ہر اس شے سے زیادہ محبوب ہے جس پر سورج طلوع ہوا، یعنی ساری دنیا سے زیادہ محبوب ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴾۔[1]

صحیح مسلم میں امام قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے ان کو حدیث بیان کی (صحابہ کو یا تابعین کو) کہا کہ حدیبیہ سے واپس پلٹنے کے دوران میں یہ آیات نازل ہوئی: ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ۭ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴾ [الفتح: ۱۔ ۵] اور اس وقت ان (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کو رنج اور غم سے شکستگی اور بدحالی پہنچ چکی تھی اور وہ حدیبیہ میں اپنی قربانی کر چکے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ البتہ مقرر مجھ پر ایک آیت اتاری گئی جو مجھے ساری دنیا سے زیادہ پیاری ہے۔[2]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝۱ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ
ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا
مُّسْتَقِيْمًا ۝۲ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝۳

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

(اے نبی!) بلاشبہ ہم نے آپ کو فتح مبین دی ① تاکہ اللہ آپ کے لیے آپ کی اگلی پچھلی ہر غلطی معاف کر دے اور آپ پر اپنی نعمت پوری کرے، اور آپ کو صراطِ مستقیم کی ہدایت دے ② اور (تاکہ) اللہ آپ کی بڑی زبردست مدد کرے ③

شانِ نزول:

ہجرت کے چھٹے برس بعد نبی اکرم ﷺ نے خواب دیکھا کہ مکے میں عمرہ کرنے کے لیے گئے ہیں اور فارغ ہونے کے بعد حلق کرتے ہیں (سر کے بال مونڈتے ہیں) آپ نے عمرے کا ارادہ کیا، اگرچہ قریش کے ساتھ دشمنی تھی،

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۹۴۳) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷۸٦)

لیکن دستور تھا کہ دشمن کو بھی عمرے اور حج سے منع نہیں کرتے تھے اور حرم میں دشمنی نہیں لیتے تھے۔ آپ ﷺ پندرہ سو آدمیوں کے ساتھ چلے۔ قریش نے لوگوں کو جمع کیا اور شہر سے باہر لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ جب نبی اکرم ﷺ ایسی جگہ پر پہنچ گئے جہاں سے مکہ نظر آیا تو سواری کی اونٹنی بیٹھ گئی، وہ اٹھنے کو تیار ہی نہ ہوئی، اس وقت نبی کریم ﷺ نے قسم کھائی کہ میں کعبے کا ادب رکھوں گا، اگر چہ یہ لوگ بڑھ چڑھ کر بولیں، تب وہ اونٹنی اٹھی، نبی کریم ﷺ مقابلہ چھوڑ کر حدیبیہ میں اترے اور پیغام دیا کہ اگر چاہو تو مجھ سے صلح کر لو اور ایک مدت تک رک جاؤ۔ اتنی دیر میں اور لوگوں کو مسلمان کر لیں، پھر اگر تم چاہو تو مسلمان ہو جانا اور چاہو تو لڑائی کرنا، آخر صلح ہوئی، لیکن اس سال عمرہ نہ کرنے دیا، اگلے سال عمرہ پورا کیا، اس صلح کے بعد یہ سورت اتری۔ اس صلح سے تمھارے درجے بڑھے۔ یہ بات اللہ نے کسی بندے کو نہیں فرمائی کہ اگلے پچھلے گناہ بخش دیے، اگر چہ بخشے گئے اور بہت سے بندے ہیں، اس میں بے خوف کر دینا ہے۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام احمد رحمہ اللہ نے معاویہ بن قرہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کو سنا، کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح کے سال اپنے سفر کے دوران میں اپنی سواری پر سورۃ الفتح پڑھی، پھر اس میں ترجیع کی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر یہ بات نہ ہوتی کہ میں ناپسند کرتا ہوں کہ لوگ ہم پر جمع ہو جائیں تو البتہ میں آپ ﷺ کی قراءت کو بیان کرتا۔[1] (أخرجاه من حديث شعبة به)

یہ سورتِ کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ ﷺ ماہ ذی قعدہ ۶ ہجری میں حدیبیہ سے لوٹے، جب مشرکوں نے آپ ﷺ کو مسجدِ حرام کی طرف جانے سے روکا، تاکہ وہاں اپنا عمرہ ادا کریں اور مشرک آپ ﷺ کے اور اس کام کے درمیان حائل ہوئے، پھر مصالحت و مہادنت کی طرف مائل ہوئے اور یہ بات کہی کہ اس سال واپس چلے جائیں اور اگلے سال آئیں، چنانچہ آپ ﷺ نے اُن کی یہ بات مان لی، باوجود اس کے کہ صحابہ کی ایک جماعت نے جس میں عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے، اس بات کو ناپسند کیا، چنانچہ اس کی تفصیل اس سورت کی تفسیر میں آئندہ آئے گی۔ إن شاء الله تعالیٰ.

پھر جب آپ ﷺ نے اپنی قربانیاں اس جگہ نحر کر ڈالیں، جہاں روکے گئے تھے اور واپس چلے گئے تو اللہ عزوجل نے یہ سورت نازل فرمائی، اس بارے میں جو آپ ﷺ کے اور اُن کے درمیان ماجرا گزرا اور اس صلح کو اس مصلحت کی وجہ سے، جو اس میں تھی، فتح ٹھہرایا اور جو کچھ بالآخر انجام ہوا، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے مروی ہے کہ تم مکے کی فتح کو فتح شمار کرتے ہو اور ہم حدیبیہ کی صلح کو فتح شمار کرتے ہیں۔[2] امام اعمش رحمہ اللہ نے عن ابی سفیان عن جابر رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، کہا ہے کہ ہم شمار نہ کرتے تھے فتح مگر حدیبیہ کے دن کو۔[3]

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ تم تو فتح مکہ کو فتح شمار کرتے ہو اور یقیناً مکے کی

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۴۰۳۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۹۴) مسند أحمد (۵/۵۴)

[2] تفسیر ابن کثیر (۴/۲۳۱) [3] تفسیر الطبري (۲۲/۲۰۱، ۲۰۲)

فتح ایک فتح تھی اور ہم حدیبیہ کے دن بیعت الرضوان کو فتح شمار کرتے تھے۔ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ چودہ سو آدمی تھے اور حدیبیہ ایک کنواں تھا۔ ہم نے اس کو کھینچ ڈالا اور اس میں پانی کا ایک قطرہ نہ چھوڑا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر پہنچی تو آپ ﷺ اس پر تشریف لائے اور اس کے کنارے پر بیٹھے، پھر پانی کا ایک برتن منگوایا اور آپ ﷺ نے وضو کیا اور کلی کی اور دعا فرمائی اور اس پانی کو کنوئیں میں ڈالا، پھر ہم نے اس کو تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ رکھا، پھر اس کنویں نے ہم کو اور ہماری سواریوں کو لوٹا دیا جو ہم نے چاہا۔[1] یعنی نبی ﷺ کی کلی کی برکت سے اس میں اتنا پانی بڑھ گیا کہ ہم اور ہماری سواریاں خوب سیراب ہو کر وہاں سے اپنی منازل پر لوٹ آئے۔ محاورۂ عرب میں جو کوئی پانی پر آتا ہے، اس کو وارد کہتے ہیں اور جو کوئی پانی پی کر یا بھر کر لوٹتا ہے، اس کو صادر بولتے ہیں۔ "أَصْدَرَتْنَا الْبِئْرُ" کے یہ معنی ہیں کہ کنوئیں نے ہم کو سیراب کر کے لوٹا دیا۔

امام احمد رحمہ اللہ نے عن زید بن اسلم عن ابیہ عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، کہا: ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے، چنانچہ میں نے آپ ﷺ سے تین بار کسی شے کا سوال کیا تو آپ ﷺ نے مجھے جواب نہ دیا، پھر میں نے اپنے جی سے کہا: اے خطاب کے بیٹے عمر! تجھے تیری ماں روئے تو نے تین بار رسول اللہ ﷺ سے الحاح وزاری کی، یعنی سوال کیا اور انھوں نے تجھے جواب نہ دیا! کہا: پھر میں نے اپنے اونٹ کو حرکت دی اور میں اس خوف سے آگے بڑھ گیا کہ کہیں میرے بارے میں کوئی آیت نازل ہو۔ کہا کہ اچانک میں نے سنا کہ ایک بلانے والا یا عمر! کہہ کر پکار رہا ہے، کہا: پھر میں لوٹا اور یہ خیال کرتا تھا کہ یقیناً میرے بارے میں کچھ نازل ہوا، پھر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: آج کی رات (حدیث شریف کا لفظ مبارکہ « بارحة » ہے۔ "بارحة" "برح" سے ماخوذ ہے بہ معنی "زال" سے۔ "بارحة" وہ قریبی رات ہے جو گزر گئی۔ فارسی میں اس کا ترجمہ شبِ گذشتہ اور بارحۂ اولیٰ کا ترجمہ دی شب صراح میں اسی طرح لکھا ہے۔ میرے نزدیک "بارحة" کا ترجمہ اِمشب اور بارحۂ اولیٰ کا ترجمہ دی شب چاہیے، کیوں کہ قریبی رات جو گزر گئی وہی ہے جس کی صبح کو تم یوں کہو کہ میں نے آج کی رات یہ کام کیا۔ دیکھو حدیث شریف میں کہ جس رات سورت اتری، عین اسی رات میں آپ ﷺ نے بارحہ فرمایا، اسی رات کے اجزاء کے اعتبار سے جو گزر گئی۔ دیکھو خالقِ باری میں کہا ہے: امشب آج رات جو بہئ دی شب کل رات جو گئی۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ بارحہ کا ترجمہ اِمشب چاہیے۔ واللہ أعلم۔ اس کی بحث "لف القماط" تالیف سیدنا ابو الوفاء الصدیق رحمہ اللہ میں خوب تفصیل سے لکھی ہے) مجھ پر ایک ایسی سورت نازل ہوئی جو مجھ کو دنیا وما فیہا سے زیادہ محبوب ہے: ﴿ إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ ﴾[2] (رواه البخاري والترمذي والنسائي من طرق عن

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩١٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٤٣) سنن الترمذي (٣٢٦٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٦١/٦) مسند أحمد (٣١/١)

مالك ﷺ وقال علي بن المديني ﷺ: هذا (قال الإمام أحمد: حدثنا أبو نوح حدثنا مالك بن أنس ﷺ عن زيد بن أسلم عن أبيه عن عمر بن الخطاب ﷺ إسناد مدني جيد لم نجده إلا عندهم)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حدیبیہ سے لوٹتے وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ﴿ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ﴾ نازل ہوئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: البتہ مجھ پر ایک ایسی آیت اتاری گئی جو مجھے ان تمام چیزوں سے زیادہ پیاری ہے جو روئے زمین پر ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ آیت ان پر پڑھی تو وہ بولے: ”هَنِيئًا مَرِيئًا يَا نَبِيَّ اللّٰهِ“ یعنی وہ آپ کو مبارک ہو، اللہ عزوجل جو آپ کے ساتھ کرے گا، وہ اس نے بیان کر دیا، پھر وہ کیا ہے جو ہمارے ساتھ کرے گا، اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴾[1] [الفتح: ٥] (أخرجه في الصحيحين من رواية قتادة به)

امام احمد رحمہ اللہ نے مجمع بن جاریہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، یہ ان قاریوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے قرآن شریف پڑھا، کہا: ہم حدیبیہ میں حاضر ہوئے، پھر جب ہم وہاں سے لوٹے تو دیکھا کہ لوگ اونٹوں کو اٹھا رہے ہیں، چنانچہ بعض لوگوں نے بعض سے کہا کہ لوگوں کو کیا ہوا ہے؟ وہ بولے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی گئی ہے، پھر ہم لوگوں کے ساتھ نکلے اس حال میں کہ ہم بے چین تھے۔ چنانچہ دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کراع غمیم کے پاس اپنی سواری پر ہیں (غمیم بہ فتحِ غین وکسرِ میم اور بہ ضمِ غین وفتحِ میم بھی ہے، یہ مکے سے دو منزل پر ایک وادی ہے) تو لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جمگھٹا کر لیا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر پڑھا: ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴾۔ کہا: پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک شخص نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا وہ فتح ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! بے شک البتہ وہ فتح ہے۔ بانٹی گئی خیبر حدیبیہ والوں پر، داخل نہ ہوا ان کے ساتھ اس میں کوئی مگر وہ جو حدیبیہ میں حاضر ہوا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کو اٹھارہ حصوں میں بانٹا اور کل لشکر ایک ہزار پانچ سو تھا، ان میں سے تین سو سوار تھے۔ چنانچہ سواروں کو تو دو حصے دیے اور پیدل کو ایک حصہ۔[2] (ورواه أبوداود في الجهاد عن محمد بن عيسىٰ عن مجمع بن يعقوب به)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عبدالرحمان بن ابی علقمہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو سنا، وہ

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٣٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٨٦) مسند أحمد (١٩٧/٣)

(2) مسند أحمد (٤٢٠/٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٣٦) اس کی سند میں ”یعقوب بن مجمع“ مجہول راوی ہے۔ دیکھیں: (ضعيف أبي داود: ٣٥٧/٢)

کہتے تھے کہ جب ہم حدیبیہ سے متوجہ ہوئے تو آخر رات کو اترے، پھر ہم سو گئے، پھر ہم اس وقت جاگے جب سورج طلوع ہو گیا تھا، پھر ہم بیدار ہوئے اور رسول اللہ ﷺ سو رہے تھے۔ کہا: پھر ہم نے کہا کہ آپ ﷺ کو جگاؤ تو آپ ﷺ جاگ اٹھے۔ چنانچہ فرمایا کہ تم وہ کرو جو کرتے تھے اور اس شخص کی طرح کرو جو سو رہا یا بھول گیا، مطلب یہ کہ قضا نماز پڑھ لو۔ کہا اور ہم نے رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کو گم پایا، پھر ہم نے اس کو ڈھونڈا تو اس کو کسی درخت کے پاس پایا جس میں اس کی نکیل اٹک گئی تھی، پھر میں اس کو لے کر آیا تو آپ ﷺ اس پر سوار ہوئے۔ پھر اس اثنا میں کہ ہم جا رہے تھے کہ آپ ﷺ کو وحی آئی، کہا کہ جس وقت آپ ﷺ کو وحی آتی تھی تو آپ ﷺ پر سخت ہوتی تھی، پھر جب وہ حالت آپ سے دور ہو گئی تو آپ ﷺ نے ہم کو خبر دی کہ آپ پر یہ نازل کیا گیا:

﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴾[1] (وقد رواه أحمد وأبو داود والنسائي من غير وجه عن جامع بن شداد به)

امام احمد رحمہ اللہ نے زیاد بن علاقہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو سنا، وہ کہتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نماز پڑھتے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے پاؤں پر ورم آ جاتا تھا تو آپ ﷺ سے کہا گیا: کیا اللہ آپ کے اگلے پچھلے گناہ نہیں بخش چکا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا پھر میں شکر گزار بندہ نہ ہو جاؤں۔[2] (أخرجاه و بقية الجماعة إلا أبا داود من حديث زياد به) امام احمد رحمہ اللہ نے عن عروہ بن زبیر عن عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ ﷺ جس وقت نماز پڑھتے تو آپ ﷺ کے پاؤں مبارک پھٹنے لگتے تھے، اس پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا آپ یہ کرتے ہیں، حالانکہ اللہ تو آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخش چکا ہے؟ تو فرمایا: اے عائشہ! کیا پھر میں شکر گزار بندہ نہ ہو جاؤں۔[3] (أخرجه مسلم في الصحيح من رواية عبدالله بن وهب به)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن قتادہ عن انس رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں کھڑے ہوئے، یہاں تک کہ آپ کے دونوں قدم مبارک پر ورم آ گیا۔ یا کہا: آپ کی دونوں پنڈلیوں پر ورم آ گیا، پھر آپ ﷺ سے کہا گیا: کیا اللہ آپ کے اگلے پچھلے گناہ نہیں بخش چکا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر کیا میں عبدِ شکور نہ ہو جاؤں۔[4] (غريب من هذه الوجه) چنانچہ ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ یقیناً ہم نے تیرے واسطے ظاہری فتح کر دی۔ اس فتح سے مراد حدیبیہ کی صلح ہے، اس لیے کہ اس سے خیرِ کثیر حاصل ہوئی اور لوگ ایمان لے آئے اور بعض بعض کے ساتھ جمع ہو گئے اور مومن نے کافر کے ساتھ گفتگو کی اور علمِ نافع اور ایمان پھیل گیا۔

---

(1) تفسير الطبري (١٩٩/٢٢) مسند أحمد (٤٦٤/١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٢٦٧/٥)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨١٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٤١٢) سنن النسائي، رقم الحديث (١٦٤٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤١٩) مسند أحمد (٢٥٥/٤)

(3) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٢٠) مسند أحمد (١١٥/٦)

(4) مسند أبي يعلىٰ (٢٨٠/٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٥٥٢/٢)

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ ﴾ یہ آپ ﷺ کی خصوصیتوں میں سے ہے جن میں کوئی اور آپ ﷺ کا شریک نہیں ہے، ثوابِ اعمال کی کسی صحیح حدیث میں آپ ﷺ کے غیر کے واسطے نہیں ہے کہ اس کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیے گئے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک عظیم شرف ہے اور آپ ﷺ اپنے سارے کاموں میں اطاعت اور نیکی اور استقامت پر تھے جن کو آپ ﷺ کے سوا کوئی بشر نہیں پہنچا، نہ پہلے لوگوں میں سے اور نہ بعد والوں میں سے اور آپ ﷺ علی الاطلاق کامل ترین بشر ہیں اور دنیا اور آخرت میں ان کے سردار ہیں۔ اور چونکہ آپ ﷺ ساری مخلوق سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے مطیع تھے اور سب سے زیادہ اللہ پاک کے اوامر ونواہی کی تعظیم کرنے والے تھے، اس لیے جب اونٹنی آپ کو لے کر بیٹھ گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: «حَبَسَهَا حَابِسُ الْفِيْلِ» یعنی فیل کے روکنے والے نے اس کو روکا ہے۔

پھر فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! وہ آج مجھ سے جس کسی شے کا سوال کریں گے اور اس سے اللہ کی حرمتوں کی تعظیم کریں گے تو میں وہ ان کو دوں گا۔[1] پھر جب آپ ﷺ نے اس باب میں اللہ کی اطاعت کی اور صلح مان لی تو اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرمایا: ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ ﴾ یعنی اور تاکہ دنیا اور آخرت میں تجھ پر اپنی نعمت پوری کرے۔ ﴿ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴾ یعنی اور بتا دے تجھ کو سیدھی راہ اس شرعِ عظیم و دینِ قویم کے سبب سے جس کو تیرے لیے مشروع فرمائے گا۔

﴿ وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ﴾ یعنی تو نے جو اللہ عزوجل کے امر کے لیے خضوع وفروتنی کی اس سبب سے اللہ تجھ کو رفعت دے گا اور تیری مدد کرے گا تیرے دشمنوں پر، جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے: نہیں زیادہ کی اللہ نے کسی بندے کو بہ سبب عفو کے مگر عزت اور جس کسی نے اللہ عزوجل کے لیے عاجزی کی، اس کو اللہ تعالیٰ نے رفعت دی۔[2] سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: نہیں سزا دی تو نے کسی کو جس نے تیرے حق میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی مثل اس کے کہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی اس کے حق میں اطاعت کرے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح اصل میں بہ معنی کشادن ہے، جیسے: محاورے میں بولتے ہیں: ''فَتَحْتُ بَابَ الدَّارِ'' یعنی میں نے گھر کا دروازہ کھولا، پھر فتح کا اطلاق کیا گیا شہر کے ظفر پانے پر، یہ ظفر پانا بہ طور عنوہ وغلبہ ہو، یا بہ طریق صلح لڑائی سے ہو، یا بغیر لڑائی کے خراج سے ہو، یا بغیر خراج کے۔ ظفر کو فتح کہنے کی یہ وجہ ہے کہ جب تک شہر پر ظفر نہ پائی تھی، تب تک وہ

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۵۸۱) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵۸۸) [3] تفسیر ابن کثیر (۴/ ۲۳۰_۲۳۳)

مُغلق تھا، جیسے بند دروازہ اور جب اس پر ظفر پائی تو وہ فتح کیا گیا، جیسے بند دروازے کو کھول دیا۔ فتح کے ایک معنی فتاحت وحکم وقضاء کے ہیں جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ ﴾ [الأعراف: ۸۹]

''اے ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے موافق فیصلہ کر دے۔''

فتح کے ایک معنی صلح کے بھی ہے۔ اس فتح کے تعین میں اختلاف ہے کہ اس سے مراد کیا ہے، چنانچہ اکثر کا قول تو اس قول کی بنا پر ہے جو صحیح بخاری میں ہے کہ مراد صلح حدیبیہ ہے۔[1] کبھی صلح کا نام فتح رکھتے ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فتح کبھی صلح ہوتی ہے۔ لغت میں فتح کے معنی فتحِ منغلق کے ہیں، یعنی بند شے کا کھولنا۔ حدیبیہ میں جو صلح مشرکوں کے ساتھ ہوئی وہ بندھی ہوئی اور مشکل تھی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کھول دیا۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوئی فتح صلح حدیبیہ سے زیادہ عظیم نہ تھی، یہ اس لیے کہ مشرکین مسلمانوں سے ملے جلے اور اُن کی بات چیت سنی، چنانچہ اسلام ان کے دلوں میں جم گیا۔ تین برس میں ایک خلقِ کثیر ایمان لے آئی اور اُن سے اسلام کی جماعت کثیر ہوگئی۔ شعبی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو جو شے حدیبیہ میں ملی، وہ کسی غزوے میں نہیں ملی۔[2]

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیے اور بیعت الرضوان کی گئی اور خیبر کی کھجوریں کھلائی گئیں اور ہدی اپنے محل کو پہنچا اور روم فارس پر غالب ہوئے تو مجوس پر اہلِ کتاب کے غالب ہونے سے مومن خوش ہوئے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فتح حدیبیہ میں ایک بڑا معجزہ ہوا، کنویں کا پانی کھینچ ڈالا گیا اور اس کنوئیں میں ایک قطرہ باقی نہ رہا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مضمضہ (کلی) کی، پھر اس کو کنوئیں میں ڈالا تو وہ پانی سے بہنے لگا، یہاں تک کہ سب لوگوں نے پیا۔[3] اس بارے میں حدیثیں پہلے گزر چکی ہیں۔[4] ارجح قول یہی ہے اور وہ بات اسی کی تائید کرتی ہے جو اس سے پہلے ہم ذکر کر آئے ہیں کہ یہ سورت حدیبیہ کی شان میں نازل کی گئی ہے۔ ایک قوم نے کہا: مراد فتح مکہ ہے۔

امام ابن مردویہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ﴾ فتح مکہ ہے[5] اور سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے بھی اس کی مثل مروی ہے۔ اب اگر یوں کہو کہ آیت تو راستے میں نازل میں ہوئی، جبکہ آپ ﷺ حدیبیہ سے لوٹے۔ یہ واقعہ ۶ ہجری کا ہے اور مکہ اس وقت فتح نہیں ہوا تھا، پھر ﴿ فَتَحْنَا ﴾ صیغۂ ماضی میں کیوں فرمایا تو کہیں گے کہ ﴿ فَتَحْنَا ﴾ بہ معنی ''قَضَيْنَا'' ہے، یعنی ہم ازل میں حکم جاری کر چکے تھے کہ آیندہ مکہ حدیبیہ کے بعد فتح ہوگا، چنانچہ ماضی اپنی حقیقت پر ہے، اس لیے کہ قضائے ازلی کی خبر دی ہے۔ یا یوں کہیں گے کہ ماضی مضارع کے معنی میں ہے، یا یہ مکے کی فتح کا وعدہ ہے۔

ماضی کے پیرائے میں اس کو اس لیے ادا کیا ہے کہ اللہ کا وعدہ اپنے سچ ہونے اور ثابت ہونے میں اس طرح

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] فتح القدير (۵/۵۹) [3] معاني القرآن (۵/۱۹)
[4] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [5] الدر المنثور (۷/۵۱۰)

ہوتا ہے، جیسے وہ امر واقع ہو چکا۔ اور اس میں جس بات کی خبر دی گئی ہے، یعنی فتح کی شان کی، وہ بلندی اور عظمت ہے جو مخفی نہیں ہے، یعنی وہ فتح ایسی عظیم الشان باہر البرہان اور قطعی یقینی ہے کہ گویا ہو گئی، باوجود اس کے کہ ابھی وقوع میں نہیں آئی۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ مکہ بطور عنوہ و غلبہ فتح ہوا اور امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ بطور صلح مفتوح ہوا۔ بویطی میں ہے کہ مکے کے اسفل کو تو سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے عنوۃً فتح کیا اور اس کے اعلیٰ کو سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ نے بہ طور صلح فتح فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرف سے داخل ہوئے اور حکم اسی کے لیے ہو گیا۔ جن خبروں کا بہ ظاہر تعارض ہے، وہ اس تقریر سے جمع ہو جاتے ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ ﴿ فَتَحۡنَا ﴾ سے صلح حدیبیہ کی خبر دی ہے۔ اس صلح کا نام فتح صرف اس لیے رکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشرکوں پر غالب ہونے کے بعد ہوئی جب کہ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح کا سوال کیا تو یہ صلح فتح مکہ کا سبب بن گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی وجہ سے باقی عربوں کے لیے فارغ ہو گئے اور ان پر چڑھائی کی اور کئی جگہیں فتح کر ڈالیں اور ایک خلقِ عظیم کو اسلام میں داخل کیا۔ اس بنا پر ﴿ فَتَحۡنَا ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ "أَوْجَدْنَا لَكَ سَبَبَ الْفَتْحِ"، یعنی ہم تیرے لیے فتح کا سبب وجود میں لائے۔

یہ سبب وہی حدیبیہ کی صلح ہے، کیوں کہ مکے کی فتح میں سبب وہی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد فتحِ خیبر ہے۔ یہ قول امام مجاہد اور عوفی رحمہ اللہ کا ہے، جیسا کہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ فتحِ روم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس فتح سے مراد ساری فتوح ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فتح کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد نبوت اور دعوت الی الاسلام ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فتح کی گئی۔

غرضیکہ اکثر کا قول یہ ہے کہ صلح حدیبیہ ہے، جیسا کہ اول مفصل گزر چکا ہے۔ اور اللہ پاک نے فتح کی نسبت اپنی طرف فرمائی، اس لیے کہ بندوں کے کام خلق اور ایجاد میں اسی کی طرف منسوب ہیں اور خطاب خاص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ یعنی ہم نے تیرے لیے فتح کر دی فتح کرنا ظاہر و واضح و مکشوف بغیر قتال و تکلیف و رنج و کلفت کے۔ بالجملہ ﴿ فَتَحۡنَا ﴾ تو بہ صیغۂ متکلم مع الغیر اظہارِ عظمت کے لیے۔

فرمایا: پھر اسم مبارک اللہ کی طرف التفات کیا جو ساری صفات کا جامع ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ لِّيَغۡفِرَ لَكَ ٱللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنۢبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعۡمَتَهُۥ عَلَيۡكَ ﴾ چنانچہ اس سے یہ بات بتانا مقصود ہے کہ چار امور سے ہر امر جو لامِ غایت کے تحت میں داخل ہیں، اللہ تعالیٰ سے ایک الگ جہت سے صادر ہے اور صفاتِ الٰہیہ میں سے ایک صفت پر مرتب ہے، مثلاً: ذنوب کی مغفرت تو اس جہت سے ہے کہ اللہ پاک غفار ہے اور صراط کی ہدایت اس حیثیت

[1] تفسیر القرطبي (۲٦١/١٦)

سے ہے کہ وہ ہادی ہے اور نعمت کا اتمام اس جہت سے ہے کہ وہ منعم ہے اور نصرِ عزیز عطا کرنا اس حیثیت سے ہے کہ وہ ناصر اور عزیز ہے اور اُن سب صفات کا جامع اللہ کا اسم مبارک ہے، اس لیے کہ یہ نام اس ذات پاک کا ہے جو جمیع صفات کا حامل ہے۔ یہ تو التفات کا نکتہ ہے۔

اب اس لام کے بارے میں مفسرین نے مختلف معنی بیان کیے ہیں۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ تو فرماتے ہیں کہ فتح کی علت ہے اس جہت سے کہ فتح مسبب ہے ان امور سے کفار کے ساتھ جہاد کرنا، دین کے بلند کرنے میں سعی و کوشش کرنا، شرک کا دور کرنا اور نفوسِ ناقصہ کو کامل بنانا۔[1] امام بغوی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لامِ کَی ہے۔[2] امام ابن الانباری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابو العباس مبرد سے اس لام کا پوچھا تو کہا کہ لام کَی ہے،[3] اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے تیرے واسطے فتح کی فتحِ ظاہر، تا کہ مغفرت کے ساتھ تمام نعمت فتح میں تیرے لیے جمع ہو جائے، پھر جب مغفرت کی طرف ایک شے حادث واقع مل گئی تو کَی کے معنی حسین ہو گئے اور جس نے یہ کہا ہے کہ فتح مغفرت کا سبب نہیں ہے، اس کی تغلیط کی ہے۔

امام جلال محلی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لام علتِ غائی کے لیے ہے۔ چنانچہ مدخول اس کا مسبب ہے، سبب نہیں ہے،[4] اس کا مطلب یہ ہے کہ لام علتِ باعثہ کے لیے نہیں ہے کہ اللہ کو کوئی شے کسی شے پر باعث نہیں ہوتی، بلکہ علتِ غائی کے لیے ہے، چنانچہ مدخول اس کا مسبب ہے، سبب نہیں ہے، کیوں کہ سبب وہ شے ہے جس کی طرف حکم اضافت کیا جاتا ہے، جیسے: وجوبِ ظہر کے لیے زوال سبب ہے اور مغفرت ایسی نہیں ہے، چنانچہ یہ بات بجائے خود ثابت کی گئی ہے۔

امام زمخشری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر تم کہو کہ مکے کی فتح مغفرت کی علت کیوں ٹھہرائی گئی؟ تو ہم کہیں گے: مغفرت کی علت نہیں ٹھہرائی گئی، لیکن وہ تو اِن چار امور کے اجتماع کی علت ہے جن کا شمار کیا گیا ہے، وہ یہ ہیں: مغفرت، اتمامِ نعمت، ہدایتِ صراطِ مستقیم اور نصرِ عزیز۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ میسر کر دی ہم نے تیرے لیے مکے کی فتح اور ہم نے تیرے دشمنوں پر تیری مدد کی، تا کہ تیرے لیے دونوں جہاں کی عزت جمع کریں اور تیری عاجل اور آجل کی غرضیں جمع کریں۔

یہ بھی جائز ہے کہ فتح مکہ اس جہت سے مغفرت اور ثواب کا سبب ہو کہ وہ دشمنوں کے ساتھ جہاد ہے۔[5] امام ابن عادل رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ ایک کلام غیر جید ہے اور ظاہر آیت کے مخالف ہے، اس لیے کہ لام تو داخل ہوا ہے مغفرت پر تو وہ فتح کی علت ہو گی اور فتح معلل بہ مغفرت ہے، چنانچہ چاہیے یہ تھا کہ یوں کہتا: فتحِ مکہ معلل بہ مغفرت کیوں کر ٹھہرائی گئی؟ پھر جواب میں یوں کہتا کہ معلل نہیں ٹھہرائی گئی۔[6] امام رازی رحمہ اللہ تعلیل کی توجیہ میں

---

[1] تفسير البيضاوي (١٩٩/٥) [2] تفسير البغوي (٢٩٧/٧) [3] فتح القدير (٥٩/٥)
[4] تفسير الجلالين (٦٧٨/١) [5] الكشاف (٣٣٤/٤) [6] اللباب في علوم الكتاب (٤٧٦/١٧)

فرماتے ہیں کہ ﴿ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ ﴾ سے مراد تعریف بہ مغفرت ہے۔ تقدیر یہ ہے: "إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ لِتَعْرِفَ أَنَّكَ مَغْفُورٌ لَكَ مَعْصُومٌ" یعنی ہم نے تیرے لیے فتح کی، تاکہ تو اس بات کو پہچان لے کہ تیری مغفرت کی گئی اور تو معصوم ہے، کیوں کہ لوگوں نے عام الفیل کے بعد یہ جان لیا کہ مکے کو اللہ کا دشمن نہیں لے گا اس کو جو فتح کرے گا، وہ اللہ کا حبیب ہے۔[1]

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: مراد یہ ہے کہ اللہ نے تیرے لیے فتح کی، تاکہ فتح کو اپنے تجھ کو بخشنے کی ایک علامت ٹھہرائے تو گویا یہ صیرورت کا لام ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لام قسم کا ہے، اس کی اصل "لیغفرن" ہے، پھر لامِ کَی سے تشبیہ دے کر اس لام کو کسرہ دیا گیا اور نون کو حذف کیا۔ یہ قولِ خطا ہے، اس لیے کہ قسم کا لام نہ تو مکسور ہوتا ہے اور نہ وہ مضارع کو نصب دیتا ہے۔[2] امام ابن عادل رحمہ اللہ نے کہا: یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ نصب نہیں ہے یہ تو صرف اس فتحہ کا بقا ہے جو نونِ تاکید کے قبل تھا، باقی رہا، تاکہ اس پر دال ہو، لیکن یہ ایک مردود قول ہے،[3] اس کے سوا اور کچھ بھی کہا ہے۔ اسلم وہ قول ہے جس پر محلی رحمہ اللہ نے اقتصار کیا ہے۔ واللہ أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ﴾ اس کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ کسی نے تو کہا ہے کہ تیرا وہ گناہ جو رسالت سے پہلے گزر چکا ہے اور جو پیچھے ہوا بعد اس کے۔ اس کے قائل امام مجاہد، سفیان ثوری، ابن جریر اور واحدی رحمہم اللہ وغیرہم ہیں۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ ﴾ یعنی "ذَنْبِ أَبَوَيْكَ آدَمَ وَحَوَّاءَ وَمَا تَأَخَّرَ مِنْ ذُنُوْبِ أُمَّتِكَ"[4] یہ قول قرآن کے معنی سے انتہائی بعید ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَا تَقَدَّمَ ﴾ سے مراد تیرے باپ ابراہیم کا ذنب ہے اور ﴿ وَمَا تَاَخَّرَ ﴾ سے مراد ان کے بعد کے انبیاء کے ذنوب ہیں۔ یہ بھی مثل ماقبل کے ہے۔ کسی نے کہا ﴿ مَا تَقَدَّمَ ﴾ سے مراد ذنبِ روزِ بدر ہے اور ﴿ وَمَا تَاَخَّرَ ﴾ سے مراد ذنبِ روزِ حنین ہے، یہ بھی بُعد میں پہلے دو قولوں کی مثل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اگر کوئی گناہ پرانا یا نیا ہوتا تو البتہ ہم اس کو تیرے لیے بخش دیتے، اس کے سوا اور کچھ بھی کہا ہے جس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے اور بعد رسالت کے ذنب سے مراد "تَرْكُ مَا هُوَ الْأَوْلیٰ" ہوگا۔

آپ ﷺ کی جلالتِ قدر کی جہت سے آپ ﷺ کے حق میں اس کا نام ذنب رکھا گیا، گو وہ آپ ﷺ کے علاوہ کسی اور کے لیے گناہ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ "حَسَنَاتُ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ" کے باب سے ہے، جیسا کہ شیخ الاسلام زکریا انصاری نے "شرح طوالع" میں کہا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ غفران کے معنی یہ ہیں کہ آپ ﷺ کے اور ذنوب کے درمیان حائل ہو جانا، تاکہ آپ ﷺ سے کوئی ذنب صادر نہ ہو، اس لیے کہ "غفر" بہ معنی ستر ہے

---

[1] تفسير الرازي (٦٨/٢٧) [2] فتح القدير (٥٩/٥)

[3] اللباب في علوم الكتاب (٤٧٧/١٧) [4] تفسير القرطبي (٢٦٢/١٦، ٢٦٣)

اور ستر یا تو بندے اور گناہ کے درمیان ہوتا ہے، یا گناہ اور اس کی سزا کے درمیان ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کے اور باقی انبیاء کے لائق اول ہے اور ثانی امتوں کے لائق ہے۔ یہ قول برماوی کا ہے

یا ﴿مَا تَقَدَّمَ﴾ ﴿وَمَا تَاَخَّرَ﴾ مبالغہ ہے، جیسے یوں کہو کہ ”زَيْدٌ يَضْرِبُ مَنْ يَلْقَاهُ وَمَنْ لَا يَلْقَاهُ“ یعنی ضرب کے مبالغے میں بولتے ہیں کہ زید مارتا ہے اسے جو اس کو ملتا ہے اور اس کو جو اس سے نہیں ملتا، باوجود اس کے کہ جو اس سے ملتا نہیں، اس کو مارنا غیر ممکن ہے۔ محلی رحمہ اللہ نے خوب کہا ہے کہ یہ مووّل (تاویل کیا گیا) ہے، اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام کی گناہوں سے عصمت بہ دلیل عقلی قاطع ہے۔[1] امام حفناوی نے ”ذنب“ کی تفسیر میں کہا ہے کہ نبوت سے پہلے اور بعد کے گناہ جو صغیرہ ہوں یا کبیرہ، عمداً کیے ہوں یا سہواً سب معصوم، یعنی معاف کیے گئے ہیں اور تاویل وہی ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔

﴿وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ﴾ اور تاکہ پوری کرے تجھ پر اپنی نعمت اس طرح سے کہ تیرے دین کو سارے دینوں پر غالب کر دے۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنی نعمت جنت کے ساتھ پوری کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ نبوت اور حکمت کے ساتھ۔ کسی نے کہا ہے کہ مکہ، طائف اور خیبر کی فتح سے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ معنی اس طرح سے ہوں، تاکہ فتح کے ساتھ تمام نعمت مغفرت اور ہدایت کے ساتھ جمع ہو جائے۔ صراطِ مستقیم سے مراد دینِ اسلام ہے۔

﴿وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا﴾ یعنی اور تاکہ تجھ کو سیدھی راہ بتا دے، یعنی تجھ کو دینِ اسلام پر ثابت رکھے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہدایت پر، یہاں تک کہ تجھ کو اپنی طرف قبض کرے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تجھ کو رسالت کے پہنچانے میں اور مراسمِ ریاست قائم کرنے میں سیدھی راہ بتا دے۔[2] چنانچہ ہدایت اپنی حقیقت پر ہے، اب یہ جو کہا ہے کہ مراد ہدایت کا زیادہ کرنا یا ہدایت پر ثابت رکھنا ہے، اس کی ضرورت نہیں۔

﴿وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا﴾ یعنی اور اللہ تیری مدد کرے جو غالب، قوی اور عزت والا ہے اور ایسی عزت جو انتہا کو پہنچنے والی ہو جس کے پیچھے کسی طرح کی ذلت نہ ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ یہاں ﴿عَزِيْزًا﴾ ”نصر“ کی صفت واقع ہوئی ہے، حالاں کہ عزیز وہ ہے جس کے لیے نصر ہوتی ہے نہ کہ خود نصر۔ پھر عزیز کی ضمیر نصر کی طرف کیسے منسوب کی گئی ہے؟ اس کا جواب یہ دیا کہ یہاں فعیل کا صیغہ نسبت کے لیے ہے تو عزیز بہ معنی ذو العزت ہے، چنانچہ معنی یہ ہیں کہ ”نَصْرًا ذَا عِزٍّ وَمَنْعَةً لَا ذُلَّ فِيْهِ“۔ نصر کے ذو منعت ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کو اس سے منع کرے کہ اس سے کوئی برائی پہنچے اور اس کو کوئی مکروہ لگے۔ اب ان معنی کے ساتھ عزیز کی نسبت نصر کی ضمیر کی طرف حقیقت ہے۔ (كما قال شيخ زاده)۔ یہ فتح البیان وغیرہ سے خلط ملط کر کے لکھا گیا ہے۔[3]

---

[1] تفسير الجلالين (٦٧٨/١) [2] تفسير البيضاوي (٢٠٠/٥) [3] فتح البيان (٨٥/١٣-٨٩)

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا
اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ۭ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ
اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ۙ۴ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ۭ
وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝ۙ۵ وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ
وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّاۗنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۭ عَلَيْهِمْ دَاۗىِٕرَةُ
السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ
مَصِيْرًا ۝۶ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا
حَكِيْمًا ۝۷

وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں طمانیت وتسکین نازل کی، تا کہ ان کے ایمان میں اور ایمان کا اضافہ ہو، اور آسمانوں اور زمین کے (سب) لشکر اللہ ہی کے ہیں، اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے ④ (یہ سب اس لیے کیا) تا کہ وہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایسے باغات میں داخل کرے، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اور (تا کہ) ان سے ان کی برائیاں دور کر دے اور یہ اللہ کے ہاں بہت بڑی کامیابی ہے ⑤ اور (تا کہ) منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے، جو اللہ کے متعلق برے گمان کرتے ہیں، بری گردش انھی پر ہے اور اللہ ان پر ناراض ہوا، اور اس نے ان پر لعنت کی، اور اس نے ان کے لیے جہنم تیار کر رکھا ہے اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے ⑥ اور آسمانوں اور زمین کے (سب) لشکر اللہ ہی کے لیے ہیں اور اللہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے ⑦

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنوں پر سکینت کا نزول:

مسلمانوں کے دلوں میں سکون ڈال دیا، یعنی رسول کے حکم پر رہے، ضدیوں کے ساتھ ضد نہ کرنے لگے، اس میں ان کے ایمان کا درجہ بڑھا۔ اللہ کے نزدیک بڑی کامیابی ہے۔ لوگ جو کہتے ہیں کہ جنت کی طلب میں نقصان ہے، یہاں سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں یہی بڑا کمال ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانیاں رکھنے والے ہیں۔ مدینے سے چلتے وقت منافق بہانے بنا کر بیٹھ رہے، یہ سمجھا کہ لڑائی میں وطن سے دور تباہ ہوں گے، فوج کم ہے اور

دشمن کے ملک میں جانا ہے۔ کافروں نے یہ سمجھا کہ عمرے کی غرض سے آئے ہیں چاہتے ہیں کہ دھوکے سے مکہ کے شہر پر قبضہ کرلیں۔ انتھٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وہی ہے جس سے سکینت اتاری: "أَيْ: جَعَلَ الطَّمَانِيْنَةَ"، دوسرا لفظ "اَلرَّحْمَةَ" ہے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "اَلْوَقَارُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ"[2] یعنی وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں حدیبیہ کے دن تسلی وتسکین اور رحمت و برد باری رکھی۔ مومنوں سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، جنھوں نے اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا مانا اور اُن کے حکم کے مطیع اور فرمانبردار ہوئے۔ پھر جب اُن کے دلوں نے اس سے قرار اور چین پکڑا تو اس نے اُن کے ایمان کے ساتھ اور ایمان بڑھایا۔ امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ ائمہ نے اس سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ دلوں میں ایمان کا تفاضل ہوتا ہے۔[3]

پھر اللہ پاک نے ذکر کیا کہ اگر وہ چاہتا تو کافروں سے خود بدلہ لے لیتا، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ یعنی اللہ کے لشکر آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ وہ اگر اُن پر ایک فرشتہ بھیج دیتا تو وہ ان کی جماعت کا ستیاناس کر دیتا، لیکن اس نے اپنے مومن بندوں کے لیے جہاد وقتال مشروع کیا ہے، اس حکمتِ بالغہ، قطعی حجتوں اور براہین کے ذریعے جو اس میں ہیں۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴾ یعنی وہ بڑا جاننے والا اور حکمت والا ہے، وہی اپنے کام کی حکمت کو خوب جانتا ہے۔

پھر فرمایا: ﴿ لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ﴾ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث پہلے گزر چکی ہے جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ کو مبارک ہو یہ تو آپ کے لیے ہے، پھر ہمارے لیے کیا ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ﴾[4] یعنی تاکہ مومن مردوں اور عورتوں کو باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان میں رہیں بسیں اور دور کرے ان سے ان کی خطائیں اور گناہ اور ان کو ان پر عذاب نہ کرے، بلکہ معاف اور درگز کرے اور بخش دے اور ستر پوشی کرے اور رحم وقدر دانی فرمائے۔

﴿ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴾ یعنی اور یہ اللہ کے نزدیک بڑی کامیابی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴾ [آل عمران: ١٨٥]

---

[1] تفسير الطبري (٢٢/٢٠٣) [2] تفسير ابن كثير (٤/٢٣٣)

[3] صحيح البخاري (١/٧) [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٣٩)

”پس جو شخص آگ سے ہٹا دیا جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے بے شک وہ کامیاب ہو گیا اور دنیا کی زندگی تو صرف دھوکے کی جنس ہے۔“

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ﴾ یعنی اور عذاب کرے منافق مردوں اور عورتوں کو اور مشرک مردوں اور عورتوں کو جو اللہ تعالیٰ کو اس کے حکم میں تہمت لگاتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے اور اُن کے اصحاب رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ گمان رکھتے ہیں کہ قتل کیے جائیں گے اور بالکل تباہ ہو جائیں گے۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۚ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴾ یعنی انہیں پر ہو پھیر مصیبت کا اور اللہ اُن پر خفا ہوا اور اُن کو اپنی رحمت سے دور کیا اور اُن کے لیے جہنم تیار کی جو پھر جانے کی بری جگہ ہے۔ پھر اللہ عزوجل نے اپنی قدرتِ انتقام کی تاکید کرنے کے لیے فرمایا: ﴿ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴾ یعنی کافر و منافق جو اس کے دشمن ہیں ان سے انتقام لینے پر اس کو پوری قدرت ہے، کیوں کہ اس کے آسمانوں اور زمین کے لشکر ہیں اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکون وطمانیت اور وقار اتارا، یعنی حدیبیہ والے مومن اس فتح کے سبب سے جو اُن کے لیے میسر کر دی، تاکہ اُن کے جی نہ اُکھڑیں اور وہ اس شے سے بے قرار اور بے چین نہ ہوں جو اُن پر وارد ہو۔ سکینہ کے بارے میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کے قول پہلے گزر چکے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ قرآن شریف میں جو بھی سکینہ مذکور ہوا اس سے مراد طمانیت ہے سوائے اس سکینہ کے جو سورۃ البقرہ میں ہے۔ اس کی تفسیر بجائے خود گزر چکی ہے: ﴿ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ﴾ یعنی اس سکینت کے سبب سے جو انھیں اَور ایمان نصیب ہوا، اسے اس ایمان کے ساتھ ملائیں جو پہلے ان کو حاصل تھا۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تصدیق ملائیں اپنی تصدیق کے ساتھ۔[2] امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر بار جو آیت آسمان سے نازل ہوئی اور اس کی تصدیق کی تو یہ اپنی تصدیق کے ساتھ اور تصدیق زیادہ کی۔ امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خشیت اپنی خشیت کے ساتھ ملائیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یقین اپنے یقین کے ساتھ۔[3] امام ابن جریر، ابن منذر، طبرانی، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہم اللہ نے دلائل میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو ”لا إله إلا الله“ کی گواہی دے کر بھیجا، پھر جب مومنوں نے اس کی تصدیق کر لی تو نماز اُن پر فرض کی، پھر جب اس کی تصدیق کر چکے تو ان پر روزے بڑھا دیے،

---

① تفسیر ابن کثیر (٢٣٣/٤، ٢٣٤) ② الدر المنثور (٥١٤/٧) ③ تفسیر القرطبي (٢٦٤/١٣) فتح القدير (٦٠/٥)

پھر جب اس کی تصدیق کر چکے تو ان پر زکات کا اضافہ کیا، پھر جب اس کو مان چکے تو حج اُن پر زیادہ کیا، پھر جب اس کی تصدیق کر چکے تو جہاد ان پر بڑھایا، پھر ان کا دین ان کے لیے کامل کر دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ [المائدة: ٣] ”آج میں نے تمھارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام بھرپور کر دیا اور تمھارے لیے اسلام کے دین ہونے پر رضا مند ہو گیا۔“ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آسمان والوں اور زمین والوں کا سب سے مضبوط اور سب سے سچا اور سب سے مکمل ایمان ”لا إله إلا الله“ کی گواہی ہے۔[1]

﴿ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴾ یعنی اللہ کے فرشتے ہیں انسان، جن اور شیاطین، وہ اُن کے کام کی جس طرح چاہتا ہے تدبیر کرتا ہے اور ان کے بعض کو بعض پر مسلط کرتا ہے اور بعض کی بعض کے ساتھ حفاظت کرتا ہے اور اللہ کثیر اور بلیغ العلم ہے اپنی خلق کے ساتھ اور اپنی کاریگری اور اقوال و افعال کے ساتھ حکمت والا ہے۔ ﴿ لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ﴾ میں حرفِ لام محذوف سے متعلق ہے: ”أَيْ: أَمَرَ بِالْجِهَادِ“

﴿ لِيُدْخِلَ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے جہاد کا امر فرمایا، تاکہ مومن مردوں اور عورتوں کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن میں نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں اور ان سے ان کی برائیوں کو ڈھانک دے ان کو ظاہر نہ کرے اور نہ ان کے سبب سے ان کو عذاب کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ لام اس محذوف سے متعلق ہے جس پر ماقبل دال ہے: ”أَيْ: يَبْتَلِي بِتِلْكَ الْجُنُوْدِ مَنْ شَاءَ“ یعنی وہ ان لشکروں کے ساتھ جس کو چاہتا ہے آزماتا ہے، چنانچہ خیر والوں سے خیر کو قبول کرتا ہے اور شر اس شخص سے جس کے بارے میں وہ اس کا حکم جاری کر چکا ہے کہ اسے آگ میں داخل کرے اور عذاب کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا ﴾ کے متعلق ہے۔ گویا یوں کہا ہے کہ ہم نے فتح کیا تیرے لیے جو کچھ فتح کیا، تاکہ داخل کرے اور عذاب کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ يَنْصُرَكَ ﴾ کے متعلق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے ساتھ تیری مدد کی، تاکہ داخل کرے اور عذاب کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ لِيَزْدَادُوْٓا ﴾ سے متعلق ہے یعنی اپنے ایمان کے ساتھ ایمان زیادہ کریں، تاکہ داخل کرے اور عذاب کرے غرضیکہ لام کے متعلق پانچ قول ہیں۔

پہلا قول محلی رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے اور فتح البیان میں پہلے اسی کو لکھا ہے،[2] اس لیے کہ قولِ مختار یہی ہے۔ فتح القدیر میں دوسرے قول کو زیادہ بہتر کہا ہے۔[3] تیسرے قول کے بارے میں امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح نہیں ہے اس بنا پر کہ ﴿ لِيَغْفِرَ ﴾ ﴿ فَتَحْنَا ﴾ سے متعلق ہو، اس لیے کہ دو حرفِ جر جن کے ایک معنی ہوں، ان میں ایک

[1] تفسير الطبري (٢٢/٢٠٣، ٢٠٤) [2] تفسير الجلالين (٦٧٩/١) فتح البيان (٩٠/١٣) [3] فتح القدير (٦/٥)

فعل بغیر عطف یا بدل یا تاکید کے عمل نہیں کرتا۔ باوجود اس خرابی کے معنی کے لحاظ سے بھی اس میں بُعد ہے۔ پانچواں قول بھی مردود ہے، کیوں کہ ﴿ وَيُعَذِّبَ ﴾ ﴿ لِيَغْفِرَ ﴾ پر معطوف ہے اور یہ مناسب نہیں ہے کہ ایمان کا زیادہ ہونا منافقین کو عذاب کرنے کی علت ہو۔

امام ابو حیان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایمان کا زیادہ ہونا کفار کی تعذیب کا سبب نہیں ہوتا۔ اس کا یوں جواب دیا کہ اس کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ یہ مومن کے لیے مقصود ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ تمھارے ازدیادِ ایمان کے سبب سے تم کو جنت میں داخل کرے گا اور تمھارے ہاتھوں سے دنیا میں کافروں کو عذاب کرے گا۔[1] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے یہ تقدیر کی ہے کہ آسمانوں اور زمین کے لشکر اللہ کے ہیں اور وہ بعض کو بعض پر مسلط کرتا ہے جس طرح کہ اس کے علم اور حکمت کا تقاضا ہے اور اسی قضیہ سے یہ ہے کہ اس نے حدیبیہ کی صلح سے مومنوں کو چین دیا اور ان کو اس بات کا وعدہ دیا کہ ان کے لیے فتح کر دے گا اور یہ جو فیصلہ کیا تو صرف اس لیے کہ مومن لوگ اللہ کی نعمت کو پہچان لیں اور اس کا شکر کریں تو اُن کو ثواب دے گا اور کافروں اور منافقوں کو عذاب کرے، اس لیے کہ یہ بات ان کو غیظ میں لائے اور اس کو ناپسند رکھا۔[2]

نکتہ:

وجود میں ترکیب اس طرح ہے کہ سیئات کی تکفیر پہلے ہوتی ہے، اس کے بعد جنت میں داخلہ ہے، یہاں ذکر میں اس کا اُلٹ ہے، پس یا تو اس لیے ہے کہ حرفِ واؤ ترتیب کا مقتضی نہیں ہوتا، یا اس لیے کہ سیئات کی تکفیر اور مکلّف کی مغفرت اہلِ جنت میں ہونے کے توابع سے ہے۔ چنانچہ ذکر میں جنت میں داخل ہونے کو پہلے رکھا، اس معنی میں کہ وہ اہلِ جنت میں سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو اعلیٰ مطالب اور واضح مقصد تھا، اس کو بیان کرنے میں مسارعت (جلدی) کی۔ یہ تو فنونِ بلاغت میں سے ہے کہ مقامِ ترغیب میں جو شے ترغیب کا اصل مقصود ہوتی ہے، اس کو تیزی سے بیان کرتے ہیں۔

﴿ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴾ یعنی یہ جو جنت میں داخل کرنا اور گناہوں کا مٹانا مذکور ہوا، اللہ تعالیٰ کے علم و قضا و حکم میں ایک عظیم کامیابی تھی۔ یعنی ہر مطلب پر فتح یاب ہونا ہر غم سے نجات ملنا ہر نفع کو حاصل کرنا ہر ضرر کو دفع کرنا عظیم کامیابی یہی ہے۔ ﴿ عِنْدَ ﴾ ظرف ہے محذوف سے متعلق ہے، اس بنیاد پر کہ ﴿ فَوْزًا ﴾ سے حال ہے، اس لیے کہ اصل میں تو اس کی صفت تھا، پھر جب مقدم کیا گیا تو حال ہو گیا: "أَيْ: كَائِنًا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ"، یعنی یہ ایک عظیم کامیابی تھی، درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہونے والی ہے۔ یہ جملہ معترضہ ہے جو ماقبل کی تقریر و تاکید کرتا ہے، معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان میں آیا ہے، یعنی "یدخل و یعذب" اور مومنین کی جزا اور منافقین و مشرکین

[1] البحر المحيط (٩١/٨) [2] تفسير النسفي (١٥٣/٤)

کی سزا کے درمیان حائل ہوا ہے، حسین موقعے پر واقع ہوا ہے کہ باوجود تقریر ماقبل کے ایک یہ جدید فائدہ دیا کہ جیسے دونوں کے جزا میں باعتبار نفس الامر کے بُعد اور مفارقت ہے، ویسی ہی اس جملے نے دونوں کے ذکر میں بھی مفارقت کر دی۔

بالجملہ اللہ پاک نے جس شے کا اپنے صالح بندوں کو وعدہ دیا، جب ان کے بیان سے فارغ ہو چکا تو اس شے کا ذکر کیا جس کے مستحق ان کے غیر ہیں، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ ﴾۔ "یدخل" پر معطوف ہے، یعنی اور تاکہ عذاب کرے منافق مردوں اور عورتوں کو اور مشرک مردوں اور عورتوں کو، دنیا میں تو اس طرح سے کہ ان کو غم اور رنج پہنچائے گا اس سبب سے کہ مسلمانوں کا بول بالا ہوگا اور اسلام کے ظہور اور غلبے کا مشاہدہ کریں گے اور اس کے مخالف مغلوب ہوں گے اور نبی کریم ﷺ کو ان پر مسلط کرے گا تو وہ ان کو ماریں گے، قید کریں گے اور غلام بنائیں گے اور آخرت میں جہنم کے عذاب سے ان کو سزا دے گا۔

یہاں منافقوں کا ذکر مشرکوں سے پہلے کیا، اس لیے کہ مومنوں پر ان کا ضرر اُن کافروں سے بھی زیادہ سخت تھا جو ظاہر ظہور کافر تھے، کیوں کہ مومن ظاہری کافر سے بچتا تھا اور منافق سے ملتا جلتا تھا، یہ گمان کر کے کہ وہ مومن ہے اور اپنا بھید اس سے ظاہر کرتا تھا۔ اور اس تقدیم سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے لیے کافروں سے بڑھ کر سخت عذاب ہے اور وہ اُن سے زیادہ اس چیز کے مستحق ہیں جن کا ان کو وعدہ دیا ہے۔ پھر ان دونوں فرقوں کا یہ وصف بیان فرمایا: ﴿ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ﴾ یعنی کون سے منافق و مشرک؟ وہ جو اللہ کے ساتھ برا گمان رکھنے والے ہیں، وہ گمان یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ مغلوب ہوں گے اور کفر کا اسلام پر بول بالا ہوگا۔

ان کی بدگمانی والی باتوں میں سے وہ بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان سے اس آیت میں نقل فرمائی ہے: ﴿ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰۤى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا ﴾ [الفتح: ١٢] "(نہیں) بلکہ تم نے تو یہ گمان کر رکھا تھا کہ پیغمبر اور مسلمانوں کا اپنے گھروں کی طرف لوٹ آنا قطعاً ناممکن ہے۔" "سوء"، موصوف محذوف کی صفت ہے: "أَيْ: ظَنَّ الْأَمْرِ السَّوْءِ" یعنی گمان برے امر کا۔

﴿ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ﴾ یہ ان پر وقوعِ سوء کی خبر دی ہے۔ یعنی جس شے کا وہ مومنوں کے ساتھ ظن اور انتظار کرتے ہیں، وہ انھیں پر چکر کھانے والی ہے، انہیں پر نازل ہونے والی ہے یا یہ ان پر بددعا ہے، یعنی وہ تو مومنوں کے لیے مصیبت کے پھیر کا خیال کرتے ہیں، اللہ پاک نے ان پر بددعا کی کہ یہ مصیبت کا چکر انہیں پر ہو۔ ﴿ دَآئِرَةُ ﴾ مصدر ہے بروزن فاعل، جیسے: "عافية وعاقبة". یا اسم فاعل کا صیغہ ہے "دَارَ يَدُوْرُ" سے۔ "دائرة" عاقبۃ الزمان کا نام رکھا، یعنی زمانے کے حادثے کو دائرہ بولتے ہیں۔

﴿ دَآئِرَةُ ﴾ اصل میں اس خط سے عبارت ہے جو مرکز کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ پھر اس کا اس حادثے پر

استعمال کیا گیا جو محیط ہو اس شخص کو جس پر وہ واقع ہو۔ ''مکر'' اس کا استعمال اکثر مکروہ میں ہوتا ہے۔ جمہور نے ''سَوْء'' بہ فتحِ سین پڑھا ہے اور امام ابوعمرو اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے بہ ضمِ سین پڑھا ہے، یہ دونوں دو لغت ہیں۔[1] کرخی رحمہ اللہ نے کہا کہ مضموم تو بہ معنی عذاب و ہزیمت و شر ہے اور مفتوح بہ معنی ذم جیسا کہ تقریر میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ تفسیر بیضاوی میں ہے کہ فتح و ذم دو لغت ہیں سوائے اس بات کے کہ مفتوح غالب ہے اس میں کہ اس کی طرف اس شے کی اضافت کی جاتی ہے جس کی مذمت کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ اور مفہوم جاری مجری شر کا ہے اور دونوں اصل میں مصدر ہیں۔[2] امام خلیل اور سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''سوء'' اس جگہ فساد ہے۔[3] اضافت ﴿دَآئِرَةُ السَّوْءِ﴾ میں عام کی خاص کی طرف اضافت کے باب سے ہے تو یہ بیانی ہوگی، جیسے کہ ''خَاتَمُ فِضَّةٍ'' میں ہے۔

جب اللہ پاک نے یہ بیان کیا کہ ﴿دَآئِرَةُ السَّوْءِ﴾ دنیا میں انہیں پر ہے تو اس کے ساتھ اس غضب و لعنت و عذابِ جہنم کا بیان فرمایا جس کے وہ مستحق ہیں۔ چنانچہ ارشاد کیا: ﴿وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا﴾۔ ﴿وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا﴾ یعنی اللہ کے لیے فرشتے، انسان، جن، شیاطین، صیحہ، رجفہ، حجارۃ، زلزال، خسف، غرق اور اس طرح کی اور اشیاء۔ یہ اللہ پاک کے لشکر ہیں جس کے ساتھ چاہتا ہے اس کے ساتھ جس کو چاہتا ہے عذاب کرتا ہے۔

اس آیت کی تکرار یا تو تاکید کے لیے ہے یا پہلے اس بنا پر مذکور ہوئی کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ پاک اپنی حکمت کے تقاضے کے طور پر مخلوقات کے کام کی تدبیر کرنے والا ہے، چنانچہ اسی لیے ﴿عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ سے اس کی تذلیل کی اور اس جگہ اس سے مراد اُن کو دھمکی دینا ہے کہ وہ منتقم کی قدرت کے قبضے میں ہیں۔ اسی لیے ﴿عَزِيْزًا حَكِيْمًا﴾ سے اس کی تذلیل فرمائی، (اس کے ذیل میں ذکر کیا) تو اب کچھ تکرار نہیں ہے۔ کسی نے یوں کہا ہے کہ جنود دو قسم کے ہیں: جنودِ رحمت اور جنودِ عذاب۔ چنانچہ یہاں پر ثانی ہے اور اسی عزت کا وصف ذکر کیا ہے جو غلبے پر دال ہے۔

کسی نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے کہ جب آسمانوں اور زمین کے لشکروں میں رحمت کے لشکر اور عذاب کے لشکر ہیں اور اللہ پاک نے مومنوں کی کمزوری جانی تو مناسب ہوا کہ پہلی آیت کو ﴿عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ پر ختم کیا جائے اور جب کافر اور منافق کے عذاب میں اور اس کی شدت میں مبالغہ کیا تو مناسب ہوا کہ دوسری آیت کو ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا﴾ پر ختم کیا جائے، چنانچہ یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ﴾ [الزمر: ٣٧] ''کیا اللہ تعالیٰ غالب اور بدلہ لینے والا نہیں ہے۔'' نیز قولہ تعالیٰ: ﴿فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ [القمر: ٤٢] ''ہم نے انھیں بڑے غالب قوی پکڑنے والے کی طرح پکڑ لیا۔''

مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک غالب ہے اس کا عذاب رد نہیں کیا جاتا، وہ حکمت والا ہے اس شے میں جس کی

[1] تفسير القرطبي (٢٦٥/١٦) [2] تفسير البيضاوي (٢٠١/٥) [3] تفسير القرطبي (٢٦٥/١٦)

تدبیر کی، یعنی وہ ہمیشہ ان صفتوں کے ساتھ متصف ہے۔ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ پر یہ احسان رکھا کہ اس نے ان کو رسالت کا شرف بخشا اور ساری مخلوق کی طرف مبعوث کیا اور اپنی اُمت کے اعمال پر گواہ بنایا، چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٨﴾ لِّتُؤْمِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٩﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ ٱللَّهَ يَدُ ٱللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ۚ فَمَن نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِۦ ۖ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَٰهَدَ عَلَيْهُ ٱللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١٠﴾

(اے نبی!) بلاشبہ ہم نے آپ کو گواہی دینے والا، اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے⑧ تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور تم اس کی مدد کرو اور اس کا ادب کرو اور تم صبح اور شام اس (اللہ) کی پاکی بیان کرو⑨ بلاشبہ جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں، وہ تو بس اللہ سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے، پھر جس نے عہد شکنی کی تو بس وہ اپنی ہی ذات کے خلاف عہد شکنی کرے گا، اور جس نے (وہ) عہد پورا کیا جو اس نے اللہ سے باندھا تھا، تو عن قریب وہ اسے بہت بڑا اجر دے گا⑩

صفاتِ رسول ﷺ:

بیعت کا مطلب ہاتھ ملاتے تھے قول پکا کرتے وقت۔ پہلے مسلمانی کا قول ہوتا تھا، پھر جس بات کا تقید منظور ہوا۔ اس کا قول لڑائیوں میں یہ ہوتا تھا کہ مرتے دم تک نہ بھاگیں گے۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی اکرم ﷺ سے فرماتا ہے: ﴿ إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴾ یعنی ہم نے تجھ کو مخلوق پر گواہی دینے والا بھیجا اور مومنوں کو بشارت دینے والا اور کافروں کو ڈرانے والا۔ اس کی تفسیر سورۃ الاحزاب میں گزر چکی ہے،[2] تاکہ تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ ﴿ وَتُعَزِّرُوهُ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا: "تُعَظِّمُوْهُ"[3] یعنی اور اس کی تعظیم کرو۔ ﴿ وَتُوَقِّرُوهُ ﴾ توقیر سے ماخوذ ہے۔ توقیر احترام، اجلال اور اعظام کو کہتے ہیں، یعنی اور اس کی توقیر اور بزرگی کرو۔ ﴿ وَتُسَبِّحُوهُ ﴾ یعنی اور تسبیح کرو اللہ کی، پاکی بولو، دن کے شروع میں اور آخر میں۔

---

① فتح البیان (۱۳/۸۹-۹۲) ② رقم الآیة (٤٥) ③ تفسیر الطبري (۲۲/۲۰۷)

ذکر بیعتِ رضوان کا:

پھر اللہ عزوجل نے اپنے رسول ﷺ کی تشریف، تعظیم اور تکریم کے لیے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ﴾، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾ [النساء: ۸۰] ''اس رسول (ﷺ) کی جو اطاعت کرے، اسی نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی۔'' یعنی رسول سے بیعت کرنا بعینہٖ اللہ سے بیعت کرنا ہے، جیسے: رسول کی اطاعت بعینہٖ اس کی اطاعت ہے۔

﴿ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ وہ ان کے ساتھ حاضر ہے، ان کی باتیں سنتا ہے اور ان کے مکان کو دیکھتا ہے اور اُن کے دلوں کی باتوں کو اور ظاہر کے کاموں کو جانتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے اللہ تعالیٰ ہی سے بیعت کی جاتی ہے، جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ [التوبة: ۱۱۱] ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔ وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، اس پر سچا وعدہ کیا گیا ہے تورات میں اور انجیل میں اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو کون پورا کرنے والا ہے تو تم لوگ اپنی اس بیع پر جس کا تم نے معاملہ ٹھہرایا ہے خوشی مناؤ اور یہ بڑی کامیابی ہے۔''

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے اللہ کی راہ میں اپنی تلوار ننگی کی تو مقرر اس نے اللہ سے بیعت کی۔[1] اور عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حجرِ اسود کے بارے میں فرمایا ہے: قسم ہے اللہ کی! البتہ اللہ عزوجل اس کو قیامت کے دن مبعوث کرے گا، اس کی دو آنکھیں ہوں گی جن سے دیکھے گا اور ایک زبان جس سے بولے گا اور گواہی دے گا اس پر جس نے حق کے ساتھ اس کا بوسہ لیا ہے۔ چنانچہ جس نے اس کا بوسہ لیا تو یقیناً اس نے اللہ تعالیٰ سے بیعت کی، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ﴾[2] اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ﴾ یعنی بیعت توڑنے والے کا وبال توڑنے والے ہی پر عائد ہوگا اور اللہ اس سے بے نیاز ہے۔

---

① تفسير ابن كثير (٢٣٤/٤) اس کی سند میں ''فضل بن یحییٰ'' مجہول راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٥٦٣١)

② سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٦١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٠٩٨) سنن ترمذی میں آیت کے ذکر کے بغیر روایت مروی ہے، البتہ تفسیر ابن کثیر (۲۳۴/۴) میں ابن ابی حاتم رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے آیت کے ذکر کے ساتھ روایت مروی ہے۔

﴿ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ یعنی اور جس نے وہ قول پورا کیا جس پر اللہ سے عہد کیا تھا تو وہ اس کو ثوابِ کثیر دے گا۔ یہ بیعت بیعۃ الرضوان ہے، حدیبیہ میں ببول کے درخت کے نیچے ہوئی تھی۔ جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے اس دن بیعت کی تھی، کہا ہے کہ تیرہ سو تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ چودہ سو تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ پندرہ سو تھے۔ درمیان والا قول زیادہ صحیح ہے۔

بیعت الرضوان میں شریک صحابہ کی تعداد کے بارے میں وارد احادیث:

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم حدیبیہ کے دن ایک ہزار چار سو تھے۔[1] (رواہ مسلم من حديث سفيان بن عيينة به) نیز صحیحین میں روایت اعمش عن سالم بن ابی الجعد عن جابر رضی اللہ عنہ مروی ہے، کہا: اس دن ہم ایک ہزار چار سو تھے اور آپ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک اس پانی میں رکھا تو آپ ﷺ کی مبارک انگلیوں کے درمیان سے پانی ابلنے لگا، یہاں تک کہ سب کے سب سیراب ہو گئے۔[2]

یہ حدیث مختصر ہے ایک اور سیاق سے جبکہ صحابہ کی پیاس کا قصہ ذکر کیا ہے جو حدیبیہ کے دن ہوئی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے ترکش سے ایک تیران کو دیا تھا جس کو انھوں نے حدیبیہ کے کنوئیں میں رکھا تو اس نے پانی سے جوش مارا، یہاں تک کہ وہ کنواں ان کو کافی ہوا، پھر سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: تم اس دن کتنے تھے؟ فرمایا کہ ہم ایک ہزار چار سو تھے اور اگر ہم ایک لاکھ ہوتے تو بھی وہ ہم کو کافی ہوتا۔ صحیحین کی ایک روایت میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے یوں مروی ہے کہ وہ "خَمْسَ عَشْرَةَ مِائَةٍ"[3] تھے، یعنی پندرہ سو۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ میں نے سعید بن مسیّب رحمہ اللہ سے کہا کہ جو لوگ بیعۃ الرضوان میں حاضر ہوئے وہ کتنے تھے؟ کہا: "خَمْسَ عَشْرَةَ مِائَةً". میں نے کہا کہ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے تو کہا ہے کہ "أَرْبَعَ عَشَرَ مِائَةً" تھے۔ سعید رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ جابر پر رحم کرے، انھوں نے وہم کیا، خود انھوں نے ہی مجھ سے حدیث بیان کی کہ وہ "خَمْسَ عَشْرَةَ مِائَةً" تھے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ روایت اس بات پر دال ہے کہ وہ قدیم میں "خَمْسَ عَشْرَةَ مِائَةً" کہتے تھے (مطلب یہ ہے کہ محاورے میں اگر پندرہ سو کہنا ہوتو "ألف و خمس مائة" اور چودہ سو کہنا ہوتو "ألف و أربع مائة" کہیں گے) پھر وہم کا ذکر کیا تو کہا: "أَرْبَعَ عَشْرَةَ مِائَةً"[4] یعنی چودہ سو۔

---

1. صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٥٦)
2. صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٥٦)
3. صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٥٦)
4. صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٢٢) دلائل النبوة للبيهقي (٩٧/٤)

امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ایک ہزار پانچ سو پچیس تھے۔[1] اور مشہور قول جو اُن سے کئی ایک نے روایت کیا ہے، وہ چودہ سو کا ہے اور یہ وہی قول ہے جس کو بیہقی رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود عن قتادہ عن سعید بن المسیب عن ابیہ روایت کیا ہے کہ ہم درخت کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ہزار چار سو تھے[2] اور اسی طرح سیدنا سلمہ بن اکوع، معقل بن یسار اور براء بن عازب رضی اللہ عنہم کی روایت میں بھی یہی ہے اور اصحابِ مغازی وسیر میں سے کئی ایک اسی کے قائل ہیں۔

صحیحین میں شعبہ کی روایت سے عن عمرو بن مرہ روایت کیا ہے کہ کہا: میں نے عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہما کو سنا، وہ کہتے تھے کہ اصحابِ شجرہ ایک ہزار چار سو تھے اور اس دن قبیلۂ اسلم مہاجرین کا آٹھواں حصہ تھا[3] (حاشیہ ابن کثیر رحمہ اللہ مطبوعہ مصر پر مصحح نے لکھا ہے: "قوله عن عروة بن مرة في نسخة عمرو بن مرة و حرر" انتہیٰ) محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے سیرت میں عن زہری عن عروۃ ابن الزبیر عن المسور بن مخرمہ و مروان بن الحکم روایت کیا ہے، ان دونوں نے عروہ کو حدیث کی کہ حدیبیہ کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کی زیارت کے ارادے سے نکلے، ان کا لڑنے کا ارادہ نہ تھا اور اپنے ساتھ قربانی کے ستر بُدنے (اونٹ) ہانک کر لے گئے اور لوگ نو سو مرد تھے۔ ہر بدنہ دس مردوں کے لیے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے جو بات مجھے پہنچی ہے، اس میں یہ ہے: وہ کہتے تھے کہ ہم حدیبیہ والے چودہ سو تھے۔[4] امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے، یہ بات اُن کے اوہام سے شمار کی گئی ہے، اس لیے کہ صحیحین میں جو محفوظ ہے وہ یہ ہے کہ "بِضْعَ عَشَرَةَ مِائَةً" تھے، یعنی دس سو سے کچھ اوپر، جیسا کہ آیندہ ان شاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔

اس بیعتِ عظیمہ کے سبب کا ذکر:

امام محمد بن اسحاق بن یسار رحمہ اللہ نے سیرت میں کہا ہے: پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو بلایا، تاکہ مکے کی طرف اُن کو بھیجیں اور جس کام کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم آئے ہیں، وہ کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اشرافِ قریش کو پہنچا دیں، چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! مجھے قریش سے اپنی جان کا ڈر ہے اور بنی عدی بن کعب میں سے مکے میں کوئی وہ شخص نہیں ہے جو مجھے منع کرے، یعنی اگر قریش میرے ساتھ برا ارادہ کریں تو مجھے ان سے بچا لے۔ میری جو عداوت قریش سے ہے اور اُن پر میری جو درشتی ہے، وہ اس کو خوب پہچان چکے ہیں۔ لیکن میں آپ کو ایک ایسا شخص بتاتا ہوں جو اس میں مجھ سے بڑھ کر عزت والا ہے، یعنی سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ابوسفیان اور اشرافِ قریش کی طرف بھیجا کہ ان کو جا کر بتائیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لڑائی کے لیے نہیں آئے اور صرف اس گھر کی زیارت کے لیے اور اس کی تعظیم کرتے ہوئے آئے ہیں۔

---

(1) تفسیر ابن کثیر (٢٣٥/٤) (2) دلائل النبوة (٩٨/٤)
(3) صحيح البخاري (٣٩٢٤) صحيح مسلم (١٨٥٧) (4) السيرة النبوة لابن هشام (٢٧٥/٤)

پھر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ مکے کی طرف نکلے تو ابان بن سعید بن العاص ان سے ملا، جب وہ مکے میں داخل ہوئے یا مکے میں داخل ہونے سے پہلے۔ چنانچہ ابان نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے آگے سوار کر لیا اور ان کو پناہ دی، یہاں تک کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا، پھر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ چلے، یہاں تک کہ ابوسفیان اور قریش کے سرداروں کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ان کو پہنچایا، چنانچہ جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام دے کر فارغ ہو گئے تو قریش نے ان سے کہا کہ اگر تو بیت اللہ کا طواف کرنا چاہتا ہے تو کر لے۔ انھوں نے کہا کہ میں ایسا نہیں ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر اس کا طواف کروں، چنانچہ قریش نے اُن کو اپنے پاس روکے رکھا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو یہ خبر پہنچی کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ تو مار ڈالے گئے۔

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے مجھ سے حدیث کی کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ مار ڈالے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم یہاں سے نہیں جائیں گے، جب تک کہ قوم سے مبارزہ نہ کریں، یعنی لڑائی نہ کر لیں، چنانچہ آپ نے لوگوں کو بیعت کے لیے بلایا تو بیعت الرضوان اس درخت کے نیچے ہوئی۔ چنانچہ لوگ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موت پر اُن سے بیعت کی، یعنی اس بات پر کہ یہاں سے نہ بھاگیں گے، یہاں تک کہ اپنے دشمنوں پر فتح یاب ہوں یا مارے جائیں نہ یہ کہ فی نفسہٖ موت مقصود ہے۔[1] (كذا في مجمع البحار)

اور سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے موت پر ان سے بیعت نہیں کی، لیکن ہم سے اس بات پر بیعت کی کہ نہیں بھاگیں گے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے بیعت کی اور جو مسلمان اس میں حاضر تھے، ان میں سے کوئی پیچھے نہ رہا، مگر جد بن قیس برادر بنی سلمہ۔ چنانچہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے تھے: واللہ! البتہ گویا میں ابھی اس کی طرف دیکھ رہا ہوں کہ اپنی اونٹنی کی بغل سے چپک رہا ہے، اس کی طرف جھک گیا ہے، اس کے ساتھ لوگوں سے چھپ رہا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ خبر آئی کہ جو اطلاع عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں آئی ہے، وہ باطل ہے۔[2]

امام ابن لہیعہ رحمہ اللہ نے عن ابی الاسود عن عروۃ بن زبیر رحمہ اللہ لگ بھگ اسی سیاق کے ذکر کیا ہے اور اپنے سیاق میں یہ بڑھایا ہے کہ قریش نے سہیل بن عمرو، حویطب بن عبدالعزیٰ اور مکرز بن حفص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھیجا، اس حال میں کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ انھیں کے پاس تھے، چنانچہ اس دوران میں کہ یہ لوگ مسلمانوں کے پاس تھے کہ اچانک بعض مسلمانوں اور بعض کافروں میں کچھ بات ہو گئی اور آپس میں تیر اور پتھر چلنے لگے اور دونوں فریق چلا اٹھے اور فریقین میں سے ہر فریق نے جس کے پاس جو قاصد تھے ان کو رہن رکھ لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے یہ

---

(1) مجمع بحار الأنوار (٢٤٣/١)

(2) السيرة النبوة لابن هشام (٢٨٢/٤_٢٨٣) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے، البتہ یہ واقعہ دیگر صحیح اسانید سے مروی ہے۔

آواز دی کہ خبردار! بے شک روح القدس واقعی رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا اور بیعت کا حکم دیا، چنانچہ تم اللہ تعالیٰ کے نام پر نکلو اور بیعت کرو۔ مسلمان رسول اللہ ﷺ کی طرف چلے اور آپ ﷺ اس درخت کے نیچے تھے اور آپ ﷺ سے بیعت کی اس بات پر کہ کبھی نہ بھاگیں گے۔ چنانچہ اس بات نے مشرکوں کو مرعوب کر دیا اور جو مسلمان ان کے پاس تھے، ان کو چھوڑ دیا اور آپس میں معاہدہ اور صلح کی طرف بلایا۔[1]

حافظ ابوبکر بیہقی رحمہ اللہ نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو بیعت الرضوان کا حکم کیا گیا تو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ مکے والوں کی طرف آپ ﷺ کے پیام بر تھے، آپ ﷺ نے لوگوں سے بیعت کی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! بے شک عثمان اللہ تعالیٰ کی حاجت میں ہے اور اس کے رسول کی حاجت میں، پھر آپ ﷺ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مارا، چنانچہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے رسول اللہ ﷺ کا دست مبارک لوگوں کے اپنی جانوں کے واسطے اپنے ہاتھوں سے بہتر تھا۔[2]

امام ابن ہشام رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے بیعت کی اور اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر مارا۔ عبدالملک بن ہشام نے شعبی رحمہ اللہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے کہ جس نے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ سے بیعتِ رضوان کی، وہ ابو سنان اسدی رضی اللہ عنہ ہیں۔[3] ابوبکر عبداللہ بن الزبیر حمیدی رحمہ اللہ کے الفاظ شعبی رحمہ اللہ سے مروی یہ ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو بیعت کی طرف بلایا تو جو سب سے پہلے آپ ﷺ کے پاس پہنچے، وہ ابو سنان اسدی رضی اللہ عنہ تھے اور کہا: آپ اپنا ہاتھ پھیلائیں کہ میں آپ سے بیعت کروں تو آپ ﷺ نے فرمایا: «عَلَامَ تُبَايِعُنِي» یعنی تو کس شے پر مجھ سے بیعت کرتا ہے؟ ابو سنان رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اس شے پر جو آپ کے دل میں ہے۔[4] یہ شخص ابو سنان وہب اسدی رضی اللہ عنہ ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے نافع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ لوگ باتیں کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے ایمان لائے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، لیکن حدیبیہ والے دن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ رضی اللہ عنہ کو اپنے ایک گھوڑے کی طرف بھیجا جو انصار میں سے کسی شخص کے پاس تھا کہ اس کو لے آئیں، تاکہ اس پر لڑیں اور رسول اللہ ﷺ اس درخت کے پاس بیعت لے رہے تھے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس سے بے خبر تھے سو عبداللہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے بیعت کر لی، پھر گھوڑے کی طرف گئے اور اس کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لے آئے اور عمر رضی اللہ عنہ لڑائی کے لیے زرہ پہن رہے تھے، یا ہتھیار لگا رہے تھے۔ چنانچہ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ان کو خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ تو اس درخت کے نیچے بیعت لے رہے

---

[1] دلائل النبوة للبيهقي (٤/١٣٣۔١٣٤) یہ روایت مرسل ہے۔
[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٠٢) اس کی سند میں ''حکم بن عبدالملک'' ضعیف راوی ہے۔
[3] السيرة النبوة لابن هشام (٤/٢٨٣) [4] دلائل النبوة للبيهقي (٤/١٣٧)

ہیں تو وہ چلے اور عبداللہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ گئے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی۔ یہ وہی قصہ ہے جو لوگ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے اسلام لائے۔[1]

پھر بخاری رحمہ اللہ نے عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما (بخاری رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے: "وقال هشام بن عمار: حدثنا الوليد بن مسلم، حدثنا عمروبن محمد العمري، أخبرني نافع عن ابن عمر رضي الله عنهما... الخ") روایت کیا ہے کہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، درختوں کے سائے میں متفق ہو گئے تھے، اچانک دیکھا کہ لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گھیر رہے ہیں تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بولے: اے عبداللہ! تو جا کر دیکھ کہ لوگوں کا کیا حال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھیر لیا ہے؟ چنانچہ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ان کو پایا کہ بیعت کر رہے ہیں تو انھوں نے بیعت کر لی، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف لوٹ کر آئے تو وہ نکلے اور پھر بیعت کی۔[2] (وقد أسنده البيهقي عن أبي عمرو الأديب عن أبي بكر الإسماعيلي عن الحسن بن سفيان عن دحيم حدثني الوليد بن مسلم فذكره)

اور لیث نے عن ابی الزبیر عن جابر رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، کہا: ہم حدیبیہ کے دن ایک ہزار چار سو تھے، چنانچہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ آپ کا دستِ مبارک پکڑنے والے تھے، اس درخت کے نیچے اور وہ سمرہ ہے، یعنی ببول ("هي شجرة كانت عندها بيعة الرضوان بضم ميم شجر الطلح"[3] (كذا في مجمع البحار) مادہ طلح میں یوں کہا ہے: "وهو لغة" یعنی "طلحة واحدة الطلح شجر عظام من شجرة العضاة له نور طيب الرائحة"[4] اور عضہ کے مادے میں یوں کہا ہے: "العضاة شجر أم غيلان وكل شجر عظيم له شوك جمع عضة بالتاء وأصله عضهة وقيل: جمع عضاهة". اس سے تیسری سطر میں کہا ہے: "العضاه بالهاء كل شجر عظيم له شوك وهو على ضربين خالص كالطلح والسلم والسلاء يعني شوك النخل و غير خالص كالنبع و الشوحط و لا الشرى و ما صغر من شجرة الشوك فهو الغصن،[5] والشرى الحنظل أو ورقة، قولان جمع شرية وأما الشريان بالكسر والفتح فشجر يعمل منه القسي،[6] وسلم هو شجر العضاه واحدها سلمة بفتح و ورقها القرظ يدبغ به ويجمع على سلمات" یہ سب تو "مجمع البحار" کے مختلف مقامات سے تھا۔[7] "مختار الصحاح" میں ہے: "سمرة بضم الميم من شجر الطلح والجمع سمر مثل رجل و سمرات،[8] والطلح بوزن الطلع شجر عظام من شجر العضاه الواحدة طلحة والطلح أيضا لغة في

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٥٠) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٥١)

[3] مجمع بحار الأنوار (١١٥/٣) [4] مجمع بحار الأنوار (٤٥٢/٣) [5] مجمع بحار الأنوار (٦١٥/٣، ٦١٦)

[6] مجمع بحار الأنوار (٢١٥/٣) [7] مجمع بحار الأنوار (١٠٨/٣) [8] مختار الصحاح (١٣١/١)

الطلع،[1] والعضاة كل شجر يعظم وله شوك واحدها عضاهة، وعضهة وعضة بحذف الهاء الأصلية"۔[2] ان سب نقول میں غور فرما کر سمجھ لیجیے، اساتذہ سے "سمرہ" بہ معنی ببول سنا ہے۔ والسلام) اور کہا: ہم نے آپ ﷺ سے بیعت کی اور اس بات پر کہ نہ بھاگیں اور موت پر بیعت نہیں کی۔[3] (رواه مسلم عن قتيبة عنه)

امام مسلم رحمہ اللہ نے سیدنا معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: البتہ مقرر میں نے اپنے آپ کو دیکھا شجرہ کے دن اور نبی کریم ﷺ لوگوں سے بیعت کر رہے تھے اور میں اس درخت کی ٹہنیوں میں سے ایک ٹہنی آپ ﷺ کے سر مبارک سے اٹھائے ہوئے تھا اور ہم چودہ سو تھے۔ اور ہم نے آپ ﷺ سے موت پر بیعت نہیں کی، لیکن ہم نے اس بات پر بیعت کی کہ نہیں بھاگیں گے۔[4]

امام بخاری رحمہ اللہ نے سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس درخت کے نیچے بیعت کی۔ یزید راوی نے کہا ہے کہ میں نے کہا: اے ابومسلم! تم اس دن کس شے پر بیعت کرتے تھے؟ کہا: موت پر۔[5] بخاری رحمہ اللہ نے ان سے دوسری روایت ان الفاظ سے کی ہے کہ حدیبیہ کے دن رسول اللہ ﷺ سے میں نے بیعت کی، پھر میں کنارے ہو گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اور سلمہ کیا تو بیعت نہیں کرتا؟ میں نے عرض کی کہ میں تو بیعت کر چکا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: آگے آ پھر بیعت کر تو میں قریب ہوا، پھر میں نے آپ ﷺ سے بیعت کی۔ یزید کہتے ہیں: میں نے کہا: سلمہ! تم نے آپ ﷺ سے کس شے پر بیعت کی؟ کہا: موت پر۔[6] (وأخرجه مسلم من وجه آخر عن يزيد بن أبي عبيد)

اسی طرح بخاری رحمہ اللہ نے عباد بن تمیم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، انھوں نے آپ ﷺ سے موت پر بیعت کی۔[7] امام بیہقی رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: ہم حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ آئے اور ہم چودہ سو تھے اور اس پر پچاس بکریاں تھیں، اس کنوئیں میں اتنا پانی نہیں تھا کہ وہ ان کو سیراب کرتا۔ یعنی اُس میں پانی بہت کم تھا۔ "فَقَعَدَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَلَى جَبَاهَا" ("جبا بالقصر والمد ماحول البئر والركي البئر الغير المطوي") یعنی "الركي" یعنی اس کنوئیں کے گرد جو شے منڈیر وغیرہ تھی، اس پر آپ ﷺ بیٹھ گئے۔ پھر یا تو آپ ﷺ نے دعا فرمائی یا اس میں تھوک دیا تو وہ جوش مارنے لگا۔ چنانچہ ہم نے جانوروں کو پانی پلایا اور پانی بھر لیا۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے اس درخت کے نیچے بیٹھ کر لوگوں کو بیعت کی طرف بلایا تو سب لوگوں سے پہلے میں نے آپ ﷺ سے بیعت کی اور لوگوں نے یکے بعد دیگرے بیعت کی، یہاں تک کہ جب آپ ﷺ لوگوں کے

---

[1] مختار الصحاح (١٦٦/١) [2] مختار الصحاح (١٨٤/١) [3] صحيح مسلم (١٨٥٦)
[4] صحيح مسلم (١٨٥٨) [5] صحيح البخاري (٢٨٠٠) [6] صحيح البخاري (٢٨٠٠، ٦٧٨٢)
[7] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٩٩)

درمیان میں ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اوسلمہ! تو مجھ سے بیعت کر۔ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں تو شروع کے لوگوں میں آپ سے بیعت کر چکا ہوں (اول یوں ہے: "فبايعته أولى الناس" اور یہاں "في أول الناس" ہے۔ غرض یہ ہے کہ جب سب سے اول بیعت کی تو اولیٰ زمرے میں ہوئی یا "فبايعته أول الناس" بمعنی "في أول الناس" ہے۔ والله أعلم) اور بھی کہا اور آپ ﷺ نے مجھے بغیر ہتھیار کے دیکھا تو مجھے حجفہ دیا یا درقہ عطا فرمایا (دونوں کے معنی سپر ہیں، یعنی ڈھال)

پھر آپ ﷺ نے بیعت کی، یعنی لوگوں سے، یہاں تک کہ جب آپ ﷺ آخر لوگوں میں ہوئے تو فرمایا او سلمہ! کیا تو بیعت نہیں کرتا؟ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں تو شروع اور درمیان والے لوگوں میں آپ سے بیعت کر چکا، فرمایا اور بھی، پھر میں نے تیسری بار آپ سے بیعت کی۔ پھر فرمایا: اے سلمہ! تیرا حجفہ یا تیرا درقہ، جو میں نے تجھے عطا کیا تھا، وہ کہاں ہے؟ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! عامر مجھے بغیر ہتھیار کے ملا تو وہ میں نے اسے دے دیا، چنانچہ آپ ﷺ ہنسے اور فرمایا: «إِنَّكَ كَالَّذِي قَالَ الْأَوَّلُ، اَللّٰهُمَّ أَبْغِنِي حَبِيبًا هُوَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ نَفْسِي» یعنی الٰہی! تو مجھے ایسا دوست عطا کر جو مجھے اپنے نفس سے بھی زیادہ محبوب ہو۔ پھر مکے کے مشرکوں نے صلح کے بارے میں ہم سے مراسلت (پیغام رسانی) کی، یہاں تک کہ بعض ہمارے بعض میں چلے، پھر ہم نے صلح کر لی۔ کہا: میں طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کا خادم تھا۔ "أَسْقِي فَرَسَهُ وَأَحُسُّهُ وَآكُلُ مِنْ طَعَامِهِ" (والله أعلم۔ اصل میں اسی طرح ہے، لیکن صحیح "أحسه" کی تصحیف یعنی کتابت کی غلطی ہے۔ "حس" بہ معنی خاریدن "ستور بشانه"، یعنی "محسه" بہ معنی شانۂ ستور خار ہے) یعنی ان کے گھوڑے کو پانی پلاتا تھا اور اُن کے کھانے میں سے کھاتا تھا اور اللہ اور رسول کی طرف مہاجر ہو کر اپنے گھر والوں کو اور مال کو چھوڑ آیا تھا۔

پھر ہم نے اور مکے والوں نے آپس میں صلح کر لی اور بعض ہمارا بعض میں خلط ملط ہو گیا تو میں ایک درخت کے پاس آیا، پھر اس کے کانٹے جھاڑے، یعنی علاحدہ کر دیے، پھر اس کی جڑ میں اس کے سائے میں لیٹ گیا تو اہلِ مکہ کے مشرکوں میں سے چار آدمی میرے پاس آئے اور وہ رسول اللہ ﷺ کی برائی کرنے لگے تو میں نے ان کو مبغوض جانا، یعنی ناپسند کیا اور ایک اور درخت کی طرف اٹھ کر چلا گیا، پھر انھوں نے اپنے ہتھیار لٹکا دیے، لیٹ رہے، پس اس اثنا میں کہ وہ اسی طرح تھے کہ ایک پکارنے والے نے آواز لگائی: "يَا آلَ الْمُهَاجِرِينَ" ابن زنیم مارا گیا (اصل میں اسی طرح ہے، کلمۂ استغاثہ ہے تو "يا للمهاجرين" چاہیے۔ والله أعلم) تو میں نے اپنی تلوار سونتی اور اُن چاروں پر حملہ کیا اور وہ سوتے تھے، چنانچہ میں نے ان کے ہتھیار لیے اور اپنے ہاتھ میں ان کا گٹھا کر کے رکھا، پھر میں نے کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے محمد ﷺ کے چہرے کی تکریم کی! تم میں سے اگر کسی نے اپنا سر اٹھایا تو میں اس شے کو ماروں گا جس میں اس کی دونوں آنکھیں ہیں، پھر میں ان کو ہانکتا ہوا رسول اللہ ﷺ کے پاس لایا اور

میرا چچا عامر عبلات کے ایک شخص کو لایا جس کو مکرز کہتے تھے (عبلات بہ فتح عین و ہائے موحدہ قریش میں امیہ صغریٰ کا نام ہے۔ اُمیہ اور اس کے دو بھائی نوفل اور عبداللہ بن عبد شمس تھے، یہ منسوب ہیں، اپنی ماں کی طرف جس کا نام عبلہ ہے، ان کی طرف نسبت عبلی بہ سکون ہوتی ہے۔[1] كذا في المجمع) یہ مشرکوں میں سے تھا، یہاں تک کہ ہم ان کو لے کر کھڑے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پاس، یہ مشرکوں کے ستر آدمی تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ ان کو چھوڑ دو، ''وَيَكُنْ لَهُمْ بَدْءُ الْفُجُوْرِ وَثَنَاهُ'' (یعنی بدعہدی کا اول و آخر انھیں کے لیے ہو)

پھر آپ ﷺ نے ان سے عفو فرمایا اور اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا﴾ [الفتح: ٢٤] ''وہی ہے جس نے خاص مکہ میں کافروں کے ہاتھوں کو تم سے اور تمھارے ہاتھوں کو اُن سے روک لیا، اس کے بعد کہ اس نے تمھیں ان پر غلبہ دے دیا تھا اور تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''[2] (وهكذا رواه مسلم عن إسحاق بن إبراهيم بن راهويه بسنده نحوه أو قريبا منه)

صحیحین میں من حدیث ابی عوانہ عن طارق عن سعید بن المسیب ثابت ہوا ہے، کہا: میرے والد اُن لوگوں میں سے تھے جنھوں نے درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی تھی، کہا: پھر ہم آیندہ سال حج کرنے کے لیے چلے تو اس درخت کی جگہ ہم سے مخفی ہوگئی، اب اگر وہ تمھارے لیے ظاہر کر دیا گیا ہے تو تم زیادہ دانا ہو۔[3] (یہ بات بطورِ طعن کہی یعنی جو لوگ اس بیعت میں حاضر تھے اور آیندہ سال آئے ان کو تو اس درخت کی جگہ نہ ملی اور تم اس بیعت کے وقت نہ تھے اور ایک مدت دراز گزری اور تم اس درخت کی جگہ بتاؤ کہ یہاں تھا یا وہاں تھا تو تم بڑے دانا ہو۔ یعنی تم کو بالکل خبر نہیں۔ صرف اٹکل پچو باتیں بناتے ہو) ابوبکر حمیدی رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: (حدثنا سفيان، حدثنا أبو الزبير عن جابر ... الخ) کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس وقت لوگوں کو بیعت کی طرف بلایا تو ہم نے اپنے میں سے ایک شخص کو دیکھا جس کو جد بن قیس کہتے تھے کہ اپنے اونٹ کی بغل کے نیچے چھپ رہا تھا۔[4] (رواه مسلم من حديث ابن جريج عن ابن الزبير به)

نیز امام ابوبکر حمیدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سفیان نے ہم کو حدیث بیان کی عمرو سے کہ اس نے جابر رضی اللہ عنہ کو سنا کہ انھوں نے کہا ہے کہ حدیبیہ کے دن ہم ایک ہزار چار سو تھے تو رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے فرمایا کہ آج کے دن تم تمام زمین والوں میں سب سے اچھے ہو۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر میں بینائی رکھتا ہوتا تو البتہ اس درخت کی جگہ

---

[1] مجمع بحار الأنوار (٥١٠/٣) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٠٧) دلائل النبوة للبيهقي (١٣٨/٤۔١٤١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٣٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٥٩)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٥٦) مسند الحميدي (٥٣٧/٢)

تم کو دکھا دیتا۔ سفیان نے کہا ہے کہ انھوں نے اس کی جگہ کے بارے میں اختلاف کیا تھا۔① (أخرجاه من حديث سفيان)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان لوگوں میں سے کوئی آگ میں داخل نہ ہوگا، جنھوں نے اس درخت کے نیچے بیعت کی۔② امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنھوں نے اس درخت کے نیچے بیعت کی، وہ سب کے سب جنت میں داخل ہوں گے مگر سرخ اونٹ والا، چنانچہ ہم جلدی جلدی سے چلے اس کی طرف تو دیکھا کہ ایک شخص تھا جس کا اونٹ گم ہوگیا تھا، ہم نے اس سے کہا کہ آکر بیعت کر تو اس نے کہا کہ میں اپنا اونٹ پالوں، یہ میرے لیے بیعت کرنے سے بہتر ہے۔③

عبداللہ بن امام احمد رحمہ اللہ نے عن جابر رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَنْ يَّصْعَدُ الثَّنِيَّةَ ثَنِيَّةَ الْمُرَارِ فَإِنَّهُ يُحَطُّ عَنْهُ مَا حُطَّ عَنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ» (''ثنية المرار'' کی گھاٹی حدیبیہ کے پاس ہے مشہور بضم میم ہے اور بعض نے مکسور کہا ہے۔④ كذا في المجمع) یعنی جو کوئی مرار کی گھاٹی پر چڑھے گا تو حالت یہ ہے کہ بے شک گرائی جائے گی اس سے وہ شے جو بنی اسرائیل سے گرائی گئی (یعنی گناہ اتارے جائیں گے) چنانچہ اُن میں سے سب سے پہلے جو لوگ چڑھے وہ خزرج کا ایک گروہ تھا، پھر اس کے بعد اور لوگوں نے مبادرت کی (جلدی کی)۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « كُلُّكُمْ مَغْفُوْرٌ لَهُ إِلَّا صَاحِبُ الْجَمَلِ الْأَحْمَرِ » یعنی تم سب کی مغفرت کی گئی مگر سرخ اونٹ والا۔ چنانچہ ہم نے کہا تو آ تیرے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغفرت مانگیں تو وہ بولا: واللہ! البتہ مجھے یہ چیز زیادہ بہتر ہے اور پسند ہے کہ میں اپنے گم شدہ کو پالوں بہ نسبت اس کے کہ تمھارا صاحب میرے لیے مغفرت مانگے، چنانچہ پھر وہ ایسا شخص تھا جو گم شدہ کو ڈھونڈتا تھا۔⑤ (رواه مسلم عن عبيد الله به)

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابوالزبیر نے مجھے خبر دی کہ اس نے جابر رضی اللہ عنہ کو سنا کہ وہ کہتے تھے کہ ام مبشر نے مجھے خبر دی کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس فرما رہے تھے کہ ان شاء اللہ اصحاب شجرہ میں سے جنھوں نے اس کے نیچے بیعت کی تھی، ان میں کوئی شخص آگ میں داخل نہ ہوگا۔ سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیوں نہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جھڑکا، چنانچہ وہ بولیں: ﴿ وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ﴾ [مریم: ۷۰] ''تم میں سے ہر ایک وہاں ضرور وارد ہونے والا ہے۔'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے: ﴿ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴾ [مریم: ۷۲] ''پھر ہم پرہیزگاروں کو تو بچا

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٥٦) مسند الحميدي (٥١٤/٢)

② سنن أبي داود (٤٦٥٣) سنن الترمذي (٣٨٦٠) مسند أحمد (٣٥٠/٣) صحيح الجامع (٧٦٨٠)

③ تفسير ابن كثير (٢٣٩،٢٣٨/٤) ④ مجمع بحار الأنوار (٥٦٢/٤) ⑤ صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٨٠)

لیں گے اور نافرمانوں کو اسی میں گھٹنوں کے بل گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔''[1] (رواہ مسلم)

نیز اس میں عن قتیبہ عن اللیث عن ابی الزبیر عن جابر رضی اللہ عنہ یہ ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ کا غلام حاطب کی شکایت کرتا ہوا آیا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! داخل ہوگا حاطب نار میں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو نے جھوٹ کہا، وہ اس میں داخل نہ ہوگا، بے شک وہ واقعی حاضر ہوا ہے بدر اور حدیبیہ میں۔[2] اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف کرتے ہوئے یوں فرمایا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا﴾ جیسا کہ اللہ عزوجل نے دوسری آیت میں فرمایا: ﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا﴾[3] [الفتح: ۱۸] ''یقیناً اللہ تعالیٰ مومنوں سے خوش ہوگیا جبکہ وہ درخت تلے تجھ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے دلوں میں جو تھا اسے اس نے معلوم کرلیا اور ان پر اطمینان نازل فرمایا اور انھیں قریب کی فتح عنایت فرمائی۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ بے شک ہم نے تجھ کو اپنی اُمت پر اس بات کی گواہی دینے والا بھیجا کہ رسالت ان کو پہنچا دے اور فرمانبردار لوگوں کو جنت کی خوش خبری دینے والا اور معصیت والوں کو آگ سے ڈرانے والا۔ ﴿شٰهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا﴾ کا نصب بنا بر حال مقدرہ ہے۔ جمہور نے ﴿لِتُؤْمِنُوْا﴾ بہ تائے فوقیہ پڑھا ہے اور امام ابن کثیر اور ابوعمرو رحمہ اللہ نے بیائے تحتیہ پڑھا ہے۔[4] اول کی بنا پر تو رسول اللہ ﷺ کو اور آپ ﷺ کی امت کو خطاب ہے اور دوسرے کی بنیاد پر اُن لوگوں کی طرف ہے جن کو خوش خبری سنائی گئی اور ڈرائے گئے۔ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِیْلًا﴾ ان تینوں فعلوں کے بارے میں قراء کے درمیان ویسا ہی اختلاف ہے، جیسا کہ ﴿لِتُؤْمِنُوْا﴾ میں تھا۔ ﴿تُعَزِّرُوْهُ﴾ کے معنی ''تَنْصُرُوْهُ وَتُفَخِّمُوْهُ'' ہیں۔ یہ قول امام حسن اور کلبی رحمہ اللہ کا ہے۔ ''تعزیر'' بہ معنی توقیر و تعظیم ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ''تَنْصُرُوْهُ وَتَمْنَعُوْا مِنْهُ'' یعنی رسول کی مدد کرو اور دشمنوں کو اس سے روکو۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے ساتھ ہو کر تلوار سے لڑو۔[5] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مراد جلال ہے۔ ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مارو اس کے آگے تلوار سے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَتُعَزِّرُوْهُ﴾ تو آپ ﷺ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: یہ کیا ہے؟ انھوں نے عرض کی کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں،

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۴۹۶) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۴۹۵) [3] تفسیر ابن کثیر (۲۳۴/٤-۲۳۹)

[4] تفسیر القرطبي (۲٦٦/۱٦) [5] تفسیر الطبري (۲۰۷/۲۲، ۲۰۸) تفسیر القرطبي (۲٦٦/۱٦، ۲٦۷)

فرمایا: تاکہ تم اس کی مدد کرو۔[1] (رواه ابن عدي و ابن مردويه و الخطيب و ابن عساكر في تاريخه)

﴿ تُوَقِّرُوْهُ ﴾ کے معنی "تُعَظِّمُوْهُ" ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: "تُسَوِّدُوْهُ"[2] یعنی اس کو سردار بناؤ۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مراد تعظیم ہے۔[3] کہا ہے کہ دونوں فعلوں میں دونوں ضمیریں نبی کریم ﷺ کی طرف راجع ہیں اور یہاں وقف تام ہے۔ پھر ﴿ وَتُسَبِّحُوْهُ ﴾ سے کلام کی ابتداء ہے، یعنی اللہ عزوجل کی پاکی بیان کرو صبح وشام۔ تسبیح میں دو وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ مراد پاکی سے یاد کرنا ہے اللہ عزوجل کو اور اس کو سارے نقائص سے منزہ کرنا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ "سبحة" سے ماخوذ ہے اور "سبحة" بہ معنی نماز ہے، یعنی اس کے لیے نماز پڑھو۔ کسی نے کہا ہے کہ تینوں فعلوں میں کل ضمیریں اللہ تعالیٰ کی طرف پھرتی ہیں، اب معنی یہ ہوں گے کہ ثابت کرو اس کے لیے توحید کو اور نفی کرو اس سے شریکوں کی۔ کسی نے کہا ہے کہ مدد کرو اس کے دین کی اور اس کے رسول کے ساتھ ہو کر لڑو۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے اتنا زیادہ کہا اور جس نے ضمیروں میں فرق کیا تو یقیناً وہ دور جا پڑا۔ اسی طرح مدارک میں بھی ہے۔[4] امام حفناوی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ قول بہت ظاہر ہے، تاکہ ضمیریں ایک طرز پر ہو جائیں۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ﴾ اللہ پاک نے خبر دی کہ یہ بیعت جو اس کے رسول کے لیے ہے یہ دراصل اسی (اللہ) کے لیے ہے، کیوں کہ مومنوں نے اپنی جانیں جنت کے عوض اللہ کو بیچ ڈالیں۔ بیعت کی اصل وہ عقد ہے جس کو آدمی اپنے نفس پر عقد کرتا ہے، یعنی امام کے لیے اپنی اطاعت کو صَرف کرنا اور اس عہد کو پورا کرنا جس کو اس کے لیے لازم کر لیا ہے۔ یہاں بیعت سے مراد بیعت الرضوان ہے جو حدیبیہ میں ہوئی تھی، کیوں کہ مومنین نے قریش سے لڑنے کے لیے درخت کے نیچے آپ ﷺ سے بیعت کی تھی۔ پھر اُن میں سے ایک جماعت نے تو موت پر بیعت کی تھی ان میں سے سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور ایک جماعت نے اس بات پر بیعت کی تھی کہ وہ بھاگیں گے نہیں۔ ان میں سے سیدنا معقل بن یسار رضی اللہ عنہ ہیں۔

حدیبیہ ایک گاؤں ہے جو کچھ بڑا نہیں۔ اس کے اور مکے کے درمیان ایک منزل سے کم فاصلہ ہے۔ وہاں ایک کنواں تھا، اس کے نام پر اس گاؤں کا نام حدیبیہ رکھا گیا۔ حدیث شریف میں مروی ہے کہ حدیبیہ ایک کنواں ہے۔[5] امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ حرم سے ہے۔ امام ابن القصار نے کہا ہے کہ اس کا بعض حل سے ہے۔ یعنی حرم نہیں ہے۔ اس کے لفظ میں تخفیف و تشدید یا دونوں جائز ہیں، لیکن پہلی قراءت یعنی تخفیف زیادہ فصیح ہے اور عامۂ محدثین اس کو تشدید کے ساتھ پڑھتے ہیں۔[6]

---

1. الدر المنثور (٥١٦/٧)
2. تفسير القرطبي (٢٦٧/١٦)
3. تفسير الطبري (٢٠٧/٢٢)
4. الكشاف (٣٣٧/٤) تفسير النسفي (١٥٣/٤)
5. صحيح البخاري (٣٣٨٤) صحيح مسلم (١٨٥٦)
6. تفسير الخازن (١٩١/٦)

جملہ ﴿ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ﴾ مستانفہ ہے جو ماقبل کی تقریر کے لیے لایا گیا ہے، بر طریق تخییل یا محلِ نصب میں ہے بنا بر حال اور اس ترکیب میں استعارہ تصریحیہ تبعیہ ہے فعل میں اور مکنیہ ہے اسمِ کریم میں اور تخییلیہ ہے اس بات ﷺمیں کہ اس کے لیے یہ ثابت کیا ہے اور اس میں مشاکلہ ہے، اس طرح سے کہ اس کے ''ید'' کا ان کے ''أيدي'' سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ بیانِ واضح یہ ہے کہ جب اللہ پاک نے یہ بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ مرسل ہیں تو یہ بیان فرمایا کہ اس کے نزدیک ان کی قدر ومنزلت ایسی ہے کہ جس نے صورتاً ان سے بیعت کی تو اس نے حقیقتاً ان سے بیعت کی، کیوں کہ جس نے آپ سے اس بات پر بیعت کی کہ جنگ کی جگہ سے نہ بھاگے گا، یہاں تک کہ مارا جائے یا اللہ فتح نصیب کرے، اگر چہ ظاہر میں اس نے اپنی بیعت سے رسول اللہ ﷺ کی رضا کا قصد کیا، لیکن حقیقت میں وہ اس سے صرف رحمان کی رضا اور ثواب اور جنت کا قصد کرتا ہے۔ اس معاہدے کا نام مبایعہ رکھا، کون سا مبایعہ؟ جو اس کے مال سے مال کا تبادلہ ہے۔

اس سے اس بات میں تشبیہ دی کہ ان میں سے ہر ایک مبادلہ کے معنی پر مشتمل ہے، اس لیے کہ یہ معاہدہ بھی مبادلے پر مشتمل ہے، اس طرح سے کہ کفار کی لڑائی میں ثابت قدمی کا لازم کر لینا، اس کے مقابلے میں نبی کریم ﷺ کی ضمانت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے راضی ہوگا اور اُن کو جناتِ نعیم کا ثواب دے گا، چنانچہ استعارے کے طور پر اس معاہدے پر مبایعت کا اسم بولا گیا۔ پھر جب یہ بات تھی کہ لڑائی میں ثابت قدم رہنے کا ثواب اللہ کی طرف سے ان کو پہنچتا تھا تو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ مبایعت کرنے سے اللہ کے ساتھ مبایعت کرنا مقصود ہوا، اس لیے کہ آپ ﷺ تو سفیر ہیں اور جب رسول کے ساتھ مبایعت اللہ کے ساتھ مبایعت ٹھہرائی گئی اور اللہ تعالیٰ کے مبائع سے تشبیہ دی گئی تو لفظ ''ید'' کو جو حقیقتاً مبائع کے لوازم سے ہے، بطور استعارہ تخییلیہ اس کو اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کیا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اعضاء و جوارح سے پاک ہے، اس لیے امام زمخشری اور کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہی ہے کہ رسول کے ساتھ عقدِ میثاق اللہ کے ساتھ عقدِ میثاق کی طرح ہے، دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے۔[1] محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کو اُن کی مبایعت کا علم ہے تو وہ اُن کو اس پر جزا دے گا۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے اس خیر کو پورا کرنے کے ساتھ جس کا ان سے وعدہ کیا ہے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ پکڑا کرتے، پھر آپ ﷺ سے بیعت کرتے تھے اور مبایعت میں اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔[3] یہ اس لیے کہ جب بائع اور مشتری بیع میں ایک دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں اور اُن کے درمیان کوئی تیسرا شخص ہوتا ہے تو وہ اپنا ہاتھ اُن کے ہاتھوں پر رکھ دیتا ہے اور اُن کو محفوظ رکھتا ہے، یہاں تک کہ عقد مکمل ہو جائے اور ایک دوسرے کا ہاتھ نہ چھوڑے، یہاں تک کہ عقد لازم ہو جائے

---

(1) الكشاف (٣٣٧/٤) (2) تفسير الجلالين (٦٧٩/١) (3) تفسير البغوي (٣٠٠/٧)

اور دونوں عقد کو فسخ نہ کریں، چنانچہ ہاتھوں پر ہاتھ رکھنا بیعت کی حفاظت کا سبب ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ﴾ یعنی اللہ ان کو بیعت پر محفوظ رکھے گا جس طرح کہ درمیان والا شخص بائع اور مشتری کے ہاتھوں کو محفوظ رکھتا ہے۔

فتح البیان میں امام رازی رحمہ اللہ کا قول ذکر کیا ہے، اس کے بعد فرمایا ہے کہ یہ اہلِ تاویل و کلام کا مذہب ہے اور اس آیت میں سلف کا مذہب اور اس جیسی اور آیتوں میں تاویل سے سکوت اختیار کرنا ہے اور آیاتِ الٰہی اور احادیثِ رسول پناہی جو صفاتِ ربانی کے متعلق ہیں، ان کو جیسے آئی ہیں ویسے ہی ماننا، بمع اس کے کہ ان پر بغیر تشبیہ کے ایمان لانا اور بغیر تکییف اور بغیر تعطیل و تحریف کے اور اُن کو ظاہر سے پھیرے بغیر اور بغیر تاویل کے ماننا ہے اور یہ حق ہے۔[1]

بالجملہ جب یہ ذکر ہو چکا کہ رسول سے بیعت بعینہٖ اللہ سے بیعت ہے تو پہلے تو اس کے توڑنے والے کو وعید فرمائی، ارشاد کیا: ﴿ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ﴾ یعنی جو اس بیعت کو توڑتا ہے جو اس نے باندھی، تو وہ اپنی جان کے برے کو توڑتا ہے، کیوں کہ اس کا ضرر اسی کی طرف پھرے گا، اس کے غیر کی طرف تجاوز نہیں کرے گا۔

پھر بیعت پوری کرنے والے کا وعدہ ذکر فرمایا: ﴿ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ یعنی اور جو کوئی اس بات کے پورا کرنے پر جس کا رسول اللہ ﷺ کی بیعت میں اللہ سے وعدہ کیا تھا، ثابت رہا تو عن قریب اس کو اجرِ عظیم دے گا۔ مراد یہ ہے کہ جنت دے گا، محاورے میں "وَفَيْتُ بِالْعَهْدِ وَأَوْفَيْتُ بِهٖ" دونوں طرح بولتے ہیں، اسی بات سے یہ آیت ہے: ﴿ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ﴾ [النحل: ٩١] ''اللہ کے عہد کو پورا کرو۔'' اور یہ آیت: ﴿ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ ﴾ [البقرة: ١٧٧] ''اور اپنے وعدے کو پورا کرنے والے۔''

جمہور نے ﴿ عَلَيْهُ ﴾ کو بہ کسرِ ہاء پڑھا ہے اور امام حفص اور زہری رحمہما اللہ نے بہ ضمِ ہاء پڑھا ہے اور ﴿ فَسَيُؤْتِيْهِ ﴾ کو جمہور نے بہ یائے تحتیہ اور امام نافع، ابن کثیر اور ابن عامر رحمہم اللہ نے بہ نون پڑھا ہے۔ امام ابو عبیدہ اور ابو حاتم رحمہما اللہ نے پہلی قراءت کو اور امام فراء رحمہ اللہ نے دوسری قراءت کو اختیار کیا ہے[2] اور دونوں سبعیہ ہیں۔ اس آیتِ کریمہ سے بیعت کی مشروعیت نکلی۔ نبی کریم ﷺ سے بہت سی بیعتیں صادر ہوئیں۔

صحیحین وغیرہما کتبِ حدیث شریف میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں، اُن میں اُن کا ذکر ہے اور اُن میں یہ ہے کہ کبھی تو لوگ ہجرت اور جہاد پر آپ ﷺ سے بیعت کرتے تھے اور کبھی ارکانِ اسلام کے قائم کرنے پر اور کبھی کفار کے ساتھ لڑائیوں میں ثابت قدمی اور قرار پر بیعت کرتے تھے اور کبھی فواحش اور منکرات کو چھوڑنے پر اور کبھی سنت پر تمسک کرنے اور بدعت سے بچنے پر اور طاعات کی حرص اختیار کرنے پر بیعت کرتے تھے جس طرح کہ انصار کی کچھ عورتوں نے اس پر بیعت کی تھی کہ نوحہ نہ کریں گی اور فقرائے مہاجرین میں سے کچھ لوگوں نے اس پر بیعت کی تھی کہ

---

[1] فتح البيان (٩٤/١٣)
[2] تفسير القرطبي (٢٦٨/١٦)

لوگوں سے کسی شے کا سوال نہ کریں گے۔ چنانچہ ان میں سے کسی کا کوڑا اگر پڑتا تو خود اپنے گھوڑے سے اترتا اور اس کو اٹھالیتا اور کسی سے سوال نہ کرتا تھا۔[1] (رواہ ابن ماجه في سننه)

بیعت پر کتابِ عزیز ناطق ہے جس طرح کہ اس آیت میں ارشاد ہے اور اس آیتِ کریمہ میں ﴿ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [الممتحنة: ١٢] ''جب مسلمان عورتیں آپ سے ان باتوں پر بیعت کرنے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا کاری نہ کریں گی، اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں گی اور کوئی ایسا بہتان نہ باندھیں گی جو خود اپنے ہاتھوں پیروں کے سامنے گھڑ لیں اور کسی نیک کام میں تیری بے حکمی نہ کریں گی تو آپ ان سے بیعت کر لیا کریں، اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کریں، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے اور معاف کرنے والا ہے۔'' جن باتوں میں کسی طرح کا شک وشبہہ نہیں ہے ان میں سے یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے کوئی فعل بر طریقِ عبادت واہتمام ثابت ہو تو وہ اس سے باہر نہیں ہوتا کہ دین میں سنت ٹھہرے۔

رہا یہ کہ نبی اکرم ﷺ زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے اور جو قرآن وحکمت اللہ تعالیٰ نے نازل کی، اس کے عالم تھے اور کتاب وسنت کے معلم، اور امت کو رذائل سے صاف و پاک کرنے والے تھے، چنانچہ جو کام آپ ﷺ نے بر طریق خلافت کیا تو وہ خلفاء کے لیے سنت ہوا اور جو کام کتاب وسنت کے معلم ہونے کے لحاظ سے کیا اور اُمت کو پاک صاف کرنے کے طریق پر کیا، وہ علمائے راسخین کے لیے سنت ٹھہرا۔ دیکھو صحیح بخاری اس بات پر شاہد ہے کہ جریر رضی اللہ عنہ سے بیعت لیتے وقت ان پر یہ شرط لگائی: « وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ »[2] یعنی ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا اور انصار کی ایک قوم سے بیعت لی تو یہ شرط لگائی کہ اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں[3] اور حق بات کہیں جہاں کہیں بھی ہوں، چنانچہ کوئی اُن میں سے امراء اور ملوک پر کھلم کھلا رد و انکار (تنقید) کرتا تھا۔ اس کے سوا اور امور ہیں اور یہ سب تزکیہ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب سے ہے۔

چنانچہ بیعت کئی قسم کی ہے، ان میں سے خلافت کی بیعت ہے اور اُن میں سے اسلام کی بیعت ہے اور اس بات کی بیعت ہے کہ تقوے کی رسی کو خوب مضبوطی سے پکڑے رہیں اور ہجرت و جہاد کی بیعت ہے اور جہاد میں پختہ اور مضبوط رہنے کی بیعت ہے۔ خلفاء کے زمانے میں اسلام کی بیعت متروک تھی، ان میں سے خلفائے راشدین کے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٤٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٦٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٧٧٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٠٩)

وقت میں تو اس لیے کہ ان کے عہد میں لوگوں کا اسلام میں داخل ہونا غلبے اور تلوار سے تھا۔ تالیفِ قلوب اور اظہارِ برہان سے نہ تھا اور نہ بطور طوع اور رغبت کے تھا۔ اور رہے غیر راشدین خلفاء کے وقت میں تو اس لیے کہ اکثر اوقات وہ ظالم و فاسق تھے، اہتمام نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح تقوے کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کی بیعت بھی متروک تھی۔

خلفائے راشدین کے وقت میں تو اس لیے کہ صحابہ کی کثرت تھی جو نبی اکرم ﷺ کی بابرکت صحبت سے روشن دل ہو گئے تھے اور آپ ﷺ کے حضور میں با ادب ہو چکے تھے چنانچہ وہ خلفاء کی بیعت کے نیاز مند نہیں ہوتے تھے۔ رہے غیر راشدین کے وقت میں تو افتراقِ کلمہ کے خوف سے اور اس ڈر سے کہ کہیں خلافت کی بیعت کا ان پر خیال کیا جائے تو فتنے اٹھیں، مختلف قسم کی بیعتیں نہیں تھیں۔ پھر جب یہ خلفاء میں مندرس (پرانا، گھسا ہوا) ہو گئے تو اکابر علماء اور مشائخ نے فرصت نکالی اور بیعت کی سنت کو پکڑا۔

مبایعتِ متصوفین جس کے صوفیائے کرام خوگر ہیں، اس میں وہ شے ہے جو مقبول ہے اور وہ شے ہے جو مردود ہے، یہ بات اس وقت ظاہر ہوتی ہے، جب ان کے طریقے کو قرآن وسنت پر پیش کیا جائے، چنانچہ جو اُن کے موافق ہے تو وہ سنت ہے اور درست ہے اور جو اُن کے خلاف ہے، وہ خطا ہے اور ہلاکت ہے۔ اور یہ بیعت صرف ایک سنت ہے اور واجب نہیں ہے، اس لیے کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی اور اس سے اللہ تعالیٰ کی طرف تقرب کیا اور اس پر کوئی دلیل دلالت نہیں کرتی ہے کہ اس کے چھوڑنے والے کو گناہ گار کہیں۔ ائمہ میں سے کسی نے اس شخص پر انکار نہیں کیا جو اس کا تارک ہو، چنانچہ یہ ایسے ہو گیا جیسے اس بات پر اتفاق ہو کہ وہ واجب نہیں ہے۔ اب بیعت لینے والے کی شرط سنو۔

یہ چند امر ہیں: ایک تو کتاب وسنت کا علم ہے کہ ان دونوں کا عالم ہو، یہ بات ہم نے صرف اس لیے شرط کی ہے کہ بیعت سے غرض یہ ہے کہ اس کو نیک بات کا حکم کریں اور اسے بری بات سے منع کریں اور اس کو راہ بتائیں کہ سکینۂ باطنہ حاصل کرے اور رذیل باتوں کو مٹائے اور اچھی باتیں حاصل کرے اور قرآنِ کریم اور حدیث شریف کے ظاہر کی پابندی کرے۔ جو کوئی کتاب وسنت کا عالم نہ ہو گا اور جس شے کو اُن دونوں نے واجب کیا ہے، اس پر عامل نہ ہو گا، اس سے اس کام کا کبھی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مشائخ کا کلمہ اس بات پر متفق ہو چکا ہے کہ لوگوں کو وعظ و نصیحت نہ کرے مگر وہ شخص جس نے حدیث شریف لکھی اور قرآن شریف پڑھا، یعنی کتاب وسنت کا عالم ہو۔ دوسری شرط عدالت، تقویٰ، صدق اور ضبط ہے، چنانچہ واجب ہے کہ وہ کبائر سے بچنے والا ہو اور صغائر پر مصر نہ ہو، یعنی انھیں مستقل طور پر اختیار نہ کرے۔

تیسری یہ ہے کہ دنیا میں بے رغبت اور آخرت میں راغب ہو۔ طاعاتِ موکدہ پر ہمیشگی کرنے والا ہو اور اُن اذکار پر جو صحیح حدیثوں میں منقول ہیں اور ہمیشہ اپنے دل کو اللہ پاک کے ساتھ متعلق رکھتا ہو۔ چوتھی یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہو، اپنی مستقل رائے رکھتا ہو، امّعہ نہ ہو کہ جس کی نہ رائے ہو نہ کوئی امر۔ صاحبِ مروت وعقلِ تام ہو جس پر ہر اس شے میں اعتماد کرتا ہو جس کا امر کرتا ہے اور جس سے روکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو گواہ کے

حق میں فرمایا ہے: ﴿ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ ﴾ [البقرۃ: ۲۸۲] ''جنھیں تم گواہوں میں سے پسند کر لو۔'' پھر صاحبِ بیعت کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔

پانچویں یہ ہے کہ علمائے کتاب وسنت کی صحبت میں رہا ہو اور ایک مدت دراز تک ان سے ادب سیکھا ہو اور ان سے ظاہری علم اور باطنی نور اور سکینت حاصل کی ہو، یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا طریقہ اسی طرح جاری ہے کہ آدمی فلاح نہیں پاتا، مگر جبکہ فلاح پانے والوں کو دیکھتا ہے۔ اس بارے میں کرامات اور خوارقِ عادات کا ظاہر ہونا شرط نہیں ہے اور نہ ہی اپنے پیشے اور کام کو چھوڑ دینا ہے، اس لیے کہ اول چیز تو اپنی کوششوں اور محنتوں کا پھل لینا ہے کمال کی شرط نہیں ہے۔ اور دوسری شرعِ مطہر کے خلاف ہے۔ جو لوگ کہ اپنے احوال میں مغلوب ہیں ان کے فعل سے دھوکا مت کھانا اور ماثور (نقل کی ہوئی) بات یہی ہے کہ تھوڑی پر قناعت ہو شکوک وشبہات سے پاک ہو۔ جب یہ بات تمھارے لیے ثابت ہو چکی تو تمھیں صاف اور گدلے کی پہچان ہو گئی اور اب تم اس کو خوب اپنے قبضے میں رکھو اور اس کے سوا کسی طرف توجہ مت دو، باللّٰہ التوفیق۔ بالجملہ جب اللہ پاک نے بیعت الرضوان والوں کا ذکر کیا اور اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا تو اُن لوگوں کا ذکر کیا جو اس بارگاہ سے غائب رہے اور اس عمرے میں حاضر ہونے سے پیچھے رہ گئے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ أَمْوَالُنَا
وَأَهْلُونَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِم مَّا لَيْسَ فِي
قُلُوبِهِمْ ۚ قُلْ فَمَن يَمْلِكُ لَكُم مِّنَ اللَّهِ شَيْـًٔا إِنْ أَرَادَ
بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۚ بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ
خَبِيرًا ﴿١١﴾ بَلْ ظَنَنتُمْ أَن لَّن يَنقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ
إِلَىٰٓ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَزُيِّنَ ذَٰلِكَ فِي قُلُوبِكُمْ وَظَنَنتُمْ
ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنتُمْ قَوْمًۢا بُورًا ﴿١٢﴾ وَمَن لَّمْ يُؤْمِنۢ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِۦ
فَإِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلْكَٰفِرِينَ سَعِيرًا ﴿١٣﴾ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ
يَغْفِرُ لِمَن يَشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَآءُ ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٤﴾

دیہاتیوں میں سے پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ آپ سے ضرور کہیں گے: ہمارے مالوں اور ہمارے اہل وعیال نے ہمیں مشغول کر دیا تھا، لہٰذا آپ ہمارے لیے مغفرت طلب کریں،

[1] فتح البیان (۹۲/۱۳۔۹۸)

وہ اپنی زبانوں سے وہ (بات) کہیں گے جو اُن کے دلوں میں نہیں ہے، آپ کہہ دیجیے: پھر کون تمھارے لیے اللہ سے کسی شے کا اختیار رکھتا ہے، اگر وہ تمھیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا کوئی نفع دینا چاہے؟ (کوئی بھی نہیں) بلکہ اللہ اس سے خوب باخبر ہے، جو تم عمل کرتے ہو⑪ بلکہ تم نے گمان کیا تھا کہ رسول اور مومنین اپنے اہل و عیال کی طرف ہرگز نہیں پلٹیں گے اور یہ بات تمھارے دلوں میں پرکشش بنا دی گئی تھی اور تم نے برا گمان کیا تھا اور تم لوگ تھے ہی ہلاک ہونے والے⑫ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں لایا تو بلاشبہ ہم نے ایسے کافروں کے لیے خوب بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے⑬ اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ جسے چاہے معاف کرے اور جسے چاہے عذاب دے اور اللہ بڑا بخشنے والا، نہایت مہربان ہے⑭

حدیبیہ سے پیچھے رہنے والوں کے جھوٹے بہانے اور ان کی وعیدِ شدید:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو اس عذر کی خبر دیتا ہے جس کو پیچھے رہنے والے گنوار پیش کریں گے جنھوں نے اس بات کو پسند کیا کہ اپنے گھروں میں اور کاروبار میں ٹھہرے رہیں اور رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جانا چھوڑا۔ انھوں نے اپنے مال اور گھر میں مصروفیت کا عذر پیش کیا اور درخواست کی کہ رسول اللہ ﷺ اُن کے لیے مغفرت مانگیں۔ یہ ان کی طرف سے صرف ایک بات تھی یہ کہ بطور اعتقاد کے تھی، بلکہ تقیہ اور مصانعت کی وجہ سے تھی (یعنی بناوٹ اور مطلب برآری کے لیے تھی)۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ کہتے ہیں اپنی زبانوں سے وہ جو اُن کے دلوں میں نہیں ہے تو پھر اگر اللہ تعالیٰ تمھیں کوئی تکلیف دینا چاہے یا کوئی فائدہ پہنچانا چاہے تو تمھارے لیے اللہ سے کسی شے کا کون مالک ہوسکتا ہے، یعنی کوئی اس پر قادر نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمھارے حق میں جس چیز کا ارادہ کرے تو اس کو وہ پھیر دے۔ وہ برتر اور پاک ہے اور وہ تمھارے بھیدوں کو اور دل کی باتوں کو خوب جانتا ہے گو تم ہم سے مصانعت اور منافقت کا برتاؤ کرو، اسی لیے یہ فرمایا: بلکہ اللہ تمھارے کام سے خبردار ہے۔ پھر فرمایا: کوئی نہیں، تم نے خیال کیا کہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان اپنے گھر کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے، یعنی تمھارا پیچھے رہنا کسی معذوری اور نافرمانی کی بنا پر نہیں تھا، بلکہ نفاق کا پیچھے رہنا تھا۔

﴿ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ﴾ یعنی تم نے یہ اعتقاد کیا کہ رسول اور مومنین مارے جائیں گے اور بالکل تباہ ہوں گے اور اُن کی طرف سے کوئی مخبر لوٹ کر نہیں آئے گا (اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں: "تستأصل شأفتهم وتستباد خضراءهم" اس سے مراد بالکل

ناس ہونا ہے۔ اس کا بیان پہلے کسی جگہ پر ہو چکا ہے)۔ ﴿ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ ﴿ بُوْرًا ﴾ بہ معنی "ھَلْکٰی" ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "فاسدین"۔[1] کسی نے کہا ہے کہ یہ عمان کا لغت ہے۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ﴾ یعنی جو کوئی اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاصِ عمل نہ کرے ظاہر و باطن میں تو بے شک اللہ تعالیٰ اس کو دہکتی آگ میں عذاب کرے گا، گو وہ لوگوں کے سامنے وہی ظاہر کرے جو اُن کا اعتقاد ہے اور حقیقت میں وہ اُن کے خلاف اعتقاد رکھے۔ پھر اللہ پاک نے یہ بیان فرمایا کہ وہ حاکم، مالک اور متصرف ہے، آسمان اور زمین والوں میں سے جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے اور جس کو چاہتا ہے عذاب کرتا ہے اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے، یعنی اس شخص کے لیے جو اس کے سامنے خضوع اور فروتنی کرے اور اس کی طرف رجوع کرے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ "أعراب" (دیہاتی) گنوار لوگوں کو کہتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ مراد غفار و مُزینہ و جُہینہ و اَسلم و اَشجع و دَئل کے اعراب ہیں اور یہ وہی گنوار ہیں جو مدینہ منورہ کے گرد تھے۔[3] "مخلف" متروک کے معنی میں ہے، یعنی اللہ پاک نے اپنے رسول کے ہمراہ جانے سے ان کو پیچھے چھوڑ رکھا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے سال عمرے کے لیے نکلے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہ گئے تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح کے سال مکے کی طرف سفر کیا، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ چلنے کی درخواست کی تھی۔ وہ اس بات سے ڈرے کہ لڑائی ہو اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی قوم کی طرف جا رہے ہیں جنھوں نے عین اُن کے گھر میں مدینے پر چڑھائی کی اور اُن کے اصحاب کو قتل کیا، اُن کی اس سے مراد جنگِ اُحد ہے۔

غرضیکہ یہ دو قول ہیں کہ حدیبیہ سے پیچھے رہے، یا فتحِ مکہ سے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تو لوٹ کر مدینے کی طرف جائے گا تو عن قریب یہ پھسڈی لوگ اپنے پیچھے رہنے کا تجھ سے یہ عذر کریں گے کہ ہم کو ہمارے مالوں اور ہمارے گھر والوں نے باز رکھا، یعنی ہم کو تیرے ساتھ نکلنے سے اس شے نے روکا جو ہمارے لیے ہے، یعنی مال اور عورتیں اور اولاد، کیوں کہ ہمارا کوئی ایسا نہیں تھا جو اُن کا بندوبست کرتا، ان کو سنبھالتا اور اُن پر ہمارا خلیفہ ہوتا اور اگر ہم ان کو چھوڑ جاتے تو وہ ضائع ہو جاتے، حالاں کہ تو نے ہم کو مال کے ضائع کرنے سے اور اہل و عیال کے حق میں کوتاہی کرنے سے منع کیا ہے، پس تو ہمارے لیے مغفرت مانگ، تاکہ یہ پیچھے رہنا، جو ہم سے ان وجوہ کی بنا پر واقع ہو گیا ہے، اللہ اس کو ہمارے لیے بخش دے۔

---

[1] تفسیر الطبري (۲۲/۲۱٤) [2] تفسیر ابن کثیر (٤/۲۳۹، ۲٤۰) [3] تفسیر الطبري (۲۲/۲۱۲) تفسیر القرطبي (۱٦/۲٦۸)

﴿سَيَقُوْلُ﴾ کے حرفِ سین کا فائدہ یہ ہے کہ ہم تجھ سے ایسا وعدہ کرتے ہیں جس میں کسی طرح کا خلاف نہیں ہے کہ وہ ضرور تجھ سے یہ عذر پیش کریں گے۔ ﴿لَكَ﴾ کا فائدہ یہ ہے کہ وہ خاص تجھی سے عذر کریں گے، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ تو بڑا رحم دل، رفیق اور شفیق ہے۔ چنانچہ وہ جو اس میں طمع رکھتے ہیں کہ تو ان کا جھوٹا عذر قبول کرے گا، وہ اس میں تیرے سوا خالص مومنوں سے طمع نہیں رکھتے۔ چونکہ ان کا استغفار طلب کرنا اعتقاد کے طور پر نہ تھا، بلکہ یہ استہزاء کے طور پر تھا اور اُن کا باطن اُن کے ظاہر کے خلاف تھا، اس لیے اللہ پاک نے ان کو یہ کہہ کر رسوا فرمایا: ﴿يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ یعنی اپنی زبانوں سے وہ کہتے ہیں جو اُن کے دلوں میں نہیں ہے (یہ کام منافقوں کا ہے) مراد استغفار طلب کرنا اور عذرِ مذکور ہے۔ چنانچہ وہ اپنے عذر کرنے میں اور استغفار طلب کرنے میں جھوٹے ہیں۔

یہ جملہ مستانفہ ہے اس سے مقصود اس شے کا بیان ہے جس پر اُن کا باطن منطوی (لپٹنے والا) ہے یا پہلے جملے سے بدل ہے۔ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو امر فرمایا کہ ان کو یہ جواب دیں: ﴿قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا﴾ یعنی تو کہہ: پھر کون منع کرے گا تم کو اس خیر و شر اور نفع و نقصان سے جس کا اللہ نے تمھارے ساتھ ارادہ کیا۔ یہ استفہام نفی کے معنی میں ہے، یعنی تمھارے لیے اس کی مشیت و قضا میں سے کسی شے پر کوئی قدرت نہیں رکھتا۔ چنانچہ ﴿مِنَ اللّٰهِ﴾ مجاز ہے "مِنْ مَشِيَّتِهٖ وَقَضَائِهٖ" سے۔

غرضیکہ پہلے تو بطور اجمال فرمایا کہ کوئی اللہ کے ارادے کو تم سے روک نہیں سکتا، پھر اس کی تفصیل کی کہ ﴿اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا﴾ یعنی اگر وہ اس شے کو نازل کرنا چاہے جو تم کو نقصان پہنچائے، اس سے مراد تمھارے پیچھے رہنے پر تمھارے مالوں کا ضائع ہونا، یا گھر والوں کا ہلاک ہونا اور قتل اور ہزیمت اور عقوبت ہے، یا تمھارے ساتھ کسی نفع کا یا مدد کرنے کا اور غنیمت کا ارادہ کرے۔ یہ اُن کی اس بات کی تردید ہے جب انھوں نے یہ خیال کیا کہ رسول اللہ ﷺ سے پیچھے رہ جانا؛ ان سے نقصان اور تکلیف کو دور کرے گا اور اُن کے لیے نفع کو کھینچ لائے گا۔ جمہور نے ﴿ضَرًّا﴾ بہ فتح ضاد پڑھا ہے، یہ مصدر ہے۔ "ضَرَرْتُهٗ ضَرًّا" کا اور امام حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے بہ ضم ضاد پڑھا ہے۔[1] "ضُرًّا" اس شے کا اسم ہے جو ضرر پہنچاتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دونوں دو لغت ہیں اور دونوں سبعیہ ہیں۔

پھر اللہ پاک نے اس سے اضراب کر کے (ہٹ کر) فرمایا: ﴿بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا﴾ یعنی تمھارا پیچھے رہنا اس وجہ سے نہیں ہے جو تمھارا زعم ہے، بلکہ جو اعمال تم کرتے ہو جن میں سے تمھارا پیچھے رہنا ہے ان سب کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اور وہ جان چکا ہے کہ تمھارا پیچھے رہنا اس وجہ سے نہیں ہے، بلکہ یہ شک اور نفاق کی وجہ

[1] تفسير القرطبي (١٦/٢٦٨، ٢٦٩)

سے ہے اور اُن فاسد خیالات کے سبب سے ہے جو تمھارے دل میں گزرے اور اللہ پر بھروسا نہ کرنے پر پیدا ہوئے۔
اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا ﴾ یہ جملہ تفسیر کرتا ہے جملہ ﴿ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴾ کی، اس لیے کہ اس میں ابہام تھا، یعنی بلکہ تم نے یہ خیال کیا کہ دشمن مومنوں کو بالکل جڑ سے اُکھاڑ دے ڈالے گا تو اُن میں کوئی بھی اپنے گھر پر نہ آئے گا، اس لیے کہ تمھارے دل میں مشرکوں کی عظمت اور مومنوں کی حقارت تھی، چنانچہ تم اس لیے پیچھے رہ گئے نہ اس وجہ سے جو تم نے ذکر کی، یعنی باطل عذر پیش کیے۔

﴿ وَزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ﴾ جمہور نے ﴿ زُيِّنَ ﴾ کو بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور کسی نے بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے، یعنی اور اچھا کر دکھایا گیا یہ گمان، یا شیطان نے تمھارے دلوں میں اچھا کر دکھایا تو تم نے اس کو قبول کر لیا۔ ﴿ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ﴾ یعنی اور تم نے برا گمان کیا، وہ یہ کہ اللہ اپنے رسول کی مدد نہ کرے گا۔ یہ ظن یا تو وہی پہلا ظن ہے اور اس کو دوبارہ لانا تاکید اور ملامت کے لیے ہے، یا اس سے مراد وہ ظن ہے جو پہلے ظن سے عام ہے تو پہلا ظن بہ دخولِ اولیٰ اس میں داخل ہو گا۔

﴿ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا ﴾ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: اور تم اللہ کے نزدیک ایک ہلاک ہونے والی قوم تھے۔ اسی طرح امام مجاہد رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "بور" وہ فاسد اور ہلاک ہونے والا شخص ہے جس میں کسی طرح کی بھلائی نہیں ہوتی۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ بُوْرًا ﴾ بہ معنی "هَلْكىٰ" ہے۔ "بُوْرٌ"، "بَائِرٌ" کی جمع ہے، جیسے: "حَائِلٌ وَحُوْلٌ" ہے معتل میں، اور "بَاذِلٌ وَبُزْلٌ" صحیح میں۔ "قَدْ بَارَ فُلَانٌ" بہ معنی "هَلَكَ" اور "أَبَارَ اللّٰهُ" بہ معنی "أَهْلَكَهُ" ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ "بُوْرٌ" بہ معنی "هَلَاكٌ" مصدر ہے، جمع سے اس کے ساتھ خبر دی ہے۔ مصدر میں واحد اور تثنیہ جمع برابر ہوتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ﴾ اللہ پاک کی طرف سے کلامِ مستانف ہے اور جس بات کے کہنے کا نبی اکرم ﷺ کو امر فرمایا ہے، اس میں داخل نہیں ہے، یعنی اور جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان نہ لائے، جیسا کہ اُن پیچھے رہنے والوں نے کیا ہے تو اس کا بدلہ وہ ہے جو اللہ نے اس کے لیے تیار کر رکھا ہے، یعنی سعیر کا اور سخت آگ کا عذاب۔ یہاں ﴿ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴾ کہا، "لهم" نہ فرمایا، ضمیر کی جگہ اسمِ ظاہر رکھا، مقصد اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ جو کوئی اللہ پر ایمان لانے اور اس کے رسول پر ایمان لانے کو جمع نہ کرے تو کافر ہے، سعیر کا مستحق ہے۔ ﴿ سَعِيْرًا ﴾ کو نکرہ ذکر کیا، اس لیے کہ وہ ایک مخصوص نار ہے جس طرح کہ ﴿ نَارًا

[1] فتح القدير (٥/٦٥)

تَلَظّٰى ﴾ [اللیل: ١٤] کو نکرہ ذکر کیا ہے۔ یا یہ تہول وتخویف (ڈر اور خوف دلانے) کے لیے ہے۔

﴿ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ یعنی اور اللہ ہی کا راج ہے آسمانوں اور زمین کا وہ جس طرح چاہتا ہے اپنی مخلوق میں اس کا تصرف کرتا ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں ہے اور مخلوق کو جو اوامر ونواہی کے ساتھ مکلّف کیا ہے تو صرف اس لیے کہ جو اچھا کام کرے اس کو ثواب دے اور جو برا کام کرے اس کو سزا دے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ یعنی وہ بخشتا ہے جس کو بخشنا چاہتا ہے اور عذاب کرتا ہے اس کو جس کو عذاب کرنا چاہتا ہے، اس کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے اور مخلوق سے پوچھ گچھ ہوگی۔ مخلفین جو خالی اس بات کا طمع رکھتے تھے کہ نبی اکرم ﷺ اُن کے لیے مغفرت مانگیں، چنانچہ اس آیت میں اس طمع کو ختم کر دیا۔

﴿ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ یعنی اللہ بہت زیادہ اور وسیع مغفرت اور رحمت والا ہے، وہ اپنی مغفرت ورحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے خاص کرتا ہے اور مومنوں میں سے اس کو خاص کرتا ہے جس کی مغفرت کے لیے اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے نہ کہ ان کے سوا کافر لوگ وہ تو اس سے قطعاً علاحدہ ہیں۔[1]

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ۭ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٥﴾

عن قریب جب تم مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لیے چلو گے تو پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ کہیں گے: ہمیں بھی چھوٹ (اجازت) دیجیے ہم بھی تمھارے پیچھے پیچھے چلتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا کلام (وعدہ) بدل دیں، کہہ دیجیے: تم ہرگز ہمارے پیچھے نہیں چلو گے، اللہ نے پہلے ہی سے یہ فرما دیا ہے۔ پھر وہ یقیناً کہیں گے: (نہیں) بلکہ تم ہم سے حسد کرتے ہو، (ایسا نہیں) بلکہ وہ لوگ کم ہی سمجھتے ہیں ⑮

حدیبیہ کے بھگوڑے:

جب مکے سے پھرے، وہاں سے حکم ہوا کہ خیبر چلو اور اُن لوگوں کے سوا کوئی ساتھ نہ چلے۔ مدینے میں تین دن رہ کر ارادہ کیا۔ جو لوگ پہلے سفر میں ڈر کر رہ گئے تھے، لالچ کے لیے اس سفر میں تیار ہوئے ان کو اللہ تعالیٰ نے ممانعت کر دی، خیبر میں یہود تھے جو جنگِ احزاب میں لوگوں کو چڑھا لائے تھے۔ انتہیٰ.

[1] فتح البیان (١٣/٩٨-١٠١)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان گنواروں کی خبر دیتا ہے جو غزوۂ حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ جب آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب خیبر کو فتح کرنے کے لیے اس کی طرف چلے، خبر یہ ہے کہ وہ درخواست کریں گے کہ ان کے ساتھ غنیمت کی طرف نکلیں، حالاں کہ جو وقت دشمنوں سے لڑنے کا اور اُن کے مقابلے میں ثابت قدم رہنے کا تھا، اس وقت تو وہ پیچھے رہ چکے تھے۔ چنانچہ اللہ پاک نے رسول اللہ ﷺ کو امر فرمایا کہ اس میں ان کو اجازت نہ دیں، تاکہ جس قسم کا ان کا گناہ ہے اسی قسم کا ان کو عقاب ہو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تنہا حدیبیہ والوں سے خیبر کی غنیمت کا وعدہ کیا ہے کہ ان کے علاوہ وہ گنوار جو پیچھے رہ گئے تھے، وہ اس میں ان کے شریک نہ ہوں، چنانچہ شرع اور قدر دونوں میں اس کے سوا اور کچھ واقع نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی بات کو بدلیں۔ امام مجاہد، قتادہ اور جویبر رحمہم اللہ نے کہا: یہ بات وہی وعدہ ہے جو حدیبیہ والوں سے کیا اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ کلام اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ﴾ [التوبة: ٨٣]

''پس اگر اللہ تعالیٰ آپ کو ان کی کسی جماعت کی طرف لوٹا کر واپس لے آئے، پھر یہ آپ سے میدانِ جنگ میں نکلنے کی اجازت طلب کریں تو آپ کہہ دیجیے کہ تم میرے ساتھ ہرگز چل نہیں سکتے اور نہ میرے ساتھ تم دشمنوں سے لڑائی کر سکتے ہو۔ تم نے پہلی مرتبہ ہی بیٹھ رہنے کو پسند کیا تھا پس تم پیچھے رہ جانے والوں میں ہی بیٹھے رہو۔''

یہ بات جو امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہی، اس میں نظر ہے، اس لیے کہ یہ آیت جو سورت براءت میں ہے غزوۂ تبوک میں نازل ہوئی اور یہ غزوۂ حدیبیہ سے پیچھے ہے۔[1] ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: چاہتے ہیں کہ اللہ کی بات کو بدلیں یعنی بہ سبب باز رکھنے اپنے کے مسلمانوں کو جہاد سے باز رکھنا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو کہہ تم ہمارے ساتھ نہ چلو گے، یونہی کہہ دیا اللہ نے پہلے سے، یعنی اللہ نے حدیبیہ والوں سے وعدہ کر دیا، اس سے پہلے کہ تم نے ان کے ساتھ نکلنے کی درخواست کی، پھر اب کہیں گے: نہیں تم ہمارا حسد کرتے ہو اس بات پر کہ ہم غنیمتوں میں تمھارے شریک ہوں۔ بات ایسی نہیں جیسا کہ ان کا خیال ہے، بلکہ وہ سمجھتے نہیں مگر تھوڑا۔ ان کو کچھ سمجھ نہیں ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ کلمۂ ﴿اِذَا﴾ ﴿سَيَقُوْلُ﴾ سے متعلق ہے، یعنی اب وہی لوگ جو پیچھے رہنے والے تھے اور جن کا ذکر ہو چکا ہے، اے مسلمانو! تمھارے خیبر کی غنیمتوں کو حاصل کرنے کے لیے

[1] تفسیر الطبري (٢٢/٢١٥_٢١٧) [2] تفسیر ابن کثیر (٢٤٠/٤)

جاتے وقت یہ کہیں گے کہ ہم کو چھوڑ دو، تاکہ ہم تمھارے ساتھ چلیں اور غزوۂ خیبر میں تمھارے ساتھ حاضر ہوں۔ اصل قصہ یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے ہمراہی مسلمان ماہ ذی الحجہ ۶ رہجری میں حدیبیہ سے لوٹ کر آئے تو ماہ ذی الحجہ کے باقی ایام اور محرم ۷ رہجری کے ابتدائی ایام میں مدینہ منورہ میں قیام کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو فتحِ خیبر کا وعدہ دیا اور اس کی غنیمتوں کے لیے ان لوگوں کو خاص کیا جو حدیبیہ میں حاضر ہوئے تھے۔ پھر جب وہ اس کی طرف روانہ ہوئے تو اُن مخلفین (حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والوں) نے کہا کہ تم ہم کو چھوڑ دو، ہم بھی تمھارے ساتھ چلیں۔

اس پر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ﴾ یعنی وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی بات کو بدل دیں۔ اس کلام سے مراد اہلِ حدیبیہ سے وہ اللہ کے وعدے ہیں کہ خیبر کی غنیمت خاص انھیں کو ملے گی۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا مراد اللہ کا امر ہے اپنے رسول ﷺ کو کہ مخلفین میں سے کوئی ان کے ساتھ نہ چلے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ کا قول پہلے گزر چکا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہ نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ غزوۂ تبوک فتح خیبر کے بعد اور فتح مکہ کے بعد ہوا ہے۔ چنانچہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے اور اسی کے قائل امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ ہیں اور امام ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی کو ترجیح دی ہے[1] اور اس پر عام اہلِ تاویل ہیں۔ جمہور نے ﴿ كَلٰمَ اللّٰهِ ﴾ پڑھا ہے اور امام حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے "کَلِمَ اللّٰہِ"۔ امام جوہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "کَلَامٌ" اسم جنس ہے قلیل اور کثیر پر واقع ہوتا ہے اور "کَلِمٌ" تین کلموں سے کم نہیں ہوتا، اس لیے کہ کلمہ کی جمع ہے، جیسے: "نَبِقٌ وَنَبِقَةٌ"۔[2]

پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو حکم کیا کہ اپنے ساتھ نکلنے سے ان کو منع کریں، چنانچہ فرمایا: ﴿ لَنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ﴾ یہ نفی مبالغے کے لیے نہی کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہیں کہ تم ہمارے ساتھ مت چلو۔ یہ اللہ تعالیٰ نے حدیبیہ سے لوٹنے سے پہلے ہی فرمایا ہے کہ خیبر کی غنیمت اُن لوگوں کے لیے ہے جو حدیبیہ میں حاضر ہوئے، ان کے علاوہ اور کسی کا اس میں کچھ حصہ نہیں ہے۔ چونکہ منافق لوگ کسی شے کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے، بلکہ یہ خیال کرتے تھے کہ یہ بات صرف ایک حیلہ ہے جس سے دنیوی مرادیں حاصل ہوتی ہیں، اس لیے اللہ پاک نے ان کے فاسد خیالات کے بارے میں آگاہ کرنے کے لیے فرمایا: ﴿ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ﴾ یعنی اب وہ منافق کہیں گے کہ بات ویسی نہیں جیسی مذکور ہوئی کہ وہ اللہ کا قول ہے، بلکہ صرف تم نے کہہ دی ہے، اس لیے کہ تم ہم پر اس کا حسد کرتے ہو کہ غنیمت میں ہم تمھارے شریک ہوں۔ چنانچہ کلمۂ ﴿ بَلْ ﴾ اضراب ہے محذوف سے جو مقولہ قول ہے، جیسا کہ ترجمے سے تم کو معلوم ہو چکا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ﴿ لَنْ تَتَّبِعُوْنَا ﴾ سننے کے وقت کہیں گے کہ ہمارا تمھارے ساتھ نہ چلنے کے لیے اللہ کا حکم

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] تفسير القرطبي (٢٧١/١٦)

نہیں ہے، جیسا کہ تمھارا زعم ہے، بلکہ اس سے تم کو سوائے حسد کے اور کوئی مانع نہیں ہے، تاکہ ہم غنیمت میں تمھارے شریک نہ ہوں۔ پھر اللہ پاک نے ان پر یوں رد فرمایا: ﴿بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ یعنی بلکہ وہ جانتے نہیں مگر تھوڑا سمجھنا۔ یہ وہی ان کی ظاہری کارروائی ہے جو باطن کے برعکس نفاق کے طور پر کرتے ہیں۔

یہاں دو اضراب ہیں: اول اضراب تو منافقوں کی طرف سے ہے، انھوں نے اس بات کی تردید کی کہ ان کا مومنوں کے ساتھ نہ جانے کا حکم اللہ تعالیٰ کا ہو اور مومنوں کا حسد ثابت کیا۔ دوسرا اضراب اللہ پاک کی طرف سے ہے، منافقوں نے حسد کی نسبت جو مومنوں کی طرف کی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا اور منافقوں کا ایک ایسے وصف کے ساتھ وصف کیا جو حسد سے عام تر ہے، یعنی جہالت اور کم عقلی۔ اس سے یہ نکلا کہ مذمت میں انتہاء جہالت ہے اور دنیا کی محبت کسی عالم اور عاقل کی خصلت نہیں ہے۔[1]

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٦﴾ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ۗ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٧﴾

آپ ان پیچھے چھوڑے جانے والے دیہاتیوں سے کہہ دیجیے: عن قریب تم ایک سخت جنگجو قوم کی طرف بلائے جاؤ گے، تم ان سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہو جائیں گے۔ پھر اگر تم اطاعت کرو گے تو اللہ تمھیں نیک اجر دے گا اور اگر تم پھرو گے، جیسا کہ اس سے پہلے تم پھرے تو وہ تمھیں نہایت دردناک عذاب دے گا (16) (جہاد سے پیچھے رہنے میں) اندھے پر کوئی گناہ نہیں، اور نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ مریض پر کوئی گناہ ہے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، اللہ اسے ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں اور جو شخص (حق سے) پھرے گا تو وہ اسے نہایت دردناک عذاب دے گا (17)

---

(1) فتح البیان (۱۰۲،۱۰۱/۱۳)

جہاد مومنوں اور منافقوں کے درمیان خطِ امتیاز:

اللہ تعالیٰ جنگجو قومِ فارس کے لوگوں کو فرماتا ہے، ان کی سلطنت ہمیشہ زبردست رہی، سیدنا عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کے وقت فارس کا ملک فتح ہوا اور کچھ لوگ بغیر لڑے ہوئے مسلمان ہوئے، وہاں سے بہت سی غنیمتیں ہاتھ لگیں۔ اندھے، لنگڑے اور بیمار پر کوئی حرج نہیں یعنی ان معذور لوگوں پر جہاد فرض نہیں۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ جنگجو قوم جن کی طرف وہ بلائے جائیں ان میں مفسرین نے کئی قول پر اختلاف کیا ہے، ایک یہ ہے کہ وہ ہوازن ہیں۔ (رواه شعبة عن أبي بشر عن سعيد بن جبير أو عكرمة أو جميعا و رواه هشيم عن أبي بشر عنهما وبه قال قتادة في رواية عنه) دوسرا قول یہ ہے کہ وہ قومِ ثقیف ہے، یہ قول ضحاک رحمہ اللہ کا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ بنو حنیفہ ہیں، یہ قول امام جویبر رحمہ اللہ کا ہے۔ (و رواه محمد بن إسحاق عن الزهري وروي مثله عن سعيد وعكرمة) چوتھا یہ ہے کہ وہ اہلِ فارس ہیں۔ (رواه علي بن أبي طلحة عن ابن عباس رضی اللہ عنہما وبه يقول عطاء ومجاهد وعكرمة في إحدى الروايات عنه)

امام کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ روم ہیں۔ امام ابن ابی لیلیٰ، عطاء، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ سے مروی ہے کہ وہ فارس اور روم ہیں اور امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ اہلِ اوثان ہیں، یعنی بت پرست۔ امام مجاہد رحمہ اللہ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ "رجال أولو بأس شديد" ہیں اور کسی فرقے کا تعین نہیں کیا، اسی کے امام ابن جریج رحمہ اللہ بھی قائل ہیں اور یہی قول امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن معمر عن الزہری روایت کیا ہے کہ وہ قوم ابھی تک تیری طرف نہیں آئی ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی دوسری روایت کے الفاظ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ وہ بارزون ہیں۔[1]

ان کی تیسری روایت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہے کہ قیامت قائم نہ ہوگی، یہاں تک کہ تم ایک ایسی قوم سے لڑو جن کی آنکھیں چھوٹی، ناکیں چپٹی، گویا چہرے ان کے سپر ہائے مطرقہ ہیں۔ سفیان نے کہا: یہ لوگ ترک ہیں[2] (اس کی اسناد یہ ہے: "حدثنا سفيان عن الزهري عن سعيد بن المسيب عن أبي هريرة عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم") سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: میں نے ایک جگہ یوں پایا: "حدثنا ابن أبي خالد عن أبيه" (پورا اسناد یہ ہے: "حدثنا أبي حدثنا ابن أبي عمر حدثنا سفيان عن ابن أبي خالد عن أبيه عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ") کہا کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہم پر اترے، پھر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی تفسیر کی کہ تم ایک ایسی قوم سے لڑو گے جن کی جوتیاں بال ہیں، کہا: وہ بارزون ہیں، یعنی اکراد۔[3]

---

(1) تفسير الطبري (٢٢/٢١٩_٢٢١) تفسير ابن كثير (٤/٢٤٠، ٢٤١)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩١٢) (3) تفسير ابن كثير (٤/٢٤١)

قولہ تعالیٰ: ﴿ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ﴾ یعنی تمھارے لیے ان کا جہاد وقتال مشروع کیا گیا، پھر وہ ہمیشہ ان پر مستمر رہے گا اور تمھاری اُن پر مدد کی جائے گی یا وہ مسلمان ہو جائیں گے اور بغیر لڑائی کے اختیاری طور پر تمھارے دین میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ﴾ یعنی پھر اگر تم اطاعت کرو گے اور جہاد میں چلو گے اور اس حق کو ادا کرو گے جو اس میں تم پر ہے تو تم کو اللہ اچھا اجر دے گا اور اگر پلٹ جاؤ گے جیسے پہلی بار پلٹ گئے، یعنی زمانۂ حدیبیہ میں جبکہ تم بلائے گئے تھے اور تم پیچھے رہ گئے تھے تو تم کو دردناک عذاب دے گا۔

پھر اللہ پاک نے جہاد کو ترک کرنے کے عذر بیان کیے، ان میں سے ایک عذر تو مستقل ہے، جیسے: اندھا پن اور لنگڑا پن جو ہمیشہ رہے اور ایک عذر عارضی ہے، جیسے: وہ بیماری جو آتی ہے اور دور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی بیماری کی حالت میں لازمی عذر والوں کے ساتھ شامل ہے، یہاں تک کہ اچھا ہو جائے۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاد میں اور اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت میں رغبت دلائی اور فرمایا کہ جو کوئی اللہ کا اور اس کے رسول کا حکم مانے، وہ اس کو باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے ندیاں بہتی ہیں اور جو کوئی جہاد سے منہ پھیرے اور معاش پر متوجہ ہو تو اس کو دنیا میں ذلت کے ساتھ دردناک عذاب کرے گا اور آخرت میں آگ کے ساتھ عذاب کرے گا۔[1] واللّٰه تعالیٰ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ "مخلفين من الأعراب" کا ذکر اس نام سے دوبارہ کیا، اس کی دو وجہ ہیں: ایک تو مذمت میں مبالغہ کرنے کے لیے، دوسرے اس بات سے آگاہ کرنے کے لیے کہ تخلف (جہاد سے پیچھے رہ جانا) بہت بری شے ہے۔ یعنی اللہ پاک نے ان کی مذمت کی، پھر دوبارہ مذمت فرمائی، جیسا کہ تقریر میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ برے ہیں اور اُن کا فعل قابلِ مذمت ہے۔

امام عطاء بن ابی رباح، مجاہد، ابن ابی لیلیٰ اور عطاء خراسانی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ ﴾ شاید فارس ہیں۔ امام کعب، حسن اور ابن ابی لیلی رحمہم اللہ (شاید اس قول میں بھی یہ شریک ہوں) نے کہا ہے کہ روم ہیں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہوازن وثقیف ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہوازن وغطفان ہیں حنین کے دن۔ امام زہری اور مقاتل رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ بنوحنیفہ یمامہ والے اصحابِ مسیلمہ ہیں۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے اس قول کو اکثر مفسرین سے حکایت کیا ہے۔[2] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اکراد ہیں۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

---

[1] تفسير ابن كثير (٢٤٠/٤، ٢٤١) [2] تفسير القرطبي (٢٧٢/١٦) فتح القدير (٦٧/٥) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٠٠/١٠)

نے فرمایا کہ فارس اور روم ہیں۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ ہوازن اور بنو حنیفہ ہیں،[1] یعنی مرتد لوگ جن سے صدیق رضی اللہ عنہ لڑے، اس لیے کہ مشرکینِ عرب اور مرتد وہی لوگ ہیں جن سے مقبول نہیں ہوتا مگر اسلام یا سیف۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ابھی تک اس آیت کی تاویل نہیں آئی۔[2] آیت ظاہری طور پر اس بات کو رد کرتی ہے۔ ان اقوال میں سے اکثر پہلے گزر چکے ہیں۔ آیتِ کریمہ میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کی امامت کے درست ہونے پر دلیل ہے۔ اس لیے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تو بنی حنیفہ کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے ان کو بلایا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فارس اور روم کے ساتھ جنگ کرنے کی طرف بلایا۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان قولوں میں سے قوی تر قول یہ ہے کہ وہ ہوازن اور ثقیف ہیں، اس لیے کہ داعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور سب سے بعید قول یہ ہے کہ وہ بنو حنیفہ ہیں۔

پھر پہلے قول کی صحت پر دلیل بیان کی ہے[3] اور اس میں طول دیا ہے، حالاں کہ وہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ یوں فرمایا ہے: ﴿ لَنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ﴾ [التوبة: ٨٣] سو یہ اس پر دال ہے کہ داعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غیر ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس قوم کو نہیں بلایا مگر ابوبکر صدیق اور عمر رضی اللہ عنہما نے۔ ﴿ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ تم ان سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہو جائیں گے تو اُن سے نہ لڑو گے، یعنی ان دو باتوں سے ایک ہو گا یا تو لڑنا یا اسلام، اور ان کا کوئی تیسرا امر نہیں ہے۔ یہ ان کافروں کا حکم ہے جن سے جزیہ نہیں لیا جاتا۔ امام زجاج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تقدیر یہ ہے: "أَوْ هُمْ يُسْلِمُوْنَ" سیدنا ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے: "أَوْ يُسْلِمُوْا أَيْ: حَتّٰى يُسْلِمُوْا"[4]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴾

یعنی پھر اگر تم ان کے لڑنے کی طرف مطیع ہو گئے تو تم کو اللہ تعالیٰ دنیا میں اچھا اجر دے گا، یعنی غنیمت اور آخرت میں جنت عطا فرمائے گا۔ اور اگر تم اعراض کرو گے، جیسا کہ تم نے پہلی بار اعراض کیا، یعنی حدیبیہ کے سال، تو تم کو دنیا میں قتل و قید و قہر کے ساتھ دردناک عذاب کرے گا اور آخرت میں عذابِ نار سے تمھیں عذاب دے گا، یہ تمھارے جرم کے مضاعف ہونے کے سبب سے ہوگا۔

پھر اللہ پاک نے معذور لوگوں کا ذکر فرمایا، یعنی جو لوگ مذکورہ وجوہات کے سبب سے معذور ہیں، ان پر کوئی حرج نہیں ہے کہ جنگ سے پیچھے رہ جائیں اور جہاد ترک کریں، اپنی استطاعت کے نہ ہونے کے سبب سے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپاہج لوگوں کو اس آیت سے معذور رکھا ہے جو حدیبیہ کی طرف جانے سے رہ

---

(1) الدر المنثور (٥٢٠/٧) (2) تفسير الطبري (٢٢١/٢٢) (3) تفسير الخازن (١٩٤/٦) (4) تفسير القرطبي (٢٧٣/١٦)

گئے تھے۔[1] سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لکھا کرتا تھا اور بے شک میں اپنے قلم کو اپنے کان پر رکھا کرتا تھا کہ ناگاہ آپ کو قتال کا حکم دیا گیا، اس وقت ایک نابینا آیا اور عرض کی کہ میرے لیے جہاد کیسے ہے؟ حالاں کہ میں نابینا ہوں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ﴾ کہا: یہ جہاد کے بارے میں ہے اور اُن پر جہاد فرض نہیں۔ جب کہ وہ طاقت نہ رکھیں۔[2] (أخرجه الطبراني قال السيوطي بسند حسن)

﴿ حَرَجٌ ﴾ سے مراد ''إثم'' ہے، یعنی ترکِ جہاد میں ان لوگوں پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ عذر صحیح اور ظاہری ہیں، یہ عذر والے کر وفر پر قدرت نہیں رکھتے۔ یہاں اور بھی عذر ہیں جن کا امام خازن رحمہ اللہ وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ ان کی جگہ فقہ کی کتابیں ہیں نہ کہ تفسیر کے صفحات۔ ﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی اللہ کا کہا مانے اور اس کے رسول کا اس بات میں جس کا انھوں نے امر کیا ہے اور جس بات سے منع فرمایا ہے تو اس کو اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے ندیاں بہتی ہیں اور جو کوئی اطاعت سے منہ موڑے اور اپنے کفر و نفاق پر جما رہے تو اس کو سخت عذاب کرے گا۔

وعید کو دوبارہ اس لیے ذکر فرمایا کہ یہ مقام ترہیب، یعنی ڈرانے کے لیے زیادہ مناسب ہے اور وعدے کی تفصیل ذکر کی اور وعید کو اجمالی طور پر ذکر فرمایا، وعدے میں مبالغہ کرنے کے لیے، اس لیے کہ غفران اور رحمت تو اس کی عادت سے ہے برخلاف عذاب کرنے کے۔ جمہور نے ﴿ يُدْخِلْهُ ﴾ بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے اور امام ابو حاتم اور ابو عبید رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے اور نافع اور ابن عامر رحمہ اللہ نے نون کے ساتھ پڑھا ہے۔[3] پھر اللہ پاک نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اپنی نیتیں خالص کیں اور بیعت الرضوان میں حاضر ہوئے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[4]

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۹﴾

البتہ تحقیق اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے،

---

[1] تفسير القرطبي (۱٦/۲۷۳، ۲۷٤)

[2] المعجم الكبير (٥/١٥٥) الدر المنثور (۷/۵۲۱) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "فيه محمد بن جابر السحيمي وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ۷/۲۳٦)

[3] تفسير القرطبي (۱٦/۲۷٤) [4] فتح البيان (۱۳/۱۰۲-۱۰۵)

چناں چہ ان کے دلوں میں جو (خلوص) تھا، وہ اس نے جان لیا، تو اس نے ان پر طمانینت و تسکین نازل کی اور بدلے میں انھیں قریب کی فتح دی⑱ اور بہت سی غنیمتیں بھی (عطا کیں) جو وہ حاصل کریں گے۔ اور اللہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے⑲

بیعتِ رضوان کے شرکاء کے لیے بشارتیں:

جب صلح کی بات چیت چل رہی تھی تو نبی اکرم ﷺ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو مکے میں بھیجا۔ یہاں جھوٹی خبر اڑا دی کہ ان کو مار ڈالا۔ نبی اکرم ﷺ نے کہا ہے کہ اب میرے لیے لڑنا حلال ہو گیا، کیوں کہ پہل مکے والوں نے کی اور وہ خبر جھوٹی تھی۔ مکے والوں کے لشکر کے اسی ۸۰ آدمی آئے کہ اکیلے اکیلے مسلمانوں کو ماریں، ان سب کو جیتے جی پکڑ لیا، اس پر نبی اکرم ﷺ نے لڑنے کا ارادہ کیا۔ آپ ﷺ ایک کیکر کے نیچے بیٹھ گئے اور کہا کہ مجھ سے پکا قول کرو کہ مرنے تک کوتاہی نہ کرو گے، سب نے قول دیا۔ ایک منافق تھا جد بن قیس اس کے سوا کوئی ایسا مسلمان نہ رہا، یعنی جس نے بیعت نہ کی ہو۔ وہ بیعت اللہ کے ہاں بہت مقبول ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کی حالت جان لی، یعنی ظاہری اندیشہ اور دل کا توکل جان لیا اور انھیں فتح کا انعام دیا، یعنی فتح خیبر کی خوش خبری دی، اس سے مسلمان آسودہ حال ہو گئے اور غنیمتوں کا جو وعدہ کیا وہ بھی انعام میں داخل ہے اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ بیعت کرنے والا کوئی شخص دوزخ میں نہ جائے گا۔[1] انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان مومنوں کے ساتھ خوش ہونے کی خبر دیتا ہے جنھوں نے اس درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی۔ ان کی تعداد کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، وہ ایک ہزار چار سو تھے اور وہ درخت حدیبیہ کی سرزمین میں سمرہ، یعنی کیکر کا تھا جس کو دہلی کی زبان میں ببول کہتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے طارق بن عبدالرحمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: میں حج کر کے چلا تو ایک قوم کے پاس سے گزرا جو نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے کہا: کیا یہ مسجد ہے؟ انھوں نے کہا کہ یہ وہ درخت ہے جہاں رسول اللہ ﷺ نے بیعتِ رضوان کی تھی۔ پھر میں سعید بن مسیب رحمہ اللہ کے پاس آیا اور اُن کو خبر دی۔ چنانچہ سعید رضی اللہ عنہ بولے کہ مجھے میرے باپ نے حدیث کی کہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اس درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی۔ کہا: پھر جب ہم آیندہ سال میں نکلے تو اس درخت کو بھول گئے، پھر ہم اس کو تلاش کرنے پر قادر نہ ہوئے، چنانچہ سعید رضی اللہ عنہ بولے کہ محمد ﷺ کے اصحاب تو اس کو نہ جان سکے اور تم نے اس کو بیان کیا تو تم زیادہ دانا ہو؟![2]

﴿فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا﴾ یعنی پھر اللہ نے اس صدق و وفا

① صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٦) ② صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٣٠)

کو اور حکم کے سننے اور مان لینے کو، جو اُن کے دلوں میں تھا، جان لیا اور اُن پر اپنی طمانیت، یعنی تسکین اتاری اور ان کو ایک قریبی فتح کا انعام کیا۔ یہ وہ صلح ہے جو اللہ عزوجل نے ان کے ہاتھوں پر جاری کی اُن کے اور اُن کے دشمنوں کے درمیان اور وہ عام اور مستمر بھلائی جو فتحِ خیبر اور فتح کے ساتھ متصل تھی اور اس کے بعد باقی شہروں اور سلطنتوں کی فتح اور وہ عزت و نصرت و رفعت جو اُن کو دنیا اور آخرت میں حاصل ہوئی تھی، اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا:
﴿ وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴾.

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: اس اثنا میں کہ ہم قیلولہ کرنے والے تھے کہ اچانک رسول اللہ ﷺ کے منادی نے آواز دی: "أَيُّهَا النَّاسُ اَلْبَيْعَةَ اَلْبَيْعَةَ نَزَلَ رُوحُ الْقُدُسِ" یعنی لوگو! بیعت کے لیے آؤ، بیعت کے لیے روح القدس نازل ہوا ہے۔ کہا: پس ہم رسول اللہ ﷺ کی طرف دوڑ پڑے اور آپ کیکر کے درخت کے نیچے تھے، پھر ہم نے آپ ﷺ سے بیعت کی، چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ ﴾۔ پھر آپ ﷺ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے بیعت کی، اس طرح سے کہ اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے پر رکھا، پھر لوگ بولے کہ مبارک ہو ابن عفان کے لیے کہ وہ تو بیت اللہ کا طواف کر رہا ہے اور ہم یہاں ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر وہ اتنے اتنے برس وہاں ٹھہرا رہتا تو بھی اس وقت تک طواف نہ کرتا، یہاں کہ میں طواف کروں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ البتہ یقیناً اللہ تعالیٰ مومنوں سے اس بیعت کے وقت راضی ہوا۔ وہ بیعت الرضوان ہے اور وہ حدیبیہ میں ایک درخت کے نیچے ہوئی۔ کلمۂ ﴿ تَحْتَ ﴾ میں عامل یا تو ﴿ يُبَايِعُونَكَ ﴾ ہے، یا محذوف ہے اس بنا پر کہ مفعول سے حال ہے: "أَيْ: إِذْ يُبَايِعُونَكَ كَائِنًا تَحْتَ الشَّجَرَةِ" یعنی وہ تجھ سے بیعت کرتے تھے اس حال میں کہ تو اس درخت کے نیچے تھا۔ یہ شجرہ حدیبیہ میں کیکر کا درخت تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ بیر کا درخت تھا (چونکہ مفسرین نے شجرہ کی تفسیر سمرہ سے کی ہے اس لیے سمرہ کی تحقیق ضروری ہوئی۔ ایک جگہ اس کا بیان خوب ہو چکا ہے۔ صاحبِ مختار نے "باب الراء" میں کہا ہے: "والسمرة بضم الميم من شجر الطلح والجمع سمر بوزن رجل وسمرات وأسمر في القلة"۔[2] پھر باب الحاء میں کہا ہے: "الطلع بوزن الطلع شجر عظيم من شجر العضاه الواحد طلحة والطلح أيضا لغة في الطلع" پھر کہا کہ جمہور مفسرین اس پر ہیں کہ قرآن میں "طلح" سے مراد موز ہے، یعنی کیلا۔[3] انتہیٰ۔ ان سے کیا غرض ہے کہ قرآن میں "طلح" کیلے

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۳۰۰/۱۰) تفسیر ابن کثیر (۲۴۱/۴، ۲۴۲) اس کی سند میں "موسیٰ بن عبیدة" ضعیف راوی ہے۔
[2] مختار الصحاح (۱۳۱/۱) [3] مختار الصحاح (۱۶۶/۱)

کے معنی میں ہی ہوا کرے۔ لغت میں "طلح" کے دو معنی ہیں: ایک تو کیلا، دوسرے معنی یہ ہیں کہ خار دار درختوں میں سے ایک بڑا درخت۔ سمرہ کی تفسیر میں یہی مراد ہے۔ والله أعلم)

بیعت اس بات پر تھی کہ قریش سے لڑیں گے اور بھاگیں گے نہیں۔ یہ بھی مروی ہے کہ آپ ﷺ نے اُن سے موت پر بیعت کی تھی۔ ان بیعت کرنے والوں کی گنتی عن قریب بیان ہو چکی ہے اور حدیث اور سیرت کی کتابوں میں یہ قصہ تفصیل کے ساتھ دیا گیا ہے۔ اس بارے میں حدیثیں ہیں جن کو امام خازن رحمہ اللہ وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

صحیح میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ درخت چھپا دیا گیا۔[1] اس کی حکمت یہ ہے کہ اس کی وجہ سے لوگ کسی فتنے میں نہ پڑ جائیں، اس خیر وخوبی کے سبب سے جو اس کے نیچے واقع ہوئی۔ چنانچہ اگر وہ باقی رہ جاتا تو ممکن تھا کہ جاہل لوگ اس کی تعظیم کرنے لگ جائیں اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی کہ بسا اوقات وہ یہ اعتقاد کر لیتے کہ اس درخت میں نفع اور نقصان دینے کی قوت ہے، جیسا کہ اب ہم اس سے کم درجے کی شے میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اسی لیے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے قول سے اشارہ کیا ہے کہ اس کا پوشیدہ کیا جانا اللہ کی طرف سے رحمت تھا، یعنی اگر وہ ظاہر رہ جاتا تو لوگ اس کو پوجنے لگتے، پھر عذاب کے مستحق ہوتے، یہ اللہ کی رحمت ہوئی کہ اس کو چھپا دیا۔[2] (كذا في الفتح و شرح المواهب) امام نافع رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو یہ خبر پہنچی کہ کچھ لوگ اس درخت کے پاس آتے ہیں جس کے نیچے بیعت کی گئی تو انھوں نے حکم دیا اور وہ کاٹ دیا گیا۔[3] (أخرجه ابن أبي شيبة في المصنف)

چونکہ اللہ پاک کے حق میں رضا کے حقیقی معنی بن نہیں سکتے اس لیے کہا ہے: معنی یہ ہیں کہ جو لوگ ایمان میں پختہ اور مضبوط تھے ان کے ساتھ راضی کا سا فعل کیا اس طرح سے کہ ان کے لیے فتح ٹھہرائی اور ثواب ان کے لیے مقدر فرمایا۔ اس نے یہ بات سمجھائی کہ کافروں سے راضی نہ ہوا، یعنی ان کے ساتھ راضی کا سا معاملہ نہ کیا۔ چنانچہ ان کو دنیا میں تو بے مدد چھوڑا اس شے کے ساتھ جو آخرت میں ان کے لیے تیار کر رکھی ہے۔ چنانچہ آیت اس شے کے لیے تقریر ہے جو ذکر کی گئی، یعنی فریقین کی جزا اور ان کے ساتھ وہ امور جن کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ اسی رضا کی وجہ سے اس کا نام بیعت الرضوان رکھا گیا۔

﴿ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ معطوف ہے ﴿ يُبَايِعُوْنَكَ ﴾ پر، اس لیے کہ مقام ماضی کا ہے۔ صیغۂ مضارع اس لیے آیا کہ مقصد مبایعت کی صورت کا مستحضر کرنا ہے، یعنی پھر جان لی اللہ نے وہ شے جو اُن کے دلوں میں تھی۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: وہ شے صدق و وفا ہے۔ امام قتادہ اور ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: بیعت کے معاملے پر راضی ہونا کہ وہ بھاگیں گے نہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کراہت بیعت کی موت پر۔[4] ﴿ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ ﴾

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٩٨) [2] فتح الباري (١١٨/٦)

[3] مصنف ابن أبي شيبة (١٥٠/٢) [4] تفسير القرطبي (٢٧٨/١٦)

معطوف ہے ﴿ رَضِيَ ﴾ پر، یعنی راضی ہوا، پھر طمانیت و سکونِ نفس و امن اتارا، جیسا کہ بیان ہوا۔ کسی نے کہا ہے کہ صبر یعنی مخلص مومنوں پر صبر نازل کیا، یہاں تک کہ ثابت رہے اور بیعت کی موت پر اور اس بات پر کہ بھاگیں گے نہیں۔

آیت اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ بیعت الرضوان والے اہلِ جنت میں سے ہیں، اس لیے کہ اللہ کا رضوان جنت میں ان کے دخول کا موجب ہے۔ صحیح حدیثیں اس پر دال ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سکینت اسی پر اتاری گئی جس سے وفا جان لی تھی،[1] یعنی موت پر بیعت لی تھی۔ ﴿ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴾ یعنی ان کو فتح قریب کا انعام دیا گیا، یعنی حدیبیہ سے ان کے واپس جانے پر فتح خیبر دی گئی، یہ قول امام قتادہ اور ابن ابی لیلی رحمہ اللہ وغیرہما کا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ فتح مکہ، مگر پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔

﴿ وَمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ﴾ یعنی ان پر بہت سی غنیمتوں کا انعام کیا۔ مطلب یہ ہے کہ یا تو ﴿ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴾ پر معطوف ہے، یا فعل محذوف کا مفعول ہے، یعنی ''آتَاهُمْ''۔ مراد خیبر کی غنیمتیں ہیں۔ خیبر ایک جگہ تھی جس میں بہت سا مال، کھجوریں اور زمین تھی، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ان میں بانٹ دیا۔ کسی نے ''تَأْخُذُوْنَهَا'' بہ تاء پڑھا ہے، التفات اس لیے ہے کہ ان کو خطاب سے مشرف کیا۔ ﴿ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے افعال و اقوال کو حکمت کے طرز پر صادر کرنے والا ہے۔[3]

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝٢٠ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۝٢١ وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝٢٢ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ښ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝٢٣ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝٢٤

اور اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا ہے کہ تم انھیں حاصل کرو گے، چناں چہ اس نے جلد ہی وہ تمھیں عطا کر دیں اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیے، تاکہ یہ مومنوں کے لیے

---

[1] الدر المنثور (٥٢٣/٧)　[2] تفسیر الطبري (٢٢٥/٢٢)　[3] فتح البیان (١٠٥/١٣، ١٠٦)

ایک نشانی ہو جائے اور تاکہ وہ تمھیں صراطِ مستقیم کی ہدایت دے ⑳ اور (اللہ نے) دوسری غنیمتوں کا بھی (وعدہ کیا) جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے (مگر) اللہ نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ㉑ اور اگر وہ لوگ، جنھوں نے کفر کیا تم سے لڑتے تو یقیناً وہ پیٹھوں کے بل پھر جاتے، پھر وہ کوئی دوست اور کوئی مددگار نہ پاتے ㉒ یہ اللہ کا طریقہ ہے جو پہلے سے چلا آرہا ہے اور آپ اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے ㉓ اور وہ (اللہ) ہی تو ہے جس نے وادیِ مکہ میں ان (کفار) کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے روک دیے بعد اس کے کہ اس نے تمھیں ان پر کامیابی دی تھی، اور اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے جو تم عمل کرتے ہو ㉔

مومنوں کے لیے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ:

لوگوں کے ہاتھ روکے، یعنی لڑائی نہ ہونے دی۔ اور تمھیں اور غنیمتیں دیں، یعنی اس بیعت کے انعام میں فتحِ خیبر دی اور فتحِ مکہ جو اس وقت ہاتھ نہ لگی، وہ بھی مل ہی چکی ہے۔ خاص مکہ میں کافروں کے ہاتھوں کو تم سے اور تمھارے ہاتھوں کو اُن سے روک لیا۔ وہ اسّی (۸۰) آدمی جو پکڑے گئے تھے، شہر مکہ کے بیچ میں، یعنی شہر کے قریب گویا شہر کا بیچ ہے۔ انتھی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿مَغَانِمَ كَثِيْرَةً﴾ سے مراد آج کے دن تک کی تمام غنیمتیں ہیں۔ ﴿فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ﴾ سے مراد فتحِ خیبر ہے۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ مراد صلح حدیبیہ ہے۔[1] ﴿وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے دشمنوں نے جو تمھارے لیے جنگ اور محاربہ اپنے جی میں چھپا رکھا تھا، اس سے تمھیں کوئی برائی نہ پہنچی اور اسی طرح جن کو تم اپنے پیچھے چھوڑ آئے تھے، ان کے ہاتھ تمھارے اہل وعیال سے روکے۔ ﴿وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ یعنی اور تاکہ عبرت لیں اس سے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ ان کا حافظ و ناصر ہے، اُن کے سارے دشمنوں پر باوجود اس کے کہ ان کی گنتی کم تھی اور تاکہ اس احسان سے جو ان پر کیا یہ جان لیں کہ وہ کاموں کے انجام کو جاننے والا ہے اور اس کو جان لیں کہ بہتری اسی چیز میں ہے جس کو وہ اپنے مومن بندوں کے لیے پسند کرتا ہے، گو وہ ظاہری طور پر انھیں ناپسند ہو، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ [البقرة: ٢١٦] ''ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو بری جانو اور دراصل وہی تمھارے لیے بھلی ہو۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا﴾ یعنی اور تاکہ تم کو اس سبب سے سیدھی راہ بتائے کہ تم اس کے

[1] تفسير الطبري (٢٣٠/٢٢)

حکم کے مطیع ہوئے اور اس کی طاعت کی پیروی کی اور اس کے رسول کے موافق ہوئے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴾ یعنی ایک اور غنیمت اور ایک دوسری فتح معین ہے جس پر تم قادر نہ تھے، اللہ اس کو تم پر آسان کر چکا ہے اور تمھارے لیے اس کا احاطہ کر لیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ متقی بندوں کو ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جہاں کا ان کو خیال تک نہیں گزرتا۔

اس غنیمت میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے تو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ خیبر ہے۔ یہ اس بنا پر کہ ﴿ فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ ﴾ کے بارے میں کہا ہے کہ وہ صلح حدیبیہ ہے۔ امام ضحاک، ابن اسحاق، عبدالرحمان بن زید بن اسلم اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مکہ ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے (اصل میں امام ابن جبیر رحمہ اللہ لکھا ہے، ظاہر ابن جریر رحمہ اللہ معلوم ہوتا ہے۔ واللّٰہ أعلم) امام ابن ابی لیلیٰ اور حسن بصری رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ فارس و روم ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ روزِ قیامت تک ہر فتح اور غنیمت ہے۔ امام ابو داود طیالسی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ وہ فتوحات ہیں جو آج کے دن تک فتح کی جا رہی ہیں۔[1]

کفار حدیبیہ میں لڑتے تو بھاگ جاتے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴾ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو خوش خبری سناتا ہے کہ اگر مشرکین ان سے مقابلہ کرتے تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو اور مومن بندوں کو ان پر فتح دیتا اور کفر کے لشکر ہزیمت خوردہ ہو کر پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے اور وہ اپنا کوئی حمایتی اور کوئی مددگار نہ پاتے، اس لیے کہ وہ تو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کے مومنین کے گروہ سے لڑنے والے ہیں۔

پھر اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ښ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق میں یہی رسم اور عادت ہے کہ جب کبھی کفر اور ایمان کسی فیصلے کی جگہ میں ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی مدد کی اور حق کو بلند کیا اور باطل کو سرنگوں کیا جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن اپنے اولیائے مومنین کے ساتھ کیا کہ ان کو اپنے دشمن مشرکین پر مدد دی، باوجود اس کے کہ مسلمانوں کی تعداد اور ساز و سامان کم تھا اور مشرکوں کی گنتی زیادہ اور تیاری بھی بہت تھی۔

قولہ سبحانہ و تعالیٰ: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ ... الآية ﴾ اللہ اپنے مومن بندوں پر احسان رکھتا ہے جب مشرکوں کے ہاتھ اُن سے روک دیے کہ ان سے انھیں کوئی برائی نہ پہنچے اور مومنوں کے ہاتھ

---

[1] تفسير الطبري (٢٢/ ٢٢٩، ٢٣٠) تفسير ابن كثير (٤/ ٢٤٢، ٢٤٣)

مشرکوں سے روک دیے، تاکہ وہ مسجد الحرام کے پاس اُن سے نہ لڑیں۔ دونوں فریق میں سے ہر ایک کو بچا لیا اور ان کے درمیان صلح پیدا کر دی جس میں مومنوں کے لیے بہتری ہوئی اور دنیا اور آخرت میں ان کے لیے نیک انجام ہوا۔ سیدنا سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں گزر چکا ہے، جبکہ ان ستر قیدیوں کو لائے اور اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے باندھ کر پیش کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف نظر کی اور فرمایا: «أَرْسِلُوْهُمْ يَكُنْ لَهُمْ بَدْءُ الْفُجُوْرِ وَثِنَاهُ»[1] یعنی ان کو چھوڑ دو، تاکہ بدعہدی کا اول اور آخر انھیں کے لیے ہو۔ کہا اور اسی بارے میں اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ ... الآية﴾

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: جب حدیبیہ کا دن ہوا تو کوہِ تنعیم کی جانب سے مکے والوں کے اسّی (۸۰) مرد ہتھیار لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر چڑھ آئے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے اصحاب کو غفلت میں نقصان پہنچانا یا قتل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر بددعا کی تو وہ پکڑے گئے۔ عفان نے کہا: پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو معاف کیا (عفان اس حدیث کی سند میں نہیں ہے، واللّٰہ أعلم) اور یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ ... الآية﴾[2] (ورواه مسلم وأبو داود في سننه والترمذي والنسائي في التفسير من سننيهما من طرق عن حماد بن سلمة به)

نیز امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن مغفل مدنی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ اس درخت کی جڑ میں تھے جس کا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ذکر کیا ہے اور اس درخت کی ٹہنیوں میں سے کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت مبارک پر پڑتی تھیں اور سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور سہیل بن عمرو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو تھے، چنانچہ آپ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: لکھ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"، تو سہیل نے ان کا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ ہم رحمان رحیم کو نہیں پہچانتے۔ تو ہمارے فیصلے میں وہ لکھ جو ہم پہچانتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لکھ: "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ"، اور لکھا کہ وہ یہ شے ہے جس پر صلح کی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مکہ سے۔ چنانچہ سہیل بن عمرو نے ان کا ہاتھ پکڑا اور کہا: البتہ مقرر ہم نے تجھ پر ظلم کیا، اگر تو اس کا رسول ہے۔ تو ہمارے فیصلے میں وہ لکھ جو ہم پہچانتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ لکھ یہ وہ شے ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے صلح کی، پھر اس دوران کہ ہم اس حال میں تھے کہ اچانک تیس جوان ہم پر حملہ کرنے کے لیے دوڑے اور ہمارے مقابلے میں آگئے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر بددعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے کانوں کو پکڑا، پھر ہم ان کی طرف گئے اور ان کو پکڑ لیا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٠٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٠٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٨٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٦٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٦٤) مسند أحمد (٣/١٢٢)

تم کسی کے عہد میں آئے ہو، یا کیا کسی نے تمھارے لیے امان دی ہے؟ تو وہ بولے: نہیں، پھر آپ ﷺ نے ان کا راستہ چھوڑ دیا اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ . . . الآية ﴾[1] (و رواه النسائي من حديث حسين بن واقد به)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابن ابزیٰ سے روایت کیا ہے، کہا کہ جب نبی اکرم ﷺ ہدی (قربانی کے جانور) لے کر نکلے اور ذوالحلیفہ تک پہنچے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے عرض کی: یا نبی اللہ! آپ ایک ایسی قوم پر بغیر ہتھیار کے اور بغیر گھوڑوں کے داخل ہو رہے ہیں جو آپ سے لڑنے والے ہیں تو آپ ﷺ نے مدینے کی طرف آدمی بھیجا اور وہاں جتنے گھوڑے اور ہتھیار تھے ان سب کو لے آیا، پھر جب آپ ﷺ مکے کے قریب ہوئے تو آپ ﷺ کو مکے میں داخل ہونے سے روک دیا گیا، پھر آپ ﷺ چلے یہاں تک کہ منیٰ میں آ کر اترے، پھر آپ ﷺ کا جاسوس آپ کے پاس آیا اور کہا کہ عکرمہ بن ابو جہل پانچ سو سواروں کے ساتھ آپ پر حملہ کرنے کے لیے نکلا ہے۔ آپ ﷺ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے فرمایا: او خالد! یہ تیرے چچا کا بیٹا سواروں کے ساتھ تیرے پاس آیا ہے۔ چنانچہ خالد رضی اللہ عنہ بولے کہ میں سیف اللہ ہوں اور اس کے رسول کی سیف ہوں تو اسی دن ان کا نام سیف اللہ رکھا گیا، پھر عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ مجھے بھیجیں جہاں چاہیں تو آپ ﷺ نے ان کو سواروں پر بھیجا، پھر وہ عکرمہ سے ملے اور درۂ کوہ میں اس کو شکست دی، یہاں تک کہ اس کو مکے کی دیواروں میں داخل کر دیا، وہ دوسری بار لوٹ کر آیا تو اس کو بھگا دیا، یہاں تک کہ اس کو مکے کی دیواروں میں داخل کر دیا، پھر تیسری بار لوٹ کر آیا تو اس کو شکست دی، یہاں تک کہ اسے مکے کی دیواروں میں داخل کر دیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ . . . الآية ﴾۔ کہا: اللہ عزوجل نے نبی کریم ﷺ کو ان پر کامیابی دینے کے بعد ان سے روک دیا ان مسلمانوں کے سبب سے جو اس میں باقی رہ گئے تھے، اس خطرے کے پیشِ نظر کہ گھوڑے ان کو روند ڈالیں۔[2] (ورواه ابن أبي حاتم عن ابن أبزىٰ بنحوه)

اس سیاق میں نظر ہے، کیوں کہ یہ حدیبیہ کے سال کا واقعہ نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ خالد اسلام نہیں لائے تھے، بلکہ وہ تو اس وقت مشرکوں کے طلیعہ (ہراول دستے) میں تھے، جیسا کہ صحیح میں ثابت ہوا ہے اور یہ بھی جائز نہیں ہے کہ عمرۂ قضا میں ہو، اس لیے کہ مشرکوں نے اس بارے میں آپ ﷺ سے یہ طے کیا تھا کہ آیندہ سال میں آئیں اور عمرہ کریں اور مکے میں تین دن ٹھہریں اور جب آپ آئے تو نہ آپ کو روکا اور نہ لڑے بھڑے، پھر اگر کوئی کہے کہ فتح کے دن ہو تو یہ بھی نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ فتح کے سال آپ ہدی نہیں لائے تھے، آپ ﷺ تو بہت سے لشکروں کے ساتھ لڑتے اور جنگ کرتے ہوئے آئے تھے، چنانچہ اس سیاق میں خلل ہے اور اس میں کوئی شے واقع ہوئی ہے۔ فليتأمل والله أعلم.

---

[1] مسند أحمد (٨٦/٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٦٤/٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٢٩١/٦)

[2] تفسير الطبري (٢٣٩،٢٣٨/٢٢) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٠١،٣٣٠٠)

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجھے اس شخص نے حدیث کی جس کو میں متہم نہیں کرتا، عکرمہ مولائے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ قریش نے اپنے لوگوں میں سے چالیس یا پچاس آدمی بھیجے اور اُن کو حکم دیا کہ رسول اللہ ﷺ کے لشکر کے گرد ہو جائیں، تاکہ آپ ﷺ کے اصحاب میں سے کسی کو ایذا پہنچائیں یا کسی کو پکڑ لیں، پھر ان کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آئے تو آپ ﷺ نے ان سے درگزر فرمایا اور اُن کا راستہ چھوڑ دیا، حالاں کہ انھوں نے آپ ﷺ کے لشکر کی طرف پتھر اور تیر پھینکے تھے۔ ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسی بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ ... الآية ﴾[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اس کو ایک تیر مارا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر بھیجا تو وہ کفار کے بارہ سواروں کو آپ ﷺ کے پاس لائے، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: کیا تمھارا مجھ پر کوئی عہد ہے؟ کیا تمھارا مجھ پر کوئی ذمہ ہے؟ وہ بولے: نہیں، تو آپ ﷺ نے ان کو چھوڑ دیا اور اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ ... الآية ﴾۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا ﴾ میں اللہ پاک کی طرف سے اپنے مومن بندوں کو ان غنیمتوں کا وعدہ ہے جن کو اُن پر وہ روزِ قیامت تک فتح کرے گا، جن کو وہ اپنے اپنے وقت میں لیں گے جس وقت ان کے وقوع کو مقدر کر رکھا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہاں صیغۂ غائب سے صیغۂ خطاب کی طرف کلام کو پھیرا، یہ ان کی مقامِ امتنان میں عزت اور شرف کے لیے کیا اور خطاب حدیبیہ والوں کو ہے۔ ﴿ فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ ﴾ سے مراد خیبر کی غنیمتیں ہیں، جیسا کہ امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے۔[3] یہ غنیمتیں ان فتوحات کے مقابلے میں ہیں جن کا اُن سے وعدہ کیا ہے ایسی ہے جیسے قلیل کثیر کے مقابلے ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ صلح حدیبیہ ہے۔

﴿ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ﴾ یعنی تم سے صلح کی وجہ سے قریش کے ہاتھ حدیبیہ کے دن روکے۔ کسی نے کہا ہے کہ خیبر والوں کے ہاتھ اور آنکھیں تمھارے ساتھ لڑنے سے روکے اور اُن کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی اہلِ مکہ کے ہاتھ اس بات سے روک دیے کہ اللہ کے حرم کو حلال کریں اور وہ تمھاری وجہ سے حلال کیا جائے، اس حال میں کہ تم احرام کی حالت میں ہو۔[4] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے حدیبیہ اور خیبر کی طرف نکلنے کے بعد یہود کے ہاتھوں کو مدینے سے روکا۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو ترجیح دی ہے، کہا اس لیے کہ لوگوں کے ہاتھوں کو حدیبیہ میں روکنا تو اس

---

[1] تفسير الطبري (٢٢/٢٣٧) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

[2] تفسير الطبري (٢٢/٢٣٨) تفسير ابن كثير (٤/٢٤٢، ٢٤٤) [3] تفسير الطبري (٢٢/٢٣٠) [4] الدر المنثور (٧/٥٢٥)

آیت میں مذکور ہے: ﴿ وَهُوَ الَّذِیْ كَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ ﴾[1] کسی نے کہا ہے کہ ''ناس'' سے مراد عیینہ بن حصن فزاری اور عوف بن مالک نضری اور ان کے ہمراہی ہیں، جب وہ اہلِ خیبر کی مدد کرنے کے لیے آئے جس وقت نبی کریم ﷺ نے ان کا محاصرہ کیا تھا۔

﴿ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ میں حرفِ واو بصریوں کے نزدیک عاطفہ ہے اور عطف علتِ مقدر پر ہے: ''أَيْ: كَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ لِتَشْكُرُوْا وَلِتَكُوْنَ هَزِيْمَتُهُمْ وَسَلَامَتُكُمْ آيَةً لِلْمُؤْمِنِيْنَ فَيَعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ يَحْرُسُهُمْ فِيْ مَشْهَدِهِمْ وَمُغِيْبِهِمْ'' یعنی لوگوں کے ہاتھ تم سے روکے، تاکہ تم اس کا شکر کرو اور تاکہ ان کی ہزیمت اور تمھاری سلامتی ایمان والوں کے لیے ایک نمونہ ہو جائے اور وہ اس بات کو جان لیں کہ اللہ اُن کے حاضر ہونے اور غائب ہونے پر بھی اُن کی حفاظت کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں: تاکہ تم اس کا شکر کرو اور تاکہ اُن کے ہاتھوں کا تم سے روکنا مومنوں کے لیے ایک نشانی ہو جائے۔ کسی نے کہا ہے: تاکہ تم اس کا شکر کرو اور تاکہ یہ غنیمت جو تم کو جلدی دی مومنوں کے لیے تیری سچائی پر ایک نمونہ ہو جائے، جبکہ تو نے اُن سے یہ وعدہ کیا کہ وہ اسے حاصل کریں گے۔ کسی نے یوں کہا: ''وَعَدَ فَعَجَّلَ وَكَفَّ لِتَنْتَفِعُوْا بِذَلِكَ وَلِتَكُوْنَ آيَةً'' یعنی اللہ نے تم کو بہت سی غنیمتوں کا وعدہ دیا، پھر تم کو یہ جلدی دی اور تم سے لوگوں کے ہاتھ روکے، تاکہ تم اس سے نفع پاؤ اور تاکہ یہ امور مومنوں کے لیے ایک نشانی ہو جائیں۔ کسی نے کہا ہے کہ حرفِ لام فعل محذوف سے متعلق ہے جو واو کے بعد مقدر ہے: ''أَيْ: فَعَلَ مَا فَعَلَ مِنَ التَّعْجِيْلِ وَالْكَفِّ لِتَكُوْنَ آيَةً'' یعنی اور کیا جو کچھ کیا، مراد غنیمت کا جلدی دینا اور ہاتھوں کا روکنا ہے، تاکہ یہ امور مومنوں کے لیے ایک نشانی ہو جائیں۔

کوفیوں کے نزدیک یہ واو زائد ہے تو اب حرفِ لام ماقبل کی علت ہو گا: ''أَيْ: وَكَفَّ لِتَكُوْنَ'' یعنی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روکے، تاکہ یہ روکنا ایک نشانی ہو جائے جس سے رسول اللہ ﷺ کی ان امور میں سچائی معلوم ہو جائے جن کا وہ تم کو وعدہ دیتے ہیں، یعنی کثیر غنیمتوں کا ملنا اور مکہ کا فتح ہونا اور مسجد الحرام میں داخل ہونا (اس صورت میں ''تکون'' کا اسم ﴿ كَفَّ ﴾ ہو گا، حالاں کہ وہ مذکر ہے تو کہیں گے کہ ﴿ اٰيَةً ﴾ کا لحاظ کر کے فعل کو مونث کر دیا ہے۔ واللّٰہ أعلم)۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''أَيْ: سُنَّةً لِمَنْ بَعْدَكُمْ''[2] یعنی تاکہ یہ اُمور ان لوگوں کے لیے ایک طریقہ ہو جائیں جو تمھارے بعد ہوں گے۔ کسی نے کہا: آیت بہ معنی عبرت ہے، یعنی اور تاکہ یہ امور مومنوں کے لیے ایک عبرت ہو جائیں کہ اس سے یہ بات پہچان لیں کہ اللہ عزوجل کے نزدیک ان کا ایک مرتبہ ہے اور وہ دشمنوں پر ان کو نصرت اور فتح دینے کا ضامن ہے۔

---

[1] تفسیر الطبري (۲۳۱/۲۲) [2] الدر المنثور (۵۲۵/۷)

﴿ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴾ یعنی تا کہ وہ اس آیت کے سبب سے تم کو اور زیادہ ہدایت اور بصیرت اور اللہ تعالیٰ کے فضل پر یقین دے اور تم کو صلح حدیبیہ اور فتح خیبر کے سبب سے طریقِ حق کے راستے پر ثابت رکھے۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ تم کو ہدایت کرے اپنی راہ کی، تا کہ تم اس پر توکل کرو اور اپنے معاملات اس کے سپرد کر دو اس لیے کہ لوگوں کے ہاتھ روکنے سے حاصل یہی ہے اور اس لیے کہ ہدایت تو اس سے پہلے حاصل تھی۔

﴿ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا ﴾ ﴿ هٰذِهٖ ﴾ پر معطوف ہے، یعنی پس جلدی کی ان غنیمتوں کے لیے اور دوسری غنیمتوں کے لیے جن پر تم قادر نہ ہوئے۔ اس کے سوا اس میں اور وجوہ ہیں امام سمین رحمہ اللہ وغیرہ نے ان کو بیان کیا ہے۔ مراد وہ فتوح ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد مسلمانوں پر فتح کر دیا، جیسے: فارس اور روم اور اُن جیسے اور، حسن، مقاتل اور ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام ضحاک، ابن زید اور ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خیبر ہے اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے کہ اس کو فتح کرے اپنے نبی سے اس کا وعدہ کیا، حالاں کہ مسلمان اس کی اُمید نہیں رکھتے تھے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فتح مکہ ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حنین ہے، پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ وہ فتوح ہیں جو آج تک فتح کی جاتی ہیں۔[2] ان سے ایک روایت یہ ہے کہ وہ خیبر ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ کسی دوسرے شہر کی فتح ہے، مطلقاً۔ کسی نے کہا ہے کہ غزوۂ حنین میں ہوازن کی غنیمتیں ہیں۔

بالجملہ ﴿ اُخْرٰى ﴾ کی ایک صفت تو ﴿ لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا ﴾ ہے اور دوسری صفت ﴿ قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ﴾ ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ایسی دوسری غنیمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے اس کا احاطہ کیا، یہاں تک کہ تم اس کو فتح کرو اور اس کو لو۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ نے اس کو تمھارے لیے مہیا اور تیار کر رکھا اور اس کو اس شے کی طرح کر دیا جس کا احاطہ کر لیا گیا ہو اس کی ہر طرف سے، چنانچہ وہ محصور ہے کہ اس سے کوئی شے کم نہیں ہوتی۔ گو وہ فی الحال اس پر قادر نہیں ہوئے، مگر وہ اُن کے لیے روکی گئی، وہ ان سے فوت نہ ہوگی۔[4] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اللہ کے علم نے احاطہ کر لیا ہے، اس طرح سے کہ عن قریب وہ اُن کے لیے ہوگی۔

﴿ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴾ یعنی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اسی میں سے بستیوں اور شہروں کا فتح کرنا ہے، وہ ایسا قادر ہے کہ کوئی شے اس کو عاجز نہیں کرتی اور نہ ہی اس کی قدرت ایسی ہے کہ وہ صرف بعض چیزوں پر قادر ہو اور بعض پر نہ ہو، بلکہ اس کی قدرت تمام اشیاء کے ساتھ برابر ہے۔ ﴿ وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴾ یعنی اور اگر تم اہلِ مکہ سے اور کفارِ قریش سے لڑتے حدیبیہ میں، جیسا کہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[5] کسی نے کہا ہے کہ اسد و غطفان، جنھوں نے خیبر کی مدد کا ارادہ کیا تھا۔ پہلا قول زیادہ

---

[1] تفسير القرطبي (٢٧٩/١٦) [2] الدر المنثور (٥٢٥/٧) [3] تفسير الطبري (٢٤٣/٢٢)

[4] فتح القدير (٦٨/٥) [5] تفسير الطبري (٢٣٥/٢٢)

صحیح ہے۔ تو البتہ وہ پیٹھ پھیرتے، پھر وہ کوئی ایسا حمایتی نہ پاتے جو تم سے لڑنے پر ان کی حمایت کرے اور اُن کو محفوظ رکھے اور نہ کوئی مددگار پاتے جو تمھارے خلاف اُن کی مدد کرے۔

﴿ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ﴾ کا نصب اس بنا پر ہے کہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے: ''أَيْ: سَنَّ اللّٰهُ سُنَّةً'' یا پہلے جملہ کے مضمون کا مصدر موکد ہے، وہ مضمون یہی کفار کی ہزیمت اور مومنوں کی مدد ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی رسم اور عادت بنا رکھی ہے جو اگلی اُمتوں میں جاری ہو چکی ہے، وہ یہ ہے کہ اپنے دوستوں کو اپنے دشمنوں پر مظفر اور منصور کرتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ ﴾ [المجادلة: ٢١] ''بے شک میں اور میرے پیغمبر غالب رہیں گے۔'' یعنی البتہ میں غالب رہوں گا اور میرے رسول۔ پھر فرمایا: ﴿ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴾ یعنی تو اللہ کی رسم میں ہرگز تبدیل ہوتا نہ پائے گا، بلکہ وہ ہمیشہ جاری اور ثابت رہے گی۔

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ... الآية ﴾ یعنی وہی ہے جس نے مشرکوں کے ہاتھ مسلمانوں سے روکے اور مسلمانوں کے ہاتھ مشرکوں سے روکے، جبکہ وہ سالِ حدیبیہ میں آئے اور مشرک لوگ رسول اللہ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو بیت اللہ سے روکتے تھے۔ بطنِ مکہ سے یہی حدیبیہ مراد ہے، اس لیے کہ اس کا زیادہ تر حصہ حرم سے ہے اور یہ مسلمانوں اور مشرکوں کے ہاتھوں کا روکنا اس کے بعد تھا کہ تم کو ان پر کامیابی دی، یعنی تم کو ان پر قادر اور مسلط کر دیا تھا، کیوں کہ مروی ہے کہ عکرمہ بن ابی جہل پانچ سو سواروں کے ساتھ نکلا تو رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کو بھیجا جس نے اس کو شکست دی اور اس کو مکے کی دیواروں میں داخل کر دیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اُن پر غالب کر دیا پتھروں کے سبب سے، یہاں تک کہ ان کو گھروں میں داخل کر دیا۔[1] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ وہی ہے جس نے ان کے اور تمھارے درمیان مکافہ ومحاجزہ کا حکم جاری کر دیا، یعنی دونوں فریق میں روک کر دی اس کے بعد کہ تم کو ان پر کامیابی اور غلبہ عطا کیا اور یہ فتح کے دن ہوا۔ اسی سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اس پر استشہاد کیا ہے کہ مکہ بطور عنوہ و غلبہ فتح کیا گیا نہ کہ بطور صلح کے۔ اس بنا پر بطنِ مکہ سے مراد مکہ ہے۔ ﴿ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال کو خوب دیکھتا ہے کوئی شے اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ﴿ تَعْمَلُوْنَ ﴾ کو بہ تاء و یاء دونوں طرح پڑھا ہے اور دونوں سبعیہ ہیں۔ اس بارے میں حدیثیں پہلے گزر چکی ہیں۔[2]

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا
اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۭ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَاۗءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ
تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ

---

(1) الكشاف (٤/٣٤٤) (2) فتح البيان (١٣/١٠٧-١١٠)

فِي رَحْمَتِهِ مَنْ يَّشَاءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ
عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿٢٥﴾ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ
حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى
الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ۭ
وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿٢٦﴾

یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تمھیں مسجدِ حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی اپنی قربان گاہ تک پہنچنے سے روکے رکھا اور اگر (مکہ میں کچھ) مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتے جن (کے ایمان) کو تم نہیں جانتے، (اگر یہ خطرہ نہ ہوتا) کہ تم انھیں روند ڈالو گے، پھر بے خبری میں ان (کے قتل) کی وجہ سے تمھیں تکلیف پہنچتی (تو تمھیں لڑنے کی اجازت دے دی جاتی لیکن ایسا نہیں کیا گیا) تاکہ اللہ جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے۔ اگر وہ (مومن اور کافر) الگ الگ ہوتے تو ان میں جو کافر تھے، ہم انھیں نہایت دردناک عذاب دیتے (25) جن لوگوں نے کفر کیا جب انھوں نے اپنے دلوں میں حمیت (غیرت) پیدا کر لی۔ جاہلیت کی حمیت (غیرت)۔ تو اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر تسکین نازل کی اور ان کو تقویٰ کی بات پر ثابت قدم رکھا اور وہ اس کے زیادہ مستحق اور اہل تھے اور اللہ ہر شے کو خوب جانتا ہے (26)

صلح حدیبیہ کی حکمتیں:

اس ماجرے میں ساری ضد اور کعبے کی بے ادبی انہیں سے ہوئی تم با ادب رہے۔ انھوں نے عمرے کے لیے آنے والوں کو منع کیا اور قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچنے دی۔ وہ اس قابل تھے کہ اسی وقت تمھارے ہاتھ سے فتح ہوتی مگر بعض مسلمان مرد اور عورتیں چھپے تھے اور بعض ابھی مسلمان ہونے کے لیے تیار تھے اس زور کی فتح میں وہ پیسے جاتے، آخر دو سال کے صلح کے زمانے میں جتنے مسلمان ہونے تھے، سب ہو چکے اور نکلنے والے نکل آئے، تب اللہ تعالیٰ نے مکہ فتح کروا دیا۔ کافروں نے اپنے دلوں میں حمیت کو جگہ دی۔ حمیت کی وجہ سے ایک ضد یہ کی کہ اس دفعہ عمرہ نہ کرنے دیا اور صلح نامے میں یہ طے کیا کہ جو مسلمان ہجرت کرے، اس کو واپس کر دو اور اگلے سال عمرے کے لیے جب آؤ تو تین دن سے زیادہ قیام نہ کرو اور کھلے ہتھیار نہ لاؤ۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ سب قبول کر لیا۔ انتھیٰ۔

اللہ پاک ایسے تمام لوگوں کو خبر دیتا ہے جو کفار مشرکینِ عرب میں سے تھے، یعنی قریش اور وہ لوگ جنھوں نے

ان کو اس پر آمادہ کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر اُن کی مدد کریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ﴾ یعنی کفار یہی ہیں نہ کہ ان کے غیر اور تم کو مسجد الحرام میں سے روکا، حالانکہ حقیقت میں اس کے زیادہ تر مستحق تمھیں ہو اور تمھیں حرم کے اہل لوگ ہو۔ اور انھوں نے قربانی کو روکا کہ اپنی جگہ پر پہنچے، حالانکہ یہ روکنا ان کی سرکشی اور دشمنی میں سے ہے۔ قربانی کے جانور ستر اونٹ تھے، چنانچہ ۔ان شاء اللہ تعالیٰ۔ آیندہ اس کا بیان آئے گا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ﴾ یعنی اگر ان کے درمیان بہت سے ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں نہ ہوتیں جو اپنی جان کے خوف سے اپنا ایمان قوم سے چھپاتے تھے، البتہ ہم تم کو ان پر مسلط کر دیتے تو تم ان کو مار ڈالتے اور اُن کی جماعت کو ہلاک کر دیتے، لیکن ان کے ان غیر معروف لوگوں میں سے مومن مردوں اور عورتوں سے کئی قومیں تھیں کہ لڑائی کی حالت میں تم ان کو نہیں پہچانتے تھے، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿لَمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾ یعنی تم ان کو نہیں جانتے تھے تو یہ خطرہ تھا کہ تم ان کو پیس ڈالتے، پھر تم کو اس کا گناہ پہنچتا اور بے خبری میں غرامت (تاوان) بھی دینا پڑتا، اللہ اپنی مہر میں جس کو چاہے داخل کرتا ہے، یعنی اُن کی سزا میں تاخیر کرتا ہے، تاکہ ان کے درمیان سے مومنوں کو الگ کر دے اور تاکہ اُن میں سے بہت سے لوگ اسلام کی طرف آجائیں۔ پھر فرمایا: ﴿لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا﴾ یعنی اگر کفار اُن مومنوں سے چھٹ جاتے جو اُن کے درمیان میں تھے تو البتہ ہم تم کو اُن پر مسلط کر دیتے، پھر البتہ تم کو مار ڈالتے تیزی سے مار ڈالنا۔

حافظ ابو القاسم طبرانی رحمہ اللہ نے حجر بن خلف سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سنا، وہ کہتے تھے: میں نے جنید بن سبیع کو سنا، وہ کہتے تھے کہ میں دن کے شروع میں تو رسول اللہ ﷺ سے لڑا کفر کی حالت میں اور دن کے آخر میں اُن کی معیت میں مسلمان ہو کر لڑا اور ہمارے حق میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ... الآية﴾ کہا: ہم نو آدمی تھے، سات مرد اور دو عورتیں۔[1] (ثم رواه من طريق أخرى عن محمد بن عباد المكي به وقال فيه عن أبي جمعة جنيد بن سبيع (فتح البیان میں جنید بن سبع ہے) فذكره والصواب أبو جعفر حبيب بن سباع رواه ابن أبي حاتم من حديث حجر بن خلف به) اور کہا ہم تین مرد تھے اور نو عورتیں اور ہمارے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ﴾[2] (فتح البیان میں ہے: أخرجه الطبراني وأبو يعلىٰ وابن أبي حاتم و ابن قانع و الماوردي و ابن مردويه قال السيوطي بسند جيد)

---

[1] المعجم الكبير (٢/٢٩٠) [2] المعجم الكبير (٤/٢٤) فتح البيان (١٣/١١٢، ١١٣) الدر المنثور (٧/٥٣٤)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے، یعنی اگر کفار مومنوں سے جدا ہو جاتے تو البتہ کافروں کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہونے کا عذابِ الیم کرتا۔[1]

قولہ عزوجل: ﴿ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ ﴾ یعنی جب کافروں نے اپنے دل میں اپنی قومی حمیت کی ضد رکھی، یعنی جب اس سے انکار کیا کہ "بسم الله الرحمن الرحيم" لکھا جائے اور انکار کیا کہ یوں لکھا جائے: "هٰذَا مَا قَاضٰى عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ"۔ ﴿ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾۔ ﴿ كَلِمَةَ التَّقْوٰى ﴾ میں تقویٰ سے مراد "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کا کہنا ہے، جیسا کہ امام ابن جریر اور عبداللہ بن امام احمد رحمہما اللہ نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے سنا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: ﴿ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى ﴾ فرمایا: "لا إله إلا اللّٰه"[2] (وكذا رواه الترمذي عن الحسن بن قزعة وقال: غريب لا نعرفه إلا من حديثه، وسالت أبا زرعة عنه فلم يعرفه إلا من هذا الوجه)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سعید بن مسیّب سے روایت کیا ہے کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ان کو خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے لڑوں، یہاں تک کہ وہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کہیں، چنانچہ جس نے "لا إله إلا اللّٰه" کہہ دیا تو یقیناً اس نے مجھ سے اپنا مال اور اپنی جان مجھ سے بچا لی مگر اس کے حق کے ساتھ اور اس کا حساب اللہ عزوجل پر ہے۔ اور اتارا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور ایک قوم کا ذکر کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ [الصافات: ۳۵] "یہ وہ (لوگ) ہیں کہ جب ان سے کہا جاتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو یہ سرکشی کرتے تھے۔"

نیز اللہ عزوجل ثناء نے فرمایا: ﴿ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ﴾ اور وہ کلمہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ" ہے، پس تکبر کیا اس سے مشرکوں نے حدیبیہ کے دن تو اُن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدت کے معاملے میں مکاتبہ کیا۔[3] (وكذا رواه بهذه الزيادات ابن جرير من حديث الزهري والظاهر أنها مدرجة من كلام الزهري والله أعلم) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كَلِمَةَ التَّقْوٰى ﴾ "اَلْإِخْلَاصُ"۔ امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ یہ ہے: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ

① تفسير ابن كثير (٢٤٥/٤)
② تفسير الطبري (٢٥٣/٢٢) مسند أحمد (١٣٨/٥) سنن الترمذي (٣٢٦٥) اس کی سند میں "ثویر بن ابی فاختہ" ضعیف راوی ہے۔
③ تفسير الطبري (٢٥٢/٢٢)

شَيْءٍ قَدِيْرٌ“ یونس بن بکیر نے عن اسحاق عن الزہری عن عروۃ عن المسور روایت کیا ہے، کہا: ”لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ“ ہے۔

امام ثوری نے عن سلمہ بن کہیل عن عبایہ بن ربعی عن علی رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، فرمایا: ”لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ“ ہے۔ اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی فرمایا ہے۔ علی بن ابی طلحہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: ”شَهَادَةُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ“ ہے اور یہ ہر تقویٰ کا سر ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: ”لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ“ ہے اور اس کی راہ میں جہاد ہے۔ امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ“ ہے۔ عبداللہ بن مبارک نے عن معمر عن الزہری روایت کیا ہے کہ ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ“ ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ”لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ“ ہے۔[1] اور وہ اس کے زیادہ حق دار تھے اور اس کے لوگ یعنی مسلمان زیادہ حق دار اور اہل تھے۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ یعنی وہ اس شخص کو خوب جانتا ہے جو خیر کا مستحق ہے اس شخص سے جو شر کا مستحق ہے۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ یوں پڑھا کرتے تھے: ”إِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَلَوْ حَمَيْتُمْ كَمَا حَمُوْا لَفَسَدَ الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ“ پس یہ خبر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو انھوں نے ان سے سخت کلام کی، چنانچہ وہ بولے: بے شک تو البتہ جانتا ہے کہ بے شک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جایا کرتا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو اس شے میں سے سکھایا کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھائی تھی۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو ایک شخص ہے کہ تیرے پاس علم ہے اور قرآن ہے، لہٰذا تو پڑھ اور اس شے سے سکھا جو تجھ کو اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائی۔[2]

ذکر ان حدیثوں کا جو حدیبیہ اور صلح کے قصے میں وارد ہوئی ہیں:

امام احمد رحمہ اللہ نے مسور بن مخرمہ اور مروان بن حکم سے روایت کیا ہے (حدثنا يزيد بن هارون أخبرنا محمد بن إسحاق بن يسار عن الزهري عن عروة بن الزبير عن المسور... الخ)، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کی زیارت کے ارادے سے نکلے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم لڑائی کا ارادہ نہیں رکھتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ ستر اونٹ قربانی کے لیے لائے اور لوگ سات سو کی تعداد میں تھے، اس طرح ہر اونٹ دس آدمیوں کی طرف سے ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے یہاں تک کہ جب آپ عسفان میں تھے تو بشیر بن سفیان کعبی آپ سے ملا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! ان قریش نے جب آپ کے روانہ ہونے کا سنا تو وہ نکلے اس حال میں کہ ان کے ہمراہ عوذ اور مطافیل ہیں

---

[1] تفسير الطبري (٢٢/٢٥٣ـ٢٥٦) تفسير ابن كثير (٤/٢٤٦) [2] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٦٣)

(عوذ جمع عائذ ہے اور عائذ وہ اونٹنی کہ جس کے جننے کے بعد اس کا بچہ مضبوط ہو جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر وہ مادہ ہے جس کو جنے ہوئے سات راتیں گزری ہوں۔ مطافیل جمع ہے مطفل کی۔ مطفل وہ اونٹنی ہے جس کے ساتھ اس کا فصیل ہو، یعنی وہ بچہ جس نے دودھ پینا چھوڑ دیا ہے۔ یہ بطور استعارہ ہے، مراد آدمی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی عورتیں اور بچوں کے ساتھ خوب تیار ہو کر آئے ہیں)

درحقیقت انھوں نے تیندوں کے چمڑے پہنے ہیں، یہ کنایہ ہے اس بات سے کہ نہایت درجہ کینہ ور اور غضبناک ہو کر آئے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ ان پر آپ غلبے کے طور پر کبھی مکے میں داخل نہ ہوں گے اور یہ خالد بن ولید اُن کے سواروں میں سے ہے۔ انھوں نے واقعی اس کو کراعِ غمیم کی طرف آگے بھیجا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: اے افسوس قریش کا! مقرر لڑائی نے ان کو کھا لیا ہے، یعنی کمزور کر ڈالا ہے۔ انھیں کیا ہو جاتا، یعنی ان کا کیا نقصان تھا اگر وہ مجھے چھوڑ دیتے اور اپنے لوگوں کو، پس اگر وہ مجھے ایذا پہنچاتے تو وہ شے ہوتی جو انھوں نے چاہی اور اگر مجھے اللہ تعالیٰ غالب کر دیتا تو وہ اسلام میں داخل ہوتے اس حالت میں کہ وہ وافر ہوتے اور اگر وہ اسلام نہ لاتے تو لڑتے اور اُن میں قوت ہوتی۔

پھر قریش کیا خیال کرتے ہیں، پس قسم ہے اللہ کی! میں ہمیشہ اُن سے اس شے پر جہاد کرتا رہوں گا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے، یہاں تک کہ اللہ عزوجل مجھے غالب کرے یا یہ سالفہ، یعنی گردن مجھ سے جدا ہو جائے۔ غرض یہ ہے کہ مجھے موت آ جائے۔ پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا تو وہ حمض کی دو جانبوں میں سیدھی جانب کے راستے پر چلے جو آپ ﷺ کو مرار کی گھاٹی پر نکالے۔ اور حدیبیہ مکے کے اسفل، یعنی نیچے کی طرف ہے۔

راوی نے کہا ہے کہ پھر آپ ﷺ لشکر لے کر اس راہ پر چلے۔ پھر جب قریش کے سواروں نے لشکر کا غبار دیکھا جو ان کے راستے کی مخالف سمت پر تھا تو قریش کی طرف واپس مڑ کر دوڑے۔ پس رسول اللہ ﷺ نکلے، یہاں تک کہ جب آپ ﷺ مرار کی گھاٹی میں پہنچے تو آپ ﷺ کی اونٹنی بیٹھ گئی، چنانچہ لوگوں نے کہا: ''خَلَأَتْ''، یعنی سرکشی کی (اونٹنی کی سرکشی کو ''خلاء'' اور اونٹ کی سرکشی کو ''الحاح'' اور گھوڑے وغیرہ کی سرکشی کو ''حرون'' کہتے ہیں) آپ ﷺ نے فرمایا: اس نے سرکشی نہیں کی اور نہ ہی وہ اس کی عادت ہے، لیکن اس کو تو ہاتھی کو مکے کی طرف جانے سے روکنے والے نے روکا ہے۔ اللہ کی قسم! آج کے دن قریش مجھے کسی حالت کی طرف نہیں بلائیں گے جس میں وہ مجھ سے صلہ رحمی کا سوال کریں گے، مگر میں ان کو وہ دوں گا۔

پھر آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا: اتر پڑو۔ عرض کی: اے اللہ کے رسول! وادی میں ایسا پانی نہیں جس پر لوگ اتریں تو آپ ﷺ نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکالا، پھر اپنے اصحاب میں سے ایک شخص کو دیا تو وہ ان کنوؤں

میں سے ایک کنویں پر اترا اور اس کو اس میں گاڑ دیا تو پانی نے لوگوں پر جوش مارا۔ ”حَتّٰى ضَرَبَ النَّاسُ عَنْهُ بِعَطَنٍ“ یعنی اتنا کثرت سے پانی نکلا کہ سب لوگ خوب سیراب ہو کر کنویں کے گرد بیٹھ گئے۔ پھر جب آپ ﷺ نے تھوڑا آرام کیا تو اچانک قبیلۂ خزاعہ کے لوگوں میں سے بدیل بن ورقاء آیا، چنانچہ آپ ﷺ نے اس سے ویسی بات کہی جیسی بشر بن سفیان سے فرمائی تھی۔ پھر وہ قریش کی طرف واپس گئے تو بدیل نے کہا: او گروہ قریش! تم محمد ﷺ پر جلدی کرتے ہو، بے شک محمد ﷺ لڑنے کے لیے نہیں آئے ہیں، وہ تو صرف اس گھر کے زائر اور معظم ہو کر آئے ہیں۔ چنانچہ قریش نے خزاعہ کے آدمیوں کو متہم کیا، یعنی تم ان سے ملے ہوئے ہو۔

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ زہری رحمہ اللہ نے کہا: ”وَكَانَتْ خُزَاعَةُ عَيْبَةَ نُصْحِ رَسُوْلِ اللّٰهِ مُشْرِكُهَا وَمُسْلِمُهَا“ یعنی خزاعہ کے خواہ مسلمان ہوں یا مشرک آپ ﷺ کے راز دار اور خیر خواہ تھے، مکے میں جو کچھ ہوتا اس کو آپ ﷺ سے مخفی نہیں رکھتے تھے۔ پھر قریش بولے: گو وہ اسی لیے آیا ہو، پس قسم ہے اللہ کی! وہ ہم پر غلبے کے طور پر اس میں کبھی بھی داخل نہ ہوگا۔ اور نہ ہی عرب لوگ اس سے بات چیت کریں گے (یعنی اگرچہ وہ عمرہ کرنے کے لیے آئے ہیں، مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ بطور غلبہ مکے میں داخل ہوں اور عرب لوگ چرچا کریں کہ قریش سے کچھ نہ بنا زبردستی مکے میں گھس آئے، اس میں ہماری ذلت ہے)۔ اور پھر مکرز بن حفص کو آپ ﷺ کی طرف بھیجا، یہ بنی عامر بن لوئی کا ایک شخص تھا۔ چنانچہ جب آپ ﷺ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ ”هٰذَا رَجُلٌ غَادِرٌ“ یعنی یہ ایک عہد شکن شخص ہے۔

پھر جب وہ آپ ﷺ تک پہنچا تو آپ ﷺ نے اس سے ویسی گفتگو کی جیسی کہ اس کے اصحاب کے ساتھ کی تھی، پھر وہ قریش کی طرف واپس گیا اور جو کچھ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا تھا، اس کی ان کو خبر دی۔ پھر انھوں نے خلیس بن علقمہ کنانی کو آپ ﷺ کی طرف بھیجا، یہ شخص اس وقت احابیش (یعنی حلیف لوگ جو قریش نے جمع کیے تھے۔ اس میں اور قول بھی ہیں) کا سردار تھا، چنانچہ جب آپ ﷺ نے اس کو دیکھا تو فرمایا: «هٰذَا مِنْ قَوْمٍ يَتَأَلَّهُوْنَ» یعنی یہ ان لوگوں میں سے ہے جو ہدی کی تعظیم کرتے ہیں، سو تم ہدی کو اٹھا کھڑا کرو، چنانچہ جب اس نے قربانی کو دیکھا کہ وادی کی طرف سے اس پر بہتی آرہی ہے اپنے قلادوں میں جس کے پشم زیادہ دیر کے رہنے کی وجہ سے کھا لیے گئے تھے، یعنی ہدی کے گلے میں نشانی کے طور پر درخت کے چھال کی یا اونٹ کے پشم کی رسی بنا کر ڈالتے ہیں، وہ زیادہ مدت کی وجہ سے گھس گھسا گئی۔ غرض کہ اس نے ہدی کو ایسی ٹوٹی ہوئی حالت میں دیکھا اور وہ ہدی کی تعظیم کرنے والوں میں سے تھا۔ پھر وہ لوٹ گیا اور ہدی کی جو حالت دیکھی تھی اس کی عظمت و عزت کرنے کی وجہ سے آپ ﷺ تک نہ پہنچا۔

جب وہ قریش کے پاس واپس پہنچا تو کہا: اے قریش کے گروہ! البتہ میں نے وہ شے دیکھی جس کا روکنا حلال نہیں ہے۔ ہدی ہے جس کے گلو بندوں کے پشم طولِ حَبس کے سبب سے اپنی جگہ سے کھا لیے گئے۔ قریش بولے: بیٹھ

جا تُو تو ایک گنوار آدمی ہے، تجھے کچھ علم نہیں ہے۔ پھر عروہ بن مسعود ثقفی کو آپ ﷺ کی طرف بھیجا، (اسے بھیجنے کا ارادہ کیا) تو وہ بولا: اے گروہِ قریش! بے شک میں نے یقیناً تم میں وہ درشتی وسختی اور بدگوئی دیکھ لی جس کا سامنا وہ شخص کرتا ہے جس کو تم محمد ﷺ کی طرف بھیجتے ہو اور وہ تمھارے پاس واپس آتا ہے اور واقعی تم جان چکے ہو کہ بے شک تم میرے لیے والد ہو اور میں ولد ہوں (بخاری کے الفاظ یہ ہیں: ''أَيْ: قوم ألست بالوالد؟ قالوا: بلی قال: أو لستم بالولد؟ قالوا: بلی''۔ بخاری کی یہ عبارت ابوذر کے نسخے کی بنا پر ہے اور غیر ابوذر کے نسخے میں وہ لفظ واقع ہوا ہے جس طرح اس جگہ تفسیر میں ہے۔ از مصحح سلمه الله تعالیٰ) اور مقرر میں نے سنی وہ شے جو تم پر آپڑی تو میں نے اس شخص کو اپنی قوم میں سے جمع کیا جس نے میرا کہا مانا، پھر میں آیا خود آیا کہ تمھاری غمخواری کروں۔ قریش بولے: تو نے سچ کہا تُو تو ہمارے نزدیک کچھ متہم نہیں ہے۔

پھر وہ نکلا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ کے روبرو بیٹھا اور کہا: او محمد! تو نے اوباش لوگ جمع کر لیے (یعنی متفرق قبیلوں کے لوگ) پھر تو اُن کو لے کر اپنے بیضے کے لیے، یعنی اپنے اصل اور خاندان کے لوگوں کے پاس آیا، تاکہ تو اُن کو توڑے۔ بے شک وہ تو قریش ہیں، وہ واقعی عوذ ومطافیل کو اپنے ساتھ لے کر نکلے ہیں اور تیندوؤں کی کھالیں پہن چکے ہیں، اللہ تعالیٰ سے عہد کرتے ہیں کہ تو اس میں کبھی داخل نہ ہوگا زبردستی یا غلبے کے طور پر اور قسم ہے اللہ کی! البتہ یہ لوگ جو تیرے ساتھ ہیں یہ تجھ سے کل کو یقیناً کھل گئے، یعنی یہ ایسے بودے ہیں کہ مجھے آج ہی نظر آ رہے ہیں، کل تیرے پاس سے بھاگ جائیں گے۔

راوی نے کہا کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، جو نبی کریم ﷺ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، وہ بولے: ''أُمْصُصْ بَظْرَ اللَّاتِ'' یعنی تو لات کا ٹنا چوس گیا، ہم آپ ﷺ کے پاس سے بھاگ جائیں گے۔ عروہ بولا: اے محمد! یہ کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ ابن ابی قحافہ ہے۔ عروہ بولا: سنتا ہے! اگر وہ احسان نہ ہوتا جو تیرا میرے پاس ہے تو البتہ میں اس گالی کا تجھے بدلہ دیتا، لیکن یہ گالی اس احسان کے عوض ہوگئی، پھر اس نے آپ کی ریش مبارک کی طرف ہاتھ بڑھایا اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ آپ کے سر مبارک کے پاس ہتھیار لے کر کھڑے تھے۔

راوی نے کہا: پس انھوں نے اس کے ہاتھ کو مارا، پھر کہا: اپنا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کی ریش مبارک سے دور رکھ۔ کسی نے کہا: واللہ! وہ تجھ تک نہ پہنچے گا (یعنی تجھ تک پہنچنے سے پہلے قلم ہو جائے گا)۔ عروہ بولا: ''وَيْحَكَ مَا أَفَظَّكَ وَأَغْلَظَكَ'' یعنی تیرا برا ہو تو کیسا سخت گو اور درشت خو ہے۔ آپ ﷺ مسکرائے (والله أعلم۔ مسکرانے کی کیا وجہ، شاید یہ ہو کہ اسلام کی محبت میں بھتیجا ہو کر چچا سے ایسی بدکلامی کرتا ہے) عروہ بولا: اے محمد! یہ کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تیرا بھتیجا مغیرہ بن شعبہ ہے۔

عروہ بولا: "أَغُدَرُ وَهَلُ غَسَلُتُ سَوُأَتَكَ إِلَّا بِالْأَمُسِ" (یعنی بے وفا کل کی بات ہے کہ میں نے تیری پیٹھ دھوئی تو چھوٹا ہو کر مجھ سے سخت کلامی کرتا ہے) راوی نے کہا: پھر آپ ﷺ نے اس سے ویسی باتیں کیں، جیسی اس کے پہلے ساتھیوں کی تھیں اور اسے خبر دی کہ ہم لڑائی کے ارادے سے نہیں آئے۔ پھر وہ آپ ﷺ کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے وہ شے دیکھی جو آپ ﷺ کے اصحاب کرتے تھے۔ آپ ﷺ وضو نہ کرتے تھے، مگر وہ اس کے پانی کو لے لیتے اور نہ تھوکتے، مگر اس کو جھپٹ لیتے اور آپ ﷺ کے بالوں میں سے کوئی شے نہ گرتی، مگر وہ اس کو لے لیتے، چنانچہ وہ قریش کی طرف واپس گیا اور کہا: اے قریش کے گروہ! بے شک میں کسریٰ کے پاس اس کے ملک میں گیا اور قیصر و نجاشی کے پاس ان کے ملک میں گیا، واللہ! میں نے کسی بادشاہ کو اس طرح نہیں دیکھا جس طرح محمد ﷺ اپنے اصحاب میں ہیں، البتہ میں نے حقیقتاً ایسی قوم دیکھی ہے جو اس کو کسی شے کے لیے بھی سپرد نہ کریں گے، لہٰذا تم جو چاہو کرو۔

راوی نے کہا کہ اس سے قبل رسول اللہ ﷺ نے خراش بن اُمیہ خزاعی کو مکے کی طرف بھیجا تھا اور اس کو اپنے ثعلب نامی اونٹ پر سوار کیا تھا۔ جب وہ مکے میں داخل ہوا تو قریش نے اس کی کھونچیں کاٹ ڈالیں اور خراش کے قتل کا ارادہ کیا تو احابیش نے ان کو منع کیا، یہاں تک کہ وہ آپ ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے عمر رضی اللہ عنہ کو بلایا، تاکہ ان کو مکے کی طرف بھیجیں، وہ بولے: اے اللہ کے رسول! بے شک مجھے قریش سے اپنی جان کا ڈر ہے اور وہاں بنی عدی میں سے کوئی بھی ایسا شخص نہیں جو مجھے بچائے۔ اور قریش اس بات کو یقیناً جان چکے ہیں کہ میں ان کو دشمن رکھتا ہوں اور ان پر سخت گیر ہوں، لیکن میں آپ کو ایسا شخص بتاتا ہوں جس کی وہاں مجھ سے زیادہ عزت ہے، یعنی عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔

راوی نے کہا: پس آپ ﷺ نے عثمان رضی اللہ عنہ کو بلایا اور اُن کو قریش کے پاس بھیجا کہ انھیں خبر دیں کہ ہم کسی سے لڑنے کے لیے نہیں آئے، ہم تو صرف اس گھر کی زیارت اور اس کی حرمت کی تعظیم کرنے کی غرض سے آئے ہیں۔ چنانچہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نکلے، یہاں تک کہ مکے میں آئے تو ابان بن سعید بن العاص ان کو ملا، وہ اپنی سواری سے اترا اور اُن کو اپنے آگے سوار کر لیا اور خود ان کے پیچھے بیٹھا اور اُن کو پناہ دی، یہاں تک کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کا پیغام پہنچایا۔ چنانچہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ چلے، یہاں تک کہ ابوسفیان اور قریش کے بڑے لوگوں کے پاس آئے اور جو پیغام دے کر نبی اکرم ﷺ نے ان کو بھیجا تھا، وہ آپ ﷺ کی طرف سے اُن کو پہنچا دیا۔ انھوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر تو بیت اللہ کا طواف کرنا چاہے تو کر لے۔ وہ بولے کہ میں ایسا نہیں ہوں کہ طواف کروں، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ اس کا طواف کریں۔ راوی نے کہا کہ قریش نے ان کو اپنے پاس روک رکھا۔ کہا: اور آپ ﷺ کو خبر پہنچی کہ عثمان رضی اللہ عنہ مار ڈالے گئے۔

محمد رحمہ اللہ نے کہا: پس زہری رحمہ اللہ نے مجھے حدیث کی کہ قریش نے سہیل بن عمرو کو بھیجا اور کہا کہ تو محمد کے پاس جا اور اس سے صلح کر اور تو اس صلح میں یہ طے کر کہ اس سال وہ ہماری طرف سے واپس لوٹ جائے، پس اللہ کی قسم! عرب لوگ کبھی یہ بات چیت نہ کریں گے کہ وہ اس میں ہم پر غلبے کے طور پر داخل ہو۔ پھر سہیل بن عمرو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ اب واقعی قوم نے صلح کا ارادہ کیا ہے، اس لیے اس شخص کو بھیجا ہے۔

پھر جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو باہم باتیں کیں اور لمبی تقریر کی اور آپس میں سوال و جواب کیا، پھر جب کام درست ہو گیا اور صرف صلح نامہ باقی رہ گیا تو سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جلدی سے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا: اے ابوبکر! کیا ہم مسلمان اور وہ مشرک نہیں ہیں؟ انھوں نے کہا: کیوں نہیں۔ کہا: پھر ہم اپنے دین کے بارے میں کس بات پر ذلت دیے جائیں؟ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ بولے: تُو تو ان کی رکاب پکڑے رہ، جہاں کہیں وہ ہوں، بے شک میں گواہی دیتا ہوں اس بات کی کہ بے شک وہ اللہ کے رسول ہیں تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بولے: اور میں بھی گواہی دیتا ہوں۔

پھر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا ہم مسلمان نہیں ہیں اور وہ مشرک؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیوں نہیں۔ عرض کی: پھر ہم کس بات پر اپنے دین میں ذلت دیے جائیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، ہرگز اس کے حکم کی مخالفت نہ کروں گا اور وہ ہرگز مجھے ضائع نہ کرے گا۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں ہمیشہ روزے رکھتا اور نماز پڑھتا اور صدقہ دیتا اور لونڈی غلام آزاد کرتا رہا، اس شے سے جو میں نے اپنی اس بات سے جس کے ساتھ میں نے اس دن کلام کیا، یہاں تک کہ میں نے یہ امید کی کہ خیر ہو۔

راوی نے کہا: پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا کہ لکھ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پس سہیل بولا: میں اس کو نہیں پہچانتا، تو لکھ "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ"، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لکھ "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ، هٰذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ"، چنانچہ سہیل بن عمرو بولا: اگر میں یہ گواہی دیتا کہ تو اللہ کا رسول ہے تو تجھ سے نہ لڑتا، تو لکھ "هٰذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ وَسُهَيْلُ بْنُ عَمْرٍو عَلٰى وَضْعِ الْحَرْبِ... الخ"، یعنی یہ وہ شے ہے جس پر محمد بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو نے دس برس تک لڑائی کے موقوف کرنے پر صلح کی۔

ان سالوں میں لوگ با امن رہیں اور بعض اُن کا بعض سے باز رہے، اس بات پر کہ جو کوئی اُن کے اصحاب میں سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو اس کو اس کے ولی کی طرف پھیر دیں اور جو کوئی قریش کے پاس اُن لوگوں میں سے آ جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں تو قریش اس کو نہ پھیریں۔ "وَأَنَّ بَيْنَنَا عَيْبَةً مَكْفُوْفَةً وَأَنَّهُ لَا إِسْلَالَ وَلَا إِغْلَالَ"، یعنی اس بات پر صلح کر لی کہ ہمارے درمیان جامہ دانی بندھی ہوئی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جیسے جامہ دان میں کپڑے محفوظ بندھے رہتے ہیں، اسی طرح جو امور ہم سے شروع میں ہو چکے ہیں، وہ بندے ہوئے رہیں، ہم میں سے کوئی ان کا اظہار اور ذکر نہ کرے۔ اور اس بات پر کہ چوری نہیں ہے اور

تلوار کھینچنا نہیں ہے اور نہ کسی طرح کی خیانت ہے اور زرہ پہننا نہیں ہے، یعنی ایک دوسرے سے نہ لڑیں۔ اور ان کی شرط میں جب انھوں نے صلح نامہ لکھا، یہ بات تھی کہ جو کوئی یہ پسند کرے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے عقد اور عہد میں داخل ہو تو اس میں داخل ہو جائے اور جو کوئی یہ پسند کرے کہ قریش کے عقد و عہد میں داخل ہو تو اس میں داخل ہو جائے۔ چنانچہ خزاعہ نے جست کی اور کہا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے عقد و عہد میں ہیں اور بنی بکر نے جست کی اور کہا کہ ہم قریش کے عقد و عہد میں ہیں اور یہ بات بھی صلح نامے میں تھی کہ اس سال تو ہمارے پاس سے لوٹ جائے اور مکے میں ہم پر داخل نہ ہو اور یہ بات کہ آئندہ سال ہم مکے میں تیرے پاس سے نکل جائیں گے، پھر تو اس میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ داخل ہو اور اس میں تین رات تک اس حال میں قیام کرے کہ تیرے پاس صرف تلواریں ہوں اپنے غلافوں میں جیسے سوار رکھتے ہیں ان کے سوا اور کوئی ہتھیار نہ ہو۔

پھر اس دوران میں کہ رسول اللہ ﷺ صلح نامہ لکھ رہے تھے کہ اچانک ابو جندل بن سہیل بن عمرو آپ کے پاس آیا، اس نے بیڑیاں پہنی ہوئی تھیں اور وہ چھوٹ کر بھاگ کر آیا تھا۔ راوی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب تو مدینے سے اس حال میں نکلے تھے کہ انھوں نے ان خوابوں کے سبب سے جو آپ ﷺ نے دیکھے تھے یہ تصور باندھ رکھا تھا کہ آرام سے عمرہ کر لیں گے، پھر جب انھوں نے دیکھا جو کچھ کہ دیکھا، یعنی صلح ہو جانا اور بغیر عمرہ کیے ہوئے لوٹ جانا اور آپ ﷺ کا اپنے نفس پر برداشت کرنا تو لوگوں کو اس سے ایک امرِ عظیم کا سامنا ہوا، یعنی یہ بات ان پر انتہائی گراں گزری، یہاں تک کہ قریب تھا کہ وہ ہلاک ہو جائیں۔

پھر جب سہیل نے ابو جندل رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو اس کے پاس گیا اور اس کے منہ پر مارا اور کہا: اے محمد! میرے اور تیرے درمیان اس کے آنے سے پہلے فیصلہ طے پا چکا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو نے سچ کہا، پھر وہ اس کی طرف گیا اور اس کا گریبان پکڑا۔ راوی نے کہا کہ ابو جندل رضی اللہ عنہ اپنی بلند آواز سے چیخا، اے مسلمانو! کیا تم مجھے اہلِ شرک کی طرف لوٹتے دیتے ہو، تاکہ وہ مجھے میرے دین میں اذیت دیں۔ کہا: پھر لوگوں کو اور زیادہ تکلیف ہوئی اس رنج کے ساتھ جو اُن کو پہلے سے تھا، یعنی ایک تو یہ سارے امور اُن پر گراں تھے اور سخت رنجیدہ ہو رہے تھے اور اب ابو جندل رضی اللہ عنہ کا واپس کر دینا ایسے حال میں اُن پر اور بھی زیادہ شاق گزرا۔

چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ابو جندل! تو صبر کر اور اجر کا طلب گار ہو، بے شک اللہ تعالیٰ تیرے لیے اور اُن کمزور لوگوں کے لیے جو تیرے ساتھ ہیں، کشائش اور تکلیف سے نکلنے کا سبب پیدا کرنے والا ہے، بے شک ہم اپنے اور قوم کے درمیان صلح کی شرائط اور عقد کر چکے ہیں اور ہم نے اُن سے اور انھوں نے ہم سے اس بات پر عہد کر لیا ہے اور ہم ہرگز ان سے عہد شکنی نہ کریں گے۔ کہا: پھر سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اس کی طرف لپکے اور ابو جندل رضی اللہ عنہ کے

پہلو پر اس کے ساتھ چلنے لگے اور لوگ کہنے لگے: ابو جندل! تو صبر کر، بے شک وہ تو مشرک ہیں اور اُن میں سے کسی ایک کا خون تو ایک کتے کا خون ہے (اصل میں "ويقال: اصبر أبا جندل... الخ" ہے قرینہ یہ ہے کہ "يقول فيضرب به أباه... الخ" اس میں "يدني" اور "يقول" کی ضمیر ظاہری طور پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف ہے واللہ أعلم) کہا اور عمر رضی اللہ عنہ تلوار کا قبضہ اس کے قریب کرتے تھے، کہا کرتے تھے میں نے یہ اُمید کی کہ وہ تلوار لے لے اور اس سے اپنے باپ کو مارے۔ کہا: پس اس شخص نے یعنی ابو جندل رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ کے ساتھ بخل کیا۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تلوار لی اور نہ اپنے باپ کو مارا، کہا: اور صلح نامہ نافذ ہو گیا، یعنی صلح جاری ہو چکی۔

پھر جب رسول اللہ ﷺ اور سہیل صلح نامہ سے فارغ ہو چکے اور آپ ﷺ حل وحرم میں نماز پڑھتے تھے اور آپ ﷺ مضطرب تھے، کہا: "فقام رسول الله ﷺ" (معلوم ہوتا ہے یہ جزا ہے لما کی بہ حرفِ فاء اور درمیان کا جملہ معترضہ ہے، یعنی جب صلح نامہ سے فارغ ہوئے تو کھڑے ہوئے... الخ) یعنی تو آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا: لوگو! نحر کرو اور سر منڈاؤ۔ کہا: پھر کوئی کھڑا نہ ہوا، کہا: پھر آپ ﷺ نے دوبارہ ایسی ہی بات فرمائی تو بھی کوئی شخص کھڑا نہ ہوا۔ پھر تیسری بار بھی اسی طرح فرمایا تو بھی کوئی شخص کھڑا نہ ہوا، چنانچہ آپ ﷺ لوٹے اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے۔ فرمایا: اے ام سلمہ! لوگوں کا کیا حال ہے؟ عرض کی: اے اللہ کے رسول! انھیں وہ چیز پہنچی ہے جو آپ نے دیکھی، یعنی اس سب قصے سے ان کو سخت رنج ہے۔

پس آپ تو اُن میں سے کسی آدمی سے ہرگز بات نہ کریں اور اپنی قربانی کا ارادہ فرمائیں، وہ جہاں ہو اور اسے نحر کر ڈالیں اور سر منڈا لیں، پس اگر آپ یہ کر لیتے تو لوگ اس کو کر لیتے، پھر آپ ﷺ نکلے اس حال میں کہ کسی سے بات نہ کرتے تھے، یہاں تک کہ جب اپنی قربانی کے پاس آئے تو اس کو نحر کیا، پھر بیٹھے اور سر منڈایا، کہا: پھر لوگ کھڑے ہو کر نحر کرنے اور سر منڈانے لگے، یہاں تک کہ جس وقت آپ مکے اور مدینے کے آدھے راستے میں پہنچے تو سورۃ الفتح نازل ہوئی۔ (هكذا ساقه أحمد من هذا الوجه و هكذا رواه يونس بن بكير و زياد البكائي عن أبي إسحاق بنحوه وقد رواه أيضا عن عبد الرزاق عن معمر عن الزهري به بنحوه و خالفه في أشياء وفيه إغراب وقد رواه البخاري في صحيحه فساقه سياقة حسنة مطولة بزيادات جيدة)

پس اپنی صحیح کی "كتاب الشروط" میں مسور بن مخرمہ اور مروان بن حکم سے روایت کیا ہے، ان میں سے ایک اپنے ساتھی کی حدیث کی تصدیق کرتا ہے۔ دونوں نے کہا ہے کہ زمانۂ حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ اپنے ایک ہزار سے کچھ زیادہ اصحاب کے ساتھ نکلے، پھر جب ذوالحلیفہ میں آئے تو ہدی کے گلوں میں گردن بند ڈالے (درخت کی چھال یا اونٹ کی پشم کے گلو بند بنا کر قربانی کے گلے میں ڈالتے ہیں، یہ قربانی کی نشانی ہے، تاکہ کوئی اس کو نہ

چھیڑے) اور ان کا اشعار کیا (یہ بھی قربانی کی علامت ہے کہ اونٹ کے کوہان میں ذرا زخم لگا کر خون بہا دیتے ہیں) اور اس سے عمرے کا احرام باندھا اور قبیلۂ خزاعہ میں سے اپنا ایک جاسوس بھیجا اور آپ ﷺ روانہ ہوئے، یہاں تک کہ غدیر اشطاط میں پہنچے تو آپ ﷺ کے پاس آپ ﷺ کا جاسوس آیا اور عرض کی کہ بے شک قریش نے آپ کے لیے جماعتیں جمع کی ہیں اور آپ کے لیے احابیش فراہم کیے ہیں (یعنی ایک ہی قسم کے لوگ۔ اس میں اور قول بھی ہیں) اور وہ آپ سے لڑنے والے ہیں اور آپ کو روکنے والے ہیں اور منع کرنے والے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: لوگو! مجھے مشورہ دو، کیا تم یہ رائے دیتے ہو کہ ہم اُن کے عیال پر اور بال بچوں پر حملہ کریں، جو ہم کو بیت اللہ سے روکنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ایک روایت میں اس طرح ہے، کیا تم یہ رائے دیتے ہو کہ ہم اُن لوگوں کے بال بچوں پر حملہ کریں جن لوگوں نے ان کی اعانت کی ہے، پھر اگر وہ ہمارے پاس آئیں گے تو مشرکوں میں سے ایک جماعت کو اللہ تعالیٰ کاٹ چکا ہو گا، ورنہ ہم نے ان کو غم میں ڈال دیا ہو گا۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ پھر اگر وہ بیٹھ رہیں گے تو اس حال میں بیٹھ رہیں گے کہ وہ منقوص (کم کیے گئے) اور محنت رسیدہ اور رنجیدہ ہوں گے اور اگر وہ نجات پائیں گے تو ایک جماعت ہو گی کہ اللہ عزوجل نے اس کو کاٹ دیا ہو گا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہمارا ارادہ بیت اللہ کی زیارت کا ہے اور جس نے ہم کو اس سے روکا تو ہم اس سے لڑیں گے۔ چنانچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بولے: اے اللہ کے رسول! آپ اس حال میں نکلے ہیں کہ اس گھر کا ارادہ کرنے والے ہیں، آپ کسی کے قتل کا یا اس سے لڑائی کا ارادہ نہیں رکھتے تو آپ تو اس کام کی طرف متوجہ ہوں اور جس نے ہم کو اس سے روکا، ہم اس سے لڑیں گے۔

ایک روایت میں یہ ہے: سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں، ہم تو عمرہ کرنے کے لیے آئے ہیں اور کسی سے لڑنے کے لیے نہیں آئے، لیکن جو کوئی ہمارے اور بیت اللہ کے درمیان حائل ہو گا تو ہم اس سے لڑیں گے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تو اب چلو۔

ایک روایت میں یہ ہے: تو اللہ تعالیٰ کے نام پر چلو۔ یہاں تک کہ جس وقت کچھ راستہ چلے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بے شک خالد بن ولید کچھ سواروں کو لے کر قریش کا طلیعہ ہے (طلیعہ ایک جماعت ہوتی ہے جو لشکر کے آگے رہتے ہیں، تاکہ دشمن کا حال معلوم کرے) اس لیے تم داہنی جانب کو چلو، پس قسم ہے اللہ کی! ان کو خالد نے نہ جانا، یہاں تک کہ اچانک انھوں نے لشکر کا غبار دیکھا تو خالد ایڑ لگاتا ہوا قریش کو ڈراتا ہوا چلا۔ یعنی خالد دوڑا کہ جلدی سے جا کر قریش کو اس کی اطلاع کرے۔ اور نبی اکرم ﷺ چلے، یہاں تک کہ جب اس گھاٹی میں آئے جس سے ان پر سے اترا جاتا ہے تو آپ ﷺ کی اونٹنی آپ ﷺ کو لیے ہوئے بیٹھ گئی، لوگ بولے: ”حَلْ حَلْ“، یعنی اس کو اٹھانے

کے لیے اس کو زجر کیا، ڈانٹا اور اس نے سرکشی کی۔ چنانچہ لوگ بولے: "خَلَأَتِ الْقَصْوَاءُ خَلَأَتِ الْقَصْوَاءُ" یعنی قصواء (اونٹنی کا نام) نے سرکشی کی تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قصواء نے سرکشی نہیں کی اور نہ اس کی یہ عادت ہے، لیکن اس کو اس نے روکا ہے جس نے ہاتھی کو روکا تھا، یعنی اللہ تعالیٰ نے۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، وہ مجھ سے جس حالت اور قضیہ کا بھی سوال کریں گے جس میں وہ اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کی تعظیم کریں گے تو وہ میں ان کو دوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ جس بات میں اوامرِ الٰہی کی تعظیم قائم رہے گی، میں ان کو مان لوں گا۔ پھر آپ نے قصواء کو جھڑکا تو وہ اُٹھ کھڑی ہوئی، چنانچہ آپ ﷺ ان سے مائل ہوئے، یہاں تک کہ حدیبیہ کے پرلے سرے میں جا اُترے، ایک تھوڑے سے پانی کے کنویں پر جس کو لوگ ذرا ذرا کر کے لیتے تھے، پھر لوگوں نے تھوڑی سی دیر میں اس کا سارا پانی ختم کر دیا اور آپ ﷺ کے پاس پیاس کی شکایت لائی گئی، آپ ﷺ نے اپنے ترکش میں سے ایک تیر کھینچا اور ان کو حکم دیا کہ وہ تیر اس میں رکھ دیں، اللہ کی قسم! وہ اُن کے لیے پانی کے ساتھ جوش مارتا رہا، یہاں تک کہ سب لوگ خوب سیراب ہو کر کنویں سے لوٹ آئے۔

پھر اس اثنا میں کہ ان کا یہ حال تھا کہ اچانک بدیل بن ورقاء خزاعی اپنی قوم خزاعہ کے ایک گروہ کے ساتھ آیا اور اہلِ تہامہ میں سے قبیلۂ خزاعہ آپ ﷺ کے راز دار اور بھروسے کے لوگ تھے، چنانچہ بدیل نے کہا: بے شک میں نے کعب بن لوی اور عامر بن لوی کو دیکھا ہے کہ وہ حدیبیہ میں سے ایک زیادہ پانی کے ذخیرے پر اترے ہیں، اُن کے ساتھ عوذ و مطافیل ہیں، یعنی بی بی بچوں کو ساتھ لے کر آئے ہیں اور وہ آپ سے لڑنے والے اور آپ کو بیت اللہ سے روکنے والے ہیں۔ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہم کسی سے لڑنے کے لیے نہیں آئے، لیکن ہم تو عمرہ کرنے کے لیے آئے ہیں اور بے شک قریش کو لڑائی نے کمزور کر دیا ہے، اگر وہ چاہیں تو اُن کے لیے میں ایک مدت مقرر کر دوں اور وہ میرے اور لوگوں کے درمیان حائل نہ ہوں، پھر اگر میں غالب ہو جاؤں تو اگر وہ چاہیں کہ اس شے میں داخل ہوں جس میں لوگ داخل ہوئے تو وہ داخل ہو جائیں، ورنہ آرام تو پا چکے اور اگر وہ نہ مانیں تو قسم ہے اللہ کی! البتہ میں ان سے اپنے اس کام کے لیے لڑوں گا، یہاں تک کہ میری گردن علاحدہ ہو جائے، یا البتہ اللہ اپنا کام نافذ کرے۔ بدیل بولا: میں ان کو جو آپ نے کہا ہے، ضرور پہنچاؤں گا۔

پھر وہ چلا، یہاں تک کہ قریش کے پاس آیا اور کہا: بے شک ہم واقعی اس شخص کے پاس سے آئے ہیں جو ایک بات کہتا ہے جو ہم نے سنی ہے تو اگر تم چاہو کہ وہ بات تمھیں پیش کریں تو کریں۔ ان کے بے وقوف لوگ تو بولے کہ ہمیں کچھ ضرورت نہیں ہے کہ تو ہمیں اس کی طرف سے کسی شے کی خبر دے اور اُن میں سے صاحب الرائے لوگ بولے کہ تو لا جو کچھ تو نے اس کو کہتے سنا ہے۔ کہا: میں نے اس کو سنا ہے کہ ایسا ایسا کہتا ہے، چنانچہ جو کچھ آپ ﷺ نے فرمایا تھا، وہ ان سے بیان کیا۔ اب عروہ بن مسعود کھڑا ہوا اور کہا: اے میری قوم! کیا تم نہیں ہو والد؟ بولے:

کیوں نہیں۔ کہا: کیا میں نہیں ہوں ولد؟ بولے: کیوں نہیں (حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس حدیث کو بہ حوالۂ بخاری نقل کیا ہے اور بخاری کی "کتاب الشروط" میں ابو ذر کے نسخے کی بنا پر عبارت یوں واقع ہوئی ہے: "أَيُ: قوم ألست بالوالد؟ قالوا: بلى! قال: أو لستم بالولد، قالوا: بلى" اور سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کے سوا دوسروں کے موافق وہ الفاظ ہیں جو تفسیر میں ہے۔از مصحح سلمه الله تعالىٰ)

کہا: پھر کیا تم مجھ کو متہم کرتے ہو؟ بولے: نہیں۔ کہا: کیا تم نہیں جانتے کہ میں نے اہلِ عطاظ سے لڑائی کے لیے نکلنے کی درخواست کی؟ پھر جب انھوں نے میرا کہا نہ مانا تو میں تمھارے پاس اہل اور اولاد کو اور جس نے میرا کہا مانا لے کر تمھارے پاس آیا؟ بولے: کیوں نہیں۔ کہا: بے شک اس شخص نے تم پر ایک راستی کی بات پیش کی ہے تو تم اس کو مان لو اور مجھے چھوڑ دو کہ میں اس کے پاس جاؤں، وہ بولے کہ تو اس کے پاس جا۔ پھر وہ آپ ﷺ کے پاس آیا تو نبی اکرم ﷺ سے باتیں کرنے لگا، آپ ﷺ نے اس سے ویسا فرمایا، جیسا کہ بدیل بن ورقاء سے فرمایا تھا۔ اس وقت عروہ بولا: اے محمد! تو مجھے بتاؤ اگر تو نے اپنی قوم کو جڑ سے اُکھاڑ ڈالا تو کیا عرب میں سے تو نے کسی کو سنا ہے کہ اس نے اپنی اصل کو تجھ سے پہلے اُکھاڑ ڈالا؟!

اور اگر دوسری بات ہوئی، یعنی تیری قوم کا غلبہ ہوا تو بے شک اللہ کی قسم! میں دیکھتا ہوں کہ تیرے ساتھیوں کے کچھ چہرے لڑنے والوں کے چہرے نہیں ہیں اور یقیناً میں البتہ دیکھتا ہوں کہ یہ متفرق قبیلوں کے لوگ ہیں اور یہ ایسے ہیں کہ بھاگ جائیں اور تجھے چھوڑ دیں۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بولے: "أُمْصُصْ بَظْرَ اللَّاتِ" یعنی تو لات کا ثنا چوس، کیا ہم بھاگ جائیں گے اور اُن کو چھوڑ دیں گے؟ عروہ بولا: یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا: سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ کہا: سنتا ہے اگر میرے پاس تیرا ایک احسان نہ ہوتا جس کا میں نے تجھ کو بدلہ نہیں دیا ہے تو البتہ میں تجھے جواب دیتا۔

راوی نے کہا: اور عروہ نبی اکرم ﷺ سے باتیں کرنے لگا۔ وہ ہر بار جب آپ ﷺ سے بات کرتا تو آپ ﷺ کی ریش مبارک کو پکڑتا تھا۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے سر مبارک کے پاس کھڑے ہوئے تھے اور ان کے پاس تلوار تھی اور ان پر خود تھا اور عروہ ہر بار جب آپ ﷺ کی ریش مبارک کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتا تو مغیرہ رضی اللہ عنہ تلوار کے کونے سے اس کے ہاتھ کو مارتے تھے اور کہتے تھے کہ اپنا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کی ڈاڑھی سے ہٹا لے۔ چنانچہ عروہ رضی اللہ عنہ نے اپنا سر اٹھایا اور کہا: یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا: مغیرہ بن شعبہ ہے۔ عروہ بولا: "أَيُ: غُدَرُ أَلَسْتُ أَسْعَى فِيُ غُدْرَتِكَ" یعنی او بدعہد! کیا میں تیری بدعہدی کے بارے میں سعی نہیں کرتا تھا (عروہ نے مغیرہ رحمہ اللہ کی عہد شکنی میں اپنی جان و مال سے سعی کی تھی، اس کا یہ طعنہ دیا) مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ جاہلیت میں ایک قوم کے ہمراہ ہوئے، پھر اُن کو قتل کیا اور اُن کا مال لے آئے، پھر آئے تو مسلمان ہو گئے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ

اسلام تو میں قبول کرتا ہوں اور رہا مال تو میں اس سے کسی شے میں نہیں ہوں، یعنی اس کا ذمہ مجھ پر نہیں ہے۔

پھر عروہ نے نبی اکرم ﷺ کے اصحاب کو اپنی آنکھوں سے تاکنا شروع کیا۔ کہا: قسم ہے اللہ کی کہ نہیں پھینکا رسول اللہ ﷺ نے کوئی کھنکار، مگر وہ اُن میں سے کسی کی ہتھیلی پر پڑا اور اس نے وہ اپنے منہ اور جسم پر مل لیا اور جس پر آپ ﷺ نے ان کو کسی چیز کا حکم دیا تو وہ اس کی بجا آوری میں جھپٹے اور جب آپ ﷺ نے وضو کیا تو قریب تھے کہ آپ ﷺ کے وضو سے گرنے والے پانی کو لینے کے لیے آپس میں لڑیں اور جس وقت آپ ﷺ بات کرتے تو اصحاب رضی اللہ عنہم اپنی آواز پست کر لیتے اور آپ ﷺ کی تعظیم کے لیے آپ ﷺ کی طرف نظر نہیں کرتے تھے۔

چنانچہ عروہ اپنے اصحاب کی طرف لوٹ کر آیا اور کہا: اے میری قوم! قسم ہے اللہ کی البتہ میں نے بادشاہوں پر وفود کیا اور قیصر و کسریٰ اور نجاشی پر وفود کیا ہے (وفد وہ قوم ہے کہ جمع ہو کر شہروں شہر پھرتے ہیں، بادشاہوں سے ملاقات کرتے ہیں، ان سے صلایات اور عطیات لیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میں بادشاہوں سے ملا ہوں) قسم ہے اللہ کی! میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھ کہ اس کے اصحاب نے اس کی کبھی ایسی تعظیم کی ہو جتنی کہ محمد ﷺ کے اصحاب محمد ﷺ کی تعظیم کرتے ہیں۔ واللہ! نہیں پھینکا اس نے کوئی کھنکار، مگر وہ اُن میں سے کسی کی ہتھیلی پر پڑا اور اس نے اس کو اپنے منہ اور اپنے جسم پر مل لیا اور جب اُن کو کسی بات کا حکم دیا تو اس کی بجا آوری میں چھپٹ پڑے اور جب آپ ﷺ نے وضو کیا تو سب آپ کے قریب ہوئے تاکہ آپ ﷺ کے وضو کا پانی لینے کے لیے لڑیں اور جب آپ ﷺ نے بات کی تو سب نے اس وقت اپنی آوازیں پست کر لیں اور آپ ﷺ کی تعظیم کے لیے آپ ﷺ کی طرف نظر تیز نہیں کرتے اور بے شک واقعی اس نے تم پر ایک راستی کی بات پیش کی ہے سو تم اس کو قبول کر لو۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص بولا: جو بنی کنانہ میں سے تھا کہ مجھے چھوڑ دو میں اس کے پاس جاؤں وہ بولے کہ تو اس کے پاس جا۔

پھر جب وہ نبی کریم ﷺ کو نظر آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ فلاں شخص ہے اور اس قوم سے ہے جو قربانی کے جانوروں کی تعظیم کرتے ہیں، اس لیے تم اس کے لیے اُن کو کھڑا کرو، پھر وہ جانور اس کے لیے اٹھائے گئے اور لوگ لبیک پکارتے ہوئے اس کے سامنے آئے۔ جب اس نے دیکھا تو وہ بولا: سبحان اللہ! ان لوگوں کو بیت اللہ سے روکنا مناسب نہیں۔ پھر جب وہ اپنے اصحاب کی طرف واپس گیا تو کہا کہ میں نے بُدنے دیکھے کہ ان کے قلادے پڑے ہوئے ہیں اور اُن کا اشعار کیا گیا ہے، چنانچہ میں نہیں دیکھتا ہوں کہ وہ بیت اللہ سے روکے جائیں۔

پھر ان میں سے ایک شخص کھڑا ہوا جس کو مکرز بن حفص کہتے تھے اور اس نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو کہ میں اس کے پاس جاؤں، کہا کہ تو اس کے پاس سے ہو کر آ۔ پھر جب وہ ان پر یعنی صحابہ پر ظاہر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ مکرز ہے اور وہ ایک مردِ فاجر ہے، پھر وہ آپ ﷺ سے باتیں کرنے لگا، پس اس دوران میں کہ وہ آپ ﷺ سے باتیں کر رہا تھا کہ سہیل بن عمرو آیا۔ اور معمر نے کہا: مجھے ایوب نے خبر دی عکرمہ سے کہ اس نے کہا: جس وقت سہیل بن عمرو آیا

تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «قَدْ سَهُلَ لَكُمْ مِنْ أَمْرِكُمْ» (آپ نے سہیل کے نام سے نیک فال لی کہ تمھارے لیے تمھارا کام سہل ہو گیا اس بنا پر حرف ''من'' زاید ہے یا تبعیضیہ ہے، یعنی تمھارا بعض کام آسان ہو گیا یا لکاتب واللہ اعلم کس سے متعلق ہے۔ شاید یہ معنی ہیں کہ جو کام کاتب سے متعلق ہے وہ سہل ہو گیا۔ واللہ أعلم) معمر نے کہا ہے کہ زہری نے اپنی روایت کردہ حدیث میں کہا: سہیل بن عمرو آیا تو کہنے لگا کہ ہمارے اور اپنے درمیان ایک خط لکھیں۔

چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کو طلب کیا اور فرمایا: لکھ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' تو سہیل بولا کہ اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ رحمان کیا ہے، لیکن تو لکھ: ''بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ'' جیسا کہ تو لکھا کرتا تھا۔ مسلمان بولے: واللہ! وہ سوائے ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کے نہیں لکھے گا تو نبی ﷺ نے فرمایا کہ لکھ ''بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ'' پھر فرمایا کہ لکھ ''هٰذَا مَا قَاضٰى عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ'' تو سہیل بولا: واللہ! اگر ہم یہ جانتے ہوتے کہ تو اللہ کا رسول ہے تو ہم تجھے بیت اللہ سے نہ روکتے، لیکن تُو تو لکھ محمد بن عبداللہ تو آپ ﷺ نے فرمایا: واللہ! بے شک میں البتہ اللہ کا رسول ہوں، گو تم نے مجھے جھٹلایا، پھر فرمایا کہ لکھ محمد بن عبداللہ۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا اور یہ یعنی اس بات کا مان لینا آپ کے اس قول کے سبب سے تھا کہ ''وَاللّٰهِ لَا يَسْأَلُوْنِيْ خُطَّةً يُعَظِّمُوْنَ فِيْهَا حُرُمَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى إِلَّا أَعْطَيْتُهُمْ إِيَّاهَا''

پھر آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: اس بات پر کہ تم ہمارے اور بیت اللہ کے درمیان حائل نہ ہو، تاکہ ہم اس کا طواف کریں۔ سہیل بولا: واللہ! عرب کہیں اس بات کا چرچا نہ کریں کہ ہم دباؤ میں آ گئے، لیکن یہ آئندہ سال سے ہو گا۔ چنانچہ یہ لکھا۔ پھر سہیل نے کہا اور یہ طے پایا کہ جب بھی ہم میں سے کوئی آدمی تیرے پاس آ جائے، گو وہ تیرے دین پر ہو تو اس کو ہماری طرف پھیر دے۔ چنانچہ مسلمان بولے: سبحان اللہ! وہ مشرکوں کی طرف کیسے پھیرا جائے، حالانکہ وہ مسلمان ہو کر آیا ہو۔

پھر اس دوران میں کہ وہ اس حال پر تھے کہ اچانک ابو جندل بن سہیل بن عمرو اپنی بیڑیوں میں الجھتا ہوا آیا، وہ واقعی مکے کے اسفل سے نکل آیا تھا، یہاں تک کہ اس نے اپنے آپ کو لا کر مسلمانوں کے درمیان پھینک دیا، چنانچہ سہیل بولا: اے محمد! یہ ان لوگوں میں سے پہلا شخص ہے جن پر میں تجھ سے صلح کرتا ہوں کہ تو اس کو میری طرف پھیر دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ابھی تو ہم نے تحریر پوری نہیں کی۔ سہیل بولا: تو اللہ کی قسم! میں اب کبھی تجھ سے کسی شے پر مصالحت نہ کروں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَجِزْهُ لِيْ» یعنی اب کی بار تو تُو اسے میرے لیے جائز کر دے۔

وہ بولا: میں تو اس کو تیرے لیے جائز کرنے والا نہیں ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں اب تو تُو کر دے۔ کہا: میں تو ایسا کرنے والا نہیں ہوں۔ مکرز بولا: کیوں نہیں، ہم نے اس کو تیرے لیے جائز کر دیا۔ ابو جندل بولا: اے مسلمانوں کے گروہ! میں مشرکوں کی طرف پھیرا جاؤں، حالانکہ میں تو حقیقت میں مسلمان ہو کر آیا ہوں، کیا تم اس

شے کو نہیں دیکھتے جو مجھے ملی ہے، یعنی جو مصیبت مجھے پیش آئی ہے، اسے تم دیکھ رہے ہو کہ مجھے بیڑیاں پڑی ہیں اور میں قید ہوں اور واقعی اس کو اللہ عزوجل کی راہ میں سخت تکلیف پہنچائی گئی تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: پھر میں نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: کیا آپ اللہ کے سچے نبی نہیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ میں نے عرض کی کہ کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ میں نے عرض کی: ”لِمَ نُعْطَى الدَّنِيَّةَ فِيْ دِيْنِنَا إِذًا“ یعنی پھر ہم اپنے دین میں کیوں ذلت دیے جائیں۔

مطلب یہ ہے کہ ہم ایسا فیصلہ کیوں مانیں جس میں ہمارے دین کی ذلت ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک میں اللہ کا رسول ہوں اور میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا اور وہ میری مدد کرنے والا ہے۔ میں نے عرض کی کہ کیا ہم سے آپ یہ نہیں بیان کرتے تھے کہ اب ہم بیت اللہ میں آئیں گے اور اس کا طواف کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ کیا پھر میں نے تجھے خبر دی تھی کہ ہم اس سال اس کو آئیں گے؟ میں نے کہا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو بے شک تو اس کی طرف آنے والا ہے اور اس کا طواف کرنے والا ہے۔ کہا: پھر میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا: اے ابوبکر! کیا یہ اللہ کے سچے نبی نہیں ہیں؟ کہا: کیوں نہیں، میں نے کہا: کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ کہا: کیوں نہیں۔ میں نے کہا: تو اب ہم اپنے دین میں ذلت کیوں دیے جائیں؟ کہا: اے شخص! بے شک وہ اللہ کے رسول ہیں اور وہ اپنے رب کی نافرمانی نہ کریں گے اور وہ اُن کی مدد کرنے والا ہے سو تو تُو اُن کی رکاب کو خوب مضبوط پکڑے رہ، قسم ہے اللہ کی! بے شک وہ حق پر ہیں۔ میں نے کہا: کیا وہ ہم سے یہ بیان نہیں کیا کرتے تھے کہ اب ہم بیت اللہ کو آئیں گے اور اس کا طواف کریں گے؟ کہا: کیوں نہیں، کہا: کیا پھر انھوں نے تجھے یہ خبر دی تھی کہ تو اس میں اسی سال آئے گا؟ میں نے کہا: نہیں۔ کہا تو بے شک تُو اس کی طرف آئے گا اور اس کا طواف کرے گا (چونکہ صدیق کے مفہوم میں یہ بات پڑی ہوئی ہے کہ اس کی قوتِ نظری نبی کی طرح ہوتی ہے، اس لیے صدیق رضی اللہ عنہ نے وہی بات کہی جو نبی کریم ﷺ نے فرمائی تھی۔ یہاں سے صدیق رضی اللہ عنہ کے منصب کو سمجھنا چاہیے)

امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر میں نے اس کے لیے عمل کیے، یعنی یہ بات چیت جو نبی ﷺ کی مرضی کے خلاف ہوئی، اس کے لیے بہت سے خیر کے کام نماز، روزہ اور خیرات وغیرہ کیے، تاکہ اس کا کفارہ ہو جائے۔ راوی نے کہا ہے کہ جب صلح نامہ کی تحریر سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ کھڑے ہوؤ اور قربانی کرو، پھر سر منڈاؤ۔

راوی نے کہا کہ اللہ کی قسم! ان میں سے کوئی کھڑا نہ ہوا، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے تین بار یہ بات فرمائی۔ پھر جب ان میں سے کوئی بھی کھڑا نہ ہوا تو آپ ﷺ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور اُن سے وہ بات ذکر کی جو آپ ﷺ کو لوگوں سے پیش آئی۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے عرض کی: یا نبی اللہ! کیا آپ اس بات کو پسند

کرتے ہیں کہ آپ نکلیں۔ پھر آپ اُن میں سے کسی سے ایک بات بھی نہ کریں، یہاں تک کہ آپ اپنی قربانیاں نحر کر ڈالیں اور سر مونڈنے والے کو بلائیں اور وہ آپ کا سر مونڈ دیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نکلے اور اُن میں سے کسی سے بات نہ کی، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے قربانیاں کیں اور سر مونڈنے والے کو بلایا تو اس نے آپ ﷺ کا سر مونڈ دیا۔ پھر جب لوگوں نے یہ دیکھا تو وہ کھڑے ہوئے اور نحر کیا اور ایک دوسرے کا سر مونڈنے لگا، یہاں تک کہ قریب تھا کہ گھمسان کی وجہ سے بعض بعض کو قتل کر ڈالے۔

پھر مومن عورتیں آئیں تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ وَاٰتُوْهُمْ مَّاۤ اَنْفَقُوْا ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ ﴾ [الممتحنة: ١٠] ''اے ایمان والو! جب تمھارے پاس مومن عورتیں ہجرت کرکے آئیں تو تم ان کا امتحان لو۔ دراصل ان کے ایمان کو بخوبی جاننے والا تو اللہ ہی ہے لیکن اگر وہ تمھیں ایمان دار معلوم ہوں تو اب تم انھیں کافروں کی طرف واپس نہ کرو، یہ ان کے لیے حلال نہیں اور نہ وہ ان کے لیے حلال ہیں، اور جو خرچ ان کافروں کا ہوا ہو وہ انھیں ادا کر دو، ان عورتوں کو ان کے مہر دے کر اُن سے نکاح کر لینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں اور کافر عورتوں کی ناموس اپنے قبضے میں نہ رکھو۔''

چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس دن دو عورتوں کو طلاق دے دی جو شرک کی حالت میں اُن کے پاس تھیں تو اُن میں سے ایک سے معاویہ بن ابی سفیان نے نکاح کیا اور دوسری سے صفوان بن اُمیہ نے نکاح کر لیا۔ پھر نبی اکرم ﷺ مدینے کی طرف لوٹ گئے تو ابوبصیر قریش کا ایک شخص آپ ﷺ کے پاس آیا اور وہ مسلمان تھا۔ قریش نے اس کو لانے کے لیے دو آدمی بھیجے تو انھوں نے کہا: ''اَلْعَهْدَ الَّذِيْ جَعَلْتَ لَنَا'' یعنی اس عہد کا خیال کرو جو تم نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔ آپ ﷺ نے ابوبصیر کو ان دونوں آدمیوں کے سپرد کر دیا۔ اور وہ اس کو لے کر نکلے، یہاں تک کہ جس وقت ذوالحلیفہ میں پہنچے تو اترے، وہ اُن کھجوروں میں سے کھا رہے تھے جو اُن کی ملکیت تھیں۔

ابوبصیر نے ان میں سے ایک شخص سے کہا: او فلاں! واللہ! بے شک میں تیری اس تلوار کو عمدہ خیال کرتا ہوں تو دوسرے شخص نے اس کو میان سے کھینچا، چنانچہ جس کی تلوار تھی، اس نے کہا: ہاں واللہ! بے شک یہ البتہ عمدہ ہے، البتہ میں نے واقعی اس کو آزمایا ہے، پھر آزمایا ہے، یعنی بارہا اس کو آزمایا ہے۔ ابوبصیر نے کہا: تو مجھے دکھا کہ میں اس کی طرف نظر کروں ''فَأَمْكَنَهُ مِنْهُ فَضَرَبَهُ'' یعنی پھر اس شخص سے تلوار کو قابو میں کر لیا (بظاہر ترجمہ اس کا یوں ٹھیک معلوم ہوتا ہے، پھر تلوار والے نے تلوار ابوبصیر کے قابو میں کر دی۔ واللہ أعلم از مصحح سلمہ اللہ تعالیٰ)

اور اس کو مارا یہاں تک کہ وہ سرد ہو گیا، یعنی مر گیا اور دوسرا بھاگا یہاں تک کہ مدینے میں آیا، پھر دوڑتا ہوا مسجد میں

داخل ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب اس کو دیکھا تو فرمایا کہ البتہ واقعی اس نے کوئی خوف دیکھا ہے۔

پھر جب وہ آپ ﷺ کے پاس پہنچا تو کہا: واللہ! میرا ساتھی قتل کیا گیا اور بے شک میں البتہ مقتول تھا۔ پھر ابوبصیر آیا تو عرض کی: اے اللہ کے رسول! واللہ! یقیناً اللہ نے آپ کا ذمہ وفا کر دیا ہے۔ واللہ! آپ نے تو مجھ کو اُن کی طرف پھیر دیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سے نجات دی تو آپ ﷺ نے فرمایا: «وَيْلٌ أمه مسعر حرب لَوْ كَانَ لَهُ أَحَدٌ» یعنی خرابی ہو اس کی ماں کی! لڑائی کا بھڑکانے والا ہے، اگر بالفرض اس کا کوئی یار و مددگار ہوتا تو یعنی اگر اس کے یار ہوتے تو فتنہ برپا کرتا اور صلح کو بگاڑ ڈالتا۔

پھر جب ابوبصیر نے یہ بات سنی تو پہچان گیا کہ وہ ضرور اس کو ان کی طرف پھیر دیں گے، چنانچہ وہ نکلا یہاں تک کہ دریا کے کنارے پر آیا۔ راوی نے کہا اور ابوجندل سہیل بھی ان کے پاس سے چھوٹ آیا اور ابوبصیر کے ساتھ مل گیا۔ اب یہ شروع ہوا کہ جو کوئی قریش میں سے مسلمان ہو کر نکلتا تو وہ ابوبصیر سے آملتا یہاں تک کہ ان میں سے ایک جماعت جمع ہوگئی۔ پھر اللہ کی قسم! وہ جب سنتے کہ قریش کا کوئی قافلہ شام کی طرف جانے کے لیے نکلا تو وہ اس کے آڑے آتے اور ان کو مار ڈالتے اور ان کے مال لے لیتے تھے۔

چنانچہ قریش نے نبی کریم ﷺ کی طرف پیغام بھیجا اور آپ ﷺ کو اللہ کی قسم دی اور قرابت کا واسطہ دیا اور کہا کہ آپ ابوبصیر والوں کی طرف پیغام بھیجیں کہ اب جو کوئی قریش میں سے آپ کے پاس آئے تو وہ امن پانے والا ہے (یعنی یہ پیغام کہ قریش کے قافلوں کو نہ چھیڑیں اور مدینے میں آجائیں) آپ ﷺ نے ابوبصیر والوں کی طرف کہلا بھیجا اور اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَهُوَ الَّذِىْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ﴾ "حَتّٰى بَلَغَ" ﴿حَمِيَّةَ الْجٰهِلِيَّةِ﴾ حمیت ان کی یہ تھی کہ اس بات کا اقرار نہ کیا کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کا اقرار نہ کیا اور اُن کے اور بیت اللہ کے درمیان حائل ہوئے۔[1] (هكذا ساقه البخاري ههنا وقد أخرجه في التفسير وفي عمرة الحديبية وفي الحج و غير ذلك من حديث معمر وسفيان بن عيينة كلاهما عن الزهري به ووقع في بعض الأماكن عن الزهري عن عروة عن مروان و المسور عن رجال من أصحاب النبي ﷺ بذلك وهذا أشبه ـ والله أعلم ـ ولم يسقه أبسط من ههنا و بينه و بين سياق ابن إسحاق تباين في مواضع وهناك فوائد ينبغي إضافتها إلى ما هنا ولذلك سقنا تلك الرواية و هذه والله المستعان و عليه التكلان و لا حول و لا قوة إلا بالله العزيز الحكيم)

امام بخاری رحمہ اللہ نے تفسیر میں حبیب بن ابی ثابت سے روایت کیا ہے، کہا: میں ابو وائل کے پاس آیا کہ اس سے سوال کروں، کہا کہ ہم صفین میں تھے، چنانچہ ایک شخص نے کہا: کیا تو نے اِن لوگوں کی طرف نہ دیکھا جو اللہ کی طرف بلائے جاتے ہیں، سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں، تو سہیل بن حنیف بولا: متہم کرو تم اپنی جانوں کو،

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٨١)

البتہ ہم نے اپنے آپ کو حدیبیہ کے دن دیکھا، یعنی اس صلح میں جو نبی اکرم ﷺ اور مشرکوں کے درمیان ہوئی تھی اور اگر دیکھتے قتال تو البتہ لڑتے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ آئے اور کہا: کیا ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں ہیں؟ ہمارے مقتول جنت میں اور ان کے مقتول دوزخ میں نہیں ہیں؟ تو کہا: کیوں نہیں۔ کہا: پھر کس بات میں ہم اپنے تئیں ذلت دیے جائیں اور لوٹ جائیں اور ابھی اللہ نے ہمارے درمیان فیصلہ نہیں کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابن خطاب! بے شک میں اللہ کا رسول ہوں اور وہ ہرگز مجھے ضائع نہ کرے گا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ خفا ہوتے ہوئے لوٹ گئے، پھر صبر نہ کیا، یہاں تک کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا: اے ابوبکر! کیا ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں ہیں؟ انھوں نے کہا: اے ابن خطاب! بے شک وہ اللہ کے رسول ہیں اور ہرگز اللہ ان کو کبھی ضائع نہ کرے گا، چنانچہ سورۃ الفتح نازل ہوئی۔ (وقد رواه البخاري أيضا في مواضع آخر و مسلم و النسائي عن طرق آخر عن أبي وائل سفيان بن سلمة عن سهيل بن حنيف به) بعض روایات میں یوں ہے کہ گو تم متہم کرو تم رائے کو، البتہ واقعی میں نے اپنے آپ کو ابو جندل کے دن دیکھا ہے اور اگر میں اس بات پر قادر ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ کی بات کو رد کرتا تو میں البتہ اس کو رد کرتا۔ ایک روایت میں یہ ہے: چنانچہ سورۃ الفتح نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو بلایا اور اس کو ان پر پڑھا۔[1]

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قریش نے نبی اکرم ﷺ سے مصالحہ کیا اور ان میں سہیل بن عمرو تھا تو آپ ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ لکھ: "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" تو سہیل بولا: ہم نہیں جانتے کہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کیا ہے، لیکن تو لکھ "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ"، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: لکھ "مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ" کہا: اگر ہم جانتے کہ تو اللہ کا رسول ہے تو البتہ ہم تیری پیروی کرتے، لیکن تو اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھ تو آپ ﷺ نے فرمایا لکھ: "مِنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ" اور آپ پر یہ شرط کی کہ جو کوئی تمھاری طرف سے آئے تو ہم اس کو تمھاری طرف نہ پھیریں گے اور جو کوئی ہماری طرف سے تمھارے پاس آئے تو تم اس کو ہماری طرف پھیر دو۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا ہم یہ لکھیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں بے شک جو کوئی ہم میں سے اُن کی طرف گیا تو اللہ نے اس کو دور کر دیا۔[2] (رواه مسلم من حديث حماد بن سلمة به)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا: جب حروریہ نکلے تو کنارے ہو گئے، یعنی علی رضی اللہ عنہ کی طاعت سے نکل گئے تو میں نے اُن سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے دن مشرکوں سے مصالحت کی، آپ ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: لکھ اے علی! «هٰذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ» قریش بولے: اگر ہم جانتے کہ تو اللہ کا رسول ہے تو ہم تجھ سے نہ لڑتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے علی! تو اسے مٹا دے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٦٣، ٣٩٥٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٦٣)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٨٤) مسند أحمد (٣/ ٢٦٨)

الٰہی! تو بے شک جانتا ہے کہ میں بے شک تیرا رسول ہوں۔ اے علی! تو محو کر دے اور لکھ دے: «هَذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ» واللہ! البتہ رسول اللہ علی سے بہتر تھے اور واقعی آپ نے اپنے نفس کو محو کیا اور آپ کا یہ محو نبوت سے محو نہیں تھا۔ کیا آپ کا نفس نبوت سے نکل گیا۔ خارجی بولے: ہاں[1] (یہ اثر قصہ طلب ہے۔ واللہ أعلم۔ قصہ کیا ہے، شاید ابو داود میں اس کا قصہ ہو)۔ (ورواه أبو داود من حديث عكرمة بن عمار اليماني بنحوه)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے دن ستر اُونٹ نحر کیے، اُن میں سے ایک اُونٹ ابوجہل کا تھا، پھر جب وہ بیت اللہ سے روکے گئے تو اُن اونٹوں نے حنین کیا (حنین کہتے ہیں: مشتاق ہونے کو، رونے کو، ٹھنکنے کو۔ اصل میں اونٹنی کا اپنے بچے کے پیچھے آواز کرنا ہے) جیسا کہ اپنی اولاد کی طرف حنین کرتے ہیں۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے: ﴿هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ﴾ یعنی وہی ہیں جو کافر ہوئے، مراد کفارِ قریش ہیں اور تم کو مسجد الحرام کی طرف جانے سے روکا۔ "صد" کے معنی یہ ہیں کہ کفارِ قریش نے مومنوں کو اس سے منع کیا کہ مسجد الحرام کا طواف کریں اور اپنے عمرے سے حلال ہوں۔ ﴿وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا﴾ کو جمہور نے بہ نصب پڑھا ہے۔ ﴿صَدُّوْكُمْ﴾ کو ضمیر منصوب پر عطف کیا ہے، یعنی اور "هدي" کو روکا۔ امام ابو عمرو رحمہ اللہ نے ایک روایت میں جر سے پڑھا ہے: ﴿الْمَسْجِدِ﴾ پر معطوف ٹھہرایا ہے۔

اس صورت میں مضاف ضرور مقدر ماننا پڑے گا: "أَيْ: عَنْ نَحْرِ الْهَدْيِ" یعنی روکا تم کو مسجد الحرام سے اور ہدی کو نحر کرنے سے۔ کسی نے بہ رفع پڑھا ہے بایں تقدیر "وَصُدَّ الْهَدْيُ" یعنی اور "هدي" کو روکا گیا۔ جمہور نے لفظ "هدي" کو بہ فتحِ ہاء وسکونِ دال پڑھا ہے اور امام ابو عمرو عاصم سے بہ کسرِ دال وتشدیدِ یاء مروی ہے۔ ﴿مَعْكُوْفًا﴾ کا نصب بنا بر حال ہے "هدي" سے: "أَيْ: مَحْبُوْسًا"۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: "عَكَفَهُ بِمَعْنَى حَبَسَهُ وَوَقَفَهُ" ہے، اسی معنی سے ﴿وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا﴾ ہے اور "اعتكاف في المسجد" بہ معنی احتباس ہے اور "عَكَفَ عَلَى الشَّيْءِ" بہ معنی "أَقْبَلَ عَلَيْهِ مُوَاظِبًا" ہے، یعنی فلاں شخص کسی شے پر ہمیشگی کر کے متوجہ ہوا۔

مطلب یہ ہے کہ "معکوف" کے معنی ہوئے روکے ہوئے۔ ابو عمرو بن العلاء نے کہا: بمعنی "مجموعا" ہے۔[3]

---

[1] مسند أحمد (٣٤٢/١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٣٧)

[2] مسند أحمد (٣١٤/١) تفسير ابن كثير (٢٤٥/٤۔٢٥٤) اس کی سند میں "محمد بن عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ" ضعیف راوی ہے۔

[3] فتح القدير (٧١/٥)

فارسی نے "عکف" کے بہ نفسہ متعدی ہونے کا انکار کیا ہے اور ابن سیدہ اور ازہری وغیرہما نے اس کا اثبات کیا ہے۔ قرآن شریف کا ظاہر یہی ہے کہ متعدی بہ نفسہ ہوتا ہے، اس لیے کہ اسم مفعول کا صیغہ اس سے بنایا گیا ہے۔[1]

﴿ اَنْ یَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ﴾ أَيْ: عَنْ أَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهُ" یعنی اور "هدي" کو اس سے روکا کہ اپنے محل کو پہنچے۔ حاصل یہ ہے کہ کلمۂ ﴿ اَنْ ﴾ سے پہلے حرف "عن" مقدر ہے، یا مفعول لہ ہے: "أَيْ: كَرَاهَةَ أَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهُ" یعنی اور ہدی کو روکا ہوا واسطے کراہت اس بات کے کہ اپنے محل کو پہنچے۔ یا بدلِ اشتمال ہے "هدي" سے۔ یعنی روکا تم کو اور روکا اس بات سے کہ "هدي" اپنے محل کو پہنچے۔ "هدي" کا محل اس کی جائے نحر ہے اور جائے نحر اس کی وہ جگہ ہے حرم سے جہاں اس کا نحر حلال ہے۔ نسفی رحمہ اللہ نے کہا "مَحْبُوْسًا أَنْ يَّبْلُغَ" اس سے یہ نکلا کہ "أَنْ يَّبْلُغَ مَعْكُوْفًا" سے متعلق ہے، یعنی اور روکا ہدی کو اس بات سے روکا ہوا کہ اپنے محل کو پہنچے اور محل اس کا وہ جگہ ہے جس میں اس کا نحر حلال ہے، یعنی واجب ہے۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ محصر کے "هدي" کا محل حرم ہے اور مراد محل معہود ہے، یعنی منیٰ۔[2] انتھٰی.

فتح البیان میں ہے کہ اللہ پاک نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس بات کی رخصت دی کہ جس جگہ تک پہنچے، یعنی حدیبیہ، اس کو نحر کے لیے محل ٹھہرائیں تو اب حنفیہ کی حجت اس بات پر قائم نہ ہوگی کہ ہدی محصر کی ذبح کی جگہ حرم ہے (حدیبیہ میں ٹھہرنے کی جگہ کو اللہ تعالیٰ نے بطنِ مکہ سے تعبیر فرمایا ہے، جس سے اس کا حدِ حرم میں داخل ہونا سمجھا جاتا ہے اور کسی جگہ یہ صراحت کے ساتھ ثابت نہیں کہ ذبح حرم سے باہر واقع ہوا، اس بنا پر یہ قول کہ ذبح حدِ حرم میں ہونا چاہیے، متجہ ہے۔ واللّٰه أعلم۔ مصحح سلمه اللّٰه تعالیٰ) اس بارے میں علماء کی بحث کتبِ فروع میں موجود ہے[3] (ظاہر ہے کہ صحابہ نے حدیبیہ میں قربانی ذبح کی اور حلال ہوگئے۔ حدیبیہ کے بارے میں اختلاف ہے کہ حرم سے ہے یا حِل سے)۔

غرضیکہ اللہ پاک نے کفارِ قریش کی حد درجہ مذمت کی کہ وہ پکے کافر ہیں اور باوجود اس کے یہ کیا کہ مسجد الحرام کی زیارت کرنے والوں کو روکا اور ہدی کو اپنے محل تک پہنچنے سے باز رکھا حالاں کہ یہ بات ہرگز نہ چاہیے۔ چنانچہ وہ اس لائق تھے کہ ان سے لڑنے کا حکم دیا جاتا، مگر ایسا حکم نہ ہوا، اس لیے کہ اس میں ایک مصلحت تھی وہ یہ ہے:

﴿ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ یعنی مکے میں جو کمزور مومن مرد وعورت پڑے ہوئے تھے جن کو تم پہچانتے نہیں ہو، یا اُن کے ایمان کو نہیں جانتے۔ چنانچہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم اَن جانے میں ان کو روند ڈالو، یعنی ان کو بھی قتل کر دو اور ایذا پہنچاؤ اور تم کو ان کی طرف سے اور اُن کی جہت سے مشقت پہنچے، اس طرح کہ اُن کے قتل میں تم پر کفارہ ادا کرنا لازم ہو اور تمھیں عیب لگے کہ مشرک

[1] اللباب في علوم الكتاب (١٧/٥٠٢) [2] تفسير النسفي (٤/١٥٧) [3] فتح البيان (١٣/١١١)

یوں کہیں کہ دیکھو مسلمانوں نے اپنے دین والوں کو مار ڈالا، یعنی اگر یہ وجوہ نہ ہوتیں تو اللہ تعالیٰ تم کو ان سے لڑنے کا اذن دے دیتا، یا تمھارے ہاتھ نہ روکتا۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اگر مسلمان مکے پر دباؤ ڈالتے اور تلوار اور نیزوں کی مدد سے اس پر زبردستی غلبہ کرتے تو جو مومن وہاں چھپے ہوئے تھے، وہ کفار سے متمیز نہ ہوتے اور وہ اس وقت مومنوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے نہ بچتے، پھر ان پر کفارہ لازم آتا اور انھیں برائی کا دھبہ بھی لگتا۔

''وطء'' اصل میں پاؤں سے روندنے کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے قتل مراد ہے اور اُن پر مکروہ کا واقع ہونا مراد ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''وَطَأْتُ الْقَوْمَ أَيْ: أَوْقَعْتُ بِهِمْ'' یعنی میں نے قوم پر مکروہ واقع کیا، ان کو تکلیف پہنچائی ﴿ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ ﴾ بدل ہے رجال ونساء سے، لیکن مردوں کو عورتوں پر تغلیب دے کر کلمۂ ﴿ هُمْ ﴾ کہہ دیا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ لَمْ تَعْلَمُوْهُمْ ﴾ کے مفعول سے بدل ہو، اسی کی بنا پر حاصل معنی اول لکھے گئے۔ ﴿ مَّعَرَّةٌ ﴾ اصل میں بہ معنی عیب ہے ماخوذ ہے ''عُر'' سے، ''عر'' خارش کو کہتے ہیں خارش ایک عیب ہے، اس لیے ﴿ مَّعَرَّةٌ ﴾ کے معنی عیب لیے گئے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ﴿ مَّعَرَّةٌ ﴾ بہ معنی ''إثم'' ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام کلبی اور مقاتل رحمہما اللہ وغیرہما نے کہا: ﴿ مَّعَرَّةٌ ﴾ قتل خطا کا کفارہ ہے، جیسا کہ اس آیت میں اس کفارے کا ذکر ہے: ﴿ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ﴾ [النساء: ۹۲] ''اور اگر مقتول تمھاری دشمن قوم کا ہو اور ہو وہ مسلمان تو صرف ایک مومن غلام کی گردن آزاد کرنی لازمی ہے۔'' اس لیے کہ اللہ پاک نے کفارہ واجب کیا ہے دار الحرب میں مومن کے قتل کا جبکہ وہ اس کے ایمان کو نہ جانتا ہو اور دیت واجب نہیں کی۔

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَّعَرَّةٌ ﴾ دیت کا تاوان ہے۔ امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَّعَرَّةٌ ﴾ ''شدة'' ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ غم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''مفعلة'' کا وزن ہے۔ ''عرة'' بہ معنی ''عراة'' سے ''إِذْ أَوْهَاهُ مَا يَكْرَهُهُ وَيَشُقُّ عَلَيْهِ'' یعنی جبکہ کسی شخص پر اچانک وہ شے آجائے جس کو وہ ناپسند کرتا ہے اور اس پر شاق گزرتی ہے۔ ﴿ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ ﴿ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ ﴾ سے متعلق ہے: ''أَيْ: غَيْرَ عَالِمِيْنَ'' چنانچہ اسی کے مطابق پہلے ترجمہ گزر چکے ہے اور ﴿ لَوْلَا ﴾ کا جواب محذوف ہے: ''أَيْ: لِإِذْنِ اللّٰهِ لَكُمْ أَوْ لَمَّا كَفَّ أَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ'' اس کا ترجمہ حاصل معنی میں گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ میں حرفِ لام اس عبارت سے متعلق ہے جو جوابِ

[1] تفسير القرطبي (۲۸۵/۱۶، ۲۸٦) فتح القدير (۷۲/۵)

سے معلوم ہوتی ہے: ”أَيْ: وَلَكِنْ لَمْ يَأْذَنْ لَكُمْ أَوْ كَفَّ أَيْدِيكُمْ عَنْهُمْ“ ﴿لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾ سے مراد یا تو وہ مومن مرد اور عورت ہیں جو مکے میں تھے تو اس بنا پر رحمت سے مراد اسلام میں زیادہ بھلائی کی توفیق ہو گی، یعنی اگر امرِ مذکور نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ تم کو اُن سے لڑنے کا اذن دیتا، یا تمھارے ہاتھ اُن سے نہ روکتا، لیکن اس نے تم کو اُن سے لڑنے کا اذن نہ دیا، تمھارے ہاتھ اُن سے روکے، تاکہ اللہ اپنے بندوں میں جس کو چاہے اپنی توفیق میں داخل کرے۔ یعنی مومن مردوں اور عورتوں کو اسلام میں زیادہ خیر کرنے کی توفیق دے، پھر اُن کے لیے ان کے اجر پورے کرے اس طرح سے کہ اُن کو کفار کے درمیان سے نکالے اور اُن کی قید سے چھڑائے اور اُن کو جو ایذائیں اور تکالیف پہنچتی تھیں، ان کو دور کرے۔ یا ﴿مَنْ يَّشَآءُ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو مشرکوں میں سے اسلام کی طرف راغب ہوئے، اس بنا پر رحمت سے مراد اسلام ہو گا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿لِيُدْخِلَ﴾ کا حرفِ لام اس سے متعلق نہیں ہے جس کا ذکر ہوا، بلکہ ایک اور محذوف سے متعلق ہے۔ تقدیر یہ ہے: ”لَوْ قَتَلْتُمُوْهُمْ لَأَدْخَلَهُمُ اللّٰهُ فِي رَحْمَتِهِ“ قولِ اول زیادہ مناسب ہے، یعنی اگر تم ان مومنین اور مومنات کو قتل کر ڈالتے تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت میں داخل کرتا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ”لَوْ لَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنٰتٌ قَالَ حِيْنَ رَدُّوا النَّبِيَّ ﷺ أَنْ تَطَاؤُهُمْ بِقَتْلِكُمْ إِيَّاهُمْ“[1] یعنی اگر مومن مرد اور عورتیں نہ ہوتیں جبکہ کفارِ قریش نے نبی اکرم ﷺ کو پھیرا، یعنی اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم ان کو اپنے مار ڈالنے سے ان کو پامال کر دو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو ان سے لڑنے کا اذن دے دیتا، صرف یہی بات تمھیں اذن دینے میں مانع ہوئی، ورنہ وہ تو اس کے مستحق ہو چکے تھے کہ ہلاک کر دیے جاتے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا﴾ جمہور نے اسی طرح پڑھا ہے: ”تَزَيَّلَ“ بہ معنی ”تَمَيَّزَ“ ہے، یعنی اگر وہ لوگ جو ایمان لائے ان لوگوں سے جو کافر ہوئے متمیز ہو جاتے تو اللہ تم کو ان سے لڑنے کا اِذن دے دیتا۔ یہ قول قتبی کا ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: اگر وہ متفرق ہو جاتے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اگر مومنین کفار کے درمیان سے زائل ہو جاتے۔ یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ امام ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ وغیرہ یعنی ابو حیوہ اور ابن عون رحمہما اللہ نے ”لَوْ تَزَايَلُوْا“ پڑھا ہے۔

”تَزَايَلَ“ بہ معنی ”تَبَايَنَ“ ہے،[3] یعنی اگر مومنین کافروں سے متباین و جدا ہو جاتے تو البتہ ہم اس وقت ان لوگوں کو دردناک عذاب کرتے جو مکے والوں میں سے کافر ہوئے، اس طرح سے کہ اس کی فتح میں ہم تم کو اذن دے دیتے۔ قاضی نے کہا ہے کہ عذابِ الیم سے مراد قتل اور قید کرنا ہے۔[4] ظاہر یہی ہے اس لیے کہ ان کی تعذیب سے دنیا کی تعذیب ہے، یعنی مسلمانوں کو اُن پر مسلط کرنا اور اُن سے لڑنا، کیوں کہ عدمِ تمیز سے یہ بات لازم نہیں ہوتی کہ

---

[1] الدر المنثور (٥٣٤/٧) [2] تفسير القرطبي (٢٨٦/١٦)
[3] فتح القدير (٧٢/٥) [4] تفسير البيضاوي (٢٠٧/٥)

آخرت کا عذاب نہیں ہوگا۔ (أفاده علي القاري) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اگر کفار مومنوں سے جدا ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کو تمھارے ہاتھوں سے قتل کر کے عذابِ الیم کرتا۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کے سبب سے کفار سے دور کرتا ہے جس طرح کہ ضعیف مومنوں کے سبب سے مشرکینِ مکہ سے دور رکھا۔[2]

﴿ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ ﴾ میں کلمۂ ﴿ اِذْ ﴾ مفعول بہ ہے "اُذْكُرْ" محذوف کا (یا متعلق ہے ﴿ صَدُّوْكُمْ ﴾ سے یا ﴿ لَعَذَّبْنَا ﴾ سے) اور ﴿ جَعَلَ ﴾ بہ معنی القا ہے اور ﴿ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ ﴾ بدل ہے اول حمیت سے اور حمیت بہ معنی انفت ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "فُلَانٌ ذُوْ حَمِيَّةٍ" یعنی فلاں انفت، غضب، تکبر اور تعاظم والا ہے۔ معنی یہ ہیں: یاد کر اس وقت کو کہ جس وقت ان لوگوں نے جو کافر ہوئے اپنے دلوں میں جاہلیت کی حمیت کا القا اور اضمار کیا اور اس پر اصرار کیا اور اس کو اپنے دلوں میں پکا اور ثابت ٹھہرایا۔

امام مقاتل بن سلیمان اور مقاتل بن حیان رحمہ اللہ کہتے ہیں: مکے والے بولے کہ ہمارے بیٹوں اور بھائیوں کو تو قتل کر ڈالا اور اب ہم پر ہمارے گھروں میں داخل ہوتے ہیں، چنانچہ عرب لوگ یہ مشہور کریں گے کہ واقعی وہ لوگ ہماری مرضی کے خلاف ہم پر داخل ہوئے، لات وعزیٰ کی قسم ہے! وہ مکے میں ہم پر داخل نہ ہوں گے۔ چنانچہ یہ حمیت وہی جاہلیت کی حمیت ہے جو اُن کے دلوں میں ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی حمیت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرنے سے عار کرنا۔[3] امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حمیتِ جاہلیت وہی ہے کہ جس کا مطلق منع ہے، وہ حق کے ساتھ ہو یا باطل کے ساتھ۔ چنانچہ وہ حق کا مطیع ہونے سے منع کرتی ہے اور اس کی بنا تشفی پر ہے بر مقتضائے غضب لغیر اللہ تعالیٰ۔ پھر وہ شرعی حدود سے تجاوز کرنے کو واجب کرتی ہے اور اسی لیے انھوں نے مسلمانوں کے مکہ مشرفہ میں بیتِ عتیق کی زیارت کے لیے، جس میں سب لوگ برابر ہیں، داخل ہونے سے عار کیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ معطوف ہے ایک محذوف عبارت پر (یہ عبارت علی قاری رحمہ اللہ نے نکالی ہے) وہ یہ ہے کہ جب کفار نے یہ حمیت کی تو مسلمانوں نے قصد کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صلح کے بارے میں کلام کی مخالفت کریں اور اس بات سے وہ ایک امرِ عظیم میں داخل ہوئے، قریب تھے کہ ہلاک ہو جائیں۔ یا بعض کے دل میں شک داخل ہو جائے، یہاں تک کہ آپ نے تین بار فرمایا: کھڑے ہوؤ اور نحر کرو، پھر سر منڈاؤ اور اُن میں سے ایک شخص بھی کھڑا نہ ہوا (اس کا قصہ پہلے پوری تشریح اور تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے) یہ خیال کر کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر اباحت یا استحباب کے لیے ہے، یا لڑائی کے کام میں مشورے کے بارے میں ہے اور ارادہ کیا کہ کفار پر دباؤ ڈالیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تسکین اپنے رسول پر اور مومنوں پر اتاری، اسی لیے تو اُن کے دلوں میں ویسی حمیت داخل نہ ہوئی جیسی کہ کفار کے دلوں میں پیدا ہوئی۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کو رضا اور تسلیم پر ثابت رکھا۔

[1] الدر المنثور (٥٣٤/٧) [2] تفسير البغوي (٣٢١/٧) [3] فتح القدير (٧٢/٥)

﴿ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى ﴾ یعنی اور اُن کے لیے وہ کلمہ پسند کیا جو شرک سے بچنے کے لیے ہے۔ چنانچہ یہ الزام (پسند کرنا) شرف اور عزت کے لیے ہے۔ ﴿ كَلِمَةَ التَّقْوٰى ﴾ سے مراد "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" ہے۔ جمہور نے اسی طرح کہا ہے۔ بعض نے اس میں "مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ" کا اضافہ کیا ہے اور بعض نے "وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ" بڑھایا ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"[1] ہے، یہ اس لیے کہ کفار نے اس کو نہیں مانا اور صلح کی اس تحریر میں اس کو لکھنے سے باز رہے جو اُن کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان ہوئی تھی۔ چنانچہ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کلمے کے ساتھ مومنوں کو خالص کیا اور اس کو ان پر لازم فرمایا۔ لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ توحید کا کلمہ وہی ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے سے بچا جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ كَلِمَةَ التَّقْوٰى ﴾ عہد کا وفا کرنا اور اس پر ثابت رہنا ہے باقی اقوال پہلے گزر چکے ہیں۔

﴿ وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ﴾ عطف تفسیری ہے، یعنی کافروں کے مقابلے میں اس کلمے کے زیادہ حق دار تھے اور کافروں کے علاوہ اس کے لائق تھے اللہ تعالیٰ کے علم میں، کیوں کہ اللہ پاک نے اپنے دین کے لیے ان کو لائق کیا اور اپنے رسول ﷺ کی صحبت کے لیے ان کو پسند فرمایا۔ ﴿ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کو خوب علم ہے کفار کے کام کا اور اس سزا کا جس کے وہ مستحق ہیں اور مومنوں کے حال کا اور اس خیر کا جس کے وہ لائق ہیں۔[2]

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ۭ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿٢٧﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿٢٨﴾

البتہ تحقیق اللہ نے اپنے رسول کو خواب میں حق کے ساتھ سچی خبر دی کہ اگر اللہ نے چاہا تو تم اپنے سر منڈاتے اور بال کترواتے ہوئے مسجدِ حرام میں ضرور داخل ہو گے، تم (کسی سے) نہ ڈرتے ہو گے، چنانچہ اللہ وہ بات جانتا تھا جو تم نہیں جانتے تھے، لہٰذا اس نے اس سے پہلے ایک فتح جلد ہی عطا کر دی (27) اور وہ (اللہ) ہی تو ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ وہ اسے سب ادیان پر غالب کر دے، اور اللہ بطور گواہ کافی ہے (28)

(1) تفسیر الطبري (۲۵۵/۲۲) (2) فتح البیان (۱۳/۱۱۱۔۱۱۵)

رسول اللہ ﷺ کے خواب کی سچائی:

اس دین کو اللہ نے ظاہر میں بھی سب پر غالب کر دیا ایک مدت تک اور دلیل کے لحاظ سے تو ہمیشہ سے غالب ہے۔ انتھٰی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خواب میں یہ دیکھا تھا کہ آپ ﷺ مکے میں داخل ہوئے اور بیت اللہ کا طواف کیا۔ چنانچہ اپنے اصحاب کو اس کی خبر دی اور آپ ﷺ مدینہ منورہ میں تھے۔ پھر حدیبیہ کے سال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عمرے کی نیت سے چلے تو اُن میں سے ایک جماعت نے بھی اس بات میں شک نہ کیا کہ اس خواب کی تعبیر اسی سال میں ہو گی۔ پھر جب واقع ہوا جو کچھ واقع ہوا صلح کا فیصلہ اور اس سال واپس آئے اس شرط پر کہ آیندہ سال پھر آئیں تو اس بات سے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل میں کچھ واقع ہوا، یہاں تک کہ سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں سوال کیا اور اپنی تقریر میں آپ ﷺ سے یہ بات عرض کی: کیا آپ ہم کو یہ خبر نہیں دیتے تھے کہ ہم بیت اللہ میں آئیں گے اور اس کا طواف کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں، کیا پھر میں نے تجھے یہ بتایا تھا کہ تو اسی سال میں اس کے پاس آئے گا؟ عرض کی کہ نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک تو اس کے پاس آنے والا اور اس کا طواف کرنے والا ہے اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی بالکل ایسا ہی جواب دیا اور اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یوں فرمایا: ﴿ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴾۔

﴿ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ ﴾ کا کلمہ خبر کی تحقیق اور تاکید کے لیے ہے، اس کو استثناء سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔ ﴿ اٰمِنِيْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے داخل ہونے کی حالت میں بے خطرہ ہو گے۔ ﴿ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ﴾ دونوں حالِ مقدرہ ہیں، اس لیے کہ داخل ہوتے وقت محلقین اور مقصرین نہ تھے، یہ جو تھا تو دوسرے حال میں تھا۔ ان میں سے بعض نے تو اپنا سر منڈایا اور بعض نے بال کترائے۔ صحیح میں ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ محلقین پر رحم کرے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اور مقصرین پر اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے فرمایا: اور مقصرین پر، تیسری بار یا چوتھی بار میں۔ [1]

﴿ لَا تَخَافُوْنَ ﴾ معنی میں حالِ مؤکدہ ہے، چنانچہ اللہ پاک نے اُن کے داخل ہونے کے وقت میں امن ثابت کیا اور اُن سے خوف کی نفی کی، اس حال میں کہ شہر کے اندر قرار پکڑیں گے اور کسی سے نہ ڈریں گے۔ یہ قصہ ماہِ ذی قعدہ ۷ ہجری عمرۂ قضا میں واقع ہوا، کیوں کہ نبی کریم ﷺ ماہِ ذی قعدہ میں حدیبیہ سے پھرے تو مدینے کی طرف رجوع ہوئے اور ماہِ ذوالحجہ اور محرم وہاں ٹھہرے اور ماہِ صفر میں خیبر کی طرف نکلے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو آپ ﷺ پر مفتوح فرما دیا۔ بعض کو تو غلبے کے طور پر اور بعض کو صلح کے طریقے سے۔ خیبر ایک بڑی اقلیم تھی، یعنی ایک بڑا ملک تھا، اس

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٤٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٠١)

میں کھجوریں اور کھیتیاں بہت تھیں۔ اس میں جو یہودی تھے اُن سے آپ نے نصف پیداوار کے عوض خدمت لی، یعنی کھجوروں وغیرہ کی خدمت کرو، ان کو پانی دو اور جو پیداوار ہو اس میں سے آدھا تم کو اور آدھا ہم کو دو اور آپ ﷺ نے اس کو صرف اہلِ حدیبیہ میں تقسیم کر دیا اور اُن کے سوا اس جنگ میں کوئی اور حاضر بھی نہ ہوا، مگر وہ لوگ جو حبشہ سے آگئے تھے۔ سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھی اور سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھی اور اُن میں سے کوئی غیر حاضر نہیں رہا۔

امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مگر ابو دجانہ سماک بن خرشہ،[1] چنانچہ یہ بات اپنی جگہ میں ثابت ہو چکی ہے۔ پھر آپ ﷺ مدینہ منورہ کی طرف لوٹ کر تشریف لائے، پھر جب ۷ر ہجری کا ماہِ ذی قعدہ آیا تو آپ ﷺ اور حدیبیہ والے عمرہ کرنے کے لیے مکے کی طرف روانہ ہوئے تو آپ ﷺ نے ذوالحلیفہ سے احرام باندھا اور اپنے ساتھ ہدی کو لیا، کہا کہ ساٹھ بُدنے (اونٹ) تھے، پھر جب آپ ظہران کے قریب سے گزرے (ظہران مکہ اور عسفان کے درمیان ایک وادی ہے اور "مر" بہ فتح میم وتشدید ایک گاؤں ہے ظہران کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔[2] كذا في مجمع البحار) تو محمد بن سلمہ کو گھوڑوں اور ہتھیاروں کے ساتھ آگے بھیجا، جب مشرکوں نے اس کو دیکھا تو سخت مرعوب ہوئے اور خیال کیا کہ رسول اللہ ﷺ اُن پر چڑھائی کریں گے اور یہ خیال کیا کہ دس برس تک لڑائی موقوف کرنے کا عہد جو اُن کے اور آپ ﷺ کے درمیان ہے، اس کو توڑ ڈالا ہے تو وہ چلے اور مکہ والوں کو جا کر خبر دی۔

پھر جب رسول اللہ ﷺ آئے تو مر الظہران میں اترے، ایسی جگہ پر جہاں سے انصاف حرم، یعنی حرم کی حدود کے نشان کی طرف نظر کریں تو ہتھیار یعنی کمانیں اور تیر اور نیزے بطنِ یاجج کی طرف بھیج دیے۔ (بہ ہمزہ وکسرِ جیم مکہ سے آٹھ میل پر ایک جگہ ہے۔[3] كذا في مجمع البحار) اور خود مکے کی طرف چلے، اس طرح کہ تلواریں میان میں بند تھیں، جیسا کہ صلح نامہ میں شرط کی گئی تھی۔ پھر جب راستے میں جا رہے تھے تو قریش نے مکرز بن حفص کو بھیجا تو اس نے کہا: او محمد! ہم نے تجھ کو نہیں جانا کہ تو عہد کو توڑتا ہو۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کیوں، حالاں کہ ہم نے تو ان کو یاجج کی طرف بھیج دیا ہے تو وہ بولا: "بِهٰذَا عَرَفْنَاكَ بِالْبِرِّ وَالْوَفَاءِ" یعنی ہم نے تجھے اسی کے ساتھ پہچانا ہے کہ تو نیکی کرتا ہے اور عہد کو پورا کرتا ہے اور کفار کے سردار مکے سے نکل گئے، تاکہ رسول اللہ ﷺ کی طرف اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی طرف نظر نہ کریں غیظ وغضب کے مارے۔

رہے مکہ کے دوسرے لوگ مرد اور عورتیں اور بچے تو وہ گھروں اور راستوں میں بیٹھے ہوئے آپ ﷺ کی طرف اور آپ ﷺ کے اصحاب کی طرف دیکھتے تھے، پھر آپ ﷺ مکے میں داخل ہوئے اور آپ ﷺ کے آگے آپ ﷺ کے اصحاب لبیک پکارتے ہوئے آئے اور ہدی کو ذی طویٰ کی طرف بھیج دیا تھا۔ آپ ﷺ اپنے ناقہ قصویٰ

[1] تفسیر الطبري (۲۵۹/۲۲) [2] مجمع بحار الأنوار (۵۰۱/۳) [3] مجمع بحار الأنوار (۱۸۹/۵)

پر سوار تھے جس پر حدیبیہ کے دن سوار تھے اور عبداللہ بن رواحہ انصاری رضی اللہ عنہ ناقۂ رسول اللہ ﷺ کی مہار پکڑے ہوئے تھے اور اسے کھینچتے جاتے اور کہتے جاتے تھے۔ ؎

بِاسْمِ الَّذِيْ لَا دِيْنَ إِلَّا دِيْنُهُ　　بِاسْمِ الَّذِيْ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُهُ
خَلُّوْا بَنِيْ الْكُفَّارِ عَنْ سَبِيْلِهِ　　اَلْيَوْمَ نَضْرِبُكُمْ عَلَى تَأْوِيْلِهِ
كَمَا ضَرَبْنَاكُمْ عَلَى تَنْزِيْلِهِ　　ضَرْبًا يُزِيْلُ الْهَامَ عَنْ مَقِيْلِهِ
وَيُذْهِلُ الْخَلِيْلَ عَنْ خَلِيْلِهِ　　قَدْ أَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ فِيْ تَنْزِيْلِهِ
فِيْ صُحُفٍ تُتْلَى عَلَى رَسُوْلِهِ　　بِأَنَّ خَيْرَ الْقَتْلِ فِيْ سَبِيْلِهِ
يَا رَبِّ إِنِّيْ مُؤْمِنٌ بِقِيْلِهِ

چنانچہ یہ متفرق روایتوں سے جمع کیا ہوا ہے۔[1] یونس بن بکیر رحمہ اللہ نے محمد بن اسحاق رحمہ اللہ سے روایت کیا، کہا: مجھے عبداللہ بن ابی بکر بن حزم نے حدیث بیان کی، کہا کہ جب رسول اللہ ﷺ مکے میں عمرۂ قضا کے لیے داخل ہوئے اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی اونٹنی کی مہار پکڑے ہوئے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے: ؎

خَلُّوْا بَنِيْ الْكُفَّارِ عَنْ سَبِيْلِهِ　　إِنِّيْ شَهِيْدٌ أَنَّهُ رَسُوْلُهُ
خَلُّوْا فَكُلُّ الْخَيْرِ فِيْ رَسُوْلِهِ　　يَا رَبِّ إِنِّيْ مُؤْمِنٌ بِقِيْلِهِ
نَحْنُ قَتَلْنَاكُمْ عَلَى تَأْوِيْلِهِ　　كَمَا قَتَلْنَاكُمْ عَلَى تَنْزِيْلِهِ
ضَرْبًا يُزِيْلُ الْهَامَ عَنْ مَقِيْلِهِ　　وَيُذْهِلُ الْخَلِيْلَ عَنْ خَلِيْلِهِ[2]

امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم کو حدیث بیان کی معمر نے عن الزہری عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ، کہا کہ جب رسول اللہ ﷺ عمرۂ قضا کے لیے مکے میں داخل ہوئے تو عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے آگے آگے چلے۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی رکاب پکڑے ہوئے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے: ؎

خَلُّوْا بَنِيْ الْكُفَّارِ عَنْ سَبِيْلِهِ　　قَدْ أَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ فِيْ تَنْزِيْلِهِ
بِأَنَّ خَيْرَ الْقَتْلِ فِيْ سَبِيْلِهِ　　يَا رَبِّ إِنِّيْ مُؤْمِنٌ بِقِيْلِهِ
نَحْنُ قَتَلْنَاكُمْ عَلَى تَأْوِيْلِهِ　　كَمَا قَتَلْنَاكُمْ عَلَى تَنْزِيْلِهِ
اَلْيَوْمَ نَضْرِبُكُمْ عَلَى تَأْوِيْلِهِ　　ضَرْبًا يُزِيْلُ الْهَامَ عَنْ مَقِيْلِهِ
وَيُذْهِلُ الْخَلِيْلَ عَنْ خَلِيْلِهِ[3]

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے عمرے میں

---

[1] تفسير ابن كثير (٢٥٤/٤، ٢٥٥) [2] السيرة النبوية لابن هشام (١٩/٥) دلائل النبوة للبيهقي (٣٢٣/٤)

[3] دلائل النبوة للبيهقي (٣٢٢/٤، ٣٢٣)

جب مرالظہران میں اترے تو آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کو یہ خبر پہنچی کہ قریش کہتے ہیں کہ وہ اتنے کمزور اور لاغر ہیں کہ اٹھ نہیں سکتے تو آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے کہا کہ اگر ہم اپنی سواریوں میں سے نحر کر لیں اور ان کے گوشت کھائیں اور ان کے شوربے سے پئیں تو کل صبح کو جب ہم قوم پر داخل ہوں گے تو خوب ہشاش، سیر اور سیراب ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ خوب کھا پی کر قوی ہو جائیں گے۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا: تم نحر مت کرو، لیکن تم اپنے توشوں کو میرے لیے جمع کرو، چنانچہ انھوں نے آپ ﷺ کے لیے جمع کیا اور چمڑے کے دسترخوان بچھائے، پھر سب نے کھایا، یہاں تک کہ کھانا بچ گیا اور اُن میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی تھیلی میں کھانا بھر لیا، پھر آپ ﷺ بیت اللہ کی طرف متوجہ ہوئے، یہاں تک کہ مسجد میں داخل ہوئے اور قریش حجر کی طرف بیٹھے (یعنی حطیم جو میزاب کے نیچے احاطہ کی ہوئی ایک جگہ ہے) آپ ﷺ نے اپنی چادر سے اضطباغ کیا (اضطباغ یہ ہے کہ چادر کے وسط کو سیدھی بغل کے نیچے رکھیں اور اس کے دونوں پلو بائیں کندھے پر ڈال دیں سینے اور پشت کی جہتوں سے) پھر فرمایا: نہ دیکھے گی قوم تم میں سے کوئی عیب، پھر آپ ﷺ نے حجرِ اسود کا استلام کیا (حجرِ اسود کو بوسہ دینا یا ہاتھ سے چھونا) پھر رمل کی یعنی کندھے ہلا کر تیز تیز چلے، یہاں تک کہ جب رکنِ یمانی کے ساتھ غایب ہو گئے تو رکنِ اسود تک چل کر گئے۔ قریش بولے: تم چلنے سے راضی نہیں ہوتے ہو۔ سنتے ہو تم تو البتہ ہرنوں کے کودنے کی طرح کودتے ہو۔ ایسا تین پھیروں میں کیا تو یہ سنت ہو گیا۔ ابوالطفیل نے کہا: پھر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے مجھے خبر دی کہ رسول اللہ نے حجۃ الوداع میں اسی طرح کیا ہے۔[1]

امام احمد رحمہ اللہ نے عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب مکے میں اس حال میں آئے کہ مدینے کے بخار نے اُن کو کمزور کر دیا تھا اور اس سے انھیں برائی پہنچی تھی تو مشرک بولے کہ تم پر ایک قوم آئی ہے جس کو یثرب کے بخار نے ضعیف کر ڈالا ہے اور اس سے برائی کو پیش آئے اور مشرک لوگ اس کنارے پر بیٹھے تھے جو حجرِ اسود سے متصل ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو اس بات پر مطلع کر دیا جو انھوں نے کہی تھی تو آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ تین پھیروں میں کاندھے ہلا کر تیز تیز چلیں، تاکہ مشرک ان کی قوت کو دیکھیں۔ کہا: پھر تین پھیروں میں کاندھے ہلا کر تیز چلے اور آپ ﷺ نے ان کو یہ حکم دیا کہ رکنِ یمانی اور حجرِ اسود کے درمیان چلیں، جہاں کہ مشرک ان کو نہیں دیکھتے، مطلب یہ ہے کہ اپنی چال چلیں دوڑیں نہیں۔ آپ ﷺ کو کوئی شے اس سے مانع نہیں ہوئی کہ سارے پھیروں میں صحابہ کاندھے ہلا کر تیز چلیں، مگر ان پر مہربانی اور رحم اس سے مانع آیا۔ چنانچہ مشرک بولے: کیا یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم نے خیال

---

[1] مسند أحمد (۳۰۵/۱) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجال أحمد رجال الصحیح" (مجمع الزوائد: ۶۰۷/۳)

کیا تھا کہ تپ نے ان کو کمزور کر ڈالا ہے یہ تو ہرنوں سے بھی زیادہ تیز اور قوی ہیں۔[1] (أخرجه في الصحيحين من حديث حماد بن زيد به)

ایک روایت میں یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم ماہِ ذیقعدہ کی چوتھی رات کی صبح کو آئے تو مشرک بولے: بے شک تم پر ایک ایسے وفد کے لوگ آتے ہیں، یعنی زائرین جن کو مدینے کے بخار نے کمزور کر ڈالا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ تین پھیروں میں رمل کریں اور اُن کو سارے پھیروں میں رمل کرنے کا حکم دینے سے صرف ان کی مسلمانوں پر شفقت نے منع کیا۔"وقال البخاري: و زاد ابن سلمة يعني حماد بن سلمة عن أيوب عن سعيد بن جبير عن ابن عباس رضی اللہ عنہما" کہا: یعنی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہ جب نبی کریم ﷺ اپنے اس سال میں بے خوف ہوئے تو فرمایا کہ رمل کرو، تاکہ مشرکوں کو اُن کی قوت دکھا دیں اور مشرک قیقعان کی جانب تھے۔[2] اور امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جو بیت اللہ کی اور صفا و مروہ کی سعی کی تو صرف اس لیے کہ مشرک لوگ آپ کی قوت دیکھیں۔[3]

(رواه في مواضع أخر و مسلم والنسائي من طرق عن سفيان بن عيينة به)

نیز امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے عمرہ کیا تو ہم نے غلمانِ مشرکین سے آپ ﷺ کا ستر کیا اس ڈر سے کہ کہیں وہ آپ کو ایذا پہنچائیں۔[4] (انفرد به البخاري دون مسلم) نیز بخاری رحمہ اللہ نے عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ ﷺ عمرے کی نیت سے نکلے تو کفارِ قریش حائل ہو گئے آپ کے اور بیت اللہ کے درمیان، چنانچہ حدیبیہ میں آپ ﷺ نے اپنے اونٹ نحر کیے اور اپنا سر مونڈ دیا اور ان سے اس بات پر صلح کی کہ آیندہ سال عمرہ کریں اور سوائے تلواروں کے اور کوئی ہتھیار نہ لائیں اور وہاں صرف اتنے دن ٹھہریں جتنا قریش اجازت دیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے آیندہ سال عمرہ کیا تو آپ ﷺ مکہ میں ایسے داخل ہوئے جیسے ان سے صلح نامے میں طے پایا تھا۔ پھر جب آپ ﷺ وہاں تین رات ٹھہرے تو اُن کو قریش نے کہا کہ نکل جائیں تو آپ ﷺ نکل گئے۔[5] یہ حدیث شریف صحیح مسلم میں بھی ہے۔

نیز امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ذی قعدہ میں عمرہ کیا تو مکے والوں نے اس سے انکار کیا کہ آپ ﷺ کو مکے میں داخل ہونے کی اجازت دیں، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ان سے اس بات پر صلح کی کہ وہاں تین دن قیام کریں۔ پھر جب صلح نامہ لکھا تو یوں لکھا: "هٰذَا مَا قَاضَى عَلَيْهِ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٢٥) صحيح مسلم (١٢٦٦) مسند أحمد (٢٩٤/١) [2] صحيح البخاري (٤٠٠٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٦٦) سنن النسائي (٢٩٧٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٠٧) [5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٠٠٦)

مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہِ"۔ قریش بولے ہم اس کا اقرار نہیں کرتے اور اگر ہم جانتے کہ تو اللہ کا رسول ہے تو ہم تجھے کسی شے سے منع نہ کرتے، لیکن تو لکھ محمد بن عبداللہ۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور میں محمد بن عبداللہ ہوں۔ پھر آپ ﷺ نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ رسول اللہ کو، یعنی اس کلمے کو مٹا دے تو انھوں نے عرض کی: لا واللہ! میں کبھی آپ کو محو نہ کروں گا تو آپ ﷺ نے وہ خط لے لیا اور آپ ﷺ اچھی طرح نہیں لکھتے تھے، پھر لکھا: "هٰذَا مَا قَاضٰى عَلَيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰہِ" یعنی یہ وہ شے ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے فیصلہ کیا کہ مکے میں نہ داخل ہو ہتھیار لے کر مگر ایک تلوار جو غلاف میں ہو اور یہ کہ اس کے لوگوں میں سے جو اس کے ساتھ جانے کا ارادہ کرے اپنے ساتھ لے کر نہ جائے اور یہ کہ اپنے اصحاب میں سے اگر کوئی مکہ میں مقیم ہونا چاہے تو اسے نہ روکے۔ پھر جب آپ ﷺ مکے میں داخل ہوئے اور مقررہ مدت گزر گئی تو مکہ کے کافر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ تو اپنے صاحب سے کہہ کہ ہمارے پاس سے نکل جائے۔ چنانچہ جب وہ مدت گزر گئی تو نبی کریم ﷺ نکلے تو سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی آپ کے پیچھے لگی، او چچا! او چچا! کہتے ہوئے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس کو لے لیا، پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ اپنے چچا کی بیٹی کو لے لے تو انھوں نے اس کو اٹھا لیا، پھر سیدنا علی، زید اور جعفر رضی اللہ عنہم اس کے بارے میں جھگڑے، چنانچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بولے کہ میں نے اس کو لیا ہے اور وہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور جعفر رضی اللہ عنہ بولے کہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میرے تحت میں ہے، یعنی میری بیوی ہے اور زید رضی اللہ عنہ بولے کہ میرے بھائی کی بیٹی ہے، نبی اکرم ﷺ نے اس کی خالہ کے لیے اس کا فیصلہ کیا اور فرمایا کہ خالہ ماں کے مرتبے میں ہے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تو میرا ہے اور میں تیرا ہوں اور جعفر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تو صورت اور سیرت میں میرے مشابہ ہے اور زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تو ہمارا بھائی اور ہمارا مولیٰ ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ آپ حمزہ کی بیٹی کو بیاہ کیوں نہیں لیتے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ تو میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے۔[1] (انفرد من هذا الوجه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴾ یعنی اللہ عزوجل نے وہ خوبی اور مصلحت جان لی جو مکے سے تمھارے پھیر دینے میں تھی اور پھر اگلے سال اس میں تمھارے داخل ہونے میں تھی جو تمھیں معلوم نہیں تھی۔ پھر اس میں داخل ہونے سے پہلے وہ خوبی کر دی یعنی قریبی فتح جس کی خوش خبری تمھیں نبی ﷺ کے خواب کی صورت میں دی تھی، یعنی وہ صلح جو تمھارے اور تمھارے مشرک دشمنوں کے درمیان طے پائی۔

پھر اللہ پاک نے مومنوں کو رسول اللہ ﷺ کے منصور ہونے کی بشارت دی کہ وہ اپنے دشمنوں پر اور سارے زمین والوں پر مظفر اور منصور ہوں گے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ ﴾ یعنی وہی ہے جس نے اپنے رسول کو علمِ نافع اور عملِ صالح دے کر بھیجا، کیوں کہ شریعت دو شے پر مشتمل ہے علم اور عمل، سو

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٠٥)

شریعت کا علم صحیح ہے اور شرعی عمل مقبول ہے، چنانچہ اس شریعت کے اخبارات حق ہیں اور اس کے انشا آت عدل ہیں۔
﴿ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ﴾ یعنی تاکہ اس کو تمام دین والوں پر غالب کر دے جو سارے زمین والوں، یعنی عرب و عجم و مسلمان اور مشرکوں میں سے ہیں۔ ﴿ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴾ یعنی اور اللہ اس بات پر گواہ کافی ہے کہ وہ اس کا رسول ہے اور وہ اس کا مددگار ہے۔[1] واللّٰه سبحانه و تعالىٰ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مفسرین نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے اپنے نبی ﷺ کو مدینے میں خواب دکھایا، اس سے پہلے کہ حدیبیہ کی طرف نکلیں، گویا آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے سر منڈایا اور بال کتروائے، پھر آپ ﷺ نے اصحاب کو اس کی خبر دی تو وہ خوش ہوئے اور یہ خیال کیا کہ وہ اب اپنے اسی سال میں مکے میں داخل ہوں گے۔

پھر جب وہ حدیبیہ سے واپس آ گئے اور مکے میں داخل نہ ہوئے تو منافق بولے: واللہ! نہ ہم نے سر منڈایا نہ بال کترے اور نہ مسجد الحرام میں داخل ہوئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ﴾[2] کسی نے کہا: یہ خواب حدیبیہ میں تھا، یعنی اللہ نے البتہ واقعی اپنے رسول کے خواب کو صادق اور سچا کر دیا اور اس کو ایسا ردی خواب نہ کیا جس کی کچھ تعبیر نہیں ہوتی، گو اس خواب کی تعبیر واقع نہیں ہوئی مگر عمرۂ قضا کے بعد۔

﴿ بِالْحَقِّ ﴾، ﴿ صَدَقَ ﴾ سے متعلق ہے، یعنی اللہ نے اپنے رسول کو اس شے میں سچا کر دیا جو اُس نے دیکھی اور اس کے وجود اور حاصل کرنے میں حق کے ساتھ، یعنی جو دیکھا تھا اس کی سچائی کو اس کے نزدیک حق اور ثابت کر دیا۔ یا ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ صفت ہے مفعول مطلق محذوف کی: "أَيْ: صِدْقًا مُتَلَبِّسًا بِالْحَقِّ" یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو خواب کے بارے میں سچا کر دیا، ایسا سچا کرنا جو حق کو لیے ہوئے ہے، یعنی حکمتِ بالغہ کو، یہ حکمتِ خالص مومن اور اس شخص کے درمیان آزمائش اور تمیز ہے جس کے دل میں نفاق کی بیماری ہے۔

غرضیکہ ﴿ لَقَدْ ﴾ میں حرفِ لام توطئہ قسم کا ہے اور قسم محذوف کا جواب ہے: "أَيْ: وَاللّٰهِ لَقَدْ... الخ" یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ قسم ہو اور حق سے مراد وہ ہو جو باطل کا نقیض ہے، یا وہ حق مراد ہو جو اللہ پاک کے اسماء میں سے ہے اور اس قسم کا جواب ﴿ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ ﴾ ٹھہرے۔ اس بنا پر ﴿ الرُّءْيَا ﴾ پر وقف ہو گا اور ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ سے ابتدائے کلام ہو گا، یعنی قسم ہے حق کی البتہ تم داخل ہو گے آیندہ سال مسجد الحرام میں اور پہلی دو وجہ جو ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ کے بارے میں گزری ہیں، ان کی بنیاد پر ﴿ لَتَدْخُلُنَّ ﴾ قسم محذوف کا جواب ہو گا: "أَيْ: وَاللّٰهِ لَتَدْخُلُنَّ"

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٢٥٤۔٢٥٨) [2] فتح القدير (٥/٧٣)

ان شاء اللہ فرما کر جو وعدے کو مشیت کے ساتھ معلق فرمایا ہے تو اس کی کئی وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ بندوں کو اس شے کی تعلیم دینا مقصود ہے جو وہ کہا کریں، جیسا کہ اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَاْیْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾ [الکھف: ۲۳۔ ۲۴] ''اور ہرگز ہرگز کسی کام پر یوں نہ کہنا کہ میں اسے کل کروں گا مگر ساتھ ہی ان شاء اللہ کہہ لینا۔'' ثعلب نے کیا خوب کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شے میں استثناء کیا جس کو وہ جانتا ہے، تاکہ مخلوق اس شے میں استثناء کرے جس کو وہ نہیں جانتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ جو آپ ﷺ کے ساتھ حدیبیہ میں تھے، اللہ پاک نے جان لیا تھا کہ ان میں سے بعض مر جائیں گے، چنانچہ اس وجہ سے استثناء واقع ہوا۔ یہ قول حسن بن فضل کا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ ﴾ بہ معنی ''كَمَا شَاءَ اللّٰهُ'' ہے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلمۂ ''إن'' بہ معنی ''إذ'' ہے، یعنی جس وقت کہ اللہ نے چاہا، جبکہ اپنے رسول کو یہ دکھایا۔[1]

﴿ اٰمِنِیْنَ ﴾ منصوب ہے بنا بر حال ﴿ لَتَدْخُلُنَّ ﴾ کے فاعل سے اور شرط درمیان میں معترض ہے۔ معنی یہ ہیں کہ البتہ تم مسجد الحرام میں بے خوف ہو کر داخل ہو گے، تمھیں اپنے دشمنوں سے یہ ڈر نہ ہوگا کہ وہ تمھیں زمانۂ آیندہ میں وہاں سے نکالیں گے۔ اسی طرح ﴿ مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِیْنَ ﴾ بھی حال ہیں، یعنی اس حال میں کہ تم میں سے بعض تو سر منڈائیں گے اور بعض بال کتریں گے۔ حلق اور تقصیر خاص طور پر مردوں کے لیے ہے اور حلق تقصیر سے افضل ہے، چنانچہ صحیح حدیث اس پر دال ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہے۔[2] ﴿ لَا تَخَافُوْنَ ﴾ کلامِ مستانف ہے اس میں اس شے کی زیادہ تاکید ہے جو ﴿ اٰمِنِیْنَ ﴾ سے سمجھی جا چکی ہے تو اب کچھ تکرار نہیں ہے۔

﴿ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا ﴾، ﴿ صَدَقَ ﴾ پر معطوف ہے، یعنی اللہ نے اپنے رسول کو خواب سچا کر دکھایا، پھر جان لی وہ شے جو تمھیں معلوم نہیں، یعنی صلح میں جو مصلحت تھی، اس لیے کہ صلح کے سال مکہ میں تمھارے داخل ہونے میں کمزور مسلمانوں کا نقصان تھا۔ ﴿ فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِیْبًا ﴾ یعنی پھر تمھارے مکے میں داخل ہونے سے پہلے ایک نزدیکی فتح ٹھہرا دی، جیسا کہ اپنے رسول کو دکھایا تاکہ اس سے تم کو قوی کر دے، کیوں کہ یہ فتح بہت سے لوگوں کے اسلام لانے کا باعث ہوئی۔ اکثر مفسرین رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ فتح صلح حدیبیہ ہے۔ امام ابن زید اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ فتح خیبر ہے اور آیندہ سال میں خواب کی حقیقت ظاہر ہوئی۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسلام میں صلح حدیبیہ سے بڑی کوئی فتح نہیں ہے۔[3] البتہ ان برسوں میں اتنے لوگ اسلام میں داخل ہوئے جتنے اس سے پہلے داخل ہو چکے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ چھے (٦) ہجری میں مسلمان چودہ سو تھے اور آٹھ (٨) ہجری میں دس ہزار تھے۔ کسی نے کہا کہ یہ فتح مکہ ہے۔

---

[1] فتح القدير (٥/٧٣) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [3] تفسير الطبري (٢٢/٢٥٩)

﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہی جس نے اپنے رسول کو اس طرح بھیجا کہ وہ ہدایت کو لیے ہوئے ہے اور دینِ حق کو۔ مراد اسلام ہے، تا کہ اس کو تمام دینوں پر اس طرح سے غالب اور بلند کرے کہ جو حق تھا اس کو منسوخ کر دے اور جو باطل تھا اس کی خرابی کو ظاہر کر دے۔ دین سے مراد کل ادیان ہیں، چنانچہ جنس کی تاکید سے یہی مطلب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ لِيُظْهِرَهٗ ﴾ کی ضمیر رسول کی طرف راجع ہے، یعنی تا کہ اپنے رسول کو غالب کرے۔ مگر پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

اور بحمد اللہ بے شک یہ غلبہ ہو گیا، اس لیے کہ دینِ اسلام واقعی تمام ادیان پر غالب ہوا اور تمام ملتوں والے اس کے لیے مغلوب اور مقہور ہو گئے۔ تو کسی دین کو کبھی نہیں دیکھے گا مگر اسلام کو اس سے بڑھ کر عزت اور غلبہ ہو گا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ غلبہ عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت ہو گا، جب روئے زمین پر کوئی کافر باقی نہ رہے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کا یہ غالب کرنا دلائل و آیات کے ساتھ ہے۔ لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ اس آیت میں اس فتح کی تاکید ہے جس کا وعدہ کیا ہے۔ ﴿ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴾ حرفِ باء زائد ہے، جیسا کہ بارہا گزر چکا ہے، یعنی اور اللہ اس غالب کرنے پر جس کا مسلمانوں کو وعدہ دیا ہے، گواہ ہے اور اپنے نبی کریم ﷺ کی نبوت کے صحیح ہونے پر۔ [1]

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ڔ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ڗ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰي سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۭ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝۲۹

محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں، وہ کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت مہربان ہیں، آپ انھیں رکوع و سجود کرتے دیکھیں گے، وہ اللہ کا فضل اور (اس کی) رضا مندی تلاش کرتے ہیں، ان کی خصوصی پہچان ان کے چہروں پر سجدوں کا نشان ہے، ان کی یہ صفت تورات میں ہے اور انجیل میں ان کی صفت اس کھیتی کے مانند ہے جس نے اپنی کونپل نکالی، پھر اسے مضبوط کیا اور وہ (پودا) موٹا ہو گیا، پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہو گیا،

[1] فتح البیان (۱۳/ ۱۱۶۔۱۱۸)

کسانوں کو خوش کرتا ہے، (اللہ نے یہ اس لیے کیا) تا کہ ان (صحابۂ کرام) کی وجہ سے کفار کو خوب غصہ دلائے، اللہ نے ان لوگوں سے جو اُن میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، مغفرت اور بہت بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے ﴿29﴾

ایمان والوں کی صفات:

جو سختی اور نرمی اپنی عادت ہو، وہ سب جگہ برابر چلے اور جو ایمان سے سنور کر آئے، وہ سختی اپنی جگہ اور نرمی اپنی جگہ۔ ان کا بانا، یعنی تہجد کی نمازوں سے صاف نیت سے اُن کے چہرے پر نور ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم چہرے کے نور سے لوگوں میں سے پہچانے جاتے تھے۔ اور کھیتی کی کہاوت یہ ہے کہ پہلے اس دین پر ایک آدمی تھا، پھر دو ہوئے، پھر قوت بڑھتی گئی، نبی اکرم ﷺ کے وقت اور خلفاء کے وقت میں اور یہ کہ اُن کو وعدہ دیا جو ایمان لائے اور نیک کام کرتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے اصحاب میں سے سب ایسے ہی تھے، مگر اس کے ختم ہونے کا اندیشہ رکھا۔ حق تعالیٰ بندوں کو ایسی خوش خبری نہیں دیتا کہ نڈر ہو جائیں، مالک سے اتنی شاباش بھی غنیمت ہے۔ انتھیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محمد ﷺ کے متعلق خبر دیتا ہے کہ بے شک وشبہہ وہ اس کے سچے اور پکے رسول ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ﴾ یہ مبتدا وخبر ہے اور ہر وصفِ جمیل پر مشتمل ہے، اس لیے کہ رسالت کا منصب سارے مناصب سے بہتر اور برتر ہے۔ جب رسول ہوئے تو ساری خوبیاں اس کے ضمن میں آگئیں، پھر آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی ثنا اور صفت کی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [المائدة: ٥٤] ''تو اللہ بہت جلد ایسی قوم کو لائے گا جو اللہ کی محبوب ہو گی اور وہ بھی اللہ سے محبت رکھتی ہو گی، وہ نرم دل ہوں گے مسلمانوں پر اور سخت اور تیز ہوں گے کفار پر۔''

یہ مومن کی ایک صفت ہے کہ وہ کافروں پر تو سخت اور درشت ہو اور نیکوں کے ساتھ رحمدل اور اچھا برتاؤ کرتا ہو۔ کافروں کے مقابلے میں تو خشمناک وترش رو ہو اور مومن کے سامنے ہنس مکھ اور ہشاش بشاش ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ﴾ [التوبة: ١٢٣] ''اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمھارے آس پاس ہیں اور ان کو تمھارے اندر سختی پانا چاہیے۔'' اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مومنوں کی مثال اپنے آپس میں دوستی اور رحم کرنے میں جسمِ واحد کی مثال کی طرح ہے کہ جس وقت اس میں سے کوئی عضو بیمار ہوتا ہے تو اس کے لیے باقی جسم ایک دوسرے کو بلاتا ہے تپ اور بے خوابی کے ساتھ۔[1] یعنی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٦)

ایک عضو کی بیماری سے سارے جسم کے اعضاء بے قرار ہو جاتے ہیں، سب کا آرام جاتا رہتا ہے، سب کو تپ چڑھ جاتا ہے۔ گویا باقی اعضاء اس عضو کی بیماری سے اس کی غم خواری میں شریک ہونے کے لیے ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔ سب کی ایک حالت ہو جاتی ہے۔

چو عضوے بدرد آورد ز روزگار دگر عضوہا را نماند قرار

''جب زمانہ ایک عضو کو درد میں مبتلا کرتا ہے تو دوسرے اعضاء کا سکون برباد ہو جاتا ہے۔''

اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ مومن دوسرے مومن کے لیے دیوار کی طرح ہے کہ بعض اس کا بعض کو مضبوط کرتا ہے اور آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کے درمیان تشبیک کی[1] یعنی ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کر کے اس کی صورت بنائی۔ یہ دونوں حدیثیں صحیح میں ہیں۔

قولہ سبحانہ وتعالیٰ: ﴿ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ﴾ اس میں ان کا وصف کثرتِ عمل اور کثرتِ صلاۃ کے ساتھ کیا ہے۔ نماز اعمال میں سب سے بہتر ہے۔ اور یہ وصف کیا کہ وہ اس میں اللہ عزوجل کے لیے اخلاص کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑا ثواب چاہتے ہیں۔ وہ ثواب جنت ہے جو اللہ عزوجل کے فضل پر مشتمل ہے اور فضل ان پر رزق کی فراخی ہے اور اللہ تعالیٰ کا ان سے راضی ہونا ہے، یہ پہلے فضل سے زیادہ بڑا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾ [التوبة: ٧٢] ''اور اللہ کی رضا مندی سب سے بڑی چیز ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ﴾ علی بن ابی طلحہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے یعنی سمتِ حسن سے مراد حسنِ ہیئت وحسنِ منظر ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا یعنی خشوع اور تواضع۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن منصور عن مجاہد روایت کیا ہے، کہا کہ خشوع ہے۔ میں نے کہا: میں تو خیال نہیں کرتا تھا مگر چہرے میں یہ نشان تو کہا کہ یہ تو بسا اوقات اس شخص کی دونوں آنکھوں کے درمیان میں بھی ہوتا ہے جو فرعون سے بڑھ کر سخت دل ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نماز اُن کے چہروں کو حسین کر دیتی ہے۔[2] بعض سلف نے کہا ہے کہ جس شخص کی رات کی نماز کثیر ہوئی تو اس کا چہرہ دن میں حسین ہوا۔ (وقد أسنده ابن ماجه في سننه بسنده عن جابر رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله ﷺ: «من كثرت صلاته بالليل حسن وجهه بالنهار».[3] والصحيح أنه موقوف)

بعض نے کہا ہے کہ بے شک حسنہ کے واسطے البتہ دل میں ایک نور ہے اور چہرے میں روشنی ہے اور رزق

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٥)

[2] تفسير الطبري (٢٦٤/٢٢) تفسير ابن كثير (٢٥٨/٤)

[3] سنن ابن ماجه (١٣٣٣) اس کی سند میں ''ثابت بن موسیٰ'' سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٤٦٤٤)

میں فراخی ہے اور لوگوں کے دلوں میں محبت ہے۔ امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں پوشیدہ کیا کسی نے کوئی سریرہ، یعنی باطن مگر اس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے چہرے کے صفحات پر اور اس کی زبان کے فلتات پر، یعنی اچانک سرزد ہونے والی بات پر ظاہر کیا۔ غرض یہ ہے کہ جو شے نفس میں چھپی ہوئی ہے، وہ چہرے کے صفحات پر ظاہر ہوتی ہے، لہٰذا جس وقت مومن کا سریرہ، یعنی باطن اللہ تعالیٰ کے ساتھ صحیح ہوتا ہے تو اللہ عزوجل لوگوں کے لیے اس کے ظاہر کو صالح کر دیتا ہے۔ امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس نے اپنا سریرہ، یعنی باطن درست کر لیا تو اللہ نے اس کا ظاہر درست کر دیا۔[1]

امام ابو القاسم طبرانی رحمہ اللہ نے عن سلمہ بن کہیل عن جندب بن سفیان البجلی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: نہیں پوشیدہ کیا کسی نے کوئی سریرہ مگر پہنائی اس کو اللہ تعالیٰ نے اس کی چادر، اگر خیر ہے تو خیر کی اور اگر شر ہے تو شر کی۔[2] محمد بن عبیداللہ عزرمی راوی سلمہ سے متروک ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم میں سے کوئی کسی ایسے ٹھوس پتھر میں بھی عمل کرے جس کا نہ کوئی دروازہ ہو اور نہ کوئی طاق ہو تو اس کا عمل لوگوں کے لیے نکلے گا، وہ جو کچھ بھی ہو۔[3]

امام احمد رحمہ اللہ نے عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ بے شک هديِ صالح وسمتِ صالح واقتصاد نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔[4] (رواه أبو داود عن عبد الله بن محمد النفيلي عن زهير به) (''ھدی'' بمعنی سیرت، ہیئات اور طریقہ ہے، یعنی یہ خصائل انبیاء کے خصائل میں سے ہیں اور اُن کے اجزائے افعال سے ایک جزء معلوم ہیں، یہ مراد نہیں کہ جس میں یہ خصائل ہو گئے تو اس میں نبوت کا ایک جز ہے اور نہ ہی مراد ہے کہ نبوت متجزی ہوتی ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ یہ خصائل ان خصائل میں سے ہیں جن کو نبوت لائی ہے اور جن کی طرف دعوت کی ہے اور اس عدد کی تخصیص اس قبیل سے ہے جس کی معرفت مستقل طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے دوسرے کو اس کا علم نہیں ہے۔[5] اقتصاد وہ شے ہے جو محمود اور مذموم کے درمیان ہو، جیسے: ظلم اور عدل کے درمیان توسط اور بخل اور سخاوت کے درمیان توسط اور جو شخص افراط وتفریط کے درمیان ہو، جیسے: اسراف اور بخل کے درمیان سخاوت ہے۔ یہ محمود مطلق ہے۔[6] كذا في مجمع البحار)

چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نیتیں خالص تھیں اور اُن کے اعمال اچھے تھے، لہٰذا جو کوئی ان کی طرف نظر کرتا تو وہ

---

1. تفسیر ابن کثیر (۲۵۹/٤)
2. المعجم الكبير (۱۷۱/۲) اس کی سند میں ''محمد بن عبیداللہ عزرمی اور حامد بن آدم'' سخت ضعیف راوی ہیں۔ (السلسلة الضعيفة: ۲۳۷)
3. مسند أحمد (۲۸/۳) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ۱۸۰۷)
4. سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٧٦) مسند أحمد (۲۹٦/۱) صحيح الجامع، رقم الحديث (۱۹۹۳)
5. مجمع بحار الأنوار (۱٤٥/٥)
6. مجمع بحار الأنوار (۲۸۷/٤)

اس کو ان کی راہ و روش میں اچھے لگتے تھے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ جس وقت نصاریٰ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھتے تھے جنھوں نے شام کو فتح کیا تو کہتے: واللہ! البتہ یہ لوگ حواریوں سے اس بات میں بہتر ہیں جو ہم کو پہنچی ہے اور انھوں نے اس بات میں سچ کہا، اس لیے کہ اس اُمت کی اگلی کتابوں میں بھی تعظیم اور فضیلت بیان کی گئی ہے اور اس اُمت میں سب سے اعظم اور افضل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں اور بے شک اللہ تعالیٰ کتبِ منزلہ واخبارِ متداولہ میں ان کے نام کو بلند کر چکا ہے۔ اور اسی لیے یہاں یوں فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ﴾۔

پھر فرمایا: ﴿ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ ﴾ "أَيْ: فَرَاخَهُ" ﴿ فَاٰزَرَهٗ ﴾ "أَيْ: شَدَّهُ" (فراخ جمع ہے فرخ کی۔ فرخ پرندے کے چوزے کو کہتے ہیں۔ شروع میں جو کھیتی زمین سے نکلتی ہے اس کو چوزے سے تشبیہ دی ہے جو انڈے سے نکلتا ہے۔ صراح میں "شطأ" کا ترجمہ کیا ہے: خوشہ و برگِ کشت۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "طرفہ"[1] یعنی شروع شروع میں زمین سے جو کھیتی کا کنارہ نکلتا ہے، وہ "شطأ" ہے، ہندی میں اس کو انکھوا کہتے ہیں) ﴿ فَاسْتَغْلَظَ ﴾ "أَيْ: شَبَّ وَطَالَ" یعنی یہ اُن کی مثال تورات میں اور یہ اُن کی مثال انجیل میں ہے، جیسا کہ کھیتی نے اپنا پٹھہ نکالا، پھر اس کو مضبوط کیا، پھر وہ جوان اور دراز ہوا، یعنی مضبوط اور موٹا ہوا، پھر اپنے تنے پر کھڑا ہو گیا، جو کھیتی والوں کو بھلا لگتا ہے، یعنی اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم ہیں کہ انھوں نے اپنے آپ کو مضبوط کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید اور مدد کی، چنانچہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسے ہیں، جیسے: "شطأ" کھیتی کے ساتھ ہوتا ہے۔

﴿ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ﴾ تاکہ ان سے کفار کو غیظ وغضب میں لائے اور اُن سے کفار کو جلائے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے ایک روایت میں اسی آیت سے روافض کی تکفیر نکالی ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض رکھتے ہیں۔ فرمایا: اس لیے کہ وہ ان سے جلتے ہیں اور جو کوئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جلے اور اُن سے خفا ہو، وہ تو کافر ہے اس آیت کی رو سے۔ علماء رحمہم اللہ میں سے ایک گروہ نے اس بات پر امام مالک رحمہ اللہ کی موافقت کی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت میں اور اُن کے ساتھ برائیوں کے ساتھ پیش آنے کی ممانعت میں بہت سی حدیثیں ہیں اور اللہ پاک کا ان کی تعریف کرنا اور اُن سے راضی ہونا، ان کے لیے کافی ہے۔

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ یہ کلمۂ "مِنْ" بیانِ جنس کے لیے ہے، تبعیض کا نہیں ہے، یعنی اللہ نے اُن لوگوں سے وعدہ کیا جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، ان کے گناہوں کی مغفرت کا اور اجرِ عظیم، یعنی ثوابِ کثیر اور رزقِ کریم کا۔ اور اللہ کا وعدہ حق اور صدق ہے نہ وہ خلاف کیا جاتا ہے اور نہ بدلہ جاتا ہے اور ہر وہ شخص جس نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اثر کی پیروی کی اور اُن کے قدم بہ قدم چلا تو وہ اُن کے حکم میں ہے اور فضیلت اور سبقت اور کمال انھیں کے لیے ہے کہ

[1] تفسیر القرطبي (۱٦/۲۹٤)

جس میں اُن کے ساتھ اس اُمت میں سے کوئی اور رل نہیں سکتا۔ رضي الله عنهم و أرضاهم وجعل جنات الفردس مأواهم وقد فعل.

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: « لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِي فَوَ الَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا أَدْرَكَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيفَهُ »[1] (یہ خطاب یا تو متاخر صحابہ کو ہے یا امت کو۔ والله أعلم) یعنی تم میرے اصحاب کو برا مت کہو، پس قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم میں کوئی اُحد کے برابر سونا خرچ کرتا تو بھی وہ اُن کی ایک مد کو نہ پاتا اور نہ اس کے آدھے کو پاتا۔ آخر تفسير سورة الفتح ولله الحمد والمنة.[2]

فتح البیان کا بیان:

﴿ مُحَمَّدٌ ﴾ مبتدا ہے اور ﴿ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﴾ اس کی خبر ہے، یا وہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور ﴿ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﴾ اس سے بدل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مُحَمَّدٌ ﴾ مبتدا اور ﴿ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﴾ اس کی صفت اور ﴿ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ﴾ مبتدا پر معطوف اور ما بعد اس کا خبر ہے، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے اور یہ جملہ مبین ہے اس شے کا جو مشہود بہ کے جملے سے ہے۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ﴾ سے مراد بعض نے کہا ہے کہ حدیبیہ والے ہیں، لیکن زیادہ مناسب ہے کہ عموم پر محمول کیا جائے۔

﴿ اَشِدَّآءُ ﴾ جمع ہے "شَدِيْدٌ" کی اور ﴿ رُحَمَآءُ ﴾ "رَحِيْمٌ" کی جمع ہے، یعنی اور وہ مومن جو اُن کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں، جیسے: شیر اپنے شکار پر سختی کرتا ہے۔ اُن کو اُن کے ساتھ کچھ نرمی نہیں پکڑتی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر سختی کرنے کا اُن کو حکم دیا ہے، اس لیے وہ اُن پر رحم نہیں کرتے۔ آپس میں رحم دل ہیں اور باہم ایک دوسرے کے ساتھ دوستی، مہربانی اور نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں، جیسے: باپ اپنے بیٹے کے ساتھ ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو اُن کے دین کا مخالف ہے، اس کے ساتھ درشتی اور سختی ظاہر کرتے ہیں اور جو اُن کا موافق ہے اس پر رحم اور نرمی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس مضمون کی دوسری آیت پہلے گزر چکی ہے۔

امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ کفار پر اُن کی سخت گیری کی یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ ان کے کپڑوں سے بچاؤ کرتے تھے کہ کہیں اُن کے کپڑوں سے نہ لگ جائیں، یعنی ان کو اور اُن کے بدنوں کو چھو نہ جائیں۔ اور آپس میں ان کے رحم اور نرمی کی نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ کوئی مومن کسی مومن کو نہیں دیکھتا تھا، مگر اس سے مصافحہ کرتا تھا اور اس سے گلے ملتا تھا۔[3] اور یہ بات ہر زمانے میں مسلمانوں کے لیے ہے کہ آپس میں اس تواضع، فروتنی، نرمی اور

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٠) [2] تفسير ابن كثير (٢٥٨/٤۔٢٦٠) [3] الكشاف (٣٤٨/٤)

مہربانی کا خیال رکھا کریں، لہٰذا جو کوئی ان کے دین سے نہیں ہے اس پر سختی کریں اور جو اسلام میں ان کے مومن بھائی ہیں ان سے نرمی اور مہربانی برتیں اس طرح سے کہ ان سے نیکی کریں اور حسنِ سلوک سے پیش آئیں، ان سے ایذا کو دور کریں، ان کی بات کو برداشت کریں، تحمل و بردباری کا برتاؤ رکھیں۔

جمہور نے ﴿ اَشِدَّآءُ ﴾ اور ﴿ رُحَمَآءُ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ موصول کی خبر ہے۔ یا ﴿ مُحَمَّدٌ ﴾ کی خبر ہے اور اس کی خبر ہے جو اس پر معطوف ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ اور حسن رحمہ اللہ نے ہر دو کو بنا بر حال یا مدح بہ نصب پڑھا ہے۔[1] اس قراءت کی بنا پر ﴿ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا ﴾ خبر ہوگی اور جمہور کی قراءت کی بنیاد پر ﴿ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا ﴾ دوسری خبر ہوگی، یا استیناف ہوگا۔ ﴿ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ﴾ جمہور کی قراءت پر تیسری خبر ہے، یا منصوب ہے بنا بر حال ﴿ تَرٰىهُمْ ﴾ کی ضمیر سے۔ اور اسی طرح ﴿ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ﴾ کا حال ہے۔

غرض کہ اللہ پاک نے خبر دی ہے کہ وہ کثرت سے نماز پڑھتے ہیں اور اس پر ہمیشگی کرتے ہیں تو اُن کو دیکھے اور مشاہدہ کرے تو ان کو اس حال میں پائے کہ رکوع اور سجدہ کرنے والے ہیں، اپنے لیے اللہ کا ثواب طلب کرتے ہیں اور یہ بات کہ وہ اُن سے راضی ہو جائے۔ اس میں یہ لطیفہ ہے کہ مخلص جو اللہ کے لیے عمل کرتا ہے تو وہ اپنا اجر اللہ سے چاہتا ہے اور دکھاوا کرنے والا جو اپنے عمل کے ساتھ دکھاوا کرتا ہے، وہ اپنے لیے اللہ سے اجر طلب نہیں کرتا۔

بعض نے اس آیت میں ذکر کیا ہے کہ ﴿ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ ﴾ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اور ﴿ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ ﴾ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہیں اور ﴿ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور ﴿ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا ﴾ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ﴿ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ﴾ باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔

﴿ سِيْمَا ﴾ بہ معنی علامت ہے، اس میں دو لغت ہیں: مد و قصر، یعنی ان کی علامت ان کی پیشانیوں میں سجدے کے اثر سے ظاہر ہوتی ہے جو وہ نماز میں کرتے ہیں، اس لیے کہ رات دن بہ کثرت عبادت کرتے ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آدمی جب جاگتا ہے تو صبح کو زرد رنگ ہو جاتا ہے، چنانچہ ﴿ سِيْمَا ﴾ یہی ٹھہرائی گئی ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مَوَاضِعُ السُّجُوْدِ أَشَدُّ وُجُوْهِهِمْ بَيَاضًا"، یعنی ان کے چہروں میں سجدے کی جگہیں انتہائی سفید ہوتی ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خشوع و تواضع ہے۔ پہلا قول یعنی ﴿ سِيْمَا ﴾ وہ ہے جو سجدے کی کثرت سے پیشانیوں میں ظاہر ہوتا ہے، اس کے قائل امام سعید بن جبیر اور مالک رحمہما اللہ ہیں۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وقار ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جس وقت اُن کو دیکھے تو دیکھے اُن کو بیمار، حالانکہ وہ بیمار نہیں ہیں۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٦/٢٩٣)

کسی نے کہا ہے کہ وہ بہاء ہے، یعنی چہرے میں روشنی اور رونق ہے اور اس پر انوار کا ظہور ہے۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "إِنَّهُ لَيْسَ الَّذِيْنَ تَرَوْنَهُ وَلٰكِنَّهُ سِيْمَا الْإِسْلَامِ وَسَمْتُهُ وَخُشُوْعُهُ" یعنی یہ وہ نہیں ہے جس کا تم خیال کرتے ہو، لیکن وہ اسلام کی علامت ہے اور اس کے حسنِ ہیئت وحسنِ منظر وتواضع وفروتنی ہے۔ ان سے دوسرا قول یہ مروی ہے کہ سمتِ حسن ہے۔[2] ان کے تیسرے قول کے الفاظ یہ ہیں کہ وہ ایک سفیدی ہے جو قیامت کے دن ان کے چہروں کو ڈھانک لے گی۔[3] ان کا چوتھا قول مرفوعاً یہ ہے کہ بے شک میں البتہ مبغوض رکھتا ہوں اس شخص کو اور اس کو مکروہ جانتا ہوں، جب میں اس کی آنکھوں کے درمیان سجدے کا نشان دیکھتا ہوں۔[4] (ذکره الخطيب ولينظر في سنده) سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ﴿ سِيْمَاهُمْ ﴾ کی تفسیر میں مرفوعاً کہتے ہیں نور ہے قیامت کے دن۔[5] (أخرجه الطبراني في الأوسط والصغير و ابن مردويه قال السيوطي بسند حسن)

امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ہر وہ شخص داخل ہے جس نے پانچوں نمازوں پر محافظت کی۔[6] امام بقاعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نہ خیال کیا جائے کہ من جملہ ﴿ سِيْمَا ﴾ وہ سجدے کا نشان ہے جس کو بعض ریاکار اپنی پیشانی پر بناتے ہیں، اس لیے کہ یہ خارجیوں کی علامت سے ہے۔[7]

﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ ان صفاتِ جلیلہ کی طرف ہے جس کا ذکر ہوا اور مبتدا ہے۔ ﴿ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ﴾ اس کی خبر ہے، یعنی یہ بزرگ اور برتر اوصاف جو مذکور ہوئے ان کا وصف عجیب الشان ہے جس کے ساتھ وہ وصف کیے گئے ہیں تورات میں اور ان کا وصف باہر البرہان ہے جس کے ساتھ وہ انجیل میں موصوف ہوئے ہیں۔ "مثل" کا لفظ دوبارہ ذکر ہوا، اس لیے کہ اس کی مزید تقریر اور تاکید کرنا مقصود ہے۔ اور اس کی غرابت اور ندرت سے آگاہ کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ غرابت میں وہ امثال کے قائم مقام ہے، نہ اس سے مراد صفت بیان کرنا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ان کی تعریف تورات اور انجیل میں لکھی ہوئی ہے اس سے پہلے جب کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔[8]

قولہ تعالیٰ: ﴿ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ ﴾ ایک کلامِ مستانف ہے، یعنی ماقبل سے الگ تھلگ ہے: "أَيْ: هُمْ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْئَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ" کسی نے کہا ہے کہ یہ کلمہ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کی تفسیر ہے، اس بنا پر کہ وہ اشارہ مبہم ہے۔ پھر اس کی تفسیر کی اور اس سے وہ اوصاف مراد نہیں ہیں جو پہلے گزر چکے۔ کسی نے کہا ہے

---

① تفسير القرطبي (١٦/٢٩٣، ٢٩٤) فتح القدير (٥/٧٤) ② تفسير الطبري (٢٢/٢٦٤) ③ الدر المنثور (٧/٥٤٢)
④ ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ ⑤ المعجم الصغير (١/٣٧٠) الدر المنثور (٧/٥٤٢)
⑥ تفسير القرطبي (١٦/٢٩٤) ⑦ فتح البيان (١٣/١٢٠) ⑧ الدر المنثور (٧/٥٤٣)

کہ یہ ﴿ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيلِ ﴾ کی خبر ہے: "أَيْ: وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ... الخ". فراء نے کہا ہے کہ اس میں دو وجہیں ہیں اگر تو چاہے تو یوں کہہ کہ ﴿ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيلِ ﴾ یعنی "كَمَثَلِهِمْ فِي الْقُرْآنِ" تو اب ﴿ الْاِنْجِيلِ ﴾ پر وقف ہوگا۔ اور اگر چاہے تو یہ کہہ ﴿ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ ﴾ پھر ابتداء کر کے یوں کہے: ﴿ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيلِ كَزَرْعٍ ... الآية ﴾۔

جمہور نے ﴿ شَطْـَٔهٗ ﴾ بہ سکونِ طاء پڑھا ہے اور ابن کثیر اور ابن ذکوان نے بہ فتحِ طاء پڑھا ہے اور امام انس و نصر بن عاصم اور ابن وثاب رحمہ اللہ نے ﴿ شَطْـَٔهٗ ﴾ مثل "عصا" کے پڑھا ہے اور جحدری اور ابن ابی اسحاق رحمہ اللہ نے "شطه" بغیر ہمزۂ اول کے پڑھا ہے۔ دو سبعیہ ہیں اور یہ سب لغات ہیں۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ شَطْـَٔهٗ ﴾ بہ معنی "طَرْفَهُ" ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَشْطَأَهُ الزَّرْعُ فَهُوَ مُشْطِئٌ إِذَا خَرَجَ"۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَخْرَجَ شَطْأَهُ أَيْ: نَبَاتَهُ"۔ امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا: "اَلشَّطْءُ سِوَى السُّنْبُلِ"۔ امام فراء رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ: "هُوَ السُّنْبُلُ" امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "شَطْءُ الزَّرْعِ وَالنَّبَاتِ فَرَاخُهُ جَمْعُ أَشْطَاءٍ" ہے۔ "وَقَدْ أَشْطَأَ الزَّرْعُ: خَرَجَ شَطْؤُهُ" سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ "نَبَاتُهُ فُرُوْخُهُ"۔[1] "فُرُوْخُ وَفِرَاخُ" "فَرْخٌ" کی جمع ہے، "فرخ" لفظ اور معنی میں فرع کی طرح ہے جس وقت کھیتی شق ہوتی ہے اور اس سے اس کی فرع نکلتی ہے تو اس وقت محاورے میں یوں بولتے ہیں کہ "أَفْرَخَ الزَّرْعُ وَفَرَخَ"، پس پہلے پہل جو کھیتی اُگتی ہے وہ مثل ماں کے ہے اور جو اُس سے متفرع (پھیلتی) ہوتی ہے، وہ اس کی اولاد اور فراخ کے مرتبے میں ہے۔

جمہور نے "آزره" بہ مد پڑھا ہے، بروزن "أَكْرَمَهُ" اس کا مضارع "يُؤْزِرُه" بروزن "يُكْرِمُهُ" ہے اور ابن ذکوان وغیرہ، (یعنی ابو حیوہ اور حمید بن قیس رحمہ اللہ) نے "أَزَرَهُ" بہ قصر "ضَرَبَ يَضْرِبُ" سے پڑھا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَزَرْتُ فُلَانًا أَزُرُهُ إِذْرًا إِذَا قَوَّيْتَهُ"[2] اور دونوں سبعیہ ہیں۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ضمیر مستتر راجع ہے طرف زرع کے اور بارز طرف شطا کے۔ "أَيْ: قَوَّى الزَّرْعُ شَطْأَهُ وَشَدَّهُ"، اور علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس کا اُلٹ کیا تو مستتر کو تو "شطأ" کی طرف پھیرا اور "بازر" کو طرف "زرع" کے: "أَيْ: قَوَّى الشَّطْأُ الزَّرْعَ"۔[3] یہ قول زیادہ تر مناسب ہے، اس لیے کہ عادت یوں ہے کہ اصل اپنی فروع سے قوی اور مضبوط ہوتی ہے تو فروع اس کی اعانت کرتے ہیں اور اس کو قوت دیتے ہیں۔ "فَاسْتَغْلَظَ" "اِسْتَحْجَرَ الطِّيْنُ" کے باب سے ہے، (یعنی شے کا صاحبِ ماخذ ہو جانا بہ تدریج جیسے مٹی پتھر ہوگئی)۔ یہ قول مختار ہے، اس لیے کہ ساق کی بنا تدرج پر ہے، یا مراد غلظت میں مبالغہ ہے، جیسے کہ "اِسْتَعْصَمَ (خوب محفوظ رہا)" جیسے الفاظ میں ہے۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۳۳۰۱/۱۰) [2] تفسير القرطبي (۲۹۴/۱٦، ۲۹۵) فتح القدير (۷۵/۵) [3] تفسير النسفي (۱٦۰/٤)

﴿فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ﴾ "سوق" جمع "ساق" ہے اور قنبل نے "سؤقه" بہ ہمزۂ ساکنہ پڑھا ہے، معنی یہ ہیں: جیسے کھیتی کہ اس نے اپنے فروع کو نکالا، پھر ان فروع نے اس کو قوی اور مضبوط کیا، پھر وہ موٹی ہوگئی اس کے بعد کہ باریک تھی، پھر اپنے تنوں پر سیدھی کھڑی ہوئی اپنی قوت و زور اور خوبصورتی کے سبب سے، اپنے کھیتی والوں کو خوش کرتی ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہاں مثل تمام ہوگئی۔

فتح البیان میں فرمایا ہے کہ یہ ایک مثال ہے جس کو اللہ پاک نے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کے لیے بیان فرمایا اور وہ ابتدا میں تو قلیل ہوں گے پھر بڑھتے جائیں گے اور بہت ہوں گے اور کھیتی کی طرح قوی ہوں گے، کیوں کہ شروع میں وہ کمزور ہوتی ہے، پھر آہستہ آہستہ مضبوط ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کا تنا موٹا ہو جاتا ہے۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انجیل میں اصحابِ محمد ﷺ کی طرح۔ اس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ عن قریب وہ نکلے گا یعنی نبی اکرم ﷺ ایک قوم سے کہ وہ کھیتی کے اُگنے کی طرح اُگیں گے، وہ حکم کریں گے نیک بات کا اور منع کریں گے بری بات سے۔[2] امام عکرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "أَخْرَجَ شَطْأَهُ بِأَبِي بَكْرٍ فَآزَرَهُ بِعُمَرَ فَاسْتَغْلَظَ بِعُثْمَانَ فَاسْتَوَى عَلَى سُوْقِهِ بِعَلِيٍّ رضي الله عنهم"[3] یہ اور اس کی مثل جو پہلے گزر چکا ہے کچھ قرآن شریف کی تفسیر نہیں ہے بلکہ من جملہ لطائفِ کلام ہے۔

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ جب انھوں نے یہ آیت پڑھی تو کہا کہ کھیتی تمام ہوگئی اور مقرر قریب ہوا اس کا کٹنا۔ صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ مثال جس کی طرف قرآن شریف نے اشارہ فرمایا ہے متی اور لوقا کی انجیل میں موجود ہے، پھر اس کا ترجمہ عربی میں کیا ہے، جس کا اردو ترجمہ ہے کہ نظر کرو تم ایک کھیتی والے کی طرف کہ وہ کھیتی کرے اور اس اثنا میں کہ وہ کھیتی کر رہا ہے کہ کچھ بیج راہ میں گر پڑے، پس پرندے آئے اور اُن کو چگ گئے اور کچھ بیج پتھروں پر گرے جہاں کچھ زیادہ مٹی نہ تھی اور اسی گھڑی وہ بیج اُگ گئے، اس لیے کہ زمین میں اتنی گہرائی نہ تھی اور جب سورج نکلا تو جل گئے اور سوک گئے، اس لیے کہ اُن کی جڑ نہ تھی اور بعضے بیج کانٹوں میں گرے، پھر کانٹے بڑھے اور اُن کا گلا گھونٹ دیا اور بعض بیج پاک زمین میں گرے اور پھل لائے، چنانچہ اس کے سو گناہ پھل لائے بعض ساٹھ گنا اور بعض تیس گنا، لہٰذا جس شخص کے سننے والے کان ہوں تو چاہیے کہ سنے۔[4] انتہیٰ.

یہ وہی بعینہٖ اس آیتِ کریمہ کے معنی ہیں اور یہ من جملہ اُن کے انجیل میں بعض امثال کے ہے۔ اور درحقیقت نصاریٰ اس سے غافل ہوئے اور اس کی ایک ضعیف تاویل کی اور کہا کہ یہ مثال اس شخص کے لیے ہے جو خیر کرتا ہے اور مواعظ سنتا ہے اور اس کو تہذیب سے ٹھہرایا اور اس قول میں فکر نہ کیا۔ لہٰذا جس شخص کا کان ہے سننے والا تو چاہیے کہ سنے، چنانچہ بے شک اس میں وہ اشارہ ہے جو اس کے علاوہ میں نہیں پایا جاتا، وہ یہ ہے کہ میں تمھارے لیے جن لوگوں کا اپنی اس مثال میں وصف

[1] فتح البيان (١٣/١٢١) [2] تفسير الطبري (٢٢/٢٦٨) [3] روح المعاني (٢٦/١٢٩) [4] فتح البيان (١٣/١٢٢)

بیان کرتا ہوں وہ موجود نہیں ہیں، اس لیے تم ان کو دیکھ نہیں سکتے، لیکن اگر تمھارے پاس یاد رکھنے والا کان ہے تو میری یہ بات سنو اور اس کو بیان کرو اور اس کو کتابوں کے صفحوں میں امانت رکھو، یہاں تک کہ کلام اپنی مدت کو پہنچے۔

اور اس کا یہ قول کہ بعض بیج راہ میں گرے...... الخ، ان نوامیس کی طرف اشارہ ہے جو یونانی فلسفیوں کے ہاتھوں میں واقع ہوئے، جن کے دلوں کو اس کی کچھ قابلیت نہ تھی کہ نوامیس کے مفہوم کے لیے ظرف ہوں، اس لیے کہ وہ نوامیس مبدیٔ جل اسمہ سے صادر نہیں ہوئی، مگر سذاجۃ کے طریق پر، پس وہ ان کے دلوں میں اثر نہیں کرتی ہیں، کیوں کہ وہ ان میں جمتی نہیں۔ پھر شیطان آتا ہے اور اُن کو جھپٹ لے جاتا ہے، اُن کے دلوں سے بہ سبب اپنے سفسطے شبہوں کے۔

اور اس کا یہ قول کہ بعض بیج پتھر پر گرے...... الخ، ان نوامیس کی طرف اشارہ ہے جو یہود کے ہاتھوں میں واقع ہوئے، کیوں کہ ان کے دل ان کو قبول کرنے میں پتھر سے بھی بڑھ کر سخت تھے تو وہ ان کو لینے کے قابل نہ تھے بلکہ وہ ان کو زبان سے کہتے تھے ایک ذرا سی مدت تک اور وہ ان کے ہاتھوں سے نصاریٰ کے ہاتھوں کی طرف منتقل ہونا ہے اور یہ وہی سورج کا طلوع ہونا ہے۔ پھر جب انھوں نے اس شخص کی تصدیق نہ کی کہ جس کو عیسیٰ ان کے پاس لائے تو اس میں سے جو شے ان کی طرف ڈالی گئی تھی، وہ اُن کے دلوں سے زائل ہوگئی اور مضمحل ہوگئی جس طرح کہ سورج کی گرمی سے وہ روئیدگی زائل ہو جاتی ہے جو پتھر پر بوئی جاتی ہے۔

اور اس کا یہ قول کہ بعض بیج کانٹوں میں واقع ہوئے...... الخ، یہ ان نوامیس کی طرف اشارہ ہے جو نصاریٰ کے ہاتھوں میں واقع ہوئے۔ کانٹے عبارت ہیں مشتبہاتِ امور سے جو عیسیٰ سے صادر ہوئے تھے، جیسے: مردے کا زندہ کرنا، مریض کو شفا دینا، مادر زاد اندھے کی بینائی کو لوٹا دینا، بہرے کا سننا، گونگے کا بولنا جو من جملہ خوارقِ عادت ہیں۔ کانٹوں کے بڑھنے سے مراد اُن امور کا زیادہ ہونا ہے اور یہ بات کہ کانٹوں نے ان کا گلا گھونٹ دیا تو اس سے یہ مراد ہے کہ ان کے موضوعات کے ساتھ اعتقاد زائل ہو گیا۔

اور اس کا یہ قول کہ بعض بیج پاک زمین میں گرے...... الخ، پس یہ ان نوامیس پر برہانِ قاطع و دلیلِ لامع وساطع ہے جو عرب کے ہاتھوں میں واقع ہوئے محمد بن عبداللہ ﷺ کی معرفت پر، اس لیے کہ ان کے دل سادہ تھے اور اس لائق تھے کہ ان کے لیے ظرف ہوں۔ اور اس کا یہ قول کہ پھل لائے۔ مطلق پھل لانے سے مراد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، بعض اس کے تو سو گنا اس سے مراد عمر رضی اللہ عنہ ہیں اور بعض ساٹھ گنا وہ عثمان رضی اللہ عنہ اور بعض تیس گنا اس سے مراد علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسبت پہلے اس لیے لائے کہ ان کے زمانے میں خلافت مستقل ہوئی اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سو گنا کی نسبت اس لیے ہے کہ ان کے عہد میں اسلام بڑھا اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی نسبت ساٹھ کی اس لیے کہ جو ترقی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوئی تھی، اس کے ضعف کا انخفاض ہوا (کمی ہوئی۔ پستی میں گری) اور تیس گنا کی نسبت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف اس لیے ہے کہ یہ خلفاء میں سے آخری اور خاتم ہیں اور نبی کریم ﷺ کے اس قول کے

مصداق ہیں کہ میرے بعد خلافت تیس برس ہے اور اس میں اس بات کے ساتھ مطابقت ہے جو عکرمہ سے مروی ہے اس قول میں: "أَخْرَجَ شَطْأَهُ بِأَبِي بَكْرٍ فَآزَرَهُ بِعُمَرَ فَاسْتَغْلَظَ بِعُثْمَانَ فَاسْتَوَى عَلَى سُوقِهِ بِعَلِيٍّ"۔[1] یہ قول پہلے گزر چکا ہے اور اس مثال کا لوقا میں مکرر ہونا تاکید کی ایک لطیف قسم ہے۔

اب اگر کوئی کہے کہ جس شے پر نصاریٰ نے اس مثال کو محمول کیا ہے، اس پر کیوں نہ محمول کیا جائے تو زرع سے مرادِ عملِ خیر ہو اور پھل لانے سے مراد صرف جزا تو کہیں گے کہ اس معنی پر محمول کرنا کئی وجہ سے جائز نہیں ہے۔ اول یہ ہے کہ ہم نے اس کو قرآن شریف میں پایا اور مطابقت ضروری ہے۔ دوسری یہ ہے کہ تعریف مفیدِ عہد ہوتی ہے اور عہد مفیدِ تخصیص اور تخصیص مباین ہوتی ہے عموم کی تو اس بات کا فائدہ دے گی جو میں نے ذکر کی ہے، پس مفیدِ عموم کی نہ ہوگی۔ یہ برہان اس شخص کے لیے کافی ہے جس کے لیے یاد رکھنے والا کان ہو، وہ نصاریٰ میں سے ہو یا مسلمانوں میں سے۔ یہ بھی جائز ہے کہ "زراع" سے مراد شارع ﷺ ہوں اور "ارض" سے مراد اُمت ہو اور بیج سے مراد ایمان ہو، مومنوں کے مراتب کے موافق اور نوعِ اخیر سے مراد اپنے مراتب کے مطابق خیارِ امت ہوں۔

غرضیکہ اللہ پاک نے اپنے نبی اکرم ﷺ کے اصحاب کی تعداد بڑھائی اور اُن کو قوی کیا اور کھیتی سے ان کو تشبیہ دی، پھر اس کی وجہ یہ بیان فرمائی: ﴿لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ حرفِ لام محذوف سے متعلق ہے: "أَيْ: فَعَلَ ذَٰلِكَ" یعنی اس نے ان کی جو کثرت کی اور اُن کو قوت دی تو اس لیے کہ وہ کفار کے لیے غلیظ ہوں، یعنی کافر لوگ اُن کی کثرت اور قوت کو دیکھ کر جلیں اور غصے میں آئیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ قول سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا ہے جو انھوں نے مسلمانوں کے بعد مکے والوں سے کہا تھا کہ آج کے بعد اللہ چھپ کر نہیں پوجا جائے گا۔[2] امام مالک بن انس رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی صبح کو اٹھا اور اس کے دل میں رسول اللہ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم پر غصہ ہے تو یقیناً اس کو یہ آیت لگی، یعنی اس پر کفر کا اطلاق ہوا۔[3] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت میں خصوصاً وعموماً بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، یہ اُن کے بیان کرنے کی جگہ نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾ یعنی اللہ پاک نے ان لوگوں کو وعدہ دیا ہے جو نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہیں، اس بات کا کہ ان کے گناہ بخش دے گا اور اُن کو اجرِ کثیر عطا فرمائے گا، اس طرح سے کہ اُن کو جنت میں داخل کرے گا جو سب سے بڑی نعمت اور سب سے عظیم احسان ہے۔ یہاں کلمۂ ﴿مِنْ﴾ جنس کے بیان کے لیے ہے تبعیض کا نہیں ہے۔ یہ آیتِ کریمہ روافض کے اس قول کو رد کرتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معاذ اللہ کافر ہو گئے، اس لیے کہ ان کو جو مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ دیا گیا ہے، یہ اس لیے ہے کہ وہ اسی حالت پر رہیں جس پر کہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں تھے۔

---

[1] روح المعاني (١٢٩/٢٦) [2] تفسير البغوي (٣٢٥/٧) [3] تفسير البغوي (٣٢٨)

جلال محلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں یعنی مغفرت اور اجر اُن کے لیے بھی ہیں جو اُن کے بعد ہیں، کئی آیتوں میں [1] یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین اور قیامت تک آنے والے ان کے بعد کے لوگ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ﴾ [الحديد: ۲۱] ''(آؤ) دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کی وسعت کے برابر ہے یہ ان کے لیے بنائی گئی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔''

خاتمہ:

اس آیت یعنی ﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ... إلىٰ آخر السورة ﴾ نے سارے حروفِ معجم کو جمع کر لیا ہے اور اس میں تلویحی بشارت کے ساتھ ساتھ ایک تصریحی بشارت بھی ہے جو اس بات میں ہے کہ ان کا کام مجتمع ہو گا اور اُن کی نصر عالی ہو گی۔ رضي الله تعالىٰ عنهم وحشرنا معهم. آمین. یہ بات لطائفِ نظمِ قرآنی میں سے ہے اور یہ قرآن شریف کی قسم تلویحی یعنی مطول کا اخیر ہے اور وہ جیسا کہ تم دیکھتے ہو، دو سورتوں سے ختم کی گئی جو درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہیں اور دونوں کا حاصل تلوار سے فتح ہے اور اس کے خلاف جو آپ سے ظاہر میں لڑا، نصر ہے جس طرح کہ قسم ثانی مفصل دو سورتوں سے ختم کی گئی جو آپ کے لیے نصرت ہیں، اس شخص کے خلاف جس نے باطن میں آپ کو ضرر پہنچانے کا ارادہ کیا۔ [2] (كذا في فتح البيان)

شبِ شنبہ (ہفتہ) چہارم ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ کو اس سورت کی تفسیر لکھنا شروع کیا تھا، دو جز سے دو ورق کم لکھے تھے کہ بیمار ہو گیا۔ ضعف کی وجہ سے کچھ نہ لکھ سکا، پھر شبِ جمعہ غرہ رمضان سنہ صدر سے لکھنا شروع کیا۔ الحمد لله والمنة کہ سیوم ماہ شوال سنہ صدر شبِ دو شنبہ (اتوار) کو نصف اخیر کے وقت تمام ہوئی۔ اللہ پاک قبول فرمائے اور آیندہ لکھنے کی توفیق دے اور عافیت سے اس کام کو جلد پورا کر دے۔ اللهم أحسن عاقبتنا في الأمور كلها وأجرنا من خزي الدنيا وعذاب الآخرة آمين. والحمد لله أولاً وآخراً وظاهراً وباطناً.

---

[1] تفسير الجلالين (۲۸۳/۱) [2] فتح البيان (۱۳/۱۱۸-۱۲۵)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سُوْرَةُ الْحُجُرٰتِ

اس سورت مبارکہ کی اٹھارہ (۱۸) آیتیں ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بالاجماع مدنی ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ مدینے میں نازل ہوئی۔[2] (أخرجه ابن الضريس والنحاس و ابن مردويه والبيهقي)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَيۡنَ يَدَىِ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ۝۱ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَكُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِىِّ وَلَا تَجۡهَرُوۡا لَهٗ بِالۡقَوۡلِ كَجَهۡرِ بَعۡضِكُمۡ لِبَعۡضٍ اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ۝۲ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَغُضُّوۡنَ اَصۡوَاتَهُمۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ امۡتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوۡبَهُمۡ لِلتَّقۡوٰى ؕ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّاَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ۝۳

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اے ایمان والو! تم اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو، اور اللہ سے ڈرو، بلاشبہ اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے ① اے ایمان والو! تم اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو، اور آپ سے اونچی آواز میں بات نہ کرو، جیسے تم ایک دوسرے سے اونچی آواز میں (بات) کرتے ہو، کہیں تمھارے عمل برباد نہ ہو جائیں اور تمھیں خبر تک نہ ہو ② بلاشبہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس اپنی آوازیں نیچی رکھتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے۔ ان کے لیے بخشش اور بہت بڑا اجر ہے ③

---

[1] تفسير القرطبي (۳۰۰/۱٦ـط: دار الكتب المصرية، القاهرة) [2] الدر المنثور (٥٤٦/٧)

اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ سے پیش قدمی کی ممانعت:

آگے بڑھنا، یعنی مجلس میں اگر کوئی کچھ پوچھے تو دیکھو کہ نبی اکرم ﷺ کیا فرماتے ہیں، تم اپنی عقل سے پہلے ہی جواب نہ دے بیٹھو۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کا ادب سکھایا ہے اور آدابِ محفل کی تعلیم دی ہے۔ ایک ادب یہ ہے کہ مجلس میں شور نہ کرو کہ نبی ﷺ کی آواز سنائی نہ دے۔ دوسرے یہ کہ آپ ﷺ کو ادب سے خطاب کرو اونچی آواز سے نہ بولو۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ وہ آداب ہیں جن سے اللہ پاک نے اپنے مومن بندوں کو مؤدب کیا ہے، ان امور میں رسول اللہ ﷺ سے برتاؤ کریں، یعنی آپ کی عزت و احترام و تبجیل (بزرگی کرنا) اور اعظام (عظمت کرنا)، مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے معاملے میں ان امور کو برتیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ یعنی رسول اللہ ﷺ سے پہلے اشیاء میں جلدی مت کرو، بلکہ سارے کاموں میں ان کے تابع ہو جاؤ، یہاں تک کہ اس ادبِ شرعی کے عموم میں سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث داخل ہو جائے، جب کہ نبی کریم ﷺ نے اُن سے اس وقت فرمایا جب ان کو یمن کی طرف بھیجا کہ تو کس شے کے ساتھ فیصلہ کرے گا؟ عرض کی کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ۔ آپ ﷺ نے فرمایا اور اگر تو نہ پائے تو؟ تو عرض کی کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کے ساتھ۔ فرمایا: پھر اگر تو نہ پائے؟ تو عرض کی کہ میں اپنی رائے کا اجتہاد کروں گا تو آپ ﷺ نے ان کے سینے میں مارا (اپنا دستِ مبارک اُن کے سینے میں مارا برکت کے لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کو حق اور صواب کی راہ بتائے اور ہر فیصلہ اللہ اور رسول کی مرضی کے مطابق ہو) اور فرمایا کہ حمد ہے اللہ کے لیے کہ جس نے رسول اللہ کے رسول کو اس شے کی توفیق دی جس کو اللہ کا رسول پسند کرتا ہے۔[1] (وقد رواه أحمد و أبو داود و الترمذي و ابن ماجه)

چنانچہ اس سے غرض یہ ہے کہ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے، نظر اور اجتہاد کو کتاب وسنت کے بعد رکھا، یعنی ان سے مؤخر کیا اور اگر اس کو کتاب وسنت سے بحث کرنے سے پہلے مقدم کرتے تو یہ بات "تَقْدِيم بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" کے باب سے ہوتی۔ علی بن ابی طلحہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ یعنی خلافِ کتاب وسنت مت کہو۔ امام عوفی رحمہ اللہ کی اُن سے روایت یہ ہے کہ اس بات سے منع کیے گئے کہ اس کے کلام سے آگے کلام کریں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "لَا تَفْتَاتُوا عَلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بِشَيْءٍ حَتَّى يَقْضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَى لِسَانِهِ"[2] [لا تسبقوا (ز) الظاهر أنه تفسير تقدموا بفتح تاء ودال.[3]

---

[1] مسند أحمد (٢٣٠/٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٩٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٢٧) اس کی سند میں "اصحابِ معاذ اور حارث بن عمرو" مجہول راوی ہیں۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٨٨١)

[2] تفسير الطبري (٢٧٢/٢٢، ٢٧٣) [3] مجمع بحار الأنوار (١٨٠/٤)

كذا في مجمع البحار] یعنی رسول اللہ ﷺ پر کسی شے کے ساتھ سبقت مت کرو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کی زبان پر جاری کرے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "لَا تَقْضُوا أَمْرًا دُوْنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ مِنْ شَرَائِعِ دِيْنِكُمْ" یعنی اپنے دین کے احکام میں سے کسی امر کا سوائے اللہ کے اور اس کے رسول کے حکم مت دو۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کسی قول اور کسی فعل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: امام سے قبل دعا مت کرو۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ہم سے یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ کچھ لوگ کہا کرتے تھے: "لَوْ أُنْزِلَ فِيْ كَذَا وَكَذَا" (اس لفظ میں۔ واللہ أعلم۔ کچھ تصحیف ہو گئی ہے، شاید حاصل معنی یہ ہوں کچھ لوگ کہا کرتے تھے کہ اگر اس اس مضمون کی آیت نازل ہو تو ایسا ایسا ہو جائے، یعنی نزولِ آیات سے پہلے جوڑ توڑ لگاتے تھے، اس کی نہی آیتِ باب میں نازل ہوئی۔ واللّٰه أعلم بحقيقة الحال از مصحح سلمه اللّٰه تعالیٰ) لَوُضِعَ كَذَا فَكَرِهَ اللّٰهُ تَعَالَى ذَلِكَ وَتَ[illegible]َمَ فِيْهِ.[2] قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ یعنی اور اللہ سے ڈرو اس شے میں جس کا تم کو حکم دیا، بے شک اللہ خوب سننے والا ہے تمھاری باتوں کا اور خوب جاننے والا ہے تمھاری نیتوں کا۔

رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کا حکم:

قولہ تعالیٰ: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ ﴾۔ یہ دوسرا ادب ہے جو اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو سکھایا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس اپنی آوازوں کو اُن کی آواز سے اونچا نہ کریں۔ مروی ہے کہ یہ آیت شیخین کے حق میں نازل ہوئی، یعنی سیدنا ابوبکر صدیق اور عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ قریب تھا کہ دو بہتر شخص ہلاک ہو جائیں، یعنی ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما، انھوں نے نبی اکرم ﷺ کے پاس اپنی آوازیں اونچی کیں، جب آپ ﷺ کے پاس بنی تمیم کا ایک رکب آیا (رکب اسم جمع ہے یا راکب کی جمع ہے، لغت میں راکب ابل کو کہتے ہیں، پھر اس کے استعمال میں وسعت کی گئی تو ہر سواری کے سوار کو کہنے لگے، مراد قافلہ ہے) تو اُن میں سے ایک نے تو اقرع بن حابس اخی بنی مجاشع کے ساتھ اشارہ کیا اور دوسرے نے ایک اور شخص کے ساتھ اشارہ کیا۔ امام نافع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھے اس کا نام یاد نہیں۔

چنانچہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تو نے صرف میری مخالفت کا ارادہ کیا۔ انھوں نے کہا: میں نے تیری مخالفت کا ارادہ نہیں کیا، پھر ان دونوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ اس پر اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ ﴾۔ سیدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما نے کہا: پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ

---

[1] تفسير ابن كثير (٤/٢٦٠) [2] تفسير الطبري (٢٢/٢٧٦)

اس آیت کے بعد اتنی آہستہ بات کرتے تھے کہ آپ ﷺ اس کو سن نہ سکتے اور پھر اس بات کو ان سے پوچھتے تھے۔ ’’وَلَمْ يُذْكُرْ ذٰلِكَ عَنْ أَبِيهِ يَعْنِي أَبَا بَكْرٍ‘‘ (یعنی جو بات عمر رضی اللہ عنہ سے ذکر کی، اس کا ذکر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے نہیں کیا کہ وہ کس طرح بات کرتے تھے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کے نانا تھے، ان کو باپ کے پیرائے میں ادا کیا، اس لیے کہ نانا بھی باپ کے مرتبے میں ہے۔ واللہ أعلم)[1] (عنه انفرد به دون مسلم)

نیز امام بخاری رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے ابن ابی ملیکہ کو خبر دی کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس بنی تمیم کا ایک وفد آیا تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ آپ قعقاع بن معبد کو امیر بنائیں اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: بلکہ آپ اقرع بن حابس کو امیر بنائیں، پس سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ بولے کہ اے عمر! تو نے صرف میری مخالفت کا ارادہ کیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے تیری مخالفت کا ارادہ نہیں کیا، پھر وہ دونوں جھگڑے، یہاں تک کہ دونوں کی آوازیں بلند ہوئیں، چنانچہ اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ ﴾ یہاں تک کہ آیت پوری ہوئی: ﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (بخاری میں حدیث اس جملہ پر تمام ہوگئی ہے: ’’حتى انقضت الآية‘‘ اور قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا ﴾ جو یہاں مذکور ہے وہ بخاری میں حدیثِ مذکور میں شامل نہیں ہے)[2] (وهكذا رواه ههنا منفردا به أيضا)

حافظ ابوبکر بزار رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ ﴾ تو میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! واللہ! میں آپ سے بات نہ کروں گا مگر اخی السرار کی طرح، یعنی ایسی بات کروں گا جیسے کوئی پوشیدہ بات کرتا ہے۔[3] حصین بن عمر اس کی سند میں ایک ایسا راوی ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ یہ حصین بن عمر اگرچہ ضعیف ہیں، لیکن عبدالرحمان بن عوف اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے ہمیں اس طرح کی روایت یہاں روایت کی گئی ہے۔ واللہ أعلم

امام بخاری رحمہ اللہ نے موسیٰ بن انس عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کو گم پایا تو ایک شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! میں آپ کو اس کی خبر لا دوں گا، پھر وہ اس کے پاس آیا تو اس کو دیکھا کہ اپنے گھر میں سر جھکائے ہوئے بیٹھا ہے اور اس سے کہا کہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ اس نے کہا کہ میرا حال برا ہے، میں اپنی آواز کو نبی کریم ﷺ کی آواز سے بلند کیا کرتا تھا تو میرے اعمال یقیناً ضائع ہو گئے ہیں اور میں اہلِ نار سے ہو گیا ہوں۔ پھر وہ شخص نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ کو بتایا کہ اس نے ایسا ایسا کہا ہے۔ موسیٰ رحمہ اللہ نے کہا پھر وہ اس کے پاس دوبارہ لوٹ کر گیا، ایک بڑی بشارت لے کر یہ کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو اس

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٦٤) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٦٦)

[3] مسند البزار (١٢٧/١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’فيه حصين بن عمر الأحمسي وهو ضعيف‘‘ (مجمع الزوائد: ٢٣٧/٧)

کے پاس جا اور اس سے کہہ کہ تو اہلِ نار سے نہیں ہے، لیکن تو تُو اہلِ جنت میں سے ہے۔[1] (انفرد به البخاري من هذا الوجه)

امام احمد رحمہ اللہ نے عن ثابت عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت اتری: ﴿إلىٰ قوله ... وَاَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ﴾ اور ثابت بن قیس بن شماس بلند آواز تھے تو کہا: میں وہ ہوں جو اپنی آواز رسول اللہ ﷺ کی آواز سے بلند کیا کرتا تھا، اس لیے میں اہلِ نار سے ہوں اور میرا عمل ضائع ہو گیا، پھر غمگین ہو کر اپنے گھر میں بیٹھ رہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو گم پایا تو کچھ لوگ ان کے پاس گئے اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے تجھے گم پایا ہے، تجھے کیا ہوا ہے؟ اس نے کہا کہ میں وہ ہوں جو اپنی آواز کو نبی کریم ﷺ کی آواز سے بلند کیا کرتا تھا اور اُن سے اونچی آواز میں بولتا تھا، لہٰذا میرا عمل ضائع ہو گیا اور میں اہلِ نار میں سے ہوں۔ پھر وہ لوگ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور انھوں نے جو بات کہی تھی اس کی آپ کو خبر دی آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ وہ تو اہلِ جنت سے ہے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر ہم اسے دیکھتے تھے کہ وہ ہمارے درمیان چل رہا ہے اور ہم جان رہے ہیں کہ بے شک وہ اہلِ جنت سے ہے۔ پھر جب یمامہ کا دن ہوا تو ہم میں کچھ بھگدڑ مچی تو ثابت بن قیس بن شماس آیا اور اس نے واقعی خوشبو لگائی ہوئی تھی اور اپنا کفن پہنا تھا، کہا: "بِئۡسَ مَا تُعَوِّدُوْنَ أَقْرَانَكُمْ" یعنی تم اپنے ہمسروں کو بہت بری شے کا خوگر کرتے ہو، پھر وہ اُن سے لڑے، یہاں تک کہ مارے گئے۔[2] رضي الله تعالىٰ عنه.

امام مسلم رحمہ اللہ نے عن ثابت بنانی عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، کہا کہ جب آیتِ مذکور اتری تو ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں بیٹھ رہے، کہا: میں اہلِ نار میں سے ہوں اور نبی اکرم ﷺ سے رک رہے تو آپ ﷺ نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: او ابو عمرو! ثابت کا کیا حال ہے؟ کیا وہ بیمار ہو گیا ہے؟ تو سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ وہ تو میرا پڑوسی ہے اور مجھے اس کی بیماری کا علم نہیں ہے۔ راوی نے کہا: پھر سعد رضی اللہ عنہ اس کے پاس آئے تو نبی اکرم ﷺ کی بات اس کو بتائی، چنانچہ ثابت رضی اللہ عنہ بولے کہ یہ آیت نازل کی گئی اور تم واقعی جان چکے ہو کہ میں رسول اللہ ﷺ پر تم سے بڑھ کر بلند آواز ہوں، اس لیے میں تو اہلِ نار میں سے ہوں۔ چنانچہ سعد رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا بلکہ وہ تو اہلِ جنت میں سے ہے۔[3] (ثم رواه مسلم عن أحمد بن سعيد الدارمي عن حيان بن هلال عن سليمان بن المغيرة به قال: ولم يذكر سعد بن معاذ رضي الله عنه.[4] وعن قطن بن بشير عن جعفر بن سليمان عن ثابت عن أنس رضي الله عنه بنحوه ليس فيه ذكر سعد بن معاذ رضي الله عنه حدثني هيثم بن عبد الأعلىٰ الأسدي حدثنا المعتمر بن سليمان سمعت أبي يذكر عن أنس رضي الله عنه قال: لما نزلت هذه الآية فاقتص الحديث ولم يذكر سعد بن معاذ رضي الله عنه و زاد "فكنا نراه يمشي بين أظهرنا رجل من أهل الجنة"[5] فهذه الطريق الثلاث معللة لرواية حماد بن سلمة فيما انفرد به من ذكر سعد بن معاذ رضي الله عنه والصحيح أن حال نزول هذه الآية لم يكن سعد بن معاذ موجودًا لأنه قد مات بعد بني قريظة بأيام قلائل سنة خمس وهذه الآية نزلت في وفد بني تميم والوفود إنما تواتروا في سنة تسع من الهجرة والله أعلم)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٦٥) [2] مسند أحمد (١٣٧/٣) [3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٩)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٩) [5] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٩)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن اسماعیل بن محمد بن ثابت بن قیس بن شماس عن ابیہ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو ثابت بن قیس راہ میں بیٹھ گئے اور روتے تھے، پھر عاصم بن عدی بن عجلان کا ان پر گزر ہوا تو کہا اے ثابت! کیوں رو رہا ہے؟ کہا کہ میں ڈرتا ہوں کہ یہ آیت میرے حق میں اتری ہو اور میں بلند آواز والا ہوں، پھر عاصم بن عدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلا اور ثابت پر رونا غالب ہوا، وہ اپنی بی بی جمیلہ دختر عبداللہ بن ابی بن سلول کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ جس وقت میں اپنے گھوڑے کے گھر میں داخل ہو جاؤں تو دروازے کو ایک میخ کے ساتھ مضبوط کر دینا (اصل کے الفاظ یہ ہیں: "فشدي علي الضبة بمسمار فضربته بمسمار"۔ "ضبه" آہن مسمار در کو کہتے ہیں) تو اس نے اس کو ایک میخ سے ٹھونک دیا اور کہا: میں نہ نکلوں گا، یہاں تک کہ مجھے اللہ تعالیٰ موت دے دے یا مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہوں۔

راوی نے کہا: اور عاصم رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو جا اور اس کو میرے پاس بلا کر لا۔ چنانچہ عاصم اس مکان کی طرف آئے، جہاں ثابت کو بیٹھا دیکھا تھا تو اُن کو وہاں نہ پایا، پھر اُن کے گھر کی طرف آئے تو اُن کو گھوڑے کے گھر میں پایا۔ چنانچہ اُن سے کہا کہ تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلاتے ہیں تو ان سے کہا کہ دروازے کے لوہے کو توڑ ڈال، پھر دونوں نکلے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ثابت! تجھے کون سی چیز رلاتی ہے؟ تو عرض کی کہ میں بلند آواز ہوں اور میں ڈرتا ہوں کہ یہ آیت میرے بارے میں اتری ہو: ﴿ لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ ... الآية﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: «أَمَا تَرْضَى أَنْ تَعِيْشَ حَمِيْدًا وَتُقْتَلَ شَهِيْدًا وَتَدْخُلَ الْجَنَّةَ» یعنی کیا تو اس بات سے راضی نہیں ہوتا کہ جیے محمود ہو کر اور مارا جائے شہید ہو کر اور داخل ہو جنت میں؟ چنانچہ ثابت رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ میں اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی خوش خبری سے خوش ہوا۔ اور میں اپنی آواز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے کبھی بلند نہ کروں گا۔

کہا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ... الآية﴾ [1] تابعین میں سے کئی ایک اہلِ علم نے اس قصے کو اس طرح ذکر کیا ہے۔ درحقیقت اللہ عزوجل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آوازوں کو بلند کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ہم کو امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں دو شخصوں کی آوازیں سنیں کہ بلند ہوئی تھیں تو آئے اور فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ تم کہاں ہو؟ پھر فرمایا کہ تم کہاں کے ہو؟ عرض کی کہ اہلِ طائف میں سے ہیں۔ فرمایا کہ اگر تم مدینے والوں میں سے ہوتے تو البتہ میں تم کو مار کر درد دیتا۔ [2] علماء رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کے پاس

---

① تفسير الطبري (٢٧٩/٢٢) ② صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٨)

آواز کو بلند کرنا، اسی طرح مکروہ ہے جس طرح کہ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارک میں مکروہ تھا، اس لیے کہ آپ ﷺ ہمیشہ کے لیے محترم ہیں، اپنی حیاتِ مبارک میں بھی اور اپنی قبر شریف میں بھی۔

پھر اللہ پاک نے آپ ﷺ سے اونچی آواز سے بولنے سے منع کیا جس طرح کہ آدمی اپنے مخاطب سے اونچی آواز میں گفتگو کرتا ہے جو آپ ﷺ کے اَور لوگوں میں سے ہو، بلکہ آپ ﷺ کے ساتھ سکینت اور وقار اور تعظیم کے ساتھ بات کرے، اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ﴾ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾ [النور: ٦٣] ''تم اللہ تعالیٰ کے نبی کے بلانے کو ایسا بلاوا نہ کرلو، جیسا کہ آپس میں ایک دوسرے کو ہوتا ہے۔''

عدمِ تعظیمِ رسول سے اعمال کے ضیاع کا خطرہ:

قولہ تعالیٰ: ﴿اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾ مطلب یہ ہے کہ ہم نے جو تم کو اس کے نزدیک آواز بلند کرنے سے منع کیا ہے، وہ اس خوف سے کہ وہ اس سے خفا ہو جائے تو اس کی خفگی سے اللہ تعالیٰ خفا ہو اور اس شخص کا عمل ضائع ہو جائے جس نے اس کو خفا کیا، حالاں کہ وہ جانتا نہیں ہے جس طرح کہ صحیح میں آیا ہے کہ بے شک کوئی شخص کبھی کوئی ایسا کلمہ بے خیالی میں کہہ جاتا ہے کہ وہ اللہ کی خوشنودی کا ہوتا ہے کہ اس کلمے کے سبب سے اس کے لیے جنت لکھ دی جاتی ہے اور بے شک کوئی شخص کبھی ایسا کلمہ بے خیالی سے کہہ جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا ہوتا ہے کہ اس کے سبب سے وہ آگ میں اتنا دور جا گرتا ہے جتنی کہ آسمان اور زمین کے درمیان مسافت ہے۔[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اس طرف بلایا کہ نبی کریم ﷺ کے نزدیک آواز پست کریں اور اس پر آمادہ کیا، اس کی طرف راہ بتائی اور اس میں رغبت دلائی، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ﴾ یعنی بے شک جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک اپنی آواز پست کرتے ہیں، وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقوے کے لیے خاص کیا ہے اور ان کو تقوے کا اہل اور اس کی جگہ ٹھہرایا ہے۔ ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے ''کتاب الزھد'' میں عن منصور عن مجاہد روایت کیا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا: اے امیر المومنین! کیا وہ شخص جو معصیت کی خواہش نہیں رکھتا اور نہ اس پر عمل کرتا ہے افضل ہے یا وہ شخص کہ جو معصیت کی خواہش رکھتا ہے مگر اس پر عمل نہیں کرتا؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ بے شک وہ لوگ جو معصیت کی خواہش رکھتے ہیں اور اس پر عمل نہیں کرتے افضل ہیں۔ ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾.[2]

---

[1] صحیح البخاري (٦١١٣،٦١١٢) صحیح مسلم (٩٨٨) صحیحین میں حدیث کا آخری جملہ ''آسمان اور زمین کے درمیان مسافت ......'' کے بجائے ''مشرق اور مغرب کے درمیان ......'' کا ہی ذکر ہے، البتہ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (٢٦٣/٤) میں ''آسمان اور زمین'' کا ہی ذکر کیا ہے۔

[2] تفسیر ابن کثیر (٢٦٣،٢٦٠/٤)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ اس سورت میں ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کے الفاظ پانچ بار ذکر کیے گئے ہیں اور جن کو اُن میں خطاب کیا گیا ہے وہ مومن ہیں اور جس شے کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے وہ امر ہے یا نہی ہے اور ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ﴾ اس میں ایک دفعہ مذکور ہے اور اس میں مومنوں اور کافروں کو عام خطاب ہے، جس طرح کہ جس شے کا اس آیت میں خطاب کیا گیا ہے، وہ دونوں کے لیے عام اور یکساں ہے، یعنی ﴿ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى ﴾ اس لیے اس میں "ناس" کا ذکر مناسب ہوا۔

﴿ لَا تُقَدِّمُوْا ﴾ کو جمہور نے بہ ضم تائے فوقیہ وتشدید دالِ مکسورہ پڑھا ہے، اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ متعدی ہے اور اس کا مفعول عمومیت کے لیے محذوف ہوا ہے (یعنی تم کسی شے کو مقدم نہ کرو اللہ اور رسول سے قبل، چونکہ مقصد تعمیم ہے، اس لیے لفظ میں تو محذوف ہے اور معنی میں مراد ہے) یا اس لیے متروک ہوا ہے (یعنی نہ لفظ میں ہے نہ معنی میں مراد ہے، کیوں کہ مقصود نفسِ فعل ہے مفعول سے کچھ غرض نہیں ہے) کہ مقصود نفسِ فعل ہے، جیسے: عرب لوگ بولتے ہیں کہ "فُلَانٌ يُعْطِيْ وَيَمْنَعُ" یعنی فلاں دیتا ہے اور منع کرتا ہے، منظور دینا اور منع کرنا ہے مفعول سے کچھ واسطہ نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ فعل لازم ہے، جیسے: "وَجَّه وَتَوَجَّهَ" دونوں کے ایک معنی ہیں، یعنی فلاں متوجہ ہوا۔ جس شخص نے "تَقَدَّمُوْا" بہ فتح تاء وقاف ودال پڑھا ہے (یعنی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، ضحاک اور یعقوب) تو یہ قراءت اس کے لازم ہونے کی مؤید ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہاں "قَدَّمَ"، "تَقَدَّمَ" کے معنی میں ہے اور وہ لازم ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب لوگ بولتے ہیں: "لَا تُقَدِّمْ بَيْنَ يَدَيِ الْإِمَامِ وَبَيْنَ يَدَيِ الْأَبِ"[1] یعنی امر و نہی میں امام اور باپ سے پہلے جلدی مت کر، اس لیے کہ معنی یہ ہیں کہ ان کے امر و نہی سے پہلے آگے مت بڑھو۔ اور "بَيْنَ يَدَيِ الْإِمَامِ" سے مراد خود امام ہے اور "مَا بَيْنَ يَدَيْ إِنْسَانٍ" مراد نہیں ہے، یعنی حقیقت میں "مَا بَيْنَ يَدَيْ إِنْسَانٍ" وہ شے ہے جو آدمی کے دونوں ہاتھوں کے درمیان ہوتی ہے، چنانچہ یہ مراد نہیں ہے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ امام سے پہلے امر و نہی کی جلدی مت کر۔

کسی نے کہا ہے کہ "بَيْنَ يَدَيْ فُلَانٍ" کے معنی ہیں "بِحَضْرَتِهِ"، اس لیے کہ جو شے انسان کے حضور میں ہوتی ہے تو وہ اس کے ہاتھوں کے درمیان میں ہے، یہ عبارت یعنی ﴿ بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ یہاں مجاز کے ایک طریق پر جاری ہوئی ہے۔ یہ وہ ہے جس کا نام اہلِ بیان تمثیل رکھتے ہیں، یعنی استعارۂ تمثیلیہ اور غرض کمال نالائقی اور کمینے پن کی تصویر اور برائی بیان کرنا ہے جو اللہ کے اور اس کے رسول کے اِذن کے بغیر اُن کی بات کو کاٹنا

---

[1] فتح القدیر (۷۸/۵)

ہے۔ یا مراد "بَيْنَ يَدَيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ" ہے اور اللہ کا لفظ مبارک رسول کی تعظیم کے لیے ہے اور اس بات سے آگاہ کرنے کے لیے ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک رسول کا وہ مرتبہ ہے جو اس کے اجلال کو واجب کرتا ہے اس بنا پر یہ کچھ استعارہ نہیں ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ کا کلام اسی طرف مائل ہے۔[1]

امام شہاب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کلام میں دو مجاز ہیں: ایک تو "بين اليدين" میں ہے، کیوں کہ اس کی حقیقت وہ شے ہے جو دو عضو کے درمیان ہو، پھر اُن دو عضو سے مجازاً وہ دو جہتیں مراد لیں جو دائیں اور بائیں کے مقابل اور اس شے کے قریب ہیں اس طرح سے کہ جو شے اُن کے مجاور و محاذی (قریب، بالمقابل) تھی اس پر "یدین" کا اطلاق کیا تو یہ مجازِ مرسل کے باب سے ہوا۔ پھر یہ ہے کہ آدمی کو جس شخص کی اتباع اور پیروی لازم ہے، اس کی اقتداء اور پیروی کرنے کے بغیر اُن کی بات کو کاٹنا اور اُن کے سامنے حکم دینے کی جرأت کر بیٹھنا جو ایک ناموزوں بات ہے، چنانچہ اس کی برائی اور خرابی کی تصویر کھینچنے کے لیے اس کے لیے تمثیلی استعارہ کیا گیا، اس جملے کا یعنی تقدم بین الیدین کا ایک محسوس صورت کے ساتھ، مثلاً: جیسے خادم اپنے مخدوم اور سردار کے آگے چلے، حالانکہ اس کا منصب یہ ہے کہ اس سے آگے نہ بڑھے، بلکہ اس کے پیچھے چلے، اس لیے کہ اس پر اس کی پیروی لازم ہے۔

چنانچہ پہلی عبارت اس مجاز کے ساتھ جو اس میں تھا اس استعارے کی طرف نقل کی گئی جس کا ذکر ہوا۔[2] کسی نے "تُقْدِمُوْا" بہ ضمِ تاء وکسرِ دال پڑھا ہے "أَقْدَمَ" سے، یعنی کسی شے پر اقدام و پیش قدمی مت کرو۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ کسی قول اور فعل کے ساتھ جلدی مت کرو اس سے قبل کہ اللہ کا رسول کہے، یا اس سے قبل کہ کرے۔[3] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ کسی نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کے کسی معاملے میں حکم کرنے سے پہلے اسے قطع مت کرو۔[4] انتھیٰ. قطعِ امر کے معنی ہیں کہ اس شخص کے اِذن کے بغیر جس کو اذن دینے کا استحقاق ہے، اس کے امر کے ساتھ جزم کرنا اور جرأت کرنا۔ کسی نے کہا کتاب و سنت کے خلاف کچھ مت کہو۔ یہ قول زیادہ ظاہر اور اشمل ہے اور پہلے گزر چکا ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ یعنی اور اللہ سے ڈرو اپنے سارے امور میں۔ اللہ اور رسول سے آگے بڑھنے کو ترک کرنا اس کے تحت میں بدخولِ اولیٰ داخل ہے۔ پھر تقوے کا حکم دینے کی علت یہ بیان فرمائی: ﴿إِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ یعنی اس لیے کہ بے شک اللہ ہر سنی جانے والی چیز کو خوب سننے والا ہے اور ہر جانی جانے والی چیز کو خوب جانتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "نُهُوْا أَنْ يَّتَكَلَّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ كَلَامِهِ"[5] یہ قول پہلے گزر چکا ہے اور یہ اس بات کو بھی شامل ہے کہ کتاب و سنت کا مقابلہ رائے اور تقلید کے ساتھ کیا جائے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ روزہ مت رکھو

---

[1] تفسير الجلالين (٦٨٤/١) [2] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧٠/٨)

[3] تفسير الخازن (٢١٨/٦) [4] تفسير البيضاوي (٢١١/٥) [5] تفسير الطبري (٢٧٢/٢٢)

اس سے قبل کہ تمھارا نبی روزہ رکھے۔ (أخرجه ابن مردويه) نیز اُن سے مروی ہے کہ کچھ لوگ رمضان کے آگے ایک یا دو دن روزے کے ساتھ تقدم کرتے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔[1] (أخرجه البخاري في تاريخه) نیز ان سے مروی ہے کہ کچھ لوگ تقدم کرتے تھے شہر کا، یعنی ماہِ رمضان کا، تو روزہ رکھتے نبی کریم ﷺ سے پہلے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (أخرجه الطبراني وابن مردويه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ ندا کے اعادے میں کئی فائدے ہیں: ایک یہ ہے کہ اس میں رشد و ہدایت کے طالب کے لیے شفقت کا مزید بیان ہے، جیسے لقمان علیہ السلام کا اپنے بیٹے سے کہنا: ﴿ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ﴾ [لقمان: ۱۳] ''اے میرے پیارے بچے! اللہ کے ساتھ شریک نہ کرنا'' اس لیے کہ ندا کا مقصد اس شخص کو ہوشیار کرنا ہے جس کو ندا کی جائے، تاکہ وہ کلام کے سننے پر متوجہ اور اپنا دل لگائے۔ چنانچہ ندا کا بار بار دھرانا اس کے تجدد کو ظاہر کرتا ہے، یعنی اب کوئی نئی بات کہنے کے لیے ندا کی جا رہی ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ یہ وہم نہ کیا جائے کہ دوسری دفعہ ندا کرنے والا پہلی دفعہ ندا کرنے والے سے مختلف ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ دونوں کلاموں میں سے ہر ایک مقصود ہے دوسری بات کا کوئی پہلی بات کی تاکید نہیں ہے۔

﴿ لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ ﴾ احتمال ہے کہ اس سے مراد حقیقت میں آواز کو بلند کرنا ہو، اس لیے کہ آواز کا بلند کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ آواز بلند کرنے والے میں حیا کی کمی ہے اور احترام کا خیال نہیں، کیوں کہ آواز کا پست کرنا اور اس کا بلند نہ کرنا عزت اور تعظیم کے لوازمات سے ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ مراد زیادہ باتیں کرنے اور شور وغل سے منع کیا گیا ہو۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اپنی آوازوں کو اس حد تک بلند نہ کرو کہ وہ اس حد سے بھی اونچی ہو جائیں جہاں نبی کریم ﷺ کی آواز پہنچے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ آیت سے مراد نبی مکرم ﷺ کی تعظیم اور توقیر ہے اور یہ بات کہ آپ ﷺ کو اس طرح سے نہ پکاریں جس طرح سے وہ ایک دوسرے کو پکارتے ہیں۔ یہ قول کے متعلق نہی ہے، جیسا کہ ﴿ لَا تُقَدِّمُوْا ﴾ فعل سے نہی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ ﴾ یعنی جب اس سے بات کرو تو اپنی آواز اس طرح اونچی نہ کرو جس طرح کہ تمھیں عادت ہے جب تم میں سے کوئی کسی سے بات کرتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے ان کو حکم دیا ہے کہ اپنے نبی کریم ﷺ کی تجلیل کریں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ ﴾ سے یہ مراد ہے کہ انھیں یا محمد اور یا احمد نہ کہو، بلکہ یا نبی اللہ اور یا رسول اللہ کہا کرو، تاکہ ان کی عزت ہو۔ آواز کے بلند کرنے اور اونچا کرنے سے مراد وہ نہیں ہے جو استخفاف (حقارت) کے طور پر واقع ہوتا ہے، کیوں کہ ایسا کرنا تو کفر ہے۔

---

[1] فتح القدير (۸۱/۵) [2] معاني القرآن (۳۲/۵)

اس جہر سے مراد یہ ہے کہ آواز فی نفسہٖ غیر مناسب ہو اور ویسی نہ ہو جیسی کہ اس شخص کے پاس واقع ہو جس کی تعظیم اور عزت کرنا واجب ہو۔ حاصل یہ ہے کہ اس جگہ کئی امر سے نہی واقع ہوئی ہے۔ پہلے تو یہ ہے کہ جس کا اذن نہیں دیا اس کلام میں آگے بڑھا جائے۔ دوسرے یہ کہ آواز کو خوب بلند کیا جائے، یہاں تک کہ وہ نبی کریم ﷺ کی آواز سے بھی اونچی ہو جائے، بے شک وہ بات نبی کریم ﷺ کے ساتھ کی جائے یا کسی اور کے ساتھ۔ تیسرا امر یہ ہے کہ آپ ﷺ سے بات چیت کرنے میں سختی اور درشتی نہ ہو اور آپ ﷺ سے خطاب کرنے میں ادب کو لازم پکڑا جائے، اس لیے کہ اپنے ہمسروں کے ساتھ باہمی اونچی آواز سے گفتگو کرنے میں ایک کو دوسرے پر کوئی ایسی فضیلت نہیں ہوتی جس سے اس کی عزت اور احترام واجب ہو۔

پھر جو بات اللہ پاک نے ذکر کی اس کی وجہ یہ بیان فرمائی: ﴿ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمٰلُكُمْ ﴾ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ: لِأَنْ تَحْبَطَ"[1] یعنی "فَتَحْبَطَ" پس لامِ مقدر صیرورت کا لام ہے، یعنی تم ان سے چیخ کر نہ بولو، اس لیے کہ اس کا انجام یہ ہوگا کہ تمھارے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ یہ علت صحیح ہے کہ نہی کی علت ہو، یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو جو جہر سے منع کیا تو اس بات کے خوف اور کراہت کی وجہ سے کہ تمھارے اعمال ضائع ہو جائیں۔ یا علت ہو منہی کی، یعنی تم جہر مت کرو، اس لیے کہ وہ اعمال کے ضائع ہونے کا باعث بنتا ہے۔ چنانچہ امام زجاج رحمہ اللہ کا کلام وجہِ ثانی کی طرف ناظر ہے نہ کہ وجہِ اول کی طرف۔

جملہ ﴿ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال اور اس میں سخت قسم کی تحذیر (ڈرانا) اور وعیدِ عظیم ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یہ مراد نہیں ہے کہ ﴿ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴾ اس کا موجب نہیں ہے کہ انسان کافر ہو جائے اور وہ جانتا نہ ہو جس طرح کہ کوئی کافر مومن نہیں ہوتا مگر کفر پر ایمان کو اختیار کر کے، اسی طرح کوئی کافر نہیں ہوتا اس حیثیت سے کہ اس کو جانتا نہیں ہے۔

پھر اللہ پاک نے اپنے امر کے مان لینے میں رغبت دلائی، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﴾ "غض" کی اصل ہر شے میں نقص یعنی کمی ہے، اسی معنی میں نقصِ صوت ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ﴾ "أَخْلَصَ قُلُوبَهُمْ" یعنی جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس ان کی جلالتِ قدر اور تعظیم کے لیے اپنی آوازیں کم کرتے ہیں، وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقوے کے لیے خالص کیا جس طرح کہ سونے کو آگ سے خالص کیا جاتا ہے تو اس میں اعلیٰ اور عمدہ قسم کا سونا اس کے ردی عنصر سے الگ ہو جاتا ہے اور اس کا خراب عنصر گر جاتا ہے۔ امام مجاہد، مقاتل اور قتادہ رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

---

[1] معاني القرآن (۳۲/۵)

امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: "اِخْتَصَّهَا لِلتَّقْوَى" یعنی ان کو تقوے کے لیے خاص کیا۔[1] امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے: "اِمْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ فَأَخْلَصَهَا لِلتَّقْوَى"[2] پس اخلاص کو حذف کیا، اس لیے کہ امتحان اس پر دال ہے، یعنی اللہ نے ان کے دلوں کا امتحان کیا، پھر ان کو تقویٰ کے لیے خالص کیا۔ یہ وجہ زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ ایسے سادات کرام کی تعریف میں کلام وارد ہے، یا ان لوگوں کی تعریض (تنگ کرنا) میں کلام وارد ہے جو ان جیسے اوصاف کے حامل نہیں ہیں۔

اسی وجہ سے آیتِ سابقہ کے فاصلے میں ﴿ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴾ کہا ہے اور آیتِ لاحقہ کے فاصلے میں ﴿ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴾ فرمایا ہے۔ کسی نے کہا کہ ان کو ہر قباحت سے طاہر و پاک کیا ہے۔ کسی نے کہا کہ وسیع اور فراخ کیا اور اُن کو کھول دیا۔ یہ ماخوذ ہے: "مَحَنْتُ الْأَدِيمَ إِذَا وَسَعْتَهُ" سے۔ ابو عمرو نے کہا: "وَكُلُّ شَيْءٍ جَهَدْتَهُ فَقَدْ مَحَنْتَهُ"۔[3] حرفِ لام محذوف سے متعلق ہے: "أَيْ: صَالِحَةٌ لِلتَّقْوَى، كَقَوْلِكَ: أَنْتَ صَالِحٌ لِكَذَا"، یا تعلیل کے لیے ہے: "كَقَوْلِكَ: جِئْتُ لِأَدَاءِ الْوَاجِبِ أَيْ: لِيَكُوْنَ مَجِيئِي سَبَبًا لِأَدَائِهِ"۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴾ دوسری خبر ہے ﴿ اُولٰٓئِكَ ﴾ کی، یا کلامِ مستانف ہے اس شے کے بیان کے لیے جو اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ان کے لیے تیار کر رکھی ہے۔ ظاہر یہی وجہ ہے۔[4] واللہ أعلم.

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۴
وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵

بلاشبہ جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں، ان میں سے اکثر بے عقل ہیں ④ اور اگر بے شک وہ صبر کرتے، حتیٰ کہ آپ (خود ہی) ان کی طرف نکلتے، تو ان کے لیے بہت بہتر ہوتا، اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے ⑤

رسول اللہ ﷺ کو حجروں کے باہر سے آواز دینے والوں کی مذمت:

بنو تمیم کے لوگ آپ ﷺ سے ملنے کے لیے آئے، نبی کریم ﷺ گھر میں تھے باہر سے ہی چلانے لگے۔ آدمی کو پہلے زبانی خبر کرنا چاہیے۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ پھر اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت کی جو آپ ﷺ کو حجروں کے

① تفسیر القرطبي (۳۰۸/۱٦) فتح القدير (۷۹/۵) ② روح المعاني (۱۳۸/۲٦)
③ تفسیر القرطبي (۳۰۹/۱٦) ④ فتح البيان (۱۳/ ۱۲۹۔۱۳۳)

باہر سے پکارتے ہیں۔ حجرات آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے گھر ہیں۔ ایسا پکارنا تو جنگلی درشت مزاج لوگوں کے پکارنے کی طرح ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ ان میں سے اکثر لوگ عقل نہیں رکھتے۔ پھر اس بارے میں جو ادب ہے اس کی طرف اشارہ کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴾ یعنی اگر وہ اس وقت تک صبر کرتے جب تک تو خود ان کی طرف نکلتا تو البتہ اس میں ان کے لیے دنیا و آخرت کی بھلائی اور مصلحت ہوتی۔

پھر اللہ عزوجل نے ان کو توبہ اور اللہ کی طرف رجوع کی دعوت دی: ﴿ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾۔ ذکر کیا گیا ہے کہ یہ آیت اقرع بن حابس تمیمی رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی، اس قول کے مطابق جس کو کئی ایک اہلِ علم نے وارد کیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو پکارا اور کہا: "يَا مُحَمَّدُ! يَا مُحَمَّدُ" ایک روایت میں ہے کہ کہا: "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!" تو آپ ﷺ نے ان کو جواب نہ دیا، پھر کہا: "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّ حَمْدِيْ لَزَيْنٌ وَإِنَّ ذَمِّيْ شَيْنٌ" یعنی بے شک میری حمد البتہ اچھی ہے اور میری ذم البتہ بری ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اللہ عزوجل ہے۔[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے، کہا کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ "يَا مُحَمَّدُ إِنَّ حَمْدِيْ زَيْنٌ وَذَمِّيْ شَيْنٌ" چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اللہ عزوجل ہے[2] اور اسی طرح امام حسن بصری اور قتادہ رحمہما اللہ نے اس کو مرسلاً روایت کیا ہے۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے حبیب بن ابی عمرہ سے روایت کیا ہے، کہا: بشر بن غالب ولبید بن عطارد یا بشر بن عطارد ولبید بن غالب اور یہ دونوں حجاج کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو بشر بن غالب نے لبید بن عطارد سے کہا کہ یہ آیت تیری قوم بنی تمیم کے حق میں نازل ہوئی: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ ﴾

کہا پھر میں نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے اس کا ذکر کیا تو کہا: سنتا ہے بے شک وہ اگر آیت کے آخری حصے کو جانتا تو اسے جواب دیتا۔ "يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوْا قَالُوْا أَسْلَمْنَا وَلَمْ يُقَاتِلْكَ بَنُوْ أَسَدٍ"[3] (اس جگہ عبارت میں کچھ نقصان ہے، حاصل مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسدی نے تمیمی کو اس آیت کی عار دلائی جو بعض بنی تمیم کی مذمت میں نازل ہوئی، پھر اس کا ذکر سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ تمیمی اس سورت کی آخری آیت پر مطلع نہ ہوتا اور نہ اسدی کو جواب دیتا، کیوں کہ آیتیں اسی سورت کے آخر میں بعض بنی اسد کی مذمت میں نازل ہوئی ہیں۔ والله أعلم)

---

[1] مسند أحمد (٤٨٨/٣) تفسير الطبري (٢٨٤/٢٢) [2] تفسير الطبري (٢٨٣/٢٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٦٧)
[3] تفسير الطبري (٢٨٥،٢٨٤/٢٢)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا ہے کہ عرب کے کچھ لوگ جمع ہوئے اور کہا ہمارے ساتھ اِس شخص کی طرف چلو، چنانچہ اگر وہ نبی ہے تو ہم اس کے ساتھ بہرہ مند تر لوگوں میں سے ہوں گے اور اگر وہ بادشاہ ہے تو "نَعِشُ بِجَنَاحِهِ" (یعنی اس کے بازو میں گھونسلہ بنائیں گے، یعنی اس کی حفاظت و پرورش میں رہیں گے یا زندگی بسر کریں گے اس کی حمایت میں اور اس کے زیرِ دامن رہیں گے) کہا: پھر میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور میں نے آپ ﷺ کو وہ بات بتائی جو انھوں نے کہی تھی، پھر وہ نبی کریم ﷺ کے حجرے کی طرف آئے اور آپ ﷺ کو پکارنے لگے، اور آپ ﷺ اپنے حجرے میں تھے: "یَا مُحَمَّدُ! یَا مُحَمَّدُ!" پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ ﴾ کہا: رسول اللہ ﷺ نے میرا کان پکڑا، پھر اس کو کھینچا اور فرمانے لگے: «لَقَدْ صَدَّقَ اللّٰهُ تَعَالَى قَوْلَكَ يَا زَيْدُ! لَقَدْ صَدَّقَ اللّٰهُ تَعَالَى قَوْلَكَ يَا زَيْدُ!»[1]

(رواه ابن جرير عن الحسن بن عرفة عن المعتمر بن سليمان به)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ ﴾ سے مراد جفاتِ بنی تمیم ہیں، یعنی سخت خو اور درشت مزاج لوگ۔ چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ ﴿ وَرَآءِ الْحُجُرٰتِ ﴾ بہ معنی حجرات سے باہر اور اُن کے پیچھے ہے، یا ﴿ وَرَآءِ ﴾ بہ معنی "قُدَّام" ہے، یعنی آگے۔ "حُجُرَاتٌ" "حُجْرَةٌ" کی جمع ہے، جیسے: "غُرُفَاتٌ" "غُرْفَةٌ" کی جمع ہے اور "ظُلُمَاتٌ" "ظُلْمَةٌ" کی جمع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "حُجُرٌ" کی جمع ہے اور "حُجَرٌ" جمع ہے "حُجْرَةٌ" کی تو "حُجُرَاتٌ" جمع الجمع ہوئی۔ حجرہ اس زمین کا قطعہ ہے جو ایک دیوار کے ساتھ روکی گئی ہے اور گھرتی ہے۔ اس پر "حُجْرَةٌ" بروزن "فُعْلَةٌ" بہ معنی مفعولہ ہے، یعنی زمین کا روکا ہوا گھیرا ہوا قطعہ۔ جمہور نے "حُجُرَات" بہ ضمِ جیم پڑھا ہے اور ابو جعفر بن قعقاع و شیبہ نے بہ فتحِ جیم پڑھا ہے تخفیف کے لیے اور ابن ابی عبلہ نے بہ سکونِ جیم پڑھا ہے اور یہ سب لغت ہیں۔[2] ان کا حجروں کے باہر سے پکارنا یا تو یوں ہے کہ وہ حجروں پر آئے ایک ایک حجرہ کر کے اور آپ ﷺ کو اُن کے باہر سے پکارا، یا یہ کہ وہ آپ ﷺ کو تلاش کرتے ہوئے حجروں پر متفرق ہو گئے اور ہر ایک حجرے پر آواز دی۔

کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائے غایت کے لیے ہے اور اس کے یہ معنی کرنے سے بھی کوئی ممانعت نہیں، یعنی ان کی نداء کی ابتداء حجروں کے باہر سے ہوئی۔ معنی یہ ہیں کہ جو لوگ تجھ کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں، ان میں سے

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٠٢/١٠) تفسير الطبري (٢٨٤/٢٢) تفسير ابن كثير (٢٦٣/٤، ٢٦٤) اس کی سند میں "داود طفاوی" متکلم فیہ راوی ہے۔

[2] فتح القدير (٨٠/٥)

اکثر عقل نہیں رکھتے، اس لیے کہ اُن پر جہالت کا غلبہ ہے اور اس کی طبیعت میں جفا اور سختی کی کثرت ہے۔ اکثر سے مراد کل ہے۔ عرب لوگ کبھی کبھی اکثر سے کل مراد لیتے ہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس طرز پر آیت کے ورود میں جس پر وہ وارد ہوئی ہے رسول اللہ ﷺ کی جو جلالت اور قدر اور مقام و مرتبہ ہے، وہ مخفی نہیں ہے، اس میں سے ایک یہ ہے کہ جو لوگ آپ کو چلا کر پکارتے ہیں، ان پر جہالت اور کم عقلی کا حکم لگایا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو جگہ اپنی بعض بیبیوں کے ساتھ خلوت و استراحت و آرام کی تھی، اس سے کنایہ کر کے "حُجُرَاتٌ" کا لفظ واقع کیا۔ تیسری یہ ہے کہ حجرات کو معرف باللام کر کے ﴿ الْحُجُرٰتِ ﴾ فرمایا اضافت نہیں کی، "حُجُرَاتِكَ" نہ کہا اور اگر کوئی غور کرنے والا غور کرے تو اس سورت کے شروع سے اس آیت کے آخر تک اس کو اسی طرح پائے گا۔ چنانچہ تو غور کر، کیسی ابتداء کی ہے، یعنی جو امور اللہ اور اس کے رسول کی طرف منسوب ہوتے ہیں، ان کا واجب کرنا سارے امور پر متقدم ہو بغیر تقیید کے، پھر اس کے بعد اس شے سے نہی کی جو تقدیم کی جنس سے ہے، یعنی آواز کو بلند اور اونچا کرنا۔

پہلا امر تمھیں ہے دوسرے امر کے لیے۔ پھر جو اپنی آوازیں پست کرنے والے ہیں، ان کی تعریف اور ثنا کی، تاکہ یہ اس بات پر دال ہو کہ اللہ کے نزدیک آپ کا مرتبہ عظیم ہے۔ پھر اس کے بعد وہ شے ذکر کی جس کی برائی بہت زیادہ اور مکمل تھی، یعنی رسول اللہ ﷺ پر آپ کی خلوت کے حال میں دیوار کے باہر سے چیخنا، جیسے اس شخص پر چیختے ہیں جو وقعت کے لحاظ سے سب لوگوں سے زیادہ ذلیل ہے۔ یہ اس لیے بیان کیا، تاکہ اس بات کی برائی اور قباحت سے آگاہ فرمائے جس کی انھوں نے جرأت کی، اس لیے کہ اللہ پاک نے اس کے مرتبے کو اس سے بلند کیا ہے کہ اس سے اونچے لہجے میں بات کی جائے تو اُن لوگوں کا فعل اس مرتبے کا منکر ہوا اور بدی کی انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴾ یعنی اگر وہ تیرے نکلنے کا انتظار کرتے اور پکارنے کی جلدی نہ کرتے تو اُن کے دین و دنیا میں اُن کے لیے بہت بہتر تھا، کیوں کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حسنِ ادب کی رعایت ہے اور اس تعظیم اور تبجیل کا عمل ہے جس کے کہ آپ ﷺ مستحق ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ لوگ قیدیوں کے بارے میں سفارش کرنے آئے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے نصف کو تو آزاد کر دیا اور نصف کا فدیہ لیا اور اگر وہ صبر کرتے تو آپ ﷺ سب کو آزاد فرما دیتے۔[2] (ذکر معناه مقاتل) کسی نے، یعنی علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ ﴾ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اگر آپ ﷺ ان کی طرف بذاتِ خود نکلتے اور اُن کے بلانے سے نہ آتے تو بھی ان کے لیے لازمی تھا کہ صبر کرتے، یہاں تک کہ اس بات کو جان لیتے کہ آپ ﷺ کا نکلنا ان کی طرف ہے۔[3] ﴿ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ پاک بڑی مغفرت اور رحمت والا ہے، ایسے لوگوں سے

[1] تفسير النسفي (١٦٢/٤، ١٦٣) [2] فتح القدير (٨٠/٥) [3] تفسير النسفي (١٦٣/٤)

مواخذہ نہیں کرتا، اس بات پر جو اُن سے سرزد ہوگئی، یعنی بے ادبی اگر وہ توبہ اور رجوع الی اللہ کریں۔ ①

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ۝۶ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ۝۷ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۝۸

اے ایمان والو! اگر کوئی نافرمان تمھارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کرلیا کرو (تاکہ) تم کسی قوم کو نادانی سے تکلیف (نہ) پہنچاؤ کہ پھر تم اپنے کیے پر پچھتاتے پھرو ⑥ اور جان لو! بلاشبہہ تم میں اللہ کے رسول ہیں، اگر بہت سے معاملات میں وہ تمھاری اطاعت کریں (تو) یقیناً تم مشقت میں پڑ جاؤ، لیکن اللہ نے ایمان کو تمھارا محبوب بنا دیا ہے اور اس نے اسے تمھارے دلوں میں آراستہ پیراستہ کر دیا ہے اور اس نے تمھارے لیے کفر و فسق اور نافرمانی کو ناپسند بنا دیا ہے (اور) یہی لوگ رُشد و ہدایت والے ہیں ⑦ اللہ کے فضل اور احسان سے اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے ⑧

فاسق آدمی کی خبر بلا تحقیق قبول نہ کی جائے:

ایک شخص کو نبی کریم ﷺ نے ایک قوم سے زکاۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا، وہ قوم اُن کے استقبال کے لیے نکلی، اسلام سے پہلے اس قوم میں اور اس کی قوم میں عداوت تھی۔ یہ ڈرا کہ وہ لوگ میرے مارنے کو نکلے، الٹا بھاگا اور مدینے میں آکر مشہور کر دیا کہ فلاں قوم مرتد ہوگئی اور نبی اکرم ﷺ اُن پر فوج بھیج رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فاسق کی شہادت قابلِ قبول نہیں ہے۔ فاسق وہ ہے جس کا عمل خلافِ شریعت صاف ظاہر ہو، رسول اللہ ﷺ اللہ کے حکم پر چلتے ہیں، اسی میں تمھاری بہتری ہے۔ اگر وہ تمھاری بات مانتا رہے تو کس کس کی بات مانے، کیوں کہ ہر کوئی اپنے مطلب کی بات کہے گا۔ اس لیے اگر تمھارا مشورہ قبول نہ ہو تو برا نہ مانو۔ انتہی۔

① فتح البیان (۱۳/۱۳۴، ۱۳۵)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ فاسق کی اطلاع کی تثبیت اور تحقیق کر لینی چاہیے، اس لیے کہ اس کے لیے احتیاط کی جائے، تا کہ اس کی بات پر فیصلہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ فاسق نفس الامر میں کاذب اور خطا کار ہو تو اس کے قول پر فیصلہ کرنے والا بھی اسی کے پیچھے چلے گا، یعنی اس کا فیصلہ بھی غلط ہو گا، حالاں کہ اللہ عزوجل نے مفسدوں کی راہ کی پیروی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اسی جگہ سے علماء کے کئی گروہ مجہول الحال آدمی کی روایت کے قبول کرنے سے باز رہے ہیں، اس لیے کہ درحقیقت اس کے فسق کا احتمال ہے۔ اور دوسروں نے اس کو قبول کیا ہے، اس بنا پر کہ ہم کو جو حکم دیا گیا ہے وہ فاسق کی خبر کی تحقیق کا حکم دیا گیا ہے اور یہ شخص ایسا نہیں کہ جس کا فسق ثابت ہو، کیوں کہ وہ تو مجہول الحال ہے۔ ہم نے شرح بخاری کے کتاب العلم میں اس مسئلے کی تقریر کی ہے۔ وللہ تعالیٰ الحمد والمنة.

مفسروں میں سے اکثر نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت ولید بن عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بنی مصطلق کے صدقات وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ یہ بات کئی طریق سے مروی ہے اور تمام طرق سے بہترین طریق وہ ہے جس کو امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔ (من رواية مالك عن ابن المصطلق و هو الحارث بن ضرار بن أبي ضرار والد جويرة بنت الحارث أم المومنين) امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا: ’’حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَابِقٍ حَدَّثَنَا عِيسُ بْنُ دِينَارٍ حَدَّثَنِي أَبِي أَنَّهُ سَمِعَ الْحَارِثَ بْنَ ضِرَارٍ الْخُزَاعِيَّ رضی اللہ عنہ‘‘

حارث کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اسلام کی دعوت دی، چنانچہ میں اس میں داخل ہوا اور میں نے اس کا اقرار کیا اور مجھے زکات کی طرف بلایا تو میں نے اس کا اقرار کیا اور میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں لوٹتا ہوں، چنانچہ میں ان کو سلام کی طرف اور ادائے زکات کی طرف بلاؤں گا، پھر جو کوئی میرا کہنا مانے گا تو میں اس کی زکات جمع کروں گا اور اے اللہ کے رسول! آپ کوئی قاصد فلاں فلاں وقت میں میرے پاس بھیج دیں، تا کہ میں نے جو زکات جمع کی ہو، وہ آپ کے پاس لے آئے۔

پھر جب حارث نے زکات جمع کی ان لوگوں سے جنھوں نے اس کا کہنا مان لیا اور وہ وقت آ گیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ کیا کہ اس کی طرف بھیجیں، یعنی قاصد کو بھیجا تو وہ قاصد اس پر رک رہا اور اس کے پاس نہ آیا اور حارث نے یہ خیال کیا کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کوئی ناراضی ہو گئی ہے، چنانچہ اس نے اپنی قوم کے سرداروں کو طلب کیا اور اُن سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف قاصد بھیجنے کا ایک وقت مقرر کیا تھا، تا کہ میرے پاس جو زکات جمع ہو وہ آ کر لے جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے وعدہ خلافی نہیں ہو سکتی اور میں نہیں خیال کرتا ان کے قاصد کو روکنے کا، مگر کسی ناراضی کی وجہ سے، اس لیے تم ہمارے ساتھ چلو کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ کو حارث کی طرف بھیجا، تا کہ اس کے پاس جو زکات جمع ہو چکی ہے اسے لے لے۔ (اصل عبارت یہ ہے: ’’ليقبض ما كان عنده مما جمع من الزكاة‘‘ کلمہ ’’من‘‘ تبعیض کا نہیں بیانیہ ہے)

پھر جب ولید چلا، یہاں تک کہ راستے میں پہنچا تو ڈرا، پس واپس لوٹا، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! حارث نے مجھے زکات نہیں دی اور میرے قتل کا ارادہ کیا، آپ ﷺ خفا ہوئے اور حارث کی طرف لشکر بھیجا اور حارث اپنے اصحاب کو لے کر متوجہ ہوا، یہاں تک کہ جس وقت لشکر چل پڑا اور مدینے سے باہر نکلا تو حارث لشکر والوں کو ملا، وہ بولے کہ حارث یہ ہے۔ پھر جب حارث ان کے پاس آیا تو اُن سے کہا کہ تم کس کی طرف بھیجے گئے ہو؟ وہ بولے: تیری طرف۔ کہا: کیوں؟ بولے کہ رسول اللہ ﷺ نے تیری طرف ولید بن عقبہ کو بھیجا تو اس نے یہ خیال کیا کہ تو نے اس سے زکات روک لی اور اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ حارث نے کہا: نہیں۔ قسم ہے اس کی جس نے محمد ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا! نہ میں نے اسے دیکھا اور نہ وہ میرے پاس آیا، پھر جب حارث رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو نے زکات روکی اور میرے قاصد کے قتل کا ارادہ کیا۔ حارث نے عرض کی: نہیں۔ قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا! نہ میں نے اس کو دیکھا اور نہ وہ میرے پاس آیا اور میں نہیں متوجہ ہوا جب کہ رسول اللہ ﷺ کا قاصد مجھ تک نہیں پہنچا، مجھے اس بات کا ڈر ہوا کہ کہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کچھ ناراضی نہ ہوگئی ہو۔ راوی نے کہا: پھر سورۃ الحجرات نازل ہوئی:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ... إلىٰ قوله ... وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾[1] (ورواه ابن أبي حاتم عن المنذر بن شاذان التمار عن محمد بن سابق به و رواه الطبراني من حديث محمد بن سابق به غير أنه سماه الحارث بن سرار و الصواب أنه الحارث بن ضرار كما تقدم)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو واقعۂ حرب کے بعد بنی مصطلق کے صدقات وصول کرنے کے لیے بھیجا، چنانچہ قوم نے اس کے متعلق سنا تو اس کے استقبال کے لیے آئے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعظیم کرتے تھے۔ فرمایا: شیطان نے اس کے جی میں ڈالا کہ یہ اس کے قتل کا ارادہ کرتے ہیں، فرمایا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ آیا اور عرض کی کہ بنی مصطلق نے درحقیقت اپنے صدقات مجھ سے روک لیے۔ اس بات پر آپ ﷺ اور باقی مسلمان خفا ہوئے۔ پھر قوم کو اس کے واپس چلے جانے کی خبر پہنچی تو وہ آپ ﷺ کے پاس آئی اور آپ ﷺ کے لیے صف باندھی، جب آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھی تو عرض کی کہ ہم اللہ کی اور اس کے رسول کی ناراضی سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں، آپ نے ایک شخص ہماری طرف صدقہ لینے کے لیے بھیجا تو ہم اس سے خوش ہوئے اور اس سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں، پھر وہ شخص راستے ہی سے واپس آ گیا اور ہم ڈرے کہ کہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کوئی ناراضی نہ ہوئی ہو۔ پھر وہ آپ ﷺ سے

[1] مسند أحمد (٢٧٩/٤) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٠٣/١٠) المعجم الكبير (٢٧٤/٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجال أحمد ثقات" (مجمع الزوائد: ٢٣٨/٧)

باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ آئے اور عصر کی نماز کے لیے اذان دی، فرمایا: یہ اور یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا... الآیۃ ﴾[1]

نیز امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بطریق عوفی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ بن ابی معیط کو بنی مصطلق کی طرف بھیجا، تاکہ ان سے صدقات لے آئے۔ ان کے پاس جب یہ خبر آئی تو وہ خوش ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کے استقبال کے لیے نکلے۔ جب ولید سے یہ بیان کیا گیا کہ وہ اس کا استقبال کرنے کے لیے نکلتے ہیں تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف واپس چلا گیا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! بے شک بنی مصطلق نے صدقہ روک لیا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے سخت خفا ہوئے، پھر اس دوران میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جی سے باتیں کر رہے تھے کہ ان پر چڑھائی کریں کہ اچانک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اُن کے ایلچی آئے اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ کا قاصد آدھے راستے سے واپس آگیا اور ہم اس بات سے ڈرے کہ جس شے نے اس کو واپس کیا، وہ آپ کی طرف سے کوئی خط ہے جو اس کے پاس آیا ہے، آپ کی کسی ناراضی کے سبب سے کہ آپ ہم پر خفا ہوئے اور بے شک ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اس کی ناراضی اور اس کے رسول کی ناراضی سے۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خائن شمار کیا تھا اور اُن پر چڑھائی کرنے کا قصد فرمایا تھا۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کا عذر کتاب میں نازل فرمایا، چنانچہ فرمایا: ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا... إلیٰ آخر الآیۃ ﴾.[2]

امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ کو بنی مصطلق کی طرف بھیجا کہ ان سے صدقات لے آئے، مگر وہ لوٹ آیا اور کہا کہ بے شک بنی مصطلق نے آپ کے لیے لشکر جمع کیا ہے، تاکہ آپ سے لڑیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے اتنا زیادہ کہا ہے اور بے شک وہ اسلام سے پھر گئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ان کی طرف بھیجا اور ان کو حکم دیا کہ تثبت کریں، جلدی نہ کریں، پھر وہ چلے، یہاں تک کہ ان کے پاس رات کو آئے اور اپنے جاسوس بھیجے، پھر جب وہ آئے تو سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کو خبر دی کہ وہ تو اسلام کو خوب پکڑے ہوئے ہیں اور انھوں نے ان کی اذان ونماز سنی ہے، پھر جب صبح کو اٹھے تو خالد رضی اللہ عنہ اُن کے پاس آئے اور وہ شے دیکھی جو اُن کو خوش کرے، یعنی ان کو پورا مسلمان پایا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف واپس گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: «اَلتَّثَبُّتُ مِنَ اللّٰهِ وَالْعُجْلَةُ مِنَ الشَّیْطَانِ» اور اسی طرح سلف میں سے کئی ایک اہلِ علم نے ذکر کیا ہے۔ ان میں سے امام ابن ابی لیلیٰ، یزید بن رومان، ضحاک،

---

[1] تفسیر الطبري (۲۲/۲۸۶، ۲۸۷) اس کی سند میں ''موسی بن عبیدہ'' ضعیف راوی ہے۔
[2] تفسیر الطبري (۲۲/۲۸۷) اس کی سند میں مسلسل بالضعفاء ہے۔

مقاتل بن حیان رحمہ اللہ وغیرہم ہیں جو اس آیت کے بارے میں یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ولید بن عقبہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ واللہ أعلم.[1]

اطاعتِ رسول کے ذریعے تعظیمِ رسول کا حکم:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﴾ یعنی تم جان لو کہ تمھارے درمیان اللہ کا رسول ہے، اس لیے اس کی تعظیم اور توقیر کرو اور اس کے ساتھ باادب رہو اور اس کے حکم کے مطیع اور فرمانبردار رہو، اس لیے کہ وہ تمھاری بہتری کو خوب جانتا ہے اور تم سے بڑھ کر تم پر شفیق اور مہربان ہے۔ اور اس کی رائے تمھارے حق میں زیادہ تر پوری ہے بہ نسبت اپنے متعلق تمھاری اپنی رائے کے۔ جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ﴾ [الأحزاب: ٦] ''پیغمبر مومنوں پر خود ان سے بھی زیادہ حق رکھنے والے ہیں۔''

پھر یہ بیان فرمایا کہ ان کی رائے بودی ہے بہ نسبت ان کے مصالح کی رعایت کرنے کے۔ چنانچہ فرمایا: اگر وہ تمھارا کہنا مانتا تو یہ تمھیں مشقت اور تنگی میں ڈال دیتا، جیسا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ [المومنون: ٧١] ''اگر حق ہی ان کی خواہشوں کا پیرو ہو جائے تو زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی ہر چیز درہم برہم ہو جائے۔ حق تو یہ ہے کہ ہم نے انھیں ان کی نصیحت پہنچا دی ہے، لیکن وہ اپنی نصیحت سے منہ موڑنے والے ہیں۔''

وقولہ تعالیٰ: ﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ﴾ لیکن اللہ نے ایمان کو تمھارے نفوس کی طرف محبوب کر دیا اور اس کو تمھارے دلوں میں اچھا کر دکھایا۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اسلام علانیہ ہے اور ایمان دل میں ہے، کہا: پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دستِ مبارک سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ تقویٰ یہاں ہے، تقویٰ یہاں ہے۔[2] اور مبغوض کر دیا تمھاری طرف کفر و فسوق و عصیان کو۔ فسوق سے مراد بڑے بڑے گناہ ہیں اور عصیان سے مراد سارے معاصی ہیں، یہ کمال نعمت کے مدارج مقرر کیے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کو درجہ بدرجہ پورا کیا۔ سب سے بڑھ کر بری چیز کفر ہے، اس کو سب سے پہلے مبغوض کیا، پھر کبائر کو پھر دوسرے گناہوں کو۔

﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ﴾ یعنی وہ لوگ جو ان صفات کے حامل ہیں، وہی نیک چال والے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے نیک چلنی دی۔ امام احمد رحمہ اللہ نے ابو رفاعہ زرقی عن ابیہ سے روایت کیا ہے، کہا: جب اُحد کا دن ہوا اور مشرک منقلب ہوئے (یعنی پلٹ کر آئے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ برابر ہو جاؤ، یہاں تک کہ میں اپنے رب عزوجل

---

[1] تفسیر الطبري (٢٢/٢٨٧-٢٨٩) تفسیر ابن کثیر (٤/٢٦٦)

[2] مسند أحمد (٣/١٣٤) اس کی سند میں ''علی بن مسعدۃ'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٩٠٦)

کی ثنا کروں تو وہ آپ کے پیچھے صفیں ہو گئے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كُلُّه، اَللّٰهُمَّ لَا قَابِضَ لِمَا بَسَطْتَّ، وَلَا بَاسِطَ لِمَا قَبَضْتَ، وَلَا هَادِيَ لِمَنْ أَضْلَلْتَ، وَلَا مُضِلَّ لِمَنْ هَدَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلَا مُقَرِّبَ لِمَا بَاعَدْتَّ، وَلَا مُبَاعِدَ لِمَا قَرَّبْتَ، اَللّٰهُمَّ ابْسُطْ عَلَيْنَا مِنْ بَرَكَاتِكَ وَرَحْمَتِكَ وَفَضْلِكَ وَرِزْقِكَ، اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ النَّعِيْمَ الْمُقِيْمَ الَّذِيْ لَا يَحُوْلُ وَلَا يَزُوْلُ، اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ النَّعِيْمَ يَوْمَ الْعَيْلَةِ وَالْأَمْنَ يَوْمَ الْخَوْفِ، اَللّٰهُمَّ إِنِّي عَائِذٌ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا أَعْطَيْتَنَا وَمِنْ شَرِّ مَا مَنَعْتَنَا، اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ إِلَيْنَا الْإِيْمَانَ وَزَيِّنْهُ فِيْ قُلُوْبِنَا وَكَرِّهْ إِلَيْنَا الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ وَاجْعَلْنَا مِنَ الرَّاشِدِيْنَ، اَللّٰهُمَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَأَحْيِنَا مُسْلِمِيْنَ وَأَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِيْنَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ، اَللّٰهُمَّ قَاتِلِ الْكَفَرَةَ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ رُسُلَكَ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِكَ وَاجْعَلْ عَلَيْهِمْ رِجْزَكَ وَعَذَابَكَ، اَللّٰهُمَّ قَاتِلِ الْكَفَرَةَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ إِلٰهَ الْحَقِّ»[1] (رواه النسائي في اليوم والليلة عن زياد بن أيوب عن مروان بن معاوية عن عبدالوحد بن أيمن عن عبيد بن رفاع عن أبيه به)

حدیثِ مرفوع میں ہے کہ جس کو اس کی نیکی اچھی لگے اور اس کی برائی بری لگے تو وہ مومن ہے۔[2] پھر فرمایا: ﴿ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ یعنی یہ عطا جو تم کو دی گئی ہے، یہ اس کی طرف سے تم پر فضل ہے اور اس کے پاس سے نعمت ہے۔ اور اللہ اس شخص کو خوب جانتا ہے جو ہدایت کا مستحق ہے، اس سے جو گمراہی کا مستحق ہے، وہ اپنے اقوال و افعال و شرع و قدر میں حکمت والا ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ جمہور نے "تبیّن" سے ﴿ فَتَبَيَّنُوْٓا ﴾ پڑھا ہے اور امام حمزہ اور کسائی رحمہ اللہ نے "فَتَثَبَّتُوْا" پڑھا ہے "تَثَبُّت" سے۔[4] "تبیّن" سے مراد تعرف و تفحص ہے، یعنی خوب تحقیق و تلاش کرنا اور "تثبت" سے مراد حلم و بردباری و عدمِ عجلت ہے اور امرِ واقع اور اس خبر میں جو پہنچے خوب غور کرنا ہے، یہاں تک کہ وہ ظاہر اور واضح ہو جائے۔ "فاسق" اور "نبا" کے نکرہ لانے میں عموم ہے فساق و اخبار میں، گویا یوں کہا ہے کہ کوئی سا فاسق کوئی بھی خبر تمھارے پاس لے کر آئے تو تم اس میں توقف کرو اور اس معاملے کی حقیقت اور تہ تک پہنچنے کی خوب کوشش کرو اور فاسقوں کی بات پر اعتماد نہ کر بیٹھو، اس لیے کہ جو شخص فسق سے نہیں بچتا تو وہ جھوٹ سے بھی نہیں بچے گا جو فسق ہی کی ایک قسم ہے۔ فسوق شے سے خارج ہونے کو کہتے ہیں، محاورے میں بولتے ہیں:

---

[1] مسند أحمد (٤٢٤/٣) سنن النسائي الكبرىٰ (١٥٦/٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٦٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٣٨٧/٥) صحيح الجامع (٢٥٤٦)

[3] تفسير ابن كثير (٢٦٤/٤_٢٦٧) [4] تفسير القرطبي (٣١٢/١٦)

"فَسَقَتِ الرَّطْبَةُ عَنْ قِشْرِهَا" یعنی تر کھجور اپنے پوست سے نکل آئی۔

من جملہ اس کے مقلوب کے "قَفَسَتِ الْبَيْضَةُ إِذَا كَسَرْتَهَا" ہے، یہ اس وقت بولتے ہیں کہ تو انڈے کو توڑ ڈالے اور اس میں جو سفیدی اور زردی ہے اس کو نکال دے۔ اور اس کے مقلوب میں سے "قَفَسْتُ الشَّيْءَ" ہے، یہ اس وقت بولے گا جب توشے کو اس کے مالک کے ہاتھ سے غصب کر کے نکال لے۔ پھر کبائر کا ارتکاب کر کے میانہ روی سے نکلنے میں فسوق کا استعمال کیا گیا۔ مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت ولید بن عقبہ کے حق میں نازل ہوئی ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

﴿ اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ ﴾ مفعول لہ ہے: "أَيْ: كَرَاهَةَ أَنْ تُصِيبُوا أَوْ لِئَلَّا تُصِيبُوا" یعنی اس بات کی کراہت کے لیے کہ پہنچو تم یا تم نہ پہنچو کسی قوم کو نادانی سے قتل اور قید کرنے کے ساتھ، اس لیے کہ جس نے بات کی تحقیق نہیں کی اور اس میں غور وفکر نہیں کیا تو زیادہ امکان ہے کہ اس میں خطا ہو اور یہ بات جہالت ہے، کیوں کہ علم سے صادر نہیں ہوئی۔ ﴿ بِجَهَالَةٍ ﴾ بہ اعتبار متعلق کے حال ہے: "أَيْ: مُتَلَبِّسِينَ بِجَهَالَةٍ بِحَالِهِمْ" یعنی کسی قوم پر اس حال میں جا پڑو کہ ان کے حال کو جانتے نہیں ہو۔

﴿ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ﴾ یعنی پھر تم اس کام پر جو تم نے ان کے ساتھ کیا، یعنی خطا سے ان پر جا پڑے، پشیمان ہونے والے اور رنج وغم کرنے والے۔ اس آیت کریمہ میں اکیلے عادل آدمی کی خبر کو قبول کرنے پر دلیل ہے، کیوں کہ اگر ہم نے اس کی خبر میں توقف کیا تو ہم نے اس کے اور فاسق کے درمیان برابری کی اور فاسق کے ساتھ جو تخصیص کی گئی تھی کہ اس کی خبر کی خوب تحقیق کر لی جائے، اس کا کوئی فائدہ نہ رہا، حالاں کہ ایسا ہونا نہیں چاہیے۔

پھر اللہ پاک نے ان کو وعظ کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ ﴾ ("أن" اور جو اس کے حیز، یعنی جگہ میں ہے، قائم مقام دو مفعول ﴿ اِعْلَمُوْٓا ﴾ کے ہے) یعنی جان لو کہ تم میں اللہ کا رسول ہے تو کوئی باطل بات مت کہو اور اپنے پاس کوئی خبر پہنچنے پر بغیر تحقیق کے جلدی مت کرو، کیوں کہ اللہ اپنے رسول کو خبر دے گا تو جھوٹے کا پردہ اُٹھ جائے گا۔ یا یہ معنی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرو اور ان کی رائے طلب کرو۔

پھر استیناف کر کے فرمایا: ﴿ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ ﴾ (یا یہ جملہ حال ہے: "فیکم" کی ضمیر سے) یعنی بہت سی باطل خبریں جو تم اسے دیتے ہو اور غلط مشورے جو تم بتاتے ہو اگر وہ ان میں تمھارا کہا مانا کرے تو تم عنت میں پڑ جاؤ۔ عنت کے معنی ہیں تکلیف و جہد و گناہ و مشقت اور ہلاکت، لیکن جن کاموں کا تم ارادہ کرتے ہو، اُن کے اکثر میں وہ تمھارا کہنا نہیں مانتا، اس سے پہلے کہ اس کی وجہ اس پر واضح ہو جائے اور جو خبر اسے پہنچتی ہے اس پر عمل کرنے کے لیے جلدی نہیں کرتا اس سے قبل کہ اس میں غور وفکر کرے۔ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے یہ آیت پڑھی اور کہا یہ تمھارے نبی ہیں کہ ان کی طرف وحی کی جاتی ہے اور تمھارے بہترین امام ہیں، اگر

وہ بہت سے کاموں میں ان کا کہا مانیں تو مشقت میں پڑ جائیں پھر آج کے دن تمھارا کیا حال ہے۔[1] (أخرجه الترمذي وقال: حديث حسن صحيح غريب)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمٰنَ ﴾ یعنی اللہ نے تمھارے لیے تمام اشیاء میں سے محبوب ترین شے ایمان کو کر دیا۔ سو تم سے صرف وہی چیز واقع ہوتی ہے جو ایمان کے مطابق ہے اور جس کا ایمان مقتضی ہے۔ یعنی نیک کاموں کا کرنا اور خبروں پر جلدی کرنے کو چھوڑنا اور اُن میں تحقیق اور تحمل کا طرزِ عمل اختیار کرنا۔ غرضیکہ یہ امور ایمان کے موافق ہیں اور اُن کا مقتضی، اس لیے تم سے یہی واقع ہوتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان لوگوں سے مراد پہلے لوگ نہیں ہیں، بلکہ ان کے علاوہ ہیں، اس لیے کہ ان کی اگلوں کے اوصاف سے براءت بیان کی گئی ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ ﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمٰنَ ﴾ کل کو وہ شے یاد دلانا ہے جس کا کہ ایمان مقتضی ہے اور جس کو ایمان کی محبت واجب کرتی ہے، کون سی محبت؟ جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رکھا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ ﴿ لٰكِنَّ ﴾ میں یہ شرط ہے کہ اس کا ما بعد ما قبل سے نفی و اثبات میں مخالف ہوتا ہے اور یہاں ایسا نہیں ہے تو کہیں گے کہ وہ شرط لفظ کی حیثیت سے موجود نہیں ہے اور معنی کے لحاظ سے حاصل ہوتی ہے، اس لیے کہ جن لوگوں کو ایمان محبوب کیا گیا تو اُن کی صفت مغائر (باہم غیر ہونا) ہوئی، ان لوگوں کی صفت کے جن کا پہلے ذکر ہو چکا۔ پس بایں معنی ﴿ لٰكِنَّ ﴾ کا جو استدراک کا موقع ہے، وہ اسی میں واقع ہوا ہے، یہ کرخی کا حاصل ہے۔

شیخ زادہ نے کہا ہے کہ یہ بات مبنی ہے اس تقدیر پر کہ ﴿ لَوْ يُطِيْعُكُمْ ﴾ کے مخاطب وہ لوگ ہوں جنھوں نے فاسق کی خبر پر اعتماد کیا، اس کے مقتضیٰ کے مطابق عمل کرنے کے لیے۔ اور ﴿ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمٰنَ ﴾ کے مخاطب کامل مومن ہوں جنھوں نے اس پوری بات پر اعتماد نہیں کیا جس کو سنا۔ اسی کی تائید امام قرطبی رحمہ اللہ کا قول بھی کرتا ہے کہ یہ مومنین مخلصین کو خطاب ہے جو نبی ﷺ پر جھوٹ نہیں بولتے اور نہ آپ ﷺ کو باطل خبر دیتے ہیں۔[2] والله أعلم وعلمه أتم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ﴾ یعنی اور حسین کر دیا ایمان کو اپنی دی ہوئی توفیق اور تم سے قرب کے سبب سے اور اس کو تمھارے دلوں میں داخل کر دیا، یہاں تک کہ تم اسی راستے پر چلے جس کا ایمان مقتضی ہے اقوال و افعال میں اور تمھارے نزدیک ہر اس شے کو مکروہ اور ناپسندیدہ کر دیا جو کفر و فسق و عصیان کی جنس سے ہے۔ فسق کی اصل اطاعت سے باہر نکل جانا ہے اور عصیان اس شے کی جنس ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جاتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد خاص طور پر جھوٹ ہے، لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٦٩) [2] تفسير القرطبي (٣١٤/١٦)

لطیفہ:

اس آیتِ کریمہ میں ایک لطیفہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے ایمان کامل کے مقابلے میں ان تین چیزوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ایمان کامل وہ ہے جس میں تین باتیں جمع ہوں: اقرار باللسان، تصدیق بالجنان اور عمل بالارکان۔ سو کفر کی کراہت تو ایمان کی محبت کے مقابلے میں ہے اور دلوں میں ایمان کو زینت دینا یہ دل کے ساتھ تصدیق کرنا ہے اور فسوق یعنی جھوٹ اقرار باللسان کے مقابلے میں ہے اور عصیان عمل بالارکان کے مقابلے میں ہے۔

﴿ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ﴾ یعنی وہ لوگ جو مذکوہ اوصاف کے حامل ہیں وہی ہیں جو حق کے راستے کو پہنچے اور استقامت اور راستی سے مائل نہ ہوئے، دور نہ ہوئے۔ رشد طریقِ حق پر سختی سے استقامت کو کہتے ہیں، یہ ماخوذ ہے ''رشادۃ'' سے۔ ''رشادۃ'' بہ معنی پتھر ہے، اس جملے میں صیغۂ خطاب سے صیغۂ غائب کی طرف پھرنا ہے مدح کے لیے۔

﴿ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً ﴾ مفعول لہ ہے ﴿ حَبَّبَ ﴾ کا، یعنی تمھاری طرف محبوب کر دیا جو کچھ کہ محبوب کیا اور تمھاری طرف مکروہ کر دیا جو کچھ کہ مکروہ کیا۔ یہ سب اپنے فضل اور انعام کے طور پر کیا۔ یا یہ معنی ہیں کہ تم کو فضل و نعمت کے طور پر راشد کر دیا۔ کسی نے کہا: تقدیر یہ ہے ''تبتغون فضلًا ونعمۃ'' یعنی تم فضل و نعمت کو طلب کرتے ہو۔ ﴿ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴾ یعنی اللہ خوب جاننے والا ہے ہر معلوم شے کو اور اپنے کام میں حکمت والا ہے اور ہر اس شے میں حکمت والا ہے جس کا اپنے بندوں میں فیصلہ کرتا ہے اور جس کو ان کے لیے مقدر فرماتا ہے۔[1]

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۖ فَإِن
بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ
إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ ۚ فَإِن فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ
اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝٩ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ۚ
وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝١٠

اور اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر (ان) دونوں میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے، تو تم اس سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، حتی کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے، پھر اگر وہ لوٹ آئے تو تم ان دونوں کے درمیان عدل (حق) کے ساتھ صلح کرا دو اور تم انصاف کرو، بلاشبہہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ⑨

[1] فتح البیان (۱۳/۱۳۶۔۱۳۹)

مومن تو (ایک دوسرے کے) بھائی ہیں، لہٰذا تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو، اور تم اللہ سے ڈرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے ⑩

مومن اگر لڑ پڑیں تو صلح کروا دو:

یعنی جب شرع کے حکم کے تابع ہوں تو انصاف سے صلح کرا دو۔ کسی ایک کی طرف داری نہ کرو، یہ حکم ہے خانہ جنگی کا جو مسلمان آپس میں لڑ پڑیں۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دو فرقوں میں جو ایک دوسرے سے لڑنے لگ جائیں، ان کے درمیان صلح کرانے کا حکم فرماتا ہے۔ اور اگر مسلمانوں کے دو فرقے آپس میں لڑ پڑیں تو اُن میں ملاپ کرا دو۔ باوجود لڑنے کے اللہ تعالیٰ نے ان کا نام مومنین رکھا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مومن معصیت کے سبب سے ایمان سے خارج نہیں ہو جاتا، گو وہ گناہ بڑے ہی کیوں نہ ہوں۔ ویسا نہیں ہے جیسا کہ خوارج کہتے ہیں اور وہ لوگ کہتے ہیں جو معتزلہ اور ان جیسے اور لوگوں میں سے ان کے تابع ہوئے ہیں۔

اسی طرح صحیح بخاری میں یہ حدیثِ حسن عن ابی بکرہ رضی اللہ عنہ ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن خطبہ پڑھا اور منبر پر آپ ﷺ کے ساتھ حسن رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے شروع کیا، ایک دفعہ اُن کی طرف نظر کرتے تھے اور دوسری بار لوگوں کی طرف نظر کرتے تھے اور فرماتے تھے میرا یہ بیٹا سید ہے اور شاید اللہ تعالیٰ اس کے سبب سے مسلمانوں کے دو فرقوں میں صلح کرائے گا۔ اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں: «لَعَلَّ اللّٰهَ تَعَالٰی أَنْ يُّصْلِحَ... الخ»[1] یعنی امید ہے اس بات کی کہ صلح کروا دے اللہ۔ پھر ویسا ہی ہوا جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے سبب سے اہلِ شام اور اہلِ عراق کے درمیان طویل لڑائیوں اور ہولناک واقعات کے بعد صلح کرا دی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ یعنی پھر اگر اُن میں سے ایک دوسرے پر چڑھا جائے تو سب مل کر اس چڑھنے والے سے لڑو، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے امر کی طرف رجوع کرے اور حق کو سنے اور مانے، جیسا کہ صحیح میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تو اپنے بھائی کی مدد کر، وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! مظلوم کی تو میں نے مدد کی۔ ظالم کی مدد کیسے کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تو اس کو ظلم سے روکے تو یہی تیرا اس کی مدد کرنا ہے۔[2]

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے عرض کی گئی: کاش! آپ عبداللہ بن ابی کے پاس تشریف لے چلیں تو آپ ﷺ اس کی طرف چلے اور آپ ﷺ گدھے پر سوار ہوئے اور مسلمان آپ ﷺ

① صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۵۵۷) ② صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲٥٥٢)

کے ساتھ پیدل چلے اور وہ زمین شور تھی، پھر جب آپ ﷺ عبداللہ کے پاس آئے تو وہ بولا: ''إِلَيْكَ عَنِّيْ فَوَ اللّٰهِ لَقَدْ آذَانِيْ رِيْحُ حِمَارِكَ'' یعنی تو میرے پاس سے ہٹ جا، اللہ کی قسم! البتہ مجھے درحقیقت تیرے گدھے کی بو نے ستایا تو انصار کا ایک شخص بولا: اللہ کی قسم! البتہ رسول اللہ ﷺ کا گدھا تجھ سے زیادہ اچھی خوشبو والا ہے۔ کہا: پھر عبداللہ کی وجہ سے اس کی قوم کے کئی لوگ خفا ہوئے، پھر ان دونوں میں سے ہر ایک کے لیے اس کے اصحاب نے غصہ کیا، کہا: پھر وہ آپس میں کھجور کی ٹہنیوں، ہاتھوں اور جوتوں کے ساتھ ایک دوسرے کو مارنے لگے، ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ یہ آیت ان کے بارے میں نازل کی گئی: ﴿ وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ... ﴾[1] (ورواه البخاري في الصلح عن مسدد ومسلم في المغازي عن محمد بن عبد الأعلىٰ كلاهما عن المعتمر بن سليمان عن أبيه به نحوه)

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ اوس اور خزرج کی آپس میں لڑائی ہوئی تھی سعف ونعال سے (یعنی کھجور کی شاخیں اور جوتیاں) اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری اور اُن کے درمیان صلح کا امر فرمایا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انصار کا ایک شخص تھا اس کو عمران کہتے تھے، اس کی ایک عورت تھی جس کو اُم زید کہہ کر پکارتے تھے، اس عورت نے ارادہ کیا کہ اپنے گھر والوں سے ملاقات کرے، اس کے خاوند نے اسے روکا اور اسے ایک اپنے بالا خانے میں رکھا کہ اس کے لوگوں میں سے کوئی اس پر داخل نہ ہو۔ اس عورت نے اپنے لوگوں کی طرف آدمی بھیجا تو اس کی قوم آئی اور اس کو اتار لیا، تاکہ اس کو لے جائیں اور وہ شخص کہیں چلا گیا تھا، گھر میں نہیں تھا تو اس کے گھر والوں نے مدد چاہی تو اس کے چچا کی بیٹی آئی، تاکہ عورت کے اور اس کے لوگوں کے درمیان حائل ہو، پھر باہم ایک دوسرے کو دور کیا اور آپس میں خوب جوتم پے زار ہوئی تو اُن کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف آدمی بھیجا اور اُن کی آپس میں صلح کرا دی اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوئے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ یعنی پھر اگر وہ فرقہ رجوع ہو تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور ان کے درمیان اس شے میں عدل کرو اور قسط کے ساتھ جس کو ان کا بعض پہنچا بعض کے لیے۔ قسط عدل کو کہتے ہیں، بے شک اللہ عدل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک دنیا میں عدل کرنے والے اللہ عزوجل کے سامنے موتیوں کے منبروں پر ہوں گے، اس وجہ سے کہ انھوں نے دنیا میں عدل کیا۔[3] (ورواه النسائي عن محمد بن المثنى عن عبد الأعلى به وهذا إسناد جيد قوي رجاله على شرط الصحيح)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٩٩) مسند أحمد (١٥٧/٣)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٠٤/١٠)

[3] سنن النسائي الكبرىٰ (٤٦٠/٣) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٠٤/١٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو ''شاذ'' کہا ہے اور مفصل بحث کی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٣٤٤)

اور عن عبداللہ بن عمرو عن النبی ﷺ روایت کیا ہے کہ قیامت کے دن مقسطین اللہ تعالیٰ کے نزدیک عرش کے داہنی جانب نور کے منبروں پر ہوں گے، یہ لوگ اپنے فیصلے میں اور اپنے گھر والوں میں اور اس شے میں جس کے وہ والی ہوئے، عدل کرتے ہیں۔[1] (ورواه مسلم والنسائي من حديث سفيان بن عيينة به)

اخوتِ اسلامیہ کا بیان:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ یعنی سارے مومن دین میں بھائی ہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ'' یعنی مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ خود اس پر ظلم کرے اور نہ اس کو دوسرے کے حوالے کرے کہ وہ اس پر ظلم کرے۔[2] صحیح میں ہے کہ اللہ بندے کی مدد میں ہے جب تک کہ وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں ہے۔[3] نیز صحیح میں ہے کہ جس وقت مسلمان نے اپنے بھائی کے لیے اس کی غیر حاضری میں دعا کی تو فرشتے نے کہا: آمین اور تیرے لیے بھی اس کے مثل ہو۔[4] اس بارے میں بہت سی حدیثیں ہیں۔ صحیح میں ہے کہ مومنوں کی مثال اپنی باہم دوستی اور رحم و وصل و پیوند کرنے میں ایک جسم کی مثل ہے کہ جس وقت اس میں سے کوئی عضو بیمار ہو جائے تو وہ اس کے لیے باقی جسم کو بخار اور بے خوابی کے ساتھ بلاتا ہے۔[5] مطلب یہ ہے کہ ایک عضو کی بیماری سے سارا جسم تپ زدہ اور بے خواب ہو جاتا ہے، گویا اس کی غم خواری میں شریک ہونے کے لیے سارے عضو ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔

نیز صحیح میں ہے کہ مومن دوسرے مومن کے لیے دیوار کی طرح ہے کہ اس کا بعض حصہ بعض کو مضبوط کرتا ہے اور آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کے درمیان تشبیک کی۔[6] امام احمد رحمہ اللہ نے ابو حازم رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا میں نے سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہما سے سنا، وہ حدیث بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک اہلِ ایمان میں مومن اسی طرح ہے جس طرح ایک جسم میں سر ہوتا ہے کہ مومن ایمان والوں کے لیے ایسے درد ناک ہوتا ہے، جیسے پورا جسم اس تکلیف کے لیے درد ناک ہوتا ہے جو سر میں ہوتی ہے۔[7] (تفرد به أحمد و لا بأس بإسناده)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ یعنی دو لڑنے والے گروہوں کے درمیان صلح کرا دو اور اپنے سارے کاموں میں اللہ سے ڈرو شاید تم پر رحم کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس شخص کے

---

(1) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٢٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٣٧٩)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٠)

(3) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٩٩) (4) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٣٢)

(5) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٦)

(6) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٧) صحيح مسلم (٢٥٨٥) (7) مسند أحمد (٣٤٠/٥) صحيح الجامع (٦٦٥٩)

لیے رحمت کا حق ہونا ہے جو اللہ سے ڈرا۔ مطلب یہ ہے کہ کلمۂ "لعل" اللہ پاک کی طرف سے تحقیق کے لیے ہوتا ہے۔ ①

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ جمہور نے ﴿ اِقْتَتَلُوْا ﴾ بہ صیغۂ جمع پڑھا ہے "طائفتین" کے تمام افراد کے اعتبار سے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا ﴾ [الحج: ١٩] ''یہ دونوں اختلاف کرنے والے ہیں۔'' علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جمع کا صیغہ معنی پر محمول کرنے کے لیے ہے، اس لیے کہ "طائفتین" قوم اور ناس کے معنی میں ہے۔ ② اور ﴿ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ﴾ میں "طائفتین" کے لفظ کا خیال کر کے تثنیہ کیا ہے۔ ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے ﴿ طَآىِٕفَتٰنِ ﴾ کے لفظ کا اعتبار کر کے "اِقْتَتَلَتَا" پڑھا ہے اور زید بن علی اور عبید بن عمیر نے "اِقْتَتَلَا" پڑھا ہے فعل کو مذکر کر کے فریقین یا رھطین کے اعتبار سے۔ ③

"بغي" سے مراد تعدی ہے بغیر حق کے اور صلح سے باز رہنا ہے جو درست عمل ہے اور استطالت و ظلم ہے (یہ بھی "بغي" کے معنی میں داخل ہے) "فيء" بمعنی رجوع ہے اور ظل اور غنیمت کا نام بھی فے رکھا جاتا ہے، اس لیے کہ ظل سورج کے چلے جانے کے بعد ہوتا ہے اور غنیمت وہ شے ہے جو کفار کے اموال سے مسلمانوں کی طرف رجوع ہوتی ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جس وقت مسلمانوں کے دو فریق لڑیں تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ ان کے درمیان صلح کرانے کی سعی کریں اور ان کو اللہ کے حکم کی طرف بلائیں، پھر اگر اس کے بعد ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے اور صلح قبول نہ کرے اور نہ اس میں داخل ہو اور نہ نصیحت کا کوئی اثر لے اور اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے سے انکار کرے تو مسلمانوں کے لیے لازمی ہے کہ اس باغی گروہ سے لڑیں، یہاں تک کہ وہ کتاب اللہ کے فیصلے کی طرف رجوع ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ صلح میں اس بات کی اطاعت کی طرف رجوع ہو جس کا اس کی کتاب نے امر فرمایا ہے۔

کلمۂ ﴿ حَتّٰى ﴾ انتہا کے لیے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "کَيْ" کے معنی میں ہے تو اب تعلیل کے لیے ہوگا، لیکن آیت کے سیاق سے مناسب اور ظاہر وہی ہے جو پہلے مذکور ہوا۔ جیسا کہ بعض نے کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں کو امر فرمایا ہے کہ جب مومنوں کا ایک گروہ لڑے تو ان کو اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف بلائیں اور بعض کا بعض سے انصاف کریں، پھر جب وہ قبول کریں تو اُن کے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کریں، یہاں تک کہ مظلوم بدلہ لے، پھر اُن میں سے جو اس فیصلے کو قبول کرنے سے انکار کرے تو وہ باغی ہے اور امام کا حق ہے کہ وہ ان سے لڑے، یہاں تک کہ وہ امر اللہ کی طرف رجوع ہوں اور اللہ کے فیصلے کو مان لیں اور تسلیم کر لیں۔ ④

---

① تفسير ابن كثير (٢٦٧/٤، ٢٦٨) ② تفسير النسفي (١٦٤/٤) ③ فتح القدير (٨٣/٥، ٨٤) ④ تفسير الطبري (٢٩٢/٢٢، ٢٩٣)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے اپنے جی میں کسی شے سے وہ نہیں پایا جو کچھ میں نے اس آیت سے پایا کہ میں اس باغی گروہ سے نہ لڑا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے[1] (ان کی غرض یہ ہے کہ مجھے باغی فرقہ سے نہ لڑنے کا رنج ہوا، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے امر فرمایا ہے۔ وہ احتیاط کے طور پر لڑائی میں شریک نہ تھے) حاصل یہ ہے کہ باغی فرقے کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اس سے لڑنا واجب ہے، جب تک وہ لڑے، پھر جب باز رہے اور اپنے ہاتھ لڑائی سے روک لے تو چھوڑ دیا جائے۔ اور ﴿ اَمْرِ اللّٰهِ ۚ ﴾ سے مراد صلح اور کینہ اور عداوت کا زائل ہونا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ﴾ یعنی پھر اگر وہ باغی گروہ اپنی بغی سے حق کی طرف رجوع ہو اور اللہ کے حکم کی طرف رجوع ہو اور اس کو جو کتاب اللہ کے حکم کی طرف دعوت دی ہے، اسے قبول کرے تو ان دونوں گروہوں میں عدل کے ساتھ نصیحت کرنے اور اللہ کے حکم کی طرف بلانے کے ساتھ صلح کرا دو اور صرف اسی کو کافی نہ سمجھو کہ انھوں نے باہم ایک دوسرے سے لڑنا چھوڑ دیا، شاید وہ کسی اور وقت میں پھر لڑنا شروع کر دیں۔ یعنی پس مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ دو گروہوں کے درمیان فیصلہ کرتے وقت عدل کریں اور اللہ کے حکم کے مطابق جو درست بات ہے اس کا قصد کریں اور ظالم گروہ کا ہاتھ پکڑیں، یہاں تک کہ وہ ظلم سے باز آجائے اور اس پر دوسرے گروہ کا جو حق واجب ہے اس کو ادا کرے۔

امام حسن، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ان دونوں میں ملاپ کرا دو اس طرح سے کہ ان کو کتاب اللہ کے فیصلے کی طرف بلاؤ اور انھیں اُن کے حقوق اور فرائض کے متعلق بتاؤ، تاکہ وہ اس سے راضی اور خوش ہوں، پھر اگر اُن میں سے ایک گروہ سرکشی کرے اور جو اس کا حق نہیں ہے اس کو طلب کرے اور صلح کی طرف رجوع نہ ہو تو تم اس سے لڑو جو سرکشی کرتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کی اطاعت اور صلح کی طرف لوٹ آئے جس کا اس نے امر فرمایا ہے۔[2] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نے اس شے کی طرح کوئی شے نہیں دیکھی جو اس آیت میں ہے جس سے اس اُمت نے اعراض کیا۔[3] غرض یہ کہ اول تو اللہ تعالیٰ نے وہ عدل بیان کیا جو دو لڑنے والے فرقوں کے ساتھ خاص ہے اور اس کا حکم دیا۔

پھر مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ اپنے تمام کاموں میں عدل کریں، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَاَقْسِطُوْا ۭ ﴾ یعنی عدل کا برتاؤ کرو۔ "قسط" بہ معنی ظلم و عدل آتا ہے، لیکن جو "قسط" بہ معنی عدل ہے اس کا فعل "أَقْسَطَ" ابوابِ رباعی میں سے ہے اس کا ہمزہ سلب کے لیے ہے، "أَقْسَطَ" کے معنی یہ ہیں کہ "قسط" کو زائل کر دیا اور "قسط" بہ معنی ظلم ہے۔ اور قسط جو ابوابِ ثلاثی سے ہے، اس کے معنی ظلم کے ہیں۔

---

① مستدرك الحاكم (١٢٥/٣) ② فتح القدير (٨٤/٥) ③ مستدرك الحاكم (١٦٨/٢)

آدمی جب جور وظلم کرتا ہے تو بولتے ہیں: "قَسَطَ" اور جب عدل کرتا ہے تو کہتے ہیں: "أَقْسَطَ"، مشہور قول یہی ہے، لیکن امام زجاج رحمہ اللہ کا اس میں اختلاف ہے، وہ دونوں کو برابر ٹھہراتے ہیں (برابری معلوم ہوئی یہ نہیں معلوم ہوا کہ ظلم کے معنی میں برابر ہیں، یا عدل کے معنی میں برابر ہیں۔ اگر امام زجاج رحمہ اللہ جور میں برابر کہیں گے تو ﴿ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴾ [الجن: ١٥] (اور جو ظالم ہیں وہ جہنم کا ایندھن بن گئے) میں تو بن جائے گا مگر ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ (آیتِ باب) میں کیسے ٹھیک ہوگا اور اگر عدل میں برابر کہیں گے تو آخیر میں بنے گا اول میں نہ بنے گا۔ واللہ أعلم) پھر عدل کرنے کی علت ذکر فرمائی: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ یعنی تم کو تمام کاموں میں عدل کرنے کا حکم اس لیے دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عدل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اللہ کا ان کو محبوب رکھنا اس بات کو لازمی قرار دیتا ہے کہ وہ ان کو اچھے سے اچھا بدلہ دے گا۔

جملہ ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ مستانفہ ہے، جو اصلاح کا حکم ماقبل میں ہے اس کی تقریر و تاکید کرتا ہے، یعنی مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور ایک ہی اصل کی طرف رجوع ہوتے ہیں، یعنی ایمان کی طرف۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دین ان کو اکٹھا کرتا ہے، اس لیے جب وہ متفق ہوں اپنے دین میں تو وہ بھائی ہیں اور دین میں متفق ہونے کی وجہ سے اپنے اصل نسب کی طرف رجوع ہوں، اس لیے کہ وہ آدم وحوا کی اولاد ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے:

أَبِيْ الإِسْلَامُ لَا أَبَ إِلَّا سِوَاهُ ۔۔۔ إِذَا افْتَخَرُوْا بِقَيْسٍ أَوْ تَمِيْمِ

یعنی میرا باپ اسلام ہے اس کے سوا میرا کوئی باپ نہیں ہے، جبکہ لوگ قبیلۂ قیس یا قبیلۂ تمیم کے ساتھ فخر کریں۔

کسی اور نے کیا خوب کہا ہے:

اَلْقَوْمُ إِخْوَانُ صِدْقٍ بَيْنَهُمْ سَبَبٌ ۔۔۔ مِنَ الْمَوَدَّةِ لَمْ يَعْدِلْ بِهِ نَسَبٌ

یعنی وہ لوگ سچے بھائی ہیں جن کے آپس میں دوستی کا ایک ایسا رشتہ ہے کہ نسب اس کی برابری نہیں کرتا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان نے بے شک اپنے لوگوں میں قربت اور چپکنے والے نسب کی وہ گرہ لگا دی ہے کہ اگر وہ بھائی پن پر مزید بڑھتی نہیں ہے تو اس سے کم بھی نہیں ہوتی۔ پھر یہ دستور ہے کہ جس وقت ایسی بات دو حقیقی بھائیوں میں پیدا ہو تو باقی لوگوں کے لیے لازمی ہے کہ اس کو دور کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور اُن میں صلح کرا دیں اور جو دینی بھائی ہیں تو وہ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ﴾ میں حرفِ فاء یہ بات بتانے کے لیے ہے کہ دینی برادری اصلاح کی موجب ہے، یعنی جب سارے مومن دینی بھائی ٹھہرے تو واجب ہے کہ تم اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ۔

[1] معاني القرآن (٣٦/٥)

"أخوین" سے مراد ہر دو مسلمان ہیں جو آپس میں لڑیں جھگڑیں۔ ﴿ بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ﴾ فرمایا: ﴿ بَيْنَهُمَا ﴾ نہ کہا۔ ضمیر کی جگہ اسمِ ظاہر کو رکھا، پھر اس کو ان لوگوں کی طرف مضاف کیا جن کو اصلاح کا حکم دیا گیا، چنانچہ اس سے اصلاح کی تقریر و تاکید کرنا منظور ہے۔

﴿ اَخَوَيْكُمْ ﴾ کی قراءت کی بنا پر خاص کر دو کا ذکر اس لیے کیا کہ دو سے زیادہ میں صلح کرانے کا وجوب بطریقِ اولیٰ ثابت ہو جائے، کیوں کہ جن میں لڑائی جھگڑا واقع ہوتا ہے، ان میں کم از کم دو آدمی ہوتے ہیں۔ جب کم میں مصالحت کرانا لازمی ہوا تو زیادہ لوگوں میں تو لازمی ہے، اس لیے کہ دو کے جھگڑے میں جو خرابی ہے، اس سے بڑھ کر جماعت کی لڑائی میں خرابی ہوتی ہے۔ جمہور نے بہ صیغۂ تثنیہ پڑھا ہے۔

امام ابو علی فارسی نے اس کی توجیہ میں کہا ہے کہ "أخوین" سے مراد طائفتین ہیں، اس لیے کہ کبھی تثنیہ کے لفظ سے کثرت مراد ہوتی ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: اس سے مراد یہ ہے: "إصلاح بین کل أخوین"۔ زید بن ثابت وغیرہ، (یعنی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام حسن، حماد بن سلمہ اور ابن سیرین رحمہم اللہ) نے "إخوانکم" بہ صیغۂ جمع پڑھا ہے اور ابو عمرو وغیرہ، (یعنی نصر بن عاصم، ابو العالیہ، جحدری اور یعقوب رحمہم اللہ) سے "إخوتکم" بہ تائے فوقیہ بہ صیغۂ جمع پڑھنا مروی ہے۔[1] بالجملہ پھر اللہ پاک نے اپنے تقوے کا حکم دیا۔

﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ یعنی تم اپنے سارے کاموں میں اللہ سے ڈرو، شاید تقوے کے سبب سے تم رحم کیے جاؤ۔ یہاں "ترجی" باعتبار مخاطب لوگوں کے ہے۔ "أَيْ: رَاجِيْنَ أَنْ تُرْحَمُوْا"، یعنی تم اللہ کا خوف رکھو، اس حال میں کہ تمھیں اس بات کی اُمید ہو کہ تم پر رحم کیا جائے۔ یا یوں کہو کہ "لعل" اللہ کی طرف سے اس مقام میں رحیم و کریم کی طرف سے طمع دلانا ہے، اس لیے کہ جس شے میں طمع دلائی جاتی ہے اس کو ضروری کرنا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں فرقۂ باغیہ سے لڑنے کی دلیل ہے، جبکہ اس سے امام پر یا مسلمانوں میں سے کسی پر بغی ثابت ہو جائے اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان: « قِتَالُ الْمُسْلِمِ كُفْرٌ »[2] کے مطابق باغی فرقہ سے لڑنا صحیح نہیں، یعنی مسلمان سے لڑنا کفر ہے تو اس آیت میں اس کے یہ کہنے کی خرابی پر دلیل ہے، کیوں کہ یہ اور اس معنی کی اور حدیث جو وارد ہوئی ہے، اس سے مراد اس مسلمان سے لڑنا ہے جس نے بغاوت نہیں کی۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر اختلاف جو دو مسلمان فرقوں کے درمیان ہوتا ہے، اگر اس سے بھاگنا اور گھروں میں بیٹھ رہنا واجب ہو تو نہ کوئی حق قائم کیا جائے گا اور نہ کوئی باطل، باطل کیا جائے گا اور نفاق اور فجور والے

[1] تفسير القرطبي (١٦/٣٢٣) فتح القدير (٥/٨٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٤)

اس طرف بڑھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جو مسلمانوں کے مالوں کو اور اُن کی عورتوں کو قید کرنے کو اور اُن کے خون بہانے کو حرام کیا ہے، وہ اس سب کو حلال سمجھ لیں گے اور جتھے بن کر اُن پر چڑھائی کریں گے اور مسلمان اپنے ہاتھ ان سے روک لیں گے، حالاں کہ یہ بات نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کے خلاف ہو گی: «خُذُوْا عَلَى أَيْدِيْ سُفَهَاءِ كُمْ»[1] یعنی تم اپنے بیوقوف لوگوں کے ہاتھ پکڑو۔

امام ابن العربی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت قتالِ مسلمین میں ایک اصل ہے اور متاولین (تاویل کرنے والے) کی لڑائی میں ایک اعتماد کی شے ہے اور اسی پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اعتماد کیا اور اسی کی طرف اہلِ ملت کے اعیان اور عمائد نے پناہ پکڑی اور یہی نبی کریم ﷺ نے مراد رکھی اپنے اس قول میں: «تَقْتُلُ عَمَّارًا الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ»[2] یعنی عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا اور اپنے اس قول میں جو خوارج کے بارے میں فرمایا ہے: «يَخْرُجُوْنَ عَلَى حِيْنِ فُرْقَةٍ مِنَ النَّاسِ تَقْتُلُهُمْ أَوْلَى الطَّائِفَتَيْنِ بِالْحَقِّ»[3] یعنی وہ لوگوں کے فرقے بننے کے وقت نکلیں گے، ان کو وہ گروہ قتل کرے گا جو دونوں فرقوں سے زیادہ ترحق کے ساتھ لگاؤ رکھتا ہوگا۔

یہ آیت اس پر بھی دلیل ہے کہ بغی ایمان کے نام کو زائل نہیں کرتی، اس لیے کہ باوجود بغی کے اللہ تعالیٰ نے ان کا نام مومنین رکھا ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اُن سے کسی نے اہلِ جمل اور صفین کے متعلق پوچھا کہ کیا وہ مشرک ہیں؟ فرمایا: نہیں، وہ تو شرک سے بھاگے ہیں۔ پھر کہا گیا کہ کیا وہ منافق ہیں؟ فرمایا: نہیں، منافق تو اللہ کا ذکر نہیں کرتے مگر تھوڑا۔ عرض کی گئی: پھر ان کا کیا حال ہے؟ فرمایا کہ ہمارے بھائی ہیں، جنھوں نے ہم پر بغاوت کی ہے۔[4]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ وہ شخصیت ہیں کہ اہلِ بغی سے لڑنے کے لیے جن کی اقتداء کی جاتی ہے۔ اور اُن سے مروی ہے کہ انھوں نے مسجد کے کنارے میں ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا: "لَا حُكْمَ إِلَّا لِلّٰهِ" یعنی حکم نہیں ہے مگر اللہ کے لیے تو فرمایا کہ کلمۂ حق کہا گیا ہے، مگر اس سے مراد باطل لیا گیا ہے۔ تمھارے لیے ہم پر تین باتیں ہیں: نہ منع کریں ہم تم کو اللہ کی مسجدوں سے کہ تم اُن میں اللہ کے نام کا ذکر کرو۔ اور ہم تم کو غنیمت سے منع نہ کریں، جب تک کہ تمھارے ہاتھ ہمارے ہاتھوں کے ساتھ ہوں اور ہم تم سے لڑنے میں پہل نہ کریں۔[5]

---

(1) شعب الإيمان (٩٢/٦) اس کی سند میں "احمد بن عبید" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢٢٨٤)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩١٦)

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤) تفسير القرطبي (٣١٧/١٦، ٣١٨)

(4) مصنف ابن أبي شيبة (٥٣٥/٧)

(5) مصنف ابن أبي شيبة (٥٦٢/٧) سنن البيهقي الكبرىٰ (١٨٤/٨) فتح البيان (١٣٩/١٣_١٤٣)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ⑪

اے ایمان والو! مردوں کی کوئی جماعت دوسرے مردوں کا مذاق نہ اُڑائے، ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا (مذاق اُڑائیں) ہوسکتا ہے کہ وہ (عورتیں) ان سے بہتر ہوں اور تم آپس میں (ایک دوسرے پر) عیب نہ لگاؤ اور تم ایک دوسرے کو بُرے القاب سے نہ پکارو، ایمان (لانے) کے بعد فاسقانہ نام (سے پکارنا) برا ہے اور جس نے توبہ نہ کی، تو وہی (لوگ) ظالم ہیں ⑪

کسی کا تمسخر اڑانے اور اسے حقیر جاننے کی ممانعت:

جہاں کسی کو برے نام سے پکارا تو پہلے اپنا نام فاسق ہو گیا اور جس کو پکارا وہ مومن تھا، اس پر جو عیب لگایا، وہ اسے نہ لگا۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ سخریہ سے منع فرماتا ہے۔ سخریہ لوگوں کو حقیر جاننا اور ان سے ٹھٹھا کرنا ہے، جیسا کہ صحیح میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: « اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ » ہے (یعنی حق کو تسلیم کرنے سے تکبر کرنا) اور ''غمص ناس'' ہے ''غمط الناس'' بھی مروی ہے،[1] اس سے مراد لوگوں کو حقیر اور صغیر جاننا ہے اور یہ حرام ہے، کیوں کہ جس شخص کی حقارت کی گئی ہے، کبھی وہ قدر ومنزلت میں اللہ کے نزدیک زیادہ محترم اور محبوب ہوتا ہے، اس شخص سے جس نے اس کے ساتھ ٹھٹھا کیا اور اس کو حقیر کیا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: ﴿ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ﴾ پس مردوں کی ممانعت تو صاف بیان فرمائی، پھر عورتوں کی ممانعت کا اس پر عطف کیا۔

قولہ تبارک و تعالیٰ: ﴿ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ﴾ ''أَيْ: لَا تَلْمِزُوا النَّاسَ'' یعنی لوگوں کو عیب مت دو۔ مردوں میں سے ''هماز'' اور ''لماز'' مذموم اور ملعون ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ﴾ [الهمزة: ١] ''بڑی خرابی ہے ہر ایسے شخص کی جو عیب ٹٹولنے والا غیبت کرنے والا ہو۔'' ''همز'' تو فعل سے ہوتا ہے اور ''لمز'' قول سے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ ﴾ [القلم: ١١] ''بے وقار، کمینہ،

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٩٩)

عیب گو، چغل خور۔'' یعنی لوگوں کو حقیر کرتا ہے، ان پر سرکشی کر کے عیب لگاتا ہے اور اُن کے درمیان چغلی لے کر چلتا پھرتا ہے۔ یہ قول سے عیب لگانا ہے، اسی لیے یہاں فرمایا ہے۔

﴿ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ﴾ جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ﴾ [النساء: ۲۹] ''اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔'' یعنی نہ قتل کرے بعض تمھارا بعض کو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سعید بن جبیر، قتادہ اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ نے کہا: نہ طعن کرے تمھارا کوئی کسی پر۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ﴾ یعنی آپس میں القاب کے ساتھ مت پکارو۔ یہ وہ ہیں جن کا سننا آدمی کو برا لگتا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے ابو جبیرہ بن ضحاک سے روایت کیا ہے، کہا کہ ہم بنی سلمہ میں آئے۔ ﴿ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ﴾ کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں تشریف لائے تو ہم میں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس کے دو نام نہ ہوں یا تین نام، لہٰذا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے کسی کو ایک نام سے پکارتے تھے، ان ناموں میں سے تو وہ کہتے کہ اے اللہ کے رسول! وہ تو اس نام سے خفا ہوتا ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ﴾[2]

(ورواه أبو داود عن موسى بن إسماعيل عن وهيب عن داود به)۔ (فتح البیان میں ہے: "أخرجه البخاري في الأدب و أهل السنن الأربع وغيرهم و عن ابن عباس رضي الله عنهما نحوه)

قولہ جل وعلا: ﴿ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ﴾ یعنی فسوق بری صفت اور برا نام ہے اور وہ تنابز بالالقاب ہے، یعنی ایک دوسرے کی چڑ ڈالنا، جیسے کہ اہلِ جاہلیت آپس میں کیا کرتے تھے، اس کے بعد کہ تمام اسلام میں داخل ہو چکے اور تم نے اس کو سمجھ لیا: ﴿ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ یعنی اور جو کوئی اس سے توبہ نہ کرے وہی ظالم ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ قَوْمٌ ﴾ کا لفظ جو نکرہ ہے وہ تبعیض کے لیے ہے اور معنی افراد کی بنا پر ہیں، گو نظمِ قرآنی جمع پر آئی، اس لیے کہ سخریہ مجمعوں میں واقع ہوتا ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بعض کے فعل کی جمیع کی طرف نسبت ہے، اس لیے کہ اکثر اوقات وہ سب اس سے راضی ہوتے ہیں اور اس لیے کہ اس کا وجود اُن کے درمیان میں ہے، یعنی اے ایمان والو! تم میں سے کچھ لوگ دوسرے لوگوں سے ٹھٹھا نہ کریں۔

---

[1] تفسیر الطبري (۲۲/۲۹۹)

[2] سنن أبي داود (٤٩٦٢) سنن الترمذي (٣٢٦٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٦٦) سنن ابن ماجه (٣٧٤١) مسند أحمد (٤/٢٦٠) الأدب المفرد (١/١٢١) فتح البيان (١٣/١٤٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٧/٢٤٦)

[3] تفسیر ابن کثیر (٤/٢٦٨، ٢٦٩)

"سخرية" بہ معنی "استهزاء" ہے، یعنی ہنسی اور ٹھٹھا۔ امام ابو زید رحمہ اللہ نے حکایت کیا ہے: "سَخِرْتُ بِهِ وَضَحِكْتُ بِهِ هَزَأْتُ بِهِ" یعنی ان افعال کا صلہ حرف باء سے آتا ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: "وَسَخِرْتُ بِهِ وَمِنْهُ وَضَحِكْتُ بِهِ وَمِنْهُ وَهَزَأْتُ مِنْهُ وَبِهِ" یہ سب بولا جاتا ہے اور اسم "سخرية" ہے اور "سخري" بالکسر و بالضم اس میں ایک لغت ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ﴾ [الزخرف: ۳۲] "تاکہ ایک دوسرے کو ماتحت کر لے۔" میں دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔[1] آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اس بات سے منع فرمایا کہ ان میں سے کوئی کسی سے ہنسی کرے۔

پھر اس ممانعت کی یہ وجہ بیان فرمائی کہ ﴿ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ ﴾ یعنی تم کو یہ نہی اس لیے کی ہے کہ جن سے ہنسی کی گئی ہے شاید وہ اللہ کے نزدیک ان سے بہتر ہوں جنھوں نے ان کے ساتھ ہنسی کی۔ تو اب چاہیے کہ کوئی اس شخص سے ہنسی کرنے کی جرأت نہ کرے جس کو اس کی آنکھ گرا دیتی ہے، جب وہ اس کو بدحال دیکھتی ہے، یا اس کے بدن میں کوئی بیماری ہوتی ہے، یا اپنی گفتگو میں تیز زبان نہیں ہوتا، شاید اس کا باطن زیادہ خالص ہو اور اس کا دل زیادہ متقی ہو، اس شخص سے جو اس سے ہنسی کرے تو اس صورت میں ہنسی کرنے والا اس شخص کی تحقیر کر کے جس کو اللہ تعالیٰ نے توقیر کی ہے، اپنے نفس پر ظلم کرے گا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک اس بات کے ساتھ بلاء مقرر کی گئی ہے کہ اگر میں کسی کتے کے ساتھ ہنسی کرتا تو البتہ میں ڈرتا ہوں اس بات سے کہ میں کتا کر دیا جاؤں۔[2] اسی مضمون کو کسی نے نظم کیا ہے: ع

إِنَّ الْبَلَاءَ مُوَكَّلٌ بِالْمَنْطِقِ

چونکہ قوم کا لفظ مردوں کے ساتھ خاص تھا، اس وجہ سے کہ وہ عورتوں پر قوام ہیں، یعنی ان کے کاروبار اور انتظامات کرنے والے ہیں، اس لیے عورتوں کا علاحدہ ذکر کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ﴾ یعنی کچھ عورتیں دوسری کچھ عورتوں کے ساتھ ہنسی نہ کریں، شاید جن سے ہنسی کی گئی ہے وہ اُن سے بہتر ہوں جنھوں نے ہنسی کی۔ کسی نے کہا ہے کہ عورتوں کا علاحدہ ذکر اس لیے کیا ہے کہ ان سے ہنسی ٹھٹھا اکثر ہوتا ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ یہ آیت بنی تمیم کی ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے، انھوں نے فقرائے مسلمین کے ساتھ استہزاء کیا تھا، جیسے: سیدنا بلال، سلمان، عمار، خباب، صہیب، ابن فہیرہ اور سالم مولی ابی حذیفہ رضی اللہ عنہم۔[3]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیوں کے حق میں نازل ہوئی ہے، انھوں نے سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو کوتاہ قد ہونے کی عار دلائی تھی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ صفیہ بنت حیی کی شان میں نازل ہوئی

[1] تفسير القرطبي (۳۲٤/١٦) [2] مصنف ابن أبي شيبة (۲۳۱/٥) تفسير القرطبي (۳۲٥/١٦)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (۳۳۰٤/١٠)

ہے، ان سے بعض ازواجِ مطہرات نے کہا تھا کہ یہودیہ ہیں یہودی کی بیٹی۔[1] پھر عیب لگانے اور طعن کرنے کی ممانعت فرمائی: ﴿ وَلَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ﴾ یعنی اپنے دین والوں پر طعن مت کرو۔ "لمز" عیب اور طعن کے معنی میں ہے اس کی تحقیق سورت براءت کی اس آیت کے تحت میں گزر چکی ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ﴾ [التوبة: ٥٨] "ان میں وہ بھی ہیں جو خیراتی مال کی تقسیم کے بارے میں آپ پر عیب رکھتے ہیں۔"

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "لمز" ہاتھ، آنکھ اور زبان کے اشارے سے ہوتا ہے اور "ھمز" صرف زبان سے ہوتا ہے۔[2] معنی یہ ہیں کہ تمھارا بعض دوسرے کو عیب نہ لگائے جس طرح کہ ان دو آیتوں میں ﴿ اَنْفُسَكُمْ ﴾ کے یہی معنی ہیں: ﴿ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ﴾ [النساء: ٢٩] "اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔" نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ﴾ [النور: ٦١] "اپنے لوگوں کو سلام کر لیا کرو۔" مومن ایک جان کی طرح ہیں، پھر جب مومن نے مومن کو عیب لگایا تو گویا اس نے اپنے نفس کو عیب لگایا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تم وہ کام مت کرو جس کے ساتھ تم عیب لگائے جاؤ، کیوں کہ جس نے وہ کام کیا جس کے سبب سے وہ اس کا مستحق ہوا کہ اسے عیب لگایا جائے تو واقعی حقیقتاً اس نے اپنے آپ کو عیب لگایا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض تمھارا بعض پر لعنت نہ کرے۔ پھر ایک دوسرے کی چڑ ڈالنے سے ممانعت فرمائی۔

برے نام رکھنے اور ان سے پکارنے کی ممانعت:

﴿ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ﴾ یعنی آدمی کو اس نام کے علاوہ جس کے ساتھ وہ نام رکھا گیا کسی اور نام سے نہ پکارو۔ "تنابز" تفاعل کا وزن ہے "نبز" بہ سکون سے "نبز" مصدر ہے اور "نبز" بہ تحریک مطلقاً لقب ہے، یعنی اچھا ہو یا برا۔ عرفِ عام میں برے کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ اس کی جمع "أنباز" ہے۔ القاب جمع ہے لُقب کی، لقب اس چیز کے علاوہ کسی کا نام ہے جس کے ساتھ آدمی کا نام رکھا گیا ہے۔ یہاں مراد برا لقب ہے۔ "تنابز بالألقاب" یہ ہے کہ ان میں سے کوئی کسی کا لقب ٹھہرائے اور ان القاب سے آپس میں ایک دوسرے کو پکاریں۔

امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مفسرین نے فرمایا ہے کہ لقب یہ ہے کہ اپنے مسلمان بھائی سے کہے "يَا فَاسِقُ يَا مُنَافِقُ"۔ یا جو مسلمان ہو گیا ہے اس سے کہے "يَا يَهُوْدِيُّ يَا نَصْرَانِيُّ"۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ہر وہ شے ہے جس سے تو نے اپنے بھائی کو اسلام سے نکالا، جیسے تو کہے: "يَا كَلْبُ، يَا حِمَارُ، يَا خِنْزِيْرُ"۔ امام حسن اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ آدمی اپنے کفر سے عار دلایا جاتا تو اس سے کہا جاتا تھا "يَا يَهُوْدِيُّ يَا نَصْرَانِيُّ"۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ امام قتادہ اور ابو العالیہ رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[3]

---

[1] تفسير البغوي (٣٤٣/٧) [2] تفسير القرطبي (٣٢٧/١٦) [3] فتح القدير (٨٥/٥)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: "تنابز" یہ ہے کہ آدمی نے گناہ کیے اور ان سے توبہ کر لی اور حق کو لوٹ آیا تو اللہ تعالیٰ نے اس بات کی ممانعت کر دی کہ اس کا جو عمل گزر چکا ہے، اس کے ساتھ اسے عار دلائی جائے۔[1] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس کی تفسیر میں مروی ہے، فرمایا: جبکہ آدمی یہودی اور وہ مسلمان ہو گیا، چنانچہ کہے: "يَا يَهُودِيُّ يَا مَجُوسِيُّ" اور مسلمان سے کہے: "يَا فَاسِقُ"۔[2]

فائدہ نفیسہ:

کہا ہے کہ جس لقب رکھنے کی ممانعت کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی ایسے لقب سے پکارا جاتا ہے کہ اس سے اس کو اس وجہ سے کراہت ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں اس کو گھٹانا ہوتا ہے۔

اب رہا اس لقب سے پکارا جانا جس کو وہ پسند کرتا ہے تو اس کا کوئی ڈر نہیں۔ اسی باب سے وہ القاب ہیں جو اپنے لوگوں کے لیے اسمِ علم کی طرح ہو گئے ہیں، جیسے: اخفش اور اعمش اور اس جیسے دوسرے القاب۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے وہ شخص مستثنیٰ ہیں جس پر استعمال غالب ہو گیا ہے، جیسے: اعرج و اَحدب اور اس کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ اپنے دل میں اس پر کچھ برا محسوس کرے۔ ائمہ نے اس کو جائز رکھا ہے اور اہلِ لغت کا ان کے قول پر اتفاق ہے۔[3] انتھیٰ. اور وہ القاب جو حمد یا تعریف کے لیے ہیں اور حق اور سچے ہوتے ہیں تو وہ مکروہ نہیں ہیں جس طرح کہ ابوبکر کو عتیق کہا گیا ہے اور عمر رضی اللہ عنہ کو فاروق اور عثمان رضی اللہ عنہ کو ذوالنورین اور علی رضی اللہ عنہ کو ابوتراب اور خالد رضی اللہ عنہ کو سیف اللہ کہا گیا ہے۔

﴿ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ﴾ یعنی برا نام ہے یہ کہ فسق کے ساتھ ذکر کیا جائے، یہاں اسم سے مراد وہ اسم نہیں ہے جو لقب اور کنیت کے مقابلے میں آتا ہے اور نہ وہ اسم جو فعل و حرف کا مقابل ہے، بلکہ اس سے مراد ذکرِ بلند ہے، کیوں کہ وہ ماخوذ ہے۔ "سُمُو" سے عرب کے اس قول سے کہ "طَارَ اسْمُهُ فِي النَّاسِ بِالْكَرَمِ أَوْ بِاللُّؤْمِ"، یعنی لوگوں میں اس کا نام سخاوت یا بخل کے ساتھ اڑا۔ مطلب یہ ہے کہ مشہور ہوا اور حقیقت اس کی وہ ہے جو اس کا ذکر لوگوں میں بلند ہوا۔ گویا یوں کہا گیا کہ مومنوں کے لیے ایسا ذکرِ بلند برا ہے جو اُن جرموں کے ساتھ ہو کہ وہ ایمان میں داخل ہونے کے بعد فسق کے ساتھ ذکر کیے جائیں۔

یہ اس بات کا قبیح کرنا ہے کہ ایمان اور فسق کو جمع کریں کہ جس کو ایمان منع کرتا ہے، جیسے تم کہو کہ "بِئْسَ الشَّأْنُ بَعْدَ الْكِبْرَةِ الصَّبْوَةُ"، یعنی برا حال ہے بڑھاپے کے بعد لڑکپن۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: یعنی البتہ یہ

---

(1) تفسير الطبري (٢٢/٣٠١، ٣٠٢) (2) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٠٥)

(3) تفسير القرطبي (١٦/٣٢٩)

فسق ہے کہ کسی شخص کے توبہ کرنے اور اسلام لانے کے بعد اس کا نام کافر یا زانی رکھا جائے۔[1] کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ جس نے سخریہ، لمز اور نبز کیا جن سے اس کو منع کیا گیا تو وہ فاسق ہے۔ ﴿وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ ... الآیۃ﴾ یعنی اور جس نے اس شے سے توبہ نہ کی جس سے اللہ تعالیٰ نے اس کو منع کیا تو وہ لوگ ہی ظالم ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جس شے کی ممانعت کی اس کے مرتکب ہوئے اور توبہ سے باز رہے اور جس کا لقب ٹھہرایا، اس پر ظلم کیا اور خود اپنی جانوں پر ظلم کیا اس گناہ کے سبب سے جو جانوں پر لازم ہوا۔[2] بالجملہ پھر اللہ پاک نے بدگمانی سے منع فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ؗ اِنَّ بَعْضَ
الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ
اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۲

اے ایمان والو! بہت سی بدگمانیوں سے بچو، بلاشبہہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں اور تم ایک دوسرے کی جاسوسی نہ کرو اور نہ تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ تو (ظاہر ہے کہ) تم اسے ناپسند کرتے ہو، اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے ⑫

بدگمانی، جاسوسی اور غیبت کی ممانعت:

تہمت لگانا اور بھید ٹٹولنا اور پیٹھ پیچھے برا کہنا کسی جگہ بھی گناہ کے بغیر نہیں سوائے اس کے کہ اس میں کچھ دین کا فائدہ ہو اور نفسانیت غرض نہ ہو۔ انتھیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ بہت بدگمانی کرنے سے منع فرماتا ہے۔ اور وہ تہمت لگانا ہے اور گھر والوں کے لیے اور قریبی رشتے داروں کے لیے اور لوگوں کے لیے اپنے غیر محل میں بہ تکلف خائف ہونا ہے۔ اس لیے کہ اس میں بعض محض گناہ ہوتا، اس لیے چاہیے کہ احتیاطاً بہت ظن کرنے سے اجتناب کیا جائے۔ ہم کو امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے فرمایا: ہرگز اپنے مومن بھائی کے منہ سے نکلی ہوئی بات پر گمان نہ کر مگر بھلائی کا، جبکہ تو اس بات کے اچھا ہونے کے لیے کوئی باعث پاتا ہے۔[3] ابو عبداللہ ابن ماجہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ کعبے کا طواف کرتے تھے اور فرماتے

① تفسیر الطبري (٣٠١/٢٢) ② فتح البیان (١٣/ ١٤٤_١٤٧) ③ الدر المنثور (٥٦٥/٧)

تھے: کیا پاک ہے تو اور کیا خوشبودار ہے تو۔ تو کیا بزرگ ہے اور کیا بزرگ ہے تیری حرمت، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! البتہ مومن کی حرمت اللہ کے نزدیک تجھ سے بھی زیادہ بڑی ہے، اس کے مال کی اور اس کے خون کی حرمت بھی تیری حرمت سے زیادہ ہے اور مومن اس سے بھی بزرگ تر ہے کہ اس کے ساتھ صرف خیر کا گمان کیا جائے۔[1] (تفرد به ابن ماجه من هذا الوجه)

امام مالک رحمہ اللہ نے عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بچو تم گمان سے، پس بے شک گمان سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے اور تجسس مت کرو، یعنی لوگوں کا بھید مت ٹٹولو اور تنافس مت کرو، یعنی آپس میں ایک دوسرے پر رشک نہ کرو اور آپس میں حسد نہ کرو اور مت بغض رکھو آپس میں اور ایک دوسرے سے پیٹھ مت پھیرو اور اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ۔[2] (رواه البخاري عن عبد الله بن يوسف و مسلم عن يحيى بن يحيى و أبو داود عن القعنبي ثلاثتهم عن مالك به)

سفیان بن عیینہ نے عن الزہری عن انس رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «لَا تَقَاطَعُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا» یعنی ایک دوسرے سے پیٹھ مت پھیرو اور آپس میں بغض مت رکھو اور ایک دوسرے پر حسد مت کرو اور اللہ کے بندے بھائی بھائی ہو جاؤ اور نہیں حلال کسی مسلمان کے لیے کہ چھوڑے اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ۔[3] (رواه مسلم و الترمذي وصححه من حديث سفيان بن عيينة به)

طبرانی نے حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تین چیزیں میری امت کے لیے لازمی رہنے والی ہیں: "طیرۃ" یعنی شگونِ بد لینا اور حسد اور بدگمانی۔ چنانچہ ایک شخص نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! وہ کون سی چیز ہے جو ان برائیوں کو دور کر دیتی ہے اس شخص سے جس میں وہ ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس وقت تو حسد کرے تو اللہ سے مغفرت مانگ اور جب تو گمان کرے تو محقق مت کر، یعنی اس کو سچا مت جان اور جب شگون لے تو چل، یعنی جو بدشگونی جی میں پڑ گئی، اس کا خیال مت کر اور جو کام کرنا ہے وہ کر ڈال۔[4] امام ابو داود رحمہ اللہ نے زید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص کو لائے اور اُن سے کہا کہ یہ فلاں ہے، اس کی ڈاڑھی سے شراب ٹپکتی ہے۔ تو عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک ہم کو واقعی تجسس سے منع کیا گیا ہے، لیکن اگر ہم کو کوئی چیز ظاہر طور پر معلوم ہو گی تو ہم اس کے ساتھ پکڑیں گے۔

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٣٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٦٣) الموطأ (٩٠٧/٢) سنن أبي داود (٤٩١٧)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٣٥)

[4] المعجم الكبير (٢٢٨/٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه إسماعيل بن قيس الأنصاري وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ١٤٩/٨)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اپنی روایت میں اس شخص کا نام ولید بن عقبہ بن ابی معیط لیا ہے۔[1] امام احمد رحمہ اللہ نے دخین کاتب عقبہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے عقبہ سے کہا کہ ہمارے پڑوسی شراب پیتے ہیں اور میں اُن کے لیے پیادوں کو بلانے والا ہوں تو وہ اُن کو پکڑ لیں گے۔ عقبہ نے کہا کہ مت کرو، لیکن ان کو وعظ کرو اور ڈراؤ۔ راوی نے کہا کہ پھر دخین نے یہ کیا، لیکن وہ باز نہ آئے، پھر دخین آیا اور کہا: بے شک میں نے ان کو منع کیا، مگر وہ باز نہیں آئے اور میں اُن کے لیے پیادوں کو بلانے والا ہوں تو وہ اُن کو پکڑ لیں گے۔ چنانچہ عقبہ نے ان سے کہا: تیرا برا ہو ایسا مت کر، بے شک میں نے سنا ہے رسول اللہ ﷺ کو کہ یہ فرماتے تھے: جس نے کسی مومن کے عیب کا ستر کیا تو گویا اس نے زندہ درگور کی ہوئی کو اس کی قبر سے زندہ کیا۔[2] (و رواه أبو داود والنسائي من حديث الليث بن سعد به نحوه)

سفیان ثوری رحمہ اللہ نے عن راشد بن سعد عن معاویہ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، کہا: میں نے سنا نبی اکرم ﷺ کو کہ فرماتے تھے: «إِنَّكَ إِنِ اتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ النَّاسِ أَفْسَدْتَّهُمْ أَوْ كِدْتَّ أَنْ تُفْسِدَهُمْ» یعنی بے شک اگر تو لوگوں کے عیبوں کے پیچھے پڑے گا تو تُو ان کو بگاڑ ڈالے گا، یا قریب ہوگا اس بات کے کہ ان کو بگاڑ ڈالے۔ چنانچہ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا: ایک کلمہ جس کو معاویہ رضی اللہ عنہ سے سنا جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا، ان کو اللہ تعالیٰ نے اس کلمے سے فائدہ دیا۔[3] (ورواه أبو داود منفرداً به من حديث الثوري به) امام ابو داود رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود عن شریح بن عبید عن جبیر بن نفیر و کثیر بن مرہ و عمرو بن الاسود المقدام بن معدیکرب و ابی امامہ رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ روایت کیا ہے: «إِنَّ الْأَمِيرَ إِذَا ابْتَغَى الرِّيبَةَ فِي النَّاسِ أَفْسَدَهُمْ»[4] یعنی بے شک امیر نے جس وقت لوگوں میں تہمت تلاش کی تو ان کو بگاڑ ڈالا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ﴾ تجسس کا اطلاق شر میں کیا جاتا ہے، اس معنی سے جاسوس ہے۔ رہا تحسس بہ حائے مہملہ تو وہ غالباً خیر میں مستعمل ہوتا ہے جس طرح کہ اللہ پاک نے یعقوب علیہ السلام کی طرف سے خبر دی کہ انھوں نے کہا: ﴿ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ﴾ [يوسف: ٨٧] ''اے میرے پیارے بچو! تم جاؤ اور یوسف علیہ السلام اور اس کے بھائی کی پوری طرح تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔'' اور کبھی ان میں سے ہر ایک شر میں مستعمل ہوتا ہے جیسا کہ صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ

---

1. سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٩٠) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٠٥/١٠)
2. مسند أحمد (١٥٣/٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٩٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٣٠٧/٤) اس کی سند میں ''کثیر بن ابی الہیثم'' مجہول راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٢٦٥)
3. سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٨٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٢٩٥)
4. سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٨٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٢٨٥)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «لَا تَجَسَّسُوا وَلَا تَحَسَّسُوا وَلَا تَبَاغَضُوا وَلَا تَدَابَرُوا وَكُونُوا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا»[1] امام اوزاعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تجسس بحث کرنا ہے شے سے اور تحسس قوم کی بات کی طرف کان لگانا ہے اور وہ اس کو ناپسند کرتے ہوں، اس بات کو کہ کوئی ان کے پسِ پشت سنے اور ''تدابر'' صرم (کاٹنا) ہے۔[2] (رواه ابن أبي حاتم عنه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ﴾ اس میں غیبت کی ممانعت ہے اور خود شارع علیہ السلام نے اس کی تفسیر فرما دی جس طرح کہ اس حدیث میں آیا ہے جس کو امام ابو داود رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: عرض کی گئی: اے اللہ کے رسول! غیبت کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے بھائی کا اس چیز کے ساتھ ذکر کرنا جس کو وہ ناپسند کرتا ہے۔ عرض کی گئی: اب آپ مجھے بتائیں کہ اگر میرے بھائی میں وہ شے موجود ہو جو میں کہتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس میں وہ شے موجود ہو جو تُو کہتا ہے تو واقعی یہ اس کی غیبت ہے اور اگر وہ شے اس میں نہ ہو جو تو کہتا ہے تو یقیناً تو نے اس پر بہتان لگایا۔[3] (ورواه الترمذي عن قتيبة عن الدراوردي به وقال: حسن صحيح ورواه ابن جرير عن بندار عن غندر عن شعبة عن العلاء وهكذا قال ابن عمر رضي الله عنهما ومسروق وقتادة وأبو إسحاق ومعاوية بن قرة)

امام ابو داود رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کی: کافی ہے آپ کو صفیہ سے ایسا ایسا۔ امام ابو داود رحمہ اللہ نے مسدد (یہ ابو داود کے استاد ہیں) سے روایت کیا ہے: ''تَعْنِي قَصِيرَةً'' یعنی عائشہ رضی اللہ عنہا کی ''كَذَا وَكَذَا'' سے مراد یہ تھی کہ وہ کوتاہ قد ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: البتہ تو نے درحقیقت ایک ایسا کلمہ کہا کہ « لَوْ مُزِجَتْ بِمَاءِ الْبَحْرِ لَمَزَجَتْهُ » یعنی اگر وہ کلمہ سمندر کے پانی میں ملا دیا جائے تو اس کو اپنے حال سے بدل دے باوجود اس پانی کی کثرت کے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اور میں نے آپ ﷺ سے ایک آدمی کی حکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں پسند نہیں کرتا اس بات کو کہ مجھ سے کسی آدمی کی حکایت کی جائے اور میرے واسطے اتنا اتنا ہو۔[4] (ورواه الترمذي من حديث يحيى القطان وعبدالرحمن بن مهدي ووكيع ثلاثتهم عن سفيان الثوري عن علي ابن الأقمر عن أبي حذيفة سلمة بن صهيب الأرحبي عن عائشة رضي الله عنها به وقال: حسن صحيح)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے حسان بن مخارق سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی، پھر جب وہ کھڑی ہوئی، تاکہ نکلے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ہاتھ سے نبی ﷺ کی طرف اشارہ کیا، یعنی وہ کوتاہ قد ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو نے اس کی غیبت کی۔[5] غرضیکہ غیبت بالاجماع حرام ہے اور اس سے مستثنیٰ نہیں ہے مگر وہ جس کی مصلحت راجع ہے جس طرح کہ جرح و تعدیل و نصیحت و خیر خواہی میں ہے، جیسے آپ ﷺ کا فرمانا، جب کہ

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٠٥)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٩) سنن أبي داود (٤٨٧٤) سنن الترمذي (١٩٣٤) تفسير الطبري (٢٢/٣٠٧، ٣٠٨)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٧٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٠٢، ٢٥٠٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥١٤٠)

[5] تفسير الطبري (٢٢/٣٠٧)

آپ ﷺ کے پاس آنے کی اجازت مانگی اس مردِ فاجر نے جس وقت کہ آپ ﷺ نے اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ درست فرمائی: « بِئْسَ أَخُوْ الْعَشِيْرَةِ »[1] یعنی یہ اس قبیلے میں کا برا آدمی ہے (یہ شخص عیینہ بن حصن ہے، مسلمان نہیں ہوا تھا، گو اسلام کا اظہار کیا تھا۔ یہ بات نبی اکرم ﷺ کی علاماتِ نبوت سے ہے، کیوں کہ وہ آپ ﷺ کے بعد مرتد ہو گیا اور اس کو قید کر کے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس لائے، آپ نے اس سے نرم باتیں کیں، اس کو مالوف کرنے کے لیے اس میں اس فاسق کی غیبت کا جواز ہے جو اپنے فسق کا اعلان کرتا ہوں۔[2] كذا في مجمع البحار)

اور جیسا کہ آپ ﷺ کا فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے فرمانا اس حال میں کہ معاویہ و ابو الجہم نے اس کو نکاح کا پیغام دیا تھا کہ معاویہ تو مفلس ہے اور ابو الجہم اپنی لاٹھی اپنے کندھے سے نہیں رکھتا،[3] یعنی عورتوں کو بہت مارتا ہے اور اسی طرح وہ بات جو اس کے قائم مقام ہے۔ اور باقی غیبت سخت حرام ہے اور اس پر زجرِ اکید، یعنی سخت قسم کی دھمکی وارد ہوئی ہے اور اسی لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے مردہ انسان کا گوشت کھانے سے اس کی تشبیہ دی، جیسا کہ فرمایا ﴿ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ﴾ یعنی جیسے تم مردہ انسان کا گوشت کھانے سے طبعاً گھن کھاتے ہو، ویسے ہی غیبت کرنے سے شرعی طور پر گھن کرو، کیوں کہ اس کی سزا اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اور یہ مردار آدمی کے گوشت کھانے کی تشبیہ کا مقصد غیبت سے نفرت دلانا ہے اور اس سے ڈرانا ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس شخص کے حق میں فرمایا ہے جو اپنے ہبہ میں رجوع کرتا ہے: « كَالْكَلْبِ يَقِيْءُ ثُمَّ يَرْجِعُ فِيْ قَيْئِهِ » یعنی وہ ایسا ہے جیسا کتا قے کرتا ہے، پھر اپنی قے میں رجوع کرتا ہے اور آپ ﷺ نے فرمایا: ہمارے لیے بری مثال نہیں ہے۔[4]

صحیح و حسن و مسند حدیثوں میں کئی وجہ سے ثابت ہوا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں فرمایا: بے شک تمھارے خون اور تمھارے مال اور تمھاری آبروئیں تم پر اس طرح حرام ہیں جس طرح تمھارا یہ دن حرمت والا ہے، تمھارے اس مہینے میں اور تمھارے اس شہر میں۔[5] امام ابو داود رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر مسلم پر دوسرے مسلم کا مال اس کی آبرو اور اس کا خون حرام ہے۔ آدمی کے شر کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے۔[6] (رواه الترمذي عن عبدالله بن أسباط بن محمد عن أبيه به وقال: حسن غريب)

نیز ابو بردہ بلوی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اے ان لوگوں کے گروہ کہ جو اپنی زبان سے ایمان لائے اور ایمان ان کے دل میں داخل نہیں ہوا! مسلمانوں کی غیبت مت کرو اور ان کے عیب مت ٹٹولو۔

---

① صحیح البخاري، رقم الحديث (٥٦٨٥) صحیح مسلم، رقم الحديث (٢٥٩١)

② مجمع بحار الأنوار (٥٩٨/٣) ③ صحیح مسلم، رقم الحديث (١٤٨٠) ④ صحیح البخاري، رقم الحديث (٦٥٧٤)

⑤ صحیح البخاري، رقم الحديث (٦٧) صحیح مسلم، رقم الحديث (١٦٧٩)

⑥ صحیح مسلم، رقم الحديث (٢٥٦٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٨٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٢٧)

بے شک شان یہ ہے کہ جو کوئی اُن کے عیب ٹٹولے گا تو اللہ اس کا عیب ٹٹولے گا اور جس کا عیب اللہ تعالیٰ ٹٹولے گا تو اس کو اس کے گھر میں رسوا کرے گا۔[1] (تفرد به أبو داود و قد روي من حديث البراء ﷺ)

چنانچہ حافظ ابو یعلیٰ رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: قَالَ: خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَتَّى أَسْمَعَ الْعَوَاتِقَ فِيْ بُيُوْتِهَا أَوْ قَالَ فِيْ خِدْرِهَا فَقَالَ: « يَا مَعْشَرَ مَنْ آمَنَ بِلِسَانِهِ لَا تَغْتَابُوا الْمُسْلِمِيْنَ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِهِمْ فَإِنَّهُ مَنْ يَّتَّبِعْ عَوْرَةَ أَخِيْهِ يَتَّبِعِ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ وَمَنْ يَّتَّبِعِ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ يُفْضِحْهُ فِيْ بَيْتِهِ »[2] (''العواتق'' یعنی بالغ عورتیں شادی کے قابل جو اپنے ماں باپ کے گھر میں ہیں۔ ''خدر'' بہ معنی پردہ ہے)

طریقِ دیگر عن ابن عمر رضی اللہ عنہما:

ابوبکر احمد بن ابراہیم الاسماعیلی رحمہ اللہ نے عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: « يَا مَعْشَرَ مَنْ آمَنَ بِلِسَانِهِ وَلَمْ يُفْضِ الْإِيْمَانُ إِلَى قَلْبِهِ لَا تَغْتَابُوا الْمُسْلِمِيْنَ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِهِمْ فَإِنَّهُ مَنْ يَّتَّبِعْ عَوْرَاتِ الْمُسْلِمِيْنَ يَتَّبِعِ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ وَمَنْ يَّتَّبِعِ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ يُفْضِحْهُ وَلَوْ فِيْ جَوْفِ رَحْلِهِ » راوی نے کہا کہ ایک دن سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کعبے کی طرف نظر کی اور کہا: تو کتنا قابلِ احترام ہے اور تیری حرمت کتنی بڑی ہے اور البتہ مومن اللہ کے نزدیک تجھ سے زیادہ محترم ہیں۔[3]

امام ابو داود رحمہ اللہ نے مستورد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے کھایا کسی مسلمان مرد کے سبب سے اکلہ (''أكلة'' بالفتح ایک بار کھانا اور بالضم بہ معنی لقمہ ہے۔[4] كذا في مجمع البحار) تو بے شک اللہ اس کو اس کے مثل جہنم میں کھلائے گا اور جو کوئی پہنایا گیا کوئی کپڑا بہ سبب کسی مسلمان مرد کے تو بے شک اللہ اس کو اس کے مثل جہنم میں پہنائے گا اور جو شخص کسی مرد کے سبب سے سمعہ و ریاکاری کے مقام میں کھڑا ہوا تو بے شک اللہ اس کو قیامت کے دن مقامِ سمعہ و ریا میں کھڑا کرے گا۔[5] (تفرد به أبو داود)

مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص مسلمان کے کسی دشمن کے پاس آئے اور اس کے سامنے اس کی برائی کرے، تا کہ وہ اس کو کھانا کھلائے یا کپڑا پہنائے تو اس کی وہ جزا ہے جو مذکور ہوئی۔ اور سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جبکہ مجھے عروج کرایا گیا، یعنی معراج کی رات تو میں ایک قوم پر سے گزرا جن

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٨٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٩٨٤)

[2] مسند أبي يعلىٰ (٢٣٧/٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجاله ثقات'' (مجمع الزوائد: ١٧٦/٨)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٣٢) صحيح الترغيب والترهيب (٢٩٢/٢) [4] مجمع بحار الأنوار (٦٩/١، ٧٠)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٨١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٩٣٤)

کے ناخن تانبے کے تھے، وہ اپنے چہروں کو اور سینوں کو نوچتے تھے۔ میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے اور اُن کی آبروؤں میں پڑتے تھے۔[1] (تفرد به أبو داود وهكذا رواه الإمام أحمد عن أبي المغيرة عبد القدوس بن الحجاج الشامي به)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: ہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ ہم سے وہ شے بیان فرمائیں جو آپ نے اس رات میں دیکھی جس رات آپ کو سیر کرایا گیا۔ فرمایا: پھر مجھے ایک خلقِ کثیر عورتوں اور مردوں کی طرف لے چلے جن پر اللہ کی مخلوق میں سے کچھ مرد متعین کیے گئے تھے، وہ ان میں سے کسی کے پہلو سے نعل (جوتی) کے مثل گوشت کا ٹکڑا کاٹتے ہیں اور اس کو اُن میں سے کسی ایک کے منہ میں رکھتے ہیں، پھر اس سے کہا جاتا ہے: کھا جیسا کہ تو نے کھایا اور وہ اس کے کھانے سے موت کو پاتا ہے جو اس پر زبردستی کی جاتی ہے۔ چنانچہ میں نے کہا: اے جبریل! یہ لوگ کون ہیں؟ کہا: یہ "هَمَّازُوْنَ لَمَّازُوْنَ"، چغلی کھانے والے ہیں، پھر کہا جاتا ہے: ﴿ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ﴾ اور وہ اس کے گوشت کے کھانے پر زبردستی کیا جاتا ہے۔[2] (هكذا أورد هذا الحديث وقد سقناه بطوله في أول تفسير سورة سبحان ولله الحمد والمنة)

امام ابوداود طیالسی رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ ایک دن روزہ رکھیں اور کوئی ہرگز افطار نہ کرے، یہاں تک کہ میں اسے اجازت دوں۔ چنانچہ لوگوں نے روزہ رکھا، پھر جب شام ہوئی تو لوگوں نے آپ ﷺ کے پاس آنا شروع کیا۔ ایک آتا اور آپ ﷺ سے کہتا کہ میں دن بھر روزے سے ہوں، چنانچہ آپ مجھے اجازت دیں کہ افطار کروں، پھر آپ ﷺ اسے اِذن دیتے۔ پھر دوسرا آتا اور آپ ﷺ سے افطار کی اجازت مانگتا تو آپ اجازت دیتے۔ یہاں تک کہ ایک آدمی آیا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ کے گھر والوں میں سے دو عورتیں آج دن بھر سے روزہ دار ہیں، آپ ان کو اذن دیں تاکہ وہ افطار کر لیں، چنانچہ آپ نے اس سے منہ پھیر لیا، پھر دوبارہ اس نے عرض کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ انھوں نے روزہ نہیں رکھا۔ وہ شخص کیسا روزہ دار ہے جو دن بھر لوگوں کے گوشت کھاتا رہتا ہے، تو جا اور اُن عورتوں کو حکم دے کہ اگر وہ روزہ دار ہیں تو قے کریں، پھر انھوں نے حکم کی بجا آوری کی تو اُن میں سے ہر ایک نے جما ہوا خون قے کیا، پھر وہ شخص نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ کو خبر دی، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر وہ مر جائیں اور خون بستہ کے دو ٹکڑے بھی اُن کے اندر رہ جاتے تو البتہ ان کو آگ کھاتی۔[3] یہ اسناد ضعیف ہے اور متن غریب ہے۔

---

[1] سنن أبي داود (٤٨٧٨) مسند أحمد (٢٢٤/٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥٣٣)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٠٥/١٠) اس کی سند میں "ابو ہارون عبدی" ضعیف راوی ہے۔

[3] مسند الطيالسي (٢٨٢/١) اس کی سند میں "یزید بن ابان رقاشی" ضعیف راوی ہے۔

اور حافظ بیہقی رحمہ اللہ نے اس کو روایت کیا ہے یزید بن ہارون سے، کہا: ہم کو حدیث کی سلیمان تیمی نے کہا: میں نے ایک شخص کو سنا، وہ ابوعثمان نہدی کی مجلس میں عبیدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا تھا جو رسول اللہ ﷺ کا مولیٰ (غلام) تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں دو عورتوں نے روزہ رکھا اور ایک شخص آپ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! یہاں دو عورتیں ہیں جنھوں نے روزہ رکھا ہے، وہ پیاس کے مارے مرنے کے قریب ہیں۔ سلیمان نے کہا کہ میں گمان کرتا ہوں کہ اس شخص نے کہا: ”بِالْهَاجِرَةِ“ یعنی دوپہر کو آ کر کہا۔ آپ ﷺ نے اس سے اعراض کیا یا خاموش رہے۔

پھر اس نے کہا: اے نبی اللہ! بے شک وہ دونوں واقعی مر گئیں یا قریب ہیں کہ مر جائیں۔ پس آپ ﷺ نے فرمایا: ان کو بلا کر لے آ، وہ آئیں، کہا: پھر ایک قدح لایا گیا یا عس (قدح بہ فتحتین لکڑی کا چھوٹا پیالہ اور عس بہ ضمِ عین وتشدیدِ سینِ مہملہ بڑا پیالہ جس میں آٹھ رطل چیز آجاتی ہے) پھر ان میں سے ایک سے فرمایا کہ قے کر تو اُس نے پیپ اور خون اور صدید کی قے کی، یہاں تک کہ آدھا پیالہ ہو گیا۔ پھر دوسری سے فرمایا کہ قے کر تو اس نے قیح، خون، صدید، گوشت اور تازہ خون کی قے کی، یہاں تک اس سے وہ پیالہ بھر گیا (قیح وہ مدّہ ہے جس میں خون ملا ہوا نہیں ہوتا۔ صدید یعنی خون و قیح جو جسم سے بہتا ہے)

پھر فرمایا کہ بے شک ان دونوں نے اس چیز سے روزہ رکھا جس کو اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے حلال کیا اور افطار کیا اس چیز سے جس کو اللہ تعالیٰ نے ان پر حرام فرمایا۔ ان میں ایک دوسری کی طرف بیٹھی اور لوگوں کا گوشت کھانا شروع کیا۔[1]

(وهكذا قد رواه الإمام أحمد عن يزيد بن هارون وابن أبي عدي كلاهما عن سليمان بن طرخان التيمي به مثله أو نحوه)

ثم رواه أيضا من حديث مسدد عن يحيى القطان عن عثمان بن غياث حدثني رجل أظنه في حلقه أبي عثمان عن سعد مولى رسول اللهﷺ کہ لوگوں کو روزے کا حکم دیا گیا، پھر دوپہر کو ایک شخص آیا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! فلاں اور فلاں دو عورتیں ہیں جن کو بہت تکلیف پہنچی ہے تو آپ ﷺ نے اس سے دو بار یا تین بار اعراض کیا، پھر فرمایا کہ تو اُن کو بلا لا۔ پھر ایک عس یا قدح لایا گیا، پھر اُن میں سے ایک عورت سے فرمایا کہ تو قے کر۔ اس نے گوشت اور تازہ خون اور پیٹ کی قے کی اور دوسری سے اسی طرح فرمایا تو اس نے بھی اسی طرح قے کی۔ پھر فرمایا بے شک ان دونوں نے اس چیز سے روزہ رکھا جس کو اللہ نے اُن کے لیے حلال کیا اور اس شے سے افطار کیا جس کو اللہ نے ان پر حرام کیا، ان میں سے ایک دوسری کے پاس آئی، پھر یہ دونوں لوگوں کے گوشت کھاتی رہیں، یہاں تک کہ ان کے پیٹ پیپ سے بھر گئے۔[2] (قال البيهقي كذا قال عن سعد و الأول وهو عبيد أصح)

[1] دلائل النبوة للبيهقي (١٨٦/٦) مسند أحمد (٤٣١/٥) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ١٢٢/٢)

[2] دلائل النبوة للبيهقي (١٨٧/٦) مسند أحمد (٤٣١/٥) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

حافظ ابن یعلیٰ رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ ماعز رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! بے شک میں نے واقعی زنا کیا، آپ ﷺ نے اس سے اعراض کیا، یہاں تک کہ اس نے یہ بات چار دفعہ کہی، پھر جب پانچویں بار کہی تو آپ ﷺ نے فرمایا: تو نے زنا کیا ہے؟ کہا: ہاں۔ فرمایا: اور تو جانتا ہے کہ زنا کیا ہے؟ عرض کی: ہاں، میں نے اس عورت کے ساتھ وہ حرام کام کیا ہے جو خاوند اپنی بیوی کے ساتھ کرے تو حلال ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو یہ بات بتا کر کیا چاہتا ہے؟ کہا: میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے پاک کر دیں۔ کہا: پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « أَدْخَلْتَ ذَلِكَ مِنْكَ فِيْ ذَلِكَ مِنْهَا » یعنی تو نے اپنا ذکر اس کی فرج میں داخل کیا ہے جس طرح کہ سلائی سرمہ دانی میں غائب ہوتی ہے اور لاٹھی کنویں میں؟ کہا: ہاں اے اللہ کے رسول! راوی نے کہا: پھر آپ ﷺ نے اس کے رجم کا حکم دیا تو وہ رجم کر دیا گیا۔

پھر آپ ﷺ نے دو مردوں کو سنا کہ ان میں سے ایک اپنے ساتھی سے کہتا ہے: کیا نہیں دیکھا تو نے اس شخص کو کہ اللہ تعالیٰ نے تو اس کی پردہ پوشی کی اور اس کو اس کے نفس نے نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ کتے کے سنگسار کیے جانے کی طرح سنگسار کیا گیا، پھر نبی اکرم ﷺ چلے، یہاں تک کہ ایک مرے ہوئے بدبودار گدھے کے پاس سے گزرے تو آپ ﷺ نے فرمایا: کہاں ہیں فلاں فلاں؟ اترو اور اس گدھے کی بدبودار لاش میں سے کھاؤ۔ وہ بولے: اللہ آپ کو بخشے اے اللہ کے رسول! کیا یہ کھایا جاتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شے تم نے ابھی ابھی اپنے بھائی کے متعلق کہی ہے، وہ اس مردار کے کھانے سے بھی بری ہے، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! بے شک وہ ابھی جنت کی نہروں میں ہے اور اُن میں غوطہ لگا رہا ہے۔[1] یہ اسناد صحیح ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ تھے تو ایک بدبودار مردار کی بدبو بلند ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ یہ بو کیسی ہے؟ یہ ان لوگوں کی بو ہے جو لوگوں کی غیبت کرتے ہیں۔[2]

طریقِ دیگر:

عبداللہ بن حمید رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ہم ایک سفر میں نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ تھے کہ ایک بدبو اٹھی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ منافقوں کے ایک گروہ نے غیبت کی ہے مسلمانوں کے ایک گروہ کی، اس لیے یہ بو اٹھی ہے وَرُبَمَا قَالَ: « فَلِذَلِكَ هَاجَتْ هَذِهِ الرِّيْحُ ».[3] سدی رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں زعم کیا ہے کہ سلمان فارسی کسی سفر میں نبی ﷺ کے دو اصحاب کے ساتھ تھے، ان دونوں کی خدمت کرتے

---

① سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٢٨) مسند أبي يعلىٰ (١٠/٥٢٤) اس کی سند میں ''عبدالرحمان بن صامت'' مجہول راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢٩٥٧)

② مسند أحمد (٣/٣٥١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ٨/١٧٢) ③ مسند عبد بن حميد (١/٣١٥)

اور کام وکاج میں ان کی مدد کرتے تھے اور ان کے کھانے میں سے کھا لیتے تھے۔ ایک دن جب لوگ روانہ ہوئے اور سلمان رضی اللہ عنہ سوتے رہ گئے اور لوگوں کے ہمراہ نہ چلے تو ان کے دونوں یار ان کو برا کہنے لگے، پھر ان کو نہ پایا تو دونوں نے خیمہ نصب کیا (یعنی لوگ چل دیے اور سلمان رضی اللہ عنہ سوتے رہ گئے چونکہ ان کے یاروں نے چلتے وقت جو کام کا وقت ہوتا ہے ان کو نہ پایا اس لیے ان کو برا بھلا کہا پھر جب منزل پر بھی نہ پایا تو انھوں نے خود خیمہ نصب کیا واللہ اعلم) پھر کہا کہ سلمان یا یہ غلام (لڑکا) چاہتا ہے کہ تیار کھانا مل جائے اور خیمہ لگا ہوا مل جائے۔

پھر جب سلمان رضی اللہ عنہ آئے تو دونوں نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا کہ جا کر اُن سے سالن لے آئیں، پھر سلمان رضی اللہ عنہ چلے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اُن کے ساتھ اُن کا ایک کاسہ تھا، چنانچہ عرض کی: اے اللہ کے رسول! مجھے میرے یاروں نے بھیجا ہے کہ آپ اُن کے لیے سالن دے دیں، اگر آپ کے پاس ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیرے یار سالن کو کیا کریں گے، انھوں نے تو سالن بنا لیا ہے۔ سلمان رضی اللہ عنہ واپس گئے کہ ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی خبر دیں، پھر اُن کے دونوں یار چلے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی: قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا! ہم جب سے منزل پر اترے ہیں، ہمیں کوئی سالن نہیں ملا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک یقیناً تم نے سلمان کا سالن بنا لیا تمھارے اس قول کے سبب سے کہ "إِنَّهُ كَانَ نَائِمًا" کہا اور یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ﴾.[1]

حافظ ضیاء مقدسی نے اپنی کتاب مختارہ میں بہ طریقِ حبان بن ہلال عن حماد بن سلمہ عن ثابت عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ عرب لوگ سفروں میں بعض بعض کی خدمت کیا کرتے تھے۔ اور سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے ہمراہ ایک شخص تھا، وہ اُن کی خدمت کیا کرتا تھا۔ چنانچہ یہ دونوں سو گئے، پھر بیدار ہوئے اس حال میں کہ اس شخص نے ان کے لیے کھانا تیار نہیں کیا تھا تو دونوں نے کہا: "إِنَّ هٰذَا لَنَؤُوْمٌ" یعنی بے شک یہ بڑا سونے والا ہے، پھر اس کو جگایا اور اس سے کہا کہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما آپ کو سلام کہتے ہیں اور آپ سے سالن مانگتے ہیں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک ان دونوں نے حقیقتاً سالن بنا لیا۔ پھر وہ دونوں آئے اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! ہم نے کس شے کا سالن بنا لیا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے بھائی کے گوشت کا۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! بے شک میں البتہ اس کا گوشت تمھارے آگے کے دانتوں کے درمیان دیکھ رہا ہوں۔ پس دونوں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے لیے بخشش مانگیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو حکم دو تو وہ چاہے تو تمھارے لیے مغفرت مانگے۔[2]

حافظ ابو یعلیٰ رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے دنیا

---

[1] الدر المنثور (٥٧٠/٧) [2] المختارة للمقدسي (١٦٩٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٦٠٨)

میں اپنے بھائی کے گوشت میں سے کھایا تو آخرت میں اس کا گوشت اس کے قریب کیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ تو کھا اس کو مردہ جیسا کہ تو نے اس کو زندہ کھایا، پھر وہ اس کو کھائے گا اور تیوری چڑھائے گا اور چیخے گا۔[1] یہ حدیث نہایت غریب ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ سے اس شے میں ڈرو جس کا تم کو حکم دیا گیا اور جس سے تم کو منع کیا ہے، چنانچہ اس کا اس بات میں پاس اور لحاظ رکھو اور اس سے ڈرو، بے شک اللہ اس پر بڑا رجوع ہونے والا ہے جو اس کی طرف رجوع ہوا اور اس شخص پر بڑا مہربان ہے جو اس کی طرف رجوع ہوا اور اس پر بھروسا کیا۔ علماء میں سے جمہور نے کہا ہے کہ جو شخص لوگوں کی غیبت کرتا ہے، اس کی توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ اس سے باز رہے اور اس بات کا عزم کرے کہ پھر نہ کرے گا۔ آیا اس شے پر جو فوت ہو گئی، ندامت شرط ہے، اس میں نزاع ہے اور یہ بات ہے کہ جس کی غیبت کی ہے اس سے معاف کرا لے۔ دوسروں نے کہا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ اس کو معاف کرائے، اس لیے کہ جب اس کو بتائے گا تو اس کو سخت تکلیف ہو گی بہ نسبت اس کے کہ جب وہ اس شے کو جانتا نہیں تھا جو اُس سے ہوئی۔

چنانچہ اب اس کا طریقہ یہ ہے کہ جو خوبی اس شخص میں ہے اس کا خوب چرچا کرے ان مجلسوں میں جہاں اس کی مذمت کیا کرتا تھا اور حسبِ استطاعت خود اس کی طرف سے غیبت کو رد کرے پس یہ تعریف کرنا اور اس سے غیبت کو رد کرنا اس خدمت اور غیبت کا عوض ہو جائے گا جو اس سے سرزد ہوتی رہی، جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے عن سہل بن معاذ بن انس جہنی عن ابیہ عن النبی ﷺ روایت کیا ہے کہ جس شخص نے کسی مومن کی حمایت کی، یعنی اس کو منافق سے بچایا جو اس کی غیبت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پاس ایک فرشتہ بھیجے گا جو قیامت کے دن اس کے گوشت کو جہنم کی آگ سے بچائے گا۔ اور جس شخص نے کسی مومن کو کسی چیز کے ساتھ تہمت لگائی جس سے وہ اس کے شتم یعنی مذمت کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ اس کو جہنم کے پل پر روکے گا، یہاں تک کہ وہ اس چیز سے نکلے جو اس نے کہی۔[2] (وكذا رواه أبو داود من حديث عبد الله و هو ابن المبارك به بنحوه)

نیز ابو داود رحمہ اللہ نے سیدنا جابر اور ابوطلحہ بن سہل انصاری رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ نہیں ہے کوئی مرد جو کسی مسلمان مرد کو مخذول کرے، یعنی بے یار و مددگار چھوڑ دے، اس جگہ میں جہاں اس کی حرمت کا ہتک کیا جاتا ہے اور جہاں اس کی عزت و آبرو میں کمی کی جاتی ہے مگر اللہ اس کو مخذول کرے گا، ان جگہوں میں جہاں وہ چاہے گا کہ اس کی مدد کی جائے۔[3] (تفرد به أبو داود)

---

① المعجم الأوسط (۱۸۲/۲) اس کی سند میں ''محمد بن اسحاق'' مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔

② مسند أحمد (۴۴۱/۳) سنن أبي داود (۴۸۸۳) اس کی سند میں ''اسماعیل بن یحییٰ معافری'' مجہول راوی ہے۔ (ضعيف الجامع: ۵۵٦٤)

③ سنن أبي داود، رقم الحديث (۴۸۸٤) تفسير ابن كثير (۲٦۹/٤ـ۲۷۵) اس کی سند میں ''اسماعیل بن بشیر'' مجہول راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ۴۳/۲)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ جب کوئی کسی کو شر سے دور کر دے تو محاورے میں یوں بولیں گے کہ "جَنَّبَهُ الشَّرَّ"، حقیقت اس کی یہ ہے کہ اس کو ایک جانب کر دیا اب "جنب" دو مفعول کی طرف متعدی کیا جائے گا۔ اللہ پاک نے خلیل جلیل کی طرف سے نقل فرمایا ہے: ﴿ وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴾ [إبراهيم: ٣٥] ''اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے پناہ دے۔''

"جنب" کا مطاوع "اِجْتَنَبَ الشَّرَّ" ہے، یعنی برائی سے الگ ہوا تو اب ایک مفعول کو کم کر دیا۔ اور ظن یہاں صرف وہ تہمت ہے جس کے لیے کوئی سبب نہ ہو، جیسے: وہ شخص جو کسی دوسرے کو کسی ایسی بے حیائی یا برے کام کی تہمت لگاتا ہے جو اس سے ظاہر نہیں ہوئی۔ اللہ پاک نے ظنِ کثیر سے بچنے کا حکم فرمایا اور اس میں ابہام رکھا، تاکہ مومن اپنے ہر ظن کو تلاش کرے جو وہ کرتا ہے، تاکہ اس کی وجہ کو جان لے، اس لیے کہ ظن میں سے وہ ظن ہے جس کا اتباع واجب ہے، کیوں کہ اکثر شرعی احکام ظن پر مبنی ہیں، جیسے: قیاس، خبرِ واحد اور دلالتِ عموم۔ لیکن یہ وہ ظن ہے جس پر عمل واجب ہے۔ جو وجوہ اس پر عمل کرنے کے موجب ہیں اُن میں سے ایک وجہ کے ساتھ قوی ہو گیا ہے تو اب شک اور تہمت سے بلند ہو گیا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ یہ ہے کہ اہلِ خیر سے برائی کا گمان کرے۔ اب رہے اہلِ سوء اور فسوق تو ہم کو جائز ہے کہ ہم ان سے ایسا گمان رکھیں جو اُن سے ظاہر ہوا ہے۔[1]

امام مقاتل بن سلیمان اور مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا: وہ یہ ہے کہ اپنے مسلمان بھائی سے برائی کا گمان کرے۔ ایسے گمان کا اس وقت تک کوئی خوف نہیں جب تک کہ اس کو زبان سے نہ کہے، پھر اگر اس ظن کو زبان سے کہہ دیا اور ظاہر کر دیا تو گناہ گار ہو گا۔[2] امام قرطبی رحمہ اللہ نے اکثر علماء سے حکایت کیا ہے کہ اس شخص سے برا گمان رکھنا جس کا ظاہر خیر ہے، ناجائز ہے اور اس شخص کے بارے میں بدگمانی رکھنے میں کچھ حرج نہیں جس کا ظاہر برا ہے۔[3] غرضیکہ پہلی آیت میں جو ظن سے بچنے کا حکم ہے اس کی یہ علت بیان فرمائی: ﴿ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ ﴾ یہ بعض وہی اہلِ خیر کے ساتھ بدگمانی رکھنا ہے۔ اور ﴿ اِثْمٌ ﴾ وہ سزا ہے جس کا مستحق وہ شخص ہے جو گمان رکھنے والا ہے۔

جو امور اس بات پر دال ہیں کہ یہ ظن جس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے یہ ظنِ سوء ہی ہے، ان میں سے یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا ﴾ [الفتح: ١٢] ''اور تم نے برا گمان کر رکھا تھا۔ دراصل تم لوگ ہو بھی ہلاک ہونے والے۔'' اب جس ظن سے اجتناب کرنے کا امر کیا گیا ہے، اس میں مسائلِ دین کے اس ظن میں سے کوئی شے داخل نہ ہو گی جن کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ پاک نے تو اپنے بندوں کو اس کے اتباع

---

[1] معاني القرآن (٣٦/٥، ٣٧) [2] فتح القدير (٧٦/٥) [3] تفسير القرطبي (٣٣٢/١٦)

کے ساتھ متعبد کیا ہے، یعنی حکم دیا ہے۔ اور جمہور اہلِ علم نے اس پر عمل کرنا واجب قرار دیا ہے۔ اس کا انکار صرف بعض بدعتی گروہوں نے کیا ہے، تا کہ دین کے ساتھ مکر کریں اور جمہور مسلمین سے علاحدہ ہو جائیں۔

ظن کے ساتھ متعبد ہونا (اس کے اتباع کو لازمی سمجھنا) شریعت کے بہت سے احکام میں آیا ہے، بلکہ اکثر میں آیا ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ من جملہ ظن وہ ظن ہے جس کا اتباع واجب ہے، جیسے اس شے میں ظن جس کا توڑ کوئی نہیں ہے اعمال میں سے اور جیسے اللہ تعالیٰ سے نیک گمان رکھنا۔ اور من جملہ ظن وہ ہے جو حرام ہے، جیسے: الہیات و نبوات میں ظن اور اس جگہ ظن کرنا جہاں اس کے مخالف کوئی قطعی حکم موجود ہے اور مسلمانوں سے بدگمانی رکھنا۔ اور من جملہ ظن وہ ہے جو مباح ہے جیسے معاشی امور میں ظن کرنا۔[1] انتھی۔

کسی نے کہا ہے کہ ظن کی کئی قسمیں ہیں، ان میں سے ایک ظن واجب ہے اور اس کا حکم کیا گیا ہے، یعنی اللہ عزوجل سے نیک گمان رکھنا اور من جملہ ان کے مندوب الیہ (مستحب) ہے، یعنی مسلمان بھائی سے نیک گمان رکھنا جو انصاف و عدل کے مطابق ہے اور ان میں وہ ظن جو حرام ہے وہ محظور (منع کیا گیا) ہے، یعنی اللہ عزوجل سے بدگمانی رکھنا اور مسلمان بھائی سے گمانِ بد کرنا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومن کو اس بات سے منع فرمایا ہے کہ مومن کے ساتھ بدگمانی رکھے۔[2] پھر جب اللہ پاک نے ان کو بہت سے ظن سے بچنے کا حکم دیا تو ان کو تجسس سے منع فرمایا۔

﴿ وَلَا تَجَسَّسُوْا ﴾ تجسس یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان عیوب اور بھیدوں کی بحث کریں جو تم سے چھپے ہوئے ہیں۔ اللہ پاک نے ان کو اس بات سے منع کیا ہے کہ لوگوں کے عیوب کو کریدیں، یہاں تک کہ ان کو معلوم کریں اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو چھپا دیا ہے۔ جمہور نے بہ جیم پڑھا ہے، اس کے معنی وہی ہیں جو مذکور ہوئے۔ امام حسن رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی ابو رجا اور ابن سیرین رحمہما اللہ) نے بہ حائے مہملہ پڑھا ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اُن میں سے ایک دوسرے سے بعید نہیں ہے، کیوں کہ تجسس بہ جیم تو بحث کرنا ہے اس شے سے جو تجھ سے پوشیدہ ہے اور تحسس بہ حائے مہملہ طلبِ اخبار اور اخبار سے بحث کرنا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جیم والے کے معنی تو بحث کے ہیں اور اسی معنی سے "رَجُلٌ جَاسُوْسٌ" ہے جبکہ وہ اُمور سے بحث کرے۔ اور حائے مہملہ تو اس شے میں ہے جس کو انسان اپنے نفس کے لیے طلب کرتا ہے۔ اور بہ جیم یہ ہے کہ اپنے غیر کے لیے رسول ہو۔ یہ ثعلب کا قول ہے اور پہلا زیادہ معروف ہے۔[3] جب تم اخبار کا تفحص کرو گے (تلاش کرو گے) تو محاورۂ عرب میں یوں کہیں گے کہ "تَحَسَّسْتُ الْأَخْبَارَ وَتَجسستها"۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو مومنوں

---

(1) تفسير أبي السعود (٨/١٢٢) (2) تفسير الطبري (٢٢/٣٠٤) (3) تفسير القرطبي (١٦/٣٣٢، ٣٣٣)

کی پوشیدہ باتوں کو تلاش کرنے سے منع فرمایا ہے[1] یعنی ان کے عیبوں کی جستجو کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اس بارے میں حدیثیں وارد ہوئی ہیں، چنانچہ کچھ پہلے بیان ہو چکی ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ﴾ یعنی بعض تمھارا بعض کو پسِ پشت اس شے کے ساتھ تناول نہ کرے (وہ شے تلاش نہ کرے، نہ لے) جو اس کو بری لگے۔ جب کوئی شخص کسی شخص کی برائی کرے تو محاورے میں اس طرح بولتے ہیں کہ "اِغْتَابَهُ اِغْتِيَابًا"۔ اور غیبت اسم ہے۔ غیبت کے معنی میں کیا خوب فقرہ کہا گیا ہے: "هِيَ ذِكْرُ الْعَيْبِ بِظَهْرِ الْغَيْبِ"۔ یعنی عیب کا ذکر پیٹھ پیچھے کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ تو آدمی کا اس شے کے ساتھ ذکر کرے جس کو وہ ناپسند کرتا ہے، جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو کہ مومن کی کسی شے کے ساتھ غیبت کی جائے اس طرح حرام کیا ہے جس طرح کہ مردار کو حرام کیا ہے۔[3] غیبت کے حرام ہونے کے بارے میں حدیثیں بہت کثرت سے ہیں جو کتبِ حدیث میں مشہور و معروف ہیں، چنانچہ ایک جملۂ صالحہ پہلے گزر چکا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ غیبت تین طرح کی ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ہے: غیبت و افک و بہتان۔ چنانچہ غیبت تو یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کے بارے میں وہ بات کہے جو اس میں ہے اور افک یہ ہے کہ اس میں وہ بات کہے جو تجھ کو اس کی طرف سے پہنچی ہے اور بہتان یہ ہے کہ وہ بات کہے جو اس میں نہیں ہے۔[4] یہ بات بغیر اختلاف کے ہے کہ غیبت کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ جس شخص نے کسی کی غیبت کی ہے، اس کے لیے لازمی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے یا جس کی غیبت کی ہے، اس کے لیے استغفار کرے، یا اس سے معاف کرائے۔ علامہ ربانی شیخ شیوخنا الشوکانی رحمہ اللہ کا اس بارے میں ایک رسالہ ہے جس کا نام "رفع الريبة عن مسألة الغيبة" ہے۔ یہ رسالہ نہایت درجے کا نفیس ہے۔ جزاہ اللہ خیرا، آمین.

بالجملہ پھر اللہ پاک نے غیبت کی تمثیل مردار کھانے سے دی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا ﴾ یہ مثال اس لیے دی ہے کہ مردہ نہیں جانتا کہ اس کا گوشت کوئی کھا رہا ہے جس طرح کہ زندہ اس شخص کی غیبت کو نہیں جانتا جس نے اس کی غیبت کی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اس کے معنی ذکر کیے ہیں۔[5] اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان کی آبرو اس کے گوشت کی مثل ہے اور یہ کہ جیسے اس کا گوشت کھانا حرام ہے ویسے ہی اس کی آبرو میں دست درازی کرنا حرام ہے اور تمثیل میں غیبت سے جو نفرت دلائی گئی ہے اور اس کی قباحت ظاہر کی گئی ہے اور اس کے کرنے والے کو ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت کی گئی ہے، وہ مخفی نہیں ہے اس لیے کہ

---

(1) تفسير الطبري (٣٠٤/٢٢) (2) اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ (3) تفسير الطبري (٣٠٨/٢٢)
(4) تفسير القرطبي (٣٣٥/١٦) (5) معاني القرآن (٣٧/٥)

انسانی گوشت اس قسم سے ہے کہ جس سے انسان کی طبیعت نفرت کرتی ہے اور بشری جبلت اس کو مکروہ جانتی ہے، قطع نظر اس کے کہ شرعی طور پر بھی وہ حرام ہے۔

اس مثال میں کئی مبالغے ہیں۔ ایک تو وہ استفہام ہے جس کے معنی تقریر کے ہیں۔ دوسرا یہ ہے کہ جو شے انتہائی درجے کی مکروہ ہے اس کو محبت کے ساتھ متصل کیا ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ تعیم کے لیے فعل کو ﴿اَحَدُكُمْ﴾ کی طرف مسند کیا ہے اور اس بات کی خبر دینے کے لیے کہ کوئی بھی اس کو پسند نہیں کرتا ہے۔ چوتھا یہ ہے کہ اسی پر اکتفا نہ کیا کہ غیبت کرنے کی تشبیہ آدمی کے گوشت کھانے سے دی، بلکہ اس آدمی کو بھائی ٹھہرایا۔ پانچواں یہ کہ بھائی کا گوشت کھانے پر اقتصار نہ کیا، یہاں تک کہ اس کو مردہ ٹھہرایا۔ پس یہ تمثیل نہایت ہی بری وجہ پر ہے۔

﴿فَكَرِهْتُمُوْهُ﴾ یعنی پس اس کی حیات میں اس کی غیبت کرنا اس کی موت کے بعد اس کے گوشت کھانے کی طرح ہے تو اب یہ کلام تمثیلی استعارے کے باب سے ہے اور اس تمثیل اور تشبیہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آدمی کی آبرو اس کے خون اور گوشت کی طرح ہے، اس لیے کہ آبرو کے کترنے سے آدمی کا دل دردمند ہوتا ہے جس طرح کہ اس کا جسم گوشت کے کاٹنے سے دردناک ہوتا ہے۔ اور یہ مثال قیاس ظاہری کے باب سے ہے، کیوں کہ آدمی کی آبرو اس کے گوشت اور خون سے زیادہ اشرف ہے۔ جس طرح کہ عقل مند کو لوگوں کا گوشت کھانا پسند نہیں اسی طرح ان کی آبرو کا کرنا بطریقِ اولیٰ اس کو اچھا نہیں لگتا، اس لیے کہ درد اور تکلیف میں یہ زیادہ سخت ہے۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی تقدیر یہ ہے: "فَقَدْ كَرِهْتُمُوْهُ فَلَا تَفْعَلُوْا" یعنی پھر جب تم اس کو واقعی مکروہ جان چکے ہو تو اب یہ مت کرو۔ معنی یہ ہیں: جب تم نے اس کو مکروہ جانا تو اس کو برائی کے ساتھ ذکر کرنے سے بچو۔ یا یہ معنی ہیں: جیسا تم نے اس کو مکروہ جانا تو اس کا برائی کے ساتھ ذکر کرنے سے بچو اس حال میں کہ وہ غائب ہے۔[1] امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حرفِ فاء تقدیر میں کلام کے جواب میں ہے گویا یوں کہا: "لَا يُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَّأْكُلَ لَحْمَ أَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ إِذًا"[2] امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محذوف پر معطوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "عُرِضَ عَلَيْكُمْ ذٰلِكَ فَكَرِهْتُمُوْهُ، وَلَا يُمْكِنُكُمْ إِنْكَارُ كَرَاهَتِهٖ"۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[3] کسی نے کہا ہے کہ "إِنْ صَحَّ ذٰلِكَ عِنْدَكُمْ فَأَنْتُمْ تَكْرَهُوْنَهٗ"، کسی نے کہا ہے کہ یہ خبر بہ معنی امر ہے، یعنی اس کو مکروہ جانو۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ یعنی اللہ سے ڈرو اس طرح سے کہ تم کو اس نے جس شے سے اجتناب کرنے کا حکم دیا ہے اس کو ترک کرو۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ﴾ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ بڑا توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان ہے اس شخص

---

[1] فتح القدير (٥/٨٧) [2] تفسير الرازي (٢٨/١١٦)

[3] التبيان في إعراب القرآن (٢/١١٧١) تفسير البيضاوي (٥/٢١٨، ٢١٩)

کے لیے جو اس سے ڈرا اور جو گناہ یا حکم کی مخالفت اس سے ہوگئی ہے اس سے توبہ کی۔ یہاں جو ﴿ تَوَّابٌ ﴾ صیغۂ مبالغہ فرمایا تو اس سے یہ بات بتانا منظور ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جن پر رجوع ہوتا ہے اور جن کی توبہ قبول فرماتا ہے وہ بہت ہیں۔ یا اس لیے کہ بندہ جو گناہ کرتا ہے وہ توبہ کی وجہ سے اس سے معاف ہی کر دیا جاتا ہے، یا اس لیے کہ جب توبہ کی قبولیت میں مبالغہ کیا گیا تو توبہ کرنے والا اس شخص کے مرتبے میں ٹھہرایا گیا جس نے کبھی گناہ ہی نہیں کیا بہ سبب سعت کرم اللہ پاک کے۔ غرضیکہ توبہ اللہ پاک کی طرف سے ایک بڑی نعمت ہے کہ جب سچے طور پر ہوئی تو گناہ معاف ہو گیا۔[1]

اب غیبت کی کوئی گنجایش نہ رہی کہ گناہ کی وجہ سے اس کی غیبت کی جائے، ایک یہ بات ہے کہ جو لوگ شریف کہلاتے ہیں تو وہ اپنے نسب پر فخر کیا کرتے ہیں اور خود کو بڑھاتے ہیں اور دوسرے کو جو نسب میں اُن سے کم درجے کا ہے اس کو گھٹاتے ہیں، چوں کہ یہ بھی غیبت کا ایک بڑا باعث ہے، اس لیے آگے فرمایا کہ نسب کچھ فخر کی چیز نہیں ہے اور نہ اللہ کے یہاں اس پر عزت اور بزرگی موقوف ہے، بلکہ وہاں تو شرف تقوے کے درجوں پر ہے جو کوئی جتنا متقی ہے اتنی ہی اس کی بزرگی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ
شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿١٣﴾

اے لوگو! بلاشبہ ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تمھارے خاندان اور قبیلے بنائے، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بلاشبہ اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ عزت والا (وہ ہے جو) تم میں سے زیادہ متقی ہے، بلاشبہ اللہ بہت علم والا، خوب باخبر ہے ⑬

تمام انسان آدم وحوا علیہما السلام کی اولاد:

ذات کی اور قوم برادری کی بڑائیاں بے کار ہیں۔ صفت نیک چاہیے۔ نری ذات کس کام کی۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو خبر دیتا ہے کہ اس نے ان کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بنایا، یعنی آدم وحوا علیہما السلام اور اُن کو شعوب ٹھہرایا۔ شعوب قبائل سے عام تر ہیں۔ قبائل کی معرفت کے اور مراتب ہیں، جیسے: فصائل، عشائر (کنبے) وعمائر وافخاذ وغیرہ۔ کسی نے کہا ہے کہ شعوب سے مراد بطونِ عجم ہیں اور قبائل سے مراد بطونِ عرب ہیں جس طرح کہ اسباط بنی اسرائیل کے بطون ہیں۔

[1] فتح البیان (۱۳/ ۱۴۷۔۱۵۱)

میں نے ایک مقدمۂ مفرد میں اس کی تلخیص کی ہے۔ ابو عمر بن عبد البر کی کتاب "الأشباہ" اور کتاب "القصد و الأمم في معرفة أنساب العرب و العجم" سے اس کو جمع کیا ہے، چنانچہ آدم اور حوا علیہما السلام کی طرف نسبت طینی کر کے تو سارے لوگ شرف میں برابر ہیں۔ رہا ان کا آپس میں ایک دوسرے سے افضل ہونا تو یہ دینی امور کے سبب سے ہوتا ہے۔ وہ امور یہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے رسول ﷺ کی متابعت ہے۔ اسی لیے اللہ پاک نے غیبت سے منع کیا اور ایک دوسرے کو حقیر جاننے سے منع فرمایا، اس کے بعد اُن کے بشریت کے لحاظ سے برابر ہونے کی تنبیہ کر کے ارشاد فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ﴾ یعنی تمھارے شعوب اور قبائل اس لیے ٹھہرائے کہ آپس میں پہچان ہو جائے اور ہر ایک اپنے قبیلے کی طرف رجوع کرے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے ﴿ لِتَعَارَفُوْا ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے، جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں بن فلاں قبیلہ فلاں فلاں سے ہے۔[1] امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حمیر تو اپنے محالف (حلیفوں) کی طرف منسوب ہوتے تھے اور حجاز کے عرب اپنے قبائل کی طرف۔[2] امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم انساب سے وہ شے سیکھو جس سے تم اپنے رشتوں کو جوڑو، پس بے شک صلہ رحمی یعنی رشتہ جوڑنا اہل میں محبت ہے، مال میں کثرت ہے۔ منساۃ یعنی تاخیر ہے اجل میں یا عمر میں یا دوام ہے نسل میں۔ پھر امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: "لَا نَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ هَذَا الْوَجْهِ"[3]

اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت کا معیار:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ﴾ یعنی تمھاری ایک دوسرے پر جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک فضیلت ہے تو وہ تقوے سے ہے، احساب یعنی حسب نسب کے سبب سے نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ سے اس بارے میں حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے عن سعید بن ابی سعید عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی نے پوچھا: "أَيُّ النَّاسِ أَكْرَمُ؟" یعنی لوگوں میں سب سے بڑھ کر عزت والا کون ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «أَكْرَمُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاهُمْ» یعنی اللہ کے نزدیک لوگوں میں سب سے بڑھ کر عزت والا وہ ہے جو اُن کا سب سے بڑا متقی ہے۔ عرض کی: ہم اس کا آپ سے نہیں پوچھتے۔ فرمایا: «أَكْرَمُ النَّاسِ يُوسُفُ نَبِيُّ اللّٰهِ ابْنُ نَبِيِّ اللّٰهِ ابْنِ نَبِيِّ اللّٰهِ ابْنِ خَلِيلِ اللّٰهِ»۔ عرض کی: ہم اس کا آپ سے نہیں پوچھتے، فرمایا: تو تم معادنِ عرب کا مجھ سے پوچھتے ہو؟ عرض کی: ہاں۔ فرمایا: تو تمھارے جاہلیت کے بہترین لوگ اسلام میں تمھارے بہترین لوگ ہیں

---

[1] تفسیر الطبري (۳۱۲/۲۲) [2] تفسیر ابن کثیر (۲۷۵/٤)

[3] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۱۹۷۹) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۲۹٦٥)

جبکہ سمجھ والے ہوئے۔[1] (وقد رواه البخاري في غير موضع من طرق عن عبدة ابن سليمان ورواه النسائي في التفسير من حديث عبيد اللّٰه و هو ابن عمر العمري به)

حدیثِ دیگر:

امام مسلم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ تمھاری صورتوں اور تمھارے مالوں کی طرف نظر نہیں کرتا، لیکن وہ تمھارے دلوں اور تمھارے اعمال کی طرف نظر کرتا ہے۔[2] (ورواه ابن ماجه عن أحمد بن سنان عن كثير بن هشام به)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: تو نظر کر بے شک تو کسی سرخ سے بہتر نہیں ہے اور نہ کسی سیاہ سے، مگر صرف اس صورت میں کہ تجھ میں اللہ کا تقویٰ زیادہ ہو۔[3] (تفرد به أحمد رحمه الله)

حافظ ابو القاسم طبرانی رحمہ اللہ نے حبیب بن خراش عصری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ مسلمان بھائی بھائی ہیں، کسی کو کسی پر کچھ فضیلت نہیں ہے مگر تقوے کے ساتھ۔[4]

امام ابو بکر بزار رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: تم سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے اور چاہیے کہ وہ لوگ باز آجائیں جو اپنے آباء پر فخر کرتے ہیں، یا وہ زیادہ خوار ہوں اللہ پر جُعلان (گبریلی کیڑا۔ وہ کیڑا جو گوبر میں ہوتا ہے) سے۔[5] (ثم قال لا نعرفه عن حذيفة إلا من هذا الوجه)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن اپنی اونٹنی قصواء پر بیٹھ کر طواف کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارکانِ کعبہ (یعنی کعبے کے کھونٹ) کو ایک ٹیڑھی سی لکڑی کے ساتھ چھوتے تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک میں تھی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کو بٹھانے کے لیے مسجد میں کوئی جگہ نہ پائی، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے ہاتھوں پر اترے، پھر اس کو لے کر بطنِ مسیل کی طرف نکلے، یعنی پانی کے بہاؤ کی جگہ جو صفا اور مروہ کے درمیان میں ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی سواری پر خطبہ سنایا، جس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی اس چیز کے ساتھ جس کا وہ لائق ہے۔

پھر فرمایا: «يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ عُبِّيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ» (بہ ضم وکسرِ عین وتشدیدِ بائے موحدہ وبائے تحتیہ، یعنی جاہلیت کا کبر اور بڑائی کرنا بہ سبب باپ دادوں کے) "وَتَعَظُّمَهَا بِآبَائِهَا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤١٢) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٦٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٤٣)

[3] مسند أحمد (١٥٨/٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٥٠٥)

[4] المعجم الكبير (٢٥/٤) اس کی سند میں "عبدالرحمان بن عمرو" سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٤٦٧٧)

[5] مسند البزار (٣٤٠/٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٥٦٨)

فَالنَّاسُ رَجُلَانِ: رَجُلٌ بَرٌّ تَقِيٌّ كَرِيمٌ عَلَى اللّٰهِ تَعَالَى (یعنی نیکوکار پرہیزگار، اللہ کے نزدیک عزت والا) وَرَجُلٌ فَاجِرٌ يَتَّقِي (فاجر يتقي. اصل میں اسی طرح ہے، لیکن صحیح "فاجر شقي" معلوم ہوتا ہے، والله أعلم) هَيِّنٌ عَلَى اللّٰهِ تَعَالَى (یعنی مائل ہونے والا حق سے اور اعمالِ خیر سے بد بخت اور بے قدر اللہ تعالیٰ کے نزدیک) إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُولُ: ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴾" پھر آپ ﷺ نے فرمایا: «أَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِي وَلَكُمْ»[1] (وهكذا رواه عبد بن حميد عن أبي عاصم الضحاك عن مخلد عن موسى بن عبيدة به)

امام احمد رحمہ اللہ نے عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک تمھارے یہ انساب کچھ گالی نہیں ہیں (اصل کے الفاظ "نمببته" ہے "فليتنبه" مصحح سلمه تعالیٰ) کسی ایک پر۔ تم سب کے سب آدم کے بیٹے ہو "طف الصاع" (یعنی بعض تمھارا بعض سے قریب ہے۔ "طف المكيال وطفاف المكيال" وہ شے ہے جو پیمانہ کے بھرنے سے قریب ہو۔ مطلب یہ ہے تم سب ایک باپ کی طرف منسوب ہونے میں ایک مرتبے میں ہو ہر لحاظ سے مکمل ہونے میں ناقص اور قاصر ہونے میں غرضیکہ نقصان میں تم سب برابر ہو۔ نقصان میں اس تکمیل سے تشبیہ دی ہے جو اس کو نہیں پہنچا ہے کہ پیمانہ کو بھر دے، پھر اُن کو یہ خبر دی کہ فضیلت نسب سے نہیں ہے لیکن تقویٰ سے ہے، کلمۂ "طف" کا حال موکدہ ہے تو منصوب ہوگا یا مرفوع ہے تو "کلکم" سے بدل ہوگا یا مبتدائے محذوف کی خبر: "أَيْ: أنتم"[2] كذا في المجمع)

"لم تمنعوه" (اصل میں اسی طرح ہے، لیکن "تملئوه" معلوم ہوتا ہے، یعنی تم قریب ہو صاع کے بھرنے کے اس کو تم نے پر نہیں کیا ہے۔ والله أعلم) نہیں ہے کسی کے لیے کسی پر کچھ فضل مگر دین اور تقوے سے اور کافی ہے مرد کے لیے یہ کہ "هُوَ بَذِيٌّ بَخِيلٌ فَاحِشٌ" (اصل کے الفاظ: "كفى بالرجل أن يكون بذيا بخيلا فاحشا" ہیں۔ "بالرجل كفى" کا فاعل ہے اور تمیز محذوف ہے: "أَيْ: نقصا" یعنی کافی ہے مرد کا نقصان یہ کہ وہ ہو فحش بکنے والا، کنجوس و فاحش) (وقد رواه ابن جرير عن يونس عن ابن وهب عن ابن لهيعة به)

اس کے الفاظ یہ ہیں: "اَلنَّاسُ لِآدَمَ وَحَوَّاءَ كَطَفِّ الصَّاعِ لَمْ يَمْلَؤُهُ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْأَلُكُمْ عَنْ أَحْسَابِكُمْ (حسب وہ ہے جو آدمی اپنے اور اپنے باپ دادوں کے مآثر و مفاخر شمار کرتا ہے یا ثروتِ مال) وَلَا عَنْ أَنْسَابِكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ۔[3] لَيْسَ هُوَ فِي شَيْءٍ مِنَ الْكُتُبِ السِّتَّةِ مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ" یعنی لوگ آدم و حوا کے ہیں اور بعض ان کا نقصان میں بعض کے قریب ہے، بے شک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمھارے حسب اور نسب کا سوال نہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۳۳۰۶/۱۰) مسند عبد بن حميد (۲۵۳/۱) اس کی سند میں "موسیٰ بن عبیدہ" ضعیف راوی ہے۔
[2] مجمع بحار الأنوار (۴۴۹/۳) [3] مسند أحمد (۱۵۸/٤) تفسير الطبري (۳۱۳،۳۱۲/۲۲) السلسلة الصحيحة (۱۰۳۷)

تم سب میں زیادہ متقی ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے درہ بنت ابی لہب رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نبی اکرم ﷺ کے سامنے کھڑا ہوا اور آپ ﷺ منبر پر تھے۔ عرض کی: اے اللہ کے رسول! لوگوں میں سے بہترین کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: لوگوں میں سے بہترین وہ ہے جو اُن میں سب سے زیادہ قراءت کرنے والا اور اللہ عزوجل سے سب سے زیادہ ڈرنے والا اور سب سے زیادہ نیک کام کا حکم کرنے والا اور سب سے زیادہ برے کام سے منع کرنے والا اور سب سے زیادہ رشتوں کو جوڑنے والا ہے۔[1] امام احمد رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا، فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ کو دنیا کی کسی شے نے خوش نہیں کیا اور نہ ہی کسی شخص نے، مگر تقوے والے نے۔[2] (تفرد به الإمام أحمد)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴾ یعنی بے شک اللہ خوب جاننے والا ہے تم کو اور خوب خبردار ہے تمھارے کاموں سے، چنانچہ ہدایت کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ رحم کرتا ہے جس پر چاہتا ہے اور عذاب کرتا ہے جس کو چاہتا ہے وہ جس کو چاہتا ہے اور جس پر چاہتا ہے فضیلت دیتا ہے اور وہ اُن سب باتوں میں علیم وخبیر ہے۔

اس آیتِ کریمہ اور احادیثِ شریفہ سے علماء میں سے اس شخص نے استدلال کیا ہے جو اس طرف گیا ہے کہ کفاءت نکاح میں شرط نہیں ہے اور سوائے دین کے اور کچھ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی روشنی میں: ﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ﴾ دوسرے لوگ اور دلیلوں کی طرف گئے ہیں جو کتبِ فقہ میں مذکور ہیں۔ ہم نے کتاب الاحکام میں اس باب سے کچھ ذکر کیا ہے۔ وللّٰه الحمد والمنة.

طبرانی رحمہ اللہ نے عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اس نے بنی ہاشم کے ایک شخص کو سنا جو کہتا تھا کہ میں لوگوں سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ سے لگاؤ رکھنے والا ہوں۔ "فَقَالَ غَيْرُهُ: أَنَا أَوْلَى بِهِ مِنْكَ وَلَكَ مِنْهُ نِسْبَةٌ" (یہاں شاید ایک "قال" رہ گیا ہے۔ والله أعلم۔ کیوں کہ "فقال" کا فاعل تو عبدالرحمان ہیں اور دوسرے "قال" کا فاعل غیر ہے) یعنی تو عبدالرحمان بولا کہ تیرے غیر نے کہا کہ میں اُن کے ساتھ تجھ سے بڑھ کر لگاؤ رکھنے والا ہوں، حالانکہ تجھے ان سے نسبت ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى ﴾ سے مراد آدم وحوا ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ وہ سب برابر ہیں، اس لیے کہ ایک نسب سے متصل ہوتے ہیں اور اُن کو ایک باپ اور ایک ماں جمع کرتے ہیں اور یہ

---

[1] مسند أحمد (٤٣٢/٦) [2] مسند أحمد (٦٩/٦) اس کی سند میں "ابن لہیعہ" ضعیف راوی ہے۔

[3] المعجم الکبیر (١٣٤/١) تفسیر ابن کثیر (٢٧٥/٤_٢٧٧)

ہے کہ انساب کی وجہ سے آپس میں فخر کرنے کی کوئی جگہ نہیں، یعنی جواز نہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ معنی ہیں کہ تمھارا ایک باپ اور ایک ماں ہے تو اب سب برابر ہیں۔ امام ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جب فتح کا دن ہوا تو بلال رضی اللہ عنہ چڑھے اور کعبے پر اذان دی تو بعض لوگوں نے کہا: کیا کعبے کی پشت پر یہ کالا غلام اذان دیتا ہے اور بعض نے کہا کہ اگر اللہ اس کو ناپسند کرے گا تو اس کو متغیر کر دے گا، یعنی اس کا حلیہ تبدیل کر دے گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1] (أخرجه ابن المنذر و ابن أبي حاتم و البيهقي في الدلائل)

امام زہری رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی بیاضہ کو یہ حکم دیا کہ ان میں سے ایک عورت سے ابو ہند کا نکاح کر دیں تو وہ بولے کہ کیا ہم اپنی بیٹیاں غلاموں سے بیاہ دیں؟! اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (أخرجه أبو داود في مراسيله و ابن مردويه و البيهقي في سننه) اور زہری رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت خاص طور پر ابو ہند کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ آیت مکی ہے اور یہ خاص کر عرب کے لیے ہے۔ "اَلْمَوَالِيُ أَيْ: قَبِيْلَةٌ لَهُمْ وَأَيُّ شِعَابٍ"[2] (أخرجه ابن مردويه)

"شُعُوْبٌ" جمع ہے "شَعْبٌ" بہ فتحِ شین کی۔ "شعب" کہتے ہیں: "حي عظيم" کو، جیسے: "مضر وربيعة" اور قبائل ان سے کم ہیں، جیسے: "ربيعة" میں سے بنی بکر اور مضر میں سے بنی تمیم۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا یہ مفسرین میں سے ایک جماعت کا قول ہے۔ ان کے تشعب اور اجتماع کے سبب سے اُن کا نام شعب رکھا، مثل شعب درخت کی شاخوں کے۔ شعب من جملہ اسمائے اضداد ہے۔ جب تم کسی شے کو جمع کرو تو کہو گے: "شَعَبْتُہٗ" اور جب ان کو متفرق کرو گے تب بھی "شَعَبْتُہٗ" کہو گے۔ اسی تفریق کے معنی سے موت کا نام شعوب رکھا ہے، اس لیے کہ وہ مفرق ہے۔

اب رہا "شِعْبٌ" بالکسرہ تو وہ پہاڑ میں راستہ ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شعب وہ ہیں جو قبائل عرب و عجم میں متشعب ہوئے اور جمع شعوب ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "شعوب" وہ ہیں جو نسب سے بعید ہیں اور قبائل اُن کے علاوہ ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: شعوبِ نسب اقرب ہیں۔ کسی نے کہا: اعلیٰ طبقاتِ نسب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یمن کے شعوب عرب ہیں قحطان سے اور قبائل ربیعہ و مضر اور باقی عدنان سے ہیں۔

امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے حکایت کیا ہے کہ شعب قبیلہ سے اکثر ہوتا ہے، پھر قبیلہ، پھر عمارہ، پھر بطن، پھر فخذ، پھر فصیلہ، پھر عشیرہ اور ہر ایک اپنے ماقبل میں شامل ہوتا ہے، پس قبائل تو شعوب کے نیچے اور عمائر قبائل کے تحت ہیں اور بطون عمائر کے نیچے اور افخاذ بطون کے تحت میں اور فصائل افخاذ کے نیچے اور عشائر فصائل کے تحت میں۔ پس خزیمہ تو شعب ہے اور کنانہ قبیلہ ہے اور قریش عمارہ ہے اور قصی بطن ہے اور عبد بن مناف فخذ ہے اور بنو ہاشم فصیلہ ہے اور عباس عشیرہ ہے۔ عشیرہ کے بعد کوئی حی نہیں ہے کہ اس کا وصف کیا جائے۔ جمہور کا جو یہ قول تھا کہ شعب قبیلہ سے اکثر

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۳۰۶/۱۰) [2] الدر المنثور (۵۷۸/۷)

ہے، چنانچہ جو امور اس کی تائید کرتے ہیں، ان میں سے شاعر کا یہ قول ہے:

قَبَائِلُ مِنْ شُعُوْبٍ لَيْسَ فِيْهِمْ كَرِيْمٌ قَدْ يُعَدُّ وَلَا نَجِيْبُ [1]

یعنی کئی قبیلے شعوب سے ایسے ہیں کہ ان میں کوئی کریم نہیں ہے کہ کبھی اس کا شمار کیا جائے اور نہ کوئی نجیب ہے۔

جب قبائل من شعوب کہا تو معلوم ہوا کہ شعب قبیلے سے اکثر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ''شعوب'' قبائلِ عظام ہیں اور ''قبائل'' بطون۔ [2] ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ شعوب جماع ہیں اور قبائل تو وہ افخاذ ہیں کہ ان سے باہم ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ [3] ان کا تیسرا قول یہ ہے کہ قبائل افخاذ ہیں اور شعوب جمہور ہیں مضر کی طرح۔ [4]

﴿ لِتَعَارَفُوْا ﴾ کو جمہور نے بہ تخفیفِ تاء پڑھا ہے، اصل میں ''لِتَتَعَارَفُوْا'' ہے ایک حرفِ تاء حذف کر دیا گیا ہے اور بزی نے بہ تشدیدِ تاء بنا بر ادغام پڑھا ہے اور امام اعمش رحمہ اللہ نے بدو تاء پڑھا ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ''لِتَعْرَفُوْا'' بنا بر مضارع ''عَرَفَ'' پڑھا ہے اور حرفِ لام ﴿ خَلَقْنٰكُمْ ﴾ سے متعلق ہے، یعنی ہم نے تم کو ایسا پیدا کیا، تاکہ تمھارا بعض بعض کو پہچانے۔ [5] تعارف کا فائدہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے نسب کی طرف منسوب ہو اور اپنے غیر کی طرف منسوب نہ ہو اور اپنا رشتہ جوڑے اور اپنے رشتہ داروں سے بہ حسنِ سلوک پیش آئے۔

مقصود اس سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا پیدا کیا ہے اس فائدے کے لیے، نہ کہ تفاخر کے لیے کہ آپس میں اپنے نسبوں کے ساتھ فخر کریں اور نہ ہی اس دعوے کے لیے پیدا کیا کہ یہ شعب اس شعب سے افضل ہے، یہ قبیلہ اس قبیلے سے زیادہ عزت والا ہے اور یہ بطن اس بطن سے اشرف ہے۔ فخر تو صرف تقوے ہی سے ہے۔

غرضیکہ آپس میں فخر کرنے کی ممانعت جس پر کلام دال ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ وجہ ذکر فرمائی: ﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ﴾ یعنی تم آپس میں ایک دوسرے پر فخر مت کرو اس لیے تمھارے آپس میں ایک دوسرے پر فضیلت صرف تقوے سے ہے، لہٰذا جس شخص میں تقویٰ ہے وہی اس کا مستحق ہے کہ اکرم و اشرف و افضل ہو اس شخص سے جس میں تقویٰ نہیں ہے۔ چنانچہ تم لوگ نسب میں فخر کرنے کی جس روش پر چل رہے ہو اس کو چھوڑ دو، کیوں کہ وہ نہ تو کسی کرم کا موجب ہوتا ہے اور نہ کسی شرف کا مثبت اور نہ کسی فضل کا مقتضی ہے۔ یہ بات کہ تقوے ہی سے بندے ایک دوسرے سے افضل ہوتے ہیں، اس کے متعلق صحیح وغیرہ میں حدیثیں وارد ہوئی ہیں جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ﴿ اَتْقٰىكُمْ ﴾ کی تفسیر میں مروی ہے، فرمایا: ''أَتْقَاكُمْ لِلشِّرْكِ'' [6] یعنی اللہ کے نزدیک سب سے بڑھ کر عزت والا وہی ہے جو سب سے بڑھ کر شرک سے بچتا ہے۔ جمہور نے ''إِنَّ'' کو بہ کسر پڑھا ہے اور

---

[1] فتح القدير (٨٩/٥) [2] الدر المنثور (٥٧٨/٧) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٠٦/١٠)
[4] الدر المنثور (٥٧٨/٧) [5] فتح القدير (٨٩/٥) [6] الدر المنثور (٥٧٨/٧)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فتح پڑھا ہے: ”أَيْ: لِأَنَّ أَكْرَمَكُمْ“[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾ یعنی بے شک اللہ ہر معلوم کو جاننے والا ہے، ان میں سے تمھارے اعمال ہیں اور خوب خبردار ہے اس چیز سے جس کو تم چھپاتے ہو اور جس کو ظاہر کرتے ہو۔ ان میں سے اس پر کوئی شے پوشیدہ اور مخفی نہیں ہے۔ جب اللہ پاک نے یہ امر ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو بڑا متقی ہے اور افضل تقویٰ ایمان تھا تو وہ شے ذکر کی جس کو عرب کہتے تھے، یعنی ایمان کا دعویٰ تا کہ ان کے لیے شرف اور فضیلت ثابت ہو جائے۔ چنانچہ فرمایا:[2]

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا
وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَا
الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا
وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۶﴾ يَمُنُّوْنَ
عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ
عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ
اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾

دیہاتیوں نے کہا: ہم ایمان لائے۔ آپ کہہ دیجیے: تم ایمان نہیں لائے، لیکن تم یوں کہو کہ ہم نے اسلام قبول کیا اور ابھی تک ایمان تمھارے دلوں میں داخل (راسخ) نہیں ہوا، اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تو وہ تمھارے اعمال (کی جزا) میں سے کچھ بھی کم نہیں کرے گا، بلاشبہ اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے ⑭ بس (سچے) مومن تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، پھر انھوں نے شک نہ کیا اور انھوں نے اپنے مالوں اور اپنی

[1] فتح القدیر (۵/۹۰) [2] فتح البیان (۱۳/۱۵۱۔۱۵۳)

جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے (مومن) ہیں⑮ (اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: کیا تم اللہ کو اپنے دین کی خبر دیتے ہو؟ حالاں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے⑯ وہ (دیہاتی) آپ پر احسان جتاتے ہیں کہ وہ مسلمان ہوئے، کہہ دیجیے: تم مجھ پر اپنے اسلام (لانے) کا احسان نہ جتاؤ، بلکہ اللہ تم پر یہ احسان فرماتا ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کی ہدایت دی، اگر تم سچے ہو⑰ بلاشبہ اللہ آسمانوں اور زمین کی چھپی باتیں جانتا ہے اور اللہ خوب دیکھ رہا ہے جو تم عمل کرتے ہو⑱

مومن و مسلم کے فرق کا بیان:

ایک کہتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں، یعنی اسلام کا دین ہم نے قبول کر لیا اس کا مضائقہ نہیں اور ایک یہ کہتا ہے کہ ہم کو پورا یقین، یعنی ایمان ہے، اگر پورا یقین ہے تو اس کے آثار کہاں ہیں۔ جو سچا مومن ہے اس کو یہ دعویٰ کرتے ہوئے، ڈر لگتا ہے۔ یعنی اگر تمھارا دعویٰ سچا ہے تو آپ کہیے کہ کیا ہو جس کے ساتھ تعلق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تو وہ خود خوب جانتا ہے، جو نیکی اپنے ہاتھ سے ہو تو اس میں اپنا کوئی کمال اور تعریف نہیں، تعریف تو رب کی ہے جس نے وہ نیکی کروائی۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان گنواروں پر انکار فرماتا ہے جو اسلام میں داخل ہوئے اور شروع شروع میں ہی اپنے لیے ایمان کے مقام کا دعویٰ کر بیٹھے، حالانکہ ایمان ابھی اُن کے دلوں میں جما ہی نہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ﴾ اس آیتِ کریمہ سے یہ بات حاصل ہوئی کہ ایمان اسلام سے زیادہ خاص ہے جیسا کہ اہلِ سنت و جماعت کا مذہب ہے اور اسی پر حدیثِ جبریل دال ہے، جبکہ انھوں نے اسلام کے متعلق سوال کیا، پھر ایمان کے متعلق پوچھا اور پھر احسان کے متعلق پوچھا، چنانچہ عام سے خاص کی طرف ترقی کی، پھر خاص الخاص کی طرف ترقی کی۔

امام احمد رحمہ اللہ نے عن عامر بن سعد بن ابی وقاص عن ابیہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ لوگوں کو کچھ عطا فرمایا اور اُن سے ایک مرد کو کچھ نہ دیا تو سعد رضی اللہ عنہ بولے: اے اللہ کے رسول! آپ نے فلاں فلاں کو عطا کیا اور فلاں کو کچھ نہ دیا، حالانکہ وہ مومن ہے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «أَوْ مُسْلِمٌ» یہاں تک کہ سعد رضی اللہ عنہ نے تین بار وہی بات کہی اور آپ ﷺ فرماتے تھے: «أَوْ مُسْلِمٌ» پھر آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک میں البتہ کچھ لوگوں کو دیتا ہوں اور اس شخص کو کچھ نہیں دیتا جو اُن سے زیادہ مجھے محبوب ہے اور اس خوف سے کہ وہ کہیں اپنے منہ کے بل آگ میں اوندھے ڈالے جائیں۔[1] (أخرجه في الصحيحين من حديث الزهري به)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٠) مسند أحمد (١٧٦/١)

چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے مومن اور مسلم کے درمیان فرق کر دیا، اس بات نے اس بات پر دلالت کر دی کہ ایمان اسلام سے زیادہ خاص ہے۔ (وقد قررنا ذلك بأدلته في أول شرح كتاب الإيمان من صحيح البخاري، ولله الحمد والمنة) اور اس نے اس پر دلالت کی کہ وہ شخص مسلمان تھا، منافق نہ تھا، اس لیے کہ اس کو عطا سے چھوڑ دیا اور جو اسلام اس میں تھا، اس کو اس کی طرف سپرد کیا، چنانچہ یہ بات اس پر دال ہے کہ یہ گنوار لوگ جو اس آیت میں مذکور ہیں منافق نہ تھے وہ جو تھے وہ مسلمان تھے، ایمان ان کے دلوں میں مستحکم نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے لیے اس مقام کا دعویٰ کر بیٹھے جو اس مقام سے بلند تھا جس پر وہ پہنچے تھے۔ چنانچہ اس بارے میں انھیں ادب سکھایا گیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابراہیم نخعی اور قتادہ رحمہ اللہ کے قول کے یہ معنی ہیں اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ اور ہم نے یہ بات صرف اس لیے کہی کہ بخاری رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ وہ منافق تھے، ایمان کا اظہار کرتے تھے۔ حالانکہ وہ ایسے نہ تھے۔[1]

امام سعید بن جبیر، مجاہد اور ابن زید رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انھوں نے ﴿ وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے: "أَيْ: اِسْتَسْلَمْنَا خَوْفَ الْقَتْلِ وَالسَّبْيِ" یعنی ہم قتل اور قید کے ڈر سے فرمانبردار ہو گئے۔[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنی اسد بن خزیمہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[3] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس قوم کے حق میں نازل ہوئی ہے جنھوں نے رسول اللہ ﷺ پر اپنے ایمان کا احسان رکھا تھا۔[4]

صحیح پہلا قول ہے کہ یہ وہ قوم ہے جس نے اپنے نفس کے لیے مقامِ ایمان کا دعویٰ کیا، حالانکہ وہ مقام ابھی ان کو حاصل نہ ہوا تھا، اس لیے ان کو ادب سکھایا گیا اور یہ بتا دیا کہ وہ ابھی اس مقام تک نہیں پہنچے۔ اگر وہ منافق ہوتے تو اُن سے سختی اور درشتی کی جاتی اور وہ رسوا کیے جاتے، جس طرح کہ سورت براءت میں منافقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اُن لوگوں سے جو کہا گیا ہے تو وہ ادب سکھانے کے لیے ہے کہ تو کہہ کہ تم ایمان نہیں لائے ہو، لیکن کہو کہ ہم مسلمان ہوئے ہیں اور ابھی ایمان تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا، یعنی ابھی تم ایمان کی حقیقت تک نہیں پہنچے ہو۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ﴾ یعنی اور اگر تم اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو ہم تمھارے لیے اجروں میں سے کچھ بھی کم نہ کریں گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ﴾ [الطور: ۲۱] "اور اُن کے عمل سے ہم کچھ کم نہ کریں گے۔" قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ یعنی بے شک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے اس شخص کے لیے جس نے اس کی طرف توبہ اور انابت کی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ

[1] تفسیر ابن کثیر (۴/۲۷۷، ۲۷۸)
[2] تفسیر الطبري (۲۲/۳۱۶)
[3] تفسیر الطبري (۲۲/۳۱۳، ۳۱۴)
[4] تفسیر الطبري (۲۲/۳۱۵)

سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴾ یعنی کامل مومن وہی ہیں جو اللہ پر ایمان لائے اور اس کے رسول پر، پھر شک نہ کیا اور نہ متزلزل ہوئے، بلکہ ایک حال پر جمے رہے۔ وہ حال یہی تصدیقِ محض اور خالص ہے اور اللہ کی اطاعت اور رضا مندی میں اپنی جان اور نفیس مال خرچ کیے۔ یہی لوگ اپنے قول میں سچے ہیں اگر وہ کہیں کہ وہ مومن ہیں نہ کہ وہ لوگ جو گنواروں کی طرح ہیں اور جن کا ایمان سے صرف ظاہری تعلق ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مومن دنیا میں تین قسموں کے ہیں: وہ لوگ جو اللہ پر اور اُس کے رسول پر ایمان لائے، پھر شک نہ کیا اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا اور وہ شخص جس کو لوگ اپنے مالوں پر اور اپنی جانوں پر امین رکھیں اور وہ شخص جب اسے کوئی طمع کی چیز کا پتا چلے تو اللہ عزوجل کو یاد کرے۔[1]

قولہ سبحانہ: ﴿ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ یعنی کیا تم اللہ کو اس شے کی خبر دیتے ہو جو دلوں میں چھپی ہوئی ہے، حالانکہ اللہ تو اس شے کو جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور اس شے کو جو زمین میں ہے، یعنی اس پر زمین اور آسمان میں ذرہ بھر چیز مخفی نہیں ہے اور نہ اس سے چھوٹی اور بڑی چیز پوشیدہ ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔

پھر فرمایا: ﴿ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ یعنی جو گنوار لوگ اپنے اسلام، متابعت ونصرت کا احسان رسول اللہ ﷺ پر رکھتے ہیں، ان پر رد کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تو ان سے کہہ کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان مت رکھو، کیوں کہ اس کا فائدہ تو تمھیں ہی پہنچتا ہے اور اس میں اللہ تم پر اس بات کا احسان رکھتا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی راہ بتائی، اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو جس طرح کہ نبی اکرم ﷺ نے حنین کے دن انصار سے فرمایا: اے انصار کے گروہ! کیا میں نے تم کو گمراہ نہیں پایا تو میرے سبب سے اللہ نے تم کو ہدایت کی اور تم متفرق تھے تو اللہ تعالیٰ نے میرے سبب سے تم میں الفت پیدا کر دی اور تم محتاج تھے تو میرے سبب سے اللہ نے تم کو آسودہ کر دیا۔ جب آپ ﷺ کچھ فرماتے تو انصار کہتے کہ "اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمَنُّ"[2] یعنی اللہ اور اس کے رسول بڑے احسان کرنے والے ہیں۔

حافظ ابوبکر بزار نے عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی طرف بنی اسد آئے تو کہا: اے اللہ کے رسول! ہم مسلمان ہوئے اور عرب آپ سے لڑے اور ہم آپ سے نہ لڑے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان کی سمجھ قلیل ہے اور شیطان ان کی زبانوں پر بول رہا ہے اور یہ آیت نازل ہوئی:

---

(1) مسند أحمد (۸/۳) اس کی سند میں "دراج ابی الہیثم اور رشدین" ضعیف راوی ہیں۔

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦١)

﴿ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ۭ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ پھر امام بزار رحمہ اللہ نے کہا: ہم نہیں جانتے اسے مگر اس سند سے مروی ہے۔ نیز ابوعون محمد بن عبیداللہ نے سعید بن جبیر سے اس حدیث کے سوا کچھ روایت نہیں کیا۔[1]

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس خبر کی تکرار فرمائی کہ وہ ساری کائنات کو جانتا ہے اور مخلوقات کے اعمال کو دیکھتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾[2] آخر سورة الحجرات. ولله الحمد والمنة وبه التوفيق والعصمة.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ "اعراب" سے مراد بنی اسد ہیں۔ یہ قول امام مجاہد رحمہ اللہ کا ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ جہینہ ومزینہ واسلم واشجع وغفار ہیں۔ قولِ اول زیادہ بہتر ہے، یعنی بنی اسد نے کہا کہ ہم ایمان لائے۔ یہ وہی ہیں جنھوں نے ایک قحط کے سال میں اسلام ظاہر کیا، وہ صدقے لینے کا ارادہ رکھتے تھے۔

چنانچہ اللہ پاک نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ان پر رد کریں، لہٰذا فرمایا: ﴿ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا ﴾ یعنی تو کہہ کہ تم ایمان نہیں لائے، مطلب یہ ہے کہ تم نے دل کے اعتقاد اور خلوصِ نیت اور طمانیتِ قلب سے صحیح تصدیق نہیں کی ﴿ وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا ﴾ یعنی لیکن تم کہو کہ ہم قتل وقید کے ڈر سے مطیع ہو گئے، یا صدقے کے طمع میں۔ یہ منافقوں کی صفت ہے، اس لیے کہ وہ ظاہری طور پر مسلمان ہوئے اور اُن کے دل ایمان نہیں لائے۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ ﴾ یعنی تم نے جو اپنی زبانوں سے ظاہر کیا وہ تمھارے دلوں کی موافقت سے نہ تھا، بلکہ صرف زبان سے ادا کی گئی ایک بات تھی جو صحیح اعتقاد اور خالص نیت کے بغیر تھی۔ یہ جملہ یا تو مستانفہ ہے جو ماقبل کی تقریر وتاکید کے لیے ہے، کیوں کہ پہلے ان پر عدمِ ایمان کا حکم لگایا، پھر اس جملے سے اس کی تاکید کی، یا محلِ نصب میں ہے بنا بر حال۔

کلمۂ ﴿ لَمَّا ﴾ میں توقع کے معنی ہیں اور یہ جملہ تکرار ہے لیکن مستقل بہ فائدہ زائدہ ہے۔ اس لیے کہ اول سے تو ایمان کی نفی معلوم ہوئی اور دوسرے سے ایمان کی نفی حصولِ ایمان کی توقع کے ساتھ ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسلام ظاہر کرنا خضوع وفروتنی کا ہے اور اس شے کو قبول کرنا جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے اور اسی سے خون روکا جاتا ہے۔ پھر اگر اس اظہار کے ساتھ اعتقاد اور تصدیق بہ قلب ہو تو یہ ایمان ہے اور اس کا حامل مومن ہے[4] اور ﴿ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ ﴾ کہہ کر اُن لوگوں کو ایمان سے خارج کر دیا، یعنی تم نے تصدیق نہیں کی

---

[1] مسند البزار (۳۲۸/۱۱) [2] تفسیر ابن کثیر (۲۷۷/٤_۲۷۹)
[3] تفسیر الطبري (۳۱۳/۲۲، ۳۱٤) [4] معاني القرآن (۳۸/۵)

اور تم صرف قتل سے بچنے کے لیے اسلام لائے ہو۔ فرقہ کرامیہ کا یہ مذہب کہ ایمان قلب سے نہیں ہوتا لیکن زبان سے ہوتا ہے تو یہ آیتِ کریمہ اُن کے مذہب کا توڑ کرتی ہے، کیوں کہ اس سے یہ صاف معلوم ہوا کہ ایمان دل سے ہوتا ہے۔

﴿ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اگر تم اللہ کی اور اس کے رسول کی صحیح اطاعت کرو گے جو خالص نیتوں اور تصدیق کرنے والے ان دلوں سے صادر ہوتی ہے جو منافق نہ ہوں تو تمھارے اعمال میں سے کچھ بھی کم نہ کرے گا۔ محاورے میں بولتے ہیں: "لَاتَ يَلِيْتُ إِذَا نَقَصَ، وَلَاتَهُ يَلِيْتُهُ وَيَلُوْتُهُ إِذَا نَقَصَهُ"۔ جمہور نے ﴿ يَلِتْكُمْ ﴾ پڑھا ہے "لَاتَهُ يَلِيْتُهُ" سے، جیسے: "بَاعَهُ يَبِيْعُهُ" ہے اور ابوعمرو نے "يَأْلِتْكُمْ" بہ ہمزہ "أَلَتَهُ يَأْلَتُهُ" سے پڑھا ہے، ماضی میں بالفتح اور مضارع میں بالکسر۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے قراءتِ ثانی کو اختیار کیا ہے، اس آیت کے سبب سے: ﴿ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ﴾ [الطور: ۲۱][1] اور یہ دونوں فصیح لغت ہیں۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ یعنی بے شک اللہ بلیغ المغفرت اور بلیغ الرحمت ہے، اس شخص کے لیے جس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے۔

پھر جب اللہ پاک نے یہ ذکر کیا کہ یہ لوگ جنھوں نے "آمَنَّا" کہا، وہ ایمان نہیں لائے اور نہ ہی ایمان ان کے دلوں میں داخل ہوا تو اُن مومنوں کا بیان کیا جو اس بات کے مستحق ہیں کہ ان پر اسمِ ایمان کا اطلاق کیا جائے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ یعنی مومن وہی ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے جو صحیح خالص ایمان ہے اور دل و زبان کی موافقت سے ہے، پھر اُن کے دلوں میں کچھ شبہہ داخل نہ ہوا اور نہ شکوک میں سے کوئی شک اُن کے ساتھ خلط ملط ہوا۔ کلمۂ ﴿ ثُمَّ ﴾ تراخی (دیر کرنا) کے لیے ہے، اس سے منظور اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ جس وقت انھوں نے ایمان حاصل کیا یا جس وقت اُن کا ایمان ظاہر ہوا، صرف اسی وقت اُن سے شک و شبہہ کی نفی نہیں چاہیے، بلکہ اس کے بعد بھی وہ آیندہ زمانے میں بھی ہر وقت شک و شبہہ سے پاک رہیں۔

گویا یوں فرمایا: "ثُمَّ دَامُوْا عَلَى ذَلِكَ" یعنی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، پھر اسی پر قائم و دائم رہے اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اس کی اطاعت میں اور اس کی رضا کی طلب کی خاطر جہاد کیا۔ جن اعمالِ صالحہ کا اللہ تعالیٰ نے امر فرمایا ہے، وہ سب جہاد میں داخل ہیں، اس لیے کہ وہ من جملہ اس شے کے ہیں جس کے ساتھ آدمی اپنے نفس کے ساتھ مجاہدہ کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے ساتھ قائم ہو اور اس کو ادا کرے، جیسا کہ اللہ پاک نے امر فرمایا ہے اور ساری طاعتیں اللہ پاک کے راستے میں ہیں اور مجاہدہ باموال عبارت ہے مالی عبادتوں سے جیسے: زکاۃ۔ یہاں اموال کا ذکر نفس سے پہلے کیا، اس لیے کہ مال اس پر حرص کرتا ہے، کیوں کہ اس کا مال اس کی روح کا حقیقی بھائی ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي (۱٦/۳٤۸، ۳٤۹)

﴿ جٰهَدُوْا ﴾ بہ معنی بذل جہد ہے، یعنی اطاعتِ الٰہی میں اپنی طاقت اور توانائی کو صَرف کرنا یا مفعول اس کا مقدر ہے: "أَيْ: اَلْعَدُوَّ أَوِ النَّفْسَ وَالْهَوٰی"۔ ﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴾ یعنی وہ لوگ جو امورِ مذکورہ کے درمیان جامع ہیں، یعنی جن میں وہ اُمور موجود ہیں، وہی ایمان کے ساتھ متصف ہونے میں سچے ہیں اور اہلِ ایمان کے شمار میں داخل ہیں نہ کہ وہ لوگ جو ان کے سوا ہیں جنھوں نے صرف اپنی زبان سے اسلام کا اظہار کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ مومن ہیں، حالانکہ ان کے دلوں نے ایمان کے ساتھ چین نہیں پکڑا اور نہ ان تک اس کے معنی پہنچے ہیں اور نہ اہلِ ایمان جیسے اعمال کیے ہیں۔ یہ وہ اعراب ہیں جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اور سارے اہلِ نفاق ہیں۔

پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو یہ حکم دیا کہ یہ اعراب اور جو اُن جیسے لوگ ہیں اُن سے ایک اور بات کہہ دیں جبکہ انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ مومن ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ﴾ تعلیم یہاں بہ معنی اعلام و اخبار (بتانا اور خبر دینا) ہے، اسی لیے ﴿ بِدِيْنِكُمْ ﴾ میں حرفِ باء داخل کیا گیا ہے، یعنی کیا تم خبر دیتے ہو اس کو اپنے دین کی جبکہ تم نے کہا: "آمَنَّا" حالانکہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، پھر اس پر تمھارے ایمان کا جس کا تم دعویٰ کرتے ہو، بطلان کیسے مخفی رہے گا۔

جملہ ﴿ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ ... الخ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال ﴿ تُعَلِّمُوْنَ ﴾ کے مفعول سے۔ ﴿ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ اور اللہ کو ہر شے کی خبر ہے، اس میں سے کوئی پوشیدہ شے بھی اس پر مخفی نہیں ہے اور وہ اس کفر کو جان چکا ہے جس کو تم چھپاتے ہو اور اس اسلام کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو نقصان کے خوف سے، یا کوئی نفع حاصل کرنے کی اُمید میں۔

﴿ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ۭ ﴾ یعنی وہ اپنے اسلام کو تم پر احسان شمار کرتے ہیں، جبکہ یہ کہا کہ ہم اثقال اور عیال لے کر تیرے پاس آئے اور ہم تجھ سے نہ لڑے جیسے بنی فلاں و بنی فلاں تجھ سے لڑے یہ بات عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہما نے کہی تھی۔[1] (أخرجه ابن مردويه وغيره. قال السيوطي بسند حسن و ابن عباس رضی اللہ عنہما نحوه) اور ذکر کیا ہے کہ وہ بنی اسد ہیں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ "مَنّ" کہتے ہیں نعمتوں کے شمار کرنے کو اس شخص پر جس پر نعمتیں کی گئی ہوں اور مخلوق کی طرف سے ایسا کرنا قابلِ مذمت ہے اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے قابلِ تعریف ہے۔

پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو اس بات کا حکم دیا کہ جو اُن سے اس وقت کہیں جب وہ اپنے اس اسلام کا، جس کے وہ مدعی ہیں، احسان رکھیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ ﴾ یعنی تم اپنے اسلام کو مجھ پر احسان نہ سمجھو، کیوں کہ اسلام وہ نعمت ہے کہ اس کا عطا کرنے والا اس شخص سے اس کا کوئی اجر یا ثواب طلب نہیں کرتا، جس پر اس کا انعام کیا ہے، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ ﴾ یعنی بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تم کو اس کی طرف راہنمائی کی اور اس کا راستہ تم کو دکھایا، خواہ تم مطلوب تک پہنچو یا نہ پہنچو۔

---

[1] الدر المنثور (۵۸۵/۷)

﴿ اَنْ اَسْلَمُوْا ﴾ کا نصب یا تو بنا بر مفعول بہ ہے اس طرح سے کہ ﴿ یَمُنُّوْنَ ﴾ کے معنی میں "یعدون" کے معنی شامل کریں، یا بہ نزع خافض "أَيْ: لِأَنْ أَسْلَمُوْا" اسی طرح ﴿ اَنْ هَدٰىكُمْ ﴾ بھی انہیں دو وجہ کا محتمل ہے۔ جمہور نے "أن هدكم" کو بہ فتح ہمزہ پڑھا ہے اور عاصم نے بہ کسر ہمزہ پڑھا ہے[1] (نسبت کسر "اِن" کی عاصم کی طرف مکرر غور کیا جائے۔ شبہہ یہ ہے کہ اگر عاصم کی قراءت بہ کسر ہوتی تو اس ملک کی قراءت ضرور یہی ہوتی البتہ یہ ممکن ہے کہ عاصم سے غیر حفص نے نقل کی ہو، مگر ایسی صورت میں عاصم کی طرف نسبت علی الاطلاق عادتاً مستبعد ہے۔ حافظ مولوی عبدالعزیز مصحح سلمہ اللہ تعالیٰ) ﴿ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴾ کا جواب محذوف ہے۔ ما قبل اس پر دال ہے: "أَيْ: إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ فَلِلّٰهِ الْمِنَّةُ عَلَيْكُمْ" یعنی اگر تم اس بات میں سچے ہو جس کا دعویٰ کرتے ہو تو تم پر اللہ تعالیٰ ہی کا احسان ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے اس شے کو جو غائب ہے آسمان و زمین میں، ان سے کوئی شے اس پر مخفی نہیں ہے، پھر تمھارا حال کیسے اس پر مخفی رہے گا، بلکہ وہ تمھارے چھپے اور کھلے کو جانتا ہے اور اللہ اس شے کو خوب دیکھنے والا ہے جو تم کرتے ہو۔ اس میں سے کچھ بھی اس پر پوشیدہ نہیں ہے۔ پس وہ تم کو جزا دینے والا ہے، خیر کی جزا خیر اور شر کی جزا شر۔ اس میں اس بات کا بیان ہے کہ وہ سچے نہیں ہیں۔ جمہور نے "تعلمون" بہ تائے فوقیہ پڑھا ہے بنا بر خطاب اور ابن کثیر نے بہ یائے تحتیہ بنا بر صیغۂ غائب پڑھا ہے۔[2] هذا آخر تفسير سورة الحجرات.

خاتمہ:

الحمد للّٰہ و المنة کہ تفسیر سورۃ الحجرات ہفت دہم (۱۷) ماہ شوال ۱۳۱۴ ہجری روز یک شنبہ (اتوار) وقتِ نمازِ صبح تمام ہوئی اور اس کے تمام ہونے سے ترجمان القرآن کی تیرھویں جلد ختم ہوئی۔ اللہ پاک قبول فرمائے۔ اب بحول اللہ وقوتہ ان شاء اللہ چودھویں جلد شروع ہوگی۔ الٰہی سیدی مولائی محض تیرے فضل و کرم سے یہ وقت آیا کہ نوبت یہاں تک پہنچی اسی طرح اب تو اس آخری جلد کو بھی جلد لکھوا دے گا تجھ پر سب کام آسان ہیں۔ انسان ضعیف البنیان سے بغیر تیری مدد اور عنایت کے کوئی کام ممکن نہیں ہے۔ اس کی تحریر میں جو غلطی و نسیان و سوئے ادراک ہوا ہو اور کتابت کے دوران میں جو خطراتِ نفسانی و خیالاتِ شیطانی و توہمات حظوظ دنیائے دنی دل میں گزرے ہوں، ان سب کو معاف کر دے، بندے کا کام سہو و خطا ہے اور مالک کا کام عفو و عطا ہے

آنکس کہ گنہ نکرد پیدا نبود   او خود خلفِ آدم و حوا نبود
حق ست اگر خطا از انسان نشود   عبدست اگر عفو خدا را نبود

---

[1] تفسیر القرطبی (۱۶/۳۵۰)   [2] تفسیر القرطبي (۱۶/۳۵۰) فتح البیان (۱۳/۱۵۳۔۱۵۶)

''وہ شخص جس نے گناہ نہ کیا پیدا نہیں ہوا۔ وہ تو آدم وحوا کا جانشیں نہیں۔ اگر انسان سے خطا نہیں ہوتی تو یہ بات درست ہے۔ اگر خدا کے پلے عفو و درگزر نہیں تو وہ بندہ ہے۔''

اللهم اجعلنی مفتاحا للخیر مغلاقا للشر ؎

ایں عمر بباد نو بہاراں ماند ایں عیش بسیل کوہساراں ماند
زنہار چناں تری کہ بعد از مرداں انگشت گزیدنی بیاراں ماند

''یہ عمر نئی بہار کی ہوا کی نذر ہوگئی۔ یہ زندگی پہاڑی سیلاب کی مانند تھی۔ ایسی زندگی ہرگز بسر نہ کر کہ مرنے کے بعد دوست حیران و پشیمان ہوں۔''

اللهم أحسن عواقبنا في الأمور كلها وأجرنا من خزي الدنيا وعذاب البرزخ وعذاب الآخرة. اللهم افتح علينا حكمتك و افتح علينا رحمتك يا ذا الجلال والإكرام، اللهم اغفر لنا ولوالدينا وأقاربنا وأحبابنا و اغفر لصاحب الترجمان مغفرة ظاهرة وباطنة لا تغادر ذنبا آمين.

اللهم انصر من نصر دين محمدﷺ واخذل من خذل دين محمدﷺ يا دافع البليات ادفع عنا البلايا كلها و يا كافي المهمات اكف مهماتنا و يا قاضي الحاجات اقض حاجاتنا واقض ديوننا، اللّٰهم اكفنا بحلالك عن حرامك وأغننا بفضلك عمن سواك، وانصرنا على أعدائنا بحولك وقوتك، اللهم اغفرلنا وتب علينا آمين، وصل وسلم وبارك على سيدنا ومولانا سيد المرسلين و شفيع المذنبين محمد وعلى آله الطيبين و صحبه الأكرمين إلى يوم الدين آمين.

وأنا العبد المذنب الراجي رحمة ربه الباري ذوالفقار أحمد النقوي البوفالي السهارنفوري ـعفا اللّٰه عنه ـ ما جناه واستعمله فيما يحبه و يرضاه آمين، والحمد للّٰه أولا وآخر وظاهرا وباطنا.

تمت بالخير

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سُوْرَۃُ قٓ

اللهم اشرح لنا صدورنا، ويسرلنا أمورنا، واستر عيوبنا، واغفر ذنوبنا، اللهم فصل وسلم وبارك على سيدنا ومولانا محمد وعلى آله وصحبه الغر الميامين إلى يوم الدين. آمين

اس سورت مبارکہ کی پینتالیس (۴۵) آیتیں ہیں۔ امام حسن، عکرمہ، عطاء اور جابر رحمہ اللہ کے قول کے مطابق سب کی سب مکی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ مکی ہے سوائے اس آیت کے: ﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴾۔ [ق: ۳۸][1] نیز سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سورت قٓ مکے میں نازل ہوئی۔[2] (أخرجه ابن الضريس والنحاس وابن مردويه والبيهقي وأخرج ابن مردويه عن ابن الزبير رضي الله عنه مثله)

مفصل سورتوں کا بیان:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بنا بر قولِ صحیح یہ سورت حزبِ مفصل میں سے سب سے پہلی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حجرات اول حزبِ مفصل ہے اور عوام جو یہ کہتے ہیں کہ سورت عمّ سے ہے، تو اس کی کچھ اصل نہیں اور نہ ہی علمائے معتبرین رحمہم اللہ میں سے کسی نے یہ کہا ہے۔ ہمارے علم میں اور اس بات کی دلیل کہ یہ سورت پہلی مفصل سورت ہے وہ حدیث ہے جو امام ابو داود رحمہ اللہ نے اپنی سنن کے باب "تحزيب القرآن" میں اوس بن حذیفہ رحمہ اللہ کی سند سے روایت کی ہے۔ اوس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ثقیف کے وفد میں آئے، چنانچہ احلاف تو مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے پاس اترے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی مالک کو اپنے ایک قبے میں اتارا۔ مسدد رحمہ اللہ نے کہا اور اوس ان ایلچیوں میں سے تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ثقیف سے آئے تھے۔

اوس نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز عشاء کے بعد ہمارے پاس آتے، ہم سے باتیں کرتے تھے۔ سیدنا ابوسعید رحمہ اللہ نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دونوں پاؤں پر کھڑے رہتے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ دیر کھڑے ہونے کی وجہ سے اپنے پاؤں کے درمیان مراوحہ کرتے (آرام کے لیے کبھی ایک پاؤں پر بوجھ ڈالنا کبھی دوسرے پر) اور آپ

[1] تفسير القرطبي (۱/۱۷) [2] الدر المنثور (۵۸۷/۷)

اکثر ہم سے وہ امور بیان فرماتے تھے جو آپ ﷺ کو اپنی قومِ قریش سے پیش آئے، پھر آپ ﷺ فرماتے: « لَا سَوَاءَ » (أَيْ: ما كان بيننا وبينهم سواءٌ بل هم كانوا أولا أعزَّ ثم أَذَلَّهُمُ اللّٰهُ تَعَالىٰ. كذا في فتح الودود۔ مصحح سلمه) یعنی حال یکساں نہیں رہتا اور ہم ضعیف تھے، ذلیل شمار کیے گئے۔

مسدد نے کہا کہ مکے میں یہ کیفیت تھی۔ پھر جب ہم مدینے کی طرف نکلے تو لڑائی کا ڈول ہمارے اور اُن کے درمیان تھا۔ ''نَدَالُ عَلَيْهِمْ وَيَدَالُوْنَ عَلَيْنَا'' یعنی کبھی ہم اُن پر غالب ہوتے کبھی وہ ہم پر۔ اوس نے کہا: پھر ایک رات کو آپ ﷺ نے ہمارے پاس آنے میں اور اپنے معمول سے دیر کی تو ہم نے عرض کی: البتہ مقرر آپ نے اس رات ہمارے پاس آنے میں دیر لگائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر میرا قرآن کا حصہ وارد ہوا، یعنی قرآن کا جتنا حصہ روزانہ پڑھتا ہوں اس کا وقت آ گیا تو میں نے اس بات کو مکروہ جانا کہ اسے پورا کیے بغیر آؤں۔ اوس نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ وہ قرآن کو کس طرح حزب حزب کرتے ہیں، یعنی کتنے ٹکڑے کتنی منزلیں کر کے پڑھتے ہیں؟ پس کہا، یعنی صحابہ نے کہ تین، پانچ، سات، نو اور گیارہ اور حزب مفصل کا تنہا۔[1] (ورواه ابن ماجه عن أبي بكر بن أبي شيبة عن أبي خالد الأحمر به ورواه الإمام أحمد عن عبد الرحمن بن مهدي عن عبد الله بن عبدالرحمن هو ابن يعلىٰ الطائفي به)

جب یہ بات معلوم ہو گئی تو جس وقت تم اڑتالیس سورتیں گنو گے تو جو سورت اس کے بعد ہے وہ سورت ق ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ تین سورتیں تو بقرہ، آل عمران اور نساء ہیں، پانچ یہ ہیں: مائدہ، الانعام، اعراف، انفال اور براءت۔ سات یہ ہیں: یونس، ہود، یوسف، رعد، ابراہیم، حجر اور نحل۔ نو یہ ہیں: سبحان، کہف، مریم، طٰہٰ، انبیاء، حج، مومنون، نور اور فرقان۔ گیارہ یہ ہیں: شعراء، نمل، قصص، عنکبوت، روم، لقمان، الم سجدہ، احزاب، سبا، فاطر اور یٰسین۔ تیرہ یہ ہیں: صافات، صٓ، زمر، غافر، حم سجدہ، حم عسق، زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، قتال، فتح اور حجرات۔ پھر اس کے بعد الحزب المفصل ہے، جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا۔ چنانچہ یہ بات متعین ہو گئی کہ اُن میں سب سے پہلی سورت قٓ ہے اور یہی بات ہم نے کہی تھی۔ وللّٰه الحمد والمنة.

سورت قٓ کی فضیلت:

امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ابو واقد لیثی سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ عید میں کیا پڑھا کرتے تھے؟ تو واقد نے کہا کہ ''قاف'' اور ''اقتربت''[2] (و رواه مسلم و أهل السنن الأربعة من حديث مالك به وفي رواية لمسلم عن ضمرة عن عبد الله عن أبي واقد قال: سألني عمر رضی اللہ عنہ فذكره)

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣٩٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٤٥) اس کی سند میں ''عبداللہ بن عبدالرحمان بن یعلیٰ'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (ضعيف أبي داود: ٦٨/٢)

[2] صحيح مسلم (٨٩١) سنن أبي داود (١١٥٤) سنن الترمذي (٥٣٤) مسند أحمد (٢١٧/٥) سنن النسائي (١٥٦٧) سنن ابن ماجه (١٢٨٢)

حدیثِ دیگر:

امام احمد رحمہ اللہ نے ام ہشام بنت حارثہ سے روایت کیا ہے۔ کہا: البتہ ہمارا اور نبی اکرم ﷺ کا تنور دو برس یا ایک برس تک ایک ہی تھا اور میں نے سوائے سورت ﴿قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ﴾ کے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے کچھ اور اخذ نہیں کیا، آپ ﷺ ہر جمعے کے دن اسے منبر پر پڑھا کرتے تھے جبکہ لوگوں کو خطبہ سناتے۔[1] (ورواہ مسلم) امام ابو داود رحمہ اللہ نے بنت حارث بن نعمان سے روایت کیا ہے کہ میں نے نہیں حفظ کی سورت قٓ مگر رسول اللہ ﷺ سے کہ آپ ﷺ اس کے ساتھ ہر جمعے میں خطبہ پڑھتے تھے۔ اور کہا کہ ہمارا اور رسول اللہ ﷺ کا تنور ایک ہی تھا۔[2] (وكذا رواه مسلم والنسائي و ابن ماجه من حديث شعبة به)

مقصد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس سورت کو بڑے بڑے مجمعوں میں پڑھا کرتے تھے۔ جیسے عید اور جمعہ۔ اس لیے کہ یہ اُن امور پر مشتمل ہے، یعنی ابتدائے خلق، بعث، نشور، معاد، قیام، حساب، جنت، نار، ثواب، عقاب، ترغیب اور ترہیب۔[3] واللّٰه أعلم. (كذا في ابن كثير) فتح البیان میں ہے کہ مسلم وغیرہ نے قطبہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نمازِ فجر کی پہلی رکعت میں ﴿قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ﴾ پڑھا کرتے تھے۔[4]

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝١ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَاۗءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ
الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝٢ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ
رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝٣ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا
كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝٤ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ
اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝٥

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

قٓ! قسم ہے قرآنِ مجید کی ① بلکہ انھوں نے تعجب کیا کہ ان کے پاس انہی میں سے ایک ڈرانے والا آیا، پھر کافروں نے کہا: یہ تو عجیب بات ہے ② کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو کیا دوبارہ اُٹھائے جائیں گے؟) یہ واپسی تو (عقل سے) بہت بعید ہے ③ یقیناً ہمیں علم ہے جو کچھ زمین ان میں سے کم کرتی ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب (ہر چیز

[1] صحيح مسلم (٨٧٣) مسند أحمد (٦/٤٣٥)
[2] صحيح مسلم (٨٧٣) سنن أبي داود (١١٠٠)
[3] تفسير ابن كثير (٤/٢٧٩، ٢٨٠)
[4] صحيح مسلم (٤٥٧) فتح البيان (١٣/١٥٧)

کی) حفاظت کرنے والی ہے ④ بلکہ انھوں نے حق کو جھٹلایا، جب وہ ان کے پاس آیا، چنانچہ وہ ایک الجھے ہوئے معاملے میں ہیں ⑤

حروفِ مقطعات کا بیان:

ہمارے پاس سب یاد رکھنے والی کتاب ہے، یعنی وہ سارے مٹی نہیں ہو جاتے، جان سلامت ہے۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قٓ حروفِ ہجا میں سے ایک حرف ہے جو سورتوں کے شروع میں ذکر کیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: "صٓ"، "نٓ"، "الٓمٓ"، "حٰمٓ"، "طسٓ" اور اسی طرح کے اور حروف۔ امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔ چنانچہ سورت بقرہ کے آغاز میں ہم اس پر مفصل کلام کر چکے، لہٰذا یہاں پر اس کا اعادہ نہیں کریں گے۔ بعض سلف سے مروی ہے کہ قٓ ایک پہاڑ ہے جو ساری زمین کو گھیرے ہوئے ہے، اس کو جبلِ قاف کہا جاتا ہے۔ واللّٰہ أعلم.

یہ قول بنی اسرائیل کی خرافات میں سے ہے جس کو بعض لوگوں نے ان سے لیا ہے، جبکہ بنی اسرائیل سے روایت کرنا اس قسم سے ہے کہ جس کی نہ تصدیق کی جائے اور نہ تکذیب کی جائے اور میرے نزدیک یہ قول اور اس جیسے دوسرے اقوالِ بنی اسرائیل کے بعض زندیقوں کی بنائی ہوئی باتیں ہیں جن سے لوگوں پر اُن کے دین کے معاملات کو خلط ملط کرتے ہیں جس طرح کہ اس اُمت میں نبی اکرم ﷺ پر جھوٹ باندھ کر حدیثیں بنائی گئیں، باوجود اس کے کہ اس اُمت کے علماء اور حفاظ اور ائمہ جلیل القدر ہیں۔ اور کچھ زمانہ بھی پرانا نہیں ہوا ہے۔ پھر بنی اسرائیل کی اُمت کے متعلق کہو کہ ان کا کیسا حال ہوگا باوجود اس کے کہ بہت زیادہ مدتیں گزریں اور اُن میں حفاظ اور نقاد بھی تھوڑے تھے۔ اور انھوں نے شرابیں پیں اور اُن کے علماء نے کلموں کی تحریف کی اور اللہ کی کتابوں اور اس کی آیتوں کو بدل ڈالا۔ شارع ﷺ نے جو فرمایا: «وَحَدِّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَرَجَ»[1] یعنی بنی اسرائیل سے روایت کرنے کو مباح فرمایا، سو یہ جواز اس شے میں سے ہے جس کو عقل جائز رکھتی ہے۔

اب رہی وہ بات جس کو عقلیں محال جانتی ہیں اور اس کو باطل سمجھنے کا حکم کیا جاتا ہے اور لوگوں کے ظنون پر اس کا جھوٹ غالب ہے وہ اس قبیل سے نہیں ہیں۔ واللّٰہ أعلم. سلف میں سے بہت سے مفسروں نے اور اسی طرح خلف میں سے ایک کثیر گروہ نے قرآنِ مجید کی تفسیر میں اہلِ کتاب کی کتابوں میں سے بہت کچھ نقل کیا ہے، حالانکہ اُن کو اُن کی کچھ حاجت نہیں ہے۔ وللّٰہ الحمد والمنة.

یہاں تک کہ ابو محمد عبدالرحمان بن ابی حاتم رازی رحمہ اللہ نے بہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس جگہ ایک اثرِ غریب

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٧٤)

وارد کیا ہے جس کی سند صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ بہ سندِ خود عن مجاہد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس زمین کے پیچھے ایک دریا پیدا کیا ہے جو اس کو گھیرے ہوئے ہے، پھر اس دریا سے پرے ایک پہاڑ پیدا کیا ہے جس کو قاف کہا جاتا ہے، آسمانِ دنیا اس پر مرفوع (بلند کیا گیا) ہے، پھر اس پہاڑ سے پرے ایک زمین پیدا کی ہے جو اس جیسی سات زمینوں کی طرح ہے، پھر اس سے پرے ایک دریا پیدا کیا ہے جو اس کو گھیرے ہوئے ہے، پھر اس کے پرے ایک پہاڑ پیدا کیا ہے جس کو دسرے آسمان کا قاف کہا جاتا ہے۔ وہ آسمان اس پر مرفوع ہے، یہاں تک کہ سات زمینیں اور سات دریا اور سات پہاڑ اور سات آسمان شمار کیے ہیں، کہا: اور وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ ﴾[1] [لقمان: ٢٧] ''اور تمام سمندروں کی سیاہی ہو اور ان کے بعد سات سمندر اور ہوں۔''

چنانچہ اس اثر کی اسناد میں انقطاع ہے اور جس قول کو علی بن ابی طلحہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے قٓ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ وہ اللہ عزوجل کے اسماء میں سے ایک اسم ہے[2] اور وہ قول جو امام مجاہد رحمہ اللہ سے ثابت ہوا ہے کہ وہ حروفِ ہجا میں سے ایک حرف ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ''صٓ''، ''نٓ''، ''طسٓ''، ''الٓمٓ'' اور اسی طرح کے اور، چنانچہ یہ قول اس قول کو بعید کرتے ہیں، جو پہلے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے گزر چکا ہے اور کسی نے کہا ہے کہ ﴿ قٓ ﴾ سے مراد ''قُضِيَ الْأَمْرُ وَاللّٰهِ'' ہے یعنی کام جاری کیا گیا اور قٓ بقیہ کلمہ پر دال ہے جو حذف کیا گیا ہے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے: ع

قُلْتُ لَهَا قِفِيْ فَقَالَتْ قٓ

''یعنی میں نے اس عورت سے کہا کہ ٹھہر جا تو وہ بولی: میں ٹھہر گئی۔''

اس تفسیر میں نظر ہے، اس لیے کہ کلام میں حذف اسی وقت ہوتا ہے جب اس پر کوئی دلیل دال ہو، اس حرف کے ذکر کرنے سے یہ کہاں سمجھا جاتا ہے۔

کفار کی طرف سے رسالت و آخرت پر تعجب اور ان کا رَد:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ﴾ یعنی قرآنِ کریم اور عظیم کی قسم ہے کہ جس کے نہ آگے سے باطل آتا ہے نہ اس کے پیچھے سے، وہ حکیم حمید کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ قسم کے جواب میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے۔ چنانچہ ابن جریر رحمہ اللہ نے بعض نحویوں سے نقل کیا ہے کہ وہ یہ قول ہے: ﴿ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ﴾[3] اس توجیہ میں نظر ہے، بلکہ جواب مضمون کلام ہے بعد قسم کے، وہ مضمون نبوت کا اثبات

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٠٧/١٠) تفسير ابن كثير (٢٨١/٤) [2] تفسير الطبري (٣٢٥/٢٢) [3] تفسير الطبري (٣٢٦/٢٢)

اور معاد کا اثبات اور اس کی تقریر وتحقیق ہے، اگر چہ قسم کا جواب لفظاً مذکور نہیں ہے اور ایسا قرآن شریف کی قسموں میں بہت ہے، جیسا کہ اس آیت میں گزر چکا ہے: ﴿ صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ ۝ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ﴾ [صٓ: ۱۔ ۲] ''ص! اس نصیحت والے قرآن کی قسم بلکہ کفار غرور ومخالفت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

اسی طرح فرمایا گیا ہے: ﴿ قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴾ یعنی انھوں نے بشر میں ان کی طرف سے رسول بھیجنے پر تعجب کیا۔ جیسا کہ اللہ جل جلالہ کے اس قول میں بتایا ہے: ﴿ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ ﴾ [یونس: ۲] ''کیا اُن لوگوں کو اس بات سے تعجب ہوا کہ ہم نے اُن میں سے ایک شخص کے پاس وحی بھیج دی کہ سب آدمیوں کو ڈرایئے۔'' یعنی بشر میں سے رسول بھیجنا کچھ انوکھی بات نہیں ہے، کیوں کہ اللہ فرشتوں میں سے اور آدمیوں میں سے رسول چن لیتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کے بارے میں یہ خبر دی کہ وہ قیامت سے بھی تعجب کرتے ہیں اور اس کے واقع ہونے کو، یعنی مر کر پھر زندہ ہونے کو بعید سمجھتے ہیں۔

﴿ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ﴾ یعنی کہتے ہیں کہ جب ہم مر گئے اور بوسیدہ ہو گئے اور ہمارے جوڑ پیوند ٹوٹ پھوٹ گئے اور ہم مٹی ہو گئے تو اس کے بعد دوبارہ اسی بنیاد اور ترکیب کی طرف لوٹنا کیسے ممکن ہے۔ یہ لوٹ کر آنا بعید الوقوع ہے۔ یعنی وہ اعتقاد کرتے ہیں اس کے محال ہونے کا اور اس کے ناممکن ہونے کا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید کر کے فرمایا: ﴿ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ﴾ یعنی ہمیں واقعی اس کا علم ہے جو زمین ان کے جسموں میں سے کھاتی ہے۔ ہم ان کے بوسیدہ ہونے کو جانتے ہیں اور ہم پر یہ بات چھپی ہوئی نہیں کہ جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کہاں گئے اور کدھر گئے۔ ﴿ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ﴾ یعنی اور ہمارے پاس وہ کتاب ہے جو اُس کو یاد رکھنے والی ہے۔ چنانچہ علم میں بھی یہ سب کچھ ہے اور کتاب میں بھی یہ ساری چیزیں لکھی ہوئی ہیں۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے، یعنی ہم نے اس شے کو جان لیا جو کچھ زمین اُن کے گوشتوں، چمڑیوں، ہڈیوں اور بالوں میں سے کھاتی ہے۔ اسی طرح امام مجاہد، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم نے بھی کہا ہے۔[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر وعناد کا سبب اور جو شے بعید القیاس نہیں اس کو بعید جاننے کا باعث بیان کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ﴾ یعنی اور یہ حال اس شخص کا ہے جو حق سے نکل گیا ہے، اس کے بعد وہ جو کچھ کہے گا تو وہ باطل ہے۔ ''اَلْمَرِيْجُ: اَلْمُخْتَلَفُ الْمُضْطَرِبُ الْمُتَلَبِّسُ الْمُنْكَرُ

① تفسير الطبري (٢٢/ ٣٢٨، ٣٢٩)

خِلَالَهُ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝ يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ﴾ [الذاريات: ٨۔ ٩]
''یقیناً تم مختلف بات میں پڑے ہوئے ہو۔ اس سے وہی باز رکھا جاتا ہے جو پھیر دیا گیا ہو۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ قٓ ﴾ کے اعراب پر کلام ویسا ہی ہے جیسا کہ ہم پہلے ﴿ صٓ ﴾ کے بارے ذکر کر آئے ہیں، اس لیے کہ دونوں ایک ہی طرز کے ہیں۔ عامہ یعنی جمہور نے اس کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور کسی نے بہ کسرِ فاء پڑھا ہے، (یعنی حسن، ابن ابی اسحاق اور نصر بن عاصم رحمہم اللہ نے)۔ اور کسی نے بہ فتحِ فاء (یعنی عیسی ثقفی نے) اس لیے کہ فتح سب سے خفیف حرکت ہے۔ اور کسی نے بہ ضم پڑھا ہے، (یعنی ہارون و ابن سمیفع نے) کیوں کہ غالب امر میں حرکت بنا کی یہی ضمہ ہے، جیسے: ''مُنْذُ وَقَطُّ وَقَبْلُ وَبَعْدُ''۔[2] ﴿ قٓ ﴾ کے معنی میں اختلاف ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مفسرین نے کہا ہے کہ ﴿ قٓ ﴾ زبرجد کے ایک پہاڑ کا نام ہے جس نے دنیا کو گھیرا ہوا ہے۔ کسی نے کہا: سبز زمرد کا ہے اور آسمان اسی سے سبز ہوا ہے اور آسمان اس پر قبے کی طرح ہے۔ اور وہ اس حجاب سے پرے ہے جس کے پرے سورج غروب ہوتا ہے۔ ایک برس کی راہ پر۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: اس قول پر یہ واجب تھا کہ ﴿ قٓ ﴾ میں اعراب ظاہر ہو، اس لیے کہ وہ اسم ہے ہجاء نہیں ہے، کہا اور شاید تنہا ﴿ قٓ ﴾ اس کے اسم سے ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ ؏

قُلْتُ لَهَا قِفِيْ فَقَالَتْ قَ

''أَيْ: أَنَا وَاقِفَةٌ'' امام فراء و زجاج رحمہما اللہ نے بیان کیا ہے کہ ایک قوم نے کہا ہے کہ ﴿ قٓ ﴾ کے معنی ہیں: ''قُضِيَ الْأَمْرُ وَقُضِيَ مَا هُوَ كَائِنٌ'' جس طرح کہ ﴿ حٰمٓ ﴾ کے بارے میں کہا: ''هِيَ حَمَّ الْأَمْرُ''۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے، اس کی قسم کھائی ہے۔ یہ قول عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے، چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اسمائے قرآن سے ایک اسم ہے۔ شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فاتحہ سورت ہے۔ ابوبکر وراق رحمہ اللہ نے کہا: اس کے یہ معنی ہیں ''قِفْ عِنْدَ أَمْرِنَا وَنَهْيِنَا وَلَا تَعْدُهُمَا'' یعنی تو ہمارے امر و نہی پر ٹھہر اور اُن سے تجاوز مت کر۔

انطاکی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے قرب ہے۔ اس کا یہ بیان ہے: ﴿ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴾ [ق: ١٦] ''اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔'' امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ عزوجل کے اسماء: ''قَادِرٌ وَقَاهِرٌ وَقَرِيْبٌ وَقَابِضٌ وَقَاضٍ'' کا افتتاح ہے[3] ان کے سوا اور قول بھی ہیں جو ان سے بھی زیادہ ضعیف اور باطل ہیں۔ حق یہ ہے کہ ﴿ قٓ ﴾ اس متشابہ سے ہے جس کا علم اللہ ہی کو ہے، جیسا کہ ہم

---

[1] تفسير ابن كثير (٤/٢٨٠۔٢٨٢) [2] تفسير القرطبي (١٧/٢٠١) [3] تفسير القرطبي (١٧/٣٠٢) فتح القدير (٥/٩٤)

سورۃ البقرہ کے شروع میں بیان کر آئے ہیں۔ چنانچہ اللہ پاک ہی اس سے اپنی مراد کو خوب جانتا ہے۔

''مجید'' کے معنی یہ ہیں کہ قرآن باقی کتب منزلہ پر صاحبِ مجد اور شرف والا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ کریم ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ رفیع القدر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کبیر القدر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ کوئی شے اس سے احسن اور افضل نہیں ہے۔[2]

قسم کے جواب کے بارے میں اختلاف ہے۔ کوفیوں نے کہا ہے کہ ﴿ بَلْ عَجِبُوْٓا ﴾ جواب ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محذوف ہے: ''أَيْ: لَتُبْعَثُنَّ'' ہے۔ اس پر یہ قولہ تعالیٰ دلالت کرتا ہے: ﴿ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ﴾ امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ ﴾ ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ قَدْ عَلِمْنَا ﴾ ہے۔ بہ تقدیرِ لام ہے: ''أَيْ: لَقَدْ عَلِمْنَا''۔ کسی نے کہا ہے کہ محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''أَنْزَلْنٰهُ إِلَيْكَ لِتُنْذِرَ'' گویا یوں کہا گیا ہے کہ ﴿ قٓ ﴾ قسم ہے قرآنِ مجید کی! ہم نے اس کو تیری طرف اتارا تاکہ تو اس سے لوگوں کو ڈرائے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے جواب کی یہ تقدیر کی ہے: ''مَا آمَنَ كُفَّارُ مَكَّةَ بِمُحَمَّدٍ ﷺ''[4] یعنی قسم ہے قرآنِ کریم کی جو مشتمل ہے نبی ﷺ کی رسالت پر اور بعث ونشور کی حقیقت پر، کفارِ مکہ محمد ﷺ پر ایمان نہیں لائے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ﴾ جوابِ قسم سے اضراب ہے (کسی نے کہا ہے کہ قرآن شریف کو جو مجید کے ساتھ موصوف کیا ہے، اس سے اضراب ہے۔[5] كذا في الفتح. والله أعلم) بنا بر اختلافِ اقوال (یعنی جو عبارت جوابِ قسم قرار پائے، اس سے یہ اضراب ہے۔ یہ اس لیے کہا ہے کہ جوابِ قسم میں چند اقوال پر اختلاف ہے۔ كما مر تفسيره مصحح سلمه الله)۔

یعنی اللہ پاک نے قرآن شریف کو نبی اکرم ﷺ پر اس لیے نازل کیا کہ لوگوں کو اس سے ڈرائیں اور جو امور اس میں ہیں، اُن سے ان کو آگاہ کریں تو لوگوں کو چاہیے تھا کہ اُن پر اور قرآن پر ایمان لاتے اور اُن کے فرمان پر عمل کرتے، انھوں نے یہ نہ کیا، بلکہ اُن میں شک کیا اور اُن کو رد کیا اور اُن پر ایمان نہ لائے، اب ان کے حال کی اور زیادہ برائی سنو کہ انھوں نے اسی شک، انکار اور ایمان نہ لانے پر بھی کفایت نہ کی، بلکہ اس بات پر تعجب کیا کہ ان کے پاس ایک ڈرانے والا انہیں میں سے آیا، یعنی محمد ﷺ اور اُن کے آنے کو عجیب امور سے ٹھہرایا، حالانکہ ان کا یہ تعجب کرنا عجیب امور میں سے نہیں ہے کہ انہیں میں سے ایک شخص جس کے صادق، عادل اور امین ہونے کو وہ جان چکے ہیں، وہ اُن کو خوفناک شے سے ڈرائے اور جو شخص ایسا ہوگا وہ ضرور اپنی قوم کا خیر خواہ ہوگا اور اس بات سے ڈرتا ہوگا کہ کہیں ان کو کوئی مکروہ، یعنی ناپسندیدہ چیز نہ پہنچے۔ اور جب وہ یہ جان لے گا کہ کوئی خوفناک شے اُن پر سایہ فگن

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۳۳۰۷/۱۰) تفسير القرطبي (۳/۱۷) [2] تفسير ابن أبي حاتم (۳۳۰۷/۱۹)
[3] تفسير القرطبي (۳/۱۷) [4] تفسير الجلالين (۶۸۸/۱) [5] فتح القدير (۹۴/۵)

ہے تو اس کے لیے لازمی ہو گا کہ اس شے سے ان کو ڈرائے۔ پھر اس شے کا کیا ذکر جو انتہائی درجے کی خوفناک شے ہے، یعنی دوبارہ زندہ ہونے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا۔

غرضیکہ کلمۂ ﴿ بَلْ ﴾ سے ایک تو ان کے اس شے سے تعجب کرنے کا انکار ہے جو عجیب نہیں ہے۔ یعنی قوم کے عادل اور امین آدمی کا سخت خوفناک شے سے ڈرانے والا بن کر آنا۔ یہ ضرور ہی ہونا چاہیے۔ یہ ہرگز کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ دوسرا اُن کے اس شے سے تعجب کرنے کا انکار ہے جس کے ساتھ آپ نے ان کو ڈرایا، یعنی مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جانا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا۔ یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، کیوں کہ انھیں اس بات کا علم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان، اور جو کچھ اس میں ہے، کے پیدا کرنے پر قادر ہے اور وہ لوگ ہر شے کے پہلی دفعہ پیدا ہونے کا اقرار کرتے ہیں اور عقل بھی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ جزا کا ہونا ضروری ہے، اب بتاؤ کہ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد بعث کا ہونا کون سی تعجب کی بات ہے، ہرگز نہیں۔

پھر اللہ پاک نے دو انکاروں میں سے ایک انکار پر اعتماد کر کے ان کے تعجب کی یہ تفسیر فرمائی: ﴿ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴾ اس میں اُن کے تعجب کی زیادہ تصریح اور وضاحت ہے، کیوں کہ ﴿ عَجِبُوْٓا ﴾ میں تو صرف اُن کی طرف تعجب کی نسبت کی تھی اور اس آیت میں کھول کر فرما دیا کہ کافروں نے کہا ہے کہ یہ ایک عجیب شے ہے۔ پہلے ان کا ذکر ضمیر کے ساتھ کیا اور یہاں پر ضمیر کے بجائے اسمِ ظاہر رکھا۔ اس سے یہ بات بتانا ہے کہ وہ اس بات کے کہنے میں انتہائی سرکش ہیں اور اُن پر اُن کے کفر کا حکم لگانا ہے کہ وہ یہ کہنے سے کافر ہو گئے۔ غرضیکہ دو انکاروں میں سے ایک پر اعتماد کرنے کی یہ وجہ ہے، تاکہ اس بات پر دال ہو کہ بعث سے اُن کے تعجب کو زیادہ تر دخل ہے استبعاد میں (یعنی یہ بعید از قیاس ہے) اور زیادہ تر انکار کا مستحق ہے۔

کلمۂ ﴿ هٰذَا ﴾ کا اشارہ ﴿ رَجْعٌ ﴾ کی طرف ہے، جیسا کہ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے، یعنی یہ لوٹ کر پھر آنا عجیب شے ہے۔[1] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اشارہ انذار کی طرف ہے۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کا تعجب یہ ہے کہ وہ ایک معبود کی طرف بلائے گئے۔ کسی نے کہا ہے کہ اُن کا عجب بعث و نشور پر ہے۔ قرآن کی نص اسی پر ہے اور یہی زیادہ بہتر ہے۔ تو اب ﴿ هٰذَا ﴾ کا لفظ ایک مبہم کی طرف اشارہ ہو گا جس کی تفسیر اس قول سے کی گئی ہے: ﴿ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ﴾۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے امام قتادہ رحمہ اللہ کے قول کو زیادہ بہتر کہا ہے۔[3] امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ﴿ هٰذَا ﴾ آنے والے منذر کی طرف اشارہ ہے،[4] پھر انھوں نے کہا: ﴿ ءَاِذَا مِتْنَا ﴾۔ نیز یہاں بعد استبعاد باستفہام (سوالیہ

---

[1] تفسير النسفي (١٧٠/٤) [2] تفسير الجلالين (٦٨٨/١) [3] فتح القدير (٩٤/٥) [4] تفسير الرازي (١٣٠/٢٨)

انداز سے بعید ہونے کا اظہار) کے ایک ایسا امر پایا گیا ہے جو تعجب کے معنی ظاہر کرتا ہے۔ وہ ان کا یہ قول ہے ﴿ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ﴾ اسی لیے کہ یہ استبعاد ہے اور یہ تعجب کی طرح ہے، چنانچہ اگر اس قول سے کہ ﴿ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴾ ان کا تعجب اُن کے اس قول کی طرف راجع ہو کہ ﴿ ءَاِذَا ﴾ تو یہ تکرار کی طرح ہو گا۔ اور اگر کوئی کہے کہ تم یہ کہتے ہو: ﴿ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴾ راجع ہے "مُجِيئِ منذر" کے۔ اس سے تکرارِ صریح لازم آتی ہے اس لیے کہ ان کا تعجب "مُجِيئِ منذر" سے معلوم ہو گیا ﴿ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ ﴾ سے تو اب قول: ﴿ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴾ تکرار ہو گا؟ تو ہم کہیں گے کہ یہ تکرار نہیں ہے بلکہ تقریر ہے، کیونکہ جب ﴿ بَلْ عَجِبُوْٓا ﴾ کہا بہ صیغۂ فعل اور یہ جائز ہے کہ انسان اس شے سے تعجب کرے جو عجیب نہیں ہے، جیسے: یہ آیت ہے: ﴿ اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ [هود: ۷۳] "کیا تو اللہ کی قدرت سے تعجب کر رہی ہے۔" اور عرف میں بولتے ہیں: "لَا وَجْهَ لِتَعَجُّبِكَ مِمَّا لَيْسَ بِعَجَبٍ" تو گویا جب انھوں نے تعجب کیا تو اُن سے کہا گیا کہ تمھارے تعجب کے کچھ معنی نہیں ہیں تو وہ بولے کہ یہ شے عجیب ہے، پھر ہم اس سے تعجب کیسے نہ کریں اور یہاں پر ﴿ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ بہ حرفِ فاء فرمایا ہے تو یہ اس پر دال ہے، اس لیے کہ فاء اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ کلام اپنے ماقبل پر ترتیب دیا گیا ہے۔

جمہور نے ﴿ ءَاِذَا ﴾ استفہام کے ساتھ پڑھا ہے۔ (ابن عامر ایک روایت کے مطابق اور ابو جعفر، اعمش اور اعرج)۔ اور کسی نے ایک ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے تو اس میں استفہام کا بھی احتمال ہے مثل قراءت جمہور کے۔ اور ہمزۂ استفہام مقدر ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کے معنی اخبار ہوں، یعنی خبر دینا۔ عامل ظرف یعنی ﴿ اِذَا ﴾ میں مقدر ہے: "أَيْ: أَنُبْعَثُ" یا "أَنُرْجَعُ إِذَا مِتْنَا" اس لیے کہ اس کا مابعد اس پر دال ہے۔ یہ تو جمہور کی قراءت کی بنا پر ہے۔ رہی دوسری قراءت تو اس کی بنیاد پر ﴿ اِذَا ﴾ کا جواب محذوف ہے: "أَيْ: رَجَعْنَا" کسی نے کہا ہے کہ ﴿ ذٰلِكَ رَجْعٌ ﴾ ہے۔[1]

بالجملہ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اور مٹی ہو جانے کے بعد بعث کو اوپرا جانا، پھر جو وہ بعث کو بعید سمجھتے تھے، اس پر پختہ ہوئے تو یوں بولے: ﴿ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ﴾ یعنی یہ بعث پھیر لانا عمل سے یا فہم سے یا عادت سے یا امکان سے بعید ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "رَجَعَهُ أَرْجَعَهُ رَجْعًا وَرَجَعَ هُوَ يَرْجِعُ رُجُوْعًا" اس سے معلوم ہوا کہ ﴿ رَجْعٌ ﴾ متعدی و لازم دونوں طرح آتا ہے۔ لیکن متعدی کا مصدر ﴿ رَجْعٌ ﴾ ہے اور لازم کا رجوع ہے۔

پھر جو بات انھوں نے کہی تھی، اللہ نے اس کا رد کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ﴾ یعنی ہم نے واقعی وہ شے جان لی ہے جس کو زمین ان کے جسموں میں سے کھاتی ہے، پس اس میں سے کوئی شے ہم

---

[1] فتح القدير (۹۵/۵)

سے گم نہیں ہوتی اور جس پاک ذات کے علم نے ہر شے کو گھیر لیا ہے، یہاں تک کہ قبروں میں مردوں کے جسموں سے جو شے جاتی رہتی ہے، اس کو بھی جانتا ہے تو بعث اس سے کچھ مشکل نہیں ہے اور نہ اس سے بعید ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ نقص سے مراد موت ہے۔[1] فرمایا ہے کہ واقعی ہم نے اس کو جان لیا جو اُن سے مرتا ہے اور جو باقی رہ گیا۔ اس لیے کہ جو مر گیا تو وہ دفن کیا گیا، گویا زمین کم کرتی ہے مردوں سے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جو کوئی مشرکوں میں سے اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ ﴿ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ﴾ یعنی اور ہمارے پاس اُن کے شمار کی اور اُن کے ناموں کی اور ہر شے کی حفاظت کرنے والی کتاب ہے، یعنی لوحِ محفوظ۔ کسی نے کہا ہے کہ کتاب سے یہاں مراد علم اور احصا (شمار) ہے۔ پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے کلام کو اس بات کی طرف پھیرا اور منتقل کیا جو اس سے بھی بڑھ کر بری اور قبیح ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ﴾، کیوں کہ اس کے بعد کہ حق سے اُن کے استبعاد (بعید جاننا) کا ذکر پہلے ہو چکا، اس آیت میں اُن کے صریح طور پر تکذیب کا ذکر کیا۔ یہاں پر مراد قرآن پاک ہے۔ امام ماوردی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کے قول میں یہی ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اسلام ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ نبوت مراد ہے جو معجزوں سے ثابت ہے، یعنی انھوں نے حق کی تکذیب کی، جب وہ اُن کے پاس آیا، یعنی حق کے پہنچتے ہی بغیر سوچے سمجھے اس کی تکذیب کرنے لگے۔ جمہور نے ﴿ لَمَّا ﴾ بہ فتحِ لام وتشدیدِ میم پڑھا ہے اور حجدری نے بہ کسرِ لام وتخفیفِ میم پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ﴾ یعنی انھوں نے ڈرانے والے کے آنے کو انوکھا سمجھا، بعث کا ہونا بعید جانا، حق کو جھٹلایا، اس کے بعد ان کا یہ حال ہے کہ وہ ایک امرِ مختلط ومضطرب میں ہیں۔ کبھی ساحر کہتے ہیں، کبھی شاعر اور کبھی کاہن۔ یہ امام زجاج رحمہ اللہ وغیرہ کا قول ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امرِ مختلف میں ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ملتبس ہیں۔[3] کسی نے کہا ہے کہ فاسد میں ہیں۔ یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ﴿ مَرِيْجٍ ﴾ متغیر شے ہے۔[4] غرضیکہ "مرج" بہ معنی فساد اور اختلاط ہے۔ اس معنی سے "مَرِجَتْ أَمَانَاتُ النَّاسِ أَيْ: فَسَدَتْ وَمَرِجَ الدِّيْنُ وَالْأَمْرُ اخْتَلَطَ" ہے۔ پھر اللہ پاک نے وہ دلیل بیان کرنا شروع کی جو ان کے قول ﴿ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ﴾ کو رد کرے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[5]

---

(1) تفسير القرطبي (٤/١٧) (2) تفسير القرطبي (٤/١٧)
(3) تفسير القرطبي (٥/١٧) فتح القدير (٩٥/٥) (4) الدر المنثور (٥٩٠/٧) (5) فتح البيان (١٥٩/١٣-١٦٢)

أَفَلَمْ يَنظُرُوٓا۟ إِلَى ٱلسَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَٰهَا وَزَيَّنَّٰهَا وَمَا لَهَا مِن فُرُوجٍ ۝٦ وَٱلْأَرْضَ مَدَدْنَٰهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَٰسِىَ وَأَنۢبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيجٍ ۝٧ تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ۝٨ وَنَزَّلْنَا مِنَ ٱلسَّمَآءِ مَآءً مُّبَٰرَكًا فَأَنۢبَتْنَا بِهِۦ جَنَّٰتٍ وَحَبَّ ٱلْحَصِيدِ ۝٩ وَٱلنَّخْلَ بَاسِقَٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيدٌ ۝١٠ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۖ وَأَحْيَيْنَا بِهِۦ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذَٰلِكَ ٱلْخُرُوجُ ۝١١

کیا پھر انھوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے کیسا بنایا اور ہم نے اسے آراستہ کیا اور اس میں کوئی شگاف نہیں ⑥ اور ہم نے زمین پھیلائی، اور ہم نے اس میں مضبوط پہاڑ گاڑ دیے، اور ہم نے اس میں ہر طرح کی خوش نما نباتات اُگائی ⑦ (حق کی طرف) رجوع کرنے والے ہر بندے کی بصیرت اور نصیحت کے لیے ⑧ اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی نازل کیا، پھر ہم نے اس کے ذریعے سے باغات اور اناج کی کاٹی جانے والی فصل اُگائی ⑨ اور کھجور کے بلند و بالا درخت (پیدا کیے) جن کے شگوفے تہ بہ تہ ہیں ⑩ بندوں کی روزی کے لیے، اور ہم نے اس (پانی) کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندہ کیا، اسی طرح (مرنے کے بعد قبروں سے) نکلنا ہے ⑪

قدرتِ الٰہی کا شاہکار:

غلے وہی جس کے ساتھ اس کی کھیتی بھی کٹ جائے اور درخت پھل کے اترنے کے بعد قائم رہتا ہے۔ یعنی قبر سے۔ انتہیٰ

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو اپنی قدرت سے آگاہ فرماتا ہے جس سے اس نے وہ شے ظاہر کی جو اس شے سے بہت بڑی ہے جس کے واقع ہونے کو بعید سمجھ کر اس سے تعجب کیا۔ کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نظر نہیں کی کہ ہم نے اس کو کیسا بنایا اور اسے چراغوں سے رونق بخشی اور اس کے لیے کوئی شگاف نہیں ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شقوق نہیں ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ فتوق۔ کسی نے کہا ہے کہ صدوع۔ سب کے معنی ایک دوسرے سے قریب ہیں، یعنی اس میں دراڑیں اور سوراخ نہیں ہیں۔ جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ ٱلَّذِى خَلَقَ سَبْعَ سَمَٰوَٰتٍ طِبَاقًا ۖ مَّا تَرَىٰ فِى خَلْقِ ٱلرَّحْمَٰنِ مِن تَفَٰوُتٍ ۖ فَٱرْجِعِ ٱلْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ

[1] تفسير الطبري (٢٢/٣٣٢)

مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ﴾ [الملك: ۳۔ ٤] ''جس نے سات آسمان اوپر تلے بنائے۔ (تو اے دیکھنے والے!) اللہ رحمان کی پیدائش میں کوئی بے ضابطگی نہ دیکھے گا۔ دوبارہ (نظریں ڈال کر) دیکھ لے، کیا کوئی شگاف بھی نظر آ رہا ہے۔ پھر دوہرا کر دوبارہ دیکھ لے، تیری نگاہ تیری طرف ذلیل (و عاجز) ہو کر تھکی ہوئی لوٹ آئے گی۔'' یعنی نگاہ ذلیل ہو کر تیری طرف لوٹ آئے گی اس حال میں کہ وہ تھکی ہوئی ہوگی، اس بات سے کہ کوئی عیب دیکھے یا کسی طرح کا نقصان دیکھے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ﴾ یعنی دوسری قدرت یہ ہے کہ ہم نے زمین کو وسیع اور فراخ کیا اور اس کو بچھایا اور اس میں پہاڑ ڈال دیے، تا کہ اپنے لوگوں کو لے کر ہلے جلے نہیں، کیوں کہ وہ تو پانی کی موج پر ٹھہرائی گئی ہے جو اس کی طرف اطراف سے اس کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور اُگائیں ہم نے اس میں تمام کھیتیاں اور میوے اور سبزہ اور طرح طرح کی چیزیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ [الذاريات: ٤٩] ''اور ہر چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے تا کہ تم نصیحت حاصل کرو۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ بَهِيْجٍ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کی خوبصورت، خوش شکل چیز۔ ﴿ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى ﴾ الآية، یعنی یہ سب ہم نے تبصرہ اور ذکریٰ کے لیے بنایا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ہر خضوع اور فروتنی کرنے والے، لرزنے والے اور اللہ تعالیٰ عزوجل کی طرف رجوع ہونے والے بندے کے لیے آسمان و زمین کی پیدائش کا مشاہدہ ہے اور ان بڑی بڑی نشانیوں کا جو اُن میں بنائی ہیں، ان کا سمجھانا اور بتانا اور یاد دلانا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ﴾ یعنی تیسری قدرت یہ ہے کہ ہم نے آسمان سے فائدہ دینے والا پانی اتارا اور اس سے باغ وغیرہ اور کھیتی اُگائے جس سے دانے حاصل کرنا اور اُن کا ذخیرہ کر کے رکھ چھوڑنا مقصود ہوتا ہے۔ اور لمبے لمبے اور اونچے اونچے کھجوروں کے درخت اُگائے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، حسن، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے: "اَلْبَاسِقَاتُ: اَلطِّوَالُ"[1] یعنی کھجور کے لمبے درخت۔ ﴿ لَهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ﴾ "أَيْ: مَنْضُوْدٌ"، یعنی ان کے گچھے تہ بہ تہ۔ ﴿ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ﴾ یعنی یہ سب مخلوق کی روزی کے لیے بنایا اور اس پانی سے ہم نے ایک شہر مردہ کو زندہ کیا، مراد وہ زمین ہے جو دبی پڑی تھی، پھر جب اس پر پانی اترا تو اس نے حرکت کی اور اُبھری اور قسم قسم کی بارونق چیزیں اُگائیں، یعنی اس قسم کے پھول وغیرہ جن کے حسن اور خوبی سے آنکھ حیران رہ جاتی ہے۔ اور یہ زمین اس کے بعد کہ اس میں کوئی سبزہ نہ تھا ہری بھری ہو کر لہلہانے لگی۔ سو یہ مرنے اور ہلاک ہونے کے بعد اُٹھ کھڑے ہونے کی مثال ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (۲۲/۳۳۵)

اسی طرح اللہ پاک مُردوں کو زندہ کرے گا اور یہ اس کی عظیم قدرت کا جس کے ساتھ مشاہدہ ہو رہا ہے، یہ اِس شے سے بھی بڑی شے ہے جس کا منکرینِ بعث نے انکار کیا ہے۔ جیسا کہ اللہ عزوجل کا فرمان ہے: ﴿ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ ﴾ [المؤمن: ٥٧] ''آسمان و زمین کی پیدایش یقیناً انسان کی پیدایش سے بہت بڑا کام ہے۔'' نیز اس کا فرمان ہے: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى ۚ بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [الأحقاف: ٣٣] ''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اُن کے پیدا کرنے سے وہ نہ تھکا، وہ یقیناً مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے؟ کیوں نہ ہو؟ وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔''

نیز اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ۚ اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [حٰمٓ السجدة: ٣٩] ''اس اللہ کی نشانیوں میں سے (یہ بھی) ہے کہ تو زمین کو دبی دبائی دیکھتا ہے۔ پھر جب ہم اس پر مینہ برساتے ہیں تو وہ تروتازہ ہو کر ابھرنے لگتی ہے، جس نے اسے زندہ کیا وہی یقینی طور پر مردوں کو بھی زندہ کرنے والا ہے۔ بے شک وہ ہر (ہر) چیز پر قادر ہے۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ سوالیہ انداز ملامت اور سرزنش کے لیے ہے، یعنی آسمان کی طرف نظر کرنے سے غافل کیوں ہو گئے، حالاں کہ وہ ان کے اوپر سایہ فگن ہے۔ اور وہ ہر وقت اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ ہم نے اس کو کیسے ایجاد کیا اور اس کو ایسے بنایا کہ ان کے اوپر خیمے کی طرح اٹھا ہوا ہے مگر اتنا فرق ہے کہ اس کا کوئی ستون نہیں ہے جس طرح خیمے کے ٹکنے کے لیے تو ستون ہوتا ہے۔ اور ہم نے اس کو چراغوں اور نورانی ستاروں اور کواکب سے زینت دی، جن کو ہم نے اس میں رکھا ہے۔ اور اس میں کوئی فروج نہیں ہے۔

﴿ فُرُوْجٍ ﴾ جمع ہے ''فرج'' کی جس کے معنی شگاف ہیں، مطلب یہ ہے کہ اس میں سوراخ اور دراڑیں نہیں ہیں جو اس کو عیب ناک کریں۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں نہ تفاوت ہے نہ کچھ اختلاف ہے۔ نہ فتوق[2] وصدوع وخلل ہے۔ حرفِ واو حالیہ ہے۔ یعنی ہم نے اسے زینت دی اس حال میں کہ اس میں نہ کوئی شگاف ہے نہ کوئی دراڑ۔ اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور بچھایا پانی کے اوپر اور اس میں ہم نے جمنے والے پہاڑ ڈالے جو اس کو حرکت کرنے سے روکتے ہیں۔ سورۃ الرعد میں اس کی تفسیر گزر چکی ہے۔[3] اور ہم نے اس میں ہر حسین اور اچھی چیز اُگائی

---

[1] تفسير ابن كثير (٢٨٢/٤) [2] تفسير القرطبي (٦/١٧) [3] رقم الآية (٣)

کہ جس کو دیکھ کر لوگ خوش ہوتے ہیں۔ اس کی تفسیر بھی سورۃ الحج میں گزر چکی ہے۔[1]

﴿ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى ﴾ یہ دونوں ماقبل کی علت ہیں۔ یعنی جو کچھ کیا یہ تبصیر اور تذکیر (بصیرت اور نصیحت حاصل کرنے) کے لیے کیا۔ یہ قول امام زجاج رحمہ اللہ کا ہے۔[2] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: "تبصُّرًا مِنَّا"[3] یعنی یہ سب ہم نے تعلیم وتفہیم واستدلال کے لیے کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ دونوں فعل مقدر سے منصوب ہیں جو ان دونوں کے لفظ سے ہے: "أَيْ: بَصَرْنَاهُمْ تَبْصِرَةً وَذَكَرْنَاهُمْ ذِكْرَى أَوْ تَذْكِرَةً"۔ کسی نے کہا ہے کہ حال ہیں: "أَيْ: مُبَصِّرِيْنَ وَمُذَكِّرِيْنَ"، یعنی کیا ہم نے یہ اس حال میں کہ ہم دکھانے والے ہیں اور یاد دلانے والے۔ کسی نے کہا: مفعول سے حال ہے "أَيْ: ذَاتَ تَبْصِرَةٍ وَتَذْكِيرٍ لِمَنْ يَرَاهُمَا" یعنی اس حال میں کہ وہ صاحبِ تبصرہ وتذکیر ہیں واسطے اس شخص کے جو ان کو دیکھتا ہے۔ ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا "أَيْ: جَعَلْنَا ذٰلِكَ تَبْصِرَةً وَّذِكْرَى".[4] امام رازی فرماتے ہیں کہ احتمال ہے کہ دونوں مصدر راجع ہوں "سماء" اور "أرض" کی طرف، یعنی ہم نے آسمان کو ﴿ تَبْصِرَةً ﴾ پیدا کیا اور زمین کو ﴿ ذِكْرٰى ﴾ پیدا کیا۔

اس پر یہ بات دال ہے کہ آسمان اور اس کی زینت ہر برس میں غیر متجدد ہے تو وہ اس شے کی طرح ہے جو شروع زمانے سے اس کے گزرنے کے ساتھ دیکھی جاتی رہی۔ رہی زمین تو وہ ہر سال اپنی زینت اور رونق کو لیتی ہے تو وہ یاد دلاتی ہے، چنانچہ آسمان تبصرہ ہے اور زمین تذکرہ، اور یہ بھی احتمال ہے کہ دونوں مصدروں میں سے ہر ایک دونوں میں موجود ہو، چنانچہ آسمان تبصرہ اور تذکرہ ہے اور زمین بھی اسی طرح ہے۔ تبصرہ اور تذکرہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ دونوں میں آیاتِ مستمرہ ومنصوبہ (مستقل اور جڑی ہوئی) ہیں بصائر کے مقابلے میں اور آیاتِ متجددہ مذکرہ میں بھول جانے کے وقت۔[5]

﴿ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴾ وہ ہے جو توبہ کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع ہونے والا ہے، اللہ پاک کی کاریگری اور اس کی عجیب مخلوقات میں غور وفکر کرنے والا ہے۔ ان آیتوں کے سیاق میں منکرینِ بعث کو یاد دلانا اور اُن کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنا ہے اور بعث کے امکان کا بیان ہے جس کو کوئی روک نہیں سکتا، کیوں کہ جو اِن اُمور پر قادر ہے، وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے۔

اسی طرح یہ قول ہے: ﴿ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ﴾ یعنی اور ہم نے بدلی سے کثیر البرکت پانی اتارا، اس لیے کہ لوگ اپنے بہت سے امور میں اس سے نفع لیتے ہیں، پھر ہم نے اس پانی سے بہت سے باغ اور حب الحصید اُگائے یعنی وہ دانے جن سے روزی حاصل کی جاتی ہے اور جو کاٹے جاتے

---

[1] رقم الآية (٥) [2] فتح القدير (٩٦/٤) [3] تفسير الجلالين (٦٨٩/١)
[4] فتح القدير (٩٦/٥) [5] تفسير الرازي (١٣٥/٢٨)

ہیں۔ معنی یہ ہیں: "وَحَبُّ الزَّرْعِ الْحَصِيدِ" یعنی کٹی ہوئی کھیتی کے دانے اور خاص کر دانوں کا ذکر اس لیے کیا کہ مقصود وہی ہیں۔ بصریوں نے اسی طرح کہا ہے۔ کوفیوں نے کہا ہے کہ "إضافة الشيء إلىٰ نفسه" کے باب سے ہے، جیسے: مسجد الجامع ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے اس کو حکایت کیا ہے اور یہ جائز ہے جبکہ دونوں لفظ مختلف ہوں، جیسے: "حق اليقين" و "حبل الوريد" و "دار الآخرة" (قاله الكرخي) امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿حَبَّ الْحَصِيدِ﴾ گیہوں اور جو ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ہر وہ دانے ہیں جو کاٹے جاتے ہیں اور ذخیرہ رکھے جاتے ہیں اور جن سے غذا حاصل کی جاتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَالنَّخْلَ﴾ معطوف ہے ﴿جَنّٰتٍ﴾ پر، یعنی اس پانی سے کھجوریں اُگائیں۔ کھجور کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا کہ باقی درختوں پر اس کی فضیلت معلوم ہو جائے۔ ورنہ ﴿جَنّٰتٍ﴾ کے تحت میں تو وہ داخل تھے۔ یا اس لیے اُن کا ذکر کیا کہ وہ بہت اونچی ہوتی ہے اور اس کے منافع بہت سے ہیں، اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان سے اس کی تشبیہ دی ہے۔[2]

﴿بَاسِقٰتٍ﴾ منصوب ہے بنا بر حالِ مقدرہ، اس لیے کہ اُگانے کے وقت وہ باسق نہ تھی۔ امام مجاہد، عکرمہ اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿بَاسِقٰتٍ﴾ بہ معنی طوال ہے۔[3] امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مُسْتَوِيَات"۔ امام حسن، عکرمہ اور فراء رحمہم اللہ نے کہا: "مواقير حوامل"،[4] (یعنی پھلوں سے لدی ہوئی بھاری بوجھل ہو رہی ہیں۔) بکری جب جنتی ہے تو اسے "بَسَقَتْ" کہتے ہیں، لغتِ عرب میں مشہور پہلا قول ہے۔ کھجور جب لمبی ہو تو بولتے ہیں: "بَسَقَتِ النَّخْلَةُ بُسُوقًا" اور "بَسَقَتِ الشَّاةُ" کے معنی ہیں کہ بکری جنی اور "أَبْسَقَتِ النَّاقَةُ" کے یہ معنی ہیں کہ اس کے تھن میں جننے سے قبل پیوسی پڑی۔ "بَسَقَ الرَّجُلُ" یعنی مرد اپنے علم میں ماہر ہوا۔ "وَبَسَقَ فُلَانٌ عَلَى أَصْحَابِهِ مِنْ بَابِ دَخَلَ" یعنی فلاں اپنے اصحاب پر فضل میں دراز ہوا، یعنی اُن سے بڑھ گیا۔

سیدنا قُطبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ صبح میں ﴿قٓ﴾ پڑھ رہے ہیں، پھر جب آپ اس آیت پر آئے: ﴿وَالنَّخْلَ بَاسِقٰتٍ﴾ تو میں نے کہنا شروع کیا کہ اس کا بسوق کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا طول۔[5] (أخرجه الحاكم وصححه وابن مردويه)

جملہ ﴿لَهَا طَلْعٌ نَّضِيدٌ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال ﴿اَلنَّخْلَ﴾ سے۔ ﴿طَلْعٌ﴾ وہ ہے جو نخل کے ثمر میں شروع شروع میں نکلتا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "طَلَعَ الطَّلْعُ طُلُوعًا وَالنَّضِيدُ: اَلْمُتَرَاكِبُ الَّذِي نَضَدَ بَعْضُهُ عَلَى بَعْضٍ" یعنی طلعِ نضید کھجور کا وہ خوشہ ہے جو ایک دوسرے پر چڑھا ہو کہ بعض بعض پر تہ بہ تہ لپٹا

[1] تفسير القرطبي (٦/١٧) [2] صحيح البخاري (٦١) صحيح مسلم (٢٨١١) [3] تفسير الطبري (٣٣٥/٢٢)
[4] تفسير القرطبي (٧،٦/١٧) [5] مستدرك الحاكم (٥٠٤/٢) امام حاکم اور ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

ہوا ہے۔ پھر جب وہ اپنے غلافوں سے نکلا تو اب نضید نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "مُتَرَاكِمٌ بَعْضُهُ عَلَى بَعْضٍ"[1] یعنی اس کا بعض بعض پر تہ بہ تہ ہے۔

﴿ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ﴾ منصوب ہے بنا بر مفعول مطلق: "أَيْ: رَزَقْنَاهُمْ رِزْقًا" یعنی ہم نے ان کو رزق دیا اچھی طرح رزق دینا، یا مفعول لہ ہے: "أَيْ: أَنْبَتْنَا هٰذِهِ الْأَشْيَاءَ لِلرِّزْقِ" یعنی اُگائیں ہم نے چیزیں رزق کے لیے۔

نکتہ:

یہاں "عباد" کو انابت کے ساتھ مقید نہیں کیا جس طرح کہ ﴿ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴾ میں مقید کیا، اس لیے کہ تذکرہ صرف منیب کے لیے ہی ہوتا ہے اور رزق ہر ایک کے لیے عام ہے، فرق اتنا ہے کہ منیب تو انعام کا ذکر وشکر کرتا ہے، پھر کھاتا ہے اور غیر منیب ایسے کھاتا ہے جیسے جانور کھاتے ہیں۔ اس لیے رزق کی کسی قید سے تخصیص نہیں کی گئی۔ (قاله الخطيب)

﴿ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ﴾ یعنی اور زندہ کیا ہم نے اس پانی سے ایک مردہ شہر کو۔ جمہور نے ﴿ مَيْتًا ﴾ کو بہ تخفیف پڑھا ہے۔ اور امام ابوجعفر اور خالد رحمہ اللہ نے بہ تشدید پڑھا ہے۔[2] ﴿ مَيِّتًا ﴾ کی تذکیر (مذکر ہونا) اس اعتبار سے ہے کہ ﴿ بَلْدَةً ﴾ بلد ہو یا مکان۔[3] (كما في عبارة أبي السعود) ﴿ بَلْدَةً مَّيْتًا ﴾ سے مراد "مجدبہ" یعنی قحط زدہ کہ جس میں نہ پھل ہیں نہ کھیتی۔ جملہ: ﴿ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ﴾ مستانفہ ہے اس بات کے بیان کے لیے کہ بعث کے وقت قبروں سے نکلنا اس زندہ کرنے کی طرح ہے، جیسے اللہ پاک نے مردہ زمین کو زندہ کیا۔ خبر کو پہلے اس لیے رکھا کہ مقصود حصر (شمار کرنا) ہے۔ یعنی مردوں کا قبروں سے نکلنا اسی طرح ہے۔ پھر اللہ پاک نے جھٹلانے والی اُمتوں کا ذکر کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[4]

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ﴿١٢﴾ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ﴿١٣﴾ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۚ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ﴿١٤﴾ اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ۚ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿١٥﴾

ان سے پہلے قومِ نوح نے اور اصحاب الرس نے اور ثمود نے جھٹلایا⑫ اور عاد اور فرعون اور برادرانِ لوط نے⑬ اور ایکہ (بستی) والوں اور قومِ تُبَّع نے، (ان) سب نے رسولوں کو جھٹلایا،

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٠٧/١٠)
[2] فتح القدير (٩٧/٥)
[3] تفسير أبي السعود (١٢٧/٨)
[4] فتح البيان (١٦٢/١٣_١٦٥)

لہٰذا (ان پر) میری وعید ثابت ہو گئی⑭ کیا پھر ہم پہلی بار پیدا کر کے تھک گئے ہیں؟ (نہیں!) بلکہ وہ ازسرِنو تخلیق کے متعلق شک میں ہیں⑮

اقوام عالم کی ہلاکت سے عبرت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک دھمکی دیتا ہے قریش کو دنیا میں اس انتقام اور عذابِ الیم کی جس کو اس نے ان جیسے دوسرے لوگوں پر نازل کیا جو اُن سے پہلے جھٹلانے والے تھے، جیسے نوح علیہ السلام کی قوم اور ساری زمین والوں کا وہ غرقِ عام جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب کیا۔ اور اصحابِ رس تو ان کا قصہ سوۃ الفرقان میں گزر چکا ہے۔[1] ثمود اور عاد وفرعون اور اخوانِ لوط یہ اُن کی اُمت ہیں جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے سدوم والوں میں سے اور سدوم کا معاملہ کہ اس کو گہرا کر دیا اور ان کو لے کر اللہ تعالیٰ نے کیسا زمین میں دھنسا دیا اور اُن کی زمین کو ایک بدبودار بحیرہ کر ڈالا، ان کے کفر و سرکشی اور حق کی مخالفت کے سبب سے اور اصحابِ ایکہ یہ شعیب علیہ السلام کی قوم ہیں اور قومِ تبع یہ تبع یمانی ہے ہم نے سورۃ الدخان میں اس کا حال ایسا تفصیل سے ذکر کیا ہے[2] کہ اس کے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وللہ الحمد والشکر.

قولہ تعالیٰ: ﴿ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ ﴾ یعنی ان امتوں اور قرنوں میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے رسول کی تکذیب کی اور جس نے ایک رسول کو جھٹلایا تو گویا اس نے سارے رسولوں کی تکذیب کی، جیسا کہ اللہ جل و علا کا فرمان ہے: ﴿ كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ﴾ [الشعراء: ١٠٥] ''قومِ نوح نے بھی نبیوں کو جھٹلایا۔'' حالانکہ ان کے پاس صرف ایک ہی رسول آیا تھا۔ چنانچہ وہ حقیقت میں ایسے ہیں کہ اگر اُن کے پاس سارے رسول آتے تو اُن کی تکذیب کرتے۔

﴿ فَحَقَّ وَعِيدِ ﴾ یعنی ان پر پھر وہ عذاب اور سزا ثابت ہوئی جس کی اللہ تعالیٰ نے ان کو تکذیب پر وعید سنائی تھی۔ تو اب چاہیے کہ مخاطب لوگ اس بات سے ڈریں کہ اُن کو بھی وہ عذاب پہنچے جو اُن کو پہنچا، کیوں کہ یہ اپنے رسول کی تکذیب کر چکے ہیں، جیسے انھوں نے تکذیب کی تھی۔

دوبارہ پیدا کرنا زیادہ آسان ہے:

﴿ أَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ ﴾ یعنی کیا پھر ہم کو ابتدائے خلق نے عاجز کر دیا، یہاں تک کہ وہ اعادے کے بارے میں شک میں ہیں۔ ﴿ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴾ معنی یہ ہیں کہ مخلوق کو پہلی دفعہ پیدا کرنے سے ہم عاجز نہیں ہوئے اور اعادہ تو اس سے بہت ہی آسان ہے۔ جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِي

---

[1] رقم الآیۃ (٣٨) [2] رقم الآیۃ (٣٧)

يَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ وَهُوَ اَهۡوَنُ عَلَيۡهِ﴾ [الروم: ٢٧] ''وہی ہے جو اول بار مخلوق کو پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور یہ تو اس پر بہت ہی آسان ہے۔''

نیز اللہ جل جلالہ نے فرمایا: ﴿وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلۡقَهٗ قَالَ مَنۡ يُّحۡيِ الۡعِظٰمَ وَهِيَ رَمِيۡمٌ ﴿٧٨﴾ قُلۡ يُحۡيِيۡهَا الَّذِيۡۤ اَنۡشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلۡقٍ عَلِيۡمٌ﴾ [یٰس: ٧٨۔ ٧٩] ''اور اس نے ہمارے لیے مثال بیان کی اور اپنی (اصل) پیدایش کو بھول گیا، کہنے لگا: ان گلی سڑی ہڈیوں کو کون زندہ کرسکتا ہے؟ آپ جواب دیجیے! کہ انھیں وہ زندہ کرے گا جس نے انھیں اول مرتبہ پیدا کیا ہے، جو سب طرح کی پیدایش کو بخوبی جاننے والا ہے۔'' صحیح میں پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابن آدم مجھ کو تکلیف دیتا ہے کہ مجھ کو ہرگز اعادہ نہ کرے گا جیسا کہ مجھ کو پہلے بنایا ہے۔ حالانکہ پہلی دفعہ پیدا کرنا میرے لیے اس اعادے، یعنی دوبارہ پیدا کرنے سے زیادہ آسان نہیں ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ جملہ ﴿كَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ وَّاَصۡحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوۡدُ﴾ مستانفہ ہے جو حقیقتِ بعث کی تقریر کے لیے وارد ہوا ہے، یہ بیان کر کے کہ سارے رسولوں کا اس کی حقیقت پر اتفاق ہے اور اس کے منکروں پر عذاب کیا گیا ہے۔ ﴿وَّاَصۡحٰبُ الرَّسِّ﴾ شعیب علیہ السلام کی قوم ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ حنظلہ بن صفوان کی قوم ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ کسی اور نبی کی قوم ہیں جو صالح علیہ السلام کے بعد بھیجے گئے تھے۔ بقیہ ثمود کے بارے میں سورۃ الفرقان میں اس کا زیادہ کلام گزر چکا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس اقصائے مدینہ (بہت دور) سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا تھا اور یہ عیسیٰ علیہ السلام کی قوم سے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ اصحابِ اُخدود ہیں۔

"رس" یا تو جگہ کا نام ہے جس کی طرف اُن کی نسبت کی گئی ہے، یا ایک کنواں ہے جس پر اپنے مویشیوں کو لے کر اقامت پذیر تھے۔ بتوں کو پوجا کرتے تھے، پھر وہ کنواں اور جو کچھ اس کے اردگرد تھا، دھنسا دیا گیا تو اُن کو اور جو کچھ اُن کا مال و اسباب تھا، اُن سب کو لے گیا، جیسا کہ ان کا قصہ سورۃ الفرقان میں مذکور ہے۔ یا "رس" فعل ہے، بہ معنی چاہ کندن۔ جب کوئی کنواں کھودتا ہے تو محاورے میں کہتے ہیں: "رَسَّ الۡبِئۡرَ" یعنی کنواں کھودا۔ فعل کو مونث رکھا، یعنی ﴿كَذَّبَتۡ﴾ کہا قوم کے معنی کے سبب سے۔ اُن سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم نے تکذیب کی اور اصحابِ رس نے اور ثمود نے اور عاد نے اور فرعون نے اور اس کی قوم نے۔

ثمود کا ذکر اصحابِ رس کے بعد اس لیے کیا گیا کہ جس رجفہ نے ان کو پکڑا، اس کا مبدأ (شروع ہونے کی جگہ) اصحابِ رس کا دھنسنا تھا۔ پھر عاد کا ذکر ثمود کے بعد اس لیے کیا کہ جس ہوا نے عاد کو ہلاک کیا وہ صیحہ ثمود کی بعد

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٩٠) تفسير ابن كثير (٢٨٣/٤)
[2] رقم الآية (٣٨)

تھی اور اخوانِ لوط نے تکذیب کی، ان کو لوط کا اخوان اس لیے ٹھہرایا ہے کہ وہ لوط علیہ السلام کے سسرال والے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی قوم سے تھے اور لوط علیہ السلام کی پہچان والوں میں سے تھے۔ اور تکذیب کی اصحابِ ایکہ نے۔ سورۃ الشعراء میں ایکہ پر پورا کلام گزر چکا ہے۔[1] اور قراء کا اختلاف بھی مذکور ہو چکا ہے۔ کسی نے وہاں "لیکہ" بھی پڑھا ہے۔

ایکہ غیضہ (یعنی درخت) کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے پر لپٹے ہوئے ہوں، یعنی درختوں کی جھاڑی۔ جو نبی ان کی طرف معبوث ہوئے وہ شعیب علیہ السلام ہیں اور قومِ تبع نے جھٹلایا، یہ تبع حمیری ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہو چکا ہے: ﴿ اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ﴾ [الدخان: ۳۷] "کیا یہ لوگ بہتر ہیں یا تبع کی قوم کے لوگ۔" تبع کا نام سعد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نام اسعد ہے اور اس کی کنیت ابو کرب ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قومِ تبع کی مذمت فرمائی ہے، تبع کی مذمت نہیں کی۔[2]

﴿ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ ﴾. ﴿ كُلٌّ ﴾ کی تنوین مضاف الیہ کے عوض ہے: "أَيْ: كُلُّ وَاحِدٍ مِنْ هٰؤُلَاءِ الْمَذْكُوْرِيْنَ" یعنی ان لوگوں میں سے جن کا ذکر ہوا، ہر ایک نے اپنے اپنے رسول کو جھٹلایا جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف بھیجا اور اس شریعت کی تکذیب کی جس کو وہ لے کر آیا۔ بعض نحوی ﴿ كُلٌّ ﴾ کی تنوین کا حذف اور ضمہ پر اس کی بنا جائز رکھتے ہیں مثل غایات کے، جیسے "قَبْلُ وَبَعْدُ" اور ﴿ اَلرُّسُلَ ﴾ میں لام عہد کے لیے ہوگا، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، یہ بھی جائز ہے کہ جنسی ہو یعنی ان طائفوں میں سے ہر طائفے نے سارے رسولوں کی تکذیب کی اس لیے کہ جس نے ایک رسول کی تکذیب کی تو گویا اس نے سارے رسولوں کو جھٹلایا۔ ﴿ كَذَّبَ ﴾ کو جو بہ صیغۂ مفرد رکھا تو یہ لفظ ﴿ كُلٌّ ﴾ کے اعتبار سے رکھا۔

اس آیتِ کریمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں کہا گیا کہ تو رنج مت کر اور ان لوگوں کے تیری تکذیب کرنے پر بہت غمگین نہ ہو۔ پس یہ تو حال ہے ان نبیوں کا جو تجھ سے پہلے گزر چکے ہیں، کیونکہ اُن کو ان کی قوموں نے جھٹلایا اور بہت تھوڑے لوگوں نے اُن کی تصدیق کی۔ کلیۃ سے مراد یہاں تکثیر ہے جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [النمل: ۲۳] "اور اسے ہر قسم کی چیز سے کچھ نہ کچھ دیا گیا ہے۔" چنانچہ یہ کلیۃ باعتبار اغلب کے ہے۔

﴿ فَحَقَّ وَعِيْدِ ﴾ اصل میں "وَعِيْدِيْ" بہ یائے متکلم ہے۔ حرف یاء کو حذف کر کے کسرے کو اس پر دلالت کرنے کے لیے باقی رکھا ہے، یعنی جب مذکورہ اُمت نے اپنے اپنے رسول کی تکذیب کی تو اُن پر میری وعید واجب

---

[1] رقم الآیة (۱۷۶) [2] فتح القدیر (۹۷/۵)

ہوئی اور اُن پر عذاب کا کلمہ ثابت ہوا اور جس جس قسم کا عذاب، مثلاً: خسف، مسخ، ہلاکت اُن پر اللہ تعالیٰ نے مقدر کیا تھا، وہ اُن پر نازل کیا۔

﴿ اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ﴾ میں سوالیہ انداز ملامت اور سرزنش کے لیے ہے اور جملہ مستانفہ ہے جو مرنے کے بعد زندہ ہونے کی تاکید اور تقریر کے لیے لایا گیا ہے جس کا اُمتوں نے انکار کیا، یعنی کیا پھر پیدا کر کے ہم عاجز ہو گئے جبکہ ہم نے اُن کو پہلی بار پیدا کیا تو اس وقت وہ کچھ چیز نہ تھے۔ لہٰذا ہم بعث سے کیسے عاجز ہوں گے! "عي" عاجز ہونے کو اور تھک جانے کو کہتے ہیں۔ جب تم کسی بات میں عاجز ہو اور اس کی وجہ کو نہ پہچانو تو محاورے میں یوں کہو گے: "عَيِيتُ بِالْأَمْرِ"۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم کو پہلی بار پیدا کرنے نے عاجز نہیں کیا۔[1] گازرونی نے کہا ہے کہ یہ معنی ہیں کہ ہم پہلے پیدا کرنے سے عاجز نہیں ہوئے تو ہم دوبارہ پیدا کرنے سے عاجز نہ ہوں گے۔ جمہور نے پہلی یاء کو کسرے اور دوسری یاء کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور امام ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے بہ تشدیدِ یاء بدون اشباع پڑھا ہے۔[2]

پھر اللہ پاک نے ذکر کیا کہ وہ بعث کے بارے میں شک میں ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴾ یعنی بلکہ وہ نئی خلق کے بارے میں شک وشبہہ اور حیرت واختلاط میں ہیں۔ یہ مردوں کو زندہ اٹھا کر کھڑا کر دینا ہے، اس لیے کہ یہ عام عادت اور دستور کے خلاف ہے۔ ﴿ خَلْقٍ ﴾ کو نکرہ اس لیے کیا ہے کہ اس کی شان کی بلندی ہو اور وہ اس لائق ہے کہ اس کے متعلق بحث کی جائے اور اس کی معرفت کا اہتمام کیا جائے۔

اضراب کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس بات کے منکر نہیں کہ اللہ تعالیٰ پہلی دفعہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ بلکہ وہ تو خلقِ جدید کے بارے میں شک میں ہیں۔ شیطان نے ان پر ملتبس کر دیا ہے اور اُن کو متحیر کر ڈالا ہے۔ شیطان نے ان کو یہ بات اچھی کر کے دکھائی کہ مردوں کو زندہ کرنا عام دستور سے باہر ہے۔ اس لیے انھوں نے صحیح قسم کے استدلال کو قبول نہ کیا کہ جو پہلی دفعہ پیدا کرنے پر قادر ہے، وہ دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ پھر اللہ پاک نے ایک اور کلام کی ابتداء کی، جس سے اللہ تعالیٰ کی بعض قدرتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[3]

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚۖ وَنَحْنُ
اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝16 اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ
عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۝17 مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا
لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝18 وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ مَا

[1] تفسير الطبري (٢٢/٣٤٠) [2] اللباب في علوم الكتاب (١٨/٢٣) [3] فتح البيان (١٣/١٦٥ـ١٦٧)

كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿١٩﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ﴿٢٠﴾
وَجَاۗءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَاۗىِٕقٌ وَّشَهِيْدٌ ﴿٢١﴾ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ
مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاۗءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿٢٢﴾

اور البتہ تحقیق ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے دل میں اُبھرنے والے وسوسوں کو بھی ہم جانتے ہیں، اور ہم (اس کی) شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں⑯ جب اَخذ کرتے (لکھتے) ہیں دو اَخذ کرنے (لکھنے) والے (فرشتے)، اس کے دائیں طرف اور بائیں طرف بیٹھے ہوئے⑰ (انسان) جو بات بھی (منہ سے) نکالتا ہے (وہ لکھنے کو) اس کے پاس ایک نگران (فرشتہ) تیار ہوتا ہے⑱ اور موت کی سختی حق الیقین (موت) کو لے آتی ہے۔ (کہا جاتا ہے:) یہی ہے وہ (موت) جس سے تو بھاگتا تھا⑲ اور صور میں پھونکا جائے گا، یہ وعید (وعدۂ عذاب) کا دن ہے⑳ اور ہر نفس آئے گا، اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا اور ایک شہادت دینے والا ہوگا㉑ البتہ تحقیق تو اس سے غفلت میں تھا، تو ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا، چناں چہ آج تیری نگاہ بہت تیز ہے㉒

اللہ تعالیٰ انسان کی ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے:

رگِ جان سے مراد گردن کی رگ ہے جس میں جان پھرتی ہے دل سے دماغ تک، اس کے کٹ جانے سے موت واقع ہوتی ہے۔ اللہ اندر سے قریب ہے اور رگِ آخر جان سے باہر ہے۔ انسان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ لکھ لیتے ہیں۔ نیکی دائیں طرف والا لکھتا ہے اور بدی بائیں طرف والا لکھتا ہے۔ ایک فرشتہ ہانک کر لاتا ہے۔ اور ایک کے پاس نامۂ اعمال ہے۔ انتھیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنی اس قدرت کی خبر دیتا ہے جو اسے انسان پر ہے اس طرح سے کہ وہ اس کا خالق ہے اور اس کے علم نے انسان کے سارے کاموں کو گھیرا ہوا ہے، یہاں تک کہ جو اچھی اور بری باتیں بنی آدم کے دلوں میں آتی ہے، ان کو جانتا ہے۔ صحیح میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کی اس شے سے درگزر کیا جو اس کے جی میں آئی، جب تک کہ اس کو زبان سے نہ کہا، یا اس پر عمل نہ کیا۔[1] مطلب یہ ہے کہ جب تک بری بات دل میں رہی نہ زبان سے نکلی اور نہ عمل میں آئی تو وہ معاف ہے اور جب زبان سے نکلی اور عمل میں آئی تو اس پر پکڑ ہے۔

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٧)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے فرشتے انسان کے زیادہ قریب ہیں، اس کی دھڑکتی رگ کی نسبت اور جس نے اس کی تاویل علم پر کی ہے، یعنی یہ قرب علم کا ہے تو وہ صرف اس لیے بھاگا ہے کہ حلول و اتحاد نہ لازم آئے، حالاں کہ بالاجماع ان دونوں کی نفی کی گئی ہے: ''تَعَالَى اللّٰهُ وَتَقَدَّسَ'' یعنی اللہ پاک نہ کسی خلق کے ساتھ متحد ہے اور نہ اس میں حلول کیے ہوئے ہیں۔

لیکن لفظِ تاویل سے علم کو مقتضی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح نہیں فرمایا: ''وَأَنَا أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ'' اس نے تو یہی فرمایا ہے: ﴿ وَنَحْنُ اَقْرَبُ ﴾ جیسا کہ محتضر کے بارے میں فرمایا ہے: ﴿ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴾ [الواقعة: ٨٥] ہم اس شخص سے بہ نسبت تمھارے بہت زیادہ قریب ہوتے ہیں، لیکن تم نہیں دیکھ سکتے۔'' یعنی جس شخص کو موت حاضر ہوئی ہے، اس سے ہمارے فرشتے بہ نسبت تمھارے زیادہ قریب ہیں، لیکن تم دیکھتے نہیں ہو۔ اور جیسا کہ یہ فرمایا ہے: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ [الحجر: ٩] ''ہم نے ہی اس قرآن کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''

چنانچہ فرشتے اللہ عزوجل کے اِذن سے قرآن کو لے کر نازل ہوئے اور اسی طرح فرشتے انسان کے زیادہ قریب ہیں اس کی دھڑکتی رگ سے، اس طرح سے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس بات کی قدرت دی ہے، چنانچہ فرشتے کے لیے انسان سے ایک لَمَّہ ہے۔ جیسا کہ شیطان کے لیے ایک لَمَّہ ہے۔ لَمَّہ بہ معنی ہَمَّہ وخطرہ ہے، یعنی آدمی سے شیطان اور فرشتے کو قرب ہوتا ہے، شیطان تو برائی کا خیال دل میں ڈالتا ہے اور فرشتہ بھلائی کا خُیال ڈالتا ہے۔ اور اسی طرح شیطان ابن آدم کے اندر خون کی طرح چلتا پھرتا ہے،[1] جیسے کہ صادق و مصدوق ﷺ نے اس کی خبر دی ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ﴾ یعنی وہ دو فرشتے جو انسان کا عمل لکھتے ہیں وہ بائیں اور دائیں طرف متعین اور منتظر ہیں۔

ابن آدم کوئی کلمہ نہیں بولتا مگر اس کے پاس ایک رقیبِ عتید ہے یعنی مگر حال یہ ہے کہ اس کلمے کا انتظار ایک شخص کر رہا ہے جو اس کے لیے تیار ہے، اس کو لکھ لیتا ہے اور وہ کوئی کلمہ اور حرکت ایسی نہیں چھوڑتا جس کو نہ لکھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كٰتِبِيْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ [الانفطار: ١٠-١٢] ''یقیناً تم پر نگہبان عزت والے اور لکھنے والے مقرر ہیں جو کچھ تم کرتے ہو وہ جانتے ہیں۔''

علماء رحمہم اللہ نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ آیا فرشتہ انسان کے کلام میں سے ہر شے کو لکھتا ہے؟ یہ قول امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ کا ہے یا وہی لکھتا ہے جس پر ثواب یا سزا ہے، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔[2] یہ دو قول ہیں۔ آیت کا ظاہر قولِ اول ہے، اس آیت کے عموم کے سبب سے: ﴿ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٧٤)
[2] تفسير الطبري (٣٤٤،٣٤٥/٢٢)

﴿رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ امام احمد رحمہ اللہ نے بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک ایک مرد اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے کلمے سے کلام کرتا ہے، وہ نہیں گمان کرتا کہ وہ پہنچے گا اس کو جس کو وہ پہنچا۔ اللہ عزوجل اس کلمے کے سبب سے اس شخص کے لیے اس دن تک کے لیے اپنی رضا مندی لکھ دیتا جس دن میں وہ اس سے ملے گا۔ اور بے شک ایک مرد اللہ تعالیٰ کی ناراضی کے کلمے سے کلام کرتا ہے، وہ نہیں گمان کرتا کہ وہ اس کو پہنچے گا جس کو وہ پہنچا کہ اللہ تعالیٰ اس کے سبب سے اس شخص کے لیے اس دن تک کے لیے اپنی ناراضی لکھ دیتا ہے جس دن میں وہ اس سے ملے گا۔ چنانچہ علقمہ کہتے تھے: کتنی ہی ایسی باتیں ہیں جن سے مجھے واقعی بلال بن حارث کی روایت کردہ حدیث نے منع کر دیا۔[1]

(ورواه الترمذي والنسائي وابن ماجه من حديث محمد بن عمرو به وقال الترمذي: حسن صحيح وله شاهد في الصحيح)

امام احنف بن قیس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دائیں طرف والا فرشتہ تو نیکیوں کو لکھتا ہے اور وہ بائیں طرف والے پر امین ہے۔ اگر بندہ کسی گناہ کو پہنچتا ہے تو وہ اس سے کہتا ہے رک جا، پھر اگر اس بندے نے استغفار کرلی تو اس کو اس کے لکھنے سے منع کرتا ہے اور اگر اس بندے نے انکار کیا، یعنی استغفار نہ کی تو اس کو لکھ لیتا ہے۔[2] (رواه ابن أبي حاتم)

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا اور یہ آیت پڑھی: ﴿عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ﴾ اے ابنِ آدم! تیرے لیے صحیفہ بچھایا گیا اور تجھ پر دو کریم فرشتے مقرر کیے گئے، ان میں سے ایک تیری دائیں طرف ہے اور دوسرا تیری بائیں طرف ہے۔ جو فرشتہ تیری دائیں طرف ہے، وہ تیری نیکیوں کو حفظ رکھتا ہے، یعنی لکھ لیتا ہے اور جو فرشتہ تیری بائیں طرف ہے وہ تیری برائیوں کو یاد رکھتا ہے۔ اب تو جو چاہے عمل کر، کم کر یا زیادہ کر، یہاں تک کہ جس وقت تو مر جائے گا تو تیرا صحیفہ لپیٹ دیا جائے گا اور تیری قبر میں تیرے ساتھ گردن میں رکھ دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ قیامت کے دن نکالا جائے گا تو اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ﴿وَكُلَّ اِنْسٰنٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا﴾ [بني إسرائيل: ١٣۔ ١٤]

”ہم نے ہر انسان کی برائی بھلائی کو اس کے گلے لگا دیا ہے اور روزِ قیامت ہم اس کے سامنے اس کا نامۂ اعمال نکالیں گے جسے وہ اپنے اوپر کھلا ہوا پالے گا۔ لے! خود ہی اپنی کتاب آپ پڑھ لے۔ آج تو تُو آپ ہی اپنا خود حساب لینے کو کافی ہے۔“

پھر امام حسن رحمہ اللہ فرماتے کہ تیرے حق میں اس نے عدل کیا جس نے تجھ کو اپنے نفس کا حساب لینے والا ٹھہرایا۔[3] علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ فرشتہ ہر وہ شے لکھتا ہے جس کے ساتھ بندے نے کلام کیا، یہاں تک کہ وہ اس کا یہ کہنا بھی لکھ لیتا ہے کہ میں نے کھایا، پیا، میں گیا، آیا، میں نے دیکھا، یہاں تک کہ جب پنج شنبہ (جمعرات) کا دن ہوتا ہے تو اس کا قول و عمل پیش کیا جاتا ہے، پھر اس میں سے وہ چیز برقرار رکھتا ہے جس میں نیکی تھی یا برائی تھی اور باقی کو ڈال دیتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿يَمْحُوا اللّٰهُ مَا

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣١٩) سنن ابن ماجه (٣٩٦٩) السلسلة الصحيحة (٨٨٨) مسند أحمد (٤٦٩/٣)

[2] الدر المنثور (٥٩٤/٧) [3] تفسير الطبري (٣٤٥/٢٢)

يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾[1] [الرعد: ۳۹] ''اللہ جو چاہے مٹا دے اور جو چاہے ثابت رکھے، لوحِ محفوظ اسی کے پاس ہے۔''

امام احمد رحمہ اللہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنے مرض میں انین (نالہ وفریاد) کیا کرتے تھے، پھر ان کو طاؤس سے یہ بات پہنچی کہ طاؤس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرشتہ ہر شے کو لکھتا ہے، یہاں تک کہ انین کو بھی تو امام احمد رحمہ اللہ نے نالہ وفریاد نہ کی، یہاں تک کہ انتقال فرمایا۔[2] رحمہ اللہ تعالیٰ۔

سکراتِ موت، نفخِ صور اور حشر ونشر کا بیان:

قولہ تعالیٰ: ﴿وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ﴾ اللہ عزوجل فرماتا ہے: اور اے انسان! موت کی بے ہوشی حق کے ساتھ آ گئی، یعنی میں نے تیرے لیے اس یقین سے پردہ کھول دیا جس میں تو شک کیا کرتا ہے۔

﴿ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ﴾ یعنی یہ وہی شے ہے جس سے تو بھاگا کرتا تھا۔ وہ واقعی تیرے پاس آ گئی سو اب نہ تو اس سے بچنے کی کوئی جگہ ہے اور نہ اس سے پیچھے ہٹنا ہے، نہ کسی طرح کی چھٹی اور خلاصی ہے۔ یہ بات کہ ﴿وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ﴾ کا مخاطب کون ہے؟ اس میں مفسرین کا اختلاف ہے، چنانچہ صحیح یہ ہے کہ اس کا مخاطب انسان ہے، وہ جہاں کہیں بھی ہو، یعنی صرف آدمی۔ کسی نے کہا ہے کہ کافر ہے۔ کسی نے اور کچھ کہا ہے۔

ابوبکر بن ابی الدنیا نے علقمہ بن وقاص سے روایت کیا ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں اپنے والد کے پاس حاضر ہوئی، ان کا انتقال ہو رہا تھا اور میں اُن کے سر کے پاس بیٹھی تھی، چنانچہ ان کو غشی نے پکڑا تو میں نے یہ شعر پڑھا:

مَنْ لَا يَزَالُ دَمْعُهٗ مُقْنِعًا   فَإِنَّهٗ لَا بُدَّ مَرَّةً مَدْفُوْقٌ

(اس میں زحاف ہے۔ مجمع البحار میں یوں ہے: ع

لا بد یوما إنه مهراق

یہ شعر بحرِ رجز سے ہے، یعنی جو شخص کہ اس کا آنسو ہمیشہ اس کے پیٹ میں محبوس رہتا تھا۔ اور جائز ہے کہ مراد ہو کہ جو شخص کہ اس کا آنسو ڈھکا ہوا تھا، اپنے شؤون میں چھپا ہوا تھا، ان میں سو ضرور ہے کہ رونا اس کو ظاہر کرے۔[3] واللہ أعلم)۔ کہا پھر انھوں نے سر اٹھایا اور فرمایا: او بیٹا! ایسا نہیں ہے، لیکن ویسا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۗ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ﴾.[4] نیز بیہقی سے روایت کیا ہے کہ جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھاری ہوئے، یعنی ان کی بیماری سخت ہوئی تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا آئیں، پھر اس بیت کے ساتھ تمثل کیا (مثال بیان کی):

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۳۰۸/۱۰) [2] تفسیر ابن کثیر (۲۸٤/٤)

[3] مجمع بحار الأنوار (۳۲٦/٤) [4] المختصرين لابن أبي الدنيا (۵۲/۱)

لَعَمْرُكَ مَا يُغْنِي الثَّرَاءُ عَنِ الْفَتَى إِذَا حَشْرَجَتْ يَوْمًا وَضَاقَ بِهَا الصَّدْرُ

تو انھوں نے اپنا منہ کھولا اور فرمایا: ایسا نہیں ہے، لیکن یہ کہہ: ﴿ وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴾. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سیرت تحریر کرتے وقت ان کی وفات کے تذکرے میں اس اثر کے بہت سے طرق ذکر فرما دیے ہیں۔[1] (مجمع البحار میں یوں ہے: "وجاءت سکرة الموت بالحق"۔ یہ قراءت صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے، یعنی قسم ہے تیری عمر کے خالق کی کہ وضع نہیں کرتی ثروت و آسودگی جوان سے، یعنی اس کے کچھ کام نہیں آتی جبکہ نفس کو غرغرہ لگے کسی دن اور سینہ اس سے تنگ ہو جائے۔ واللہ أعلم۔ مجمع البحار میں پہلا مصرع یوں ہے: ع

لَعَمْرُكَ مَا يُغْنِي الثَّرَاءُ وَلَا الْغِنَا[2])

صحیح میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوا ہے کہ جب آپ کو موت ڈھانکتی، یعنی اس کے سکرات کی شدت ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم چہرۂ مبارک سے پسینہ پونچھنے لگتے تھے اور فرماتے: « سُبْحَانَ اللّٰهِ إِنَّ لِلْمَوْتِ لَسَكَرَاتٍ »[3] ("سکرات"، جمع ہے "سکرة" کی۔ "سکرة" سے مراد موت کی شدت اور اس کا ہم وغم ہے جو اس پر غالب ہو جاتا ہے اور اس کے فہم اور عقل کو متغیر کر دیتا ہے، جیسے شراب کا نشہ) یعنی پاک ہے اللہ ہر عیب و نقص سے بے شک موت کے لیے بے ہوشیاں ہیں۔ ﴿ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴾ میں دو قول ہیں: ایک ہے کہ کلمۂ "ما" اس جگہ موصولہ ہے، یعنی یہ وہ شے ہے جس سے تو بہ تکلف دور ہوتا اور بھاگتا تھا، وہ شے اب واقعی تجھ پر نازل ہوئی اور تیرے صحن میں آ اتری۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کلمۂ "ما" نافیہ ہے، یعنی یہ وہ ہے جس سے جدا ہونے اور اس سے بھاگنے کی تو قدرت نہیں رکھتا تھا۔

طبرانی رحمہ اللہ نے عن یونس بن عبید عن الحسن عن سمرہ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس شخص کی مثال جو موت سے بھاگتا ہے لومڑی کی طرح ہے کہ زمین اس سے قرض طلب کرتی ہے، پھر وہ دوڑتی ہوئی آئی، یہاں تک کہ جس وقت تھک گئی اور بیدار رہی تو اپنے سوراخ میں گھس گئی اور زمین نے اس سے کہا: او لومڑی! میرا قرض تو وہ پادتی ہوئی نکلی، پھر وہ ہمیشہ اسی طرح رہی، یہاں تک کہ اس کی گردن ٹوٹ گئی اور مر گئی،[4] اس مثال کا مضمون یہ ہے کہ جیسے لومڑی کو نہ زمین سے چھٹی ہے نہ گریز کی جگہ، اسی طرح انسان کو موت سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ﴾ پہلے حدیث ﴿ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ ﴾ اور "فزع وصعق وبعث" پر کلام گزر چکا ہے اور یہ روزِ قیامت ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « كَيْفَ أَنْعَمُ »

---

[1] المختصرين لابن أبي الدنيا (۱/۵۱) تفسير ابن كثير (۴/۲۸۵) [2] مجمع بحار الأنوار (۱/۵۲۰)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۴۱۸۴) [4] المعجم الكبير (۷/۲۲۲) اس کی سند میں "معاذ بن محمد ہذلی" ضعیف راوی ہے۔

یعنی میں کیسے خوش ہوؤں اور عیش و آرام کروں، حالانکہ قرن والے نے تو قرن کو منہ میں لے لیا ہے اور اپنی پیشانی جھکائی ہے اور وہ اس بات کا منتظر ہے کہ اسے اذن دیا جائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! ہم کیا کہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کہو« حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ »تو قوم نے کہا:« حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ »[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ﴾ یعنی اور ہر نفس آیا اس کے ساتھ ایک فرشتہ ہے جو اس کو محشر کی طرف ہانکے لیے جاتا ہے اور ایک فرشتہ ہے جو اس پر اس کے اعمال کی گواہی دیتا ہے۔ آیتِ کریمہ سے ظاہر یہی قول ہے اور اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ پھر یہ حدیث اسماعیل بن ابی خالد عن یحییٰ بن رافع مولی ثقیف سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے سنا اور وہ خطبہ پڑھ رہے تھے تو یہ آیت پڑھی: ﴿ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ﴾ چنانچہ فرمایا کہ ایک ہانکنے والا ہے جو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف ہانکتا ہے اور ایک شاہد ہے جو اس پر اس کام کی گواہی دیتا ہے جو اس نے کیا۔ اسی طرح امام مجاہد، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ نے بھی کہا ہے۔ مطرف نے عن ابی جعفر مولی اشجع عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ﴿ سَآئِقٌ ﴾ فرشتوں میں سے ہے اور ﴿ شَهِيْدٌ ﴾ خود انسان ہے، اپنے نفس پر گواہی دے گا۔ امام ضحاک بن مزاحم رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴾ کے خطاب سے کون مراد ہے؟ اس میں ابن جریر رحمہ اللہ نے تین قول نقل کیے ہیں: ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد کافر ہے، اس کو علی بن ابی طلحہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور اسی کے قائل امام ضحاک بن مزاحم اور صالح بن کیسان رحمہم اللہ بھی ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ہر ایک ہے۔ وہ نیک ہو یا بد، اس لیے کہ آخرت دنیا کی بہ نسبت مثل بیداری کے ہے اور دنیا مثل خواب کے۔ یہ قول ابن جریر رحمہ اللہ کا اختیار کردہ ہے۔ (ونقله عن حسين بن عبد الله بن عبيد الله عن عبد الله بن عباس رضي الله عنهما)

تیسرا قول یہ ہے کہ اس کے مخاطب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ زید بن اسلم اور ان کے فرزند اسی کے قائل ہیں۔[3] ان دونوں کے قول کی بنا پر معنی یہ ہیں کہ البتہ مقرر تو اس قرآن کے متعلق غفلت میں تھا، اس سے قبل کہ تیری طرف وحی کی جائے، چنانچہ ہم نے تجھ سے تیرا پردہ کھول دیا اس کے تیری طرف اتارنے کے سبب سے، پس آج کے دن تیری نگاہ تیز ہے اور قرآنی سیاق کا ظاہر اس قول کے خلاف ہے، بلکہ یہ خطاب انسان کو ہے وہ کوئی ہو۔

اور ﴿ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا ﴾ سے مراد "هٰذَا الْيَوْمِ" ہے، یعنی البتہ وہ واقعی اس دن کے بارے میں غفلت میں تھا، پس ہم نے تجھ سے تیرا وہ پردہ کھول دیا تو تیری نگاہ آج کے دن قوی ہے، اس لیے کہ

[1] سنن الترمذي (٢٤٣١) السلسلة الصحيحة (١٠٧٩) [2] تفسير الطبري (٢٢/٣٤٧_٣٤٩) [3] تفسير الطبري (٢٢/٣٤٩، ٣٥٠)

قیامت کے دن ہر شخص خوب دیکھنے والا اور بینا ہوگا، یہاں تک کہ دنیا میں جو لوگ کافر تھے، وہ بھی قیامت کے دن استقامت پر ہوں گے، لیکن یہ ان کو فائدہ نہ دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اَسۡمِعۡ بِهِمۡ وَاَبۡصِرۡ يَوۡمَ يَاۡتُوۡنَنَا ﴾ [مریم: ۳۸] ''کیا خوب دیکھنے سننے والے ہوں گے اس دن جب کہ ہمارے سامنے حاضر ہوں گے۔'' نیز فرمایا ہے: ﴿ وَلَوۡ تَرٰۤى اِذِ الۡمُجۡرِمُوۡنَ نَاكِسُوۡا رُءُوۡسِهِمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ رَبَّنَاۤ اَبۡصَرۡنَا وَسَمِعۡنَا فَارۡجِعۡنَا نَعۡمَلۡ صَالِحًا اِنَّا مُوۡقِنُوۡنَ ﴾ [السجدة: ١٢] ''کاش کہ آپ دیکھتے جب کہ گناہ گار لوگ اپنے رب تعالیٰ کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہوں گے، کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا اب تو ہمیں واپس لوٹا دے ہم نیک اعمال کریں گے ہم یقین کرنے والے ہیں۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

﴿ الۡاِنۡسَانَ ﴾ سے مراد جنسِ انسان ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام ہیں۔ ﴿ نَعۡلَمُ ﴾ خبر مبتدائے مقدر ہے: ''أَيْ: وَنَحْنُ نَعْلَمُ'' اور جملہ محلِ نصب میں ہے بنا بر حالِ مقدرہ۔ یہ ٹھیک نہیں ہے کہ خود ﴿ نَعۡلَمُ ﴾ بغیر تقدیرِ مبتداء حال ہو، اس لیے کہ مضارع مثبت با واو ہے اور یہ حال نہیں پڑتا ہے۔ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ مصدریہ اور حرفِ باء زائد جس طرح کہ ''صَوَّت بِكَذَا وَهَمَسَ بِهِ'' میں زائد ہے: ''أَيْ: وَنَعْلَمُ وَسْوَسَةَ نَفْسِهِ إِيَّاهُ'' یا حرفِ باء واسطے تعدیہ کے ہے: ''أَيْ: وَنَعْلَمُ وَسْوَسَةَ نَفْسِهِ لَهُ'' اور ﴿ بِهٖ ﴾ کی ضمیر ﴿ الۡاِنۡسَانَ ﴾ کی طرف راجع ہے۔

پس نفس انسان کو قائم بہ الوسوسہ کر دیتا ہے، یعنی نفس اپنا وسوسہ انسان کی طرف پہنچاتا ہے اور اس کو اس میں قائم رکھتا ہے، یا کلمۂ ﴿ مَا ﴾ موصولہ ہے، جیسا کہ تفسیر بیضاوی میں ہے[2]: ''أَيْ: وَنَعْلَمُ الْأَمْرَ الَّذِيْ تُحَدِّثُهُ نَفْسُهُ بِهِ''. ''تحدثه'' کی ضمیر انسان کی طرف راجع ہے اور ﴿ بِهٖ ﴾ کی ضمیر مائے موصولہ کی طرف راجع ہے، یعنی ہم اس امر کو جانتے ہیں جس کی انسان کو اس کا نفس حدیث کرتا ہے۔ اس امر کے ساتھ خود انسان اپنے نفس کے ساتھ دو شخص ٹھہرائے گئے، سو کبھی تو یوں کہتے ہیں کہ انسان اپنے نفس سے باتیں کرتا ہے، کبھی یہ بولتے ہیں کہ نفسِ انسان، انسان سے باتیں کرتا ہے۔ باہم دونوں میں بات چیت ہوا کرتی ہے۔ وسوسہ اصل میں بہ معنی خفیہ آواز کے ہے، اسی معنی سے زیور کی آواز کو وسوسہ کہتے ہیں، جیسا کہ اعشیٰ نے کہا ہے:

تُسْمِعُ لِلْحُلِيِّ وَسْوَاسًا إِذَا انْصَرَفَتْ [3]

یعنی وہ عورت زیوروں کی خفیہ آواز سناتی ہے، جبکہ وہ لوٹ کر جاتی ہے۔ پھر حدیثِ نفس کے لیے اس کا استعمال کیا گیا جو خفی ہے، حالانکہ حدیثِ نفس میں آواز بالکل نہیں ہے، لیکن اصلی معنی سے مناسبت جو خفا ہے ہر ایک میں ہے، یہاں وسوسہ سے مراد حدیثِ نفس ہے جو آدمی کے سر، قلب اور ضمیر میں مختلج ہوتی ہے، یعنی پھڑکتی ہے۔

[1] تفسير ابن كثير (٤/٢٨٣_٢٨٦) [2] تفسير البيضاوي (٥/٢٢٦) [3] تفسير القرطبي (١٧/٨، ٩)

مطلب یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں جو کچھ آدمی اپنے دل میں مخفی اور چھپا کر رکھتا ہے۔

﴿ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴾ یہ جملہ گویا ماقبل کی تعلیل ہے۔ یعنی ہم انسان کے دل کی بات چیت کو جانتے ہیں، کیوں کہ ہم اس کی دھڑکن سے بھی اس سے زیادہ قریب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جتنا قرب انسان سے دھڑکتی رگ کو ہے اللہ تعالیٰ کا قرب اس سے بڑھا ہوا ہے، اس لیے کہ انسان کے اجزاء بعض بعض کے حاجب ہوتے ہیں اور اللہ سبحانہ پر کوئی شے حاجب نہیں ہوتی ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ﴿ اَلْوَرِيْدِ ﴾ وتین ہے اور یہ دل سے معلق ایک رگ ہے، یہ اس رگ کے انسان سے قرب کے ساتھ قرب کی ایک مثال ہے۔[1] امام کرخی رحمہ اللہ نے محلی رحمہ اللہ کے قول کی شرح میں کہا ہے: یعنی ہم اس کی طرف علم کے ناتے اس کی حبلِ ورید سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

ہم پر اس کی پوشیدہ باتوں میں سے کچھ بھی مخفی نہیں ہے تو گویا اس کی ذات اس سے قریب ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ اللہ ہر جگہ پر ہے، یعنی اپنے علم سے، کیوں کہ اللہ پاک تو مکانوں سے منزہ ہے، اس کا حاصل یہ ہے علم کے قرب کو قربِ ذات کے پیرائے میں ادا کیا ہے مجازاً۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ ہم اس کی طرف زیادہ قریب ہیں اس طرح سے کہ اس میں ہماری قدرت کا نفوذ ہے اور اس میں ہمارا حکم اور امر جاری ہوتا ہے، جیسے: خون اس کی رگوں میں جاری ہوتا ہے۔

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « نَزَلَ اللّٰهُ مِنِ ابْنِ آدَمَ أَرْبَعَ مَنَازِلَ هُوَ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ وَهُوَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَهُوَ أَخِذٌ بِنَاصِيَةِ كُلِّ دَابَّةٍ وَهُوَ مَعَهُمْ أَيْنَمَا كَانُوْا »[2] یعنی اللہ اترا ہے ابن آدم سے چار منزلوں میں، وہ اس کی طرف حبلِ ورید سے بھی زیادہ قریب ہے اور وہ مرد اور اس کے دل کے درمیان حائل ہوتا ہے اور زمین پر ہر چلنے والے کی چوٹی پکڑنے والا ہے اور وہ اُن کے ساتھ ہے، وہ کہیں پر ہوں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴾ کی تفسیر میں دو قول مروی ہیں: ایک یہ ہے کہ وہ گردن کی رگیں ہیں اور دوسرا یہ ہے کہ نیاطِ قلب،[3] یعنی دل کی رگیں ہیں۔ امام خطیب رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ قشیری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں ایک قوم کے لیے ہیبت وخوف اور ڈر ہے اور ایک قوم کے لیے راحت وانس اور سکونِ قلب ہے۔

﴿ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴾ میں اقوال ہیں: ایک یہ ہے کہ "هُوَ حَبْلُ الْعَاتِقِ وَهُوَ مُمْتَدٌّ مِنْ نَاحِيَةِ حَلْقِهِ إِلَى عَاتِقِهِ" اور یہ دو رگیں ہیں دائیں اور بائیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ ایک بڑی رگ ہے، گردن میں تو "ورید" ہے اور دل میں "وتین" اور پشت میں "أبهر" اور دست اور ران میں "أكحل ونسا" اور "خنصر" (چھوٹی انگلی) میں "أسيلم"۔

[1] تفسير القرطبي (٩/١٧) [2] فتح القدير (١٠٤/٥) [3] تفسير الطبري (٣٤١/٢٢) الدر المنثور (٥٩٢/٧)

تفسیر خازن میں کہا ہے: ''ورید'' وہ رگ ہے جس میں خون جاری ہوتا ہے اور جسم کے تمام حصوں میں پہنچتا ہے اور وہ حلق اور علباوین (گردن کے دو پٹھوں) کے درمیان ہے۔[1] امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا: یہ دو ورید ہیں جو گردن کی دو جانب کو احاطہ کرتی ہیں، ان کے مقدم میں متصل ہیں وتین سے، وارد ہوتی ہے سر سے اس کی طرف۔[2] امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک رگ ہے جو دل سے متصل ہے جب کاٹی جاتی ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ حبل کی اضافت ورید کی طرف بیانی ہے: ''أَيْ: حَبْلٌ مِنَ الْوَرِيْدِ''. کسی نے کہا ہے ''حَبْلُ نَفْسٍ وَرِيْدٍ'' ہے تو یہ مسجد الجامع کے باب سے ہوئی۔ ''ورید'' کا نام ''ورید'' اس لیے رکھا ہے کہ روح اس کی طرف وارد ہوتی ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''ورید'' بہ معنی وارد ہے، یا بہ معنی مورود۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا: ﴿حَبْلِ﴾ بہ معنی عِرق ہے، یعنی رگ اور اس کی اضافت بیانی ہے۔[3]

بالجملہ پھر اللہ پاک نے یہ ذکر کیا کہ باوجود اس کے کہ اس کو انسان کا علم ہے دو فرشتے اس پر مقرر کیے، وہ لکھتے ہیں اور اس کے عمل کو محفوظ رکھتے ہیں، حجت کو لازم کرنے کے لیے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ﴾۔ کلمۂ ﴿اِذْ﴾ میں عامل ''اُذْكُرْ'' مقدر ہے، یہ بھی جائز ہے کہ ﴿اَقْرَبُ﴾ میں جو فعل کے معنی ہیں وہ اس میں عامل ہوں۔ ''تلقی'' بہ معنی ''أخذ'' ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''تلقی'' بہ معنی ''تلقن'' ہے حفظ اور کتابت کے ساتھ، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسان کے زیادہ قریب ہے، اس کی حبلِ ورید سے بھی زیادہ قریب جس وقت کہ اخذ کرتے ہیں دو اخذ کرنے والے، یعنی دو فرشتے جو اس پر مقرر ہیں، اس شے کو جو وہ بولتا ہے اور عمل کرتا ہے، یعنی اس کو اخذ کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک اس کے احوال کو خوب جانتا ہے۔ حفظِ موکلین کا محتاج نہیں ہے اور یہ بات جو ٹھہرائی ہے تو صرف حجت قائم کرنے کے لیے اور تاکیدِ امر کے لیے ہے۔

امام حسن، قتادہ اور مجاہد رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿اَلْمُتَلَقِّيٰنِ﴾ دو فرشتے ہیں، وہ تیرے عمل کو اَخذ کرتے ہیں، ان میں سے ایک تو تیری دائیں طرف ہے اور تیری نیکیاں لکھتا ہے اور دوسرا تیری بائیں طرف ہے جو تیری برائیاں لکھتا ہے۔ نیز امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر دو فرشتے مقرر کیے ہیں رات میں اور دو فرشتے دن میں جو اس کے عمل کو محفوظ رکھتے ہیں اور اس کے اثر کو لکھتے ہیں۔[4]

﴿عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ﴾ یعنی داہنی طرف اور بائیں طرف بیٹھے ہیں۔ مروی ہے کہ وہ اس کے دو اگلے دانتوں پر بیٹھے ہیں، اس کی زبان تو اُن کا قلم ہے۔ اور اس کا تھوک ان کی سیاہی ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے اس کو ذکر کیا ہے۔[5] ﴿قَعِيْدٌ﴾ فرمایا، ''قَعِيْدَانِ'' نہ کہا، حالاں کہ وہ دو ہیں، اس لیے کہ مراد یہ ہے: ''عَنِ

---

(1) تفسير الخازن (٦/٢٣٥) (2) الكشاف (٤/٣٨٧) (3) تفسير أبي السعود (٨/١٢٨)

(4) تفسير الطبري (٢٢/٣٤٤) تفسير القرطبي (١٧/٩) (5) تفسير أبي السعود (٨/١٢٩)

الْيَمِيْنِ قَعِيْدٌ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ‘‘ اول کو حذف کر دیا ہے، اس لیے کہ ثانی اس پر دال ہے۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

نَحْنُ بِمَا عِنْدَنَا وَأَنْتَ بِمَا عِنْدَ ۔۔۔ كَ رَاضٍ وَالرَّأْيُ مُخْتَلِفٌ

یعنی ’’نَحْنُ بِمَا عِنْدَنَا رَاضُوْنَ‘‘۔ امام اخفش اور فراء رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ لفظ ﴿ قَعِيْدٌ ﴾ واحد و تثنیہ و جمع کے لیے صحیح ہے، اس کی ضرورت نہیں کہ پہلے میں مقدر مانا جائے۔ ائمۂ لغت و نحو میں امام جوہری رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ فعیل و فعول اس قبیل سے ہیں جس میں واحد و تثنیہ و جمع برابر ہوتا ہے۔ ﴿ قَعِيْدٌ ﴾ بہ معنی ’’مقاعد‘‘ ہے،[1] جیسے: ’’جلیس‘‘ بہ معنی ’’مجالس‘‘ ہے، لفظاً بھی اور معناً بھی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴾ یعنی وہ کوئی بات اپنے منہ سے نہیں نکالتا مگر اس بولنے والے کے پاس ایک فرشتہ ہے جو اس کی بات کا انتظار کر رہا ہے اور اس کو لکھتا ہے۔ رقیب انسانی امور کا حافظ اور متتبع ہے جو ہر اس خیر و شر کو لکھ لیتا ہے جو وہ بولتا ہے، پس نیکیاں لکھنے والا تو داہنی طرف کا فرشتہ ہے اور برائیاں لکھنے والا بائیں طرف کا فرشتہ ہے۔ ﴿ عَتِيْدٌ ﴾ کے معنی ہیں حاضر مہیا۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ عَتِيْدٌ ﴾ بہ معنی مہیا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: ’’عَتَدَهُ تَعْتِيْدًا وَاعْتَدَهُ اعْتِدَادًا أَيْ: أَعَدَّهُ‘‘ یعنی فلاں شے مہیا کی۔ اسی معنی سے یہ آیت ہے: ﴿ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً ﴾[2] [یوسف: ۳۱] ’’اور ان کے لیے ایک مجلس مرتب کی۔‘‘ یہاں مراد یہ ہے کہ وہ فرشتہ لکھنے کے لیے مہیا اور تیار ہے۔

﴿ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴾ میں مفرد کا صیغہ رکھا باوجود اس کے کہ دونوں فرشتے ایک ہی وقت میں اس شے پر مطلع ہوتے ہیں جو اس سے صادر ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اس کام کا منتظر ہے جو اس کو سپرد کیا گیا ہے نہ کہ اس کام کا جو اس کے ساتھی کے سپرد کیا گیا ہے۔ جس طرح کہ کلمۂ ﴿ عَتِيْدٌ ﴾ اس بات کی خبر دے رہا ہے۔ قول کو خاص کر کے ذکر کیا فعل میں حکم کو دلالۃ النص کے ساتھ ثابت کرنے کے لیے، چنانچہ یہ بات معلوم ہوئی کہ دونوں فرشتوں میں سے ہر ایک کو ﴿ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴾ کہا جاتا ہے اور اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ دونوں فرشتے اس کام کے لیے تیار کیے گئے ہیں بہ خلاف پہلی آیت کے۔ نیز اس سے صریحاً اس بات کا علم ہوا کہ فرشتہ ہر لفظ کو ضبط (تحریر) کرتا ہے اور یہ بات پہلی آیت سے معلوم ہوئی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ فرشتہ جو لکھتا ہے وہ نیکیاں اور برائیاں ہے۔ اس قسم کی باتیں نہیں لکھتا کہ او غلام! گھوڑے پر زین کس۔ او غلام! مجھے پانی پلا۔[3]

صحیحین وغیرہما میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک اللہ نے اس امت کے لیے وہ چیز معاف کر دی ہے جس کے ساتھ اُن کے دلوں نے بات چیت کی ہے، جب تک اس پر عمل نہ کیا یا کلام

---

[1] تفسير القرطبي (۱۰/۱۷) [2] الصحاح للجوهري (۳/۶۷) [3] تفسير ابن أبي حاتم (۱۰/۳۳۰۸)

نہ کیا۔[1] عمر بن ذر عن أبیہ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا ہے: بے شک اللہ ہر کہنے والے کی زبان کے نزدیک ہے، لہٰذا چاہیے کہ بندہ اللہ سے ڈرے اور چاہیے کہ اس شے پر نظر کرے جو وہ کہتا ہے۔[2] (أخرجه أحمد و أبو نعيم والبيهقي في الشعب وابن أبي شيبة وأخرج الحكيم الترمذي عن ابن عباس رضي الله عنهما مرفوعا مثله)۔ مطلب یہ ہے کہ جب آدمی کی ہر بات لکھی جاتی ہے تو چاہیے کہ خوب سوچ بچار کر بات کرے اور بغیر سوچے سمجھے ہر بات جھٹ پٹ منہ سے نہ نکالا کرے۔

بالجملہ جب اللہ پاک نے یہ بیان کیا کہ بندوں کے سارے اعمال محفوظ اور لکھے جاتے ہیں گو اس کے بعد موت کا ذکر کیا، جو اُن پر نازل ہو گی اور بعث کا اور اُن احوال اور ہولنا کیوں کا ذکر کیا جو اس پر متفرع ہیں، یعنی جو اس پر ترتیب دیے گئے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ﴾ اور ان امور میں سے ہر ایک کو ماضی کے پیرائے میں ادا کیا۔ اس لیے کہ ان کے بہت قریب کے زمانے میں واقع ہونے کے بارے میں آگاہی بخشنا منظور ہے۔ ورنہ یہ امور تو آیندہ زمانے میں واقع ہوں گے۔

﴿سَكْرَةُ الْمَوْتِ﴾ سے مراد اس کی سختی اور شدت ہے جو انسان کو ڈھانک لیتی ہے اور اس کی عقل پر غالب ہو جاتی ہے، جیسے: شراب کا نشہ عقل پر غالب ہو جاتا ہے۔ ﴿بِالْحَقِّ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ موت کے وقت انسان پر حق کھل جائے گا اور اللہ کے رسول جو بعث کی خبر اور وعد و وعید لے کر آئے ہیں، ان کا صدق اس پر ظاہر ہو گا۔ کسی نے کہا ہے کہ حق خود موت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے: "أَيْ: وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ"۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی طرح پڑھا ہے اور ﴿سَكْرَةُ﴾ وہی حق ہے، چنانچہ دونوں لفظوں کے اختلاف کے سبب سے اس کی اضافت اپنے نفس کی طرف کی گئی۔[3] کسی نے کہا ہے کہ حرفِ باء ملابست (آپس میں خلط ملط ہونا) کے لیے ہے، جیسا کہ ﴿تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ﴾ [المؤمنون: ٢٠] "جو تیل نکالتا ہے۔" میں ہے: "أَيْ: مُتَلَبِّسَةً بِالْحَقِّ أَيْ: بِحَقِيقَةِ الْحَالِ" یعنی موت کی شدت حقیقت حال کو لیے ہوئے آئی، یا حکمت و غایت جمیل کو لیے ہوئے آئی۔ کسی نے کہا ہے کہ حرفِ باء تعدیت کا ہے: "أَيْ: أَتَتْ بِالْأَمْرِ الْحَقِّ" یعنی موت کی شدت امرِ حق کو لائی، یعنی اس کا ظاہر کر دیا، اس سے مراد آخرت کی ہولنا کیاں ہیں جو موت کے بعد ہوں گی۔ جلال محلی رحمہ اللہ نے فرمایا: "بِالْحَقِّ مِنْ أَمْرِ الْآخِرَةِ حَتَّى يَرَاهُ الْمُنْكِرُ لَهَا عَيَانًا وَهُوَ نَفْسُ الشِّدَّةِ"[4] یعنی موت کی شدت امرِ آخرت سے حق کو لیے ہوئے آئی، یہاں تک کہ اس امر کو آخرت کا منکر ظاہری طور پر دیکھے گا۔ علی قاری نے فرمایا ہے کہ "هُوَ نَفْسُ الشِّدَّةِ" کے معنی مجھے ظاہر نہیں ہوئے۔ انتہیٰ۔

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[2] مصنف ابن أبي شيبة (٨١/٧) شعب الإيمان (٢٦٥/٤) یہ روایت مرسل ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٩٥٣)

[3] تفسير الطبري (٣٤٦/٢٢) فتح القدير (١٠٠/٥) [4] تفسير الجلالين (٦٩٠/١)

یہ ممکن ہے کہ یوں کہا جائے کہ ''ھو'' کی ضمیر امرِ آخرت کی طرف راجع ہے اورشدت سے مراد امرِ شدید ہے، یعنی آخرت کی ہولناکیاں تو اس بنا پر جملہ ''من أمر الآخرۃ'' کی تفسیر ہوگا، یعنی وہ امرِ آخرت خود آخرت کی ہولناکیاں ہیں۔ کسی نے کہا: ''بِالْحَقِّ أَيْ: بِمَا يَؤُوْلُ إِلَيهِ أَمْرُ الإِنْسَانِ مِنَ السَّعَادَةِ وَالشَّقَاوَةِ'' یعنی موت کی شدت آئی اس سعادت و بدبختی کو لے کر جس کی طرف انسان کا حال رجوع کرے گا۔ اللھم اغفرلنا و تب علینا واسعدنا ولا تشقنا برحمتك الواسعة و فضلك العظیم آمین.

﴿ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ﴾ یعنی یہ موت وہ شے ہے جس سے تو اپنی زندگی میں مائل ہوتا اور بھاگتا تھا۔ سو بھاگنے نے تجھ کو نفع نہ دیا۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''حَادَ عَنِ الشَّيْءِ يَحِيْدُ حَيُوْدًا وَحَيْدَةً وَحَيْدُوْدَةً مَالَ عَنْهُ وَعَدَلَ''۔ غرضیکہ ''حید'' کے معنی کسی شے سے مائل ہونا ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: ﴿تَحِيْدُ﴾ ''تھرب''۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ''تفزع''۔ کسی نے کہا ہے کہ ''تکرہ''۔ کسی نے کہا ہے کہ ''تنفر'' یعنی تو بھاگتا تھا ڈرتا یا کراہت کرتا تھا یا نفرت کرتا تھا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ﴾ معطوف ہے ﴿جَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ﴾ پر، یعنی اور صور میں پھونکا جائے گا۔ اس کے وقوع کو ماضی کے پیرائے میں تحقیق کے سبب سے ادا کیا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ یہ وہی بعث کے لیے نفخۂ آخرہ ہے۔ صور وہ قرن ہے جس میں اسرافیل علیہ السلام پھونکیں گے اور وہ ایک ایسی بڑی شے ہے جس کے اندازے کو اللہ پاک کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ اسرافیل علیہ السلام نے اس کو اپنے منہ میں لے لیا ہے جب سے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ انھیں صور میں پھونکنے کا اذن ملے۔ (ذکرہ الخطیب)

قولہ تعالیٰ: ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ﴾ فعل جیسا کہ مصدر پر دال ہوتا ہے، ویسا ہی زمانے پر بھی دلالت کرتا ہے، یعنی یہ وقت جس میں صور پھونکا جائے گا وعید کا دن ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے کافروں کو وعید سنائی تھی۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''وعید'' سے مراد عذاب ہے۔[2] آخرت میں خاص کر وعید کا ذکر کیا اس کے باوجود کہ وہ وعد اور وعید دونوں کا دن ہے تو اس سے اس دن کو ہولناک کرنا مقصود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ دن وعید کے تحقق اور اس کے پورا کرنے کا دن ہے۔

غرضیکہ پہلے موت کا ذکر کیا، پھر بعث کا، پھر ان احوال کا ذکر کیا جو اس میں واقع ہوں گے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ﴾ (یہ جملہ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال۔[3] کما في فتح القدیر) یعنی اس دن میں ہر شخص آئے گا کہ اس کے ساتھ ایک تو اسے ہانکنے والا ہوگا اور ایک وہ جو اس کے فائدے اور نقصان کی گواہی دے گا۔ ﴿سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ﴾ میں اختلاف ہے۔ چنانچہ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿سَآئِقٌ﴾

[1] تفسیر البغوي (۳٦٠/۷) [2] تفسیر البغوي (۳٦٠/۷) [3] فتح القدیر (۱۰۰/۵)

فرشتوں میں سے ہے اور ﴿ شَهِيْدٌ ﴾ ان کے نفوس میں سے ہے، یعنی ہاتھ اور پاؤں۔ امام حسن اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک سائق ہے جو اسے ہانکے گا اور ایک شاہد ہے کہ اس پر اس کے عمل کی گواہی دے گا[1] یعنی دونوں فرشتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک ہی فرشتہ ہے جو دونوں وصفوں کا حامل ہوگا۔

امام ابن مسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ سَآئِقٌ ﴾ شیطانوں میں سے اس کا ساتھی ہے، اس کا نام ﴿ سَآئِقٌ ﴾ اس لیے رکھا ہے کہ وہ اس کے پیچھے چلے گا گو اس کو تیز نہ چلائے اور ﴿ شَهِيْدٌ ﴾ اس کے اعضاء اور اعمال ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ سَآئِقٌ وَشَهِيْدٌ ﴾ دو فرشتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ سَآئِقٌ ﴾ تو برائیاں لکھنے والا ہے اور ﴿ شَهِيْدٌ ﴾ نیکیاں لکھنے والا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قول کو زیادہ صحیح کہا ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ پھر کہا کہ آیت میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ یہ مسلم و کافر کے حق میں عام ہے۔ یہ قول جمہور کا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ یہ کافر کے ساتھ خاص ہے۔ یہ قول امام ضحاک رحمہ اللہ کا ہے۔[2]

جملہ ﴿ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا ﴾ بہ تقدیرِ قول محلِ نصب میں ہے بنا بر حال نفس سے، یا مستانفہ ہے۔ گویا کسی نے کہا ہے کہ اس سے کیا کہا جائے گا اور یہ اس کا جواب ہے کہ کہا جائے گا کہ البتہ درحقیقت تو اس سے غافل تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ کافر ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: اس سے مراد مشرک ہیں، کیوں کہ وہ اپنے انجام کے بارے میں غفلت میں تھے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے، یعنی البتہ اے محمد! تو واقعی رسالت سے غفلت میں تھا۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد ساری خلق ہے، وہ خواہ نیک ہو یا بد۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار یہی قول ہے،[3] جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، اس لیے کہ کوئی نہیں ہے جس کو آخرت سے کسی طرح کا اشتغال نہ ہو۔

﴿ فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ ﴾ یعنی پس ہم نے تجھ سے تیرا پردہ کھول دیا جو دنیا میں تھا۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے امورِ آخرت کے درمیان جو پردہ تھا، وہ ہم نے اٹھا دیا اور تو جو اس سے غفلت میں تھا، وہ غفلت ہم نے دور کر دی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس سے مراد حیات بعد موت ہے۔[4] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "غطاء" سے مراد پردہ ہے جو قیامت کے معاملات پر پڑا ہوا ہے، یعنی ان سے غافل ہونا اور محسوس اور موجود چیزوں میں منہمک اور مالوف ہونا اور صرف انھیں کی فکر کرنا۔[5] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ "غطاء" سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی ماں کے شکم میں تھا، پھر پیدا کیا گیا۔[6] کسی نے کہا ہے کہ وہ قبر میں تھا، پھر اس کو اٹھایا گیا۔ لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

---

(1) تفسير الطبري (٢٢/٣٤٨، ٣٤٩) (2) تفسير القرطبي (١٧/١٤) (3) تفسير الطبري (٢٢/٣٥٠، ٣٥١)
(4) تفسير الطبري (٢٢/٣٥٢) (5) تفسير البيضاوي (٥/٢٢٨) (6) تفسير القرطبي (١٧/١٥)

﴿فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ﴾ یعنی تیری نظر آج کے دن بہت تیز ہے تو وہ وہ چیزیں دیکھتا ہے جو دنیا میں تجھ پر مخفی رہتی تھیں اور تو اس شے کو اب محسوس کرتا ہے جس کا تو نے انکار کیا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ بصر سے مراد دل کی بصر ہے، یعنی بصیرت۔ کسی نے کہا ہے کہ آنکھ کی بصارت ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تیری نظر آج کے دن جبکہ تیری نیکیاں اور برائیاں تولی جائیں گے، بہت تیز ہے اور اپنی میزان کی لسان کی طرف دیکھ رہی ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[1] جمہور نے "كُنْتَ" کو بہ فتح تائے فوقیہ اور ﴿غِطَآءَكَ﴾ اور ﴿فَبَصَرُكَ﴾ کو بہ فتح کاف پڑھا ہے۔ ان کو مذکر پر محمول کر کے جو لفظ کل میں ہے۔ جحدری اور طلحہ بن مصرف رحمہ اللہ نے سب کو بالکسر پڑھا ہے اس بنا پر کہ مراد نفس ہے۔[2] (كذا في فتح البيان مع بعض التغير) پھر اور حالت بیان کی جو اس دن میں ہوگی۔

وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ﴿٢٣﴾ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ
كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿٢٤﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبٍ ﴿٢٥﴾ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ
اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ﴿٢٦﴾ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا
مَاۤ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ﴿٢٧﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا
لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿٢٨﴾ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ
وَمَاۤ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿٢٩﴾

اور اس کا ساتھی (فرشتہ) کہے گا: یہ ہے وہ (روداد) جو میرے پاس تیار ہے (23) (حکم ہوگا:) تم دونوں ہر کافر سرکش کو جہنم میں ڈال دو (24) بھلائی سے منع کرنے والے کو، حد سے نکلنے والے (اور دین میں) شک کرنے والے کو (25) وہ جس نے اللہ کے ساتھ دوسرا معبود بنا لیا تھا، لٰہذا تم دونوں اسے سخت عذاب میں ڈال دو (26) اس کا ساتھی (شیطان) کہے گا: اے ہمارے رب! میں نے اسے سرکش نہیں بنایا تھا اور لیکن وہ (خود ہی) پرلے درجے کی گمراہی میں پڑا رہا (27) اللہ فرمائے گا: تم میرے پاس جھگڑا نہ کرو، حالاں کہ میں پہلے ہی تمھاری طرف (عذاب کی) وعید بھیج چکا تھا (28) میرے ہاں بات بدلی نہیں جاتی، اور میں بندوں پر ظلم توڑنے والا نہیں (29)

فرشتے کی گواہی اور کفار کو جہنم میں پھینکنے کا حکم:

فرشتہ اعمال حاضر کرے گا اور شیطان ساتھی اپنی بے گناہی بتائے گا۔ میرے ہاں بات بدلتی نہیں، یعنی کافر بخشا نہیں جاتا۔ انتہیٰ۔

[1] تفسير القرطبي (١٥/١٧) [2] روح المعاني (١٨٤/٢٦) فتح البيان (١٣/١٦٧-١٧٢)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرشتے کے متعلق خبر دیتا ہے جو بنی آدم کے عمل پر مقرر کیا گیا تھا کہ وہ اس پر قیامت کے دن اُن اعمال کی گواہی دے گا جو اس نے کیے۔ وہ فرشتہ کہے گا: ﴿ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ﴾ "أَيْ: مُعْتَدٌّ مُحْضَرٌ" یعنی یہ وہ شے ہے جو میرے پاس تیار اور حاضر ہے، اس میں کوئی زیادتی اور کمی نہیں کی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات ہانکنے والے فرشتے کی ہے۔ کہے گا: یہ ابن آدم ہے جس پر تو نے مجھے مقرر کیا تھا، میں نے اس کو پورے کا پورا حاضر کر دیا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے کہ یہ عام ہے سائق اور شہید کے لیے اور یہ قول قابلِ توجہ اور قوی ہے۔[1]

چنانچہ اس وقت اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں عدل کے ساتھ فیصلہ کرے گا تو فرمائے گا کہ ﴿ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴾ نحویوں نے ﴿ اَلْقِيَا ﴾ میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے تو کہا ہے کہ یہ بعض عرب کا ایک لغت ہے کہ وہ مفرد کو بہ صیغۂ تثنیہ خطاب کرتے ہیں، جیسا کہ حجاج سے مروی ہے کہ وہ یوں کہا کرتا تھا: "يَا حَرَسِيُّ اِضْرِبَا عُنُقَهُ" یعنی او سپاہی! اس کی گردن مار۔ ("حرس" بفتحتین نگاہبان درگاہِ سلطان۔ "حراس" جمع ہے۔ "حرسی" ان میں سے ایک کو کہتے ہیں۔ كذا في الصراح)۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس لغت کی سند پر جو اشعار پڑھے ہیں، ان میں سے شاعر کا قول ہے:

فَإِنْ تَزْجُرَانِيْ يَا ابْنَ عَفَّانَ أَنْزَجِرْ وَإِنْ تَتْرُكَانِيْ أَحْمِ عِرْضاً مُمَنَّعَا[2]

یعنی اے ابن عفان! اگر تو زجر کرے گا تو میں منزجر ہو جاؤں گا اور اگر تو مجھے چھوڑ دے گا تو میں اپنی عزیز آبرو کو بچاؤں گا۔

کسی نے کہا ہے کہ یہ نون تاکید کا ہے الف کی طرف تسہیل کیا گیا ہے۔ یہ قول بعید ہے، کیوں کہ یہ جو ہوتا ہے تو وقف میں ہوتا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ سائق اور شہید دونوں کو خطاب ہے۔ چنانچہ سائق نے تو اس کو حساب کے میدان میں حاضر کر دیا اور جب شہید اس پر گواہی دے چکا تو اللہ تعالیٰ نے دونوں کو حکم دیا کہ اس کو جہنم کی آگ میں ڈال دیں۔ ﴿ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ یعنی جہنم پھر جانے کی بری جگہ ہے۔

ہر اس شخص کو جہنم میں ڈال دو جو بڑا کفر کرنے والا، بڑا حق کو جھٹلانے والا اور حق سے دشمنی رکھنے والا اور باطل کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے والا ہے، باوجود اس کے کہ وہ باطل کو جانتا ہے۔ ﴿ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ ﴾ بڑا منع کرنے والا ہے خیر کو، یعنی اس پر جو حقوق ہیں ان کو ادا نہیں کرتا اور نہ اس میں کوئی اچھائی اور نیکی اور احسان ہے اور نہ صلہ رحمی ہے نہ صدقہ وخیرات ہے، جس شے کو خرچ کرتا ہے اس میں حد سے بڑھ جاتا ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مُعْتَدٍ فِيْ مَنْطِقِهِ وَسَيْرِهِ وَأَمْرِهِ"[3] یعنی اپنے بولنے اور چلنے اور کام میں

---

[1] تفسير ابن كثير (٢٨٦/٤) [2] تفسير ابن كثير (٢٥٤/٢٢) [3] تفسير الطبري (٣٥٦/٢٢)

حد سے بڑھنے والا ہے۔ ﴿ مُّرِيبٍ ﴾ "أَيْ: شَاكٌّ فِيْ أَمْرِهِ مُرِيْبٌ لِمَنْ نَظَرَ فِيْ أَمْرِهِ" یعنی اپنے کام میں شک کرنے والا ہے اور جس کے کام میں نظر اور غور کرتا ہے اس پر تہمت لگانے والا ہے۔ جس نے اللہ کے ساتھ ایک اور معبود ٹھہرایا، یعنی اللہ کے ساتھ شرک کیا اور اس کے ساتھ اس کے غیر کو پوجا۔ چنانچہ تم اس کو سخت عذاب میں ڈال دو۔ حدیث میں پہلے گزر چکا ہے کہ خلائق کے لیے آگ میں سے ایک گردن نکلے گی، یعنی ان کے لیے عذاب کا ایک ٹکڑا ظاہر ہوگا اور ایک ایسی آواز کے ساتھ ندا کرے گا جس کو ساری مخلوقات سن لیں گی، وہ کہے گا کہ میں واقعی تین قسم کے لوگوں پر مقرر کیا گیا ہوں: ایک تو ہر جبار عنید پر اور دوسرے اس شخص پر جس نے اللہ کے ساتھ اور معبود ٹھہرایا اور مصوروں پر، پھر وہ اُن پر لپٹ جائے گا۔[1]

امام احمد رحمہ اللہ نے عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آگ میں سے ایک عنق نکلے گی ("عنق أَيْ: طائفة من النار"[2] یعنی آگ کا ایک ٹکڑا۔ كذا في مجمع البحار) اور کلام کرے گی، وہ کہے گی: میں آج کے دن تین قسم کے لوگوں پر مقرر کی گئی ہوں: ہر جبار عنید پر اور اس پر جس نے اللہ کے ساتھ اور معبود ٹھہرایا اور اس پر جس نے کسی نفس کو بغیر نفس کے مار ڈالا، پھر وہ اُن سے لپٹ جائے گی اور اُن کو جہنم کی گہرائیوں میں پھینک دے گی، جہاں پر بڑی آگ ہوگی۔[3]

انسان وشیطان کا اللہ تعالیٰ کے ہاں جھگڑا:

قولہ تعالیٰ: ﴿ قَالَ قَرِيْنُهٗ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ وغیرہم نے کہا: یہ قرین وہ شیطان ہے جو اس پر متعین کیا گیا تھا۔[4] ﴿ رَبَّنَا مَاۤ اَطْغَيْتُهٗ ﴾ یعنی جو انسان قیامت میں کافر ہو کر آئے گا، اس سے اس کا شیطان بے زار ہوگا اور اس کے بارے میں کہے گا کہ اے ہمارے رب! میں نے اس کو گمراہ نہیں کیا۔ ﴿ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ﴾ یعنی بلکہ وہ خود ہی گمراہ تھا جو باطل کو قبول کرنے والا اور حق کے ساتھ دشمنی رکھنے والا تھا، جس طرح کہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں اس کے متعلق خبر دی ہے: ﴿ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [إبراهيم: ٢٢] "اور جب کام کا فیصلہ کر دیا جائے گا تو شیطان کہے گا کہ اللہ نے تو تمھیں سچا وعدہ دیا تھا اور میں نے تم سے جو وعدے کیے تھے ان کا خلاف کیا، میرا تم پر کوئی دباؤ تو تھا ہی نہیں، ہاں میں نے تمھیں پکارا اور تم نے میری مان لی، پس تم مجھے الزام نہ لگاؤ، بلکہ خود اپنے آپ

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٧٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٨٠٥١) [2] مجمع بحار الأنوار (٦٨٩/٣)
[3] مسند أحمد (٤٠/٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٦٩٩) [4] تفسير الطبري (٣٥٧/٢٢)

کو ملامت کرو، نہ میں تمھارا فریادرس اور نہ تم میری فریاد کو پہنچنے والے، میں تو سرے سے مانتا ہی نہیں کہ تم مجھے اس سے پہلے اللہ کا شریک مانتے رہے، یقیناً ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔‘‘

قولہ تبارک وتعالیٰ: ﴿ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَیَّ ﴾ انسان اور جنوں میں سے اس کا ساتھی دونوں حق تعالیٰ کے روبر جھگڑیں گے تو آدمی کہے گا: یا رب! اس نے مجھ کو ذکر سے بہکایا، اس کے بعد کہ وہ میرے پاس آ چکا۔ شیطان کہے گا: اے ہمارے رب! میں نے اس کو گمراہ نہیں کیا، لیکن یہ خود ہی گمراہی میں تھا جو حق سے دور تھی۔ چنانچہ اللہ عزوجل دونوں سے فرمائے گا کہ میرے نزدیک جھگڑا مت کرو۔

﴿ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَیْكُمْ بِالْوَعِیْدِ ﴾ یعنی اور یقیناً میں نے تمھاری طرف رسولوں کی زبان سے تمھارا عذر ختم کر دیا اور میں نے کتابیں اتاریں اور تم پر حجتیں اور دلیلیں اور براہین قائم ہو چکیں۔ ﴿ مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ’’قَدْ قَضَیْتُ مَا أَنَا قَاضٍ‘‘[1] یعنی میں نے جو کرنا تھا وہ کر چکا۔ ﴿ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴾ یعنی میں ایسا نہیں ہوں کہ کسی کو کسی اور کے گناہ پر عذاب کروں، لیکن میں تو کسی کو اس کے گناہ پر اس کی حجت قائم ہو جانے پر ہی عذاب کرتا ہوں۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ قَرِیْنُهٗ ﴾ سے مراد وہی فرشتہ ہے جو اُس پر مقرر کیا گیا تھا اور یہ وہی رقیب ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ پہلے یہ گزرا ہے کہ رقیب نیکیوں کو لکھنے والے اور برائیوں کو تحریر کرنے والے ہیں اور انسان کے لیے دو رقیب ہیں اور وہ دونوں ﴿ عَتِیْدٌ ﴾ ہیں، یعنی تیار اور حاضر ہیں تو اب قرین کو واحد ذکر کرنا اس کی تاویل کی وجہ سے ہے، جیسے کہ رقیب میں گزر چکی ہے۔ شہاب وزادہ میں ہے کہ قرین سے مراد جنس ہے اور اگر پہلے والے خطابات کافر کے لیے ٹھہرائے جائیں تو قرین کے واحد لانے کی وجہ ظاہر ہو گی۔[3]

﴿ هٰذَا مَا لَدَیَّ عَتِیْدٌ ﴾ یعنی وہ فرشتہ جو اس پر مقرر کیا گیا تھا، وہ کہے گا: یہ تیرے عمل کی وہ کتاب ہے جو میرے نزدیک ہے، یہ حاضر ہے، مقرر میں نے اس کو تیار کیا ہے۔ امام حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرشتہ اللہ سبحانہ سے کہے گا کہ یہ وہ ہے جس پر تو نے مجھے بنی آدم میں سے تعین کیا تھا۔ میں نے یقیناً اس کو حاضر کیا اور اس کے عمل کے دفتر کو حاضر کیا۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ شیاطین میں سے اس کا قرین کہے گا: یعنی یہ وہ شے ہے جو میں نے اپنے گمراہ کرنے اور بہکانے کے سبب سے تیرے لیے مہیا کی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی ﴿ قَرِیْنُهٗ ﴾ ’’شَیْطَانُهٗ‘‘ فرمایا ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ مراد

[1] تفسیر الطبري (۳۵۹/۲۲) [2] تفسیر ابن کثیر (۲۸٦/٤، ۲۸۷) [3] حاشیة الشهاب علی تفسیر البیضاوي (۸۸/۸)

انسانوں میں سے اس کا قرین ہے۔[1] کلمہ ﴿عَتِيْدٌ﴾ مرفوع ہے اس بنا پر کہ کلمۂ "ما" کی صفت ہے اگر وہ موصوفہ ہو، "أَيْ: هٰذَا شَيْءٌ عَتِيْدٌ لَدَيَّ" اور اگر "مَا" موصولہ ہو تو خبر بعد خبر ہوگی۔ یا خبر مبتدائے محذوف کی۔

﴿اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ﴾ خطاب ہے اللہ عزوجل کی طرف سے سائق اور شہید کو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ان دونوں فرشتوں کو امر ہے جو اس پر مقرر کیے گئے تھے[2] یعنی سائق اور شہید۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آگ کے خازنین میں سے دو فرشتوں کو خطاب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ ایک کو خطاب ہے، اس بنا پر کہ فاعل کے تثنیہ کو فعل کے تثنیہ و تکریر کے رتبے میں قائم کیا ہے۔ امام خلیل اور اخفش رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ عرب کا کلام صحیح ہے کہ واحد کو تثنیہ کے لفظ سے خطاب کیا جاتا ہے، وہ بولتے ہیں: "اِرْحَلَاهَا وَازْجُرَاهَا وَخُذَاهُ وَأَطْلِقَاهُ" واحد کے لیے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک سے کہتے ہیں: "قُوْمَا عنا" یعنی تو ہمارے پاس سے اٹھ جا۔ اصل اس کی یہ ہے کہ آدمی کی بکریوں، اونٹوں اور سفر کے رفیقوں میں کم سے کم مددگار اور اعوان دو ہوتے ہیں، سو اسی پر آدمی کا کلام ایک کے لیے جاری ہوگیا، اسی باب سے عرب کا قول ہے، ایک کے لیے "خَلِيْلَيَّ"، جیسا کہ امری القیس نے کہا ہے:

خَلِيْلَيَّ مُرَّا بِيْ عَلٰى أُمِّ جُنْدَبٍ نُقَضِّ لُبَانَاتِ الْفُؤَادِ الْمُعَذَّبِ

یعنی اے میرے یار جانی! مجھے اُم جندب پر لے گزر۔ پوری کریں ہم آفت رسیدہ دل کی حاجتیں۔

اور اسی باب سے اس کا یہ قول ہے: "قِفَا نَبْكِ مِنْ ذِكْرٰى حَبِيْبٍ وَّمَنْزِلِ" اور ایک شعر پہلے گزر چکا ہے۔ لیکن فتح القدیر میں "وَإِنْ تَدْعُوَانِيْ" ہے بجائے "تَتْرُكَانِيْ" کے۔ مازنی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿اَلْقِيَا﴾ "أَلْقِ أَلْقِ" پر دال ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تثنیہ بنا بر تاکید ہے، چنانچہ ﴿اَلْقِيَا﴾ قائم مقام "أَلْقِ أَلْقِ" کے ہوگیا ہے[3] یا الف تثنیہ کے لیے نہیں ہے نہ تو حقیقتاً اور نہ صورتاً، بلکہ نون تاکید خفیفہ سے منقلب ہے بنا بر اس قاعدے کے:

وَأَبْدِلَنْهَا بَعْدَ فَتْحٍ أَلِفَا وَقِفًا كَمَا تَقُوْلُ فِيْ قِفَنْ قِفَا

اور وصل مجرای وقف میں جاری کیا گیا، جیسے: "نَسْفَعًا" یعنی نون خفیفہ کو الف سے بدل لو بعد فتح کے حالتِ وقف میں، جیسے کہ "قِفَنْ" میں "قِفَا" بولتے ہو۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ کی قراءت شواذ میں "أَلْقِيَنْ" یہ نون تاکید خفیفہ اس کی موید ہے۔[4] قرائے سبعہ میں سے کسی نے اس کو نہیں پڑھا۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خطاب دونوں فرشتوں، یعنی سائق و شہید کو ہے، اکثر لوگوں کے قول کی بنا پر اور ظاہر یہی ہے۔ غرضیکہ اللہ پاک نے دونوں سے فرمایا کہ جہنم میں ہر کفار، یعنی بڑے ناشکرے کو ڈال دو جو نعمتوں کا شکر نہیں کرتا، ایسا ناشکرا ہے کہ ایمان سے کنارہ کرنے

---

[1] تفسير الطبري (٣٥٧/٢٢) تفسير القرطبي (١٦/١٧) [2] معاني القرآن (٤٥/٥)

[3] تفسير القرطبي (١٦/١٧) فتح القدير (١٠١/٥) [4] تفسير القرطبي (١٦/١٧)

والا ہے اور ایمان سے دشمنی رکھنے والا ہے۔

امام مجاہد اور عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: "مُعَانِدٌ لِلْحَقِّ" یعنی حق سے عناد اور دشمنی رکھنے والا۔[1] کسی نے کہا ہے کہ حق سے اعراض کرنے والا۔ جب کوئی حق سے مخالفت کرتا ہے اور اس کو رد کرتا ہے، حالاں کہ اس کو پہچانتا ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: "عَنَدَ يَعْنِدُ" بالکسر "عُنُوْدًا"۔ ﴿ مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ ﴾ یعنی خیر کا بڑا روکنے والا ہے۔ بذل (عطا) نہیں کرتا خیر کو، زکاتِ مفروضہ کو ادا نہیں کرتا۔ یا ہر حق جو اس پر واجب ہے اسے ادا نہیں کرتا، ﴿ مُعْتَدٍ ﴾ یعنی ظالم ہے اللہ کی توحید کا اقرار نہیں کرتا، ﴿ مُّرِيْبٍ ﴾ یعنی حق میں شک کرنے والا ہے۔ عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے کہ "أَرَابَ الرَّجُلُ إِذَا صَارَ ذَا رَيْبٍ".

قولہ تعالیٰ: ﴿ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ﴾ منصوب ہے بنا بر بدل کل سے یا منصوب ہے بنا بر ذم "أَيْ: أَذُمُّ"۔ یا مجرور ہے بنا بر بدل کفار سے، یا مرفوع ہے بنا بر متبداء اور خبر ﴿ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ﴾ ہے چوں کہ متبدا مشابہ شرط ہے عموم میں، اس لیے حرفِ فاء اس کی خبر میں آیا ہے، یہ تاکید ہے امرِ اول کی، یا اس سے بدل ہے۔ ﴿ الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ﴾ سے مراد آگ ہے۔

جملہ: ﴿ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَاۤ اَطْغَيْتُهٗ ﴾ مستانفہ ہے اس بات کو بیان کرنے کے لیے جس کو قرین کہے گا، یہاں اس سے مراد وہ شیطان ہے جو اس کافر پر تعین کیا گیا تھا، اس نے اس بات سے انکار کیا کہ اس نے بہکایا ہے۔ ہر اس قرین نے کہا: ﴿ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ﴾ یعنی لیکن وہ ہی گمراہی میں تھا جو حق سے بہت دور تھی، چنانچہ میں نے اس کو بلایا تو اس نے میرا کہنا مان لیا اور اگر وہ تیرے خالص بندوں میں سے ہوتا تو مجھے اس پر قدرت نہ ہوتی۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کا قرین وہ فرشتہ ہے جو اس کی برائیاں لکھا کرتا تھا اور کافر کہے گا: یا رب! اس نے مجھ پر جلدی کی تو وہ اس کو یہ جواب دے گا۔ امام مقاتل اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے[2] اور قولِ اول زیادہ بہتر ہے اور جمہور اسی کے قائل ہیں۔

جملہ ﴿ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ ﴾ مستانفہ ہے۔ گویا کسی نے کہا ہے کہ پھر اللہ پاک نے کیا فرمایا؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ اللہ سبحانہ نے کافروں سے اور اُن کے قرینوں سے فرمایا، میرے پاس مت جھگڑا کرو، ان کو حساب کی جگہ میں جھگڑنے سے منع کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ انھوں نے بغیر عذر کے عذر کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی حجت باطل کر دی اور اُن کی بات ان پر رد فرما دی۔[3]

جملہ: ﴿ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال اور حرفِ باء تاکید کے لیے مفعول میں زاید ہے، یا "قدم" "تقدم" کے معنی ہیں شامل کیا جائے، یعنی حال یہ ہے کہ میں تمھاری طرف وعید کو آگے بھیج چکا، اس

---

[1] تفسير البغوي (٣٦١/٧) [2] تفسير القرطبي (١٧/١٧) [3] تفسير الطبري (٣٥٨/٢٢)

طرح سے کہ رسول بھیجے اور کتابیں اتاریں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ ﴾ کا مفعول ﴿ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ ﴾ ہے، یعنی یقیناً میں نے تمھاری طرف یہ قول آگے بھیجا، حالاں کہ اس میں وعید تھی۔ یہ توجیہ نہایت بعید ہے، معنی یہ ہیں کہ میرے نزدیک اس باب میں بات نہیں بدلی جاتی، یعنی میری وعید کو کسی طرح کی رکاوٹ نہیں، بلکہ وہ ضروری ہونے والی ہے اور مقرر میں تم پر عذاب کا فیصلہ کر چکا ہوں اور وہ اب تبدیل نہیں ہوگا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس قول سے مراد یہ آیت ہے: ﴿ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ﴾ [الأنعام: ١٦٠] ”جو شخص نیک کام کرے گا اس کو اس کے دس گنا ملیں گے اور جو شخص برا کام کرے گا اس کو اس کے برابر سزا ملے گی۔“ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت ہے: ﴿ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [السجدة: ١٣] ”میں ضرور ضرور جہنم کو انسانوں اور جنوں سے پر کر دوں گا۔“ کسی نے کہا کہ قول سے مراد کافر کو جہنم میں ہمیشہ رہنے کی وعید دینا ہے اور دوسرے گناہ گاروں کو ان کے استحقاق کے مطابق سزا کی وعید دینا ہے۔

امام فراء اور ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ میرے نزدیک بات میں اضافہ کر کے یا اس میں سے کمی کر کے جھوٹ نہیں بولا جاتا، اس وجہ سے کہ میں غیب کو جانتا ہوں۔ یہ قول امام کلبی رحمہ اللہ کا ہے اور امام واحدی رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے ﴿ لَدَيَّ ﴾ فرمایا ہے۔ ”مَا يُبَدَّلُ قَوْلِي“ نہیں کہا۔[1] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تم اس کا طمع نہ رکھو کہ میں اپنی وعید بدل ڈالوں گا اور گناہ گاروں کو معاف کرنا بعض اسباب کی تبدیلی سے نہیں ہے، اس لیے کہ گناہ گار مومنوں کے حق میں عفو کی دلیلیں تو تخصیصِ وعید پر دال ہیں اور کافر کے بارے میں کچھ تخصیص نہیں ہے۔ تو ان کے حق میں وعید اپنے عموم پر ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

﴿ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾ یعنی میں ان کو ظلماً عذاب نہیں کروں گا بغیر کسی جرم و گناہ کے جو انھوں نے کیا ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا: ”مَا أَنَا بِمُعَذِّبٍ مَنْ لَمْ يَجْتَرِمْ“[2] یعنی اس کو عذاب کرنے والا نہیں ہوں جس نے جرم نہیں کیا۔ چونکہ ظلام کی نفی مجرد ظلم کی نفی کو لازمی نہیں کرتی، اس لیے کہا گیا ہے کہ اس جگہ ”ظلام“ بہ معنی ظالم ہے، جیسے: ”تَمَّارٌ“ بہ معنی ”تَامِرٌ“ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مبالغے کا یہ صیغہ اس معنی و مفہوم کی تاکید کے لیے ہے اس چیز کو ظاہر کرنے کے ساتھ جو ظلم میں مبالغہ کے ضمن میں بغیر گناہ کے عذاب دینے کا ذکر ہوا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ صیغۂ مبالغہ جمعیتِ عبید کی رعایت کے لیے ہے۔ عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے کہ ”فُلَانٌ ظَالِمٌ لِعَبْدِهِ وَظَلَّامٌ لِعَبِيْدِهِ“ کسی نے کہا کہ ”ظَلَّامٌ“ بہ معنی ”ذِيْ ظُلْمٍ“ ہے۔ بدلیل قولہ تعالیٰ: ﴿ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ﴾ [المؤمن: ١٧] اور جب اس نے اس دن میں ظلم نہ کیا تو اس سے اس دن کے غیر میں نفی بطریقِ اولیٰ ہوگی، چنانچہ اس کا کوئی مفہوم مخالف نہیں ہے۔ ان کے سوا اس میں اور قول بھی ہیں۔ سورت آلِ عمران وسورۃ الحج میں اس پر کلام گزر چکا ہے۔[3]

[1] فتح القدير (١٠٢/٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٠٩/١٠) [3] فتح البيان (١٧٣/١٣-١٧٦)

يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِن مَّزِيدٍ ۝٣٠ وَأُزْلِفَتِ
الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ ۝٣١ هَٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِكُلِّ أَوَّابٍ
حَفِيظٍ ۝٣٢ مَّنْ خَشِيَ الرَّحْمَٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ ۝٣٣
ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ ۖ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُودِ ۝٣٤ لَهُم مَّا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا
مَزِيدٌ ۝٣٥

(یاد کرو!) جس دن ہم جہنم سے کہیں گے: کیا تو بھر گئی ہے؟ اور وہ کہے گی: کیا کچھ مزید ہے؟ 30 اور جنت متقین کے قریب کی جائے گی، (وہ) دور نہیں ہو گی 31 (کہا جائے گا:) یہ ہے وہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، خوب رجوع کرنے والے، (امرِ الٰہی کی) حفاظت کرنے والے ہر شخص کے لیے 32 جو رحمان سے بن دیکھے ڈر گیا اور وہ رجوع کرنے والا دل لے آیا ہے 33 (کہا جائے گا:) تم اس (جنت) میں سلامتی سے داخل ہو جاؤ، یہی ہمیشہ رہنے کا دن ہے 34 وہ جو کچھ چاہیں گے ان کے لیے ہو گا، اور ہمارے پاس اور بھی بہت کچھ ہے 35

جنت وجہنم کے حالات وواقعات:

دوزخ کا پھیلاؤ اس قدر ہے کہ لوگوں سے نہ بھرے گا۔ ہمارے پاس اور بھی زیادہ ہے، یعنی ایسی نعمتیں ہیں جو ان کے خواب وخیال میں بھی نہیں ہیں۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ قیامت کے دن وہ جہنم سے فرمائے گا: کیا تو بھر چکی؟ یہ اس لیے کہ اس نے اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اس کو جنوں اور انسانوں اجمعین سے بھر دے گا۔ چنانچہ اللہ پاک حکم کرے گا جہنم کی طرف جس کا کہ حکم کرے گا اور وہ اس میں ڈالا جائے گا اور وہ کہے گی: ﴿هَلْ مِن مَّزِيدٍ﴾ یعنی کیا کوئی اور شے مجھے دینے کے لیے باقی ہے؟ سیاقِ آیت سے ظاہر یہی قول ہے اور اسی پر حدیثیں دال ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں عن انس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ نار میں ڈالا جائے گا اور وہ کہے گی: ﴿هَلْ مِن مَّزِيدٍ﴾ یہاں تک کہ اللہ اپنا قدم اس میں رکھے گا تو وہ کہے گی: «قَط قَط»[1] یعنی بس بس۔
امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے، ہمیشہ رہے گی جہنم کہ جب اس میں کسی کو ڈالا جائے گا تو وہ کہے گی: ﴿هَلْ مِن مَّزِيدٍ﴾ یہاں تک رب العزت اس میں اپنا قدم رکھے گا تو اس کا بعض بعض سے مل جائے گا اور وہ کہے گی: "قَط قَط بِعِزَّتِكَ وَكَرَمِكَ" یعنی بس بس قسم ہے تیری عزت اور تیرے کرم کی! اور ہمیشہ رہے گا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٦٧)

جنت میں فضل یہاں تک کہ اللہ اس کے لیے ایک اور مخلوق کو پیدا کرے گا، پھر ان کو اللہ تعالیٰ جنت کے خالی حصے میں بسائے گا۔[1] (ثم رواه مسلم من حديث قتادة بنحوه ورواه أبان العطار وسليمان التيمي عن قتادة نحوه)

حدیثِ دیگر:

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس کو مرفوع کیا ہے اور اکثر ابو سفیان اس کو موقوف بیان کرتے تھے۔ جہنم سے کہا جائے گا: کیا تو بھر چکی؟ اور وہ کہے گی: ﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ پس اللہ تبارک وتعالیٰ اپنا قدم اس پر رکھے گا تو وہ کہے گی: ''قَط قَط''[2] (و رواه أبو أيوب و هشام بن حسان عن محمد بن سيرين به)

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنت اور نار جھگڑیں، چنانچہ نار نے کہا کہ میں متکبروں اور متجبروں کے لیے اختیار کی گئی اور جنت نے کہا کہ میرے لیے یہ ہے کہ نہیں داخل ہوں گے مجھ میں مگر ضعیف اور اُن کے کمتر لوگ۔ اللہ عزوجل نے جنت سے فرمایا کہ تو میری رحمت ہے میں رحم کرتا ہوں تیرے ساتھ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہوں اور نار سے کہا کہ تو جو ہے پس میرا عذاب ہے، میں عذاب کرتا ہوں تیرے ساتھ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہوں اور تم دونوں میں سے ہر ایک کے لیے اس کی بھرتی یعنی حصہ ہے اور نار تو وہ نہ بھرے گی یہاں تک کہ اس میں وہ اپنا پاؤں رکھے گا تو وہ کہے گی: ''قَط قَط'' چنانچہ اس وقت وہ بھر جائے گی۔ (اصل روایت کے الفاظ: ''هنالك'' ہیں، یہ ظرفِ مکان ہے اور کبھی زمان کے معنی میں بھی آتا ہے)۔ اور ملایا جائے گا اس کا بعض بعض سے اور اللہ تعالیٰ اپنی خلق میں سے کسی پر ظلم نہیں کرتا اور رہی جنت تو بے شک اللہ اس کے لیے ایک اور مخلوق پیدا کرے گا۔[3]

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنت اور نار آپس میں جھگڑیں۔ نار نے کہا کہ مجھ میں جبار اور متکبر لوگ ہیں اور جنت نے کہا کہ مجھ میں ضعیف لوگ ہیں اور ان کے مسکین ہیں۔ پھر ان میں فیصلہ کیا تو جنت سے فرمایا کہ تو میری رحمت ہے میں تیرے ساتھ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہوں رحم کرتا ہوں اور نار سے فرمایا کہ تو میرا عذاب ہے، میں تیرے ساتھ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہوں عذاب کرتا ہوں اور تم میں سے ہر ایک کے لیے اس کی بھرتی، یعنی حصہ ہے۔[4] (انفرد مسلم دون البخاري من هذا الوجه، والله سبحانه وتعالىٰ أعلم)

امام احمد رحمہ اللہ نے بطریقِ دیگر مبسوط تر ازیں طریق سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے اس کو روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنت اور نار نے فخر کیا تو نار بولی: یا رب! مجھ میں جبار اور متکبر اور بادشاہ اور باعزت

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤٨) مسند أحمد (٢٣٤/٣)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٦٨)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٦٩)
[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤٧)

لوگ داخل ہوں گے اور جنت نے کہا: اے رب! مجھ میں ضعیف، فقیر اور مسکین داخل ہوں گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نار سے فرمائے گا: تو میرا عذاب ہے میں پہنچوں گا تیرے ساتھ جس کو چاہوں گا، یعنی مصیبت پہنچاؤں گا، عذاب کروں گا جس کو چاہوں گا اور جنت سے فرمائے گا: تو میری رحمت ہے، وہ وسیع ہوئی ہے ہر شے کو اور تم دونوں میں ہر ایک کے لیے اس کی بھرتی ہے۔ پھر نار میں اس کے لوگ ڈالے جائیں گے تو وہ کہے گی: ﴿ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴾ فرمایا اور ڈالا جائے گا اس میں اور وہ کہے گی: ﴿ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴾ اور پھر اس میں اور ڈالا جائے گا اور وہ کہے گی: ﴿ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴾ یہاں تک کہ اس کے پاس اللہ عزوجل آئے گا اور اس پر اپنا قدم رکھ دے گا، پس وہ بجھ جائے گی اور کہے گی: "قَدْنِ قَدْنِ" یعنی بس ہے مجھے بس ہے مجھے۔ لیکن جنت کا حال یہ ہے کہ باقی رہے گا اس میں جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہے گا کہ باقی رہے، پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کے لیے ایک مخلوق جو چاہے گا پیدا کرے گا۔ [1]

حافظ ابویعلیٰ رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو قیامت کے دن اپنا نفس پہچنوائے گا تو میں ایک سجدہ کروں گا اور وہ اس کے سبب سے مجھ سے راضی ہوگا، میں اس کی ایک مدح کروں گا تو وہ اس کے سبب سے مجھ سے راضی ہوگا، پھر مجھ کو کلام کا اذن دیا جائے گا، پھر میری اُمت صراط پر گزرے گی جو جہنم کے درمیان نصب کیا گیا ہوگا، پھر وہ پلک جھپکنے سے بھی پہلے اس پر سے گزریں گے تیر سے اور تیز تر گھوڑے سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے، یہاں تک کہ مرد اس میں سے سرین کے بل گھسٹتا ہوا نکلے گا، اور وہ اعمال ہیں (یعنی جیسا جس کا عمل ہے ویسا ہی پل صراط پر سے اس کا گزرنا ہوگا۔) اور جہنم مزید کا سوال کرے گی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس میں اپنا قدم رکھ دے گا تو اس کا بعض حصہ بعض سے مل جائے گا اور وہ کہے گی: «قَطْ قَطْ» اور میں حوض پر ہوؤں گا۔ عرض کی گئی: اور حوض کیا ہے اے اللہ کے رسول؟! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اس کی شراب، یعنی پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں اور برف سے زیادہ ٹھنڈا اور مشک سے زیادہ خوشبودار اور اس کے برتن تاروں کی تعداد سے زیادہ ہیں، اس میں سے جو انسان پی لے گا، وہ پھر کبھی پیاسا نہ ہوگا۔ "وَلَا يُصْرَفُ فَيَرْوِيْ أَبَدًا" (یعنی اور نہ پھیرا جائے گا اس سے کوئی آدمی پھر وہ کبھی سیراب ہو، مطلب یہ ہے کہ جو کوئی اس سے پی لے گا، وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا اور جو کوئی وہاں سے پھیرا جائے گا وہ کبھی سیراب نہ ہوگا)۔ یہ قول ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار ہے۔ [2]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، فرمایا: "مَا امْتَلَأْتِ"، یعنی تو نہیں بھری؟ کہا: وہ کہے گی: اور کیا ہے مجھ میں کوئی جگہ کہ زیادہ کیا جائے مجھ میں! اسی طرح حکم بن ابان نے عکرمہ رحمہ اللہ

---

① مسند أحمد (۳/۱۳) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجالہ ثقات" (مجمع الزوائد: ۷/۲۴۳)

② تفسیر ابن کثیر (۴/۲۸۸، ۲۸۹) ظلال الجنة (۲/۶۲) اس کی سند میں ''عبدالغفار بن قاسم'' سخت ضعیف راوی ہے۔

سے اس کو روایت کیا ہے اور کہا ہے: آیا ہے مجھ میں کوئی مدخلِ واحد! (یعنی داخل ہونے کی ایک جگہ، یا ایک کے داخل ہونے کی جگہ۔ واللّٰہ أعلم) مقرر میں بھر گئی۔ ولید بن مسلم نے یزید بن ابی مریم سے روایت کیا ہے کہ یزید نے امام مجاہد رحمہ اللہ کو کہتے ہوئے سنا کہ ہمیشہ رہے گا کہ اس میں ڈالا جائے گا، یہاں تک کہ وہ بولے گی میں واقعی بھر گئی، پھر کہے گی کہ آیا ہے مجھ میں کوئی زیادتی!

عبدالرحمان بن زید بن اسلم رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے، چنانچہ ان لوگوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا یہ قول: ﴿هَلِ امْتَلَأْتِ﴾ اس کے بعد ہے کہ اس پر اپنا قدم رکھ دے گا اور وہ بھچ جائے گی اور اس وقت کہے گی کہ کیا مجھ میں کوئی زیادتی باقی رہ گئی ہے کہ وہ کسی شے کو سمائے![1] امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور یہ اس وقت ہے کہ اس میں اتنی سی جگہ بھی باقی نہ رہے گی کہ ایک سوئی کو بھی سما لے۔[2] واللّٰہ أعلم.

﴿وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ﴾ امام قتادہ، ابو مالک اور سدی رحمہم اللہ نے کہا: جنت نزدیک لائی جائے گی۔[3] اور متقیوں کے قریب کی جائے گی اور یہ قیامت کے دن ہے اور کچھ بعید نہیں ہے، اس لیے کہ وہ تو ضرور واقع ہونے والا ہے اور ہر شے جو آنے والی ہے قریب ہے۔ ﴿هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ﴾ "أَيْ: رَجَّاعٍ، تَائِبٍ، مُقْلِعٍ يَحْفَظُ الْعَهْدَ فَلَا يَنْقُضُهُ وَلَا يَنْكُثُهُ" یعنی یہ وہ شے ہے جس کا تم کو وعدہ دیا جاتا ہے ہر رجوع ہونے والے، توبہ کرنے والے، باز رہنے والے کے لیے جو نگاہ رکھنے والا ہے عہد پر اور اس کو توڑتا نہیں ہے۔ عُبید بن عمیر رحمہ اللہ نے کہا: ﴿اَوَّابٍ حَفِيْظٍ﴾ وہ ہے جو نہیں بیٹھتا ہے کسی مجلس میں پھر اٹھتا ہے تو اللہ عزوجل سے مغفرت مانگتا ہے۔

﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ﴾ یعنی جو شخص اپنے پوشیدہ حال میں ڈرا جہاں سے اس کو اللہ عزوجل کے سوا کوئی نہیں دیکھتا ہے جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: «وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ»[4] یعنی وہ ایک مرد ہے کہ اس نے تنہائی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کیا اور اس کی دونوں آنکھیں بہہ نکلیں۔ ﴿وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ﴾ یعنی اور قیامت کے دن اللہ عزوجل سے ایسا دل لے کر ملا جو اس کی طرف رجوع ہونے والا ہے اور سلیم ہے، یعنی شرک وغیرہ سے پاک ہے اور اس کے پاس عاجزی اور فروتنی کرنے والا ہے۔ ﴿اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ﴾ یعنی سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ عزوجل کے عذاب سے سلامت رہے اور اُن پر اللہ تعالیٰ کے فرشتوں نے سلام کی۔[5]

قولہ تعالیٰ: ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ﴾ یعنی جنت میں ہمیشہ رکھے جائیں گے، نہ کبھی مریں نہ کبھی وہاں سے نکلیں۔ اور نہ وہاں سے جگہ بدلنا چاہیں۔ ﴿لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا﴾ یعنی جو کچھ انھوں نے پسند کیا، وہ ان کو مل گیا،

---

[1] تفسير ابن كثير (٤/٢٨٩) [2] تفسير الطبري (٢٢/٣٦٠) [3] تفسير الطبري (٢٢/٣٦٣، ٣٦٤)
[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٩) صحيح مسلم (١٠٣١) [5] تفسير الطبري (٢٢/٣٦٦)

لذت کی مختلف قسم کی چیزیں جو انھوں نے طلب کیں، وہ اُن کے لیے حاضر کر دی گئیں۔ ﴿ وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴾ یعنی ہمارے پاس اور زیادہ بھی ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کثیر بن مرہ سے روایت کیا ہے، کہا: ﴿ مَزِيْدٌ ﴾ میں سے یہ ہے کہ اہلِ جنت کے اوپر ایک بدلی گزرے گی اور کہے گی کہ تم کیا چاہتے ہو کہ میں تم پر برساؤں؟ پھر وہ جو شے طلب کریں گے وہ ان پر برسا دے گی۔ کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ البتہ اگر مجھ کو اللہ اس موقعے میں حاضر کرے گا تو میں تو ضرور یہ کہوں گا کہ ہم پر جواری مزینات برسا دے[1] یعنی جوان نوخیز بنی ٹھنی لڑکیاں۔

حدیث شریف میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ بے شک اگر تو پرندوں کی خواہش کرے گا تو وہ تیرے آگے بھنے بھنائے ہو کر گر پڑیں گے۔[2] امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس وقت مومن لڑکے کی خواہش کرے گا تو اس کا حمل اور اس کا جننا اور جوان ہونا ایک ہی گھڑی میں ہو جائے گا۔[3] (ورواه الترمذي وابن ماجه عن بندار عن معاذ بن هشام به وقال الترمذي: حسن غريب وزاد: كما يشتهي) قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴾ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ﴾ [يونس: ٢٦] ''جن لوگوں نے نیکی کی ہے، ان کے لیے خوبی ہے اور مزید برآں بھی۔''

صحیح مسلم میں بروایتِ صہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ پہلے گزر چکا ہے کہ زیادہ اللہ کریم کے وجہ (چہرے) کی طرف نظر کرنا ہے۔[4] سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ﴿ مَزِيْدٌ ﴾ کی تفسیر میں مروی ہے کہ انھی کے لیے رب عزوجل ہر جمعے کو ظاہر ہوگا۔[5] (رواه البزار و ابن أبي حاتم من حديث شريك القاضي عن عثمان بن عمير أبي اليقظان عنه)

امام ابوعبداللہ شافعی رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں بہ سندِ خود بروایتِ عبیداللہ بن عمیر اس کو مرفوعاً روایت کیا ہے کہ عبیداللہ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو سنا، کہتے تھے کہ جبریل علیہ السلام ایک سفید آئینہ رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے، اس میں ایک نکتہ تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ تو جبریل علیہ السلام نے کہا: یہ جمعہ ہے، فضیلت دیا گیا ہے تو اور تیری امت اس کے ساتھ۔ پس یہود و نصاریٰ اس میں آپ کے تابع ہیں۔ اور تمھارے لیے اس میں خیر ہے اور تمھارے لیے اس میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ کوئی مومن اس میں اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کی دعا کرے گا تو وہ اس کے لیے قبول کی جائے گی اور وہ ہمارے نزدیک ''یوم المزید'' ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: « أَيْ: جِبْرِيْلُ » اور ''یوم المزید'' کیا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣١٠/١٠)

[2] مسند البزار (٤٠١/٥) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہِ ضعف ہیں۔ تفصیل دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٧٨٤)

[3] مسند أحمد (٩/٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٦٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٣٨) صحيح الجامع (٦٦٤٩)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨١)

[5] مسند البزار (٧٠/١٤) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣١٠/١٠) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''فيه عثمان بن عمير وهو ضعيف'' (مجمع الزوائد: ٢٤٣/٧)

ہے؟ انھوں نے کہا کہ بے شک تیرے رب تبارک وتعالیٰ نے فردوس میں ایک فراخ وادی بنائی ہے، اس میں مشک کے ٹیلے ہیں، پس جس وقت جمع کا دن ہو گا تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں میں سے جو چاہے گا اتارے گا اور اس کے گرد نور کے منبر ہیں، ان پر نبیوں کی نشستیں ہیں اور وہ منبر سونے سے گھیرے گئے ہیں اور وہ یاقوت اور زبرجد سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان ٹیلوں پر شہداء اور صدیق لوگ ہوں گے، پھر اُن سے پرے ان ٹیلوں پر بیٹھیں گے، پھر اللہ عزوجل فرمائے گا: میں تمھارا رب ہوں، میں نے مقرر تم سے اپنا وعدہ سچ کیا، پس تم مجھ سے مانگو میں تم کو عطا کروں گا تو وہ عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہم تجھ سے تیرے رضوان، یعنی رضا مندی کا سوال کرتے ہیں، چنانچہ وہ فرمائے گا: میں واقعی تم سے راضی ہو گیا اور تمھارے لیے میری طرف سے وہ ہے جس کی تم نے تمنا کی اور میرے پاس مزید ہے۔ چنانچہ وہ اس خیر کے سبب سے جمعہ کو پسند کریں گے جو اُن کا رب تبارک وتعالیٰ ان کو اس میں عطا کرے گا اور یہ وہ دن ہے جس میں تمھارا رب عرش پر مستوی ہوا اور اس میں آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے اور اس میں قیامت قائم ہو گی۔[1]

(هكذا أورده الإمام الشافعي رحمه الله في كتاب الجمعة من الأم وله طرق عن أنس بن مالك رضي الله عنه وقد أورده ابن جرير هذا الحديث من رواية عثمان بن عمير بن أنس رضي الله عنه بأبسط من هذا و ذكر ههنا أثرا عن أنس موقوفا وفيه غرائب كثيرة)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک مرد جنت میں تکیہ لگائے گا ستر برس تک اس سے پہلے کہ نقل کرے، (یعنی ستر برس تک ایک ہی نشست پر بیٹھے گا، دوسری نشست نہ بدلے گا) پھر اس کے پاس ایک عورت آئے گی جو اپنا ہاتھ اس کے مونڈھے پر مارے گی تو وہ اپنے چہرے کو اس کے رخسار میں آئینے سے بھی زیادہ صاف دیکھے گا اور اس پر جو ادنیٰ موتی ہو گا وہ اس پر مشرق ومغرب کے درمیان جو جگہ ہے، اتنی جگہ کو روشن کر دے گا، پھر وہ اس پر سلام کرے گی اور وہ اس کے سلام کا جواب دے گا، پھر اس سے پوچھے گا: تو کون ہے؟ تو وہ کہے گی: میں مزید سے ہوں اور بے شک حال یہ ہے کہ اس پر ستر حلے ہوں گے، ان میں سے ادنیٰ طوبیٰ کے نعمان کی طرح (اصل میں اسی طرح ہے۔ واللہ أعلم۔ اس کے کیا معنی ہیں) چنانچہ اس کی نگاہ ان حلوں میں سے پار ہو جائے گی، یہاں تک کہ ان کے پیچھے سے اس کی پنڈلی کے گودے کو دیکھ لے گا اور بے شک اس پر تاج ہوں گے، بے شک ان کا ادنیٰ موتی مشرق ومغرب کے درمیان روشنی کر دے گا۔[2] (وهكذا رواه عبد الله ابن وهب عن عمرو بن الحارث عن دراج به)

فتح البیان کا بیان:

جمہور نے ﴿ نَقُوْلُ ﴾ بہ نون اور نافع اور ابوبکر نے "یَقُوْلُ" بہ یائے تحتیہ اور حسن رحمہ اللہ نے "أَقُوْلُ" بہ الف

---

[1] الأم للشافعي (٣٥٦/١) اس کی سند میں "موسیٰ بن عبیدہ" ضعیف راوی ہے۔

[2] مسند أحمد (٧٥/٣) تفسیر ابن کثیر (٢٨٧/٤۔٢٩٠) اس کی سند میں "دراج عن ابی الہیثم" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (ضعیف الترغیب والترهیب: ٢٥٠/٢)

اور اعمش نے "یُقَالُ" بہ صیغۂ مضارع مجہول پڑھا ہے۔[1] کلمۂ "إذ" میں عامل ﴿ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ ﴾ ہے، یا "اُذْکُرْ" محذوف ہے، یا "أَنْذِرْهُمْ" ہے، یعنی بات نہیں بدلی جائے گی جس دن ہم کہیں گے، یا اس دن کا ذکر کر جس دن ہم کہیں گے۔ یا ان کو اس دن سے ڈرا جس دن ہم جہنم سے کہیں گے: کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی: ﴿ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴾ کہا ہے کہ یہ کلام تمثیل و تخییل کے طور پر ہے اور وہاں نہ کچھ سوال ہے اور نہ جواب۔

امام زمخشری رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں،[2] زیادہ بہتر یہ ہے کہ برطریقِ تحقیق یعنی حقیقی ہے۔ اس سے نہ عقل مانع ہے اور نہ شریعت۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زمخشری کا اس کو مجاز کے باب سے ٹھہرانا مردود ہے، اس لیے کہ حدیث شریف میں یوں وارد ہو چکا ہے: « تَحَاجَّتِ النَّارُ وَالْجَنَّةُ »[3] یعنی نار اور جنت جھگڑیں، « وَاشْتَكَتِ النَّارُ إِلَى رَبِّهَا »[4] یعنی نار نے اپنے رب سے شکوہ کیا اور اس سے کوئی مانع نہیں ہے۔ پس بے شک کنکریوں نے تسبیح کی اور پتھر نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام کیا اور اگر اس میں مجاز کا باب کھولا جائے تو خرق وسیع ہو جائے گا۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حقیقی طور پر جہنم سے قول ہے اور یہ کوئی اوپری بات نہیں، جیسے: اعضاء کو بلوا دینا اور اُن سے کفار کی ڈانٹ ڈپٹ کے لیے سوال کرنا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو اس کو جانتا ہے کہ وہ بھر چکی یا نہیں۔[5]

امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مفسروں نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہنم کو اپنے اس قول کی تصدیق دکھائی: ﴿ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ ﴾ [الأعراف: ١٨] "میں ضرور جہنم کو بھر دوں گا۔" پھر جب وہ بھر گئی تو اس سے فرمایا کہ تو بھر گئی؟ اور یہ کہے گی: ﴿ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴾ یعنی میں واقعی بھر گئی اور مجھ میں کوئی ایسی جگہ باقی نہیں رہی جو بھری نہیں ہے۔

امام عطاء، مجاہد اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[6] کسی نے کہا ہے کہ یہ سوالیہ انداز اور زیادہ طلب کرنے کے معنی میں ہے، یعنی وہ اُن لوگوں پر جو اُس میں جا چکے ہیں اور زیادہ طلب کرے گی۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اس نے یہ طلب کیا کہ اس کی وسعت میں زیادتی کی جائے اپنے لوگوں پر تنگ ہونے کے سبب سے۔ ﴿ مَزِيْدٍ ﴾ یا تو مصدر ہے مجید کی طرح یا اسم مفعول ہے، جیسے: "مبیع" چنانچہ پہلا تو بہ معنی "هَلْ مِنْ زِيَادَةٍ" ہے اور دوسرا اس معنی میں ہے کہ کیا کوئی شے ہے جو تو مجھے زیادہ دے گا۔ "قدم" کا ذکر جو بعض حدیثوں میں آیا ہے "حَتَّى يَضَعَ رَبُّ الْعِزَّةِ فِيْهَا قَدَمَهُ"[7] اور کسی حدیث میں "حَتَّى يَضَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا رِجْلَهُ"[8] آیا ہے۔ (یعنی صحیحین میں بروایتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔ كما في فتح البيان) سو کسی نے کہا ہے کہ "قدم" کے معنی یہاں پر وہ قوم ہے جو نار کی طرف آگے بڑھنے والی ہے اور "رجل" کے معنی ہیں آدمیوں وغیرہ کی کثیر تعداد۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٨/١٧) [2] الكشاف (٣٩٢/٤) [3] صحيح البخاري (٤٥٦٩) صحيح مسلم (٢٨٤٦)

[4] صحيح البخاري (٥١٢) صحيح مسلم (٦١٧) [5] تفسير النسفي (١٧٣/٤، ١٧٤) [6] فتح القدير (١٠٢/٥، ١٠٣)

[7] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [8] صحيح البخاري (٤٥٦٩) صحيح مسلم (٢٨٤٦) فتح البيان (١٧٧/١٣)

صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں جمہور کا مذہب یہ ہے کہ ان پر بغیر تاویل اور تعطیل کے ایمان لائیں اور ان کے ظاہر پر بغیر کسی کیفیت اور مثل کے تصور اور تحریف کے امرار کریں۔ یہ وہ حق ہے جس سے کسی طرح کا مفر (بھاگنے کی جگہ) نہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب تذکرہ میں کہا ہے: "بَابُ مَا جَاءَ إِنَّ جَهَنَّمَ فِي الْأَرْضِ وَإِنَّ الْبَحْرَ طَبَقُهَا" عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور وہ نبی اکرم ﷺ سے راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہ سوار ہو دریا پر کوئی مرد مگر غازی یا حاجی یا عمرہ کرنے والا، بے شک دریا کے نیچے آگ ہے۔ امام ابو عمر رحمہ اللہ نے اس کو ذکر کیا ہے اور اس کو ضعیف کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ دریا کے پانی سے وضو نہ کرے، اس لیے کہ وہ جہنم کا طبق ہے۔ ابو عمر نے اس کو بھی ضعیف کہا ہے۔[1]

پھر جب اللہ پاک کافروں کے حال کو بیان کرنے سے فارغ ہوا تو مومنوں کا حال بیان کرنا شروع کیا، پس فرمایا: ﴿ وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴾ یعنی جنت متقی لوگوں کے لیے قریب کی گئی جو شرک سے بچے۔ ﴿ غَيْرَ بَعِيدٍ ﴾ یا تو صفت ہے مفعول مطلق محذوف کی: "أَيْ: تَقْرِيبًا غَيْرَ بَعِيدٍ" یعنی ایسا قریب کرنا کہ کچھ بعید نہیں ہے، یا صفت ہے: "مَكَانًا" محذوف کی، یعنی ایسے مکان میں قریب کی گئی کہ اُن سے دور نہیں ہے اس طرح سے کہ اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور موقف میں اسے دیکھ رہے ہیں اور جو ساز و سامان عیش و عشرت کا اس میں ہے اس کی طرف نظر کر رہے ہیں۔ وہ ایسا ساز و سامان ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا نہ کسی بشر کے دل پر اس کا خیال تک گزرا۔ یا منصوب ہے بنا بر حال، یعنی وہ قریب کی گئی اس حال میں کہ وہ ان سے کچھ دور نہیں ہے۔ کسی نے کہا کہ "قربت" بہ معنی "زینت" ہے یعنی دنیا میں ترغیب و ترھیب کر کے ان کے دلوں کو اچھی کر کے دکھائی گئی تو وہ ان کے دلوں سے قریب ہو گئی۔

پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مسافت کو جو مومن کے اور جنت کے درمیان ہے طے کر دے گا۔ پس قریب کرنا یہی ہے اور یہ مومن کی عزت کے لیے ہے اور اس کے شرف کے بیان اور اس بات کے بیان کے لیے ہے کہ وہ اُن میں سے ہے جن کی طرف جنت خود چل کر آتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد جنت کا قرب اور اس میں داخل ہونا ہے۔ قربِ مکانی کے معنی میں نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ أُزْلِفَتِ ﴾ کے معنی ہیں "جُمِعَتْ مَحَاسِنُهَا" یعنی اس کی خوبیاں جمع کی گئیں، اس لیے کہ وہ مخلوق ہے۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ اس کا حصول قریب کیا گیا، کیوں کہ وہ کلمۂ طیبہ کے سبب سے ملتی ہے۔ متقیوں کو اس کے ساتھ اس لیے خاص کیا کہ اس کے زیادہ ترحق دار وہی ہیں۔

[1] التذكرة للقرطبي (٨٥٤/١)

جملہ ﴿ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ ﴾ بہ تقدیر قول ہے: "أَيْ: يُقَالُ لَهُمْ هٰذَا مَا يُوْعَدُوْنَ" اور ﴿ هٰذَا ﴾ کا اشارہ اس جنت کی طرف ہے جو اُن کے لیے قریب کی گئی اس معنی میں کہ "هٰذَا الَّذِيْ تَرَوْنَهُ مِنْ فُنُوْنِ نَعِيْمِهَا" یعنی یہ شے جو تم دیکھ رہے ہو، اس کی مختلف قسم کی نعمتوں میں سے وہ شے ہے جس کا تم کو وعدہ دیا جاتا تھا۔ جمہور نے بہ تائے فوقیہ اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ﴾ بدل ہے ﴿ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ سے باعادۂ جار، یا قول سے متعلق ہے جو حال ہے: "أَيْ: مَقُوْلًا لَهُمْ لِكُلِّ أَوَّابٍ"۔ ﴿ اَوَّابٍ ﴾ یعنی اللہ کی اطاعت کی طرف گناہوں سے تائب ہو کر بڑا رجوع ہونے والا۔ کسی نے کہا: بہ معنی "مسبح" ہے، یعنی تسبیح کرنے والا۔ کسی نے کہا ہے کہ تنہائی میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا۔ امام شعبی اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا: وہ ہے جو تنہائی میں اپنے گناہ یاد کرتا ہے اور اللہ سے ان کی بخشش مانگتا ہے۔ عبید بن عمیر کا قول پہلے گزر چکا ہے۔

﴿ حَفِيْظٍ ﴾ یعنی یاد رکھنے والا اپنے گناہوں کا، یہاں تک کہ ان سے توبہ کرلے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کے حق اور نعمت کا حافظ ہے جس کو اس کے پاس امانت رکھا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے امر کا حافظ ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جو وصیت کی ہے، اسے قبول کر کے نگاہ رکھتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ کی حدود کا محافظ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اپنے گناہوں کا حفیظ ہے، یہاں تک کہ ان سے رجوع ہوا۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ﴾ بدل ہے یا ﴿ لِكُلِّ اَوَّابٍ ﴾ کا بیان ہے یا ﴿ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ سے بدل بعد بدل ہے۔ اس قول میں نظر ہے، اس لیے کہ بدل کا تکرار نہیں ہوتا، اس حال میں کہ مبدل منہ ایک ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ مرفوع ہو بنا بر استیناف اور خبر ﴿ اُدْخُلُوْهَا ﴾ ہو، بایں تقدیر کہ "يُقَالُ لَهُمْ: أُدْخُلُوْهَا"، خشیت گناہ کو یاد کرنے کے وقت دل کی بے قراری ہے۔ اور خشیت بالغیب یہ ہے کہ اللہ سے ڈرتا ہے، حالاں کہ اس نے اس کو نہیں دیکھا۔ امام ضحاک اور سدی رحمہما اللہ نے کہا: یعنی خلوت اور تنہائی میں ڈرنا جہاں اس کو کوئی نہیں دیکھتا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جس وقت پردہ لٹکا دیا اور دروازہ بند کر دیا۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ بِالْغَيْبِ ﴾ محذوف سے متعلق ہو کر حال ہے: "أَيْ: كَائِنًا بِالْغَيْبِ" یا ﴿ خَشِيَ ﴾" کے مصدر کی صفت ہے: "أَيْ: خَشْيَةً كَائِنَةً بِالْغَيْبِ"۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ ﴾ اور قلبِ منیب، یعنی ایسا دل لے کر آیا جو اللہ کی طرف رجوع ہونے والا اور اس کی عبادت کے لیے اخلاص کرنے والا ہے۔ کسی نے کہا

[1] تفسير القرطبي (٢٠/١٧) فتح القدير (١٠٣/٥)
[2] تفسير القرطبي (٢١/١٧)

ہے کہ سریرۂ مرضیہ (پسندیدہ باطن) اور صحیح عقیدہ لے کر آیا۔ کسی نے کہا: ﴿ مُّنِیْبٍ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اطاعت پر متوجہ ہونے والا۔ کسی نے کہا: بہ معنی سلیم ہے۔ ﴿ اُدْخُلُوْهَا ﴾ بہ تقدیرِ قول ہے: "یُقَالَ لَهُمْ: اُدْخُلُوْهَا"۔ جمع ﴿ مَنْ ﴾ کے معنی کے اعتبار سے ہے۔ ﴿ بِسَلٰمٍ ﴾ محذوف سے متعلق ہو کر حال ہے: "أَيْ: مُتَلَبِّسِیْنَ بِسَلَامٍ" یعنی ہر خوف وعذاب سے سلامتی کو لیے ہوئے جنت میں داخل ہو و۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی طرف سے سلام کے ساتھ۔ کسی نے کہا ہے کہ نعمتوں کے زائل ہونے سے اور نعمتوں (دکھ، عذاب) کے اترنے سے سلامتی کے ساتھ۔ کسی نے کہا ہے کہ سلام کے ساتھ، یعنی چاہیے کہ تمھارا بعض دوسروں کو سلام کرے، پس سلام سے مراد وہ سلام ہے جو اُن کے آپس میں ہوگا۔

آیتِ کریمہ کے اُن سب معانی پر محمول کرنے سے کوئی امر مانع نہیں۔ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ زمانے کے اس دن کی طرف ہے جس میں دخول حاصل ہوا، جیسا کہ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے[1] اور اس کی خبر ﴿ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ﴾ ہے۔ اس کا نام ﴿ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ﴾ اس لیے رکھا ہے کہ اس کی کچھ انتہا نہیں ہے، بلکہ وہ ابد الآباد اور قائم و دائم ہے۔ یہ قول دنیا میں اطلاع اور خبر دینا ہے اور یہ کوئی قول نہیں ہے کہ ﴿ اُدْخُلُوْهَا ﴾ کہنے کے وقت اس کو کہے گا، یا یہ اس وقت کہا جائے گا: اس لیے کہ قلب کا اطمینان قول سے زیادہ ہوتا ہے۔

﴿ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا ﴾ یعنی اُن کے لیے جنت میں طرح طرح کی اور قسم قسم کی نعمتیں اور خوبیاں ہیں جن کو ان کے دل چاہیں اور جن سے ان کی آنکھیں لذت لیں۔ ﴿ وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴾ یعنی اور ہمارے پاس ان نعمتوں سے بھی زیادہ ہے جن کا نہ کسی دل سے خطرہ ہوا اور نہ کسی خیال میں ان کا گزر ہوا۔ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے وجہ کریم کی طرف نظر کرنا ہے۔ یہ قول جابر رضی اللہ عنہ کا ہے۔ اللهم ارزقنا بفضلك العظيم يا رحيم آمين.

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رب عزوجل ہر جمعہ کو اُن کے لیے دارِ کرامت میں اپنی تجلی فرمائے گا۔ چنانچہ یہ وہ مزید ہے۔[2] (أخرجه البزار و ابن المنذر و ابن أبي حاتم و ابن مردويه و البيهقي في البعث والنشور كذا في فتح القدير) سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رب عزوجل اُن کے لیے تجلی فرمائے گا۔[3] (أخرجه البيهقي في الرؤية والديلمي كذا في فتح القدير) کسی نے کہا ہے کہ اہلِ جنت پر بادل گزرے گا، پھر اُن پر حوریں برسائے گا تو وہ کہیں گی: ہم وہ مزید ہیں جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴾۔ اس باب میں روایات اور احادیث ہیں، بعض کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔[4] (كذا في فتح البيان مع التوضيح) پھر اللہ پاک نے اہلِ مکہ کو اس عذاب اور عقاب سے ڈرایا جو ان سے پہلے قرنوں (زمانوں) پر نازل ہوا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

---

[1] التبيان في إعراب القرآن (۲/۱۱۷۷) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[3] فتح القدير (۵/۱۰۵) [4] فتح البيان (۱۳/۱۷۶-۱۷۹)

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ﴿۳۷﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖۗ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿۳۸﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۚ﴿۳۹﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾

ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں، وہ ان سے قوت میں زیادہ سخت تھیں، پھر وہ شہروں میں گشت کرنے لگے، کیا انھیں (ہمارے عذاب سے) کوئی بچ نکلنے کی جگہ ملی؟ (36) بلاشبہ اس میں اس شخص کے لیے نصیحت ہے جو (آگاہ) دل رکھتا ہے، یا وہ کان لگائے، جبکہ وہ (دل و دماغ سے) حاضر ہو (37) اور البتہ تحقیق ہم نے آسمانوں اور زمین کو، اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، چھے دنوں میں پیدا کیا، اور ہمیں کسی قسم کی تھکاوٹ نے چھوا تک نہیں (38) چناں چہ (اے نبی!) جو وہ کہتے ہیں اب آپ اس پر صبر کریں، اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کریں، طلوعِ آفتاب سے پہلے اور غروبِ آفتاب سے پہلے (39) اور رات کے کچھ حصے میں پھر آپ اس کی تسبیح کریں، اور سجود (نمازوں) کے بعد بھی (40)

کفار کو دھمکی اور رسول اللہ ﷺ کو صبر و نماز کا حکم:

یہ دو وقت یعنی سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے اللہ کو یاد کرنے کے ہیں۔ ان میں دعا قبول ہوتی ہے۔ انتھیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان جھٹلانے والوں سے پہلے ہم کتنے قرن ہلاک کر چکے ہیں، وہ ان سے تعداد میں زیادہ تھے اور قوت کے لحاظ سے ان سے زیادہ سخت تھے اور انھوں نے زمین کو ان سے زیادہ آباد کیا تھا، اسی لیے یہاں یوں فرمایا: ﴿فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ﴾۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "أَثَرُوْا فِيهَا" یعنی زمین میں اثر ڈالے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "ضَرَبُوْا فِي الْأَرْضِ" یعنی زمین میں چلے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "فَسَارُوْا فِي الْبِلَادِ"[1] یعنی شہروں میں روزیاں اور تجارتیں اور کسب تلاش کرنے کے لیے چلے پھرے، اس سے

[1] تفسير الطبري (٢٧١/٢٢) تفسير ابن كثير (٢٩١/٤)

زیادہ جوتم پھرے۔ جو کوئی شہروں میں پھرتا ہے تو اس کو کہا جاتا ہے کہ ”نَقَّبَ فِيهَا“ یعنی اس نے ان میں گشت کیا، چلا پھرا۔ امرأ القیس نے کہا ہے:

لَقَدْ نَقَّبْتُ فِي الْآفَاقِ حَتَّى رَضِيتُ مِنَ الْغَنِيمَةِ بِالْإِيَابِ

یعنی البتہ مقرر میں اطراف زمین میں چلا پھرا، یہاں تک کہ غنیمت کے ساتھ رجوع ہونے پر راضی ہوا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ﴾ یعنی کیا اُن کے لیے اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر سے کوئی جائے گریز تھی، اور جو کچھ انھوں نے جمع کیا تھا، کیا اس نے اُن کو کچھ فائدہ دیا اور اللہ کے عذاب کو ان سے پھیر دیا، جب وہ ان پر رسولوں کو جھٹلانے کے سبب سے آیا؟ ہرگز نہیں، اس لیے تمھارے لیے بھی نہ کوئی مفر ہے نہ جائے گریز ہے۔

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى ﴾ یعنی بے شک اس ہلاک کرنے میں البتہ عبرت ہے۔ ﴿ لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ ﴾ یعنی اس شخص کے لیے جس کو سمجھ ہے جس سے وہ یاد رکھتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عقل ہے۔ ﴿ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ﴾ یعنی یا وہ کلام کو سنے اور اسے یاد رکھے اور اپنے دل سے اور لب (عقل) سے اس کو سمجھے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے ﴿ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ ﴾ یعنی ”لَا يُحَدِّثُ نَفْسَهُ فِي هَذَا بِقَلْبٍ“ مطلب یہ ہے کہ اس میں اپنے جی سے قلب کے ساتھ باتیں نہ کرے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: ”اَلْعَرَبُ تَقُولُ أَلْقَى فُلَانٌ سَمْعَهُ إِذَا اسْتَمَعَ بِأُذُنَيْهِ وَهُوَ شَاهِدٌ بِقَلْبٍ غَيْرُ غَائِبٍ“ یعنی جب کوئی اپنے دونوں کانوں سے سنے اور دل سے حاضر ہو غائب نہ ہو تو اس وقت عرب بولتے ہیں کہ فلاں نے اپنا کان ڈال دیا۔ اسی طرح امام ثوری رحمہ اللہ اور کئی اہلِ علم نے بھی کہا ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ﴾ میں معاد کی تقریر ہے، کیوں کہ جو آسمان وزمین کو پیدا کرنے پر قادر ہوا تو وہ بطریقِ اولیٰ اس لائق ہے اور اس پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہود۔ علیهم لعائن اللّٰه۔ نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو چھے دن میں پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا اور یہ یوم السبت ہے، یعنی روزِ شنبہ (ہفتہ) اور وہ اس کا نام یوم الراحت رکھتے ہیں۔[2]

اس پر اللہ تعالیٰ نے انھوں نے جو بات کی اور اس کی جو تاویل کی اس میں ان کی تکذیب کی اور فرمایا: ﴿ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴾ یعنی اور ہم کو نہ کچھ ماندگی ہوئی اور نہ ہی تھکاوٹ اور نہ تکلیف پہنچی، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۚ بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [الأحقاف: ٣٣] ”کیا وہ نہیں دیکھتے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اُن کے پیدا کرنے سے وہ نہ تھکا وہ یقیناً مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے؟ وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔“ نیز فرمایا ہے: ﴿ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ ﴾ [المؤمن: ٥٧] ”آسمان و زمین کی پیدائش انسان کی

---

[1] تفسیر الطبري (٣٧٤،٣٧٣/٢٢) تفسیر ابن کثیر (٢٩١/٤)
[2] تفسیر الطبري (٣٧٦/٢٢)

پیدایش سے بہت بڑا کام ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰىهَا ﴾ [النازعات: ۲۷] ''کیا تمھارا پیدا کرنا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کا؟ اللہ تعالیٰ نے اسے بنایا۔''

قولہ سبحانہ وتعالیٰ: ﴿ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ ﴾ یعنی پس تو اس بات پر صبر کر جو جھٹلانے والے کہتے ہیں اور ان کو چھوڑ دے اچھی طرح کا چھوڑ دینا۔ ﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴾ پہلے معراج شریف میں فرض دو نمازیں تھیں، ایک سورج نکلنے سے پہلے فجر کے وقت میں اور دوسری سورج غروب ہونے سے پہلے عصر کے وقت میں اور رات کا قیام نبی اکرم ﷺ پر اور آپ ﷺ کی اُمت پر واجب تھا ایک برس تک، پھر اُمت کے حق میں اس کا وجوب منسوخ ہوا، پھر شبِ معراج شریف میں اللہ تعالیٰ نے اس سب کو پانچ نمازوں سے منسوخ فرمایا، لیکن ان میں سے صبح کی اور عصر کی نماز باقی رہی سو یہ دونوں سورج نکلنے سے قبل اور غروب ہونے سے قبل ہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ نے جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے نزدیک بیٹھے ہوئے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے چودھویں رات کے چاند کی طرف نظر کی۔ پھر فرمایا: خبردار! بے شک تم عن قریب اپنے رب کے سامنے پیش کیے جاؤ گے، پھر تم اس کو دیکھو گے جیسے تم اس چاند کو دیکھتے ہو: «لَا تَضَامُّوْنَ فِيْهِ» یعنی اس حال میں کہ اس کے دیکھنے میں ازدحام کے مارے ایک دوسرے پر ظلم نہیں کرتے ہو، بلکہ بغیر کسی تکلیف کے سب کے سب برابر دیکھتے ہو۔

چنانچہ اگر تم طاقت رکھو اس بات کی کہ سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے نماز پر مغلوب نہ ہوؤ تو کرو، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴾[1] (ورواه البخاري و مسلم و بقية الجماعة من حديث إسماعيل به). قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ ﴾ یعنی رات میں تو اس کے واسطے نماز پڑھ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴾ [بني إسرائيل: ۷۹] ''رات کے کچھ حصے میں تہجد کی نماز میں قرآن کی تلاوت کریں یہ زیادتی آپ کے لیے ہے، عن قریب آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود پر کھڑا کرے گا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴾۔ امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے عن مجاہد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ یہ نماز کے بعد کی تسبیح ہے[2] اس کی تائید وہ روایت کرتی ہے جو صحیحین میں بہ روایتِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ثابت ہوئی ہے کہ فقراء مہاجرین آئے تو عرض کی: اے اللہ کے رسول! دولت مند لوگ بڑے بڑے درجے اور نعیم مقیم لے گئے، چنانچہ

---

[1] صحيح البخاري (٥٢٩) صحيح مسلم (٦٣٣) سنن أبي داود (٤٧٢٩) سنن الترمذي (٢٥٥١) سنن النسائي الكبرىٰ (١٧٦/١) سنن ابن ماجه (١٧٧)

[2] تفسير الطبري (٣٨٠/٢٢)

آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ عرض کی کہ وہ نماز پڑھتے ہیں جیسے ہم پڑھتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں جیسے ہم رکھتے ہیں اور وہ خیرات کرتے ہیں اور ہم نہیں کرتے اور وہ غلام آزاد کرتے ہیں اور ہم نہیں کرتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا پھر میں نہ سکھا دوں تم کو ایک ایسی شے کہ جب تم اس کو کرلو تو تم سابق ہو جاؤ ان پر جو تمھارے بعد ہیں اور تم سے کوئی شخص افضل نہ ہو مگر وہ جس نے اس طرح کیا جو تم نے کیا۔ تم ہر نماز کے بعد تینتیس (۳۳) دفعہ تسبیح کرو اور حمد کرو اور تکبیر کرو۔

راوی نے کہا: پھر انھوں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! ہمارے مال والے بھائیوں نے سن لیا، جو ہم نے کیا تو انھوں نے بھی اسی کے مثل کیا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جس کو چاہتا ہے اسے دیتا ہے۔[1] دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴾ سے مراد وہ دو رکعتیں ہیں جو مغرب کے بعد ہیں۔ یہ بات عمر اور علی رضی اللہ عنہما اور ان کے فرزند حسن رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس، ابوہریرہ اور ابو امامہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور اسی کے قائل امام مجاہد، عکرمہ، شعبی، نخعی، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم ہیں۔[2] امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر فرض نماز کے بعد سوائے فجر وعصر کے دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ عبدالرحمان کے الفاظ: ''دُبُرَ کُلِّ صَلَاۃٍ'' ہیں[3] (اس کی سند میں امام احمد رحمہ اللہ کے دو استاد ہیں: ایک وکیع دوسرے عبد الرحمان۔ امام وکیع رحمہ اللہ کی روایت کے الفاظ: ''علی أثر کل صلاۃ مکتوبۃ'' ہیں۔ اور عبدالرحمان کی روایت کے الفاظ: ''دبر کل صلاۃ'' ہیں)۔ (ورواہ أبو داود و النسائي من حدیث سفیان الثوري به زاد النسائي و مطرف عن أبي إسحاق به)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا کہ ایک شب میں نے نبی اکرم ﷺ کے پاس رات بسر کی تو آپ ﷺ نے دو ہلکی رکعتیں پڑھیں جو فجر سے پہلے ہیں، پھر آپ ﷺ نماز کی طرف نکلے تو فرمایا: اے ابن عباس! نمازِ فجر سے قبل کی دو رکعتیں ﴿ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴾ [الطور: ۴۹] ہیں اور مغرب کے بعد کی دو رکعتیں ﴿ اَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴾ ہیں۔[4] (ورواہ الترمذي عن هشام الرفاعي عن محمد بن فضيل به وقال: غريب لا نعرفه إلا من هذا الوجه و حديث ابن عباس رضی اللہ عنہما وإنه بات في بيت خالته ميمونة رضی اللہ عنہا وصلى تلك الليلة مع النبي ﷺ ثلاث عشرة ركعة.[5] ثابت في الصحيحين وغيرهما فأما هذه الزيادة فغريبة لا نعرف إلا من هذا الوجه ورشدين بن كريب (عن أبيه عن ابن عباس ضعيف ولعله من كلام ابن عباس رضی اللہ عنہما موقوفاً عليه.[6] والله أعلم)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ اور زیادتِ مناسب وتغیرِ یسیر کے ساتھ یہ ہے کہ جب اللہ پاک نے

---

1. صحيح البخاري، رقم الحديث (۸۰۷) صحيح مسلم (۵۹۵) 2. تفسير الطبري (۲۲/۳۷۸ـ۳۸۰)
3. مسند أحمد (۱/۱۲۴) سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۲۷۵) سنن النسائي الكبرىٰ (۱/۱۴۸)
4. سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۲۷۵) تفسير ابن أبي حاتم (۱۰/۳۳۱۰) اس کی سند میں ''رشدین بن کریب'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعیف الجامع، رقم الحدیث: ۲۴۸)
5. صحيح البخاري، رقم الحديث (۶۶۶) صحيح مسلم (۷۶۳) 6. تفسير ابن كثير (۴/۲۹۰ـ۲۹۲)

سورت کے شروع میں پرانی اُمتوں کی تکذیب کا ذکر کیا تو یہاں پہلی اُمتوں کے ہلاک کرنے کا ذکر کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا ﴾ یعنی قریش اور اُن کے موافقین سے پہلے ہم نے کافروں کی ایک کثیر اُمت ہلاک کر ڈالی ہے، ایسی امت جو قوت میں اُن سے زیادہ سخت ہے، جیسے: عاد وثمود وغیرہم۔

﴿ فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ﴾ حرف فاء عاطف ہے معنی پر۔ گویا یوں کہا گیا کہ "اِشْتَدَّ بَطْشُهُمْ فَنَقَّبُوْا"۔ جمہور نے بہ تشدید قاف بہ صیغۂ ماضی پڑھا ہے۔ تنقیب کسی امر کی تنقید و بحث کرنے کو کہتے ہیں۔ اس کی اصل نقب بہ معنی طریق سے ہے، یعنی اُن کی قوت سخت ہوئی تو انھوں نے شہروں میں جا کر موت سے بچنے کی کرید کی اور تفتیش اور بحث کی یا ان میں سیر کی اور اُن کے قطعات میں چلے پھرے، موت سے فرار طلب کرنے کے لیے، یہ کہتے ہوئے کہ کیا کوئی مفر ہے۔ مگر ان کو کوئی راستہ نہ ملا تو وہ ہلاک کر دیے گئے۔ غرضیکہ "نَقَّبُوْا" کے معنی "فَتَّشُوْا" ہیں یا "سَارُوْا أَوْ تَقَلَّبُوْا"۔ فتح البیان میں اس کو اولیٰ کہا ہے۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "ضَرَبُوْا وَطَافُوْا" نضر بن شمیل نے کہا ہے کہ "دَوَّرُوْا"۔ مورج نے کہا ہے کہ "تَبَاعَدُوْا"۔ سیر طواف کے معنی میں ہے، حارث بن حلزہ کا قول ہے:

نَقَّبُوْا فِيْ الْبِلَادِ مِنْ حَذَرِ الْمَوْتِ وَجَالُوْا فِيْ الْأَرْضِ كُلَّ مَجَالِ

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ (یعنی حسن رضی اللہ عنہ، امام ابو العالیہ اور ابو عمر رحمہم اللہ) نے "نَقَبُوْا" بہ فتح قاف مخففہ پڑھا ہے۔ نقب بہ معنی پہاڑ میں خرق و طریق کے ہے۔ اسی طرح منقب و منقبہ ہے۔ امام ابن سکیت نے ایسا ہی کہا ہے۔ "نقب" کی جمع "نقوب" ہے اور سلمی و یحییٰ بن یعمر نے بہ کسرِ کاف مشدد پڑھا ہے اس بنا پر کہ امر ہے خوف دلانے کے لیے، یعنی شہروں میں گشت کرو اور ان کے اطراف میں چلو پھرو۔ ﴿ مَحِيْصٍ ﴾ مصدر ہے: "حَاصَ يَحِيْصُ حَيْصًا وَحُيُوْصًا وَمَحِيْصًا وَمَحَاصًا وَحَيَصَانًا أَيْ: عَدَلَ وَحَادَ" کا اور بہ معنی ظرف بھی ہے: "أَيْ: مِنْ مَعْدَلٍ وَمَحِيْدٍ وَمَهْرَبٍ"[2] یعنی کیا کوئی جائے گریز ہے کہ موت سے بھاگ کر اس کی طرف جائیں یا کوئی مخلص ہے کہ اس کے سبب سے عذاب سے خلاصی پائیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے موت سے کوئی محیص، یعنی جائے فرار نہ دیکھی۔[3]

بالجملہ کلمۂ ﴿ هَلْ ﴾ حرفِ استفہام ہے اور حرف ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے اور ﴿ مَحِيْصٍ ﴾ مبتدا ہے جس کی خبر محذوف ہے اور جملہ باضمارِ قول حال ہے "نَقَّبُوْا" کی واو سے۔ تقدیر یہ ہے: "فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ قَائِلِيْنَ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ لَنَا"، یعنی انھوں نے شہروں میں جا کر بحث اور کرید کی یہ کہتے ہوئے کہ کیا ہمارے لیے موت سے کوئی جائے فرار ہے سو اس کو نہ پایا۔ یا یوں کہو کہ یہ اللہ پاک کی طرف سے جملہ مستانفہ ہے، اس طرح سے کہ جب تقدیر یہ ٹھہری کہ "فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ وَلَمْ يَسْلَمُوْا مَعَ كَثْرَةِ تَنْقِيْبِهِمْ وَتَفْتِيْشِهِمْ"، یعنی انھوں نے شہروں میں موت

---

[1] فتح البیان (۱۳/۱۸۰) [2] تفسیر القرطبي (۱۷/۲۲، ۲۳) [3] معاني القرآن (۵/۴۸)

سے بچنے کے لیے بحث اور تلاش کی اور وہ سلامت نہ رہے باوجود اپنی بحث وجستجو کے تو یہاں ایک سوال پیدا ہوا جس میں عاقل ذاہل کے لیے تو تنبیہ ہے اور عناد رکھنے والے جاہل کے لیے زجر وتوبیخ ہے، اس قول سے کہ ''هَلْ مِنْ مَحِيْصٍ لَهُمْ أَوْ لِغَيْرِهِمْ'' یعنی کیا اُن کے لیے یا کسی اور کے لیے ہماری قضا سے کوئی مفر ہے۔ تاکہ ان کے لیے ہمارے امر کی تردید کی کوئی توجیہ ہو۔

مطلب یہ ہے کہ اُن کے لیے کوئی مفر نہیں ہے اور نہ ہی امرِ الٰہی کے رد کرنے کی کوئی وجہ ہے۔ غرضیکہ اہلِ مکہ کو ڈرانا ہے کہ جیسی اُن سے پہلے کی اُمتیں تھیں ویسی ہی یہ ہیں، موت اور عذاب سے کوئی جائے فرار نہ پائیں گے۔ چونکہ وعظ ونصیحت کا اثر قبول کرنا عقل پر موقوف ہے، اس لیے ارشاد فرمایا: ﴿ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ ﴾ یعنی اس سورت میں شروع سے آخر تک جو قصے مذکور ہوئے ہیں، بے شک اس میں اس شخص کے لیے ایک بڑی نصیحت اور وعظ ہے جس کے پاس دل ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: عربیت میں جائز ہے کہ یوں کہیں: ''مَا لَكَ قَلْبٌ وَمَا قَلْبُكَ مَعَكَ''[1] یعنی تیری عقل نہیں ہے اور تیری عقل تیرے ساتھ نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد خود قلب ہے، کیوں کہ دل آفات سے سالم ہوتا ہے تو حقیقتِ حال کو سمجھ لیتا ہے اور جیسا غور وفکر کرنا چاہیے ویسا کرتا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اس کو نصیحت ہے جس کے لیے حیات اور تمیز کرنے والا نفس ہے۔

﴿ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ ﴾ یعنی یا نصیحت ہے اس کے لیے جس نے وعظ وغیرہ کو سنا جو اس سے کہا جاتا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''أَلْقِ إِلَيَّ سَمْعَكَ'' یعنی مجھ سے بات سن۔ معنی یہ ہیں کہ اس نے اس شے کی طرف کان لگایا جو اس پر پڑھی جاتی ہے یعنی وحی جو اس ماجرے کو بیان کرتی ہے جو ان اُمتوں پر گزرا۔ جمہور نے ﴿ أَلْقَى ﴾ بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے اور امام سلمی، طلحہ اور سدی رحمہم اللہ نے بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔ اور ''السَّمْعُ'' پر ضمہ پڑھا ہے۔[2] کلمۂ ''أَوْ'' ''مانعة الخلو'' ہے، ''مانعة الجمع'' نہیں ہے، کیوں کہ کان لگا دینا جبکہ دل سلامت نہ ہو کچھ فائدہ مند نہیں ہے۔

چنانچہ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَهُوَ شَهِيْدٌ ﴾ اس طرف اشارہ کر رہا ہے، یعنی اس نے کان ڈالا اس حال میں کہ اس کا فہم حاضر ہے، یا اس کا دل حاضر ہے، اس لیے کہ جو بات کو سمجھتا نہیں ہے تو وہ ایسے ہے جیسے غائب ہے گو اپنے جسم کے لحاظ سے حاضر ہے، لیکن اپنے فہم سے حاضر نہیں ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حال میں کہ اس کا دل اس بات میں حاضر ہے جس کو سنتا ہے۔ امام سفیان رحمہ اللہ نے فرمایا: یعنی وہ حاضر نہیں ہوتا اس حال میں کہ اس کا دل غائب ہے۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اہلِ کتاب کے بارے میں ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ محمد بن کعب اور ابو صالح رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ خاص کر اہلِ قرآن کے حق میں ہے۔[3]

---

[1] تفسير البغوي (٣٦٤/٧) [2] فتح القدير (١٠٦/٥) [3] تفسير القرطبي (٢٣/١٧)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ﴾ یعنی البتہ یقیناً ہم نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو اور اس کو جو اُن کے درمیان میں ہے چھے دن میں۔ ان کا پہلا دن اتوار ہے اور آخری دن جمعہ ہے۔ چنانچہ زمین کو تو دو دن میں پیدا کیا اور اس کے منافع کو دو دن میں پیدا کیا اور آسمانوں کو دو دن میں پیدا کیا اور اگر وہ چاہتا تو پلک جھپکنے سے بھی کم مدت میں سب کو پیدا کر دیتا، لیکن اس نے اپنے فضل سے ہم کو کاموں میں "تأنی" (دیر لگانا) اور آہستگی کی تعلیم فرمائی۔ کلمۂ "یوم" سے کبھی وقت مراد ہوتا ہے اور کبھی اس کے ساتھ زمانے کی مدت کی تعبیر کی جاتی ہے کتنی ہی مدت ہو۔ غرضیکہ اللہ پاک نے یہ سب چیزیں پیدا کیں۔

پھر فرمایا: ﴿ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴾ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے، یعنی حال یہ ہے کہ ہم کو کسی طرح کی تھکاوٹ اور ماندگی نے نہیں چھوا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ لُغُوْبٍ ﴾ بہ معنی نصب (تکلیف) ہے۔[1] ﴿ لُغُوْبٍ ﴾ مصدر ہے۔ مختار میں کہا ہے کہ "لُغُوْبٌ بِضَمَّتَيْنِ" بہ معنی تعب و إعیاء ہے۔ اس کا باب "دخل" ہے اور "لغب بالكسر من باب تعب لغوبا" بھی ایک ضعیف لغت ہے۔[2] جمہور نے بہ ضم لام اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ، امام طلحہ، سلمی اور یعقوب رحمہم اللہ نے بہ فتح لام پڑھا ہے۔ دونوں ایک معنی میں مصدر ہیں۔[3] امام واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مفسرین کی جماعت نے کہا ہے کہ یہ آیت یہود کے اس قول کا رد کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے کہ اللہ نے ہفتے کے دن آرام کیا اور عرش پر چت لیٹ گیا، اسی لیے انھوں نے اس دن میں کام کرنا چھوڑ دیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرما کر ان کی تکذیب کی: ﴿ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴾[4]

تھکاوٹ اور تکلیف کی اس سے نفی اس لیے ہے کہ وہ مخلوق کی صفات سے پاک ہے اور اس لیے کہ اس کے اور اس کے غیر کے درمیان مماست (ایک دوسرے کو چھونا) نہیں ہے، یعنی ان موجودات کے ساتھ وہ مس نہیں کرتا جن کو وہ ایجاد اور پیدا کرتا ہے۔ اور تھکاوٹ ماندگی تو صرف علاج ومشقت سے ہوتی ہے اور اس سے ہوتی ہے کہ فاعل اپنے مفعول سے مماسہ کرتا ہے، جیسے: بڑھئی ولوہار اور نانبائی وغیرہ کو ہوا کرتی ہے اور یہ جو ہوتی ہے تو مخلوقین کے افعال میں ہوتی ہے اور خالق پاک اس سب سے مبرا اور پاک ہے۔

اشیاء کے ایجاد میں اس کی شان تو یہ ہے کہ وہ اس سے کہتا ہے ہو جا تو وہ فوراً ہو جاتی ہے۔ ﴿ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [البقرة: ١١٧] جو فرمایا ہے تو صرف مخلوق کو سمجھانے کے لیے، صرف معقول کے قریب کرنے کے لیے فرمایا ہے ورنہ حقیقت میں نہ کوئی قول ہے نہ کاف ونون ہے۔ اس کے سوا اس میں اور قول بھی ہیں اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا: ظاہر یہ ہے کہ مراد مشرکوں کا رد کرنا ہے اور ﴿ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا ﴾ سے

---

[1] تفسير الطبري (٣٧٥/٢٢) [2] مختار الصحاح (٦١٢/١)

[3] اللباب في علوم الكتاب (٤٨/١٨) [4] فتح القدير (١٠٦/٥)

مراد امرِ بعث میں استدلال ہے اور یہود نے جو بات کہی اور اس کو نقل کیا، پس یا تو وہ اُن سے تحرف ہے، یا انھوں نے اس کی تاویل نہیں جانی۔[1]

غرضیکہ پھر اللہ پاک نے نبی کریم ﷺ کو تسلی دی اور انھیں صبر کا حکم دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ ﴾ یعنی پس تو ان باتوں پر صبر کر جو مشرکین کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تو اپنے نفس پر آسانی کر اور اُن کے کہنے کی وجہ سے رنجیدہ مت ہو اور جو کچھ اُن کی طرف سے تجھ پر وارد ہوتا ہے اس کو صبر کے ساتھ برداشت کر۔ چونکہ نبی اکرم ﷺ دو کاموں میں مشغول رہا کرتے تھے: ایک تو اللہ تعالیٰ کی عبادت۔ دوسرا مخلوق کی ہدایت۔ لہٰذا جب وہ راہ یاب نہ ہوئے تو آپ ﷺ سے کہا گیا کہ تو اپنے دوسرے شغل میں متوجہ ہو، یعنی عبادت۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴾ یعنی تو اللہ کی پاکی بیان کر اس شے سے جو اس کی بارگاہِ عالی جاہ کے لائق نہیں ہے۔ اس کی حمد کے ساتھ متلبس ہو کر فجر اور عصر کے وقت میں یا مراد نمازِ فجر اور نمازِ عصر ہے، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ پانچوں نمازیں۔ کسی نے کہا ہے کہ دو رکعت طلوعِ شمس سے پہلے پڑھ اور دو اس کے غروب سے پہلے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

﴿ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ ﴾ کلمہ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کا ہے: "أَيْ: سَبِّحْ بَعْضَ اللَّيْلِ" یعنی بعض رات میں اس کی تسبیح کر۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ رات کی نماز ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ فجر کی دو رکعتیں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ عشاء کی نماز ہے۔ پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔

﴿ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴾ "أَيْ: وَسَبِّحْ أَعْقَابَ الصَّلَوَاتِ" یعنی اور نمازوں کے عقب میں اس کی تسبیح کر۔ جمہور نے ﴿ اَدْبَارَ ﴾ بہ فتح ہمزہ پڑھا ہے بنا بر جمع "دُبُر" اور امام نافع، ابن کثیر اور حمزہ رحمہ اللہ نے بہ کسر ہمزہ پڑھا ہے بنا بر مصدر ماخوذ "أَدْبَرَ الشَّيْءُ إِدْبَارًا إِذَا وَلَّى" سے۔[2] قرائے سبعہ نے ﴿ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴾ میں اس پر اتفاق کیا ہے کہ بہ کسر ہمزہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہ اللہ کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ ﴿ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴾ مغرب کے بعد کی دو رکعتیں ہیں اور ﴿ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴾ فجر سے پہلے کی دو رکعتیں ہیں۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ﴿ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴾ اور ﴿ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴾ کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴾ مغرب کے بعد کی دو رکعتیں ہیں اور ﴿ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴾ غداۃ، یعنی نمازِ فجر سے قبل دو رکعتیں ہیں۔[3] (أخرجه مسدد في مسنده وابن المنذر وابن مردويه). سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ﴿ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴾ دو رکعتیں ہیں مغرب کے بعد اور ﴿ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴾ فجر سے پہلے دو رکعتیں ہیں۔ (أخرجه محمد بن نصر في الصلاة و ابن المنذر و عن أبي هريرة مثله، أخرجه ابن أبي شيبة و ابن نصر و ابن جرير و ابن المنذر و ابن مردويه)

---

[1] تفسیر الرازي (۲۸/۱۵۸) [2] تفسیر القرطبي (۱۷/۲۶) [3] الدر المنثور (۷/۶۱۰، ۶۱۱) فتح القدير (۵/۱۰۸)

امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: "أَمَرَهُ أَنْ يُسَبِّحَ فِي أَدْبَارِ الصَّلَوَاتِ كُلِّهَا"۔ ① امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا: بہ سبب ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے جو صحیح میں مرفوعاً آئی ہے: «مَنْ سَبَّحَ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ، وَحَمِدَ اللّٰهَ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ وَكَبَّرَ اللّٰهَ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ فَذٰلِكَ تِسْعَةٌ وَّتِسْعُوْنَ وَتَمَامَ الْمِائَةِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ غُفِرَتْ خَطَايَاهُ وَإِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ» ②

وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿41﴾ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿42﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ﴿43﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴿44﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿45﴾

اور توجہ سے سنیے! جس دن منادی کرنے والا قریب کے مقام سے ندا دے گا ﴿41﴾ جس دن وہ اس چیخ (نفخۂ ثانیہ) کو فی الواقع سنیں گے، یہی (قبروں سے) نکلنے کا دن ہوگا ﴿42﴾ بلاشبہ ہم ہی زندہ کرتے اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری ہی طرف (سب کی) واپسی ہے ﴿43﴾ جس دن ان کے اوپر سے زمین پھٹ جائے گی (وہ اس میں سے) تیزی سے (نکل رہے ہوں گے) یہ حشر (برپا کرنا) ہم پر نہایت آسان ہے ﴿44﴾ ہم اسے خوب جانتے ہیں جو وہ (مشرکین) کہتے ہیں، اور آپ ان پر زبردستی کرنے والے نہیں، لہٰذا آپ اس قرآن کے ذریعے سے اس شخص کو نصیحت کرتے رہیں، جو میری وعید سے ڈرتا ہے ﴿45﴾

قیامت کے دن کے بعض حقائق:

کہتے ہیں کہ صور بیت المقدس کے پتھر پر پھونکی جائے گی، یا اس کی آواز ہر جگہ پر ایسے لگے گی جیسے نزدیک سے آ رہی ہو۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے محمد! تو کان رکھ جس دن پکارنے والا نزدیک کی جگہ سے پکارے گا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا: اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو حکم دے گا کہ ندا کرے

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٧١) ② صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩٧) فتح البيان (١٣/١٨٠-١٨٣)

بیت المقدس کے صخرے پر: ''أَيَّتُهَا الْعِظَامُ الْبَالِيَةُ وَالْأَوْصَالُ الْمُتَقَطِّعَةُ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُنَّ أَنْ تَجْتَمِعْنَ لِفَصْلِ الْقَضَاءِ''[1] یعنی او بوسیدہ ہڈیو اور پارہ پارہ جوڑو! بے شک اللہ تعالیٰ تم کو امر فرماتا ہے کہ فصلِ قضا کے لیے جمع ہو جاؤ۔ ﴿ يَوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ﴾ یعنی جس دن صور میں پھونکنا سنیں گے جو وہ حق لائے گا جس میں ان کے اکثر شک کرتے تھے۔ ﴿ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴾ یعنی وہ دن ہے قبروں سے نکل پڑنے کا۔

﴿ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ﴾ یعنی وہی ہے جو خلق کی ابتداء کرتا ہے پھر اس کو دہرائے گا اور وہ اس پر زیادہ آسان ہے اور اسی کی طرف ساری خلائق کا پہنچ رہنا ہے۔ پھر وہ ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا دے گا اگر اچھا عمل ہے تو اچھی جزاء اور برا ہے تو بری جزاء۔

﴿ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ﴾ یہ اس طرح ہوگا کہ اللہ عزوجل آسمان سے ایک پانی اتارے گا جس سے ساری مخلوق کے جسم اپنی قبروں میں اُگ آئیں گے جس طرح کہ نمناک زمین میں پانی سے دانے اگ آتے ہیں، پھر جب جسم مکمل ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ اسرافیل علیہ السلام کو حکم دے گا تو وہ صور پھونکیں گے اور روحیں صور کے سوراخوں میں امانت رکھی گئی ہیں اور جب اسرافیل علیہ السلام اس میں پھونکیں گے تو روحیں آسمان و زمین کے درمیان چمکتی ہوئی نکلیں گی۔ پھر اللہ عزوجل فرمائے گا: میری عزت اور جلال کی قسم ہے! ہر روح کو چاہیے کہ وہ اس جسم کی طرف لوٹ جائے جس کو وہ دنیا میں آباد رکھتی تھی۔ تو ہر روح اپنے جسم کی طرف رجوع کر آئے گی، پھر آہستہ آہستہ اس میں چلے گی جس طرح کہ سانپ کے کاٹے ہوئے ہیں زہر چلتا ہے اور اُن سے زمین پھٹ جائے گی تو وہ اٹھ کر حساب کے لیے کھڑے ہونے کی جگہ کی طرف بلانے والے کی طرف جلدی سے چل پڑیں گی، اپنے سر کو اللہ عزوجل کے لیے جھکائے ہوئے ہوں گی۔ کافر کہیں گے کہ یہ ایک مشکل دن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٥٢] ''جس دن وہ تمھیں بلائے گا تم اس کی تعریف کرتے ہوئے تعمیلِ ارشاد کرو گے اور گمان کرو گے کہ تمھارا رہنا بہت ہی تھوڑا ہے۔'' صحیح مسلم میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''میں ان میں سے سب سے پہلا ہوں جن سے زمین شق ہوگی۔''[2]

﴿ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴾ یعنی وہ ایک سہل اعادہ ہے ہم پر، آسان ہے ہمارے نزدیک جیسا کہ اللہ جل جلالہ نے فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَمْرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ﴾ [القمر: ٥٠] ''اور ہمارا حکم صرف ایک دفعہ (کا ایک کلمہ)

---

1. تفسير الطبري (٣٨٢/٢٢)

2. صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٧٨) مسند أحمد (١٤٤/٣) ان الفاظ کے ساتھ روایت صحیح مسلم میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، البتہ مسند احمد وغیرہ میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے بھی یہ روایت مروی ہے۔

ہی ہوتا ہے، جیسے: آنکھ کا جھپکنا۔" نیز فرمایا: ﴿ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۗ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ ۢ بَصِيْرٌ ﴾ [لقمان: ۲۸] "تم سب کی پیدائش اور مرنے کے بعد جلانا ایسا ہی ہے جیسے ایک جی کا، بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے۔"

رسول اللہ ﷺ کو تسلی:

قولہ تعالیٰ: ﴿ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴾ یعنی ہمارا علم اس شے کو محیط ہے جو مشرکین تجھ سے کہتے ہیں، یعنی وہ جو تجھے جھٹلاتے ہیں ہم کو اس کی خوب خبر ہے، چنانچہ یہ تجھے ڈر میں مبتلا نہ کرے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴾ [الحجر: ۹۷۔ ۹۹] "اور یقیناً ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں، اس سے آپ کا سینہ (دل) تنگ ہوتا ہے۔ آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کریں اور سجدہ گزاروں میں ہو جائیں۔ اور آپ اپنے رب کی عبادت کریں، حتی کہ آپ کے پاس یقین (موت) آ جائے۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ﴾ یعنی تو وہ نہیں ہے کہ ان کی ہدایت پر جبر کرے اور نہ ہی یہ اس شے میں سے ہے جس کا تو مکلف ہے۔ امام مجاہد، قتادہ اور ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: "لَا تَتَجَبَّرْ عَلَيْهِمْ"[1] یعنی تو ان پر جبر مت کر۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ اگر اللہ پاک کی مراد وہ ہوتی جو ان لوگوں نے کہی تو یوں فرماتا: "وَلَا تَكُنْ جَبَّارًا إِلَيْهِمْ" اور اس نے جو فرمایا ہے تو وہ ﴿ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ﴾ ہے، اس معنی میں کہ تو ایمان پر اُن کا جبر کرنے والا نہیں ہے تُو تو بس ایک پہنچا دینے والا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے عرب کو سنا ہے کہ وہ یوں کہتے ہیں: "جَبَرَ فُلَانٌ فُلَانًا عَلَى كَذَا بِمَعْنَى أَجْبَرَهُ"[2]

پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴾ یعنی تُو تو اپنے رب کی رسالت پہنچا دے، نصیحت پذیر وہی ہو گا جو اللہ سے اور اس کی وعید سے ڈرتا ہے اور اس کے وعدے کی امید رکھتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴾ [الرعد: ٤٠] "آپ پر تو صرف پہنچا دینا ہی ہے حساب تو ہمارے ذمے ہی ہے۔" نیز اللہ جل جلالہ کا فرمان ہے: ﴿ فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴾ [الغاشية: ۲۱۔ ۲۲] "پس آپ نصیحت کر دیا کریں (کیوں کہ) آپ صرف نصیحت کرنے والے ہیں۔ آپ کچھ ان پر داروغہ نہیں ہیں۔"

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [البقرة: ۲۷۲] "انھیں

---

[1] تفسير الطبري (۳۸٤/۲۲) [2] تفسير الطبري (۳۸٥/۲۲)

ہدایت پر لا کھڑا کرنا تیرے ذمے نہیں، بلکہ ہدایت اللہ تعالیٰ دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [القصص: ٥٦] ''آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہے ہدایت کرتا ہے۔'' نیز اسی لیے یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴾۔ امام قتادہ رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: ''اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِمَّنْ يَّخَافُ وَعِيْدَكَ وَيَرْجُوْ مَوْعِدَكَ يَا بَارُّ يَا رَحِيْمُ'' یعنی اے اللہ! تو ہم کو ان لوگوں میں سے کر دے جو تیری وعید سے ڈرتے ہیں اور تیرے وعدے کی اُمید رکھتے ہیں، اے احسان کرنے والے اے مہربان! آخر تفسیر سورت قٓ۔ والحمد لله وحده وحسبنا الله ونعم الوكيل.[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ تو قیامت کے احوال پر کان رکھ جس کی تیری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اس میں اس شے کی ہولناکی اور بڑی شان کی خبر دی ہے جس کی وحی کی جاتی ہے، وہ ایک بڑی ہولناک شے ہے، اسی لیے تو اس کے احوال سنانے کے لیے پہلے ﴿ اِسْتَمِعْ ﴾ فرمایا کہ اس پر کان رکھ اور خوب غور سے سن۔ کسی نے کہا کہ ''اِسْتَمِعِ النِّدَاءَ أَوِ الصَّوْتَ''۔ ﴿ اَلصَّيْحَةَ ﴾ یعنی کان رکھ نداء پر یا آواز پر یا صیحہ پر۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اِسْتَمِعْ ﴾ بہ معنی انتظار ہے۔ یہ قول بعید ہے۔

﴿ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ ﴾ جس دن پکارنے والا پکارے گا، مراد اسرافیل علیہ السلام ہیں۔ یا جبریل علیہ السلام صخرہ بیت المقدس پر کھڑے ہوں گے، پھر حشر کی نداء کریں گے۔ ﴿ اِسْتَمِعْ ﴾ کا مفعول اگر ﴿ اَلصَّيْحَةَ ﴾ ہوگا تو اس سے مراد صیحۂ قیامت ٹھہرے گا، یعنی نفخۂ ثانیہ جو صور میں اسرافیل علیہ السلام کی طرف سے ہوگا۔ کسی نے کہا ہے کہ اسرافیل علیہ السلام پھونکیں گے اور جبریل علیہ السلام نداء کریں گے اہلِ محشر کو اور کہیں گے: آؤ حساب کے لیے، چنانچہ اس بنا پر ندا محشر میں ہے۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا: یہ زیادہ صحیح ہے۔[3] چنانچہ اس پر آثار دال ہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: یہ اسرافیل علیہ السلام ہیں وہ محشر میں نداء کریں گے، چنانچہ کہیں گے: ''يَا أَيُّهَا النَّاسُ هَلُمُّوا لِلْحِسَابِ،''[4] یعنی لوگو حساب کے لیے آؤ۔ کسی نے یوں کہا ہے کہ یہ ندا کریں گے: ''أَيَّتُهَا الْعِظَامُ الْبَالِيَةُ وَالْأَوْصَالُ الْمُتَقَطِّعَةُ وَاللُّحُوْمُ الْمُتَمَزِّقَةُ وَالشُّعُوْرُ الْمُتَفَرِّقَةُ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُنَّ أَنْ تَجْتَمِعْنَ لِفَصْلِ الْقَضَاءِ''

قولہ تعالیٰ: ﴿ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴾ یعنی جس دن نداء کرنے والا مکانِ قریب سے نداء کرے گا، یعنی اس جگہ

---

1. تفسير ابن كثير (٢٩٢/٤، ٢٩٣)
2. تفسير الطبري (٣٨٢/٢٢)
3. حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٩٢/٨)
4. فتح القدير (١٠٧/٥)

سے کہ وہ آسمان کے قریب ہوگی جہاں سے اہلِ محشر کے افراد میں سے ہر فرد کو نداء پہنچ جائے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمیں یہ حدیث بیان کی جاتی تھی کہ وہ نداء کریں گے صخرۂ بیت المقدس سے[1] اور اسی کے قائل سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی ہیں۔[2] امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صخرہ آسمان کی طرف زمین کا قریب تر مقام ہے۔ بارہ میل۔ امام کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اٹھارہ میل۔ کسی نے کہا ہے کہ صخرہ وسطِ زمین ہے۔

﴿ يَوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ﴾ بدل ہے ﴿ يَوْمَ يُنَادِ ﴾ سے۔ ﴿ اَلصَّيْحَةَ ﴾ بعث ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ کے معنی بالبعث ہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی "إِنَّهَا كَائِنَةٌ حَقًّا"[3] یعنی وہ صیحہ تحقیق ہونے والا ہے اور ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ حال ہے ﴿ يَسْمَعُوْنَ ﴾ سے: "أَيْ: يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ مُتَلَبِّسِيْنَ بِالْحَقِّ" یا حال ہے ﴿ اَلصَّيْحَةَ ﴾ سے: "أَيْ: مُتَلَبِّسَةً بِالْحَقِّ"۔ امام جلال محلی رحمہ اللہ کی عبارت اس کی تفسیر میں یہ ہے: "بِالْبَعْثِ وَهِيَ النَّفْخَةُ الثَّانِيَةُ مِنْ إِسْرَافِيْلَ وَيَحْتَمِلُ أَنْ تَكُوْنَ قَبْلَ نِدَائِهِ وَبَعْدِهِ"[4] انتہیٰ۔ یہ قول غیر مستقیم ہے، کیونکہ صیحہ کی تفسیر نفخۂ ثانیہ سے کی جو نفخۂ بعث ہے۔ پھر کہا: اور احتمال ہے کہ صیحہ اسرافیل علیہ السلام کی نداء ہے جو نفخۂ ثانیہ سے سنی جائے گی جس طرح کے امام قرطبی رحمہ اللہ نے ندائے مذکور کو صیحہ کی تفسیر ٹھہرایا ہے۔[5] تأمل۔ یہ حاصل ہے جمل کا۔

﴿ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴾ یعنی یہ دن نداء کا، اور صیحہ سننے کا، قبروں سے نکلنے کا دن ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی جس دن قبروں سے بعث کی طرف نکلیں گے[6] یہ اپنی تکذیب کے انجام کو جان لیں گے (یہ عامل کی تقدیر ہے جو ﴿ يَوْمَ يُنَادِ ﴾ میں ہے، یعنی جس دن منادی ندا کرے گا یہ اپنی تکذیب کے انجام کو جان لیں گے۔)

﴿ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ ﴾ یہ جملہ مستانفہ ہے امرِ بعث کی تقریر کے لیے، یعنی بے شک ہم جلائیں گے آخرت میں اور ہم مارتے ہیں دنیا میں، اس میں ہمارا کوئی مشارک نہیں ہے کہ ہمارے ساتھ شریک ہو۔ ﴿ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ﴾ یعنی اور ہماری ہی طرف پھر آنا ہے تو ہم ہر عمل کرنے والے کو اس کے عمل کی جزا دیں گے۔

﴿ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ﴾ جمہور نے تاء کا شین میں ادغام کیا ہے اور کوفیوں نے ایک تاء کو تخفیف کے لیے حذف کر کے بہ تخفیفِ شین پڑھا ہے اور زید بن علی رحمہ اللہ نے ہر دو تاء کے اثبات کے ساتھ بنا بر اصل پڑھا ہے۔[7] اور کسی نے بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔ ﴿ سِرَاعًا ﴾ کا نصب بنا بر حال ہے ﴿ عَنْهُمْ ﴾ کی ضمیر سے اور حال میں عامل وہی ہے جو ﴿ يَوْمَ ﴾ میں ہے۔ ﴿ يَوْمَ ﴾ ظرف ہے "مصیر" کا، یا ظرف ہے ﴿ اَلْخُرُوْجِ ﴾ کا، یا "یخرجون" مقدر سے منصوب ہے، یعنی نکلیں گے قبروں سے جس دن زمین پھٹ جائے گی اُن سے اس حال میں

[1] فتح القدير (١٠٧/٥) [2] الدر المنثور (٦١٢/٧) [3] فتح القدير (١٠٧/٥) [4] تفسير الجلالين (٦٩٢/١)
[5] تفسير القرطبي (٢٧/١٧) [6] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣١٠/١٠) [7] فتح القدير (١٠٧/٥)

کہ جلدی کرنے والے ہوں گے پکارنے والے کی طرف جس نے ان کو پکارا ہے۔

﴿ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴾ یعنی فنا کے بعد یہ زندہ کرنا اور عرض اور حساب کے لیے جمع کرنا یہ ہم پر ایک آسان چیز ہے۔ ﴿ اِلَيْنَا ﴾ کی تقدیم اختصاص پر دال ہے، یعنی ایسا امرِ عظیم آسان نہیں ہوتا مگر اس قادر پر جس کو کوئی کام کسی کام سے باز نہیں رکھتا۔ پھر اللہ پاک نے اپنے نبی اکرم ﷺ کی تسلی و تعزیت کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴾ یعنی وہ جو تیری تکذیب کرتے ہیں اس شے میں جس کو تو لے کر آیا ہے اور بعث اور توحید کا انکار کرتے ہیں تو ہم کو اس کی خوب خبر ہے۔ ﴿ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ﴾ یعنی تو ان پر مسلط نہیں ہے کہ ان کو ایمان پر مجبور کرے۔ یہ آیت آیتِ سیف سے منسوخ ہے۔

﴿ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴾ یعنی تو قرآن کے ساتھ اس شخص کو نصیحت کر جو میری وعید سے ڈرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے جو اپنے نافرمانوں کو عذاب کی وعید سنائی ہے تو جو لوگ اس وعید سے ڈرتے ہیں ان کو قرآن سے سمجھا اور جو اُن کے علاوہ ہیں، ان کے ساتھ مشغول مت ہو، ہم ان کو وہ انواعِ عقاب اور طرح طرح کے عذاب کریں گے جس کے موجب و مستدعی ان کے اقوال ہوں گے۔ پھر اس کے بعد اللہ سبحانہ نے آپ ﷺ کو قتال کا امر فرمایا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کاش آپ ہم کو خوف دلائیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴾[1] (أخرجه ابن جرير)

یہ لوگ مومنین ہیں اس لیے کہ قرآن شریف سے نفع پانے والے یہی ہیں۔ وعید کی رسم (تحریر کرنا) بغیر یاء ہے۔ رہا لفظ میں تو ورش نے باثباتِ یاء پڑھا ہے بعد دال کے وصل میں نہ وقف میں اور باقی قراء نے وصل و وقف دونوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔ (كذا ذكر الخطيب)۔ "جبار" صیغۂ مبالغہ ہے، اس لیے کہ فعال کا وزن ثلاثی ہی سے بنایا جاتا ہے۔ مصباح میں کہا ہے: "أَجْبَرْتُهُ عَلَى كَذَا بِأَلِفٍ" یعنی میں نے فلاں کو فلاں شے پر آمادہ کیا قہر و غلبے سے۔ "فَهُوَ مُجْبَرٌ" سو وہ جبر کردہ شدہ ہے۔ یہ لغت عامۂ عرب کا ہے اور بنی تمیم کی لغت میں اور اہلِ حجاز کے بہت سے لوگوں کی لغت میں "جَبَرْتُهُ جَبْرًا" بابِ قتل سے ہے۔ امام ازہری رحمہ اللہ نے اس کو بیان کیا ہے۔ پھر کہا ہے کہ "جَبَرْتُهُ وَأَجْبَرْتُهُ" دو جید لغت ہیں۔ امام خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جبار وہ ہے جس نے اپنی مخلوق کو مجبور کیا ہے اپنے امر و نہی پر، جس کا اس نے ارادہ فرمایا۔ "جَبَرَهُ السُّلْطَانُ وَأَجْبَرَهُ" ایک معنی میں بولا جاتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ﴾ کے زیرِ تفسیر میں نے بعض تفاسیر میں دیکھا ہے کہ ثلاثی ایک لغت ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کو حکایت کیا ہے اور اس کی صحت کے لیے اس لفظ کے ساتھ استشہاد کیا ہے جس کے

---

[1] تفسير الطبري (٢٢/٣٨٥)

یہ معنی ہیں کہ فعال نہیں بنایا جاتا مگر فعل ثلاثی سے، جیسے: "فتّاح" و "علّام" اور "أفعل" بالف سے نہیں آیا مگر "درّاك" چنانچہ اگر "جبّار" کو اس معنی پر محمول کیا جائے تو وہ وجہ وجیہ ہے، یعنی ایک با وجہ بات ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا اور مقرر میں نے عرب کو سنا ہے کہ وہ یوں بولتے ہیں: "جَبَرْتُهُ عَلَى الْأَمْرِ وَأَجْبَرْتُهُ" اور جب یہ ثابت ہو گیا تو جس نے اس لغت کی تضعیف کی ہے، اس کے قول پر اعتماد نہ کیا جائے۔[1] (كذا في فتح البيان مع زيادة مناسبة والله سبحانه و تعالىٰ أعلم و علمه أتم)

الحمد لله والمنة کہ اس سورت مبارکہ کی تفسیر دوسری تاریخ ماہ ذیقعدہ ۱۳۱۴ء ہجری بروز سوموار شبِ منگل کو قریب یازدہ ساعت (گیارہ بجے) تمام ہوئی۔ الٰہی، سیدی مولائی اس کو قبول کر اور سہو ونسیان سے تجاوز فرما اور آئندہ لکھنے کی توفیق عطا کر۔ اللهم أحسن عواقبتنا في الأمور كلها وأجرنا من خزي الدنيا وعذاب الآخرة آمين. الحمد لله أولا وآخراً وظاهراً وباطنا، والصلاة والسلام على سيدنا ومولانا محمد وعلى آله وصحبه وأزواجه وذرياته وأتباعه وأشياعه إلى يوم الدين.

---

[1] المصباح المنير (۵۱/۱) فتح البيان (۱۸۳/۱۳ـ۱۸۵)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سُوۡرَةُ الذّٰرِيٰتِ

جلالین کے بعض نسخوں میں ﴿ وَالذّٰرِيٰتِ ﴾ ہے واؤ کے ساتھ۔ اس سورت مبارکہ کی ساٹھ (٦٠) آیتیں ہیں اور یہ مکی ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کے قول کے مطابق۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورۃ ﴿ الذّٰرِيٰتِ ﴾ مکہ میں نازل ہوئی۔[2] (أخرجه ابن الضريس والنحاس وابن مردويه والبيهقي في الدلائل وأخرج ابن مردويه عن ابن الزبير مثله)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرۡوًا ۙ﴿۱﴾ فَالۡحٰمِلٰتِ وِقۡرًا ۙ﴿۲﴾ فَالۡجٰرِيٰتِ يُسۡرًا ۙ﴿۳﴾
فَالۡمُقَسِّمٰتِ اَمۡرًا ۙ﴿۴﴾ اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَصَادِقٌ ۙ﴿۵﴾ وَّاِنَّ الدِّيۡنَ لَوَاقِعٌ ؕ﴿۶﴾
وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الۡحُبُكِ ۙ﴿۷﴾ اِنَّكُمۡ لَفِىۡ قَوۡلٍ مُّخۡتَلِفٍ ۙ﴿۸﴾ يُّؤۡفَكُ عَنۡهُ مَنۡ
اُفِكَ ؕ﴿۹﴾ قُتِلَ الۡخَـرّٰصُوۡنَ ۙ﴿۱۰﴾ الَّذِيۡنَ هُمۡ فِىۡ غَمۡرَةٍ سَاهُوۡنَ ۙ﴿۱۱﴾
يَسۡـَٔلُوۡنَ اَيَّانَ يَوۡمُ الدِّيۡنِ ؕ﴿۱۲﴾ يَوۡمَ هُمۡ عَلَى النَّارِ يُفۡتَنُوۡنَ ﴿۱۳﴾
ذُوۡقُوۡا فِتۡنَتَكُمۡ ؕ هٰذَا الَّذِىۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ ﴿۱۴﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

قسم ہے ان ہواؤں کی جو (مٹی وغیرہ کو) اُڑا کر بکھیرنے والی ہیں ① پھر ان بادلوں کی (قسم) جو (پانی کا) بوجھ اُٹھانے والے ہیں ② پھر ان کشتیوں کی (قسم) جو آسانی سے چلنے والی ہیں ③ پھر ان فرشتوں کی (قسم) جو کام تقسیم کرنے والے ہیں ④ بلاشبہ تمھیں جو وعدہ دیا جاتا ہے، وہ ضرور سچا ہے ⑤ اور بلاشبہ (اعمال کی) جزا ضرور ملنے والی ہے ⑥ قسم ہے آسمان کی جو راستوں والا ہے ⑦ بلاشبہ تم (باہم) مختلف باتوں میں (پڑے) ہو ⑧ اس سے پھیرا جاتا ہے

① تفسير القرطبي (٢٩/١٧ـط: دار الكتب المصرية، القاهرة) ② الدر المنثور (٦١٣/٧)

جوشخص (بھلائی سے) پھیرا گیا⑨ اٹکل پچو لگانے والے مارے گئے⑩ جو بے پروا غفلت میں پڑے ہیں⑪ وہ پوچھتے ہیں: جزا کا دن کب ہو گا؟⑫ جس دن وہ آگ میں جلائے جائیں گے⑬ (کہا جائے گا:) تم اپنا عذاب چکھو، یہ وہ عذاب ہے جسے تم جلدی مانگتے تھے⑭

قیامت اور حساب کی خبر کی صداقت:

ہواؤں کی قسم اٹھائی ہے۔ پہلے آندھی چلتی ہے جس سے غبار اُڑتا ہے اور بادل بنتے ہیں، پھر اُن میں پانی بنتا ہے۔ ہوائیں اس بوجھ کو لے کر پھرتی ہیں، پھر برسنے کے قریب نرم ہوا چلتی ہے، پھر بادل کو ہانک کر دوسری جگہ کا حصہ وہاں پہنچاتی ہیں جس طرح حکم ہوتا ہے۔ راہوں والا آسمان یعنی اس میں تاروں کا جال بچھا ہوا ہے۔ مختلف بات میں پڑے ہوئے ہو، یعنی آخرت کے جینے اور نہ جینے میں، جو اس کو نہ مانے وہ سیدھے راستے سے پھیرا گیا۔ بے سند باتیں کرنا، یعنی دین کی بات میں اٹکل دوڑانا۔ انتہی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ کوفے کے منبر پر چڑھے اور فرمایا کہ تم مجھ سے اللہ کی کتاب کی کسی آیت کے بارے اور کسی سنت کے بارے میں جو رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے، مجھ سے سوال کرو گے تو میں تم کو اس کی خبر دوں گا۔ چنانچہ ان کی طرف سے ابن الکواء کھڑا ہوا اور عرض کی: یا امیر المومنین! قولہ تعالیٰ: ﴿وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا﴾ کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا: ''اَلرِّيْحُ'' یعنی ہوا۔ عرض کی: ﴿فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا﴾ فرمایا: ''سَحَابٌ'' یعنی بدلیاں۔ عرض کی: ﴿فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا﴾ فرمایا: ''سُفُنٌ'' یعنی جہاز و کشتیاں۔ عرض کی: ﴿فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا﴾ فرمایا: فرشتے۔[1] (قال شعبة بن الحجاج عن سماك عن خالد بن عرعرة أنه سمع عليا رضي الله عنه وشعبة أيضا عن القاسم بن أبي بزة عن أبي الطفيل أنه سمع عليا رضي الله عنه وثبت أيضا من غير وجه عن أمير المومنين علي بن أبي طالب رضي الله عنه أنه صعد ... الخ)

اس بارے میں ایک مرفوع حدیث مروی ہے۔ چنانچہ حافظ ابوبکر بزار رحمہ اللہ نے سعید بن میسّب رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا ہے کہ صبیغ تمیمی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور عرض کی: اے امیر المومنین! آپ مجھے ﴿وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا﴾ کے متعلق خبر دیں، فرمایا کہ یہ ہوائیں ہیں اور اگر میں نے یہ رسول اللہ ﷺ سے نہ سنا ہوتا تو میں اس کو بیان نہ کرتا۔ عرض کی: پھر آپ مجھے ﴿فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا﴾ کے بارے میں بتائیں۔ فرمایا کہ فرشتے ہیں اور اگر میں نے یہ رسول اللہ ﷺ سے نہ سنا ہوتا تو نہ کہتا۔ کہا: پھر آپ مجھے ﴿فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا﴾ کے بارے میں بتائیں، فرمایا: یہ کشتیاں ہیں اور اگر میں نے یہ رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے نہ سنا ہوتا تو نہ کہتا۔ پھر اس کے مارنے کا حکم دیا تو وہ

① تفسير الطبري (٣٨٦/٢٢) مستدرك الحاكم (٥٠٦/٢)

سوضرب مارا گیا اور ایک گھر میں رکھا گیا۔ پھر جب وہ اچھا ہو گیا تو اسے بلایا، پھر اس کو اور سوضرب لگائی گئیں اور اسے پالان پر سوار کیا گیا اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا کہ تو لوگوں کو اس کی ہم نشینی سے منع کر۔ پھر وہ ہمیشہ اسی طرح رہا یہاں تک کہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور بڑی بڑی قسمیں کھائیں اور کہا کہ وہ اپنے جی میں اس شے میں سے کچھ نہیں پاتا جس کو پہلے پایا کرتا تھا' تو ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے میں عمر رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا تو انھوں نے جواب میں لکھا کہ میں اسے نہیں خیال کرتا ہوں مگر مقرر اس نے سچ کہا ہے، اب تو اسکے اور لوگوں کی مجالست کے درمیان تخلیہ کر دے۔[1] (قال أبو بكر البزار: فأبو بكر بن أبي سبرة لين وسعيد بن سلام ليس من أصحاب الحديث)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کو مرفوع کہنا ضعیف ہے اور اس میں جو قریب تر شے ہے وہ یہ ہے کہ یہ موقوف ہے عمر رضی اللہ عنہ پر، کیوں کہ صبیغ بن عسل کا قصہ عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مشہور ہے اور انھوں نے جو اس کو مارا تو اس لیے کہ ان کو اس کے حال سے یہ ظاہر ہوا تھا کہ وہ تعنت وعناد کے طور پر سوال کرتا ہے۔ واللہ أعلم

حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے ترجمۂ صبیغ میں یہ قصہ مطول ذکر کیا ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم، امام مجاہد، سعید بن جبیر، حسن، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے ان اشیاء کی اسی طرح تفسیر کی ہے۔ امام ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ نے اس کے سوا اور کچھ نہیں نقل کیا۔[3] اور مقرر کہا گیا کہ ﴿ الذّٰرِیٰتِ ﴾ سے مراد ہوائیں ہیں، جیسا کہ پہلے گزرا ہے کہ ﴿ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ﴾ سے مراد بدلیاں ہیں، جیسا کہ پہلے گزرا، اس لیے کہ وہ پانی کو اٹھاتی ہیں، جیسا کہ زید بن عمرو بن نفیل نے کہا ہے:

وَأَسْلَمْتُ نَفْسِي لِمَنْ أَسْلَمَتْ لَهُ الْمُزْنُ تَحْمِلُ عَذْبًا زُلَالًا

یعنی میں نے اپنی جان اس ذات کے لیے مطیع کر دی ہے جس کے لیے بدلیاں مطیع ہوئی ہیں جو صاف شیریں پانی کو اٹھائے پھرتی ہیں۔

اب رہیں ﴿ فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا ﴾ تو جمہور سے مشہور یہ ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے، کہ وہ کشتیاں ہیں نرمی سے پانی میں چلتی ہیں نرم چلنا۔ بعض نے کہا: وہ تارے ہیں جو اپنے افلاک میں چلتے ہیں نرمی سے، یہ معنی اس لیے کہے کہ یہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہو جائے، پھر اس کی طرف جو اس سے اعلیٰ ہے۔ چنانچہ ہواؤں کے اوپر تو بدلیاں ہیں اور تارے ان کے اوپر ہیں اور ﴿ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ﴾ فرشتے ہیں یہ اُن کے اوپر ہیں اللہ پاک کے شرعی وکونی احکام لے کر اترتے ہیں۔

یہ اللہ عزوجل کی طرف سے قیامت کے قائم ہونے پر ایک قسم ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ

---

[1] مسند البزار (۴۲۳/۱) اس کی سند میں ''ابوبکر بن ابی سبرہ اور سعید بن سلام'' سخت ضعیف راوی ہیں۔

[2] تاریخ دمشق (۴۱۰/۲۳) [3] تفسیر ابن کثیر (۲۹۴/٤)

لَصَادِقٌ ﴿5﴾ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ﴾ یعنی جس شے کا تم کو وعدہ ملتا ہے وہ البتہ سچی خبر ہے اور بے شک حساب البتہ ضروری ہونے والا ہے۔ پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ﴾۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں:

"ذَاتِ الْجَمَالِ وَالْبَهَاءِ وَالْحُسْنِ وَالِاسْتِوَاءِ"

اسی طرح امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، ابو مالک، ابو صالح، سدی، قتادہ، عطیہ عوفی اور ربیع بن انس رحمہم اللہ وغیرہم نے بھی کہا ہے، یعنی قسم ہے حسن و جمال و رونق و برابری والے آسمان کی۔ امام ضحاک اور منہال بن عمرو رحمہما اللہ وغیرہما نے کہا ہے: "مِثْلُ تَجَعُّدِ الْمَاءِ وَالرَّمْلِ وَالزَّرْعِ إِذَا ضَرَبَتْهُ الرِّيحُ فَيَنْسِجُ بَعْضُهُ بَعْضًا طَرَائِقَ طَرَائِقَ فَذَلِكَ الْحُبُكُ"[1] یعنی پانی اور ریت اور کھیتی کے پیچیدہ ہونے کی طرح جس وقت اس کو ہوا مارتی ہے تو بعض اس کا بعض کو بُن دیتا ہے طریقے طریقے۔ پس "حبك" یہ ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن ابی قلابہ عن رجل من اصحاب النبی رضی اللہ عنہم عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّ مِنْ وَّرَائِكُمُ الْكَذَّابَ الْمُضِلَّ وَإِنَّ رَأْسَهُ مِنْ وَّرَائِهِ حُبُكًا حُبُكًا» يعني بِالْحُبُكِ: الْجُعُودَةَ[2] ("الکذاب" سے مراد دجال ملعون ہے) یعنی بے شک تمھارے پرے جھوٹا گمراہ کرنے والا ہے اور بے شک اس کا سر اس کے ورے سے حبک حبک ہے، یعنی اس کے سر کے بال گھونگریالے ہونے کے سبب سے متکسر ہیں، جیسا ٹھہرا ہوا پانی یا ریت جس وقت اس پر ہوا چلتی ہے تو وہ پیچیدہ ہو جاتے ہیں اور راستے سے بن جاتے ہیں۔

امام ابو صالح سے مروی ہے: ﴿ ذَاتِ الْحُبُكِ ﴾ "اَلشِّدَّةِ" یعنی سختی و مضبوطی والا۔ امام خصیف رحمہ اللہ نے کہا "ذَاتِ الصَّفَاقَةِ"[3] یعنی سختی والا۔ صفاقہ سختگی جامہ کو کہتے ہیں۔ امام حسن بن ابی الحسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ ذَاتِ الْحُبُكِ ﴾ "حُبِكَتْ بِالنُّجُومِ" یعنی تاروں سے جال بنایا گیا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے بہ سند خود عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: ﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ﴾ یعنی ساتواں آسمان[4] اور۔ واللہ أعلم۔ گویا اس سے وہ آسمان مراد لیا جس میں ثوابت اور تارے ہیں۔ بہت سے علمائے ہیئت کے نزدیک یہ تارے آٹھویں آسمان میں ہیں جو ساتویں کے اوپر ہے۔ واللہ أعلم۔ یہ سب ایک شے کی طرف رجوع ہوتے ہیں، یعنی حسن و بہاء، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: "فَإِنَّهَا مِنْ حُسْنِهَا مُرْتَفِعَةٌ شَفَافَةٌ صَفِيقَةٌ شَدِيدَةُ الْبِنَاءِ مُتَّسِعَةُ الْإِرْجَاءِ أَنِيقَةُ الْبَهَاءِ مُكَلَّلَةٌ بِالنُّجُومِ الثَّوَابِتِ وَالسَّيَّارَاتِ مُوَشِّحَةٌ بِالشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَالْكَوَاكِبِ الزَّاهِرَاتِ"[5] یعنی آسمان اپنے حسن وخوبی سے بلند صاف شفاف سخت ہے، اس کی بنا مضبوط ہے اس کے اطراف فراخ ہیں، اس کی

[1] تفسیر الطبري (٢٢/٣٩٥_٣٩٧) تفسير ابن كثير (٤/٢٩٥)

[2] تفسير الطبري (٢٢/٣٩٦) مسند أحمد (٥/٣٧٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٨٠٨)

[3] تفسير ابن كثير (٤/٢٩٥) [4] تفسير الطبري (٢٢/٣٩٦، ٣٩٧) [5] تفسير ابن كثير (٤/٢٩٥)

روشنی اور رونق خوش نما ہے ثوابت اور سیارات تاروں کا تاج پہنایا گیا ہے، سورج اور چاند اور روشن تاروں سے زینت دیا گیا ہے۔

مشرکین کی باتوں میں اختلاف:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ﴾ یعنی او مشرکو! رسولوں کو جھٹلانے والو! بے شک تم البتہ ایک مختلف مضطرب بات میں پڑے ہوئے ہو جو نہ جڑتی ہے نہ جمع ہوتی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "إِنَّكُمْ لَفِي قَوْلٍ مُخْتَلِفٍ مَا بَيْنَ مُصَدِّقٍ بِالْقُرْآنِ وَمُكَذِّبٍ بِهِ"[1] یعنی تم اس درمیان میں پڑے ہو کہ کوئی تو قرآن کی تصدیق کرنے والا ہے اور کوئی اس کو جھٹلانے والا ہے۔

﴿ يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ﴾ یعنی قرآن کا جھٹلانا اسی پر رواج پا جاتا ہے جو فی نفسہ گمراہ ہے، کیوں کہ یہ ایک باطل بات ہے، اس کے لیے فرمانبردار نہیں ہوتا اور اس کے سبب سے گمراہ نہیں کیا جاتا اور اس سے پھیرا نہیں جاتا مگر وہی جو پھیرا گیا ہے، ناتجربہ کار ہے اور اسے کچھ سمجھ نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ۝ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴾ [الصافات: ١٦١۔ ١٦٣]۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اور امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: "يُضَلُّ عَنْهُ مَنْ ضَلَّ"، یعنی اس سے وہی شخص گمراہ کیا جاتا ہے جو گمراہ ہوا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "يُؤْفَنُ عَنْهُ مَنْ أُفِنَ"("افن"، ضعفِ رائے کو کہتے ہیں۔ كذا في الصراح)۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: پھیرا جاتا ہے اس قرآن سے وہ شخص جس نے اس کی تکذیب کی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "كَذَّابُوْنَ"، یعنی بڑے جھوٹے، کہا: اور یہ اس کلمے کی طرح ہے جو سورت عبس میں ہے: ﴿ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَاۤ اَكْفَرَهٗ ﴾ [عبس: ١٧] "اللہ کی مار انسان پر، کیسا ناشکرا ہے۔" ﴿ اَلْخَرّٰصُوْنَ ﴾ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم مر کر اٹھائے نہیں جائیں گے اور یقین نہیں کرتے۔ علی بن ابی طلحہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ الفاظ روایت کیے ہیں کہ "لُعِنَ الْمُرْتَابُوْنَ"، یعنی شک کرنے والے لعنت کیے گئے۔ اور اسی طرح سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ اپنے خطبے میں فرمایا کرتے تھے "هَلَكَ الْمُرْتَابُوْنَ"، امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَلْخَرّٰصُوْنَ ﴾ "أَهْلُ الْغِرَّةِ وَالظُّنُوْنِ"[2] یعنی دھوکا کھانے والے اور اٹکل کرنے والے ہیں۔

﴿ اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ کفر و شرک میں غافل اور لہو و لعب میں مشغول ہیں۔[3] ﴿ يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ﴾ یعنی پوچھتے ہیں کہ انصاف کا دن کب ہے؟ اور یہ جو کہتے ہیں تو برائے تکذیب، عناد، شک اور استبعاد کے کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ﴾۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، حسن رحمہم اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا: ﴿ يُفْتَنُوْنَ ﴾ "يُعَذَّبُوْنَ"

[1] تفسیر الطبري (٣٩٨/٢٢) [2] تفسیر الطبري (٣٩٨/٢٢، ٤٠٠) تفسیر ابن کثیر (٢٩٥/٤) [3] تفسیر الطبري (٤٠٠/٢٢، ٤٠١)

كَمَا يُفْتَنُ الذَّهَبُ عَلَى النَّارِ" یعنی جس دن وہ آگ پر عذاب کیے جائیں گے۔ ایک اور جماعت نے کہا، جس میں امام مجاہد، امام عکرمہ، ابراہیم نخعی، زید بن اسلم اور سفیان ثوری ؒ بھی ہیں، "يُحْرَقُونَ"[1] یعنی جس دن کہ وہ آگ پر جلائے جائیں گے۔ ﴿ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ﴾ امام مجاہد ؒ نے کہا ہے کہ "حَرِيقَكُمْ" اور غیر مجاہد نے کہا ہے کہ "عَذَابَكُمْ"[2] یعنی تم اپنا جلنا یا اپنا عذاب چکھو۔ ﴿هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ﴾ یعنی ان کو ملامت اور توبیخ کے لیے اور ان کی تحقیر وتصغیر کے لیے کہا جائے گا کہ یہ وہ شے ہے جس کی تم جلدی چاہتے تھے۔[3] (واللّٰہ أعلم)

فتح البیان کا بیان:

"ذَرْوٌ وَذَرْيٌ" برداشتن بادکاہ وخاک را، یعنی ہوا کا گھاس اور خاک کو اٹھانا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "ذَرَتِ الرِّيحُ التُّرَابَ وَغَيْرَهُ تَذْرُوهُ وَتَذْرِيهِ ذَرْوًا ذَرْيًا أَيْ: سَفَتْهُ" غرضیکہ ہوا جو خاک وغیرہ کو اُڑا کر بکھیرتی ہے اس بکھیرنے اور اُڑانے کو "ذَرْوٌ وَذَرْيٌ" کہتے ہیں۔ نصب ﴿ذَرْوًا﴾ کا بنا بر مفعول مطلق ہے۔ "ذَارِيَاتٌ" اس میں عامل ہے اور مفعول محذوف "أَيْ: اَلتُّرَابُ" وغیرہ۔ امام ابوعمرو اور حمزہ ؒ نے "ذَارِيَاتٌ" کے حرف "تاء" کو ﴿ذَرْوًا﴾ کی ذال میں ادغام کیا ہے، باقی قراء نے ادغام کے بغیر پڑھا ہے۔[4] ﴿الذّٰرِيٰتِ﴾ کا موصوف مقدر ہے: "أَيْ: وَالرِّيَاحُ الذَّارِيَاتُ التُّرَابَ" وغیرہ، یعنی ان ہواؤں کی قسم ہے جو خاک وغیرہ کو خوب اڑانے والی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ موصوف "النِّسَاءُ الْوَلُوْدُ" ہے: "أَيْ: وَالنِّسَاءِ الْوَلُوْدِ الذَّارِيَاتِ الْأَوْلَادَ ذَرْوًا" یعنی قسم ہے کثرت سے جننے والی عورتوں کی جو اولاد کو خوب بکھیرنے والی ہیں۔

﴿فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا﴾ ﴿وِقْرًا﴾ کا نصب بنا بر مفعول بہ ہے، جیسے کہا جاتا ہے: "حَمَلَ فُلَانٌ عِدْلًا ثَقِيلًا" یعنی فلاں نے بھاری بوجھ اٹھایا۔ جمہور نے ﴿وِقْرًا﴾ کو بہ کسر واؤ پڑھا ہے۔ "وِقْرٌ" اس شے کا نام ہے جو اٹھائی جاتی ہے، کسی نے بہ فتح واؤ پڑھا ہے بنا بر مصدر۔ موصوف مقدر ہے: "أَيْ: فَالسَّحَابِ الْحَامِلَاتِ وِقْرًا" یعنی بدلیوں کی جو اٹھانے والی ہیں پانی کو ایسے اٹھاتی ہیں، جیسے چوپایہ بوجھ کو اٹھاتا ہے۔ کسی نے کہا کہ موصوف "الرِّيَاحُ الْحَامِلَاتُ لِلسَّحَابِ" ہیں یا "النِّسَاءُ الْحَوَامِلُ" یعنی حاملہ عورتیں بچوں کو اٹھاتی ہیں۔

﴿فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا﴾. "یسر" بہ معنی سہل ہے ہر شے میں۔ اس کا نصب اس بنا پر ہے کہ مفعول مطلق محذوف کی صفت ہے: "أَيْ: جَرْيًا ذَا يُسْرٍ" یا مصدر ہے موضوع حال میں ہے۔ "مُيَسَّرَةً" اور موصوف مقدر ہے: "أَيْ: فَالسُّفُنِ الْجَارِيَاتِ جَرْيًا سَهْلًا" یعنی پھر قسم ہے کشتیوں کی جو دریا میں ہواؤں سے چلنے والی ہیں سہل اور آسان چلنا۔ کسی نے کہا ہے کہ موصوف "الریاح" یعنی پھر قسم ہے ان ہواؤں کی جو اپنے چلنے کی جگہوں میں

---

[1] تفسير الطبري (٢٢/٤٠٢، ٤٠٣) [2] تفسير الطبري (٢٢/٤٠٤، ٤٠٥)

[3] تفسير ابن كثير (٤/٢٩٤_٤٩٦) [4] فتح القدير (٥/١٠٩)

چلنے والی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "الکواکب" ہیں، یعنی قسم ہے ان ستاروں کی جو اپنی منزلوں میں چلتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "السحاب"، یعنی قسم ہے بدلیوں کی جو پانی کو اٹھاتی پھرتی ہیں آسانی سے آسمان و زمین کے درمیان۔ پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔

﴿ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ﴾ اس کا نصب بنا بر مفعول بہ ہے، یا بنا بر حال "أَيْ: مَامُوْرَةً" اس کا موصوف "اَلْمَلَائِكَةِ" ہے، یعنی پھر قسم ہے ان فرشتوں کی جو کاموں کی تقسیم کرتے ہیں، یعنی باران اور رزق اور اُن کے سوا اور چیزیں جو تقسیم کی جاتی ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرشتے مختلف امور کو لاتے ہیں۔ جبرائیل علیہ السلام تو انبیاء کی طرف سختی اور وحی کو لاتے ہیں اور میکائیل علیہ السلام رحمت اور رزق پر مقرر ہیں اور ملک الموت علیہ السلام موت کو لاتے ہیں[1] اور اسرافیل علیہ السلام صور اور لوح پر مقرر ہیں۔ کسی نے امرِ مختلف کو یوں بیان کیا ہے کہ قحط و ارزانی و بارش و موت و حوادث کو لاتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ موصوف "اَلرِّيَاحِ" ہے، یعنی قسم ہے ہواؤں کی جو امطار کو تقسیم کرتی ہیں بدلیوں کے گردش دینے کے ساتھ۔ کسی نے کہا ہے کہ موصوف "اَلسُّحُبِ" ہے، یعنی قسم ہے بدلیوں کی جن سے اللہ تعالیٰ بندوں کے کام کی تقسیم کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان چاروں وصف سے مراد "ریاح" ہیں جس طرح کہ ہر وصف کے تحت میں گزر چکا ہے، کیوں کہ وہ ان سب کے ساتھ موصوف ہو سکتی ہیں، اس لیے کہ وہ خاک وغیرہ کو اڑاتی ہیں اور بوجھوں کو اٹھاتی ہیں اور فضا میں چلتی ہیں اور امطار کو تقسیم کرتی ہیں۔ یہ قول انتہائی ضعیف ہے اور بہتر وہی ہے جو ہر وصف میں پہلے مذکور ہے اور اس کے متعلق احادیث پہلے گزر چکی ہیں۔

ان قسموں میں ترتیب رتبی و ذکری ہے اس اعتبار سے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلالت کرتی ہیں، ان کے مراتب متفاوت (مختلف) ہیں۔ توضیحِ مقام یہ ہے کہ جو قسمیں قرآن پاک میں واقع ہوئی ہیں، گو ان کا ورود جس بات پر قسم اٹھائی گئی، اس کی تاکید کی صورت میں ہوا ہے مگر ان سے اصل مقصود قسم اٹھانے والے کی تعظیم ہے، کیوں کہ اس میں کمالِ قدرت پر دلالت ہے تو اب قسم سے مقصود اس کے ساتھ محلوف علیہ پر استدلال ہوگا اور وہ یہاں پر وعدۂ بعث و جزاء کی سچائی ہے۔ گویا یوں کہا گیا کہ جو ذات پاک ان عجیب امور پر قادر ہوا ہے، وہی اس بات پر قادر ہے کہ جس شے کو وہ پہلے پیدا اور ایجاد کر چکا ہے، اس کو پھر دوہرا کر بنا دے۔ چنانچہ جب بات یوں ٹھہری تو جو قسمیں مختلف اُمور کے ساتھ اٹھائی گئی ہیں، اُن کی ترتیب میں مناسب یہ ہے کہ جو قسم کمالِ قدرت پر زیادہ تر دال ہو، وہی پہلے رکھی جائے۔

چنانچہ ہوائیں کمالِ قدرت پر بدلیوں کی نسبت زیادہ دال ہیں، اس لیے کہ وہ ان کے اسباب ہیں اور بدلیاں اس پر کشتیوں کی نسبت زیادہ دال ہیں اس لحاظ سے کہ بدلیوں کی ماہیت عجیب و غریب ہے اور اُن کے منافع کثیر ہیں اور اُن کو اٹھانے والا اور لادنے والا، یعنی ہوا ایک رقیق شے ہے اور یہ تینوں اس پر زیادہ دال ہیں بہ نسبت فرشتوں

[1] تفسير القرطبي (۳۰/۱۷)

کے جو حس سے غائب ہیں، کیوں کہ جو شخص حس سے غائب ہے، بسا اوقات مدِ مقابل اس کے وجود کا انکار کرے گا تو پھر استدلال پورا نہ ہو گا۔

یہ بیان تو اس بنا پر ہے کہ ترتیب تدلی (نزدیک ہونا) وتنزل کے طریق پر ہو۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بطور ترقی ہو، اس لیے کہ اس میں سے ہر ایک میں وہ صفات ہیں جو اُن کو ایک وجہ سے اعلیٰ اور دوسری وجہ سے ادنیٰ کر دیتی ہیں۔ پس ملائکہ "مُدَبِّرَات" بزرگ تر و نافع تر ہیں کشتیوں سے اور کشتیاں بہ نسبت بدلیوں کے زیادہ تر فائدہ مند ہیں، اس اعتبار سے کشتیاں انسان کے ہاتھ میں ہیں جس طرح چاہتا ہے ان کو استعمال کرتا ہے اور ان کے سبب سے ہلاک کرنے والی جگہوں سے سالم رہتا ہے اور بدلیاں ہواؤں کی نسبت زیادہ نفع بخش ہیں، اس لیے کہ بدلیوں میں پانی ہے۔ یہ ملخص ہے شیخ زادہ اور شہاب کا۔[1] (علی ما نقله الجمل)۔ بالجملہ اللہ پاک نے اشیائے مذکورہ کی قسم کھائی ان کی شرافتِ ذات کے سبب سے اور اس لیے کہ ان میں اس کی عجیب وغریب کاریگری اور قدرت پر دلالت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس میں مقدر ہے۔ تقدیر یہ ہے: "وَرَبِّ الذّٰرِيٰتِ... الخ" جب کہ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ کیوں کہ اللہ پاک کو اختیار ہے کہ اپنی مخلوق میں سے جس کی چاہے قسم کھائے اور اس کا شرف ظاہر کرنے کے لیے ہاں بندوں کو غیر اللہ کی قسم کھانا جائز نہیں۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قسم کا جواب ذکر کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ﴾ کلمۂ "ما" موصولہ ہے اور عائد محذوف: "أَيْ: أَنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ بِهِ مِنَ الثَّوَابِ وَالْعِقَابِ" یعنی بے شک وہ ثواب وعقاب جس کا تم کو وعدہ دیا جاتا ہے البتہ ضروری ہونے والا ہے۔ یا کلمۂ "ما" مصدریہ ہے: "أَيْ: إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ إِيَّاكُمْ" یعنی اللہ تعالیٰ کا تم کو ثواب وعذاب کا وعدہ دینا ضرور ہونے والا ہے۔ ﴿ وَاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ﴾ یعنی بے شک اعمال پر حساب وجزاء البتہ حاصل وکائن ہے، یعنی بالضرور وجود میں آنے والے ہیں۔

پھر ایک اور قسم کی ابتداء کی، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ﴾ اس جگہ سماء سے مراد یہی سماء معروف ہے، یعنی آسمان۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد بادل ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ جمہور نے "حُبُك" کو بہ ضمِ حاء و باء پڑھا ہے اور کسی نے بہ ضمِ حاء وسکونِ باء پڑھا ہے اور کسی نے بہ کسرِ حاء وفتحِ باء پڑھا ہے اور کسی نے بہ کسرِ حاء وضمِ باء پڑھا ہے۔[2] امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سب لغات ہیں۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا کہ "حُبُك" جمع ہے "حَبِيْكَة" کی، جیسے: "طَرِيْقَةٌ وَطُرُقٌ" یعنی صاحبِ طرق خلقت میں ہے، جیسے کہ ریت میں طرق ہوتے ہیں۔[3]

مفسرین نے "حبك" کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے، چنانچہ امام مجاہد، قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا: معنی یہ ہیں کہ "ذَاتِ الْخَلْقِ الْمُسْتَوِيْ الْحَسَنِ" یعنی برابر خوبصورت پیدائش والا۔ امام ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (۸/۹۳، ۹۴) [2] فتح القدير (۵/۱۱۰) [3] تفسير الجلالين (۱/۶۹۳)

کہ ہر شے جس کو تو نے پختہ ومضبوط کیا اور اس کے عمل کو خوبصورت بنایا تو مقرر تو نے اس کو حبک واحتباک کیا۔ حسن اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ”ذَاتِ الزِّيْنَةِ“ یعنی زینت والا۔ حسن رحمہ اللہ سے یہ بھی مروی ہے کہ ”ذَاتِ النُّجُوْمِ“ یعنی ستاروں والا۔ کسی نے کہا ”ذَاتِ الْبُنْيَانِ الْمُتْقِنِ“ یعنی محکم ومضبوط بنانے والا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”ذَاتِ الطَّرَائِقِ“۔ امام فراء رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں، یعنی طریقوں والا۔ جو پانی اور ریت جسے تو دیکھتا ہے جس وقت اسے ہوا لگتی ہے تو اس کو ”حُبُكٌ“ کہا جاتا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ”حُبُكٌ“ متکسر ہونا ہے ہر شے کا، جیسے: ریت کہ جس وقت اس پر تھمی ہوئی ہوا کا گزر ہوا اور پانی کہ جب اس پر ہوا گزر کرے۔ لوہے کی زرہ کو بھی ”حُبُكٌ“ کہتے ہیں، یعنی اس لیے کہ اس میں طرق ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ”حُبُكٌ“ شدت ہے: ”أَيْ: وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الشِّدَّةِ“ اور ”مَحْبُوْكٌ“، ”شَدِيْدُ الْخَلْقِ“ کو بولتے ہیں وہ گھوڑا ہو یا کچھ اور۔

امام واحدی رحمہ اللہ نے پہلا قول بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ اکثرین کا قول ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”أَيْ: حُسْنُهَا وَاسْتِوَاؤُهَا“۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے: ”ذَاتِ الْبَهَاءِ وَالْجَمَالِ وَإِنَّ بُنْيَانَهَا كَالْبُرْدِ الْمُسَلْسَلِ“۔ ان کا تیسرا قول یہ ہے: ”ذَاتِ الْخُلُقِ الْحَسَنِ“۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی کے مثل مروی ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ساتواں آسمان ہے۔[2] اہلِ لغت جس پر ہیں وہ یہی ”طَرَائِقُ“ میں ”حُبُكِ“ کا استعمال ہے، گو اکثر مفسرین اس کے خلاف پر ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ تفسیر ”حبك“ میں وہ اقوال اسی کی طرف راجع ہوں اس طرح سے کہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ صحیح ہے کہ آسمان میں جو طرائق ہیں وہ اس کے مزید حسن اور استوائے خلق کا سبب ہوں۔ اور اس میں حصولِ زینت اور مزید قوت کا سبب ہوں۔ تفسیر بیضاوی شریف میں ہے: ﴿ذَاتِ الْحُبُكِ﴾ ”ذَاتِ الطَّرَائِقِ وَالْمُرَادُ بِالطَّرَائِقِ الْمَحْسُوْسَةِ الَّتِي هِيَ مَسِيْرُ الْكَوَاكِبِ أَوِ الْمَعْقُوْلَةِ الَّتِي تَسْلُكُهَا النُّظَّارُ وَتَتَوَصَّلُ بِهَا إِلَى الْمَعَارِفِ أَوِ النُّجُوْمُ فَإِنَّهَا لَهَا طَرَائِقُ أَوْ أَنَّهَا تُزَيِّنُهَا كَمَا يُزَيِّنُ الْمَوَاشِيْ طَرَائِقَ الْوَشْيِ“[3] یعنی قسم ہے طرائق والے آسمان کی اور مراد یا تو وہ طرائقِ محسوس ہیں جو تاروں کے چلنے کی جگہ ہے، یا طرائقِ معقولہ مراد ہیں جن میں غور وفکر کرنے والے چلتے ہیں اور اُن سے معارف کی طرف توصل کرتے ہیں، یا مراد تارے ہیں اس لیے کہ وہ آسمان کے لیے طرائق ہیں، یا وہ آسمان کو زینت دیتے ہیں جس طرح کہ کپڑے پر نقش ونگار کرنے والا نقش ونگار کے طرائق کو زینت دیتا ہے۔ واللہ أعلم.

بالجملہ قسم کا جواب یہ ہے: ﴿اِنَّكُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ﴾ یعنی بے شک اے اہلِ مکہ! تم البتہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اور قرآن کی شان میں ایک متناقض (متضاد) بات میں پڑے ہوئے ہو۔ تم میں سے کوئی تو کہتا ہے کہ وہ

---

[1] تفسير القرطبي (١٧/٣١، ٣٢) فتح القدير (٥/١١٠) [2] تفسير الطبري (٢٢/٣٩٥) فتح القدير (٥/١١٤)

[3] تفسير البيضاوي (٥/٢٣٥)

شاعر ہے، کوئی کہتا ہے کہ ساحر ہے اور کوئی کہتا ہے کہ مجنون ہے اور قرآن شعر ہے، سحر ہے، کہانت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے مختلف قول میں ہونے سے یہ مراد ہے کہ کوئی تو ان میں سے حشر کی نفی کرتا ہے اور کوئی اس میں شک کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ یہ تو اقرار کرتے ہیں کہ ان کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور پوجتے بتوں کو ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ خاص کر اس آسمان کی قسم کھائی جو مذکورہ صفات کا حامل ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مختلف اقوال کی تشبیہ آسمان کے طرائق کے مختلف ہونے کے ساتھ دی ہے، یعنی ان کے اقوال کا اختلاف ایسا ہے جیسا کہ آسمان کے طرائق کا اختلاف ہے۔

﴿ يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ أُفِكَ ﴾. ﴿ أُفِكَ ﴾ کسی شے سے پھیرنے کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "أَفَكَهُ يَأْفِكُهُ إِفْكًا أَيْ: قَلَبَهُ عَنِ الشَّيْءِ وَصَرَفَهُ عَنْهُ"۔ اسی معنی میں یہ آیت ہے: ﴿ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ﴾ [الأحقاف: ٢٢] ''قوم نے جواب دیا: کیا آپ ہمارے پاس اس لیے آئے ہیں کہ ہمیں اپنے معبودوں (کی پرستش) سے باز رکھیں؟'' یعنی رسول اللہ ﷺ پر اور اس شے پر جس کو وہ لائے ہیں ایمان لانے سے پھیرا جاتا ہے، یا حق سے مراد بعث و توحید ہے، وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہدایت سے پھیرا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "يُحْرَمُ مِنْهُ مَنْ حُرِمَ"۔ امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا: "يُخْدَعُ عَنْهُ مَنْ خُدِعَ"۔ یزیدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "يُدْفَعُ عَنْهُ مَنْ دُفِعَ"۔[1] خطیب میں ہے: کسی نے کہا ہے کہ یہ قول مومنوں کی مدح ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ قول مختلف سے پھیرا جاتا ہے، وہ شخص جو پھیرا گیا ہے اس قول سے اور راہ بتایا گیا برابر بات کی طرف۔ انتہیٰ۔ یا اس مضمون کو اس طرح ادا کرو کہ پھیرا جاتا ہے اس اختلاف سے وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے عصمت اور توفیق کے ساتھ اس سے پھیر دیا۔

﴿ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ﴾ یہ اُن پر بد دعا ہے، یعنی مارے جائیں اٹکل کرنے والے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے سارے مفسروں سے حکایت کیا ہے کہ معنی یہ ہیں: "لُعِنَ الْكَذَّابُوْنَ"، یعنی بڑے جھوٹے پھٹکارے جائیں۔ "كَذَّابُوْنَ" سے مراد قولِ مختلف والے ہیں۔ اس ترکیب کی اصل قتل کے ساتھ وعدہ ہے، اس کو لعن کا قائم مقام کیا گیا ہے اور اس کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اس لیے کہ وہ ملعون جس سے ہر خیر و سعادت فوت ہوتی ہے، اس کو اس مقتول سے تشبیہ دی ہے جس سے حیات اور ہر نعمت فوت ہوتی ہے۔ امام ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے قتل کے ساتھ خبر دی جاتی ہے تو وہ لعنت کے معنی میں ہوتا ہے، اس لیے کہ جس کو اللہ سبحانہ نے ملعون کیا تو وہ مقتول ہلاک ہونے والے کے مقام پر ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ قُتِلَ ﴾ بہ معنی "لُعِنَ" ہے۔[2]

---

[1] تفسير القرطبي (٣٣/١٧) [2] فتح القدير (١١١/٥)

قاموس میں وہ بات ہے جس کا تقاضا ہے کہ ﴿ قُتِلَ ﴾ بہ معنی "لُعِنَ" آتا ہے۔ نصِ قاموس یہ ہے: ﴿ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَاۤ اَكْفَرَهٗ ﴾ "أَيْ: لُعِنَ وَقَاتَلَهُمُ اللّٰهُ أَيْ: لَعَنَهُمُ اللّٰهُ"[1] انتہیٰ۔ ﴿ اَلْخَرّٰصُوْنَ ﴾ وہ "کَذَّابُوْنَ" ہیں جو اس شے میں بہ تکلف اٹکل کرتے ہیں جس کو جانتے نہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ محمد ﷺ کذاب ہے، شاعر ہے، ساحر ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اَلْخَرّٰصُوْنَ ﴾ "کَذَّابُوْنَ" ہیں۔[2] خرص اٹکل کرنا ہے تر کھجوروں کا جو درخت پر ہیں خشک کھجوروں کے ساتھ۔ اور خراص وہ ہے جو ان کا اندازہ کرتا ہے۔ اس جگہ یہ مراد نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول پہلے گزر چکا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ "هُمُ الْكَهَنَةُ"[3] یعنی وہ کاہن لوگ ہیں کہ اٹکل پچو سے غیب کی باتوں کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ وہ بانٹ لینے والے لوگ ہیں، جنھوں نے مکہ کی راہیں بانٹ لی تھیں، تاکہ لوگوں کو اسلام سے پھیریں۔

پھر اللہ پاک نے خود اُن کا بیان فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ﴾ اصل میں غمرہ وہ شے ہے جو کسی شے کو چھپا دے ڈھانک دے۔ اس معنی سے سکراتِ موت کو غمرات الموت بولتے ہیں، اس لیے کہ موت کی شدتیں ہوش و حواس کو چھپا دیتی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ غَمْرَةٍ ﴾ کفر و شک ہے۔[4] معنی یہ ہیں کہ "خَرَّاصُوْنَ" وہ ہیں جو امورِ آخرت سے غفلت، نابینائی اور جہالت میں ہیں۔ "سہو" کسی شے سے غفلت ہے اور اس کا دل سے چلے جانا ہے، یعنی وہ لاہی (لہو و لعب میں مبتلا) اور غافل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: غفلت میں لاہی ہیں۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے: "فِيْ ضَلَالَتِهِمْ يَتَمَادُوْنَ"[5] یعنی اپنی گمراہی میں بڑھتے ہیں۔ ﴿ يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ﴾ یعنی تکذیب اور استہزاء کے طور پر کہتے ہیں کہ جزاء کا دن کب آئے گا؟

پھر اللہ پاک نے اس دن کی خبر دی، چنانچہ فرمایا: ﴿ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ﴾ یعنی جس دن وہ آگ میں جلائے جائیں گے اور عذاب کیے جائیں گے۔ "يُقَالُ: فَتَنْتُ الذَّهَبَ إِذَا أَحْرَقْتَهُ لِتَخْتَبِرَهُ". فتنے کی اصل اختبار و امتحان ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ سونا جس وقت آگ میں داخل کیا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے: "فُتِنَ"[6] یعنی جلایا گیا۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا: اصل فتنہ جوہر کا گلانا ہے، تاکہ اس کا کھوٹ ظاہر ہو جائے، پھر عذاب دینے اور جلانے میں استعمال ہونے لگا۔[7] ﴿ يُفْتَنُوْنَ ﴾ کو بہ حرفِ ﴿ عَلٰى ﴾ اس لیے متعدی کیا ہے کہ وہ "يُعْرَضُوْنَ" کے معنی میں شامل ہے۔ کلمۂ ﴿ يَوْمَ ﴾ منصوب ہے مضمر سے: "أَيْ: اَلْجَزَاءُ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ"۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ يَوْمُ الدِّيْنِ ﴾ سے بدل ہو اور فتحہ بنا کے لیے ہو، کیوں کہ وہ جملہ کی طرف مضاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بتقدیرِ "أَعْنِيْ" منصوب ہے۔ امام ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے بہ رفع "يَوْمُ" پڑھا ہے

---

[1] القاموس المحيط (١/١٣٥٢) [2] معاني القرآن (٥/٥٢) [3] تفسير الطبري (٢٢/٣٩٩) [4] الدر المنثور (٦/١٠٧)
[5] تفسير الطبري (٢٢/٤٠٠، ٤٠١) [6] تفسير الطبري (٢٢/٤٠٢) [7] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٨/٩٥)

بنابر بدل ﴿ یَوْمُ الدِّیْنِ ﴾ سے۔

جملہ ﴿ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ﴾ بتقدیرِ قول ہے، یعنی ان سے کہا جائے گا کہ اپنا عذاب چکھو۔ یہ قول امام ابن زید رحمہ اللہ کا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "حَرِيْقَكُمْ"۔ اول کو امام فراء رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے۔[1] جملہ ﴿ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴾ من جملہ محکی بالقول ہے، یعنی یہ وہ شے ہے جس کی تم دنیا میں تعجیل طلب کرتے تھے اور اپنی طرف سے استہزاء کرتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ جملہ ﴿ فِتْنَتَكُمْ ﴾ سے بدل ہے۔ بالجملہ جب اللہ سبحانہ نے اہلِ نار کا ذکر کیا تو اہلِ جنت کا حال بھی بیان کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ﴿15﴾ اٰخِذِیْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِیْنَ ﴿16﴾ كَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَهْجَعُوْنَ ﴿17﴾ وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿18﴾ وَ فِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآىِٕلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ﴿19﴾ وَ فِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ﴿20﴾ وَ فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿21﴾ وَ فِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَ مَا تُوْعَدُوْنَ ﴿22﴾ فَوَ رَبِّ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَاۤ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ﴿23﴾

بلاشبہ متقین باغات اور چشموں میں ہوں گے (15) جو کچھ ان کا رب انھیں دے گا، وہ اسے لے رہے ہوں گے۔ بلاشبہ وہ اس سے پہلے نیکوکار تھے (16) وہ رات کو بہت ہی تھوڑا سوتے تھے (17) اور وہ سحری کے وقت مغفرت مانگا کرتے تھے (18) اور ان کے مالوں میں سوالی اور محروم (نہ مانگنے والے) شخص کا حق (حصہ) ہوتا تھا (19) اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں (بہت سی) نشانیاں ہیں (20) اور (خود) تمھارے نفسوں میں بھی، کیا پھر تم دیکھتے نہیں؟ (21) اور آسمان میں تمھارا رزق ہے اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے (22) پھر قسم ہے آسمان اور زمین کے رب کی! بلاشبہ یہ (مذکورہ امور اسی طرح) حق ہیں، جیسے تم بولتے ہو (23)

متقین کی جزا اور ان کی صفات:

سوال سے بچنے والا وہ ہے جو محتاج ہے اور مانگتا نہیں پھرتا۔ آنے والی بات کا حکم آسمان سے ہی اترتا ہے، جیسا تمھیں اپنی بولی میں شبہہ نہیں اسی طرح اس کلام میں بھی شبہہ نہیں۔ انتہی۔

(1) تفسير الطبري (۲۲/۴۰۴، ۴۰۵) فتح القدير (۵/۱۱۱) (2) فتح البيان (۱۳/۱۸۹۔۱۹۳)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی خبر دیتا ہے جو اس سے ڈرتے ہیں کہ وہ قیامت کے دن باغوں اور چشموں میں ہوں گے بخلاف اس عذاب وسزا و جلنے اور طوقوں کے جس میں وہ بدبخت لوگ ہوں گے۔

﴿ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ﴾ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: یعنی وہ ان فرائض پر عمل کرنے والے ہیں جو ان کے رب نے ان کو دیے۔ ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ﴾ یعنی اس سے قبل کہ فرائض ان پر فرض کیے جائیں، وہ اعمال بھی نیک کرنے والے تھے۔ پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابن حمید رحمہ اللہ سے بروایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ﴿ مَآ اٰتٰىهُمْ ﴾ کی تفسیر میں "مِنَ الْفَرَائِضِ" اور ﴿ قَبْلَ ذٰلِكَ ﴾ کی تفسیر "قَبْلَ الْفَرَائِضِ يَعْمَلُوْنَ" روایت کیا ہے،[1] حالانکہ یہ اسناد یعنی ابن حمید کا ضعیف ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح نہیں ہے۔ (وقد رواه عثمان ابن أبي شيبة بسنده عن سعيد بن جبير عن ابن عباس رضي الله عنهما فذكره)

امام ابن جریر رحمہ اللہ کی اس تفسیر میں نظر ہے، کیوں کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ اٰخِذِيْنَ ﴾ حال ہے ﴿ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴾ سے۔ چنانچہ متقی لوگ جبکہ وہ جنات وعیون میں ہوں گے وہ اس نعیم وسرور وخوشی کو لینے والے ہوں گے جو ان کے رب نے ان کو دی اور ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ وہ دارِ دنیا میں نیکی کرنے والے تھے، جیسا کہ اللہ جل جلالہ کا فرمان ہے: ﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔۢا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴾ [الحاقة: ٢٤] "(ان سے کہا جائے گا) کہ مزے سے کھاؤ، پیو اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم نے گزشتہ زمانے میں کیے۔"

پھر اللہ پاک نے عمل میں ان کے محسن ہونے کا بیان کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴾ مفسرین نے اس میں دو قول پر اختلاف کیا ہے، ایک قول یہ ہے کہ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ نافیہ ہے تقدیر یہ ہے: "كَانُوْا قَلِيْلًا مِنَ اللَّيْلِ لَا يَهْجَعُوْنَهُ"، یعنی رات کے تھوڑے سے حصے میں نہیں سوتے تھے۔ اس سے یہ نکلا کہ سونا بہت اور نہ سونا کم۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نہیں گزرتی تھی ان پر کوئی رات مگر وہ اس سے لیتے تھے کچھ ہی ہو، یعنی کوئی رات عبادت سے خالی نہیں چھوڑتے تھے اگرچہ ذرا سی ہی سہی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے مطرف بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ کوئی رات نہیں آتی تھی ان پر، مگر وہ اس میں نماز پڑھتے تھے اللہ عزوجل کے لیے، یا تو رات کے شروع میں یا رات کے درمیان میں۔ مجاہد نے کہا بہت ہی کم تھا کہ رات بھر صبح تک سوئیں اور تہجد نہ پڑھیں۔ اسی طرح امام قتادہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے، یعنی کسی رات کو بغیر نماز پڑھے نہیں چھوڑتے تھے۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مغرب اور عشاء کے درمیان نماز پڑھا کرتے تھے۔ امام ابو جعفر باقر رحمہ اللہ نے فرمایا: سوتے نہیں تھے، یہاں تک کہ عشاء کی نماز پڑھ لیتے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کلمۂ "ما"

[1] تفسير الطبري (٢٢/٤٠٦)

مصدریہ ہے، تقدیر یہ ہے: ”كَانُوا قَلِيلًا مِنَ اللَّيْلِ هُجُوعُهُمْ وَنَوْمُهُمْ“ یعنی رات میں ان کا سونا تھوڑی دیر کا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ سونا کم اور جاگنا زیادہ۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو پسند کیا ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: ”كَابَدُوا قِيَامَ اللَّيْلِ فَلَا يَنَامُونَ مِنَ اللَّيْلِ إِلَّا أَقَلَّهُ وَنَشَطُوا وَفَمَدُوا إِلَى السَّحَرِ حَتَّى كَانَ الإِسْتِغْفَارُ بِسَحَرٍ“ یعنی رات کی نماز پڑھنے کی سختی کھینچی تو نہیں سوتے رات سے مگر بہت تھوڑا حصہ اور نشاط کیا تو سحر تک کھینچا، یہاں تک کہ استغفار سحر کے وقت میں ہوتا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ احنف بن قیس نے کہا ہے کہ وہ نہ سوتے تھے مگر تھوڑا، پھر کہتے کہ میں اس آیت کے لوگوں میں سے نہیں ہوں۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ احنف بن قیس کہتے تھے کہ میں نے اپنے عمل کا مقابلہ اہلِ جنت کے عمل سے کیا تو دیکھا کہ وہ ایک قوم ہیں جن کے اعمال ہم سے بہت دور اور مختلف ہیں، وہ ایک قوم ہیں کہ ان کے عمل کو ہم نہیں پہنچتے۔ ﴿ كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ﴾ اور میں نے اپنا عمل اہلِ نار کے عمل پر پیش کیا تو دیکھا کہ وہ ایک قوم ہے کہ ان میں کوئی خیر نہیں۔ وہ کتاب اللہ کی تکذیب کرنے والے اور رسولوں کو جھٹلانے والے ہیں اور موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو نہ ماننے والے ہیں۔ پس مقرر میں نے از روئے منزلت اپنے میں سے بہترین اس قوم کو پایا جنھوں نے ایک عملِ صالح کو دوسرے برے عمل کے ساتھ ملایا۔[1]

عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بنی تمیم کے ایک شخص نے میرے والد سے کہا: اے ابو اسامہ! ایک صفت ہے کہ اس کو میں اپنے لوگوں میں نہیں پاتا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کا ذکر کیا ہے تو فرمایا ہے: ﴿ كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ﴾ اور ہم واللہ! تھوڑی سی رات میں بھی قیام نہیں کرتے، تو میرے والد نے اس سے کہا: ”طُوبَى لِمَنْ رَقَدَ إِذَا نَعَسَ وَاتَّقَى اللّٰهَ إِذَا اسْتَيْقَظَ“ یعنی خوشی ہو اس شخص کو جو سویا جب اسے اونگھ آئی اور جب جاگ اٹھا تو اللہ سے ڈرا۔[2] عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہوئے، میں ان لوگوں میں تھا جو جمع ہوئے تھے، جب میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک دیکھا تو پہچان لیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مردِ کذاب کا چہرہ نہیں ہے۔ چنانچہ پہلے پہل جو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا وہ یہ تھا: « يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَصِلُوا الْأَرْحَامَ، وَافْشُوا السَّلَامَ، وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ، تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ»[3] یعنی لوگو! کھانا کھلاؤ، رشتے جوڑو، سلام پھیلاؤ، رات کو نماز پڑھو اور لوگ سوتے ہوں تو سلامتی سے جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک جنت

---

[1] تفسير الطبري (٢٢/٤٠٧-٤٠٩) تفسير ابن كثير (٤/٢٩٦، ٢٩٧) [2] تفسير الطبري (٢٢/٤١٢)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٨٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٣٤) مسند أحمد (٥/٤٥١) صحيح الجامع (٧٨٦٥)

میں بالاخانے ہیں جن کا ظاہر اُن کے باطن سے دکھائی دیتا ہے اور اُن کا باطن اُن کے ظاہر سے دکھائی دیتا ہے۔ تو سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ بولے: اے اللہ کے رسول! وہ کس کے لیے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: «لِمَنْ أَلَانَ الْكَلَامَ وَأَطْعَمَ الطَّعَامَ وَبَاتَ لِلّٰهِ قَائِمًا وَالنَّاسُ نِيَامٌ»[1] یعنی اس کے لیے ہے جس نے نرم بات کی اور کھانا کھلایا اور رات بسر کی اللہ کے لیے کھڑے ہو کر اور لوگ سوتے ہیں۔ معمر نے کہا ہے کہ امام زہری اور حسن رحمہ اللہ کہتے تھے: "كَانُوْا كَثِيْرًا مِنَ اللَّيْلِ مَا يُصَلُّوْنَ" یعنی بہت سی نماز پڑھتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے کہا: "مَا يَنَامُوْنَ" یعنی "هُجُوْعٌ" بہ معنی "نوم" ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "إِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ كَانُوْا قَلِيْلًا" پھر ابتداء کی تو کہا: ﴿مِنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾[2] اس قول میں بعد اور تعسف ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ "يُصَلُّوْنَ"[3] یعنی استغفار بہ معنی نماز ہے۔ دوسروں نے کہا ہے کہ رات کو قیام کیا، یعنی نماز پڑھی اور استغفار کیا، اسحار تک تاخیر کی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ [آل عمران: ١٧] "اور پچھلی رات کو بخشش مانگنے والے۔" پھر اگر استغفار نماز میں ہو تو یہ بہت بہتر ہے۔ صحاح وغیرہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے عن رسول اللہ ﷺ ثابت ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک جب رات کا تہائی حصہ رہ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ سمائے دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے اور فرماتا ہے: کیا ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ میں اس پر رجوع ہوؤں، کیا ہے کوئی بخشش مانگنے والا کہ میں اسے بخشوں، کیا ہے کوئی سائل کہ اسے اپنا سوال دیا جائے، یہاں تک کہ فجر طلوع ہوتی ہے۔[4] یہ جو اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام کی طرف سے خبر دی ہے کہ انھوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا: ﴿سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ﴾ [یوسف: ٩٨] "میں جلد ہی تمھارے لیے اپنے پروردگار سے بخشش مانگوں گا۔" پس اس کی تفسیر میں بہت سے مفسروں نے کہا ہے کہ انھوں نے ان کو سحر کے وقت تاخیر دی تھی، یعنی اس لیے کہ سحر کا وقت قبولیت کا ہے۔

جب اللہ پاک نے ان کا وصف نماز کے ساتھ کیا تو اس کے بعد ان کو زکاۃ نیکی اور صلہ رحمی کے ساتھ موصوف کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَفِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾ یعنی ان کے مالوں میں ایک حصہ بانٹا گیا ہے جس کو سائل اور محروم کے لیے علاحدہ کر رکھا ہے۔ سائل تو معروف ہے، یعنی وہ شخص جو سوال خود کرتا ہے اور اس کے لیے حق ہے جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود عن فاطمہ بنت الحسین عن ابیہا الحسین بن علی رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «لِلسَّائِلِ حَقٌّ وَإِنْ جَاءَ عَلَى فَرَسٍ» یعنی سائل کا حق ہے گو وہ گھوڑے پر سوار ہو

[1] مسند أحمد (١٧٣/٢) [2] تفسير الطبري (٤٠٩/٢٢، ٤١١)
[3] تفسير الطبري (٤١٣/٢٢) [4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٥٨)

کر آئے۔[1] (ورواه أبو داود من حديث سفيان الثوري به ثم أسنده من وجه آخر عن علي بن أبي طالب رضی اللہ عنہ وروي من حديث الهرماس بن زياد مرفوعاً)

رہا محروم تو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''هُوَ الْمُحَارِفُ الَّذِيُ لَيُسَ لَهُ فِيُ الْإِسُلَامِ سَهُمٌ.[2] يَعُنِيُ لَا سَهُمَ لَهُ فِيُ بَيُتِ الْمَالِ وَلَا كَسُبَ لَهُ وَلَا حِرُفَةَ يَتَقَوَّتُ مِنُهَا''، یعنی محروم وہ بے نصیب ہے جس کا اسلام میں کچھ حصہ نہیں ہے، یعنی بیت المال میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے اور نہ اس کے لیے کوئی کمائی ہے، نہ کوئی پیشہ جس سے روزی حاصل کرے۔ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''هُوَ الْمُحَارِفُ الَّذِيُ لَا يَكَادُ يَتَيَسَّرُ لَهُ مَكُسَبُهُ''،[3] یعنی وہ بے نصیب ہے کہ نہیں قریب ہوتا اس کے کہ میسر ہو اس کو اس کی کمائی۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: وہ یہ ہے کہ اس کے لیے کوئی مال نہیں ہے مگر وہ چلا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے یہ حکم فرمایا ہے۔ امام ابو قلابہ رحمہ اللہ نے کہا: یمامہ میں ایک سیلاب آیا اور ایک شخص کا مال لے گیا، چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک شخص نے کہا ہے کہ یہ محروم ہے۔

نیز سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام سعید بن مسیّب، ابراہیم نخعی، نافع مولای ابن عمر رضی اللہ عنہما اور عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَالْمَحْرُوْمِ ﴾ ''محارف'' ہے، یعنی بے بخت خلاف مبارک۔ امام قتادہ اور زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محروم وہ ہے جو لوگوں سے کسی شے کا سوال نہیں کرتا۔[4] امام زہری رحمہ اللہ نے کہا اور مقرر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: مسکین وہ نہیں ہے جو پھرتا رہتا ہے جس کو ایک لقمہ یا دو لقمے اور ایک کھجور یا دو کھجور دینا پھیر دیتا ہے، لیکن مسکین وہ ہے جو اتنا نہیں پاتا کہ اسے مانگنے سے غنی کر دے۔ ''وَلَا يُفُطَنُ لَهُ فَلُيُتَصَدَّقَ عَلَيُهِ''، یعنی اور نہ لوگ اس کے حال سے مطلع ہوتے ہیں کہ اس پر صدقہ کیا جائے۔[5] (وهذا الحديث قد أسنده الشيخان في صحيحيهما من وجه آخر)

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: وہ یہ ہے کہ آتا ہے اس حال میں کہ غنیمت بانٹ دی گئی تو اس کو کچھ دیا جائے۔ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمارے بعض اصحاب نے مجھے حدیث کی، کہا: ہم عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے ساتھ مکہ کے راستے میں تھے تو ایک کتا آیا تو عمر رحمہ اللہ نے بکری کا شانہ کھینچا اور اسے اس کی طرف پھینک دیا اور کہتے ہیں کہ یہ محروم ہے۔[6] امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھے اس بات نے تھکا دیا کہ میں جان لوں کہ محروم کیا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو اختیار کیا ہے کہ محروم وہ ہے جس کے لیے کوئی مال نہ ہو کسی سبب سے ہو اور اس کا مال جاتا رہا ہو یا وہ کمائی کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو یا اس کا مال ہلاک ہو گیا یا اسی طرح کسی آفت سے مال ضائع ہو

---

[1] سنن أبي داود (١٦٦٥) اس کی سند میں ''یعلیٰ بن ابی یحییٰ'' مجہول راوی ہے۔ تفصیل دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ١٣٧٨)
[2] تفسير الطبري (٤١٤/٢٢) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣١٢/١٠) [4] تفسير الطبري (٤١٦_٤١٤/٢٢)
[5] صحيح البخاري (١٤٠٩) صحيح مسلم (١٠٣٩) تفسير الطبري (٤١٦/٢٢) [6] تفسير ابن كثير (٢٩٨/٤)

گیا۔[1] امام ثوری رحمہ اللہ نے عن قیس بن مسلم عن الحسن بن محمد رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کا ایک ٹکڑا بھیجا تو وہ غنیمت لائے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قوم آئی جو غنیمت میں حاضر نہ ہوئی تھی، اس پر یہ آیت اتری۔[2] یہ حدیث اس کی مقتضی ہے کہ یہ آیت مدنی ہو، حالانکہ یوں نہیں ہے، بلکہ وہ مکی ہے اور اپنے مابعد کو شامل ہے۔

زمین میں اور نفسِ انسانی میں قدرتِ الٰہی کی نشانیاں:

قولہ عزوجل: ﴿ وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ﴾ یعنی زمین میں نشانیاں ہیں جو اس کے خالق کی عظمت پر اور اس کی قدرتِ باہرہ پر دال ہیں، ان انواع واقسام کی چیزوں میں سے جن کو اس پر پیدا کیا ہے۔ دیکھو طرح طرح کی روئیدگی قسم قسم کے جاندار، کہیں نیچا کہیں اونچا، کہیں پہاڑ کہیں برابر زمین، کہیں جنگل کہیں آبادی، کسی جگہ نہریں ندیاں بہہ رہی ہیں، کہیں دریا جوش مار رہے ہیں، آدمیوں کو دیکھو تو ان کی زبانیں مختلف، رنگ مختلف اور جن ارادوں اور قوتوں پر وہ پیدا کیے گئے ہیں وہ مختلف اور ان کے آپس میں جو عقل وفہم وحرکت وسکون وسعادت وشقاوت کا فرق ہے اور ان کی ترکیب میں جو جو طرح طرح کی حکمتیں مختلف رکھی ہیں، ان کے اعضاء میں سے ہر عضو کو اسی جگہ میں رکھا ہے جس میں وہ اس کی طرف محتاج ہے۔ اسی لیے اللہ عزوجل نے یوں فرمایا: ﴿ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴾ یعنی اور خود تمھارے اندر نشانیاں ہیں، کیا پھر تم دیکھتے نہیں ہو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو شخص اپنے نفس کی پیدائش میں غور وفکر کرے گا تو وہ پہچان جائے گا کہ اسے جو پیدا کیا گیا ہے اور اس کے جوڑ اور پیوند نرم کیے گئے ہیں تو عبادت کے لیے کیے گئے ہیں۔[3]

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ ﴾ یعنی اور تمھاری روزی آسمان میں ہے، مراد باران ہے۔ ﴿ وَمَا تُوعَدُونَ ﴾ یعنی اور وہ شے جس کا تم کو وعدہ دیا جاتا ہے مراد جنت ہے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام مجاہد رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم کا ہے۔[4] امام سفیان نے کہا ہے کہ واصل احدب نے یہ آیت پڑھی تو کہا: کیا میں نہیں دیکھتا ہوں اپنی روزی آسمان میں اور میں اس کو زمین میں طلب کرتا ہوں، پھر وہ ایک ویران جگہ میں گھس گئے اور وہاں تین رات ٹھہرے اور کسی شے کو نہ پاتے تھے، پھر جب تیسرا دن ہوا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ٹوکری تر کھجور کی موجود ہے اور ایک بھائی جو اُن سے بھی زیادہ اچھی نیت والے تھے، وہ بھی ان کے ساتھ داخل ہوئے تھے تو وہ دو ٹوکریاں ہوگئیں، پھر ہمیشہ ان دونوں کا یہی حال رہا، یہاں تک کہ موت نے ان کو جدا کر دیا۔[5]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ ﴾ اللہ پاک اپنے نفسِ کریم کی قسم کھا

---

1 تفسير الطبري (٤١٨/٢٢) 2 تفسير الطبري (٤١/٢٢) یہ روایت مرسل ہے۔ 3 الدر المنثور (٦١٩/٧)
4 تفسير ابن كثير (٢٩٨/٤) 5 تفسير الطبري (٤٢١/٢٢)

کر فرماتا ہے کہ امرِ قیامت اور بعث اور جزاء جس کا اس نے ان کو وعدہ دیا ہے، بے شک وہ ضرور ہی ہونے والا ہے اور وہ حق ہے اس میں کسی طرح کا شک نہیں ہے، اس لیے تم اس میں شک نہ کرو جس طرح تم اپنے بولنے میں شک نہیں کرتے ہو، جبکہ تم بولتے ہو۔ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ جس وقت کسی شے کی حدیث کرتے تو اپنے مصاحب سے کہتے کہ بے شک یہ البتہ حق ہے جس طرح کہ تم واقعی اس جگہ موجود ہو۔ مسدد نے عن ابن ابی عدی عن عوف عن الحسن البصری روایت کیا ہے کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «قَاتَلَ اللّٰهُ أَقْوَامًا أَقْسَمَ لَهُمْ رَبُّهُمْ ثُمَّ لَمْ يُصَدِّقُوا» یعنی لعنت کرے اللہ ان قوموں کو کہ ان کے لیے ان کے رب نے قسم کھائی پھر بھی انھوں نے تصدیق نہ کی۔[1] (رواه ابن جرير عن ابن أبي عدي عن عوف عن الحسن فذكره مرسلا)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ بے شک متقی لوگ ایسے باغوں میں جانے والے ہیں جن میں ان کے اطراف اور مکانوں میں چشمے جاری ہیں، ان کی صفت کو صفت کرنے والے نہیں پہنچ سکتے، یعنی ان کی خوبی بیان سے باہر ہے، اس حال میں کہ قبض کرنے والے ہیں اس خیر و ثواب و کرامت کو جو ان کو ان کے رب نے ذرا ذرا کر کے عطا فرمائی، اس سے راضی اور خوش ہوتے ہوئے اور اس کے لیے قبولیت کے ساتھ پیش آتے ہوئے اور اس خیر و کرامت کو شیئاً فشیئاً لیتے رہیں گے، اس کو پورا استیفا نہ کر لیں گے (ایک ہی دفعہ پورا لے لینا) کیونکہ جس شے کی انتہا نہیں ہے اس کا استیفا نہیں ہو سکتا۔ جنت کا سارا ساز و سامان ﴿ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴾ [هود: ١٠٨] اور ﴿ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ﴾ [القلم: ٣] ہے، یعنی اس کا انقطاع نہیں ہے۔

جملہ: ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ﴾ تعلیل ہے ما قبل کی، یعنی متقی لوگوں کو یہ عیش و عشرت اور ناز و نعمت اس لیے ملا کہ وہ دنیا میں، یعنی اپنے جنت میں داخل ہونے سے پہلے محسنین تھے اپنے اعمالِ صالح میں اس طرح سے کہ ان کو جس بات کا حکم کیا گیا تھا اس کی بجا آوری کرتے تھے اور جس سے ان کو منع کیا گیا تھا اس کو ترک کرتے تھے۔

پھر اللہ پاک نے ان کے احسان کا ذکر کیا جس کے ساتھ ان کو موصوف فرمایا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴾ ہجوع رات میں سونے کو کہتے ہیں نہ کہ دن میں۔ اس کا باب "خضع" ہے۔ "هَجْعَةٌ"، "نَوْمَةٌ خَفِيفَةٌ" کو بولتے ہیں، کلمۂ ﴿ مَا ﴾ زاید ہے اور ﴿ يَهْجَعُوْنَ ﴾ "كَانَ" کی خبر ہے اور ﴿ قَلِيْلًا ﴾ ظرف ہے: "أَيْ: كَانُوا يَنَامُونَ فِي زَمَنٍ يَسِيرٍ مِنَ اللَّيْلِ وَيُصَلُّونَ أَكْثَرَهُ"۔ محلی نے اسی طرح کہا ہے[2] یعنی دنیا

---

[1] تفسير الطبري (٤٢٢/٢٢) تفسیر ابن كثير (٢٩٦/٤-٢٩٨) یہ روایت مرسل ہے۔
[2] تفسير الجلالين (٦٩٣/١)

میں ان کا محسن ہونا یہ تھا کہ وہ رات کے ذرا سے وقت میں سوتے تھے اور اس کے اکثر اوقات میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ یا کلمۂ ﴿ مَا ﴾ مصدریہ ہے: "أَيْ: كَانَ هُجُوْعُهُمْ فِيْ زَمَنٍ قَلِيْلٍ مِنَ اللَّيْلِ" یعنی ان کا سونا رات کے زمانۂ قلیل میں تھا۔ یا کلمۂ ﴿ مَا ﴾ موصولہ ہے: "أَيْ: كَانَ مَا يَهْجَعُوْنَ فِيْهِ زَمَانًا قَلِيْلًا مِنَ اللَّيْلِ" یعنی وہ وقت جس میں سوتے تھے رات کا ایک قلیل وقت تھا۔ کسی نے کہا ﴿ مَا ﴾ نافیہ ہے: "أَيْ: مَا كَانُوْا يَنَامُوْنَ قَلِيْلًا مِنَ اللَّيْلِ فَكَيْفَ بِالْكَثِيْرِ مِنْهُ" یعنی وہ رات کے قلیل وقت میں نہیں سوتے تھے تو پھر اس کے کثیر وقت میں کیسے سوئیں گے۔ یہ قول انتہائی ضعیف ہے۔ اسی طرح اس شخص کا قول ہے جس نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں: "كَانَ عَدَدُهُمْ قَلِيْلًا" یعنی ان کی گنتی کم تھی۔ یہ بات پوری ہوگئی۔

پھر کلام کی ابتداء کی تو کہا: ﴿ مِنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴾ یعنی وہ رات کو سوتے نہیں تھے۔ امام ابن الانباری رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[1] یہ قول پہلے قول سے بھی بڑھ کر ضعیف ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ ہے کہ ان پر کوئی رات ایسی نہیں آتی تھیں کہ وہ سوئیں یہاں تک کہ صبح کریں مگر وہ اس میں نماز پڑھتے تھے۔[2] دوسرا قول یہ ہے: "قَلِيْلًا مَا كَانُوْا يَنَامُوْنَ"[3] یعنی رات کو کم سوتے تھے۔ ﴿ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴾ یعنی سحر* کے اوقات میں اللہ پاک سے طلب کرتے ہیں کہ ان کے گناہ بخش دے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ انھوں نے نماز لمبی کی اسحار تک، پھر اسحار میں استغفار شروع کی۔[4]

امام کلبی، مقاتل اور مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "هُمْ بِالْأَسْحَارِ يُصَلُّوْنَ"[5] یعنی وہ اوقاتِ سحر میں نماز پڑھتے ہیں، یہ یوں ہے کہ ان کی نماز اُن کا مغفرت طلب کرنا ہے، (یعنی اوقاتِ سحر میں مغفرت طلب کرنے کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی ﴿ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴾ کے معنی "يُصَلُّوْنَ" مروی ہیں۔)[6] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نمازِ فجر ہے۔[7]

خطیب میں ہے: "وَبِالْأَسْحَارِ"۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سحر اخیر رات کا چھٹا حصہ ہے[8] ﴿ هُمْ ﴾ "أَيْ: دَائِمًا بِظَوَاهِرِهِمْ وَبَوَاطِنِهِمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ" یعنی وہ ہمیشہ اپنے ظاہر و باطن سے مغفرت مانگتے ہیں، یعنی باوجود اس سعی و کوشش کے اپنی جانوں کو گناہ گار شمار کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی مغفرت مانگتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے علم کے اور اس بات کے علم کے سبب سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدر کرنے پر اس طرح سے قادر نہیں ہیں، جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے، گو وہ اس کے لیے پوری کوشش کریں، اس لیے کہ سید الخلق جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: « لَا أُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ »[9] یعنی کسی نے کہا ہے کہ عبادت میں اپنی تقصیر کی مغفرت مانگتے ہیں، اس قدر

[1] فتح القدير (١١٢/٥) [2] تفسير الطبري (٤٠٧/٢٢) [3] تفسير الطبري (٤١١/٢٢) [4] تفسير الطبري (٤٠٩/٢٢)
[5] تفسير الطبري (٤١٣/٢٢) فتح القدير (١١٢/٥) [6] الدر المنثور (٦١٦/٧) [7] تفسير القرطبي (٣٨/١٧)
[8] تفسير الطبري (٤١٣/٢٢) [9] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٨٦)

قلیل وقت میں جس میں وہ رات کو سوتے تھے۔

جب اللہ پاک نے ان کی بدنی عبادت کا ذکر کیا تو مالی عبادت کا بھی بیان کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَفِيٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴾ یعنی وہ اللہ عزوجل کا تقرب چاہنے کے لیے اپنے مالوں میں سے سائل اور محروم کے لیے ایک حق مقرر کر دیتے ہیں اور اسے اپنے لیے واجب کر لیتے ہیں۔ کرم اور سخاوت کے تقاضے کے لیے اپنے مالوں سے صلہ رحمی کرتے ہیں اور فقراء و مساکین کو دیتے ہیں۔ امام محمد بن سیرین اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ ﴿ حَقٌّ ﴾ سے مراد زکاتِ مفروضہ ہے۔[1] پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ چنانچہ وہ صدقۂ نفل و صلہ رحمی و مہمان کی مہمان نوازی پر محمول ہو گا، اس لیے کہ سورت مکی ہے اور زکات مدینہ طیبہ میں ہی فرض ہوئی۔ اس کا بیان سورت ﴿ سَاَلَ سَآئِلٌ ﴾ کی آیت میں آئے گا: ﴿ وَالَّذِيْنَ فِيٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴾ [المعارج: ٢٤۔ ٢٥] ”اور جن کے مالوں میں مقررہ حصہ ہے مانگنے والوں کا بھی اور سوال سے بچنے والوں کا بھی۔“

وہاں لفظ ﴿ مَعْلُوْمٌ ﴾ زیادہ ہے۔ سائل تو وہ ہے جو اپنے فاقے کے سبب سے لوگوں سے سوال کرتا ہے۔ محروم کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے جو سوال سے تعفف کرتا ہے، یعنی بچتا ہے یہاں تک کہ لوگ اس کو غنی خیال کرتے ہیں اور اسے خیرات نہیں دیتے۔ امام قتادہ اور زہری رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام حسن اور محمد بن حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ ہے جس کے لیے غنیمت میں کوئی حصہ نہیں اور نہ ہی اس پر فیٔ میں سے کوئی شے جاری کی جاتی ہے۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا: وہ ہے جس کے پھل یا کھیتی یا ماشیہ (چوپائے) آفت رسیدہ ہوئے۔ قرظی نے کہا ”هُوَ الَّذِيْ أُصِيْبَ بِجَائِحَةٍ“ یعنی جس کو کوئی آفت پہنچائی گئی۔ کسی نے کہا ہے کہ کتا۔ اس کے سوا اور قول بھی ہیں، کچھ پہلے گزر چکے ہیں۔ امام شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجھے آج کے دن ستر برس ہوئے جب سے کہ میں بالغ ہوا ہوں، میں محروم کے بارے میں سوال کرتا ہوں، میں اس کے بارے میں آج کے دن اس دن سے زیادہ جاننے والا نہیں ہوں[2] (یعنی وہ دن اور آج کا دن دونوں برابر ہیں کچھ آج میرا علم اس دن سے زیادہ نہیں ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ باوجود اتنی مدت تک سوال کرنے کے مجھے محروم کا علم نہیں ہے)۔ جس بات پر اعتماد کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ جس پر لغوی معنی دلالت کرتے ہیں۔

”محروم“ لغت میں ممنوع کے معنی میں ہے: ”حرمان“ سے ماخوذ۔ ”حرمان“ بہ معنی منع ہے تو اب اس کے نیچے وہ شخص داخل ہو گا جو اصل سے محروم الرزق ہے اور وہ جس کا مال آفت رسیدہ ہو کسی آفت کے سبب سے جو اس کو لے گئی اور وہ جو عطا سے اور صدقے سے اپنے تعفف کی وجہ سے محروم ہوا۔ ان قولوں کا ظاہر تر یہ ہے کہ ”محروم“ متعفف (سوال سے بچنے والا) ہے، اس لیے کہ اس کو سائل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور متعفف سوال نہیں کرتا ہے

[1] تفسیر القرطبي (١٧/٣٨) [2] تفسیر القرطبي (١٧/٣٨، ٣٩)

اور لوگ اس کو نہیں دیتے ہیں جو مانگتا نہیں ہے۔ اس پر بیدار اور ہوشیار اور مطلع ہوتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان کے مالوں سے زکات کے سوا حق ہے، وہ ان سے صلہ رحمی کرتا ہے، ان سے مہمان کی مہمانی کرتا ہے، ان سے محروم کی اعانت کرتا ہے۔[1] دوسرا قول یہ ہے کہ سائل وہ ہے جو لوگوں سے مانگتا ہے اور محروم وہ ہے جس کے لیے مسلمانوں میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ محروم وہ محارف (یعنی وہ بے بخت ہے جس سے اس کی معاش منہ پھیر گئی ہے) جو دنیا کو طلب کرتا ہے اور وہ اس سے پیٹھ پھیرتی ہے اور لوگوں سے سوال نہیں کرتا۔[2]

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اس کے عطا کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ فاطمہ بنت قیس سے مروی ہے کہ انھوں نے نبی اکرم ﷺ سے اس آیت کا پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک مال میں زکات کے سوا ایک حق ہے اور یہ آیت پڑھی: ﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآىِٕلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ﴾ [البقرة: ١٧٧] ''ساری اچھائی مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنے میں ہی نہیں بلکہ حقیقتاً اچھا وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب اللہ پر اور نبیوں پر ایمان رکھنے والا ہو، جو مال سے محبت کرنے کے باوجود قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والے کو دے، غلاموں کو آزاد کرے، نماز کی پابندی اور زکات کی ادائیگی کرے۔''[3] (أخرجه الترمذي والبيهقي في سننه)

پھر اللہ سبحانہ نے وہ دلیلیں ذکر کی جو اس کی توحید اور وعد و وعید پر دال ہیں۔ فرمایا: ﴿ وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ ﴾ یعنی زمین میں واضح دلیلیں اور ظاہر نشانیاں ہیں: پہاڑ، جنگل، دریا، درخت، نہریں، میوے اور اس میں کافر امتوں کے ہلاک ہونے کے آثار ہیں جنھوں نے اس شے کے تکذیب کی جس کو اللہ کے رسول لائے اور اس کی طرف ان کو بلایا۔ اور دیکھو زمین بچھونے کی طرح بچھائی ہوئی ہے، اس کے لیے جو بھی اس پر ہے اور جو لوگ اس میں چلتے پھرتے ہیں، ان کے لیے اس میں راستے ہیں اور اس کے حصے بنائے گئے ہیں، سو کوئی نرم ہے، کوئی سخت ہے، کوئی شیریں ہے اور کوئی شور ہے۔ اس میں ریزہ ریزہ کی ہوئی کانیں ہیں اور پھیلے ہوئے جانور ہیں جن کی شکلیں مختلف ہیں، ان کی ہیئات اور کام ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں، ان کے علاوہ اس کی کاریگری کے نمونے اور اس کی قدرت اور حکمت اور تدبیر کی چیزیں ہیں۔

پھر فرمایا: ﴿ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴾ یعنی یہ سب نشانیاں موحدوں کے لیے ہیں جو برابر برہانی راستے پر چلے ہیں جو معرفت کی طرف پہنچانے والا ہے۔ چنانچہ وہ دیکھنے والی آنکھوں سے نظر کرنے والے ہیں اور دور تک جانے والی

---

[1] تفسير القرطبي (٣٨/١٧) [2] تفسير القرطبي (٦١٥/٢٣)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٦٠) سنن البيهقي الكبرىٰ (٨٤/٤) اس کی سند میں ''میمون ابو حمزہ'' ضعیف راوی ہے۔

فہموں سے غور کرنے والے ہیں۔ جب کبھی کوئی آیت دیکھ لی تو اس کی تاویل کی وجہ کو پہچان گئے، پھر اپنے یقین پر اور زیادہ پکے ہو گئے۔ خاص کر اللہ پر یقین کرنے والوں کا ذکر تھا۔

اب ان نشانیوں کا ذکر کیا جو خود انسان کے اندر ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَفِيٓ اَنْفُسِكُمْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ یعنی ابتداء میں تمھاری جانوں کی حالت اور اُن کے ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہونے میں وہ نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر اور اس شے کی سچائی پر دلالت کرتی ہیں جس کو اللہ کے رسول لے کر آئے۔ پھر تم بصیرت و عبرت کی آنکھ سے زمین کی طرف اور جو کچھ اس میں ہے اس کی طرف نظر نہیں کرتے اور نفوس کو اور اُن میں جو عجیب و غریب چیزیں ہیں ان کو نہیں دیکھتے تاکہ اس سے خالق و رازق پر استدلال کرو جو اکیلا ہی اللہ ہے اور اس بات پر استدلال کرو کہ اس کا نہ کوئی شریک ہے نہ ضد و ند ہے اور اس پر کہ اس کا وعدہ اور قول حق ہے اور اس پر کہ رسول جو کچھ تمھاری طرف لے کر آئے، وہ ایسا حق ہے جس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں ہے۔

وہ نشانیاں یہ ہیں کہ اللہ پاک نے آدمیوں کو پیدا کیا، اس طرح کہ پہلے نطفہ، یعنی پانی کی بوند تھا، پھر خون بستہ (جما ہوا) بنا، پھر گوشت کا ٹکڑا ہوا، پھر ہڈیاں، یہاں تک کہ ان میں روح پھونکی جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد اُن کی صورتیں اور رنگ اور طبیعتیں اور زبانیں مختلف ہوتی ہیں، پھر خود اُن کی پیدایش اس عجیب الشان صفت پر گوشت و خون و ہڈیاں و اعضائے حواس و مجاری و منافس سے اور اُن کے باطن و ظاہر میں فطرت اور پیدایش کے وہ عجائب ہیں جن میں ذہن حیران رہ جاتے ہیں۔

باری تعالیٰ کی قدرت و حکمت سمجھنے کے لیے تم کو دل کافی ہیں اور وہ عقلیں جو اُن میں مرکوز کی گئی ہیں اور زبانیں اور قوتِ گویائی اور حروف کے مخارج اور جو جو اُن کی ترکیب، ترتیب اور لطائف میں روشن نشانیاں اور قطعی دلیلیں ہیں، اُن سب کی تدبیر کرنے والے اور بنانے والے کی حکمت پر۔ کانوں کو اور آنکھوں کو اور اطراف اور باقی اعضاء کو دیکھو اور ان کے اس کام کے لیے مطیع ہونے کو دیکھو جس کے لیے وہ پیدا کیے گئے ہیں اور مفاصل، یعنی جوڑ اور پیوند جو اعضاء میں ٹھیک بنائے گئے ہیں جن سے مڑتے اور لچک لیتے ہیں، لہٰذا جب ان میں سے کوئی چیز سست ہو جاتی ہے تو ذلت و خواری آ جاتی ہے، یعنی جو عضو جس کام کے لیے بنا ہے جب اس کا کوئی جوڑ سخت ہو گیا، استرخا آ گیا (ڈھیلا ہو گیا) تو جو کام اس سے متعلق تھا وہ اس سے باز رہے گا تو یقینی طور پر ذلت و خواری پیش آئے گی۔ ﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ [المومنون: ١٤] کسی نے کہا ہے کہ زبانوں کا اور صورتوں کا اور رنگوں کا اور طبیعتوں کا اختلاف مراد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد بول و براز کی دو راہیں ہیں، ایک راہ سے کھاتا پیتا ہے اور دو راستوں سے نکلتا ہے۔ (عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''پیشاب و پاخانے کا راستہ''[1] (أخرجه الفريابي و سعيد بن

---

[1] فتح القدير (١١٥/٥)

منصور وغیرهما كما في فتح القدیر))۔ کسی نے کہا ہے کہ ''أنفس'' سے مراد ''ارواح'' ہیں، یعنی تمھارے نفوس میں، کہ جن سے تمھاری حیات ہے، نشانیاں ہیں۔

تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک شے کے ساتھ کی جائے، دوسرے کے ساتھ نہ کی جائے، بلکہ قرآنی الفاظ اس سے زیادہ تر وسیع ہیں (امام رازی رحمہ اللہ نے ایک کتاب ''فوائدِ غیاثیہ'' نامی لکھی ہے، اس میں زمین و آسمان و انسان کی خوب بحث کی ہے اور سارے اعضائے انسانی کی حکمتیں بتائی ہیں اور اچھی طرح سے اللہ پاک کی قدرت و توحید ثابت کی ہے)۔

﴿ وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ﴾ یعنی اور تمھارے رزق کا سبب آسمان میں ہے مراد بارش ہے، کیوں کہ وہ رزق کا سبب ہے۔ امام سعید بن جبیر اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ رزق وہ بارش اور برف ہے جو آسمان سے نازل ہوتی ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ سماء سے مراد بادل ہیں، یعنی بادل میں تمھاری روزی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ سماء سے مراد مطر ہے۔ اس کا نام سماء اس لیے رکھا ہے کہ وہ اس کی طرف سے نازل ہوتی ہے، اسی معنی سے شاعر کا قول ہے: ؎

إِذَا نَزَلَ السَّمَاءُ بِأَرْضِ قَوْمٍ رَعَيْنَاهُ وَإِنْ كَانُوا غِضَابًا

امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے یعنی ''وَعَلَى رَبِّ السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ''، یعنی تمھاری روزی آسمان کے رب پر ہے، کہا: اس کی نظیر یہ آیت ہے: ﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا ﴾ [هود: ٦] ''زمین پر چلنے پھرنے والے جتنے جاندار ہیں سب کی روزیاں اللہ تعالیٰ پر ہیں۔'' یہ قول بعید ہے۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا: ''أَيْ: عِنْدَ اللهِ فِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ''[2] یعنی آسمان میں اللہ کے پاس تمھاری روزی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تمھارے رزق کی تقدیر آسمان میں ہے۔

جمہور نے ﴿ رِزْقُكُمْ ﴾ صیغۂ واحد کے ساتھ پڑھا ہے اور امام یعقوب وغیرہ، (یعنی امام ابن محیصن اور مجاہد رحمہ اللہ) نے ''أَرْزَاقُكُمْ'' بہ صیغۂ جمع پڑھا ہے۔ ﴿ وَمَا تُوعَدُونَ ﴾ یعنی اور جس کا تم کو وعدہ دیا جاتا ہے وہ آسمان ہے مراد جنت اور نار ہے، یہ قول امام مجاہد رحمہ اللہ کا ہے۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ثواب و عقاب۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خیر و شر۔ امام ابن سیرین رحمہ اللہ نے کہا: امر ساعت۔ ربیع بھی اسی کے قائل ہیں۔[3] زیادہ بہتر ہے کہ اس کو اس شے پر محمول کیا جائے جو ان اقوال میں سے عام تر ہے، اس لیے کہ اعمال کی جزاء آسمان میں لکھی ہوئی ہے اور قضا و قدر اسی سے نازل ہوتی ہے اور جنت اور نار اس میں ہیں (جنت تو ساتویں آسمان میں ہے اور نار ساتویں زمین میں ہے۔ یہ ایک قول ہے۔ ہر چیز کی اصل اللہ ہی کو معلوم ہے)۔

---

① تفسير الطبري (٤٢٠/٢٢) ② تفسير القرطبي (٤١/١٧) ③ فتح القدير (١١٣/٥)

پھر اللہ پاک نے اپنے نفسِ مقدس کی قسم کھائی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ﴾ یعنی آسمان وزمین کے رب کی قسم! بے شک وہ شے جس کی تم کو ان آیتوں میں خبر دی ہے وہ البتہ حق ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: بے شک امرِ رزق اور آیات جس کا ذکر کیا گیا ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی وہ شے جو کتاب میں قصہ کی گئی ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: یعنی امرِ ساعت۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴾ میں کلمۂ "ما" مبتداء ہے اور اس کی خبر ﴿ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ﴾ ہے تو اب ﴿ اِنَّهٗ ﴾ کی ضمیر ﴿ مَا ﴾ کی طرف راجع ہوگی۔

پھر اللہ سبحانہ نے فرمایا: ﴿ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ﴾ "أَيْ: كَمِثْلِ نُطْقِكُمْ"۔ کلمۂ "ما" زاید ہے، بعض کوفیوں نے اسی طرح کہا ہے بہ نزعِ خافض منصوب ہے۔ امام زجاج اور فراء رحمہما اللہ نے کہا: جائز ہے کہ بنابر تاکید منصوب ہو۔ "أَيْ: لَحُقَّ حَقًّا مِثْلَ نُطْقِكُمْ"۔ مازنی نے کہا ہے کہ مثل مع "ما" کے بمنزلہ شیء واحد ہے تو فتح پر بنا کیا گیا۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مثل اس لیے مبنی ہے کہ غیر متمکن کی طرف مضاف ہوا ہے۔ یہ سب جمہور کی قراءت کی بنا پر ہے جو بہ نصبِ ﴿ مِثْلَ ﴾ ہے۔ امام ابو عبیدہ اور ابو حاتم رحمہما اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے، حمزہ وغیرہ (یعنی امام کسائی، ابوبکر اور اعمش رحمہم اللہ) نے بہ رفعِ ﴿ مِثْلُ ﴾ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ حَقٌّ ﴾ کی صفت ہے، اس لیے کہ کلمۂ ﴿ مِثْلَ ﴾ کو اضافت کیا گیا ہے، لیکن وہ اضافت سے معرفہ نہیں بنتا ہے جس طرح کہ کلمۂ غیر کا حال ہے۔

امام ابو علی فارسی نے مازنی کے قول کو ترجیح دی ہے، آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے جس شے کی خبر دی اس کی تحقیق کی تشبیہ آدمی کے نطق و وجود کی تحقیق سے دی ہے۔ یہ ویسی بات ہے جو تم کہتے ہو: "إِنَّهُ الْحَقُّ كَمَا أَنَّكَ هٰهُنَا وَإِنَّهُ لَحَقٌّ كَمَا أَنْتَ تَتَكَلَّمُ"، یعنی بے شک وہ بات اپنے صدق و وجود میں اس شے کی طرح ہے جس کو تو بداہتاً پہچانتا ہے۔[2] بعض حکماء نے کہا ہے: معنی یہ ہیں کہ جس طرح ہر انسان خود اپنی زبان سے بولتا ہے اسے ممکن نہیں ہے کہ اپنے غیر کی زبان سے بولے، اسی طرح ہر انسان خود اپنا رزق کھاتا ہے جو اس کی قسمت میں کیا گیا ہے وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ اپنے غیر کا رزق کھائے۔ ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ فَرَّ مِنْ رِزْقِهِ لَتَبِعَهُ كَمَا يَتْبَعُهُ الْمَوْتُ »[3] (أسنده الثعلبي وذكره القرطبي) یعنی اگر تم میں سے کوئی رزق سے بھاگتا تو البتہ وہ اس کے پیچھے ایسے لگتا جیسے اس کو موت پیچھے لگتی ہے۔[4]

---

① فتح القدير (١١٣/٥) ② تفسير القرطبي (٤٣/١٧، ٤٤) فتح القدير (١١٣/٥، ١١٤)

③ الكشف والبيان للثعلبي (١١٥/٩) تفسير القرطبي (٤٢/١٧، ٤٣) المعجم الأوسط للطبراني (٣٦٣/٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥٩٢)

④ فتح البيان (١٩٣/١٣-١٩٩)

حکایت:

امام اصمعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں بصرے کی جامع مسجد سے آیا تو ایک اعرابی اپنے اونٹ پر ظاہر ہوا (اصل کے الفاظ "على قعود له" ہیں "قعود" بالفتح) پس کہا: تو کن لوگوں میں سے ہے؟ میں نے کہا: بنی اصمع کا۔ کہا: تو کہاں سے آیا؟ میں نے کہا: اس جگہ سے جہاں رحمان کا کلام پڑھا جاتا ہے، کہا کہ تو مجھ پر پڑھو۔ تو میں نے ﴿ وَالذّٰرِيٰتِ ﴾ پڑھی، پھر جب میں اس آیت پر پہنچا: ﴿ وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ ﴾ تو بولا: بس، پھر وہ اپنی اونٹنی کی طرف گیا اور اس کو نحر کر ڈالا اور اس کو ان لوگوں پر تقسیم کر دیا جو وہاں آئے اور مارے گئے اور اپنی کمان اور تلوار کی طرف قصد کیا اور اُن کو توڑ ڈالا اور چل دیا۔ پھر جب میں نے رشید کے ساتھ حج کیا اور میں طواف کرنے لگا تو ناگاہ مجھے کوئی شخص نرم آواز سے پکار رہا ہے، میں نے پھر کر دیکھا تو وہی اعرابی ہے، وہ واقعی لاغر ہو گیا تھا اور زرد پڑ گیا تھا، پھر اس نے مجھ کو سلام کیا اور اس سورت کو پڑھنے کے لیے کہا، جب میں اس آیت پر پہنچا تو وہ چلایا اور کہا: "قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا" یعنی ہمارے رب نے ہم سے جو وعدہ کیا ہے مقرر ہم نے اس کو حق پایا۔ پھر کہا: اس کے سوا کچھ اور ہے؟ تو میں نے یہ آیت پڑھی: ﴿ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ﴾ پس وہ چیخا اور کہا: "أَيْ: سُبْحَانَ اللّٰهِ" یہ کون ہے جس نے جلیل کو خفا کیا، تا آنکہ اس نے قسم کھائی، اس کو اس کے قول میں سچا نہ جانا، یہاں تک کہ قسم کی طرف اسے مضطر کیا، اس کلمے کو تین بار کہا اور اسی کے ساتھ اس کی جان نکل گئی۔ رحمه الله تعالىٰ۔ امام زمخشری، نسفی اور امام یافعی رحمہ اللہ نے اس حکایت کو بیان کیا ہے۔[1]

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝٢٤ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝٢٥ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ۝٢٦ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝٢٧ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۭ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝٢٨ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ۝٢٩ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝٣٠

(اے نبی!) کیا آپ کے پاس ابراہیم کے گرامی قدر مہمانوں کی خبر آئی ہے (24) جب وہ اس کے پاس پہنچے تو انھوں نے سلام کہا، ابراہیم نے بھی کہا: (تم پر) سلام ہو، (پھر دل میں کہا تم) لوگ تو اجنبی ہو (25) پھر وہ اپنے اہل کی طرف بڑھا اور ایک موٹا تازہ بچھڑا (بھون کر) لے آیا (26)

---

[1] الكشاف (٤٠٣/٤) تفسير النسفي (١٧٨/٤)

پھر وہ انھیں پیش کیا (اور) کہا: تم کھاتے کیوں نہیں؟ 27 تب اس نے (دل میں) ان سے خوف محسوس کیا۔ انھوں نے کہا: تو نہ ڈر۔ اور انھوں نے اسے بڑے ذی علم بیٹے کی بشارت دی 28 پس ابراہیم کی عورت چیختی چلاتی سامنے آئی، پھر اس نے (تعجب سے) اپنے چہرے پر ہاتھ مارا اور کہا: (میں) بانجھ، بڑھیا (ہوں اولاد کیسے؟) 29 انھوں نے کہا: تیرے رب نے اسی طرح کہا ہے، بلاشبہ وہ بڑی حکمت والا، خوب جاننے والا ہے 30

قصہ ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا:

یہ قصہ سورت ھود اور سورۃ الحجر میں بھی گزر چکا ہے۔ ﴿ اَلْمُکْرَمِیْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے عزت وتکریم کا سامان تیار کیا تھا۔ امام احمد رحمہ اللہ اور علماء میں سے ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ مہمان کے لیے ضیافت واجب ہے اور اس بارے میں سنت وارد ہو چکی ہے جس طرح کہ یہ ظاہر تنزیل ہے۔ ﴿ قَالَ سَلٰمٌ ﴾ میں رفع زیادہ قوی اور ثابت ہے نصب سے، چنانچہ یہ سلام کا جواب افضل ہے اس سلام کرنے سے، اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ﴾ [النساء: ٨٦] ”اور جب تمھیں سلام کیا جائے تو تم اس سے اچھا جواب دو یا انھی الفاظ کو لوٹا دو۔“ اسی لیے خلیل علیہ السلام نے افضل کو اختیار کیا۔

مطلب یہ ہے کہ مہمانوں نے بہ جملہ فعلیہ سلام کیا جو تجدد پر دال ہے اور انھوں نے جملہ اسمیہ سے جواب دیا جو ثبات و استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ خلیل علیہ السلام نے مہمانوں کو دیکھ کر ﴿ قَوْمٌ مُّنْکَرُوْنَ ﴾ اس لیے کہا کہ یہ لوگ فرشتے تھے۔ جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام، ان کے پاس ایسے خوبصورت جوانوں کی صورتوں میں آئے جن پر ایک عظیم ہیبت تھی۔ ﴿ فَرَاغَ اِلٰٓی اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ ﴾ یعنی پھر وہ اپنے گھر میں چھپ کر جلدی گئے اور ایک فربہ بچھڑا اپنے بہترین مال میں سے لے آئے۔ دوسری آیت میں یوں ہے: ﴿ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ ﴾ [ھود: ٦٩] ”اور بغیر کسی تاخیر کے گائے کا بھنا ہوا بچھڑا لے آئے۔“

﴿ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَیْهِمْ ﴾ یعنی پھر اس کو ان کے نزدیک کیا، پھر اپنے بیان میں لطف اور نرمی اور بہتر عرض کر کے کہا: ﴿ اَلَا تَاْکُلُوْنَ ﴾ یعنی تم کیوں نہیں کھاتے۔ اس آیت میں ضیافت کے آداب بتائے ہیں، کیوں کہ وہ بہ سرعت اپنا کھانا لے آئے ایسی جگہ سے کہ مہمانوں کو شعور نہ ہو اور پہلے سے ان کو نہیں بتایا، یوں نہ کہا کہ ہم تمھارے پاس کھانا لاتے ہیں، بلکہ چھپ کر جلدی سے اس کو لے آئے اور اپنے مال میں سے جو بہتر پایا وہ لائے، یعنی جوان فربہ بھنا ہوا بچھڑا۔ پھر اس کو ان کی طرف قریب کیا اور اسے رکھ نہیں دیا اور نہ کہا کہ قریب ہو جاؤ، بلکہ اس کو ان کے سامنے رکھ دیا اور بہ صیغۂ جزم ایسا امر نہ کیا جو سننے والے کو گراں معلوم ہو، بلکہ بطور عرض وتلطف (نہایت نرمی سے)

یوں کہا کہ ﴿ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴾ یعنی تم کیوں نہیں کھاتے، جس طرح کہ کہنے والا کہتا ہے: "اَلْيَوْمَ إِنْ رَأَيْتَ أَنْ تَتَفَضَّلَ وَتُحْسِنَ وَتَتَصَدَّقَ فَافْعَلْ"، یعنی اگر آج تمھاری یہ رائے ہو کہ تم تفضّل و مہربانی و احسان و تصدیق کرو تو کرو۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ﴾ یہ بات محال ہے اس تقریر کی بنا پر جو قصے میں گزری ہے۔ دوسری سورت کے اندر وہ یہ آیت ہے: ﴿ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿٧٠﴾ وَامْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ ﴾ [هود: ۷۰۔ ۷۱] ''اب جو دیکھا کہ ان کے تو ہاتھ بھی اس کی طرف نہیں پہنچ رہے تو ان سے اجنبیت محسوس کر کے دل ہی دل میں ان سے خوف کرنے لگے، انھوں نے کہا: ڈرو نہیں، ہم تو قومِ لوط کی طرف بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ اس کی بیوی جو کھڑی ہوئی تھی وہ ہنس پڑی۔'' یعنی اُن کی بیوی قومِ لوط کے ہلاک ہونے کی خبر سے خوش ہوئیں، اس لیے کہ قومِ لوط اللہ تعالیٰ پر تمرد اور سرکشی کیا کرتی تھی۔

چنانچہ اس وقت فرشتوں نے ان کی بیوی کو اسحاق علیہ السلام کی خوش خبری دی اور اسحاق علیہ السلام کے بعد یعقوب علیہ السلام کی خوش خبری دی۔ ﴿ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴿٧٢﴾ قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴾ [هود: ۷۲۔ ۷۳] ''وہ کہنے لگی: ہائے میری کم بختی! میرے ہاں اولاد کیسے ہو سکتی ہے! میں خود بڑھیا اور یہ میرے خاوند بھی بڑی عمر کے ہیں یہ تو یقیناً بڑی عجیب بات ہے! فرشتوں نے کہا: کیا تو اللہ کی قدرت سے تعجب کر رہی ہے؟ تم پر اے اس گھر کے لوگو! اللہ کی رحمتیں اور اس کی برکتیں نازل ہوں، بے شک اللہ حمد و ثنا کا سزاوار اور بڑی شان والا ہے۔''

اور اسی لیے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہاں یوں فرمایا: ﴿ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴾ جو بشارت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ہے، وہی بشارت اُن کی بیوی کے لیے ہے، اس لیے کہ بچہ ماں باپ دونوں سے ہوتا ہے تو اُن میں سے ہر ایک کو اس کی بشارت دی گئی۔ ﴿ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ ﴾ "أَيْ: فِيْ صَرْخَةٍ عَظِيْمَةٍ وَرَنَّةٍ." [1] ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، عکرمہ، ابو صالح، ضحاک، زید بن اسلم ثوری اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ان کا یہ چیخنا چلانا ان کا یہ کہنا ہے: ﴿ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴾۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا ﴾ "أَيْ: ضَرَبَتْ بِيَدَيْهَا عَلَى جَبِيْنِهَا"۔ (قاله مجاهد و ابن باسط) یعنی پھر انھوں نے اپنے ہاتھ سے اپنی جبیں پر مارا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "لَطَمَتْ"، [2] یعنی تعجب کے لیے طمانچہ مارا جس طرح کہ عورتیں عجیب کام پر تعجب کیا کرتی ہیں اور بولیں ﴿ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ﴾ یعنی میں کیسے جنوں گی! حالانکہ میں بڑھیا ہوں اور میں جوانی کی حالت میں بانجھ تھی، حاملہ نہیں ہوتی تھی۔ ﴿ قَالُوْا كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ اِنَّهٗ

[1] تفسير الطبري (۲۲/ ۴۲٦، ۴۲۷) [2] تفسير الطبري (۲۲/ ۴۲۸، ۴۲۸)

﴿هُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ﴾ یعنی بے شک وہ اپنے اقوال و افعال میں حکیم ہے اسے خوب خبر ہے اس کی کرامت کی جس کے تم مستحق ہو۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع توضیح یہ ہے کہ اللہ پاک نے ابراہیم علیہ السلام کا قصہ اس لیے ذکر کیا ہے کہ یہ بات بیان فرمائی کہ اس نے جن لوگوں کو ہلاک کیا ہے سو اسی تکذیب کے سبب سے ان کو کھپا دیا ہے۔ سوالیہ انداز سے اس قصے کی اور اس کی شان کی تعظیم اور بڑائی ہے اور اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ یہ قصہ اس قبیل سے نہیں ہے کہ جس کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، اس کو جو آپ نے جانا ہے تو وحی کے ذریعے سے جانا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿هَلْ﴾ بہ معنی "قَدْ" ہے جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ﴾ [الدهر: ١] "یقیناً گزرا ہے انسان پر ایک وقت زمانے میں۔" ﴿ضَيْفِ﴾ مصدر ہے اس کا اطلاق واحد، تثنیہ اور جمع پر برابر ہوتا ہے۔

"مُكْرَمِينَ" ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا اکرام کیا گیا ہے اس لیے کہ وہ بنی آدم کی صورت میں فرشتے تھے اور ان کی طرف آئے تھے جیسا کہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں ان کو اکرام کے ساتھ موصوف کیا ہے: ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ﴾ [الأنبياء: ٢٦] "بلکہ وہ اس کے باعزت بندے ہیں۔" امام مجاہد اور مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ان کا اکرام کیا اور اُن پر احسان کیا اور اُن کے سر پر کھڑے رہے، وہ مہمانوں کے سر پر کھڑے نہیں رہا کرتے تھے اور اپنی بیوی کو حکم دیا کہ ان کی خدمت کریں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَكْرَمَهُمْ بِالْعِجْلِ"[2] اُن کے لیے مہمانی کی جلدی کی۔ کسی نے کہا: اس لیے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے مہمان تھے اور ابراہیم علیہ السلام اس وقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک ساری مخلوق سے بڑھ کر کریم اور عزیز تھے اور کریم کے مہمان "مُكْرَمُونَ" ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ بلائے ہوئے نہیں تھے، یعنی بن بلائے خود آ گئے تھے۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

﴿إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ﴾ ظرف میں عامل حدیث ہے: "أَيْ: هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُهُمُ الْوَاقِعُ فِيْ وَقْتِ دُخُولِهِمْ عَلَيْهِ" یعنی کیا آئی تیرے پاس حدیث مہمانوں کی جو اس وقت میں واقع ہونے والی تھی جس میں وہ اُن پر داخل ہوئی، یا اس میں عامل کلمہ ﴿ضَيْفِ﴾ ہے، اس لیے کہ وہ مصدر ہے اور مصدر بہ مشابہتِ فعل عامل ہوتا ہے، یا اس میں عامل "مُكْرَمِينَ" ہے، یا عامل مضمر ہے: "أَيْ: اُذْكُرْ" (كذا ذكره السمين) یعنی یاد کر اس وقت کو جس وقت ابراہیم علیہ السلام پر داخل ہوئے۔

﴿فَقَالُوا سَلَامًا﴾ "أَيْ: نُسَلِّمُ عَلَيْكَ سَلَامًا" چنانچہ مہمانوں نے کہا کہ ہم تجھ پر سلام کرتے ہیں اور

---

[1] تفسير ابن كثير (٤٩٩/٤) [2] فتح القدير (١١٦/٥)

احتمال یہ ہے کہ یہ معنی ہوں: ''فَقَالُوْا كَلَامًا حَسَنًا'' یعنی پس مہمانوں نے ایک اچھی بات کہی، اس لیے کہ اس کے باعث متکلم لغویات کے کہنے سے سلامت رہتا ہے، چنانچہ اس معنی کی بنا پر ﴿سَلٰمًا﴾ مفعول بہ ہوگا۔ ﴿قَالَ سَلٰمٌ﴾ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ''سلام''۔ اس سے مراد تحیت ہے۔ جمہور نے پہلے ''سلام'' کو بہ نصب اور دوسرے کو بہ رفع پڑھا ہے اس بنا پر کہ مبتداء محذوف الخبر ہے: ''أَيْ: عَلَيْكُمْ سَلَامٌ'' یعنی میرا سلام تم پر دائم اور مستمر رہے۔ رفع کی طرف عدول کیا اس قصد سے کہ جملہ اسمیہ دوام وثبات کا فائدہ دیتا ہے، بخلاف جملہ فعلیہ کے کہ وہ صرف تجدد وحدوث کے لیے ہوتا ہے، اسی لیے اہلِ معانی نے کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا سلام ملائکہ کے سلام سے ابلغ ہے۔ پہلے کا نصب بنا بر مفعول مطلق ہے فعل مقدر سے جیسا کہ مذکور ہوا ہے۔ کسی نے دونوں کو بہ رفع پڑھا ہے اور کسی نے بہ نصب پڑھا ہے اور اہلِ کوفہ نے سوائے عاصم کے ﴿سَلٰمًا﴾ بہ کسرِ سین پڑھا ہے۔[1] کسی نے دونوں جگہ ''سَلْمٌ'' پڑھا ہے۔

﴿قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ﴾ کا رفع بنا بر خبر مبتدائے محذوف ہے: ''أَيْ: أَنْتُمْ قَوْمٌ مُنْكَرُوْنَ'' یعنی تم ایک اوپرے لوگ ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ انھوں نے یہ اپنے دل میں کہا اور اُن سے اس کا خطاب نہ کیا، اس لیے کہ یہ اکرام کے خلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ان کو اس لیے اوپرا سمجھا کہ انھوں نے سلام کی ابتداء کی، حالانکہ ان کی قوم میں اس بات کا دستور نہیں تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان میں وہ شے دیکھی جو بعض بشری صورتوں کے مخالف تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ ان فرشتوں کو ان غیر صورتوں پر دیکھا جن کو وہ پہچانتے تھے۔ کسی نے کہا: اس لیے کہ وہ اذن طلب کیے بغیر داخل ہوئے۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ تم غرباء ہو، یعنی مسافر ہو ہم تم کو نہیں پہچانتے، اس لیے تم اپنی پہچان کراؤ کہ تم کون ہو؟ اس کے سوا اور قول بھی ہیں۔

﴿فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ﴾ أَيْ: عَدَلَ'' یہ قول امام زجاج رحمہ اللہ کا ہے،[2] یعنی اپنے اہل کی طرف مائل ہوئے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کی طرف گئے اپنے مہمانوں سے چھپ کر۔ یہ دونوں معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ اہل سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس گائے، بیل تھے، ان کا عام مال یہی تھا، جیسا کہ خطیب نے کہا ہے۔ تو اب ﴿اَهْلِهٖ﴾ سے مراد اُن کے خادم ہوں گے، جیسے چرواہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''رَاغَ وَارْتَاغَ أَيْ: طَلَبَ وَمَا ذَا تُرِيْغُ أَيْ: تُرِيْدُ وَتَطْلُبُ وَرَاغَ إِلَى كَذَا مَالَ إِلَيْهِ سِرًّا وَحَادَ''۔ اس کی تفسیر سورۃ الصافات میں گزر چکی ہے۔[3]

﴿فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ﴾ یعنی پھر ابراہیم علیہ السلام اپنے مہمانوں کے پاس ایک بچھڑا لائے جس کو ان کے لیے بھونا تھا، جیسا کہ سورت ہود میں ﴿بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ﴾ [هود: ٦٩] ہے۔ صحاح میں کہا ہے کہ ''عِجْلٌ وَلَدُ بَقَرٍ'' ہے یعنی گائے کا بچہ اور ''عَجُوْلٌ'' اس کے مثل ہے اور جمع ''عَجَاجِلُ'' ہے اور مؤنث ''عَجَلَةٌ'' ہے۔[4] کسی نے کہا بعض لغات میں ''عَجَلُ شَاةٍ'' ہے، یعنی بعض لغات میں بکری کو ''عِجلٌ'' کہتے ہیں۔ یہاں کلام میں حذف ہے۔ فائے ''فصیحہ''

[1] تفسير القرطبي (٤٥/١٧) [2] معاني القرآن (٥٤/٥) [3] رقم الآية (٩١) [4] مختار الصحاح (٤٦٧/١)

اس پر دال ہے: "أَيْ: فَذَبَحَ عِجْلًا فَحَنَذَهُ فَجَاءَ بِهِ" یعنی پھر ایک بچھڑا ذبح کیا، اس کو بھونا اور اس کو لائے۔

﴿ فَقَرَّبَهٗۤ اِلَيْهِمْ ﴾ یعنی پھر اس بچھڑے کو ان کی طرف قریب کیا اور اس کو ان کے آگے رکھا اور ان پر کھانا پیش کیا اور کہا: ﴿ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴾ سوالیہ انداز انکار کے لیے ہے، یہ اس لیے ہے کہ جب اس کو ان کی طرف قریب کیا اور انھوں نے اس میں سے نہ کھایا تو کہا: کیا تم کھاتے نہیں ہو؟ یا یہ کلمۂ ﴿ اَلَا ﴾ عرض کے لیے ہے، یا تخصیص کے لیے، یعنی تم کیوں نہیں کھاتے ہو۔

﴿ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ﴾ "أَيْ: أَحَسَّ" یعنی پھر احساس کیا اور اپنے جی میں ان کی طرف سے خوف محسوس کیا، جب انھوں نے اس کھانے میں سے نہ کھایا جو اُن کی طرف قریب کیا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ "أَوْجَسَ" بہ معنی "أَضْمَرَ" ہے، یعنی ان سے خوف کو پوشیدہ کیا اور یہ ان کو اس وقت واقع ہوا جب انھوں نے ان کے کھانے کا احترام نہ کیا۔ لوگوں کے اخلاق میں سے یہ بات ہے کہ جس شخص نے کسی انسان کے کھانے سے کھا لیا تو وہ اس کی طرف سے بے خوف ہو گیا اور نہ کھانا اس کے برخلاف ہے۔

ابراہیم علیہ السلام نے یہ خیال کیا کہ وہ شر کے لیے آئے ہیں خیر کے لیے نہیں آئے۔ شیخ زادہ نے کہا کہ جو انکار بچھڑے کو قریب کرنے سے پہلے ہوا، جیسا کہ سورت ھود میں گزرا ہے، وہ اس معنی میں ہے کہ ان کو یہ علم نہیں تھا کہ وہ کون سے شہر سے ہیں اور جو انکار کے بعد ہوا تو وہ اس معنی میں ہے کہ ان کو یہ علم نہ تھا کہ وہ ان کے پاس خیر کے ارادے سے آئے ہیں یا شر کے ارادے سے، کیوں کہ جو شخص کھانا کھانے سے باز رہا تو اس کے شر سے خوف کیا جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے دل میں یہ بات آئی کہ وہ فرشتے ہیں، پھر جب فرشتوں نے ان پر خوف کی علامات کو دیکھا جو اُن پر ظاہر ہوئیں تو کہا: ﴿ لَا تَخَفْ ﴾ یعنی آپ ڈریں نہیں اور اُن کو خبر دی کہ وہ فرشتے ہیں اور اللہ پاک کی طرف سے ان کے پاس بھیجے گئے ہیں۔ ﴿ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴾ اور اُن کو ایک ایسے لڑکے کی خوش خبری دی جو کثیر علم والا ہو گا جب وہ مردوں کے مرتبے کو پہنچے گا۔ جس لڑکے کی ان کو بشارت دی گئی جمہور کے نزدیک وہ اسحاق علیہ السلام ہیں۔ صرف امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اسماعیل علیہ السلام ہیں۔[1] یہ قول اس آیت سے مردود ہے: ﴿ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ ﴾ [الصافات: ١١٢] اس بات کی تحقیق سورت ھود میں اس طرح سے گزر چکی ہے اس میں نظر کرنے والا کسی اور بات کا محتاج نہ ہو گا۔

﴿ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ ﴾ یعنی پھر اُن کی بیوی سارہ علیہا السلام چیختی ہوئی آئیں۔ یہ آنا کچھ اس معنی میں نہیں ہے کہ ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف آئیں، یہ تو ایسا ہے جیسا تم کہتے ہو: "أَقْبَلَ يَشْتِمُنِي أَيْ: أَخَذَ فِي شَتْمِي" یعنی فلاں لگا مجھے گالی دینے۔ امام فراء رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔ ﴿ صَرَّةٍ ﴾ بہ معنی "صَيْحَةٌ"

---

[1] تفسير الطبري (٤٢٦/٢٢)

وَضَجَّةٌ" ہے، یعنی وہ چیختی ہوئی آئیں، اس لیے کہ جب ان کو لڑکے کی خوش خبری دی گئی تو انھوں نے خونِ حیض کی حرارت پائی۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ صَرَّةٍ ﴾ آدمیوں کی جماعت ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اَلصَّرَّةُ: الصَّيْحَةُ وَالضَّجَّةُ وَالصَّرَّةُ: اَلْجَمَاعَةُ وَالصَّرة اَلشِّدَّةُ مِنْ حَرْبٍ وَغَيْرِهٖ"۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "إِنَّهَا الرَّنَّةُ وَالتَّأَوَّهُ"، یعنی صرہ رونے کو اور آہ آہ کرنے کو کہتے ہیں۔ ﴿ فِیْ صَرَّةٍ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال: "أَيْ: كَائِنَةً فِيْ صَرَّةٍ" اور جب آنے سے یہ مراد ہو کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آنا تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ گھر کے کسی کونے میں تھیں اور اُن کی طرف نظر کر رہی تھیں، پھر وہ صیحہ میں یا ضجہ یا لوگوں کی جماعت میں آئیں جو فرشتوں کی باتیں سنتی تھی۔

﴿ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا ﴾ یعنی پھر اپنے کھلے ہوئے ہاتھ سے اپنے چہرے پر مارا جیسا کہ تعجب کے وقت عورتیں کرتی ہیں۔ امام مقاتل اور کلبی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اپنی انگلیوں کو اپنی پیشانی پر مارا تعجب کے طور پر۔[1] "صك" کے معنی کسی شے کے ساتھ کسی چوڑی شے کو مارنا کے ہیں۔ "يُقَالُ: صَكَّهُ أَيْ: ضَرَبَهُ". ﴿ وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ﴾ یعنی اور بولیں: کیوں کر جنوں گی حالانکہ میں تو ایک بانجھ بڑھیا ہوں۔ اپنی بڑی عمر کی وجہ سے بچہ ہونے کو بعید سمجھا اور اس وجہ سے کہ وہ بانجھ تھیں اور اُن کے کوئی بچہ نہ ہوتا تھا۔

﴿ قَالُوْا كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ ﴾ یعنی فرشتے بولے کہ ہم نے جیسا تجھے کہا ہے یہ تیرے رب نے کہا ہے، اس لیے تو اس میں شک نہ کر اور نہ اس سے تعجب کر، کیوں کہ جس شے کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا وہ ضرور ہونے والی ہے اور یہ ہم نے اپنی طرف سے نہیں کہا۔ اس وقت ان کی عمر ننانوے برس کی تھی اور ابراہیم علیہ السلام سو برس کے تھے اور بشارت اور ولادت میں ایک برس کا فاصلہ تھا۔[2] (ذكره القرطبي) اس کا بیان پورے طور پر پہلے گزر چکا ہے۔ جملہ ﴿ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴾ تعلیل ہے ماقبل کی، یعنی بے شک وہ اپنے افعال و اقوال میں حکمت والا ہے اور ہر شے کو جاننے والا ہے، ان میں سے اس بچے کا پیدا کرنا ہے۔ اس کی حکمت کو وہی خوب جانتا ہے۔ بالجملہ جب فرشتوں نے یہ بات کہی تو گویا کسی نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس کے بعد کیا کہا؟ تو یہ اس سوالِ مقدر کا جواب ہے۔[3]

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿۳۳﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۴﴾ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۳۷﴾

---

[1] فتح القدير (١١٧/٥) [2] تفسير القرطبي (٤٧/١٧) [3] فتح البيان (١٣/١٩٩-٢٠٢)

ابراہیم نے کہا: اچھا تو تمھارا مقصد کیا ہے، اے قاصدو! (فرشتو؟) 31 انھوں نے کہا: بلاشبہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں 32 تاکہ ہم ان پر مٹی کے پتھر (کھنگر) برسائیں 33 جو آپ کے رب کے ہاں حد سے گزر جانے والوں کے لیے نامزد ہو چکے ہیں 34 پھر وہاں جو بھی مومن تھے، ہم نے انھیں نکال لیا 35 اور ہم نے وہاں مسلمانوں کا صرف ایک ہی گھرانہ پایا 36 اور ہم نے وہاں ان لوگوں کے لیے ایک نشانی چھوڑی جو دردناک عذاب سے خوف کھاتے ہیں 37

قومِ لوط کی ہلاکت کے لیے فرشتوں کی آمد:

اللہ پاک نے خلیل علیہ السلام کی طرف سے دوسری آیت میں یوں خبر دی ہے: ﴿ فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ۝ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴾ [هود: ٧٤۔ ٧٥] ''جب ابراہیم کا ڈر خوف جاتا رہا اور اسے بشارت بھی پہنچ چکی تو ہم سے قومِ لوط کے بارے میں کہنے سننے لگے۔ یقیناً ابراہیم بہت تحمل والے نرم دل اور اللہ کی جانب جھکنے والے تھے۔ اے ابراہیم! اس خیال کو چھوڑ دیجیے' آپ کے رب کا حکم آ پہنچا ہے اور ان پر نہ ٹالے جانے والا عذاب ضرور ہی آنے والا ہے۔''

اور یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴾ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے کہا: پھر تمھارا کیا حال ہے اور تم کس بارے میں آئے ہو؟ فرشتوں نے کہا: بے شک ہم مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں، اُن کی مراد قومِ لوط ہے، تاکہ ہم اُن پر مٹی کے پتھر برسائیں جو تیرے رب کے نزدیک حد سے بڑھ جانے والوں کے لیے نشان کیے گئے ہیں۔ یعنی وہ اس کے پاس اُن کے ناموں کے ساتھ لکھے گئے ہیں، ہر پتھر پر اس کے صاحب کا نام ہے۔ چنانچہ سورۃ العنکبوت میں یوں فرمایا ہے: ﴿ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۚ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ۚ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۚ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴾ [العنکبوت: ٣٢] ''(ابراہیم علیہ السلام نے) کہا: اس میں تو لوط ہیں، فرشتوں نے کہا: یہاں جو ہیں ہم انھیں بہ خوبی جانتے ہیں۔ لوط کو اور اس کے خاندان کو سوائے اس کی بیوی کے ہم بچا لیں گے، البتہ وہ عورت پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔''

اور یہاں اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یہ لوگ لوط علیہ السلام اور ان کے اہلِ بیت ہیں۔ ﴿ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾۔ اس آیت سے اس شخص نے حجت پکڑی ہے جو ان معتزلہ کی رائے کی طرف گیا ہے جو مسمائے ایمان و اسلام (یعنی مومن اور مسلم) کے درمیان فرق نہیں کرتے، ان کی حجت کی وجہ یہ ہے کہ ان پر مومنین اور مسلمین کا اطلاق کیا ہے۔ یہ استدلال ضعیف ہے، اس لیے کہ یہ لوگ قوم

مومنین تھے اور ہمارے نزدیک ہر مومن مسلم ہے اور اس کا عکس نہیں تو خصوصیت حال کی وجہ سے یہاں دونوں نام متفق ہو گئے اور یہ ہر حال میں لازمی نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتَرَكْنَا فِيهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ یعنی اور ہم نے اس عذاب وسزا ومٹی کے پتھروں کے سبب سے جوان پر نازل کیے گئے اس کو عبرت کر دیا اور ان کی جگہ کو ایک بدبودار اور ناپاک چھوٹا سا دریا بنا دیا۔ چنانچہ اس میں ان ایمان والوں کے لیے ایک عبرت ہے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

"خطب" بمعنی شان و قصہ ہے، یعنی ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں سے کہا کہ اے اللہ کی طرف سے بھیجے ہوؤ! تمھاری شان اور قصہ کیا ہے اور اس بشارت کے علاوہ وہ کیا کام ہے جس کے لیے تم کو بھیجا گیا ہے؟ فرشتوں نے کہا ہے کہ بے شک ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں، یعنی کافر قوم کی طرف، اس سے مراد لوط علیہ السلام کی قوم ہے، تا کہ ہم ان پر آسمان سے پتھر نازل کریں، یعنی تا کہ ان کو پتھروں سے رجم کریں، ایسے پتھر جو مٹی سے بنے ہیں۔ وہ مٹی جو متحجر ہے، یعنی آگ سے پکائی گئی ہے۔ اس سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ لواطت کرنے والے کا پتھروں سے رجم کرنا واجب ہے۔

﴿ مُسَوَّمَةً ﴾ منصوب ہے اس بنا پر کہ ﴿ حِجَارَةً ﴾ کی صفت ہے، یا حال ہے اس ضمیر سے جو جار و مجرور میں مستکن ہے یا ﴿ حِجَارَةً ﴾ سے اس لیے جار و مجرور سے اس کی صفت کی گئی ہے، یعنی ایسے پتھر جن پر نشانیاں لگائی گئی ہیں جن سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ مخطط تھے (ان پر لکھا گیا تھا) سیاہی اور سفیدی سے۔ کسی نے کہا ہے کہ سیاہی اور سرخی سے۔ کسی نے کہا کہ وہ اس بات کے ساتھ معروف تھے کہ وہ عذاب کے پتھر ہیں۔ کسی نے کہا کہ ہر پتھر پر اس شخص کا نام لکھا ہوا تھا جو اس سے ہلاک ہوگا۔

﴿ عِنْدَ رَبِّكَ ﴾ ﴿ مُسَوَّمَةً ﴾ کا ظرف ہے، یعنی ایسے پتھر جو تیرے رب کے نزدیک علامت کیے گئے تھے ﴿ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴾ یعنی اُن لوگوں کے لیے جو گمراہی اور فجور میں حد سے بڑھنے والے ہیں، اس طرح سے کہ مردوں سے بدفعلی کرتے ہیں۔[2] امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مسرفین" بمعنی "مشرکین" ہے۔ شرک گناہوں میں سے اسرف اور اعظم ہے۔ امام سدی اور مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قومِ لوط کی تعداد چھے لاکھ تھی۔ چنانچہ جبرائیل علیہ السلام نے اپنا پَر زمین کے نیچے گھسایا، پھر اُن کی بستیوں کو اُکھاڑا، وہ چار بستیاں تھیں اور انھیں اوپر کو اٹھایا، یہاں تک کہ آسمان والوں کی آوازیں سنیں، پھر اُن کو الٹا دیا، پھر ان پر پتھر چھوڑے، چنانچہ پتھروں نے ان لوگوں کا پیچھا کیا جو ان میں سے اپنی زمین سے باہر تھے اور اُن کے مسافروں کا۔

---

[1] تفسير ابن كثير (٣٠٠/٤) [2] فتح القدير (١١٧/٥، ١١٨)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ اللہ پاک کی طرف سے ایک کلام ہے، یعنی جس وقت ہم نے قومِ لوط کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا تو ہم نے ہر اس شخص کو نکال لیا جو قومِ لوط کی بستیوں میں تھا اور اس کی قوم میں سے تھا جو اس پر ایمان لانے والے تھے۔ یہ حرفِ فاء فصیحہ ہے کئی جملوں کا اظہار کر رہا ہے جو یہاں حذف کر دیے گئے ہیں، اس بات پر اعتماد کر کے کہ دوسری جگہوں میں ان کا ذکر ہو چکا ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے: "فَبَاشَرُوْا مَا أُمِرُوْا بِهِ فَأَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا بِقَوْلِنَا" ﴿ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ ﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾۔ ﴿ فِيْهَا ﴾ کی ضمیر قومِ لوط کی بستی کی طرف راجع ہے گو بستی کا ذکر نہیں کیا گیا، لیکن سیاق اس پر دال ہے۔ بیت سے مراد اہلِ بیت ہے۔ محاورے میں بیت شریف بولتے ہیں اور اس سے مراد اہلِ بیت لیتے ہیں، یعنی پھر ہم نے ان بستیوں میں سوائے ایک گھر کے اور کوئی مسلمانوں کا گھر نہ پایا۔ کہا ہے کہ یہ لوط علیہ السلام کے اہلِ بیت ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوط علیہ السلام اور اُن کی دو بیٹیاں۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ تیرہ تھے۔[1] اسی کی طرح امام اصفہانی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ اسلام اللہ پاک کے حکم کی فرمانبرداری اور اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہے، اس کے حکم کی اطاعت اور فرمانبرداری کا نام اسلام ہے۔ چنانچہ ہر مومن مسلم ہے، اسی کے متعلق یہ آیت ہے: ﴿ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا ﴾ [الحجرات: ١٤] "دیہاتی لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ آپ کہہ دیجیے کہ درحقیقت تم ایمان نہیں لائے لیکن تم یوں کہو کہ ہم اسلام لائے۔"

اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام اور ایمان کے درمیان فرق واضح فرما دیا ہے اس حدیث شریف میں جو کئی طریق سے صحیحین وغیرہما میں ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ تو اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور تو نماز قائم کرے اور تو زکات دے اور تو بیت اللہ کا حج کرے اور تو رمضان کے روزے رکھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کے رسولوں پر، قدر پر اس کے خیر پر اور اس کے شر پر ایمان لائے۔[2] چنانچہ دونوں کے فرق میں مرجع وہی ہے جو صادق و مصدوق نے فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ اہلِ علم کے بیان کردہ مضطرب ومختلف اور متناقض فرق کی طرف بالکل توجہ نہیں دینا چاہیے۔

اب رہا اس کے متعلق اختلاف جو کتابِ عزیز میں اسلام و ایمان کو جن جگہوں میں استعمال کیا گیا ہے تو یہ اختلاف لغوی معانی اور استعمالاتِ عربیہ کے اعتبار سے ہے اور واجب یہ ہے کہ شرعی حقیقت کو لغوی معانی پر مقدم رکھا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣١٢، ٣٣١٣) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠) صحيح مسلم (٨)

جائے اور شرعی حقیقت وہی ہے جس کی رسول اللہ ﷺ نے ہم کو خبر دی ہے اور جس کے ساتھ آپ ﷺ نے سائل کے سوال کا جواب دیا۔

امام محلی رحمہ اللہ نے ﴿ غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے: "وَهُمْ لُوْطٌ وَابْنَتَاهُ وُصِفُوْا بِالْإِيْمَانِ وَالْإِسْلَامِ أَيْ: مُصَدِّقُوْنَ بِقُلُوْبِهِمْ عَامِلُوْنَ بِجَوَارِحِهِمُ الطَّاعَاتِ"[1] اس سے مراد لوط علیہ السلام اور ان کی دونوں بیٹیاں ہیں جن کو ایمان و اسلام کے ساتھ متصف کیا گیا ہے، یعنی وہ جو اپنے دلوں سے تصدیق کرنے والے اور اپنے اعضاء و جوارح کے ساتھ عمل کرنے والے ہیں۔ انتہیٰ. امام کرخی رحمہ اللہ نے اس کی شرح میں کہا ہے کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے جو امام خطابی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہی ہے کہ مسلم کبھی مومن ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا اور مومن ہمیشہ مسلم ہے۔ چنانچہ یہ اخص ہے، یعنی مومن و مسلم میں عام و خاص مطلق کی نسبت ہے، ہر مومن مسلم ہے اور ہر مسلم مومن نہیں ہے۔ اس حدیث سے آیات و احادیث کی تاویل مستقیم ہو جاتی ہے۔

﴿ وَتَرَكْنَا فِيْهَا آيَةً ﴾ یعنی ان کافروں کو ہلاک کرنے کے بعد ان بستیوں میں ایک علامت چھوڑ رکھی گئی جو اس عذاب پر دلالت کرتی ہے جو ان کو پہنچا۔ یہ نشانی وہ پتھر ہیں، یا پتھر تہ بتہ، یا پانی سیاہ بدبودار جو ان کی زمین سے نکلا، یا آثار عذاب کے ان بستیوں میں، کیوں کہ وہ ظاہر ہیں۔ کسی نے کہا یہ نشانی چھوڑ رکھی گئی، وہ خود وہی اجاڑ بستیاں ہیں۔ ﴿ لِلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْأَلِيْمَ ﴾ یعنی وہ ہر اس شخص کے لیے نشانی ہے جو اللہ کے عذاب سے ڈرتا ہے، وہ خواہ اس وقت کے لوگوں میں سے ہو یا ان کے بعد آنے والے لوگوں میں سے ہو اور وہ ان جیسا کام نہ کرے۔ خاص کر ان لوگوں کا ذکر کیا کہ مواعظ سے نصیحت یہی لوگ حاصل کرتے ہیں اور یہی نشانیوں میں سوچ بچار کرتے ہیں نہ کہ ان کے علاوہ لوگ جو اللہ کے عذاب سے نہیں ڈرتے۔ یہ لوگ مشرک ہیں جو بعث (مرکر دوبارہ جی اٹھنا) اور وعدہ و وعید کی تکذیب کرنے والے ہیں۔[2] (كذا في فتح البيان)

وَفِيْ مُوْسٰۤى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾
فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ
فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿۴۰﴾ وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ
الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴿۴۱﴾ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ
كَالرَّمِيْمِ ﴿۴۲﴾ وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۴۳﴾
فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۴۴﴾

[1] تفسير الجلالين (٦٩٤/١) [2] فتح البيان (٢٠٢/١٣-٢٠٥)

فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ﴿45﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿46﴾

اور موسیٰ (کے قصے) میں (عظیم نشانی ہے) جب ہم نے اسے فرعون کی طرف ایک کھلے معجزے کے ساتھ بھیجا 38 تو وہ اپنی قوت کے بل پر (حق سے) پھرا اور کہا: (موسیٰ) جادوگر یا دیوانہ ہے 39 پھر ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا اور انھیں سمندر میں پھینک دیا، جبکہ وہ قابلِ ملامت (کام کرتا) تھا 40 اور عاد (کے قصے) میں (نشانی ہے) جب ہم نے ان پر بے خیر و برکت ہوا بھیجی 41 وہ جس چیز پر سے بھی گزرتی اُسے گلی سڑی ہڈی کے مانند ریزہ ریزہ کر ڈالتی تھی 42 اور ثمود (کے قصے) میں (نشانی ہے)، جب ان سے کہا گیا: تم ایک وقت (تین دن) تک فائدہ اٹھاؤ 43 پھر انھوں نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی تو انھیں کڑک نے آ پکڑا جبکہ وہ دیکھ رہے تھے 44 پھر نہ تو ان میں اٹھنے کی سکت تھی اور نہ وہ بدلہ ہی لینے والے تھے 45 اور ان سے پہلے (ہم نے) قومِ نوح کو (ہلاک کیا)، بلاشبہ وہ لوگ نافرمان تھے 46

اقوامِ عالم کے عبرت سے لبریز واقعات:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: قولہ تعالیٰ: ﴿ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴾ "أَيْ: بِدَلِيْلٍ بَاهِرٍ وَحُجَّةٍ قَاطِعَةٍ" یعنی اور موسیٰ علیہ السلام کے حال میں نشانی ہے جب ہم نے اس کو واضح دلیل اور قطعی حجت دے کر بھیجا۔ ﴿ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ ﴾ یعنی فرعون نے تکبر اور عناد کی وجہ سے اس ظاہر حق سے منہ موڑا جس کو موسیٰ علیہ السلام اس کے پاس لے کر آئے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "تَعَزَّزَ بِأَصْحَابِهِ" یعنی اپنے ساتھیوں کے ساتھ زور آور ہوا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "غَلَبَ عَدُوُّ اللّٰهِ عَلٰى قَوْمِهِ" یعنی اللہ کا دشمن اپنی قوم پر غالب ہوا۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "بِجُمُوْعِهِ الَّتِيْ مَعَهُ" یعنی اس نے اپنی جماعتوں کے بل پر جو اُس کے ساتھ تھیں اعراض کیا۔ پھر امام ابن زید رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴾ [1] [هود: ٨٠] "کاش کہ مجھ میں تم سے مقابلہ کرنے کی قوت ہوتی یا میں کسی زبردست کا آسرا پکڑ پاتا۔" پہلے معنی قوی ہیں اس آیت کی دلیل سے: ﴿ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [الحج: ٩] "جو اپنے پہلو موڑنے والا بن کر، اس لیے کہ اللہ کی راہ سے بہکا دے۔" یعنی حق سے اعراض کرنے والا، حق سے تکبر کرنے والا۔

[1] تفسير الطبري (٤٣١/٢٢) تفسير ابن كثير (٣٠٠/٤)

﴿ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴾ یعنی تیرا امر خالی نہیں ہے اس شے میں جس کو تو لے کر میرے پاس آیا ہے اس سے کہ تو جادوگر ہو یا دیوانہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ﴾ یعنی ہم نے اس کو اور اس کے لشکر والوں کو پکڑا، پھر ہم نے ان کو دریا میں ڈال دیا۔ ﴿ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴾ "أَيْ: وَهُوَ مَلُوْمٌ كَافِرٌ فَاجِرٌ مُعَانِدٌ"، یعنی اس حال میں کہ وہ ملامت کیا ہوا، کافر و فاجر و معاند تھا۔

پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴾ یعنی فاسد کرنے والی ہوا جو کسی شے کا نتیجہ نہیں دیتی۔ یہ قول امام ضحاک اور قتادہ رحمہ اللہ وغیرہما کا ہے۔[1] اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: ﴿ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴾ یعنی کسی شے کو جس پر وہ آئے، یعنی ان چیزوں میں سے جن کو ہوا فاسد کرتی ہے، اسے نہیں چھوڑتی مگر اس کو ہلاک ہونے والی شے کی طرح اور بوسیدہ کر دیتی ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ ہوا تسخیر کی گئی ہے دوسری سے، یعنی دوسری زمین سے، پھر جب اللہ تعالیٰ نے عاد کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا تو ریح کے خازن کو حکم دیا کہ ان پر ایک ہوا چھوڑے جو عاد کو ہلاک کر ڈالے۔ عرض کی: اے رب! کیا میں بقدر بیل کے نتھنے کے چھوڑ دوں۔ جبار تبارک وتعالیٰ نے اس سے فرمایا: نہیں اتنی ہوا تو زمین کو اور جو اس پر ہے، سب کو الٹ پلٹ دے گی۔ لیکن تو ان کو بقدر انگوٹھی کے چھوڑ دے، چنانچہ یہ ہے وہ جو اللہ عزوجل نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: ﴿ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴾[2] (هذا الحديث رفعه منكر والأقرب أن يكون موقوفا على عبد الله بن عمرو من زاملتيه اللتين أصابهما يوم اليرموك. والله أعلم)

سعید بن مسیب رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ "الجنوب"،[3] یعنی ریح عقیم جنوبی ہوا ہے۔ صحیح میں بروایتِ شعبہ عن الحکم عن مجاہد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: « نُصِرْتُ بِالصَّبَا وَأُهْلِكَتِ الْعَادُ بِالدَّبُوْرِ »[4] صبا شرقی ہوا ہے اور دبور غربی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ریحِ عقیم غربی ہوا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ حَتّٰى حِيْنٍ ﴾ یعنی "إِلَى وَقْتِ فَنَاءِ آجَالِكُمْ"۔ یعنی جب ثمود سے کہا گیا کہ تم اپنی اجلوں کے فنا کے وقت تک عیش کر لو۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ ﴾ [حمٓ السجدة: ١٧] "رہے ثمود، سو ہم نے ان کی بھی راہبری کی، پھر بھی انھوں نے ہدایت پر اندھے پن کو ترجیح دی جس بنا پر انھیں (سراپائے) ذلت کے عذاب کی کڑک نے پکڑ لیا۔"

اسی طرح اس جگہ فرمایا ہے: ﴿ وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴾ یہ یوں ہوا کہ انھوں نے تین

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٣٠٠) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٣١٣) اس کی سند میں "دراج" ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسیر الطبري (٢٢/٤٣٣) [4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٩٨٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٠٠)

دن عذاب کا انتظار کیا، پھر چوتھے دن کی صبح عذاب آیا، پھر نہ وہ بھاگ سکے اور نہ اٹھ سکے اور نہ وہ اس بات پر قادر ہوئے کہ جس عذاب میں مبتلا تھے اسے بدل سکیں۔ ﴿ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴾ یعنی ہم نے ان سے پہلے قومِ نوح کو ہلاک کر ڈالا، بے شک وہ ایک فاسق قوم تھے۔ یہ سب قصے متعدد سورتوں میں بہت جگہ تفصیل سے گزر چکے ہیں۔[1] واللّٰہ سبحانہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

﴿ وَفِيْ مُوْسٰٓى ﴾ معطوف ہے ﴿ فِيْهَآ ﴾ پر باعادۂ جار، تقدیر یہ ہے: "وَتَرَكْنَا فِي قِصَّةِ مُوسَى آيَةً" یعنی ہم نے موسیٰ کے قصے میں ایک نشانی رکھی۔ امام سمین رحمہ اللہ نے اس وجہ کو واضح کیا ہے۔ یا معطوف ہے: "وَفِي الْأَرْضِ" پر، تقدیر یہ ہے: "وَفِي الْأَرْضِ وَفِي مُوسَى آيَاتٌ" یعنی زمین میں اور موسیٰ میں نشانیاں ہیں۔ یہ قول امام فراء، ابن عطیہ اور زمخشری رحمہ اللہ کا ہے۔[2] امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وجہ انتہائی بعید ہے، قرآن کو ایسی وجہ سے منزہ کیا جائے۔[3]

یہ بھی جائز ہے کہ "جعلنا" مقدر سے متعلق ہو، اس لیے کہ ﴿ وَتَرَكْنَا ﴾ اس پر دال ہے۔ کسی نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ وَتَرَكْنَا ﴾ پر معطوف ہو بر طریق قول قائل کے: ع

عَلَفْتُهَا تِبْنًا وَّمَاءً بَارِدًا

"أَيْ: وَسَقَيْتُهَا مَاءً بَارِدًا" تقدیر یہ ہے: "وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً وَجَعَلْنَا فِي مُوسَى آيَةً"۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "وجعلنا" کے مضمر کرنے کی کچھ حاجت نہیں ہے، حالانکہ یہ ممکن ہے کہ ﴿ وَتَرَكْنَا ﴾ مجرور میں عامل ہو۔[4] پہلی وجہ ہی زیادہ بہتر ہے۔ اس کے علاوہ محض تکلف ہے جس کی ضرورت نہیں ہے۔ کلمۂ ﴿ اِذْ ﴾ محذوف سے متعلق ہے، یا ﴿ تَرَكْنَا ﴾ سے منصوب ہے، لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔

﴿ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴾ سے مراد حجتِ ظاہرہ و واضح ہے، یعنی عصا اور وہ آٹھ نشانیاں جو اس کے ساتھ تھیں۔

"تولّٰی" بمعنی اعراض ہے اور "رکن" بمعنی جانب ہے۔ یہ قول امام اخفش رحمہ اللہ کا ہے۔ معنی یہ ہیں: "أَعْرَضَ بِجَانِبِهِ"، كَمَا فِيْ قَوْلِهٖ: ﴿ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ﴾ [بني إسرائيل: ٨٣] "اس نے منہ موڑ لیا اور کروٹ بدل لی۔" امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "رکن شيء" جانبِ اقوی ہے اس شے کی۔ "وَيَأْوِيْ إِلَى رُكْنٍ شَدِيْدٍ أَيْ: عِزٍّ وَمَنَعَةٍ"۔[5] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ بِرُكْنِهٖ ﴾ "بِقَوْمِهٖ"۔[6] امام ابن زید اور مجاہد رحمہما اللہ وغیرہما

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣٠٠/٤، ٣٠١) [2] تفسير القرطبي (٤٩/١٧) الكشاف (٤٠٦/٤) [3] البحر المحيط (١٣٩/٨)

[4] البحر المحيط (١٣٩/٨) [5] تفسير القرطبي (٤٩/١٧) [6] تفسير الطبري (٤٣١/٢٢)

نے کہا ہے کہ "رکن" اس جماعت اور اس کے لشکر ہیں جن سے وہ قوی ہوتا تھا۔ اسی باب سے یہ آیت ہے: ﴿ أَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴾ [هود: ۸۰] "یا میں کسی زبردست کا آسرا پکڑتا۔" "أَيْ: عَشِيْرَةٍ وَمنعة" کسی نے کہا کہ ﴿ رُكْنِ ﴾ نفسِ قوت ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ اسی کے قائل ہیں اس معنی سے عنترہ کا قول ہے:

فَمَا أَوْهَى مَرَاسُ الْحَرْبِ رُكْنِي وَلَكِنْ مَا تَقَادَمَ مِنْ زَمَانِي [1]

یعنی لڑائی کی ممارست (ہمیشگی کرنا) نے مجھے کمزور نہیں کیا، لیکن میرے زمانے نے جو پرانا ہو گیا ہے۔

غرضیکہ فرعون نے اپنے زور پر منہ موڑا اور موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا کہ ﴿ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴾ چنانچہ ان سے جو احوال دیکھے تو ان میں دو باتوں پر موسیٰ علیہ السلام کی تردید کی کہ وہ جادوگر ہیں یا دیوانے ہیں۔ چنانچہ یہاں پر کلمۂ ﴿ اَوْ ﴾ اپنے باب پر ہے، یعنی سننے والے پر کسی شے کا مبہم کر دینا یا شک پیدا کرنے کے لیے ہے۔ اپنے آپ کو اس شخص کے مرتبے میں ٹھہرایا جو اپنے کام میں شک کرنے والا ہے، اس سے غرض اپنی قوم پر ملمع کرنا ہے اور اس کو مغالطہ دینا ہے، کیوں کہ وہ یہ جانتا تھا کہ جو خارقِ عادت امور اس نے دیکھے وہ نہ کسی ساحر کے ہاتھ پر ظاہر ہوتے ہیں نہ ان کو کوئی مجنون کر سکتا ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَوْ ﴾ بمعنی واو ہے، اس لیے کہ اس نے یہ دونوں باتیں کہی ہیں اور تردد نہیں کیا۔ امام مورج اور فراء رحمہما اللہ بھی اس کے قائل ہیں۔ [2]

دیکھو اللہ پاک نے ایک اور جگہ اس کا یہ قول نقل فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴾ [الأعراف: ۱۰۹] "یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے۔" دوسری جگہ یوں کہا ہے: ﴿ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴾ [الشعراء: ۲۷] "بے شک تمھارا یہ رسول جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے دیوانہ ہے۔" اور ﴿ اَوْ ﴾ بمعنی واو آتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴾ [الدهر: ۲٤] "اور اُن میں سے کسی گناہ گار یا ناشکرے کا کہا نہ مان۔" لوگوں نے قولِ مذکور کے کہنے والے پر رد کیا ہے کہ کہا ہے کہ اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ یہاں ﴿ اَوْ ﴾ کو واو کے معنی میں ٹھہرائیں۔ رہیں دونوں آیتیں تو وہ اس بات پر دال نہیں ہیں کہ فرعون نے ساحر و مجنون معاً کہا ہو۔ وہ جو مفید ہیں تو اس کی کہ اس نے عام طور پر دونوں کو کہا ہے بجائے اس کے کہ دونوں معاً ہوں۔ یا ساحر ایک وقت میں کہا ہو اور مجنون دوسرے وقت میں کہا۔ (كذا ذكر السمين)

غرضیکہ جب لعین نے موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی تو عذاب کا مستحق ہوا، اسی لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یوں فرمایا: ﴿ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴾ یعنی پھر ہم نے اس کو اور اس کے لشکروں کو پکڑا اور ہم نے ان کو دریا میں پھینک دیا اور وہ سب کے سب ڈوب گئے۔ جملہ ﴿ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال، یعنی

---

[1] تفسير القرطبي (۱۷/۴۹) [2] اللباب في علوم الكتاب (۱۷/۹۳) فتح القدير (۵/۱۲۰)

اس حال میں کہ فرعون اس شے کو لانے والا تھا جس پر اس کو ملامت کی جاتی تھی۔ جب اس نے ربوبیت کا دعویٰ کیا اور رسولوں کو جھٹلایا اور اللہ تعالیٰ کا منکر ہوا اور اس کی نافرمانی میں حد سے بڑا۔ ﴿ مُلِيْمٌ ﴾ کا اسناد جو فرعون کی طرف ہے اس میں مجاز ہے جس طرح ﴿ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴾ [القارعة: ٧] میں ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "أَلَامَ الرَّجُل فَعَلَ مَا يَسْتَحِقُّ عَلَيْهِ اللَّوْمَ، وَاللَّوْمُ: اَلْعَذْلُ، تَقُوْلُ: لَامَهُ عَلَى كَذَا، مِنْ بَابِ قَالَ: وَلَوْمُهُ أَيْضًا فَهُوَ مَلُوْمٌ وَاللَّائِمَةُ الْمَلَامَةُ"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴾ یعنی ہم نے عاد کی ہلاکت کے قصے میں ایک نشانی چھوڑی، جبکہ ہم نے ان پر "ریحِ عقیم" یعنی وہ ہوا بھیجی جس میں نہ کسی طرح کی خیر تھی نہ برکت، نہ وہ درختوں کو باردار کرتی تھی اور نہ پانی کو اٹھاتی تھی۔ وہ تو عذاب اور ہلاکت کی ہوا تھی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "ریح عقیم" نکباء ہے۔[1] نکباء ہر وہ ہوا ہے جو دو ہواؤں کے درمیان چلے۔ اس کو نکباء اس لیے کہتے ہیں کہ ہواؤں کے چلنے کی جو معروف جگہیں ہیں ان سے وہ منحرف اور مائل ہوتی ہے۔ ہوائیں بہت سی ہیں ایک ہوا نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "ریح عقیم" وہ سخت ہوا ہے جو کسی شے کو باردار نہیں کرتی۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ وہ درختوں کو باردار نہیں کرتی اور نہ بادل کو اٹھاتی ہے۔[2] اس ہوا میں اختلاف کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جنوبی ہوا تھی۔

ظاہر تر یہ ہے کہ دبور تھی نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان کی دلیل سے: « نُصِرْتُ بِالصَّبَا وَأُهْلِكَتْ عَادٌ بِالدَّبُوْرِ ».[3] "عقم" کا یہاں معنی مذکور کے لیے تبعیت کے طریق پر اشارہ کیا گیا ہے، یعنی بے خیر و برکت ہوا۔ ہوا میں جو یہ صفت ہے کہ پانی کو نہیں اٹھاتی اور درختوں کو پھل دار کرنے سے مانع ہوتی ہے اس کی تشبیہ عورت کی اس صفت سے دی ہے کہ وہ حمل سے منع کرتی ہے۔ پھر ہوا کو عقیم کہا گیا اور اس سے یہ معنی مراد لیے گئے اس قرینے سے کہ ہوا کو اس صفت سے موصوف کیا گیا ہے۔ یا ہوا کا نام عقیم اس لیے رکھ دیا کہ اس نے عاد کو ہلاک کر ڈالا اور ان کی جڑ کاٹ دی۔ (كما أفاده الكرخي)۔ شہاب میں ہے کہ "عقیم" کی اصل "یبس" یعنی وہ خشکی جو اثر قبول کرنے سے مانع ہے۔[4] (كما قاله الراغب)۔

"عقیم" بروزن "فعیل" بمعنی فاعل ہے یا بمعنی مفعول ہے۔ پھر جب اس ہوا نے عاد کو ہلاک کیا اور اس کی نسل کاٹ دی تو اس ہلاک کرنے کی تشبیہ عدمِ حمل سے لی نسل کو لے جانے کے سبب سے جو اس میں ہے۔ یہاں یہی مراد ہے۔

پھر اللہ پاک نے اس ہوا کا وصف بیان کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴾

---

① الدر المنثور (٦٢٢/٧) ② تفسير الطبري (٤٣٣/٢٢)

③ اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ ④ حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٩٨/٨)

یعنی ایسی ہوا ہے جو کسی شے کو نہیں چھوڑتی جس پر گزرتی ہے۔ ان کی جانوں، چوپایوں، مالوں کو مثل رمیم کے کر ڈالا، یعنی اس ہلاک کی ہوئی شے کی طرح جو بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہونے والی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رمیم وہ خشک روئیدگی ہے جو روندی گئی۔ امام سدی اور ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوٹی ہوئی خاک۔ امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ راکھ۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ گھاس جس کو جانوروں نے روند کر ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ اصل کلمہ اس محاورے سے ہے کہ "رَمَّ الْعَظْمُ، إِذَا بَلِيَ فَهُوَ رَمِيْمٌ، وَالرِّمَّةُ، اَلْعِظَامُ الْبَالِيَةُ وَالْجَمْعُ رِمَمٌ وَرِمَامٌ" کسی شاعر نے کہا ہے:

تَرَكَتْنِي حِيْنَ كَفَّ الدَّهْرُ مِنْ بَصَرِيْ وَإِذْ بَقِيْت كَعَظْمِ الرِّمَّةِ الْبَالِيْ

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "كَالشَّيْءِ الْهَشِيْمِ" روئیدگی جب سوکھ جاتی ہے اور ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے تو اس کو "رَمِيْمٌ وَهَشِيْمٌ" کہتے ہیں۔[1] تقدیر یہ ہے: "مَا تُتْرُكُ شَيْءٌ إِلَّا مَجْعُوْلًا كَالرَّمِيْمِ"۔ چنانچہ جملہ ﴿ تَذَرُ ﴾ کے مفعول ثانی کی جگہ میں ہے اور امام ابو حیان رحمہ اللہ نے اس کو حال ٹھہرایا ہے،[2] یہ وجہ ظاہر نہیں ہے۔

﴿ وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴾ یعنی ہم نے ثمود کے قصے میں ایک نشانی چھوڑی جب ہم نے ان سے کہا اس کے بعد کہ انھوں نے اونٹنی کی کھونچیں کاٹ ڈالیں کہ تم اپنی زندگی کا مزہ لے لو اس دنیا میں اپنے ہلاک ہونے تک، یعنی اپنی اصل کے پورا ہونے تک۔ اجل کی یہ مدت تین دن کی تھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ﴾ [هود: ٦٥] "تم اپنے گھروں میں تین دن تک تو رہ سہہ لو۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ ﴾ یعنی پس انھوں نے اللہ پاک کے حکم کی بجا آوری سے تکبر کیا۔ یہ ترتیب اخباری ہے ورنہ حقیقت میں ان کا تکبر تو اس سے پہلے تھا کہ ان کو ہلاکت کا وعدہ دیا جو ﴿ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴾ سے مراد ہے بنا بر تفسیر ﴿ حِيْنٍ ﴾ کی جو مذکور ہوئی، اس لیے کہ اس سے وہ مدت مراد ہے جو ان کی اجلوں سے باقی رہ گئی تھی۔ ﴿ اَمْرِ رَبِّهِمْ ﴾ سے مراد وہ امر ہے جو سورت ہود میں مذکور ہے: ﴿ وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴾ [هود: ٦٤] "اور اے میری قوم والو! یہ اللہ کی بھیجی ہوئی اونٹنی ہے جو تمھارے لیے ایک معجزہ ہے اب تم اسے اللہ کی زمین میں کھاتی ہوئی چھوڑ دو اور اسے کسی طرح کی ایذا نہ پہنچاؤ ورنہ فوری عذاب تمھیں پکڑے گا۔"

﴿ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ ﴾ یعنی پھر تین دن گزرنے کے بعد ان کو صاعقہ نے پکڑا۔ یہ پکڑنا اونٹنی کی کھونچیں کاٹنے کے بعد تھا۔ صاعقہ ہر ہلاک کرنے والا عذاب ہے۔ جمہور نے "صاعقة" پڑھا ہے اور عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ (یعنی امام حمید، ابن محیصن، مجاہد اور کسائی) نے "صَعْقَةٌ" پڑھا ہے "صَعَقَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ" کے مصدر سے۔ "صَعْقَةٌ" بہ معنی "مَرَّةٌ" ہے اور "صَاعِقَةٌ" اس آگ کو بھی کہتے ہیں جو آسمان سے نازل ہوتی ہے جس میں سخت گرج ہوتی ہے۔[3]

---

[1] تفسير القرطبي (١٧/٥٠، ٥١) [2] البحر المحيط (١٣٩/٧) [3] تفسير القرطبي (٥١/١٧)

سورۃ البقرہ میں اور کئی جگہ ”صاعقة“ پر کلام گزر چکا ہے۔[1]

جملہ: ﴿ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال، یعنی ان کو صاعقہ نے پکڑا اس حال میں کہ وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، اس لیے کہ اس کا نزول دن میں ہوا تھا۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ جس عذاب کا ان کو وعدہ دیا تھا اس کا انتظار کرتے تھے، مگر پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

﴿ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ ﴾ یعنی پھر وہ عذاب کے نزول کے وقت کھڑے ہونے پر قادر نہ ہوئے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”من نهوض“[2] یعنی پھر وہ اس پچھڑنے سے نہ اُٹھے۔ مطلب یہ ہے کہ کھڑے ہونے سے عاجز ہوئے، بھاگنے کا کیا ذکر۔ اسی کی مثال یہ آیت ہے: ﴿ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴾ [هود: ٦٧] ”اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے رہ گئے۔“

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ﴾ اور نہ تھے وہ اللہ کے عذاب سے ممتنع ہونے والے بہ سبب اپنے غیر کے ان لوگوں میں سے جن کو اللہ تعالیٰ نے ہلاک کیا۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے کسی نے بھی عذاب کو دور نہیں کیا۔ یا یہ معنی ہیں کہ ان کو عذاب کا مقابلہ کرنا ممکن نہ ہو، اس لیے کہ انتصار کے معنی مقابلے کے ہیں۔

﴿ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ﴾ (امام حمزہ، کسائی اور ابو عمرو رحمہ اللہ نے ﴿ قَوْمَ ﴾ کے جر سے پڑھا ہے: ”أَيْ: وَفِيْ قَوْمِ نُوْحٍ آيَةٌ“۔ باقی قراء نے بہ نصب پڑھا ہے)۔[3] ﴿ قَوْمَ ﴾ مفعول ہے ”أَهْلَكْنَا“ کا یا ”نَبَذْنَا“ کا یا ”اُذْكُرْ“ کا، اس کے سوا نصب کی تین وجہ اور ہیں۔ اور جر کی قراءت میں چار وجہ ہیں۔ امام سمین رحمہ اللہ نے ان کو ذکر کیا ہے طول کی وجہ سے ان کا ذکر نہیں کیا، یعنی ہلاک کر ڈالا ہم نے نوح کی قوم کو اُن ہلاک کردہ شدہ لوگوں سے پہلے، کیوں کہ ان کا زمانہ فرعون، عاد اور ثمود کے زمانے سے پہلے ہے۔ ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴾ ما قبل کی علت ہے، یعنی ان کو اس لیے ہلاک کیا کہ بے شک وہ اللہ کی اطاعت سے نکلنے والی ایک قوم تھے۔[4] (كذا في فتح البيان)

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۝47 وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ۝48 وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝49 فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝50 وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝51

اور ہم نے آسمان کو قوت کے ساتھ بنایا اور بلاشبہ ہم بہت وسعت والے ہیں (47) اور ہم نے زمین کو بچھایا، تو ہم کیا ہی خوب بچھانے والے ہیں! (48) اور ہم نے ہر (جاندار) چیز سے

---

[1] رقم الآية (٥٥) [2] تفسير الطبري (٢٢/٤٣٧) [3] فتح القدير (٥/١٢٠) [4] فتح البيان (١٣/٢٠٥-٢٠٨)

جوڑے پیدا کیے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو ⑭ لہٰذا تم اللہ کی طرف دوڑو، بلاشبہہ میں تمھیں اس کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں ⑮ اور تم اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بناؤ، بلاشبہہ میں تمھیں اس کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں ⑯

توحیدِ باری تعالیٰ کے دلائل کا ذکر:

حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تنبیہ فرماتا ہے عالم علوی وسفلی کے پیدا کرنے پر۔ ﴿ وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا ﴾ یعنی ہم نے آسمان کو ایک محفوظ بلند چھت بنا دیا۔ ﴿ بِاَيْىٍد ﴾ یعنی قوت کے ساتھ۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، قتادہ اور ثوری رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔[1] ﴿ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴾ اور یقیناً ہم نے اس کے اطراف کو وسیع اور فراخ کر دیا ہے اور ہم نے اس کو بغیر ستون کے بلند کر دیا، یہاں تک کہ وہ بلند ہو گیا جیسا کہ وہ ہے۔ ﴿ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا ﴾ اور زمین کو ہم نے بچھونا کر دیا۔ مخلوقات کے لیے ﴿ فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴾ یعنی اور ہم نے اس کو اس کے اہل کے لیے گہوارہ کر دیا۔

﴿ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ ﴾ یعنی ساری مخلوقات جوڑے جوڑے ہے۔ زمین و آسمان، شب و روز، سورج اور چاند، خشکی اور دریا، روشنی اور تاریکی، ایمان اور کفر، موت اور حیات، شقاوت اور سعادت، جنت اور نار، یہاں تک کہ حیوانات و نباتات اور اسی لیے یوں فرمایا ﴿ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ یعنی تاکہ تم اس بات کو جان لو کہ خالق ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ ﴿ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ﴾ یعنی پس اس کی طرف پناہ پکڑو اور اپنے کاموں میں اس پر بھروسا کرو۔ ﴿ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ بے شک میں تمھارے لیے اس کی طرف سے کھول کر ڈرانے والا ہوں۔ ﴿ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ﴾ یعنی اس کے ساتھ کسی شے کو مت شریک کرو۔ ﴿ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾[2]

فتح البیان کا بیان:

﴿ بِاَيْىٍد ﴾ "أَيْ: بِقُوَّةٍ وَقُدْرَةٍ"[3] (قالہ ابن عباس رضی اللہ عنہما) یعنی ہم نے آسمان کو قوت و قدرت سے بنایا۔ جمہور نے ﴿ اَلسَّمَآءَ ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے بر اشتغال۔ تقدیر یہ ہے: "وَبَنَيْنَا السَّمَاءَ بَنَيْنٰهَا" اور کسی نے (یعنی ابو السماک اور ابن مقسم رحمہ اللہ نے) بہ رفع "اَلسَّمَاءُ" پڑھا ہے بنا بر ابتداء۔[4] "موسع" بہ معنی "ذُو الْوُسْعِ وَالسَّعَةِ" ہے، یعنی بے شک ہم آسمان کے اور اس کے علاوہ اور چیزوں کے پیدا کرنے میں صاحب وسعت ہیں۔ ہم اس سے عاجز نہیں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وسع بہ معنی طاقت و قدرت سے ماخوذ ہے، یعنی بے شک ہم البتہ قادر

[1] تفسير الطبري (٢٢/٤٣٨) [2] تفسير ابن كثير (٤/٣٠١)
[3] تفسير الطبري (٢٢/٤٣٨) تفسير القرطبي (١٧/٥٢) [4] فتح القدير (٥/١٢٠)

ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "أَوسَعَ الرَّجُلُ" بہ معنی "صَارَ ذَا سَعَةٍ وَغِنًى" یعنی وہ شخص فراخی اور آسودگی والا ہو گیا۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ ہم آسمان کو واسع اور فراغ کرنے والے ہیں اس بنا پر کہ یہ حالِ موسعہ ہوگا۔ پہلے اللہ پاک نے خبر دی کہ اس نے اپنی قوت اور قدرت سے آسمان کو بنایا، پھر یہ خبر دی کہ اس کو واسع کر دیا۔ چنانچہ زمین آسمان کی نسبت ایسی ہے جیسے جنگل میں ایک حلقہ ہو۔

﴿ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا ﴾ کو جمہور نے بہ نصب پڑھا ہے بنا بر اشتغال۔ اور کسی نے (یعنی امام ابو السماک اور ابن مقسم رحمہ اللہ نے) بہ رفع پڑھا ہے بنا بر ابتداء۔[1] جمہور کی قراءت زیادہ مناسب ہے، کیوں کہ اس سے پہلے جملہ اشتغال کا جملہ فعلیہ پر عطف ہے۔ معنی یہ ہیں: "بَسطَنَاهَا وَمَهَدنَاهَا وَمَدَدنَاهَا"۔ پس فرش کنایہ ہے بسط وتسویہ سے، یعنی ہم نے زمین کو بچھایا اور اس کو پھیلایا۔ ﴿ فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴾ "أَي: نَحنُ" یعنی ہم اچھے بچھانے والے ہیں، محاورے میں بولتے ہیں: "مَهَدتُّ الفِرَاشَ بَسَطتُهُ وَوَطَّأتُهُ" یعنی میں نے بچھونے کو بچھایا اور اسے نرم کر دیا۔ "تمهيد الأمور" کے معنی اموز کا سیدھا کرنا اور اصلاح کرنا ہیں۔

﴿ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ ﴾ یعنی اور ہم نے ہر شے سے دو صنف پیدا کیے، یا دو امر متقابل، یا دو قسمیں نر اور مادہ، جنگل و دریا، میٹھا کڑوا، جن وانس، خیر وشر، نرم وسخت، گرمی وسردی، حق وباطل، شیریں وترش، سرور وغم۔ ان کے سوا اور اشیاء ہیں جن کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ پس ان میں ہر دو زوج ہے اور اللہ تعالیٰ فرد ہے، یعنی اکیلا ہے اس کا کوئی مثل نہیں ہے۔ ﴿ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ یعنی یہ سب ہم نے ایسا پیدا کیا تاکہ تم یاد کرو تو پہچان جاؤ کہ وہ ہر شے کا خالق ہے اور اللہ تعالیٰ کی توحید پر استدلال کرو اور اس کے وعدے اور وعید کے صدق وراستی پر استدلال کرو۔

﴿ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ﴾ یعنی اے محمد! تو ان سے کہہ دے کہ جب بات یوں ہے تو اللہ کی طرف اس طرح سے بھاگو کہ اپنے ذنوب، کفر اور معاصی سے توبہ کرو، اس کے عذاب سے اس کے ثواب کی طرف بھاگو اس طرح سے کہ اس کی اطاعت کرو اور اس کی نافرمانی مت کرو۔ کسی نے کہا ہے کہ مکہ سے نکل جاؤ۔ حسین بن فضل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کے سوا ہر شے سے احتراز کرو، پس جو کوئی غیر اللہ کی طرف بھاگا تو وہ اس سے ممتنع نہیں ہوا[2] یعنی غیر اللہ کی طرف بھاگ کر اللہ سے نہیں بچ سکتا۔ کسی نے کہا ہے کہ شیطان کی اطاعت سے رحمان کی اطاعت کی طرف بھاگو۔ کسی نے کہا ہے کہ جہل سے علم کی طرف بھاگو۔ یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم نے یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ یکتا ہے اس کا کوئی نظیر نہیں ہے تو اس کی طرف بھاگو اور اس کی توحید کرو اور اس کے ساتھ کسی شے کو شریک مت کرو۔ پھر امرِ مذکور کی یہ علت ذکر فرمائی: ﴿ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ یعنی تم اللہ کی طرف بھاگو، اس لیے کہ بے شک میں تمھارے لیے اللہ کے پاس سے "منذر بیّن الانذار" ہوں، یعنی تم کو صاف صاف

[1] فتح القدير (١٢١/٥) [2] تفسير القرطبي (٥٣/١٧، ٥٤)

ڈراتا ہوں۔ بالجملہ پہلے تو اللہ کی طرف بھاگنے کا امر کیا، پھر جن چیزوں سے بھاگنا واجب ہے ان میں سے سب سے بڑی شے کی تصریح کر کے اس سے نہی کی، یعنی شرک باللہ۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَا تَجۡعَلُوۡا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ﴾ پھر اس نہی کی علت بیان فرمائی: ﴿ اِنِّیۡ لَكُمۡ مِّنۡهُ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴾ اس کی تکرار تاکید کے لیے ہے اور وعید میں اطالت (کلام کو دراز کرنا) زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

یا یوں کہو کہ پہلی دفعہ تو ترکِ ایمان و طاعت پر مرتب ہے اور دوسری دفعہ اشراک پر مرتب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تکرار صرف اس لیے کی گئی ہے کہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ ایمان نفع نہیں دیتا مگر عمل کے ساتھ (مگر یہ قول درجۂ اعتبار سے ساقط ہے، کیوں کہ کسی اہلِ حق کا سلف و خلف سے یہ مذہب نہیں ہے کہ عمل کے بغیر ایمان ایسا ہے جیسا عمل بغیر ایمان کے۔ یہ قول تو خوارج کا ہے۔ از مصحح سلمہ اللہ) جس طرح کہ عمل نفع دیتا ہے مگر ایمان کے ساتھ اور یہ بات کہ ایمان کے پاس کامیاب اور نجات پانے والا صرف وہی ہوتا ہے جو دونوں میں جمع کرنے والا ہے۔[1]

كَذٰلِكَ مَاۤ اَتَى الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا قَالُوۡا سَاحِرٌ اَوۡ مَجۡنُوۡنٌ ﴿۵۲﴾ اَتَوَاصَوۡا بِهٖ ۚ بَلۡ هُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ ﴿۵۳﴾ فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ فَمَاۤ اَنۡتَ بِمَلُوۡمٍ ﴿۵۴﴾ وَّذَكِّرۡ فَاِنَّ الذِّكۡرٰى تَنۡفَعُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۵﴾ وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾ مَاۤ اُرِیۡدُ مِنۡهُمۡ مِّنۡ رِّزۡقٍ وَّمَاۤ اُرِیۡدُ اَنۡ یُّطۡعِمُوۡنِ ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الۡقُوَّةِ الۡمَتِیۡنُ ﴿۵۸﴾ فَاِنَّ لِلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ذَنُوۡبًا مِّثۡلَ ذَنُوۡبِ اَصۡحٰبِهِمۡ فَلَا یَسۡتَعۡجِلُوۡنِ ﴿۵۹﴾ فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ یَّوۡمِهِمُ الَّذِیۡ یُوۡعَدُوۡنَ ﴿۶۰﴾

اسی طرح ان سے پہلے لوگوں کے پاس جو بھی رسول آیا تو انھوں نے بس یہی کہا کہ (یہ) جادوگر ہے یا دیوانہ 52 کیا وہ ایک دوسرے کو اس بات کی وصیت کرتے آئے ہیں؟ (نہیں) بلکہ وہ (سب) لوگ سرکش ہیں 53 لہٰذا آپ ان سے پھر جائیں تو آپ پر کچھ ملامت نہیں 54 اور آپ نصیحت کرتے رہیں، اس لیے کہ بے شک نصیحت مومنوں کو نفع دیتی ہے 55 اور میں نے جن اور انسان اسی لیے تو پیدا کیے ہیں کہ وہ میری ہی عبادت کریں 56 میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا، اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں 57 بلاشبہہ اللہ تو خود رزق دینے والا

---

[1] فتح البیان (۱۳/۲۰۸_۲۱۰)

ہے، بڑی قوت والا، نہایت طاقت ور ہے 58 پھر بے شک جن لوگوں نے ظلم کیا ان کے نصیب میں (عذاب) ہے، جیسا ان کے ساتھیوں کے نصیب میں (تھا)، لہٰذا وہ مجھ سے (عذاب) جلدی نہ مانگیں 59 چناں چہ کافروں کے لیے ان کے اس دن (کے آنے) سے تباہی ہے، جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے 60

ہر قوم کا اپنے رسول کی تکذیب کے لیے یکساں انداز:

اللہ تعالیٰ اپنے نبی اکرم ﷺ کو تسلی دیتا ہے کہ جیسا ان مشرکوں نے کہا ہے ویسا ہی اگلے تکذیب کرنے والوں نے اپنے اپنے رسول سے کہا تھا: ﴿ كَذٰلِكَ مَاۤ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴾ یعنی جب بھی ان لوگوں کے پاس جو ان سے پہلے تھے کوئی رسول آیا تو انھوں نے کہا کہ جادوگر ہے یا دیوانہ۔ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ﴾ کیا ان کے بعض بعض کو اس کی وصیت کرتے آئے ہیں کہ جو اگلا کہہ چکا، وہی بعد والا کہتا ہے۔ ﴿ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴾ یعنی بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں جو حد سے بڑھنے والے ہیں۔ ان کے دل باہم مشابہ ہو گئے ہیں، لہٰذا ان کے بعد والے نے ویسا ہی کہا جیسا کہ ان کا اگلا کہہ چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ﴾ یعنی "پس اے محمد! تو ان سے اعراض کر۔" ﴿ فَمَاۤ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴾ یعنی اب ہم تجھے اس پر ملامت نہ کریں گے۔ ﴿ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ اور تو نصیحت کیے جا پس نصیحت کرنے سے وہی دل فائدہ پائیں گے جو یقین کرنے والے ہیں۔

پھر اللہ جل جلالہ نے فرمایا: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ یعنی میں نے جو جن وانس کو پیدا کیا ہے تو اس لیے کہ ان کو اپنی عبادت کا امر کروں نہ اس لیے کہ مجھے ان سے کوئی مطلب ہے۔ علی بن ابی طلحہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے: "إِلَّا لِيُقِرُّوْا بِعِبَادَتِي طَوْعًا أَوْ كَرْهًا" یعنی مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کا خوشی یا ناخوشی سے اقرار کریں۔ یہ قول امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[1] امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: "إِلَّا لِيَعْرِفُوْنَ" یعنی مگر اس لیے کہ وہ مجھے پہچانیں۔ امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا: "إِلَّا لِلْعِبَادَةِ" یعنی مگر عبادت کے لیے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: عبادت میں سے وہ ہے جو فائدہ دیتی ہے اور اس میں سے وہ جو فائدہ نہیں دیتی۔ ﴿ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ [الزمر: ٣٨] "اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان وزمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یقیناً وہ یہی جواب دیں گے کہ اللہ نے۔" یہ اقرار کرنا ان کی طرف سے عبادت ہے، حالانکہ یہ شرک کے ساتھ ان کو کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد مومنین ہیں۔[2]

---

[1] تفسیر الطبري (٢٢/٤٤٤، ٤٤٥)
[2] تفسیر ابن كثير (٤٠٢/٤)

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴾ امام احمد رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے یوں پڑھایا ہے: "إِنِّي لَأَنَا الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ"۔[1] (ورواہ أبو داود والترمذي والنسائي من حديث إسرائيل وقال الترمذي: حسن صحيح) آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو پیدا کیا، تاکہ اسی وحدہ لاشریک لہ کو پوجیں۔ پس جس نے اس کی اطاعت کی تو اسے تمام تر جزا دے گا اور جس نے اس کی نافرمانی کی تو اس کو سخت تر عذاب کرے گا۔ اور یہ خبر دی کہ وہ ان کی طرف محتاج نہیں ہے، بلکہ وہی اپنے سارے حالات میں اس کی طرف محتاج ہیں۔ چنانچہ وہ ان کا خالق و رازق ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابنِ آدم! تو میری عبادت کے لیے فارغ ہو جا، میں تیرا سینہ غنا سے بھر دوں گا اور تیرا فقر بند کر دوں گا اور اگر تو نہ کرے گا تو تیرا سینہ شغل سے بھر دوں گا اور تیرا فقر بند نہ کروں گا۔''[2] (ورواه الترمذي وابن ماجه من حديث عمران بن زائدة وقال الترمذي: حسن غريب)

امام احمد رحمہ اللہ نے سلام بن شرحبیل سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے حبہ اور سواء رضی اللہ عنہما کو سنا، جو خالد کے بیٹے ہیں، وہ کہتے تھے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ کوئی کام کر رہے تھے یا کوئی بناء بنا رہے تھے۔ امام ابومعاویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کسی شے کی صلاح کر رہے تھے، پس ہم نے آپ کی اعانت کی اس کام میں۔ پھر جب آپ ﷺ فارغ ہوئے تو ہمارے لیے دعا کی اور فرمایا کہ جب تک تمھارے سر ہلتے ہیں تم رزق سے ناامید مت ہونا۔ پس بے شک انسان کو اس کی ماں جب جنتی ہے تو وہ سرخ ہوتا ہے اور اس پر پوست نہیں ہوتا، پھر اللہ اس کو عطا کرتا ہے اور اس کو رزق دیتا تھا۔[3] بعض کتبِ الٰہیہ میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اے ابنِ آدم! میں نے تجھ کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا سو تو کھیل کود مت کر اور میں تیرے رزق کا کفیل ہوا سو تو مشقت میں پڑ اور مجھ کو طلب کر تو تو مجھے پائے گا، پس اگر تو نے مجھے پا لیا تو تو نے ہر شے پا لی اور اگر میں تجھ سے فوت ہو گیا تو تجھ سے ہر شے فوت ہو گئی اور میں تیری طرف ہر شے سے زیادہ دوست ہوں۔''

﴿ فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ ﴾ یعنی پس بے شک ان لوگوں کے لیے جنھوں نے ظلم کیا عذاب کا ایک حصہ ہے، ان کے اصحاب کے حصے کی طرح سو وہ اس کو جلدی نہ مانگیں، کیوں کہ وہ تو ضرور واقع ہونے والا ہے۔ چنانچہ خرابی ہے ان لوگوں کے لیے جو اس دن کے منکر ہوئے جس کا ان کو وعدہ دیا جاتا ہے، یعنی روزِ قیامت۔ آخر تفسیر سورۃ الذاریات، وللّٰہ الحمد والمنۃ۔[4] (كذا في ابن كثير)

---

[1] مسند أحمد (٣٩٤/١) سنن أبي داود (٣٩٩٣) سنن الترمذي (٢٩٤٠) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٦٩/٦)

[2] مسند أحمد (٣٥٨/٢) سنن الترمذي (٢٤٦٦) سنن ابن ماجه (٤١٠٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٩١٤)

[3] مسند أحمد (٤٦٩/٣) اس کی سند میں ''سلام بن شرحبیل'' مجہول راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٧٩٨)

[4] تفسير ابن كثير (٣٠٢/٤، ٣٠٣)

فتح البیان کا بیان:

﴿ كَذٰلِكَ ﴾ محلِ رفع میں ہے اس بنا پر کہ مبتداء محذوف کی خبر ہے اور حرفِ کاف بہ معنی مثل ہے: "أَيْ: الْأَمْرُ وَالشَّأْنُ وَالْقِصَّةُ مِثْلُ ذٰلِكَ" پھر اس اجمال کی تفسیر اس قول سے کی: ﴿ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴾ یا محلِ نصب میں ہے اس بنا پر کہ مفعول مطلق محذوف کی صفت ہے: "أَيْ: أُنْذِرُكُمْ إِنْذَارًا كَإِنْذَارِ مَنْ تَقَدَّمَنِي الرُّسُلُ الَّذِيْنَ أَنْذَرُوْا قَوْمَهُمْ"۔ اور پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ پہلے کی بنا پر معنی یہ ہیں کہ حال اور قصہ ایسا ہے کہ ان سے پہلے جس قوم کے پاس کوئی رسول آیا تو اس کو یہی کہا کہ ساحر ہے یا مجنون ہے۔ اس سے رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے یہ بیان کر کے کہ اگلی اُمتوں کا بھی یہی حال رہا ہے۔ اور عرب کے لوگوں نے جو آپ کی تکذیب کی اور آپ کو سحر اور جنون کے ساتھ موصوف کیا ہے تو یہ کام پہلے لوگوں سے اپنے رسولوں کے لیے واقع ہو چکا ہے۔

﴿ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ﴾ میں استفہام ملامت اور زجر و توبیخ اور تعجیب کا ہے۔ اللہ پاک تکذیب پر اُن کو زجر و توبیخ کرتا ہے اور اُن کے حال سے تعجب دلاتا ہے کہ کیا اُن کے پہلے لوگوں نے بعد والوں کو تکذیب وصیت کی ہے اور اس پر اتفاق کیا ہے، یہاں تک کہ اس پر متفق ہو کر سب نے یہی بات کہی۔ یا استفہام نفی کے معنی میں ہے، یعنی ان سے اس کی کچھ وصیت واقع نہ ہوئی، کیوں کہ وہ ایک وقت میں باہم ملے جلے نہیں ہیں، پھر اس توبیخ اور نفی سے ہٹ کر وہ بات بیان کی جو حقیقت میں ان کی تکذیب کا باعث ہوئی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴾ سو یہ اضراب انتقالی ہے۔ طغیان کفر میں حد سے بڑھنے کو کہتے ہیں، یعنی انھوں نے باہم اس کی وصیت نہیں کی، بلکہ طغیان و سرکشی نے اور کفر میں بہت زیادہ بڑھ جانے نے ان کو متفق کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ سب کے سب ایک ہی بات بولتے ہیں۔

پھر اللہ پاک نے رسول اللہ ﷺ کو ان سے اعراض کرنے کا حکم دیا: ﴿ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ﴾ یعنی جب ان کی یہ حالت ہے کہ کفر و عناد میں بڑھے ہوئے ہیں، حق کی طرف کان تک نہیں دھرتے تو تو ان سے اعراض کر اور ان کے ساتھ جدال کرنے اور ان کو حق کی طرف بلانے سے رک جا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تجھے جس بات کا امر کیا تھا وہ تو کر چکا ہے اور اس کی رسالت پہنچا دی ہے اور ان پر دعوت کو بار بار پیش کر دیا، چنانچہ انھوں نے کفر پر جمے رہنے اور عناد کے سوا اور کچھ نہ کیا۔ ﴿ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴾ یعنی اب تو اس انذار کے بعد ان سے اعراض کرنے پر اللہ کے نزدیک ملوم نہیں ہے، کیوں کہ جو کچھ تجھ پر لازم تھا وہ تو ادا کر چکا اور جس کام کا تجھے امر کیا گیا تھا اس میں تو نے کوئی کمی نہیں کی اور رسالت کے پہنچانے میں اپنی پوری کوشش اور سعی صرف کر دی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جناب محمد ﷺ کو امر فرمایا کہ کفار سے اعراض کریں،

تا کہ وہ کفار کو عذاب کرے۔[1] یہ آیت آیتِ سیف سے منسوخ ہے، یا اس آیت سے جو آگے آتی ہے: ﴿ وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ جب آپ ﷺ کو ان سے اعراض کرنے کے لیے کہا تو آپ ﷺ کو یہ حکم دیا کہ تذكير وموعظة بالتي هي أحسن کو ترک نہ کریں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ یعنی اور تو اُن سب کو وعظ ونصیحت کر، بے شک نصیحت اس شخص کو فائدہ دے گی جو ایمان لا چکا ہے، کیونکہ وہ اس سے بصیرت اور زیادہ کرے گا۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: یہ معنی ہیں کہ تو اُن لوگوں کو قرآن سے وعظ کر جو تیری قوم میں سے ایمان لائے ہیں پس بے شک نصیحت ان کو نفع دے گی۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کفارِ مکہ کو وعظ کر، پس بے شک وعظ اس شخص کو فائدہ دے گا جو اللہ کے علم میں ہے کہ وہ ایمان لائے گا۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ان کو عقوبت کے ساتھ اور ایام اللہ کے ساتھ تذکیر (نصیحت) کر۔ تذکیر کے ساتھ مومنوں کو اس لیے خاص کیا کہ اس سے نفع پانے والے وہی ہیں۔

جملہ ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴾ مستانفہ ہے جو ماقبل کی تقریر کرتا ہے، اس لیے کہ صرف عبادت کے لیے ان کا پیدا کیا جانا اس قبیل سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو تذکیر کے لیے خوش کرتا ہے اور لوگوں کو تذکیر قبول کرنے کے لیے خوش کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ خاص کر ان لوگوں کے حق میں ہے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ سابق ہو چکا ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں گے سو یہ ایسا عموم ہے جس سے مراد خصوص ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مفسرین نے کہا ہے کہ یہ ان کے لیے خاص ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے ہیں یعنی جنوں اور انسانوں کے دونوں فریق میں سے جو لوگ اطاعت کے اہل بنائے گئے ہیں۔ کہا اور یہ قول امام کلبی اور ضحاک رحمہ اللہ کا ہے اور امام فراء اور ابن قتیبہ رحمہ اللہ کا اختیار کردہ ہے۔

امام قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بالقطع آیت میں تخصیص داخل ہوئی ہے، کیونکہ مجنون اور بچے مامور بعبادت نہیں ہیں اور نہ اس کا ان سے ارادہ کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ پاک یوں فرما چکا ہے: ﴿ وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ﴾ [الأعراف: ۱۷۹] ''اور ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لیے پیدا کیے ہیں۔'' اور جو جہنم کے لیے پیدا کیے ہیں وہ ان میں سے نہ ہوں گے جو عبادت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔[3] (قاله شيخ الإسلام زكريا نقلا عن الرازي)

چنانچہ آیت ان میں سے مومنوں پر محمول ہے اور سیدنا اُبی بن کعب اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی قراءت ''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالإِنْسَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ'' اس پر دال ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: ''إِلَّا لِيَعْرِفُوْنِي''۔ امام ثعلبی رحمہ اللہ نے کہا: (فتح القدیر میں ثعلبی ہے اور فتح البیان میں کلبی۔ والله أعلم) یہ قول حسن

[1] الدر المنثور (٦٢٤/٧) [2] تفسير البغوي (٣٨٠/٧) [3] فتح القدير (١٢٢/٥) فتح الرحمن (٥٣٥/١)

ہے، کیوں کہ اگر وہ اُن کو پیدا نہ کرتا تو اس کا وجود اور اس کی توحید پہچانی نہ جاتی۔ ① امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ معنی یہ ہیں: "إِلَّا لِآمُرَهُمْ وَأَنْهَاهُمْ" ② یعنی عبادت سے مراد یہ ہے کہ میں ان کو امر و نہی کروں۔ اس پر یہ آیت دال ہے: ﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ [التوبة: ۳۱] "حالانکہ انھیں صرف اکیلے اللہ ہی کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ پاک ہے ان کے شریک مقرر کرنے سے۔" امام زجاج رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔

امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وہ سعادت اور شقاوت ہے جس پر وہ مجبول و مخلوق (پیدا) ہوئے ہیں۔ چنانچہ جنوں اور انسانوں میں سے نیک بخت لوگ تو عبادت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور بد بخت لوگ معصیت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی "إِلَّا لِيُوَحِّدُوْنِ" ہیں۔ ③ پس جو مومن ہے وہ تو اس کی توحید کرتا ہے شدت اور رخاء میں، یعنی سختی اور نرمی و عیش و عشرت میں اور کافر جو ہے تو وہ اس کی نہ شدت میں توحید کرتا ہے نہ نعمت میں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول میں ہے: ﴿ وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ [لقمان: ۳۲] "اور جب ان پر موجیں سائبانوں کی طرح چھا جاتی ہیں تو وہ (نہایت) خلوص کے ساتھ اعتقاد کر کے اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں۔" ایک جماعت نے کہا: "إِلَّا لِيَخْضَعُوْا لِيْ وَيَتَذَلَّلُوْا" یعنی مگر اس لیے کہ میرے لیے خضوع و فروتنی و ذلت کریں۔ لغت میں عبادت کے معنی ذل و خضوع و انقیاد کے ہیں اور جن و انس میں سے ہر مخلوق اللہ کی قضا کے لیے خاضع ہے، اس کی مشیت کے لیے متذلل ہے اور اس شے کے لیے جس کو اس پر مقدر کیا ہے منقاد ہے۔ ان کو اس طرح سے پیدا کیا جس طرح چاہا اور اُن کو رزق دیا جیسا فیصلہ کیا ان میں سے کوئی اپنے نفس کے کسی نفع کا مالک نہیں ہے اور نہ کسی نقصان کا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول پہلے گزر چکا ہے، دوسرا یہ ہے: "عَلَى مَا خَلَقْتُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ طَاعَتِيْ وَمَعْصِيَتِيْ وَشِقْوَتِيْ وَسَعَادَتِيْ" ④ یعنی تاکہ وہ میری عبادت کریں اس شے پر جس پر میں نے ان کو پیدا کیا ہے میری طاعت و معصیت و شقاوت و سعادت سے۔ کسی نے کہا: ﴿ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ کے یہ معنی ہیں: "إِلَّا مُسْتَعِدِّيْنَ لِأَنْ يَّعْبُدُوْا" یعنی نہیں پیدا کیا میں نے جنوں اور انسانوں کو مگر اس حال میں کہ وہ لیاقت اور استعداد رکھنے والے ہیں اس کی کہ اس طور سے عبادت کریں کہ میں نے ان میں عقل و حواس و قدرت پیدا کی ہے جس سے عبادت حاصل ہوتی ہے اور یہ اس کو منافی نہیں ہے ان کے بعض سے بالفعل عبادت کا تخلف ہے، کیوں کہ اس بعض نے گو اللہ کو نہیں پوجا لیکن اس میں تہیہ و استعداد ہے جو حقیقت میں غایت وہی ہے۔ یہ قول احسن ہے۔ یہاں جن کو انس سے پہلے رکھنے کی وجہ ان کے وجود کا مقدم ہونا ہے۔

---

① فتح القدير (۱۲۲/۵) فتح البيان (۲۱۱/۱۳) ② تفسير القرطبي (۵۶/۱۷)

③ تفسير القرطبي (۵۶/۱۷) فتح القدير (۱۲۲/۵) ④ الدر المنثور (۶۲٤/۷)

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَاۤ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴾ اس جملے میں اللہ پاک کے اپنے بندوں سے استغنا کا بیان ہے اور اس بات کا کہ وہ ان سے کسی منفعت کا ارادہ نہیں رکھتا، جیسا کہ مالک لوگ اپنے غلاموں سے اس کا ارادہ رکھتے ہیں، بلکہ غنیِ مطلق و رازق وعطا کرنے والا وہی ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ میں ان سے یہ نہیں چاہتا کہ میرے بندوں میں سے کسی کو روزی دیں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ خود اپنے آپ کو روزی دیں اور نہ یہ کہ میری مخلوق میں سے کسی کو کھلائیں اور نہ یہ کہ خود اپنے آپ کو کھلائیں۔ طعام کی نسبت جو اپنے نفس ومقدس کی طرف کی تو اس لیے کہ مخلوق اللہ کی عیال ہیں، پس جس نے اللہ کے عیال کو کھلایا تو اس کے مثل ہے جس نے اس کو کھلایا۔ یہ ویسا ہی ہے جو نبی ﷺ کے قولِ مبارک میں واقع ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے میں نے تجھ سے کھانا مانگا سو تو نے مجھے نہ کھلایا،[1] یعنی تو نے میرے بندوں کو نہ کھلایا۔ ﴿ مِّنْ رِّزْقٍ ﴾ میں کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے عموم کی تاکید کے لیے ہے۔

پھر ان سے رزق نہ چاہنے کی یہ علت بیان فرمائی: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ﴾ یعنی اللہ پاک ان سے رزق نہیں چاہتا، اس لیے کہ رزاق وہی ہے اس کے سوا کوئی رزاق نہیں ہے اور نہ کوئی داتا ہے۔ چنانچہ وہی اپنی سب مخلوق کو روزی دیتا ہے اور وہی اس شے کا بندوبست کرتا ہے جو ان کے حال کی اصلاح اور درستی کرتا ہے۔ اس لیے ان کو چاہیے کہ عبادت کے علاوہ کسی کام میں مشغول نہ ہوں۔ غرضیکہ اللہ پاک مخلوق سے رزق تو اس لیے نہیں چاہتا کہ رازق وہی ہے اور مخلوق مرزوق ہے۔

پھر یہ بات رہی کہ روزی کے تمام وکامل ہونے میں کھانے پینے کی اصلاح و درستی کے لیے خدمت لینے کی حاجت ہوتی ہے، سو اس کی حاجت نہ ہونے کی یہ علت ذکر فرمائی: ﴿ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴾ یعنی اس کو ان سے خدمت لینے کی کچھ ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ وہ زور آور اور مضبوط ہے اس کو کسی کام میں کسی کی کچھ بھی حاجت نہیں ہے۔ جمہور نے ﴿ اَلْمَتِيْنُ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے اس بنا پر کہ ﴿ اَلرَّزَّاقُ ﴾ کی صفت ہے، یا کلمۂ ﴿ ذُو ﴾ کی صفت ہے، یا خبر بعد خبر ہے، یا مبتدائے مقدر کی خبر ہے۔ بر ہر تقدیر یہ تاکید ہے اس لیے کہ ﴿ ذُو الْقُوَّةِ ﴾ اس کا فائدہ دیتا ہے۔ امام یحییٰ بن وثاب اور اعمش رحمہ اللہ نے بہ جر پڑھا ہے اس بنا پر کہ ﴿ اَلْقُوَّةِ ﴾ کی صفت ہے۔ مذکر اس لیے ہے کہ ﴿ اَلْقُوَّةِ ﴾ کی تانیث غیر حقیقی ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حق اس کا "المتينة" تھا، پھر اس کو مذکر کیا اس لیے کہ اسے "شيء مبرم محكم الفتل" کی طرف لے گئے جو رسی مضبوط بٹی ہوئی ہوتی ہے تو محاورے میں اسے "حبل متين" بولتے ہیں۔[2] مطلب یہ ہے کہ جب متین سے "شيء مبرم" مراد لے لی تو اب وہ بے کھٹکے قوت کی صفت پڑ گئی۔ اس جگہ متین کے معنی "شديد القوة" ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ اَلْمَتِيْنُ ﴾ "الشديد".[3]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٦٩) [2] تفسير القرطبي (١٧/٥٦، ٥٧) [3] تفسير الطبري (٢٢/٤٤٧)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ ﴾ یعنی پس بے شک ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر و معاصی کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا، مکہ والے اور ان کے علاوہ، عذاب کا ایک حصہ ہے ان کافروں کے حصے کی طرح جو پہلی امتوں میں سے تھے۔'' امام ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''يُقَالُ يَوْمٌ ذَنُوْبٌ أَيْ: طَوِيْلُ الشَّرِّ لَا يَنْقَضِيْ''[1] یعنی جس دن کا شر طویل ہو منقضی نہ ہو اس کو یوم ذنوب کہتے ہیں۔ لغت میں ذنوب کی اصل ''دَلْوٌ عَظِيْمٌ'' ہے یعنی بڑا ڈول پھر ذنوب کا استعمال کیا گیا کسی شے کے حصے میں۔ اسی باب سے شاعر کا قول ہے:

لَعَمْرُكَ وَالْمَنَايَا طَارِقَاتٌ لِكُلِّ بَنِيْ أَبٍ مِنْهَا ذَنُوْبٌ

یعنی قسم ہے تیری عمر کی! موتیں رات کو آنے والی ہیں، ہر باپ کے بیٹوں کے لیے ان میں سے ایک حصہ ہے۔

اور آیت اس سے ماخوذ ہے کہ پانی پلانے والے پانی کو بڑے ڈول سے آپس میں بانٹتے ہیں تو ایک ڈول اس کے لیے ہوتا ہے اور ایک ڈول اس کے لیے۔ پس یہ تمثیل ہے کہ ذنوب کو حصے اور نصیب کی جگہ ٹھہرایا ہے۔[2] (قالہ ابن قتيبة) کسی نے کہا ہے کہ نصیب کی تعبیر ذنوب کے ساتھ اس لیے کی ہے کہ عذاب کا حصہ اس بات میں ذنوب کے مشابہ ہے کہ ان پر عذاب ڈالا جائے گا جس طرح کہ ڈول ڈالا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴾ [الحج: ١٩] ''ان کے سروں کے اوپر سے سخت کھولتا ہوا پانی بہایا جائے گا۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ ذَنُوْبًا ﴾ ''دَلْوًا''۔[3] امام راغب رحمہ اللہ نے کہا: ''اَلذَّنُوْبُ الدَّلْوُ الَّذِيْ لَهُ ذَنَبٌ''[4] یعنی دم دار ڈول۔

﴿ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ ﴾ یعنی وہ مجھ سے یہ نہ طلب کریں کہ ان کے لیے عذاب کی جلدی کر دوں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٧٠] ''پس ہم کو جس عذاب کی دھمکی دیتے ہو اس کو ہمارے پاس منگوا دو اگر تم سچے ہو۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴾۔ ''فَوَيْلٌ لَّهُمْ'' کے بجائے موصول رکھا، اس سے ان پر کفر کا حکم لگانا منظور ہے اور حکم کی وجہ کی خبر دینا، یعنی ان کے لیے جو ویل کے ثابت ہونے کا حکم لگایا گیا ہے، اس کی وجہ ان کا کفر ہے۔ معنی یہ ہیں: پس کافروں کے لیے خرابی ہے ان کے اس دن سے جس میں ان کو عذاب کا وعدہ دیا جاتا ہے۔ کہا گیا کہ یہ دن قیامت کا دن ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بدر کا دن، لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔

یہاں تین حرف فاء ہیں: پہلا تو محذوف پر مرتب، یعنی جب تم نے اگلے کفار عاد و ثمود و قومِ نوح کا حال جان لیا کہ کفر و تکذیب کی وجہ سے ہلاک ہوئے اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے تو ان کافروں کے لیے بھی!

---

[1] تفسير القرطبي (١٧/٥٧) [2] فتح القدير (٥/١٢٣)

[3] تفسير الطبري (٢٢/٤٤٨) [4] المفردات في غريب القرآن (١/١٨١)

عذاب کا بڑا حصہ ہے، جیسا کہ ان کے اشباہ و امثال (ان جیسے لوگ) کے لیے ہے۔ دوسرا حرفِ فاء عذابِ عظیم پر استعجال کی نہی کی ترتیب کے لیے ہے، یعنی جب یہ معلوم ہوا کہ ان کے لیے بڑا عذاب ہے تو اس کے لیے جلدی نہ چاہیں، کیوں کہ کوئی عاقل اپنے عذاب کی جلدی نہیں چاہتا۔ اسی طرح تیسرا حرفِ فاء ثبوتِ ویل کی ترتیب کے لیے ہے عذابِ عظیم پر، یعنی جب وہ بڑا عذاب ہے تو اُن کے لیے سخت خرابی ہے۔ ''ویل'' بہ معنی شدتِ عذاب ہے، یا جہنم میں ایک وادی ہے۔[1] والله أعلم بالصواب.

الحمد لله والمنة کہ اس سورت مبارکہ کی تفسیر ۱۶/ ماہِ ذی قعدہ ۱۳۱۴ ہجری کو شب سہ شنبہ (منگل) وقت دو ساعت تمام ہوئی۔ اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور آیندہ لکھنے کی توفیق دے۔ آمین. الحمد لله أولا و آخراً وظاهرا وباطناً، وصلى الله وسلم وبارك على سيدنا ومولانا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين إلى يوم الدين آمين.

---

(1) فتح البیان (۱۳/ ۲۱۰۔۲۱۴)

سلسلۂ مطبوعات (49)

برِ صغیر میں

اہلِ حدیث کی اوّلیات

تالیف: مولانا محمد اسحاق بھٹی

مجلد // صفحات: 208

سلسلۂ مطبوعات (50)

قرآن مجید پر عیسائی مبلغین کے اعتراضات کا مسکت اور مدلل جواب...

ایک نایاب دستاویز پہلی بار منظر عام پر

برھان التفاسیر

لاصلاح سلطان التفاسیر

تالیف: شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری

مجلد // صفحات: 432

سلسلۂ مطبوعات (51)

ارمغان مولانا محمد اسحاق بھٹی

تالیف

حمید اللہ خان عزیز

مجلد // صفحات: 948

سلسلۂ مطبوعات (52)

اہلِ حدیث کا منہج

اور

احناف سے اختلاف کی حقیقت و نوعیت

تالیف: فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف

مجلد // صفحات: 288

سلسلۂ مطبوعات (53)

تاریخ و تعارف

دار الحدیث رحمانیہ دہلی

تالیف: فضیلۃ الشیخ مولانا اسعد اعظمی حفظہ اللہ

تعلیق: مولانا محمد اسحاق بھٹی

مجلد // صفحات: 352

سلسلۂ مطبوعات (54)

جاوید احمد غامدی کے تصورِ حدیث و سنت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

فتنۂ غامدیت

تالیف: فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف

مجلد // صفحات: 368

سلسلۂ مطبوعات (55)

شیخ الکل سید میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ
کے تلامذہ کرام کا تذکارِ جمیل

دبستانِ نذیریہ

تالیف: محمد تنزيل الصديقي الحسيني

* 3 جلدیں // * معیاری طباعت

سلسلۂ مطبوعات (56)

تحریکِ اہلِ حدیث کی دینی و ملی تگ و تاز
اور اکابر کا دلنشین تذکرہ

ہمارے اَسلاف

تالیف
مولانا محمد یوسف انور حفظہ اللہ

* مجلد // * صفحات: 408

سلسلۂ مطبوعات (57)

اردو تحریر و انشا میں سرزد ہونے والی اغلاط کی اصلاح

زبانِ خامہ کی خامیاں

تالیف: علیم ناصری رحمہ اللہ   اضافہ: محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ

پیش لفظ: حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ   نظر ثانی: محسن فارانی

* مجلد // * صفحات: 224

سلسلۂ مطبوعات (58)

سلفیانِ برصغیر کے پہلے تنظیمی سربراہ اور دبستانِ نذیریہ کے ممتاز رکن
استاذ الاساتذہ حافظ محمد عبداللہ محدث غازی پوری رحمہ اللہ کے احوال و آثار اور دینی خدمات کا تذکرہ

یادگارِ سلف

حافظ شاہد رفیق
فاضل مدینہ یونیورسٹی

* مجلد // * صفحات: 592

سلسلۂ مطبوعات (59)

دلچسپ واقعات اور سبق آموز حکایات پر مبنی طلبائے علم کے لیے ایک راہنما تحریر

دینی تعلیم و تربیت کے اصول و آداب

تالیف: مولانا عبدالرؤف خان رحمانی جھنڈانگری رحمہ اللہ

* کارڈ کور // * صفحات: 118

سلسلۂ مطبوعات (60)

سوئے منزل

تالیف: مولانا عبدالخالق مدنی

* کارڈ کور // * صفحات: 304

سلسلۂ مطبوعات (89)

جائزة الأحوذي
في التعليقات على
سنن الترمذي

تالیف: العلامة المحدث أبي النصر ثناء الله بن عيسى خان المدني

* جلدیں // * معیاری طباعت

سلسلۂ مطبوعات (90)

الوصائل
في
شرح الشمائل

تالیف: العلامة المحدث أبي النصر ثناء الله بن عيسى خان المدني

* مجلد // * صفحات: 672

سلسلۂ مطبوعات (91)

خطبہ غدیر خم
اور
اہل بیت کے حقوق

تالیف: مولانا ارشاد الحق اثری

* مجلد // * صفحات: 144

سلسلۂ مطبوعات (92)

مقام صحابہ رضی اللہ عنہم

تالیف
مولانا ارشاد الحق اثری

* مجلد // * صفحات: 264

سلسلۂ مطبوعات (93)

فضائل صحابہ و اہل بیت
اور
مسائل محرم الحرام

علمائے پاک و ہند کی تقریظات کے ساتھ مسند ایڈیشن

تالیف: فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف

* مجلد // * صفحات: 320

سلسلۂ مطبوعات (94)

برصغیر میں
اصحاب الحدیث
ایک مطالعہ

تالیف
محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

* مجلد // * صفحات: 464

سلسلۂ مطبوعات (101)

علمائے اہلِ حدیث کی کہانی اُن کی اپنی زبانی

تالیف: حکیم محمد یحییٰ عزیز ڈاھروی رحمہ اللہ

تقریظ: مورخِ اہلِ حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ

مجلد // صفحات: 860

سلسلۂ مطبوعات (102)

نيل المرام من تفسير آيات الأحكام

تاليف

العلّامة أبي الطيب صديق حسن خان البخاري القنّوجي

(المتوفى: ١٣٠٧هـ)

مجلد // صفحات: 684

سلسلۂ مطبوعات (103)

المقامات الخمس الأولى وفق المنهج المقرر في وفاق المدارس السلفية باكستان

المقامات الحريرية

لأبي محمد القاسم بن علي الحريري رحمه الله

مع

التعليقات العربية

للشيخ محمد إدريس الكاندهلوي رحمه الله

مجلد // صفحات: 320

سلسلۂ مطبوعات (109-104)

تعلیم الاسلام

تالیف نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

تحقیق وتسہیل حافظ عبداللہ سلیم حفظہ اللہ

مجلد // صفحات: 256

سلسلۂ مطبوعات (114-110)

ارکانِ اسلام

تالیف نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

تحقیق وتسہیل حافظ عبداللہ سلیم حفظہ اللہ

مجلد // صفحات: 712

سلسلۂ مطبوعات (115)

قادیانیت پر اوّلین فتوائے تکفیر

تاریخی حقائق اور شبہات کا ازالہ

تالیف: ابو صہیب محمد داؤد ارشد حفظہ اللہ

مجلد // صفحات: 544

سلسلۂ مطبوعات (116)

عقیدہ سلف کا ترجمان اور اسلامی عقائد وافکار کا مستند ماخذ

صریح السنہ

تالیف: امام محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ

ترجمہ: حافظ محمد اسحاق طاہر حفظہ اللہ

کارڈ کور // صفحات: 80

سلسلۂ مطبوعات (117)

تذکرہ مولانا عبدالحق محدث ملتانی رحمہ اللہ اور ان کا خانوادۂ علمی

تالیف: حافظ ریاض احمد عاقب اثری حفظہ اللہ

تقدیم: محدث العصر مولانا محمد رفیق اثری حفظہ اللہ

مجلد // صفحات: 592

سلسلۂ مطبوعات (118)

قرآن مجید کا مستند ترجمہ اور مختصر تفسیر

قرآن کریم مترجم و محشی

ترجمہ وحواشی

مولانا فتح محمد جالندھری رحمہ اللہ — حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ

نظر ثانی

ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر رحمہ اللہ — حافظ عبدالحمید ازہر حفظہ اللہ

مجلد // صفحات: 735

سلسلۂ مطبوعات (119)

تاریخ حیات حضرت امام سید محمد نذیر حسین صاحب مرحوم محدث دہلوی

الحیاۃ بعد المماۃ

تالیف: مولانا فضل حسین بہاری رحمہ اللہ

تدوین وحواشی: محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

مجلد // صفحات: 512